شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ صدر حیدرآباد
محرم الحرام ۱۳۸۴ھ جون ۱۹۶۴ء

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی،

مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

محمد سرور،

قیمت سالانہ :- آٹھ روپے

فی پرچہ :- پچھتر پیسے

الرحیم حیدرآباد

جلد ۲ محرم الحرام سنہ ۱۳۸۴ھ مطابق جون سنہ ۱۹۶۴ء نمبر ۱

فہرست مضامین

اس شمارے سے ماہ نامہ الرحیم کا دوسرا سال شروع ہو رہا ہے، جن خریدار حضرات کا سالانہ چندہ ختم ہو گیا ہے، ان سے درخواست ہے کہ وہ منی آرڈر کے ذریعہ نئے سال کا چندہ مرحمت فرمائیں۔

(مینیجر)

شذرات

خدا کا شکر ہے، اس دفعہ عاشورۂ محرم امن دامان سے گزر گیا۔ اور ملک کے کسی حصے میں بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔ آپس میں اتحاد و اتفاق ہر انسانی جمعیت کے لئے ہمیشہ سے ایک ضروری و لابدی چیز رہا ہے، لیکن ہمارا ملک اپنی زندگی کے جن کٹھن مراحل میں سے اس وقت گزر رہا ہے، ان میں تو اور بھی ضروری ہے کہ ہم متحد ہوں اور مذہبی اختلافات اور فرقہ وارانہ کشمکش کی قسم کی کوئی چیز ہمارے ہاں بار نہ پا سکے۔

پاکستان مسلمانوں کی قومی مملکت ہے۔ اس کا قیام برصغیر پاک و ہند کے تمام مسلمانوں کی مجموعی جدوجہد اور ان سب کے متفقہ ملی شعور کا نتیجہ ہے، چنانچہ قدرتی بات ہے کہ اس میں ہم سب بحیثیت ایک متحدہ مسلمان قوم کے رہیں اور اس بڑی وحدت میں ہمارے مختلف مذہبی فرقے، اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہوئے، باہم آہنگ ہوں اور اس طرح ان سب کی ایک متحدہ اسلامی قومیت بنے، جس کی فکری و اعتقادی اساس تو اسلام کی ہمہ گیر اور جامع انسانیت تعلیمات ہوں، اور اس کا عملی موطن یہ سرزمین پاک ہو، جو ایک ٹھوس اور مادی حقیقت ہے۔ جس طرح روح اور جسم کا ارتباط ایک فرد انسانی کو زندگی اور وحدت بخشتا ہے، اسی طرح اسلامیت اور پاکستانیت مل کر ہماری قومیت کی زندگی اور وحدت کی ضامن بن سکتی ہے۔ اب مملکت پاکستان ایک سیاسی انتظامی و معاشی وحدت ہے، خدانخواستہ اگر ہماری اسلامیت اس کے لئے ایک بنیادی وحدت نہ بنی اور وہ باہم متحارب اور آپس میں بغض و حسد رکھنے والے مذہبی فرقوں میں بٹی رہی تو اس تضاد اور تصادم کے جو نتائج نکلیں گے، ان کا ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ مسلمان قوموں کی ہیئتِ سیاسی واجتماعی میں ان کی مذہبی فرقہ وارانہ تنظیموں کا بہت دخل تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ اِس دور میں ہر جگہ مسلمانوں کی قومی مملکتیں وجود میں آرہی ہیں جن کی اپنی اپنی مستقل سیاسی وحدتیں ہیں اور جن کے باشندوں کے بلا تمیز فرقہ ونسل ایک سے معاشی اجتماعی، تعلیمی، ثقافتی وتمدنی مسائل ہیں، اور بین الاقوامی حالات اور خود ان کی اپنی ملکی وقومی ضرورتیں انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان مسائل سے متحد ہو کر عہدہ برآ ہوں، ورنہ ان کی نہ تو سیاسی آزادی محفوظ رہے گی، اور نہ وہ معاشی آسودگی اور اجتماعی بہبود کی منزل تک پہنچ سکیں گے، غرض الگ الگ مذہبی فرقوں سے بلند ہو کر ایک متحدہ مسلمان پاکستانی قوم بننا ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کے بقاء وترقی کے لئے آج شرط اولیں ہے، اور اس کے بغیر ہمارا کوئی قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ بلکہ مذہبی فرقہ آرائی سے الٹا ہمارا قومی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

علامہ اقبال کا ارشاد ہے "تسلسلِ حیاتِ ملیہ از محکم گرفتن روایاتِ مخصوصہ ملیہ می باشد" اور انہیں کا یہ شعر ہے۔

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو

از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

مولانا سندھی فرمایا کرتے تھے "وہ فکر جس کی اپنی تاریخ نہیں، اس کی افادیت ونتیجہ خیزی کم ہی ہوتی ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ جب گری ہوئی قومیں دوبارہ اٹھتی ہیں، اور حیاتِ نو سے بہرہ ور ہوتی ہیں تو وہ اکثر اپنے ماضی کی کتاب کے درخشندہ صفحات کو تلاش کرتی اور ان کی فکری روایات کو اپناتی ہیں۔ اور اس طرح اپنی حیاتِ ملیہ میں تسلسلِ فکری پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں ۔ تاریخ میں ہر قوم کا یہی عمل رہا ہے۔ خواہ وہ ماضی پرست ہو یا کمیونزم کو ماننے والی ماضی کا انکار کرنے والی ہی کیوں نہ ہو۔

بے شک ہماری یونیورسٹیاں اور تعلیمی وعلمی ادارے کسی حد تک یہ کام کر رہے ہیں، لیکن

قیام پاکستان کے بعد ضرورت تھی ایسے مخصوص اداروں کی، جن کا مقصود و نصب العین ہی اپنی ملی تاریخ کی تحقیق اور اس کے تابندہ گوشوں کو موجودہ اور آیندہ نسلوں سے متعارف کرانا ہو۔ محکمہ اوقاف مغربی پاکستان قابل مبارک باد ہے کہ اس کی کوششوں سے پچھلے دنوں اس قسم کے متعدد ادارے وجود میں آگئے ہیں، اور علمی تحقیق و تفحص کے کاموں کی ایک گونہ طرح پڑ گئی ہے۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد کے بعد لاہور میں ایک اور علمی و تحقیقی ادارے کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا دائرۂ کار کافی وسیع ہوگا۔ اس کے علاوہ محکمہ اوقاف کی طرف سے تصوف کی بعض بنیادی کتابیں شائع کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ امید ہے محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام قومی و ملی تاریخ ضبط کرنے کے اس کام کا دائرہ برابر وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ اور اس کی بدولت ان شاء اللہ اس ملک اور قوم کو زیادہ سے زیادہ پائندگی حاصل ہوگی۔

ہماری سیاسی و فکری بیداری کے موجودہ دور کو بالعموم سرسید سے شروع کیا جاتا ہے۔ ۱۱ رمئی کو کراچی میں طلبائے قدیم علی گڑھ کی ایک کنونیشن میں تقریر کرتے ہوئے صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب نے بجا فرمایا ہے کہ ہمیں اس ضمن میں اور آگے جانا چاہیے۔ سرسید دراصل اس سلسلے کی ایک کڑی تھے جس کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ، ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز اور دیگر بزرگوں سے ہوا اور آخر میں علامہ اقبال اور قائداعظم نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔

واقعہ یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی اکثر حالیہ اسلامی تحریکوں کے سوتے حضرت شاہ ولی اللہ ہی سے پھوٹتے ہیں اور وہی ہماری موجودہ فکری و سیاسی نہضت کے بانی ہیں۔

ہمعات اور سطعات کے بعد اکیڈمی کی طرف سے "تاویل الاحادیث" کا سندھی ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ افسوس ہے ماہنامہ الرحیم کا سندھی ایڈیشن ڈیکلریشن نہ ملنے کی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہو سکا وہ بھی اب زیر طبع ہے۔ اکیڈمی کا سالانہ تحقیقی مجلہ "الحکمۃ" جو انگریزی میں ہوگا، طباعت کے آخری مراحل میں ہے، امید ہے وہ ماہ جون کے وسط تک شائع ہو جائے گا۔

السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم[1]

مترجم مولانا ابو یحیی امام خاں[2]

یہ رسالہ مصنف علام کے مسترشدین ملا امان اللہ اور ملا شیر محمد دونوں کی تحریک پر سپرد خامہ ہوا۔ شاہ صاحب بعد البسملہ و تحمیدہ فرماتے ہیں:۔

اما بعد فیقول العبد الضعیف ولی اللہ بن عبد الرحیم عاملھما اللہ تعالیٰ بفضلہ العظیم ھذہ فائدۃ ارجوان ینتفع بھا من تاملھا و اعطاھا من الفھم حقھا حملنی علی تحریرھا التماس اخوی فی الدین ملا امان اللہ و ملا شیر محمد بلغنی اللہ وایاھما بما نتمنی بمنہ و کرمہ۔

---

[1] شاہ ولی اللہ کا یہ رسالہ عربی میں ہے۔

[2] مترجم کے پیش نظر رسالہ مذکورہ کا وہ نسخہ ہے جس کا عربی متن اردو ترجمے کے ساتھ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں دہلی میں چھپا تھا۔ اس کے طابع و ناشر سید ظہیر الدین عرف سید احمد ولی اللہی مالک مطبع احمدی متعلق مدرسہ عزیزی دہلی تھے۔

مدرسہ عزیزی کا محل وقوع دہلی کے موجودہ اردو بازار سے مشرق کی طرف جگت سینما سے ملحقہ کھڑکی سے لگا ہوا ہے اور ادھر کوچہ چیلاں کی طرف جاتے ہوئے۔ یہ احاطہ پہلے مدرسۂ شاہ عبد الرحیم سے موسوم تھا۔ اب اس میں بڑ بھونجے رہتے ہیں۔ ادھر کھڑکی سے ملا ہوا کمرہ ہے جس میں بیٹھ کر شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے تھے۔ یہ واقعہ مجھے عبد الغنی صاحب نے بتایا جو ۱۹۳۹ء میں شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار پر مجاوری فرماتے تھے اور ایک ٹانگ کے بل پر چلتے تھے۔

(ابو یحیی)

شکر ہے اس خدا کا، جو نعمتیں بخشنے والا اور مکروہات سے نجات دلانے والا ہے۔ دلوں میں حکمت و دانائی کا القا جس کے بس میں ہے، ہم اس کی حمد کرتے اور اسی کے حضور اپنی بخشش کے خواہش مند ہیں۔ اس کی ذات سے اپنی ناجائز تمناؤں کے نقصانات سے پناہ مانگتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ اس ذات کبریا کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ اور ہم یہ شہادت بھی دیتے ہیں کہ بلاشبہ سیدنا محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں، جو خلاق حرم کے ایمان کا سبب ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ اہل معالی الھمم۔

بعدازیں عرض گزار ہے عبد ضعیف ولی اللہ بن عبدالرحیم۔ ان دونوں کے ساتھ پروردگار بخشش اور احسان کا معاملہ فرمائے۔ اس (رسالے) سے امید ہے پڑھنے اور سننے والے فائدہ حاصل کریں۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی دست گیری فرمائے۔

واضح ہو کہ علوم مدونہ چار قسموں پر مشتمل ہیں۔ عربی۔ شرعی۔ فلسفی اور محاضرہ کے متعلق۔ ہم انشاءاللہ ان علوم کے ناموں اور لوگوں میں یہ جس طرح پھیلے، اس کے اسباب پر، بہایت اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے

پہلی فصل —— علوم عربیہ

علوم عربیہ اس لئے مدون کئے گئے کہ ان کے ذریعہ کلام عرب کی معرفت حاصل ہو۔ منجملہ ان کے ایک وہ علم ہے، جس میں حروف مفردات سے بحث کی جاتی ہے۔ اگر ان سے بہ لحاظِ مادہ بحث کی جاتی ہے، تو یہ علم لغت ہے۔ اگر زبان سے حروف کو ادا کرنے کی کیفیت پر بحث ہو، تو یہ علم المخارج ہے، الفاظ کی ہیئت سے بحث کو علم صرف سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جب الفاظ کو اصل و فرع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے منسوب کیا جائے، تو یہ علم الاشتقاق ہوا۔ منجملہ ان کے ایک وہ علم ہے، جس میں مرکبات سے بحث کی جاتی ہے، اور اس کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ اگر مرکب کلمہ کے آخری احوال سے بحث ہو تو وہ علم الاعراب ہے۔ صنعت ترکیب کے اعتبار سے بحث کی گئی ہو، تو وہ علم التالیف ہے اور محسناتِ کلام کے لحاظ سے بحث ہو، تو وہ علم البدیع ہے۔

منجملہ ان کے ایک وہ علم ہے، جس میں شعر کے احوال سے بحث کی جاتی ہے اور اس کی بھی متعدد شاخیں ہیں۔ وزن کے لحاظ سے شعر پر بحث ہو، تو وہ علم العروض ہے۔ اواخر ابیات کے اعتبار سے بحث ہو تو وہ علم القافیہ ہے اور اس سے متعلق علم الخط ہے، جس میں عربوں کی اصطلاح کے مطابق

نقوش کتابت یعنی حروف کی شکل و صورت سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ فنون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر اس شکل میں نہیں تھے کہ ان کا کوئی خاص مقام ہوتا۔ سب سے پہلے ابوالاسود نے ان کے استنباط کی طرح ڈالی۔ اس نے دواوینِ اشعار پر زیر زبر پیش کی علامتوں کے لئے نقطے لگائے۔ پھر خلیل بن احمد آئے۔ اور انہوں نے لغت میں کتاب العین تصنیف کی اور عروض وقافیہ کا استنباط کیا۔ پھر سیبویہ آئے اور انہوں نے نحو میں اپنی مشہور کتاب لکھی اور اس میں ایک ضمیمہ شامل کیا، جس میں حروف کے مخارج علم صرف علم تالیف اور قدرے علم معانی کا بیان ہے اس کے بعد بادشاہوں کے ندیموں وغیرہ میں سے جو سخن طراز لوگ تھے، انہوں نے قصے کہانیاں اور بلیغوں کے شعروں کے متعلق باہمی بحثوں کے نکتے، جمع کر دیئے، چنانچہ یہ علومِ معانی و بیان و بدیع کے استنباط کا ایک اساس بن گیا۔

دوسری فصل — علومِ شرعیہ

علوم شرعیہ کی تدوین اس غرض سے ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جن امور کے ساتھ مبعوث ہوئے، ان کی معرفت حاصل ہو۔ ان علوم کا مرجع ہے قرآن مجید و سنت اور جو ان سے مستنبط کیا گیا۔ سلف نے علوم شرعیہ میں چار اصناف کی تصانیف کیں۔ فقہ جس میں عبادات، خرید و فروخت، میراث، خانہ داری، شہروں کی سیاست، اور آداب بعثت کا ذکر ہے۔ تفسیر، اس میں قرآن مجید کے نامانوس (غرائب) الفاظ کی شرح، نزول آیات کے اسباب کا بیان، متعارض آیات میں تطابق و توافق، مشکل مقامات کی وضاحت، ناسخ و منسوخ کا بیان اور اسی طرح کی چیزیں آتی ہیں۔ سیر۔ اس میں آنحضرتؐ کی عادات و شمائل، آپؐ کا اِدھر اُدھر جانا، آپؐ کے غزوات و شواہد اور اسی طرح کی دوسری باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ رقائق۔ یہ مشتمل ہے مواعظ و نصائح کی تلقین اور جنت و دوزخ، اعمال کے فضائل، صحابہ کے مناقب اور زہد و ترک دنیا وغیرہ کے ذکر و اذکار پر۔

ان اہل علم میں سے کوئی ایسا تھا، جس نے ایک فن میں کمال حاصل کیا، اور وہ اسی کا ہو گیا۔ بعض دو دو اور بعض کئی فنوں پر جامع تھے۔ چنانچہ ضحاک بن مزاحم مفسر تھے۔ ابوحنیفہ، مالک اور شافعی فقہاء، اور ابن اسحاق اور واقدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے عالم اور واعظین، زہاد اور صوفیہ علم رقائق والے تھے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی عبداللہ بن عباس امام تفسیر تھے اور ابن عباس بہت سے فنون کے جامع تھے۔

اور عمر، علی، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم ائمۂ فقہ تھے۔ ان کے زمانے کے بعد اور لوگ ان فنون کی تحقیق میں لگ گئے اور ان کی بحث وتمحیص میں انہوں نے گہرے غور وفکر سے کام لیا چونکہ پہلے پہلے صرف قرآن وسنت ہی تھے، اس لئے انہوں نے قرات کی مختلف وجوہ یعنی لہجوں کے بارے میں تصنیفات کیں۔ اور اس میں سات اور سات سے بھی زیادہ مذاہب ہو گئے۔ ان میں سے بعض روایت پر اور بعض عربوں کے کلام اور علم المخارج پر محمول ہیں۔ انہوں نے قرآن کے رسم الخط پر لکھا اور اس میں عثمانی مصاحف کا تتبع کیا۔ اسی طرح انہوں نے اول اول بغیر کسی سابقہ نمونے کے جمع وتدوین احادیث پر کتابیں لکھی۔ پھر انہیں غور وفکر اسی ضمن میں بہت سے فنون کی ترتیب کی طرف لے گیا۔ ان میں سے ایک حدیث صحیح کو سقیم سے اور مستفیض کو غریب ومعلول سے متمیز کرنا ہے، جیسے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مستدرک حاکم، مسند احمد، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، نسائی، دار قطنی ہیں۔ ان کتابوں میں ایک قسم ہے، جس میں حدیثوں کو مسائل فقہ کے اعتبار سے مرتب کیا گیا۔ مثلاً کتب شافعی، ابن ماجہ، بیہقی اور شرح السنۃ وغیرہ نیز احادیث کی ایک تقسیم صحابہ کے لحاظ سے ہے۔ اور یہ کتابیں مسند کے نام سے موسوم ہیں، جیسے مسند ابی یعلی[۱] اور مسند بزار۔

بجملہ ان فنون کے، ایک فن اسماء الرجال[۲] کا ہے۔ اس میں رجال احادیث پر جرح وتعدیل

---

[۱] نام مسند نہ صرف صحابہ کی تقسیم کے لحاظ سے ہے، بلکہ شیوخ واساتذہ کے ساتھ بھی مسند منسوب ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلاء میں ایسی تقریباً پچاس مسانید کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور مسند امام احمد بن حنبل ہے۔ مسانید میں ترتیب مسائل کا لحاظ نہیں ہوتا۔ پہلے کسی ایک صحابی کی مرویات آتی ہیں۔ پھر دوسرے کی۔ اب ان سے اخذ مسئلہ کے لئے ان کی تبویب ضروری ہوئی۔ چنانچہ مسند امام احمد کی بے شمار شروح کے ساتھ اسے مبوّب بھی کیا گیا۔

[۲] علمائے ہند وپاک میں سے علامہ طاہر پٹنی نے المغنی نام سے رجال پر کتاب لکھی جو مطبع نظامی دہلی میں طبع ہوئی۔ اور اب نایاب ہے۔

اور احادیث کے نامانوس غریب الفاظ[1] کی شرح ہوتی ہے۔ انہی فنون میں سے ایک مختلف کتب میں آمدہ احادیث کی تخریج[2] ہے، جیسے احیاء العلوم کی تخریج اور ایسے ہی کتب صحیحہ کی طرز پر تخریج ہے جیسے صحیح ابی عوانہ اور صحیح الاسماعیلی۔

منجملہ ان فنون کے ایک فن مشکل الحدیث کا ضبط، مختلف حدیثوں میں تطبیق دینا اور اصول حدیث ہے۔ اور ان میں سے ایک کتب حدیث کی متون کی شرح کرنا ہے۔ جیسے ابن حجر اور نووی نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی شرحیں لکھیں۔ ان کے علاوہ وہ کثیر التعداد شرحیں جن کا شمار کرنا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس بندے پر بہت بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اسے اسرار حدیث اجمالاً و تفصیلاً بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں انہیں مدون کر دیا ہے،

---

[1] غریب الحدیث پر بھی علامہ پٹنی نے مجمع البحار کے نام سے کتاب لکھی۔ اردو میں نواب وحید الزماں حیدرآبادی نے نور اللغات نام سے کتاب لکھی، جو دوسری مرتبہ کراچی سے شائع ہوگئی ہے۔

[2] کسی مصنف کی مؤلفہ کتاب میں جو احادیث آئی ہوں، ان کے راویوں کی جرح و تعدیل تخریج ہے جیسے امام غزالی کی احیاء العلوم پر حافظ زین الدین العراقی (م ۸۰۶ھ) کی کتاب اور ہدایہ پر زیلعی (جمال الدین یوسف م ۷۶۲ھ) کی تالیف نصب الرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ ہے۔

برصغیر میں علم حدیث کی اس صنف پر زیادہ کام نہیں ہو سکا۔ شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں آوردہ احادیث کی تخریج قاضی محمد مچھلی شہری نے یہ مہم سر کی تھی۔ لیکن ان کی رحلت کے بعد یہ کتاب طبع نہ ہو سکی۔ تخریجات میں ہندی علماء میں سے نواب صدیق حسن خاں کی کتاب الادراک فی تخریج احادیث الاشراک "تقویت الایمان" میں مستخرجہ احادیث پر ہے اور نواب وحید الزماں کی تالیف احسن الفوائد فی تخریج احادیث شرح العقائد ہے۔ اسی فصل میں مولانا سید امیر علی ملیح آبادی کی تالیف تعقیب ہے۔ جس میں تقریب التہذیب ذہبی میں آمدہ راویوں کے اسماء دکنی کی تصحیح ہے۔ یہ کتاب تقریب التہذیب کے حاشیے پر نولکشور میں طبع ہو چکی ہے۔

بعد ازاں اہل علم ان مذکورہ بالا چار فنوں کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور تفسیر میں ان کا زیادہ اہتمام ہوا۔ چنانچہ ہر صاحب فن نے تفسیر لکھی۔ صاحب نحو نے نحو کو صاحب لغت نے لغت کو صاحب اخبار نے مناسب قصوں کو صاحب قرأت نے اپنے فن کو، صاحب فقہ نے فقہ کو، صاحب علم معانی نے علم معانی کو، صاحب علم کلام نے علم کلام کو اور صاحب تصوف نے تصوف کو اس میں شامل کیا۔ غرض بڑی کثرت سے کتابیں لکھی گئیں۔ اور وہ خوب پھیلیں۔ اس کے بعد اہل علم نے ان تمام کو جمع کرنے کی کوشش کی، جیسے کہ رازی، بیضاوی اور نیشاپوری کی تفسیریں ہیں۔ پھر فقہ میں تلاش و تفحص انہیں اس طرف لے گیا کہ وہ اصول فقہ، علم جدل اور معرفت خلاف کا استنباط کریں اور چونکہ حوادث و واقعات کسی ایک حد پر نہیں رکتے اور جو کچھ پہلے لکھے گئے ہیں، وہ تمام حوادث و واقعات کے لئے کافی نہیں، اس لئے بعد میں آنے والوں نے پہلوں کے نصوص سے مسائل استنباط کرنے کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے فتاویٰ اور واقعات جمع کئے اور اس میں بعض اقوال اور وجوہ کی دوسروں پر ترجیح کو مدنظر رکھا۔ اس کے بعد وہ اپنے اپنے مذاہب فقہ کے علوم کی تدوین اور اقوال اور وجوہ کی روایت کی تحقیق و تائید میں لگ گئے اور انہوں نے ہر مذہب و مسلک کے حق میں منقول اور معقول دلائل فراہم کیں اور اس پر کتابیں لکھیں۔ اس وقت وہ فقہی مذاہب، جو مدوّن و منضبط ہو چکے تھے اور ان میں تخریج و ترجیح بکثرت ہو چکی تھی۔ چار تھے

علم رقائق یعنی وعظ و نصیحت میں ایک گروہ نے دو طریقوں سے عملی دلچسپی لی۔ کبھی تو انہوں نے مواعظ اور دلوں میں رقت پیدا کرنے والی حکایات پر مشتمل کتابیں تصنیف کیں اور منبروں سے ایسے اسلوب میں جو لوگوں کے دلوں پر اثر کرے، ان چیزوں کا ذکر کیا۔ اور کبھی انہوں نے راہِ آخرت پر چلنے کے بارے میں کتابیں لکھیں۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے قواعد بنائے انہیں تفصیل سے بیان کیا اور ان پر مسائل کی بنیاد رکھی، جیسے کہ کتاب احیاء العلوم ہے اسی طرح بعد میں آنے والے کتب سیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ان میں تنقیح اور بحث کی اور جو مناسب سمجھا اس کا اضافہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے صحابہ، تابعین، علماء اور زاہدوں کی سیَر لکھیں، اور یہ سلسلہ اتنا آگے بڑھا کہ لوگوں نے اپنے مشائخ کی سیرتیں تصنیف کیں اور فرداً فرداً ان کے اقوال منضبط کر دیئے۔ تصانیف کی اس قسم کو "مقامات" اور "ملفوظات" کا نام دیا گیا۔

بالایک شیخ کے حالات ضبط کرنے کے بجائے ایک طبقے کے تمام لوگوں کے حالات یکجا کر دیئے

جیسے مشائخ چشت یا علمائے حنفیہ یا ایک زمانے، یا ایک ملک یا شہروں کے علماء و مشائخ کے حالات۔ اس نوع کی تصنیفات کو طبقات یا طباق کا نام دیا گیا۔ ان تصنیفات میں کچھ تو تاریخ کا حصہ ہے اور کچھ اسماء الرجال کی کتابوں کا۔ ان کی ترتیب میں ادھر ادھر سے استفادہ کیا گیا۔ اس باب میں راقم ضعیف نے انفاس العارفین کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اپنے والد ماجد اور عم محترم کے مقامات اور بعض اہلِ حرمین کے کچھ حالات جمع کئے ہیں۔ علی ھٰذا القیاس ان اہلِ علم میں سے بعض ایسے تھے، جنہوں نے صوفیہ کے اوراد اور ان کے احوال پر کتابیں لکھیں اور بعض نے صوفیہ کے رموز، جو ان کے احوال کے تغیر کی وجہ سے تھے ان پر تصنیفات کیں۔ پھر ان لوگوں کے سلوک کے معاملے میں کئی مسلک اور مذہب ہو گئے۔ اور ہر مسلک اور مذہب پر انہوں نے رسالے لکھے۔

ان اہلِ علم میں سے ایسے بھی تھے، جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و درود بھیجنے کے متعلق تصنیفات کیں، جیسے کہ دلائل الخیرات[1] ہے اور بعض نے احزاب اور مناجات مرتب کیں۔

جب ملت کے بہت سے فرقے بن گئے اور ان فرقوں نے مختلف جماعتوں کی شکل اختیار کرلی تو یہ ہوا کہ ان میں قیل وقال اور بحث و مناظرہ ہونے لگے۔ ان فرقوں میں سے معتزلہ تھے۔ انہی میں سے روافضہ تھے۔ اہل تفلسف تھے۔ اور انہی میں سے یہود و نصاریٰ اہل کتاب تھے۔ بعض اوقات دین کی نصرت کے لئے ان مباحثوں[2] کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان مباحثوں کے لئے انہوں نے مجالس و محافل قائم کیں۔ لیکن جب تک ان امور کے لئے مستحکم اصول، الگ الگ فروع، ترتیب و تسلسل افکار اور حسن تحریر و تقریر نہ ہو، یہ مباحث اتمام کو نہیں پہنچ سکتے۔ اور عادتاً یہ دوسروں کی باتیں سننے، وراثت میں دوسروں سے سیکھنے، تدوین و تصنیف اور تعلیم و تعلم کے بغیر ممکن

---

[1] از ابو عبداللہ محمد بن سلیمان بن ابوبکر۔ م ۸۵۴ھ

[2] ان میں سب سے زیادہ موثر مناظرہ بشر مریسی معتزلی اور امام عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی المکی کا ہے۔ جو مامون الرشید کی صدارت میں قدم و خلق قرآن پر ہوا۔ اور بعد میں کتاب الحیدہ کے نام سے چھپ گیا۔ اس کا اردو میں ترجمہ فتنۂ خلق قرآن کے نام سے راقم السطور نے ۱۹۳۵ء میں چھپوایا۔

تہیں۔ لہٰذا وہ لوگ علم کلام کی تالیف میں لگ گئے۔

اہل اسلام میں سے جنہوں نے سب سے پہلے بحث و مناظرہ سے علمی دلچسپی لی، وہ معتزلہ تھے انہوں نے فلسفہ سے حد[1]، اسم[2]، قیاس[3] اور مقولات[4] عشر کے مباحث نیز الٰہیات میں سے امور[5] عامہ کے مباحث لئے اور ان کے ساتھ شریعت میں جو صفات، نبوات اور معاد کے مباحث تھے، انہیں شامل کر لیا۔ چنانچہ وہ اصول فلسفہ جو قواعد اسلامیہ کے خلاف نہ تھے، انہیں تو انہوں (معتزلہ) نے بحالہ رہنے دیا اور جو قواعد اسلامیہ کے خلاف تھے، ان پر اعتراض کئے۔ اور ان کی جگہ انہوں نے دوسرے اصول قائم کر دیئے۔ فلسفہ سے علم کلام کو اخذ کرنے کے یہی معنی ہیں اہل سنت میں سے جنہوں نے سب سے پہلے علم الکلام پر گفت گو کی۔ اور اسے اختیار کیا۔ وہ ابوالحسن اشعری تھے۔ اور ان کا اعتزال سے رجوع کا قصہ تو مشہور ہی ہے۔ وہ (معتزلی ہونے کے دور میں) جان گئے تھے۔ کہ ایک اصول کی بنیاد کیسے ڈالی جاتی ہے۔ اور پھر اس سے مختلف فروع اور شاخیں کس طرح نکلتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے معتزلہ ہی کے نمونے پر اپنے طریقے کی بنا رکھی۔ بعد ازاں ابو نصر اور ابو علی وغیرہ آئے۔ اور انہوں نے قواعد اسلامیہ کو فلسفہ پر اس طرح تطبیق دینا شروع کیا کہ فلسفہ میں جو چیز اسلام کے خلاف تھی، اس کی تاویل کرتے گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کو ان کا علم کلام نقل کرنے اور اس پر ردّ و قدح کرنے کی ضرورت پڑی۔ مثال کے طور پر جب شیعہ اپنے مذہب کے حق میں استدلال کرتے، تو انہیں ان کا علم کلام نقل کرنے اور اس کی تردید کرنے کی ضرورت پڑتی۔ اس طرح علم کلام کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ اور وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی اہمیت اور وقار ہو گیا۔ چنانچہ ان کے دنوں

---

۱ تعریفِ شے بذاتیات، چناں کہ تعریف انسان بہ حیوان ناطق۔

۲ اسم۔ قیاسِ شے بعرضیات چناں کہ تعریف انساں بہ ماشی و ضاحک

۳ قیاس۔ قولیست مرکب بہ دو جملہ کہ لازم آید ازوے نتیجہ

۴ مقولات عشر ۔ یک جوہر و نہ عرض

۵ الٰہیات کے امور عامہ۔ در اصطلاح اہل حکمت چیزہا او گویند کہ ذات آنہا عام باشد و مختص بیک قسم از اقسام موجودات نباشد، بلکہ شامل باشد۔

میں جو تذبذب ہوتا تھا، اس سے سکون حاصل کرنے کے لئے وہ اس علم کی طرف رجوع کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ یہی خالص حق ہے۔

جب اہل حدیث[1] نے یہ دیکھا تو انہوں نے اہل سنت کے عقیدے پر کتابیں تصنیف کیں۔ اس ضمن میں انہوں نے وہ احادیث الگ کر لیں، جن سے عقائد کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں جہاں تک صوفیہ کا تعلق ہے، پہلے تو وہ ان اشارات و رموز میں مشغول رہے جو صوفیہ کے احوال اور کیفیات کی تعبیر کرتے ہیں۔ پھر وہ اس مقام سے معارف کی طرف منتقل ہوئے۔ اس میں سب سے پیش پیش شیخ محی الدین محمد بن عربی اور ان کے تلمیذ شیخ صدرالدین ہیں۔ جن کی بدولت یہ بھی ایک جداگانہ علم بن گیا۔ اس علم کی باریک باریک رگوں کی طرح بہت سی شاخیں ہیں، جو علوم اشراقیہ سے سیراب ہونے لگیں۔ اسی وجہ سے ان کی اصطلاحات میں مثال[2]، ناسوت[3] اور لاہوت[4] مروج ہوئیں۔ وہ شخص جس نے سب سے پہلے قلم، لوح، امر و خلق کا ان معنوں میں جو صوفیہ کے ہاں مستعمل ہیں، ذکر کیا، وہ میرے نزدیک فارابی تھا، پھر اس کے بعد ان لوگوں کے متبعین جیسے ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان امور کے ایک ایک باب کے متعلق کتابیں لکھتے رہے۔ اور ان میں آپس میں بحثیں اور مناظرے ہوتے رہے۔ غرض شرعی علوم و فنون اس طرح شاخ در شاخ اور فرع در فرع ہوئے

(مسلسل)

۱۔ اہل حدیث سے عاملین بالحدیث ترک التقلید نہیں بلکہ ممارسین بالحدیث مفہوم ہے۔

۲۔ عالم مثال۔ عالمے فروتر است از عالم ارواح و آں چہ دریں عالم ظاہر ایست مثل آں در عالم مثال است و خواب مے بینند آں را صور عالم مثال گویند۔

۳۔ ناسوت۔ عالم اجسام کہ دنیا و ایں جہاں باشد گاہے مجازاً بمعنی شریعت و عبادت ظاہری

۴۔ لاہوت۔ دراصل "لا ھو الا ھو" است

شاہ ولی اللہ دہلوی سے منسوب تصانیف

از محمد ایوب قادری ایم اے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام قطب الدین احمد اور تاریخی نام "عظیم الدین"[۲] ہے مگر "ولی اللہ" کے نام سے مشہور و معروف ہوئے ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کو اپنی ننہال قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے حسب رواج پانچ سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ ساتویں سال میں قرآن شریف ختم ہوا اور فارسی تعلیم شروع ہوئی یہاں تک کہ دس سال کی عمر میں فوائد ضیائیہ (شرح ملا جامی) پڑھ لی اور مطالعہ کتب کی استعداد پیدا ہو گئی چودہ سال کی عمر میں شادی ہوئی پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد شاہ عبدالرحیم سے بیعت ہوئے اور اشغال مشائخ نقشبندیہ کی تعلیم حاصل کی۔ اسی سال تفسیر بیضاوی کا ایک جز پڑھ کر تعلیم سے فراغت حاصل کر لی شاہ عبدالرحیم نے اس موقعہ پر بطور اظہار خوشنودی ایک عام ضیافت کا انتظام کیا اور شاہ ولی اللہ کو درس کی اجازت دی۔

شاہ صاحب خود لکھتے ہیں[۳]

"دریں میاں سخنان بلند در ھر ضمن بخاطر می رسید ندرانہ کوشش زیادہ تر کشاد کار بنظر می آید"

---

[۱] یہ مقالہ پاکستان ہسٹری کانفرنس کے چودھویں اجلاس منعقدہ پشاور اپریل ۱۹۶۴ء میں پڑھا گیا۔

[۲] "عظیم الدین" سے ۱۱۱۵ھ برآمد ہوتے ہیں اس میں ایک عدد زیادہ ہے۔

[۳] جزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (مشمولہ انفاس العارفین) از شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۹۵ (مطبع احمدی دہلی سال طباعت ندارد)

شاہ ولی اللہ کی عمر کا سترھواں سال تھا کہ ان کے والد شاہ عبد الرحیم نے ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۸ء کو انتقال فرمایا اس کے بعد کم وبیش بارہ سال تک شاہ صاحب نے مسند درس کو زینت بخشی (۱۱۴۳ھ ۱۷۳۱ء) کے اخیر میں حج وزیارت سے مشرف ہوئے ایک سال حجاز مقدس میں مقیم رہے اور رجب ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء میں بخیریت تمام وطن واپس ہوئے شاہ ولی اللہ نے حج وزیارت سے واپس آکر دہلی میں تدریس وتبلیغ اور اصلاح وتذکیر کے فرائض انجام دیئے اور کم وبیش تہائی صدی تک شاہ صاحب کا یہ کام جاری رہا ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۲ء کو شاہ صاحب کا انتقال ہوا۔

شاہ ولی اللہ کے زمانے میں سیاسی ابتری وانتشار کمال کو پہنچا ہوا تھا مغلیہ حکومت کے تناور درخت کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں تخت نشینی کے لئے آئے دن کشت وخون کا بازار گرم رہتا تھا۔ صوبے دار مرکز سے باغی ہو رہے تھے امراء و رؤسا آپس ہی برسر پیکار تھے اس پر ان کی چیرہ دستیاں اور سفاکیاں مستزاد تھیں سید برادران حسین علی اور عبد اللہ خاں سیاہ وسپید کے مالک بنے ہوئے تھے بادشاہ دہلی ان کے اشارہ چشم وابرو کا منتظر رہتا تھا اس پر غیر ملکی حملوں نے رہی سہی ساکھ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ سیاسی کمزوری کے نتیجہ میں اقتصادی معاشرتی اور مذہبی حالات بھی بد سے بدتر تھے عوام بدحال وپریشان اور تجارت وصنعت کا جنازہ نکل چکا تھا معاشرہ کی زوال پذیری اپنی حد کو پہنچ چکی تھی ظاہری نمود ونمائش اور غیر اسلامی رسوم ورواج کا دور دورہ تھا مذہبی بدحالی بیان سے باہر ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے معاشرہ کا بھرپور جائزہ لیا۔ سیاسی حالات کو دیکھا ملوک وامراء علماء وصوفیاء کا مطالعہ کیا اور پھر مسلم معاشرہ کی ذہنی اصلاح کے لئے ایسا مواد مہیا کیا کہ جس سے نہ صرف علوم اسلامیہ کا احیاء ہوا بلکہ مسلم معاشرہ میں اصلاح کی تحریک شروع ہوئی اور لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا شاہ ولی اللہ نے جمود کو توڑا، قرآن وحدیث کو عام کیا، فقہ کی حیثیت متعین کی۔ عقائد کو واضح کیا اور مسلمانوں کو عمل کی دعوت دی۔ شاہ صاحب کی تصانیف کا مندرجہ ذیل عناوین کے تحت ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں حکیم الامت تھے شاہ صاحب کی فہرست تصانیف ملاحظہ ہو۔

قرآن

۱۔ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (۲) فوز الکبیر (۳) فتح الخبیر (۴) مقدمہ در فن ترجمہ قرآن

(۵) تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء۔

حدیث

۶۔ مسوّی (شرح مؤطا) عربی (۷)، مصفیٰ (شرح مؤطا) فارسی (۸) اربعون حدیثاً مسلسلۃ بالاشراف فی غالب سندہا (۹) الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین (۱۰) النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر (۱۱) الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین (۱۲) الارشاد الی مہمات علم الاسناد (۱۳) تراجم البخاری (۱۴) شرح تراجم بعض ابواب البخاری (۱۵) انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ۔

فقہ وکلام وعقائد

۱۶۔ حجۃ اللہ البالغہ (۱۷) البدور البازغہ (۱۸) انصاف فی بیان سبب الاختلاف ۔ (۱۹) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (۲۰) السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم ۔ (۲۱) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (۲۲) المقالۃ الوضیۃ فی النصیحہ والوصیہ (وصیت نامہ) (۲۳) حسن العقیدہ (۲۴) المقدمۃ السنیہ (۲۵) فتح الودود فی معرفۃ الجنود (۲۶) مسلسلات (۲۷) رسالہ عقائد بصورت وصیت نامہ (فارسی) جس کا منظوم اردو ترجمہ سعادت یار خاں رنگین نے کیا ہے۔

تصوف وغیرہ

۲۸۔ التفہیمات الٰہیہ (۲۹) فیوض الحرمین (۳۰) القول الجمیل (۳۱) ہمعات (۳۲) سطعات (۳۳) لمحات (۳۴) الطاف القدس (۳۵) ہوامع شرح حزب البحر (۳۶) الخیر الکثیر۔ (۳۷) شفاء القلوب (۳۸) کشف الغین فی شرح الرباعیتین (۳۹) زہراوین (۴۰) فیصلہ وحدت الوجود والشہود (مکتوب مدنی)

سیر وسوانح

(۴۱) سرور المحزون (۴۲) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (۴۳ ۔ ۴۹) انفاس العارفین[1] ۱۔ بوارق الولایت ۔ ۲۔ شوارق المعرفت، ۳۔ امداد فی ماثر الاجداد، ۴۔ جذۃ الابریزیہ فی اللطیفۃ العزیزیہ

---

[1] انفاس العارفین میں سات مختلف رسالے شامل ہیں۔

۵۔ العطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ، ۶۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین، ۷۔ جزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف۔

مکتوبات

(۵۰) مکتوبات معہ مناقب ابی عبداللہ و فضیلت ابن تیمیہ (۵۱) مکتوب المعارف معہ ضمیمہ مکتوب ثلاثہ (۵۲) مکتوبات فارسی (مشمولہ کلمات طیبات) (۵۳) مکتوبات عربی (مشمولہ حیات ولی)، (۵۴) مکتوبات (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ خلیق احمد نظامی)

نظم

(۵۵) الطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم، یہ بائیہ قصیدہ ہے اس کے ساتھ تین اور قصیدے ہمزیہ، تائیہ اور لامیہ بھی شامل ہیں (۵۶) دیوان اشعار عربی، جس کو شاہ عبدالعزیز نے جمع کیا اور شاہ رفیع الدین نے مرتب کیا ہے۔ [۱]

صرف۔ (۵۷) نظم صرف میر (فارسی)

متفرق (۵۸) رسالہ دانشمندی

شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف کی ایک مکمل فہرست ہم نے پیش کی ہے ان میں سے بیشتر کتابیں طبع ہو چکی ہیں اور ان کی زیارت کا ہمیں شرف حاصل ہوا ہے شاہ صاحب کی تصانیف سب سے پہلے مولوی عبداللہ بن بہادر علی حسینی نے کلکتہ سے طبع و شائع کیں ان کی شائع کردہ کتابیں (۱) المقالۃ الوضیہ (۲) فوز الکبیر (۳) فتح الخبیر (۴) چہل احادیث ہماری نظر سے گزری ہیں، چہل احادیث کا اردو ترجمہ مولوی عبداللہ نے ہی کیا ہے، ان کے بعد مولانا محمد احسن نانوتوی، پروفیسر عربی و فارسی، بریلی کالج (ف ۱۳۱۲ھ) نے اپنے پریس مطبع صدیقی بریلی سے اور پھر ان کے ربیب خان بہادر مولوی حافظ عبدالاحد (ف ۱۹۲۰ء) نے مطبع مجتبائی دہلی سے شائع کیں۔ اسی زمانے میں دہلی سے شاہ رفیع الدین کے نواسے ظہیر الدین سید احمد ولی اللہی نے بالالتزام شاہ صاحب اور ان کے فرزندان عالی مقام کی کتابیں طبع و شائع کیں۔ ظہیر الدین کے ایک عزیز عبدالغنی ولی اللہی بن حاجی سید محمد

---

[۱] نزہۃ الخواطر جلد ششم از حکیم عبدالحی ص ۴۰۵-۳۹۸ (حیدرآباد دکن، ۱۹۵۷ء)

سجادہ نشین و متولی درگاہ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی نے بھی شاہ صاحب کی بعض کتابیں شائع کیں، بیسویں صدی میں مولانا عبیداللہ سندھی (ف ۱۹۴۴ء) اور مولانا محمد منظور نعمانی نے تصانیف اور علوم و افکار ولی اللہی کی نشر و اشاعت میں خاصہ حصہ لیا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی سے منسوب بعض ایسے رسالے بھی ملتے ہیں جو شاہ صاحب کی تصنیف نہیں ہیں۔ اور لوگوں نے شاہ صاحب سے منسوب کرکے چھاپ دیئے ہیں یا شاہ صاحب کی تصنیف بتاتے ہیں اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام مرزا علی لطف مؤلف تذکرہ گلشن ہند کا ہے یہ تذکرہ ۱۸۰۱ء میں تالیف ہوا ہے مرزا علی لطف نے ولی اللہ سرہندی المتخلص بہ اشتیاق کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سمجھ کر ان کی ہجو کی ہے اور ان سے دو کتابیں منسوب کی ہیں وہ لکھا ہے۔ [۱]

"فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کے نہایت بلند تھا۔ خصوصاً علم حدیث اور تفسیر میں بہت بڑی دست گاہ رکھتے تھے یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدہ روزگار کا زبان خلائق پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کرکے جاری ہے اکثر کتابیں تصنیف اس بحر علم کی مشہور ہیں چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین" ہے اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ" کہتے ہیں تصنیفات سے اس محی الدین کی یادگار صفحۂ روزگار پر ہیں، والد ماجد میں یہ اس رونق بخش کشور قناعت کے کہ جس کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے آج کے دن تک قدم توکل گاڑے ہوئے شاہجہاں آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی (ف ۱۹۱۴ء) اس تحریر کا رد کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں [۲]

"دونوں نام غلط ہیں پہلی کتاب تفضیل شیخین [۳] میں ہے شہادت امام حسین علیہ السلام کے ابطال سے خدانخواستہ اس کا تعلق نہیں اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے معاویہؓ کے

---

[۱] گلشن ہند از مرزا علی لطف، تصحیح و حاشیہ از شمس العلماء شبلی نعمانی و مقدمہ از مولوی عبدالحق ص ۲۴۲ (حیدرآباد دکن ۱۹۰۶ء)

[۲] ایضاً ص ۲۴۲

[۳] کتاب کا نام "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" ہے۔

مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں"

بابائے اردو مولوی عبدالحق (ف ۱۹۶۱ء) نے بھی اسی نقطۂ نظر کو قبول کیا ہے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں۔[1]

"صاحب تذکرہ مرزا علی لطف نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین" اور "عنت العانیہ فی مناقب المعاویہ" ان کی تصانیف سے ہیں حالانکہ ان مباحث میں ان کی کوئی کتاب نہیں ہے نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے اور نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے یہ محض اتہام ہے اس کے بعد یہ کہہ کر کہ "یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے" خوب ہجو ملیح کی ہے"

شاہ محمد اسحاق دہلوی (۱۸۴۶-۱۷۸۵ء) جب ۱۲۵۷ھ ۱۸۴۱ء میں حجاز کو ہجرت کر گئے تو دہلی میں تقلید و عدم تقلید کے مباحث نے خوب زور پکڑا۔ مقلدین و غیر مقلدین کے درمیان مناظرے ہوئے اور ان مباحث پر طرفین سے رسالے اور کتابیں لکھی گئیں[2] اسی زمانے میں بعض جعلی کتابیں بھی وجود میں آئیں قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی (۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶ء) اپنی ایک تالیف کشف الحجاب میں لکھتے ہیں[3]

"اور ایسا ہی ایک اور جعل (غیر مقلدین) کرتے ہیں کہ سوال کسی مسئلہ کا بنا کر اور اس کا جواب موافق اپنے مطلب کے لکھ کر علمائے سابقین کے نام سے چھپواتے ہیں۔ چنانچہ بعض مسئلے مولانا شاہ عبدالعزیز کے نام سے اور بعض مسئلے مولوی حیدر علی کے نام سے علیٰ ہذا القیاس چھپوائے ہیں۔"

۱؎ گلشن ہند (مقدمہ) ۲۵۴

۲؎ تفصیل کے لئے دیکھئے تنبیہ الضالین و ہدایۃ الصالحین (مجموعۂ فتاوائے علمائے دہلی و حرمین شریفین در جواز تقلید) مطبوعہ مطبع سید الاخبار دہلی، ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۵ء)

۳؎ کشف الحجاب از قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی ۹۲ (مطبع بہار کشمیر لکھنؤ ۱۲۹۸ھ)

شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان کے ایک فرد اوران کی تصنیفات کے مشہور ناشر ظہیر الدین سید احمد ولی اللہی بمبیرہ شاہ رفیع الدین دہلوی جنہوں نے شاہ صاحب کی تصانیف کی بڑی تعداد طبع وشائع کرکے وقف عام کی ہے انہوں نے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ دلائی چنانچہ وہ شاہ صاحب کی ایک کتاب "تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاءؑ" کے آخر میں لکھتے ہیں۔ [۱]

"بعد حمد و صلوٰۃ کے بندہ محمد ظہیر الدین عرف سید احمد ولی گزارش کرتا ہے ۔ بہ خدمت شائقین تصانیف حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب و مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کہ آج کل بعض لوگوں نے بعض تصانیف کو اس خاندان کی طرف منسوب کر دیا ہے اور درحقیقت وہ تصانیف اس خاندان میں سے کسی کی نہیں اور بعض لوگوں نے جو ان کی تصانیف میں اپنے عقیدہ کے خلاف بات پائی تو اس پر حاشیہ جڑا اور موقعہ پایا تو عبارت کو تغیر و تبدل کر دیا تو میرے اس کہنے سے یہ عرض ہے کہ جواب تصانیف ان کی چھپیں اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے جب خریدنی چاہیں۔"

ظہیر الدین صاحب اس سلسلہ میں مزید وضاحت شاہ صاحب کی ایک دوسری تصنیف "انفاس العارفین" کے آخر میں "التماس ضروری" کے عنوان سے کرتے ہیں اور اس میں جعلی کتابوں کے نام اور ناشرین کی بھی نشان دہی کرتے ہیں [۲]

"دوسری التماس آپ کے ملاحظہ فرمانے کے لائق یہ بھی ہے کہ فی زمانہ "الدنیا زور لا یحصلہا الا بالزور" کو بعض حضرات نے کمر باندھی ہے اور دنیا کمانے کے واسطے حضرات موصوفین (شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف) کی طرف اکثر کتابیں منسوب

---

[۱] تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء از شاہ ولی اللہ دہلوی مطبوعہ مطبع احمدی کلاں محل متعلق مدرسہ عزیزی دہلی باہتمام ظہیر الدین ولی اللہی (سال طباعت ندارد)

[۲] انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ دہلوی مطبوعہ مطبع احمدی دہلی متعلق مدرسہ عزیزی باہتمام ظہیر الدین ولی اللہی۔

کرکے چھاپ دی ہیں جو کسی طرح ان حضرات کی تصنیف میں سے نہیں ہیں اور ارباب بصیرت ان کو پڑھ کر ان کے عیب اور مفاسد کو اس طرح جان لیتے ہیں جس طرح ایک تجربہ کار نقاد کھرے کھوٹے کو کسوٹی پر لگا کر پہچان لیتا ہے مگر چونکہ بفحوائے العوام کالانعام بیچارے اردو پڑھنے والے علم سے بے بہرہ لوگ اکثر ان جعلی اور مصنوعی رسائل کو پڑھ کر ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس واسطے میرا فرض ہے کہ میں ان رسائل کے نام اس کاغذ کوتاہ میں لکھ دوں اور اپنے دین دار بھائیوں کو ارباب زمانہ کی گندم نمائی اور جو فروشی سے آگاہ کردوں آگے اس پر عمل کرنا نہ کرنا ان کا فعل ہے۔

منت آنچہ حق بود گفتم تمام
تو دانی دگر بعد ازیں والسلام

اور وہ جعلی و مصنوعی رسائل یہ ہیں۔

۱۔ تحفۃ الموحدین	مطبوعہ اکمل المطابع دہلی	منسوب بر طرف
۲۔ بلاغ المبین	مطبوعہ لاہور	حضرت شاہ ولی اللہ صاحب
۳۔ تفسیر موضح القرآن[۱]	مطبوعہ مطبع خادم الاسلام دہلی	منسوب بر طرف شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم

---

[۱] شاہ عبدالقادر نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں مکمل کیا اس پر مختصر تفسیری حاشیے ہیں اس ترجمہ کا تاریخی نام "موضح قرآن" ہے "موضح القرآن" نہیں ہے "تفسیر مولانا شاہ عبدالقادر المعروف بموضح القرآن" کے نام سے ایک تفسیر ابو محمد ثابت علی اعظم گڑھی اور غلام حسین مونگیری نے ۱۳۰۷-۸ھ میں مطبع خادم الاسلام دہلی سے طبع کرا کے شائع کی یہ کتاب سات جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس کی دوسری جلد پر شمس العلماء میاں نذیر حسین دہلوی (ف ۱۹۰۲ء) کے داماد مولوی سید شاہجہاں کی تقریظ ہے اور آخر کتاب میں اشتہار ہے کہ شہر دہلی پھاٹک حبش خاں مدرسہ مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب سے طلب فرمائیں اس تفسیر کی طرف سید ظہیر الدین نے اشارہ کیا ہے۔

۴۔ ملفوظات [1] مطبوعہ میرٹھ منسوب بطرف حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ

المشتہر سید ظہیر الدین احمد مالک مطبع احمدی دوکان اسلامیہ دہلی"

ایک نامور عالم مولانا وکیل احمد سکندرپوری بلاغ المبین کے متعلق اپنی تصنیف وسیلۂ جلیلہ میں لکھتے ہیں [2]

"یہ کتاب (البلاغ المبین) کسی وہابی کی تصنیف ہے جسے کافی لیاقت نہ تھی مگر اعتبار و استناد کے لئے مولانا شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب کی گئی اس کا انتساب ایسا ہی ہے جیسے دیوان مخفی کا زیب النساء کی طرف یا دیوان محی کا حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی طرف یا دیوان معین الدین ہروی کا حضرت معین الدین چشتی کی طرف"

تحفۃ الموحدین سب سے پہلے اکمل المطابع دہلی میں طبع ہوا پھر قیام پاکستان کے بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے ادارہ اشاعۃ السنہ نے رجب ۱۳۷۳ھ میں اسے دوبارہ شائع کیا اس رسالہ کے شروع میں ادارہ کے ناظم محمد اسحٰق صاحب نے "سخن گفتنی" کے عنوان سے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے [3]

"حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا توحید کے مسئلہ پر ایک مختصر لیکن جامع رسالہ تحفۃ الموحدین نصف صدی کے قریب کا عرصہ ہوا افضل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا رسالہ فارسی میں ہے اس کا ترجمہ حضرت شاہ صاحب موصوف کے ایک سوانح نگار مولانا حافظ محمد رحیم بخش دہلوی نے کیا"

---

[1] ملفوظات شاہ عبدالعزیز (فارسی) کا پہلا اڈیشن مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا اور مطبع ہاشمی میرٹھ سے ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء میں ان ملفوظات عزیزی کا اردو ترجمہ سب سے پہلے شائع ہوا ترجمہ کے فرائض مولوی عظمت الٰہی بن محمد ہاشم نے انجام دیئے تھے سنہ ۱۹۶۰ء میں ملفوظات شاہ عبدالعزیز کا اردو ترجمہ پاکستان ایجوکیشنل پبلیشرز کراچی نے شائع کیا مترجمین مولوی محمد علی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی ہیں "پیش لفظ" ڈاکٹر معین الحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

[2] وسیلہ جلیلہ از مولانا وکیل احمد سکندرپوری ص ۲۳ مطبع یوسفی لکھنؤ۔ سال طباعت ندارد

[3] تحفۃ الموحدین ۱۳ (شائع کردہ ادارہ اشاعۃ السنہ، مرکزی جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان ۱۳۷۳ھ)

طبع ثانی کی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں تحفۃ الموحدین کے سرورق پر "مصنفہ یا مؤلفہ شاہ ولی اللہ" تحریر نہیں ہے بلکہ "از افادات شاہ ولی اللہ دہلوی" لکھا ہوا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ناشر اس سلسلے میں خود متردد ہے لہٰذا اس نے اس رسالہ کا اعتبار قائم کرنے کے لئے اس کا مترجم "حیات ولی" کے مؤلف مولانا رحیم بخش دہلوی کو بتایا ہے حالانکہ حیات ولی میں مولانا رحیم بخش دہلوی نے شاہ ولی اللہ کی جو فہرست تصانیف درج کی ہے اس میں کہیں تحفۃ الموحدین یا بلاغ المبین کا ذکر نہیں ہے۔ [1]

تحفۃ الموحدین کے آغاز میں مصنف کا نام "ولی اللہ دہلوی" تحریر ہے شاہ صاحب کی تصانیف کی ایک بڑی تعداد کی زیارت کا ہمیں شرف حاصل ہے ان میں کہیں صرف ان کے نام کے ساتھ "دہلوی" کی نسبت تحریر نہیں ہے وہ ہر جگہ "فقیر ولی اللہ" یا "ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم" لکھتے ہیں۔

البلاغ المبین بھی سب سے پہلے مطبع محمدی لاہور سے ۱۳۰۷ھ میں طبع و شائع ہوئی طابع و ناشر نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ اس کو اس کتاب کا قلمی نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا۔ حالانکہ ایک اہل حدیث عالم مولوی فقیر اللہ اس کے طابع و ناشر ہیں اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ البلاغ المبین میں کہیں مصنف کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ کا نام نہیں ہے۔ شاہ صاحب کی ہر تصنیف کے آغاز میں شاہ صاحب کا نام موجود ہوتا ہے۔ مگر البلاغ المبین میں ایسا نہیں ہے۔

ان دونوں کتابوں کی زبان، طرز بیان اور طریقہ استدلال شاہ ولی اللہ دہلوی سے بالکل مختلف ہے اکثر غیر مستند اور وضعی حدیثوں سے استدلال کیا گیا ہے [2]

ان میں صوفیاء کے اقوال اور ان کے ملفوظات کے حوالے ملتے ہیں صاحب مجالس الابرار (شیخ احمد رومی) شیخ عبدالحق دہلوی اور ابن تیمیہ کے حوالہ جات کی کثرت ہے بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خاص طور سے

---

[1] ملاحظہ ہو "حیات ولی" از مولانا رحیم بخش دہلوی ۴ ۵ ۷ ۵ .... ۵۸۰۔ (مکتبۃ السلفیہ لاہور ۱۹۵۵ء)

[2] مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے مولوی فقیر اللہ مرحوم نے حواشی میں اکثر اس طرح اشارہ کیا ہے ملاحظہ ہو بلاغ المبین ص ۵۲، ۵۵ (لاہور ۱۹۶۲ء)

ابن تیمیہ (ف ۲۸ ھ ۱۳۲۸ء) کا پروپیگنڈہ مقصود ہے[۱]۔ چنانچہ ان کا نام اس طرح لکھا گیا ہے[۲]۔

"علامہ ابوالعباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام مفتی ملک شام"

ملک کے مشہور اہل حدیث محقق و مورخ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں[۳]۔

"البلاغ المبین تو یقیناً شاہ ولی اللہ کی کتاب نہیں، اس کا اسلوب تحریر

طریق ترتیب مطالب شاہ صاحب کی تمام تصانیف سے متفاوت ہیں

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ابتدائی دور کی تصنیف ہوگی۔"

ان دونوں کتابوں تحفۃ الموحدین اور بلاغ المبین کا شاہ صاحب کی تصنیفات میں یا ان کے صاحبزادگان کی تصنیفات میں یا ان کے مستفدین کی تصنیفات میں کوئی ذکر یا حوالہ نہیں ملتا شاہ صاحب کے سوانح نگار اول مولانا رحیم بخش دہلوی مؤلف حیات ولی[۴] بھی ان کتابوں کا قطعاً ذکر نہیں کرتے دوسرے تذکرہ نگار مولوی رحمان علی مؤلف تذکرہ علمائے ہند[۵] مولوی فقیر محمد جہلمی مؤلف حدائق الحنفیہ[۶] نواب صدیق حسن خاں مؤلف ابجد العلوم[۷] مولوی حکیم عبدالحیٔ مؤلف نزہتہ الخواطر[۸]

---

[۱] ملاحظہ ہو البلاغ المبین ص ۶۰، ۹۹ (شائع کردہ مکتبۃ السلفیہ، لاہور ۱۹۶۲ء)

[۲] ایک موقعہ پر حضرت شاہ ولی اللہ نے امام ابن تیمیہ کے سلسلہ میں ایک خط لکھا ہے اس میں انہوں نے ان کو "شیخ تقی الدین احمد ابن تیمیہ لکھا ہے"، ملاحظہ ہو مکتوبات مناقب ابی عبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری ص ۶۶ (مطبع احمدی دہلی، سال طباعت ندارد)

[۳] مکتوبات مولانا غلام رسول مہر بنام محمد ایوب قادری مکتوبہ ۲۸ر فروری ۱۹۶۴ء)

[۴] حیات ولی از رحیم بخش دہلوی ص ۵۷۵ - ۵۸۰ (مکتبۃ السلفیہ لاہور ۱۹۵۵ء)

[۵] تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) مرتبہ و ترجمہ محمد ایوب قادری ص ۵۲۳ (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء)

[۶] حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد جہلمی ص ۲۲۷ ص ۲۲۸ (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۰۶ء)

[۷] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں ص ۹۱۲ - ۹۱۴ (مطبع صدیقی بھوپال ۱۲۹۶ھ)

[۸] نزہتہ الخواطر جلد ششم از مولوی حکیم عبدالحیٔ ص ۳۹۸ - ۱۵م (دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن ۱۹۵۷ء)

اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مؤلف تاریخ اہل حدیث کے یہاں بھی ان کتابوں کا ذکر نہیں ملتا۔[۱]

البلاغ المبین کا اردو ترجمہ تبلیغ حق کے نام سے ۱۳۶۲ھ میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ اس پر مولوی غلام محمد بی اے (عثمانیہ) مؤلف تذکرہ سلیمان نے مولانا سلیمان ندوی سے دریافت کیا۔[۲]

"بلاغ المبین کے نام سے ایک کتاب اہل حدیث حضرات کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور اس کو مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی بتایا گیا ہے کیا یہ کتاب واقعتاً شاہ صاحب کی ہے اور اگر ہے تو اس میں بعض مسائل ایسے ملتے ہیں جن میں شدت حد اعتدال سے زائد ہے۔"

مولوی غلام محمد صاحب نے قوسین میں اس کا جواب اس طرح لکھا ہے[۳]

"بعد میں تحقیق سے پتہ چلا اور خود حضرت والا (مولانا سلیمان ندوی) نے بھی تصدیق فرمائی کہ یہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف ہے ہی نہیں، بلکہ کسی نے لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہے تاکہ شاہ صاحب کو ماننے والے ان عقائد کو مان لیں"

شاہ ولی اللہ دہلوی سے منسوب ایک رسالے کی نشان دہی مولانا محمد علی کاندھلوی خواہر زادہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے بھی کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں سنتا ہوں کہ لوگ غیر مقلدیت کو پروان چڑھانے کے لئے حضرت شاہ صاحب کی کتابوں سے ادھوری اور تراشیدہ عبارتیں نقل کر کے بیچارے عوام کو دھوکا دیتے ہیں یہی نہیں بلکہ "قول سدید" کے نام پر ایک من گھڑت کتاب کو شاہ صاحب سے منسوب کرتے ہیں"

---

۱ - تاریخ اہل حدیث از مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی ۴۱۱ - ۴۱۶ (اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور ۱۹۵۳ء)

۲ - تحفۃ الموحدین کو نوشاہ ولی اللہ کی تصنیفات میں ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مؤلف تراجم علمائے اہل حدیث (۴۲ - ۴۶) نے بھی شامل نہیں کیا ہے۔

۳ - تذکرہ سلیمان از غلام محمد ۴۶۹ (ادارہ مجلس علمی، کراچی ۱۹۶۰ء)

اس سلسلہ میں ایک اور رسالہ کا ذکر بھی ضروری ہے جس کا نام "اشارۂ مستزہ" ہے اس کو شاہ صاحب کی تصنیف بتایا گیا ہے اس رسالہ کو اردو ترجمہ کے ساتھ فضل الرحمٰن صاحب مدرس جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء میں مکتبہ عربیہ قرول باغ دہلی سے شائع کیا گیا ہے مترجم نے آخر میں لکھا ہے کہ اس کا مخطوطہ ٹونک کے کتب خانہ سے حاصل ہوا تھا۔ جو ۱۲۸۱ھ ۵-۱۸۶۴ء کا مکتوبہ تھا۔

شاہ صاحب کی فہرست تصانیف میں دو رسالے (۱) رسالہ اوائل اور (۲) فیما یجب حفظہ للناظر بھی ناشرین کی عدم توجہ سے شامل ہو گئے ہیں جن میں پہلا رسالہ تو شیخ محمد سعید بن شیخ محمد سنبل کا مؤلفہ ہے اور دوسرا رسالہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کسی شاگرد نے لکھا ہے جس میں شاہ صاحب کا ذکر "شیخنا" کی صراحت کے ساتھ کیا ہے۔

اسلام کی عقلی تاسیس کوئی بعد کی پیداوار نہیں۔ خود نبی کریم صلعم کے ہاں ماہیت اشیاء کو جاننے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ اور قرآن حکیم میں استدلال بھی موجود ہے اور عقل کو استعمال کرنے اور مشاہدہ کائنات سے اس کے خالق کو پہچاننے کی تلقین ہے۔ مسلمانوں میں صوفی اور غیر صوفی مفکرین نے جو کام کیا، وہ مسلمانوں کی ثقافت کا ایک سبق آموز باب ہے انہوں نے ایک مربوط نظام افکار کی تعمیر کی کوشش کی۔ ان میں حقیقت کی تلاش کا جذبہ پایا جاتا ہے، لیکن تعمیر الہیات کی یہ قابل قدر ساعی خاص حدود کے اندر محدود رہیں۔ کیونکہ فکر کی وسعت بھی زمانے کے تقاضوں کے متناسب ہوتی ہے۔ ان کو اگر بہتر زمانہ ملتا، تو ان کی کوششیں زیادہ بار آور ہوتیں مسلمانوں کی علمی زندگی میں یونانی فلسفہ بہت کچھ دخیل ہو گیا۔ یونانی علوم و فنون کی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کی بدولت مسلمانوں کے افکار میں بہت زیادہ وسعت اور اثرات پیدا ہوئے۔ لیکن علم کلام کے بہت سے مذاہب پر نظر ڈالنے سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یونانی فلسفے کے اثر نے متکلمین کی قرآنی بصیرت کو ضرر پہنچایا ....."

(فکر اقبال از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم)

موجودہ مسائل کو کس طرح حل کیا جائے؟[1]

از مولانا محمد تقی صاحب امینی ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرات علماء کرام! ہماری یہ علمی مجلس جدید مسائل کو حل کرنے کی اہمیت یا مسلم پرسنل لاء میں نظر ثانی کی ضرورت پر غور و فکر کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کے پیش نظر آگے کے کام ابتدائی خاکہ و طریق کار کا نقشہ مرتب کر کے کام شروع کر دینا ہے۔

جدید مسائل حل کرنا ہوں یا سماجی خرابیوں کی وجہ سے مسلم پرسنل لاء پر نظر ثانی ہو، اس قسم کے جملہ شرعی امور کے لئے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ "اجماع" کو متحرک اور جان دار بنایا جائے۔

"اجماع" دراصل قانون کو قابلِ عمل و قابل نفاذ بنانے کے لئے ایک قسم کا اختیار ہے جو شارع اصلی اور مقننِ حقیقی کی طرف سے ان لوگوں کو عطا ہوا ہے جو فکری و علمی حیثیت سے اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اجماع کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیمات و نبوی تشریحات اپنے اپنے رنگ میں جامع ہونے کے باوجود ہر دور کی سماجی خرابیوں اور نت نئے پیدا شدہ حالات و مسائل کے تذکرہ سے خالی ہیں بلاشبہ الہٰی ہدایات اپنی جگہ کامل ہیں جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً (مائدہ)	آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کیا۔

---

[1] ماہنامہ "برہان" دہلی میں یہ مضمون چھپا ہے۔ مولانا امینی صاحب نے اسے ایک مخصوص علمی مجلس کے لیے لکھا تھا۔ لیکن شدید مجبوری کی وجہ سے پڑھا نہیں جا سکا۔ ماہنامہ برہان سے شکریہ کے ساتھ یہ مضمون الرحیم میں شائع کر رہے ہیں۔ — مدیر

لیکن کامل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر قسم کی سماجی خرابیوں پر قابو پانے کی تدبیروں اور ہر دور کے نئے پیش آمدہ مسئلوں کا تفصیلی ذکر ان میں موجود ہے۔ جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں ہے لا ادراج حکم کل حادثۃ فی القرآن[1] ایسا نہیں ہے کہ ہر جزئی واقعہ و حادثہ کا حکم قرآن حکیم میں موجود ہے۔

ایسی حالت میں فطری طور پر کسی ایسی شکل کی ضرورت ہے جو وقتِ ضرورت موجودہ مسائل کا حل متعین کرتی رہے اور الٰہی ہدایات کی روشنی میں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کر کے زندگی اور قانون میں ہم آہنگی پیدا کرتی رہے۔ ورنہ زمانہ کا "مفتی" بہت سے مروجہ مسائل کو مہمل قرار دیدے گا اور پیش آمدہ مسائل میں اپنا رنگ بھر کر لوگوں کو عمل کے لئے مجبور کر دے گا۔ اور پھر دین کے کمال کا دعویٰ باطل ہو جائے گا۔

اسلامی اصول قانون میں "اجماع" کو جس قدر اہمیت حاصل ہے بدقسمتی سے اسلامی تاریخ میں اسی قدر بے توجہی برتی گئی ہے۔ شخصی حکومتوں کے زمانہ میں اس بنا پر حوصلہ افزائی نہیں کی گئی کہ حکومتیں عموماً ایسا کوئی "ادارہ" برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی ہیں جو ایک طرف تو حالات و مسائل میں آزادانہ غور و فکر اور فیصلہ کا حامل ہو اور دوسری طرف عوامی رجحان کو مائل کرنے کی اس میں طاقت و صلاحیت ہو۔

دراصل اس سیاسی مفاد کی وجہ سے "اجماع" جیسے اہم اصول کو بروئے کار آتے رہنے کا موقع نہ مل سکا اور بعد میں یہ خیال عام ہو گیا کہ اجماع میں چونکہ جمیع امت کا اتفاق ہونا چاہیئے۔ اور یہ صورت حال تقریباً ناممکن ہے اس لئے اجماع کا انعقاد ناممکن ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔

"اصل ثالث از اصول شریعت اجماع است باز اجماعیکہ متخیل اہل زمان است بمعنی اتفاق جمیع امتِ مرحومہ بحیثیت لایشذ منہم فرد واحد نصاً من کل واحد منہم خیال محال است ہرگز واقع نشدہ۔"

پھر آگے فرماتے ہیں۔

اجماع کثیر الوقوع اتفاق اہل حل و عقد است از فقیہانِ امصار این معنی در مسائل مصرح فاروق اعظم یافتہ می شود کہ اہل حل و عقد برآن اتفاق کردہ اند"[2]

---

[1] تلویح ص۵۰

[2] ازالۃ الخفاء

اجماع کی ممکن العمل صورت یہی ہے کہ قانونی معاملات میں اہل حل وعقد کی ایک مجلس مشاورت قائم کی جائے اور وہ حالات و مسائل میں غور و فکر کے بعد صحیح حل تجویز کرے جو ایک طرف کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو اور دوسری طرف ضروریات زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے والا اور دشواریوں پر قابو پانے والا ہو۔

اجماع بحیثیت مجموعی ہدایت الٰہی کی کُلی پالیسی اور بنیادی اصول کے تحت ہونا چاہیئے علیحدہ علیحدہ قرآن و سنت میں اس کی سند ضروری نہیں ہے ورنہ اجماع سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔

یعنی جس امر پر اجماع ہوا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ قرآن و سنت میں اس کے لئے مستقل سند موجود ہو بلکہ اس کا اسلام کے بنیادی اصول اور اس کی کلی پالیسی کے تحت ہونا کافی ہے جیسا کہ فقہاء کی تشریحات سے واضح ہوتا ہے۔ ۱؎

البتہ جن لوگوں سے اجماع منعقد ہوتا ہے یا اصلاح کے مطابق جو اس معاملہ میں اہل حل وعقد کہلانے کے مستحق ہیں، ان کا علمی اور عملی حیثیت سے معیاری اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے تاکہ قوم ان کے فیصلہ کو سند کا مقام دینے میں حق بجانب ہو، علمی حیثیت سے مثلاً۔

۱۔ قرآن حکیم میں علم و بصیرت کا درجہ حاصل ہو صرف معلومات کافی نہ ہوں گے،

۲۔ سنّت نبوی کو روایت و درایت کے معیار پر جانچنے کے طریقہ سے واقفیت ہو اور اس کے صحیح مقام و محل کے تعین کی معرفت ہو۔

۳۔ صحابۂ کرام کی زندگی سے واقفیت اور ان کے اجماع و فیصلہ کا علم ہو۔

۴۔ قیاس کے ذریعہ استدلال و استنباط کے اصول و قواعد معلوم ہوں۔

۵۔ قوم کے مزاج، حالات و تقاضوں، رسم و رواج اور عادات و خصائل سے بھی واقفیت ہو۔

۶۔ جدید رجحانات اور تقاضوں سے واقفیت کے لئے ایسے حضرات کو شامل کیا جائے جو زیر بحث معاملات میں سنجیدگی اور بصیرت کیساتھ رائے دے سکیں۔

اجماع کے افراد کا علمی حیثیت سے اونچے اخلاق و کردار کا حامل ہونا ضروری ہے، ماموارت پر عمل کرتے ہوں اور منہیات سے بچتے ہوں، اس کے لئے تقویٰ کا کوئی خاص معیار متعین نہیں ہے بلکہ فسق و فجور اور بری

۱؎ ملاحظہ ہو التقریر والتحبیر ج ۳ ص ۱۱۲

عادتوں سے پاک ہونا کافی ہے، اسی طرح زندگی کے حالات و معاملات میں غیر محتاط نہ ہونا چاہیئے۔

اجماع کے انعقاد کے لئے صاحبِ صلاحیت افراد کا کثیر تعداد میں ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ نہ مہیا ہونے کی صورت میں کم از کم تین سے بھی کام چل سکتا ہے۔

ایسے فیصلہ میں ہر حیثیت سے سب کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اکثریت کا اتفاق کافی ہے۔

صحابۂ کرام کی زندگی اور ان کے طرزِ عمل میں اس کا ثبوت ملتا ہے اور امام غزالی فرماتے ہیں۔

انہ ینعقد مع مخالفۃ الاقل۔ [۱]

قاعدہ کے مطابق اجماع منعقد ہونے کے بعد اسلام کے قانونی نظام میں اسے کافی اختیارات حاصل ہیں مثلاً۔

۱۔ حالات اور تقاضوں کے مطابق قرآن و سنت کی روشنی میں نئے قوانین وضع کرنا۔

۲۔ پرانے اجماعی فیصلے جو حالات و مصلحت کے تابع تھے ان میں موجودہ حالات و مصالح کے پیشِ نظر مناسب ترمیم کرنا۔

۳۔ وہ احکام جو بتدریج نازل ہوئے ہیں، معاشرتی حالات کے لحاظ سے انہیں مقدم و موخر کرنا

۴۔ وہ احکام جن میں عرب کے مقامی حالات رسم و رواج خصائل و عادات ملحوظ ہیں، ان کی روح اور پالیسی برقرار رکھتے ہوئے جدید حالات کے پیشِ نظر ان کے لئے نیا قالب تیار کرنا۔

۵۔ وہ احکام جو وقتی تقاضہ اور مصلحت کے تحت ہیں، موجودہ تقاضہ اور مصلحت کے تحت ان میں مناسب ترمیم کرنا۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جن احکام میں مختلف الرائے ہیں معقول دلیل کی بنا پر ان میں کسی ایک کو ترجیح دینا۔

۷۔ فقہاء کی مختلف رایوں میں حالات و تقاضہ کی مناسبت سے ترجیحی صورت پیدا کرنا وغیرہ۔

جن لوگوں نے الٰہی ہدایات کا دقتِ نظر اور وسعتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے نیز مروجہ احکام و مراسم

---

[۱] الحصول المامول من علم الاصول ص ۴۰

کے باب میں انبیائی طرز عمل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے (جس کی تفصیل شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں میں آسانی سے دیکھی جاتی ہے) وہ اس حقیقت سے انکار نہ کر سکیں گے کہ ہدایت الٰہی کے پیش نظر ہمیشہ دو مقصد رہے ہیں۔

۱۔ قلبی و روحانی اصلاح اور (۲) معاشرتی و تمدنی فلاح۔ اس لحاظ سے "ہدایت" میں دو قسم کے قوانین پائے جاتے رہے ہیں (۱) ایک وہ جن کی روح اور قالب یا معنی اور صورت دونوں ہی متعین اور مقصود ہیں۔ (۲) دوسرے وہ جن کی روح اور معنی مقصود ہیں، قالب یا معنی اور صورت مقصود نہیں ہیں۔

پہلی قسم کے قوانین غیر متبدل اور یکساں رہنے والے ہیں اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ شکل و صورت میں ہو سکتی ہے اور نہ روح و معنی میں، اور دوسری قسم کے قوانین چونکہ سماجی زندگی کے مختلف حالات، وقت اور موقع کی مناسبت کے تابع ہوتے ہیں اس لئے معاشرہ کی حالت تبدیلی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ان کی شکل و صورت میں تبدیلی کی گنجائش ہے، شارع کی طرف سے ان کی صرف روح کی بقار کا مطالبہ ہے، حالات و زمانے کے تقاضہ کے لحاظ سے شکل و صورت جو بھی متعین ہو اس سے بحث نہیں ہے، قرآن حکیم کی بعض آیات سے بھی اس بحث پر روشنی پڑتی ہے مثلاً

کل الطعام کان حِلاً لبنی اسرآئیل الخ ۳/۹۳ اور فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم الخ ۴/۱۶۰

ہدایتِ الٰہی کی مذکورہ نوعیت و کیفیت کی بنا پر ہر دور میں درج ذیل کاموں کی ضرورت رہتی ہے۔

۱۔ حکم اصولی اور کلی شکل میں موجود ہے لیکن حالات کی تبدیلی کی بنا پر اس کے موقع و محل میں تبدیلی لازمی بن گئی ہے تو روح اور پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے حال اور مقام کی مناسبت سے اس کی صورت متعین کرنا۔ مثلاً محنت و سرمایہ میں توازن برقرار رکھنے کا مسئلہ یا حق اور فرض کے حدود متعین کرنے کا سوال ہے، وغیرہ۔

۲۔ حکم موجود ہے لیکن اس پر عمل درآمد سے قومی و ملّی نقصان کا یقین ہے یا حالت و مصلحت کے بدل جانے کی وجہ سے اس کا اصل مقصد فوت ہو رہا ہے، مثلاً ذرائع پیداوار کی تنظیم اور پیداوار کی تقسیم کا مسئلہ ہے یا سرمایہ اور زمین کی نئی تنظیم کے بعد تجارت زراعت کے بہت سے فقہی مسائل اپنے مقصد میں بڑی حد تک ناکام رہتے ہیں اور شارع کا جو اصل مقصد ہے وہ فوت ہو جاتا ہے۔

اسی طرح معاشرتی زندگی کے بعض فقہی مسائل ہیں جن کا نہ اب محل باقی رہا ہے اور نہ ان پر عمل درآمد سے شارع کا مقصد ہی حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ زمانہ کی کروٹوں اور نئی نئی ضرورتوں نے ایسے حالات و مسائل پیدا کر دیئے ہیں جن کا فقہ میں کوئی تذکرہ نہیں ہے البتہ اصولی اور عمومی رنگ میں ہدایت الٰہی ان سب کو شامل ہے مثلاً موجودہ دور کے مالیاتی و سماجی نظام نے بہت سے مسائل (کمرشل انٹرسٹ، انشورنس، کواپریٹو سوسائٹیاں وغیرہ) ایسے پیدا کر دیئے ہیں جن میں غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچتا ہے اور مذہبی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے قوم و ملت کی رہنمائی کرتا ہے

ان کاموں کے لئے دوسری ضروری چیز اجتہاد کے بند دروازہ کو کھولنا ہے، بدقسمتی سے موجودہ دور میں جو طبقہ اجتہاد کا پرزور حامی ہے وہ اس کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہے جو طبقہ کچھ کچھ واقفیت رکھتا ہے اس کی نظر میں عملاً عرصہ سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور اس کی کنجی بھی گم ہو گئی ہے فقہاء نے ان دونوں افراط و تفریط کی راہوں کی برائی بیان کی ہے۔ اور اجتہاد کو فقہ کا اصل مدار وعلیہ مدار الفقہ ۱ اور تکمیلِ ہدایت کا اہم باب قرار دیا ہے چنانچہ:۔

ولاشک ان الاحکام التی تثبت بصریح الوحی بالنسبۃ الی الحوادث الواقعۃ قلیلۃ غایۃ القلۃ فلولم یعلم احکام تلک الحوادث من الوحی الصریح بقیت احکامھا مھملۃ لایکون الدین کاملا فلابد من ان یکون للمجتھدین ولایۃ استنباط احکامھا ۲

اس میں شبہ نہیں کہ جو احکام صریح وحی سے ثابت ہیں وہ پیش آنے والے واقعات و حوادث کے مقابلہ میں نہایت ہی کم ہیں، اگر ان کا حکم وحی صریح سے بذریعہ استنباط نہ معلوم کیا جائے تو یہ مہمل پڑے رہ جائیں گے اور دین کے کمال کا دعویٰ بیکار ہو جائیگا، اس بنا پر ضروری ہے کہ مجتہدین کو احکام کے استنباط کا اختیار دیا جائے۔

اسی طرح دوسری جگہ ہے:۔

فلابد من حدوث وقائع لاتکون منصوصا علی حکمھا ولایوجد للاولین فیھا اجتھاد وعند ذلک فاما ان یترک فیھا مع اھوائھم وینظر فیھا بغیر اجتھاد

یہ ضروری بات ہے کہ ایسی نئی نئی صورتیں پیش آئیں جن کا صریح حکم نہ موجود ہو اور نہ پہلے لوگوں نے ان میں اجتہاد کیا ہو۔ ایسی حالت میں اگر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ من مانی کارروائی کریں یا اجتہاد شرعی کے بجائے محض اٹکل کے تیر چلائیں

---

۱ نور الانوار ص ۲۴۶ ۲ تلویح ص ۵۰

شرعی وھو ایضا اتباع للھوی وذلك کله فساد[1]

تو یہ سب خواہشات کی اتباع اور فساد کا موجب ہے

جن لوگوں کا مسلک ہے کہ ائمۂ اربعہ پر اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اب قطعاً اس کی گنجائش نہیں ہے فقہاء نے ان پر اس طرح ملامت کی ہے۔

وھذا کله ھوس من ھوساتھم لم یاتوا بدلیل ولا یعبأ بکلامھم وانما ھم من الذین حکم الحدیث انھم افتوا بغیر علم فضلوا واضلوا[2]

یہ سب باتیں خواہشاتِ نفسانی سے تعلق رکھتی ہیں ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل ہے اور نہ ایسی لغو باتوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے یہ حضرات تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں حدیث نبوی ہے کہ بغیر جانے بوجھے فتویٰ دیتے ہیں خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

رہے وہ لوگ جو اجتہاد کے پُرزور حامی ہیں اور اس کے لئے مقررہ شرطوں اور صلاحیتوں کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں وہ بالعموم وہی ہیں جن کے دل سے قدامت کی قدر و قیمت نکل چکی ہے اور ماضی کی وہ عظیم الشان روایتیں جن پر قومی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے ان کی نظر میں فرسودہ اور غیر ترقی یافتہ بن چکی ہیں۔ یہ اسلام کا ایک جدید ایڈیشن تیار کرنا چاہتے ہیں جس کی تقریباً ہر چیز باہر سے برآمد کی گئی ہو، یہاں ان لوگوں کے طریق کار و اندازِ فکر سے بحث نہیں ہے۔

کہنا صرف اس قدر ہے کہ مذہبی لوگوں میں اجتہاد کے سلسلہ میں اب تک جو ردو قدح چلتی رہی ہے، اب اس کا زمانہ ختم ہونا چاہیئے ایک حد تک صلاحیت افراد ہر دور میں موجود ہوتے ہیں انہیں کام کی ضرورت کا شدید احساس نہیں ہوتا ہے یا اس کے مواقع نہیں میسر آتے ہیں جس کی بنا پر اجتہادی صلاحیتیں بروئے کار نہیں آتی ہیں۔

بہر حال مذکورہ کاموں کی انجام دہی کے لئے اجتہاد کا بند دروازہ کھولے بغیر چارہ نہیں ہے، فقہاء نے اجتہاد کے لئے کافی سامان فراہم کر دیا ہے، اصول اور ضابطے مقرر کئے ہیں کام کا اندازہ اور طریقہ بتایا ہے، کام کر کے دکھایا ہے، اجتہاد کے لئے جس قسم کی صلاحیت درکار ہے اس کی نہایت تفصیل کے ساتھ

---

[1] الموافقات ج ۴ ص ۱۰۴ [2] شرح مسلم الثبوت لبحر العلوم ص ۶۲۴

وضاحت کی ہے اس سے زیادہ ہماری محرومی اور بے بصری کیا ہوگی کہ اس سے فائدہ اٹھانے کو ہم جرم سمجھیں یا خود فریبی میں مبتلا ہو کر اس کی اہمیت محسوس نہ کریں۔

موجودہ حالات و ضروریات کے پیش نظر اجتہاد کے لئے اصرار کے باوجود ہماری رائے انفرادی اجتہاد کی نہیں ہے بلکہ شورائی طرز کے اجتہاد کی ہے کہ علما کی ایک صاحبِ صلاحیت مجلس زیر بحث مسائل میں ضابطہ کے مطابق غور کر کے باہمی تعاون کے ذریعہ ان کا حل تلاش کرے۔

اس مجلس کو اونچے پیمانہ پر اجتہاد کی ضرورت ہوگی اور نہ کوئی نئی راہ نکالنے کی اجازت ہوگی بلکہ فقہی اصطلاح کے مطابق مجتہد منتسب نے جس طرح فرائض انجام دیئے تھے ویسے ہی یہ مجلس انجام دے گی۔

مثلاً اخذ و استفادہ کے باب میں یہ مجلس وسعت سے کام لے گی، نہ تو بالکلیہ آزاد و خود رائے ہوگی اور نہ وقت ضرورت دوسرے امام سے استفادہ کو حرام جانے گی بلکہ ہر مسئلہ کو دلیل و بصیرت کی روشنی میں سمجھ کر قبول کرے گی اور اطمینان حاصل کرنے کے بعد فیصلہ کرے گی۔

اسی طرح مختلف اقوال میں جب ترجیحی صورت نکالنے کی ضرورت ہوگی تو حالات و مقامات کی مناسبت سے مقررہ قاعدہ اور ضابطہ کے مطابق بعض قول کو بعض پر ترجیح دے گی۔

اگر کسی مسئلہ میں نصِ صریح یا تعلیل صحیح متقدمین سے نہ ملے گی تو تحقیق و تلاش کر کے مسئلہ کو دلیل سے آراستہ کرے گی اور اس بات کا مکلف اپنے آپ کو نہ سمجھے گی کہ مسئلہ میں پہلے کی کہی ہوئی ہر بات کی تقلید کی جائے خواہ اطمینانِ قلبی حاصل ہو یا نہ ہو اور موجودہ حالات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

اور اگر مسئلہ کی سابقہ دلیل موجود ہے لیکن اس سے قلب مطمئن نہیں ہے اور وہ مسئلہ اجماعی نہیں بلکہ اجتہادی ہے تو یہ مجلس خود اجتہاد کے ذریعہ مسئلہ کو مضبوط بنائے گی۔

ایسے ہی جب نئی صورت حال پیش آئے گی یا حالات و مقامات کی تبدیلی سے مسئلہ میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی تو یہ مجلس اس قسم کے فرائض بھی انجام دے گی۔

فقہ کی کتابوں میں ائمہ اور ان کے شاگردوں کے مختلف اقوال میں مذکورہ صورت کی بہت سی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں، یہ مجلس اجتہاد کے طریقہ میں بھی آزادانہ ہوگی بلکہ وہی طرز عمل اختیار کرے گی جس کی نظیریں اور مثالیں موجود ہیں مثلاً پہلے زیر بحث مسئلہ کی روح اور مقصد سمجھنے کی کوشش کرے گی پھر اس پر غور کرے گی

کہ شارع کے پیش نظر اس کے ذریعہ کس قسم کی مصلحت کا حصول اور مضرت کا دفعیہ ہے پھر یہ دیکھے گی کہ اس کو مزاج اور ذہنیت کی تبدیلی سے کتنا دخل ہے نیز معاشرتی حالت اور سماجی زندگی کس حد تک اس کی روح اور اصل کردار کو جذب و انگیز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد حل طلب مسئلہ کو اس کے مناسب باب سے متعلق کریگی اور نظائر تلاش کریگی پھر اس کی روح اور مقصد کو سامنے رکھ کر مقررہ قاعدہ کے مطابق بالترتیب قرآن و سنت، اجماع و قیاس سے اس کا تعلق جوڑے گی۔ بعض صورتیں ایسی ہونگی جن کا حل آسان ہوگا، صرف اصول و کلیات اور ضرورت و مصلحت میں صحیح تطبیق سے ان کا حل نکل آئے گا اور بعض میں دشواری پیش آئے گی اور ایسی حالت میں اختلاف ائمہ سے فائدہ اٹھانے کی بھی ضرورت پڑے گی لیکن ہر حال میں روح اور مقصد کو سامنے رکھنا ضروری ہوگا اور فقہی ضابطہ سے انحراف جائز نہ ہوگا ورنہ شریعت ہوا و ہوس اور سہل پسندی کا "بازیچہ" بن کر رہ جائے گی۔

مجلس کو درج ذیل قسم کے کام انجام دینے ہوں گے۔

۱۔ مسلم پرسنل لار کے ان مسائل کی فہرست تیار کرنا جن میں حالات کی تبدیلی اور سماجی خرابیوں کی بنا پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۲۔ پرسنل لار پر عمل درآمد کے لئے سماجی خرابیوں اور ان کے ازالہ کی تدبیروں پر غور و فکر کرکے عملی قدم اٹھانا۔

۳۔ ان رسوم کے متعلق حکم شرعی کا اظہار جنہوں نے مسلمانوں کی خانگی زندگی کو نہایت دشوار و عذاب جان بنا دیا ہے، اور ان کے ازالہ کے لئے شرعی، اخلاقی اور قانونی کوشش کرنا۔

۴۔ نئے پرسنل لار کی تدوین اور اس کو منظور کرانے کی کوشش کرنا۔

۵۔ پرسنل لار کو نافذ کرنے کے لئے شرعی حاکم کے تقرر کے لئے جد و جہد۔

۶۔ جدید مسائل کی فہرست مرتب کرکے ترتیب اور ان کا حل کرنا۔

اگر جدید مسائل کو حل کرنے کی طرف فوری طور پر اجتماعی قدم نہ اٹھایا گیا تو مذہبی طبقہ مذہب سے مایوس ہو جائیگا۔ یا پھر اپنے کو مذہب کی خود ساختہ تعبیر کے حوالہ کرنے پر مجبور ہوگا۔

رہبرانِ ملت!

آخر میں اتنی اور گذارش ہے کہ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیئے تھے لیکن افسوس ہے کہ مختلف وجوہ کی

بنا پر اب تک نہ ہو سکے، یہ غالباً آخری وقت ہے، اور اگر اب بھی کام میں وہی وجوہ حائل بنے رہے تو قوم و ملت کا اتنا عظیم خسارہ ہوگا کہ اس کی تلافی کی کوئی امکانی صورت نظر نہیں آتی ہے اور قیامت کے دن جب ہم سے باز پرس ہوگی تو ہماری ساری خوش فہمیاں بے نتیجہ اظہار معذرت میں تبدیل ہو جائیں گی، اور کوئی بات بنائے نہ بن سکے گی؟ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حاصل مدعا یہ ہے کہ قرآن کے اساسی قانون پر حکومت قائم کرنے والی جماعت کے متفقہ یا اغلبیت کے فیصلوں کا نام اجماع ہے۔ یہ اجماع آج بھی ہو سکتا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا یہ کسی خاص زمانے یا عہد تک محدود نہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ اجماع "اتباع بالاحسان" پر عمل کرنے والی جماعت کا ہو۔ یعنی وہ جماعت قرآن کے ساتھ ساتھ رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسلام نیز مہاجرین اور انصار کے عہد وفاق کے فیصلوں کو بھی اپنے لئے سند مانے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہ فیصلے دراصل قرآن سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ یہ تو محض "بائی لاز" تھے جو اساسی قانون یعنی قرآن کی عملی تفصیلات کرتے تھے۔ چنانچہ جس طرح ان مہاجرین اور انصار نے اپنے لئے "بائی لاز" یا تمہیدی قوانین بنائے اسی طرح "اتباع بالاحسان" پر عامل جماعت آج بھی اساسی قانون یعنی قرآن مجید، دورِ اوّل کے اجماع یعنی ان بائی لاز یا تمہیدی قوانین یا سنت سے استنباط کر کے اپنے لئے تشریحی "بائی لاز" بنا سکتی ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ تک جاری رہ سکتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس طرح اجماع کی اجازت نہ ہو اور قرآن کے اساسی قانون پر عمل کرنے والوں کو نئے نئے زمانے کے نئے نئے حالات کی مناسبت سے اپنے لئے تشریحی قوانین بنانے ممنوع ہوں تو کوئی نظام جو ترقی پذیر ہے۔ اور کوئی جماعت جو ترقی کن ہے، زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی۔

(مولانا سندھیؒ مرحوم)

مفسرین قرآن کا تقویٰ اور دیانت

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی جامعہ مدینہ۔ کیمبل پور

قرآن حکیم کے دیگر امتیازات کے علاوہ سب سے بڑا جو امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا تعلق کسبی علوم سے نہیں بلکہ وہبی علوم سے ہے۔ یہ درست ہے کہ کسبی علوم اس کے اسرار اور رموز سمجھانے میں نہ صرف ممد و معاون بلکہ ایک درجہ ضروری ہیں لیکن ان علوم سے معارف قرآنی تک رسائی اس وقت ناممکن ہے جب تک کہ نور ایمان اور یقین غیر متزلزل سے مشرف نہ ہو چکا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحابہ کرام جو موجودہ فنی اور اصطلاحی علوم سے سراسر نابلد تھے، سراپا علم النقیاد بن گئے اس کی وجہ ظاہر ہے یہ ہے کہ قرآن حکیم کا علم سمعی اور بصری نہیں بلکہ اس کا علم صدری اور قلبی ہے کیونکہ اس کا نزول قلب انور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا ارشاد قرآنی ہے۔

فانہ نزلہ علی قلبک ؎۱ (بقرہ ۹۷) وعلمک مالم تکن تعلم ؎۲ (النساء ۱۱۳) چنانچہ قرآنی معارف اور اسرار فرقانی کا مرکز صرف انسانی سمع و بصر نہیں بلکہ حسب ارشاد قرآنی۔ بل ھو اٰیات بینٰت فی صدور الذین اوتوا العلم ؎۳ (العنکبوت ۴۹)

؎۱ سو بے شک اس نے (اللہ تعالیٰ) اسے (قرآن مجید کو) تمہارے دل پر اتارا ہے۔

؎۲ اس نے (اللہ تعالیٰ نے) تمہیں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) وہ باتیں سکھائیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

؎۳ بلکہ یہ قرآن تو آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا۔

علم والوں کے دل اور قلوب ہیں۔ اس لئے علمائے تفسیر نے قرآنی تفسیر کرنے کے لئے جو شرط بیان کی ہیں ان میں سب سے بڑی شرط یہ تھی۔

والعاشر علم الموھبۃ وذلک علم یورثہ اللہ من عمل بما علم قال علی رضی اللہ عنہ قالت الحکمۃ من ارادنی فلیعمل باحسن ما علم [۱] مقدمہ امام راغب ص۵،۶

امام ابوطالب نے تفسیر قرآن حکیم کے لئے دوسری شروط کے ساتھ سب سے بڑی شرط یہی قرار دی ہے کہ پاکیزہ دل اور پاکیزہ دماغ رکھے۔ جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے۔

لا یمسہ الا المطھرون [۲] (الواقعہ ۷۹)

اسی لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے فرمایا ہے۔

"مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک فقرہ اس باب میں بہت خوب ہے انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ کبھی حضرت شاہ ولی اللہ اور سید احمد خان دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں مگر ایک سے ایمان پرورش پاتا ہے اور دوسرے سے کفر"

(العلم مارچ ۱۹۵۹ء)

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ کا دل تجلیات الٰہیہ اور جمالیات محمدیہ سے معمور تھا۔ امام مجاہد شاگرد رشید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ جب ابن عباس قرآن حکیم کی تفسیر فرمایا کرتے تھے میں ان کے چہرہ پر نور محسوس کرتا تھا۔

ذیل میں اسی مناسبت سے چند ایسے واقعات درج کئے جاتے ہیں جن سے مفسرین قرآن حکیم کا تقوی اور دیانت پوری طرح جھلک رہا ہے۔

۱۔ عبداللہ بن محمد بن ابی القاسم جن کے آباؤ اجداد تونس کے تھے اور ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی

---

[۱] دسواں علم موہبت ہے، اور یہ وہ علم ہے، جسے اللہ اس کو دیتا ہے جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔ حکمت یہ کہتی ہے کہ جو مجھے چاہتا ہے، وہ جو کچھ جانتا ہے، اس پر بہتر سے بہتر عمل کرے۔

[۲] اس کو وہی چھوتے ہیں، جو پاک بنائے گئے ہیں۔

شیخ رضی الدین طبری مکی ہے انہوں نے الکتاب نیض رکھا تفسیر ابن عطیہ کے وہ حافظ تھے ان کے تقویٰ کا یہ حال تھا کہ پچاس سال سے زیادہ مدت میں انہوں نے اپنی نمازیں دربار نبوی کے روضۃ "من ریاض الجنۃ" میں اس طرح ادا کیں کہ ہر نماز باجماعت اور پہلی ہی صف میں ادا کی۔ اور جیسے ہی روزانہ حرم نبوی کا دروازہ کھلتا تو آپ در اقدس پر سب سے پہلے حاضر ہوتے۔

اپنی زندگی میں پچپن حج بیت اللہ مکرمہ کے کئے۔ آپ نے جمعہ کے دن دس ربیع الاول ۶۶۹ھ کو مدینہ منورہ میں رحلت فرمائی۔

۲۔ عبدالرحمٰن بن محمد بن مخلوف ثعالبی الجزائری جو اپنے زمانہ کے بہت بڑے مفسر تھے، تفسیر الجواہر ان ہی کی مرتبہ ہے جو ابن عطیہ کی تفسیر کا خلاصہ ہے موصوف کئی دفعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اور اس تفسیر کے مرتب کرنے کا حکم بھی دربار رسالت سے ملا۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں۔

"میں نے دیکھا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھانا دیا اور ارشاد فرمایا کیا یہ بات نہیں کہ نبی جب کسی کو کھانا کھلاتا ہے تو وہ قے کر دیتا ہے۔ چنانچہ میں خواب ہی میں قے کرنے تیار ہو گیا مگر مگر آپ نے فرمایا میری مراد یہ تو نہیں تو میں نے سمجھ لیا کہ اس سے مراد قرانی معارف کی اشاعت ہے۔ چنانچہ میں نے یہ تفسیر مرتب کی۔" آپ کی وفات ۸۷۵ھ کو ہوئی۔

۳۔ شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ تو عام تذکروں میں ملتا ہے کہ بیس سال تک عشاء کے وضو کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی۔ کئی مرتبہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حضرت ہی کے حکم سے اعتزال سے تائب ہوئے ساری زندگی لبتی کی اس زمین سے پیدا ہونے والے غلے سے بسر اوقات کی جو ان کے دادا بلال بن ابی بردہ نے وقف کر دی تھی۔ قرآن حکیم کی بہترین تفسیر لکھی ہے جس میں معتزلہ پر رد کیا۔ امام سبکی نے اسے دیکھا ہے۔ آپ کی وفات ۳۲۴ھ کو ہوئی۔

۴۔ احمد بن الحسین الحافظ ابوبکر البیہقی رحمۃ اللہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم محدث اور مفسر گذرے ہیں امام الحرمین نے ان کے متعلق فرمایا[1] مامن شافعی الا وللشافعی فی عنقہ منۃ الا البیہقی فان لہ

---

[1] کوئی (فقہی مسلک) شافعی ایسا نہیں جس کی گردن میں (امام) شافعی کا احسان نہ ہو۔ سوائے البیہقی کے سو اس کا (امام) شافعی پر احسان ہے۔

علی الشافعی منۃ۔ اپنی زندگی کے آخری تیس سال اس طرح گذارے کہ روزانہ روزہ ہوا کرتا تھا۔ آپ کی وفات ۵۰۸ھ کو ہوئی۔

۵۔ ابونصر بن ابی القاسم القشیری عبدالرحیم بن عبدالکریم۔ اپنے زمانہ کے علماء کے صدر گزرے ہیں۔ محدث اور مفسرِ تھے قرآن کریم کی بہترین تفسیر لکھی جس کا امام سبکی نے مطالعہ کیا۔ تقوی کا یہ حال تھا کہ آخر عمر میں زبان پر کوئی دوسرا کلمہ سوائے کلمات قرآنی کے آ ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ آپ اپنی ضروریات کے سلسلے میں بھی آیات قرآنی ہی با محل تلاوت فرماتے۔ گویا آپ کی عام بول چال بھی مستقل علمی تفسیر بن گئی تھی

۶۔ امام الحرمین علیہ الرحمۃ یوسف بن عبداللہ نے جو اپنے زمانہ کے یکتا عالم اور زاہد تھے، ایک بہت بڑی تفسیر قرآن مجید کی ترتیب دی، جس میں ہر آیت کی تاویل اور تفسیر کو دس طریقوں سے پیش فرمایا۔ ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کا یہ اثر تھا کہ ان کے وصال پر غسل دیتے ہوئے غاسل اور دوسرے شرکا غسل نے دیکھا کہ ان کا دایاں ہاتھ بغل تک چمک رہا ہے یہ تفسیر قرآن حکیم کی تحریر کی برکت اور اس کا اثر تھا۔ آپ کی دفات ۸۳۸ھ کو ہوئی۔

۷۔ محی السنۃ ابوالحسین الفرا البغوی جو بہت بڑے محدث اور مفسر تھے خراسان کے امام اور مرجع عوام تھے آپ اس حد تک قانع اور صابر تھے کہ زندگی بھر خشک روٹی بغیر سالن کے کھایا کئے جب احباب نے اس پر تنگ و ترش کیا تو پھر زیتون کے ساتھ کھالیا کرتے تھے آپ کی وفات ۵۱۰ھ کو ہوئی۔

"ہر عہد کا مصنف اپنے عہد کی ذہنی آب و ہوا کی پیداوار ہوتا ہے اور اس قاعدے سے صرف وہی دماغ مستثنیٰ ہوتے ہیں، جنہیں مجتہدانہ ذوق نظر کی قدرتی بخشائش نے صف عام سے الگ کر دیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لیکر قرون آخرۃ تک جس قدر مفسر پیدا ہوئے ان کا طریق تفسیر ایک رو بہ تنزل معیارِ فکر کی مسلسل زنجیر ہے جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔۔۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد)

فکرِ ولی اللّٰہی کی جامعیت

محمد سرور

حضرت شاہ ولی اللہ کے علوم و معارف میں جو چیز سب سے نمایاں ہے، اور جس کی بنا پر ہم انہیں صحیح معنوں میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا امام کہہ سکتے ہیں، وہ ان کے فکر کی جامعیت ہے اگرچہ شاہ صاحب اپنے زمانے میں ان تمام کوششوں میں دلچسپی لیتے رہتے، جو اُس وقت حکومت اسلامی کو تباہی اور خلق خدا کو بربادی سے بچانے کے لئے کی جاتی رہیں، لیکن انہوں نے زیادہ تر اپنے تئیں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خلافت باطنہ[1] کی تکمیل کے لئے وقف رکھا بے شک جو لوگ خلافت ظاہری[2] کے لئے زیادہ موزوں تھے شاہ ولی اللہ صاحب ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں قوم کی مادی مشکلات ان کی نظروں سے کبھی اوجھل نہ ہوئیں۔ لیکن ان کا اپنا راستہ دوسرا تھا۔ انہوں نے نہ صرف کلام مجید کا فارسی ترجمہ اور درس و تالیف کتب حدیث سے کتاب و سنت کی وسیع اشاعت کا سامان کیا، انہیں ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی

---

[1] جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں، یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی، قرآن اور سنن و آثار کی تعلیم دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں، وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے، خواہ وہ مناظرہ و مباحثہ کی راہ سے ہو، جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے۔ یا وعظ و پند کے طریقے سے ہو، جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطبا، دین کی خدمت سرانجام دیتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں، جیسا کہ مشائخ و صوفیا کا حال ہے۔ اس طرح جو نمازیں قائم کراتے ہیں۔ حج کراتے ہیں اور جو احسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زہد و تقویٰ کی طرف لوگوں کو راغب کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو ہم خلفائے باطنی (باقی صفحہ ۴۲ پر)

کا معمول بہ بنانے کی کوشش کی۔ تصوف و معرفت کا احیا کیا، اور علوم اسلامی کی ترتیب و تنظیم سے ہمارے لئے ایک بیش بہا علمی خزانہ یادگار چھوڑا، بلکہ اختلافی معاملات میں ایک ایسا راستہ اختیار کرکے، جس پر صوفی اور ملاّ، شیعہ اور سُنی، حنفی اور شافعی، مجددی اور وحدت الوجودی، معتزلہ اور اشاعرہ متفق ہو سکیں، اس سرزمین کے مسلمانوں کو ایک ایسا دینی اور علمی نظام عطا کیا، جو اس ملک میں مسلمانوں کے شعار قومی کی حیثیت حاصل کر سکتا تھا۔ اور جس کے مروج و مقبول ہونے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک متفق علیہ مذہبی نظام کی بنیادوں پر ایک قوم کی تعمیر ہو سکی۔ اور جدید اسلامی ہندوستان کا آغاز ہوا۔

شاہ ولی اللہ کی فکری جامعیت کی ترکیب و تشکیل میں ہمیں اتنے گوناگوں، متضاد اور ہمہ گیر عناصر کارفرما نظر آتے ہیں کہ ایک ذاتِ واحد میں ان کا اس طرح اجتماع بہت ہی کم ہوا کرتا ہے۔ ایک تو آپ کی ان تمام علوم و فنون پر جو اس وقت مسلمانوں میں رائج تھے، وافی اور غائر نظر تھی، اور دوسرے ان علوم و فنون کے مختلف پہلوؤں کو مختلف ماحول اور مختلف زاویوں سے دیکھنے کا بھی آپ کو بڑا اچھا موقع ملا۔ خوش قسمتی سے حدیث و فقہ و تفسیر، تصوف و طریقت اور حکمت و فلسفہ کے مختلف مکاتب آپ کی ذات میں جمع ہو گئے تھے، اور آپ نے پوری وسعت فکری سے ان سب سے استفادہ کیا، اور اس کی اساس پر اپنی منفرد شان جامعیت کی عمارت اٹھائی۔

اس سلسلے میں شاہ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ نہ صرف آپ نے اسلامی علوم و فنون کا

(بقیہ حاشیہ) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (فیوض الحرمین)

۷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں امت مرحومہ کے لئے نیک نمونہ ہے۔ اب امت میں سے جو اصحاب خلافت ظاہرہ ہیں یعنی وہ لوگ جن کا کام شریعت کی حدود قائم کرنا، جہاد کے لئے ساز و سامان فراہم کرنا، سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا، وفود بھیجنا، صدقات اور خراج جمع کرنا اور مستحقین پر ان کو تقسیم کرنا، مقدموں کا فیصلہ کرنا۔ یتیموں، مسلمانوں کے اوقاف، گزرگاہوں، مسجدوں اور اسی طرح کے جو امور ہیں، ان کی خبرگیری کرنا۔ ان لوگوں کے لئے تو رسول اللہ کا نیک نمونہ آپؐ کے وہ احکام و اوامر ہیں، جو مذکورہ بالا امور کے متعلق کتب حدیث میں بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ جس شخص پر ان امور کی ذمہ داری ہوتی ہے ہم اس کو خلیفۂ ظاہر کہتے ہیں۔ (فیوض الحرمین)

کا احصاء کر کے انہیں نئے سرے سے مرتب فرمایا، بلکہ ان میں جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے ان میں آپس میں تطبیق دی، اور ان کے اصول و مبادی کو ہم آہنگ ثابت کیا۔ اپنے "مکتوب مدنی" میں وہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیں اس زمانے میں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ ہمارے سینے میں اس امت کے علماء کے سب علوم جمع ہو گئے ہیں۔ کیا معقولات، کیا منقولات اور کیا کشف و وجدان کے علوم۔ ہمیں خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ ایک علم کو دوسرے پر تطبیق دے سکتے ہیں۔ اس طرح بظاہر ان میں جو اختلافات ہوتے ہیں، وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اور ہر بات اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ جاتی ہے۔ اور ان میں کوئی تناقض نہیں رہتا۔ مختلف اور متعارض اقوال میں ہمارا تطبیق کا یہ اصول علم کے تمام فنون پر حاوی ہے۔ اس کے تحت فقہ بھی آتی ہے۔ علم کلام بھی آجاتا ہے۔ اور تصوف کے مسائل بھی"

اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ صاحب نے جیسا کہ وہ اپنی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں،

مصطفوی شریعت کو برہان اور دلیل کے پیراہنوں میں ملبوس کر کے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا اور انسانی فلاح و بہبود کے جو بنیادی اصول ہیں، اسلامی تعلیمات کو ان پر منطبق فرمایا۔ ان کا ترجمۃ القرآن ہی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اگر وہ کچھ اور نہ کرتے تب بھی انہیں ہمارے علمی محسنوں کی صف اول میں جگہ ملتی لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا انہوں نے علوم اسلامی کی شاخ مثلاً حدیث، تفسیر تاریخ فقہ اور عقائد کو لیا۔ اور ان میں بلند پایہ اور بنیادی کتابیں تصنیف کر کے علوم اسلامی کی ایک مستقل لائبریری قائم کر دی ان کے مختصر سے رسائل مثلاً الانصاف اور الفوز الکبیر کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ چالیس چالیس پچاس پچاس صفحات کے اندر شاہ صاحب نے کس قدر ٹھوس معلومات اور پتے کی باتیں جمع کر دی ہیں۔ شاہ صاحب کے علمی کارنامے ایک معجزہ ہیں اس لحاظ سے شاہ صاحب نہ صرف ہندوستانی علماء کے صدر نشین ہیں، بلکہ اسلامی دنیا کی ممتاز ترین ہستیوں مثلاً امام غزالی یا امام ابن تیمیہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کے مستحق ہیں اور کئی باتوں میں ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ شاہ صاحب کا خطاب زیادہ تر اسلامی ہندوستان سے تھا۔ انہوں نے ان مسائل پر زیادہ توجہ دی، جو ان کے ہم وطنوں کے لئے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر خالص علمی کارناموں پر نظر رکھیں

توشاہ صاحب کا مرتبہ امام غزالی اور امام تیمیہ سے کچھ بلندہی نظر آتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شبلی اپنی تصنیف "تاریخ علم الکلام" میں لکھتے ہیں "ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانے میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا، اس کے لحاظ سے یہ امید نہ تھی کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں جب کہ اسلام کا نفسِ بازپسیں تھا، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔"

آپ کے متعلق نواب سید صدیق حسن خاں لکھتے ہیں "اگر وجود او در صدرِ اوّل و در زمانۂ ماضی مے بود امام الائمہ و تاج المجتہدین شمردہ مے شد" یعنی اگر آپ پہلے زمانے میں پیدا ہوتے تو آپ کو اماموں کا امام سمجھا جاتا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم شاہ صاحب کو محض اپنی کم ہمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں سمجھتے، ورنہ جہاں تک علمی تبحر، دماغی قابلیت، مجتہدانہ نظر، سلیم الخیالی اور اشاعت کتاب و سنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذہبی خدمات کا تعلق ہے ابنائے اسلام میں بہت ہی کم بزرگ ہوں گے، جن سے آپ پیچھے رہے ہوں۔ آپ نے بیسوں کتابیں لکھیں۔ تفسیر، حدیث تصوف، فقہ اور تاریخ علم الکلام، غرضکہ علوم اسلامی کی کوئی شاخ نہیں، جسے آپ نے سیراب نہ کیا ہو۔

اب ہم فرداً فرداً اس جامع کمال شخصیت کے علمی کارناموں کا تعارف کراتے ہیں۔

قرآن مجید۔ شاہ صاحب کا سب سے اہم کام قرآن مجید اور علوم قرآنی کی نشر و اشاعت ہے اور اس سلسلے میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی، لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا حج سے واپس آنے کے بعد ۱۷۳۸ء - ۱۷۳۷ء میں آپ نے فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ گو بعض علماء کی طرف سے اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مخالفت کم ہوتی گئی۔ اور اس کی وجہ سے قرآن مجید کے اردو ترجموں کی بھی راہ پیدا ہوگئی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے دو صاحبزادوں نے قرآن مجید کے اردو میں ترجمے کر دیئے۔ شاہ ولی اللہ کے ترجمۂ قرآن کے متعلق قرآن مجید کے مشہور اردو مترجم مولانا نذیر احمد لکھتے ہیں۔ "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لئے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ میں علی وجہ الکمال

پائی جاتی تھیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں، وہ سب ان کے پیش نظر ہیں، اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں، اسے اختیار کرتے ہیں۔"

شاہ صاحب نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا، بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لئے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب لکھتے ہیں: "اس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس کمترین امت پر بہت سے ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے"

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کرکے ہی نہیں کی، بلکہ علم تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں، جن میں الفوز الکبیر فی اصول التفسیر خاص طور پر قابل ذکر ہے کتاب کے ایک باب میں شاہ صاحب نے علوم پنجگانہ کا تعین کیا ہے۔ جنہیں قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلہ نسخ پر بحث کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ قرآن میں زیادہ سے زیادہ صرف چار آیات منسوخ ہیں، اسی طرح آیات کی شان نزول کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں: "حق یہ ہے کہ نزول قرآنی سے مقصود اصلی نفوس بشریہ کی تہذیب اور ان کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے" گویا وہ قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے ہیں۔ علم تفسیر میں اسرائیلیات کو جو بہت زیادہ بار مل گیا تھا، اس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں "اسرائیلی روایات کا ذکر کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے"

الغرض شاہ صاحب نے اصول تفسیر میں اپنی یہ مختصر سی کتاب الفوز الکبیر لکھ کر قرآن مجید کے مطالعہ اور اس سے استفادہ کرنے اور ہدایت پانے کی ایک نئی راہ کھولی ہے اور قرآن کا سمجھنا سہل بنایا ہے

حدیث ـ اس زمانے میں اسلامی مدارس میں عام طور سے صرف و نحو یا منطق و فقہ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں شیخ عبدالحق سے حدیث کی اشاعت شروع کی، لیکن فقہ و منطق کے فروغ نے حدیث کو چمکنے نہ دیا۔ ان کے جانشینوں نے اس علم پر تصنیف و تالیف کا

سلسلہ جاری رکھا، لیکن شاہ جہاں اور عالمگیر کی علم پروری انہیں قضا اور افتاء کی مسندوں پر لے گئی اور وہ درسِ حدیث کا سلسلہ پوری طرح جاری نہ رکھ سکے۔ اس کی تلافی شاہ ولی اللہ صاحب نے کی۔ ایک تو اورنگ زیب کے بعد مفتیوں اور قاضیوں کی پہلی سی قدر نہ رہی اور فقہ کی کشش کچھ کم ہو گئی دوسرے شیخ عبدالحق کی طرح شاہ ولی اللہ بھی فنا فی العلم تھے۔ "قاضی القضاۃ" اور "شیخ الاسلام" بننے کی خواہش ان کے دل میں نہ تھی۔ انہوں نے اپنی کوشش اس علم کی توسیع کے لئے وقف رکھی، جس کی بادشاہوں کے درباروں میں تو قدر نہ تھی، لیکن جو عام مسلمین کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لئے ضروری تھا۔ شاہ صاحب نے علم حدیث پر کئی کتابیں لکھیں، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ایسے علماء کی تربیت کر گئے جنہوں نے درس حدیث کا سلسلہ ان کے بعد جاری رکھا اور یہ فیض ملک میں عام ہو گیا۔

شاہ ولی اللہ امام مالک کے مرتب کردہ اور سب سے قدیمی مجموعۂ حدیث مؤطا کے بڑے مداح تھے۔ چنانچہ وصیت نامہ میں لکھتے ہیں "جب عربی زبان پر قدرت ہو جائے مؤطا بروایت یحیٰی بن یحیٰی مصمودی پڑھا دیں۔ اسے ہرگز نہ چھوڑیں کہ علم حدیث کی اصل ہے۔ اس کے پڑھنے میں بہت فیض ہیں" علم حدیث میں شاہ صاحب کا یہ اجتہاد سمجھنا چاہیئے کہ وہ مؤطا کو صحیح بخاری پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاہ صاحب نے مؤطاء کی شرح فارسی و عربی دونوں زبانوں میں لکھی۔

"حجۃ اللہ البالغہ" جو اسرار شریعت میں آپ کی ضخیم اور مشہور کتاب ہے، اس کے مضامین بھی بیشتر احادیث پر مبنی ہیں۔ اور اس سے بھی علم حدیث سے آپ کی عمیق واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔

اصول فقہ۔ گو شاہ صاحب نے وقتی ضروریات کے متعلق فقہی فتوے بہت نہیں دیئے، لیکن علم فقہ کو صحیح علمی اور ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے انہوں نے بڑی کوشش کی اور ایسی کتابیں لکھیں جو اہل بصیرت و دانش کو ہدایہ اور فتاوائے عالمگیری سے اوپر فقہ اور شریعت کے اصلی سرچشمے تک پہنچا دیتی ہیں، اور جن کی وجہ سے ایک مبتدی کے لئے بھی ممکن ہے کہ وہ ان حالات کا اندازہ کرے، جن کے ماتحت شرع اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی بہترین کتاب ایک مختصر رسالہ "انصاف فی بیان سبب الاختلاف" ہے۔ اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم حدیث کہا جائے تو بجا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت یہ کتاب عہد سعادت سے لیکر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین، کتب احادیث کی فراہمی اور مختلف مذاہب فقہی کے آغاز کی ایک دلچسپ، منصفانہ اور معلومات افزا تاریخ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے۔ شاہ صاحب

کے اس مختصر سے رسالے میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے تقریباً ان سب اہم بنیادی مسائل کا ذکر آگیا ہے، جن پر علما میں اختلافات ہوئے اور ان اختلافات کی توضیح کی گئی ہے ساتھ ساتھ مذاہب اربعہ یعنی حنفی شافعی مالکی اور حنبلی طریقوں کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل پر نہایت عالمانہ تبصرہ ہے۔ جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی کے مجموعوں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ان وجوہات کا ذکر کیا ہے، جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہوگیا۔

اجتہاد - تقلید و اجتہاد ہی کے مسئلے پر شاہ صاحب کی ایک بڑی مفید کتاب عقد الجید ہے اس میں انہوں نے اجتہاد کی قسموں اور مجتہد کی خصوصیات کے علاوہ اس قسم کے مسائل سے بحث کی ہے کہ ایک عامی فقہاء کے اختلاف کی صورت میں کیا کرے اور آیا ایک عامی مختلف فقہی مذاہب کی مختلف باتیں اختیار کر سکتا ہے۔ شاہ صاحب باب اجتہاد کے بند ہونے کے قائل نہ تھے، لیکن انہوں نے مجتہدین کے لئے بڑی کڑی شرطیں رکھیں ہیں۔

فقہ کا ایک بڑا اختلافی مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے۔ اس کے متعلق شاہ صاحب کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے۔ وہ عامی کو مجتہدین کا مقلد رہنے کے حق میں تھے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو جس ملک میں شرعی قانون رائج ہوگا، اس کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ عامی کی تقلید حقیقتاً قوانین رائج کی تعمیل ہے۔ لیکن شاہ صاحب تقلید کو حد سے زیادہ بڑھانے کے مخالف تھے۔ انہوں نے ایک باب تقلید میں اعتدال رکھنے کے بارے میں لکھا ہے۔ اور تقلید کی ایک قسم کو حرام قرار دیا ہے، جو ان کے الفاظ میں یہ ہے "کہ کسی فقیہ کو گمان ہو کہ وہ علم میں نہایت کو پہنچ گیا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ وہ خطا کرے تو ایسے مقلد کو جب کوئی حدیث صحیح اور صریح پہنچتی ہے کہ مخالف اس فقیہ کے قول کے ہو، تو اس کے قول کو نہیں چھوڑتا۔"

تصوف - شاہ صاحب نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی، وہاں تصوف سے لگاؤ ہونا لازمی تھا۔ شاہ صاحب کے والد اور چچا اہل طریقت تھے اور معاصرانہ تذکروں میں ان کا ذکر مشائخ کے ضمن میں ہوا ہے، علماء کے ضمن میں نہیں۔ شاہ صاحب اس ضمن میں اپنے دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اس زمانے میں لوگ شرقاً غرباً صوفیہ کے علوم قبول کرنے پر متفق ہیں، یہاں تک کہ ان کے اقوال

اور حالات لوگوں کے لئے کتاب وسنت سے بھی زیادہ مرغوب خاطر ہیں، بلکہ عامۃ الناس تو صوفیہ کے رموز واشارات کے بغیر کوئی چیز قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں ... اسی بنا پر وجدان، اشراق قلبی یا کشف اس زمانے میں ایک ضروری علم بن گیا ہے۔"

اور یوں بھی تصوف وطریقت تزکیۂ نفس اور روحانی اصلاح کے لئے بہت ضروری ہے اور اس کی سیدھی سادی ریاضتوں اور ذکر وشغل سے، جن کا شرع سے کوئی تضاد نہیں، انسان باطنی خرابیوں کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اور مانا کہ اس وقت تصوف میں کئی کوتاہیاں ہیں لیکن تب بھی مسلمانان پاک وہند کے لئے اسے جڑ سے اکھیڑ پھینکنا آسان نہیں ہمارا ادب فلسفہ اور مذہب تصوف کی گود میں پلا ہے اور اگر ہم تصوف کا قلع قمع کر دیں تو اپنے بہت سے قیمتی ورثے سے ہاتھ دھونا پڑے گا اس کے علاوہ تصوف کی اسلامی صورت یعنی "احسان" یا اخلاص فی العمل کی ضرورت قوم کو ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔

شاہ ولی اللہ صاحب کو تصوف[۱] سے گہری دلچسپی تھی۔ اور ان کی اصلاحی تحریک اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک میں سب سے بڑی وجہ امتیاز یہ تھی کہ جہاں آخرالذکر تصوف کے اصلاً مخالف تھے، وہاں شاہ صاحب نے تصوف پر کئی کتابیں لکھیں۔ اور اس کی اصلاح کی کوشش کی تصوف پر شاہ صاحب کی ایک کتاب "القول الجمیل" ہے جس میں انہوں نے بڑی تفصیل سے مرید اور مرشد کے آداب وفرائض بتلائے

---

[۱] شاہ ولی اللہ صاحب کے مسلک میں تصوف کو کتنی اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ ان کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے۔

وہ ہمارے گروہ میں سے نہیں، جس نے کتاب اللہ پر غور نہ کیا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں فہم وبصیرت حاصل نہ کی ہو۔ وہ ہم میں سے نہیں جس نے ایسے علماء کی صحبت ترک کر دی ہو، جو صوفیا ہیں اور انہیں کتاب وسنت میں درک ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو ایسے اصحاب علم سے کنارہ کش ہو گیا ہو، جو تصوف میں بہرہ رکھتے ہوں اور ایسے محدثین کی صحبت میں نہ بیٹھے جو محدثین کے ساتھ ساتھ فقہاء بھی ہوں۔ وہ ہم میں سے نہیں، جس نے ایسے فقہاء کی صحبت ترک کر دی ہو جو علم حدیث بھی جانتے ہیں۔ باقی رہے جاہل صوفیہ اور جاہل علماء جو تصوف کا انکار کرتے ہیں، تو یہ دونوں کے دونوں چور اور رہزن ہیں، ان سے بچنا چاہیئے۔ خدا تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان لوگوں کے زمرے میں شامل کرے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور اس کی رضامندی چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں بناتے بے شک ہم اس کے لئے ہیں۔ اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ "دارالسلام" تفہیمات ص ۲۰۳/۲

اور مختلف سلسلوں کے جو ذکر و اشغال ہیں، ان کو بیان کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں شاہ صاحب نے راہِ حق کے طالب کو جو وصیت کی ہے اس سے تصوف و طریقت کے متعلق شاہ صاحب کا جو مسلک ہے، اس کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب کی اس وصیت کا خلاصہ یہ ہے "راہِ حق کے طالب کو چاہیئے کہ وہ دولت مندوں کی صحبت اختیار نہ کرے، سوائے اس کے کہ وہ اس کے ذریعہ لوگوں پر جو ظلم ہوتے ہیں، ان کو روکنا چاہئے، یا وہ اس طرح انہیں نیک کاموں پر آمادہ کرنا چاہتا ہو۔ وہ جاہل صوفیوں جاہل عبادت گزاروں، خشک مزاج فقیہوں، ظاہر پرست محدثوں اور حد سے بڑھے ہوئے معقولیوں کے پاس نہ بیٹھے۔ اس کے برعکس وہ صاحب علم صوفی اور زاہد ہو۔ ہر دم اللہ کی طرف توجہ کرنے والا ہو، معرفت کے احوال کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔ سنت کی طرف راغب ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار کی تلاش میں رہے۔ وہ محقق فقہاء جو قیاس و رائے کے مقابلے میں حدیث کی طرف زیادہ مائل ہیں، وہ علماء جن کے عقائد سنت سے ماخوذ ہیں۔ اور وہ عقلی استدلال کو ایک زائد سی چیز سمجھتے ہیں۔ اور وہ اصحاب سلوک جو جامع ہیں علم اور تصوف کے اور بلا وجہ اپنے اوپر سختی نہیں کرتے اور نہ ضرورت سے زیادہ سنت میں دقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ طالب حق کو چاہیئے کہ ان فقہاء، ان علماء اور ان اصحاب سلوک کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار کی وضاحت اور تفصیل دیکھے۔

راہِ حق کے طالب کو چاہیئے کہ وہ فقہ کے کسی ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح دینے کے بارے میں گفت گو نہ کرے، بلکہ ان سب مذاہب کو وہ ایک ہی درجہ قبولیت پر رکھے ۔۔۔ اسے چاہیئے کہ فقہ کے ان سب مذاہب کو یوں سمجھے، جیسے کہ یہ ایک مذہب ہے۔ اور اس معاملے میں وہ ہرگز تعصب نہ برتے۔"

اور آخر میں فرماتے ہیں:۔ "طالب راہِ حق کو میری آخری وصیت یہ ہے کہ وہ تصوف کے ایک طریقے کو دوسرے طریقے پر ترجیح دینے کے متعلق بحث نہ کرے۔ صوفیاء میں سے جو مغلوب الحال لوگ ہیں، نہ تو وہ ان کو برا سمجھے اور نہ ان کو جو سماع وغیرہ امور میں تاویل کرنے والے ہیں اور جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے وہ سوائے اس راہ کے، جو سنت سے ثابت ہو، اور اہل علم میں سے محققین اور راسخین کا گروہ اس پر عامل ہے، کسی اور پر نہ چلے۔ باقی توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا تو اللہ ہی ہے"

غرض شاہ ولی اللہ نے تصوف و طریقت کا اقرار کرتے ہوئے اسے شریعت کے مطابق کرنے کی

کوشش کی، اور اس بات پر زور دیا کہ اسے اخلاقی اصلاح اور روحانی تربیت کا واسطہ بنایا جائے۔

شاہ صاحب کی سب سے مشہور اور مقبول عام کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے، جو آپ نے اسرار علم دین کے متعلق لکھی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ مذہب اسلام کے جو عقائد یا احکام ہیں، ان میں کیا کیا مصلحتیں ہیں۔ شاہ صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوا کرتی۔ اور اعمال اور ان کی جزا میں جو منجانب اللہ مقرر ہے، کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اور احکام شریعت کا مکلف کرنا بعینہ ایسا ہی ہے، جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کی فرماں برداری کی آزمائش کرنے کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کے چھونے کا حکم دے، جس میں بجز آزمائش کے اور کوئی فائدہ نہیں۔ پس اگر اس کی اطاعت کرے، جزا پائے اور سرکشی کرے تو سزا دی جائے۔ یہ گمان بالکل فاسد ہے۔ حدیث اور ان زمانوں کا اجماع، جن کی خوبی اور برکت پر خود شرع نے شہادت دی ہے اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ کے متعلق نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں کہ گزشتہ بارہ صدیوں میں علمائے عرب و عجم میں سے کسی نے اس جیسی تصنیف نہیں کی۔ اس سلسلہ میں مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ مذہب دو چیزوں سے مرکب ہے۔ عقائد و احکام۔ شاہ صاحب کے زمانے تک جس قدر تصنیفات لکھی جا چکی تھیں، صرف پہلے حصے کے متعلق تھیں۔ دوسرے حصے کو کسی نے مس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحب پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔

شاہ ولی اللہ کی علمی شخصیت کتنی جامع تھی۔ اور علوم اسلامیہ میں سے ہر علم پر ان کی نظر کتنی گہری اور ہمہ گیر تھی، اس کا اندازہ آپ کو اس مختصر سے تبصرے سے ہو گیا ہوگا۔ اگرچہ ان کا یہ بہت بڑا علمی کمال تھا۔ اور تاریخ اسلام میں آپ کو بہت کم ایسے علماء ملیں گے، جو اس معاملے میں شاہ صاحب کا مقابلہ کر سکیں لیکن اس کے علاوہ ان کا دوسرا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کے جتنے بھی اسلامی مکاتب خیال اور مسلمانوں کے فرقے تھے، ان میں ہم آہنگی و موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی، اور ان کے باہمی اختلافات کی ایسی تاریخی و علمی توجیہیں پیش کیں کہ وہ آپس میں اختلافات رکھتے ہوئے اسلام کے بنیادی و اصولی معاملات میں متفق ہو سکتے تھے۔ شاہ صاحب کا یہ کارنامہ سب سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور یہی ان کی فکری جامعیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

شاہ صاحب اپنے اس خصوصی علمی کمال کا ذکر یوں فرماتے ہیں۔ "میرے دل میں تخلیق و ایجاد کے علوم کا بالعموم اور عالم خیال میں جو تخلیق ہوتی ہے، اس کے علوم کا بالخصوص فیضان ہوا۔ نیز اس علم کا فیضان ہوا کہ دو متناقض چیزوں اور دو ضدوں کا اجماع فی نفس الامر ممکن ہے۔" اور یقیناً یہ اس لئے تھا جیسا کہ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزاء کو جمع کر دے۔"

دو متضاد چیزوں میں ہم آہنگی و مطابقت پیدا کرنے کو تطبیق کہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے چند اہم متنازع فیہ مسئلوں پر تطبیق کرنے کی کوشش کی ہے ان کا اجمالاً یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

وحدت الوجود اور وحدت شہود۔ خواجہ باقی باللہ نقشبندی کی آمد سے پہلے جو صوفیہ کے سلسلے ہندوستان میں برسر فروغ تھے، گو ان میں جزوی اور فروعی اختلافات ضرور تھے۔ لیکن ان کا روحانی پس منظر ایک تھا۔ یہ تینوں (چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ) "صلح کل" طریقے کے قائل تھے اور تینوں میں وحدت وجود کا طریق رائج تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی سلسلے کو لے کر آئے جس میں شرع کی پابندی پر بڑا زور تھا۔ اور سماع کی بھی ممانعت تھی بعد میں حضرت مجدد الف ثانی نے جو حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید تھے وحدت وجود کے مقابلے میں وحدت شہود کا ایک مستقل تصور پیش کیا جو معنوی لحاظ سے وحدت وجود کی ضد تھا اور عملی زندگی میں اس کے جو نتائج نکلے وہ باقی سلسلوں کے "صلح کل" کے مسلک کے خلاف تھے۔ وحدت وجود کو آپ شان جمالی سمجھیں اور حضرت مجدد نے اس کے مدمقابل جس فلسفہ تصوف کی دعوت دی، وہ اپنے اندر شان جلالی رکھتا تھا۔ اس وقت اس اختلاف و تضاد کی وجہ سے مسلمان صوفیہ میں کافی کش مکش تھی اور ان کے دو گروہ ہو گئے تھے۔

شاہ ولی اللہ نے وحدت وجود اور وحدت شہود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور ابن عربی اور مجدد الف ثانی کے خیالات میں تطبیق کی۔ شاہ صاحب نے دیکھا کہ ایک اصول اخذ و انجذاب کا ہے اور دوسرا تطہیر و تزکیہ کا۔ ایک کے پیرو مشابہتوں اور یکرنگیوں کو دیکھتے ہیں اور دوسروں کی نظر اختلافات پر پڑتی ہے۔ ایک گروہ والے

۱ؔ فیوض الحرمین

عیسائی تو افلاطونی اور ہندو فلسفوں اور طریقوں کو کھنگالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان میں کون سی چیز اچھی ہے اور اخذ کی جاسکتی ہے اور دوسرے اصول کے پیرو ان چیزوں کو اسلام کی کسوٹی پر کستے ہیں، تاکہ جو چیز شرعی معیار پر پوری نہ اترے اسے رد کر دیا جائے۔ اگر پہلا گروہ نہ ہو تو اسلامی خیالات اور فلسفہ کی نشوونما ختم ہو جائے۔ دماغ ایک محدود اور تنگ و تاریک دائرے سے باہر نہ نکلے اور خیالات میں وسعت اور لچک نہ رہے اگر دوسرا گروہ اپنا کام بند کر دے، تو ہر رطب ویابس بلکہ ملحدانہ اور مضر خیالات قبول کر لئے جائیں اور قوم کا نہ صرف شرعی بلکہ فکری اور روحانی نظام درہم برہم ہو جائے۔

شاہ صاحب نے وحدت وجود اور وحدت شہود کے بارے میں صوفیا کے درمیان جو اختلافات تھے، ان دونوں تصورات کو ایک دوسرے کے مطابق ثابت کر کے اس خلیج کو پُر کیا۔ اس کے علاوہ روحانی اختلافات مٹانے کے لئے یہ بھی کیا کہ بیعت کے وقت چاروں خانوادوں کا نام لیتے۔ "تذکرۃ الرشید" میں لکھا ہے۔ "... چاروں خانوادوں کے نام لینے کا طریقہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے سے نکلا ہے۔"

شریعت اور طریقت۔ صوفی اور فقیہ کا اختلاف شروع سے چلا آتا ہے۔ ہندوستان میں اسلام زیادہ تر صوفیہ کے ذریعہ اشاعت پذیر ہوا، اور اسی لئے ضرورت تھی کہ اس اختلاف کو دور کیا جائے شاہ ولی اللہ اس کام کے لئے بے حد موزوں تھے۔ وہ فقہ اور اصول فقہ کے زبردست عالم تھے۔ اور باقاعدہ صوفی بھی۔ انہوں نے اپنے اس علم اور اپنے ذاتی تجربات کو تصوف اور فقہ کے اختلافات مٹانے کے لئے استعمال کیا۔ آپ نے تصوف کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھیں، جن کے متعلق مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم لکھتے ہیں "ان کتابوں سے ملا اور صوفی کے جھگڑوں کا بشرطیکہ انصاف سے کام لیا جائے، خاتمہ ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے تصوّف کے مسائل کو خالص اسلامی تعبیروں میں پیش کر کے مولویوں کی اس بھڑک کو مٹا دیا ہے، جو ان بیچاروں میں صوفی و صوفیت کے متعلق پائی جاتی ہے"

اس طرح شاہ صاحب نے صوفیہ کے آپس کے جو اختلافات تھے، انہیں بھی کم کرنے کی سعی کی اور صوفیہ اور فقہا کی کش مکش کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی۔

مذاہب فقہ کا اختلاف۔ شاہ صاحب کی ابتدائی تعلیم حنفی طریقے پر ہوئی تھی۔ ان کے والد اور چچا دونوں حنفی تھے لیکن حجاز میں آپ کے استاد جن سے آپ بہت متاثر ہوئے، شیخ ابو طاہر مدنی شافعی تھے۔

شاہ صاحب نے فقہ کے ان دونوں مذاہب سے فیض حاصل کیا، اور دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں[1]۔ "میرے دل میں ایک خیال ڈالا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے مذہب امت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ پیرو بھی ان کے پائے جاتے ہیں۔ اور تصانیف بھی انہی مذاہب کی زیادہ ہیں ..... اس وقت جو امرِ حق ملاء اعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ دونوں کو ایک مذہب کی طرح کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو حدیث نبوی کے مجموعوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔ جو کچھ ان کے موافق ہو، اس کو رکھا جائے، اور جس کی کچھ اصل نہ ہو، اس کو ساقط کر دیا جائے پھر جو چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں، اگر دونوں مذاہب میں متفق علیہ ہوں، تو مسئلہ میں دونوں قول تسلیم کئے جائیں۔"

نہ صرف یہ کہ شاہ صاحب نے فقہ اسلامی کے ان دو بڑے مذاہب کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی، بلکہ خود حنفی مذہب کا ایک ایسا طریقہ تجویز کیا "جو ان مشہور احادیث سے جو امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں۔ اور ان کی اس زمانے میں جانچ پڑتال بھی ہوئی، موافق ترین ہے" اور وہ طریقہ یہ ہے "امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے، جو مسئلہ زیر بحث میں مشہور احادیث سے سب سے زیادہ قریب ہو، پھر ان فقہائے احناف کے فتاوے کی پیروی کی جائے، جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں"

شیعہ سنی مسئلہ — ہندوستان میں شروع سے سنی مسلمانوں کی غالب اکثریت رہی ہے، لیکن یہاں شیعہ اثرات بھی کافی کارفرما رہے ہیں۔ اسلامی ہند کی دفتری اور ادبی زبان فارسی تھی۔ اور پھر جب ایران میں شیعہ مذہب کا فروغ ہوا، تو وہاں سے شیعہ علماء شعراء اور فلسفی کافی تعداد میں ہندوستان آتے رہے۔ اور بعد میں خود ہندوستان میں بھی شیعہ اہل علم پیدا ہوئے۔ اب اگر شیعوں کے خلاف غلو سے کام لیا جائے گا تو لازماً اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوگا۔ اور اسلام کو ضعف پہنچے گا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس معاملے میں بھی ایک احسن طریق عمل اختیار کیا جو دونوں طبقوں کے نقطۂ نظر اور اس بحث پر تمام تاریخی مواد اور نبوی احکام مطالعہ کرنے کے بعد مدوّن ہوا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے ان مسائل پر جن کی وجہ سے شیعہ سنّی

---

[1] تفہیماتِ الٰہیہ

اختلافات پیدا ہوئے، بڑی سیر حاصل بحث کر کے دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں تطبیق کی، اور امت کے لئے راہ وسط نکالی۔

شیعہ سنی تنزاع کو کم کرنے کے بارے میں شاہ صاحب کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم لکھتے ہیں :-

"ہندوستان میں پہلے تورانی سنی پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سنی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن و تشیع کے سلسلے میں عجیب افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے اس سلسلے میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزارہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات ازالۃ الخفا میں ایسے دل نشین طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے تو اسی کے ساتھ ان غالی سنیوں کی شدت و تیزی میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہ کے مناقب کیوں بیان کئے یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہائے حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا، ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ اور اس کے لئے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب نے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی جس سے بہت سے فتنوں کا سدِ باب ہو گیا۔"

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ افضل ہیں یا حضرت علیؓ۔ اس بے حد متنازع فیہ مسئلے کو شاہ صاحب یوں حل کرتے ہیں :- . . . "گو حضرت علیؓ نسب کے اعتبار سے نیز اپنی جبلت اور مجبوب فطرت کے لحاظ سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے زیادہ آپؐ سے قریب تھے۔ اور "جذب" میں بھی قوی تر اور "معرفت" میں بھی بلند تر تھے، لیکن اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے منصب نبوت کے کمال کے پیش نظر حضرت علیؓ سے زیادہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف مائل تھے، اسی بنا پر ہم دیکھتے

---

[1] فیوض الحرمین

ہیں کہ وہ علماء جو معارفِ نبوت کے حامل ہیں، وہ شروع سے حضرت علیؓ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو فضیلت دیتے چلے آئے ہیں، اور جو علماء معارفِ ولایت کے قائل ہیں، وہ حضرت علیؓ کو افضل مانتے رہے ہیں، اور بقول شاہ صاحب کے حضرت علیؓ اسی امت کے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں اور یہ کمالات سوائے آپ کی ذات میں اور کسی میں نہیں ہیں۔"

حسن اتفاق سے شاہ ولی اللہ معارفِ نبوت کے حامل علماء میں سے بھی تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ معارفِ ولایت کے حامل علماء میں سے بھی، اس لئے تفضیلِ ابوبکرؓ و عمرؓ اور علیؓ کے معاملے میں ان کے ہاں قدرتاً تضاد تھا۔ اس ضمن میں وہ ایک جگہ "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں:۔ "ان امور میں سے جن کا میں نے بارگاہ نبوی سے استفادہ کیا، آخری امر یہ ہے کہ مجھے حضرت علیؓ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو فضیلت دینے کا حکم دیا گیا۔ گو اس معاملے میں اگر میری طبیعت اور میرے رجحان کو آزاد چھوڑا جاتا تو وہ دونوں حضرت علیؓ کو فضیلت دیتے۔ اور ان سے زیادہ محبت کا اظہار کرتے۔ لیکن یہ ایک چیز تھی، جو میری طبیعت کی خواہش کے خلاف عبادت کی طرح مجھ پر عائد کی گئی تھی اور مجھ پر اس کی تعمیل لازمی تھی۔"

اسی سلسلے میں وہ آگے لکھتے ہیں:۔ "میرے اندر ان تین متناقض چیزوں کا ہونا ایک عجیب بات ہے کاش ایسا نہ ہوتا، لیکن میری ذات میں "جامعیت" کی جو شدت ہے، اسی نے مجھے ان متناقضات میں ڈالا ہے

ان تین متناقض چیزوں میں سے ایک چیز تو وہ ہے جس کا ابھی اوپر ذکر ہوا۔ اور دوسری چیز خود شاہ صاحب کے الفاظ میں یہ ہے "مجھے کہا گیا ہے کہ میں فقہ کے چار مذاہب کا پابند رہوں، اور ان کے دائرے سے باہر نہ نکلوں، اور جہاں تک ممکن ہو اس سے موافقت پیدا کروں، لیکن خود میری طبیعت کا یہ حال ہے کہ وہ تقلید سے ابا کرتی ہے، لیکن چونکہ یہ چیز اطاعت و عبادت کی طرح مجھ سے طلب کی گئی تھی۔ اس لئے مجھے اس سے جائے مفر نہ تھی۔"

اور تیسری چیز ہے شاہ صاحب کا اسباب کی طرف فطری التفات، اور پھر انہیں ترک اسباب کے لئے حکم ملنا۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں "مجھ سے یہ عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ میں اسباب کو وسیلہ بنانا چھوڑ دوں۔ اس سے یہ ہوا کہ ایک طرف تو میری طبیعت کا فطری رجحان اسباب کی طرف تھا۔ اور دوسری طرف مجھ سے ترکِ اسباب کا عہد لیا گیا تھا۔ اب میرے اندر یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں جو متناقض ہیں ..."

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھ میں ان تناقضات کا ہونا ایک عجیب بھید اور نکتہ ہے۔ اور دراصل یہ بھید

اور نکتہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ اس طرح شاہ صاحب کی فکری جامعیت وجود میں آسکے بے شک شاہ صاحب بہت بڑے عالم ربانی، محدث، فقیہہ، متکلم اور صوفی وصاحب کشف بزرگ تھے لیکن ان کی اس جامعیت کی تشکیل میں زیادہ تر اس خصوصیت کا حصہ ہے جو ان کے والد اور ان کے خاندان کو دوسرے علماء سے ممتاز کرتی تھی۔ اور یہ تھی ان کی علمی سوجھ بوجھ اور مسائل زیر بحث کے نظری پہلوؤں سے زیادہ ان کے عملی پہلوؤں پر زور دینا۔ شاہ عبدالرحیم نے خاص طور سے اپنے نامور فرزند کو یہ تعلیم دی تھی جسے اس زمانے کی اصطلاح میں "حکمت عملی" کا نام دیا گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حکمت عملی جس پر اس عہد میں خیر و برکت کا انحصار ہے، کارساز قدرت نے مجھے اس کا وافر حصہ عطا فرمایا...."

اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا وہ معقول نقطہ نظر اور متوازن دل و دماغ، جو عمل کے لئے لازمی ہوتا ہے اور اس کے بغیر جامعیت ممکن نہیں، جس نے شاہ ولی اللہ کو اسلامی ہند میں ایک خاص امتیاز بخشا ہے اور جس کی وجہ سے آج فلاح قومی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے ذہنی نظام میں شاہ ولی اللہ کو مرکزی جگہ دیں۔

تطبیق کی فی الحقیقت ضرورت ہی اس لئے پڑتی ہے کہ عمل کے لئے ذہنی تناقضات کو ہم آہنگ کیا جائے۔ اس تطبیق میں شاہ صاحب کا سب سے نمایاں وصف عدل و اعتدال ہے۔ جو کوئی بھی شاہ ولی اللہ کے فکر اور مسلک پر تبصرہ کرے گا، اسے اس سلسلے میں لامحالہ متوازن دل و دماغ" "معتدل مزاج" "ہمہ گیر فطرت" "جامعیت" "توازن صادق" اور اعتدال صحیح" یا اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے پڑیں گے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے الفاظ میں "شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآن شریف کا جو نصب العین معین فرمایا ہے، وہی ان کی حکمت کی اساس ہے، یہ حکمت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود یہ دنیا ہے۔ شاہ صاحب نے تمام انبیاء کی زندگی کو اسی حکمت کی نظر سے دیکھا ہے اور ان کی تعلیمات کو تدریجی ترقی کے اسی اصول پر حل کیا ہے۔ ہمارے نزدیک شاہ صاحب کا سب سے بڑا علمی کمال ہے اسی لئے ہم ان کو امام مانتے ہیں۔ ہم شاہ صاحب کی امامت پر محض اس بنا پر زور دیتے ہیں کہ انہوں نے انسانی فکر کو از اول تا آخر ایک تاریخی تسلسل میں مرتب کر دیا ہے، جس کی وجہ سے تمام انبیاء کی تعلیم میں فکری وحدت پیدا ہو جاتی ہے"

اسی طرح شاہ صاحب نے تاریخ اسلام کو بھی از اول تا آخر ایک فکری وحدت دینے کی کوشش کی ہے اور یہی ان کی جامعیت کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔

تصوف اسلامی کا ارتقاء

پروفیسر ضیاء

حضرت شاہ ولی اللہؒ تصوف کے طریقوں میں مختلف زمانوں میں جو بڑے بڑے تغیرات ہوئے اُن کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "ہمعات" میں فرماتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی میں حاصل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان بزرگوں کا "احسان"[1] یعنی حاصل تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے۔ ذکر اور تلاوت کرتے تھے، روزے رکھتے تھے صدقہ اور زکوٰۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوتا، جو سر نیچے کئے بحر تفکرات میں غرق نظر آتا۔ یہ بزرگ خدا تعالےٰ سے قرب و حضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر و اذکار کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے۔ بے شک ان اہل کمال بزرگوں میں جو محقق ہوتے ان کو نماز اور

---

[1] احسان یعنی اللہ کی اس یقین کے ساتھ عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا اسے سامنے دیکھ رہا ہے یا اگر اتنا نہ ہو تو اسے یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحب "ہمعات" میں فرماتے ہیں :۔ دین کے محافظین کا دوسرا گروہ وہ ہے جسے خدا تعالےٰ نے باطن دین کی حفاظت کی، جس کا کہ دوسرا نام "احسان" ہے، استعداد عطا فرمائی ہے زمانے میں اس گروہ کے بزرگ عوام الناس کے مرجع رہے ہیں۔ اطاعت و نیکوکاری کے اعمال سے باطن نفس میں جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور دل کو ان سے جو لذت ملتی ہے، یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں۔

ذکر و اذکار میں لذت ملتی۔ قرآن مجید کی تلاوت سے وہ متاثر ہوتے۔ مثلاً وہ زکوٰۃ محض اس لئے نہ دیتے کہ زکوٰۃ دینا خدا کا حکم ہے بلکہ خدا کے حکم کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بخل کے روگ سے بچاتے چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں بے حد منہمک پاتے اور انہیں اس کا احساس ہوتا، تو وہ دل کو کاروبارِ دنیا سے ہٹانے کے لئے زکوٰۃ دیتے۔ اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

شاہ صاحب کے نزدیک یہ تصوف کا پہلا دور ہے، اور اس میں زیادہ زور ایمان اور عمل پر تھا۔

تصوف جسے اس دور میں "احسان" کا نام دیا جاتا تھا، دین اسلام کا وہ پہلو ہے جس کا زیادہ تر تعلق باطنی زندگی سے ہے، اب واقعہ یہ ہے کہ اسلام دین وسط ہے۔ وہ خارجی اور باطنی زندگی میں توازن چاہتا ہے۔ فکر و عمل میں حدِ اوسط قائم کرتا ہے۔ ایمان اور عمل دونوں کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اور پھر اس کا ظہور بھی ایک ایسی سرزمین میں ہوا، جو مشرق اور مغرب کے درمیان واقع تھی اور دونوں کو ملانے والی کڑی تھی۔ ایک طرف اس کا رشتہ ہندوستان اور چین سے تھا۔ دوسری طرف یونان و روم و ایران سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ اور جس قوم نے سب سے پہلے اس دین کو اپنایا، اس کے تصورات کے خاکوں میں رنگ بھرا، وہ عربوں جیسی عملی قوم تھی۔ پھر ان کے بعد جس قوم نے اسلامی علوم و فنون اور ادب و فلسفہ کو ترقی دی، وہ ایرانیوں جیسی ذہین قوم تھی، جس کی طبیعت کا رجحان باطن کی طرف زیادہ تھا۔

"احسان" نے بعد میں اسلامی تاریخ میں تصوف کی جو علمی و عملی شکل اختیار کی، تو ایسا ہونا فطری تھا کیونکہ جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا ہے، دین محمدی کی دو حیثیتیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی، نیکی و طاعت کے کاموں سے دل پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں، ان کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت کا مقصود ہے اور یہی تصوف ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت میں تصوف کا یہ رجحان ملتا ہے۔ اور ہر قوم نے تصوف کے اس رجحان کو حسب استعداد عملی شکل دی ہے۔ ظاہر ہے، عام زندگی کی طرح باطنی زندگی کے متعلق بھی انسانوں کے ہر گروہ کا ردِ عمل اپنے اپنے قومی مزاج اور مخصوص ملکی و تاریخی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ اب اسلامی تصوف نے سب سے پہلے عربی ماحول کے اثرات لئے، اور کتاب و سنت کو اس نے اپنا اساس بنایا۔ اس کے بعد آریائی تصورات و رجحانات سے سابقہ پڑا۔ اور اس نے ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ۲ خذ و جذب،

ترکیب و استلاف اور ہم آہنگی و موافقت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور تصوفِ اسلام مختلف ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا ایک ایسی منزل پر پہنچا کہ وہ دین و حکمت اور شریعت و طریقت دونوں پر جامع سمجھا جانے لگا۔
علامہ اقبال مرحوم تصوفِ اسلام کی اس جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "فلسفۂ عجم" میں لکھتے ہیں۔

> اسلامی تصوف کی قوت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انسانی فطرت کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بہت ہی جامع و مکمل ہے۔ اور اسی پر وہ مبنی بھی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ راسخ العقیدہ مذہبی لوگوں کے ظلم و تعدی اور سیاسی انقلابات سے صحیح و سلامت آیا۔ کیونکہ یہ فطرتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے۔

تصوف کے اس دور میں جسے شاہ ولی اللہ صاحب اس کا پہلا دور کہتے ہیں "کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا، نہ وہ جوش میں آ کر کپڑے پھاڑنے لگتا، اور نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی بات اس کی زبان سے نکلتی۔ یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام ادا نہ کرتے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین ہوتی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات و خوارق اور سرمستی و بے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں، یہ کیفیات ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوئی تھیں کہ وہ ملکہ بن جاتیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جب کبھی ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی تو یا تو اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو از روئے ایمان صمیم قلب سے مانتے تھے وہ چیز بے اختیار ان کی زبان پر آ جاتی .... یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لیتے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کر لیتے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔" (ہمعات)

غرض حضرت شاہ صاحب کے الفاظ میں "اس دور میں جسے تصوف یا 'احسان' کا پہلا دور کہنا چاہیئے۔ اہل کمال کا غالب طور پر یہی حال رہا"

پہلی صدی ہجری کے بعد اہل کمال کے ایک گروہ میں یہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اعمالِ شریعت کی پوری پابندی کے ساتھ ساتھ باطنی زندگی کی نشو و نما میں لگ جاتے ہیں۔ ان بزرگوں میں

حضرت رابعہ بصری خاص طور پر ممتاز ہیں۔

علامہ اقبال تصوف کے اس رجحان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس کی نوعیت زیادہ تر سامی تھی۔ اس مکتب کے صوفیاء کے نصب العین میں طلب علم غالب نہیں ہے، بلکہ تقدس، دنیا سے بے تعلقی اور خدا سے گہری محبت جو گناہ کے شعور سے پیدا ہوتی ہے، ان کی زندگی کے مخصوص خط و خال میں سے تھی۔"

ان کے تقریباً ایک سو سال بعد تیسری ہجری کے اوائل میں ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، اور جنید بغدادی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ حضرت جنید کو موجودہ علم تصوف کا ایک لحاظ سے بانی سمجھنا چاہیئے۔ آپ کا رجحان شرعی پابندی کی طرف زیادہ تھا چنانچہ حضرت جنید کا یہ قول مشہور خاص و عام ہے کہ ہمارا "تصوف کتاب و سنت کے ساتھ مربوط ہے" آپ کی وفات ۲۹۷ھ میں ہوئی اور آپ کو سید الطائفہ کا نام دیا گیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب تصوف کے اس دور کے بارے میں فرماتے ہیں:۔ "حضرت جنید جو گروہ صوفیا کے سرخیل ہیں، ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے، اس زمانے میں یہ ہوا کہ اہل کمال میں سے عام طبقہ تو اسی طریقے پر کاربند رہا، جس کا ذکر پہلے دور کے ضمن میں ہو چکا ہے، لیکن ان میں سے جو خواص تھے، انہوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ اور مستقل طور پر وہ ذکر و فکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو "تعلق باللہ" کی نسبت حاصل ہو جائے۔"

"تعلق باللہ" کی اس نسبت کے حصول کے لئے "وہ مدتوں مراقبے کرتے، اور ان سے تجلی، استتار انس اور وحشت کے احوال و کوائف ظاہر ہوتے، اور وہ اپنے ان احوال کو نکات و اشارات میں بیان بھی کرتے۔ ان اہل کمال میں سے سب سے صادق وہ بزرگ تھے، جنہوں نے اپنی زبان سے وہی کہا جو خود ان پر گزرا تھا۔"

حضرت شاہ صاحب کے الفاظ میں ان بزرگوں کی کیفیت یہ تھی:۔ "یہ لوگ سماع سنتے، سرمستی و بے خودی میں بے ہوش ہو جاتے۔ کپڑے پھاڑتے، اور وفور جوش میں رقص کرتے۔ یہ کشف و اشراف

کے ذریعہ دوسروں کے دلوں کی باتوں کو بھی معلوم کر لیتے تھے انہوں نے دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لی۔ اور گھاس اور پتوں پر زندگی گزارتے اور گودڑیاں پہننے لگے۔ نفس و شیطان کے مکروں اور دنیا کے فریبوں کو یہ خوب سمجھتے تھے اور ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ لوگ مجاہدے بھی کرتے تھے الغرض اس دور کے اہل کمال کا تصوف یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت دوزخ کے عذاب سے ڈر کر یا جنت کی نعمتوں کے طمع میں نہ کرتے تھے، بلکہ ان کی عبادت کا محرک خدا کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ ہوتا۔"

تصوف کے اس دور میں "توجہ[1]" کی نسبت اپنے درجہ کمال تک نہ پہنچی تھی۔ اس زمانے میں ان اہلِ کمال میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا، جس نے کہ خاص توجہ کو ان معنوں میں اپنا نصب العین بنایا ہو کہ وہ ہمیشہ اسی کی بات کرتا اور اسی طرف اس کا ہر اشارہ ہوتا۔

حضرت جنید بغدادی سے منصور حلاج کا رشتہ مریدی بتایا جاتا ہے۔ منصور کا نعرہ "انا الحق" آگے چل کر صوفیہ کے ایک گروہ کے کارواں کے لئے بانگ درا بن گیا۔ منصور کو کم و بیش ۳۰۹ھ میں پھانسی دی دی گئی۔ اس تاریخی واقعہ کے بعد ایک سو سال کے اندر تصوف پر بعض مستقل کتابیں لکھی گئیں، جن میں ابونصر سراج[2] کی تصنیف "کتاب اللمع" ابوطالب مکی کی "قوت القلوب" القشیری کا الرسالہ اور حضرت داتا گنج بخش[3] کی کشف المحجوب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانے میں شیخ ابوسعید بن ابی الخیر اور ابوالحسن خرقانی ہوئے۔ جن سے شاہ ولی اللہ تصوف کے تیسرے دور کی ابتدا کرتے ہیں شیخ ابوسعید ۳۵۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۴۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔

اس سلسلے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں :- سلطان الطریقت شیخ ابوسعید بن ابی الخیر اور شیخ ابوالحسن خرقانی کے زمانے میں طریق تصوف میں ایک اور تغیر رونما ہوا۔ اس دور میں اہل کمال میں سے

۱ھ "توجہ سے یہاں مراد نفس کا پوری طرح حقیقت الحقائق یعنی ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہونا ہے اور اس طرح کہ نفس اللہ کے رنگ میں کلیتہً رنگا جائے اور وہ دنیا کی عارضی اور فانی چیزوں پر پوری طرح غالب آجائے (ہمعات)

۲ھ آپ طوس کے رہنے والے تھے ۳۷۸ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔

۳ھ سن وفات ۴۶۵ھ

عوام تو حسب سابق شرعی اوامر و اعمال پر ٹھیرے رہے اور خواص نے باطنی احوال و کیفیات کو اپنا نصب العین بنایا اور جو خواص الخواص تھے، انہوں نے اعمال و احوال سے گزر کر "جذب" تک رسائی حاصل کی۔ اس "جذب" کی وجہ سے ان کے سامنے "توجہ" کی نسبت کا راستہ کھل گیا۔ اس سے تعینات کے سب پردے ان کے لئے چاک ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات ہے جس پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے وہی ذات سب اشیاء کی قیوم ہے۔ یہ لوگ اس ذات میں گم ہو گئے اور اس کے رنگ میں ان کے نفوس رنگے گئے چنانچہ اس حال میں نہ ان کو اوراد و وظائف کی چنداں ضرورت رہی اور نہ مجاہدے اور ریاضتیں کرے اور نفس اور دنیا کے فریبوں کو جاننے کی سدھ بدھ رہی۔ ان کی تمام کوشش کا مقصد یہ ٹھیرا کہ جس طرح بھی ہو "توجہ" کی نسبت کی تکمیل کریں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں :- اس عہد میں توحیدِ وجودی اور توحید شہودی میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ درحقیقت ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذات الٰہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذت اندوز ہوں۔ چنانچہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے کہ کائنات کا وجودِ الٰہی سے کیا علاقہ ہے ؟ انسان خدا کی ذات میں کیسے گم ہوتا ہے ؟ اور فنا و بقا کے کیا حقائق ہیں ؟"

جس زمانے میں شیخ ابو سعید کا انتقال ہوتا ہے، کم و بیش یہ وہی زمانہ ہے، جس میں امام غزالی[1]

---

[1] امام غزالی ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام محمد بن محمد بن احمد ہے آپ کا فقہ، کلام، اصول اور منطق میں بہت بڑا مقام تھا، اور اس کے ساتھ حکمت و فلسفہ پر بھی آپ کو بڑا عبور تھا۔ لیکن آخر میں آپ نے تصوف کی راہ اختیار کی اور اس کے تحت دین اور عقل کو ہم آہنگ کیا۔ بقول مولانا شبلی "آج تمام دنیا میں الٰہیات، نبوت اور معاد کے متعلق مسلمانوں کے جو معتقدات و مسلمات ہیں، وہی ہیں، جو امام صاحب کے مقرر کردہ ہیں۔ جس قدر مشہور تصنیفات ہیں، امام صاحب کے ہی عقائد کے گویا شروح و حاشیے ہیں۔ حضرات صوفیہ اور علمائے اسلام سرتاپا اسی الٰہیات کے پیرو ہیں جس کو امام غزالی نے اسرار شریعت سے تعبیر کیا ہے، اور جس کی نسبت ان کو نہایت اصرار ہے کہ عام نہ ہونے پائے۔ حضرات صوفیہ اور فلاسفۂ اسلام کے سرگروہ مولانا روم، شیخ الاشراق، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب ہیں، ان بزرگوں کی تصنیفات درحقیقت امام صاحب ہی کے (باقی صفحہ ۶۳ پر)

پیدا ہوتے ہیں، تصوف کی تاریخ میں امام غزالی کا شمار گروہ صوفیہ میں سے نہیں ہوتا، بے شک وہ عالم دین اور متکلم پہلے تھے۔ اور صوفی بعد میں، لیکن تصوف کے سلسلے میں ان کی خدمات یہ ہیں کہ اہل دین جو تصوف کی آزاد خیالی اور آزادوش روی سے بیزار ہو رہے تھے، اور تصوف جو شرعی قیود سے آزاد ہوتا جا رہا تھا آپ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا۔ عقل جو اسلام میں تحریک معتزلہ کے نام سے مذہبی حقائق کی شارح بن کر نکلی تھی، ادہر ادہر بھٹک کر آخرکار امام غزالی کی شخصیت میں تصوف کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرتی ہے۔ اور اس طرح امام غزالی کی کوششوں سے ہمارا تصوف مذہب کی مسلمہ روایات سے ہمنوا ہوتا ہے۔ امام غزالی کا انتقال ۵۰۵ھ میں ہوا۔

حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی جن سے تصوف کا مشہور و معروف طریقہ قادریہ چلا، امام غزالی سے تقریباً ۵۵ سال بعد فوت ہوئے، ان کی تاریخ وفات ۵۶۱ھ/۱۱۶۶ء ہے۔ طریقہ سہروردی کے موسس شیخ شہاب الدین سہروردی متوفی ۶۳۲ھ کے چچا اور ان کے مرشد شیخ ابو نجیب عبدالقاہر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے معاصر تھے۔ اور انہوں نے امام غزالی کے بھائی احمد غزالی سے اکتساب فیض کیا تھا۔ غرض امام غزالی ہی کے بعد تصوف کے مشہور خانوادے وجود میں آئے، جن کا سلسلۂ فیض اب تک جاری ہے۔

امام غزالی نے ۵۰۵ھ میں وفات پائی ان کے تقریباً پچاس برس بعد علم تصوف کے مشہور و معروف مصنف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی پیدا ہوئے۔ ان سے شاہ صاحب تصوف کے چوتھے دور کا آغاز کرتے ہیں، اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

"آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہل کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائق کی بحث و تدقیق کرتے ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی

(بقیہ حاشیہ) خیالات کا نمونہ ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ علامہ صدرالدین شیرازی باوجود اختلاف مذہب کے، الہیات میں امام غزالی کے خوشہ چین ہیں اور سند کے طور پر امام صاحب کی عبارت کے صفحے کے صفحے نقل کرتے جاتے ہیں (الغزالی)

ان بزرگوں نے ظہورِ وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کئے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کسی چیز کا صدور ہوا۔ اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا۔ غرض یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوعِ بحث بن گئے۔

ابن عربی نے تو ان حقائق کو علم و حکمت کی مغلق زبان میں پیش کیا۔ ان کے بعد عطار، رومی، جامی اور دوسرے شعراء شعر کے دل کش، وجد آور اور زود اثر پیرائے میں ان حقائق کو ادا فرمایا۔ اور اس طرح تصوف کے معارف خواص سے عوام تک پہنچے اور ہر شخص تصوف کا کلمہ پڑھنے لگا۔ ابن عربی مسلمانوں میں عقیدہ وحدۃ الوجود کے سب سے سرگرم مبلغ تھے، اور انہوں ہی نے اس عقیدے کو علمی طور پر تصوف کا اساس بنایا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی وفات ۶۳۶ ء میں ہوئی۔ اگرچہ شروع سے ان کی شخصیت اہل تصوف اور اہل شرع کے ہاں ما بہ النزاع رہی ہے، اور امام ابن تیمیہ اور بعض دوسرے بزرگوں نے ان کی تکفیر کی ہے، لیکن اس کے باوجود "شیخ ابن عربی کے کمال پر اساطین امت کی شہادت" ہے۔ مثال کے طور سے شیخ مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس کہتے تھے۔ ہم کو قوم میں سے کسی کے متعلق یہ روایت نہیں پہنچی کہ کوئی شخص کبھی علم شریعت و حقیقت میں اس درجہ کو پہنچا ہو، جس درجہ کو شیخ محی الدین پہنچے ہیں۔ اور وہ شیخ کے غایت درجہ کے معتقد تھے۔ اور جو شخص شیخ پر نکیر رکھتا تھا، وہ اس پر نکیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیشہ سے لوگ شیخ کے ساتھ عقیدت رکھتے پر اور ان مولفات کو آب زر

---

۱ سر احمد حسین "فلسفہ فقرا" میں لکھتے ہیں:۔ ابن عربی نے علم کے ذریعہ حقیقت کی گتھی کو سلجھانا چاہا تھا چونکہ علم کثرت کو ہمیشہ وحدت کے ذیل میں جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے قدرتی طور پر ابن عربی اس نتیجے پر پہنچے کہ مظاہر کی بوقلمونی ایک ہی وجود کا حاصل ہے اور ان سب کی اصل ایک ہی وجود ہے۔ یہی ہے ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا تصورِ توحید۔

---

۲ ابن عربی از مولانا اشرف علی تھانوی

سے بچنے پر غایت درجہ متوجہ رہے، ان کی حیات میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی۔ اور اسی سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ جس امر کا میں قائل ہوں اور اس کو محقق سمجھتا ہوں، اور اس کے موافق اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ شیخ محی الدین، شیخ طریقہ تھے، حالاً بھی اور علماً بھی اور امام اہل تحقیق تھے، حقیقتاً بھی اور ظاہراً بھی اور علوم عارفین کے احیاء کرنے والے تھے فعلاً اور لفظاً بھی، اسی طرح کا بہت طویل مضمون فرمایا اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ حاصل کلام یہ ہے کہ شیخ پر بعض ایسے فقہاء خشک نے نکیر کیا ہے جن کو محققین کے مشرب سے کچھ بہرہ نہ تھا، باقی جمہور علماء اور صوفیاء نے تو اس کا اقرار کیا ہے کہ وہ اہل تحقیق و توحید کے امام ہیں اور علوم ظاہرہ میں یکتا و یگانہ ہیں۔[۱]

اور منجملہ ان کے ثنا خوانوں کے شیخ قطب الدین شیرازی ہیں اور وہ کہا کرتے تھے۔ شیخ محی الدین علوم شریعت و حقیقت میں کامل تھے، اور ان کی شان میں وہی شخص جرح و قدح کرتا ہے، جو ان کے کلام کو نہیں سمجھتا اور اسی لئے، اس کی تصدیق نہیں کرتا (مگر یہ ان کے کمال میں قادح نہیں) جیسا حضرات ابنیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہ لانے والوں کی زبان سے ان کو جنوں و سحر کی طرف منسوب کیا جانا ان حضرات کے کمال میں قادح نہیں۔"[۲]

اسی طرح شیخ مؤید الدین جندی فرماتے تھے کہ ہم نے کسی شخص کو اہل طریق میں سے نہیں سنا کہ وہ ان علوم پر مطلع ہوا ہو، جن پر شیخ محی الدین مطلع ہوئے ہیں اور اسی طرح شہاب الدین سہروردی فرماتے تھے...... اور اسی طرح شیخ کمال الدین کاشی فرماتے تھے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ شیخ محی الدین کامل محقق صاحب کمالات و کرامات ہیں ...... اور شیخ فخر الدین رازی نے بھی ان کی ثنا کی ہے اور کہا ہے کہ شیخ محی الدین ولی عظیم تھے..."[۳]

غرض تاریخ تصوف میں شیخ محی الدین ابن عربی کا بہت بلند مقام ہے، اور ان کے افکار نے تصوف و معرفت کی دنیا میں شاید سب سے گہرے اور سب سے وسیع تر اثرات چھوڑے ہیں، چنانچہ مولانا

۱۔ ابن عربی از مولانا اشرف علی تھانوی؟
۲۔ " " " " "
۳۔ " " " " "

اشرف علی تھانویؒ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں :- ..." میرا مسلک حضرت شیخ قدس اللہ سرہ کے باب میں یہ ہے کہ بنا بر شہادتِ جم غفیر اکابر امت کے جس کی حجیت حدیث انتم شہداء اللہ فی الارض سے ثابت ہے، شیخ کی مقبولیت اور ولایت کا عقیدہ کامل رکھتا ہوں ...." [1] نیز "... اپنے بزرگوں کو چونکہ مثل دیگر ائمہ طریق کے ان کا معتقد پایا، ان کی عقیدت و عظمت ہمیشہ قلب میں مرکوز رہی ......" [2]

تصوف کے ارتقاء کے یہ چار دور ہیں، "ہمعات" میں ان کا ذکر کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں۔

" تصوف کے ان چاروں دوروں میں جو بھی اہل کمال بزرگ گزرے ہیں، گو وہ اپنے ظاہری اعمال و احوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں، لیکن جہاں تک ان کی اصل کا تعلق ہے، میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں۔ ..... تصوف کے یہ چاروں طریقے خدا تعالےٰ کے نزدیک مقبول ہیں اور ملاء اعلیٰ میں بھی ان سب کی منزلت مسلم ہے۔ ارباب تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔"

---

[1] ابن عربی از مولانا اشرف علی تھانوی

[2] " " " " "

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعض عمرانی اصطلاحات

عبدالوحید صدیقی

(شاہ ولی اللہ کے استقرائی وسائنٹفک عمرانی مباحث پر ایک مقدمہ بعنوان "نظریۂ ارتقائے معاشرہ" مئی کے "الرحیم" میں شائع ہو چکا ہے اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دعویٰ کے دلائل سے بحث کی جائے۔ اس سلسلے میں یہ پہلا مقالہ ہے)

سائنسی انداز تحقیق میں وضع اصطلاحات اور ان اصطلاحات کے معنی کے تعین و تعریف بنیادی اہمیت کی حامل ہے اس کے بغیر محقق اپنی نئی تحقیقات کو دوسروں تک منتقل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور امریکی ماہر عمرانیات برنارڈ نے سائنس کی بنیادی چھ خصوصیات میں وضع و تعریفِ اصطلاحات بھی شامل کیا ہے [1]

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی اپنی عمرانی تحقیق کو کچھ اصطلاحات کے ذریعہ سے واضح کیا ہے۔ یہ اصطلاحات بعض اوقات آپ نے خود وضع کئے ہیں اور خود ہی ان کے مفہوم کو متعین کیا ہے۔ بعض اوقات پہلے سے مروجہ اصطلاحات کو ان کے متعارف مفہوم میں لے لیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ان مروجہ اصطلاحات کو اپنا خاص مفہوم اور معنیٰ بھی دیا ہے۔ اصطلاحات کی یہ وضع و تعریف عمرانیات کے علاوہ شاہ صاحب نے الٰہیات، نفسیات اور ہر اس علم و فن میں کی ہے جس پر آپ نے تحقیق فرمائی ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الرحیم" مارچ سنہ ۶۴ء (شاہ ولی اللہ کی اصطلاحات)

نظریہ ارتقائے معاشرہ اور عمرانیات کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی تین بنیادی اصطلاحات

---

[1] برنارڈ، دی فیلڈس اینڈ میتھڈس آف سوشیولوجی۔ نیویارک ۱۹۳۴ - صہ ۲۴۳-۲۴۴

کی تشریحات حسبِ ذیل ہیں -

۱۔ الارتفاق لفظ ارتفاق کا بنیادی مادہ "رِفق" بالکسر ہے[۱] لغت میں اس کے کئی معنی آتے ہیں جو ایک دوسرے سے قریب اور بعض مترادف ہیں - نرمی، سہولت، رحم اعانت، نزاکت، نفع رسانی[۲] نرم برتاؤ، مہربانی کا سلوک اور وہ چیز جس سے مدد لی جائے - اس کے مشہور معانی ہیں - اَمْرٌ رَفِقُ البغیۃ[۳] ایک ایسے کام کو کہتے ہیں جو آسانی سے حاصل ہوتا ہے - اس لفظ سے المرفِقُ ہے اور اس کے معنی ہیں وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے - مَرَافِقُ الدَّارِ گھر کے منافع یعنی لوازمات خانہ جیسے کنواں، باورچیخانہ، پائخانہ وغیرہ کو کہتے ہیں - اسی طرح سے اہل ملک کی نفع اندوزی کی چیزوں کو مرافقُ البلادِ کہا جاتا ہے[۴]

لغات القرآن میں پرویز صاحب نے ابن الفارس کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور تشدد کے بغیر ایک دوسرے کے قریب اور ہمنوا ہونے اور باہم موافقت کرنے کے ہیں[۵]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ نرمی اور رحم کے معنی میں استعمال کیا ہے آپ فرماتے ہیں -

مَنْ رَفَقَ بِاُمَّتِی رَفَقَ اللّٰہُ بِہٖ

"جو میری امت کے ساتھ نرمی اور رحم کا برتاؤ کرے گا، اس کے ساتھ اللہ نرمی کا برتاؤ کرے گا"

یہی لفظ جب باب افتعال میں آتا ہے تو مندرجہ ذیل معانی میں استعمال ہوتا ہے -

۱- کسی جگہ یا چیز کو ٹیک دینا - مُرْتَفَقٌ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر ٹیک لگائی جائے، تکیہ

۱۔ تاج العروس - الجزء السادس

۲۔ لینیز عربک انگلش لیکسیکن - بوک I - پارٹ III لندن ۱۸۶۷ء

رَفُقَ = "He was, or became, gentle, soft, tender, gracious, courteous, or civil"

۳۔ المنجد

۴۔ المنجد

۵۔ غلام احمد پرویز، لغات القرآن (ر ف ق) - ادارہ طلوع اسلام - لاہور

اور سہارے کے لئے بھی یہی لفظ مستعمل ہوتا ہے[۱] چونکہ اس طرح ٹیک لگانے سے راحت ملتی ہے اس لئے ارتفق بہ کے معنی ہیں "اس سے نفع اٹھایا"[۲]

قرآن مجید میں یہ لفظ ٹھکانے اور ٹیک لگانے کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے جہنم کو سَاءَتْ مُرْتَفَقًا (برا ٹھکانہ) اور جنت کو حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (اچھا ٹھکانہ) کہا گیا ہے[۳]

۲۔ بھرا ہونا[۴] ابن الابرص کا مندرجہ ذیل شعر اس معنی پر دلالت کرتا ہے۔

فَأَصْبَحَ الرَّوْضُ وَالْقِيعَانُ مُمْرِعَةً
مِنْ بَيْنِ مُرْتَفِقٍ مِنْهَا وَمُنْصَاحٍ[۵]

"چراگاہ اور میدان گھاس اور ہریالی سے اٹ گئے۔ کچھ اس پانی کی وجہ سے جو وہاں بھر گیا تھا اور کچھ اس کی وجہ سے جو اوپر سے بہہ رہا تھا۔"

اسی طرح سے برتن کے بھر جانے کو اِرْتَفَقَ الْإِنَاءُ کہتے ہیں[۶]

۳۔ بھر جانے کے قریب ہو جانا[۷]

۴۔ کھڑا رہنا[۸]

۵۔ جاری رہنا[۹]

۶۔ مدد چاہنا[۱۰]

اگر باب افتعال کی خصوصیات کو لفظ ارتفاق میں جاری کیا جائے تو اس کے کئی معانی ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اہم معانی سے یہاں پر بحث کی جاتی ہے۔

۱۔ محیط الدائرۃ

۲۔ تاج العروس

۳۔ سورۃ ۱۸۔ آیت ۲۹-۳۱

۴۔ المنجد

۵۔ لینز عربک انگلش لیکسیکن

۶۔ المنجد [۷] عربک انگلش لیکسیکن [۸] اور [۹] القاموس [۱۰] المنجد

۱- باب افتعال کی ایک خصوصیت "اتخاذ" ہے اتخاذ کا مطلب ہے فاعل کا کسی چیز کو اپنے واسطے بنالینا۔ ؎۱ اسی کو انگریزی زبان میں ایڈاپشن کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اِمتطٰی۔ اس نے سواری بنائی۔ اِشتوٰی۔ اس نے کباب بنائے۔

اس خصوصیت کے جاری کرنے کی صورت میں لفظ ارتفاق کے معنی ہوں گے۔

"اپنے لئے سہولت اور آسانی کو بہم پہنچانا"

شاہ ولی اللہ دہلوی نے عموماً اسی خصوصیت کے مدنظر لفظ ارتفاق کو ایک خاص اصطلاحی معنی پہنائے ہیں جیساکہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا۔

۲- باب افتعال کی ایک اور خصوصیت "تصرف" ؎۲ کو اگر لفظ "ارتفاق" میں جاری کیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا۔

"سہولت کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا"

۳- بعض اوقات باب افتعال میں اشتراک کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ بقول میر سید شریف

وشاید کہ بین اثنین باشد بمعنی تفاعل

چوں اِخْتَصَمَ زَیدٌ وَعَمْرٌو ؎۳

اس معنی کے جاری کرنے کی صورت میں ارتفاق کے معنی "ایک دوسرے کی مدد کرنا" یا "ایک دوسرے کو سہولت پہنچانا" بھی لے سکتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس لفظ کو پہلی بار ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ عام طور پر صلہ اِرتَفَقَ بِہٖ میں استعمال کرتے ہوئے شاہ صاحب نے اس سے مراد لی ہے۔ "انسانی ضرورتوں کو آسان طریقوں سے پورا کرنا" حجۃ اللہ البالغہ میں آپ فرماتے ہیں۔

وکان من عنایۃ اللہ بہ ان الھمہ کیف یرتفق بانواع ھذہ الحاجات

؎۱ محمد بن یوسف سورتی، علم صرف۔ علی گڑھ ۱۹۲۴ء ص۲۷۹ ص ۲۷۸

؎۲ " " " " " "

؎۳ صرف میر- کتب خانہ رشیدیہ دہلی ۱۹۵۲ء ص۴۵ - نیز علم صرف علی گڑھ ص۲۷۹

الهاماً طبعیاً من مقتضی صورته النوعیة الخ۔ [1]

یعنی ـــ

اللہ تعالیٰ کی انسان پر ایک یہ عنایت بھی ہوئی کہ اسے اس کی صورتِ نوعی کے تقاضے کے مطابق طبعی الہام کے ذریعے سے اپنی گوناگوں ضروریات کو آسانی سے پورا کرنے کے طریقوں سے نفع اندوز ہونا سکھایا۔

حضرت شاہ صاحب کے الفاظ ہیں :-

"ہر نوع کو اپنے نوعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے طبیعی الہامات سے نوازا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں نوع انسان کو اپنی ضرورتوں کی تحصیل اور اس میں مزید آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ "خصوصی الہامات" سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔ ان الہامات کا ظہور جن عملی پیرایوں میں ہوتا ہے، ان کا نام ارتفاقات ہے" [2]

ضروریات کو آسانی سے پورا کرنا ظاہر ہے کہ ایک جامد سلسلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک متحرک سلسلہ ہے اور آئے دن پرانے طریقوں اور سہولت کے فنی وسائل (Technical Means) کی اصلاح، ترقی اور ایجاد ہوتی رہتی ہے۔ پھر یہ سہولت کے لئے فنی وسائل کی ترقی کا سلسلہ انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کرتا رہتا ہے اور اس طرح سے دوسرے شعبے بھی ترقی پذیر رہتے ہیں۔ اس پورے سلسلے کا نام "ارتفاق" ہے۔ مثال کے طور پر "غذا" انسان کی بنیادی مادی ضرورت ہے اس ضرورت میں وہ اور دوسرے حیوان مشترک ہیں۔ غذا کی تلاش، جستجو اور اس کے لئے جدوجہد کرنا ایک طبعی امر ہے جسے خالق نے تمام حیوانات اور انسان کی جبلت میں ودیعت فرمایا ہے اور اس کو شاہ صاحب "الہام طبعی" کہتے ہیں۔ غذا اور دوسری حاجتوں کے حصول کے لئے یہ "الہام طبعی" صرف انسان کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام حیوانات کو ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں

---

[1] القسم الاول - المبحث الثالث - الباب الاول

[2] الرحیم - مئی ۱۹۶۴ء ص ۱۷ حاشیہ ۱

کما الھم النحل کیف تاکل الثمرات الخ "جیسا کہ (اللہ تعالیٰ نے) شہد کی مکھی کو الہام کیا کہ وہ کس طرح سے میوے کھائے "۔

اسی الہام کو نفسیات میں جبلت (Instinct) کہا جاتا ہے۔

اسی الہام طبعی یا جبلی تقاضے کے مطابق انسان ابتداء میں بیوں اور بندروں کی طرح قدرتی خودرو پھل پھول اور بھیڑیوں اور شیروں کی طرح دوسرے جانوروں کے گوشت کو غذا بناتا رہا۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہا تب تک انسان میں اور دوسرے شیرخوار حیوانوں میں کوئی بالفعل فرق نہ تھا۔ انسان اگر انسان تھا بھی تو بالقوۃ ۔ وہ اپنی خصوصیات اور فصول کو قوۃ سے فعلیت میں لانے کی تگ ودو میں مصروف تھا حتی کہ اس نے اپنی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے زراعت کا نیا اور زیادہ آسان طریقہ اور اس سے متعلق فنون دریافت کیئے تو یہ اس کے پورے نظام زندگی میں تبدیلی اور ترقی کا باعث بنا۔ پہلے وہ "شکاری حیوان" تھا اور اب وہ "متمدن شہری"۔ اس نئے اور شاہ صاحب کی نظر میں پہلے آسان فنی طریقے کا نام "ارتفاق اول" ہے البدور البازغہ میں فرماتے ہیں۔

من عنایتہ الرحمن بنوع الانسان ان اودع فیھم دواعی الاکل والشرب کی یتقوم بھما ابدانھم...... لا یزاحمہ فیھا احد۔

" انسانوں کے متعلق خداوند رحمان کی ایک عنایت یہ ہے کہ ان میں کھانے اور پینے کی ضروریات رکھیں تاکہ وہ اپنے جسم کو بنا سکے ۔ پھر جنسی ضرورت بھی رکھی تاکہ اپنی نسل کو ایک خاص مدت تک باقی رکھ سکے ۔ نیز یہ کہ انہیں رہنے سہنے اور گرمی سردی سے بچنے کے لئے مکن کے حاصل کرنے کا الہام کیا۔ تمام انسان اپنے ابناء الجنس (حیوانی جنس کے دوسرے انواع) سے اس معاملہ میں مشترک ہیں۔ لیکن اپنے نوعی تقاضے کے مطابق وہ ایک مخصوص انداز سے ان جبلی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے یہ ارتفاق اول ہے جیسے زراعت، دوسروں سے مدد مانگنا، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بات کرنا اور ایک ایسی بیوی کا تعین کرنا جس میں کوئی دوسرا مزاحمت نہ کرے "

مختلف اور گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چونکہ یہ سب ابتدائی طریقے ہیں اس لئے شاہ صاحب انہیں "ارتفاقِ اول" کہتے ہیں ۔ اس میں زراعت کو مقدم کرنے کا اشارہ اس طرف ہو سکتا ہے کہ "غذا" سب سے اہم ضرورت ہے اور سب سے پہلے اس کے حصول کے لئے زیادہ سے

زیادہ آسان طریقے دریافت کئے جاتے ہیں۔

ارتقائے معاشرہ کی تاریخ میں اس قسم کے چار مختلف ادوار آتے ہیں جن میں سے ہر نیا دور پرانے دور کے آسان فنی طریقوں یا ٹکنولوجی میں کسی بنیادی تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ یہ تبدیلی ایک ایسے نظام پر منتج ہوتی ہے جو پہلوؤں سے بہتر اور ترقی پذیر ہوتا ہے ان چاروں ادوار کو شاہ صاحب "الارتفاقات الاربعۃ" کہتے ہیں۔ ان کی تشریح درجہ بندی (classification) کے ماتحت کی جائے گی۔

ارتفاق البھائم

ارتفاق البھائم ایک اور اصطلاح ہے جو شاہ صاحب نے وضع کی ہے۔ اس سے وہ آسان طریقے مراد لئے گئے ہیں جنہیں حیوانات نے اپنی جبلی تقاضے کے مطابق اپنی غذا مسکن اور جنسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔ مثلاً شہد کی مکھی کا پھولوں کا رس چوسنا اور چھتہ بنانا۔ "ارتفاق البھائم" ہے۔

شاہ ولی اللہ کی نظر میں انسانی ارتفاقات کی بنیاد ہی ارتفاق البھائم یا حیوانی ارتفاق ہے۔ البدور البازغۃ میں فرماتے ہیں۔

الارتفاق الاول مبنی علی ارتفاق البھائم فزاد علیہ بصفاء واتصال و لطافۃ وظرافۃ کمثل ابناء المعادن علی المواليد۔ واعلم ان الارتفاق الاول مندرج تحت ارتفاق البھائم والفرق بینھما فرق اجمال و تفصیل۔

ارتفاق اول دراصل ارتفاق حیوانی پر مبنی ہے جس میں صفائی، اتصال، لطافت اور آراستگی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف معدنیات کہ ان کی بنیاد دراصل ذرات پر ہے۔ اور جان لے کہ ارتفاقِ اول، ارتفاقِ حیوانی ہی کے ذیل میں آتا ہے۔ ان دونوں میں فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے۔

الارتفاقات الضروریۃ

ارتفاقاتِ ضروریہ ان ضروریاتِ زندگی کے آسان طریقوں سے حصول کو کہتے ہیں جو دنیا کے تمام انسانوں کو لاحق ہوتی ہیں اور جن کا دارومدار ارتفاق البھائم پر ہے لیکن جو چیز، بس یوں ہی محض تعیش

کے لئے حاصل کی جائیں وہ غیر ضروری ہیں

ارتفاقات ضروریہ کی ترقی، تمدن، تہذیب اور انسانیت کی ترقی ہے اور غیر ضروری چیزوں میں زیادہ بڑھنے کا نتیجہ تہذیب و تمدن کے تنزل اور معاشرہ کے فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ارتفاقات ضروریہ کی تشریح شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

وکذلک من مفاسد المدن ان ترغب عظماء ھم فی دقائق الحلی واللباس والبناء والمطاعم وغید النساء ونحو ذلک زیادۃ علی ما تعطیہ الارتفاقات الضروریۃ التی لابد للناس منھا واجتمع علیھا عربھم وعجمھم۔ الخ

شہروں کی بربادی کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں کے بڑے لوگ عمدہ زیورات نفیس لباس، شاندار عمارات لذیذ طعام عورتوں کے حسن وغیرہ کے پیچھے پڑ جائیں اس طرح ان ارتفاقات ضروریہ سے بڑھ جائیں جو انسان کے لئے ضروری ہیں اور جن پر عرب اور عجم مشترک ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگرچہ تمام عالموں نے فقہ کو لب لباب علوم دین کا سمجھا ہے، مگر ان کے نزدیک علم اسرار دین ہی سب کا سرتاج ہے۔ پھر وہ تسمیہ بیان کرتے ہیں کہ یہی علم اس لائق ہے کہ بعد ادائے فرائض کے آدمی اسی علم میں اپنے تمام اوقات عزیز صرف کرے اور ذخیرۂ آخرت لے جاوے۔

شاہ صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب کہ اس قسم کے مطالب پر لوگ غور کرتے آئے ہیں اور مسائل اور مطالب نکالتے رہے ہیں۔ تو اب علم اسرارِ دین پر گفتگو کرنا اور بحث کرنا خرق اجماع ہی نہیں رہا۔ میں کہتا ہوں کہ خرق اجماع کیسا اب اس پر بحث کرنا فرض عین ہو گیا ہے،

(سرسید احمد خاں)

تنقید و تبصرہ

شاہ محمد غوث گوالیاری

از پروفیسر محمد مسعود احمد ایم۔اے
صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج میرپور خاص (سندھ)

برصغیر پاک و ہند کے مشہور صوفی بزرگ شاہ محمد غوث گوالیاری کا بابر، ہمایوں اور اکبر اعظم کا زمانہ تھا۔ آپ ۹۰۶ھ/۱۵۰۱ء میں پیدا ہوئے اور ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء میں آپ کا انتقال ہوا، آپ نے اپنی تصنیف اوراد غوثیہ میں ۴۳ سال کی عمر تک کے اپنے حالات زندگی مختصراً یوں لکھے ہیں۔

"اس درویش نے سات سال کی عمر میں راہ طریقت میں قدم رکھا۔ نو سال کا تھا تو معرفت حاصل ہوئی۔ پندرہ سال کی عمر میں رہنمائی کر رہا تھا۔ بائیس سال کی عمر میں معراج ہوئی۔ پچیس سال کی عمر میں طالبان طریقت کو ہم آہنگ بنا رہا تھا۔ تینتیس سال کی عمر میں تو مرجع خاص و عام ہو گیا تھا اور مقتدی و پیشوا بن گیا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں بادشاہوں سے کچھ اختلاف کی صورت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ سفر اختیار کیا اور ملک گجرات پہنچا۔ یہ اوراد (غوثیہ) قلعہ جاپانیر میں لکھے گئے ..... ان اوراد کو لکھتے وقت اس درویش کی عمر تینتالیس سال تھی۔"

زیر نظر کتاب میں فاضل مصنف نے بڑی تحقیق و تفصیل سے شاہ محمد غوث گوالیاری کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی "اولاد امجاد"، آپ کی "تصانیف" اور آپ کے "خلفائے کبار" کے حالات بھی اس کتاب میں آ گئے ہیں۔ آخر میں "اشاریہ" اور "کتابیات" ہے غرض اس موضوع پر ایک جامع کتاب ہے، اور مصنف نے ہر لحاظ سے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

بابر بادشاہ کی فوج کا گوالیار کے قلعہ پر شاہ محمد غوث کی مدد سے قبضہ ہوا اور اس طرح

شاہان مغلیہ کے ساتھ آپ کے اور آپ کے خانوادہ کے تعلقات کا سلسلہ قائم ہوا۔ شیر شاہ کے خلاف آپ نے ہمایوں کا ساتھ دیا، اور جب شیر شاہ بادشاہ بنا، تو آپ گوالیار سے گجرات چلے گئے، اکبر اعظم کے برسر اقتدار آنے پر آپ آگرہ تشریف لائے، اور آپ کے انتقال کے بعد اکبر نے ۱۰۰۸ھ ۱۵۹۹ء میں آپ کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ بنایا۔ بابر نے اپنی تزک میں آپ کا ذکر کیا ہے، ہمایوں بھی آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اور آپ سے اس کی خط و کتابت تھی۔ جہانگیر آپ کے خلیفہ شیخ وجیہہ الدین کے روضے کی زیارت کے بعد لکھتا ہے۔

"شیخ وجیہہ الدین، شیخ محمد غوث کے ایسے بلند مرتبہ خلیفہ تھے، جن پر خود مرشد کو فخر ہوتا ہے۔ شیخ محمد غوث سے شیخ وجیہہ الدین کی ارادت و عقیدت سے، خود شیخ محمد غوث کے بزرگ و برتر مرتبے کا پتہ چلتا ہے"

شاہان ہند سے ان تعلقات کے ساتھ ساتھ عوام و خواص میں بھی آپ کی بڑی مقبولیت تھی، عبدالقادر بدایونی آپ کے بارے میں اپنا ایک چشم دید واقعہ یوں بیان کرتا ہے۔

"۹۶۶ھ میں فقیر نے آگرے کے بازار میں دور سے (شیخ محمد غوث) کو دیکھا تھا (گھوڑے پر سوار تشریف لے جارہے تھے اور چاروں طرف لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ وہاں سے کسی کا گزرنا محال تھا۔۔۔۔ سنہ مذکور میں آپ گجرات سے آگرے تشریف لائے تھے۔"

صاحب طریقت کے ساتھ ساتھ شاہ محمد غوث صاحب تصانیف بزرگ بھی تھے۔ گلزار ابرار میں آپ کی ان آٹھ کتابوں کا ذکر ہے۔ (۱) جواہر خمسہ (۲) اوراد غوثیہ (۳) ضمائر (۴) بصائر (۵) بحر الحیات (۶) کلید مخزن (۷) کنز الوحدۃ بحر الحیات سنسکرت کی کتاب امرت کنڈ کا ترجمہ ہے، اس کے متعلق گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی ۱۰۲۲ھ ۱۶۱۳ء لکھتے ہیں:۔

"جریدۂ دستور العمل طائفہ جوگی و سنیاسی کا ترجمہ۔ اس میں باطنی اعمال، تصوری اشغال، پاس انفاس کا ذکر نیز ان امور کے سوا اور بھی اقسام ریاضت بیان کئے گئے ہیں، جن کی بدولت روحی لشکر کو جسمانی سپاہ پر فتح ملتی ہے، جوگیوں اور سنیاسیوں کی دو جماعتیں ہنود کے ریاضت مند (ان) گوشہ نشینوں اور رہبانوں کی سرگروہ ہیں اور انہیں اشغال و اذکار کی برکات سے استدراج اور خرق عادات کے درجہ کو پہنچ کر سائلوں کے ضمیروں کی چیستاں پر اطلاع حاصل کرتی ہیں۔ آپ نے

ان تمام معانی کو سنسکرت عبارت سے جو کتب ہنود کی زبان ہے، اخذ کر کے فارسی لباس پہنایا ہے۔ اس کتاب کے مفہومات سے زنار توڑ کر بجائے اس کے توحید اور اسلام کی تسبیح گردن میں ڈال دی ہے۔ نیز حقیقی ایمان کی قوت سے ان مفہومات کو تقلید کی قید سے نکال کر صاحب تحقیق صوفیوں کے اذکار و اشغال سے تطبیق دی ہے۔"

یوں بھی شاہ محمد غوث صلح کل مشرب رکھتے ہیں۔ عبدالقادر بدایونی آپ کے اس مسلک کے متعلق لکھتا ہے "جس کسی کو بھی دیکھتے یہاں تک کہ کفار کے لئے بھی تعظیماً کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے بعض ہندویا کچھ ان پر ملامت کرتے تھے اور ان کی ولایت کے منکر ہو گئے تھے۔ والغیب عنداللہ ... معلوم نہیں آپ کی کیا نیت ہو گی۔"

پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے اس کتاب پر بڑی محنت کی ہے اور حتی الوسع شاہ محمد غوث گوالیاری کے سوانح حیات کا کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا، جس کے متعلق پوری تحقیق نہ کی ہو۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، اور اسے بڑے اہتمام سے نفیس کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ ضخامت دو سو صفحے سے کچھ زیادہ ہے۔ قیمت مجلد ۶/۵۰ روپے۔

اگرچہ صاحب موصوف نے "سر آغاز" میں بعض مشہور صوفیائے کرام کا ذکر کیا ہے لیکن ضرورت تھی کہ سلسلۂ شطاریہ کا جس سے کہ شاہ محمد غوث منتسب تھے قدرے تفصیل سے ذکر ہوتا۔ اور اس سلسلہ کے جو خصوصی اذکار و اشغال ہیں، ان پر زیادہ روشنی ڈالی جاتی۔ ظاہر ہے اس پس منظر میں شاہ محمد غوث کی شخصیت کو سمجھنے میں مزید مدد مل سکتی تھی۔

دوسری تشنگی جو اس کتاب کو پڑھ کر محسوس ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جس تاریخی دور میں شاہ محمد غوث گزرے ہیں اس ضمن میں جن سیاسی حالات سے ان کو سابقہ پڑا، اس کے متعلق کتاب میں کچھ نہیں ملتا اور اس کی وجہ سے ان کی شخصیت خلا میں معلق سی نظر آتی ہے۔

ایک عرض اور ہے:- خود مصنف کو اعتراف ہے "شاہ محمد غوث کی رواداری اور وسعت قلبی کا یہ عالم تھا کہ مسلمان تو مسلمان ہندوؤں کے لئے تعظیماً کھڑے ہو جایا کرتے تھے اسی سلسلہ میں مصنف نے شیخ علی ہمدانی کی زبانی شیخ فضل عیاض کا یہ قول نقل کیا ہے

"الفتوۃ ان لا تمیز من یاکل عندک مومن او کافر صدیق او عدو"

لیکن مصنف شاہ محمد غوث کے صاحبزادے شاہ ضیاء اللہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابوالفضل کے کہنے سے اکبر نے چاہا کہ جہانگیر کو پیدا ہونے کے بعد "شاہ صاحب کی مجلس میں رکھا جائے تو خیر و برکت کا باعث ہوگا" اس پر وہ رنجیدہ ہوئے اس بارے میں مصنف لکھتے ہیں۔

"شاہ ضیاء اللہ کے کبیدہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، سوائے اس کے جہانگیر کی ماں چونکہ ہندو تھی اور شاہ صاحب نہیں چاہتے ہوں گے کہ ایک ہندو عورت ان کے مکان میں رہے، انہوں نے اس کو اپنی تذلیل خیال کیا"

ہوسکتا ہے کہ مصنف کی یہ توجیہ صحیح ہو، لیکن جس بزرگ کے والد شاہ محمد غوث راجہ ٹوڈرمل کے لئے تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے، وہ اکبر اعظم کی بیوی اور ولی عہد سلطنت کی ماں کو جو خیر و برکت کے حصول کی خاطر ان کے ہاں آرہی تھی، اپنے گھر رکھنا اپنی تذلیل خیال کریں، کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب مصنف کا یہ ارشاد گرامی ہے۔

"اور ایمان کا تقاضا بھی یہی تھا۔"

مصنف کا یہ افتاء ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

کتاب کے ملنے کا پتہ یہ ہے۔

پروفیسر محمد مسعود احمد چھوراہل لین، حیدرآباد سندھ۔ سید خطیر الدین شاہ قاسم آباد کالونی کراچی ۱۹

علاجِ خوف و حزن

تالیف ڈاکٹر میر ولی الدین۔ سابق پروفیسر و صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ ناشر مکتبہ دینیہ، دیوبند یوپی، ضخامت ۱۸۴ صفحے ڈبل کراؤن سائز، قیمت غیر مجلد ۳ روپے مجلد ۴ روپے

زیر نظر کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ خود فاضل مصنف کا لکھا ہوا ہے، اور اس میں غم و حزن و خوف کے جذبات کی نفسیاتی تحلیل کی گئی ہے اور ان کے رفع کرنے کے لئے روحانی و نفسیاتی طریقوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اور دوسرا حصہ ترجمہ ہے امام حافظ ابن ابی الدنیا کا عربی رسالہ الفرج بعد الشدۃ کا۔

امام حافظ ابن ابی الدنیا (۲۰۸ھ - ۲۸۰) نے جس زمانے میں یہ رسالہ لکھا موجودہ

زمانے کی طرح بڑا نازک تھا" یہ تیسری صدی ہجری کے وسط کا زمانہ ہے۔ سلطنت عباسیہ کا زوال سرعت سے جاری تھا۔ اہل ملک کی نا اتفاقیوں اور دشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے اس مملکت اسلامی کے اجزا الگ الگ ہو رہے تھے۔ ایک طرف خراسان میں بغاوت پھیل رہی تھی، تو دوسری طرف مصر اپنی آزادی کا جھنڈا بلند کر رہا تھا۔ جنوبی علاقوں پر زنجباری وحشیوں کے حملے شروع ہو گئے۔ روم کے بحری ڈاکو بحر روم کے ساحلوں پر چھاپے مار رہے تھے۔ قرامطہ کا گروہ ملک کے مختلف حصوں میں دہشت انگیزی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ان سب کے علاوہ آفاتِ سماوی کا نزول بھی تھا..."

جب ظاہری اسباب کے ذریعہ مصائب پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا ہے، اور دنیاوی وسائل حالاتِ گرد و پیش کے مقابلے میں مکمل شکست کھا جاتے ہیں، تو پھر انسان اپنے باطن اور اس مادی دنیا سے جو ماوراء روحانی قوتیں ہیں، ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان سے اپنی بگڑی بنانے کی استدعا کرتا ہے۔ اس سے نہ صرف اسے کامل ادبار و مایوسی کی اس فضا میں قلبی سکون ملتا ہے، بلکہ بارہا انابت الی اللہ سے اس کے دکھ درد دور ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو مطمئن محسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے کتاب کے شروع کے کوئی ۵۸ صفحوں میں خوف و حزن کے اسی قسم کے علاج بتائے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک تو ابتلاء انسان کی تقدیر ہے اور مصائب گناہ و بدکاری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دوسرے اس کائنات کا کارفرما سراپا حکمت و خیر ہے اور اس کی رضا پر راضی رہنا چاہیئے۔ وہ ابتلاء میں ڈال کر آپ کا بھلا ہی چاہتا ہے بقول فاضل مصنف کے "بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لئے ہی نہیں آتی بلکہ ارتفاع درجات اور بلوغ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے"۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ تمام مصیبتوں کی اصل جڑ خوف ہے، اور خوف کا علاج یہ ہے خود شناس بنو۔ عرفان نفس حاصل کرو۔ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ۔ اس عرفان کا آلہ محض عقل نظری نہیں، اس کے لئے اس عقل کی ضرورت ہے جو بقول اقبالؔ "ادب خوردہ دل ہے"۔ موصوف موصوف یہ بھی تلقین کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ رکھو" نہ صرف حق تعالے ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں اللہ معنا بلکہ ہماری زندگی میں منشائے الٰہی ہی کی تکمیل ہو رہی ہے"، اس سے بقول ان کے "تمہیں خوف و حزن سے کامل رستگاری حاصل ہو جائے گی"۔

آخر میں آپ نے رفعِ خوف وحزن کے لئے دعا کی اہمیت وافادیت بتائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"ہماری دعا قضا یعنی تقدیر کو بھی پلٹ سکتی ہے۔ لا یردّ القضاء الّا الدعاءُ۔ (رواہ الترمذی) اسی وجہ سے دعا سے بڑھ کر حق تعالےٰ کے ہاں کوئی چیز بزرگ تر نہیں۔ لیس شیٔ اکرمَ علی اللّٰہ من الدعا (رواہ الترمذی وحسنہ) بہرحال دعا مومن کا ہتھیار ہے اور کسی صورت میں کو اس کو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔۔۔۔"

حافظ ابن ابی الدنیا نے بھی جن کے رسالے کا ترجمہ زیرِ نظر کتاب میں شامل ہے، مصائب وآفات پر قابو پانے کی یہی راہ تجویز فرمائی ہے۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے ایسے آثار وروایات بیان کی ہیں، جن میں دعاؤں سے مصائب کے بادل چھٹ گئے، اور جہاں ہلاکت یقینی تھی وہاں سلامتی کی راہ نکل آئی۔ بقول فاضل مصنف "ان کو اس بات کا یقین تھا کہ تزکیہ نفس وتصفیہ قلب کے بعد حق تعالیٰ مومن کے کامل طور پر ولی، مولیٰ ونصیر ہو جاتے ہیں۔ ان کی نصرت اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اور ان ہی حقائق کی طرف وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ دفع خوف وحزن کے لئے ماثور دعائیں، وہ دعائیں جو اولیائے عظام کو الہام ہوئی ہیں، اس عہد کے قصص وروایات اور چند دلچسپ واقعات اور بعض موثر اشعار سے انہوں نے اپنے رسالہ میں کام لیا ہے۔ اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں"

یہ سب کچھ بجا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ مسلک حالات کی سنگینی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف نہیں، اور کیا اس کا نتیجہ فراریت اور بے عملی کے سوا کچھ اور نکل سکتا ہے۔

(ا- س)

م حافظ ابن ابی الدنیا

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمحات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ، جو اغلاط سے پر تھا، ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اس پر بحث کی ہے، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔

قیمت دو روپے

——:o:——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۷/۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ صدر ۔ حیدرآباد ۔ پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

الرحیم
ماہنامہ
شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈیمی، حیدرآباد (پاکستان)

قیمت سالانہ :- آٹھ روپے　　فی پرچہ :- پچھتر پیسے

جلد ۲ صفر المظفر ۱۳۸۴ھ مطابق جولائی ۱۹۶۴ء نمبر ۲

فہرست مضامین

شذرات

جامعہ ازہر کی مدعو کردہ "مؤتمر عالم اسلامی قاہرہ" میں شرکت کے بعد ہمارے علمائے کرام کا وفد واپس آگیا ہے۔ اور اب اس کے ارکان کے قلم سے اس مؤتمر کے حالات وکوائف اور خود ان کے مشاہدات و تاثرات شائع ہو رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مؤتمر بڑے تزک واحتشام سے کی گئی، اور داعیان نے اس پر بڑی فیاضی سے خرچ کیا۔ یقیناً جس طرح پاکستانی وفد کے ارکان حضرات اس مؤتمر سے متاثر ہو کر لوٹے ہیں، دنیا کے دوسرے پچاس ملکوں کے نمایندے بھی اسی قسم کے اچھے تاثرات لے کر گئے ہوں گے، چنانچہ اس لحاظ سے قاہرہ کی مؤتمر عالم اسلامی واقعی بڑی کامیاب رہی۔

اس سلسلے میں جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے ناظم اعلیٰ نے جو اس وفد کے ایک معزز رکن تھے، اپنے ایک مضمون میں متحدہ جمہوریہ عرب کے صدر جمال عبدالناصر کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

۱۔ اس نے جامعہ ازہر کی عمارت کیلئے ۸ کروڑ روپیہ منظور کر کے علم دوستی کا ثبوت دیا۔

۲۔ اس نے ایک ریڈیو اسٹیشن کو قرآنی تلاوت کے لئے خاص کر کے قرآن کی بہترین خدمت کی۔

۳۔ اس نے مسجدوں کے لئے مفت بجلی اور پانی مہیا کر کے دنیائے اسلام کیلئے بہترین نظیر قائم کی۔

بے شک جمال عبدالناصر نے یہ امور سرانجام دے کر اسلام کی بڑی خدمت کی ہے، اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے کارنامے ہیں، جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے، لیکن موصوف یا ان کی حکومت خدمت اسلام کے ضمن میں یہ امور کیسے سرانجام دے سکی، مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

متحدہ عرب جمہوریہ یعنی مصر میں تمام مساجد براہ راست وزارت اوقاف کے تحت ہیں، جن کا نہ صرف نظم ونسق،

بلکہ ان میں ائمہ، خطباء اور قاریوں کا تقرر بھی اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نیز وعظ و ارشاد کے لئے وعاظ مرشدین بھی اسی وزارت کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔ اور یہی اور صرف یہی عوام میں جاکر وعظ کر سکتے ہیں۔ گو جامعہ ازہر ایک حد تک خود مختار تعلیمی ادارہ ہے، لیکن علاوہ بھی وزارت اوقاف ہی کے زیر انتظام ہے چنانچہ مولانا سید محمد یوسف بنوری رئیس وفد پاکستانی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایوانِ موتمر کے صدر مقام میں جو چند ایک کرسیاں تھیں، ان میں سے ایک تو صدر مملکت کے نمایندے کے لئے تھی، اور باقی کرسیاں وکیل الازھر ڈاکٹر عبداللہ ماضی، ڈاکٹر ابھی وزیر الاوقاف وشئون الازھر، اور ڈاکٹر محمود حب اللہ ناظم مجمع البحوث کی تھیں۔ اور ایک کرسی قاری کے لئے تھی۔ علاوہ ازیں موتمر قاہرہ میں شریک ہونے والے ہمارے ان ارکان وفد نے اپنے مضامین میں اس امر کی طرف بھی اشارہ نہیں کیا کہ صدر ناصر نے جامعہ ازھر کو کتنا "ماڈرن" بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ کہ اس موقع پر ازھر کے "مدینۃ الجامعہ" کا جو سنگ بنیاد رکھا گیا، تو اس میں "طلباء اور طالبات کے لئے الگ الگ مختلف علوم و فنون کے کالج، ہوسٹل، لائبریری، اسمبلی ہال، کھیل کے میدان، رستوران اور بازار اور پارک اور تیرنے کے تالاب، غرضکہ یہاں ہر وہ چیز ہوگی، جس کی ضرورت یونیورسٹی کے طلبا کو ہوتی ہے۔"

ایک مسلمان ملک کی تمام مساجد اس کی وزارت اوقاف کے ماتحت ہوں۔ ائمہ، خطباء، اور واعظوں کا تقرر اسی کی طرف سے ہو۔ دینی تعلیم بھی عام دنیوی تعلیم کی طرح حکومت کی نگرانی میں ہو اور حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی شخص پبلک میں وعظ کرنے کا مجاز نہ ہو، پھر وہاں دینی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ اتنا ہی "ماڈرن" ہو، جتنا کہ اس وقت جامعہ ازھر ہے اور نہ صرف وہاں کے وزیر اوقاف اور مجمع البحوث الاسلامیہ کے ناظم "ڈاکٹر" ہوں بلکہ نائب شیخ الازھر تک ایک "ڈاکٹر" ہو۔

کیا ہمارے علمائے کرام جو موتمر قاہرہ میں شریک ہوئے تھے، اس کے لئے تیار ہیں؟ ہم ان کی خدمت میں باادب یہ عرض کریں گے کہ صدر جمال عبدالناصر اور ان کی حکومت کے جن کارناموں کی آپ تعریف فرما رہے ہیں۔ وہ صرف اس لئے ممکن ہو سکے کہ مصر میں مساجد اور معابد دینی وزارت اوقاف کے انتظام میں ہیں۔ وہاں وعظ و ارشاد وزارت اوقاف کی ذمہ داری ہے، اور دینی تعلیم ایک انفرادی کاروبار نہیں، بلکہ اس کا ایک مستقل شعبہ ہے، جس کی نگران و منصرم خود حکومت ہے، اور پھر یہ کہ

"ڈکانترہ" بھی دینی شعبوں کے انچارج ہیں۔

ہمارے ان محترم بزرگوں کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیئے کہ جب تک "محافظین" اور "عصریین" میں پورا تعاون نہیں ہوگا اور "راسخ العقیدگی" اور "جدیدیت" میں موافقت پیدا نہیں ہوگی نہ اسلام کی عظمتِ ماضی کا احیاء ہو سکے گا، نہ اس کے شاندار مستقبل کی تعمیر۔

مصر تو بہر حال وہ سرزمین ہے، جہاں ترکی سے بھی پہلے "جدیدیت" کو اپنانے کی کوشش کی گئی تھی اور جدید مصر کے بانی محمد علی نے نئے علوم و فنون اور نئے اوضاعِ حکومت کو اختیار کیا تھا، لیکن اب تو سعودی عرب اور یمن جیسے دقیانوسی ملک بھی اپنا پرانا چولا اتارنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور وہاں بھی "جدیدیت" کی لہر آ رہی ہے۔

موتمر قاہرہ کے شرکاء حضرات نے صدر ناصر کے عہد کے ایک پہلو کی تو تعریف کی ہے، لیکن جن عناصر سے وہ پہلو قابلِ تعریف ہو سکا، ان کا ذکر نہیں کیا، کاش ہمارے یہ محترم بزرگ ان کی طرف بھی اشارہ فرما دیتے۔

الرحیم کے پچھلے شمارے میں ہم نے محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی طرف سے تصوف کی بعض بنیادی کتابیں شائع کرنے کے پروگرام کا ذکر کیا تھا، معلوم ہوا ہے اس سلسلے میں مکتوباتِ امام ربانی، مکتوبات خواجہ محمد معصوم، حضرت داتا گنج بخش کی کشف المحجوب، حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات فوائد الفواد، کلیات خواجہ باقی باللہ اور باقیات خواجہ باقی باللہ کے اصل متون شائع کئے جا رہے ہیں۔ نیز "نزہتہ الخواطر و بھجتہ المسامع والنواظر" جو ہندوستان یعنی برصغیر ہند و پاک کے علماء اور بزرگوں کے حالات پر مشتمل ایک جامع کتاب ہے، اس کا اردو ترجمہ کرایا جا رہا ہے اور امید ہے اسی مالی سال کے اندر یہ کتابیں شائع ہو جائیں گی۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے پروفیسر جلبانی صاحب نے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب تاویل الاحادیث کا سندھی میں ترجمہ کیا ہے یہ کتاب چھپ گئی ہے اب شاہ ولی اللہ اکیڈمی خود اصل کتاب کو جو عربی میں ہے، شائع کر رہی ہے مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب نے اسے ایڈٹ کیا ہے نیز اکیڈمی کی درخواست پر مولانا محمد اسمعیل صاحب گودھری نے المسوّیٰ عربی کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مولانا مرحوم کے وارثوں نے ہمیں ترجمہ کا مسودہ ارسال کر دیا ہے اور اب اس کے چھاپنے کا بھی انتظام ہو رہا ہے۔

الرحیم (سندھی) محض ڈیکلیریشن نہ ملنے کی وجہ سے رکا پڑا ہے، الحکمۃ (انگریزی) اس وقت پریس میں ہے، ڈاکٹر ملے پوتا صاحب کے سفر امریکہ کی بنا میں اس کو اشاعت میں شاید کچھ تاخیر ہو جائے۔

السرّ المکتوم فی اسباب تدوین العلوم[1]

ترجمہ مولانا ابو یحییٰ امام خاں صاحب

اب رہے علوم حکمیہ، سو اُن کی اصل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد زمین میں پھیلی۔ وہ اس کے اطراف وجوانب میں آباد ہوئی اور اس کے گروہ در گروہ ہوگئے۔ چنانچہ ہر ملک میں لوگوں کی ایک کثیر جماعت جمع ہوگئی اور ذہانت، تجربہ اور ان امور کی معرفت میں مشغول ہونے کی وجہ سے جنہیں احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے، بہت سے اتفاقات کے باوجود ان میں اختلافات ضروری ہوگیا اب ضرورت پیش آئی کہ تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کے فنون اور اچھے اخلاق کو برے اخلاق سے پہچاننے کے متعلق ان کی روایات اور نکتوں کو نقل کیا جائے اسی طرح طب، دواؤں اور بیماریوں کی معرفت اور ستاروں کہانت، قیافہ اور حساب کو جاننے نیز بدنی اور نفسیاتی ریاضتوں کے ذریعہ تہذیب نفس کے طریقوں کی معرفت سے متعلق امور نقل ہوں۔

اب ان لوگوں میں جو بھی صنعتیں وجود میں آئیں، وہ ان کے باہم متفق ہونے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کی وجہ سے تھیں۔ چنانچہ لوگوں میں سے کسی قدیم اور جدید گروہ کو تم ایسا نہیں دیکھو گے کہ ان فنون میں سے کسی نہ کسی سے اسے لگاؤ نہ ہو۔ بلکہ وہ سرزمین جہاں کے باشندے خلافت اور بادشاہت کے وارث ہوئے اور اُن میں اِن علوم کے حصول اور ان کی معرفت میں مقابلے کی رسم چل پڑی، اُن کی اِن امور میں معرفت دوسروں سے زیادہ تھی۔ خلافت اور بادشاہت کا دور دورہ فریدوں کے زمانے

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب کے اس عربی رسالے کے اردو ترجمے کی پہلی قسط جون کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ (مدیر)

سے ہمارے نبی علیہ السلام کے زمانے تک فارس اور روم میں رہا۔ اسی لئے وہاں کے حکماء کو ان امور میں بہت زیادہ رغبت تھی۔

اتفاق سے اسکندر سے تین سو سال کے لگ بھگ پہلے اقلیم یونان میں ذہین، طلب علم کی مشقتوں پر صبر کرنے والے اور معرفت امور میں ایک دوسرے سے بڑھ کر رغبت کرنے والے لوگ تھے وہ ان علوم و فنون میں بہت زیادہ گھس گئے۔ چنانچہ طب میں انہماک انہیں معدنی، نباتی اور حیوانی دواؤں، ان کے خواص اور ان کے طبیعی افعال کی تلاش و تفحص اور ابدانِ موالید[1] کی طبیعتِ مدبرہ[2] اور یہ طبیعت مدبرہ جس طرح ابدان میں غذا پہنچانے اور نشوو نما دینے وغیرہ کا کام کرتی ہے، اس کی کیفیت میں بحث و نظر کی طرف لے گیا۔ اس سے وہ کائنات فضائی و معدنی وغیرہ کے بہت سے اسباب کی ٹوہ میں لگ گئے اور اس ضمن میں انہیں بہت سی حکایتیں اور نکتے ملے۔ جنہیں ذہین لوگوں نے لے لیا، اور جہاں تک بن پڑا انہیں رسالوں میں ضبط کر لیا۔

اسی طرح ستاروں کا علم انہیں سیاروں کی حرکات کی تحقیق کی طرف لے گیا، اور چونکہ ہندسی اور حسابی قواعد کے بغیر انہیں دائرہ ضبط میں نہیں لایا جا سکتا تھا، اس لئے انہوں نے یہ قواعد بھی مرتب کئے تاکہ اس طرح وہ ستاروں کی تحقیق کر سکیں غرض ان کے غور و فکر کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ ہیئت ہندسہ اور حساب نے مستقل فنون کی شکل اختیار کر لی۔

اسی طرح نفسانی ریاضتیں جو پیش رو انبیا سے ماخوذ تھیں، انہیں ان ریاضتوں کے ثمرات کے ادراک کی طرف لے گئیں اور پھر یہ ادراک باعث بنا دنیا سے علیحدگی، تجرد اور انسلاخ کا اور یہ انہیں معارفِ وجدانیہ کی طرف لے گیا۔ چنانچہ انہوں نے ان سب کے متعلق گفت گو کی اور ان پر رسالے لکھے، جن میں سے اکثر رمزوں اور اشاروں میں ہیں۔ پھر بعد کے زمانے والوں نے ان فنون میں دلچسپی لی اور ان میں بحثیں کرنے لگے اور یہ مباحثے انہیں تمدید، استدلال، جدل اور کثرتِ ردّ و منع کی طرف لے گئے پھر ارسطا طالیس پیدا ہوا۔ وہ صحیح فکر اور تیز ذہن والا تھا۔ شور و شغب اور جھگڑے اور جدل

---

[1] جمادات، نباتات اور حیوانات موالیدِ ثلاثہ کہلاتے ہیں۔

[2] ان موالید میں تصرف کرنے والی طبیعت کو طبیعت مدبرہ کا نام دیا جاتا ہے۔

کے بجائے انصاف اور تحقیق کو عزیز رکھتا تھا۔ اس نے دیکھا جب تک حدّ اور برہان کے مباحث کی تنقیح اور برہانی[1] سے جدل و شعر کی تمیز نہ ہو، علوم میں صائب نظر پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس نے اس بارے میں نہایت صاف و مفید گفت گو کی، جسے عقلوں نے فوراً قبول کر لیا۔ ارسطاطالیس کا یہ کارنامہ خلیل سے جس نے علم عروض کا استنباط کیا، ملتا ہے۔ غرض ارسطاطالیس نے علم الطبیعۃ سے اوپر کے تین علوم اخذ کئے۔ اس میں اس جیسی اور چیزیں شامل کیں اور ان سب کو بڑی اچھی طرح سے بیان کیا۔ اس نے اشراقیین[2] کے رسالوں میں غیر مربوط کلام دیکھا کہ اس میں سے کہیں کہیں تناقض، تعقید، اور اضطراب ہے، جس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوا کہ اس میں حدّ اور برہان کے مباحث کی رعایت نہیں رکھی گئی۔ گویا ان مسائل میں غور و خوض نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ارسطاطالیس نے اسے بڑے صاف اور مختصر طریقے سے بیان کیا۔

---

[1] شعری مقدمات، وہ مقدمات جن سے طبیعت میں انقباض پیدا ہو۔

برہان باصطلاحِ منطقیین عبارت است از قیاسے کہ مرکب باشد از مقدمات یقینی و آں دو قسم است۔ یکے لمّی۔ ولمّی آنست کہ حدّ اوسط دروں علتِ حکم بود در ذہن و نفس الامر۔ چناں کہ گویند۔ ھذا متعفن الاخلاط و کُلّ متعفن الاخلاط فہو محموم۔ فہذا محموم۔ پس حدّ اوسط کہ متعفن الاخلاط است علت است برائے حکم کردن محموم بر ھذا در ذہن و نفس الامر۔ و آں را برہان لمّی ازاں گویند کہ دلالت می کند بر لِم و علتِ حکم در نفس الامر۔ دوم انّی۔

[2] بالکسر، گروہیست از حکمائے سلف کہ از باعثِ اشراق و روشنی باطن قُواہا کہ از کثرتِ ریاضت پیدا کردہ بودند۔ تعلیم و تعلم بمکاشفہ و مراقبہ می کردند و حاجتِ برفتن پیش یک دیگر نداشتند بخلاف حکمائے مشائین کہ ایشاں نزدیک یک دیگر رفتہ، مقدمات دریافت می ساختہ، چنانچہ افلاطون و بقراط وغیرہ از زمرۂ اشراقیین بودند۔

اگر اسکندر نہ ہوتا، تو نہ ارسطاطالیس یہ کتابیں تصنیف کرتا اور نہ لوگ ہی اس کی کتابوں کی طرف اتنا زیادہ رجوع کرتے۔ باقی رہا بطلیموس، تو وہ علم ہیئت اور نجوم میں بڑا ماہر تھا۔ اور ان فنون میں اسکی بڑی اچھی کتابیں ہیں۔ اقلیدس وہ تھا جس نے اپنے زمانے کے ایک بادشاہ کے لئے اُصول ہندسہ پر کتاب لکھی۔ بقراط طب میں بڑا ماہر تھا۔ اور اس موضوع پر اس نے کتاب تصنیف کی اس کے بعد جالینوس آیا۔ اس نے علم طب کی تنقیح کی اور اسے اتمام کو پہنچایا۔ دور جاہلیت تو ختم ہو گیا لیکن ان کی یہ کتابیں اور رسالے رہے، لوگ انہیں پڑھتے پڑھاتے تھے اور ان کے مصنفین کی عزت و تکریم کرتے اور ان میں ایک دوسرے سے بڑھ کر بحثیں کرتے تھے۔

موسیقی کی نسبت میرا خیال یہ ہے کہ وہ علوم کے بجائے صناعات میں سے تھی، لیکن ایک جماعت نے دیکھا کہ اس کے منتشر مسائل کی وجہ سے اس کی تعلیم ایسی صورت میں آسان ہو سکتی ہے کہ وہ ایک رسالے میں مدون ہو، چنانچہ انہیں اس فن میں کتابوں اور رسالوں کو تصنیف کرنے کی ضرورت پڑی پھر حکماء کی ایک جماعت آئی۔ اور اس نے اس بارے میں بحث کی کہ بعض نغمات سے تو نفس کو لذت ملتی ہے اور بعض سے نہیں۔ ان کی یہ بحث حکمت کی قبیل سے تھی چنانچہ اس طرح موسیقی کو اصطلاحاً علوم حکمیہ میں داخل کیا گیا۔

پھر جب اسلام آیا اور حنین[1] نے کتب فلسفہ کو یونانی سے عربی میں منتقل کیا، تو

---

[1] حنین بن اسحٰق عبادی۔ یہ اپنے عہد کا بڑا صاحب کمال نصرانی طبیب تھا۔ اس کو یونانی سریانی، اور عربی تینوں زبانوں میں کامل دستگاہ تھی۔ اس نے یونانی کتابوں کے بکثرت عربی اور سریانی میں تراجم کئے، اس کی تالیفات و تراجم بے شمار ہیں۔

مُلا کاتب چلپی لکھتے ہیں کہ جب خلافت مامون کے پاس آئی تو اس نے اپنے دادا ابو جعفر منصور کے کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ اور علوم و فنون کو ان کے مرکزوں اور معدنوں سے نکالنے کی طرف متوجہ ہوا۔ سلاطین روم سے فلسفہ کی کتابیں مانگ بھیجیں چنانچہ ان لوگوں نے افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس، اقلیدس اور بطلیموس وغیرہ کی کتابیں بھیجیں اور مامون نے ماہر مترجمین سے ان کا ترجمہ کرا کے لوگوں کو ان کی تعلیم کی (باقی حاشیہ صفحہ ۹ پر)

مسلمان ان کے مطالعہ میں لگ گئے۔ اس کے بعد بوعلی[2] آئے، اور وہ بھی اسی نہج پر چلے ان دونوں نے ایسی باتیں بیان کیں جو مشابہ تھیں اس مُلمع سے جس سے کہ دونوں فریق راضی نہ ہوں۔ ان میں سے بعض باتیں ایسی تھیں جن کے بارے میں یہ دونوں اس اصل مصلحت کو ہی نہیں سمجھے، جو شارع کے مقصود تھی اور نہ وہ کلام کا جو اصل مقصد تھا، اسے سمجھے پس جو کچھ ان کی سمجھ میں آیا، وہ انھوں نے بیان کر دیا۔ جہاں تک بوعلی کا تعلق ہے اس نے ان لوگوں کے علوم پر کتابیں لکھیں۔ اور اپنی تصنیف کتاب "الشفا" میں ان علوم کو بڑی اچھی طرح مرتب کیا۔ اس نے حکمت نظری کی چار قسمیں کیں۔ ایک منطق، جس میں نو بحثیں ہیں کلیات خمس[3]۔ معقولات عشر۔ قضایا۔ قیاس۔ مباحث حدو برہان۔ خطابت، جدل، شعر اور مغالطہ

حکمت نظری کی دوسری قسم طبعیات ہے۔ اس کے آٹھ ابواب ہیں :۔ سماع طبعی[4]، کون، فساد کائنات جوی، معادن، نبات، حیوان اور نفس۔ تیسری قسم ریاضیات ہے۔ اور اس کے چار ابواب ہیں

بقیہ حاشیہ صد) ترغیب دلائی۔ اور چند دن کے اندر اندر ایک معتد بہ جماعت علوم و فنون سے آراستہ ہو گئی (تاریخ اسلام حصہ سوم۔ مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)

ماموں رشید نے ۸۳۳ء میں انتقال کیا مگر حنین بن اسحٰق کا سال وفات ۸۷۷ء ہے۔ اس کا سنِ ولادت ۸۰۰ء کے لگ بھگ ہے (نامور مسلم سائنس داں۔ پروفیسر حمید عسکری)

[2] بوعلی سینا ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اس نے ایک سو سے زائد کتب تالیف کیں، جو ہر قسم کے علوم مثلاً فلسفہ، سائنس، طب، فقہ اور ادب پر مشتمل تھیں۔ لیکن جن کتابوں کے باعث اس کو اسلامی دور کے نامور سائنس دانوں کی صف میں بہت اونچی جگہ ملی، وہ ہیں ایک قانون دوسری شفا۔ شفا میں فلسفہ، طبعیات، کیمیا، ریاضی، موسیقی اور حیاتیات (یعنی بائی آلوجی) پر مضامین ہیں ۔۔۔۔ دوسری بڑی کتاب "قانون" صحیح معنوں میں اس کی سب سے عظیم تصنیف ہے۔ یہ علم العلاج کا ایک مکمل انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں اس نے اپنے زمانے تک کی تمام قدیم اور جدید معلومات کو نہایت قابلیت سے یک جا جمع کیا ہے۔

(نامور مسلم سائنس داں۔ پروفیسر حمید عسکری)

[3] جنس (حیوان) نوع (انسان)۔ فصل (ناطق) خاصا (ضاحک) عرض (ماشی) یہ کلیات خمس کہلاتے ہیں۔ [4] وہ حکمت جس میں جسم طبیعی سے بحث کی جائے۔

ہئیت، حساب، ہندسہ اور موسیقی - چوتھی قسم الہیات ہے، اور اس کے دو باب ہیں - موجودات کے لئے امور عامہ کی معرفت اور باری تعالیٰ اور عقول کی معرفت، بوعلی نے اپنی کتاب کے آخر میں سزا و جزا، امور نبوت اور عبادات کے متعلق جو اسرار شریعت ہیں، انہیں اور خانہ داری و شہریت کی سیاسیات کو بیان کیا ہے اب اگر تم ان امور میں تلاش و تفحص کرو تو دیکھو گے کہ بوعلی جب باری تعالیٰ اس کی صفات اور کلام پر بحث کرتا ہے، تو اس میں بہت زیادہ بودا پن ہے - اور ان مباحث میں اسکی گفت گو ظن و تخمین سے مشابہ ہے، طبعیات میں فلسفیوں کی گفتگو کا مرجع زیادہ تر عناصر اور موالید میں جو حوادث رونما ہوتے ہیں حواس و قیاس سے ان کے اسباب بیان کرنا ہوتا ہے،

اب رہے علوم محاضرہ، یہ عبارت ہیں ان کلی قوانین، مفید صنعتوں اور عجیب و غریب حکایات وغیرہ سے، جو اس لئے مدون کئے گئے کہ لوگوں کو ان کی ضرورت پڑتی ہے، یا لوگوں میں انکو جاننے کی رسم چلی آتی ہے - یا لوگوں کا ایک طبقہ انہیں یاد رکھنے کا میلان رکھتا ہے، یا اسی قسم کی کوئی اور بات ہوتی ہے - ان علوم کی بھی کئی قسمیں ہیں ایک قبل از وقت معرفت حاصل کرنے کے علوم اور ان کی تدوین کی وجہ یہ ہوئی کہ لوگ اپنے معاملات میں اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ وہ فتح، شکست، بارش اور خشک سالی وغیرہ کے واقعات کو ان کے وقوع ہونے سے قبل جانیں اور اس کے لئے ستاروں، فال، کہانت، تعبیر رؤیا، رمل اور جفر وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے - انہی علوم میں سے مزاج کو اعتدال پر رکھنے اور بیماریوں کو دور کرنے کے علوم ہیں - اور ان کی طرف لوگوں کی احتیاج کسی سے مخفی نہیں - اور یہ ہیں علم طب، تعویذ گنڈوں کا علم اور ان حیوانات کے علاج و معالجے کا علم جنہیں پالنے کی رسم چلی آتی ہے، جیسے کہ گھوڑے، اونٹ، گائیں، بکریاں، ہاتھی، کبوتر وغیرہ ہیں۔

ان علوم میں سے یہ عجیب و غریب اور مفید صنعتیں بھی ہیں، جیسے تیر اندازی، خوش خطی، کیمیا، موسیقی، کھانا پکانا اور کاشت کاری - انہی علوم میں سے فنون حکمیہ ہیں اور یہ وہ نکات ہیں جن سے اخلاق فاضلہ، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے - قدیم حکماء کا یہ دستور تھا کہ وہ وحشی جانوروں، پرندوں اور درندوں کی زبان سے واقعی یا فرضی حکایتیں تصنیف کیا کرتے تھے ان حکایتوں میں نکتہ طرازی انہیں بہت دور تک لے گئی -

ان علوم میں سے بادشاہوں اور رہبانوں کی تواریخ، نادر حکایتیں، ملکوں اور شہروں کے احوال

ونیکیں اور پہاڑوں اور درختوں وغیرہ کی ہیئتیں بھی ہیں۔ انہی علوم میں سے زبانوں کا جاننا جیسے کہ ترکی عربی، فارسی اور ہندی وغیرہ ہیں اور مختلف خطوں کا جاننا ہے۔ انہی علوم میں سے لوگوں کی شعر و شاعری، اس کی نشوونما، اشعار کے نظم کرنے اور رسائل لکھنے کی معرفت ہے، اور ان علوم میں سے قوموں کے مذاہب اور ان کی کتابوں کی روایات اور ان کے تراجم کی معرفت ہے۔

ان اوراق میں جو ہم درج کرنا چاہتے تھے، یہاں اس کا اختتام ہوتا ہے۔

وللہ الحمد اولاً و آخراً

قرآن شریف دوسری مذہبی کتابوں سے اس لئے ممتاز ہے کہ وہ تمام عقائد کے بارے میں عقل کو مخاطب کرتا ہے اور خلاف و عناد کی صورت میں اسی کو حکم قرار دیتا ہے اس نے جس عقیدے کو ثابت کیا ہے یا جس کا رد کیا ہے، دلیل عقلی سے کیا ہے۔ دوسری اور کون سی کتاب ہے جس نے حدوث عالم پر اجرام سماوی کی حرکات سے دلیل پیش کی ہے۔ اس کو یاد کرو اور حضرت مریم اور عیسیٰ علیہما السلام کی عبادت کرنے والوں کی رد میں اس آیت میں غور کرو "وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک ایسی ہی ہے، جیسے آدم، خدا نے انہیں پیدا کیا اور پھر فرمایا، ہو جا، تو وہ ہو گئے" یہ ان لوگوں کا جواب ہے، جو حضرت عیسیٰ کے بے باپ ہونے کو الوہیت کی دلیل ٹھہراتے تھے۔ اثبات نبوت میں اس آیت کو دیکھو "یا کہتے ہیں، وہ تو باتیں بناتا ہے، نہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اچھا اگر سچے ہیں، تو ایسی ہی ایک بات وہ بھی بنا لائیں" اور یہ آیت "میں پہلے بھی تم میں ایک مدت رہ چکا ہوں، سمجھتے نہیں" اور حشر کے محال نہ ہونے کی دلیل میں یہ آیت "جس نے آسمان بنائے زمین پیدا کی۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان کے مثل پیدا کر سکے۔ بے شک وہ قادر ہے بڑا پیدا کرنے والا ہے اور دانا ہے" اسی طرح کی اور آیتیں جو علم کلام کی بنیاد ہیں۔

(مولانا اصغر علی روحی از بانی الاسلام)

اقبال اور قوم کی نئی تعمیر

فضلِ حمید

حقیقی معنوں میں اقبال شناس تو معدودے چند ہی ہوں گے، لیکن حضرت مرحوم کے کلام کے ثنا خواں، ناقد اور شارح بے شمار ہیں اور اسی لئے کلام اقبال کی تعبیرات و توجیہات بھی لاتعدد و لاتحصیٰ ہیں۔

وللناس فیما یعشقون مذاہب، ایک کہتا ہے۔ علامہ نے یہ فرمایا ہے۔ دوسرا کہتا ہے یہ نہیں فرمایا، کچھ اور فرمایا ہے۔ اور تیسرا کہتا ہے کہ جو میں کہتا ہوں، اقبال نے وہی بات کہی ہے۔ بعض کی سخن سنجی کا یہ حال ہے کہ اقبال کے بہترین اشعار کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہیں کہنا پڑتا ہے کہ "شعر فہمی عالم بالا معلوم شد۔" علامہ مرحوم" عالم مثال میں یہ کہتے ہوں گے کہ "من چہ می سرائم و طنبورۂ اینہا چہ می سرایند" عجب نہیں کہ اسی تاثر کے تحت انہوں نے یہ شعر کہے ہوں۔ ؎

چوں رختِ خویش بر بستم ازیں خاک　　همه گفتند باما آشنا بود
ولیکن کس نہ دانست ایں فقیرے　　چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

ان کے یہ اشعار بھی اسی حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں :۔

بہ چشمِ من جہاں جز رہگذر نیست　　ہزاراں راہ رو یک ہمسفر نیست
گذشتم از ہجومِ خویش پیوند　　کہ از خویشاں کسے بیگانہ تر نیست

شاید اس ضمن میں مولانا روم کے یہ اشعار زیادہ حسب حال ہیں۔ گو محل مصداق کلام کا تفاوت جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں۔

من بہ ہر جمیعتے نالاں شدم | جفتِ خوش حالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من | وز درونِ من نہ جُست اسرارِ من

بااین ہمہ اس میں شک نہیں کہ مزاج، طبیعت اور استعداد کے لحاظ سے معنی کی تعبیریں بدل جاتی ہیں۔

عبارا تنا شتی و حُسنکَ واحدٌ

اہلِ نظر کے لئے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اقبال نے کیا نہیں کہا؟

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم!

حضرتِ اقبال کی ہمہ گیر، ہمہ رس، ہمہ رنگ طبیعت اور آزاد فطرت کسی محدود دائرہ میں مقید نہیں ہو سکتی تھی اور نہیں ہوئی۔ مغز و پوست کی بات دوسری ہے۔

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

میرے خیال میں اقبال کی فلسفیت نے ان کے کلام کی شعریت میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا البتہ اقبال کی شاعری نے ان کی فلسفیت کو کمزور کر دیا یا الجھا دیا ہے۔ مگر جب وہ اپنے شاعرانہ وارادات یا باطنی وجدان کے تقاضے سے شعر کہتے ہیں تو فی الحقیقت یہ شعر ہوتے ہیں اور کمالِ شاعری کے اعتبار سے لاجواب۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ الشعراءُ تلامیذ الرحمٰن۔ اقبال کے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ گلدستے ہیں، جن میں انہوں نے مشرق و مغرب کے حکما، شعراء اور فضلا کے رنگا رنگ افکار اپنے اشعار کے سانچوں میں ڈھال کر موزوں کئے ہیں ثانیاً حکمت بہ قیدِ ردیف و قافیہ۔ ثالثاً شاعرانہ واردات والہامات اور یہی اصل میں ان کی شاعری کی جان ہیں۔ اسی قسم کے اشعار کے بارے میں فیضی کا دعویٰ ہے۔

نشۂ فیضی بود از بزمِ خاص
جرعۂ جامش ز فیضِ عام نیست

اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کے اعتبار سے لامحدود اور ایک ارتقاء و تغیر پذیر عالم میں قیدِ زمان و مکان سے بالاتر ہے۔ اس کی فطرت کی ممکنات بھی لامحدود ہیں۔ نہ مبدائے جمال و

کمال یعنی حقیقت کی انتہا ہے اور نہ مظہرِ حقیقت یعنی انسان کی ممکنات کی کوئی حد ہے۔

؎ نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

غالب بھی ایک ہردم دگرگوں عالم کے قائل ہیں:۔

؎ در ہر مژہ برہم زدن ایں خلقِ جدید است

نظارہ سگالد کہ ہماں است و ہماں نیست

مگر یہ "تجددِ امثال" کے پرانے خیال کا ایک اندازِ بیان ہے۔ غالب عالم کے تحسینی ارتقاء کو بھی ایک نہایت لطیف و بدیع شاعرانہ پیرایہ میں یوں بیان کرتے ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　　　پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یہی مضمون اقبال نے اس شعر میں بیان کیا ہے، مگر شعریت اور معنوی لطافت کے اعتبار سے اقبال کا قدم آگے بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں

ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

اسی سے ملتا جلتا کسی پرانے فارسی شاعر کا یہ شعر ہے۔

؎ مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند　　　ستارہ می شکنند و آفتاب می سازند

اقبال کے تخیل کی جدت آفرینی نے ایک ارتقاء پذیر عالم کے تصور پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ وہ ایک نئی دنیا کی جستجو میں بھی ہیں۔

زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

یہی نہیں وہ ایک نئے انسان کی تخلیق کے بھی متمنی ہیں۔ جنابِ باری تعالیٰ میں شاعرانہ شوخی سے عرض کرتے ہیں۔

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار　　　لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

ایک اور جگہ وہ اس خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ:۔

خدا خود در تلاشِ آدمی ہست

اپنی علمی ہمہ رنگی اور فکری بوقلمونی کا خود اقبال کو اعتراف ہے:۔

؎ رہ مدہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

فکر و نظر کی اس گونا گونی کے باوجود چند مرکزی و اساسی تصورات ہیں، جو حضرت اقبال کے تمام کلام میں پائے جاتے ہیں۔ گو بعض مشاکلات و متشابہات میں ہمارا تخیل حیران اور ناطقہ سر بہ گریبان رہ جاتا ہے مگر اس سے ان کی فکری وحدت میں کوئی تضاد یا تخالف واقع نہیں ہوتا۔ اس مقالہ میں یہ گنجائش نہیں کہ ان کے اس مرکزی خیال کی توضیح و تشریح کی جائے۔ مزید برآں یہ کہ موضوع سخن بھی اس کا متحمل نہیں۔

مختصراً اتنا عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اقبال کے نزدیک زندگی ایک رواں دواں روح یعنی بقولِ برگساں ایک "جوہر سیال حیات" ہے جو ساری کائنات پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ روحِ حیات انسان کے وجود بلکہ جملہ کائنات کی عین ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

؎ تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

انسان کا وجود یعنی بود و نمود تخلیقِ مقاصد پر منحصر ہے اور ان روایات کے تحفظ پر جو انِ مقاصد کی حامل ہیں۔

؎ ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

لیکن کشاکشِ آرزو اور تخلیقِ مقاصد کے بغیر زندگی کا استمرار و دوام ممکن نہیں

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو ست
فطرتِ ہر شے امینِ آرزو ست

آرزو صید مقاصد را کمند
دفتر افعال را شیرازہ بند

زندگی سرمایہ دار از آرزو ست
عقل از زائیدگانِ بطنِ او ست

یہی نہیں۔ سوز و سازِ آرزو کو نہ صرف وہ شرطِ حیات قرار دیتے ہیں بلکہ عینِ حیات

سمجھتے ہیں۔

اگر ز رمزِ حیات آگہی مجو و مگیر
دلے کہ از خلشِ خار آرزو پاک است

اقبال کا یہ خیال بھی ان کے ایک اور بنیادی تصور کا مرہونِ منت ہے اور وہ یہ کہ انسان فطرت کا محکوم نہیں۔ از روئے قابلیت فطرت اس کی محکوم ہے۔ انسان کی روحِ فعّال کار فرمائی فطرت سے برسرِ پیکار ہے اور انسان کی انانیت کا مقصد تسخیر کائنات ہے۔ عالمِ آب و گل میں انسانی ممکنات کا بروئے کار آنا اس کی انا کی قوت کے ظہور پر موقوف ہے ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا

غالب نے کہا تھا۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اقبال نے "میکدہ" اور "دعوتِ عام" کے تلازمہ سے مضمون اونچا کر دیا ہے۔ اور توسیع ممکنات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ "اندازۂ جام" عبارت ہے ظرفِ استعداد سے۔ استعداد کا مسئلہ بڑا نازک ہے مگر اس میں خودی کی لامحدود قوتِ سعی و حصول کی گنجائش کہاں ہے؟ بہرکیف اقبال انسان کی تقدیر گر و تقدیر شکن قوت کے قائل ہیں اور روشِ زمانہ اگر سازگارِ مقاصد نہ ہو، تو اس کے خلاف معرکہ آرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی بے پناہ تنقید کی زد سے سعدی شیرازی بھی نہ بچ سکے۔ سعدی نے کہا تھا "زمانہ با تو نہ سازد۔ تو با زمانہ بساز"، یہ "لاتسبوا الدہر" کی ہی شرح تھی۔ مگر اقبال کے فلسفہ ستیز و سخت کوشی میں اس ہم آہنگی کی گنجائش نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اس آویزش کے باب میں بجز اس کے اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ بقولِ سعدیؔ۔ "سعدی آں نیست ولیکن چوں تو فرمائی ہست!" اگر مے و محبوب کی مقاصد و مطامع سے تعبیر کی جائے تو کسی شاعر کا

یہ شعر اقبالؔ کے مشرب کا آئینہ دار بن جاتا ہے اور کلام کی موسیقیت و شعریت میں کوئی خلل نہیں آتا۔

مشربِ اہلِ نظر عشق مدام است اینجا
زندگی بےلے و محبوب حرام است اینجا

بر سبیل تذکرہ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اقبال اپنے فلسفۂ انانیت و لاغیریت کے باوجود ہر عظیم مفکر و شاعر کے خیالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ طبع زاد شاعر ہیں اور ہر طبع زاد شاعر میں قوتِ منفعلہ بحدِّ کمال ہوتی ہے۔ اگر یہ انفعالیت نہ ہو تو شعر موزوں نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال شیکسپیئر اور ورڈز ورتھ، غالبؔ اور گوئٹے، نیٹشے اور رومیؔ، کارل مارکس اور شوپن ہار ایمرسن اور سوامی رام تیرتھ فکٹے اور ہیگل سے یکساں متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ حافظ کی تاثیر بھی انکے کلام میں پائی جاتی ہے۔ دراں حالیکہ حافظ پر انہوں نے کڑی تنقید اور سخت جرح کی تھی۔

"پیر رومی" اور "مرید ہندی" کے مسلک میں جو بعد المشرقین ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ جب ان کی قوتِ فعّالہ بروئے کار آتی ہے، تو ان کا کلام فلسفہ منظوم بن جاتا ہے۔ جب وہ اپنے قلبی واردات سے شعر کہتے ہیں تو وہ شعر ہوتے ہیں۔ اتنی ہمہ رس و ہمہ گیر طبیعت شاید ہی کسی شاعر کو مبدائے فیاض سے ملی ہو۔ آخر گلہائے رنگا رنگ سے ہی چمنِ جمال کی زینت ہے۔

اقبالؔ روحِ حیات کی ابدیت اور لازوالیت کے قائل ہیں اور انسانیت کے کمال کے لئے مقاصد کی بلندی اور مطامع کی پاکیزگی لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اس تمیزِ رنگ و بُو کے عالم میں جَو بوئیں اور آخر کار گندم کی فصل برداشت کریں۔ سعدیؔ کے اس شعر کو انہوں نے بہ نظر استحسان اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

اقبالؔ فلسفۂ وحدت الوجود سے بھی بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اگرچہ بظاہر ان کے فلسفۂ خودی میں اس کی گنجائش بہت کم نظر آتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی — کہ او پیدا است تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی — تلاش خود کنی جز او نیابی

لیکن شاید یہ "گلشن راز" کی صدائے بازگشت ہے۔ وجودیوں کی تعبیرات سے اقبال کو شدید اختلاف ہے کیونکہ وہ خودی کو ہست، یعنی حقیقت سمجھتے ہیں اور جملہ موجودات کو نیست، یعنی تخلیقاتِ خودی کا اعتبار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک لحاظ سے الٰہ کی نفی بھی ہوتی ہے۔ اس کا انہیں احساس ہے اس تشکیک و تذبذب کا اظہار وہ اسطرح کرتے ہیں۔

تو می گوئی کہ من ہستم خدا نیست　　　جہانِ آب و گل را انتہا نیست

ہنوز ایں راز بر من ناکشود است　　　کہ چشمم آنچہ بیند ہست یا نیست

اقبال کے نزدیک قوم کے جہانِ نو کی تعمیر سنگ و خشت سے نہیں بلکہ افکارِ عالیہ اور مقاصدِ حسنہ سے ہوتی ہے جن کا ایسا لطیف امتزاج ہو، جو انسان کے جوہرِ حیات کو مثلِ گوہر تابندہ بنادے اور اسے اُمہاتِ سِفلی اور آباءِ عُلوی یعنی عناصرِ اربعہ اور عناصرِ فلکیہ پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے ضبط نفس اور تربیتِ خودی پر زور دیا ہے۔ جن کے کمال کو وہ نیابت الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ قوموں کا عروج و اقبال اور ان کی اخلاقی و ثقافتی عظمت کا دار و مدار سر بفلک عمارتوں اور عظیم الشان کارخانوں پر نہیں بلکہ اخلاقی و روحانی قدروں کی سربلندی و ترقی پر ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس راہ میں وہ محکومی و تقلید کو سنگ گراں سمجھتے ہیں اور یہ افسوس کرتے ہیں کہ ہمارے فکر کی اجتہادی قوت ہمیں جواب دے گئی ہے۔

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی

رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اور اس سلسلہ میں وہ اس زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو تدریجاً ہمارے قومی ارتقاء کی رجعتِ قہقری

کا باعث ہوا۔ یہاں تک کہ خوب و زشت کا امتیاز بھی جاتا رہا۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال کے حق میں مدح سرائی اور داد واہ ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد خوب ہوئی مگر تحسین قدر شناس کی کمی اب تک محسوس ہو رہی ہے۔ شاید ان کا روئے سخن اسی ناگوار صورت حال کی طرف ہے۔

جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

البتہ اس راہ میں کچھ دشواریاں بھی ہیں اور "مرد مومن" یعنی انسان کامل کے جذبات و داعیات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قربانیاں ناگزیر ہیں۔ پنڈت ہر گوپال تفتہ نے اس مسلک کی کیا خوب ترجمانی کی ہے

بہ کوثر غوطہ ہا زد ہر کہ اندر خوں تپید اینجا	محبت کربلائے ہست باید شد شہید اینجا

اقبال نے بھی یہی بات اپنے رنگ میں کہی ہے۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایہ حیات	فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جلترنگ

سفر حیات میں علامہ اقبال کے نزدیک جس زادِ راہ کی ضرورت ہے وہ بیش از یں نہیں۔

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے	دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بے تابے

مقصد حیات کا جو تصور اقبال کے دل و دماغ میں ہے اسے وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

اے زرانۂ زندگی بیگانہ خیز	از شراب مقصدے مستانہ خیز
مقصدے مثل سحر تابندۂ	ماسوائے را آتشِ سوزندۂ

مقصدے از آسماں بالاترے

دلربائے دلستانے دلبرے	باطل دیرینہ را غارتگرے

فتنہ در جیبے سراپا محشرے

وہ درد کے بھی قائل ہیں مگر دردمندی اور جانداری ان کے ہاں ہم معنی ہیں۔

کسے کو دردِ پنہانے نہ دارد	تنے دارد ولے جانے نہ دارد

ان مقاصد کی مزید تشریح کرتے ہوئے وہ روح کی پاکیزگی پر بھی زور دیتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر روح کی بلند پروازی یا بلند آہنگی نہ رہے تو محض اخلاقی اقدار انسانیت کبریٰ کی تخلیق نہیں کر سکتیں اور نہ آدمی کو اس منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہیں جو اس کی زیست کا مدعا یعنی عین وجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ضمیر پاک و خیال بلند و ذوقِ لطیف رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید

ملّتِ اسلامیہ کے لئے ان کا پیام خاص ہے اور طرزِ خطاب بھی یقین اجابت کی آئینہ دار ہے کیونکہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ امتِ محمدیہ کی تشکیل انسانیتِ کبریٰ کی تخلیق اور وحدت انسانی کی تکمیل کے لئے معرض وجود میں آئی ہے۔

ان کے نزدیک۔ "خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے" ابن عربیؒ کے نزدیک جمادات بھی زندہ ہیں مولانا رومؒ کا خیال ہے۔ "زندہ معشوق است و عاشق مردہ"

توحید کا جو تصوّر علامہ اقبالؒ نے پیش کیا ہے اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں ہے مگر ملّتِ اسلامیہ کی وحدتِ افکار کو وہ اسلامی توحید کا جزو لاینفک قرار دیتے ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت

وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام ہے بیکار

یہاں محلِ نظر یہ بات ہے کہ دنیا میں یکسانیت ہی یکسانیت ہو تو تنوع کی دلفریبی کہاں سے آئے گی۔ بقولِ ذوق۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ ہماری ذہنی تنگ دامانی اور بے حوصلگی اور کوتاہ دستی کی دلیل ہوگی اگر ہم اقبال کی روح پرور، ہمت افزا ولولہ انگیز شاعری کے باوجود بھی اپنی قوم کی تعمیر نو نہ کر سکیں اور قوم کی تعمیری ترقی کو سنگ و خشت کے سطحی پیمانوں سے ہی ناپتے تولتے رہیں۔ خدا نخواستہ یہ صورت ہوئی تو ہماری مثال چلتی پھرتی لاشوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

اخلاقی اور روحانی قدریں اگرچہ قوم کی اصلی حیات کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن وہ مالیات یا مادیات کی تخیلی تنگ نائے میں سما نہیں سکتیں۔ جو کم نظر قومی ترقی کو ثقافت کی قدروں اور جمالیات

یعنی انسانی فطرت کے حسن و کمال سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، وہ اس ذوق لطیف، احساس سربلندی اور شعورِ ماکان و مایکون سے محروم ہیں جو قومی زندگی کی ہم آہنگی اور وحدت فکر و عمل کے لوازم ہیں۔ کوئی قوم اپنی ثقافتی، علمی اور روحانی بے مایگی کے باوجود محض مرئی اور ٹھوس مادی ترقی سے دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ یا کم از کم عزت و افتخار کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ میکالے کا یہ قول کہ وہ برطانوی شہنشاہیت سے دستبردار ہونے کو تیار ہے مگر شیکسپیئر کے ثقافتی سرمایہ سے دست کش ہونے پر آمادہ نہیں، اسی بالغ نظری پر مبنی تھا۔ حضرت حافظ کے اس شعر میں بھی یہی رمز بعنوانِ دگر مذکور ہے۔

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دل مارا

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حُسن طبیعت، سوزِ باطن، ذوقِ سلیم اور توازنِ فکر کے بغیر انسان اجتماعی طور پر ان مقاصد حیات کی تکمیل نہیں کر سکتا جو اقبال کے نزدیک اصل الاصول ہیں۔ فلسفۂ خودی سے ان عناصر ترکیبی کی کیا نسبت و اضافت ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ بہر کیف مقامِ حیرت و تاسف ہے کہ اقبال پرستی اور کلام اقبال کے ساتھ والہانہ عقیدت و دل بستگی کے ہوتے ہوئے بھی قوم تعمیر نو کے تقاضوں اور اخلاقی و روحانی قدروں کی ترقی و تعالی سے غافل ہے۔ اس سلسلہ میں کسی دیدہ ور کا یہ شعر حسب حال ہے۔

زتیرہ بختیٔ آئینہ حیرتے دارم

ترا کشید بہ آغوش آفتاب نہ شد

با ایں ہمہ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ اقدار کی آزمائش کے امکانات غیر محدود ہیں اقبال نے کہا ہے کہ تقدیرات لا انتہا ہیں مشہور مقولہ ہے کہ روما کا شہر ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا۔ قوموں کی تعمیر میں بھی وقت لگتا ہے۔ بقول اقبال کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ۔

منزلِ عشق گرچہ بسے دور دراز است ولے

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

جس طرح قوموں کا زوال و انحطاط اہمال و تدریج سے ہوتا ہے اسی طرح ان کا عروج و اقبال بھی تحمل اور سعئ پیہم کا محتاج ہے۔ کہنے کو تو یہ حسن اتفاق ہے لیکن انتظامِ عالم میں سعئ مسلسل

تقدیراتِ حیات کی تعدیل معادلہ میں جملہ شرطیہ کا اعتبار رکھتی ہے۔ جس طرح ہم کبھی کبھی حوادث ناگہانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح کبھی کبھی سرراہے خوش نصیبی کی دولت بھی ہاتھ آجاتی ہے مگر یہ تو نہ ہو کہ جامہ نہ دارم دامن از کجا آرم، کا مضمون ہو جائے۔ گو شاذونادر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ عاملان قضا قدر جامہ بھی دیتے ہیں اور دامن بھی بھر دیتے ہیں۔ بہ ہر صورت راہِ طلب میں شرط سفر ناگزیر ہے۔

دادیم ترا از گنجِ مقصود نشاں
گر ما نہ رسیدیم تو شاید برسی

اور اس جدوجہد یعنی منزل عشق کی شرطِ اول یہ ہے کہ۔

؎ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اور یہ اس لئے کہ کسی اداشناسِ فطرت کا قول ہے۔

شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

عصر حاضر کی لادین اشتراکیت کا مطمح نظر بے شک نسبتاً زیادہ وسیع ہے، اور اس کے جوش وسرگرمی کا بھی وہی عالم ہے جو کسی نئے مذہب کا، لیکن اس کی اساس چونکہ ہیگل کے مخالف نظر متبعین پر ہے، لہٰذا وہ اس چیز ہی سے برسرِ پیکار ہے، جو اس کے لئے زندگی اور طاقت کا سرچشمہ بن سکتی تھی بہر حال یہ وطنیت ہو، یا لادین اشتراکیت، دونوں مجبور ہیں کہ بحالتِ موجودہ انسانی روابط کی دنیا میں تطابق و توافق کی جو صورت ہے، اس کے پیش نظر کسی کو نفرت، بدگمانی اور غم و غصہ پر اکسائیں۔ حالانکہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے۔

(از تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجم سید نذیر نیازی)

برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث

احمد اقبال ایم اے لیکچرار اسلامیات، سندھ یونیورسٹی

علم حدیث کا تاریخی ارتقاء اور مختلف ممالک اسلامیہ میں اس کی اشاعت ایک بہت وسیع مضمون ہے۔ ہمارے پیش نظر اس وقت صرف برصغیر پاک و ہند میں اس علم کی ابتدائے اشاعت، اس کی نشوونما اور فروغ، اس کی ارتقائی تاریخ اور محدثین کے مختصر احوال پیش کرنا ہے۔

پاک و ہند میں علم حدیث کی اشاعت و توسیع کو اس کے ارتقائی مدارج کے لحاظ سے پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور آغاز علم حدیث کا ہے جب کہ ہمیں سرزمین عرب سے براہِ سمندر سندھ اور سواحل ہند کے بعض دوسرے خطوں میں صرف رواۃِ حدیث کے ورود اور بعض مقامی محدثین اور ان کے مدارس کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور کی ابتدا قرن اوّل سے شروع ہو جاتی ہے۔ جسے ہم سلطان محمود غزنوی کے حملہ یعنی پانچویں صدی ہجری پر ختم کرتے ہیں۔

دوسرا دور سلطان محمود غزنوی کے حملے سے شروع ہو کر آٹھویں صدی پر ختم ہوتا ہے اس میں علم حدیث کی اشاعت و ترویج زیادہ تر درۂ خیبر کے راستے سے آنے والے اصحاب علم کے ذریعہ ہوئی۔ جن کا تعلق بالعموم صوفیا و مشائخ سے تھا۔ اس ضمن میں چند ممتاز محدثین اور ان کی تصانیف آتی ہیں۔

تیسرا دور آٹھویں صدی سے شروع ہوتا ہے جب کہ احمد شاہ اوّل والی گجرات کے عہد میں عرب و ہند کا بحری راستہ قائم ہوا اور چند اکابر محدثین حجاز، عراق اور ایران سے ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے۔ اور ان کی آمد سے علم حدیث کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اس میں گجرات کو

علم حدیث کی مرکزیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس دور کو علم حدیث کے توسیعی دور کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ دسویں صدی کے نصف اول پر ختم ہوتا ہے۔

چوتھا دور چودھویں صدی سے گیارہویں صدی تک کا ہے اس میں علم حدیث کی مرکزیت گجرات سے دہلی منتقل ہوتی ہے۔ ہم اس دور کو اس علم کے استقلالی دور سے موسوم کرتے ہیں اس کی امامت شیخ الہند عبدالحق محدث دہلوی اور مجدد الف ثانی نے فرمائی۔

پانچواں دور جس کا آغاز بارہویں صدی سے ہوتا ہے اس کو ہم علم حدیث کے تکمیلی دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی امامت امام العصر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے سر ہے اور تا حال جاری ہے۔

پہلا دور قرن اول سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک

عرب و ہند کے تجارتی تعلقات تو قبلِ اسلام ہی سے تھے اسلام کے بعد ان روابط میں مزید اضافہ ہوا اور قرن اول سے ہی مبلغین اور مجاہدین اسلام سواحل سندھ و ہند پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کے بعد سندھ مستقل طور پر خلافت اسلامیہ کا ایک صوبہ ہو گیا اور یہاں صحابہ تابعین اور اتباع تابعین آئے۔ بعض اصحاب بنی ہاشم اموی اور عباسی خلفاء کے خوف سے بھی ہجرت کر کے یہاں سکونت پذیر ہوئے پھر مسلسل اہل علم آتے رہے۔ یہاں وہ مستقل متوطن ہوئے ان کی نسلیں پھیلیں اس طرح یہاں چار صدیوں تک علم حدیث کی اشاعت ہوتی رہی[1]۔ دوسری صدی کے وسط تک تو سندھ مرکزی خلافت سے وابستہ رہا۔ اس کے بعد طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ اور خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں مگر پھر جب یہاں باغیوں کو بالادستی حاصل ہوئی تو کچھ عرصہ کے لئے عام مسلمانوں کا یہاں سے تعلق ختم ہو گیا اس طرح علم حدیث کی اشاعت اور علمائے حدیث کی مساعی زیادہ تفصیلات محفوظ نہ رہ سکیں۔ البتہ چند رواۃِ حدیث اور محدثین کے نام اور ان کے مدارس کا ذکر تلاش سے ملتا ہے۔ ذیل میں ہم صرف انہیں محدثین کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے یہاں علم حدیث کی اشاعت میں حصہ لیا۔ وہ حضرات

---

[1] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند عبدالحیٔ الحسنی ص ۱۲۵

جن کا تعلق تو سندھ وہند سے تھا مگر وہ ہجرت فرما کر دوسرے ملکوں میں متوطن ہو گئے۔ اور یہاں ان کا فیض عام نہ ہو سکا۔ ان کا ذکر ہم اس مضمون میں نہیں کر رہے ہیں۔

رواۃِ حدیث از اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اصابہ میں مذکور ہے کہ سر باتک ہندی راجہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ حضرت اسامہ حضرت صہیب وغیرہ کو خط دیکر اس کے پاس بھیجا۔[1] اس روایت کی تائید جمع الجوامع سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پانچ صحابیوں کے ہمراہ ایک مکتوب گرامی باشندگان سندھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ اہل سندھ میں بعض نیک دل حکمراں اس خط سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے پانچ صحابیوں میں سے دو اصحاب سندھیوں کا ایک وفد ساتھ لے کر حضور کی خدمت میں واپس تشریف لے گئے اور باقی تین اصحاب سندھ میں ہی رہ گئے۔[2]

رواۃِ حدیث از تابعین و اتباع تابعین۔ مورخ بلاذری نے لکھا ہے کہ عہد فاروقی میں عثمان بن ابی العاص الثقفی گورنر بحرین نے اپنے بھائی الحکم بن ابی العاص الثقفی کو بروچ[3] کی

---

[1] سر باتک ہندی زعم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ارسل الیہ حذیفۃ واسامہ وصہیبا وغیرہم اصابہ محولہ تاریخ القرآن۔ از عبد الصمد صارم ص ۶۹

[2] "سرزمین سندھ میں علم حدیث" از مخدوم امیر احمد رسالہ الرحیم جولائی ۶۳ء

[3] بروچ جسکو مسعودی نے بروص لکھا ہے اصل میں بھڑوچ ہے جو اس وقت سورت اور بڑودہ کے درمیان ایک ضلع کا صدر مقام ہے بلاذری نے لکھا ہے "بندر کبیر من بنادر الہند" علامہ سید سلیمان ندوی نے اسی بھڑوچ کے بارے میں اپنے تاثرات ایک نظم میں ظاہر فرمائے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کے لئے اس کے منتخب حصے پیش کر دیئے جائیں۔

جانتی ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز
تیرے دروازے پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز

ہند میں اسلام کے انجام کی آغاز تو
چار صدیوں تک رہی اسلام کی دمساز تو

رشتہ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار
تیرے ساحل کا ہر ایک ذرہ ہے اسکی یادگار

اے بھڑوچ اے خاتم انگشت رودِ نربدا
عہد ماضی کی تیرے باقی رہے عزت سدا

(تاریخ گجرات از سید ابو ظفر ندوی)
جولائی ۶۴ء

طرف بھیجا تھا۔ ابن الاثیر نے اسد الغابہ میں آپ کو صحابہ کی فہرست میں شمار کیا ہے مگر اکثر اہل حدیث نے آپ کو تابعی کی حیثیت سے قبول کیا ہے اور آپ کی مرویات مراسیل میں شمار ہوتی ہیں۔

سنان بن سلمہ بن المحبق الھذلی۔ اصابہ میں آپ کی پیدائش عہد نبوی میں بیان کی گئی ہے۔ زیاد نے ۵۰ھ میں آپ کو غزوہ ہند میں بھیجا تھا۔ ابن سعد نے آپ کو تابعین کے طبقہ اولیٰ میں شمار کیا ہے۔

شیخ محدث الربیع بن صبیح السعدی بصرہ کے رہنے والے تھے۔ سعد بن زید مناۃ قبیلہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ کا شمار تابعین کے طبقہ متوسط سے ہے۔ بڑے عابد و زاہد تھے۔ ۱۵۹ھ میں خلیفہ المہدی عباسی نے عبدالملک بن شہاب سمعی کو ہندوستان جہاد کے لئے روانہ کیا اس مہم میں ربیع بن صبیح بھی شریک تھے طبقات ابن سعد میں ہے کہ جہاد کے لئے سمندر کے راستے سے ہند گئے۔ وفات پا جانے پر جزائر ہند کے ایک جزیرہ میں دفن کئے گئے۔ یہ واقعہ خلیفہ مہدی کے ابتدائی ایام ۱۶۰ھ کا ہے۔[1]

تہذیب التہذیب میں ہے کہ آپ بصرہ کے پہلے مصنف ہیں۔ صحاح ستہ کی کتاب ابن ماجہ باب الجہاد میں آپ کی روایت کردہ حدیث موجود ہے۔ سفیان ثوری وکیع اور ابن مہدی نے آپ سے روایت کی ہے۔[2]

موسیٰ بن یعقوب ثقفی اور دی سندھی ۹۳ھ میں محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ تشریف لائے۔ سندھ فتح ہونے کے بعد آپ یہاں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے رواۃِ حدیث میں سے ہے۔

اسرائیل بن موسیٰ ابو موسیٰ البصری نزیل ہند۔ اتباع تابعین میں سے تھے حضرت امام حسن بصری کے شاگرد تھے۔ ہندوستان کی طرف بکثرت سفر فرمایا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ کا لقب نزیل ہند ہو گیا تھا۔ ابن حبان نے آپ کو ثقات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے "کان یسافر الی الھند" امام بخاری نے

---

[1] محولہ تاریخ گجرات از سید ابو الظفر ندوی ص ۲۰۰

[2] حاشیہ الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن از مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی

صحیح میں ان سے روایت کی ہے۔

ان مشاہیر رواۃِ حدیث کے علاوہ مندرجہ ذیل مقامی محدثین کے نام بھی ملتے ہیں۔ منصور بن حاتم النحوی۔ ابراہیم بن محمد الدیبلی۔ احمد بن عبداللہ الدیبلی۔ احمد بن محمد المنصوری۔ ابوالعباس بڑے پائے کے محدث تھے۔ امام داؤد ظاہری کے مسلک پر عامل تھے۔ ان کے علاوہ شعیب بن محمد بن الدیبلی۔ علی ابن موسیٰ الدیبلی۔ فتح بن عبداللہ السندی۔ اور محمد بن ابراہیم الدیبلی نے بھی اس علم کی خدمت کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔

غرض سلطان محمود غزنوی کے حملہ ہند سے قبل تک سندھ ہی علم حدیث کا مرکز رہا اور یہاں علم حدیث کے ایسے علماء پیدا ہوئے جن کا شمار ممتاز ترین محدثین میں ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ان کے فیض سے نہ صرف ہندوستان میں حدیث کا علم پھیلا بلکہ خود حجاز و عراق کے مرکز علم میں بھی ان کا فیض جاری رہا۔ ایسے ہندی علمائے حدیث کی ایک بہت بڑی فہرست تیار ہو جاتی ہے، جنہوں نے ہند سے ہجرت کر کے عالم اسلام کے دوسرے حصوں میں علم حدیث کی خدمت کی۔ ان میں ابومعشر نجیح سندھی امام فن مغازی وسیر اور رجاء السندی اسفرائینی جن کے لئے حاکم نے لکھا ہے "کان رکن من ارکان الحدیث" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دوسرا دور

ہندوستان میں علم حدیث کے ورود کا دوسرا دروازہ درۂ خیبر ہے۔ پانچویں صدی ہجری سے مسلمان اس راستے سے ہندوستان آنے شروع ہوئے ۴۱۲ھ میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور فتح کیا۔ سلطان مسعود کے عہد میں سب سے پہلے محدث شیخ اسمٰعیل لاہور میں تشریف لائے آپ فن حدیث و تفسیر کے جامع تھے۔ ایک خلق عظیم آپ کے ہاتھوں پر مشرف باسلام ہوئی۔ ۴۴۸ھ میں آپ نے لاہور میں وفات پائی۔ تاریخ علماء ہند میں ہے۔

"از عظماء محدثین و مفسرین بود و اوّل کسے است کہ علم حدیث و تفسیر به لاہور آورد۔"

شیخ موصوف کے بعد جس بزرگ کا فیض لاہور میں عام ہوا، وہ محدث حسن بن محمد صغانی

کی ذات ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے آباء و اجداد غزنی کے رہنے والے تھے، آپ کے والد نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ ۵۷۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی، پھر حجاز و عراق میں جا کر علم کی تکمیل کی لغت اور حدیث کے امام قرار پائے اور بغداد میں خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نام سے حدیث کی ایک کتاب مشارق الانوار تصنیف فرمائی جو مشکوٰۃ کی طرح حدیث کی مختلف کتابوں کا منتخب مجموعہ ہے شارح الکازرونی کی تصریح کے مطابق اس کتاب میں دو ہزار چھیالیس حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ مشارق الانوار کی ترتیب فقہی کتابوں کے طرز کے بجائے احادیث کے ابتدائی الفاظ پر مرتب کی گئی ہے مثلاً مَن موصولہ سے شروع ہونیوالی احادیث اِذ یا اِذا سے، قد یا لو سے، پوری کتاب بارہ ابواب پر منقسم ہے۔[1] مشارق الانوار کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ بے شمار علماء نے اس کی شرحیں تحریر کیں اور ایک عرصہ تک یہ کتاب ہندوستان مدارس میں داخل نصاب رہی۔

حضرت نظام الدین اولیا نے مشارق الانوار کا درس مولانا کمال الدین زاہد دہلوی سے لیا تھا اور انہوں نے مولانا برہان الدین بلخی سے اور انہوں نے خود مصنف سے یہ کتاب پڑھی تھی۔[2]

مشارق الانوار کی شروح میں سید محمد یوسف دہلوی دفین بہ گلبرگہ کی فارسی زبان میں، شیخ منور بن عبدالمجید لاہوری کی شرح، سید احمد بن محمد الفریضی الکردی کی فارسی شرح اور تحفۃ الاخیار مصنفہ مولوی خرم علی بنوری مشہور ہیں۔[3] صاحب کشف الظنون نے مشارق کی ایک شرح ابجلی کا ذکر کیا ہے۔[4] مشارق الانوار کے علاوہ فن حدیث میں شیخ موصوف کی دو اور کتابیں بھی معروف ہیں۔ ایک "مصباح الدجی فی حدیث المصطفیٰ" اور دوسری الشمس المنیرہ[5]

---

[1] رجال السند والہند مصنفہ قاضی اطہر مبارکپوری ص۱۰۳

[2] تاریخ علماء ہند ص۱۷۳

[3] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند مصنفہ عبدالحی الحسنی ص۱۵۵

[4] بحوالہ رجال السند والہند مصنفہ قاضی اطہر مبارک پوری، ص۱۰۲

[5] " " " " " "

شیخ حسن بن محمد صغانی کو خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے دربار میں بڑی عزت حاصل تھی۔ خلیفہ نے آپ کو رضیہ سلطانہ ملکۂ ہند کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اس سے پہلے شمس الدین ایلتمش کے عہد میں بھی آپ خلیفہ کے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان آچکے تھے۔ غرض آپ عالم اسلام کے ذی مقتدر علماء میں سے تھے۔ بغداد، دہلی اور لاہور سب ہی جگہوں پر آپ کا فیض عام ہوا۔ امام جلال الدین سیوطی اور امام الذہبی نے آپ کو "المنتہی فی اللغۃ" تسلیم کیا ہے دمیاطی نے لکھا ہے "انہ کان اماما فی اللغۃ والفقہ والحدیث"۔ آپ کے شاگردوں میں شیخ شرف الدین الدمیاطی نظام الدین محمود بن عمر الھروی، محی الدین ابو البقا، صالح بن عبد اللہ الاسدی الکوفی المعروف بابن الصباغ اور شیخ برہان الدین محمود بلخی ثم دہلوی جیسے علماء شامل ہیں[1] آپ کی وفات ۶۵۰ھ میں ہوئی۔

شیخ برہان الدین محمود دہلوی جو علم حدیث میں امام صغانی کے شاگرد تھے اور علم فقہ کی تعلیم امام مرغینانی صاحب ہدایہ سے حاصل کی تھی، غیاث الدین بلبن کے وقت میں دہلی تشریف لائے دہلی میں آپ مشارق الانوار کا درس دیتے تھے۔ آپ نے آثار النیرین فی اخبار الصحیحین کی شرح تصنیف فرمائی[2]

اسی زمانے کے دوسرے بزرگ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے ان سے طریقۂ سہروردیہ کی خوب اشاعت ہوئی۔ ملتان میں ۵۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ کمال یمنی سے حدیث پڑھی۔ ۵۳ برس تک مدینہ شریف میں حدیث پڑھائی پھر ہندوستان واپس تشریف لائے اور ۶۶۱ھ میں وفات پائی حضرت سے ملتان کے جوار میں علم حدیث کی اشاعت ہوئی۔

مولانا برہان الدین کے شاگرد مولانا کمال الدین زاہد مشارق الانوار کا درس دہلی میں دیتے تھے آپ اپنے وقت کے بہت بڑے محدث تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے آپ کو اپنا امام

---

۱ رجال السند والہند مصنفہ قاضی مبارکپوری ص ۱۰۱

۲ ایضاً۔ اور ترجمہ تذکرہ علماء ہند ص ۱۳۰

مقرر کرنا چاہا مگر آپ راضی نہ ہوئے۔

مولانا کمال الدین سے سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء نے علم حدیث حاصل کیا۔ اور مشارق الانوار کی سند لی۔ مشارق الانوار آپ کو زبانی یاد تھے۔ آپ نے ۷۲۵ھ میں وفات پائی۔[1]

اسی عہد میں ہمیں حضرت شرف الدین ابو توامہ بنگال میں اس علم کی خدمت کرتے نظر آتے ہیں سنار گاؤں میں آپ کا مدرسہ تھا۔ آپ بڑے پائے کے محدث تھے آپ کے شاگرد شرف الدین احمد بن یحییٰ بہاری بہت مشہور ہوئے جنھوں نے قابل قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔ آپ طریقت میں خواجہ نجیب الدین فردوسی دہلوی کے مرید تھے، آپ کی زیادہ تر تصانیف آداب طریقت اور اسرار حقیقت کے بیان میں ہیں۔[2]

حضرت سلطان المشائخ نظام الاولیاء کے بعد فن حدیث کی اشاعت میں ان کے شاگردوں اور خلفاء نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ جن میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، مولانا فخر الدین اور مولانا شمس الدین قابل ذکر ہیں۔ مولانا شمس الدین نے مشارق الانوار کی شرح بھی تحریر فرمائی۔

غرض اس دور میں امام صغانی لاہوری تنہا محدث مصنف ہیں اور مشارق الانوار اس عہد کی تنہا خدمت حدیث ہے۔

ہندوستان میں درۂ خیبر کے راستے سے جو علماء وارد ہوئے وہ اپنے ساتھ زیادہ تر فقہ منطق فلسفہ اور علم کلام لائے۔

فقہ پر چونکہ نظام حکومت کا دارومدار تھا اس لئے یہ سلاطین سے تقرب کا ذریعہ تھا۔ عہد تیموری سے پہلے تک یہاں علم حدیث کا بہت کم رواج تھا۔ چنانچہ تغلق کے زمانے تک حدیث میں صرف مشارق الانوار طلبہ کے زیر درس تھی علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم اس زمانے کے حالات پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ اس فن شریف کے لاہور و دہلی کے مرکز سلطنت میں زیادہ اشاعت نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں سفر حجاز کے لئے خشکی کا راستہ مستعمل

---

[1] تذکرہ علماء ہند مترجمہ محمد ایوب قادری ص ۱۳۱

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۱۷۵

تھا۔ یہ راستہ اس قدر دور دراز اور پُرخطر تھا کہ بمشکل آمد و رفت ممکن تھی، اس طرح مسلمان مرکزِ علم حدیث کے سرچشمہ سے بے تعلق تھے۔

سلاطین اور خدمتِ علم حدیث

سلاطین دہلی میں محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق علم دین کے بڑے قدر داں تھے۔ محمد تغلق کے زمانہ میں علامہ ابن تیمیہ کے ایک شاگرد شیخ عبدالعزیز الاردویلی ہندوستان تشریف لائے تو سلطان نے خود ان سے حدیث شریف سنی اور ان کی بڑی عزت کی غرض اس کے عہد میں اہل شرع کو بڑا وقار حاصل ہوا۔ برنی لکھتا ہے۔

واز برائے جریان احکام شریعت قاضیان و مفتیان و داعیان و محتسبان عہد او را آبروئے بس بسیار و آشنائی تمام آمدہ بود۔

فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں علوم دینیہ کو جو فروغ حاصل ہوا اسکی مثال پورے سلطنت دہلی کے دور میں نہیں ملتی اس عہد میں کئی قابل ذکر فقہی تصانیف کے نام ملتے ہیں۔ جن میں فقہ فیروز شاہی اور فتاویٰ تاتارخانیہ نے شہرت دوام حاصل کی۔ فیروز شاہ کے زمانے کا مشہور شاعر مطہر اپنے ایک قصیدے میں حوض علائی کے مدرسہ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

گفت ایں مدرسہ و باغ شہنشاہ جہاں است — اندروں آئی کہ یک حسن بہ بینی بہ ہزار

گفتم ایں عالم آفاق جلال الدین است — رومی، آں کز نسبش رسے کند و روم فخار

راوی ہفت قرأت سندِ چار دہ علم — شارح پنج سنن مفتی مذہب ہر چار

پس شنیدیم ز گفتارش انواع علوم — اخذ کردیم ز تفسیر و اصول و اخبار

ان شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن، حدیث، تفسیر فقہ اور اصول سب ہی علوم دینیہ کو اس عہد میں خاص اہتمام حاصل رہا، مگر سلاطین ہند میں سے جس سلطان کو خاص طور سے علم حدیث کی اشاعت کا شرف حاصل ہوا ہے وہ سلطان محمود بہمنی المتوفی ۷۹۹ھ کی ذات ہے فرشتہ نے سلطان کے حال میں لکھا ہے۔

دجہت محدثان اخبار حضرت نبوی صلعم در شہر ہائے کلاں وظائف مقرر کردہ

در تعظیم ایشان میکوشید،

تیسرا دور آٹھویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک

اس دور میں علم حدیث کی مرکزیت گجرات کو حاصل ہو جاتی ہے۔ جس کا آغاز مظفر شاہ والیٔ گجرات کے خلف الرشید احمد شاہ اول کے عہد سے ہوتا ہے احمد شاہ نے عرب و ہند کا بحری راستہ دوبارہ قائم کیا جس سے علماء حدیث مرکز علم حجاز و عراق سے یہاں براہ راست آنے جانے لگے۔

سب سے پہلے بزرگ جو علم حدیث کی نعمت ایران سے لیکر گجرات وارد ہوئے وہ مولنا نورالدین احمد شیرازی تھے آپ سید شریف جرجانی کے شاگرد تھے صحیح کی ان کی سند اتنی عالی تھی کہ وہ حجاز و یمن پہنچی تو بڑے بڑے محدثین نے اس کو شوق و ذوق کے ساتھ حاصل کیا آپ کے بعد اور بھی بہت سے محدثین گجرات کی سرزمین میں وارد ہوئے" جنہوں نے اس فن شریف کی بڑی خدمت کی اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم شخصیت مولانا راجح بن داؤد گجراتی کی ہے۔ جنہوں نے شیخ المحدثین حافظ سخاوی سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا "درالغیبہ" کی سند انہی سے لی تھی۔ سنہ ۹۰۴ھ میں بمقام احمد آباد آپ کی وفات ہوئی۔

حافظ سخاوی کے دوسرے شاگرد مولانا وجیہ الدین ہیں جنہیں گجرات میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور ملک المحدثین کے لقب سے یاد کئے گئے۔ آپ نے شرح نخبۃ الفکر کی شرح تصنیف کی۔ مظفر شاہ حلیم سلطان گجرات کے زمانے میں حافظ سخاوی کے ایک اور شاگرد جمال الدین محمد بن عمر حضرمی آئے۔ سلطان نے آپ کی بڑی تعظیم کی اور ان سے خود سند حدیث حاصل کی مگر اس عہد کی سب سے ممتاز شخصیت جس کے فیض کی شعاعیں سرزمین ہند کے شمالی و جنوبی دونوں حصوں کو منور کرتی رہیں، وہ سید رفیع الدین صفوی شیرازی کی ہے آپ معقولات میں محقق دوانی کے شاگرد تھے اور علم حدیث کی سند شیخ المحدثین حافظ سخاوی سے حاصل کی تھی آپ یہ سرمایہ سعادت گجرات لائے اور حدیث کا درس دینا شروع کیا۔ جوق در جوق طالبان علم آپ کے حلقۂ درس کی زینت بنے۔

سلطان سکندر لودھی نے جس نے کہ آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا علماء

کی بڑی قدردانی کی اس طرح آگرہ بہت جلد علم و فن کا مرکز بن گیا۔ اگرچہ اس زمانے میں شمالی ہند میں زیادہ زور علوم معقولات پر ہی تھا بالخصوص شیخ عبداللہ تلبنی اور شیخ عزیز اللہ نے ان کے درس و تدریس کے معیار کو بہت بلند کر دیا تھا۔ بادشاہ کی ان علوم سے دلچسپی کا حال یہ تھا کہ وہ شیخ عبداللہ کے درس میں شریک ہوتا تھا۔ سید رفیع الدین صفوی کی شہرت جب عام ہوئی تو سلطان سکندر لودھی نے آپ سے دلی آنے کی درخواست کی۔ آپ گجرات سے دلی اور پھر آگرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری فرمایا۔ غرض سکندر لودھی کی علم نوازی سے شمالی ہند میں بھی قال قال رسول اللہ کے نغمے گونجنے لگے۔ سید صفوی کے شاگردوں میں سب سے زیادہ معروف شیخ ابوالفتح تھانیسری ہیں جو غالباً سب سے پہلے ہندوستانی ہیں جو محدث کے لقب سے مشہور ہوئے شیخ ابوالفتح پچاس برس تک علم حدیث کا درس آگرہ میں دیتے رہے آپ کے شاگردوں میں ملا عیسیٰ، مولانا کمال الدین اور ملا بدایونی جیسے علما پیدا ہوئے۔

شیخ ابوالفتح کے ایک معاصر سید عبدالاول جینی تھے جن کے آبا و اجداد جونپور کے رہنے والے تھے۔ آپ نے گجرات میں تعلیم حاصل کی پھر علم حدیث کی تکمیل کے لئے حجاز تشریف لے گئے وہاں سے پھر گجرات تشریف لائے اور درس حدیث کا سلسلہ جاری فرمایا۔ خانخاناں نے عہد اکبری کے اوائل میں انہیں گجرات سے دلی آنے کی دعوت دی۔ آپ سب سے پہلے ہندوستانی محدث ہیں جنہوں نے ہندوستان میں پوری صحیح بخاری کی مبسوط شرح بنام فیض الباری لکھی، سفر السعادۃ کا خلاصہ بھی آپ نے تالیف فرمایا۔

سید عبدالاول گجراتی کے شاگرد شیخ طیب سندی ہیں اپنے استاذ کی طرح آپ اس فن شریف کی خدمت میں مصروف رہے تقریباً پچاس برس تک آپ ایلچ پور اور برہان پور میں درس حدیث دیتے رہے۔ آپ نے ترمذی شریف کی شرح قلم بند فرمائی۔ امام سخاوی کے سلسلہ سند کے ایک محدث جو بہت مشہور ہوئے عبدالملک گجراتی تھے جنہیں بخاری شریف زبانی یاد تھی۔

برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث کے سلسلے میں دسویں صدی ہجری کے اب تک جن محدثین کا ذکر کیا گیا ہے، وہ زیادہ تر شیخ المحدثین حافظ سخاوی کے سلسلہ تلمذ سے تعلق رکھتے تھے مگر حجاز کے دوسرے شیخ الحدیث جن کے ہندی تلامذہ کے فیض نے ہندوستان میں علم حدیث

کے منہج دور کا آغاز کیا، وہ ذات گرامی حضرت شیخ الحدیث حافظ ابن حجر ہیتمی کی ہے آپ کے شاگردوں
میں سب سے زیادہ ممتاز ہندوستان کے ستارۂ درخشاں شیخ الحدیث شیخ علی متقی برہانپوری
ہیں جنہوں نے ملتان و گجرات سے علم ظاہر و باطن کی تکمیل کی پھر حرمین تشریف لے گئے۔ جہاں
شیخ ابن حجر ہیتمی اور شیخ ابو الحسن بکری سے سند حدیث حاصل کی اور ۹۷۱ھ میں حدیث کی وہ
دائرۃ المعارف ترتیب دی جو "کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال" کے نام سے مشہور ہے آپ
کی دوسری تصنیف رسالہ منہج العمال ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کے بعد امام رزین اور حافظ جلال الدین
سیوطی کے مجموعوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ کنز العمال کافی ضخیم ہے، اسمیں جمع الجوامع مصنفہ جلال الدین
السیوطی کو جامع الاصول کے طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔ شیخ موصوف نے ان دو بڑی کتابوں کے
علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے اس فن شریف میں تصنیف فرمائے جیسے البرہان فی
علامات مہدی آخر الزماں جو العرف الوردی فی اخبار المہدی کی تلخیص ہے اور عقد الدرر فی اخبار
المہدی المنتظر وغیرہ۔

شیخ ابن حجر ہیتمی کے دوسرے قابل ذکر تلامذہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا محمد بن عبداللہ المتوفی ۹۹۲ھ گجرات میں مقیم ہوئے

۲۔ سید عبداللہ عیدروس المتوفی ۹۹۰ھ محدث گجرات

۳۔ شیخ سعید حبشی الشافعی محدث گجرات

۴۔ سید مرتضیٰ شریفی جرجانی شاگرد امام ہیتمی آگرہ میں درس حدیث دیتے تھے۔

۵۔ محدث جوہر ناتھ کشمیری نو مسلم تھے۔ ملا علی قاری سے سند حاصل کی تھی۔ کشمیر میں درس
حدیث دیتے تھے۔

شیخ یعقوب صرفی جنہوں نے شیخ ہیتمی کے علاوہ ابو الحسن بکری اور ملا جامی سے
بھی سندات حدیث حاصل کی تھیں۔ بخاری شریف کی شرح تصنیف فرمائی اور مغازی
پر کتاب لکھی۔ آپ سے حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے سند حدیث حاصل کی۔

اس تیسرے دور میں اس فن شریف کا مرکز بڑی حد تک گجرات رہا پھر گجرات
سے یہ فیض شمالی ہند اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پھیلا۔ اور درس حدیث کے

حلقوں نے بڑی وسعت اختیار کی اور متعدد تصانیف بھی وجود میں آئیں جن میں شیخ علی متقی برہانپوری کی کنز العمال کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، جو ہندوستان میں مشارق الانوار کے بعد دوسری اہم حدیث خدمت کہلانے کی مستحق ہے۔ غرض ہم اس دور کو علم حدیث کے توسیعی دور کے نام سے منسوب کر سکتے ہیں۔

ائمہ اربعہ میں، بجز امام مالک کے، کہ آپ نے کبھی طلب علم کے لئے مدینہ سے باہر قدم نہیں نکالا (کیونکہ اس وقت خود مدینہ دار العلم تھا اور تمام ممالک کے شیوخ و اساتذہ خود آستانۂ نبوی پر حاضر ہوتے تھے) بقیہ تمام ائمہ کے اسفار علمیہ ثابت ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ کوفیؒ نے طلب علم میں بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ کا سفر کیا تھا۔ اور اکثر سال سال بھر کے قریب کم و بیش قیام رہتا تھا۔ اس زمانے میں حج بھی افادہ و استفادہ کا بڑا ذریعہ تھا۔ کیونکہ ممالک اسلامیہ کے گوشے گوشے سے بڑے بڑے اہل کمال حرمین میں آکر جمع ہو جاتے تھے۔ اور درس و افتاء کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ امام ابو المحاسن مرغینانی نے بسند نقل کیا ہے کہ آپ نے پچپن حج کئے تھے۔ علاوہ ازیں ۱۳۰ھ سے لے کر منصور عباسی کے زمانۂ خلافت تک، جس کو چھ سال کا عرصہ ہوتا ہے، آپ کا مستقل طور پر قیام مکہ معظمہ ہی میں رہا۔ امام شافعی کے متعدد سفروں میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے حسب ذیل مقامات کے نام لئے ہیں۔ مدینہ، یمن، عراق اور مصر۔ امام احمد بن حنبل نے طلب حدیث میں کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا تھا۔۔ حافظ ذہبی نے مناقب ابی حنیفہ و صاحبیہ میں خود امام محمد کی زبانی نقل کیا ہے کہ میرے پدر بزرگوار نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے۔ میں نے ان میں سے پندرہ ہزار نحو اور شعر کی تحصیل میں صرف کئے اور پندرہ ہزار حدیث و فقہ کی تکمیل پر

(مولانا محمد عبد الرشید نعمانی از "امام ابن ماجہ اور علم حدیث")

سید محی الدین قطب ویلوری

محمد سخاوت مرزا قادری (بی اے ایل ایل بی عثمانیہ)

اسم گرامی وسلسلۂ نسب :- سید شاہ عبداللطیف[1] ثالث نام شاہ محی الدین قطب ویلوری (مدراس)، سادات نقوی ابن سید شاہ ابوالحسن قادری المتخلص بہ محوی ابن سید شاہ محی الدین عبداللطیف المتخلص بہ ذوقی، ابن سید رکن الدین محمد المعروف بہ سید شاہ ابوالحسن قربی۔ ابن سید شاہ عبداللطیف قادری بیجاپوری ابن میراں سید ولی اللہ ابن شاہ عبداللطیف المعروف بہ باپوجی گجراتی ثم بیجاپوری۔

اجداد قطب ویلوری :- آپ کے اجداد میں سے ایک بزرگ سید محمد تھے۔ جو مدینہ منورہ اور بغداد سے کشمیر تشریف لائے۔ یہ بزرگ اس خانوادے کی چودہویں پشت میں تھے۔ قرائن یہ ہیں کہ وہاں یہ خاندان تقریباً ایک صدی تک متوطن رہا۔ اس کے بعد بیسویں پشت کے بزرگ مولانا سید عبدالفتاح نے کشمیر کو خیرباد کہا اور وہ دہلی وارد ہوئے۔

---

[1] حضرت سید محی الدین قطب ویلوری نے شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے علم حدیث کی سند حاصل کی تھی اس لحاظ سے موصوف شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ایک واسطے سے شاگرد ہیں اور ان کا شمار سلسلہ شاہ ولی اللہ میں کیا جاسکتا ہے۔

[2] رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو پاکستان) جولائی ۱۹۵۲ء ص ۲ مضمون احقر۔ بحوالہ جواہر السلوک مصنفہ قطب ویلوری۔

اسی خاندان کے ایک بزرگ سید برہان الدین نے عراق کے شہر ۔۔۔ سے نقل وطن کرکے احمد آباد گجرات میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور یہیں وہ واصل بحق ہوئے ان کے صاحبزادے قاضی سید اسمٰعیل گجراتی بلحاظ علم و فضل اکابر اولیا، گجرات سے تھے۔ اور حضرت سید عالم شاہ بخاری گجراتی (م ۸۸۸ھ) کے دیکھنے والے اور خلیفہ تھے۔ ان کے فرزند مولانا سید عبدالفتاح[1] وہ مشہور بزرگ ہیں جن کی شرح مثنوی مولانا روم اور شرح جام جہاں نما ہے۔ غرض حضرت قطب ویلوری کے جد اعلیٰ ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں پہلے کشمیر آئے۔ یہ سلاطین تغلق کا زمانہ تھا۔ آپ کے جد محترم سید عبداللطیف عرف باپوجی گجرات ہی سے بزمانۂ سلطان محمد عادل شاہ ($\frac{۱۰۳۷}{۱۰۶۷}$ ھ) بیجاپور تشریف لائے آپ کے تقدس علم و فضل اور رواداری کی وجہ سے اہل مہاراشٹر یعنی مرہٹے انہیں باپوجی کے نام سے یاد کرتے تھے، اور صبح کے وقت آپ کے قدمبوس ہونا باعث برکت سمجھتے تھے۔ سلطان محمد عادل شاہ نے چند مواضعات نذر کیے اور چار ہون (اشرفی) بطور یومیہ وظیفہ مقرر کیا۔

سید عبداللطیف (پدر مولانا ابوالحسن قربی اور جد امجد صاحب زیر ترجمہ) عالمگیر کی وفات کے بعد بیجاپور سے شاہنور ضلع بلگام (احاطہ بمبئی) چلے آئے، پھر وہاں سے شہر سِرا اور وہاں سے ۱۱۳۲ھ میں آرکاٹ (علاقہ مدراس) آکر مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ ڈھائی سو سال سے یہ خاندان جنوبی ہند میں علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج میں مصروف ہے مولانا ابوالحسن قربی کی جدہ محترمہ حضرت[2] پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے تھیں۔ سلاطین بہمنیہ کے زمانے میں ان کے جد اعلیٰ سید یوسف ابن سید احسن الدین نجف اشرف سے گلبرگہ شریف دکن آئے تھے۔ ان کی اولاد و احفاد میں مولانا سید یونس شرف جہاں اور مولانا سید عبدالرحمن اشرف جہانگیر اور سید یونس ثانی گلبرگہ شریف میں اور مولانا سید شمس الدین بہاؤالدین عارف اور سید عبدالقادر عرف بید یوسف ثانی اور سید بدرالدین حبیب اللہ محمد آباد بیدر میں، جو سلاطین بہمنیہ و بریدیہ کا پایۂ تخت تھا، مدفون ہیں۔ سید شاہ ابوالحسن بیجاپور چلے آئے، جنکی ایک تالیف انساب میں مخزن السلاسل مشہور ہے۔

۱ھ شرح مثنوی مولانا روم مؤلفہ میر عبداللہ رضوی، مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ کا ماخذ شرح سید عبدالفتاح بھی ہے

۲ھ جواہر السلوک مصنفہ قطب ویلوری مطبوعہ۔ مراۃ احسن فی مناقب ابی الحسن (قربی) مؤلفہ باقر آگاہ (عربی) مخطوطہ

مولانا قربی میراں سید ولی اللہ کے پوتے اور میر ابوالقاسم خاں الملقب بہ ولایت خاں عظیم آبادی کے نواسے تھے۔

مولانا سید ابوالحسن قربیؒ[1] (۱۱۱۷ھ / ۱۱۸۶ھ) حضرت قطب ویلوری کے پردادا۔ بڑے عالم فاضل اور عارف کامل تھے۔ ان کے سینکڑوں شاگرد مدراس کے اضلاع اور مضافات میں پھیلے ہوئے تھے۔ فاضل اجل علامہ محمد باقر آگاہ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا قربی اردو اور فارسی کے جید شاعر اور صاحب تصنیف و تالیف تھے تبرکاً آپ کا کہا ہوا ایک بند بطرز بیدل ہدیۂ قارئین ہے جس کی بحر اکفض الجلیل د صوت الناقوس ہے۔

رنگ رانی جگ گلفام ہوئی　　　　مدماتی مے آشام ہوئی[2]
گل نرگس رنگیں جام ہوئی　　　　من جیون کو آرام ہوئی
یک درسن ہیں کے کام ہوئے

دکنی کلام بڑا عارفانہ اور محققانہ ہے۔

پابوس سوں عالم کے، توقیر نہیں آتی　　　　بندے کوں عنایت سوں توقیر خدا دیتا

وحدۃ الوجود اسلامی

بندہ سو بندہ، رب سو رب، نہیں عبد رب
رب نہیں ہے عبد مذہب منے عشاق کے یوں بوج کہ اللہ سب
خدا ہونا ہی مشکل ہے　　　　بندہ ہونا ہی مشکل ہے
سمجھتا ہے یہ نکتے کون　　　　جو عارف صاحب دل ہے

مولانا سید شاہ محی الدین عبداللطیف المتخلص بہ ذوقیؒ (۱۱۵۱ھ / ۱۱۹۴ھ) حضرت قطب ویلوری کے جد امجد تھے۔ آپ عارف کامل و جامع علوم ظاہری اور فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ قصائد میں عرفی کا اور مثنوی میں نظامی گنجوی اور مولانا جامی کا رنگ تھا۔

---

[1] گلدستہ کرناٹک فارسی، قلمی ص ۳۲ و مثنوی مطلع النور اردو مطبوعہ مولفہ عبدالحی داعنا بنگلوری

[2] دیوان اردو مولانا قربی۔ قلمی انجمن ترقی اردو کراچی۔

چنانچہ مثنوی معجز مصطفےٰ سیرت نبوی میں نظامی کی پیروی کی ہے۔ اس کے سات ہزار دو سو ابیات ہیں۔ قصۂ شیریں کے دو ہزار اشعار ہیں۔ اور قصائد بجواب عرفی پانچ ہزار ابیات پر مشتمل ہیں۔ غرض آپ کے تقریباً نوّے ہزار بیت محفوظ ہیں۔ آپ نے پچاس کتب تصنیف فرمائیں۔ بعض تالیفات فن لغت میں بھی ہیں۔ مثلاً غرائب اللغات (غیر منقوط الفاظ) اور جامع عجائب مرکب الفاظ کی توضیح و تشریح ہے۔ "غاب قطب الامجاد" مادۂ تاریخ وفات ہے مولانا باقر آگاہ کے طویل قطعہ کا آخری شعر یہ ہے [1]

تاریخ رحلتش چو طلب کردم از سروش

گو، ہمدم حکیم نظامی، ندا رسید

۱۱۹۴ھ

حضرت قطب ویلوری کے والد ماجد سید شاہ ابوالحسن ثانی ویلوری المتخلص بہ محوی (۱۱۸۶ھ - ۱۲۴۳ھ) کو عقائد، فقہ، تفسیر، حدیث، سیرت، طبابت اور حقائق و سلوک میں کمال حاصل تھا۔ نثر فارسی بطرز چہار مقالہ خوب لکھتے تھے۔ بڑے صاحب قال و حال بزرگ مہمان نواز اور مخیر تھے۔ اللہ کی راہ میں ایک لاکھ نقد اور سات سو گھوڑے غربا و فقرا کو تقسیم کئے۔ اکثر جذب غالب رہتا تھا۔ دکنی زبان میں بعض رسائل تصوف یادگار ہیں۔ مثلاً تفصیل المراتب فی المدار المراقب۔ رسالہ ذکر وجود و مراتب وجود رسائل عالم ارواح و عالم مثال وغیرہ۔ بعمر ۵۷ سال ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی۔ "غاب قطب الزماں" (۱۲۴۳ھ) مادۂ تاریخ وصال ہے [2]

سید شاہ عبداللطیف ثالث، الملقب بہ سید محی الدین قطب ویلوری آپ بتاریخ ۱۴ ار جمادی الثانی ۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۲ء بمقام محلہ سعید آباد ویلور (مدراس) پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی والد ماجد حضرت محوی المتوفی ۱۲۴۳ھ کے زیر عاطفت تعلیم و تربیت پائی۔ انیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ علوم متداولہ عقائد و فقہ، اخلاق و انشاء، صرف و نحو، منطق

---

[1] تذکرۂ گلدستۂ کرناٹک قلمی ص ۲۲ مملوکہ احقر۔

[2] اقطاب ویلور ص ۴۲ مطبوعہ

وکلام۔ نظریات، عملیات، طبابت، ہیئت و ہندسہ، مساحت، علم الفرائض اور تصوف وغیرہ سے کما حقہ بہرہ ور تھے، بعد تکمیل علوم ۱۲۲۸ھ یعنی ۲۱ سال کی عمر میں قرآن حفظ فرمایا۔ ۱۲۳۴ھ میں مزید تکمیل علوم کے لئے اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ مدراس تشریف لے گئے، اور وہاں مولوی محمد علاؤالدین فرنگی محلی، برادرزادہ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم سے مزید علم کی تکمیل فرمائی۔ مؤلف اقطاب ویلور نے لکھا ہے کہ آپ علامہ باقر آگاہ اور مولانا عبدالعلی بحرالعلوم نے بھی مستفید ہوئے تھے۔[1] مگر آپ کا ۱۲۳۴ھ میں مدراس جانا صحیح نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اس وقت علامہ باقر آگاہ[2] (۱۲۲۰ھ) اور مولانا بحرالعلوم (۱۲۲۵ھ) وفات پا چکے تھے۔ ممکن ہے کہ ۱۲۲۰ھ سے قبل مدراس گئے ہوں اور ان حضرات سے استفادہ علم کیا ہو۔ ؟ البتہ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے تحصیل علوم دینیہ کا ارادہ تھا مگر بوجہ وفات والد ماجد اس کا موقعہ نہیں ملا اور ادھر شاہ عبدالعزیز بھی رحلت فرما چکے تھے[3]۔ آپ جب ۱۲۶۰ھ میں زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں حضرت شاہ اسحٰق دہلوی سے ملاقات ہوئی۔ اور بزمانہ قیام حرمین ایک خواب دیکھا کہ کعبۃ اللہ میں ایک چھوٹا سا پودا نکل آیا اور وہ ایک سایہ دار درخت ہوگیا۔ آپ نے اس کی تعبیر حضرت شاہ اسحٰق سے دریافت کی۔ آپ نے فرمایا کہ آپ کو ایک فرزند صالح ہوگا۔ اور اس کی اولاد خوب پھولے پھلے گی اور عالم کو فائدہ پہنچے گا۔ غرض آپ نے شاہ اسحٰق محدث دہلوی سے علم حدیث کی تجدید کی، اور شاہ صاحب نے آپ کو سند حدیث عطا فرمائی جو یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ اما بعد فیقول العبد الضعیف الحقیر خادم علماء الاخلاق محمد اسحٰق ان الفتح الجلیل، صاحب الفضل المبین

---

[1] اقطاب ویلور مطبوعہ

[2] تذکرہ حدیقۃ المرام عربی مطبوعہ

[3] تذکرہ علماء ہند مؤلفہ رحمان علی

[4] مقالات طریقت مؤلفہ مولانا عبدالرحیم ضیا مطبوعہ ص ۲۵۶

الشیخ محی الدین سلمہ اللہ الی یوم الدین، طلب منی اجازۃ بعض الکتب الحدیث، فاجزت لہ اجازۃ الکتب الصحاح الستۃ البخاری والمسلم، وسنن ابی داؤد والجامع الترمذی وسنن النسائی وابن ماجہ القزوینی، وایضاً اجزت لہ بمشکوٰۃ المصابیح والحصن الحصین للجزری، وحصل لی الاجازۃ والقراۃ لھذہ الکتب من الشیخ الذی فاق بین اقرانہ بالتمیز اعنی الشیخ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ، وحصل لہ الاجازۃ عن والدہ الشیخ ولی اللہ المحدث الدھلوی العارف باللہ وحصل لہ الاجازۃ[1] عن والدہ الشیخ ابراہیم المدنی وباقی سند مذکور فی محلہ۔ حرر فی المکۃ المعظمۃ فی الشہر الجمادی الاولیٰ فی سنہ ۱۲۶۲ الھجریۃ۔ علی صاحبھا الف الف صلوٰۃ۔

مہر

محمد اسحٰق
۱۲۵۸

(مقالات طریقت مؤلفہ مولانا عبدالرحیم ضیاء تلمیذ سید محی الدین ویلوری بحوالہ انتباہ وعجالہ نافعہ۔) ص ۲۰۷ – ۲۵۶ – مطبوعہ۔

سلسلۂ طریقت:۔ حضرت قطب ویلوریؒ کو اپنے جد امجد سید شاہ ابوالحسن قربی خلیفہ محمد مخدوم عبدالحق سادی بیجاپوری سے دو واسطے سے خلافت حاصل تھی، جن کا سلسلۂ طریقت چشتیہ، حضرت میران جی شمس العشاق بیجاپوری خلیفہ شاہ کمال الدین بیابانی خلیفہ شاہ جمال الدین مغربی خلیفہ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز قدس سرہ، خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس اسرارہم تک پہنچتا ہے۔ نیز طریقہ قادریہ رفاعیہ اور مجددیہ نقشبندیہ میں بھی اجازت تھی۔

---

[1] یہاں ناقل سے سہو ہو گیا ہے۔ دراصل شاہ ولی اللہ نے دوران قیام حجاز میں شیخ ابو طاہر مدنی سے استفادہ کیا تھا۔ اور وہ اپنے والد الشیخ ابراہیم کردی سے مستفید ہوئے تھے:۔ اس ضمن میں مولانا سندھی لکھتے ہیں:۔ "زمانۂ قیام حجاز میں سب سے بڑے استاد جن سے شاہ صاحب کو معنوی مناسبت پیدا ہوئی شیخ ابو طاہر مدنی متوفی ۱۱۴۵ھ تھے۔ شیخ موصوف زیادہ تر اپنے والد شیخ ابراہیم کردی متوفی ۱۱۰۱ھ کے تابع اور انہیں کے علوم و معارف کے حامل تھے" (شاہ ولی اللہ کا فلسفہ) (مدیر)

طریقۂ قادریہ - ایک سلسلہ میں بتوسط حضرت مولانا ابوالحسن بیجاپوری، حضرت میراں یوسف قدس سرہٗ گلبرگوی از اولادِ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے - دوسرا سلسلۂ قادریہ میر شاہ علی گنج گوہر خلیفہ شاہ پیر محمد قادری سے سلسلہ بہ سلسلہ شاہ ابراہیم ملتانی خلیفہ شیخ ابراہیم بھکری (سندھ) تک پہنچتا ہے - تیسرا سلسلہ بتوسط محمد مخدوم عبدالحق ساوی، حضرت حاجی اسحٰق بیجاپوری تک - طریقۂ مجددیہ نقشبندیہ - مولانا ابوالحسن قربی - حضرت شاہ رحمت اللہ نیلوری - نائب رسول اللہ قدس سرہٗ خلیفہ شیخ اشرف مکی و شیخ آدم بنوری خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ آپ کے جدِ امجد شاہ عبداللطیف ذوقی قدس سرہٗ (متوفی ۱۱۹۴ھ) اپنی تصنیف انشاء لطف اللہی[1] میں اپنے پدر بزرگوار حضرت قربی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں -

"خلافت بست و شش خانوادہ و یکصد و نود و یک سلاسل مطابق مخزن السلاسل"

"و نہ سلسلۂ دیگر نیز دادہ شد"

(مخزن السلاسل مؤلفہ سید ابوالحسن بیجاپوری قلمی کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد میں ان سلاسل کی تفصیل موجود ہے)

معمولات:- حضرت قطب ویلوری نے اپنی زندگی مسلمانوں کی اصلاح اور تبلیغ دین میں گزاری - جمعہ کو عام مسلمانوں کے وعظ کی مجلس منعقد فرماتے اور منگل کے روز مستورات کے لئے پابندی کے ساتھ وعظ فرماتے - اور ہمیشہ علوم متداولہ کی درس و تدریس اور خاص مجلس میں اسرار و معارف کی تلقین کا شغل رہتا - آپ کے مواعظ میں ہزاروں کا مجمع ہوتا - بعض مفسد پردازوں نے آپ کے خلاف اتہام لگایا، اور حکومت کو باور کرایا کہ آپ سرکار انگریزی کمپنی کے خلاف عوام میں نفرت کے جذبات پیدا کر رہے ہیں - حکومت نے اس کے زیر اثر آپ پر مقدمہ چلایا، اور آپ کو نظر بند کر دیا - آپ شہر چتور کی جیل میں مقید رہے - اور وہاں بھی آپ کا وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رہا - آخر عدالت کی تحقیقات میں آپ بے گناہ ثابت ہوئے اور بری کر دیئے گئے - ہائیکورٹ کے جج نے ملکۂ وکٹوریہ کے پاس مقدمہ کی روئداد بھیجی جس کے جواب میں ملکہ نے آپ کو معذرت نامہ بھیجا اور لکھا یہ مقدمہ کسی ذاتی عداوت پر مبنی نہ تھا وغیرہ - اس کے جواب میں آپ نے ملکہ وکٹوریہ کو اسلام کی حقانیت اور صداقت پیش کرتے ہوئے اسلام کی دعوت دی، جس پر ملکہ

---

[1] انشاء لطف اللہی مؤلفہ سید غلام محی الدین ذوقی جد قطب ویلوری - قلمی کتب خانہ سالار جنگ (حیدرآباد دکن)

نے آپ کی حق گوئی کی داد دی۔ اور سو روپیہ وظیفہ مقرر کیا۔ آپ نے قبول نہیں فرمایا الغرض آپ نے تبلیغ اسلام میں بڑا حصہ لیا۔ اور نہایت جرأت کے ساتھ اور بھی آپ نے غیر مسلم مشاہیر عالم کو دعوت نامے بھیجے جو بزبان عربی، فارسی ہندی اور انگریزی میں مرتب کئے گئے تھے۔ ان میں سے تین دعوت نامے تو لندن بھیجے تھے۔ اس کے علاوہ راجگان ہند کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ ایک مکتوب نواب سالار جنگ اول کو حیدرآباد دکن بھیجا تھا کہ اپنے ملک میں ضابطہ شریعت جاری کریں۔ نواب صاحب نے مکتوب پڑھ کر تعریف کی اہل کتاب کو آپ نے جو دعوت نامہ بھجوایا تھا اس کا ترجمہ یہ ہے۔

ایہا العیسیون اے عیسوی لوگو! تھے عیسیٰ رسول اللہ کے اور بندے اوس کے، جیسے تھے موسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ کے اور بندے اس کے، اللہ نے ان کی معجزوں اور نشانیوں کے ساتھ تائید کی، تاکہ سچ اور جھوٹ دعویٰ رسالت میں معلوم ہو جائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مُردوں کو زندہ کیا، بیماروں اور کوڑیوں کو شفا دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو پھاڑا حضرت محمد صلعم نے شق القمر کیا کتاب عظیم لائے وغیرہ۔

بعض معاصرین۔

مولوی اسلمی[1] (محمد سعید) الملقب بہ سراج العلماء (متوفی ۱۲۷۲ھ) تلمیذ مولانا بحر العلوم فرنگی محلی، مؤلف تفسیر مواہب الرحمٰن، وشرح تحفہ اثنا عشریہ مصنفہ شاہ عبد العزیز۔ محدث دہلوی[2]

۲۔ افضل العلماء[3] مولوی ارتضا علی خاں خوشنود گوپاموی۔ قاضی القضاۃ (متوفی ۱۲۷۰ھ) تلمیذ مولانا حیدر علی سندیلوی و محمد ابراہیم ملباری ثم بلگرامی۔ نیز مرید و خلیفہ سعدی بلگرامی (سید غلام نصیر الدین) آپ کثیر التصانیف اور مدراس کے جگت استاد تھے۔ ایک کتاب ترجمہ شرح جامی بر کافیہ ابن حاجب ضخیم قلمی جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے۔

۱؎ مقالات طریقت مؤلفہ عبد الرحیم ضیا۔ خلیفہ قطب ویلوری مطبوعہ ص ۲۶۷/۲۷۴ مطلع النور مولانا عبد الحی واعظ بنگلوری مطبوعہ

۲؎ تذکرہ حدیقۃ المرام (عربی) و علماء ہند مؤلفہ رحمٰن علی ص ۲۲ مطبوعہ

۳؎ تاشہ تذکرہ معاصرین کے حالات کے لئے دیکھو حدیقۃ المرام مؤلفہ محمد مہدی واصف مدراس سنہ ۱۲۷۹ھ قلمی

۳۔ مولوی صبغۃ اللہ محدث، المخاطب بہ قاضی الملک بدر الدولہ (١٢١٠ / ١٢٨٠ھ) تلمیذ بحر العلوم و مولوی علاؤ الدین فرنگی محلی (خواجہ تاش حضرت قطب ویلوریؒ) مصنف ہدایت السالک لموطاء امام مالک و حاشیہ شرح مواقف (عربی) و تفسیر فیض الکریم (اردو) فوائد بدریہ فی اسیر النبویہ وغیرہ۔ آپ چالیس پچاس کتابوں کے مصنف تھے۔

۴۔ محمد عبد اللہ المخاطب بہ نجشی الملک محتشم الدولہ (متوفی ١٢٦٧ھ) تلمیذ بحر العلوم۔ مرید شاہ غفار خلیفہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی۔ مصنف اسماء الرجال صحیح مسلم وغیرہ۔

۵۔ مولوی جمال الدین احمد ابن مولوی علاؤ الدین فرنگی محلی (خواجہ تاش قطب ویلوری) شارح فصول اکبری۔ (متوفی ١٢٧٦ھ)

۶۔ مولا محمد المعروف بہ خان عالم خاں فاروقی (والاجاہی) (١٢٠٧ / ١٢٧١ھ)

اردو، فارسی، عربی، ترکی انگریزی کے فاضل اور اردو و فارسی کے شاعر، مرید و خلیفہ محمد علی واعظ رامپوری خلیفہ سید احمد شہید۔ مولف حاشیہ دیوان متنبی۔ آپ کا مولوی دلدار علی مجتہد لکھنوی اور عیسائی پادریوں سے مناظرہ رہتا تھا۔

۷۔ مولوی زین العابدین المعروف بہ سلطان بیان۔ صدر مدرس دار العلوم حیدر آباد دکن۔ (وفات ١٢٩١ھ)

مصنف انشاء مفیض و طریق النجات ترجمہ اردو راہ نجات مصنفہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی۔[1]

قیام حرمین۔

قطب ویلوری سنہ ١٢٦٠ھ میں[2] زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے، جہاں آپ کا قیام دو سال تک رہا۔ اور یہی زمانہ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا حضرت شاہ اسحٰق محدث دہلوی سے استفادہ حدیث کا ہے۔ گویا آپ نے صحاح ستہ کو از سر نو دہرایا۔ اور اجازت حاصل فرمائی۔

آپ کی مدینہ منورہ میں گنبد خضرا پر اکثر حاضری رہتی۔ اور آپ اپنی التجائیں نبی اکرمؐ کے حضور

---

[1] انشا مفیض مطبوعہ حیدر آباد دکن (١٢٩٢ھ)

[2] انتخاب ویلور ص ۵۴ مطبوعہ بنگلور۔

میں بطور مناجات پیش کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ دربانوں نے روکا تو آپ نے باآواز بلند فرمایا "السلام علیک یا جدّی" تو غیب سے سلام کا جواب ملا۔ وعلیک السلام یا ولدی۔

اسی طرح ایک روایت ہے کہ رجب کی ۲۷ کو تہجد کے وقت، کعبۂ مکرمہ میں فرشتوں کی اذان کا اعلان ہوا۔ آپ نے بھی شرکت فرمائی۔ بعض لوگ صرف شہادتیں سنکر بے ہوش ہوگئے۔ اور بعض مست و مخمور ہوگئے فجر کی نماز کی امامت بایماء امام الائمہ مصلّی حنفی آپ نے کرائی۔

وادی حمرا کے قیام کے زمانہ میں حسب خواہش شیخ القراء ان کی نواسی کا خطبۂ نکاح پڑھا۔ شیخ القراء نے مسرت میں فرمایا کہ "ہٰذا من عنداللہ" ھذا من عنداللہ" سالار قافلہ نے کہا کہ اس گھاٹی میں زیادہ قیام نہ فرمایئں یہ ڈاکوؤں کی آماجگاہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تو مہبط جبرئیل روحی ہے میں ڈاکوؤں کے خوف سے اس مقام کو چھوڑ نہیں سکتا۔ غرض آپ حرمین میں بڑے ہر دلعزیز رہے، اور وہاں تعلیم و تلقین سے اکثر لوگوں کو مشرف فرمایا۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت بھی کی۔ اور آپ نے بعض کو خلافت بھی عطا فرمائی۔ اور بعض کتب بمقام طائف تصنیف فرمایئں، جن کا ذکر آگے آتا ہے۔ ۱۲۶۲ھ میں وطن واپس ہوئے[1] اور حسب ایماء شاہ محمد اسحٰق محدث نکاح کیا۔ اس وقت آپ کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ تھی۔ حضرت شاہ صاحب ممدوح نے آپ کا ایک خواب سنکر تعبیر کی تھی کہ تمہارے ہاں ایک فرزند صالح پیدا ہوگا۔ چنانچہ آپ کے صاحبزادے سید محمد الملقب بہ رکن الدین پیدا ہوئے۔ آپ اپنے وطن میں ۲۵ سال تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

۱۲۸۸ھ میں آپ دوبارہ زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے۔ اور اس سفر میں جنوبی ہند کے بعض شہروں[2] اور اولیاء اللہ کے مزارات کی بھی زیارت فرمائی۔ مثلاً کرڑپہ[3]، کرنول[4]، ادھونی، رایچور، اور گلبرگہ شریف گئے۔ گلبرگہ میں حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کے مزار کی زیارت فرمائی، وہاں سے بمبئی پہنچے اور ۶ ذی قعدہ کو جدہ روانہ ہوئے۔ آپ کے فرزند اور بہت سے مریدین و معتقدین ساتھ تھے

---

[1] اقتطاب ویلور ص۵۹ مطبوعہ بنگلور

[2] اقتطاب ویلور ص۶۰-۶۱

[3] کرڑپہ میں حضرت سید محمد شاہ میر مصنف اسرار التوحید اور آپ کے برادر خورد سید کمال الدین بخاری مصنف دیوان مخزن عرفان از احفاد مخدوم جہانیاں اوچی کے مزارات ہیں۔ (باقی حاشیہ ص۷۶ پر)

ادھونی اور رائچور بھی اولیاء اللہ کا مرکز رہا ہے۔ جہاں حضرت غوث اعظم کی اولاد و احفاد شاہ حضرت نبیرۂ قادری اور حضرت شاہ طاہر حموی کرنولی کے مزارات ہیں۔ یہ علاقے سلاطین بہمنیہ اور عادل شاہیہ کی مملکت میں شامل تھے۔ نیز ان مقامات کے امراء اور سربرآوردہ اشخاص سے بھی آپ نے ملاقاتیں کیں۔ غرض آپ اس طرح سیر و سیاحت فرماتے ہوئے ۳ ذی الحجہ کو جدہ اور ۶ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ پہنچے۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد آپ علیل ہو گئے اور مرض ہی کی حالت میں ۶ محرم ۱۲۸۹ھ کو مدینہ منورہ پہنچے اور روضۂ اقدس نبوی کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اپنے صاحبزادہ شاہ محمد رکن الدین کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اور یہیں ۱۲ محرم کو پنجشنبہ کے روز بعمر ۸۰ سال آپکا وصال ہو گیا۔ اتفاق سے دوسرے روز جمعہ کو آپ کے ہمشیر زادہ سید شاہ محمد قادری نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حاکم مدینہ کو حضرت نبی کریم صلعم کا اشارہ ہوا کہ آپ کو جنت البقیع میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ آپکی اور آپ کے ہمشیر زادہ کی نماز جنازہ مسجد نبوی میں بعد نماز جمعہ ادا ہوئی۔ اور جنت البقیع میں حضرت امام حسنؓ کی پائیں میں آپ کو دفن کیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق ستر ہزار اشخاص آپ کے جنازہ میں شریک تھے۔ "غاب قطب القوم" مادہ تاریخ وفات ہے۔

۱۲۸۹

نیز قطعہ تاریخ وفات مصنفہ مولانا عبدالرحیم ضیاء خلیفہ قطب ویلوری درج ذیل ہے۔

آں پیر محی ملت دریں کز وجود او — علم و عمل چو عنبر و بو خبر و ہم شدہ

شوق ادائے حج مکرر چو جوش او — پایان عمر عازم طوف حرم شدہ

ہر چند ناشتہ او مرض ساختش زبوں — فارغ ز عزم خود بہ ثبات قدم شدہ

(بقیہ حاشیہ) جن کی سند آپ نے اپنی تصانیف میں پیش فرمائی ہے۔ اس خاندان سے رشتۂ ازدواج بھی قائم رہا ہے۔ ۵ کرنول میں حضرت سید شاہ عبداللطیف حموی (معاصر عبداللہ قطب شاہ) وغیرہ کے مزارات ہیں۔ حضرت غوث اعظم کی اولاد سے تھے۔

۱ تذکرہ روضۃ الاولیاء بیجاپور ترجمہ شاہ سیف اللہ مطبوعہ

۲ رسالہ اردو پاکستان مضمون احقر خوان لغما۔ مصنفہ شاہ طاہر۔ ۳ اقطاب ویلور صفحہ ۶۳ - ۶۲ - ۵۹ مطبوعہ

زیں پس پئے زیارت جدّ بزرگوار — در بند انتظار زوال الم شدہ

بانگ تعال یا ولدی خورد تا بگوش — سرتا بپا بجواب زبان نعم شدہ

آخر بذوق مائدہ نعمت وصال — داخل بروضۂ شہ گردون خم شدہ

از بعد استفاضہ کہ تا ہفتہ می نمود — مامور بر اقامت عین ارم شدہ

ہم ظاہر آز قبۂ فرزند فاطمہ — قرب جوار یافتہ و محترم شدہ

از روئے ایں اشارہ ضیا سال آں نوشت — مقبول بارگاہِ شفیع الامم شدہ

۱۲۸۹ھ

سید محمد علی رامپوری (خلیفہ حضرت سید احمد شہید) ماہ محرم ۱۲۴۵ھ کی ابتدا میں مدراس تشریف لائے۔ ۱۸ محرم کو نواب عظیم جاہ سے ملاقات کی۔ نواب صاحب نے ان کے لئے کھانے وغیرہ کے سات تورے بھیجے۔ ۔ ۔ ان کے ایک دو وعظ ہوئے تھے کہ ہر طرف سے انہیں وعظ کہنے کے لئے مدعو کیا جانے لگا۔ وہ ہر جگہ نئے انداز سے اتباعِ کتاب وسنت اور ردِّ شرک وبدعات پر وعظ کہتے جارہے تھے۔ بے شمار آدمی ان کی مجلس وعظ میں شریک ہوتے تھے۔ اور اختتام پر ان سے ملاقات کرتے تھے۔ اور بعض ان کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ کرتے تھے۔ امراء وعمائدینِ شہر رقص وسرود اور لہو ولعب کی محفلوں میں سرمست تھے۔ ان لوگوں سے ان کی شہرت سنی تو محض آزمانے کی خاطر ان کی مجلس میں شریک ہونے لگے۔ ان کے وعظ کا ان پر اتنا اثر ہوتا تھا کہ وہ خود بخود ان کے پاس پہنچکر ان کے مرید ہو جاتے تھے۔

(از خانوادۂ قاضی بدرالدولہ مرتبہ مولانا محمد یوسف کوکنی)

اصول الحکم فی الاسلام

استاد علال فاسی۔ وزیر امور اسلامیہ مراکش[1]

اسلامی حکومت کی خصوصیات اور اسلام میں حکومت کے کیا اصول ہیں، ان پر گفت گو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں حکومتوں کی جو جانی بوجھی شکلیں ہیں، ان کا ہم ذکر کر دیں تاکہ ان کے پس منظر میں اسلامی حکومت کی حیثیت کا تعین ہو سکے۔

آج کی حکومتیں یا تو شاہی ہیں یا جمہوری[2]۔ مغربی ملکوں میں کلیسائی نظام کی موجودگی اور اس کی وجہ سے دینی اصلاح کے سلسلے میں جرمنی، سوئٹزر لینڈ اور برطانیہ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہوئے وہ آگے چل کر سیکولر (لادینی) نظام حکومت کو بروئے کار لانے کی تحریک کا باعث بنے جس کا مطلب یہ تھا کہ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، وہ ملک کے باشندوں کے مختلف مذاہب کے معاملے میں غیر جانب دار ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سب کو اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے کی آزادی دی جائے گی سیکولر نظام حکومت کی اس تحریک کا قائد فرانس تھا، لیکن اس معاملے میں کسی بھی ڈیموقراطی (ڈیموکریٹک) حکومت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ ان کے ہاں کسی نہ کسی مذہب کو سرکاری حیثیت دی گئی۔ بے شک اشتراکی

---

[1] مملکت مراکش کے شہر رباط سے "البینۃ" کے نام سے ایک علمی مجلہ شائع ہوتا ہے۔ زیر نظر مضمون "اصول الحکم فی الاسلام" اسی عنوان کے عربی مضمون کا ترجمہ ہے۔ (مدیر)

[2] مضمون نگار نے کافی تفصیل سے ان دونوں نظامہائے حکومت سے بحث کی ہے۔ یہ باتیں چونکہ معلوم و معروف ہیں، اس لئے ان کے ترجمے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مدیر

(سوشلسٹ) جمہوریتوں نے بھی مذہب میں غیر جانب داری کی پالیسی کو مانا ہے لیکن انہوں نے مملکت پر حکمران پارٹی کو تھوپ دیا ہے، اور ان کے ہاں کلیسا کے عقیدے کی جگہ پارٹی کے عقیدے نے لے لی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے، جو ہر قسم کے کلیسائی اقتدار سے بے تعلق ہے، اس لئے بعض اسلامی حکومتوں کا دینی یا لادینی (سیکولر) نظام حکومت کے فکر کو اپنانا غلطی ہے بلکہ سرے سے یہ بات ہی صحیح نہیں کہ اس مسئلے کو دنیائے اسلام میں اس رنگ میں پیش کیا جائے، جس رنگ میں کہ وہ یورپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ دنیائے اسلام میں اس مسئلے کو عوامی حقیقتِ واقعی کی اساس پر رکھنے کی ضرورت ہے اور وہ یوں کہ قوم یا تو کسی عقیدے کو ماننے والی ہوگی، ظاہر ہے اس صورت میں اس کے نمائندے لامحالہ قوم کے اس عقیدے کا خیال رکھیں گے، کیونکہ اسی عقیدے کی بنیاد پر توان کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ یا وہ قوم کسی خاص عقیدے کو نہ ماننے والی ہوگی۔ یقیناً اس صورت میں اس کے نمائندے قانون سازی پر سوچ بچار کرتے وقت آزاد ہوں گے۔

الغرض عہد حاضر کے نظامہائے حکومت پر اس اجمالی تبصرے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نظامہائے حکومت میں 'حکمِ اسلامی' کا کیا مقام ہے؟ اور اس کی کیا خصوصیات اور اصول ہیں؟ اس سوال کا جواب دیتے وقت ہمیں اس عہد میں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے اور اس عہد میں جب کہ آپؐ کے بعد خلفاء برسر اقتدار آئے، فرق کرنا ہوگا۔

رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد کی بنیاد آپؐ کی رسالت و دعوت پر تھی۔ آپؐ مسلمانوں اور دوسروں کی نظر میں امت اسلامیہ کے سردار، اس کے امور کے منتظم و نگراں، قاضی اور پیش آنے والے معاملات کا فیصلہ کرنے والے اور شارع تھے اور اس کے ساتھ ہی آپؐ رسول مانے جاتے تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم ملتا تھا، وہ اس کی تبلیغ فرماتے تھے۔ خواہ وہ عقائد ہوں یا شریعت یا ایک خاص طریقہ کار اور منہاج۔

اس کے باوجود کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالت دی گئی تھی اور آپؐ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرماں برداری کرتے ہوئے دینِ اسلام اور مملکت اسلامی کی تاسیس فرما رہے تھے، آپؐ کی حکومت آپؐ کی زندگی کے دوران دستوری اور مقیدہ[1] تھی۔ چنانچہ آپؐ نے صرف تمام دنیاوی امور

[1] اصل عربی لفظ "مقیدہ" ہی ہے۔ یعنی مطلق العنان کی ضد۔ (مترجم)

میں اپنی امت سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، بلکہ بعض دینی امور میں بھی جب تک کہ ان کے بارے میں وحی الٰہی نہ آتی آپؐ صحابہ سے مشورہ کرتے تھے۔ اور آپ کا یہ عمل اللہ تعالےٰ کے نازل کردہ اس حکم کے اتباع میں تھا وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ[1]۔ نیز اسلامی معاشرے کو رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس قالب میں ڈھالا تھا، قرآن مجید نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے، وامرھم شوریٰ بینھم[2]۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے جن امور میں مشورہ فرمایا، ان میں سے ایک غزوۂ بدر کے قیدیوں کے فدیے کا معاملہ تھا اور دوسرا اذان کا۔ آپؐ نے نر اور مادہ کھجوروں کے پھولوں کو باہم ملانے کے متعلق ایک رائے دی تھی۔ لیکن بعد میں صحابہ کے کہنے سے اپنی اس رائے سے آپ نے رجوع کر لیا۔ یہ واقعہ حدیث اور سیر کی کتابوں میں مذکور ہے۔

آپؐ کے عہد میں حکمِ اسلامی میں مشورے کی روح جس طرح جلوہ گر تھی، اس کا ثبوت آپؐ کے اس عہد نامے (میثاق) میں ملتا ہے، جس میں آپ نے مہاجرین، انصار، اہل مدینہ اور اس کے قبائل کو ان کے حسب ونسل ومذہب کے اختلاف کے باوجود امن کی ضمانت دی تھی۔ آپؐ نے یہ معاہدہ مدینہ منورہ پہنچتے ہی کیا تھا۔ اور یہی معاہدہ نہایت وضاحت سے ان بنیادوں کا تعین کرتا ہے، جن پر امت محمدیہ اور اس کی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

اگرچہ یہ معاہدۂ نبوی ان قدیم ترین دستاویزوں میں سے ہے، جنہیں کتبِ سیر نے ہمارے لئے محفوظ رکھا اور جو شرعی احکام مدوّن ہوئے، ان میں سے یہ سب سے پہلوں میں سے ہے، اور سب سے زیادہ اہم ہے، لیکن اس کے باوجود حکم اسلامی، اس کے اقتدار کی نوعیت، اس کی فرمانروائی اور اسلام میں امت کی کیا سیاسی حیثیت ہے، ان امور پر بحث کرنے والے علمائے اسلام نے اس کو نظر انداز کیا۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اسے اس سلسلے میں پیش کروں اور اس کی ضروری

---

[1] آپؐ پیش آئندہ امر میں ان (صحابہ) سے مشورہ کیا کریں۔ اور جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر توکل کریں۔

[2] ان اصحابہ کا دستور آپس میں مشورہ کرنا ہے۔

تشریح بھی کردوں تاکہ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان عہد کی یاد تازہ ہو جائے۔ اور دوسرے مسلمانوں کو اولیں دستور اسلامی کی یاد دلائی جائے۔ جو ان کے لئے اس طریقے کی نشان دہی کرتا ہے، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت اسلامیہ کی تاسیس اور اس کی سیاسی و اجتماعی تشکیل کے ضمن میں عمل فرماتے تھے۔

معاہدہ نبوی ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ یہ تحریر محمد النبی (رسول اللہ) کی طرف سے ہے مومنین و مسلمین قریش اور اہل یثرب اور جو ان کے تابع اور ان سے ملحق ہیں، اور ان سے مل کر انہوں نے جہاد کیا ہے، ان کے درمیان۔ بے شک یہ سب لوگوں سے الگ ایک امت ہیں۔ مہاجرین قریش اپنی جگہوں میں ہیں۔ وہ آپس میں مل کر مقتولوں کی دیت (خون بہا) دیں اور ان میں جو مصیبت زدہ ہو، اس کی دستور کے مطابق اور مومنوں میں جیسا عدل و انصاف ہونا چاہیئے، اس کے تحت مدد کریں۔ بنو عوف اپنی جگہ میں ہیں۔ اور وہ جس طرح پہلے مقتولوں کی دیت دیتے تھے۔ دیت دیں۔ اور ہر گروہ اپنے میں سے مصیبت زدہ کا دستور کے مطابق اور مومنوں میں باہمی عدل و انصاف کے مطابق فدیہ دے۔[1]

مومنوں میں اگر کوئی بے سہارا ہو تو وہ دستور کے مطابق اس کا فدیہ اور دیت دیں۔ کوئی مومن دوسرے مومن کے مولی کو اس کی مرضی کے بغیر حلیف نہ بنائے۔ اگر مومنوں میں سے کوئی زیادتی کرے، تو اس کے خلاف سب مومن ایک ہیں۔ اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف اٹھیں گے، خواہ وہ ان میں سے کسی ایک کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی مومن دوسرے مومن کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کرے۔ اور نہ وہ دوسرے مومن کے خلاف کافر کی مدد کرے۔ اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے۔ جو قریب ترین ہو وہ مدد کرے۔ اور مومن دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر آپس میں خود ایک دوسرے کے مولی و مددگار ہیں۔ اور یہ کہ یہود میں سے جو بھی ہمارا تابع ہے، اس کے لئے مدد ہے۔ اور اس کے مخالف کی مدد نہیں ہو گی۔ مومنین کی صلح ایک ہے۔ کوئی مومن اللہ کی راہ میں جو لڑائی ہو رہی ہو، اس میں دوسرے مومن کو

---

[1] بنو عوف کی طرح مدینہ کے متعدد دوسرے قبائل کا بھی اسی طرح نام لیا گیا ہے۔ اور ان کے ساتھ بھی یہی عبارت مذکور ہے۔ بغرض اختصار یہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ (مترجم)

چھوڑ کر عدل و انصاف کو ملحوظ رکھے بغیر صلح نہ کرے۔ ہر گروہ باری باری سے ہمارے ساتھ غزوے کو نکلے۔ مومنوں کے خون آپس میں برابر ہیں۔ مومنین متقین بہترین طریقے پر ہیں۔ کوئی مشرک نہ تو قریش کے مال کو اور نہ ان کی جانوں کو پناہ دے۔ اور نہ وہ قریش اور مومنوں کے بیچ میں حائل ہو۔ جس نے ایک مومن کو ظلم سے قتل کیا ہو، اس سے لازمی طور پر اس کا قصاص لیا جائے گا، سوائے اس کے کہ مقتول کا وارث دیت یعنی خون بہا لینے پر راضی ہو جائے۔ اس معاملے میں تمام مومن قاتل کے خلاف ایک ہوں گے، اور ان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کے خلاف نہ اٹھیں۔ کسی مومن کے لئے جس نے کہ اس صحیفہ (تحریر) کا اقرار کیا اور وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا۔ جائز نہیں کہ وہ کسی مفسد کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔ اور جس نے اس کی مدد کی یا اسے پناہ دی، تو اس پر اللہ کی لعنت اور یوم قیامت میں اس کی پھٹکار ہوگی، اور اس کے بدلے میں اس سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔

کسی چیز کے بارے میں تم میں جو اختلاف ہو، اسے اللہ اور محمدؐ (صلعم) کی طرف لوٹاؤ۔ جنگ میں یہود مومنین کے ساتھ خرچ کریں گے۔ یہودِ بنی عوف مومنوں کے ساتھ ایک امت ہیں۔ یہود کے لئے اپنا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے اپنا دین۔ اور ان کے اپنے موالی اور اپنی جانیں ہیں[1]۔

یہود سے جو متعلق ہیں وہ بھی انہی جیسے ہیں۔ یہود میں سے کوئی بھی محمدؐ (صلعم) کی اجازت کے بغیر باہر نہ نکلے[2]۔ جس سے کسی زخم کا بدلہ لیا جاتا ہو، وہ بدلہ دینے سے انکار نہ کرے البتہ جس پر خود یا اس کے اہل پر زیادتی کی گئی ہو، اس سے بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ زیادہ عدل والا ہے۔ یہود پر ان کے مصارف ہیں اور مسلمانوں پر ان کے مصارف اور جو اس صحیفہ والوں کے خلاف لڑے، اس میں یہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ وہ باہم ایک دوسرے کی خیر خواہی اور ایک دوسرے سے بھلائی کریں۔ اور آپس میں کسی کا برا نہ چاہیں۔

---

[1] اس کے بعد دوسرے یہود قبائل کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ ان کے بھی وہی حقوق ہیں، جو یہود بنی عوف کے اختصار کی خاطر یہ حصہ بھی حذف کر دیا ہے۔ (مترجم)

[2] بعض نے اس کے معنی جنگ کے لئے نکلنے کے لئے ہیں۔ (مترجم)

کسی شخص سے اس کے حلیف کی وجہ سے زیادتی نہ ہو۔ اور جس پر ظلم ہوا ہو، اس کی مدد کی جائے لڑائی کے دوران میں یہود مومنین کے ساتھ خرچ کریں۔ اس صحیفہ والوں کے لئے یثرب کی سرزمین حرمت و احترام والی (دار الحرام) ہے۔ پڑوسی کے حقوق بھی اپنے جیسے ہیں، نہ تو اسے تنگ کیا جائے، نہ اس پر زیادتی ہو۔ لوگوں کی مرضی کے بغیر ان کو زیر حمایت نہ لیا جائے۔ اس صحیفہ والوں کے درمیان اگر جھگڑا ہو، جس سے کہ فساد کا اندیشہ ہو، تو اسے اللہ اور محمدؐ رسول اللہ کی طرف لوٹایا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس صحیفہ میں جو کچھ ہے، اس سے زیادہ عدل و انصاف والا ہے۔ قریش کو اور جو ان کی مدد کریں۔ ان کو پناہ نہ دی جائے۔ جو یثرب پر حملہ کرے۔ اس کے خلاف سب ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اور اگر انہیں صلح کی طرف بلایا جائے، تو وہ اس سے صلح کریں۔

یہ تحریر کسی ظالم یا گناہ گار کی مدافعت نہیں کرتی۔ اور یہ کہ جو (غزوے کے لئے) نکلا وہ بھی امن میں ہے، اور جو بیٹھا رہا اور نہ نکلا، وہ بھی امن میں ہے۔ سوائے اس کے کہ اس نے ظلم یا زیادتی کی ہو۔ جس شخص نے بھلائی کی اور ظلم اور زیادتی سے بچا رہا۔ اللہ تعالیٰ اور محمد رسول اللہ اس کی پناہ ہیں۔

جیسے ہی رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے، ایک طرف مہاجرین و انصار اور دوسری طرف مشرکین و یہود کے درمیان آپؐ نے یہ معاہدہ کیا تھا، جسے ہم "دستور مدنی" کہہ سکتے ہیں۔ اس دستور کی چند ایک خصوصیات یہ تھیں :۔

اس دستور میں "امت" کی تاسیس کا اعلان کیا گیا۔ یہ "امت" خونی رشتوں اور قرابت داری پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ ایک طرف اس کی بنیاد عقیدہ تھا، اور دوسری طرف باہم مدد کرنے اور حفاظت کی ذمہ داری۔ اس "امت" کے دروازے ہر ایک کے لئے جو اس میں داخل ہونا چاہے، کھلے تھے یا تو وہ اسلام قبول کرے اور مومنین میں شامل ہو جائے یا پھر ان کے ساتھ حلف میں شریک ہو۔ اور ان سے مل کر جہاد کرے۔

یہ دفعات بڑی وضاحت سے بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح ایک اتنا بڑا انقلاب لائے، جس نے عرب کی معاشرے کی سرے سے بنیاد ہی بدل دی - یہ وہ زمانہ تھا جب عرب قبائل آپس میں لڑ رہے تھے اور ان میں سوائے خونی رشتے کے، اور وہ بھی ـــ

بہت ہی محدود پیمانے پر، باہم کوئی رابطہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور آپؐ نے ان قبائل کو ایک بلند تر رابطے میں منسلک کیا، اور وہ تھا "ایک امت" کا رابطہ، جس کی اپنی ایک "سرزمین" ہے، گو اس "امت" میں شامل ہونے والوں کے مذہبی عقائد اور نسب و نسل مختلف تھے۔

اب اس "امت" میں ایک تو مومنین مہاجرین و انصار تھے۔ دوسرے مشرکین اور یہود نیز اور عرب قبیلے تھے جن میں بعض مسلمان ہو چکے تھے اور بعض مشرک۔ پھر وہ قبائل تھے جو یہود سے ملحق اور ان کے حلیف تھے۔ جہاں تک اپنے اپنے مخصوص نظام اور روایات کا تعلق تھا، اس "امت" کے ہر فریق کی یہ بحال رکھی گئیں لیکن دینی عقائد کے لحاظ سے مسلمان تمام دوسروں سے ممتاز تھے۔ البتہ یہ سب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیر رعایت اور آپؐ کی حکومت کے تحت متحد ہو گئے تھے تاکہ وہ باہم مل کر قصر "امت" کی تعمیر اور اس کی سرزمین کی حفاظت کریں۔

اس ضمن میں یہ بھی وضاحت کر دی گئی کہ کسی ظالم اور قصوروار کو یہ معاہدہ بچا نہیں سکے گا، کیونکہ وہ اپنے کئے کے لئے خود جواب دہ ہوگا۔ اس طرح کسی کو اپنے حلیف کی زیادتی کی وجہ سے پکڑا نہیں جائے گا۔ عرب میں اس زمانے میں حلیف کے اعمال کا بدلہ اس شخص سے لیا جاتا تھا، جس کا وہ حلیف ہوتا تھا۔ پھر یہ کہ جس پر ظلم کیا گیا ہو، اس کی مدد ہر ایک پر واجب ہے۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں جس معاشرے کی بنیاد رکھی تھی اس کی اجمالی صورت کی تصویر قرآن مجید کی یہ آیت پیش کرتی ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکرٍ و انثی۔ وجعلنا کم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ [1]

اوپر کی تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ "حکومتِ محمدیہ" کی نوعیت شورائی اور "مقید" تھی یعنی یہ کہ وہ اس عہد پر گامزن تھی، جس کا اعلان رسول اللہ صلعم نے مدینہ پہنچتے ہی فرمایا تھا۔ بلکہ اس سے

---

[1] (ترجمہ) اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے کنبے اور قبیلے بنائے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار و متقی ہے۔

بھی بڑھ کر آپؐ اس میثاق کے پابند (مقید) تھے - جو ہر دستور سے برتر و اعلیٰ ہے، اور وہ میثاق تھا قرآن کریم اور وحی الٰہی - چنانچہ اللہ تعالےٰ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے

وان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک [1]

چنانچہ نبوی حکومت کا اصل دستور قرآن تھا - رسول اللہ صلعم پر خدا تعالےٰ کی طرف سے جو کچھ نازل ہوتا تھا، آپؐ اسے نافذ فرماتے اور مومنین کا فرض تھا کہ وہ اس کی اطاعت کریں - ارشاد خداوندی ہے -

وما کان لمؤمن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان تکون لھم الخیرۃ من امرھم [2]

---

[1] (ترجمہ) اللہ نے جو کچھ اتارا ہے، اس کے مطابق ان کے درمیان فیصلے کرو - اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ جاؤ اور ان سے بچتے رہنا کہ یہ کہیں تم کو بہکا نہ دیں کسی ایسی بات سے جو اللہ نے تم پر اتاری ہے -

[2] جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مومن مرد اور مومن عورت کو اس بارے میں اختیار نہیں رہتا -

---

شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفہ کے اساسی اصول پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی شہرہ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کا مطالعہ کیا جائے، تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک انبیا علیہم السلام کی تعلیمات نے جس طرح انسان کی باطنی استعدادوں کے تزکیہ اور ان کی اصلاح کے بعد اسے قابل بنایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ربّیت کا اہل ہوسکے اسی طرح انہوں نے تہذیب جوارح کا فرض بھی ادا کیا - شاہ صاحب کی رائے میں نبوت کا مقصد انسان کی پوری زندگی کی اصلاح اور تہذیب ہے اور نبوت "حسنۃ فی الدنیا" اور حسنۃ" فی الآخرہ دونوں پر حاوی اور دونوں کی نگراں ہے -

(مولانا عبید اللہ سندھی)

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء

محمد سرور

شاہ ولی اللہ صاحب اپنی ضخیم فارسی کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفا" کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس زمانے میں بدعتِ تشیع[1] آشکار ہوگئی ہے۔ عوام کے دل ان کے شبہات سے متاثر ہوگئے ہیں اور اس ملک کے اکثر لوگ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خلافت کے اثبات میں شک کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ توفیق الٰہی کی روشنی نے اس بندۂ ضعیف

---

[1] ہندوستان میں پہلے تورانی سنّی، پھر ایرانی شیعہ اور آخر میں متشدد سُنّی روہیلوں کی شکل میں داخل ہوئے۔ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے تسنن و تشیع کے سلسلے میں عجیب افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی شاہ صاحب نے اس سلسلے میں بھی بڑا کام کیا۔ بڑی محنت سے ہزارہا ہزار صفحات کو پڑھ کر آپ نے چاروں خلفاء کے واقعی حالات "ازالۃ الخفا" میں ایسے دل نشین طریقہ سے مرتب فرمائے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر شیعوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے، تو اسی کے ساتھ غالی سنیوں کی شدت و تیزی میں کمی پیدا ہو جاتی ہے، جو محض اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز نے تنہا حضرت علی کرم اللہ وجہ، کے مناقب کیوں بیان کئے یا شاہ ولی اللہ نے شیعوں کی تکفیر میں فقہائے حنفیہ کے اختلاف کو کیوں بیان کیا ان پر بھی شیعیت کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ اور اس کے لئے بجائے مناظرے اور مجادلے کے شاہ صاحب کے ایک ایسی راہ دریافت فرمائی جس سے بہت سے فتنوں کا سدباب ہو گیا۔

(ماہنامہ الفرقان۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی)

کے دل میں ایک علم کو واضح و مبسوط کیا ہے، جس سے یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ ان بزرگوں کے تحت خلافت کا اثبات اصولِ دین میں سے ہے۔ جب تک کہ اس اصول کو مضبوطی سے نہ پکڑا جائے مسائل شریعت میں سے کوئی مسئلہ مضبوط نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اکثر احکام جو قرآن عظیم میں مذکور ہیں، مجمل ہیں، سلف صالح کی تفسیر کے بدون ان کا حل نہیں ہو سکتا اور اکثر احادیث خبرِ واحد ہیں کہ وضاحت کی محتاج ہیں۔ اور سلف کی ایک جماعت سے ان احادیث کی روایت اور ان سے مجتہدین کے استنباط کے بغیر یہ قابل تمسک نہیں ہو سکیں اور نہ ان بزرگوں کی کوشش کے بغیر متعارض حدیثوں میں تطبیق کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح تمام علوم دینیہ جیسے علم قرأت و تفسیر و عقائد و علم سلوک ہیں، ان بزرگوں کے اقوال کے بغیر پائیدار نہیں ہو سکتے۔ ان امور میں سلف کے لئے قابل اتباع تو خلفائے راشدین ہی تھے اور سلف نے انہی کا دامن پکڑا تھا۔ جمع قرآن اور قرأتِ شاذ سے قرأتِ متواتر کی معرفت خلفاء ہی کی کوششوں پر مبنی ہے۔ اور قضایا، حدود، احکام وغیرہ انہی کی تحقیق پر مرتب ہوئے۔ لہٰذا جو شخص اس اصل کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ درحقیقت تمام دینی علوم کو مٹانا چاہتا ہے"

غرض شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ کتاب گو اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک لحاظ سے فرقہ وارانہ نزاعی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے پیش نظر بقول ان کے "بدعت تشیع" ہی کا رد ہے، لیکن اس ضمن میں انہوں نے شریعت حقہ کے اصول و مبادی کے متعلق بھی بعض ایسے امور بیان فرمائے ہیں، جن کی اپنی ایک مستقل حیثیت ہے اور فکر ولی اللہی کی تعیین میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ آئندہ صفحات میں شاہ صاحب کے ان ارشادات کو فرقہ وارانہ نزاع سے قطع نظر کرتے ہوئے سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تمام خلق اللہ کے لئے مبعوث ہوئے تو آپ نے ان کے ساتھ معاملات کئے اور ہر معاملے کے لئے اپنے نائب مقرر کئے اور ہر معاملے کا خاص اہتمام فرمایا۔ جب ہم ان معاملات پر غور کرتے ہیں اور جزئیات سے کلیات کی طرف اور کلیات سے کلی واحد کی طرف، جو سب کو شامل ہیں، منتقل ہوتے ہیں، تو ان سب کی جنس عالی اقامتِ دین ہے، جو سب کلیات کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور اس کے تحت دوسری اجناس ہیں۔ ان اجناس میں سے ایک تو علوم دین کا احیاء ہے، جیسے قرآن و سنت کی تعلیم اور وعظ و نصیحت،

اور دوسری چیزیں ارکان اسلام کا قیام ہے، کیونکہ یہ ثابت شدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ، عیدین اور نماز پنج وقتہ کا اہتمام فرماتے ہر مقام پر امام مقرر کرتے، زکوٰۃ وصول فرماتے اور اسے صرف کرنے اور ان کاموں کے لئے عامل مقرر فرماتے تھے۔ آپ کا جہاد کرنا، سردار مقرر کرنا، لشکر بھیجنا، تنازعات کا فیصلہ کرنا، بلادِ اسلام میں قاضیوں کو مقرر کرنا، اقامت حدود، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسے امور ہیں، جو محتاج بیان نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام جس دین کے ساتھ مبعوث ہوئے، وہ شامل تھا تعلیم کتاب و سنت و تذکیر و موعظ کے ساتھ ساتھ ان امور پر بھی جو ایک مملکت کے قیام کے لئے ضروری ہیں۔ یعنی آج کی مروجہ اصطلاح میں دین اسلام "دین" بھی تھا اور "دولت" بھی۔

خلافت کی شروط بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ خلیفہ مجتہد ہو۔ اس کے بعد مجتہد ہونے کی کیا شرطیں ہیں، ان کا بیان یوں فرماتے ہیں۔

دراصل مجتہد وہ شخص ہے جو ایک بڑا حصہ احکام فقہ کا جانتا ہو، مع ان کے دلائل تفصیلیہ یعنی کتاب و سنت و اجماع و قیاس کے، اور ہر حکم کو اس کی علت کے ساتھ مرتبط جانتا ہو اور اس علت کا ظن قوی رکھتا ہو۔ اب اِس زمانے میں مجتہد وہی شخص ہو سکتا ہے، جو ان پانچ علموں کا جامع ہو۔ قرآن کی قرأت و تفسیر کا علم، سنت کا اس کی اسناد کے ساتھ علم اور اس میں صحیح و ضعیف کی معرفت، مسائل کے متعلق اقوال سلف کا علم تاکہ اجماع سے تجاوز نہ ہو اور دو قولوں کے اختلاف میں تیسرا قول اختیار نہ کرے۔ علم عربیت یعنی لغت نحو وغیرہ کا علم۔ استنباط کے طریقوں اور دو مختلف چیزوں میں تطبیق کا علم۔ ان پانچ علموں کے حصول کے بعد وہ جزئی مسائل میں غور و فکر کرے اور ہر حکم جس دلیل کے ساتھ وہ مرتبط ہے، اسے جانے۔ اور لازم نہیں ہے کہ وہ ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ کی طرح مجتہد مستقل ہو۔

یہ تو شاہ صاحب کے الفاظ میں "اب اِس زمانے" کا ذکر ہے۔ "صحابہ کرامؓ کے زمانے میں" ان کے نزدیک مجتہد بننے کے لئے مذکورہ علوم میں سے اکثر علوم کی ضرورت نہ تھی۔ صرف علم قرآن و حفظ حدیث کافی تھا۔ عربی خواں ان کی زبان تھی صرف و نحو وغیرہ حاصل کئے بغیر عربی کلام کو سمجھ لیتے تھے اور اس وقت تک ایک دوسرے سے متعارض حدیثیں بھی ظہور پذیر نہیں ہوئی تھیں نہ مسائل میں سلف کا اختلاف تھا۔"

حضرت عمرؓ کے عہد حکومت میں قرآن مجید کے اس حکم "لا اکراہ فی الدین" پر کس طرح عمل ہوتا تھا۔ شاہ صاحب اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ حضرت عمرؓ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مسلمانوں کے کام کافروں کو سپرد کئے جائیں، لیکن اس کے باوجود وہ کسی غیر مسلم کو اس پر مجبور نہیں کرتے تھے کہ وہ اسلام لے آئے۔ اس ضمن میں وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب "عوارف المعارف" سے مندرجہ ذیل روایت نقل کرتے ہیں۔

"وثیق رومی (نصرانی) کا بیان ہے کہ میں (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کا غلام تھا۔ وہ مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ اسلام قبول کرلے کیونکہ اگر تو مسلمان ہو جائے گا تو میں تجھ سے مسلمانوں کے کام میں مدد لیا کروں گا۔ اس لئے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ میں مسلمانوں کے کام میں اس شخص سے مدد لوں جو مسلمانوں میں سے نہ ہو، وثیق رومی کہتے ہیں کہ میں نے اسلام لانے سے انکار کردیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا دین میں زبردستی نہیں ہے۔ پھر جب حضرت عمرؓ کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے مجھے آزاد کردیا اور فرمایا کہ جہاں تیرا جی چاہے، چلا جا"

رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس منبع فیوض و برکات تھی، اور اس سے ہر صحابی نے اپنی اپنی جبلی استعداد کے مطابق استفادہ کیا۔ اس بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ صحابہ کی ایک کثیر جماعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے اپنے اپنے نصیب کے مطابق ان اوصاف سے استفادہ کیا اور یہ آپؐ کی بعض بعض باتوں میں منصب خلافت پر فائز ہوئے۔ مثال کے طور پر قرات و فقہ میں عبداللہ بن مسعود، قضا میں معاذ بن جبل اور علم فرائض میں زید بن ثابت۔ اور ان میں سے جو قریش تھے اور حکومت و ریاست کا بار اٹھانے کی اہلیت رکھتے تھے، وہ خلافت مطلقہ کے مستحق ہوئے۔ پھر یہ مستحقینِ خلافت بارگاہِ عزت میں منتظر کھڑے تھے کہ دیکھیں ان میں سے کس کو فضل الٰہی بالفعل خلافت مطلقہ کا مرتبہ دیتا ہے۔

ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشآء واللہ ذوالفضل العظیم[1]

---

[1] حضرت ابوبکرؓ جس طرح خلیفہ منتخب ہوئے، مولانا سندھیؒ اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں۔"...... اس وقت مسلمانوں کی ایک مرکزی جماعت تھی، جس کے ہاتھ میں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰)

وعظ و افتاء اور پیش آمدہ مسائل کے متعلق فیصلے کرنے میں صحابہ کرام کا کیا معمول تھا، اس کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"عہد سابق میں وعظ اور فتویٰ خلیفہ کی رائے پر موقوف تھا۔ اور خلیفہ کے حکم کے بغیر لوگ نہ وعظ کہتے تھے اور نہ فتویٰ دیتے تھے۔ بعد میں خلیفہ کی رائے کے بغیر وہ وعظ کہنے لگے اور فتویٰ دینے لگے۔ لیکن اس وقت فتویٰ دیتے وقت جماعت صالحین کا مشورہ ہوتا تھا۔ ابوداؤد نے عوف بن مالک اشجعی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وعظ یا تو امیر کہتا ہے یا اس کا مقرر کیا ہوا یا وہ جو متکبر اور ریاکار ہے۔ دارمی نے ابن عوف سے اور انہوں نے محمدؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن مسعود سے فرمایا کہ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم فتوے دیتے ہو حالانکہ تم امیر نہیں ہو۔ اس کی مشقت کا بار اس پر رہنے دو، جو اس کی راحت کا مالک ہے دارمی نے مسیب بن رافع سے روایت کی ہے کہ صحابہ کو جب کوئی واقعہ پیش آتا اور اس کے

(بقیہ حاشیہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین چننے کا اختیار تھا۔ اس جماعت کا قرعہ انتخاب حضرت ابوبکرؓ پر پڑا۔ اس لئے اس کا فیصلہ قبول کرنا پڑا۔ اگر یہ مرکزی جماعت حضرت علی، حضرت عثمان یا حضرت عمر کو ترجیح دیتی تو مسلمانوں کے لئے اس کے اس فیصلے کو ماننا بھی اسی طرح ضروری ہوتا...

بات صرف اتنی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے تعلیم اسلام کو چلانے کے لئے جو جماعت چھوڑی تھی اس کا فیصلہ تھا کہ حضرت ابوبکر خلیفہ بنیں۔ یہ جماعت مہاجرین اور انصار میں سے سابقین اوّلین کی تھی۔ اور یہ وہ لوگ تھے، جن پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" صادق آتا تھا۔ ظاہر ہے صحابہ کی اس جماعت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ اور باعث خوشنودی تھا۔ اس لئے کسی کو اس کے فیصلے کے متعلق چون وچرا کرنے کی گنجائش نہیں۔

اسلام کے دور اوّل میں مرکزی کمیٹی کے اس طرح کے وجود کا تعین بظاہر میرے اپنے غور و فکر کا نتیجہ ہے، لیکن اگر "قرۃ العینین" اور "ازالۃ الخفا" کو غور سے پڑھا جائے، تو شاہ ولی اللہ کا رجحان فکر بھی اسی طرف مائل نظر آئے گا۔

(شاہ ولی اللہ کا فلسفہ)

متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث نہ ہوتی، تو وہ جمع ہو کر اس کے بارے میں اجماع کرتے پس حق وہی ہے، جو انہوں نے فیصلہ کیا۔ پس حق وہی ہے جو انہوں نے فیصلہ کیا۔

یہ بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب اس مسئلے کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں "حضرت عثمان کے زمانے تک مسائل فقہ میں اختلاف واقع نہیں ہوا تھا۔ اور جب کبھی اختلاف ہوتا تو لوگ خلیفہ کی طرف رجوع کرتے اور خلیفہ مشورے کے بعد ایک بات اختیار کر لیتا، اور اسی بات پر اجماع ہو جاتا تھا۔ فتنہ[1] کے بعد ہر عالم بذات خود فتویٰ دینے لگا اور اسی زمانے میں اختلاف واقع ہوا۔ باقی شہرستانی نے کتاب "ملل ونحل" میں یہ جو کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی اختلاف پیدا ہو گیا[2] تو یہ غلط ہے۔ اختلاف وہ نہیں کہ مشورے کے دوران مختلف باتیں کہی جائیں اور آخر میں ایک بات واضح ہو جائے اور اسی پر سب کا اجماع ہو جائے بلکہ اختلاف یہ ہوتا ہے کہ ایک معاملے کے متعلق دو مستقل رائیں ہوں اور ہر شخص دوسرے کو اپنی طرف کھینچے اور مخالف کی رائے ختم کرنا چاہے۔"

ہمارے ہاں ہر نئی چیز کو "بدعت" کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اصطلاحاً "بدعت" کا تعلق صرف دین سے ہے، لیکن بالعموم دین کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ اکثر ہر نئی چیز "بدعت" کے زمرے میں آجاتی ہے۔ شاہ صاحب ایک جگہ اس پر بھی بحث کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اوضاع واطوار کے دوسری اوضاع واطوار کی صورت میں متغیر ہونے کی کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم کا اپنا جداگانہ حکم ہے۔ بعض تغیر اس قبیل کے ہیں کہ ان میں انسانی اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً قحط پڑ جانا اور زلزلوں کا آنا ..... اور بعض تغیر انسان کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ ان کی ایک قسم کا ذکر شاہ صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

---

1. فتنے کا آغاز حضرت عثمان کی شہادت سے ہوتا ہے۔ جب کہ خلافت راشدہ کی مرکزیت درہم برہم ہو گئی۔ (مدیر)
2. ممکن ہے شہرستانی کا اشارہ بیعت حضرت ابوبکرؓ کی طرف ہو۔

"لوگ کسی امرِ مستحب کو سنّت موکدہ کی طرح لازم کرلیں یا اچھے کاموں میں سے کسی ایک کی صورت اور ہیئت کا التزام کرلیں اور اسے دانتوں سے خوب مضبوط پکڑیں۔ اس قسم کو بدعت حسنہ کہتے ہیں، جیسے کہ وظائف اور اوراد کی ایجاد ہے۔ اس قسم کے امور پر ثواب مترتب ہوتا ہے۔ البتہ اس کے متعلق تاکید و وجوب کا اعتقاد باطل ہے۔ اور ثواب صرف اسی اصل کا ملے گا، جو شرع میں معروف و مسلّم ہے۔ ایک اچھے کام کی وہ ہیئت و صورت مباح ہے نہ اس کی تعریف ہوسکتی ہے اور نہ مذمت۔ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ اس طرح ایک ہیئت وصورت التزام کرلینے سے اس پر بعض مفاسد مترتب ہوں اور بعد کے زمانے میں اس سب کو سنت سمجھ لیا جائے۔ اور اس طرح شریعت حقہ کی تحریف لازم ہوجائے (یعنی جو چیز شریعت میں نہ تھی، وہ داخل شریعت ہو جائے) لیکن وہ شخص جس نے امر مباح کو لازم کرلیا ہے، اور وہ بعد میں مترتب ہونے والے مفاسد کا شعور نہ رکھتا ہو، وہ خطا کار نہیں ہے۔

اوضاع واطوار کی تغییر کی تیسری قسم یہ ہے کہ ہر شخص اس امر مباح کو جسے اس نے اپنا شعار بنا رکھا ہے، اپنے لئے لازم کرلے اور اس طرح ہر زمانے میں ایک رسم اور وضع عام ہو جائے اور یہ سب بذاتہ مباح ہونے پر قائم رہیں۔ اس کی نہ مذمت ہوسکتی ہے نہ مدح، سوائے بالعرض کے (یعنی اس معاملے میں اگر تعصب آجائے اور ایک وضع و رسم کو دوسری وضع و رسم پر ترجیح دی جائے۔ یا یہ کہ بعد کا زمانہ اُسے سنت سمجھنے لگ جائے اور اس طرح لوگ تحریف میں مبتلا ہو جائیں، (اس صورت میں ان امور مباح کا عامل مستحق ملامت ہوگا)

یہ سب بیان کرنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔

"جب یہ مقدمات واضح ہو گئے تو لازم ہے کہ اوضاع و رسوم کے تغیر اور اس اختلاف امت کے مسئلے کو جو کہ اس زمانے میں پیدا ہوگیا ہے، تم ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکو اور ان کو ایک مرتبے پر نہ رکھو (بلکہ بعض اختلاف میں ایک جانب حق اور دوسری جانب خطا ہوتی ہے اور بعض میں دونوں جانب حق دائر رہتا ہے)

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

حضرت عمرؓ کے ذکر میں شاہ صاحب لکھتے ہیں :۔ اہل کتاب میں سے ایک شخص نے آپ

کا گذر ہوا، جو ایک دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا مسلمانوں نے مجھے مشقت و مصیبت میں ڈالا مجھ سے جزیہ لیا اور جب میں نابینا ہو گیا تو اب مجھے کوئی ایک پیسہ دینے کا بھی روادار نہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر تمہارا یہی حال رہا، تو ہم نے انصاف ہی کیا کیا۔ آپ نے کہا یہ بھی ان لوگوں میں سے ہے۔ جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "انما الصدقات للفقراء والمساکین" پھر آپ نے اس کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آیت "انما الصدقات للفقراء والمساکین میں اہل کتاب بھی داخل ہیں۔

حضرت عمرؓ ہی کا ایک اور واقعہ ہے:۔ عبیدہ السلمانی سے روایت ہے کہ عیینہ بن حصین اور اقرع بن حابس حضرت صدیقؓ کے پاس آئے اور عرض کی کہ ہمارے پاس ایک شور زمین ہے، نہ اس میں گھاس ہوتی ہے، نہ کوئی اور شے۔ اگر آپ اسے ہمارے لئے لکھ دیں تو ہم اسے درست کر کے اس میں کچھ بو سکیں۔ حضرت صدیقؓ نے یہ قطعہ زمین ان کے نام لکھ دیا بعد ازاں یہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے تا کہ آپ کو بھی اس معاملے میں شاہد بنائیں۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ تحریر پڑھی گئی، تو آپ نے اسے مٹا دیا، عیینہ اور اقرع کو یہ بڑا ناگوار گزرا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں تمہاری تالیف قلب کرتے تھے جب کہ مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ اب تو اللہ نے اسلام کو عزت دی ہے تمہیں چاہیئے کہ سعی وکوشش کرو اور مال مفت پر نگاہ نہ رکھو، ورنہ اللہ تمہیں برکت نہ دے گا۔

آیت "فمن کان علی بینۃٍ من ربہ ویتلوہ شاھدٌ منہ ومن قبلہ کتٰبُ موسیٰ اماماً ورحمۃً اولئک یؤمنون بہ" کے ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

مفسرین میں اس آیت کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن جو امر تحقیق شدہ ہے وہ یہ ہے:۔ اس آیت میں غور و فکر کرنے سے اس امر میں کچھ شک نہیں رہتا کہ بعض افراد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ہی اپنے قلب ذکی کی شہادت سے اصول شریعت کو پہچان لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عبادتِ اصنام، شراب خوری اور زنا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور باقتضائے وقت و طبیعتِ عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے نہ صرف منتظر تھے، بلکہ

خواب و رویائے صادقہ اور فراست و درایت سے آنحضرت کی بعثت کو پہچانے ہوئے تھے۔

اس اجمالی علم کو جو اُن کے قلوب میں مرتکز تھا، اللہ تعالیٰ نے بینہ و دلیل سے تعبیر فرمایا ہے پھر جب آپؐ مبعوث ہوئے اور ان افراد نے اس دلیل و بینہ اور اپنے اس اجمالی علم کی جو انہیں قبل ازیں بتزکیۂ قلب حاصل تھا، آپ سے شہادت پائی اور قرآن مجید نازل ہوا، تو یہ ایمان لے آئے اور ان کا یہ اجمالی علم، علم تفصیلی سے اور ظن و قیاس، یقین و مشاہدہ میں تبدیل ہوگیا..... صحابہ کرام میں سے ایک اعلیٰ جماعت ان اوصاف سے جو اوپر مذکور ہوئے متصف تھی۔ اور ان میں سرفہرست حضرت صدیقؓ تھے۔ اس مناسبت باطنی اور تزکیۂ قلب کی وجہ سے آپ کو اسلام قبول کرنے میں تامل نہیں ہوا۔ اور آپ بلا تامل اور معجزہ طلب کئے بغیر ایمان لے آئے۔ چنانچہ اس آیت میں حضرت صدیق ہی کی طرف اشارہ ہے۔

مستحب کی دو قسمیں ہیں۔ وہ مستحب جن کا ثبوت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے۔ اسے کوئی بدعت نہیں کہہ سکتا اور جو کہے وہ غلطی کرتا ہے۔ باقی رہا وہ مستحب جس کا ثبوت صرف اگلے بزرگوں کے قول و فعل سے ہوتا ہے، اسے کوئی بدعت کہے اور اس پر عمل نہ کرے، تو اس کی مختلف حالتیں ہیں۔ عمل نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا خیال ہے کہ اس فعل کو اگر سب کرنے لگیں گے اور ہمیشہ کرتے رہیں گے، تو عوام اسے ضروری مثل فرض و واجب اعتقاد کرنے لگیں گے اور عوام کو اس غلط اعتقاد سے بچانا ضروری ہے۔ یا کوئی بڑے پائے کا بزرگ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگلے بزرگوں نے یہ فعل جس مصلحت سے کیا ہے، وہ مصلحت اس وقت نہیں ہے۔ اور جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یا خلفائے راشدین نے اسے کیا نہیں، اس لئے نہیں کرتا۔ ایسا شخص مذمت کے لائق نہیں ہو سکتا، بلکہ تعریف کے لائق ہے۔ مسلمانوں کے اور خصوصاً اہل علم کا ایسے فعل کو بدعت کہہ کر اس قدر شور کرنا کہ باہم فتنہ و فساد قائم ہو جائے نہایت بُرا ہے۔

(از تبشیر مولانا سید محمد علی مونگیری)

ٹھٹہ - ایک تاریخی علمی مرکز

مولانا اللہ ڈنہ دیوبردہی استاد مظہر العلوم کراچی

باز گو از نجد و از یاران نجد
تا در و دیوار را آری بہ وجد

سرزمین سندھ جو آج علم و فضل کے اعتبار سے حرف غلط کی طرح دنیا کے نقشے سے محو ہوتی جارہی ہے کسی زمانے میں یہی سرزمین علوم و معارف کا فلک اور فضل و کمال کا عرش عظیم تھا۔

سندھ کا وہ مرکزی خطہ جو ٹھٹہ کے نام سے معروف ہے، جو آجکل لایعنی رسومات کی چکی میں بری طرح پس رہا ہے۔ کسی زمانے میں توحید و رسالت کا عظیم مبلغ تھا۔ جہاں آج جہالت کی حکومت ہے وہ کسی زمانے میں بہارستان مصر اور نخلستان عرب سے کسی صورت میں کم نہ تھا۔ جہاں آج علوم اسلامیہ و دینیہ کا کوئی معروف عالم نظر نہیں آتا وہ کسی زمانے میں یگانۂ روزگار علماء کا مرکز تھا۔

بلدہ ٹھٹہ کے متصل مغربی سمت ایک میل کی مسافت پر لب سڑک کوہ مکلی واقع ہے جس کے دامن میں علم و فضل اور دین و مذہب کا ایک عظیم کارواں آسودۂ خواب ہے۔ اس خاک پاک کے درویشان باصفا اور مردان حق آگاہ نے اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں شاندار خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ بوریا نشین تھے، لیکن ان کے آستانہ جلال پر بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ جھکتے نظر آتے تھے۔ انہوں نے مصائب برداشت کئے تکالیف کا سامنا کیا کڑی ریاضتیں کیں اور

مجاہدے کئے۔ وہ اپنی خانقاہوں میں چٹائیوں پر بیٹھے قرآن و سنت کی تبلیغ کرتے وہ شریعت حقہ کے علمبردار تھے۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس تھا۔ وہ ہر اس چیز سے اجتناب کرتے جس کی مخالفت شریعت میں کی گئی تھی۔ ان کی زندگی شریعت و طریقت کا حقیقی امتزاج تھا۔

صوبۂ سندھ کی علمی تاریخ جو کچھ کہ تھی اور وہ بہت کچھ تھی۔ افسوس کہ اہالیان سندھ کی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے زاویۂ عدم میں چلی گئی مگر جو کچھ کہ دستیاب و دریافت ہو سکتی ہے، وہ بھی کچھ کم عبرت خیز نہیں۔

آیئے آج کی صحبت میں ان برگزیدہ شخصیتوں کی ایک اجمالی فہرست پر ایک نظر ڈالیں جن کی علمی عظمت کا لوہا آج عرب و عجم کا ہر اہل علم مانتا ہے۔

با صد ہزار دیدہ بگرد جہاں سپہر
جویائے آدمی ست ولے آدمی کجاست!

محقق اور محدث علماء میں سے مولانا ابوالحسن کبیر سندھی ثم المدنی۔ مولانا محمد حیات سندھی ثم المدنی۔ مولانا ابوالطیب سندھی ثم المدنی، مولانا مخدوم محمد ہاشم سندھی ٹھٹوی المخاطب من الرسول الکریم بقاضیٔ سندھ، صاحب کتاب الفتاوی "المسمی بہ بیاض ہاشمی" مولانا مخدوم محمد معین ٹھٹوی صاحب "دراسات اللبیب" مولانا ابوالحسن صغیر مولانا شیخ محمد مراد ٹھٹوی۔ مولانا مخدوم محمد جعفر بوبکانی۔ مولانا مخدوم عبدالواحد سیوستانی۔ صاحب کتاب الفتوی المسمی بہ بیاض واحدی، مولانا ابوالحسن الداہری صاحب "الینابیع الابدیہ" مولانا محمد عابد سندھی ثم المدنی صاحب "الحصر الشارد" رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

مولانا ابوالحسن کبیر سندھی ثم المدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مدینہ کے بہت بڑے عالم علامہ شیخ صالح بن محمد العمری فرماتے ہیں کہ استاد شیخ ابوالحسن کبیر عبدالہادی سندھی اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم، عارف، زکی، سراج منیر، عالم فاضل اور امام السنۃ تھے۔ نیز آپ نے صحاح ستہ پر حواشی لکھے ہیں۔ نیز مسند امام احمد بیضاوی و فتح القدیر و آیات بینات فی الاصول الاذکار نودی پر بھی حاشیئے لکھے ہیں۔ ایک تفسیر لطیف بھی آپ کی تصانیف میں

سے ہے نیز تفسیر جلالین پر حاشیہ لکھا ہے۔

علامہ سید زین العابدین مفتی شافعیہ بالمدینۃ المنورہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ محمد حیات سندھی کی ایک خود نوشتہ تحریر دیکھی ہے، جس میں آپ نے لکھا ہے کہ شیخ ابوالحسن سندھی بڑے جلیل القدر استاد اور نحو و معانی، منطق واصول اور تفسیر و حدیث میں ماہر اور محقق تھے۔ آپ فقیہ بھی اعلیٰ رتبہ کے تھے۔ آپ کا مولد و منشا بلاد سندھ میں ٹھٹہ ہے۔ آپ محقق علماء اور علوم دینیہ کے طلبہ کے لئے مرجع تھے۔ آپ گوشہ نشینی اختیار کرنے کی نیت سے عازم حرمین الشریفین ہوئے اور دس سال تک گوشہ نشین رہے۔ مگر بعدازاں لوگوں کے اصرار پر حرم نبوی میں صحاح ستہ پر ایسے حاشیے لکھے کہ کسی نے بھی اس سے پہلے ایسے حاشئے نہیں لکھے تھے۔

آپ زاہد متورع۔ کتاب اللہ اور سنت رسول کے سخت متبع اور طبیعت کے نہایت ہی متواضع تھے آپ کی وفات ۱۱۳۹ھ میں ۲۲ شوال کو واقع ہوئی۔ اور سیدنا امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

حضرت شیخ محمد حیات سندھی ثم المدنی بھی آپ کے شاگرد تھے۔ شیخ محمد عابد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیخ ابوالحسن کبیر اعلیٰ درجہ کے فقیہ، محدث، استاد الوقت اور امام الانام فی العلوم تھے۔

شیخ محمد حیات سندھی ثم مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت شیخ صالح فلانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ فاضل کامل عارف واصل اور متقی تھے۔ شیخ عابد لکھتے ہیں کہ آپ عالم، عامل، زاہد متورع صوفی عامل بالحدیث اور جمود و تعصب سے بیزار حنفی تھے جیسے کہ ان کے استاد ابوالحسن کبیر۔ آپ نے منذری کی کتاب ترغیب وترہیب اور اربعین نووی پر عمدہ شرح کے علاوہ اور بہت سے رسائل علمیہ پر رسائل عجیبیہ لکھے ہیں۔ آپ نے شیخ ابوالحسن سندھی کبیر اور خاتم المحدثین شیخ عبداللہ بن سالم البصری سے علم کی تحصیل کی ہے اور آپ سے حرمین شریفین یمن، سندھ، ہند، اور مشرق و مغرب کے ہزارہا علماء نے علم کی نعمت حاصل کی ہے۔ جس طرح کے آپ کے استاد ابوالحسن کبیر محدثین عرب و عجم، شام و روم اور ہند کے شیخ سلاسل ہیں۔ اسی طرح شیخ محمد حیات سندھی رحمتہ اللہ علیہ بھی دنیا بھر کے اکثر محدثین اور مشائخ علماء کے شیخ سلاسل اور استاد ہیں۔

نواب سید صدیق الحسن خاں اپنی کتاب " اتحاف النبلاء المحققین " میں مولانا کے متعلق لکھتے

ہیں "شیخ محمد حیات سندھی ثم مدنی از علماء ربانیین و عظمائے محدثین بود۔ نام والدش ملا فلاویہ از قبیلہ چاچڑ ساکن اطراف عادلپور از توابع بکھر مولد و منشا شیخ محمد حیات سندھی است در عنفوان شباب توفیق زیارت حرمین شریفین یافت در مدینہ توطن و تاہل کرد۔ تمام عمر خدمت شریف صرف ساخت و تبحر عظیم دریں فن اشرف اندوخت، ہمیشہ ناشر علوم لطیفہ و عامر اوقات شریفہ بود۔ خواص و عوام حرمین مکرمین و مصر و روم و شام اعتقاد و اخلاص داشتند و از ذات ہمایوں، کسب برکات می نمودند"

آپ نے ۱۱۶۳ھ ۲۶ صفر کو بروز چہار شنبہ رحلت فرمائی۔ اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

شیخ محمد سعید صفر۔ شیخ عبدالرحمن۔ شیخ عبدالقادر کرک۔ سید عبدالقادر بن احمد بن عبدالقادر۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی اور شیخ محمد فاخر الہ آبادی، جن میں سے ہر ایک فرید الدہر اور شیخ سلاسل ہے ان کے شاگردوں میں سے ہیں شیخ محمد فاخر الہ آبادی نے ایک قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے۔ جس کا آخری شعر ہے۔

سر من خاکپائے او بادا

جان من در رضائے او بادا

مولانا ابوالطیب سندھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ عالم فاضل اور استاد الوقت فی العلوم تھے۔ شیخ محمد صفر کے بھی آپ استاد اور شیخ ہیں۔ آپ کے والد کا اسم شریف عبدالقادر تھا۔ آپ سندھ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں متوطن ہوئے۔ آپ نے بہت سی حدیث کی کتابوں پر حاشیے لکھے ہیں۔ مثلاً جامع ترمذی جو مطبع نظامی کانپور میں طبع ہوا ہے۔ آپ ۱۱۴۴ھ میں راہئ دار البقا ہوئے۔

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی سندھ کے فقہائے محققین اور علمائے ربانیین کے سرکردہ اور ایک سو سے زیادہ ضخیم کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ بعض مشائخ سلاسل کے استاد اور شیخ ہیں۔

شیخ ابوالحسن صغیر سندھی جو زبردست محدث اور مجتہد الوقت مانے جاتے تھے۔ آپ ہی کے شاگرد رشید ہیں۔ سلاطین وقت مثلاً نادر شاہ اور احمد شاہ ان کے ساتھ ارادتمندانہ پیش آتے تھے ۱۱۷۴ھ میں آپ واصل بحق ہوئے۔

مخدوم محمد معین سندھی ٹھٹوی ادیب لبیب، فاضل اجل، محدث اکمل، عامل بالحدیث اور

صوفی صافی تھے۔ آپ کے والد ماجد مخدوم محمد امین نواب فاضل خاں والیٔ ٹھٹہ کے داماد تھے۔ فاضل خاں ان کے دادا مخدوم طالب اللہ کے مرید تھے۔ اس لئے مخدوم محمد امین دنیوی جاہ و جلال بھی رکھتے تھے۔

تحفتہ الکرام میں لکھا ہے کہ مخدوم محمد معین صاحب صفات حمیدہ جامع جمیع فنون کمال اور علوم معقول و منقول میں نحریر عصر و علامۂ دہر تھے۔ حکام وقت آپ کی بڑی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ آپ ایک محقق عالم دین ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب بھی تھے۔ ہندی میں بیراگی اور پارسی میں تسلیم تخلص کرتے تھے۔ آپ کی تصنیفات میں سے "دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ الی الحبیب" درباب عمل بالحدیث ایک عمدہ کتاب ہے، جو عراق و یمن میں بہت مقبول ہے۔ بعض علماء نے اس کتاب کی تعریف میں عربی زبان میں اتنے قصائد لکھے ہیں کہ اگر وہ یک جا جمع کئے جائیں تو ایک ضخیم مجلد ہو جائے۔

ان یگانۂ روزگار علماء کے علاوہ ملا مبارک۔ ابو الفیض فیضی مصنف تفسیر سواطع الالہام علامہ ابو الفضل علامہ سید ابو البصیر اللعکوی مصنف درایۃ النحو شرح ہدایۃ النحو۔ علامہ سید عبدالرشید ٹھٹوی مؤلف منتخبات اللغت عرف لغات رشیدی فارسی۔ وغیرہم مشاہیر سندھ میں سے گذرے ہیں جن کے علوم و معارف پر عرب اور عجم کے علمی حلقوں کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

مذکورہ بالا حضرات جو اقلیم علم و فضل کے شہنشاہ تھے؛ ان میں اکثریت اسی ٹھٹہ کے خاک پاک کی پیداوار ہے۔ وہی ٹھٹہ جو کسی زمانہ میں نجد و حجاز کے علماء کا سہارا تھا، آج زوال و انحطاط کے آخری درجہ میں ہے، کوہ مکلی کی ان خاموش فضاؤں میں جہاں ہماری عظمت رفتہ کی ایک تاریخ دفن ہے، وہاں اس دور کے آخری علم پرور اور علماء دوست بزرگ جناب الحاج سید عبدالرحیم شاہ مرحوم کی وساطت سے امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ اور امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی علیہ الرحمۃ جیسے اکابر بنفس نفیس آکر عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کر گئے ہیں۔

آج سے کچھ عرصہ پیشتر اسی کوہسار مکلی پر جسے آجکل "ہاشم آباد" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جناب سردار فضل محمود خان لغاری ایس پی ٹھٹہ۔ جناب الحاج محمد شفیع صاحب دفتردار ٹھٹہ اور جناب خانصاحب حاجی صادق علی میمن کی تحریک اور مساعی سے ایک دینی دار العلوم اور جامع مسجد

کی بنیاد رکھی گئی ہے، جس کا سنگ بنیاد حیدرآباد ڈویژن کے کمشنر جناب ابو نصر صاحب نے رکھا۔ نیز شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی جانب سے ایک دار المطالعہ اور لائبریری بھی معرض وجود میں آرہی ہے۔ یہ روح پرور خبریں ایسی ہیں کہ ؎

بر ایں مژدہ گر جاں فشانم رواست

ان حضرات کی مساعی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ٹھٹہ جو آج علمی اعتبار سے ایک اجڑے ہوئے دیار کے مانند ہے۔ جہاں کسی زمانہ میں علم وحکمت کی فرمانروائی تھی۔ جہاں سینکڑوں دینی ادارے تھے، وہاں آج ایک بھی قابل ذکر ادبی اور دینی ادارہ نہیں، دار العلوم جامع مسجد اور شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی جانب سے متوقع دار المطالع ہمارے نیک دل افسران اور ارباب حکومت کی پاکیزہ تمناؤں کا مظہر ہے اور یہ عزائم بتلا رہے ہیں کہ یہ آگے چلکر کو ہمارے ملک کی علمی ترقی و تہذیبی بیداری کا نشان ثابت ہوگا۔ اور وہاں کی مقدس ارواح کی سعید آرزوں کا سہارا ہوگا۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

سندھ کا یوں تو ہر قصبہ اور قریہ، بلکہ یوں کہئے کہ چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ تصوف اور عرفان، رشد اور ہدایت کا مرکز رہا ہے، لیکن خاص طور پر قدیم شہروں میں الور، دیبل، سیوستان، منصورہ، ٹھٹھہ بھکر وغیرہ اور جدید شہروں میں روہڑی، ریل، منتعلوی، ہالا، لواری، ٹلٹی اور بوبک وغیرہ کو اس سلسلے میں ہمیشہ سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اور یہی شہر تھے جو عرفان و تصوف اصلاح اخلاق اور تزکیۂ نفس کے سرچشمے بنے رہے اور سندھ میں سماجی انقلاب لانے کا باعث ہوئے۔ اور یہیں کی خانقاہیں تھیں، جن کے نظام اصلاح و تربیت نے نہ صرف اخلاقی قدروں کو بلند کیا، بلکہ ایمان اور عمل کی قوتوں کو اجاگر کرکے خداشناسی کی فضا قائم کی۔

(سید حسام الدین راشدی از تذکرہ صوفیائے سندھ)

تنقید و تبصرہ

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء مصنف جناب سید محمد الحسنی
ناشر مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (ہندوستان)

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال (۱۷۰۷ء) پر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ یہ دور اُن کی کامل سیاسی بالاتری کا تھا۔ اس کے بعد ان کے سیاسی زوال کا آغاز ہوتا ہے، جو بڑی سرعت سے پھیلتا چلا گیا۔ لیکن اس سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں ایسی دینی، فکری، علمی اور اصلاحی و اجتماعی تحریکیں بھی جنم لیتی ہیں، جن کے پیش نظر مسلمانوں کے بادشاہوں اور حکمران طبقوں سے ہٹ کر ان کے عوام کو بیدار کرنا اور انہیں نئی زندگی بخشنا تھا۔ ان تحریکوں کا سلسلہ شاہ ولی اللہ صاحب سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۵۷ء کی کامل شکست کے بعد پہلے یہ مدرسہ دیوبند، علی گڑھ کالج، ندوۃ العلماء حمایت اسلام لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور وغیرہ کی شکل میں تعلیمی قالب اختیار کرتی ہیں اور آگے چل کر انہیں کے زیر اثر مسلمانان پاک و ہند کی سیاسی جدوجہد کی طرح پڑتی ہے اور ہم سیاسی لحاظ سے اس مقام پر پہنچتے ہیں، جہاں اس وقت ہیں۔

۱۷۰۷ء سے بعد کا یہ دور، جسے اگر ہم ایک لحاظ سے تعمیری دور کا نام دیں، تو چنداں بے محل نہیں ہوگا بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب یہ دور ہمارے ارباب علم اور اہل تحقیق کا موضوع بحث بن رہا ہے اور اس دور کی جملہ تحریکوں پر مفصل اور جامع کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ سرسید اور مولانا محمد قاسم کے سوانح حیات پر کافی لکھا جا چکا ہے، جناب سید محمد الحسنی نے بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیری کی سیرت مرتب فرما کر اس دور کی ایک اہم تحریک اور اس کے نامور داعی و بانی سے موجودہ نسلوں کو متعارف کرایا ہے۔ زیر نظر کتاب بڑی تحقیق، دلی شغف اور خلوص و محنت سے لکھی گئی ہے، اور اس کی طباعت بھی بڑے اہتمام سے ہوئی ہے۔

مولانا سید محمد علی صاحب ۲۸ جولائی ۱۸۴۶ء کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ وہیں کے ایک مدرسہ فیض عام میں تعلیم پائی اور آپ نے اس زمانے کے متداولہ علوم پڑھے۔ اس کے ساتھ ہی اسی عمر میں تصوف

سے بھی لگاؤ رہا۔ بعد میں اس زمانے کے مشہور بزرگ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی سلسلۂ ولی اللہی کے نامور بزرگ" حاجی امداد اللہ صاحب نے بھی مولانا کو چاروں سلسلوں کی اجازت عطا کی تھی۔ ایک تسبیح، ایک چادر اور ایک چادر بطور خرقہ کے بھیجی تھی"۔

ایک طرف مولانا نے ان تمام علوم کی تحصیل کی، جو ایک مستند عالم کے لئے اس زمانے میں ضروری تھے، دوسری طرف آپ نے تصوف و معرفت کی بھی راہ طے کی غرض اس طرح وہ ایک عالم دین کے ساتھ ساتھ ایک صاحب معرفت صوفی بھی تھے۔ اس کے بعد انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اس دور میں اور اپنی تعلیمی زندگی کی ابتدا ہی میں مولانا کا اجتماعی شعور کتنا بیدار تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آپ نے اس زمانے میں "انجمن تہذیب" کے نام سے کانپور میں ایک انجمن بنائی، جس کا "مقصد علمار اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں صحیح اسلامی افکار کی اشاعت و ترجمانی اور ان کے درمیان باہمی اتحاد اور اخوت پیدا کرنا تھا"۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ بڑے جارحانہ انداز سے کی جا رہی تھی دوسرے حساس اور بیدار مغز مسلمان علماء کی طرح مولانا مونگیری پر بھی اس کا شدید ردعمل ہوا۔ چنانچہ اس کے جواب میں جہاں انہوں نے ردّ عیسائیت کے سلسلے میں جدوجہد کی، وہاں ان میں مسلمان علمار کو آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے فکری و تنظیمی لحاظ سے تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جس نے بعد میں ندوۃ العلماء کی تحریک کی شکل اختیار کی۔ مصنف نے "تحریک ندوۃ العلماء اور اس کا پس منظر" بڑی خوبی اور بہت وضاحت سے اس ماحول کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس میں ندوۃ العلمار کی تحریک کی داغ بیل پڑی۔

یہ کتاب کا سب سے زیادہ سبق آموز اور بصیرت افروز حصہ ہے۔ اس وقت عربی و دینی تعلیم کا پرانا نصاب کتنا جامد اور فرسودہ تھا، مصنف نے بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :- "اس نصاب درس اور طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ان کے سامنے کوئی ایسا تعمیری اور انقلابی میدان نہ رہا جہاں ان صلاحیتوں اور طاقتوں کا مظاہرہ ہوتا ... نتیجہ یہ ہوا ان کی یہ صلاحیت ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق، فروعی اختلافات، جماعتی عصبیت اور علمی طبقہ واریت کی نذر ہو کر رہ گئی ... ہندوستان کے مقتدر علماء اور نامور شخصیات پر کفر کے فتوے لگائے گئے، ...

پوری امت مقلدین اور غیر مقلدین میں تقسیم ہو گئی۔ اہل حدیث اور اہل فقہ کے دو الگ الگ گروہ بن گئے۔ اور ایک دوسرے سے اس طرح برسرپیکار ہوئے کہ گویا وہ دو مختلف مذاہب

کے پیرو ہیں۔ ساری طاقت آمین بالجہر، قرأۃ فاتحہ اور رفع یدین کے نقض یا اثبات پر صرف کر دی گئی۔ فقہ کے جزئیات اور مختلف فیہ مسائل پر جن پر اسلام کی بقا و ترقی کا انحصار نہ تھا ضخیم مناظرانہ کتابیں تیار ہونے لگیں۔ مناظرے ہوئے، اور طنز و تعریض کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور یہ معاملات صرف مناظروں تک محدود نہ رہے، بلکہ تقلید اور عدم تقلید پر مقدمہ بازیاں عدالتوں تک پہنچیں جن میں فیصلہ کرنے والے غیر مسلم ہوتے تھے۔ بقول مصنف کے "...... یہی قوم دیکھتے دیکھتے باسُھم بینھم شدیدٌ کی زندہ تصویر بن گئی اور مختلف صفات اور صلاحیتوں کے افراد جو ایک لڑی میں پیوست تھے، باہم دست و گریباں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے"۔ اس کے علاوہ امت میں دو گروہ اور بھی تھے جو اس وقت ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے اور وہ تھے جدید اور قدیم گروہ۔ ایک ہر نئی چیز کو خیر و صواب سمجھتا تھا۔ اور دوسرے کے نزدیک قدامت بمنزلہ تقدس کے تھی۔

یہ تھا اسلامی ہندوستان کا وہ ماحول، جس میں مولانا سید محمد علی صاحب نے ندوۃ العلماء کی تحریک کی آواز بلند کی۔ ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی پر علماء کی ایک مجلس مشاورت نے علماء کی ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا، دوسرے سال کے جلسے میں ہندوستان کے ممتاز علماء شریک ہوئے، اور اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء رکھا گیا۔ اور اس کے ناظم مولانا سید محمد علی مقرر ہوئے۔

ندوۃ العلماء کی تنظیم میں ایک تو ہر مکتب خیال کے علماء منسلک تھے، دوسرے اس کے سالانہ جلسوں میں جہاں علماء شریک ہوتے، وہاں جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی مدعو کئے جاتے، اور علماء کے ساتھ ساتھ وہ بھی حاضرین کو خطاب کرتے۔ مختلف مکاتیب کے علماء اور پھر علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے اس طرح کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کرنا اس زمانے میں ایک بہت بڑا انقلابی اقدام تھا، اور یہ محض تحریک ندوۃ العلماء کی بدولت ممکن ہو سکا اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کے پیش نظر عربی و دینی تعلیم کے نصاب اور طریقے کی اصلاح بھی تھی چنانچہ اس سلسلے میں یہ کوششیں بھی بروئے کار لائی گئیں۔

ندوۃ العلماء کا مقصد کیا تھا؟ بالکل ابتدا ہی میں مولانا سید محمد علی صاحب نے اپنی ایک تحریر میں

اس کی وضاحت فرمائی تھی۔ آپ نے عربی دینی تعلیم کی فرسودگی اور اس سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی بدحالی اور کس مپرسی کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں خود علماء میں جو نزاع باہمی اور جماعتی عصبیت پائی جاتی تھی، اسے بڑی دلسوزی سے یوں بیان فرمایا تھا۔

"اب خیال کیجئے مقلدین وغیر مقلدین میں کیسی کیسی شرمناک لڑائیاں ہوتی ہیں۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کی جان کا، مال کا، آبرو کا کس طرح خواہاں ہوتا ہے۔ خلاف مذہب کے اجلاس میں مقدمات جاتے ہیں۔ ہمارے محترم علماء مجرموں کی طرح سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث ان کے جوتوں کے پاس ان کے نیچے ڈھیر ہوتی ہیں۔ اور آمین اور رفع یدین کی تحقیق جناب چوبے گھنشیام داس صاحب بہادر اور کرمول صاحب بہادر کے روبرو پیش ہوتی ہیں۔ اور اس کو دین خیال کیا جاتا ہے"[1]

اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کانپور کی دستار بندی کے موقع پر ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں سال بہ سال یہ جلسے ہوتے رہے، اور اس طرح بعض حلقوں کی مخالفت کے باوجود ندوۃ العلماء کا پیغام برصغیر کے ہر حصے میں پہنچا، آخر ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ابتدائی درجہ قائم کر دیا گیا، جس نے آگے چل کر موجودہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شکل اختیار کیا۔

جب تک ندوۃ العلماء کی حیثیت ایک تحریک اور نظریے کی رہی، اس کے بانیوں اور شرکاء میں کوئی زیادہ اختلاف نہ ہوا، لیکن جیسے ہی اس تحریک نے ایک ٹھوس تعلیمی ادارے کو جنم دیا، علمائے کرام میں اختلافات شروع ہوگئے۔ سب سے بڑا اختلاف تو نصاب تعلیم پر ہوا، اور یہ قدرتی تھا کیونکہ جہاں تک قدیم نظام درس اور جدید طریقۂ تعلیم کا تعلق ہے ان دونوں کی راہیں اس وقت بھی بالکل واضح تھیں، اور آج بھی اسی طرح واضح ہیں، لیکن ان دونوں کے بیچ میں اعتدال کی راہ کیا ہے؟ اور قدیم و جدید طریقہائے تعلیم کو کس طرح باہم سمویا جائے؟ اس کا فیصلہ نہ اس وقت ہوا، اور نہ بدقسمتی سے آج ہو پا رہا ہے۔ اگر قدیم کو ترجیح دی جاتی ہے تو جدید طبقہ بدک اٹھتے ہیں اور اگر جدید کو زیادہ اہم

---

[1] روئداد سال اول حصہ اول (ص ۱۲-۱۶) باختصار

سمجھا جاتا ہے، تو قدیم خیال والے بدظن ہو جاتے ہیں یہی وجہ اس وقت اس اختلاف کی ہوئی۔ اور اسی بنا پر دیوبند اور علی گڑھ، یعنی قدیم اور جدید تعلیمی تحریکوں کے بعد ندوۃ العلماء اور بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت عام نہ ہو سکی۔ اور یہ دونوں تعلیمی ادارے اور ان کی راہِ وسط بس ان کی حدود تک سمٹ کر رہ گئی۔

مولانا شبلی جو بعد میں تحریک ندوۃ العلماء میں شریک ہوئے تھے، یہ اختلاف دراصل ان میں اور مولانا سید محمد علی اور ان کے رفقائے کار میں تھا۔ اس اختلاف کی اجمالی تصویر خود مصنف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

> مولانا (شبلی) کو ارباب ندوہ سے جو بنیادی اختلاف تھا، اس میں اور وجوہ کے ساتھ نصاب تعلیم اور انگریزی کا مسئلہ خاص طور پر شامل تھا۔ مولانا (شبلی) چاہتے تھے کہ قدیم نصاب میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے، وہ سب کی سب قبول کر لی جائیں۔ قدیم تعلیمی ڈھانچہ یک قلم منسوخ کر دیا جائے، اور انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کا پورا انتظام کیا جائے۔ لیکن مولانا محمد علی اس عجلت کو نہ مفید سمجھتے تھے، نہ ممکن۔ وہ تدریجی طور پر اور نرم روی کے ساتھ تبدیلیوں کے حامی تھے۔ ان کے ساتھ اور دوسرے مدرسین اور عہدہ داران بھی اس عجلت اور انتہا پسندی کے حق میں نہ تھے۔"

اس اختلاف کی بعض تفصیلات دینے کے بعد مصنف لکھتے ہیں:-

> "پالیسی کا یہ اختلاف اندازِ فکر اور ذہن و مزاج کے اختلاف سے مل کر رفتہ رفتہ شدت اختیار کرتا گیا۔ اور یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی گئی۔"

اور آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ ندوۃ العلماء کی تحریک ایک عام تحریک نہ بن سکی، اور اس کا قائم کردہ دارالعلوم ایک محدود سا تعلیمی ادارہ بن کر رہ گیا[1]۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا سید محمد علی صاحب اس کی نظامت سے علیحدہ

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی صاحب زیرِ نظر کتاب کے مقدمے میں فرماتے ہیں:-
"(یہ کتاب) نہ صرف ایک عظیم و برگزیدہ شخصیت کی سوانح ہے، بلکہ ایک عظیم تحریک کی تاریخ بھی ہے ایک معاشرے کی تصویر بھی ہے۔ اور ایک پورے دور کی عکاسی بھی۔ ماضی کی سرگزشت بھی ہے اور مستقبل کا وہ خواب بھی، جو خدا کے ایک برگزیدہ و عالی ہمت بندہ نے دیکھا تھا اور جس کی تعبیر پورے طور پر ابھی ظاہر نہیں ہوئی ....."

ہو کر مونگیر (بہار) تشریف لے گئے، اور وہاں ان کی سرگرمیاں تمام تر "قادیانیت کے مقابلے" اور سلوک و ارشاد اور اصلاح عام تک مرتکز ہو گئیں یہاں تک کہ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کو یہ آفتاب رشد و ہدایت غائب ہو گیا

مولانا سید محمد علی صاحب واقعی ایک جامع شخصیت تھے علم دین، تصوف و معرفت، قدیم پر عبور، جدید رجحانات کا احساس، اجتماعی شعور، دوسروں سے مل جل کر کام کرنا، رواداری اور وسعت قلبی، یہ سب خوبیاں آپ کی ذات میں جمع تھیں، انہوں نے تحریک ندوۃ العلماء کو انہی خطوط پر چلانے کی کوشش کی لیکن جس زمانے اور جس فضا میں یہ تحریک چلی، وہ ان مقاصد کے لئے زیادہ سازگار نہ تھی چنانچہ مرحوم نے جو خواب دیکھا تھا اس کی پوری طرح تعبیر نہ ہو سکی۔

اور یہ صرف اسلامی ہند میں ہی نہیں ہوا، اسی زمانے کے لگ بھگ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی قدیم و جدید کو سمو کر ایک راہ وسط نکالنے کی جو کوشش ہوئیں، وہ بار آور نہ ہو سکیں مثال کے طور پر ترکی میں "تنظیمات" کی تحریک ناکام ہوئی۔ اور اس کی جگہ "اتحاد و ترقی" اور "کمالیت" نے لے لی۔ اسی طرح مصر میں شیخ محمد عبدہ، اور دار العلوم کی قدیم و جدید کو ہم رشتہ کرنے کی تحریک موثر ثابت نہ ہوئی، اور اب وہاں "ناصریت" کا غلبہ ہو رہا ہے، سوال یہ ہے کہ مولانا سید محمد علی صاحب اور ان جیسے ذہن و قلب رکھنے والے بزرگوں نے ایک زمانے میں اسلامی معاشرے کے مستقبل کے بارے میں جو خواب دیکھے تھے، اور جن کی اس وقت تعبیر نہیں ہو سکی کیا اب یا آئندہ ان کی تعبیر کا کوئی امکان ہے، ہمارے خیال میں اگر ان تعبیر کرنے والوں کے سامنے اسلام کا بھی یہی تصور ہے جو زیر نظر کتاب کے صفحہ ۷۰ پر درج ہے، تو ان خوابوں کی تعبیر ہونا بڑا ہی مشکل نظر آتا ہے۔

"اسلام کا مقصد اور قرآن کا موضوع انسان کی ہدایت ہے، نہ کہ اس کی مادی ترقی"

آج اس زمانے میں "انسان کی ہدایت" کو "اس کی مادی ترقی" سے بے تعلق بنانے کو سوائے اس کے حقائق سے آنکھیں بند کرنا اور فراریت کہا جائے، اور کیا کہا جا سکتا ہے، اور بدقسمتی سے آج "راہ وسط" کی اکثر تحریکوں کا دار العلوم ندوۃ العلماء سمیت یہی حشر ہو رہا ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے "تذکرہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ" ہونے کا تعلق ہے، مصنف کی یہ کوشش بڑی کامیاب ہے، اور ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ انہوں نے سیرت نگاری کے ساتھ ساتھ اکثر جگہ تجزیے اور تنقید سے بھی کام لیا ہے، جس نے اس کتاب کی افادیت کو بہت بڑھا دیا ہے

امید ہے علمی حلقوں میں یہ کتاب پسند کی جائے گی۔

کتاب مجلد ہے۔ اس کے بڑے سائز کے ۴۲۴ صفحے ہیں۔ کاغذ اعلیٰ قسم کا، طباعت و کتابت بہت عمدہ ہے۔ اور قیمت صرف ۶ روپے ہے۔

استدراک۔ کتاب کے ص ۲۶ کے حاشیے میں شاہ اسحاق دہلوی کو سہواً شاہ عبدالعزیز کے نواسے کے بجائے پوتا لکھ دیا گیا ہے۔

(ا۔س)

صراط مستقیم

مولانا قاضی عبدالسلام خطیب جامع مسجد نوشہرہ صدر (ضلع پشاور) نے قرآن مجید کی آیت مقدسہ "وان ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ" کی روشنی میں یہ رسالہ مرتب فرمایا ہے۔ یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے اس میں موصوف نے "پرویز صاحب اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی دعوت پر شریعت مقدسہ کی رو سے غور کیا ہے"۔

زیر نظر رسالے میں پرویز صاحب کا ذکر بس ضمناً سا ہے، دراصل سارا رسالہ مولانا مودودی صاحب کے ان خیالات اور اجتہادات کے متعلق ہے، جن سے ہمارے علماء کی غالب اکثریت کو آپ سے اختلاف ہے۔ "صراط مستقیم" میں وہ تمام مسائل یک جا آ گئے ہیں، جن میں مولانا مودودی صاحب نے جمہور علماء سے ایک الگ موقف اختیار کیا ہے، رسالے کے مرتب کے نزدیک مولانا موصوف نے اس قسم کے اجتہادات کر کے گویا شریعت اسلامیہ کو مسخ کیا ہے۔

رسالہ غیر مجلد ہے، ضخامت ۱۳۰ صفحات، قیمت دو روپے

شائقین حضرات خود مرتب رسالے سے اسے طلب کر سکتے ہیں۔

تحریف الاذان

از جناب محمد ابوالخیر اسدی۔ اس مختصر سے رسالے میں اذان کے بعد جو صلاۃ و سلام پڑھا جاتا ہے، اس پر بحث کی گئی ہے مؤلف نے بتایا ہے کہ اذان کے بعد صلاۃ و سلام پڑھنے کا آغاز ۷۹۱ھ میں قاہرہ میں ہوا، اور اس کے بعد اس کا رواج عام ہو گیا۔ موصوف نے بعض کتب فقہ کے حوالے سے اسے بدعت قرار

دیا ہے۔ یہ رسالہ مجلس نشر السنۃ مخدوم رشید (ملتان) نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۵۰ پیسے ہے اس مجلس نے اس قسم کے اور بھی متعدد رسالے شائع کئے ہیں۔

سنت قرآن کے آئینے میں شیخ الحدیث مولانا محمد اسمعیل سلفی صاحب کا یہ مختصر سا رسالہ انجمن اشاعت السنہ ۔ ۲۴۸ جناح کالونی، لائلپور نے شائع کیا ہے۔

اس رسالے میں حجیت حدیث پر بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ تعلیمات اسلامی میں حدیث کی حیثیت ایسے جزء کی ہے، جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

الطاف ربانیہ اس ۳۲ صفحے کے ٹریکٹ میں مولانا مفتی عزیز الرحمن مرحوم کا ایک مضمون جو حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر اور ان کے ایک مرید مولانا شاہ محمد رفیع الدین دیو بندی پر ہے شائع کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالغنی حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان میں سے تھے شاہ اسحاق سے آپ نے حدیث پڑھی۔ شاہ غلام علی کے خلفاء سے سلوک باطنی کی تکمیل کی۔ پھر مسند آبائی پر فائز ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے قبل ہندوستان سے ہجرت فرما کر حجاز تشریف لے گئے، اور وہیں انتقال ہوا۔

شاہ عبدالغنی صاحب کو اپنے شاگردوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کے ساتھ ہے۔ اور مریدین میں موردِ عنایت خاصہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی (جن کا ذکر اس رسالے میں ہے) مہتمم مدرسہ عالیہ اسلامیہ تھے۔" آخر میں شاہ عبدالغنی کے کئی مکتوبات درج رسالہ ہیں۔ اس رسالے کے ناشر مولوی عبداللہ میاں عربک ٹیچر سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی ہیں۔ ہدیہ ۳۷ پیسے۔

اصلی حنفیت مرتبہ مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ (مرحوم و مغفور) مجلس اصلاح و تبلیغ، گمٹی بازار لاہور نے حضرت مولانا احمد علیؒ کا مضمون بعنوان "اصلی حنفیت" ٹریکٹ کی شکل میں شائع کیا ہے، جسے ۷ پیسے کے ٹکٹ بھیجکر مجلس مذکور سے مفت طلب کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا مرحومؒ نے اپنے اس مضمون میں حنفی بھائیوں سے آپس کی ناچاقی دور کرنے کی دردمندانہ اپیل کی ہے اور بتایا ہے کہ حضرت امام الائمہ مولانا و مقتدانا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح متبع کون ہے، اور حنفیت صحیحہ کا علم بردار کون ہے؟

افکار و آراء

سنہ ۱۳۵۷ھ میں جب حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مکہ معظمہ سے ۲۱ سال کے بعد دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور ان کے اعزاز میں طلبا اور تمام شیوخ و اساتذۂ کرام کا ایک اجتماع ہوا تو فقیر نے باجازت صدر حضرت مولنا سندھی کے حضور میں فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے تھے

مرحبا پیکِ ظفر طائرِ فرخندہ خبر — مرحبا بلبلِ میمون ہمایون پیکر
مرحبا قاصدِ خوش لہجہ نوایت خوشتر — بہ نثارِ تو دو صد جانِ حزیں ہم کمتر

بوئے مشکینِ کسے زیر قبا مے داری
زود فرما کہ بشارت ز کجا مے آری

بطرب ناز خرامِ تو اداہا دارد — شہپر ماندہ ات گردِ سفرہا دارد
لہجہ و دیدہ و منقار نواہا دارد — لبِ میگون بہ تبسم مژدہ دلہا دارد

بہ گمانم کہ ز کنعاں خبرے یافتۂ
یوسفِ گم شدہ ام را اثرے یافتۂ

گفت اللہ غنی منبعِ عرفاں عشق است — ملہمِ سرِ خفی بہر گدایان عشق است
پیر ہی ناندہ تمام وصالِ آں عشق است — اخترِ نیرِ ہر شامِ غریبان عشق است

مژدہ آں جاں ز تن رفتہ بہ تن باز آمد
یعنی آں یوسف ہندی بہ وطن باز آمد

دورِ غم ختم شدہ عہدِ طرب زاد آمد — شادی آورد گل و بادِ صبا شاد آمد
موسمِ عاشقی و کار بہ بنیاد آمد — رہبرِ قافلہ با حسنِ خدا داد آمد

بارک اللہ بدیوبند قران السعدین
کوکبِ سعد عبید[1] آمدہ با سعد حسین[2]

[1] حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ [2] حضرت مولانا حسین احمدؒ

حامل سرّ لدن عارفِ علمِ ازلی　　　غازیِ اعظم و دادارِ کمالِ عملی
مرشد و ہادیِ راہِ حق آں لم یزلی　　　وارثِ علمِ علی، جہدِ حسین ابن علی

فیضِ صحبت ز درِ کعبۂ حق یافتہ است
ساقیِ زمزم و از حجر سبق یافتہ است

کشتیِ امتِ مرحوم گرفتارِ بلا ست　　　افقِ ہند ہمہ معرکۂ کرب و بلا ست
قرنِ شیطاں بہ مشرق عَلَمِ خود افراشت　　　نامِ حق زیر شدہ غلبۂ باطل برپا ست

ہمتے اے شہہ عالی ہمم بحرِ آشام
الغیاث اے بہ تو دالبستہ غریبے ناکام

قاضیِ غمزدہ یکبار دعائے خواہد　　　التفاتِ کرمے دفعِ بلائے خواہد
دورِ غم ختم شود ہمچو ادائے خواہد　　　یک نظر سوئے منِ بے سروپائے خواہد

صاحبِ دولتیِ شاہا و سحابِ اَمَلی
منبعِ علمی و اُستادِ کتابِ عملی

قاضی عبد السلام عفی عنہ،

خطیب جامع مسجد نوشہرہ صدر۔ ضلع پشاور

السلام علیکم۔ مجھے آپ کی اکاڈمی کے متعلق معلوم ہوا تھا۔ لیکن اس کا صحیح پتہ نہ تھا۔ اب ایک صاحب سے معلوم ہوا ہے، تو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

میں بھی مولانا عبید اللہ صاحب کا شاگرد ہوں۔ اور مولوی احمد علی صاحب (مرحوم و مغفور) اور میں ایک ہی جماعت میں تھے، جب نظارۃ المعارف (دہلی) کا مولانا نے افتتاح کیا تھا۔ میری عمر زیادہ ہونے کے سبب سے مجھے آنکھوں سے دو گز سے زیادہ دکھلائی نہیں دیتا، اس وجہ سے میں آپ کے پاس نہیں آیا۔

حکیم فضل الرحمٰن

معیاری دواخانہ، جیل روڈ، حیدرآباد

ہمعات (فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی
تربیت وتزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

(عربی)

لمحات

شاہ ولی اللہ رح کے فلسفۂ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفٰے قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ
ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔
اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت دو ۲ روپے

(فارسی)

سطعات

انسان کی نفسی تکمیل وترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعین فرمایا ہے
اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے ذریعہ جس طرح حظیرة القدس
سے اتصال پیدا کرتا ہے، "سطعات" میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت
اشاعت کا انتظام کرنا۔

امی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر
یں دستیاب ہو سکتی ہیں، اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے
اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ الٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے
کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمتِ ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی
غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا۔

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۰ صدر حیدرآباد

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،

مخدوم امیر احمد،

مُدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی،

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے   فی پرچہ:- بچھتر پیسہ

الرحیم

حیدرآباد

جلد ۲	ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ مطابق اگست ۱۹۶۵ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

شذرات

برّصغیر پاک و ہند میں برطانوی حکومت کی عمل داری سے پہلے، اُس زمانے کی ضرورتوں کے مطابق مُسلمانوں کی تعلیم کا اچھا خاصا انتظام تھا۔ کم و بیش ہر مسجد میں بچّوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے مدارس ہوتے، جن میں مختلف علوم و فنون پڑھائے جاتے۔ ان مدارس کی مالی کفالت عام طور پر اوقاف، معافیات اور رؤسا و اُمرا کے عطیات سے ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں اہلِ علم کے بعض مشہور خاندان تھے، جن کے اپنے خصوصی مدرسے تھے، اور اُن میں اُس خاندان کے افراد نسلاً بعد نسلاً طلبہ کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ جیسے مثال کے طور پر دھلی میں شاہ ولی اللہ صاحب کے والدِ بزرگوار شاہ عبد الرّحیم کا مدرسہ تھا۔ جس میں سب سے پہلے شاہ عبد الرّحیم صاحب پڑھاتے رہے، پھر اُن کی مسندِ تدریس پر شاہ ولی اللہ صاحب بیٹھے، اُن کے بعد اُن کی جگہ شاہ عبد العزیز صاحب نے لی۔ اُن کا انتقال ہُوا، تو اُن کے نواسے شاہ محمّد اسحٰق صاحب مدرسہ رحیمیہ کے سربراہ بنے اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دھلی کا پُورا نقشہ ہی نہیں بدل گیا۔

اُس زمانے میں آج کی طرح دینی اور دُنیوی تعلیم کے مدارس الگ الگ نہیں ہوتے تھے، ایک ہی نظامِ تعلیم ان دونوں پر مشتمل ہُوا کرتا تھا۔

برطانوی عمل داری کی پہلی زد مسلمان رؤسا و اُمرا پر پڑی۔ اُن میں سے اکثر اپنی املاک سے محروم کر دیئے گئے۔ چنانچہ اسلامی درس گاہوں کی یہ آمدنی اس طرح بند ہُوئی۔ اس کے بعد مدارس کے لئے جو اوقاف اور معافیات تھیں، وہ تمام ضبط کر لی گئیں۔ اور ان کا رہا سہا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا۔ انگریزوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسلامی درس گاہوں کا وجود اُن کی نظروں میں کھٹکنے لگا۔ ان میں اُنھیں بغاوت کی بُو آتی تھی۔

غرض مسلمانوں کی درس گاہیں ایک ایک کر کے بند ہو رہی تھیں۔ رؤسا اور دولت مند طبقے افلاس کا شکار ہو رہے تھے، غریب مسلمانوں کا حال تو اور بھی بدتر تھا، ان حالات میں مسلمان بچے کہاں تعلیم حاصل کرتے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے جو نئے مدرسے کھولے جا رہے تھے۔ اُن کی تعداد برائے نام تھی۔ اور پھر اُن میں دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہوتا تھا۔

ہمارے علمائے کرام کا اُمّتِ اسلامیہ پر بہت بڑا احسان ہے، انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے انتہائی ناساز گار حالات میں مسلمانوں اور خاص طور پر اُن کے غریب طبقوں کی عمومی اور اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بار اپنے کندھوں پر اُٹھایا، اور اجنبی حکومت کی مخالفت اور اہلِ ثروت طبقے کی اعانت سے محرومی کے باوجود برِّصغیر کے طول و عرض میں چھوٹے اور بڑے مدارسِ دینی کا ایک جال پھیلا دیا۔ جن کی وجہ سے غریب سے غریب مسلمان طالب علم کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کر سکے ــــ ذرا تصوّر کیجئے کہ اگر ہمارے علمائے کرام عمومی و دینی تعلیم کے میدان میں یہ قدم نہ اٹھاتے، تو آج ہمارے ہاں نسبتِ خواندگی کیا ہوتی!

ہمارے علمائے کرام کا یہ اتنا شاندار کارنامہ ہے کہ تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

برطانوی عمل داری تو کبھی کی ختم ہو گئی، اب پاکستان میں ہماری خود اپنی قومی و اسلامی حکومت ہے ــــ اب یہ حکومت تعلیم کو عام کرنے میں ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ کوئی سال نہیں جاتا کہ یہ کثیر تعداد میں نئے مدارس نہ قائم کرتی ہو ــــ اس کے علاوہ عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے، اور اس سلسلے میں تمام یونیورسٹیوں میں اسلامی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے خاص شعبے بھی قائم ہو گئے ہیں، مختصراً ــــ وہ حالات، جن کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ دینی مدارس کا قیام اور انھیں حکومت کی ہر طرح کی مداخلت، نگرانی اور سرپرستی سے آزاد رکھنا ناگزیر تھا، وہ کلیۃً بدل گئے ہیں ــــ اب اِس پر اصرار کہ ان مدارس پر خود دینی، قومی و اسلامی حکومت کی بھی کسی طرح کی نگرانی نہ ہو، صحیح نہیں ہے، اس سے ملک و قوم کو جو نقصان ہوگا، وہ تو ہے ہی، لیکن خود یہ ان مدارس کے لئے بھی اچھا نہیں ہوگا، اور آگے چل کر ان کی افادیت بالکل

ختم ہو جائے گی۔

ہمارے علمائے کرام کو اِس مسئلے پر ٹھنڈے دِل سے سوچنا چاہیئے۔

آج اسلام ایک بڑی بین الاقوامی سیاسی قوت ہے، اور اسے اُن مسلمان حکومتوں کے علاوہ، جو سیکولرزم اور سوشلزم کی طرف زیادہ مائل ہیں، وہ غیر مسلم حکومتیں بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں جن کا دُور سے بھی اِسلام سے کوئی تعلق نہیں ــــ پچھلے دِنوں ماہ ذی الحجہ میں مکّہ معظمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے زیرِ اہتمام ایک مؤتمر اسلامی منعقد ہوئی تھی، اُس میں بڑی کوششوں کے بعد ہندوستان، اور ایبی سینیا کی حکومتوں نے اپنے ہاں کے مسلمانوں کے وفدوں کے لئے شرکت کی اجازت حاصل کی تھی، اِس سے پہلے انڈونیشیا میں ایشیائی اور افریقی مسلمانوں کا جو اجتماع ہُوا، اُس میں عوامی جمہوریہ چین کے مسلمان نمائندے بھی شریک ہُوئے تھے ــــ متحدہ عرب جمہوریہ تقریباً ہر سال قاہرہ میں ایک اِسلامی اجتماع منعقد کرتا ہے، جس میں تمام مسلمان ملکوں کے اہلِ علم کو مدعو کیا جاتا ہے۔

پاکستان کا ایک اسلامی ملک ہونے کی حیثیت سے ان بین الاسلامی اجتماعات میں ایک خاص مقام ہوتا ہے ــــ اَب ظاہر ہے کہ اِس طرح کے اجتماعات برابر ہوتے رہیں گے، اور پاکستان کو ان میں زیادہ سے زیادہ مؤثر اور فعّال نمائندگی کرنا ہوگی۔

ہمارے علمائے کرام کو اپنے محدود فقہی و نظری دوائرے سے اَب باہر نکلنا چاہیئے۔ انگریز کے دَورِ حکومت میں اُنھیں اِسلام کا دفاع کرنا تھا، اور دفاع کے لئے ایک خاص طرح کے ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اَب وہ ایک آزاد، ترقی پذیر اور وسعت خواہ اسلامی ملک کے دینی رہنما ہیں، اُن کے سامنے اس ملک کے اندر اور اس کے باہر بین الاسلامی اجتماعات میں اپنی بات کہنے کے وسیع مواقع ہیں، اُنھیں ان مواقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی نمائندگی جتنی اچھی ہمارے
علمائے کرام کر سکتے ہیں، اور کوئی نہیں کر سکتا!

مولانا مملوک علی نانوتوی

پروفیسر محمد ایوب قادری

استاذ العلماء مولانا مملوک علی بن شیخ احمد علی نانوتہ ضلع سہارن پور میں تقریباً ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے[1] مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن نانوتہ میں حاصل کی اس کے بعد تحصیل علم کی غرض سے دہلی پہنچے اس زمانے میں دہلی علوم مشرقی کا خاص مرکز تھا شاہ ولی اللہ دہلوی کے نامور صاحبزادگان شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔ مولانا مملوک علی نے تبرکاً حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں ہدایۃ النحو کے کچھ اسباق پڑھے پھر شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین کے تلمیذ خاص مولانا رشید الدین خاں کی خدمت میں جملہ علوم متداولہ کی تحصیل کی اور اپنے ہم عصر علماء میں مشہور و معروف ہوئے[2] خیال

---

[1] مولانا مملوک علی کے تلمیذ مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء) نے ۱۸۴۷ء میں مولانا مملوک علی کی عمر کا اندازہ تقریباً ساٹھ سال لگایا ہے (تذکرہ طبقات الشعرائے ہند ص ۴۶۴ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء) اسی تخمینہ کو مولانا مناظر احسن گیلانی نے قبول کیا ہے (سوانح قاسمی جلد اول ص ۱۰۱)

[2] تعجب ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سید احمد شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (ف ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) کے فیوض و برکات کا یہ نتیجہ قرار دیا ہے کہ جب ان بزرگوں نے نانوتہ وغیرہ بستیوں میں دورے کیے تو وہاں خاطر خواہ اثر ہوا اور مولانا مملوک علی وغیرہ دہلی تحصیل علم کی غرض سے گئے (سوانح قاسمی جلد اول ص ۸۱-۹۱) حالانکہ سید احمد شہید کی پیدائش ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء اور حاجی امداد اللہؒ کی پیدائش ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء کی ہے جب سید احمد شہیدؒ نے ان علاقوں میں دورہ کیا تو مولانا مملوک علی دہلی میں مسند درس پر متمکن تھے اور جب حضرت حاجی امداد اللہؒ نے رشد و ہدایت کی شمع روشن کی ہوگی تو مولانا مملوک علی جوانی کی منزلیں طے کر چکے ہونگے۔

یہ ہے کہ تحصیل علم کے بعد مولانا مملوک علی نے دہلی ہی میں درس تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا ہوگا اور جب ۱۸۲۵ء میں دہلی کا مشہور مرکز علم مدرسہ غازی الدین "دہلی کالج" میں تبدیل ہو گیا[1]۔ تو مولانا رشید الدین سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر عربی کے صدر مدرس مقرر ہوتے اور مولانا مملوک علی کا نائب مدرس کی حیثیت سے پچاس روپے ماہوار پر تقرر ہوا۔ مولانا مملوک علی کے تقرر کی تاریخ یکم جون ۱۸۲۵ء ہے[2]

نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) لکھتے ہیں[3]

" از اعیان دہلی بودند تلمذ ایشاں در علوم درسیہ با مولوی رشید الدین خاں است و از طرف فرنگیاں تدریس درجہ اول مدرسہ دہلی بایشان تعلق داشت "

وہ دہلی کے اکابر میں سے تھے اور علوم درسیہ میں مولوی رشید الدین خاں کے شاگرد تھے مدرسہ دہلی میں انگریزوں کی طرف سے جماعت اول (عربی) کو پڑھانے کے لئے مقرر تھے۔

---

[1] مدرسہ غازی الدین فیروز جنگ المتوفی ۱۷۱۰ء (والد نظام الملک آصف جاہ اول) نے اجمیری دروازے کے پاس قائم کیا تھا مدرسہ کی عمارت کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی تھی پاس ہی مقبرہ بنوایا جہاں خود دفن ہوئے۔ اس مدرسہ کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا۔ اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" (۲۴) میں مدرسہ غازی الدین کا بانی فیروز جنگ ثانی خلف نظام الملک آصف جاہ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے؛ ۱۸۲۹ء میں دہلی کالج کی مالی حالت بہت درست ہو گئی کیونکہ اعتماد الدولہ فضل علی خان وزیر شاہ اودھ نے ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم اس درسگاہ کے لئے وقف کی اور انکے داماد نواب حامد علی خاں نگراں اور متولی مقرر ہوئے۔ ملاحظہ ہو۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ۳۳۴ و مرحوم دہلی کالج از مولوی عبدالحق۔

[2] رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن ۳-۱۸۴۲ء، دہلی کالج سے متعلق رپورٹوں کے اصل اقتباسات ہمیں جناب رضیہ بشیر صاحبہ کے ذریعہ سے ملے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں وہ دہلی پر پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔

[3] تاریخ قنوج (قلمی) از نواب صدیق حسن خاں ص ۱۰۰ (مرتبہ ۱۲۷۸ھ) (مخزونہ مسلم یونیورسٹی لائبریری، حبیب گنج کلیکشن)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ (ف ۱۹۴۴ء) لکھتے ہیں[1]

"اخذ عن الشیخ رشید الدین، تقدم فی العربیۃ والفقہ وفنون التحصیل علی علماء عصرہٖ ونصب مدرساً ثانیاً "دھلی کالج" بعد شیخہ مولانا رشید الدین:

انھوں نے شیخ رشید الدین سے علوم حاصل کئے اور اپنے ہم عصر علماء میں عربی، فقہ اور فنون تحصیل میں سبقت لے گئے، اپنے استاد مولانا رشید الدین کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا یہ بیان درست نہیں کہ وہ اپنے شیخ مولانا رشید الدین کے بعد دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے بلکہ مولانا مملوک علی اور ایک دوسرے استاد مولوی سید محمد مولانا رشید الدین کے ساتھ ہی نائب مدرسین کی حیثیت سے دہلی کالج میں ملازم ہوئے تھے۔

اس کے بعد شعبہ عربی میں دو اور مدرس مقرر ہوئے مولوی سدید الدین بن مولوی رشید الدین کا ۳۰ راکتوبر ۱۸۳۰ء کو اور مولوی سبحان بخش شکارپوری کا ۵ راکتوبر ۱۸۳۲ء کو اس شعبہ میں تقرر ہوا۔[2]

مسٹر ٹامس ونیٹر دہلی کالج نے ۸ رنومبر ۱۸۴۱ء کو ایک رپوٹ میں مولوی مملوک علی کے اضافۂ تنخواہ کی سفارش کی کہ ان کو اسی روپے ماہوار تنخواہ ملنی چاہیے۔[3] بالآخر مولانا کو ساٹھ روپے تنخواہ ملنے لگی اس دوران میں نواب حامد علی خاں نے مولوی جعفر علی[4] کو سو روپے ماہوار پر کالج میں ملازم رکھ لیا۔ اور کوشش یہ کی کہ ان کو صدر مدرس مقرر کر دیا جائے۔ مولانا مملوک علی پندرہ سولہ سال

---

[1] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از عبید اللہ سندھی ۱۸۱ (کتاب خانہ پنجاب لاہور ۱۹۴۲ء)

[2] رپورٹ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن ۳-۱۸۳۲ء

[3] رپورٹ جنرل کمیٹی مورخہ ۸ رنومبر ۱۸۴۱ء

[4] مولوی جعفر علی بن افضال علی قصبہ جارچہ ضلع بلند شہر یوپی میں ۲ صفر ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کو پیدا ہوئے لکھنؤ اور دہلی میں تحصیل علم کی فن قرأت کو خاص طور سے حاصل کیا وہ دہلی میں اہل شیعہ حضرات کی ایک جماعت کے مقتدا تھے اور مولوی محمد باقر دہلوی (مقتول ۱۸۵۷ء) کے حریف سمجھے جاتے تھے ان دونوں حضرات کی جماعتیں جعفری اور باقری کے نام سے مشہور ہوئیں ۸ صفر ۱۳۱۳ھ میں فوت ہوئے اور جارچہ میں دفن ہوئے (ملاحظہ ہو غالب اور قاری جعفری علی از صفیر اصغر جارچوی "ماہ نو" کراچی فروری ۱۹۶۵ء)

سے کالج میں ملازم تھے ان کی حق تلفی ہوتی تھی کالج کے ارباب حل وعقد نے مفتی صدرالدین آزردہ سے اس مسئلہ میں رائے طلب کی انھوں نے مولانا مملوک علی کے علم وفضل کو سراہا اور ان کی سفارش کی مگر انتظامیہ نے نواب حامد علی خاں کے مقرر کردہ مولوی جعفر علی کو علیحدہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور معاملہ کچھ دنوں کے لئے ملتوی کردیا[1] بالاخر ۸ر نومبر ۱۸۴۱ء کو مولانا مملوک علی صدر مدرس قرار پائے اور سو روپے ماہوار ان کا مشاہرہ مقرر ہوا[2]۔ مسٹر ٹامسن نے مولانا مملوک علی کے لئے لکھا ہے[3]

وہ عربی کے بہت بڑے فاضل ہیں۔ اور شہر (دہلی) میں ان کا بہت احترام ہے۔	HE IS VERY GOOD ARABIC SCHOLAR AND VERY MUCH RESPECTED IN THE CITY.

مولانا جعفر علی ۱۸۴۳ء میں دہلی کالج سے علیحدہ ہو گئے۔

مولانا مملوک علی کوچہ چیلاں دہلی میں رہتے تھے انھوں نے اپنا ذاتی مکان بنالیا تھا۔ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں مولانا مملوک علی نے کالج سے رخصت حاصل کی اور حج کے لئے تشریف لے گئے۔ تقریباً ایک سال اس مقدس سفر میں لگا۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں[4]

"سن بارہ سو ساٹھ ہجری میں حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی نے کہ دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز کے تھے اچانک ارادہ ہجرت کا کیا ذیقعدہ میں شاید روانہ ہو گئے دہلی میں اندھیر ہو گیا، اور آپ صاحبان کے ساتھ ایک بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا یہ دیکھ کر حضرت والد مرحوم کو بھی حج کا دھیان ہوا خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کرتے رہے آخر جب رخصت ایک سال کی مل گئی اور سرکار نے براہِ قدردانی

[1، 2، 3] رپورٹ جنرل کمیٹی ۱۳ر نومبر ۱۸۴۱ء (جنرل پروسیڈنگ جلد چہاردہم)

[4] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص ۴۳ (حاشیہ) (مطبع صادق الانوار بہاول پور ۱۲۹۷ھ)

آدھی تنخواہ بھی دی رجب ۱۲۵۸ھ میں وطن سے روانہ ہو گئے اور
اول ذی الحجہ کو مکہ پہنچے زیارت حرمین سے فارغ ہو کر برس دن میں
پھر دہلی پہنچے اس وقت یہ سفر جلد طے ہونے میں عجیب سمجھا رخصت
کے دن پورے ہو چکے تھے وطن نہ آسکے ذی الحجہ میں جب چھٹی سالانہ
ہوئی وطن تشریف لائے اور مولوی صاحب (محمد قاسم نانوتوی)
کو دہلی ساتھ لے گئے"

مولانا مملوک علی خانوادۂ ولی اللہی کے فیض یافتہ اور مستفید تھے اور اسی خاندان سے ان کو نسبت تلمذ تھی۔ وہ اپنے زمانہ طالب علمی سے اپنے انتقال تک تقریباً تہائی صدی سے زیادہ دہلی میں رہے اور ایک عالم و مدرس کی حیثیت سے مشہور و معروف ہوئے۔ وعظ و تذکرہ اور تصنیف و تالیف سے کچھ تعلق نہ تھا[1] درسی ضرورت سے دو تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان کا خاص میدان درس و تدریس تھا اور اس اعتبار سے وہ مشہور ہوئے کالج کے علاوہ طلبا کی ایک جماعت ان سے گھر پر بھی استفادہ کرتی تھی۔ دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتمد رہے کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا مملوک علی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ہر سالانہ رپورٹ میں ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ ایک موقعہ پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا مملوک علی کو انعام سے بھی نوازا۔ صورت یہ ہوئی کہ ۱۵، ۱۷ رنومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار کیا، ۱۷ رنومبر کے دربار میں ۲۷ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا مولانا مملوک علی مدرس اول کو خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا۔ اسی طرح مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت ہفت پارچہ سہ رقم جواہر اور مفتی صدر الدین خاں بہادر صدر آزردہؔ دہلی کو خلعت سہ پارچہ اور گھنٹہ ملا[2] اس وقت انگریزی حکومت کا مقصد یہ تھا کہ مغربی علوم اور تعلیم ہندوستان کے مسلمانوں میں اور خاص طور

---

[1] آثار الصنادید از سر سید احمد خاں (باب چہارم) ۲۰۷ (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۶ء)

[2] دہلی کا آخری سانس (اقتباسات احسن الاخبار بمبئی ۴۶-۱۸۴۴ء) مترجمہ سید محمد صاحب ناصر دہلوی شائع کردہ خواجہ حسن نظامی دہلوی ۲۶۳ (حلقہ مشائخ دہلی ۱۹۲۵ء)

سے دہلی کے مسلمانوں میں مروج و مقبول ہو۔ اس مقصد میں گورنمنٹ کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔
سی۔ ایف اینڈریوز لکھتے ہیں[۱]

دہلی کی نشاۃ ثانیہ میں ایک اور امر جو عجیب و غریب دلچسپی رکھتا تھا کہ شعبہ علوم مشرقیہ جو زیادہ تر عربی اور فارسی لٹریچر سے متعلق تھا بہت زیادہ ہر دلعزیز ہو گیا تھا ان جماعتوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی لیکن نئی انگریزی جماعتوں کی وجہ سے طلبا نے انھیں چھوڑ نہیں دیا تھا۔"

مولانا مملوک علی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے بھی دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقینی آگے بڑھیں۔ اور مسلمانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی کہ جس نے نئے نظام تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں، مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (مدرس اجمیر کالج) مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج) مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس) مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس) تو خاص ان کے اعزہ و احباب ہیں۔ ان کے علاوہ شمس العلماء ڈپٹی شیخ ضیاء الدین ایل ایل ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف سنہ ۱۹۱۲ء) شمس العلماء محمد حسین آزاد (ف سنہ ۱۹۱۰ء) پیرزادہ محمد حسین (سیشن جج) خواجہ محمد شفیع (جج) خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء) مولوی کریم الدین پانی پتی (ف سنہ ۱۸۷۹ء) مولوی جعفر علی (ف سنہ ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں کہ جو اسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات سرانجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور حسن صلہ سے نوازا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کا یہ خیال ہے کہ جب سنہ ۱۲۵۷ھ میں شاہ محمد اسحاق حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے تو تحریک کی نگرانی کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا جس کے صدر مولانا مملوک علی اور تین

---

[۱] تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی از سی۔ ایف اینڈریوز ص ۷۶

دکن مولانا نواب قطب الدین (ف ۱۲۸۹ھ) مولانا مظفر حسین کاندھلوی (ف ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ م ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء) اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی (ف ۶ محرم ۱۲۹۵ھ) تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا مملوک علی خانوادہ ولی اللہی کے فیض یافتہ شاہ محمد اسحاق کے معتمد و معتقد تھے۔ مگر ان کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل تو درکنار کہیں اشارہ بھی نہیں ملتا۔ ان کی زندگی تو تمام تر درس و تدریس سے عبارت رہی ہے لہذا یہ صدارت کچھ محل نظر سی معلوم ہوتی ہے۔

مولانا مملوک علی نہایت متواضع، حلیم بردبار اور منکسر المزاج تھے، وعظ و تذکیر کی عادت نہ تھی سادہ لباس پہنتے تھے[1] مولانا مظفر حسین اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (ف ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء) سے خاص تعلقات تھے مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں[2]

"جب حضرت مولوی صاحب (مظفر حسین کاندھلوی) دہلی تشریف لاتے تو والد مرحوم کے پاس ہمارے مکان میں فروکش ہوتے اور والد مرحوم جب وطن جاتے، کاندھلہ ہو کر جاتے، جب وطن سے لوٹتے کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے اور یہی حال جناب حاجی امداد اللہ صاحب سے تھا۔"

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی لکھتے ہیں[3]

"مولانا مملوک علی صاحب ہمیشہ دہلی آتے اور جاتے جب کاندھلہ سے گزرتے تو باہر سڑک پر گاڑی کو چھوڑ کر ملنے آتے حضرت مولانا مظفر حسین صاحب اول یہ پوچھتے کہ کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے اگر کہا کھا چکا تو پھر کچھ نہیں اور اگر نہ کھائے ہوئے ہوتے تو کہہ دیتے کہ میں کھاؤں گا تو مولانا پوچھتے کہ رکھا ہوا لا دوں یا تازہ پکوا دوں چنانچہ ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ

---

[1] آثار الصنادید ص ۷۰

[2] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی ص ۱۲۴

[3] حالات مشائخ کاندھلہ از مولوی احتشام الحسن کاندھلوی ص ۳۴، ۳۵ (ادارہ اشاعت دینیات دہلی ۱۳۸۳ھ)

دکھا ہوا لا دو اس وقت صرف کھچڑی کی کھرچن تھی اسی کو لے آئے
اور فرمایا رکھی ہوئی تو یہی تھی، انھوں نے کہا کہ بس یہی کافی ہے پھر
جب رخصت ہوتے تو مولانا مظفر حسین صاحب ان کو گاڑی تک
پہنچانے جاتے تھے۔ یہی ہمیشہ کا معمول تھا"

یہ بزرگ خلوص و محبت اور تواضع و انکسار کا سراپا نمونہ تھے اللہ تعالےٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

مولانا مملوک علی ۱۲۵۹ھ میں حج سے سیدھے دہلی واپس آئے اور تعطیل کے موقعہ پر ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ میں اپنے وطن نانوتہ گئے اور اپنے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کو تعلیم کی غرض سے اپنے ہمراہ دہلی لائے اور وہاں نہایت توجہ سے ان دونوں کی تعلیم و تربیت کی ایک سال کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہی (ف ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے ان اقطاب ثلاثہ کی تعلیم و تربیت مکمل ہو چکی تھی کہ مولانا مملوک علی کو پیام آگیا اور وہ گیارہ دن یرقان کے مرض میں مبتلا رہ کر ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۷ راکتوبر ۱۸۵۱ء داعیٔ ملک بقا ہوئے[1] اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندانی قبرستان مہندیوں میں شیخ عبدالعزیز شکر بار کے پائیں دفن ہوئے مولوی بشیر الدین احمد لکھتے ہیں[2]

"آپ کی قبر کچی ہے جب تک کوئی نہ بتائے مل نہیں سکتی ناقدر دانیٔ
زمانہ ملاحظہ ہو کہ آپ کے ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار
تھے مگر استاد کو کسی نے بھی نہ پوچھا اور اتنا بھی نہ کیا کہ ایک
ہاتھ بھر کا پتھر کا ٹکڑا لگا دیتے کہ اس خاک کے ڈھیر پر سے گزرنے
والے فاتحہ تو پڑھ لیتے"

۱۳ اکتوبر ۱۸۵۱ء کو پرنسپل دہلی کالج نے مولوی مملوک علی کے انتقال کے متعلق

---

[1] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی ۹۲

[2] واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم از مولوی بشیر الدین احمد ۵۸۲

انتظامیہ کو اطلاع دی۔[1] مولانا مملوک علی جماعت علماء میں ایک امتیازی حیثیت کے مالک تھے سر سید احمد خاں لکھتے ہیں[2]:

"علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ علم خالی ہو جاوے تو ان کی لوح حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے، ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و علم احاطہ تحریر سے افزوں تر ہے۔"

مولوی کریم الدین پانی پتی لکھتے ہیں[3]

"بناء مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں مہارتِ تامّہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اُردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے اور جس کام پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں اُن کے ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو۔"

مولانا مملوک علی کی ذات مرجع طلباء تھی اکناف واطراف سے طلبہ ان کی خدمت میں پہنچ کر استفادہ علمی کرتے تھے، کالج کے علاوہ فاضل اوقات میں ان کے گھر پر بھی طلبہ کا ہجوم رہتا تھا مولوی کریم الدین لکھتے ہیں[4]:

---

[1] رپورٹ جنرل کمیٹی ۱۸۵۱ء

[2] آثار الصنادید ۲۰۷

[3] تذکرہ طبقات الشعراء ہند از مولوی کریم الدین ۲ ۴۶۳

[4] تذکرہ فرائد الدہر از مولوی کریم الدین ۲ ۲۰۷

"گھر اس کا محط الرحال طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علماء و فضلاء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے ...... سوا درس دہلی طلبا مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں ...... تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلبا میں نصف شب تک منقسم ہے ...... ان کی فہرست میں صدہا طالب علم اطراف و جوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں۔ اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں"

طلبہ مولانا مملوک علی سے مطمئن ہوتے تھے اور مولانا کے یہاں ان کی خاطر خواہ تشفی ہوتی تھی مولانا رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں[1]

"ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی کبھی سبق تھوڑا ہوتا تھا اور کبھی شبہات کا جواب نہ ملتا تھا۔ مگر جب مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا۔ اور بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کر لیں گویا استاد نے گھول کر پلا دیا (مولانا رشید احمد) فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو۔ اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں ایک ہمارے استاد مولانا مملوک العلی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدرالدین صاحب تھے رحمۃ اللہ علیہما"

مولانا مملوک علی کے طرز تدریس کے متعلق مولانا محمد یعقوب نانوتوی رقم طراز ہیں[2]

---

[1] تذکرۃ الرشید حصہ اول از مولوی عاشق الٰہی میرٹھی ص ۳۰-۳۱

[2] سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی ص ۳

"ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا وہ طرزِ عبادت سے سمجھ لیتے تھے یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں۔"

مولانا مملوک علی کے تلامذہ کی تعداد کا استحصار نا ممکن ہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے علماء مثل مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی، مولوی کریم الدین پانی پتی، منشی جمال الدین مدار المہام بھوپال۔ شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین۔ ایل ایل ڈی [۱] ——— مولوی عالم علی مُرادآبادی (ف ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء) مولوی سمیع اللہ دہلوی [۲]

---

[۱] خان بہادر شمس العلماء مولوی شیخ ضیاء الدین ایل ایل ڈی کے والد داروغہ شیخ محمد بخش موضع بسی تحصیل دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ یہ خاندان گورنمنٹ کا خیرخواہ تھا غدر ۱۸۵۷ء میں (داروغہ شیخ محمد بخش) دھیرج کی پہاڑی پر خبر رسانی کرتے تھے۔ جب انگریزی فوج دلی میں داخل ہوئی تو داروغہ جی اپنے گھر میں تھے کہ ایک سپاہی کی گولی سے ڈھیر ہوگئے۔ خبر رسانی کے صلہ میں کچھ اراضی انعام میں ملی ان کے فرزند مولوی ضیاء الدین نے مولانا مملوک علی اور مفتی صدر الدین آزردہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ دلی کالج کے طالب علم رہے۔ پھر نارمل اسکول اور دلی کالج کے مدرس رہے جب ۱۸۷۷ء میں دہلی کالج ٹوٹا تو اکسٹرا اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔

(واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ۱۷۹۲)

[۲] مولوی سمیع اللہ خاں بن منشی عزیز اللہ ۱۸۳۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے مولوی غلام محمد اور مولانا مملوک علی سے ان کے گھر پر تعلیم حاصل کی مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی پڑھا نومبر ۱۸۵۶ء میں منصفی اور وکالت کا امتحان پاس کیا اور کانپور میں منصف مقرر ہوئے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۳ء تک آگرہ کی صدر دیوانی، صدر نظامت اور ہائی کورٹ میں وکالت کی ۱۸۷۳ء میں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ علی گڑھ، الٰہ آباد، مرادآباد اور فتح گڑھ میں کار فرما رہے سرسید احمد خاں کی تعلیمی مہم میں شریک و معاون تھے مولوی سمیع اللہ خاں کی کوشش سے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جو ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا، ایک جلسہ میں بصدارت مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ مدرسہ علی گڑھ کے افتتاح کی رسم ادا کی گئی، مولوی صاحب نے میور سنٹرل کالج الٰہ آباد کے مسلم طلباء کے لئے

(باقی صـ ۱۸۶ پر)

مولانا عبدالرحمان پانی پتی[1] وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے مولانا مملوک علی کے تلامذہ میں سرسید احمد خان (ف ۱۸۹۸ء) ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء) اور مولوی ذکاء اللہ (۷، نومبر ۱۹۱۰ء) کو بھی شامل کیا ہے، اس سلسلہ میں مولانا سندھی نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے غالباً آخرالذکر حضرات کو تو اس لئے اس فہرست میں شامل کر لیا ہے کہ یہ حضرات دہلی کالج کے تعلیم یافتہ ہیں مگر معلوم نہیں سرسید کو کسطرح ان کا شاگرد لکھ دیا۔ سرسید احمد خاں تو دہلی کالج کے طالب علم بھی نہیں رہے۔ سرسید خاں نے آثار الصنادید ۱۸۴۶ء میں مرتب کی اور اس وقت مولانا مملوک علی زندہ تھے انہوں نے اس میں کہیں تلمذ کا ذکر نہیں کیا ہے[2] اسی طرح حیات جاوید میں مولانا حالی نے ابتدائی تعلیم کا حال کم وبیش سرسید احمد خاں ہی کے الفاظ میں نقل کیا ہے وہاں بھی سرسید احمد خاں نے مولانا مملوک علی کو

(بقیہ حاشیہ ص۱۸۵) الہ آباد میں ایک بورڈنگ ہاؤس بنوایا جس کا افتتاح سر آکلینڈ کالون لفٹیننٹ گورنر یوپی کے ہاتھ سے ۱۱ مارچ ۱۸۹۲ء کو کرایا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۸۲ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں انہوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔ ۵ ربیع الاول ۱۳۲۶ھ مطابق ۷ اپریل ۱۹۰۸ء کو دہلی میں فوت ہوئے۔

(سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں از مولوی ذکاء اللہ دہلوی مطبع انوار الاسلام حیدرآباد دکن ۱۹۰۹ء)

[1] قاری عبدالرحمن پانی پتی بن قاری محمدی نے مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک علی سے تحصیل علم کی اور صحاح ستہ کی سند شاہ محمد اسحاق سے لی۔ علم قرات قاری امام الدین امروہوی سے حاصل کیا، ۱۶ سال نواب ذوالفقار الدولہ رئیس باندہ کے مدرسہ میں مدرس رہے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں باندہ میں مقیم تھے، ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو پانی پت میں انتقال ہوا (تذکرہ علمائے ہند ۵۷۷-۵۷۸، مقالات شروانی از نواب حبیب الرحمان شروانی ۲۷۹-۲۸۲، تذکرہ رحمانیہ از خواجہ الطاف حسین حالی، مطبوعہ نقوش لاہور۔ اپریل ۱۹۵۳ء)

[2] آثار الصنادید از سرسید احمد خاں ۲۰۷

اپنے اساتذہ میں شمار نہیں کیا ہے۔[1]

ڈپٹی نذیر احمد کے حالات حیات النذیر میں مفصل لکھے گئے ہیں۔ ان کے اساتذہ کی فہرست میں مولانا مملوک علی کا نام اس کتاب میں بھی شامل نہیں ہے ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۴ء دہلی کالج میں طالب علم رہے[2] ابتدائی سالوں میں تو دوسرے اساتذہ کے پاس اسباق رہے ہوں گے اور اکتوبر ۱۸۵۱ء کو مولانا مملوک علی کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے مولانا مملوک علی سے پڑھنے کی نوبت ہی نہیں آئی ہوگی ورنہ حیات النذیر کے مؤلف اس کا ذکر ضرور کرتے۔

شمس العلماء منشی ذکاءاللہ بھی تقریباً ۱۸۴۵ء ہی دہلی کالج میں داخل ہوئے ان کو فارسی سے خاصا لگاؤ تھا انھوں نے اپنے استاد مولوی امام بخش صہبائی (ش ۱۸۵۷ء) کا بہت محبت سے ذکر کیا ہے ان کا خاص مضمون ریاضی تھا اور وہ ماسٹر رام چندر (ف ۱۸۸۰ء) کے خاص شاگرد تھے اور اس مضمون میں انھوں نے امتیاز و اختصاص بھی حاصل کیا ان کے اساتذہ میں کہیں مملوک علی کا نام نہیں آتا ہے۔[3]

حکیم عبدالحی (ف سنہ) مؤلف نزہتہ الخواطر نے مولانا اشرف علی تھانوی سے روایت کی ہے کہ مولانا شیخ محمد تھانوی (ف ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء) نے علوم متعارفہ کی تحصیل مولانا مملوک علی سے کی تھی۔[4]

مولانا مملوک علی کا تمام وقت درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا، دن اور رات ان کے یہاں طلباء کا ہجوم رہتا تھا لہذا تصنیف و تالیف کے لئے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ دہلی کالج کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج کی طرف سے جن کتابوں کا ترجمہ ہوتا تھا ان میں

---

[1] حیات جاوید از الطاف حسین حالی ۲۴-۲۵ (آگرہ ۱۹۰۳ء)

[2] حیات النذیر از افتخار عالم مارہروی ۳۴ (شمسی پریس دہلی ۱۹۱۲ء)

[3] تذکرہ مولوی ذکاءاللہ دہلوی (سی۔ ایف۔ اینڈریوز) ترجمہ ضیاءالدین برنی ۶۵-۸۰ (تعلیمی مرکز، کراچی ۱۹۵۲ء)

[4] مرتبہ ثناءالحق ۲۲۴ (پاک اکیڈمی، کراچی ۱۹۶۳ء) تحقیق وحدت الوجود والشہود

سے اکثر کی وہ نگرانی و نظر ثانی کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل کتابوں کے خود مولانا مملوک علی نے ترجمے کئے ہیں۔

۱۔ تحریر اقلیدس ۱۸۴۳ء میں دہلی کالج کے پرنسپل کی تحریک پر تحریر اقلیدس کے اول کے چار مقالوں اور آخر کے گیارھویں اور بارھویں مقالوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

اس کے ترجمہ کے متعلق مولوی کریم الدین لکھتے ہیں[1]

"ترجمہ اردو زبان میں کر کے بانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا ہے"

تحریر اقلیدس ۱۸۴۹ء میں ایک سو پچاس اور ۱۸۵۱ء میں تین سو کی تعداد میں طبع ہوئیں[2] اسکا مطبوعہ نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے

۲۔ ترجمہ سنن ترمذی چونکہ یہ کتاب دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھی اس لئے مولانا مملوک علی نے اس کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کیا[3]

۳۔ تاریخ یمینی تاریخ یمینی بھی دہلی کالج کے نصاب میں شامل تھی اس کا اردو ترجمہ بھی مولانا مملوک علی نے کیا اس کتاب کا خطی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے کتب خانہ میں موجود ہے[5]

۴۔ عربی خط غیر منقوطہ مولوی کریم الدین نے تذکرہ فرائد الدہر میں مولانا مملوک علی کا ایک عربی خط نقل کیا ہے جو انھوں نے شہزادہ فیروز شاہ کو لکھا تھا۔

مولانا مملوک علی کے نامور فرزند مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے۔

---

[1] تذکرہ طبقات الشعرائے ہند ص ۴۶۴

[2] صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات از محمد عتیق صدیقی ص ۱۸۸۲، ۱۹۰ (انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۲ء)

[3] مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۲

[4] تذکرہ اہل دہلی (سر سید احمد خاں) مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ص ۹۸ (انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۵ء)

[5] تاریخ یمینی کو اصل عربی میں ڈاکٹر اے۔ اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج نے ایڈٹ کیا (مرحوم دہلی کالج ص ۱۴۸) اس کتاب کا عربی سے فارسی میں ترجمہ مولانا فضل امام خیر آبادی نے کیا ہے جو ان کے ہاتھ کا تحریر کردہ حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کی عنایت سے ہماری نظر سے گزرا یہ فارسی ترجمہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔

سید جمال الدین افغانی

از:- ضیا

سید جمال الدین افغانی ۱۲۵۴ھ ،۱۸۳۸ء میں افغانستان کے ایک گاؤں اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے انھوں نے چھوٹی عمر ہی میں مروّجہ علوم میں تکمیل کر لی۔ وہ اٹھارہ سال کے تھے کہ ہندوستان آئے، وہاں انھوں نے کوئی ڈیڑھ سال قیام فرمایا[۱]۔ اس کے بعد فریضۂ حج ادا کرنے وہ عازمِ حجاز ہوئے۔ سید جمال الدین افغانی نے جزیرۂ عرب کی بھی کافی سیاحت کی۔ حج سے فراغت کے بعد آپ افغانستان واپس چلے گئے، اور وہاں حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔

سید جمال الدین افغانی نے جس علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہاں دوسرے اسلامی

---

[۱] معلوم ہوتا ہے، ہندوستان میں وہ پہلی بار یورپی علوم سے واقف ہوئے۔ وہ ہندوستان میں کہاں ٹھہرے اور کس کس سے ملے؟ اس کی کوئی تفصیلات نہیں ملتیں۔ لیکن ہندوستان کے اس قیام سے انھوں نے جو فائدہ اٹھایا، اُس کا ذکر اپنے مشہور رسالے العروۃ الوثقیٰ میں، جو سید صاحب نے اپنے شاگرد شیخ محمد عبدہ کے ساتھ مل کر پیرس سے نکالا تھا، اِن الفاظ میں کرتے ہیں: "میں نے مشرق اور اس کے باشندوں کی طرف نظر دوڑائی، تو سرزمینِ افاغنہ نے اپنی طرف مجھے متوجہ کیا، اور وہ پہلی زمین ہے، جس کی مٹی نے میرے جسم کو چھوا۔ اس کے بعد ہندوستان آتا ہے، جہاں میری عقل کی تربیت ہوئی پھر ایران ہے......" العروۃ الوثقیٰ کے بارے میں شیخ محمد عبدہ نے ایک دفعہ فرمایا تھا، کہ اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا، اُن میں سے کوئی بھی میرا نہیں، اور جو تحریریں اُس میں چھپیں، اُن میں سے کوئی بھی سید صاحب کی نہیں ؛

ممالک سے زیادہ فلسفہ و حکمت کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ افغانستان کے مشہور عالم و محقق صلاح الدین سلجوقی سید صاحب کے سوانح حالات میں لکھتے ہیں کہ سترھویں صدی عیسوی سے افغانستان اور شمالی ہندوستان میں منطق و فلسفہ کی تعلیم کی طرف خاص رجحان پیدا ہو گیا تھا چنانچہ حالت یہ تھی کہ علم کلام فلسفہ سے بھرپور تھا۔ فلسفہ تصوف بالخصوص اس کے وحدت الوجود کے تصور سے متاثر تھا۔ اور ادب، و شعر وحدت الوجود کی عکاسی کرتا تھا۔ یہ علمی خصوصیت صرف ان علاقوں میں پائی جاتی تھی۔ اور عربی ممالک اس سے بالعموم خالی تھے۔ درس و تدریس کے اس رجحان کی بنیاد دراصل بو علی بن سینا نے اپنی کتاب "الاشارات" میں رکھی۔ اس کے بعد جلال الدین دوانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، مُلّا صدرا، محمد جونپوری اور انہیں کے پائے کے دوسرے حضرات اسی راہ پر چلے۔ یہ حضرات علماء بھی تھے، فلسفی بھی اور متکلم، صوفی اور ادیب بھی۔

اس کے بعد سلجوقی صاحب سید جمال الدین افغانی کی تعلیمی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :- انھوں نے ایک عام افغانی طالب علم کی طرح علوم دینیہ، فلسفہ، تصوف اور ادب کی تحصیل کی۔ اور ان میں درجہ تکمیل حاصل کیا۔ میں نے سنا ہے کہ سید صاحب نے قاضی بشر (؟) حافظ دراز اور حبیب اللہ قندھاری سے پڑھا تھا۔ لیکن اس بارے میں ان کی خصوصیت یہ تھی کہ قدیم فلسفیوں کی طرح ان کے مطالعے کا محور زیادہ تر اجتماعی و سیاسی امور رہے۔ اور ان امور میں ان کے پیش نظر وہ مقصد تھا، جسے ابو علی بن مسکویہ "کمال" سے تعبیر کرتا ہے[1]

سید جمال الدین افغانی کی ذہنی زندگی کا یہ نقطہ آغاز تھا۔ اس کے بعد وہ ملکوں ملکوں پھرے، انھیں زندگی کے نئے نئے تجربے ہوتے اور اس طرح ان کی علم و فکر کی حدیں وسیع ہوتی گئیں۔

افغانستان میں اس وقت امیر دوست محمد خاں کی حکومت تھی۔ اور سید صاحب جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اس میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ امیر دوست محمد خاں کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ سید صاحب محمد اعظم خاں کے ساتھ تھے

---

[1] جمال الدین افغانی بقلم محمد ابو ریہ۔ مطبوعہ قاہرہ

اسے اس کے بھائی شیر علی خاں نے انگریزوں کی مدد سے شکست دے دی، اور وہ ایران چلا گیا۔ سید صاحب اس کے بعد کابل میں ہی رہے۔ پھر حج کے ارادے سے دوسری بار ہندوستان آئے۔ اس دفعہ ہندوستان میں آپ کا صرف ایک ماہ قیام رہا۔ ہندوستان میں پہلی بار سید صاحب ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ تشریف لائے تھے اور دوسری بار ۱۸۶۹ء میں۔ یہاں سے آپ نے مصر کا قصد کیا۔ مصر میں سید صاحب صرف چالیس روز ٹھہرے۔ اس دوران میں وہ جامعہ ازہر آتے جاتے رہے۔ اور زیادہ تر شامی طلبہ ان سے ملے بلکہ بعض نے اُن سے کتاب شرح الاظہار کے کچھ سبق بھی پڑھے[1]۔

مصر سے سید جمال الدین استنبول گئے۔ وہاں اُن کی کافی آؤ بھگت ہوئی، اور انھیں مجلس تعلیمات کا رکن مقرر کیا گیا۔ لیکن ترکی کا شیخ الاسلام اُن کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو دیکھ کر ان سے خار کھانے لگا۔ اور ان کی ایک تقریر کے بعض جملوں کو غلط معنی پہنا کر اُن کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مجبوراً سید صاحب کو استنبول چھوڑنا پڑا۔ استنبول سے وہ ۱۸۷۱ء میں مصر آ گئے۔ اس دفعہ وہ مصر میں پورے آٹھ برس رہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان آٹھ سالوں میں سید صاحب کی تعلیمات سے سب سے زیادہ فائدہ مصر نے اٹھایا اور وہاں جو دینی اصلاح کا جذبہ، ذہنی بیداری، سیاسی شعور اور عربی ادب و انشا کا نیا اسلوب پیدا ہوا، وہ سب سید صاحب اور اُن سے استفادہ کرنے والوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

مصر میں سید جمال الدین افغانی کے پائے کے عالم دین کے لئے موزوں ترین جگہ ازہر تھی، لیکن علمائے ازہر کو سید صاحب کا کتب فلسفہ کی تعلیم دینا پسند نہ تھا، کیونکہ اس زمانے میں کتب فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے کو زندیق اور کافر سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ اس وقت ایک شاعر نے کہا تھا۔

ومن يقل بالطبع او بالعلة فذاك كفر عند اهل الملة

---

[1] جمال الدین افغانی بقلم محمد ابو ریۃ۔ مطبوعہ قاہرہ

(جو طبیعت اور علت و معلول کی بات کرے، تو وہ اہل ملت کے نزدیک کفر ہے)

یہ صورت حال دیکھ کر سید صاحب نے اپنے گھر پر ہی تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا گو علمائے ازہر اس سے بڑے برافروختہ ہوئے، لیکن سید صاحب نے اس کی مطلق پروا نہ کی، ان کے درس میں علماء میں سے بہت کم اور غیر علماء تعلیم یافتہ طبقے میں سے کافی لوگ آنے لگے اور اس طرح سید صاحب کا حلقہ اثر وسیع ہوتا گیا۔ وہ صرف کتابیں نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں میں ایک نئی روح بھی پیدا کرتے تھے، دینی اصلاح کی روح، اجتماعی و سیاسی امور کو بدلنے کی روح اور اپنے خیالات کو زبان و قلم سے دوسروں تک پہنچانے کی روح۔

سید صاحب اپنے درس و تلقین میں ایک طرف جمود فکری اور تقلید اعمی کی مخالفت کرتے۔ اور دوسری طرف خدیو اسماعیل جو اس وقت مصر کا فرمانروا تھا۔ اس کے استبداد پر برسا کرتے۔ اور اہل مصر کے لئے ذمہ دار حکومت کے قیام کی ضرورت پر زور دیتے۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے استاد کی ان سرگرمیوں کا اسی زمانے میں ان الفاظ میں ذکر کیا تھا۔

"سید جمال الدین مصر آئے۔ ان کا ارادہ یہاں قیام کا نہ تھا، لیکن جب وہ وزیر اعظم ریاض پاشا سے ملے، تو اس نے انھیں قیام مصر پر آمادہ کر لیا۔ اور اُن کے لئے ایک ہزار قرش مصری وظیفہ مقرر کیا۔ اُن کے اس زمانہ قیام میں بہت سے طالبعلموں نے اُن کا رُخ کیا اور ان سے علم کلام، نظری حکمت، طبیعیات، عقلیات، ہیئت، علم تصوّف اور اُصول فقہ اسلامی کے فنون کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں۔ اس تمام عرصے میں اول تا آخر اُن کا گھر ہی ان کا مدرسہ تھا۔ وہ کبھی ازہر میں پڑھانے کے لئے نہیں گئے۔ البتہ کبھی کبھی اُسے دیکھنے ضرور جاتے، اور زیادہ تر وہ جمعہ کے دن وہاں جایا کرتے تھے۔

"طالب علموں کے دلوں میں سید صاحب کی عظیم شخصیت کا نقش بیٹھ گیا۔ اور انھوں نے ان سے بہت کچھ اخذ کیا۔ وہ ان کے دین اور ان کی باتوں کے شیفتہ ہو گئے۔ چنانچہ زبانیں اُن کی تعریف میں رطب اللسان ہوئیں۔ اور مصر کے طول و عرض میں اُن کی شہرت پھیل گئی۔ سید صاحب نے عقل کو اوہام کے شکنجوں سے آزاد کرانے کی طرف

خاص توجہ فرمائی۔ اس سے ذہنوں کو تازگی ملی اور بصیرت میں نئی روشنی پیدا ہوئی۔

"سید صاحب نے اپنے شاگردوں کو مضمون نگاری پر آمادہ کیا۔ اور وہ مختلف موضوعات پر مقالات لکھنے لگے۔ اور اس میں انھوں نے خاص مہارت حاصل کر لی۔ اس طرح مصر میں انشاپردازی کو بڑی ترقی ہوئی اور ایسے کئی مشہور اہل قلم مل گئے۔

یہ وہ چیزیں تھیں، جن کی وجہ سے بعض لوگ اُن پر حسد کرنے لگے۔ اور ان کا کتب فلسفہ پڑھنا ان کو مطعون کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا، کیونکہ متاخرین کے ہاں ایسا کرنا حرام سمجھا جاتا تھا ان کتب فلسفہ میں جو خیالات تھے، حاسدوں نے وہ ان کی طرف منسوب کئے، اور اس بات کو عوام میں بڑی شہرت دی۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو ان کی مجلس میں جاتے، اور جو کچھ وہاں وہ کہتے اسے نہ سمجھتے پھر اس کو غلط سلط نقل کر کے انھیں بدنام کرتے۔ لیکن عقلاء اور اہل معرفت کے ہاں اُن کا جو مقام تھا۔ اس قسم کی حرکات سے اس پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ اور اُونچا ہوتا گیا اور دل ان کی طرف برابر مائل ہوتے گئے، یہاں تک کہ خدیو توفیق برسر اقتدار آیا اور اس کے حکم سے انھیں ۱۸۷۹ء میں مصر سے نکال دیا گیا۔"[1]

شیخ محمد عبدہ کا سید جمال الدین افغانی سے شاگردی و استادی کا جو تعلق تھا اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :۔

"میں محرم ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کے شروع سے اُن کے ساتھ رہا میں نے ان سے ریاضی، حکمت و فلسفہ اور علم الکلام کے سبق پڑھنے شروع کئے۔ اس کے علاوہ میں دوسروں کو بھی آمادہ کرتا تھا کہ وہ سید صاحب سے پڑھیں۔ اس پر مشائخ ازہر اور طلبہ کی ایک کثیر جماعت اُن کے اور ہمارے خلاف باتیں بنانے لگے۔ اُن کا یہ کہنا تھا کہ ان علوم کا حاصل کرنا صحیح عقائد کو متزلزل کر دے گا۔ اور اس سے آدمی ایسی گمراہیوں

---

[1] یہ مضمون ۱۸۸۵ء میں لکھا گیا تھا۔ جمال الدین افغانی۔ بقلم محمود ابو ریہ

میں گمرے گا کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیوں سے
محروم ہو جائے گا۔

مصر سے سید جمال الدین افغانی کا اخراج محض خدیو توفیق کی وجہ سے عمل میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ اس کے پیچھے برطانوی قنصل کا ہاتھ تھا، جو اس وقت مصری حکومت کی مالیات کی نگرانی پر مقرر تھا۔ الدکتور محمد البہی کے الفاظ میں :۔

"مصر پر برطانیہ کے فوجی قبضے سے تین سال پہلے سید جمال الدین کو برطانوی قنصل کے مشورے سے مصر سے نکالا گیا۔ اُن پر الزام یہ تھا کہ "وہ بعض سر پھرے نوجوانوں کی جماعت کے صدر ہیں، جو دین اور دنیا دونوں میں گڑبڑ کرنا چاہتی ہے"۔[۱]

۱۸۷۹ء میں سید صاحب تیسری بار ہندستان آئے۔ پہلے وہ ایک سال تک حیدرآباد دکن میں رہے، وہیں انھوں نے "الرد علی الدھریین" نام کا رسالہ لکھا جس میں انھوں نے سرسید اور ان کی نام نہاد "نیچری تحریک" پر سخت تنقید کی ہے۔ اس رسالے کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب سرسید کی انگریز دوستی سے بہت زیادہ خفا تھے، اور اسی خفگی نے ان سے یہ رسالہ لکھوایا۔ بعد میں جب انھوں نے پیرس سے "العروۃ الوثقٰی" نکالا، تو اس میں بھی سرسید کی انگریز دوستی پر تنقید ہوتی رہتی تھی، سید جمال الدین کا خیال تھا کہ سرسید اس "نیچریت" کو اس لئے ہوا دے رہے ہیں تاکہ وہ ہندستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار بنا سکیں۔

جب مصر میں عرابی پاشا کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی تو سید صاحب کو حیدرآباد دکن سے کلکتہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اور وہاں وہ اس وقت تک نظربند رہے، جب تک مصر پر انگریزوں کا پورا قبضہ نہیں ہو گیا۔ کلکتہ کے دوران قیام میں انھوں نے ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے کہا۔

---

[۱] الفکر الاسلامی الحدیث۔ ص۱۷

میرے تعجب کی حد نہیں رہتی جب میں ان لوگوں کا خیال
کرتا ہوں، جو چراغ لے کر شام سے صبح تک شمس بازغہ کا مطالعہ
کرتے ہیں، لیکن کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ جب لیمپ
سے چمنی دور کر لی جائے، تو وہ کیوں دھواں دینے لگتا ہے
اور جب اس پر چمنی رکھ دی جائے تو کیوں دھواں رک
جاتا ہے۔ ایسے علماء اور ان کے اس علم پر افسوس۔ اس سے
بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے مذہبی رہبروں
نے علم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک کو وہ دینی علم کہتے
ہیں اور دوسرے کو افرنگیوں کا علم بتاتے ہیں۔ یہ امر کس قدر
تعجب خیز ہے کہ آج کے مسلمان کس ذوق و شوق سے افلاطون
و ارسطو کی تصانیف کا تو مطالعہ کرتے ہیں، لیکن اگر آپ
ان کی توجہ گلیلو اور کپلر کی طرف منعطف کرائیں، تو وہ ان
کے علم کو کفر اور حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے، کہ ایسا
کرنے سے وہ مذہب اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔ حالانکہ
درحقیقت وہ اس کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔

عرابی پاشا کی بغاوت کے اختتام پر سید صاحب کو اجازت مل گئی کہ وہ جہاں
چاہیں جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے لندن گئے، اور وہاں سے پیرس جہاں بعد میں
شیخ محمد عبدہ بھی، جنھیں مصر سے جلاوطن کر دیا گیا تھا، اور وہ شام میں مقیم تھے پہنچ گئے
اور دونوں نے مل کر پیرس سے العروۃ الوثقی جاری کیا۔

العروۃ الوثقی کا پہلا شمارہ جمادی الاول ۱۳۰۱ھ (۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء) کو
نکلا، آٹھ ماہ کی مدت میں اس کے کل آٹھ پرچے شائع ہوئے۔ آخری پرچہ ۲۶ ذی الحجہ
۱۳۰۱ھ (۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء) کو نکلا، اور اس کے بعد رسالے کو مجبوراً بند کر دینا پڑا۔
کیونکہ انگریزوں نے مصر اور اپنی دوسری مقبوضات میں اس کا داخلہ بند کر دیا تھا۔

اور مصر میں جس کے پاس یہ رسالہ پایا جاتا، اسے جرمانہ کیا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ العروۃ الوثقیٰ کے اوّلیں مخاطب مسلمان تھے، لیکن اس کے پیش نظر تمام اہل مشرق کے مفادات تھے۔ چنانچہ پہلے شمارے میں رسالے کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں یہ لکھا گیا۔

"یہ رسالہ حتی الامکان تمام اہل مشرق کی اس طرح خدمت سرانجام دے گا کہ وہ واجبات جن میں کوتاہی ہوئی اور جس کا نتیجہ زوال اور کمزوری کی شکل میں نکلا، انھیں بیان کرے۔ اور ان راہوں کی نشان دہی کرے، جن پر چلنا ضروری ہے۔ تاکہ گزشتہ نقصان کی تلافی ہو سکے اور آنے والے خطرات سے بچا جا سکے۔"

ایک اور مضمون میں جو العروۃ الوثقیٰ کے آٹھویں شمارے (بمطابق ۱۵ مئی ۱۸۸۴ء) میں شائع ہوا، بعض لوگوں کی اس غلط فہمی کو کہ چونکہ اس کا لہجہ اسلامی ہے اس لئے یہ صرف مسلمانوں کے لئے خاص ہے۔ ان الفاظ میں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ ہمارا یہ جریدہ خاص طور سے مسلمانوں کا بار بار ذکر اور ان کے حقوق کا دفاع کر کے ان میں اور ان لوگوں میں، جو اپنے وطنوں میں ان کے پڑوسی ہیں، اپنے ملکوں کے مفادات میں ان سے اتفاق رکھتے ہیں اور طویل عرصے سے منافع میں شریک ہیں، افتراق و انشقاق پیدا کرنا چاہتا ہے، نہ ہمارا یہ موقف ہے، نہ ہم اس کی طرف میلان رکھتے ہیں، نہ ہمارا دین اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہماری شریعت اس کی روادار ہے۔ ہمارا مقصد تو تمام اہل مشرق کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص ان پر غیر ملکیوں کی زیادتیوں اور ان کے ملکوں میں ان کی دسیسہ کاریوں سے خبردار کرنا ہے اور اس بارے میں ہم مسلمانوں کو خاص طور سے اس لئے مخاطب کرتے ہیں کہ ان علاقوں میں ان کی غالب آبادی ہے جو غیر ملکیوں کی غداریوں کا نشانہ بنے، وہاں کے سب باشندوں کو انھوں نے ذلیل کیا اور ان کی نعمتوں کو سمیٹ کر لے گئے۔"

پیرس ہی کے زمانہ قیام میں سید جمال الدین افغانی کا فرانس کے مشہور مستشرق ارنسٹ رینان سے وہ تاریخی مباحثہ ہوا، جس کا خود موسیو رینان نے بھی ذکر کیا ہے، اور سید صاحب

کے سوانح نگار بھی بڑے اہتمام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مارچ ۱۸۸۳ء میں پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں رینان نے "اسلام اور علم" کے موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ جس کے ضمن میں یہ کہا "اسلام علمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، بلکہ وہ ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ اس کا امور غیب، اور خوارق عادات پر اعتقاد اور قضا و قدر پر مکمل یقین رکھنا ہے"۔ سید جمال الدین نے ایک فرانسیسی مجلہ "JOURNAL DES DEBATS" میں اس کا جواب دیا۔ جس کا لب و لباب یہ ہے کہ اس بارے میں قابل غور امر یہ ہے کہ موسیو رینان نے جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، کیا وہ دراصل اسلامی عقائد میں ہیں، یا وہ اُن قوموں کی ہیں جو اسلام لائیں۔ؔلہ

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے سید صاحب نے لکھا۔

"یہ صحیح ہے کہ عربوں نے یونان سے اپنا فلسفہ لیا۔ جس طرح انھوں نے ایران سے وہ چیزیں لیں، جن کے لئے وہ قدیم زمانے سے مشہور تھا، لیکن یہ سب علوم جو انھوں نے اِن ممالک کی فتح و تسخیر کے ذیل میں لئے، انھیں انھوں نے ترقی دی، اس کے دائرے کو وسیع کیا۔ ان کی وضاحت کی اور ان میں وہ مرتبہ کمال کو پہنچے۔ ان علوم کو عربوں نے منطقی ترتیب پر مرتب کیا جس سے ان کی سلامتی ذوق اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بے شک اس زمانے میں فرانسیسی جرمن اور انگریز روما اور بازنطینی قسطنطنیہ سے عربوں سے جن کا پایۂ حکومت بغداد تھا، زیادہ دور نہ تھے، اور اُن کے لئے بڑا آسان تھا، کہ وہ ان دونوں تہذیبوں کے مدفون علمی خزانوں سے فائدہ اٹھاتے، لیکن انھوں نے یہ نہیں کیا، یہاں تک کہ وہ دن آیا، جب عربی تہذیب کا منارۂ روشنی پیرانیز کی چوٹی پر جلوہ افگن ہوا۔ اور اس نے مغرب کو اپنی روشنی سے منور کیا اور یورپ والے اس وقت ہی صحیح معنوں میں ارسطو کا استقبال کر سکے، جب وہ عربی جامے میں ملبوس اُن کے پاس پہنچا۔ جب تک وہ ان کے قریب ہی یونانی جامے میں رہا، اس کے متعلق انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔

رینان نے اپنے لیکچر میں درحقیقت مذہب اور فلسفہ کی بحث اٹھائی تھی۔ اور مذہب کو

لہ الفکر الاسلامی الحدیث، تالیف ڈاکٹر محمد البہی، ص ۸۶

فلسفہ یعنی آزادی فکر کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ سید صاحب نے آخر میں اس بارے میں لکھا۔ عقیدے اور فکر آزاد یا دین اور فلسفہ کی باہمی لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی، جب تک کہ انسانیت کا وجود ہے، اور میرا خیال ہے کہ اس سخت لڑائی میں فکر آزاد کے حصے میں فتح نہیں ہو گی۔ کیونکہ محض عقل جمہور عوام کے حسب حال نہیں ہوتی اور اس کی تعلیمات ایک منتخب روشن خیال طبقہ ہی سمجھ سکتا ہے، علم اپنے تمام حسن وجمال کے باوجود انسانیت کو پوری طرح راضی نہیں رکھ سکتا۔ وہ ہمیشہ ایک مثلِ اعلیٰ اور آئیڈیل کیلئے پیاسی رہے گی اور دور دراز تاریک دستوں میں پرواز کرنا چاہے گی۔ جہاں تک فلسفیوں کی رسائی نہیں ہو سکتی"

موسیو رینان نے سید صاحب کے اس مضمون کا بڑے اچھے انداز میں جواب دیا۔ اور اس ضمن میں لکھا:۔

"شیخ جمال الدین کی بعض اہم آراء سے جن سے انھوں نے مجھے مستفید کیا۔ میرے اس بنیادی نظریئے کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام اپنے تاریخی وجود کے نصف اول میں، اسلامی ممالک میں علمی ترقی کی راہ میں، روک نہیں بنا۔ لیکن نصف آخر میں اس نے بے شک علمی ترقی کا گلا گھونٹا"

موسیو رینان سید صاحب سے ملا بھی تھا۔ وہ اس ملاقات کا ذکر اپنی ایک کتاب میں ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"کوئی دو ماہ ہوئے، شیخ جمال الدین افغانی سے میرا تعارف ہوا۔ بہت کم لوگ ہوں گے، جو میرے دل پر اس طرح اُثر سے ہوں جیسے کہ وہ، انھوں نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ہمارے درمیان علم اور اسلام کے باہمی تعلق کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی۔ جب میں ان سے باتیں کر رہا تھا اور انھیں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا، تو ان کی آزادی فکر، شرافت اور صاف گوئی سے میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے میرے سامنے ان قدماء میں سے جنہیں میں جانتا ہوں، کوئی بزرگ ہیں اور میں ابن سینا، ابن رشد یا ان عظیم ملحدوں میں سے کسی کو دیکھ رہا ہوں جو

گزشتہ پانچ صدیوں سے انسانیت کو غلامی سے آزاد کرانے کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں،

العروۃ الوثقیٰ کے بند ہو جانے کے بعد سید جمال الدین افغانی کی تمام تر سرگرمیاں بین الاقوامی یا زیادہ صحیح الفاظ میں بین الاسلامی اور بین المشرقی سیاسیات کے دائرے تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ اُن کے ایک آئرلینڈی دوست مسٹر بلنٹ تھے، جنھوں نے سید صاحب کو ایک دفعہ لندن میں لارڈ چرچل اور لارڈ سالبری سے ملوایا۔ ان دونوں نے سیّد صاحب سے سوڈان میں مہدی سوڈانی کی بغاوت کو فرد کرنے کے بارے میں امداد چاہی تھی۔ وہ دو بار ایران گئے۔ دوسری بار شاہ ایران نے انھیں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کیا۔ لیکن وہ جلد ہی سیّد صاحب سے برگشتہ خاطر ہو گیا۔ اور انھیں بہت بُری حالت میں ایران سے نکلوایا۔ جس کا انتقام سیّد صاحب کے ایک شاگرد نے اس طرح لیا کہ شاہِ ایران اس کے ہاتھ سے ہلاک ہوا۔ وہ چار سال تک روس میں رہے اور روس میں آباد ترکوں کی دینی و قومی بیداری میں اُن کا بڑا حصہ ہے۔ روسی ترکوں کے مشہور مصلح و مفکر محمد اسمٰعیل گیپرنسکی سیّد صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ ۱۸۹۲ء میں لندن میں تھے — کہ سلطان عبدالحمید نے انھیں استنبول بلا بھیجا، چنانچہ اپنی زندگی کے باقی پانچ سال انھوں نے استنبول ہی میں گزارے۔ کہا جاتا ہے کہ استنبول میں سیّد صاحب ایک لحاظ سے زیرِ حراست تھے۔ اور ان کی موت کے بارے میں بھی یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ سلطان عبدالحمید نے انھیں زہر دلوایا تھا، سیّد جمال الدین افغانی کا انتقال ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو ہوا۔

سیّد جمال الدین افغانی کی ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی اور عدیم المثال شخصیت تھی۔ گزشتہ کئی صدیوں میں پوری دنیائے اسلام پر کسی ایک شخصیت کا اتنا ہمہ گیر، دور رس انقلاب آفریں اور گہرا اثر نہیں پڑا۔ جتنا ان کا پڑا ہے۔ وہ بیک وقت عالم دین بھی تھے اور دینی مصلح بھی۔ اجتماعی و سیاسی امور میں نظر غائر رکھنے والے بھی اور ان کی اصلاح کے داعی بھی۔ وہ تمام قدیم اسلامی علوم پر بھی حاوی تھے اور جدید علوم سے بھی متعارف تھے۔ سیاسیات کا انھیں وسیع اور عمیق تجربہ تھا۔ اور اس کے پیچ و خم سے خوب واقف تھے۔ پھر ان میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ مردِ فعّال تھے اور کر گزرنے کا حوصلہ اور

ہمت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں جاتے، باحوصلہ لوگ ان کے ارد گرد جمع ہوجاتے اور وہاں دینی و سیاسی اصلاح اور فکری و ادبی بیداری کی تحریک شروع ہوجاتی۔

مشہور کتاب "جدید عالم اسلامی" کے امریکی مصنف لوتھراپ کے الفاظ میں اسلامی ملکوں میں سے کوئی ملک ایسا نہیں، جس کی زمین پر جمال الدین کے پاؤں پڑے ہوں، اور وہاں ایک فکری و اجتماعی بغاوت نہ نمودار ہوئی ہو، جس کی کہ آگ پھر کبھی نہ بجھی......

شیخ محمد عبدہ نے اپنے عظیم استاد کی شخصیت کا خاکہ یوں پیش کیا ہے۔

"جہاں تک ان کے اخلاق کا تعلق ہے، سلامتِ قلب ان کے تمام اوصاف پر غالب تھی، اُن میں بڑی بُردباری تھی، جس کی وسعت میں وہ سب کچھ آجاتا، جو اللہ چاہتا، لیکن اگر کوئی ان کی عزت یا اُن کے دین کے درپے ہونے کے لئے اُن کے پاس آتا تو ان کی بُردباری غضب اور غصے میں بدل جاتی، جس سے کہ شعلے نکلتے۔ چنانچہ ابھی وہ بُردبار درگزر کرنے والے ہوتے اور پھر وہ حملہ کرنے والے شیر ہوجاتے۔ وہ بڑے سخی اور فیاض تھے، جو کچھ ان کے پاس ہوتا خرچ کردیتے۔ اللہ پر انھیں بڑا اعتماد تھا اور زمانے کی مصیبتوں کی مطلق پروا نہ کرتے۔ بڑے امین تھے۔ جو ان کے ساتھ نرم ہوتا، اُس سے نرمی برتتے۔ اور جو ان کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آتا۔ اس سے سخت ہوتے۔ اپنے سیاسی مقصد میں بڑے حوصلہ مند تھے۔ اگر اس کے متعلق امید کی کوئی شعاع نظر آتی، تو اس تک پہنچنے میں جلدی کرتے، اور اکثر یہی جلدی محرومی کا باعث بنتی،

"دنیا کی انھیں بہت کم حرص تھی۔ اور اس کی ظاہری آرائشوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بڑے کاموں سے شیفتگی رکھتے، چھوٹے چھوٹے کاموں سے اعراض برتتے۔ شجاع اور آگے بڑھنے والے تھے، موت سے نہیں ڈرتے تھے، جیسے وہ موت کو جانتے ہی نہیں۔ لیکن وہ مزاج

کے تیز تھے اور اکثر یہ تیزی ان کی ذہانت کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی۔ اس کے باوجود وہ ایک مستحکم پہاڑ تھے:

مسٹر بلینٹ سید جمال الدین افغانی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

ان کی غیر معمولی ذہانت یہ تھی کہ وہ جن ملکوں میں گئے وہاں کے مسلمانوں کو اس امر پر آمادہ کرنے کی جدوجہد کی کہ وہ موجودہ اسلامی صورتحال کے متعلق پوری طرح نظر ثانی کریں۔ قدامت سے چمٹے رہنے کے بجائے آگے بڑھیں اور جدید علوم سے ہم آہنگ علمی و فکری تحریکوں کو وجود میں لائیں، قرآن و سنت کے علم تام نے انھیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ دلائل سے ثابت کر سکتے تھے کہ اگر قرآن و سنت کی صحیح طرح تعبیر و تشریح ہو، تو اسلام عظیم ترقی کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ اور مسلمان ایک طرف اپنے مذہب اور دوسری طرف انسانیت جو ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ آرزو میں رکھتی ہے اور نئی زندگی جو کچھ بھی چاہتی ہے ان کے درمیان پوری ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے۔

سید جمال الدین افغانی کی نظر مستقبل میں کتنا دور دیکھتی تھی، اس کا اندازہ اس پیش گوئی سے کیجئے، جو آپ نے اپنے ایک شاگرد عبدالرشید تاتاری سے دوران گفتگو میں کی تھی، آپ نے فرمایا:۔

یا ولد انک ستصلی صلاۃ الجنازۃ علی القیصریۃ الروسیۃ و ستحضر تشییع جنازۃ الامبراطوریۃ الانجلیزیۃ فی الھند۔

"عزیزم! تم عنقریب روسی قیصریت کی نماز جنازہ پڑھو گے اور ہندوستان کی انگریزی شہنشاہیت کے جنازے کے ساتھ چلو گے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کا فقہی مسلک

مولانا محمد عبدالحلیم چشتی

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح و تذکرہ پر اردو زبان میں چھوٹی بڑی کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جن میں ان کی زندگی کے ہر پہلو پر مفصل بحث ہے اور ان کے متعلق ہر قسم کے ناروا اعتراض اور بے جا الزام کی کھل کر تردید کی گئی ہے مگر تعجب ہے کہ ان تذکرہ نگاروں نے موصوف کے فقہی مسلک سے کوئی اعتناء نہیں کیا حالانکہ یہ بحث ان کی زندگی ہی میں چھڑ چکی تھی اس لئے یہ کسی طرح بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہ تھی یہ تو مستقل سوانح عمریوں کا حال ہے۔ باقی کتب تذکرہ میں ایک آدھ تذکرہ نگار نے اس سلسلہ میں کوئی بات کہی بھی ہے تو اس کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

جن لوگوں نے اسلامی تحریکوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ان کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کیا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ عجم کی سرزمین پر کوئی اسلامی تحریک بھی تصوف اور مذاہب ائمہ اربعہ میں سے کسی مسلک کی پابندی کے بغیر کبھی پروان نہیں چڑھ سکی۔ ان وجوہ سے سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسے مخلص مصلح، مجاہد، متبع سنت، حق گو، حق پسند بزرگ اور امام وقت کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالتے وقت سیرت نگاروں کا یہ فرض تھا کہ وہ موصوف کے مسلک فقہی کی وضاحت کرتے اور جو حقیقت تھی اس کو بے کم و کاست پیش کرتے مگر نہایت افسوس ہے کہ ارباب تذکرہ نے ایسا نہیں کیا بلکہ بعض تذکرہ نگاروں نے اپنے مبہم بیانات سے اس مسئلہ کو اور بھی الجھا دیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان مبہم بیانات پر ایک تفصیلی نظر ڈال لی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان ارباب تذکرہ نے اس سلسلہ میں موصوف کے ساتھ کہاں تک انصاف کیا ہے اور پھر خود حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات اور ان کے نامور خلفاء کے بیانات سے ان کے فقہی مسلک کی وضاحت کر دی جائے۔

سب سے پہلے سرسید احمد خاں نے جو ابتداء میں اہل حدیث تھے آثار الصنادید میں سید شہیدؒ کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کیا لیکن اس سلسلہ میں ایک حرف نہیں لکھا پھر نواب صدیق حسن خان نے تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار" میں ان کے حالات لکھے اور اس میں موصوف کے مقامات عالیۂ اتباع سنت اور جہاد سب ہی امور پر روشنی ڈالی۔ وہابیت کے الزام کی بھی پر زور تردید کی لیکن حنفیت کے متعلق دو لفظ لکھنے سے پہلو تہی کر گئے ہیں۔

نواب صاحبؒ کا بیان ملاحظہ ہو۔

وعظ خلفاء وے سرزمین ہند را از خس و خاشاک شرک و بدع پاک ساختہ و بر شاہراہِ اتباع کتاب و سنت آورده کہ ہنوز برکات آن نصائح جاری و ساری است۔

سید صاحبؒ کے خلفاء کے وعظ نے ہندوستان کی سرزمین کو شرک و بدعات کی خس و خاشاک سے پاک و صاف کیا اور کتاب و سنت کی پیروی کی راہ پر ڈالا کہ آج بھی ان کے وعظ کی برکتیں جاری و ساری ہیں۔

مقامات سیدؒ در سلوک ظاہر و باطن عالی تر از آں ست کہ بمقامات و حالات، فلاں و بہماں ماند اگر خواہی کہ نمونہ از آں بہ بینی بیاد کتاب صراط مستقیم و رد الاشراک و رسالہ امامت و تقویۃ الایمان را ملاحظہ کن و دریاب کہ ایں ہمہ بیان ہر چند در ظاہر از زبان خلفاء و مریدان او ست اما در حقیقت از جنان او فائض گشتہ ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

سید احمد شہیدؒ کے سلوک ظاہری و باطنی اس سے کہیں بالاتر ہیں کہ کسی کے حالات و مقامات سے تشبیہ دی جاسکے اگر تم چاہتے ہو کہ اس کا نمونہ دیکھو تو آؤ اور کتاب صراط مستقیم، رد الاشراک، رسالہ (منصب) امامت اور تقویۃ الایمان کو دیکھو اور معلوم کرو۔ ہر چند یہ تمام بیان ان کے خلیفہ اور مریدوں کی زبان سے ادا ہوا ہے لیکن حقیقت میں یہ سب انہی کے فیض باطنی کا اثر ہے۔ ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

تسدید و تقریب صوری و معنوی علماء موحدین متبعین ایں سرزمین را منبع و معدن

اس سرزمین کے متبع سنت اور توحید پرست علماء کی ظاہری اور باطنی آراستگی اور درستگی کا

همیں فیوض خاطر اوست ....
......گور پرستان و پیرپرستان
ہند بمجرد دیدن جہاد از وے در
حدود افاغنہ طریقہ او را بہ دامن
محمد بن عبدالوہاب نجدی بستند و
گفتند انچہ گفتند و نوشتند انچہ
نوشتند و کردند آنچہ کردند حاشا وکلا
کہ او را ہیچ علاقہ ظاہر و باطن با مشار
الیہ باشد،

جہاد نہ ایجاد شیخ نجد
بود کہ ایں مسئلہ در جملہ کتب
اسلام از کتاب و سنت و فقہ
جزو آں مرقوم ست اما تا شروط
و قیود آں موجود نگردد روا نیست
و لہذا سید احمد در ہند جہاد نکرد و با دولت
برطانیہ طرف نشد، ہجرت نمود و بیروں ازیں معمورہ
میدان صف باسکھاں و افغانان آراست [1]

منبع و مخزن سید صاحبؒ کے فیضان باطنی
ہی کا نتیجہ ہے .... ہندوستان کے قبر
پرستوں اور پیر پرستوں نے سید صاحبؒ کو
افغانوں کے حدود میں محض جہاد کو دیکھ کر ان
کے طریقہ کو شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے
طریقہ سے وابستہ کر دیا اور کہا جو کچھ کہ کہا اور
لکھا جو کچھ کہ لکھا اور جو کچھ کہ کیا کیا، حاشا وکلاّ ان کا
ظاہری اور باطنی کوئی ادنیٰ سا تعلق بھی
عبدالوہاب نجدی سے نہیں، جہاد شیخ نجدی کی
ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ اسلام کی تمام کتابوں
میں قرآن، حدیث، فقہ اور دوسری کتابوں میں
بھی مذکور ہے، جب تک اس کے شروط و قیود
نہیں پائے جاتے اس وقت تک جہاد جائز نہیں،
اس وجہ سے سید احمد شہیدؒ نے ہندوستان میں
جہاد نہیں کیا اور حکومت برطانیہ سے برسرپیکار
نہیں ہوئے۔ ہجرت کی اور انکی عملداری سے باہر
سکھوں اور افغانوں کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے [2]

---

[1] ملاحظہ ہو تقصار جیود الاحرار، مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۸ھ ص ۱۰۹ و ۱۱۰

[2] افسوس ہے کہ نواب صدیق حسن خان نے سرکار کی خیر خواہی کی وجہ سے سید صاحبؒ کے انگریزوں سے جہاد نہ کرنے کو بڑے ہی غلط رنگ میں پیش کیا ہے چنانچہ مہر صاحب نے "سید احمد شہیدؒ" (طبع لاہور ج۔۱ ص ۲۳) کے آغاز ہی میں اس پر تنبیہ کر دی ہے، وہ فرماتے ہیں

(نواب صدیق حسن خان) نے لکھا ہے کہ کتاب و سنت میں جہاد کے شروط و قیود ہیں اسی لئے
(باقی ص ۱۹۵ پر)

عجیب بات ہے کہ نواب صدیق حسن خان نے حضرت شہیدؒ کے خلاف وہابیت کے الزام کی تردید پر تو بڑا زور دیا ہے مگر ان کے حنفی ہونے کا ذکر نہیں کیا جس سے کہ خود بخود اس الزام کی تردید ہو جاتی،

مولانا حکیم سید عبدالحی لکھنوی جو اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے، ان کو تو سید احمد شہیدؒ کے جزئیات احوال کی ایسی تلاش تھی کہ انھوں نے موصوف کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی خاطر ۱۳۱۲ھ میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر بھی کیا تھا اور ان کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان کو بھی دیکھا تھا، نزہۃ الخواطر میں ان کا تذکرہ نہایت عقیدت کے ساتھ ان شاندار الفاظ میں کیا ہے۔

السید الامام الهمام حجة الله بين الانام موضح حجة الملة والاسلام قامع الكفرة والمبتدعين واغوذج الخلفاء الراشدين والائمة المهديين مولانا الهمام المجاهد الشهيد السعيد احمد بن عرفان بن نور الشريف الحسني البريلوي كان من ذرية الامير الكبير بدر الملة المنير شيخ الاسلام قطب الدين محمد بن احمد المدني[1]

(بقیہ حاشیہ ص۱۹۴) سید صاحبؒ نے ہندوستان میں جہاد نہ کیا اور حکومت برطانیہ کے خلاف محاذ قائم نہ فرمایا بلکہ باہر جا کر سکھوں اور افغانوں کے خلاف لڑے مبادا اس بیان سے غلط فہمی پیدا ہو، اس لئے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ سید صاحبؒ انگریزوں کو مسلمانوں کے لئے سکھوں سے بدرجہا زیادہ خطرناک سمجھتے تھے یہ اتفاق کی بات ہے کہ مختلف مصالح کی بنا پر سرحد کو مرکز بنایا اور اس میں سکھ سامنے آگئے، افغانوں کے خلاف لڑائیاں سید صاحبؒ کے مقاصد میں داخل نہ تھیں، نہ سید صاحبؒ انھیں پسند کرتے تھے، لیکن جن افغانوں نے مسلمانوں کے خلاف سکھوں کا ساتھ دیا اور بار بار کی تفہیم کے باوجود باطل کا راستہ نہ چھوڑا، ان سے مجبوراً لڑنا پڑا۔

[1] ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر حیدرآباد دکن ج۔۷ ص۲۷

مذکورۂ بالا عبارت میں سید شہیدؒ کے حنفی ہونے کی طرف ہلکا سا اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ اس کے برعکس ایسے الفاظ لکھ دیئے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موصوف سلفی تھے یعنی اہل حدیث تھے اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کے مسلک پر عمل پیرا نہیں تھے موصوف کے الفاظ ہیں۔

شد المئزر بنصرة السنة المحضة والطریقة السلفیة[1]

سید شہیدؒ نے سنت سنیہ اور طریقۂ سلیقہ کی تعرف دحمایت میں بڑی سرگرمی دکھائی ہے۔

یہی وہ تعبیر ہے جس سے یہ ایہام ہو جاتا ہے کہ موصوف تقلید آئمہ کے قائل نہیں تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صاحب نزہتہ الخواطر نے حضرت سید احمد شہیدؒ جیسے پکی حنفی کو جو کابراً عن کابر حنفی تھے اور اس امر کا ببانگ دہل اعلان بھی کرتے تھے، جیسا کہ آگے آتا ہے، سلفی لکھ دیا ہے۔ سید صاحبؒ نے چونکہ لوگوں کو کتاب وسنت پر عمل کرنے کی دعوت دی تھی اور شرک وبدعات کی بیخ کنی کی تھی اس بنا پر صاحب نزہتہ الخواطر نے انہی کو نہیں بلکہ ان کے بہت سے خلفاء اور مریدوں کو بھی زمرۂ اہلحدیث میں شمار کیا اور عوارف المعارف فی انواع العلوم والمعارف میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ موصوف کے اکثر وبیشتر اتباع کرنے والے کسی ایک امام کے مقلد نہیں تھے، فرماتے ہیں۔

ثم حدثت قوم من بینھم فی ھذا الزمان فانھم رفضوا التقلید بالمذاھب المذکورة وتمسکوا بالکتاب والسنة فمنھم من سلك مسلك التوسط بین الافراط والتفریط وذھب الی انه لا یجوز تقلید شخص معین مع تمکن الوجوع

پھر اس زمانہ میں ان کے اندر ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے مذاہب اربعہ کی تقلید کو چھوڑ دیا اور کتاب وسنت کو پکڑا، پھر ان میں بعض ایسے ہوئے جنہوں نے افراط وتفریط کے درمیان توسط کی راہ اختیار کی اور وہ اس طرف گئے کہ مقلد کو اپنے امام کے قول کے خلاف روایات تک رسائی کی قدرت

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب مذکور صـ۲۹ یہ سفر نامہ اب کتابی صورت میں "دہلی اور اس کے اطراف" کے نام سے کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔

الی الروایات الدالۃ علی خلاف قول الامام المقلد (بالفتح) والتقلید المطلق جائز والا لزم تکلیف کل عامی وھذا مذھب الشیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم الدھلوی وحفیدہ اسماعیل بن عبدالغنی بن ولی اللہ واکثر اتباع سیدنا الامام احمد بن عرفان بن نور الشہید السعید[1]

ہو تو اسے کسی خاص امام کی تقلید روا نہیں ہے اور مطلق تقلید جائز ہے ورنہ ہر عامی کو مکلف قرار دینا لازم آئیگا یہ شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی اور ان کے پوتے اسماعیل بن عبدالغنی بن ولی اللہ اور سیدنا امام احمد بن عرفان بن نور شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بیشتر پیروؤں کا یہی مسلک ہے۔

موصوف کے نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہید میں ان کے مسلک پر کچھ نہیں لکھا ہے بلکہ سید صاحبؒ کے اکابر و اسلاف کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے، اس کا حاصل بھی وہی نکلتا ہے جو ان کے والد ماجد مولانا سید عبدالحیؒ کے الفاظ میں اوپر گذر چکا ہے۔

شیخ محمد اکرام نے "موج کوثر" میں اس مسئلہ کو "مسلک ولی اللہی اور وہابیت" کے عنوان سے چھیڑا ہے لیکن موصوف نے اس بحث کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیا ہے لکھتے ہیں۔

"وہابی عقائد میں ایک اہم عقیدہ عدم وجوب تقلید شخصی کا ہے اس مسئلہ پر شاہ اسماعیل شہیدؒ نے سفر حج کے بعد اپنے آپکو غیر مقلد ظاہر کیا مولوی عبدالحی ان سے متفق نہ تھے اور سید صاحبؒ کے عقائد کے متعلق اختلاف رائے ہے[2]۔ لیکن جہاد کے دوران میں مخالفین عام مسلمانوں

---

[1] ملاحظہ ہو الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، طبع دمشق ۱۳۷۷ھ ص۱۰۳

[2] اختلاف رائے کی بات شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بارے میں کہی جاتی تو کسی عنوان درست بھی ہوسکتی تھی شاہ اسمٰعیل اور شاہ ولی اللہ رحمہما اللہ کے متعلق وہی رائے درست ہے جو سر سید احمد شہیدؒ سے محققین علماء کے متعلق منقول ہے (جیسا کہ آگے آتا ہے) اسی لئے ارباب نظر اہل علم نے شاہ اسماعیل شہیدؒ کو کسی دور میں بھی غیر مقلد تسلیم نہیں کیا ہے۔

کو سید صاحبؒ کے عقائد کے بارے میں بہکانے لگے اور انھوں نے بمقام پنجتار مذہبی مسائل کی تشریح کے لئے افغان علماء کو بلایا اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ نے بڑی قابلیت سے مسئلہ "عدم وجوب تقلید" کی حمایت کی" اس وقت شاہ صاحبؒ نے جو رائے دی وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے' انھوں نے فرمایا کہ یہ وقت ترک تقلید کا نہیں' ہم کو اس وقت کفار سے جہاد کرنا ہے تقلید کا جھگڑا اٹھا کر اپنے اندر تفرقہ ڈالنا بہتر نہیں' اس جھگڑے سے جس کی بنا ایک فروعی اختلاف سنت یا مستحب ہے۔ ہمارا اصل کام ہجرت اور جہاد کا جو فرض عین ہے فوت ہو جائے گا۔ مولانا سید احمد رائے بریلویؒ کی وفات کے بعد یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا[1]"

شیخ صاحبؒ کے مذکورہ بالا بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ نے عدم وجوب تقلید کے مسئلہ کو اس عنوان سے کہ یہ وقت ایک فروعی اختلاف کا نہیں بلکہ فرضیت جہاد کا ہے ٹال دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خیال میں یہ مسئلہ نہ سید شہیدؒ کی حیات میں طے ہوا بلکہ ان کی وفات کے بعد اور بھی پیچیدہ ہو گیا۔ قطع نظر اس کے کہ شیخ صاحب کا بیان کردہ واقعہ کس حد تک صحت سے قریب ہے' یہ طریق بحث اس وقت میں سید صاحبؒ کے حق میں ہی نہیں بلکہ ان کی پوری دینی تحریک کے حق میں بھی سخت ضرر رساں تھا اور یہ مسئلہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس عنوان سے معترضین کو خاموش کیا جا سکتا۔ جیسا کہ سید صاحبؒ کی تصریحات سے (جو آگے آتی ہیں) ظاہر ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحبؒ پر بڑی محنت کی ہے مگر انھوں نے بھی اس امر سے بحث نہیں کی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (طبع جدید' لیڈن) کے فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے بھی اپنے مقالہ میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

مولانا مہر صاحب کو اس امر کا اعتراف ہے کہ بعض علماء کے طرز عمل سے سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء پر سرحد کے چند نامور علماء کی طرف سے جو سب سے پہلا اور سنگین اعتراض کیا گیا تھا وہ یہی تھا کہ ان کا کوئی مسلک و مذہب نہیں ہے' موصوف "سید احمد شہید" میں لکھتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو "موج کوثر" مطبوعہ استقلال پریس لاہور ص ۴۳'۴۴

شاہ اسماعیل شہیدؒ کے مجموعہ مکاتیب میں دو مکتوب ایسے ہیں، جو پشاور کے دس علمار کے نام بھیجے گئے[1]۔ پہلا ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ (۲۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء) کو دوسرا ۱۷ شوال ۱۲۴۵ھ (۱۱ اپریل ۱۸۳۰ء) کو ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان علمار کی طرف سے سید صاحبؒ اور آپ کے رفقار پر کئی الزام لگائے گئے تھے مثلاً

(۱) سید صاحبؒ اور آپ کے رفقار الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں، ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں ہے، نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذاتِ جسمانی کے جویا۔

اس کے بعد دیگر الزامات کو نام بنام گنا کر لکھا ہے۔

یہ الزامات سراسر بے اصل تھے، سید صاحبؒ نے ان کا شافی جواب دیا[2]۔

مولانا مہر نے وہ جواب نقل نہیں کیا اور نہ اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں کہیں پیش

---

[1] ان علمار کے نام اور مختصر حالات مولانا مہر صاحب کے الفاظ میں درج ذیل ہیں۔

(۱) مولانا حافظ محمد احسن بن محمد صدیق معروف بہ حافظ دراز پشاوری متبحر عالم علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے، سرحد سے سمرقند تک ان کے علم کا چرچا تھا (۲) مولانا حافظ محمد عظیم:۔ علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں شیخ وقت، صحاح ستہ کے اسانید زبانی یاد تھے، روتے بہت تھے، آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے، جب اخوند سید امیر عرف ملا کوٹھا پر معاندین نے کفر کا فتویٰ لگایا تو انھوں نے علی الاعلان خلاف رائے دی، ملا صاحب کوٹھا انھیں کے شاگرد تھے ــــــ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۵ھ (۲۶ دسمبر ۱۸۵۸ء) وفات پائی (۳) مولانا غلام جیب:۔ بڑے عالم تھے انھوں نے ملا صاحب کوٹھا کے خلاف فتوائے تکفیر کی مخالفت کی تھی ان کے فرزند مولانا غلام جیلانی مرحوم نے کتب خانہ اسلامیہ کالج پشاور کو دیدیا تھا (۴) مولانا مفتی محمد احسن بن مولانا مفتی محمد احمد متبحر عالم تھے، مکان محلہ کوٹلہ رشید خاں علاقہ گنج پشاور میں تھا (۵) مولانا مفتی حافظ احمد (۶) مولانا عبد الملک اخوند زادہ (۷) مولانا مراد اخوند زادہ (۸) مولانا قاضی سعد الدین۔ (۹) مولانا قاضی مسعود (۱۰) مولانا عبد اللہ اخوند زادہ (مہر)

[2] ملاحظہ ہو سید احمد شہیدؒ، طبع لاہور ج-۲ ص ۲۸۱-۲۸۲

کیا، ورنہ بات صاف ہو جاتی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے ان محولہ بالا دو مکتوب میں سے پہلا مکتوب جو ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ کو سید احمد شہیدؒ نے لکھوایا تھا، سوانح احمدی میں نقل کر دیا ہے۔ یہ مکتوب خاصا طویل ہے۔ اس کا صرف وہ ابتدائی حصہ جو اس موضوع سے متعلق ہے، ہدیۂ ناظرین ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از امیر المومنین سید احمد بخدمت عالیات منابیع ہدایات مصادر افادات ہادیان راہ دین، خادمان شرع مبین ناشران احکام رب العالمین، نائبان رسول آمین مولانا حافظ دراز و مولانا حافظ محمد عظیم و مولانا عبد الملک اخوند زادہ و مولانا حافظ مراد اخوند زادہ و مولانا غلام حبیب اخوند زادہ و مولانا قاضی سعد الدین و مولانا قاضی مسعود و مولانا عبد اللہ اخوند زادہ و مولانا محمد حسن اخوند زادہ و مولانا حافظ احمد اخوند زادہ و جمیع علماء بلدۂ پشاور سلمہم اللہ تعالیٰ۔

بعد ادائے تحیات و دعائے ترقی مدارج ہدایات مکشوف باد، دریں ایام چناں مسموع گردیدہ کہ بعضے از مجادلین بے انصاف و مکابرین با اعتساف چندے از وساوس فتنہ انگیز و شبہات عناد آمیز بہ نسبت با فقرائے مہاجرین و ضعفائے مجاہدین بر تاختہ در جمہور انام از خواص و عوام متلبس ساختہ آتش عداوت

امیر المومنین سید احمد کی طرف سے بخدمت عالی مخزن و مرجع افادات، رہبران راہ دین، خادمان شرع مبین ناشران احکام رب العالمین، نائبان رسول امین، مولانا حافظ دراز، مولانا حافظ محمد عظیم، مولانا عبد الملک اخوند زادہ، مولانا حافظ مراد آخوند زادہ، مولانا غلام حبیب اخوند زادہ، مولانا قاضی سعد الدین، مولانا قاضی مسعود، مولانا عبد اللہ اخوند زادہ، مولانا محمد حسن اخوند زادہ، مولانا حافظ احمد اخوند زادہ اور تمام علماء پشاور سلمہم اللہ تعالیٰ۔

بعد سلام و دعائے ترقی مدارج معلوم ہو کہ ان دنوں ایسا سنا گیا ہے۔ کہ بعض بے انصاف جھگڑالو اور مخالف دشمنوں نے ہم ضعیف مجاہدین اور فقیر مہاجرین کی نسبت کچھ فتنہ انگیز وسوسے اور عناد آمیز شبہے پیدا کر دئے ہیں اور تمام عوام و خواص میں شہرت دیکر

در میان مسلمین محض بلقلقہ لسانی
افروختہ و مایۂ شقاوت پنہانی برائے خود
اندوختہ وبال کذب وافتراء بر گردن خود
برداشتہ ونکالِ دروغ بیفروغ بروز
جزاء برائے خود مہیا ساختہ
معاذ اللہ من ذالک. علاوہ برایں آنکہ بذریعہ
افتراء وبہتان اضلال بعضے از اہل ایمان
کردہ وایشاں را از راہ رب العالمین کہ عبارت
از مشارکت مہاجرین مجاہدین است دور تر
بردہ ودر اذہان ایشاں بر نسبت خدام
شرع مبین سوءظن انداختہ وراہ راست
جہاد را در نظر ایشاں راہ کج ساختہ آیۂ
کریمہ الا لعنۃ اللہ علی الکاذبین
وآیۂ کریمہ الا لعنۃ اللہ علی الظالمین
الذین یصدون عن سبیل اللہ و
یبغونہا عِوَجاً گاہے نخواندہ واسپ
نظر وفکر را در میدانِ انصاف تراندہ ہر
چند ما ضعفاء کہ محض باستعانتِ
رب العالمین اعتقاد میداریم و فقط
عنایت او را قابل اعتماد می شماریم ہرگز موافقتِ
مخلوقین را بخیال ہم نمی آریم واشتہار نام نیک
وبد را در میان ابنائے زمان بجوے ہم نمی شماریم
وذم ایشاں را ہمرنگ مدح ایشاں

اپنی زبان آوری سے مسلمانوں کے درمیان
عداوت کی آگ لگا رکھی ہے انھوں نے شقاوت
باطنی کا سرمایہ جمع کیا کذب وافترا کا وبال اپنی گردن پر
رکھا ہے اور دروغ بے فروغ کا عذاب قیامت کے دن
کیلئے اپنے واسطے تیار کیا ہے، اس سے اللہ کی پناہ!
اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ بہتان تراشی اور
افترا پردازی کر کے بعض مومنین کو گمراہ کیا اور
ان کو رب العالمین کی راہ سے جو کہ مہاجرین
مجاہدین کے ساتھ شرکت سے عبارت ہے دور تر
کر دیا ہے اور ان کے اذہان میں خادمان دین
متین کی نسبت بدگمانی پیدا کر دی ہے ــ اور
آیت پاک لعنۃ اللہ علی الکاذبین (پ۳ ع۱۴)
جو لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے اور آیت پاک
الا لعنۃ اللہ علی الظلمین الذین
یصدون عن سبیل اللہ ویبغونہا
عِوَجاً پ۱۲ سو پھٹکار ہے اللہ کی ناانصاف
لوگوں پر جو کہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور
ڈھونڈھتے ہیں اس میں کجی کو، کبھی پڑھا نہیں
ہے اور فکر ونظر کے گھوڑے کو انصاف کے
میدان میں دوڑایا نہیں ہے۔ ہر چند ہم ضعیف
لوگ جو صرف رب العالمین کی مدد پر یقین رکھتے
ہیں اور محض اسکی عنایت کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں
مخلوق کی موافقت ومخالفت کا خیال بھی نہیں

ساقط الاعتبار می دانیم و دائماً منتظر نزول
رحمت قادر مختار می مانیم اما بحکم حدیث
اتقوا من مواضع التہم دفع تہمت ایشاں
لازم دانستیم و بنا بر توقع آنکہ شاید کسے
از مخلصین صادقین عزم مشارکت
مجاہدین داشتہ باشد و بسبب تہمت
و افترائے ایشاں رو تافتہ باشد
شاید بکشف حقیقۃ الحال و حل عقدۂ
اشکال باز براہ راست معاودت نماید و
بطریق اخلاص مراجعت فرماید بناءً علیہ
بیان واقع درین باب واجب شمردیم
پس می گوئیم کہ چناں شنیدہ ایم کہ از جملہ
مفتریات آں مفتریاں آنست کہ ایں فقیر را
بلکہ زمرۂ مجاہدین را بالحاد و زندقہ نسبت
می نمایند یعنی چناں اظہار می کنند کہ ایں جماعۂ
مسافرین ہیچ مذہب ندارند و بہیچ مسلک
مقید نیستند بلکہ محض راہ نفسانیت می پویند
و بہر وجہ لذات جسمانی می جویند خواہ موافق
کتاب باشد خواہ مخالف معاذ اللہ
من ذالک۔ پس باید دانست کہ نسبت
ما مردم بایں امر شنیع افترائیست قبیح و بہتانیست
صریح، ایں فقیر و خاندان ایں فقیر در بلاد ہندوستان
گمنام نیست الوف الوف انام از خواص و عوام

کہتے ہیں اور اپنے ہمعصروں کے اندر نیک نامی
بدنامی کی شہرت کو ایک جو کے برابر بھی نہیں
سمجھتے ان کی مذمت کو ان کی مدح کی طرح
ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں اور ہمیشہ قادر مختار
کی نزول رحمت کے منتظر رہتے ہیں لیکن
حدیث شریف اتقوا من مواضع التہم (کہ
تہمت کی جگہوں سے بھی بچو) کے حکم کے بموجب ان
کی تہمت کو اس خیال سے دور کرنا لازم سمجھتے ہیں کہ
شاید مخلص حق پرستوں میں سے کوئی مجاہدین کی
شرکت کا عزم رکھتا ہو اور اس نے ان کی تہمت
و افترا پردازی کی وجہ سے منہ موڑ لیا ہو، ممکن ہے
حقیقت حال واضح ہو جانے اور عقدۂ اشکال حل
ہو جانے سے وہ پھر راہ راست کی طرف لوٹ آئے
اور از راہ اخلاص واپس آجائے اس بنا پر اس سلسلہ
میں حقیقت حال کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم
کہتے ہیں کہ ہم نے ایسا سنا ہے کہ ان افترا پردازوں
کی افترا پردازیوں میں سے یہ ہے کہ اس حقیر کو بلکہ
مجاہدین کے پورے گروہ کو الحاد و زندقہ کی طرف
نسبت کرتے ہیں یعنی یوں بیان کرتے ہیں کہ مسافرین
کی یہ جماعت کوئی مذہب نہیں رکھتی اور نہ کسی
مسلک کی پابند ہے بلکہ محض نفسانیت کی پیرو
اور لذات جسمانی کی جویا ہے خواہ کتاب اللہ
کے موافق ہو خواہ مخالف، اس سے خدا کی پناہ!

این فقیر و اسلاف این را می دانند که
مذہب این فقیر ابا عن جد مذہب
حنفی است و بالفعل ہم جمیع اقوال
و افعال این ضعیف بر قوانین
اصول حنفیہ و آئین و قواعد
ایشان منطبق است یکے از آں
خارج از اصول مذکورہ نیست
الا ماشاء اللہ آنچہ از ہمہ
افراد ایشان بسبب غفلت
و نسیان صادر می گردد کہ بخطائے
خود معترف می باشد و بعد
از اعلام براہ راست معاودت
می نماید۔

آرے در ہر مذہب طریق محققین دیگر می
باشد و طریق غیر ایشاں دیگر ترجیح بعض
روایات بر بعضے دیگر نظر بقوت دلیل
توجیہ بعضے عبارات منقول از سلف و تطبیق
مسائل مختلف مدون در کتب و امثال ذلک
دائماً از کار و بار اہل تدقیق و تحقیق است باین
سبب ایشاں خارج از مذہب نمی توانند
شد بلکہ ایشاں را لب لباب اہل آں مذہب
باید شمرد ہر کہ در یں مقدمہ شبہ داشتہ باشد
لازم است کہ نزد این فقیر آمدہ بالمشافہ حل

پس جاننا چاہیئے کہ ایسی بات کی ہم لوگوں کی طرف
نسبت بہت بڑا افترا اور کھلا ہوا جھوٹ ہے یہ
فقیر اور اس فقیر کا خاندان ہندوستان میں گمنام
نہیں۔ ہزارہا انسان خواص ہوں یا عوام اس
فقیر کو اور اس کے بزرگوں کو جانتے ہیں کہ اس فقیر
کا آبائی مذہب حنفی ہے اور اس زمانہ میں بھی اس
فقیر کے تمام اقوال و افعال حنفیہ کے اصول و
قوانین اور انہی کے آئین اور قواعد پر منطبق ہیں۔
ایک بھی ان اصول مذکورہ سے خارج نہیں ہے
الا ماشاء اللہ جو ان اصحاب سے غفلت اور بھول
چوک سے صادر ہو جاتا ہے تو وہ اپنے قصور کا
اعتراف کرتے ہیں اور اطلاع پانے کے بعد
راہ راست پر آجاتے ہیں۔

ہاں ہر مذہب میں محققین کا طریقہ اور
ہوتا ہے اور جو محقق نہیں ہوتے ان کا اور ہوتا
ہے۔ بعض روایتوں کو بعض پر ترجیح دینا، قوت
دلیل کو دیکھنا، سلف سے بعض منقول
عبارتوں کی توجیہہ کرنا کتابوں میں مدون شدہ
مختلف مسائل میں تطبیق دینا اور اسی طرح کے اور
امور میں یہ ہمیشہ اہل تحقیق و تدقیق کا منصب رہا
ہے اس وجہ سے ان کو مذہب سے خارج نہیں
سمجھا جا سکتا بلکہ انہی کو اہل مذہب کا لب لباب
سمجھنا چاہیئے۔ جس کسی کو اس مقدمہ میں کوئی شبہ ہو

اشکال نماید یا خود بفہمد یا این فقیر را بفہماند[1] | اس پر ضروری ہے کہ وہ اس فقیر کے پاس آکر دور دو اشکال حل کرے یا خود سمجھے یا فقیر کو سمجھا دے۔

سید شہیدؒ کی کتاب حقیقۃ صلوٰۃ کے حسب ذیل جملے بھی موصوف کے حنفی ہونے کی بین دلیل ہیں۔

"جلسے اور قومے میں سوا ان دو دعاؤں کے اور بھی صحیح حدیثوں میں منقول ہے لیکن حنفی مذہب میں ایسا ثابت ہوا ہے کہ وہ دعائیں اگر نفل نماز کے قومے اور جلسے میں پڑھے تو سنت ہے اس لئے کہ فرض نماز میں ان دعاؤں کا پڑھنا سنت نہیں ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ علماء پشاور نے تو یہ سوال بہت بعد میں اٹھایا تھا۔ ہندوستان میں جب سید صاحبؒ کا قیام اپنے وطن بریلی میں تھا اسی زمانہ میں موصوف کے مشہور خلیفہ مولانا کرامت علی جونپوری نے سید صاحبؒ سے تقلید ائمہ کے بارے میں سوال کیا تھا۔ موصوف کا بیان ہے۔

اس عاجز نے بریلی میں حضرت مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ سے پوچھا کہ ہم کس پر عمل کریں اور کس امام کی تقلید میں نجات ہے۔ فرمایا فقہ پر عمل کرو اور چاروں اماموں میں سے جس کی تقلید پر کوئی مرے گا نجات ہے اور بریلی میں اپنے مرشد حضرت سید احمد ادام اللہ برکاتہ سے پوچھا کہ کس پر عمل کریں۔ آپ نے فرمایا کہ فقہ کی متون پر مثل حدیث متواترہ کے آنکھ موندے عمل کیا کرنا اور فتاویٰ کو تحقیق کر لینا کیونکہ اس میں نرم گرم سب طرح کی روایتیں لاتے ہیں اور یہی بات حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہما اللہ وغیرہ علمائے دین کی تصنیفات سے ظاہر ہے۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو تواریخ عجیب موسوم بہ سوانح احمدی از مولوی محمد جعفر تھانیسری مطبع فاروقی دہلی ۱۳۰۷ھ ص ۳۰۵ تا ۳۰۷
اسی اصول کے اعتبار سے ارباب نظر شاہ اسمٰعیل شہید اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو حنفی کہتے ہیں اور ان کو زمرۂ محققین احناف میں شمار کرتے ہیں [2] ملاحظہ ہو قوۃ الایمان از مولانا کرامت علی جونپوری مطبع قادری کلکتہ سنہ ۱۲۵۳ھ ص ۲۹

موصوف "نور علی نور" میں فرماتے ہیں[۱]

مرشد برحق آپ مقلد تھے اور تقلید کے خلاف جو کوئی شخص کرتا تو اپنے قافلہ سے نکلوا دیتے اور جو تعلیم پذیر ہوتا تو حضرت مرشد برحق اس کو نصیحت کرکے راہ پر لاتے اور یہ بات تمام ہندوستان اور بنگالے میں مشہور ہے۔

اسی کتاب "نور علی نور" میں ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں۔

حضرت مرشد برحق نے خلافت نامہ میں تقلید کا حکم دیا ہے اور آپ مقلد تھے، حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ کے اور حضرت مرشد برحق اپنے حنفی ہونے کا فخر کرتے تھے اور جب ان کی مجلس میں حدیث کی کوئی کتاب پڑھی جاتی اور امام شافعی رحمۃ اللہ کے مذہب کے موافق کوئی حدیث نکلتی تب فرماتے تھے کہ اس مسئلہ میں جس حدیث پر ہمارے امام صاحب نے تمسک کیا ہے اس کو بھی پڑھو اور اس عاجز نے لامذہبوں کی باتوں کا کہیں کہیں غلغلہ سن کے مرشد برحق سے پوچھا کہ وہ لوگ حدیث پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہیں اور فقہ پر عمل کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اس مقدمہ میں حضور کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ تب حضرت مرشد نے بطور وصیت کے بڑی تاکید سے فرمایا کہ المتون کالمتواتر تم فقہ کی متون کتابوں پر آنکھ موندے ہوئے بلا کھٹکے چلے جاؤ اور فتاویٰ میں خوگیر کی بھرتی ہوتی ہے یعنی اس میں قوی، ضعیف سب طرح کی روایت ہوتی ہے۔ اس کو چن چان چھونک چھانک لینا ہے یعنی اس کو خوب تحقیق کرکے مفتی بہ پر عمل کرنا ہے[۲]

مولانا عبدالحکیم تنبیہ المغترین میں رقم طراز ہیں۔

بڑے بڑے مفسرین و محدثین کیا ارباب شریعت و کیا صاحبان طریقت سب حنفی شافعی، مالکی، حنبلی ہوئے ہیں۔ خود طریقۂ مجددیہ کے پیشوا حضرت امام ربانی مجدد

۱؎ ملاحظہ ہو نور علی نور از مولانا کرامت علی جونپوری، اعظم المطابع جونپور ۱۳۲۵ھ ص۱۲

۲؎ ملاحظہ ہو نور علی نور ص ۱۵، ۱۶

الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث طریقۂ محمدیہ کے بڑے امیر المومنین امام اجد حضرت سید احمد اور ان کے خلفاء مولانا محمد اسماعیل، مولانا عبدالحی، مولوی سید محمد علی صاحب واعظ، مولوی خرم علی صاحب، مولوی کرامت علی صاحب وغیرہم یہ سب حنفی المذہب تھے، کتاب ایضاح الحق والصریح، جو تصنیف سے مولانا ممدوح محمد اسماعیل صاحب کے ہے سو حنفی المذہب کے اصول و قواعد پر مبنی ہے۔[1]

نواب صدیق حسن خان قنوجیؒ نے ہدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل میں شاہ اسماعیل شہیدؒ کو حنفی تسلیم کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں۔

خاندان محمد بن عبدالوہاب بیت علم حنابلہ بود
وخاندان ایشاں بیت علم حنفیہ ست و
ایشاں را بادشاں ہیچ علاقہ تلمذ یا ارادت
یا ہموطنی یا صحبت یا معرفت گاہے نبودہ۔[2]

محمد بن عبدالوہابؒ کا خاندان حنفی المذہب
تھا اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا خاندان حنفی
مسلک کا پیرو تھا ان کا ان سے نہ شاگردی کا
تعلق تھا نہ عقیدت اور ہموطنی کا نہ صحبت
اور ہمنشینی تھی اور نہ کبھی ایک دوسرے کا آپس
میں تعارف ہی ہوا تھا۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ سید احمد شہیدؒ اپنے شیخ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی طرح پکے حنفی تھے اور انہی کے طریقہ پر سختی سے عامل تھے، فروع میں آزادی رائے اور آزادی عمل کے قائل نہیں تھے اور نہ وہ اس کو اچھا سمجھتے تھے۔

---

[1] تنبیہ المغتر، مطبع مسلمانی دیلمور ۱۲۸۴ھ ص ۳۶

[2] ہدایۃ السائل، مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۲ھ

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلوی کے روابط

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں[1]

از ـــــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوبات حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ بنام حضرت رائے بریلویؒ

مکتوب (۱) بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ـــــــ حقائق و معارف

آگاہ فضیلت و کمالات دستگاہ السید الحبیب النسیب النجیب النقیب السید ابو سعید الحسنی سلمہ اللہ واوصلہ الیٰ فوق مناہ آمین ـــــــ الحمد للہ الذی فتح السنۃ اولیائہ لمعارف لا تعد ولا تحصٰی وکشف علیہم عوارف لا عدھا یوجی والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الاولیاء محمدن المصطفیٰ واحمد المجتبیٰ وعلیٰ آلہ واصحابہ بدور الدجیٰ ونجوم الھدیٰ ـــــــ اما بعد ـــــــ از فقیر حقیر عبدالعزیز عفا اللہ عنہ والحقہ بسلفہ الصالحین فی المکارم الماثم مطالعہ فرمایند ـــــــ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من جنابہ الکریم ان یعافینا وایاکم امین! ـــــــ ہرچند بذکر جمیل ایشاں پیوستہ رطب اللساں

---

[1] یہ مضمون ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ سے شکریہ کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے ـــــ مدیر

بودیم وور پیشِ ارباب بصیرت دفتر مناقب واحوالِ ایشاں میکشودیم لیکن بجہتِ عدم وصول مکاتیب بہجت اسالیب کہ بمنزلۂ نصف الملاقات است بلابل شوق در باتین ارواح بنغمات یا آسفی علیٰ یوسفؔ چوں ہزار داستان در ترنم می آمد ونیرانِ اشتیاق در کانونِ سرائر شعلہ برمی زد وعساکرِ اندوہِ فراق بر ولایاتِ قلوب میتاخت وطارحِ جنان را بلجامِ افکار در ریاضت می انداخت ــــــــ الحمد للہ کہ صحیفۂ شریفہ متضمن معارف حقہ ووجدانیات مطابقہ خاطر فاتر را اگل گل شگفانید واز قیدِ انتظار رہانید ــــ

فقلتُ لہٗ اہلاً وسہلاً ومرحبا. بخیر کتاب جاءمِن خیر کاتب فان کان عنی فی العیان مغیبا. فلیس لدی صدری وقلبی بغائب ــ ہذا وقد طالعتُ معارفکم المکتوبۃ فی ذیل الصحیفۃ فوجدتُہا صحیحۃ المعانی راسخۃ المبانی زاد اللہ فی عرفانکم ورفع شانکم ــــــــ الا آنکہ دریں معارف تفصیلِ دیگر کہ از مذوقاتِ حضرتِ مرشدی نعمت قدس اللہ سرہٗ واز مدرکات ایں فقیر است نیز فہم باید کرد وآں آنست .... ایں حالت عجب حالت است کہ بہ سبب غلبۂ ..... سکھ ومرہٹہ وجٹ بر بلادِ مسلمین ونہبِ اموالِ ایشاں وانتہاکِ حرمتِ ایشاں، دل وجاں آسائش را فراموش نمودہ چنانچہ فقیر نیز مع قبائل بمراد آباد انتقال نمودہ است وتمام میانِ دو آب زیرو زبر بنعالِ فرسانِ ایں بدکیشاں شد لیکن الحمد للہ کہ ایں فقیر وقریۂ پہلت وبرادر صاحب کلاں ہمہ باآبرو و ناموسِ جان ومال بسلامت ماندیم والسلام ــ از طرف ہمہ صِغار وکبارِ اینجا خصوصاً والدہ صاحبہ ومیاں رفیع الدین و عبد القادر وخواجہ محمد امین جیو وسائر یاراں سلامِ شوق خوانند ــــــــ

ترجمہ: ــــــــ بسم اللہ الرحمن الرحیم ــــــــ حقائق ومعارف آگاہ فضیلت وکمالات دستگاہ ..... السید ابو سعید حسنی ــ اللہ تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے اور اُس درجہ پر پہونچائے جس کی وہ تمنّا کرتے ہیں بلکہ اُس سے بھی زیادہ مرتبے پر فائز کرے آمین !

اللہ کی حمد ہے کہ اُس نے اپنے اولیاء کی زبانوں کو بے شمار معارف کے ساتھ کھولا اور ان پر وہ عوارف ظاہر فرمائے جن کو گِنا نہیں جاسکتا ــ صلوٰۃ وسلام سید الانبیاء

والاولیاء حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ پر اور ان کے آل واصحاب پر جن میں سے ہر ایک بدرالدجیٰ اور نجم الہدیٰ تھا ـــــ بعد حمد وصلوٰۃ ـــــ فقیر حقیر عبدالعزیز کی طرف سے مطالعہ فرمائیں ـــــ اللہ تعالےٰ اُس کے گناہ معاف کرے اور اُس کو مکارم ومآثر میں سلفِ صالحین سے لاحق فرمائے ـــــ الحمد للہ عافیت سے ہوں اور ربّ کریم سے یہی درخواست ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو عافیت سے رکھے آمین! ـــــــــــــــ

چونکہ آپ کے ذکرِ جمیل سے ہم ہمیشہ رطب اللسان رہتے تھے اور اربابِ بصیرت کے سامنے آپ کے دفترِ مناقب واحوال کھولتے رہتے تھے لیکن چونکہ آپ کے مسرت آمیز خطوط نہیں آرہے تھے جو کہ نصف ملاقات کی مانند ہوتے اس لئے ہم سب کے عنادلِ شوق باغاتِ ارواح کے اندر غمِ جدائی میں چہچہارہے تھے اور اشتیاق کی آگ دلوں کی بھٹی میں بھڑک رہی تھی نیز اندوہِ فراق کے لشکر ممالکِ قلوب پر چڑھائی کر رہے تھے اور ہم کو افکار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ الحمد للہ کہ (ایسی حالت میں) صحیفہ شریفہ پہونچا جو کہ معارفِ حقّہ اور وجدانیات مطابقہ پر مشتمل تھا اور جس نے دلِ غمگین کو پھول کی طرح شگفتہ کر دیا اور قیدِ انتظار سے رہائی دی ـــــ میں نے کہا مرحبا اچھے کاتب کے پاس سے اچھا خط آیا ہے اگرچہ وہ کاتب میری نظر سے غائب ہے مگر میرے سینے اور قلب سے غائب نہیں ہے ـــــ میں نے آپ کے لکھے ہوئے معارف کا مطالعہ کیا جو اس مکتوب کے ذیل میں تھے ـــــ میں نے ان معارف کو صحیح اور پختہ پایا۔ اللہ تعالےٰ آپ کے عرفان کو اور بڑھائے اور آپ کی منزلت کو بلند فرمائے ـــــ مگر اتنی بات ہے کہ ان معارف میں ایک اور تفصیل بھی سمجھ لینی چاہیئے جو حضرت ولی نعمت، قدس اللہ سرہٗ (حضرت شاہ ولی اللہؒ) کے ذوق کی چیز ہے اور اس فقیر کے مدرکات میں سے ہے ـــــ

(آگے وہ تفصیل ہے جو یہاں پر دقیق ہونے کی بنا پر پیش نہیں کی گئی) ....

اس وقت عجیب عالم ہے کہ بلادِ مسلمین پر غلبہ سکھ ومرہٹہ وجٹ کے باعث اور ان کے اموالِ مسلمین کو لوٹنے اور مسلمانوں کی بے آبروئی کرنے کی وجہ سے دل رُبا ان نے آسائش وآرام کو فراموش کر دیا ہے چنانچہ فقیر بھی مع قبائل ومتعلقین مراد آباد

آگیا ہے ۔ وہ آبے کی تمام سرزمین مذکورہ بالا قوموں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زیر و زبر ہوگئی ہے ۔ الحمد اللہ فقیر اور قریہ پُھلت (کے ساکنین اور بڑے بھائی شیخ محمد[1] قصبہ بڑھانہ میں) بعزت و آبرو اور جان مال کی سلامتی کے ساتھ ہیں ـــــــ

والسلام ــ یہاں کے تمام خرد و کلان کی طرف سے خصوصاً والدہ ماجدہ کی جانب سے اور میاں رفیع الدین، عبدالقادر اور خواجہ محمد امین[2] صاحب نیز تمام دوستوں کی طرف سے سلام پہونچے ۔

مکتوب (۲) سلالہ دودمانِ نجابت و خلاصۂ خاندانِ کرامت، مجمع المحاسن میر ابوسعید اسعدہم اللہ تعالےٰ بعد تحیات اشتیاق مرتسمات از فقیر عبدالعزیز واضح باد ـــ الحمد اللہ علی العافیہ والسلامۃ منہ، والمسئول من اللہ سبحانہ، ان یدیمہا لنا ولکم ـــ قبل ازیں دو مرتبہ مکاتیب محبت اسالیب رسید متضمن وقائع عجیبہ و

---

[1] الشیخ العالم المحدث محمد بن ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلویؒ احد رجال العلم والطریقہ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے صاحبزادے (حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زوجۂ اولیٰ کے لبطن سے) تھے، دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی ۔ اپنے والد بزرگوار سے مکمل تعلیم حاصل کی اور ان کے انتقال کے بعد قصبہ بڑھانہ ضلع مظفرنگر میں سکونت اختیار کر لی ۔ ۱۲۰۸ھ میں وہیں انتقال فرمایا ۔ بڑھانہ کی جامع مسجد میں آپ کا مزار ہے {نزہۃ الخواطر جلد (۷)}

[2] الشیخ العالم الکبیر الخواجہ محمد امین الولی اللّٰہی الکشمیری ــ آپ اصل کے لحاظ سے کشمیری اور سکونت کے لحاظ سے دہلوی ہیں ۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے خلفا میں سے ہیں (آپ پہلے وہ شخص ہیں جو) حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف نسبت کر کے ولی اللّٰہی کہے جاتے تھے ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ان سے بھی اخذِ علم کیا ہے جیسا کہ عجالۂ نافعہ سے واضح ہو ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ان کے لئے بھی بعض رسائل تصنیف فرمائے ہیں ۔ ان کی وفات غالباً ۱۱۸۷ھ میں ہوئی ہے ۔ جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اگلے مکتوب گرامی سے ظاہر ہے {نزہۃ الخواطر جلد (۶)}

کشوف صحیحہ بود خیلے مسرور گردانید حق تعالے در ترقیاتِ مراتبِ عالیہ افزائش کناد۔ توقع کہ ہموارہ یاد فرمابودہ بر احوالِ سعادت مآل مطلع فرمودہ باشد کہ باعث زیادت اطمینان خواہد بود و مزاج فقیر از مدتِ یکسال بلکہ زیادہ بسبب عارضہ برودت و رطوبت کسلمند میباشد الحمد للہ دریں ایام اکثر عوارض زائل شدہ طبیعت رُو بصحت کلی آورد۔ مگر گاہ گاہ اندک اثرے ظاہر میشود تدارکِ آں بادویۂ مجربہ نمودہ می آید۔ خاطر جمع دارند۔ برادرانِ عزیز القدر سلمہم اللہ تعالے سلام می رسانند۔ رفیع الدین بفضلِ الٰہی از تحصیل علوم فارغ شدہ در مجلس کہ مجمع علماء و فقراء بود دستار تبرک بستہ اجازتِ درس دادہ شد۔ الحمد للہ مردم بسیارے از تعلیم وے مستفید اند عبد القادر ہم اکثر کتب تحصیل را خواندہ است بمرتبۂ فضیلت رسیدہ ان شاء اللہ ببرکت ارواحِ طیبہ عنقریب فارغ التحصیل خواہد شد۔ عبد الغنی قرآن را ختم نمودہ در رمضان مبارک گزشتہ درمحراب استادہ شد باہتمام تمام در حفظِ قرآن شریف اہتمام نمود الحال کتب فارسی شروع کردہ است بعد ماہ مبارکِ آئندہ قصد ہست کہ شروع در صرف و نحو کنانیدہ خواہد شد والسلام۔ میر ابو اللیث و دیگر فرزنداں ما سلام ہمہ ہا رسانند برادر صاحب بزرگ شیخ محمد صاحب سلام شوق می رسانند۔ والدہ صاحبہ نیز سلام و دعا گفتہ اند فقیر محمد امین (کاتب تحریر) سلامِ شوق ابلاغ می نماید ——

ترجمہ —— سلالۂ دودمانِ نجابت، خلاصۂ خاندانِ کرامت، مجمع المحاسن میر ابو سعید اسعدہم اللہ تعالے فقیر عبد العزیز کی طرف سے بعد سلام واضح ہو کہ میں عافیت و سلامتی کے ساتھ ہوں اور اللہ تعالے سے درخواست ہے کہ وہ ہم کو اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے —— اس سے پہلے دو محبت آمیز مکتوب ملے جو وقائعِ عجیبہ اور کشوفِ صحیحہ پر مشتمل تھے، انھوں نے بہت مسرور کیا۔ حق تعالے مراتب عالیہ میں مزید ترقی عطا فرمائے —— امید ہے کہ (اسی طرح) ہمیشہ یاد فرما دہ کر احوالِ سعادت مآل سے مطلع فرماتے رہیں گے تاکہ زیادت اطمینان کا موقع ملے —— —— فقیر کا مزاج ایک سال سے بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے سے عارضۂ برودت

و رطوبت کے سبب کسلمند رہتا ہے۔ الحمد اللہ ان ایام میں اکثر عوارض زائل ہو گئے ہیں اور طبیعت صحتِ کلی کی طرف متوجہ ہے مگر کبھی کبھی تھوڑا بہت (بیماری کا) اثر ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کا تدارک مجربہ دواؤں سے کیا جاتا ہے۔ خاطر جمع رکھیں ــــــ رفیع الدین بفضلِ الٰہی تحصیل علوم سے فارغ ہو گئے ہیں مجمع علماء و فقراء میں دستار تبرک ان کے سر پر باندھ کر اجازت درس دے دی گئی ہے۔ الحمد للہ بہت سے لوگ ان کی تعلیم سے مستفید ہوئے ہیں۔ عبد القادر نے بھی اکثر کتب درسیہ کو پڑھ لیا ہے اور وہ بھی فضیلت و مولویت کے درجے کو پہونچ گئے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو ارواحِ طیبہ کی برکت سے عنقریب وہ بھی فارغ التحصیل ہوں گے ــــــ عبد الغنی نے قرآن شریف ختم کر لیا ہے۔ گزشتہ رمضان المبارک میں انھوں نے پہلی محراب سنائی۔ کامل استعداد کے ساتھ حفظِ قرآن میں انھوں نے اہتمام کیا ہے ــــــ اب انھوں نے کتب فارسی پڑھنی شروع کر دی ہیں۔ اگلے ماہ مبارک (رمضان) کے بعد قصد ہے کہ صرف و نحو شروع کرا دی جائے۔ والسلام ــ میرا ابو اللیث اور دیگر فرزند کو سب کا سلام پہونچائیں۔ برادر بزرگ شیخ محمد صاحب سلام شوق پہونچاتے ہیں۔ والدہ صاحبہ بھی سلام و دعا فرماتی ہیں۔ فقیر محمد امین (کاتب تحریر) سلام شوق پہونچاتا ہے۔

مکتوب (۳) بزبان عربی۔ السید الجید والشریف الاید طرۃ ناصیۃِ السیادۃ غرۃ جبھتِہِ السعادۃ۔ نبوی الاخلاق دالمآثر علوی الاعراق والمفاخر سید ابو سعید اکرمہ اللہ بشہودہ وافاض علیہ برکات ابائہ وجدودہ الفقیر عبد العزیز یرشح علیکم التحیات الوافیہ والدعوات الذاکیہ بکرۃ وعشیًا ویذکر مکارمکم السنیۃ ومناقبکم العلیہ اناء الصباح واطراف المساء ھذا وقد مضیٰ زمانٌ طویل لم نطّلع علی خبرٍ من اخبارکم ولم نعرف اثراً من اثارکم ولا ذکرتمونا فی ھذہ المدۃِ المدیدۃِ بصحیفۃٍ وما کان ذلک ظنّنا بکم فالمرجو منکم ان لا تنسونا من لطیف مکاتیبکم فان

المکاتیب نوع مواصلة - والسلام

الشیخ الکبیر محمد و رفیع الدین و عبدالقادر و عبدالغنی و شیخ محمد عاشق و مولانا نوراللہ و بابا فضل اللہ و خواجہ محمد امین و شیخ محمد جواد و شیخ محمد فائق کلھم یُسَلِّمُونَ علیکم و یُقَبِّلُونَ یدیکم والسلام۔

ترجمہ ـــ .... السید المجید والشریف الاید ..... سید ابوسعید اللہ تعالیٰ ان کو اپنے شہود سے مکرم کرے اور ان پر ان کے آباد اجداد کے فیوض و برکات برسائے۔

فقیر عبدالعزیز صبح و شام آپ کے لئے دعاہائے فراواں اور رات دن آپ کے مکارم اخلاق اور مناقب عالیہ کا تذکرہ کرتا رہتا ہے .... ایک طویل زمانہ گزر گیا کہ آپ کی کوئی خیر خبر نہیں ملی اور آپ کے آثار میں سے کوئی اثر معلوم نہ ہوسکا اور نہ آپ نے اس مدتِ مدیدہ میں اپنے مکتوبِ گرامی سے سرفراز فرمایا۔ آپ سے ایسی امید نہ تھی آپ سے تو یہ امید ہے کہ ہمیں اپنے مکاتیب سے فراموش نہ فرمائیں گے اس لئے کہ مکاتیب ایک قسم کی ملاقات ہوتے ہیں ـــ والسلام ـــ برادر بزرگ شیخ محمد، رفیع الدین، عبدالقادر، عبدالغنی، شیخ محمد عاشق، مولانا نوراللہ، بابا فضل اللہ، خواجہ محمد امین، شیخ محمد جواد اور شیخ محمد فائق (ابن شیخ محمد عاشق) یہ سب کے سب آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی دست بوسی کرتے ہیں۔ والسلام۔

مکتوب۔ میر ابوسعید رائے بریلویؒ بنام صاحبزادگان شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (بزبان عربی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم ـــــــ الحمد للہ الذی جعل المحدثین المجتبین والعلماء ورثة الانبیاء و علمھم اسرار مشیونا تہ و تنزلاتہ فی مدرستہ الازلیہ ...... و عززھم بالعِزۃ القدسیة حیث قال ذوالعظمة والکبریاء انما یخشی اللہَ مِن عبادہ العلماءُ والصلوٰۃ والسلام علیٰ افضلِ الرُسلِ والانبیاء وعلیٰ الہ و اصحابہ الذین ھُم نجوم الاھتداء وعلیٰ مشایخنا الکرام والنقباء ـــ اما بعد فتح الکلام بمفاتح التحفة التحیة والاکرام فیسلم

علیکم و یسئل احوالکم الکریمه المحب المخلص الداعی الی جناب العالی ابو سعید .... مولانا و مخدومنا الشیخ عبد العزیز و شیخ محمد و شیخ رفیع الدین و شیخ عبد القادر و شیخ عبد الغنی سلمکم اللہ تعالیٰ بالبرکات و امکث اللہ وجودکم فی الدنیا بالحفظ و الامان و یسّرکم فی الدار الاخرۃ باعلی الجنان و صانکم اللہ من الآفات و العاھات بحرمۃ النّبی اٰخر الزمان و بعد فان سألتم عن احوالی فللّٰہ الحمد و المنۃ شرفنا اللہ تعالیٰ بزیارۃ الحرمین الشریفین زادھما اللہ شرفا و تعظیما و دخلنا فی شھر ربیع الثانی فی مکۃ الشریفۃ فی اٰخر ثلث اللیل و کان الوقت مبارکًا منورا بجذ بالیھا حتیٰ دخلنا من باب السّلام مع ابنی و رفقائی بین یدی الکعبۃ المبارکۃ و شفناھا و دعونا فی حقنا و فی حقّ مشایخنا و اُصولنا و فروعنا و جمیع المؤمنین و المؤمنات ماکان ینبغی لھم و ادّینا العمرۃ و سعینا بین الصّفا و المروۃ و لبثنا فیما...... و اعطانا اللہ فیھا برکۃً معنویۃً ـــــ یومًا کنتُ فی منزلی مضطجعاً متیقّظاً متفکّراً فی سرّ الکعبۃ الشرّیفۃ و طوافھا و خصوصیتھا فی ھذا المکان المخصوص دون مکان اٰخر۔ نبّانی اللہ تعالیٰ حقیقۃ الکعبۃ و سرّ طوافھا و ھی الخ......... و الملتمس من حضورتکم اذا وصل ھذا الورق الی جنابکم الاعلی ان تلاحظوا مضمونھا و تدعون ماکان الخیر فی حقنا ان اللہ لا یضیع اَجرکم کتبت عجلۃً لا تنظروا الی قصورنا فی العلم ـ العاقبۃ بالعافیۃ والسلام والاکرام ـ

ترجمہ مکتوب شاہ ابو سعید حسنیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... بعد الحمد و الصلوٰۃ...... دعاگو ابو سعید آپ حضرات کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے...... "آپ حضرات" سے میری مراد........

مولانا و مخدومنا شیخ عبدالعزیز، شیخ محمد، شیخ رفیع الدین، شیخ عبدالقادر اور شیخ عبدالغنی ہیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو برکات کے ساتھ سلامت رکھے اور دنیا میں آپ کا وجود حفظ و امان کے ساتھ قائم رکھے نیز آخرت میں اعلیٰ جنت نصیب فرمائے اور (اس جہاں میں) آفات و بلیات سے محفوظ رکھے بحرمۃ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم......

اللہ کی حمد ہے اور اُس کا احسان ہے کہ اس نے ہم کو حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف فرمایا۔ زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً ہم مکہ معظمہ میں ذیح الثانی کے مہینے میں رات کے آخری تلث میں پہونچے تھے۔ وہ وقت بڑا ہی مبارک اور منور تھا اور اُس وقت ایک خاص کشش خانۂ کعبہ کی طرف تھی ___ چنانچہ ہم اپنے لڑکے (میر ابو اللیث) اور اپنے رفقاء کے ساتھ باب السلام سے (مسجد الحرام میں) داخل ہوئے اور کعبۂ مبارکہ کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی اور اپنے حق میں اور اپنے مشائخ، اُصول و فروع اور جمیع مومنین و مومنات کے حق میں دعائے خیر کی۔ پھر ہم نے عمرہ ادا کیا اور (طواف کے بعد) صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ___ مکہ معظمہ میں ہم کئی دن ٹھہرے اللہ تعالےٰ نے ہم کو مکہ معظمہ میں برکتِ معنویہ عطا فرمائی ___ وہاں ایک دن میں اپنی قیام گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ جاگ رہا تھا اور کعبۂ شریفہ کی حقیقت کے سلسلے میں سوچ رہا تھا کہ اُس کے طواف میں کیا مصلحت ہے اور دوسرے مقامات کو چھوڑ کر اسی مکان مخصوص کی کیا خصوصیت ہے؟ اُس وقت اللہ تعالےٰ نے مجھے حقیقتِ کعبہ اور اس کے طواف کی مصلحت و خصوصیّت سے آگاہ فرمایا اور وہ یہ ہے..... [یہ ایک دقیق اور خالص الہامی مضمون ہے اس لئے اس کو یہاں درج نہیں کیا گیا] (آخر میں ہے) آپ حضرات سے التماس ہے کہ جب یہ رقعہ آپ کی خدمت عالی میں پہونچے تو اُس کے مضمون کو ضرور ملاحظہ فرمالیں اور ہمارے حق میں جو خیر ہو اس کی دعا فرمائیں ___ اللہ تعالےٰ آپ کا اجر ضائع نہیں فرمائے گا ___ میں نے یہ خط عجلت میں لکھا ہے ___ ___ ہمارے قصور علمی پر نظر نہ فرمائیے گا۔ انجام عافیت کے ساتھ ہو ___ والسلام والاکرام ___

جواب از طرف حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ (بزبان عربی)

مکتوب (۴) — بسم اللہ الرحمن الرحیم — الحمد للہ الذی کشف اسرار العوالم صغیرہا و کبیرہا و کلہا و جزءہا و غیبہا و شہادتہا و ارواحہا و مثالہا علی من یشاء — لاسیما النبی الامی الہاشمی البالغ الغایۃ القصوی فی الاعتلاء صلی اللہ علیہ و علی آلہ و صحبہ ما دامت الارض و السماء — الی السید الحسیب النسیب العارف اللبیب صاحب الکمالات العالیہ و المعارف السنیہ — حاج الحرمین الشریفین زائر المکانین المتحرمین وارث الاسرار بالاستحقاق، مصداق السعید من سعد فی بطن امہ بلاخلاف و شقاق سلمہ اللہ تعالی و عجل لنا بالخیر و السلامۃ لقیاہ من الفقیر عبد العزیز و سائر اخوانہ المشتاقین الی لقائکم الراغبین الی اللہ فی طول بقائکم — اما بعد — فقد وصلت الرقیمہ الکریمہ منبئۃً عن سلامۃ ذاتکم مخبرۃً عن تفاصیل حالاتکم مبشرۃً بحصول الحج الشریف و الزیارۃ المنیف لکم و لولدکم الارشد و رفقائکم وانکم قد دعوتم فی ذلک المکان المعظم و المکرم المجسم فی تلک الساعۃ المیمونۃ المبارکۃ المفخمہ لجمیع المومنین و المومنات و لذوی الحقوق منکم علی التخصیص المرجو ان دعائکم ان شاء اللہ مستجابٌ بلا شک و لا ارتیاب جزاکم اللہ تعالی احسن الجزاء و رزقکم حسن المآب — فحمدنا اللہ تعالی علی کل ذلک و شکرناہ و غبطنا لانفسنا و تمنیناہ ان اللہ تعالی علی تحصیلہ لنا قدیر .... واما ما اشرتم الیہ من حصول البرکات المعنویہ فی تلک الاماکن العالیہ فذلک ہو الیقین و الصواب و قرۃ عیون الاحباب ادام اللہ لکم الترقیات و شرفکم العوالی التجلیات واما ما کتبتم

فی سرّ الکعبۃ وطوافھا فھو امر مطابقٌ لکشف الکبار من الاولیاء رضوان اللہ علیہم اجمعین .... وبالجملۃ فمکشوفکم حق وصواب ھنیئاً لکم امثال ھذہ المعارف الحقّیۃ والعلوم العمیقۃ الدقیقۃ واما ما التمستم من الدعاء فنحن نلتمس منکم اضعافہ ولا نغفل عن الدعاء فی حقّکم وفی حق ولدکم وکل من توسّل بکم طرفۃ عینٍ ۔ تقبّل اللہ منّا ومنکم ورزقنا وایّاکم سعادۃ الدارینِ والسّلام۔ وقد توفی الی رحمتہٖ من اصحاب سیّدنا وشیخنا قدّس سرّہٗ الشیخ اھل اللہ والشیخ محمد عاشق والشیخ نذراللہ وخواجہ محمد امین وحاجی محمد سعید البریلوی فادعوا اللہ تعالٰی فی حقھم ـــ

ترجمہ ـــ یہ خط عبدالعزیز اور اس کے تمام بھائیوں کی طرف سے ہے ـــ جو مکتوب الیہ کی ملاقات کے مشتاق اور ان کی طول عمر کے اللہ تعالٰے سے خواہاں ہیں۔

ـــ اور حبیب و نسیب، عارف لبیب، صاحب کمالات و معارف عالیہ حاجی حرمین شریفین ذائر مکانینِ محترمین .... (میر ابوسعید) کی طرف لکھا جارہا ہے ۔ اللہ تعالٰی ان کو سلامت رکھے اور خیر و عافیت کے ساتھ ہم کو جلد ان کی ملاقات میسر کرائے ـــ

ـــ بعد حمد و صلوٰۃ واضح ہو کہ مکتوب گرامی ملا جو آپ کی سلامتی کی اطلاع اور آپ کے تفصیلی حالات کی خبر دینے والا تھا ـــ اس میں حصولِ حج و زیارت کی خوشخبری بھی تھی اس خط سے معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے (میر ابواللیث) اور آپ کے رفقاء کا بھی یہ سعادت حج و زیارت نصیب ہوئی ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے اس مقام معظم و مکرم (مسجد الحرام) میں ساعتِ سعید کے اندر تمام مومنین و مومنات کے لئے عموماً اور اہلِ حقوق کے لئے خصوصاً دعا فرمائی ۔ امید تو یہی ہے کہ آپکی دعا انشاء اللہ تعالٰے بے شک و شبہ مستجاب ہوگی ـــ اللہ تعالٰے آپ کو بہترین جزا دے اور آخرت کی بھلائی عطا کرے ـــ ہم نے (آپ کا خط پڑھ کر) مندرجہ مکتوب باتوں پر اللہ کی حمد کی اور اس کا شکر ادا کیا۔ ہم کو آپ کی اس کامیابی پر غبطہ در شک ہوا اور اس

کامیابی کی اپنے لئے بھی تمنا کی ـــ اللہ تعالےٰ اس سعادت و کامیابی کے حاصل کرانے پر قادر ہے ..... آپ نے ان مقامات مقدسہ میں حصولِ برکاتِ معنویہ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ بالکل حق و صواب اور احباب کی آنکھوں کا نور ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کی ترقیات کو دائماً برقرار رکھے اور آپ کو تجلیات سے مشرف فرمائے ـــ آپنے کعبہ اور طوافِ کعبہ کی حقیقت پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی صحیح اور کبار اولیاء رحمہم اللہ کے کشف کے مطابق ہے ـــ ...

..... حاصل کلام یہ ہے کہ آپ کا مکشوف بالکل صحیح و درست ہے۔ آپ کو اسطرح کے معارفِ حقیقیہ اور علوم دقیقہ مبارک ہوں ـــ اور آپ نے دعا کا جو التماس کیا ہے تو ہم بھی آپ سے زیادہ سے زیادہ دعا کی درخواست کرتے ہیں اور آپ کے اور آپکے صاحبزادے اور آپ کے متوسلین کے حق میں دعا کرنے سے ایک لمحہ غافل بھی نہیں ہیں ـــ اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی دعا قبول کرے اور ہمیں اور آپ کو سعادتِ دارین نصیب فرمائے ـــ سیدنا و شیخنا قدس سرہٗ (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ) کے اصحاب میں سے یہ حضرات وفات پاکر جوار رحمت خداوندی میں پہونچ گئے ہیں ـــ

(۱) شیخ اہل اللہ (۲) شیخ محمد عاشق (۳) شیخ نور اللہ (۴) خواجہ محمد امین (۵) حاجی محمد سعید بریلوی[له] ـــ ان حضرات مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت فرمائیں ـــ

له الشیخ العالم الصالح محمد سعید بن محمد ظریف بن خان محمد بن یار محمد ابن خواجہ احمد الافغانی الدہلوی ـــ آپ افغانستان میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی۔ تحصیل علم کے لئے دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر کمالاتِ علمیہ سے مالا مال ہوئے۔ آپ بھی سفر حجاز میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ہمراہ تھے۔ آپنے شیخ کی حیات میں برابر خدمتِ اقدس میں رہے۔ بعد وفات شاہ صاحبؒ آپ دہلی سے بانس بریلی تشریف لے آئے۔ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں نے آپکو اپنے صاحبزادے عنایت خاں کا معلم مقرر کیا۔ چنانچہ آپنے بریلی ہی میں اقامت کر لی۔ اور ۱۱۸۹ھ سے کچھ پہلے انتقال فرمایا۔ آپ کے پوتے مولانا نجم الغنی نے صاحب نزہتہ الخواطر (باقی صـ ۲۱۹ پر)

مکتوب سیّد محمد نعمان[1] حسنی بنام حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ

[جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے آخری حالات اور دیگر نادر معلومات پر مشتمل ہے]

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ شانہٗ ۔ الحمد للہ علی النعماء والرضا علی القضاء والصبر علی المصیبۃ والبلاء ۔ والصلوٰۃ والسلام علی سیّد الشاکرین وزبدۃ الراضین وقدوۃ الصابرین شفیع المذنبین ورحمۃٍ للعٰلمین محمدٍ وآلہٖ وصحبہ الطیبین الطاہرین وعلیٰ ورثتہٖ علماء الراسخین واولیاء المرشدین الیٰ یوم الدین بعد ھذا ـــــ اگر شرح سوگواری ......

واقعۂ ارتحال امام سنت وجماعت ومقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زماں سرآمد اولیائے جہاں، قطب زمانی، محبوب سبحانی سیدنا ومرشدنا ولی اللہ فاروقی مجدد مأتہ دوم الف ثانی رضی اللہ عنہ ازیں عالم پُر ملال بصوب دار الافضال بوصال ذوالجلال برصفحہ

(بقیہ حاشیہ ص۲۱۸) کو یہی سن وفات بتایا ہے، مکتوب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے بھی قریب قریب یہی سنِ وفات معلوم ہوتا ہے۔

۹ ـــ {نزہۃ الخواطر جلد (۶)} ـــ تاریخ کا یہ زبردست سانحہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب سے کامل ربط رکھنے والی پانچ اہم اور باکمال شخصیتیں ایک سال کے اندر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں ـــ اس کا انکشاف حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مکتوب گرامی ہی سے ہو ـــ حضرت شاہ ابوسعید حسنی ۱۱۸۷ھ میں حجاز کو روانہ ہوئے اور ۱۱۸۸ھ میں واپس آئے ہیں۔ واپسی پر ۱۱۸۸ھ میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کو یہ مکتوب لکھا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۸۸ھ میں ان سب حضرات کا انتقال ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ۱۱۸۷ھ سب کا سال وفات ہو یا بعض کا ۱۱۸۷ھ میں اور بعض کا ۱۱۸۸ھ میں وصال ہوا ہو لیکن مولانا نجم الغنی نے اپنے دادا کے متعلق یہ خبر دی ہو کہ ۱۱۸۸ھ سے کچھ پہلے یعنی ۱۱۸۷ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے جس سے حاجی محمد سعیدؒ کے لیے سنہ ۱۱۸۷ھ متعین ہے مگر دوسرے چار حضرات کے متعلق پھر احتمال ۱۱۸۸ھ کا بھی ہے اسی وجہ سے صاحب نزہۃ نے احتیاطاً ان بقیہ چار بزرگوں کی تاریخ وفات کو ان الفاظ میں لکھا ہے "وتوفی فی نحو سنۃ سبع وثمانین ومائۃ والف" نزہۃ الخواطر جلد ۶ میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے جس مکتوب گرامی کا کئی جگہ ذکر ہے وہ یہی مکتوب (۴) ہے ـــ

[1] مولانا سید محمد نعمان بن سید محمد ابن سید محمد ہدیٰ ابن عارف باللہ سید محمد علم اللہ حسنی رائے بریلوی قدس سرہٗ

روز گار ثبت یابد ہر آئینہ مانند حالِ ما عزیباں سزد ؎

چہ بخاطر رسید بار مرا کہ بہجراں کشید کار مرا

وامصیباہ ــــ ایں چہ بے نیازی .... است کہ ہمچنیں روح مقتدائے را در کمتر وقت بعمر شصت و دو سالگی نداء ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ دادند و اصحاب بدع و ضلال را عشرت آگیں نمودند و اصحاب دین را اندوہگین کردند یعنی بتاریخ سلخ محرم الحرام سنہ ۱۱۷۶ھ یک ہزار و یکصد و ہفتاد و شش یوم السبت وقت الظہر بامر داعی برحق روح مطہر آنحضرت از قالب عنصری مفارقت نمودہ باوج علیین نشیمن ساختہ ...... حالتِ تمام اصحاب احباب از مفارقتِ آنجناب چناں تباہ و خراب بود کہ از حیزِ تحریر بیرونست ...... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ رحمۃ اللہ علیہ وعلی من بجنابہ یتوسلون ۔ آمدیم بر اینکہ از فضل الٰہی و تصدق جناب حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم جاذبۂ حضرت ایشاں علیہ الرحمتہ ایں عاصی را بسوئے خود کشید بشہر ذی قعدہ در بڈھانہ رفتہ بتقبیل آستانہ متبرکہ استعداد یافتہ وبملازمت جناب قدسی القاب بشرف گردید و بر حالات خود توجہات عالیات بلیش از بیش یافتہ از انجا کہ حضرت ایشاں جہت تداوی و تدابیر در ماہ ذی حجہ تاریخ نہم بشہر دہلی بمکان بابا فضل اللہ در مسجد روشن الدولہ بچوک سعد اللہ خاں نزول فرمودند از فرزندانِ گرامی میاں محمد صاحب و میاں عبدالعزیز و میاں رفیع الدین مدظلہم العالی ـــــــــ و میاں محمد عاشق صاحب و میاں اہل اللہ صاحب و میاں محمد فائق و میاں محمد جواد و محمد امین وغیرہ یاران حاضر خدمت بودند ایں غلام و میر محمد عتیق و میر قاسم علی کہ در وقتِ آخریں شرفِ انتساب بیعت یافتہ ــ ہر روز بشرف حضور پر نور خدمت گاری وسیلۂ حضور در حضور سعادت اندوز میشدیم ۔ مشفقا ایں مجلسِ آخریں عجب مجلسے بود پر فیض دائماً مہبطِ ملاء ملکوت و نزول ارواح طیبہ ارکان عالم ناسوت میگردید و نفحاتِ انس و رحمت و رشحات قدس و برکت بمثالِ نزول غیث می بارید ۔ اکثر یارانِ اہل نسبت بوجدانِ صحیحہ خود می دریافتند ــــ و احسرتا اہل اللہ عمر فالازال در ہر زمان می باشند اما ایں چنیں مرد با جمعیتِ اوصاف حمیدہ اعلم بکتاب و سنت با جتہاد مطلق و در حقائق و

و معارف بحرِ مواج و در علوم دیگر محض فیاض پس از صدہا سال می آید ؎

دورہا باید کہ تا یکمرد صاحبدل شود
بایزید اندر خراساں یا سہیل اندر یمن

یاراں می باید کہ مصابرت و شکیبائی ورزیدہ نسبتِ رابطہ حضرت شیخ را بمجامع ہمت در
تصور نہادہ بمراقباتِ معلومہ مشغول باشند ان شاء اللہ تعالیٰ فیض صحبت و رابطہ برابر
خواہد بود کما یفیض من بعض رسالاتہ رحمۃ اللہ علیہ — والحمد للہ رضامندی حضرت
صاحب قدس سرہٗ از اصحاب و توجہاتِ عالیات بر حال ایشاں زیادہ از حدِ بیان
یافتہ اکثر اوقات استفسارِ احوال سامی می فرمودند و ماجرائے غارتگری ابدالیاں و
رسیدنِ آنصاحب در عین رستخیز و انطفا یافتن التہاب نہیب بسبب قدمِ گرامی از زبانِ
دُرفشاں مودّی ساختند و شاید کہ منظور لقائے آخرین بضمیر منیر بودہ باشد سرہٗ فرمودند
کہ "میر ابو سعید ارادۂ آمدن دارند اگر زود برسند بہتر باشد" صاحب من ظاہر صحبتِ
ایشاں را باستسعاد کشیدہ تصنیفات آنحضرت قریب بنود بل زیادہ در علوم دین از تفسیر
و اصول و فقہ و کلام و حدیث مثل حجۃ اللہ البالغہ و اسرار فقہ و مصور و ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفا
و ترجمہ قرآن کہ ہر واحد قریب ہشتاد و نو جزو کلاں بحجم خواہد بود و دیگر رسائل در حقائق و
معارف مثل الطاف القدس و ہمعات و فیوض الحرمین و انفاس العارفین وغیرہم کہ
نشان از صحبت و برکت خدمت می دہند، می باید کہ عزیمت بر این آرند کہ ہمہ را نویسانیدہ
رائج نمایند باندک توجہات سرانجام خواہد یافت و مثل این تصنیفات واللہ اعلم در
اسلام تصنیف شدہ باشد یا نہ. چنانچہ ارباب بصیرت عبرت یافتہ اعتراف دارند و کلام
ایشاں در ہر باب کہ نوشتہ اند اصول است ..... و یقین این فقیر و دیگر صاحبزادہا و
یارانِ حضرت بملاحظۂ فرطِ محبتِ سامی بجناب حضرت انیست کہ بمجردِ شنیدن این حادثۂ
عظیمہ جہتِ فاتحۂ روحانیت و زیارت مرقد مطہر راہی این صوب خواہند شد — لہذا
منتظرِ قدمِ ہمتم اگر زود تشریف بیارند بارے بملاقات سامی مسرور الوقت شوم و اگر توقف
در آمدن باشد اعلام نمایند کہ فقیر ہم عزم مراجعتِ وطن دارد — و دیگر
آنکہ میاں محمد عاشق صاحب بعد سلام فرمودہ اند کہ میر ابو سعید جیو را بنویسید کہ ہر مکاتیب

حضرت ایشاں کہ بجانب آنصاحب شرف صدور یافتہ باشند نقل آنہا البتہ بفرستید کہ داخلِ مکاتیب نمودہ شود از حضرت میاں اہل اللہ صاحب و دیگر یاراں و صاحبزادہ ہا سلام اسم باسم مطالعہ فرمایند ـــــ و کیفیت ارتحال و وصال مرحوم و مغفور غفران پناہ بھائی محمد معین صاحب رحمتہ اللہ علیہ ...... بجناب عالی حضرت صاحبؒ قبلہ در مقام بڈھانہ عرض کردم فاتحہ بروحانیت خواندند و تاسفہا نمودند ـــــ

ترجمہ ـــــ باسمہ سبحانہ و تعالیٰ شانہٗ ـــــ اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اس کی نعمتوں پر نیز جذبۂ رضا بالقضا کے حصول پر اور مصیبت و بلا میں صبر کے حاصل ہونے پر اور درود و سلام سید الشاکرین، زبدۃ الماضین، قدوۃ الصابرین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ پر اور (آپ کے ضمن میں) آپ کے آل و اصحاب پر جو کہ طیب و طاہر تھے اور آپ کے وارثین یعنی علماء راسخین اور اولیاء مرشدین پر ـ تا قیام قیامت ـــــ

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ امام سنت و جماعت، مقتدائے ارباب کرامت، پیشوائے عرفائے زمان، سرآمد اولیاء جہاں، قطبِ زمانی محبوب سبحانی سیدنا و مرشدنا ولی اللہ فاروقی مجدد وقت رضی اللہ عنہٗ کے انتقال پُر ملال کا واقعہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ہم جیسے غمزدہ لوگوں کے مناسب حال ہے ـــــ ہمارے دوست کے دل میں کیا آیا کہ ہمیں فراق و مہجوری میں مبتلا کر گیا ـــــ وامصیبتاہ ـــــ اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا عجیب نمونہ ہے کہ ایسے مقتدا کی روح کو صرف ۶۲ سال کی عمر میں ارجعی الیٰ ربکِ راضیۃً مرضیہ (اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف راضی اور پسندیدہ ہو کر رجوع ہو جا) کی ندا دے دی گئی اور بدعت و ضلالت والوں کو خوش اور اصحاب دین کو اندوہ گین کر دیا گیا ـــــ یعنی محرم الحرام ۱۱۷۶ھ کی آخری تاریخ میں ہفتے کے دن ظہر کے وقت حکم خداوندی کے مطابق حضرت اقدس کے طائر روحِ مطہر نے اوج علیین پر اپنا نشیمن بنا لیا ....

اصحاب و احباب کی حالت آنجنابؒ کی مفارقت سے ایسی خراب و خستہ تھی کہ احاطہ تحریر میں نہیں آسکتی .... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ـــــ

اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ پر اور آپ کے متوسلین پر نازل ہو ـــــ

اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں ـــــ فضلِ الٰہی سے اور درگاہ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وعلی آلہٖ وصحبہٖ وسلم کے صدقے میں اس عاصی کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کشش نے اپنی طرف کھینچا چنانچہ ذی قعدہ (۱۱۷۵ھ) کے مہینے میں بڈھانہ ضلع مظفر نگر جاکر آستاں بوسی کی سعادت حاصل ہوئی اور جناب قدسی القاب (حضرت شاہ صاحبؒ) کی صحبتِ اقدس سے مشرف ہوا۔ بڈھانہ سے حضرت ایشاں ۹ ذی الحجہ (۱۱۷۵ھ) کو بغرض علاج شہر دہلی تشریف لے آئے اور وہاں بابا فضل اللہ کے مکان پر مسجد[1] روشن الدولہ کے احاطے میں جو چوک سعد اللہ خاں میں واقع ہے ـ فروکش ہوئے ـــــ فرزندانِ گرامی قدر میں سے میاں محمد میاں عبد العزیز، میاں رفیع الدین مدظلہم العالی (اور اقربا ومتوسلین میں سے) میاں محمد عاشق صاحب، میاں اہل اللہ صاحب، میاں محمد فائق میاں محمد جواد (پھلتی) اور خواجہ محمد امین وغیرہ حاضر خدمت تھے۔

یہ غلام اور میر محمد علیق نیز میر قاسم علی (ساکنانِ رائے بریلی) جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے آخری ایام میں شرفِ بیعت سے مشرف ہو گئے تھے۔ ہر روز حاضری اور خدمتگاری سے سعادت اندوز ہوتے رہتے تھے ـــــ

مشفقِ من! یہ آخری مجلسیں بھی عجیب پُر کیف اور پُر فیض تھیں..... نفحاتِ اُنس و رحمت اور رشحات قدس و برکت بادش کی طرح برستے تھے۔ اکثر اہل نسبت حضرات اپنے وجدانِ صحیح سے اس کو محسوس کرتے تھے ـــــ..... اہل اللہ اور عارف تو ہمیشہ ہر زمانے میں ہوتے ہیں مگر ایسا مرد حقانی جو جمیع اوصافِ حمیدہ کا حامل ہو اور جو

---

[1] مسجد و مدرسہ روشن الدولہ ـــــ شاہجہاں آباد (دہلی) میں یہ عمارتیں دریبے کے اندر نواب ؟ روشن الدولہ کی بنوائی ہوئی ہیں۔ ۱۷۲۲ء میں نواب موصوف نے بنوائی تھیں ـــــ مسجد کے برج سنگ مرمر زرد کے بنے ہوئے ہیں اور نہایت خوبصورت ہیں۔ بڑے در کی پیشانی پر کتبہ کندہ ہے مدرسہ کا مکان ۱۸۵۷ء سے کوتوالی کے متعلق ہو گیا ہے (عزابت نگار مولفہ عبد الحق دہلوی)

کتاب و سنت کا اجتہادی شان سے بہترین عالم ہو نیز حقائق و معارف میں بحرِ مواج ہو
اور دیگر علوم میں دریائے ذخار ہو ــــ صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

ع۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

...... دوستوں کو چاہیئے کہ صبر و شکیبائی کو اختیار کرکے حضرت شیخؒ کی نسبت رابطہ کو ہمت کے ساتھ تصور میں لاکر مراقباتِ معلومہ میں مشغول رہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ نے چاہا تو فیضِ صحبت و رابطہ برابر باقی رہے گا جیسا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعض رسائل سے یہ بات واضح ہوتی ہے ــــ یہ امر بھی لائقِ حمد ہے کہ حضرت صاحب قدسِ سرہٗ کی آپ سے رضامندی اور آپ پر ان کی توجہات عالیہ کو میں نے حدِ بیان سے زیادہ پایا۔ اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے رہتے تھے ــــ ابدالیوں کی جنگ کا واقعہ اور آپ کا عین اس ہنگامۂ قیامت خیز میں پہونچنا اور آپ کے قدمِ گرامی سے آتشِ فتنہ کا فرو ہو جانا ــــ ان باتوں کو حضرت قدسِ سرہٗ اپنی زبانِ دُرفشاں سے بیان فرمایا کرتے تھے ــــ شاید آپ سے آخری ملاقات کی تمنا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں تھی چنانچہ ایک مرتبہ یوں فرمایا:۔

"میر ابوسعید آنے کا ارادہ کر رہے ہیں اگر وہ جلدی آجائیں
تو اچھا ہو ــــ"

صاحب من! حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ظاہری صحبت تو اب میسر نہیں آسکتی البتہ علومِ دینیہ میں ان کی تصنیفات نوے کے قریب بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں ــــ تفسیر، اصول، فقہ، کلام اور حدیث میں ــــ جیسے حجۃ اللہ البالغہ، اسرارِ فقہ[عہ]، منصور[عہ]، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء جن میں سے ہر ایک کی کافی بڑی ضخامت ہے ــــ ان کے علاوہ دیگر رسائل ہیں جو حقائق و معارف پر مشتمل ہیں۔ جیسے الطاف القدس، ہمعات، فیوض الحرمین اور انفاس العارفین وغیرہا ــــ یہ کتابیں آپ کے فیوض و برکات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ آپ قصد اس امر کا کریں کہ ان تمام کتابوں کو لکھوا کر رائج فرمائیں۔

عہ، عہ یہ دونوں کتابیں حیاتِ ولی کی فہرستِ تصانیف میں موجود نہیں ہیں۔

یہ کام تھوڑی سی توجہ سے انجام پا سکتا ہے ——— معلوم نہیں کہ ایسی تصنیفات گزشتہ دور میں ہوئی ہیں یا نہیں ؟ واللہ اعلم ——— ارباب بصیرت ان کتابوں کی افادیت کا اقرار کرتے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ہر باب میں اصولی حیثیت رکھتا ہے — ..... اس فقیر کو اور صاحبزادگان نیز تمام یاران حضرت رح کو آپ کی محبت کے پیش نظر یہ یقین ہے کہ جیسے ہی آپ اس حادثۂ عظیمہ (وفات حضرت شاہ صاحبؒ) کی خبر سنیں گے (فوراً) فاتحہ پڑھنے اور مرقد مطہر کی زیارت کرنے کے لئے دہلی کو روانہ ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے میں منتظر قدوم ہوں اگر جلدی تشریف لائیں تو میں ملاقات سامی سے مسرور الوقت ہو جاؤں — اگر تشریف لانے میں کچھ دیر ہو تو مطلع فرما دیں کیونکہ فقیر بھی وطن کو واپس جانے کا قصد رکھتا ہے — دوسری بات یہ ہے کہ میاں عاشق صاحب (پھلتی) بعد سلام فرماتے ہیں کہ میرا ابو سعید کو لکھو کہ حضرت رح اقدس کے جتنے مکتوبات بھی ان کے نام صادر ہوئے ہیں ان کی نقول ضرور بھیجیں تاکہ ان کو داخل مکاتیب کیا جائے۔ حضرت میاں اہل اللہ صاحب اور دیگر متوسلین نیز صاحبزادگان کی طرف سے نام بنام سلام مطالعہ فرمائیں۔ میں نے بڈھانہ میں حضرت اقدس رح کی خدمت میں مرحوم و مغفور غفران پناہ بھائی محمد معین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی کیفیت بیان کر دی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی روح کو ایصال ثواب کیا تھا اور بڑا افسوس ظاہر فرمایا تھا۔

شاہ ولی اللہ کا تصورِ اخلاقیات

طفیل احمد قریشی

انسان مدنی الطبع ہے۔ وہ اپنے طریق بود و باش، معاملات اور افکار میں اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اور ماحول بذاتِ خود افراد کے ذہنی رجحانات کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہی رجحانات اس کے کردار کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔ اگر رجحانات اچھے ہیں تو کردار بھی اچھا اگر رجحانات بُرے ہیں تو کردار بھی بُرا۔ انسان کے کردار کی تصویر اس کے اعمال ہوتے ہیں اور اعمال اچھا یا بُرا ماحول پیدا کرتے ہیں جن سے کہ ایک معاشرے کے افراد کسی نہ کسی صورت میں متاثر ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی کردار ہی کسی اچھے یا بُرے معاشرے کی تشکیل کی بنیاد بنتا ہے۔ انسان کے کردار کی ہر دور میں جانچ پڑتال ہوتی ہے اور اس کے اچھے اور بُرے اعمال اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کا جائزہ ہمیشہ لیا جاتا رہا ہے۔ مصلحین اپنی تعلیمات میں اسے اساسی حیثیت دیتے رہے ہیں۔ علماء اس کے مختلف مسائل اور الجھنوں کا تجزیہ کرتے رہے ہیں اس طرح وہ علم جسے ہم اخلاقیات کہتے ہیں، انسانی معاشرے کی تاریخ کے ابتدائی دور ہی سے کسی نہ کسی صورت میں زیر بحث رہا ہے۔ یونانی فلاسفہ کے ابتدائی دور میں اس علم کی نظریاتی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں، جن کا ماخذ ان فلاسفہ کے مابعد الطبعیاتی افکار ہوتے تھے۔ ہرقلیتوس جس کے نزدیک یہ کائنات آگ کی پیداوار ہے، رواقیت کا بانی کہلایا۔ اسی طرح دیمقراطیس اپنے مخصوص مابعد الطبعیاتی نظریات کی وجہ سے لذتیت کا بانی بن گیا۔ اس طرح یونانی فلاسفہ کے افکار اخلاقیات کے مختلف مذاہب کا روپ

دھارنے لگے۔

انسانی کردار کیا ہے؟ اس سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں ان کے عوامل کیا ہیں؟ نیکی یا بدی کیا ہے؟ خیر و شر کیوں ضروری ہے؟ انسان کی حقیقی مسرت یا خوشی کا راز کس بات میں پوشیدہ ہے؟ کردار کی تشکیل کے لیے کن جوہروں کا ہونا گزیر ہے؟ غرض یہ کہ ایسے اور بہت سے سوالات کا حل ڈھونڈنے کے لئے یونانی مفکرین نے سوچنا شروع کر دیا جس نے اخلاقیات نے بعد میں معیاری علم کی صورت اختیار کی۔ ہرقلیتوس اور دیمقراطیس کے بعد پرمانیدس اور فیثاغورث نے ان سوالات کے مختلف پہلوؤں پر اپنی آراء کا اظہار کیا۔ جنھیں بعد میں ان کے شاگردوں نے مختلف نظریات کا جامہ پہنا دیا۔ بعد میں انہی کی روشنی میں سوفسطائیہ نے اخلاقیات کے مختلف مسائل کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نظریات نے اس علم کو اور بھی وسیع کر دیا، جس کی وجہ سے سینکڑوں نظریات معرض وجود میں آئے جنھیں دو بڑے مکاتب فکر کلبیہ اور سیرینہ کی مختلف شاخیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اخلاقیات کی تاریخ میں ان دونوں مکاتب فکر کے نظریات کی جھلک ہر دور میں نظر آتی ہے۔ کلبیہ کو جسے رواقیت بھی کہا جا سکتا ہے، راہبوں، جوگیوں اور فقیروں نے اپنا لیا جن کے نزدیک اخلاقیات اور اس کے مسائل وجدان اور روحانی تعلیمات کے مطابق حل ہوتے ہیں۔ انسانی کردار کی تشکیل اور روحانی سکون اس مکتب فکر کے نزدیک مذہبی عبادات و ریاضات کو اپنانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی مسرت روح کی پاکیزگی کا نام ہے۔ سیرینہ مکتب فکر کو جسے ابقوریت بھی کہا جاتا ہے، ان لوگوں نے اپنایا جو سقراط کے نظریہ لذتیت و تمتع کے قائل تھے۔ پھر ایک دور ایسا بھی آیا جس میں اخلاقیات میں نئے مسائل کے تجزیہ کے بجائے پرانی ڈگر پہ چلنے پر ہی اکتفا کیا۔ اپیکوری داد تیا بی اور دوسرے مذاہب ارسطو کی "کتاب الاخلاق" اور افلاطون کے "فلسفۂ تصوریت" کو ہی کافی خیال کرنے لگے۔ مسلم دور البتہ اس علم کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے جس میں یعقوب الکندی، غزالی، ابن مسکویہ اور دیگر علماء نے کافی کام کیا۔

اخلاقیات کے فلسفۂ جدید کے بانیوں میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام سرفہرست لکھا جاسکتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب افراط و تفریط سے ہٹ کر اخلاقیات کے مسائل کا ایسا حل پیش کرتے ہیں جس سے انسانی کردار کی تشکیل میں روحانی اور مادی دونوں عنصر شامل ہو جاتے ہیں۔ روحانی سے مراد مذہبی اقدار کی راسخیت اور مادی سے مراد فطرت طبعیہ کی روشنی میں انسانی کردار کے تکمل کا اہتمام ہے۔ وہ عوامل جو کردار کی تشکیل میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں، شاہ صاحب کی اصطلاح میں "اخلاق فاضلہ" کہلاتے ہیں، ان کے نزدیک ہر وہ عمل جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرے اور ترقی و تکمل کی نشاندہی کرے، اخلاق فاضلہ میں شمار ہوتا ہے۔

انسانی جبلتیں:۔

اس سے پہلے کہ اخلاق فاضلہ پر گفتگو ہو۔ شاہ صاحب کی تعریف بذاتِ خود تشریح طلب ہے جس کا انحصار ان کے بیان کردہ بہت سے اخلاقیات کے مسائل سے ہے۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ اخلاق فاضلہ فی الحقیقت بنیادی طور پر انسانی جبلتوں ہی کی ارتقائی اور مکمل صورت ہوتے ہیں یہ جبلتیں حیوانوں اور انسانوں میں مشترک ہوتی ہیں۔ ولیم میگڈوگل نے اپنی کتاب (OUTLINE OF PSYCHOLOGY) میں ان کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ متلون مزاجی و کسی چیز کے حصول کا اشتیاق، جنگ، ذاتی تذلیل و تعریف، جذبۂ مادری و پدری اور جنس بنیادی جبلتیں ہیں اور شاہ صاحب کے نزدیک غضب، ہمت، انتقام، احساس خود اعتمادی جذبہ برتری، معاشقہ، جنسیت سے وابستگی اور حسد بنیادی جبلتیں ہیں جوں جوں یہ جبلتیں انسان کے امتیازی جواہر سے متاثر ہوتی ہیں، جذبات و عواطف کی صورت خیال کر لیتی ہیں جن پر قابو پانا یا ان کا صحیح استعمال و اظہار انسانی کردار کی تشکیل کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے

انسان کی امتیازی خصوصیّات

انسانی اور حیوانی اعمال انہی جواہر اور جبلتوں کا مظہر ہیں لیکن وہ بنیادی چیزیں

جو ایک انسانی عمل کو حیوانی اعمال سے ممتاز کرتی ہیں شاہ صاحب کے خیال میں تین ہیں جنھیں امتیازی جواہر ثلثہ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ حیوانی جبلتوں کی وجہ سے جو انسان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ انسان اور حیوان دونوں اپنے اعمال میں مشترک ہیں لیکن وہ پہلی چیز جسے حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے وہ "رائے" یا مقصدیت ہے۔ حیوان کے پیش نظر فوری منفعت کا حصول ہوتا ہے، جسے شاہ صاحب "رائے الجزئی" کا نام دیتے ہیں، لیکن اس کے برعکس انسان فوری منفعت کے علاوہ دور رس نتائج و عواقب پر بھی نظر رکھتا ہے۔ جسے شاہ صاحب "الرائی الکلی" کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب کے بیان کردہ اخلاق فاضلہ میں "الرائی الکلی" کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

فالبھیمیہ تغضب لدفع ضراد جلب نفع والانسان قد یغضب لیحصل بغضبہ نظاما کاملاً فی المدینۃ والبھیمیۃ ان کانت تتعب نفسہ لیحصل غوضاً والانسان قد یتعب نفسہ لیحصل غوضا اجلا اخرویا۔

(البدور البازغہ ص۲۸)

"حیوان کی ناراضگی یا غصہ نقصان سے بچنے یا فائدہ کے حصول کے لئے" ہوتا ہے اور انسان اسے مدنی زندگی میں ایک اچھے نظام کی تشکیل کے لئے استعمال کرتا ہے۔ حیوان اپنے نفس کی بات محض اپنی فوری غرض کی تکمیل کے لئے مانتا ہے جبکہ انسان کے پیش نظر اخروی نتائج ہوتے ہیں۔"

شاہ صاحب کے نزدیک دوسری چیز جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے وہ "ظرافۃ" ہے، جو اس کی طبیعت میں نفاست پسندی پیدا کرتی ہے جس سے وہ ہر چیز کو کثافت سے پاک اور لطافت سے قریب تر دیکھنا چاہتا ہے۔ تہذیبوں کے عروج اور کسی اچھے معاشرے کی تشکیل کے لئے یہ خوبی نہایت اہم کردار انجام دیتی ہے۔ چنانچہ انسان کے اس جوہر کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

فالبھیمیۃ مطعمہا لسد جوعہا والانسان یزید علی ذالک

تقوبه عینه و تلتذ به نفسه من الحسن والبہاء

(البدور البازغہ ص۲۸)

جانور کھانے سے صرف اپنی بھوک ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن انسان اس کھانے کی لطافت ونفاست سے (دل اور آنکھوں سے) لطف اندوز ہوتا ہے۔

تیسری حد فاصل جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے، شاہ صاحب کے نزدیک حصول "تکمّل" ہے۔ حیوان جس ماحول میں رہتا ہے، اسی پر قانع ہوتا ہے لیکن انسان کی تکمل کی یہ خواہش اسے مادی اور روحانی ترقیوں پر ابھارتی رہتی ہے جس سے نہ صرف اس کا کردار بلکہ معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

ان البھیمیہ انما علومھا آلة لارتفاقھا فی معاشھا فقط والانسان قد یعلم ویرید ان یتکمّن نفسه بالعلم۔

(البدور البازغہ ص۲۹)

"حیوانات کے علوم تو صرف ان کے معاش کی ترقی کے لئے ہوتے ہیں لیکن انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے، وہ اپنے نفس (کردار) کی تکمیل کے لئے کرتا ہے۔"

اخلاق فاضلہ

الرائی الکلی، ظرافتہ اور تکمل کو انسان کے اخلاق کی بنیاد قرار دے کر شاہ صاحب "اخلاق فاضلہ" کو بیان کرتے ہیں، جنھیں وہ جامع انداز میں بیان کرتے ہوئے مندرجہ ذیل سات حصوں میں بانٹ دیئے ہیں۔

(۱) حکمت (۲) شجاعت (۳) عفت (۴) سماحت (۵) فصاحت یا فطانت (۶) دیانت یا ذکاوت (۷) السمت الصالح۔

شاہ صاحب کے نزدیک حکمت محض فلاسفہ کی آراء اور صوفیاء کے وجدان کا نام نہیں جیسا کہ فرماتے ہیں۔

ولیست الحکمة التی نقصد بیانھا عندنا فاما اختص به الصوفیة

ومن ضاھاھم من الوجدان العمیق من قبل التجلی المعتمد علی نفوسھم
او من قبل اعیانھم بل یھتدی بہ اصحاب الامزجۃ السلیمۃ الی
معالیشھم والی علومھم الی من قبل نسمتھم
(البدور البازغہ)

یعنی حکمت سے مراد صوفیہ یا ان کے وجدان واعیان نہیں بلکہ اس سے مراد سلیم الطبع
لوگوں کو ان کے معاش اور علوم میں ہدایت ہے۔

ایک دوسری جگہ حکمت کی وضاحت یوں فرماتے ہیں۔

وان العلوم کلھا اذا داخلہ الرائی الکلی التکمل باالاخلاق
صار حکمۃ۔
(البدور البازغہ ص۳۰)

اور جب علوم میں رائی الکلی اور تکمل داخل ہو جاتے ہیں تو وہ حکمت بن جاتے ہیں۔ شجاعت
کا تعلق قوت غضبیہ سے ہے لیکن اس قوت کو ذاتی اغراض یا معاشرہ میں فساد پیدا
کرنے کے لئے استعمال کرنا شاہ صاحب کے نزدیک شجاعت کے مفہوم کے قطعی منافی ہے
"رائی الکلی" کا دخل اس میں ہونا ان کے نزدیک ضروری ہے۔ لکھتے ہیں۔

"الغضب اذا داخل الرائی الکلی صار شجاعۃ"

جب غصہ کا اظہار رائی الکلی کی حدود میں رہ کر کیا جائے تو وہ شجاعت ہے۔

جنسیت کے بارے میں شاہ صاحب نہ تو لذتیت کے مادہ پرست نظریہ سے اتفاق
کرتے ہیں اور نہ وہ رواقی جوگیوں اور راہبوں سے متفق ہیں۔ جنسیت کو وہ انسانی جبلت
کا اہم جزو مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مخالف جنس سے وابستگی کے رجحانات بالکل فطری ہیں
چنانچہ اس وابستگی میں "رائی الکلی" کو دخل ہونا چاہیئے، جسے عفت کہا جا سکے۔ وہ لکھتے ہیں۔

محبۃ النساء علی وصف الغلبۃ دون الانقیاد اذا بھا
الرائی الکلی صارت عفۃ
(البدور البازغہ ص۳۱-۳۰)

وقار اور وجاہت قائم رکھنے کے لئے عزور و فخر سے کام لیا جاتا ہے لیکن یہی آگے چل کر
بسا اوقات ظلم و تعدی اور شیخی بگھارنے کا باعث بھی بنتے ہیں اس لئے شاہ صاحب کا
خیال ہے کہ نہ تو اتنا گرا جائے جس سے انسانی وقار کو ٹھیس پہنچے اور نہ اس قدر افراط سے

کام لیا جائے جس سے انسان یا تو شیخی خورہ محسوس ہونے لگے یا مغرور کہلائے۔ اس لئے "سماحت" سے ان کی مراد فخر و مباہات کا انسانی وقار کے لئے ایسا استعمال ہے جو معاشرہ اور اخلاقی قدروں کی حدود میں رہ کر کیا جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

التیہ والعجب اذا ھذبہ الرائ الکلی صار سماحۃ (البدور البازغہ ص۳۰)

"فخر و مباہات کو جب رائے کلی کی حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے تو وہ سماحت ہے"

فصاحت و بلاغت کے سلسلے میں بھی شاہ صاحب "رائی الکلی" کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ

"ان الصوت الشدیدۃ اذا داخلہ الظرافۃ صار کلاما واذا داخلہ الرای الکلی والتکمل صار فصاحۃ۔" (البدور البازغہ ص۳۰)

یعنی جب آواز میں "ظرافہ" (لطافت یا حسن) شامل ہو جاتا ہے تو وہ کلام ہے اور جب اس میں "رائی الکلی" اور "تکمل" کا شمول ہوتا ہے تو اسے فصاحت کہا جاتا ہے۔

"دیانت" اور "السمت الصالح" میں بھی آپ "رائی الکلی" کو نظر انداز نہیں فرماتے۔ انسانی قلب، فہم اور شعور کو ان (دیانت السمت الصالح) سے بہت گہرا تعلق ہے، جس کی وجہ سے انسانی کردار میں ان اخلاق کی صحیح نشو و نما پر شاہ صاحب بہت زور دیتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ خیالات اور قلب پر کنٹرول ہی وہ بہترین طریقہ ہے جس کی بدولت انسانی کردار میں یہ دونوں اخلاق نمایاں نظر آتے ہیں۔

ان سات اخلاق فاضلہ کے علاوہ شاہ صاحب نے اخبات، سماحت، طہارت اور عدالت کے عنوان سے چار اور اخلاق پر بحث کی ہے، جنھیں اخلاق عالیہ کہا جا سکتا ہے، جو ان کی رائے میں بہت زیادہ روحانی لوگوں میں ہوتے ہیں۔

اخلاق فاضلہ کے اس اجمالی تذکرہ کا مقصد یہاں یہ تھا کہ یہ بات عیاں ہو جائے کہ شاہ ولی اللہ کے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد انسان کی وہ امتیازی خصوصیات (رائی الکلی ظرافۃ اور تکمل) ہیں جنھیں اساس بنا کر وہ اپنے کردار کی بہترین تشکیل کر سکتا ہے۔

نیکی اور بدی کا تصوّر (البرّ والاثم)

یوں تو نیکی اور بدی کا کچھ نہ کچھ تصور علمائے اخلاقیات بیان کرتے ہی آئے ہیں مگر جو چیز شاہ صاحب کو دیگر علماء سے ممتاز کرتی ہے، وہ آپ کا نیکی و بدی یا اچھائی اور برائی کا ایک جامع تصوّر ہے۔ آپ "البر" نیکی کی تعریف یوں فرماتے ہیں۔

فالبر کل عمل یفعله الانسان قضیة لانقیادہ للملاء الاعلی وانصحلال فی تلقی الالہام من اللہ وصیرورتہ فانیاً فی مواد الحق وکل عمل یجازی علیہ فی الدنیا والاخرۃ وکل عمل یصلح الارتفاقات التی بنی علیھا نظام الانسان وکل عمل یفید حالة الانقیاد ویدفع الحجب[1]

نیکی کی اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک نیکی ہر اس عمل کا نام ہے جو

۱۔ ملاء اعلیٰ کی اطاعت سے کیا جائے۔

۲۔ الہام الٰہی کو قبول کرتے ہوئے کیا جائے۔

۳۔ جس کی جزا دنیا اور آخرت دونوں میں ملے۔

۴۔ جس سے تدابیر نافع کی اصلاح ہو اور سوسائٹی ترقی کرے۔

۵۔ جو حجابات کو دور کرنے کا ذریعہ بنے۔

اس کے برعکس بدی یا "اثم" کی تعریف انکے نزدیک یہ ہے کہ ہر وہ عمل جو

۱۔ شیطانی تحریک سے کیا جائے۔ ۲۔ جس کی سزا دنیا اور آخرت میں ملے۔

۳۔ جس سے تدابیر نافعہ میں خرابی اور ابتری پیدا ہو۔ ۴۔ جو متمردانہ ہو۔

۵۔ جس سے حجابات نظرآور مستحکم ہو جائیں۔

گو کہ ملاء الاعلیٰ، جزا و سزا، ارتفاقات، حجابات بذات خود مستقل موضوع ہیں جنہیں اس تعریف میں بیان کیا گیا ہے اور جن پر شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں سیر حاصل بحث فرمائی ہے پھر بھی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے انسان کے وجدانی، نفسانی، روحانی اور معاشرتی پہلوؤں کو نیکی کی اس تعریف میں سمو کر رکھ دیا ہے۔

---

[1] حجة اللہ البالغہ ص ۳۹

افکار و آراء

مساوات

جب بھی انسانیت کی پشت پر ظلم و طغیان کے کوڑے برسے، اس نے ہمیشہ مساوات کے خواب دیکھے۔ صدیاں گزر گئیں اور اقوام عالم مساوات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور انھیں یہ مساوات —— سوائے فلسفیوں کی تصنیفات کے اور کہیں نظر نہ آئی۔ گویا مساوات ایک سراب ہے۔ جب بھی اس کے پاس پہنچو، وہ نظروں سے روپوش ہو جاتی ہے۔ اس دوران میں رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوتے ہیں۔ آپ اس خواب کو ایک حقیقت بنا دیتے ہیں۔ ایسی حقیقت جس نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اور پہلی دفعہ دنیا میں ایک معاشرہ معرض وجود میں آیا، جو مساوات کے بارے میں باتیں کرنے کے بجائے اس پر عامل تھا۔ اگرچہ بعد میں اسلامی افق سے یہ درخشاں نور چھپ گیا لیکن وقتاً فوقتاً اسلامی تاریخ میں اس کی تھوڑی بہت شعاعیں نظر آتی رہیں۔ اب یہ قصور اسلام کا نہیں۔ بلکہ مسلمانوں کا ہے جنھوں نے اپنے اسلام کو ضائع کر دیا۔ اور ان کے ہاتھ سے عزت و احترام کے اسباب جاتے رہے۔ اس ضمن میں جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، وہ ایک ایسا دین ہے جو ہمیشہ کے لئے ہے، اور ایک ایسا سرچشمہ ہے، جو کبھی خشک نہیں ہوگا اگر ہم اس کی طرف رجوع کریں گے تو اس کو اسی حالت میں پائیں گے جس میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے۔ یعنی ہماری روحوں کے لئے غذا ہے۔ ہماری قوت کا سرچشمہ ہے۔ اور عدل و انصاف کی حقیقی اساس ہے۔ جس میں ظلم بار نہیں پا سکتا۔ اس میں ایسی مساوات ہے کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اور اگر ایک انسان کو دوسرے پر کوئی فضیلت ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر۔ اسلام میں مساوات صرف تنگ مادی دائرے تک محدود نہیں۔ بلکہ وہ مسلمانوں کے نفوس کو ہر قسم کی عبودیت و غلامی سے آزادی دیتا ہے۔ اس مساوات کا نقطہ آغاز ایک خدا پر ایمان لانا ہے، جو سب کا پروردگار ہے۔ اور وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے وہی مارتا ہے، اسی کے ہاتھ میں روزی ہے۔ اور ہر چیز پر اسی کا اقتدار ہے، ہمارے اور اس کے درمیان کوئی اور واسطہ نہیں اور نہ کوئی سفارش کرنے والا ہے۔ ہم سب اسی کے بندے ہیں خواہ ہم میں سے کوئی کتنا بھی بلند مرتبہ

کیوں نہ ہو۔

جب مسلمان اسلام کے اس عقیدے میں جو اساسی معانی مضمر ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں، تو ان میں سے ہر ایک اپنے کمزور اور فانی وجود کو خدائے قادر و رحیم کی قدرت سے براہ راست مربوط محسوس کرتا ہے اور اس سے اسکے اندر بہادری اور احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جو اسے یہ شعور بخشتا ہے کہ وہ اللہ تعالے کی نظروں میں معاشرے کے ہر فرد کے مساوی ہے قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے چنانچہ جب مسلمانوں کے دلوں میں یہ عقیدہ گھر کر جاتا ہے تو پھر اسلامی معاشرہ اس مرحلے میں داخل ہوتا ہے، جو حقیقی مساوات کا ہے اسکے بعد ہی تشریعات اسلامی بروئے کار آتی ہیں، اور یہ اسلامی معاشرہ وہ امت بنتا ہے جسے قرآن مجید نے "خیر امت اخرجت للناس" کہا ہے۔ مساوات اسلام کا ایک امتیازی نشان ہے۔ اور غیر مسلم انصاف پسند مصنفین تک نے اسلام کی اس خصوصیت کا اعتراف کیا ہے۔ اس ضمن میں مشہور برطانوی مفکر تھامس کارلائل جو کچھ لکھا ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اس مساوات پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ ان کرمکم عند اللہ اتقکم"

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنا دیا۔ تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)

"وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفی الا من امن وعمل صالحا" فاولئک لھم جزاء الضعف بما عملوا وھم فی الغرفات امنون۔

(اور تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایسی چیز نہیں جو درجے میں تم کو ہمارا مقرب بنا دے۔ مگر ہاں جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرے۔ سو ایسے لوگوں کے لئے ان کے عمل کا دگنا صلہ ہے۔ اور وہ بالاخانوں میں چین سے ہوں گے۔)

غرض یہ اسلام تھا، جس نے مسلمانوں کو بھائی بھائی بنایا۔ اُن کے دلوں کو متحد کیا۔ انھیں قانون کے سامنے اور معاشرے کے اندر مساوات دی۔ اور اس امر کی وضاحت کی کہ انسان کا عمل ہی اسکی سفارش کر سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا "وان لیس الانسان الا ما سعی" اور یہ کہ "لا تزر وازرۃ وزر اخری" (انسان کیلئے وہی ہے، جس کی اس نے کوشش کی۔ ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔)

کفالتِ اجتماعی

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے سب سے پہلے کفالتِ اجتماعی کی دعوت دی اور اسے معاشرے کے لیے ضروری قرار دیا۔ اسلام نے حکومت پر فرض کیا کہ وہ اپنی سیاسی طاقت کے بل پر کفالتِ اجتماعی کو عملی جامہ پہنائے اور اپنے بیت المال سے اس کو مالی مدد دے۔۔ لیکن افسوس اسلام نے دنیا میں پہلی بار جس خواب کو حقیقت کر دکھایا۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے۔

" و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلھم ائمۃ و نجعلھم وارثین"
(ہم ان لوگوں پر جو زمین میں کمزور تھے، احسان کرنا چاہتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ان کو امام اور اس زمین کا وارث بنائیں۔)

وہ دیرپا ثابت نہ ہوا اور اسلام کے بہت سے احکام بے اثر ہو کر رہ گئے۔ انہی میں سے کفالتِ اجتماعی کا اسلامی نظام بھی تھا۔ اب اس زمانے میں بہت سی متمدن حکومتیں کفالتِ اجتماعی کی داعی ہیں۔ اور یہ چیز اس دور کا خصوصی شعار ہو گئی ہے۔

کفالتِ اجتماعی کے سلسلے میں، اسلام نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اُس نے کام کرنے کو شرعاً واجب اور بے کاری کو حرام قرار دیا۔ بلکہ اس کے نزدیک محتاج اور معذور کے علاوہ دوسروں کے لیے بھیک مانگنا جرم ہے۔ ہر فرد کے کام کرنے کو واجب قرار دینے کے بعد اسلام کفالتِ اجتماعی کے ضمن میں دو عملی تدابیر پیش کرتا ہے۔ ایک یہ کہ خاندان پر فرد کی معاشی کفالت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور دوسرے اسلام نے صدقہ و احسان کرنے پر زور دیا ہے۔ اس کے بعد حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بیت المال سے محتاجوں کی مدد کرے۔

کفالتِ اجتماعی کا اصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عہد میں معین ہو گیا تھا۔ ایک روایت ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب کی بیوہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آئیں تاکہ آپ سے اپنے یتیم بچوں کے لئے کچھ کہیں۔ آپ نے ان سے فرمایا

کہ تم ان بچوں کے معاملے میں فقر و احتیاج سے خائف ہو۔ میں اس دُنیا میں اور آخرت میں ان کا ولی اور ذمہ دار ہوں۔ آپ نے حضرت جعفر کی بیوی سے یہ بات اس بنا پر نہیں کہی کہ وہ آپ کی قریبی عزیز تھی۔ مگر آپ نے بہ حیثیت امام اور حاکم یہ فرمایا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب اور ان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس اصول کو عملی جامہ پہنایا چنانچہ ان دونوں خلفاء نے کفالت اجتماعی کے ضمن میں جو کچھ کیا۔ اس کی مثالیں تاریخ اسلام میں بکثرت موجود ہیں۔

کفالت اجتماعی کے قوانین کو مندرجہ ذیل تین خطرات سے جو بالعموم افراد معاشرہ کو پیش آتے ہیں۔ عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ (۱) جسمانی خطرات جو افراد کو لاحق ہوتے ہیں۔ اور انھیں کام کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتے۔ جیسے کہ بیماریاں، جسمانی معذوری اور بڑھاپا۔ (۲) پیشہ ورانہ خطرات وہ خطرات جو کام کرنے والوں کو اپنے کام کے سلسلے میں پیش آتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے وہ جزوی یا کلی طور پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ (۳) غریبی و افلاس کے خطرات ایک شخص کثیر العیال ہے۔ اور اس کی آمدنی کم ہے۔

ان خطرات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسلام کیا تجویز کرتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں غور و توجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ خط پڑھنا چاہیئے، جو انھوں نے اپنے مصر کے والی کو لکھا تھا۔ (۴) حضرت علی نے لکھا:۔

> نچلے طبقے کا جس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں، مسکینوں، محتاجوں، مصیبت زدوں، اور جسمانی معذوروں، کا خیال رکھو۔ ان طبقوں میں سے بعض تو سوال کر لیتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جنھیں بغیر سوال دینا چاہیئے، ان کے معاملے میں اللہ نے اپنے جس حق کا تمہیں ذمہ دار بنایا ہے۔ اسے دُور کرنے میں اللہ کو حاضر و ناظر جانو۔ اُن کے لئے ایک تو اپنے بیت المال کا دوسرا مال غنیمت کا حصہ مقرر کرو۔ اسلام کا عمل دخل پوری مملکت اسلامیہ میں ہے۔ جو مذکورہ بالا طبقوں، میں سے دُور دراز حصّوں میں رہتے ہیں۔ اُن کے لئے بھی اتنے ہی حقوق

ہیں، جتنے قریب کے حصّوں میں رہنے والوں کے، ان میں سے ہر ایک کے حق کو تمہیں ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ تمہاری اپنی آسودہ حالی اور حال مستی ان سے تمہیں غافل نہ کردے۔ اس بارے میں تمہاری ذرا سی کوتاہی بھی قابل معافی نہیں ہوگی۔ خواہ تم ایک اہم اور بڑے کام کو اچھی طرح بھی کر لو۔ اس کے باوجود تمہاری توجہ اِن لوگوں سے نہیں ہٹنی چاہیئے اور نہ تم ان سے تکبّر سے پیش آؤ۔ اِن میں سے جو شخص تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ نگاہوں میں نہیں جچتا اور لوگ اسے حقیر سمجھتے ہیں۔ اس کا خاص خیال رکھو جو فرماں بردار اور تواضع کرنے والے ہیں۔ اُن پر تمہیں اعتماد کرنا چاہیئے۔۔۔ یتیم کنبوں اور چھوٹی عمر والوں کی، جن کے پاس نہ وسائل ہیں اور نہ وہ خود سوال کر سکتے ہیں۔ اِن کی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال کرو۔ بے شک والیوں پر یہ ذمّہ داریاں بڑی گراں ہیں۔ لیکن حق ہوتا ہی بڑا گراں ہے۔"

حضرت علی کا اپنے والی مصر کے نام یہ خط محض باتیں نہیں، جو صفحہ قرطاس پر لکھ دی گئیں بلکہ وہ نافذ ہونے والا قانون ہے۔ جو ایک صاحب اقتدارِ حاکم اپنے ایک والی کے نام جاری کرتا ہے تاکہ اسے بروئے کار لایا جائے اور اس کی مدد سے کفالت اجتماعی کے ایک بہترین نظام کی طرح پڑے۔

اس اصول کی عملی تطبیق اور معاشرتی عدل وانصاف کے قیام، نیز افراد معاشرہ کو فقر و احتیاج سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں تاریخ اسلام میں جو مشکلات پیش آتی رہی ہیں اب میں اِن سے بحث کروں گا۔

فقر و احتیاج

اس بارے میں اِس واقعہ کا ذکر کرنا کافی ہے، جو حضرت عمرؓ کو ایک عورت کے

ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ عورت زبردستی اپنے بچے کا دودھ چھڑا رہی تھی اور بچہ تھا کہ بُری طرح چیخ چلا رہا تھا۔ حضرت عمر نے اس عورت سے پُوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ اس نے جواب دیا (اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ حضرت عمر سے مخاطب ہے) کہ عمر دودھ پیتے بچے کو تو وظیفہ نہیں دیتے۔ میں اس لئے بچے کا دُودھ چھڑا رہی ہوں کہ مجھے اِس بچے کا وظیفہ ملے اس سے میں اپنی احتیاج پوری کروں۔ یہ سُن کر حضرت عمر اپنے گھر لوٹے۔ انھوں نے نماز فجر ادا کی، اور سلام پھیرنے کے بعد اپنے آپ سے کہنے لگے۔ اے عمر! تیرے لئے خرابی ہو معلوم نہیں تیرے اس حکم سے مسلمانوں کے کتنے بچے مرے ہیں۔ پھر انھوں نے منادی کرنے والے سے یہ منادی کرائی۔ اے لوگو! اپنے بچوں کا جلد دودھ نہ چھڑاؤ ہم نے ہر بچے کے لئے اس کے پیدا ہونے کے بعد سے ہی وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔

ایک عورت کا واقعہ جو اپنے بھوکے بچوں کو چولہے پر ہنڈیا رکھے جس میں کہ خالی پانی اور صِرف کنکریاں تھیں، بہلا رہی تھی کہ حضرت عمر وہاں پہنچے، تاریخ اسلام میں مشہور ہے حضرت عمر خود بیت المال سے اس کے لئے غلّہ لے کر گئے۔ خود بچوں کے لئے کھانا پکایا۔ اور جب تک وہ کھا کر سیر نہیں ہوئے۔ وہ وہاں رہے۔

بڑھاپا اور بیماری

حضرت علی نے والی مِصر کے نام جو ہدایات بھیجی تھیں۔ ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یہاں ہم حضرت عمر کی زندگی کی بعض اور مثالیں پیش کرتے ہیں۔ حضرت عمر نے ایک اندھے کو دیکھا کہ وہ راہ چلنے والوں سے بھیک مانگ رہا ہے۔ انھیں معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے۔ حضرت عمر نے اس سے پُوچھا کہ کس چیز نے اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اُس نے کہا۔ جزیہ، احتیاج اور بڑھاپے نے۔ حضرت عمر اسے اپنے گھر لے گئے اور اس کی ضرورت پوری کی اِس کے بعد حضرت عمر نے بیت المال کے خازن کو بلوایا۔ اور اُس سے کہا۔ "یہ کتنی بُری بات ہے۔ خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ہم نے اس کی جوانی سے تو فائدہ اٹھایا۔ اور بڑھاپے میں اسے ذلیل کر رہے ہیں بے شک صدقات فقرا اور مساکین

کے لئے ہیں "انما الصدقات للفقراء والمساکین"۔ اور یہ شخص مساکین اہل کتاب میں سے ہے
اسی بناء پر حضرت عمر نے بوڑھوں، بیماروں اور معذوروں سے جزیہ معاف کر دیا تھا اور
ان کے گزارے کے لئے بیت المال سے وظیفے مقرر کئے تھے۔ غرض اس بارے میں حضرت
عمر نے ایک شاندار اصول وضع کیا۔ جس کی رو سے عدل اجتماعی کا دائرہ صرف مسلمانوں
تک محدود نہ رکھا گیا۔ بلکہ اس میں تمام مسلم اہل وطن شامل تھے۔ اس کی ایک اور مثال
حضرت عمر کا وہ واقعہ ہے کہ آپ شام جاتے ہوئے ایسے لوگوں کے پاس سے گذرے، جنھیں
کوڑھ تھا، اور وہ عیسائی تھے۔ حضرت عمر نے انھیں صدقات دینے کا حکم دیا۔ اور ان کا
گذارہ مقرر کیا۔

ایک دفعہ حضرت طلحہ نے حضرت عمر کو رات کے اندھیرے میں اپنے گھر سے باہر
نکلتے دیکھا، وہ چپکے سے اُن کے پیچھے ہو لئے۔ حضرت عمر ایک مکان میں داخل ہوئے اور پھر
وہاں سے نکلے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت طلحہ اس مکان میں گئے اور وہاں ایک اندھی معذور
بڑھیا دیکھی۔ حضرت طلحہ نے اُس سے پوچھا کہ یہ کون شخص تمہارے پاس آتا ہے۔ اس
بڑھیا نے کہا کہ یہ ایک عرصہ سے میری دیکھ بھال کر رہا ہے۔ جس چیز کی مجھے ضرورت
ہوتی ہے۔ وہ لاکر دیتا ہے اور میری جو تکلیف ہوتی ہے، وہ دور کرتا ہے۔

ماہنامہ فکر و نظر جولائی ۱۹۶۵ء
ماخوذ از مقالہ استاد احمد ذکی یمانی
وزیر معدنیات، مملکت سعودی عرب

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone 4154 Regd. S. No. 2548

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad

المسوّٰی من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ——— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکۂ مکرمہ میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّٰی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں۔ قیمت:۔ ۲۰ روپے

(فارسی)

سطعات

انسان کی نفسی تکمیل و ترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعیّن فرمایا ہے اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے ذریعہ جس طرح حظیرۃ القدس سے اتصال پیدا کرتا ہے، "سطعات" میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

تصوّف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "همعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے

فی پرچہ:- پچھتر پیسے

جلد ۲ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۴ء نمبر ۴

فہرست مضامین

شذرات

ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں علمائے کرام کی ایک کافی پرانی اور اہم تنظیم ہے، جو جمیعت العلماء ہند کے نام سے مشہور ہے، اور جس سے ہمارے پاکستان کی جمیعت العلماء اسلام کے بزرگوں کا بھی روحانی و تاریخی تعلق رہا ہے، جمیعت العلماء ہند نے آزادیٔ ملک کے فوراً بعد یہ ضروری سمجھا کہ وہ پہلے کی طرح ایک سیاسی پارٹی نہ رہے۔ اور اپنی تمام سرگرمیاں صرف مسلمانان ہند کی دینی، اصلاحی، معاشرتی اور تعلیمی خدمات تک محدود کردے۔ ایک آزاد ملک میں ایک سیاسی پارٹی کا اولین مقصد اپنے مخصوص پلیٹ فارم سے انتخابات لڑنا، اور ملک کی اسمبلیوں میں اپنے نمایندے بھیجنا ہوتا ہے۔ کسی جماعت کے سیاسی نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں یا ہم خیالوں کے عام فلاح و بہبود کے کاموں سے بے تعلق ہو جائے اور ان کے دینی و دنیوی حقوق کے لئے آئینی جدوجہد نہ کرے۔

جمیعت العلماء ہند نہ صرف ان معنوں میں پہلے کی طرح ایک سیاسی پارٹی نہیں رہی، بلکہ وہ آزاد ہندوستان میں سیکولر (نامذہبی) دستور کی سب سے بڑی حامی ہے۔ اور اسے وہ لفظاً نہیں، بلکہ عملاً بھی سیکولر بنانے کا مطالبہ کرتی اور اس کے لئے بڑے زور شور سے برابر جدوجہد کر رہی ہے اور اس جدوجہد میں شاید وہ ہندوستان کی سب جماعتوں میں پیش پیش ہے۔ غرض انتخابات کی عملی سیاسیات سے بے تعلقی اور سیکولرزم کی تائید و حمایت، جمیعت العلماء ہند کے محترم سربراہوں کے لئے اسلام کے منافی نہیں، اور وہ گزشتہ ۲۱ سال سے اسی راہ پر گامزن ہیں۔

پاکستان کی طرح ہندوستان میں بھی اسلامی جماعت کی تنظیم ہے، اور اسلامی جماعت ہند کے نزدیک بھی اسلامی جماعت پاکستان کی طرح جماعت اسلامی کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا لٹریچر

جماعت اسلامی کے فکر کی مستند شرح ہے" لیکن اس کے باوجود جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا ابواللیث نے پچھلے دنوں کانگریس کے مشہور رہنما ڈاکٹر سید محمود کے سوالات کے جواب میں بتایا ہے کہ "ہم اور جماعت اسلامی ہندوستان کے دستور کو مانتے ہیں اور اس کی ان خوبیوں کے معترف ہیں، جن کا آپ نے اپنے خط میں حوالہ دیا ہے ..." اور یہ کہ "سیکولرزم کی جو تعبیر آپ نے پیش فرمائی ہے۔ اس کے ہم ہرگز مخالف نہیں ہیں، لیکن اگر اس کے معنی الحاد کے ہوں، تو ہم یقیناً اس کے مخالف ہیں۔"

ڈاکٹر سید محمود کا امیر جماعت اسلامی ہند سے سیکولرزم کے بارے میں یہ سوال تھا کہ "کیا مولانا اور جماعت اسلامی سیکولرزم کو مانتے ہیں یا نہیں" ڈاکٹر صاحب نے اپنے سوال کی تفصیل میں لکھا تھا۔ "ہندوستان کی سیکولرزم کا یہ مفہوم نہیں کہ لادینیت کو فروغ دیا جائے، بلکہ صاف مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ جیسا کہ انگلستان میں وہاں کا بادشاہ عیسائی مذہب کا محافظ اور مددگار سمجھا جاتا ہے" اس ضمن میں مولانا ابواللیث نے یہ بھی لکھا کہ "میں پورے وثوق سے دعویٰ کر سکتا ہوں کہ ہمارے لٹریچر سے کوئی ایک سطر یا ہماری گزشتہ تاریخ کی کوئی ایک مثال اس بات کے ثبوت میں پیش نہیں کی جا سکتی کہ ہم دستور یا اسٹیٹ کے غیر وفادار ہیں" (مدینہ بجنور۔ ۲۵ جولائی ۱۹۶۴ء)

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا بہت ضروری ہے۔ جہاں تک نفس سیاست کا تعلق ہے، اسے اور دین اسلام کو الگ الگ سمجھنا ایسے ہی ہے، جیسے کہ زندگی اور سیاست دو جدا جدا چیزیں سمجھی جائیں واقعہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ نہیں جو ان معنوں میں سیاست سے باہر ہو، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام دین و سیاست دونوں ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہے۔ یہاں دراصل ہمارے زیر بحث نفس سیاست نہیں، بلکہ انتخابات لڑنے والی سیاسی "پارٹی بازی" ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور غلط فہمی کا بھی ازالہ ہونا چاہیئے۔ جب ایک قوم اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہوتی ہے۔ تو ان غیر معمولی حالات میں سیاست اور سیاسی "پارٹی بازی" میں کوئی تفریق نہیں رہتی، اور قوم کی ہر جماعت، گروہ اور ہر فرد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بے دھڑک آزادی کی جنگ میں کود سے۔ اور اپنے ملک اور قوم کو آزاد کرائے۔ یہ ایک ملک و قوم کی ہنگامی صورت حال ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ سیاسی باریک بینیاں نہیں کی جاتیں، ہمارے سامنے اس وقت ایک آزاد ملک کے عام حالات ہیں۔ اور ہم انہی کے پس منظر میں سیاسی "پارٹی بازیوں" کا ذکر کر رہے ہیں۔

ایک آزاد مسلمان ملک میں جیسا کہ پاکستان ہے، علمائے کرام کا اپنی جماعتوں کے مذہبی پلیٹ فارم کو سیاسی "پارٹی بازی" کے طور پر استعمال کرنا اور اس کے ذریعہ انتخابات لڑنا اور اسمبلیوں میں جانے کی کوشش کرنا، ہمارے نزدیک مستحسن نہیں ہے اس سے دین اسلام جس کے ہمارے یہ علمائے کرام ترجمان، شارح اور محافظ ہیں، لامحالہ سیاسی "پارٹی بازی" کی سطح پر آجائے گا۔ اور جہاں "پارٹی بازی" کا معاملہ ہو، اور وہ بھی انتخابات ہیں، تو قدرتاً حریف ایک دوسرے کو زک دینے اور بدنام کرنے کے لئے کوئی حیلہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، ہمیں ڈر ہے کہ اس سے علمائے کرام کے وقار پر بھی زد پڑے گی۔ اور ان کی وجہ سے عوام کو اسلام سے جو دلی وابستگی ہے، اس میں بھی فرق آئے گا۔

خدا گواہ ہے کہ ہماری ان معروضات کا محرک خدانخواستہ علمائے کرام سے کسی قسم کا عناد نہیں، بلکہ وہ دلی عقیدت و احترام ہے۔ جو ہم اپنے دل میں ان محترم بزرگوں کے لئے شروع سے محسوس کرتے آئے ہیں۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر علمائے کرام اسمبلیوں کے لئے نمائندے منتخب کرنے والے عوام کے سامنے اپنے نقطہ ہائے نظر پیش نہیں کریں گے، تو حکومت کی پالیسیوں کو وہ جو اسلامی بنانا چاہتے ہیں، کس طرح بنا سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سوال اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، لیکن اس کا جواب علماء کرام کی سیاسی "پارٹی بازی" نہیں اور وہ اس کا تجربہ کرکے خود دیکھ بھی چکے ہیں۔ ہماری رائے میں علمائے کرام مذہبی پلیٹ فارم سے جو کافی ہمہ گیر اور موثر ہے۔ رائے عامہ کو ہم خیال بنا کر حکومت سے اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ اس طرح ان کی بات زیادہ توجہ سے بھی سنی جائے گی۔ اور عوام و حکومت دونوں میں ان کا وقار بھی بڑھے گا۔

رسالۂ دانش مندی[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سب تعریف اللہ تعالےٰ ہی کے لئے ہے، جو حکمتوں کا الہام کرنے والا اور نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور درود و سلام ہو ان سب میں افضل پر، جنہیں (اللہ تعالےٰ کی طرف سے) کتاب اور فیصلہ کن بات دی گئی۔ نیز آپؐ کی آل اور آپؐ کے صحابہ پر، جنہوں نے احکام دین کی تبلیغ و اشاعت کی اور ہمارے لئے انہیں اس طرح بیان کیا کہ اس سے یقین حاصل ہو۔ اس کے بعد فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتا ہے کہ اس خاکسار نے فن دانشمندی اپنے والد سے سیکھا۔ انہوں نے میر محمد زاہد بن قاضی اسلم سے یہ فن سیکھا۔ انہوں نے ملا محمد فاضل سے۔ انہوں نے ملا محمد یوسف قراباغی سے۔ انہوں نے مرزا جان سے۔ انہوں نے ملا محمود شیرازی سے۔ انہوں نے ملا جلال الدین دوانی سے۔ انہوں نے اپنے والد اسعد بن عبدالرحیم اور ملا مظہر الدین گازرونی سے۔ ان دونوں نے ملا سعد الدین تفتازانی اور سید شریف جرجانی سے۔ انہوں نے قطب الدین رازی سے۔ انہوں نے اور ملا سعد الدین تفتازانی دونوں نے قاضی عضد سے۔ انہوں نے ملا زین الدین سے۔ انہوں نے قاضی بیضاوی سے اور ان کی سند کا سلسلہ جو کتب تاریخ میں مشہور و معروف ہے شیخ ابوالحسن اشعری تک جاتا ہے۔

غرض فقیر نے فن دانشمندی اس سند سے اخذ کیا ہے۔ اور علم کلام اور اصول[2] بھی اس فن سے مخلوط ہیں۔ اس سند کے رجال سب کے سب اہل تصنیف اور اصحاب تحقیق ہیں اور درس و تدریس

---

[1] فن دانشمندی پر شاہ صاحب کا فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)　[2] اصول سے مراد اصول فقہ ہے۔

اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے ہیں۔ سوائے فقیر کے والد (شاہ عبدالرحیم کے) کے، جو اشغال قلبی میں مشغول رہنے کی وجہ سے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے لئے وقت نہ نکال سکے
اس فقیر کے دل میں آیا کہ فن دانشمندی کے قواعد و اصول مرتب کرے۔ اور اپنے زمانے والوں کو ان سے متعارف کرائے۔ اگر تم یہ پوچھو کہ دانشمندی سے میں کیا مراد لیتا ہوں تو دانشمندی سے میری مراد کتاب دانی ہے۔ اور اس کے تین درجے ہیں۔ اس کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ ہو، اور اس کی حقیقت بدرجہ تحقیق حاصل کی جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ استاد کتاب کو پڑھائے اور اس کی حقیقت شاگردوں کو سمجھائے۔ اور اس کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اس کتاب پر شرح یا حاشیہ لکھے اور اس کی حقیقت کے انکشاف میں مبالغہ کرے۔

اگر تم کہو کہ یہ جو میں نے فن دانشمندی کے اصول و قواعد کو مرتب کرنے کا ذکر کیا ہے، اس کا اور ان کے حفظ کرنے اور ان کی تحقیق کرنے کا کیا فائدہ ہے، تو میں یہ کہتا ہوں کہ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو اس سے طالب علم کتاب کے مطالعہ کا طریقہ جان لیتا ہے اور اس طرح اکثر حالات میں یہ مطالعہ قرین صواب ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب طالب علم کو فن دانشمندی کے بعض مقدمات جیسا کہ صرف و نحو و لغت وغیرہ ہیں، یاد ہوں گے۔ اس کے بعد وہ کسی کتاب کا مطالعہ کرے گا۔ اس کے پیش نظر اس کتاب کی شرح و تفسیر ہو گی اور شفیق استاد اسے ان قواعد کلیہ سے آگاہ کرے گا۔ اس کے بعد استاد اسے ہر مقام پر شارح نے اس سلسلے میں جو نکتہ بیان کیا ہو گا۔ اس سے مطلع کرے گا، تو اس طرح طالب علم کو کتاب مذکور سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہو جائے گا اس میں شک نہیں کہ کلیات کے احکام جاننے کے بعد جزئیات اور جزئیات سے ان جیسی جو اور چیزیں پیدا ہوتی ہیں، ان کا احاطہ زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے کہ جو شخص شعرا کے دواوین پر ممارست رکھتا ہے، وہ شعر کہنے لگتا ہے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ان بزرگوں نے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اور وہ اور ان جیسے دوسرے حضرات جو دانشمندی میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں، فنونِ دانشمندی کو علم کلام و اصول وغیرہ سے مخلوط کر دیا ہے۔ اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم ان علوم سے فنون دانشمندی کو الگ تمیز نہیں کر سکتا۔ اور ان سب کے مجموعہ کو وہ ایک ہی علم جانتا ہے چنانچہ اس زمانے کے اکثر خام طبعوں کا یہ حال ہے کہ چونکہ انہیں علم کے مختلف پہلوؤں میں انتشار نظر آتا ہے اس کی وجہ سے وہ اس کا صحیح طرح احاطہ نہیں کر سکتے اور نہ وہ فن دانشمندی پر عمل کر سکتے ہیں، کیونکہ ادھر

ان کا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔ غرض جب اس مجموعی علم سے اس کے فنون الگ اور متمیز ہونگے اور طالب علم اس قاعدے کو جان لے گا۔ اور اس طرح اس کے ذہن میں فنون دانش مندی کے بارے میں ایک امر جامع معین ہو جائے گا تو جیسے ہی وہ کسی مقام پر تھوڑی سے توجہ کرے گا، وہ اس علم کے مسائل کا الگ الگ ادراک کرے گا اور ان کے ہر پہلو پر اس کا احاطہ ہو جائے گا۔

وما ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللّٰہ (میں توحتی المقدور بس اصلاح چاہتا ہوں اور اللہ تعالےٰ ہی مجھے اس کی توفیق دینے والا ہے)

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر ایک عالم اپنے شاگردوں کو علوم کی کتابوں میں سے کوئی کتاب درایت وتحقیق کے طریقے پر پڑھانا چاہتا ہے، تو اسے لازمی طور پر پندرہ باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب کی شرح کرنا چاہتا ہے، تو لامحالہ طور سے بھی ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ وہ پندرہ باتیں یہ ہیں :۔

پہلی - پیش نظر عبارت میں جو مشکل الفاظ ہیں، ان کی نشان دہی یعنی عبارت میں جو اسماء و افعال ہیں اگر ان کی حرکات وسکنات محل اشتباہ ہیں، تو انہیں بیان کردے۔ اسی طرح حروف پر جہاں نقطے ہیں، اور جہاں کوئی نقطہ نہیں، وہ بھی بیان کرے تاکہ تصیحف خطی اور تصحیف لفظی (مثلاً ح کی خ ع کی غ، ت کی ث وغیرہ سے تمیز ہو جائے) ہر دو سے محفوظ ہو جائے۔

دوسری یہ کہ :۔ عبارت میں جو غریب وناما نوس لفظ آئے، تو اس کی شرح کرے یعنی اگر کوئی لفظ قلیل الاستعمال ہے اور شاگردوں کے لئے اس کے استعمال کا مفہوم واضح نہیں، تو عالم اس کی لغت اور اصطلاح دونوں کی رو سے تشریح کردے۔

ان پندرہ باتوں میں سے تیسری بات یہ ہے :۔ عبارت میں جو مغلق جگہ ہو، استاد اس کی وضاحت کرے۔ یعنی اگر عبارت میں کوئی مشکل ترکیب یا مشکل نحوی وصرفی صیغہ آیا ہے اور شاگردوں کے لئے اسے سمجھنا مشکل ہے، تو عالم اس کو نحو اور صرف کے مطابق حل کردے۔

چوتھی یہ کہ :۔ مسئلہ زیر بحث کو مثالیں دے کر یا اس کی مختلف صورتیں پیش کرکے سمجھائے۔ مثلاً کتاب میں ایک قاعدے کا ذکر ہے۔ اور شاگرد اسے نہیں سمجھ پاتے، تو عالم اسے واضح طور پر بیان کرے اور اس کی مثالیں دے تاکہ شاگردوں کے ذہن میں اصل مقصد آجائے۔

پانچویں بات "تقریب الدلائل" (دلیلوں کو ذہن کے قریب لانا) ہے۔ یعنی اگر کتاب

کیلئے مسئلے پر کوئی دلیل قائم کی گئی ہے، تو عالم اس کے مخفی[1] مقدمات کو اس طرح بیان کرے کہ بعض مقدمات کا بعض سے جو التزام ہے، یا بعض جو دوسروں میں مندرج ہیں، ان سے جو نتیجہ مقصود ہے وہ نکل آئے اور اس ضمن میں وہ ایسے مقدمات بدیہیہ[2] کی طرف رجوع کرے کہ جن میں شک اور شبہ بلاتامل داخل نہ ہو۔

اس سلسلے کی چھٹی بات یہ ہے کہ تعریفات کی تحقیق کرتے وقت ان کی جو قیود[3] ہوں، ان کے فوائد بیان کرے۔ اور اگر کسی تعریف کی قیود میں سے کسی قید کی کمی ہے تو اسے پورا کیا جائے۔ نیز اسناد تقسیمات[4] اور ان سے ایسی جامع و مانع حد[5] کے انتزاع[6] کا جس میں کہ کوئی چیز زائد نہ ہو، طریقہ شرح و بسط سے بیان کرے۔ ساتویں بات یہ ہے کہ قواعد کلیہ کی اس طرح وضاحت کرے کہ اس کے ذیل میں تعریف کی قیود کے فوائد، تقسیمات اور مثالوں کا نیز ان سے اس قاعدہ کلی[7] کے ایسا انتزاع کا کہ اس میں کوئی چیز زائد نہ ہو، اور وہ جامع و مانع ہو، شرح و بسط سے بیان آجائے۔

آٹھویں بات یہ ہے:- عالم تقسیمات کو حصر کرنے کی وجہ واضح کرے اور بتائے کہ یہ حصر تقسیمات استقراء[8] کی بنا پر ہے یا وہ اس کے حق میں عقلی دلیل پیش کرے کہ شئے مطلوب انہی مذکورہ اقسام میں محصور ہے اور اسی طرح عالم فصول و قواعد میں جو تقدیم و تاخیر ہو، اس کی وجہ بیان کرے۔

نویں بات ہے دو التباس رکھنے والی چیزوں میں تفریق۔ مثلاً اگر بادی النظر میں دو قسمیں مشابہ ہوں یا دو مخالف مذہب ایک دوسرے سے مشابہ دکھائی دیں، تو عالم بڑے واضح طور سے ان کے درمیان جو فرق ہے اسے بیان کرے۔

دسویں بات ہے۔ دو مختلف چیزوں میں تطبیق۔ اگر مصنف کی عبارت میں دو مختلف جگہوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، تو عالم اس اختلاف کو حل کرے، خواہ ان دونوں کا اختلاف دلالت[10] مطابقی کا ہو، یا ایک دلالت مطابقی ہو، اور دوسرا تضمنی یا التزامی۔

---

[1] قیاس دو قضیوں سے مرکب ہوتا ہے۔ اور ان سے نتیجہ نکلتا ہے۔ جیسے عالم متغیر ہے۔ یہ پہلا قضیہ ہے اور جو چیز متغیر ہو، وہ حادث ہوتی ہے، یہ دوسرا قضیہ ہے۔ اس سے لازم آیا کہ عالم حادث ہے یہ نتیجہ ہے، پہلے قضیے کو صغریٰ اور دوسرے کو کبریٰ کہتے ہیں۔ اگر پہلا قضیہ مذکور اور دوسرا متروک ہو تو یہ قضایا یا مقدمات مخفی ہوں گے۔

[2] وہ تصور یا تصدیق جس میں غور و فکر کی ضرورت نہ ہو، بدیہی ہوتا ہے۔ ذہن میں کسی چیز کا آنا تصور ہے اور تصور مع الحکم کو تصدیق کہتے ہیں۔ [3] انسان کی تعریف ہے حیوان ناطق۔ حیوان ناطق اس تعریف کی قیود ہیں۔

گیارھویں بات - یہ پہلی بات کا تکملہ ہے - ظاہر الورود شبہات کا دور کرنا ہے - جیسے کہ مثال کے طور پر تعریفات میں استدراک (کسی زائد چیز کا ذکر)، خفی تر شئے سے کسی چیز کی تعریف کرنا اور تعریف کا جامع و مانع نہ ہونا، ممنوع ہے - یا جیسے کہ دلائل میں جزئیہ[۱۰] کبری[۱۱] ممنوع ہے یا شاگردوں کو مصنف کے کلام میں بادی النظر میں مخالفت نظر آئے یا اس کا استدلال استدلال کے موقع و محل پر ٹھیک نہ بیٹھتا ہو - عالم ان ظاہر الورود شبہات کی طرف توجہ کرے اور انہیں دور کرے - بارھویں بات - جہاں حوالہ دیا گیا ہے، وہاں حوالے کا اور جہاں مصنف نے "وفیہ نظر" کہا ہے، وہاں اس سے مصنف کی کیا مراد ہے، اس کا ذکر کیا جائے اور جہاں سوال[۱۲] مقدر کی طرف اشارہ ہوتا ہو اس کی وضاحت کی جائے -

---

(بقیہ حاشیہ) ۴ تقسیمات (بسط قسمت) - مثلاً اس طرح استدلال کرنا کہ یہ چیز یوں یوں ہے، اور یوں یوں نہیں - ایک چیز کے خواص اور عدم خواص کا برابر تفصیل کرتے جانا "بسطِ قسمت" کہلاتا ہے -

۵ اپنے تمام افراد پر محیط ہونا جامع اور اپنے تمام غیر افراد کی نفی کرنا مانع ہے -

۶ دلیل یا قیاس میں تین حدیں ہوتی ہیں - اصغر - اوسط - اکبر - "عالم متغیر ہے" دلیل یا قیاس میں عالم کو حدِ اصغر کہتے ہیں، ہر متغیر حادث ہے حادث کو حدِ اکبر کہیں گے اور عالم اور حادث کو ملانے والی حدِ اوسط ہے

۷ استخراج - نتیجہ نکالنا

۸ وہ قاعدہ جو بہت سی چیزوں پر صادق آئے، کلی ہے -

۹ اس دلیل کو کہتے ہیں، جس میں جزئیات کی تحقیق کرکے ان کی ماہیت کلی پر حکم لگایا جائے -

۱۰ الفاظ کا اپنے معنی پر دلالت کرنا "دلالت" کہلاتا ہے - یہ دلالت یا تو وضعی ہوتی ہے یا غیر وضعی - لفظ کا اپنے اس معنی پر دلالت کرنا، جس کے لئے وہ وضع کیا گیا ہے، یہ دلالت وضعی ہے - اور اس کا اپنے اس معنی پر دلالت کرنا جس کے لئے وہ وضع نہیں کیا گیا - یہ دلالت غیر وضعی ہے - دلالت وضعی کی تین قسمیں ہیں - مطابقی - تضمنی اور التزامی - انسان کا حیوان ناطق پر دلالت کرنا یہ دلالت مطابقی ہے - انسان کا حیوان یا ناطق میں سے کسی ایک پر دلالت کرنا یہ دلالت تضمنی ہے - اور اگر ان دونوں سے کسی خارج چیز پر وہ دلالت کرے اور وہ خارج چیز انسان کے لئے ذہن میں لازم ہے تو اسے دلالت التزامی کہتے ہیں مثلاً انسان کا قابل العلم ہونے پر دلالت کرنا -

۱۱ قیاس اقترانی کی چار شکلیں ہوتی ہیں، شکل اول میں یہ شرط ہے کہ (باقی حاشیہ صفحہ پر)

اماں پندرہ باتوں میں سے تیرہویں بات یہ ہے کہ اگر شاگردوں کی زبان وہ نہیں، جو کتاب کی ہے، تو کتاب کی عبارت کا شاگردوں کی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔

چودھویں بات ۔ مختلف توجیہات کی تنقیح، اور ان توجیہات میں جو صحیح تر ہو، اس کا تعین مطلب یہ ہے کہ اگر کتاب کے کسی مقام کے متعلق پڑھانے والوں اور شارحوں میں اختلاف ہو۔ ایک جماعت ایک جہت سے اس کی نئی شرح کرتی ہے۔ اور دوسری جماعت دوسری جہت سے اس کی شرح کرتی ہے۔ اور اس طرح توجیہات میں نزاع پیدا ہو جاتا ہے۔ عالِم ان توجیہات کی تنقیح کرے اور ان میں سے جو بہترین ہو، اس کا تعین کرے۔ اور اسی پر مشکل الفاظ کا ضبط و نشان دہی اور مشکل ترکیبوں کا حل بھی قیاس کر لو۔

پندرھویں بات یہ ہے کہ عالِم کی تقریر سہل ہو۔ یعنی اوپر جن بارہ باتوں (صنعتوں) کا ذکر ہے، انہیں وہ واضح اور موجز و مختصر عبارت میں اس طرح بیان کرے کہ وہ ذہن سے قریب ہوں، (کم سے کم الفاظ میں مفہوم ادا کرنا کہ اس میں کوئی غیر ضروری چیز نہ آئے، ایجاز و اختصار ہے) اور ان کا اخذ کرنا آسان ہو۔ اور ان میں سے ایک بات امتزاج بھی ہے اور وہ یہ کہ استاد مصنف کی عبارت کو اپنی عبارت کے ساتھ اس طرح ملائے کہ دونوں عبارتیں مل کر باہم مربوط و ہم آہنگ ہو جائیں۔

جب ایک عالِم مذکورہ بالا پندرہ صنعتوں پر عمل کرے گا تو وہ درس و تدریس اور کتاب کی شرح و تفسیر میں کامل ہو جائے گا۔ شفیق استاد کو چاہیئے کہ اولاً۔ وہ اپنے شاگردوں کو ان امور سے اجمالی طور سے مطلع کرے۔ ثانیاً جب وہ شرح و بیان کے دوران ان امور سے گزریں، تو وہ انہیں بتائے کہ یہاں شارح کا مطلب یہ ہے، اور وہاں اس کا مطلب یہ تھا۔ ثالثاً۔ شفیق استاد شاگردوں کو بتائے کہ وہ کتاب کے مطالعہ میں ان ان امور کو پیش نظر رکھیں۔ اور ان ان میدانوں میں اپنی فکر کو جولاں کریں۔ رابعاً۔ شاگرد کے مطالعہ کا اپنے مطالعہ سے مقابلہ کرے۔

(بقیہ حاشیہ) صغریٰ موجبہ ہو اور کبریٰ کلیہ، اس شکل میں جزئیہ کلیہ آنا ممنوع ہے۔

۲۲؎ کوئی عبارت جو کسی سوال کا جواب معلوم ہوتی ہے لیکن عبارت میں سوال مذکور نہ ہو، اس سوال کو سوالِ مقدر کہتے ہیں۔

اور شاگرد سے غلطی ہو تو اسے اس طرح اس پر متنبہ کرے کہ یہ غلطی اس کے ذہن پر واضح ہو جائے اور وہ آیندہ ایسی غلطی کرنے میں احتیاط برتے۔

خامساً - استاد شاگرد کو کسی کتاب کی شرح یا اس پر حاشیہ لکھنے کو کہے۔ اور اس طرح اس کی قابلیت کا امتحان لے تاکہ تربیت کا جو حق ہے، اس کی تکمیل ہو سکے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ دانش مندی کے فن کا کتب معقول و منقول اور علوم برہانیہ[1] اور خطابیہ[2] سب پر اطلاق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کتب منقول میں زیادہ تران کی عبارتوں کی تحقیق کی ضرورت پڑتی ہے اور کتب معقول میں مسائل کی تحقیق کی۔ علوم برہانیہ میں ایک یا ایک سے زیادہ واسطوں کے مقدمات بدیہی کو بطریق برہان[3] لوٹانے کی ضرورت ہوتی ہے، اور علوم خطابیہ میں بطریق ظن — میں نے اپنے اساتذہ سے مذکورہ بالا سند کے ساتھ جو فن دانش مندی سیکھا تھا یہ اس کا خلاصہ مطلب ہے۔ اور یہ یہاں ختم ہوتا ہے۔

والحمد للہ اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً

---

[1] علوم برہانیہ، وہ علوم جن میں دلیل و برہان ہو، جیسے کہ منطق

[2] ظن کے علوم کو علوم خطابیہ کہتے ہیں۔ ان میں ظنی مقدمات پیش کر کے اپنی بات کہی جاتی ہے

[3] وہ تصدیق جو جازم و ثابت اور واقع کے مطابق ہو، یقین ہے اور وہ قیاس جو مقدمات یقینی سے مرکب ہو، برہان ہے۔ یہ مقدمات یقینی یا تو بذاتہ بدیہی ہوتے ہیں یا ان مقدمات یقینی کی طرف ایک واسطے یا ایک سے زیادہ واسطوں سے پہنچایا جاتا ہے۔

صدرِ اسلام میں مسلمانوں کے علمی مرکز

محمد سرور

دیکھنے میں آیا ہے کہ مذاہب، علوم و فنون اور ادب و شعر نے ہمیشہ شہروں میں جنم لیا اور وہیں یہ پروان چڑھے ہیں۔ یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ عہد حاضر میں بھی جدید افکار و آراء اور اصلاح و ترقی کے خیالات شہروں ہی سے اٹھتے ہیں، اسی طرح علوم و فنون کی درس گاہیں، ادبی ادارے، کتب خانے اور اخبارات و رسائل دیہات کے مقابلے میں شہروں میں زیادہ پھلتے پھولتے ہیں پھر تمام شہر ایک سے نہیں ہوتے۔ ہر ایک دوسرے سے کوئی نہ کوئی امتیازی خصوصیت ضرور رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک شہر ایک خاص علم میں ممتاز ہوتا ہے اور دوسرا دوسرے علم میں نمایاں حیثیت حاصل کرتا ہے۔ کہیں فلسفہ و حکمت کے چرچے ہوتے ہیں اور کسی جگہ شعر و ادب کی گرم بازاری نظر آتی ہے۔

صدرِ اسلام میں سرزمین حجاز میں علم حدیث کو بڑا فروغ ہوا۔ مذاہب دینیہ اور جدید افکار و آراء کا سرچشمہ عراق بنا۔ پھر عراق میں بصرے کو نحو کی اختراع کا فخر حاصل ہوا۔ مدنِ اسلامیہ کا یہ تنوع محض اتفاقات کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ اس کے پیچھے تاریخی طبعی اسباب تھے۔ اسلامی شہروں کے شہرتِ علمی میں مختلف ہونے اور علوم و فنون میں ان کی انفرادی حیثیت کے کئی ایک اسباب تھے۔

۱۔ اسلامی مدنیت کی عمارت قدیم مدنیتوں کے کھنڈرات پر قائم ہوئی تھی، اور اس کی وجہ سے ہر شہر اپنے مقامی رنگ اور ماحول کے اثرات سے متاثر ہوا۔ جب مسلمانوں نے عراق و شام فتح کیا، تو وہاں کے باشندے اپنی پرانی ذہنیت اور افکار و مزاج سے جو انہیں آباء و اجداد سے

لہ ماخوذ از فجر الاسلام مصنفہ احمد امین مصری مرحوم

داشت میں ملے تھے، یکسر خالی نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ اسلام کا اثر ان سب پر غالب آگیا۔ اور اس طرح ان کی نئی ذہنیت کی تشکیل عمل میں آئی، جو نتیجہ تھی ان کے قدیم آراء و افکار پر اسلام کے اثر و نفوذ کا۔

۲۔ صحابہ کرام اور تابعین کا اہل علم طبقہ اپنے علمی رجحانات اور ذہنی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اس فطری اختلاف کے علاوہ صحابہ کرام اسلامی مملکت کے مختلف حصوں میں جا کر بس گئے تھے۔ چنانچہ وہاں ان کے درس و تدریس اور اثر و نفوذ سے جو علمی مراکز بنے، ان پر یقیناً ان کے شخصی علمی رجحانات اور ان کے مخصوص نقطہ ہائے نظر کا پرتو پڑا۔ بعد میں آنے والے لوگ بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلے اور اس طرح ان اسلامی مراکز میں مستقل مکاتب فکر معرض وجود میں آگئے۔

۳۔ تیسرا اہم سبب سیاسی اور تاریخی حوادث تھے، جنہوں نے مختلف اسلامی شہروں کی علمی و ذہنی زندگی کو بالکل بدل دیا تھا۔ مکہ کیا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ مدینہ آپؐ کے دار الہجرت ہونے کے بعد صفحۂ تاریخ پر ایک نئی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ سیاسی انقلابات اور فتنہ و فساد کی گرم بازاری نے عراق کو نئے نئے افکار کا مرکز بنا دیا۔ اس طرح دمشق کی ذہنی زندگی کی تشکیل پر اس کے خلافت اموی کے صدر مقام ہونے نے بڑے دور رس اثرات ڈالے۔

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کے علمی و ذہنی مراکز حسب ذیل تھے:۔ سرزمین حجاز میں مکہ و مدینہ۔ عراق میں بصرہ و کوفہ، شام میں دمشق اور مصر میں فسطاط،

حجاز ـــــ خطہ حجاز سنگلاخ اور بے آب و گیاہ اور دریاؤں سے خالی ہے۔ اس کا بیشتر حصہ صحرا اور پہاڑیاں ہیں۔ گرمی اتنی شدید ہے کہ چند ایک وادیوں کے سوا سبزہ زمین سے سر نہیں نکال سکتا، باشندوں کی غالب اکثریت بادہ نشین تھی۔ یہ آس پاس کی دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ یہاں نہ تو خود تہذیب و تمدن نے کبھی خاص ترقی کی اور نہ یہاں کے باشندوں نے بیرونی دنیا سے تہذیب و تمدن مستعار لینے کی کوشش کی۔ باہر سے یہودیت و نصرانیت نے آکر کہیں کہیں اس سرزمین میں اپنے قدم جمائے۔ اور کچھ فلسفیانہ خیالات کو بھی یہاں تدریجے بار ملا۔ لیکن یہ بالکل غیر منظم صورت میں تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ اہل حجاز ایسی حکمراں قوموں کی سیادت سے محروم رہے۔ جو انہیں

تہذیب و تمدن کا سبق دیتیں، لیکن ان کی اس محرومی نے ان میں غیرت، عزت نفس، خود اعتمادی اور آزادی سے غیر معمولی شیفتگی کے جذبات پیدا کئے اور اسلام قبول کرنے کے بعد وہ مشرق و مغرب میں پھیل گئے۔

اس ظلمت کدے میں آفتاب اسلام طلوع ہوتا ہے۔ اور اس کی نورافشانیوں سے مکہ و مدینہ ہدایت و سعادت اور علم و حکمت کے مرکز بن جاتے ہیں۔

مکہ معظمہ کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظہور قدسی کا شرف حاصل ہوا۔ وہیں اللہ تعالے نے آپ کو سعادت نبوت سے سرفراز فرمایا اور وہیں سے آپ کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ قریش کو دعوت حق دینا، ان کی مخالفت و سرکشی اور آپ اور آپ کے صحابہ کو ان کا ایذائیں دینا، عہد نبوت کے یہ سارے ابتدائی واقعات اسی شہر میں ہوئے، اور یہی شریعت کا مکی حصہ مدون ہوا، جسے پوری طرح سمجھنے کے لئے مکہ کی اس دور کی تاریخ اور اس کے اجتماعی حالات کا جاننا ضروری ہے۔ مکہ معظمہ کے بعد مدینہ منورہ کو آپ کے دارالہجرت ہونے کی سعادت ملی۔ اور یہ شہر اسلامی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ اس جگہ شریعت اسلامی کا بڑا حصہ مدون ہوا۔ صدر اسلام کے اہم تاریخی واقعات کا مصدر و منبع یہی شہر تھا۔ مدینہ ہی میں رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث کا بڑا حصہ محفوظ تھا۔ اس عہد کی اسلامی تاریخ و تشریع کو صحیح طرح سمجھنے کے لئے مدینہ منورہ کے اجتماعی ماحول کا غائر مطالعہ بڑا اہم ہے۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کے انتہائی عروج کے زمانے یعنی حضرات ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں مدینہ ہی صدر حکومت رہا اور صحابہ کرام کی بھی بڑی تعداد یہیں مقیم تھی۔ ان سب بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ آپ کے ارشادات سنے تھے غزوات و مہمات میں آپ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ ظاہر ہے آپ کے انتقال کے بعد یہ لوگ آپ کے سوانح حیات طیبہ اور آپ کے ارشادات و اوامر کا سب سے زیادہ علم رکھتے ہوں اگر اس دور کی یہ سب باتیں پیش نظر ہوں، تو اس وقت مکہ و مدینہ کی جو دینی و علمی اہمیت تھی اس میں کوئی شک نہیں رہتا۔ صدر اسلام میں علوم حدیث، قرآن اور فقہ و تاریخ کے طالبوں کا مرجع و مقصود یہی دو شہر تھے۔ اور ان دونوں میں بھی آخر الذکر کو اول الذکر پر فوقیت حاصل تھی۔

بات یہ ہے کہ ایک تو ہجرت کے وقت تمام صحابہ کرام مکہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے دوسرے ہجرت کے بعد اہل مکہ میں سے جو بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتا، وہ سیدھا مدینہ کا رخ کرتا۔ اور خاص طور سے اہل مکہ میں سے ذی اثر افراد مدینہ میں سکونت کو ترجیح دیتے تھے۔ آپ کی ہجرت سے بعد کی ساری زندگی اسی شہر میں گزری تھی۔ پھر یہ اب اسلامی مملکت کا مرکز اور

صدر مقام تھا۔ اور عرب کے طول و عرض سے طالبانِ حق اسی شہر کا قصد کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مدینہ کی مرکزیت و اہمیت میں فرق نہ آیا۔ اور وہ نبوت کے بجائے خلافت کا مرکز بن گیا۔ حضرت عمرؓ اپنے عہد خلافت میں بالاثر صحابہ کو مدینہ ہی میں رکھنے پر بڑے مُصر تھے۔ پھر یہی وہ دور ہے جب مسلمانوں کو عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئیں اور مفتوحہ قوموں کے اسیرانِ جنگ مدینہ پہنچنے لگے۔ حضرت عمرؓ کا خاص حکم تھا کہ جنگوں میں جو قیدی مسلمان فوجوں کے ہاتھ لگیں، ان کو آپس میں تقسیم کرنے کے بجائے مدینہ بھیجا جائے۔ ان اسیرانِ جنگ میں ایران کے طبقہ امراء کے ممتاز افراد ہوتے تھے اور وہ اپنے ملک کے دستور کے مطابق یقیناً علوم مروجہ سے بہرہ مند بھی ہوتے ہوں گے۔ ان میں سے ایک کافی تعداد مدینہ میں بس بھی گئی تھی ابن سعد نے اپنی مشہور کتاب طبقات میں ان سے بہت سے افراد کے نام بھی گنائے ہیں۔ یہ لوگ ان اکابر صحابہ کے موالی شمار ہونے تھے، جن کے ہاتھ پر وہ اسلام لاتے تھے۔ یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ اسیرانِ جنگ میں سے جو لوگ اس طرح اسلام لاتے تھے، ان کے افکار اور نفسیات اپنے ہم مذہب عربوں سے لازماً مختلف ہوتی ہوگی۔ پھر یہ لوگ دوسروں سے ملتے جلتے بھی ہوں گے ظاہر ہے اس کا دوسرے مسلمانوں کی معاشرت پر ضرور اثر پڑتا ہوگا۔

یہ اسباب تھے، جن کی وجہ سے مدینہ منورہ مکہ معظمہ سے اپنی علمی و دینی حیثیت اور سیاسی اہمیت میں بہت بڑھ گیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ جن صحابہ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تھی شروع شروع میں وہ مدینہ چھوڑ کر واپس مکہ جانا نہایت کراہت سے دیکھتے تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے۔ محمد بن عمر کہتے ہیں کہ مہاجرین اہل بدر میں سے کوئی فرد ایسا یاد نہیں پڑتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مکہ واپس گیا ہو، سوائے ابی سبرہ کے، یہ مکہ گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان کے اس فعل کو بہت بُرا سمجھا، ان کے صاحبزادے اس واقعہ سے انکار کرتے ہیں۔ اور اس کے ذکر کو پسند نہیں کرتے"

مدینہ کی علمی شہرت کے یہی اسباب تھے۔ صدر اسلام کے اکثر علمائے تفسیر و حدیث و فقہ و تاریخ مدینہ ہی کے مکتب فکر کے فارغ التحصیل تھے۔ اس عہد میں دور دراز حصوں سے طلبہ تحصیل علم کے لئے مدینۃ النبیؐ کا قصد کرتے تھے ابن اثیر نے لکھا ہے کہ عبدالعزیز بن مروان نے اپنے بیٹے عمر بن عبدالعزیزؒ کو جو بعد میں خلیفہ ہوئے تعلیم و تربیت کے لئے مدینہ بھیجا۔ اور صالح بن کیسان کو ان کا نگران مقرر کیا۔ ایک دن عمر نے نماز میں تاخیر کی۔ صالح بن کیسان نے

باز پرس کی تو انہوں نے کہا کہ کنگھی کرنے والی میرے بالوں کو ٹھیک کر رہی تھی۔ صالح نے اس واقعہ کی اطلاع عبدالعزیز بن مروان کو دی انہوں نے ایک خاص ایلچی بھیجا۔ جس نے آتے ہی عمر بن عبدالعزیز کے بال ہی کٹوا دیئے۔ محمد بن اسحاق اور واقدی نے مدینہ میں ہی نشوونما پائی، اور وہ اسی مرکز علمی کے فارغ تھے۔ مصنفین متاخرین نے سیر مغازی کی تالیف میں ان دونوں سے جو مدد لی، وہ ظاہر ہے۔

ظاہر ہے اہل مدینہ سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کے غزوات کا علم رکھنے والا اور آپ کی حیات طیبہ کے حالات اور آپ کے جانشین خلفائے راشدین کی تاریخ سے واقف اور کون ہو سکتا تھا۔ یہ تو وہ لوگ تھے جن کے سامنے یہ سب واقعات رونما ہوئے اور ان کے عینی شاہد تھے۔

مکہ کا علمی مرکز

مکہ فتح کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو اپنا نائب مقرر کیا تاکہ وہ اہل مکہ کو دین کی تعلیم دیں حلال و حرام کے احکام سے آگاہ کریں اور لوگوں کو قرآن سمجھائیں۔ حضرت معاذ اپنے علم، صبر و تحمل اور فیاضی میں نوجوانان انصار میں خاص طور پر ممتاز تھے۔ وہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی علمی زندگی کے شاہد تھے۔ ان کا شمار حلال و حرام کے مسائل میں معرفت تامہ رکھنے والے صحابہ میں ہوتا تھا۔ نیز وہ قرآن مجید کے بہترین قاریوں میں سے تھے، اور عہد نبوت میں قرآن جمع کرنے کی سعادت ان کو نصیب ہوئی تھی۔ ابن عباس اور ابن عمر نے ان سے روایت کی ہے، حضرت معاذ کا انتقال طاعون عمواس میں ہوا تھا۔

حضرت معاذ کے بعد ابن عباس نے اپنی آخری زندگی میں مکہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سے قبل مدینہ و بصرہ ان کے علمی فیوض سے مستفید ہو چکے تھے۔ عبدالملک اور عبداللہ بن زبیر کی خانہ جنگی کے دوران وہ مکہ منتقل ہو گئے۔ اور اس جگہ اپنی علمی مسند بچھائی۔ حضرت ابن عباس حرم کعبہ میں بیٹھتے اور وہیں تفسیر، حدیث و فقہ اور ادب کا درس دیتے۔ مکہ کی علمی شہرت اور مرکزیت ان کی اور ان کے شاگردوں کی رہین منت ہے۔ اس علمی مرکز کے فارغ التحصیل علماء میں سے حسب ذیل تابعین خاص طور پر ممتاز ہوئے:۔ مجاہد بن جبیر، عطاء بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان[1]

---

[1] ذہبی نے طاؤس کا شمار یمن کے علماء و فقہاء میں کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ان کا ایام حج میں مکہ میں انتقال ہوا ابن سعد نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن ہم نے ابن القیم الجوزیہ کے حوالے سے انہیں علمائے مکہ میں گنا ہے۔

یہ تینوں بزرگ غیر عرب یعنی موالی میں سے تھے۔ مجاہد بنی مخزوم کے مولی تھے۔ حضرت ابن عباس کی تفسیر کے راوی یہی ہیں۔ مجاہد کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباس کے سامنے تین دفعہ قرآن پڑھا۔ پڑھنے کے دوران میں ہر آیت پر ٹھہرتا اور اس کے بارے میں ان سے پوچھتا کہ یہ آیت کس کے بارے میں اتری اور اس کا مطلب کیا ہے۔

عطا بن ابی رباح بنی فہر کے مولی تھے۔ ان کا رنگ سیاہ، ناک چپٹی اور بال گھونگر والے تھے وہ مکہ کے جلیل القدر فقہا اور عبادت گزاروں میں شمار ہوتے تھے، حضرت عطا مناسکِ حج کے احکام میں اعلیٰ ترین سمجھے جاتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ حرم میں بیٹھ جاتے، لوگ ان کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے، وہ لوگوں سے گفتگو کرتے، انہیں پڑھاتے اور فتوے دیتے۔

طاؤس بن کیسان یمنی تھے اور وہاں کے ابنائے فارس کی اولاد میں سے تھے انہوں نے بہت سے صحابہ سے ملاقات کی اور ان سے استفادہ کیا۔ آخر میں ابن عباس کے زمرۂ شاگردی میں منسلک ہوگئے۔ طاؤس کا شمار حضرت ابن عباس کے خاص شاگردوں میں ہوتا ہے۔ وہ ممتاز تابعین میں سے تھے اور اپنے وقت میں مکہ کے فقیہ اور مفتی مانے جاتے تھے۔

مکہ کے مرکز علمی کی سرگرمیوں کا سلسلہ نسلاً بعد نسل جاری رہا۔ اس سلسلے کی پانچویں کڑی میں سفیان بن عیینہ اور مسلم بن خالد الزنجی کی شخصیتیں خاص قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں بزرگ موالی تھے۔ امام شافعی نے، جو قریش میں سے تھے، ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ امام موصوف غزہ (فلسطین) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والدہ مکہ لے آئیں ادب و شعر میں اہل بادیہ کی شاگردی کی ان سے شعر حفظ کرتے اور لغت سیکھتے تھے۔ بعد ازاں مقدم الذکر بزرگوں سفیان بن عیینہ اور مسلم بن خالد الزنجی سے مکہ میں حدیث پڑھی۔ بیس سال کی عمر میں مدینہ منورہ گئے اور وہاں تعلیم مکمل کی۔

مدینہ کا علمی مرکز

اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ مدینہ کا علمی مرکز سب سے ممتاز تھا۔ اس کے اہل علم صحابہ میں سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ خاص طور پر مشہور ہیں لیکن اس مرکز کے سب سے ممتاز بانی جنہوں نے اپنی زندگی صرف درس و تدریس کے لئے وقف کردی، اور ان کے شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع ہوا، صرف دو ہیں۔ زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر۔ یہ دونوں بزرگ اپنے علمی مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ زید بن ثابت انصار میں سے تھے۔ بچپن ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، سریانی

اور عبرانی زبانوں کی بھی تحصیل کی، لیکن یہ معلوم نہیں کہ ان زبانوں میں انہیں کتنی دسترس تھی۔ ارباب سیر کا بیان ہے کہ انہوں نے پندرہ دن میں عبرانی اور سترہ دن میں سریانی پڑھی۔ ظاہر ہے اس قلیل مدت میں کسی زبان پر قدرت حاصل کرنا مشکل ہے کیا اس کے بعد بھی انہوں نے ان زبانوں کی تحصیل کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس بارے میں ہماری معلومات زیادہ نہیں۔ بہرحال احکام اسلام کے فہم وادراک میں زید بن ثابت کا درجہ مسلّم ہے۔

قرآن وحدیث سے استنباطِ مسائل میں انہیں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ جب ان کو کوئی مسئلہ قرآن وحدیث میں نہ ملتا تو وہ اپنی رائے، قیاس سے کام لیتے۔ زید بن ثابت کے بارے میں سلیمان بن یسار کہتے ہیں:۔ "حضرت عمر اور حضرت عثمان مقدمات کا فیصلہ کرنے، فتوے دینے اور علم الفرائض وقرأت میں زید بن ثابت پر کسی کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔" القاسم کا بیان ہے "حضرت عمر جب کبھی سفر کرتے، زید بن ثابت کو اپنا قائم مقام بناتے اور ان کے سوا وہ دوسرے لوگوں کو اور اور جگہ بھیجتے۔ حضرت عمر باہر بھیجنے کے متعلق جب کبھی اصحاب فہم وذکاء کا پوچھتے، اور ان کے سامنے زید بن ثابت کا نام لیا جاتا، تو وہ فرماتے، زید کی منزلت سے مجھے انکار نہیں لیکن اہل مدینہ کو روزمرہ کے مسائل میں زید کی ضرورت رہتی ہے۔ اور ان کے سوا کوئی دوسرا یہ کام نہیں کرسکتا۔ اس لئے میں زید کو باہر نہیں بھیجتا۔"

قبیصہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر، عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم کے زمانۂ خلافت میں مدینہ کی قضا، فتویٰ دینے اور فرائض (احکام وراثت) کے مناصب زید بن ثابت کے سپرد تھے۔ حضرت علی کے بعد امیر معاویہ نے بھی ان کو اسی خدمت پر بحال رکھا۔ یہاں تک کہ ۴۵ھ میں وہ انتقال فرما گئے۔ ابن عباس ان کی رکاب تھاما کرتے، اور کہا کرتے علماء واکابر کی توقیر یوں کی جاتی ہے۔

زید بن ثابت ریاضی کے ماہر تھے، اسی لئے علم الفرائض میں ان کا کوئی مثیل نہ تھا۔ جنگِ یرموک کا مال غنیمت ان کے ہاتھوں تقسیم کیا گیا۔ غرض زید بن ثابت بلند پایہ عالم اور فقیہہ تھے۔ اس کے ساتھ ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور مسائل ومعانی کے استنباط میں ان کو خاص ملکہ تھا۔ جو مسئلہ انہیں قرآن وحدیث میں نہیں ملتا، اس میں وہ اپنی رائے سے کام لیتے تھے۔

زید بن ثابت کی وفات پر شاعر النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام حسان بن ثابت نے مرثیہ کہا تھا، اس میں کا ایک شعر ہے۔

فمن للقوافی بعد حسان وابنہ   ومن للمعانی بعد زید بن ثابت

(حسان اور اس کے بیٹے کے بعد اشعار و قوافی کے لئے کون ہے۔ اور زید بن ثابت کے بعد معانی کے لئے کون ہے)

یہی "معانی" کا وصف، جس کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے، زید بن ثابت کا نمایاں جوہر تھا۔ اور یہی خصوصیت ان کو عبداللہ بن عمر سے ممتاز کرتی تھی۔ ابن عمر صرف عالم تھے۔ وہ حدیثیں جمع کرتے، ان کی روایت کرتے۔ انہیں قلم بند فرماتے اور فتوے دیتے تھے۔ اس ضمن میں وہ اپنی ذاتی رائے دینے سے ہمیشہ بچتے۔ اسلامی علوم کی تاریخ میں ہمیں یہ دونوں علمی رجحان۔ اجتہاد و تقلید۔ ایک طویل عرصے تک پہلو بہ پہلو سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

مدینہ کے علمی مرکز نے علمائے تابعین کی کافی بڑی تعداد پیدا کی۔ ان کے سرتاج اور سب سے مشہور سعید بن المسیب تھے۔ وہ زید بن ثابت کے تلامذہ میں سے تھے۔ سعید بن المسیب اپنے استاد کے فتوؤں کو محفوظ رکھتے تھے۔ اور ان کے قول کو دوسروں کے اقوال پر ترجیح دیتے تھے۔ عروہ بن زبیر بن عوام بھی اسی مدرسۂ فکر کے فارغ التحصیل ہیں۔ مدینہ کے اہل علم و اہل تقویٰ بزرگوں میں ان کی ممتاز حیثیت تھی۔

علمائے تابعین کے اسی گروہ سے ابن شہاب الزہری قریشی نے علم حاصل کیا۔ انہوں نے علمائے مدینہ سے فقہ و حدیث پڑھی تھی۔ زمرۂ علماء میں سے سب سے پہلے ابن شہاب الزہری ہی نے تدوین علم کی طرف توجہ کی متعدد خلفائے امیہ کے ہاں انہیں تقرب حاصل ہوا۔ خاص طور سے عبدالملک اور ہشام ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ یزید بن عبدالملک ان سے فتوے لیا کرتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انہیں کے متعلق فرمایا تھا۔ کہ پیش رو سنت کا جاننے والا الزہری سے بڑھ کر کوئی نہیں ملے گا۔

آخر میں مدینہ کے اسی مدرسۂ علم نے امام مالک بن انس ایسی زبردست شخصیت پیدا کی۔

عراق

وادیٔ دجلہ و فرات کا جنوبی حصہ عراق کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ اور پانی کی فراوانی ہے۔ اسی سبب سے اس کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے، جہاں سب سے پہلے تہذیب و تمدن کی داغ بیل پڑی۔ حضرت مسیح سے تین ہزار سال قبل مختلف متمدن قوموں نے یکے بعد دیگرے عراق کو اپنا جولان گاہ بنایا۔ اہل بابل، اشوری، کلدانی، ایرانی اور یونانی نسلوں کا اپنے اپنے وقت میں

عراق پر دورِ دورہ رہا - اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے دستور کے مطابق یہاں سلطنتوں کی بنیاد رکھی جن کی تہذیب و تمدن کی ضیا باریاں آس پاس کے ملکوں کو برابر منور کرتی رہیں -

اہل عرب قدیم سے اس سرزمین کو جانتے تھے - قبائل بکر و ربیعہ تو یہاں آباد بھی ہو گئے تھے - بعد میں ان لوگوں نے یہاں ایک ریاست بھی قائم کی، جو حیرہ کے نام سے مشہور ہے - حضرت عمر کے عہد میں عراق فتح ہوا اور یہاں بصرہ و کوفہ نئے شہروں کی بنیاد پڑی جو بسرعت بڑی ترقی کر گئے - مدائن جو ایرانی کسراؤں کا دار السلطنت تھا، اس کے خزانوں کا بڑا حصہ بصرہ و کوفہ والوں کو ملا۔ اور بابل وحیرہ کی تہذیب نے بھی ادھر کا رخ کیا - چنانچہ بنی امیہ کے دورِ حکومت میں عراقی تہذیب ان دو شہروں میں سمٹ آئی تھی - یہاں تک کہ اس زمانے میں عراق سے بصرہ و کوفہ مراد لئے جاتے تھے اور اکثر ان پر "عراقین" کا اطلاق ہوتا تھا -

جب عراق فتح ہوا تو اہل عرب نے بڑی کثیر تعداد میں ادھر کا رخ کیا - عرب اپنے ساتھ اسلام کے علاوہ اپنی قبائلی روایات و عصبیات بھی لے کر عراق پہنچے تھے - ان دو شہروں کی روزِ اول ہی سے قبیلہ وار تقسیم ہو گئی - مثال کے طور سے کوفہ کے دو حصے کئے گئے - شرقی اور غربی - شرقی حصہ یمنی قبائل نے لے لیا - اور دوسرا نزاری قبائل نے - اس بڑی تقسیم کے بعد ہر حصے کی قبیلہ وار تقسیم ہوئی - شعبی کا بیان ہے کہ کوفہ میں اہل یمن نزاریوں سے زیادہ تھے - اول الذکر بارہ ہزار تھے اور نزاری آٹھ ہزار -

اس کے علاوہ عراق میں آباد ہونے والے ان عربوں میں فاتحانہ عالی دماغی بھی تھی - جس کا اظہار اکثر و بیشتر غیر عرب موالی کے خلاف ہوتا رہتا - عراق میں اکثریت غیر عربوں کی تھی - ان میں سے جو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے انہیں موالی کہا جاتا تھا - قاعدہ یہ تھا کہ یہ موالی کسی نہ کسی عرب قبیلے کے حلیف بن جاتے اور اس طرح وہ اس قبیلے کی حمایت کے حق دار ہوتے - حلیف بننے کے بعد موالی بھی اپنے حلیف قبیلوں کی عصبیت میں ان کے ہم نوا ہو جاتے تھے - بلاذری لکھتا ہے :-

"اہل فارس کی ایک فوجی جماعت جو اساورہ کے نام سے مشہور ہے، شروع میں بنی ازد کی حلیف بنی - بعد میں انہوں نے دریافت کیا کہ بنی ازد اور بنی تمیم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام سے نسباً کون قریب ہیں - اور ان دونوں میں سے کس نے آپ کی زیادہ مدد کی - جب اس بارے میں بنی تمیم کا نام لیا گیا، تو وہ قبیلہ ازد کے بجائے اس کے حلیف ہو گئے۔" عراق کی تمام تجارت اور صنعت و حرفت انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی - حضرت عمر کے حکم کے زمینیں بھی انہی کے پاس

رہنے دی گئیں عرب صرف حکمراں تھے۔ اہل عرب جہاں بھی گئے، اپنے ساتھ اپنی قبائلی عصبیتوں کو لیتے گئے۔ جب وہ کوفہ بصرہ میں آباد ہوئے تو پہلی قبائلی عصبیتوں کے علاوہ ان میں کوفہ وبصرہ کے ہونے کی عصبیت بھی شامل ہوگئی۔ کوفہ کے عرب اوران کے موالی حلیف کوفہ کی عصبیت کا دم بھرتے اور اسی طرح بصرہ والے بصرہ کو سراہتے۔ ہر جماعت اپنے شہر کے طبعی اوصاف اور محل وقوع کی خوبیوں کو فخریہ بیان کرتی۔ اور جو جو معرکے انہوں نے سر کئے تھے، ان پر فخر کیا جاتا۔ جس کسی کے ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تشریف فرما ہوئے تھے، وہ اپنی اس سعادت پر ناز کرتا۔ اور اس پر رجزیہ اشعار کہے جاتے۔ اور تو اور علم وفضل میں بھی باہم مفاخرت اور چشمک رہتی۔ اہل بصرہ وکوفہ کی ان باہم چشمک آرائیوں کی تفصیل ہمدانی کی کتاب البلدان میں ملتی ہے۔ اپنے اپنے شہر کے اہل علم کی طرفداری اور اس سلسلے میں باہمی نوک جھونک کے مظاہر علوم کی متعدد شاخوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ علم نحو میں بصری وکوفی، فقہ میں بصری وکوفی، مذاہب دینی میں بصری وکوفی، یہاں تک کے ادب وشعر میں بصری وکوفی کی تقسیم وجود میں آگئی۔

اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے، تو جہاں تک علمی وادبی سرمائے کا تعلق ہے عراق کو اس کا حصہ وافر ملا تھا۔ لیکن بعض باتوں میں جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے، حجاز عراق پر فوقیت لے گیا تھا۔ عراق میں علمی وادبی سرمائے کی فراوانی کے کئی اسباب تھے، اسلامی عراق کی تکوین قدیم تہذیبوں کے کھنڈرات پر عمل میں آئی تھی۔ اہل عرب کے آنے سے پہلے عراق کے طول وعرض میں سریانی زبان بولنے والے پائے جاتے تھے۔ عراق میں ان کی درسگاہیں تھیں، جہاں یونانی علوم کی تعلیم ہوتی تھی۔ نیز عراق میں مسیحی فرقے تھے، جن میں آپس میں بحث وجدل کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ خاص حیرہ میں یونانی تہذیب کے حامل افراد، جو روم وایران کی جنگوں میں قیدی بنائے گئے تھے موجود تھے۔ فتح کے بعد جب اسلامی عراق کی تکوین کا عمل جاری تھا یقیناً عراق ما قبل اسلام کے یہ اثرات، خیالات اس فضا میں تھے۔ اب جو اہل عراق کی غالب تعداد اسلام میں داخل ہوئی تو اسلامی تعلیمات نے ان کے پہلے افکار وخیالات کو بتدریج اسلامی رنگ میں رنگنا شروع کیا جو خیالات اسلام کے موافق تھے۔ ان کو قدرتی طور پر فروغ ہوا۔ اور مخالف اسلام خیالات روز بروز کمزور ہوتے گئے۔

علاوہ ازیں پہلی صدی ہجری میں سلطنت اسلامیہ کے اور حصوں سے کہیں زیادہ خلافت راشدہ کے آخری زمانے اور بنی امیہ کے تمام دور حکومت میں عراق باہمی جنگ وجدل اور مسلسل فتنہ وفساد

کا میدان کارزار بنا رہا۔ سیاسی اختلافات اور ان کی بنا پر اگر خونریز جنگیں ہوں تو ان سے لوگوں کے ذہنوں میں لازماً طرح طرح کے سوالات اٹھتے ہیں۔ اور وہ ہونے والے واقعات کے حسن و قبح اور جواز و عدم جواز پر سوچ بچار کرتے ہیں۔ عراق کے اس فتنہ و فساد کے زمانے میں بھی لازماً لوگوں کے ذہنوں میں اس طرح کے سوالات اٹھتے تھے اور ان میں بحثیں ہوا کرتی تھیں چونکہ خلافت راشدہ کے اواخر اور بنی امیہ کے تمام دور حکومت میں عراق ہی ان تمام ہنگاموں کا سب سے بڑا مرکز رہا۔ اس لئے طبعاً عراقی ان بحثوں میں زیادہ پڑتے تھے۔ چنانچہ اس عہد میں یہی سرزمین تھی جہاں سب سے زیادہ مذہبی فرقہ وارانہ خیالات کو فروغ ہوا۔

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ اس دور میں علمائے وقت کے سرتاج امام حسن بصری سمجھے جاتے تھے۔ ایک دفعہ چند لوگ ان کے پاس آئے اور کہا کہ اس سرکش (حجاج) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ اس نے بے جا کشت و خون کیا۔ ظلماً لوگوں کے اموال غصب کئے۔ نماز ترک کی اور ایسا کیا، ویسا کیا .... الخ۔ ابن سعد ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ ایک شخص نے حسن بصریؒ سے پوچھا کہ آیا ہم عبدالرحمٰن[1] بن اشعث اور یزید بن مہلب کا ساتھ دیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ اِن کا ساتھ دو، نہ اُن کا اس پر اہل شام میں سے ایک شخص بولا۔ اے ابو سعید (حضرت حسن بصری کی کنیت تھی) امیرالمومنین کا بھی ساتھ نہ دیں؟ یہ کہتے ہوئے وہ شخص طیش میں آگیا۔ اور ہاتھ کو بڑے زور سے حرکت دے کر کہنے لگا۔ کہ کیا امیرالمومنین کا بھی ساتھ نہ دیں۔؟ حسن بصری فرمانے لگا۔ ہاں نہ امیرالمومنین کا ساتھ دو۔ اس قبیل کے بہت سے واقعات اس عہد کی تاریخوں میں ملتے ہیں۔

اہل عراق میں ایک تو کافی بڑی تعداد میں عرب تھے اور دوسرے غیر عرب موالی۔ عربوں کے ہاتھ میں حکومت و سیادت تھی اور موالی تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کے پیشوں پر حاوی تھے۔ موالی دینی اور دنیوی ہر دو اغراض کے لئے عربی زبان سیکھنے پر مجبور تھے، اس سلسلہ میں قدرتاً

---

[1] عبدالرحمٰن بن اشعث نے عبدالملک بن مروان کے زمانے میں حجاج بن یوسف کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور یزید بن مہلب حجاج بن یوسف کے سیاسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ حجاج کے مرنے کے بعد اس نے اموی خلیفہ یزید بن عبدالملک کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ ان دونوں بغاوتوں کی لپیٹ میں پورا عراق آگیا تھا۔ (سرور)

ن کی یہ خواہش ہوگی کہ عربی سیکھنے کا کوئی آسان طریقہ معلوم ہو۔ اوران کی یہی ضرورت علم
دکے باقاعدہ وجود میں آنے کا محرک بنی۔ اسی لئے حجاز اور شام کے بجائے عراق میں علم نحو کی
اغ بیل پڑنا زیادہ قرین قیاس نظر آتا ہے۔ اہل حجاز کی خود اپنی زبان عربی تھی، چنانچہ انہیں اس
ے سیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ باقی رہا شام، تو وہاں سے کہیں زیادہ عراق کے موالی عربی زبان سیکھنے
طرف مائل ہوئے۔ واضح رہے کہ اسلام سے پہلے عراق میں سریانی ادبیات کا بڑا چرچا تھا۔
راس زبان کے قواعد وغیرہ بھی موجود تھے۔ اب اس میں کوئی دقت نہ تھی کہ سریانی زبان کے قواعد
ے طرز پر عربی زبان کے قواعد وضع کرلئے جائیں اور خصوصاً اور جب کہ دونوں زبانیں ایک ہی اصل کی
رع تھیں۔ کوفہ سے پہلے بصرہ میں علم نحو کی بنیاد پڑی۔ اور بادیہ عرب کی قربت کی وجہ سے اہل بصرہ
فہ والوں سے سبقت لے گئے۔

غرض حجاز میں مکہ اور مدینہ دو مدارس فکر نے عروج پایا، اور عراق میں بصرہ اور کوفہ
علمی مرکز بن گئے۔

دور اموی میں عراق مستقل طور پر باہمی جنگ و جدل کا میدان بنا رہا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے
بعد حضرت عائشہؓ، طلحہؓ وزبیرؓ نے بصرہ کا رخ کیا۔ اور حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا مرکز بنایا۔ پھر کوفہ اور بصرہ کے
درمیان جنگ جمل ہوئی، حضرت حسینؓ حجاز سے کوفہ روانہ ہوئے اور کربلا میں ان کو شہید کیا گیا۔ مختار ثقفی
نے کوفہ ہی میں حضرت حسینؓ کا انتقام لینے کا نعرہ بلند کیا۔ اور عبیداللہ بن زیاد اور دوسرے قاتلین
حسینؓ مارے گئے۔ مختار عبداللہؓ بن زبیرؓ کے بھائی مصعب کے ہاتھوں قتل ہوا، پھر
عبدالملک بن مروان نے کوفہ پر چڑھائی کی، جس میں مصعب مارے گئے۔ اور عراق
پر اموی تسلط قائم ہوگیا۔ عبدالرحمٰن بن اشعث نے عبدالملک کے خلاف بغاوت کی اور
حجاج کو شکست دے کر کوفہ پر قبضہ کرلیا! اس سلسل انقلاب گردی میں لوگوں میں برابر
یہ خیالات پیدا ہوتے تھے کہ ان محاربین میں سے کون فریق عقلی پر تھا اور کون راستی پر
چونکہ عراق ان جنگوں کا جولان گاہ تھا، اس لئے طبعاً عراقی ان بحثوں میں زیادہ پڑتے تھے

شاہ ولی اللہ کی سیاستِ عملی

عمر فاروق خان - ملک پور (مانسہرہ)

حضرت شاہ ولی اللہ جس دور میں پیدا ہوئے اور جس دور میں انہوں نے وفات پائی، وہ زوال پذیر جاگیرداری سماج کا دور تھا۔ یورپ اور ایشیا دونوں میں سوائے بادشاہوں کی حکومت کے اور کسی حکومت کا اب تک تصور عام نہیں ہوا تھا۔ البتہ برطانیہ میں ایک صنعتی انقلاب کی داغ بیل پڑ چکی تھی، اور سرمایہ داری بڑی سرعت سے ترقی کر رہی تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد انقلاب فرانس ہوتا ہے، جس نے یورپ میں ایک زبردست تہلکہ ڈال دیا، اور پرانے پرانے بادشاہوں کے تخت ہل گئے۔ اسی زمانے میں امریکہ آزاد ہوتا ہے اور عہد حاضر کی پہلی جمہوریت جنم لیتی ہے

جہاں تک ایشیا کا تعلق تھا، وہاں اس قسم کی سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کے ابھی کوئی آثار نہ تھے۔ اگرچہ جاگیرداری دور کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اور جاگیرداروں اور بادشاہوں کے لئے لوگوں میں "حق نمک" کا جو روایتی احساس ہوتا تھا، وہ کمزور پڑ گیا تھا، لیکن اس کے باوجود بادشاہی اقتدار کا مصدر و منبع مانا جاتا تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے تقریباً ایک سو سال بعد ۱۸۵۷ء میں جب برصغیر میں برطانوی تسلط کے خلاف مسلمان اور ہندو دونوں اٹھے، تو ان کے فوجی قائدین کی نظریں قدرتی طور پر دہلی کے لال قلعہ کی طرف مرتکز ہو گئیں اور انہوں نے بہادر شاہ کو سربراہ اقتدار بنایا اور اس طرح اپنی "بغاوت" کے لئے ایک وجہ جواز پیدا کر لی۔ غرض ایشیا میں اس دور میں عوام کی حکومت کا تصور جیسا کہ اس وقت ہمارے ہاں ہے اور یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد اس کا شعور ابھرنا شروع ہوا تھا، نہیں تھا۔ تمام سیاسی بحثوں کا مرکز بادشاہ ہی ہوتا تھا۔ البتہ اس سلسلہ میں اچھے اور بُرے بادشاہ پر گفت گو ہوتی تھی۔

لامحالہ نظام سیاست پر بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ صاحب کو بادشاہت ہی پر

گفت گو کرنا پڑی۔ تفہیمات میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں[۱]:

"فلو فرض ان یکون ھذا الرجل فی زمان وا قتضت الاسباب
ان یکون اصلاح الناس باقامۃ الحروب ونفث فی قلبہ
اصلاحھم لقام ھذا الرجل بامر الحروب اتم قیام وکان
اماماً فی الحرب لا یقاس بالرستم والاسفندیار وغیرھما
طفیلیون علیہ مستمدون منہ مقتدون بہ۔"

ان حالات میں ضروری تھا کہ شاہ صاحب اپنے عہد کے سیاسی حالات کی اصلاح کے لئے مغل فرمانرواؤں ہی کی طرف متوجہ ہوتے۔ اور انہیں مفاسد کو ختم کرنے کی تلقین فرماتے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ برصغیر کی تاریخ کا وہ انتہائی انارکی اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ اور اس پر صحیح معنوں میں یہ عام کہاوت صادق آتی ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، ملک میں امن و امان مفقود تھا۔ باہر سے برابر حملے ہوتے تھے، اندرون ملک میں ایک گروہ دوسرے گروہ سے برسر جنگ تھا۔ لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ لوٹ مار کا ہر طرف بازار گرم تھا۔ نہ کسی کی عزت محفوظ تھی، نہ مال اور گھر، خاص طور پر ان سب سرکشوں اور غارتوں کا نشانہ مسلمان بن رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ ایک حقیقت پسند عملی آدمی کی حیثیت سے ان خطرات و خدشات کو نظر انداز نہیں کرسکتے تھے انہوں نے سیاسی نظام کے بارے میں جو کچھ سوچا اور لکھا، اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھ کر

---

[۱] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات از خلیق احمد نظامی

(ترجمہ) "فرض کیجئے اگر یہ شخص اپنے زمانے میں ہوتا اور اسباب کا اقتضا یہ ہوتا کہ لوگوں کی اصلاح جنگوں ہی سے ہوسکتی اور اس شخص کے دل میں لوگوں کی اصلاح کا خیال ڈالا جاتا، تو یہ شخص جنگ کا بہترین انتظام کرتا اور جنگ کا وہی قائد و امام بھی ہوتا۔ رستم و اسفندیار وغیرہ بھی اس کے مقابلے میں کیا تھے۔ وہ اس کے طفیلی ہوتے۔ اس سے مدد لیتے، اور اس کا اقتدا کرتے۔" ظاہر ہے اس شخص کا اشارہ شاہ صاحب کا خود اپنی طرف ہے، مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں اس طرح کی قیادت کا امکان نہیں، اور کام موجودہ قیادتوں ہی سے لینا ہوگا۔

اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ کے معاصر شیخ محمد بن عبدالوہاب نے بھی جزیرۃ العرب میں اصلاح احوال کے لئے یہی طریقہ کار اختیار کیا۔ اور اپنی دعوت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نجد کے ایک مشہور شیخ قبیلہ آل سعود کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ (مدیر)

سوچا اور لکھا۔ وہ مغلوں کے روایتی تخت کو ملک میں نئی نئی ابھرنے والی مسلم طاقتوں سے تقویت دے کر ایک تو مسلم اقتدار کی حفاظت کرنے کے خواہاں تھے، دوسرے وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح اور صرف اس طرح ملک میں امن وامان بحال ہو سکتا ہے۔ اور لوگوں کی جان آبرو اور ان کا گھر اور مال محفوظ رہ سکتا ہے۔ تفہیمات الہیہ میں بادشاہوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

الملاء الاعلیٰ ان تنصبوا فی کل ناحیۃ و فی کل مسیرۃ ثلثۃ ایام و اربعۃ ایام امیراً عادلاً یاخذ للمظلوم حقہ من الظالم ویقیم الحدود و یجتھد ان لا یحصل فیھم بغیٌ ولا قتال ولا ارتداد ولا کبیرۃ و یفشو الاسلام و تظھر شعائرہ و یاخذ بفرائضہ کل احد ویکون لامیر کل بلدٍ شوکۃ یقدر بھا علی اصلاح بلدہ ولا یکون لہ شوکۃ یتمتع بسببھا و یعصی علی السلطان وینصب علی کل اقلیم کبیراً امیراً یقلدہ القتال فقط یکون جمعہ اثنا عشر الفاً من المجاھدین لا یخافون فی لومۃ لائم یقاتلون کل باغٍ وعادٍ فاذا کان ذلک فرضاء الملاء الاعلیٰ ان یفتش جنبذٍ من النظامات المنزلیۃ والعقود ونحوہ حتی لا یکون شیءٌ الا موافق الشرع حتی یامن الناس من کل وجہ (تفہیمات ص ۲۱۶)

تو اس کے بعد ملاء اعلیٰ کی مرضی یہ ہے کہ تم اے بادشاہو! ہر علاقے اور تین دن یا چار دن کی ہر مسافت پر ایک صاحب عدل امیر کو مقرر کرو، جو ظالم سے مظلوم کا حق لے سکتا ہو۔ شرعی حدود قائم کر سکتا ہو۔ وہ اس کی کوشش کرے کہ ان کی طرف سے پھر سرکشی اور فساد پیدا نہ ہو اور ارتداد اور کبیرہ کا ارتکاب نہ کر سکیں اسلام بالکل فاش اور علانیہ ہو جائے اس کے شعائر بالکل کھلم کھلا ظاہر ہوں، اور اپنے منصبی فرائض کو ہر شخص اختیار کرے۔ چاہیئے کہ ہر شہر کے امیر کے پاس اتنی قوت و شوکت ہو، جس کے ذریعہ سے وہ اپنے شہر کی اصلاح پر قابو پا سکے، مگر اتنی شوکت وقوت اس کے پاس نہ ہو کہ اس سے خود نفع اٹھانے لگے۔ اور بادشاہِ وقت سے سرکشی کرنے لگے۔ چاہیئے کہ ہر اقلیم (صوبہ) میں ایک بڑا امیر بھی مقرر ہو، جس کے ذمے فقط جنگ کی ذمہ داری عائد کی جائے۔ چاہیئے کہ اس کی فوجی جمعیت ایسے بارہ ہزار مجاہدوں کی ہو، جو اللہ کی راہ میں کسی ملامت سے خوف زدہ نہ ہوں۔ اور ہر سرکش باغی سے جنگ کر سکتے ہوں۔ جب یہ ہو چکے، تب چاہیئے کہ منزلی نظامات اور عقود و معاملات

کی جانچ کی جائے اور اسی قسم کی دوسری باتوں کی کہ کوئی بات ایسی نہ رہے جو شریعت کے مطابق نہ ہو۔ تاکہ لوگ ہر لحاظ سے امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگیں[1]۔ (یہاں حوالہ ختم ہوتا ہے)

ظاہر ہے اس طرح کی سیاسی تنظیم صرف مغل تخت ہی کے ارد گرد ہو سکتی تھی جو اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کی شاہی روایات کا حامل تھا اور لوگوں کی اس سے ایک گونہ وفاداری بھی تھی، جیسا کہ اس دور کے واقعات بتاتے ہیں چنانچہ سادات بارہہ، ترک و ایرانی سرداروں، مرہٹوں، روہیلوں اور آخر میں انگریزوں میں سے جس نے بھی دہلی پر تسلط حاصل کیا، اس نے یہ ضروری سمجھا کہ بادشاہ وقت کے سامنے خواہ ظاہرداری ہی سے سہی، باادب کھڑا ہو، اور اس سے سند و خلعت حاصل کرے، اس عہد میں کسی امارت کو قانونی جواز صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا تھا۔

مغل تخت اب تک جن پایوں پر کھڑا تھا۔ وہ ایک ایک کرکے ہٹتے جا رہے تھے۔ اسی کی وجہ سے مسلمان صوبہ دار بھی مائل سرکشی تھے اور غیر مسلم جتنے بھی شورشیں کر رہے تھے حضرت شاہ صاحب نے ایک طرف تو ماوراے دریائے سندھ کے افغانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور دوسری طرف روہیلوں کی مدد سے اس تخت کو استحکام دینے کی کوشش کی۔ یہ اجمال کچھ تفصیل چاہتا ہے، جسے یہاں مختصراً پیش کیا جاتا ہے۔

جب محمود غزنوی اور اس کے بعد محمد غوری کے زمانے میں مسلمان افواج ہندوستان کی طرف بڑھی ہیں، تو سوائے راجپوتوں کے۔ اس سرزمین میں کوئی منظم گروہ ان کے سیلاب کو روکنے والا نہ تھا۔ بے شک راجپوت بڑے بہادر، لڑنے مرنے والے اور جان پر کھیل جانے والے تھے، لیکن ایک تو ان میں اتحاد و اتفاق نہ تھا۔ اور وہ آپس میں اس طرح بٹے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے کی شکست سے خوش ہوتے، دوسرے ان کی فوجی تنظیم اور جنگی کارکردگی حملہ آور ترک مسلمانوں کے مقابلہ میں کمتر تھی۔ غلاموں، خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں ہندوستان کی تقریباً یہی سیاسی حالت رہی، لودھی پٹھان تھے اور پٹھان نہ صرف برصغیر کے مختلف علاقوں میں کافی بڑی تعداد میں آباد تھے، بلکہ دریائے سندھ سے پار ان کے مستقل علاقے تھے جہاں ان کی غالب اکثریت تھی۔ اگرچہ پٹھانوں کی آپس کی پھوٹ اور بابر کے توپ خانہ کی وجہ سے ابراہیم لودھی جنگ پانی پت میں شکست کھا گیا۔ لیکن بابر کے بعد اس کے بیٹے ہمایوں کو پٹھانوں نے شیر شاہ سوری کے جھنڈے تلے جمع ہو کر نکال دیا۔ اور وہ ہندوستان کے فرمانروا بن گئے۔

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات - از خلیق احمد نظامی

جب اکبر کو اپنے باپ اور دادا کا تخت دوبارہ ملا، تو اسے مغل سلطنت کی بنیادی کمزوری کا احساس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ جن پٹھانوں سے اس نے تخت چھینا ہے، ان کی ہندوستان کے اندر بہت بڑی جمعیت ہے اور پھر ماورائے دریائے سندھ ان کی مستقل آبادیاں ہیں، تورانی سردار جو خاندان شاہی کی برادری کے اور اس کے دست و بازو ہیں، ان کی وفاداری مشکوک ہے۔ اور وہ کسی وقت بھی وہی سلوک اس سے کرنے سے گریز نہیں کریں گے، جس کا نشانہ اس کا باپ ہو چکا ہے۔ اس بنیادی کمزوری کی تلافی اس نے راجپوتوں اور ایرانی سرداروں کے ذریعہ کی۔ اور اس طرح وہ اکبر اعظم بنا، اور مغل سلطنت کو اتنی لمبی عمر نصیب ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ایرانی اور تورانی سرداروں کی آپس میں سخت کشمکش شروع ہو گئی، راجپوت بھی مغل فرمانرواؤں سے زیادہ خوش نہ تھے پھر ان میں وہ پہلے کا سا دم خم بھی نہ رہا تھا۔ راجپوتوں کے بجائے اب ہندوؤں میں سے مرہٹے، جاٹ اور سکھ منظم ہو کر آگے آ گئے تھے اور ان کی تحریکیں نریاں مغل سلطنت کے خلاف زور پکڑ رہی تھیں۔ ان حالات میں شاہ ولی اللہ صاحب نے سوچا، اور اس وقت ان کا ایسا سوچنا بالکل فطری تھا کہ ماورائے دریائے سندھ کے افغانوں[1] اور موجودہ شمالی یوپی میں آباد روہیلوں کی ابھرتی ہوئی نئی طاقت سے مدد لے کر مغلوں کے روایتی تخت و تاج کو مضبوط کیا جائے۔

احمد شاہ ابدالی کا عروج ایک لحاظ سے افغان قوم کا عروج تھا۔ شروع میں وہ نادر شاہ کے سامنے بطور ایک جنگی قیدی کے پیش ہوا، نادر شاہ نے اسے اپنا مقرب بنا لیا، اور جب نادر شاہ ایرانی سرداروں کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کے افغان دستوں نے اسے بادشاہ چن لیا۔" احمد شاہ بعض اعتبار سے اپنے عہد کے نہایت ہی ممتاز حکمرانوں میں سے تھا۔ اس کی صلاحیت جہانبانی، تدبر، عسکری لیاقت کا اعتراف اس کے مخالفین تک نے کیا ہے۔ اس نے اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائی اور افغان علاقے کو جو اس وقت چھوٹی چھوٹی منتشر ریاستوں پر مشتمل تھا۔ ایک مضبوط سیاسی سانچے میں ڈھال کر افغانستان کی شکل دی[2]

---

[1] موجودہ افغانستان تاریخ میں شروع ہی سے برصغیر کا ایک حصہ رہا ہے، اور نادر شاہ کے حملے تک تو کابل کا صوبہ مغل سلطنت کے ہی ماتحت تھا۔ شاہ صاحب کا ماورائے دریائے سندھ کے افغانوں کو حلیف بنانے کا یہ اقدام ایک غیر ملکی طاقت سے استمداد سمجھنا غلطی ہے۔ پھر اس زمانے میں "ملک و قوم" کے یہ تصورات ہی نہ تھے، جن کی بنا پر آج اس زمانے کے واقعات پر فتوے دیئے جا رہے ہیں۔ (مدیر) [2] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ۔ از خلیق احمد نظامی

خلیق احمد نظامی آگے لکھتے ہیں[۱]:۔ " احمد شاہ مذہبی رجحانات کا آدمی تھا۔ علماء ومشائخ کا ہجوم اس کے گرد رہتا تھا۔ پشاور، لاہور اور پٹیالہ کے مشائخ کی خدمت میں وہ اکثر حاضر ہوا ہے ...... ہر جمعرات کی شب میں وہ علماء ومشائخ کو کھانے پر بلاتا تھا۔ اور مذہبی معاملات پر گفت گو کرتا تھا وہ خود نہایت پابند شرع سُنی تھا۔ ان تمام مذہبی دلچسپیوں کے باوجود انتہائی غیر متعصب اور وسیع النظر تھا۔ اس کے ملک میں شیعہ، ہندو، عیسائی سب پوری مذہبی آزادی کے ساتھ رہتے تھے۔ افغانستان کی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ایران کے شمالی علاقے سے نادر شاہ نے عیسائیوں کو بلاکر کابل میں بسا دیا تھا۔ ہندو اور عیسائی دونوں اطمینان کے ساتھ افغانستان میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کی تصدیق ۱۷۸۳ء میں جارج فوسٹر نے کی تھی۔

احمد شاہ کے متعلق ایک اور انگریز مصنف فیریر لکھتا ہے۔ " مشرقی ممالک کی بہت سی خرابیوں سے احمد شاہ مبرا تھا۔ شراب نوشی، افیون وغیرہ سے اجتناب کلی کرتا تھا۔ لالچ اور منافقانہ حرکتوں سے پاک تھا۔ مذہب کا سختی پابند تھا۔ اس کی سادہ لیکن باوقار عادتیں اس کو ہر دلعزیز بنا دیتی تھیں۔ اس تک پہنچنا آسان تھا۔ وہ انصاف کا خاص خیال رکھتا تھا۔ کبھی کسی نے اس کے فیصلے کی شکایت نہیں کی[۲]۔

احمد شاہ کے انہی ذاتی اوصاف اور اس کی غیر معمولی سیاسی وجنگی صلاحیتوں کی وجہ سے شاہ ولی اللہ صاحب نے اس سے مرہٹوں کی قوت کے استیصال کے لئے مدد چاہی، جس کے نتیجے میں تیسری جنگ پانی پت ہوئی۔ اور جہاں تک شمالی ہندوستان کا تعلق ہے مرہٹوں کی طاقت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی[۳]۔

۱؎　شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات

۲؎　" 　" 　" 　" 　"

۳؎　شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات مرتبہ خلیق احمد نظامی میں ایک طویل خط احمد شاہ ابدالی کے نام ہے جس میں بڑی تفصیل سے ہندوستان کے اس وقت کے حالات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔ دریں زمانہ باد شاہے کہ صاحب اقتدار وشوکت باشد وقادر بہ شکستِ لشکر کفار ودور اندیش، جنگ آزما، جز آں ذات آنحضرت موجود نیست لاجرم بر آں حضرت فرض عین است قصدِ ہندوستان کردن وتسلط کفار مرہٹہ برہم زدن وضعفائے مسلمین را کہ در دستِ کفار اسیر اند، خلاص فرمودہ

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی تصنیف "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے خواب میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کو دیکھا، اور آپ نے انہیں پشتو زبان سیکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے نیچے حاشیے میں یوں مرقوم ہے۔ "اس کی روح یہ ہے ان کو پشتونوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اس سے پہلے شاہ ولی اللہ اپنی کتاب خیر کثیر میں صفحہ ۱۱۳ میں لکھ چکے ہیں کہ حکومت چلانے کی استعداد مسلمانان ہند سے افاغنہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے اس سے ان کی مراد جنگی طاقت ہے۔ جس قوم سے لڑنے مرنے کی طاقت سلب کر لی گئی ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔"

شاہ ولی اللہ نے ایک طرف تو افغانوں کی اس نئی طاقت کو مغلوں کے روایتی تخت و تاج کا حلیف بنانا چاہا، اور اسی سلسلے میں دوسری طرف ان کا ہاتھ مدد کے لئے روہیلوں کی طرف بڑھا۔ روہیلوں کا سردار اس وقت نجیب الدولہ تھا۔ خلیق احمد نظامی کے مرتبہ "سیاسی مکتوبات" میں نجیب الدولہ کے نام کئی خط ہیں۔ اسے شاہ صاحب امیر المجاہدین امیر الغزاۃ، رئیس المجاہدین اور منبع الحسنات جیسے باعزت القاب سے خطاب فرماتے ہیں۔ "نجیب الدولہ پشاور سے ۲۵ کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں منری میں پیدا ہوا تھا۔ تلاش معاش میں وہ آپ کے علاقے میں آگیا۔ اللہ نے اسے بے پناہ صلاحیتیں دی تھیں .... ۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۰ء تک وہ دہلی کی سب سے بڑی شخصیت تھا۔ تمام سیاست اس کے گرد گھومتی تھی..... سر جدونا تھ سرکار نے لکھا ہے۔ "ایک مورخ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی کس خوبی کی سب سے زیادہ تعریف کرے۔ میدان جنگ میں اس کی حیرت انگیز قیادت کی، یا مشکلات میں اس کی تیز نگاہی اور صحیح رائے کی، یا اس کی اس فطری صلاحیت کی، جو اس کو انتشار اور ابتری میں ایسی راہ دکھا دیتی تھی جس سے نتیجہ اس کے موافق نکل آتا تھا۔" نجیب الدولہ انتہائی قومی درد اور مذہبی جذبہ رکھنے والا انسان تھا ... اس نے مغلیہ سلطنت کو بچانے کے لئے وہی سب کچھ کیا، جو سلجوقیوں نے خلفائے عباس کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے کیا تھا۔[1]

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات

نجیب الدولہ بڑا مذہبی اور علم دوست ہونے کے باوجود نہایت غیر متعصب تھا۔ اس بارے میں جدوناتھ سرکار لکھتا ہے :۔ نجیب الدولہ نے ۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء کو انتقال کیا۔ اس کی عدل گستری اور بالغ نظری کا یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا کہ وہ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا، تو اس نے اپنی فوجوں کو (جو اس کے ساتھ بالپوڑ کے مقام پر تھیں اور گڑھ کا میلہ ہو رہا تھا) حکم دیا کہ گنگا کے میلے پر آنے جانے والے ہندو یاتریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے [۱]

شاہ صاحب ایک خط میں نجیب الدولہ کو لکھتے ہیں :۔ "پردۂ غیب میں مرہٹہ اور جٹ کا استیصال مقرر ہو گیا ہے ۔ بس وقت پر موقوف ہے، جونہی کہ اللہ کے بندے کمر ہمت باندھیں گے، طلسم باطل ٹوٹ جائیگا۔ ایک بات اور کہنی ہے وہ یہ کہ جب افواج شاہیہ کا گزر دہلی میں واقع ہوا تو اس وقت اہتمام کلی کرنا چاہیئے کہ دہلی سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے ۔ دہلی والے کئی مرتبہ اپنے مالوں کی لوٹ اور اپنی عزت کی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، اسی وجہ سے کارہائے مطلوبہ کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہے۔"

اسی خط میں تاکید فرمائی ہے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں، ہرگز تعرض نہ کرے۔"

ایک اور خط جو شاید محاربۂ پانی پت سے بعد کا ہے ۔ اس میں شاہ صاحب نجیب الدولہ کو جاٹوں سے لڑنے کی یوں تاکید فرماتے ہیں :۔ "میرے عزیز جاٹوں پر فتح غیب الغیب میں مقرر ہو چکی ہے ۔ اس بارے میں کوئی اندیشہ دل میں نہیں ہونا چاہیئے ۔ انشاء اللہ مرہٹوں کی طرح جونہی کہ مقابلہ ہوگا، یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت [۲] جاٹوں کے ساتھ ہے، تو اس کا کوئی خیال نہ فرمائیں ۔ مجھے امید ہے کہ بجز اس کے ظاہر میں دشمنوں کی کثرت نظر آئے، اور کوئی تشویش پیش نہ آئے گی ...... اگر بعض ایسے مسلمان جن کی اعلائے دین محمدی کے سلسلے میں نیت کمزور ہے ایسے چوڑے خطرے سامنے لاکر پیش کریں، تو ان کی بات نہ سننی چاہیئے ۔"

ایک اور خط کا متن یہ ہے، :۔ اللہ تعالیٰ آں راس المجاہدین، رئیس الغزاۃ، امیر الامراء

---

[۱] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات مرتبہ خلیق احمد نظامی

[۲] اودھ کے صفدر جنگ نے جاٹوں سے ساز باز کر لیا تھا۔

کو سند عزت پر برقرار رکھ کر طرح طرح کی بھلائیاں ظہور میں لائے۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت التزام کے واضح ہو کہ۔ جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس دور میں تائید ملت اسلامیہ وامت مرحومہ آپ (جو کہ مصدر خیر ہیں) کے پردے میں ظہور کر رہی ہے۔ کسی طرح کا وسوسہ قلب گرامی میں نہ آنے پائے تمام کام انشاءاللہ تعالیٰ دوستوں کی مراد کے مطابق ہوں گے۔ اور تمام دشمن غلبۂ قہر الٰہی سے پامال ہو جائیں گے۔"[1]

روہیلے اس عہد کی ایک بڑی طاقت تھے۔ اور پورا روہیل کھنڈ ان کا مستقل مستقر و وطن تھا۔ ایک وقت میں تو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ان کے سردار نجیب الدولہ مغلوں کے تخت دہلی کے محافظ و منصرم بن گئے تھے۔ غرض اس دور میں روہیلے اسی طرح کی ایک "صاحب وطن" اور "صاحب زمین" عوامی طاقت تھے، جیسے کہ مرہٹے، جاٹ اور سکھ تھے[2]۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ان سے توقعات قائم کرنا اس زمانے کے لحاظ سے بالکل بجا تھا۔ روہیلے ایک کثیر التعداد قوم[3] تھی، وہ بہادر اور جنگ جو تھے، پھر ان میں مذہبی حمیت بہت زیادہ تھی۔ اور بوقت ضرورت ماورائے دریائے سندھ سے ان کو مزید کمک بھی مل سکتی تھی[4]۔ لیکن بد قسمتی سے نجیب الدولہ کے بعد ان میں کوئی مرکزی قیادت نہ رہی اور وہ خود آپس میں لڑنے لگے۔ پھر اودھ کے شجاع الدولہ اور انگریزوں کی متحدہ یورش نے روہیلوں کا زور توڑ دیا، اور وہ بطور ایک قومی

---

[1] یہ سب اقتباسات خلیق احمد نظامی صاحب کے مرتبہ "مکتوبات سیاسی" کے اردو ترجمے سے ہیں۔

[2] روہیلوں کی اجتماعی طاقت ختم ہونے پر ان کے بچے کچھے افراد کی بدولت رامپور، ٹونک بھوپال اور جاورہ کی ریاستیں وجود میں آئی تھیں۔

[3] علامہ محسن البہاری "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں:- (ترجمہ) جب احمد شاہ ابدالی کا تسلط دہلی پر ہو گیا اور دہلی کی گلیوں میں بکثرت ان کی قوم کے لوگ بھر گئے۔ اور یہ لوگ قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ تعداد میں تھے (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی)

[4] مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:- جب ہلکر نے انگریزوں سے سمجھوتہ کر لیا تو امیر خاں نے اس صلح نامہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں کابل جا کر شاہ شجاع کو ساتھ لاؤں گا وہ نہ آئے گا تو اپنے ہم قوموں کا لشکر بھرتی کروں گا۔ اور انگریزوں سے لڑوں گا۔"

(سید احمد شہید)

جمعیت کے سیاسی لحاظ سے اسی طرح ختم ہو گئے، جیسے مرہٹے اور سکھ۔ اگر روہیلوں کی جمعیت قائم رہتی۔ اور نجیب الدولہ جیسی قیادت کا سلسلہ اور آگے چلتا، تو شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ علمی کے سیاسی افکار کی نشو و نما کو بے شک ایک موزوں زمین، بڑی سازگار آب و ہوا اور ایک صاحب صلاحیت قوم مل جاتی۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خواب شدہ است۔

شاہ ولی اللہ کے بعد اسی سلسلے کے ایک نامور بزرگ حضرت سید احمد شہید نے بھی ایک اور روہیلے سردار امیر خاں سے اسی قسم کی توقع قائم کی تھی۔ چنانچہ وہ "یہ نصب العین لے کر امیر خاں کے پاس گئے تھے کہ اس عظیم الشان آزاد قوت کو صحیح راستوں پر لگائیں۔ اس سے آزادیٔ وطن اور احیائے اعلام کا کام لیں[1]"۔ لیکن یہ مراد بھی بر نہ آسکی، نواب امیر خاں کو بھی انگریزوں سے مفاہمت کرنی پڑی۔

احمد شاہ ابدالی کے بعد اس کے جانشین کسی قابل نہ ہوئے اور وہ آپس میں لڑتے رہے یہی حال روہیلوں کا تھا۔ اور ان سب کو مقابلہ کرنا پڑا آخر میں ایک ایسی قوم سے، جس کا سیاسی سماجی نظام ان کے سیاسی و سماجی نظام سے بہتر تھا۔ اس میں بالکل ایک نئی قسم کی تنظیم تھی۔ اس کے اسلحہ اور طریقۂ جنگ ان سے اعلیٰ تھا۔ اور پھر یہ کہ اس میں باہم پھوٹ پڑنے، اس کے سرداروں کے باہم لڑ جانے یا ان کے ہئیت حاکمہ کے خلاف ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ افغان اور روہیلے اپنی تمام بہادری، جوش ایمانی اور جرأت و حمیت کے ایک زوال پذیر جاگیرداری دور کے نمائندے تھے، جسے آخر کار مٹنا ہی تھا۔ اور یہ قوم نئی قوتوں سے بھرپور ایک ترقی خواہ اور قدم آگے بڑھانے والے ایک صنعتی نظام کی کل پرزہ تھی جو یورپ سے نکل کر ساری دنیا پر چھا جانے والا تھا۔

---

[1] سید احمد شہید از مولانا غلام رسول مہر۔ اسی کتاب میں ہے۔ "ایک انگریز مورخ نے خود نواب کے بیان کی بنا پر لکھا ہے کہ ۱۸۱۴ء میں اس کے پاس پچاس ہزار سوار، بارہ ہزار پیادے اور بھاری توپ خانہ تھا (تاریخ ہندوستان مصنفہ مل و دالس جلد ہشتم ص۹۲۳) ایک اور مصنف نے لکھا ہے۔ امیر خاں ایک قابل قائد اور بہادر سپاہی تھا۔ اس کی فوج نہایت اسلح تھی۔ اور ہندوستان کی تمام ریاستی فوجوں میں سے بہترین ساز و سامان والی فوج سمجھی جاتی تھی۔
(لارڈ ہیسٹنگز اور ہندوستانی ریاستیں مصنفہ موہن سنہا مہتہ ص۱۱)

یہ سب کچھ صحیح، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے میں مسلمان جن سنگین حالات میں گھرے ہوئے تھے اور ان کے سامنے زندگی اور موت کا سوال جس طرح کی نازک صورت اختیار کر چکا تھا، اس میں خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں "شاہ صاحب کی بالغ نظری، سیاسی بصیرت اور حقائق شناسی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے وہ ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جن کو بیسویں صدی کا ایک مشہور مورخ (سر جدو ناتھ سرکار) اٹھارویں صدی کی سب سے زیادہ قابل شخصیتیں سمجھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی سیاست عملی، یہ تو ایک باب ہوا، آئندہ ان کی سیاست نظری پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

اسلامی تاریخ کے پہلے ہزار سال میں ترقی کے کئی راستے تھے۔ اور امام ولی اللہ کے بزرگ بھی ان طرق میں سے ایک طریقے پر عامل تھے۔ دوسرے ہزار سال (الف ثانی) میں جس کی ابتدا ہندوستان میں اکبر کی حکومت سے ہوئی اور امام ربانی مجدد الف ثانی اس تجدید کا اساس رکھنے والے تھے، اس تجدید کی تکمیل کرنے والے امام ولی اللہ دہلوی ہیں۔ اور اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ جل و علیٰ نے صرف ان کو منتخب فرمایا۔

امام ولی اللہ کے سیاسی فکر اور ان کی بتائی ہوئی راہ عمل کی اصابت اور ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ سلطان محی الدین احمد اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد جب اسلامی سلطنت میں زوال شروع ہوا۔ اور اس ملک پر یورپی طاقتوں کے غلبہ کی ابتدا ہوئی۔ تو عین اس وقت شاہ صاحب اپنی سیاسی تحریک کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ اس نئے سیاسی نظام کی ضرورت بھی بتاتے ہیں۔ اور اس کے لئے سائنٹفک یعنی حکیمانہ اساس بھی وضع کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب ہمارے ملک کی سیاسی زندگی کا رشتہ کہیں ٹوٹنے نہیں دیتے۔ اور وہ ایک آزاد ہندوستانی حکومت کی شکست کے ساتھ ہی دوسرے سیاسی نظام کا نعم البدل پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ پہلے تو یورپ کی سیاست کو سمجھو پھر امام ولی اللہ کی حکمت کا عمیق مطالعہ کرو۔ اس طرح تم ایک طرف یورپ کو جان لوگے اور دوسری طرف ہندوستان کی سیاست کو سمجھ جاؤ گے۔ (ماخوذ از خطبہ مولانا سندھیؒ۔ یہ خطبہ جمعیت الطلبہ سندھ کے اجلاس منعقدہ حیدرآباد ۱۷ اپریل ۱۹۴۳ء میں مولانا مرحوم نے دیا تھا۔)

تصوف - تاریخ، توحید اور سلوک[1]

شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ

صوفیاء کے مختلف دور رہے۔ پہلا وہ دور تھا جو ابتدائے عہد اسلام سے ایک صدی تک رہا اس دور میں تصوف نے کوئی خاص نام اختیار نہیں کیا بلکہ ایک جماعت عباد و زہاد کی اصحاب صفہ کی طرح علیحدہ ہوگئی جس نے عبادات مجاہدے اور ہمہ تن خدا کی جانب متوجہ رہنا اپنا شیوہ اختیار کر لیا۔

---

[1] شاہ محمد حسین الہ آبادی متوفی ۱۳۲۲ھ آپ سلسلہ صابریہ چشتیہ کے بزرگ شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ شیخ موصوف کو شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف پر بڑا عبور تھا۔ اور آپ نے فصوص الحکم کی کئی شرحیں لکھی تھیں۔ شاہ جہاں اور دارا شکوہ ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ دارا شکوہ نے اپنے زمانہ قیام الہ آباد میں ان سے استفادہ بھی کیا تھا۔ البتہ اورنگ زیب عالمگیر کی ان کے متعلق اچھی رائے نہ تھی۔ اور اس نے ان کے رسالہ تسویہ کو جلا دینے کا حکم دیا تھا۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی اپنے ایک خط میں دارا شکوہ کو لکھتے ہیں۔

• فقیر کیا و نصیحت کیا۔ حق آنست کہ اندیشہ رفاہیت خلق خدا دامن گیر خاطر حکام باشد۔ چہ مومن و چہ کافر کہ خلق خدا پیدائش خدا است "

شاہ محمد حسینؒ الہ آبادی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ آپ نے دار العلوم ندوہ کی تحریک میں بھی بڑا سرگرم حصہ لیا، اور اس تحریک کے آپ اولیں داعیوں میں سے تھے۔ ۱۳۲۲ھ میں اجمیر شریف میں سماع سنتے آپ کا انتقال ہوا۔

(مدیر)

انکا تعلق بالکل عمل تھا جو علمی بحثوں سے بالکل پاک تھا اس زمانہ تک نہ اس فن کا نام تصوف ہوا تھا نہ ان کے اختیار کرنے والوں کو صوفیا کہتے تھے۔ یہ حضرات ریاضاتِ نفس اور مجاہدات کے خوگر اور زہد، علم، صدق اور دیگر محاسن اخلاق سے اپنے کو متصف کرنا مقصد تصوف قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ تمام برے اخلاق کا ترک کرنا اور اچھے اخلاق کا اختیار کرنا تصوف ہے۔
حضرت ثوری سے صوفیا کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ دوسروں کے لئے اسباب راحت مہیا کرنا اور ان کی ایذا دہی سے گریز کرنا۔ حضرت حسن بصری، فضیل بن عیاض عبد الواحد بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسی دور کے حضرات ہیں۔

اس دور کے بعد دوسری صدی میں اس فرقہ نے صوفیا کا لقب اختیار کیا۔ سب سے پہلے ابوہاشم کو صوفی کا لقب ملا جن کو حضرت سفیان ثوری نے یہ خطاب دیا اور ارشاد فرمایا کہ اگر ابوہاشم صوفی نہ پیدا ہوتے تو ریا کے دقائق میرے سمجھ میں نہ آتے۔ اس دور میں تصوف نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے کافی ترقی کی۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں مجاہدہ کے خاص خاص طریقے پیدا ہوئے جس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں میں جاہ طلبی اور تعیش بہت زیادہ پیدا ہوگیا اور قرونِ اولیٰ کے مخصوص صفات حسنہ مثلاً موٹے کپڑے پہننا، فقر و فاقہ کرنا ایثار و قربانیاں صرف خدا کے لئے کرنا، یہ ایک حد تک مفقود ہوگیا تھا۔ جہاد میں وہ ولولہ جو صرف اعلاء کلمۃ اللہ کی غرض سے قلوب میں موجزن تھا، اب مالِ غنیمت کی محبت اور ملک گیری کی تمنا کی صورت میں نمایاں ہوگیا تھا۔ خدا اور رسول سے زیادہ مال و دولت کی محبت مسلمانوں کے دل میں پیدا ہوگئی تھی جس کا نتیجہ سیاسی اور اخلاقی انحطاط کی صورت میں ظاہر ہورہا تھا۔ لوگ عام طور پر صرف ظاہری احکام کے پابند رہ گئے تھے اور ان میں کثرت سے حیلے اور بہانے صرف حکومت کے قانون سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایجاد کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا حضرت معاویہؓ کو صرف اچھے عبا پر تنبیہ کرنا یہ اس بات کی بدیہی شہادت ہے کہ اسی زمانہ سے تن آسانی اور تعیش تیزی سے بڑھ رہا تھا، جس نے بعد کو خلفاء امراء اور اغنیاء کے درباروں کی صورت اختیار کرلی۔ جہاں ارباب علم فصحا اور بلغاء کو کثرت سے انعامات دیئے جاتے تھے علماء کے گھر زیب و زینت، راحت اور تن آسانی کے اسباب سے مزین رہتے تھے۔ یہ حضرات ہزاروں دینار و دراہم کے مالک ہوتے۔

ان تمام باتوں نے پوری ملت مسلمہ کو راحت طلب بنا دیا اور صحابہ کی سی جفاکشی ختم ہوگئی

اس وقت اس کی سخت ضرورت پیش آئی کہ انہیں سادہ زندگی فقروفاقہ اور مسکنت کی جانب مائل کیا جائے۔ جس کے لئے صوفیہ نے اپنے فن کو زیادہ ترتیب کے ساتھ مدون کیا اور اس فن کے دو حصے کر دیئے علمی اور عملی۔

عملی میں فقر، روزے رکھنا، کثرت سے نوافل پڑھنا، انسانی کمزوریوں کو رفع کرنے کے لئے نفس کو طرح طرح کی شقتوں میں مبتلا کرنا وغیرہ وغیرہ، اس قسم کی تعلیم کے اس زمانہ میں سخت ضرورت تھی اور بلا اس طرح کی تعلیم کے اعتدال نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔

ان کے علاوہ جو سیاسی حالات اس زمانہ میں ہو گئے تھے، ان کا مقتضا یہ تھا کہ مسلمانوں کے تعمیری کام کرنے کے لئے ایک جماعت اپنے کو حکومت کے اعزازوں سے علیحدہ کر کے صرف مسلمانوں

. . . .

. . . . . کی اخلاقی تربیت میں مشغول ہو جائے۔ اور وہ جماعت صوفیہ کے علاوہ کوئی نہ تھی۔ اگرچہ صوفیہ میں بھی کثرت سے ایسے لوگ شامل ہو گئے تھے جنہوں نے "دلق و سجادہ" کو اپنے مکر و فریب چھپانے کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ حالانکہ ان کو صوفیہ سے تعلق نہ تھا بلکہ ان میں سے اکثر ان فرقوں سے تعلق رکھتے تھے جو مسلمانوں کے دینی انتشار کی وجہ سے ممالک اسلامیہ میں پھیل گئے تھے۔ انہیں فرقوں نے صوفیہ میں انتشار پیدا کر کے اور ان کے اصول کو خبط کر کے ایک کثیر جماعت ان کے مخالفین کی عالم اسلامی میں بنا دی مگر پھر بھی اکثریت انہیں اچھی نگاہ سے دیکھتی رہی۔ چنانچہ انہیں صوفیہ کی جماعت کے لئے مختلف خانقاہیں ارباب ثروت نے بنائیں اور ان پر بڑے بڑے اوقاف کئے عوام بھی ان سے ہدایت و ارشاد کے سبق برابر حاصل کرتے تھے۔

علمی دور اس دور میں ارباب تصوف نے تصانیف کا سلسلہ شروع کیا۔ ابو طالب مکی۔ ابو نعیم اصفہانی۔ ابو القاسم قشیری۔ امام غزالی وغیرہ نے اخلاقیات کے اس حصہ کو جو قرآن و حدیث میں مذکور تھا، مگر دوسرے نصوص کے ساتھ ملا ہوا تھا، علیحدہ کر کے ہدایت و ارشاد کو مختلف فن کی صورت عطا کر دی۔ یہ ضرور ہے کہ ان حضرات نے جو اصطلاحات ایجاد کئے ان پر بدعت ہونے کے الزامات لگائے گئے جو ان حضرات کے لئے ناگزیر تھے جن میں خاص مذہبی غلو پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ چیز بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی کہ حضرات صوفیا کی تصانیف میں بعض ضعیف احادیث بھی صرف تحریض علی العمل کی غرض سے ذکر کر دی گئیں اگرچہ ضعیف احادیث سے محدثین کی بھی کم کتابیں خالی ہیں۔ بہر حال قرون اولیٰ ہی سے اس جماعت نے مستقل حیثیت اختیار کرنی شروع

اور آخر میں اس نے اپنی عملی اور علمی کارناموں کے اعتبار سے جو امتیازی شخصیت حاصل کی وہ اسلام کی دوسری جماعتوں میں نہیں ملتی لیکن دوسرے فرقِ اسلامی کی طرح اس جماعت میں بھی کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہوگئے جنہوں نے مقصدِ تصوف کو صرف مکر و فریب کا ذریعہ بنا لیا اور اپنے کو "قانون شریعت" سے آزاد کرنا چاہا جسے دیکھ کر ہر صوفی کامل نے علماً اور عملاً اتباع شریعت اور ترکِ بدعت کی تلقین کی چنانچہ ہر مصنف کی کتاب میں اور ہر بزرگ کے ملفوظات میں مذکورہ بالا نظریہ کے کافی نظائر ملیں گے۔

حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ غنیۃ الطالبین میں ارشاد فرماتے ہیں کہ مومنوں کا ظاہر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے اور باطن اللہ عز و جل کے ساتھ اور ان کے اعمال کلام اللہ کے حکم اور دل اللہ کے علم سے مزین ہوتے ہیں۔

حضرت جدیؒ رسالہ التماس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اصول تصوف کے نسبت ائمہ صوفیہ کے اقوال نقل کرتا ہوں آپ ملاحظہ فرمایئں کہ اس زمانہ میں جو لوگ فقر و تصوف کی جانب منسوب کہلاتے ہیں ان میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو ان اصوال کے پابند ہیں (اقوال حسنہ یہ ہیں) سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ہدایت کے تمام راستے صرف اس کے لئے کھلے ہیں، جو رسول اللہ کی پیروی کرے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ہمارا علم تصوف کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے۔ حضرت شیخ اکبر فتوحات میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر "حقیقت" جو خلاف "شریعت" ہو گمراہی ہے اور ہر "شریعت" جو "حقیقت" سے خالی ہو وہ اپنے عمل کرنے والے کے لئے ایک معطل چیز ہے اور جس میں اسے کہیں کم فائدہ ہے جتنا اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو دونوں چیزوں کا جامع ہو۔ پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے خدا تک پہنچنے کا طریقہ سوا شرع کے اور کچھ نہیں۔

صوفیاء کرام کے اعتقادات اور سلوک ان کی تاریخ میں اہم چیزیں ہیں۔ اعتقادات میں مسئلہ توحید رب سے اہم مسئلہ ہے جس کے متعلق صوفیاء کرام یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کسی علمی یا عملی جماعت نے اس پر اتنا مکمل ذخیرۂ بحث دنیا کے لئے نہیں چھوڑا جتنا ان حضرات نے۔

مسئلہ توحید

یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ تصوف نے یونانی فلسفہ اور ایرانیوں کے خطابیات سے کافی اثر حاصل کیا۔ یہ بات اکثر علوم اسلامی میں پائی جاتی ہے۔ اور اسلام نے جس وسعت نظر کی تعلیم "الحکمۃ ضالتہ المومن" (حکمت مومن کی گمشدہ چیز ہے) کے ذریعہ سے دی تھی اس کا مقتضا بھی یہی تھا کہ مسلمان ہر چشمۂ علم سے علوم حاصل کرتے اچھی باتوں کو اختیار کر لیتے اور بری باتوں کو چھوڑ دیتے۔

یہ مسئلہ کہ خالق اور مخلوق کا تعلق کیا ہے اور وہ ایک ہے یا متعدد، مذہبی نقطۂ نظر سے صانع اور مصنوع کے تعلق سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اتنا کہہ دینا کہ وہ تمہارا پیدا کرنے والا ہے۔ یا سورۂ اخلاص کی تلاوت کر دینا تشفی بخش تھا۔ لیکن جب یونانی اور ایرانی علوم نے مسلمانوں کے دماغوں کو دلائل کا خوگر کر دیا تو فلسفیانہ نقطہائے نظر سے بحثیں شروع ہو گئیں۔ متکلمین اور فلسفی دست وگریباں ہو گئے۔
یونانی فلسفے نے اس نظریہ کی بنا پر کہ "ایک چیز سے ایک ہی چیز پیدا ہو سکتی ہے" خدا کو صرف عقل فعال کا بنانے والا مان کر اسے معطل کر دیا۔

ایرانیوں نے خدا کی جانب برائیوں کے منسوب ہونے کے خطرہ سے خیر اور شر کا خدا علیحدہ علیحدہ تسلیم کیا۔ متکلمین نے خدا کو فاعل مختار اور ایک مان کر ان اعتراضات کا جواب دینا شروع کیا جو یونانی فلسفہ کے مسلّمات کو مان کر ان پر وارد ہوتے تھے۔

حضرات صوفیاء نے مشاہدات کے ذریعہ سے کچھ نظریئے قائم کئے جو ان کے نزدیک تو بدیہی تھے، لیکن دوسروں کے نزدیک جنھیں مشاہدہ نہیں ہوا تھا، نظری تھے۔

توحید باری کا مسئلہ ان حضرات نے اس طرح سمجھا اور الفاظ کے قیود میں لا کر یوں بیان کیا کہ جب ہم موجودات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں دو حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک اشتراک دوسرے امتیاز یعنی ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف صفتوں میں مشترک ہیں مثلاً انسان انسانیت میں مشترک ہے اور اپنے خاص خاص تعینات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اسی طرح جتنے جاندار ہیں ان سب میں جاندار ہونا مشترک ہے اور انسان اور گھوڑا ہونا ان کو آپس میں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی طرح تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے، وہ وجود ہے۔ ممکن اور واجب دونوں میں وجود پایا جاتا ہے۔ اس وجود سے ہونا مراد نہیں، بلکہ وہ حقیقت مراد ہے، جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر بلا کسی موجود کرانے والے کے موجود ہے۔ اس لئے کہ یہی ذریعۂ وجود ہے۔ لہٰذا اسے خود پہلے موجود ہونا چاہیئے اور یہی وجود تمام چیزوں کو حاوی ہے اگر یہ نہ ہو تو ہر شے معدوم ہے۔

اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں، وہ اعتباری ہیں اس لئے کہ اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا یہی وجود خدائے تعالیٰ کا عین ذات ہے۔ اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں، ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے اور ہر چیز کی علیحدہ شخصیت علاوہ وجود کے صرف اعتباری ہے یہ صوفیاء کے مسلک کی بہت ہی دھندلی تصویر ہے۔ چونکہ ان کا یہ مسلک مشاہدۂ الٰہی کے بنا پر ہے

اس لئے قرآن شریف کی کثیر آیتیں انہیں اپنے اس مسلک کی شہادت میں ملی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ وھو معکم اینما کنتم۔ وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں تم ہو۔

۲۔ لا یستخفون من اللہ وھو معھم۔ وہ لوگ خدا سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ ان کے ساتھ ہے۔

۳۔ کان اللہ بکل شئی محیطا۔ خدا ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

۴۔ اللہ نور السموات والارض۔ خدا زمین اور آسمان کا نور ہے۔

حضرات صوفیاء اسی وجود کو جو تمام مخلوقات کو روشن کئے ہوئے ہے ذات باری تعالےٰ سمجھتے ہیں۔ امام ربانیؒ فرماتے ہیں کہ "حضرت وجود نفس ذات است تعالیٰ وتقدس" (مکتوب ۲۳۴)

پھر آخری آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں "زیرا کہ مبین شد کہ ممکنات باسرہا عدمات اندکہ سراسر ظلمت و شرارت است وخیر وکمال وحسن وجمال درانیہا از حضرت وجود است کہ نفس ذات است تعالیٰ وتقدس وعین ہر خیر وکمال پس ناچار نور آسمانہا وزمین ہا حضرت وجود باشد"

شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ وجود میں ضد نہیں ہے اس لئے کہ وجود ہی ایک حقیقت ہے اور شئی خود اپنی ضد نہیں ہوتی۔ (فصوص الحکم)

پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ خدا ہی ظاہر ہے اور ہم اپنے اصل کے اعتبار سے عدم ہیں اگرچہ ہمارے استعداد کے مطابق ہم کو وجود عطا کیا گیا ہے

حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ فرماتے ہیں کہ فمن قال وجودہٗ عین ذاتہ بمعنیٰ انہ ذات وحدۃ او وجود محض نجیٰ، جس شخص نے کہا کہ اس کا وجود عین ذات ہے ان معنیٰ کرکے کہ وہی وجود محض ہے تو اس نے نجات پائی۔ (تسویہ)

حضرت شیخ اکبرؒ اپنے زمانہ میں اس خاص مسئلہ کے موجد سمجھے جاتے تھے۔ چونکہ یہ مسئلہ کشف سے تعلق رکھتا ہے اس لئے کسی عبارت میں اس کی تعبیر پیچیدگی ہی اور اضافہ کردیتی ہے۔ لہٰذا جن حضرات نے اسے دلائل کا رنگ دیا، ان کی کتابوں کے سمجھنے والے اور ان سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد بہت کم رہی مثلاً شیخ اکبر شیخ کبیر، امام ربانی وغیرہ لیکن جن حضرات نے اسے خطابی رنگ میں ظاہر فرمایا، وہ اذواق کو اس مسئلہ میں زیادہ متاثر کرسکے مثلاً ملا جامیؒ مولانائے رومی شمس تبریزؒ وغیرہ کیونکہ اس کا سمجھنا مشاہدات پر موقوف تھا۔

یہ مسئلہ اعتقادی حیثیت سے بہت سے شعبوں میں تقسیم ہوگیا۔ جن میں سے بعض ملّا جامی نے تحریر فرمایا ہے جو درج ہیں۔ توحید کے چار مراتب ہیں۔

توحیدِ ایمانی یہ ہے کہ بندہ خدا ہی کو مستحق معبودیت سمجھے اور آیات واخبار نبوی کے اشارات کے مطابق زبان اور قلب سے اس کا اقرار اور یقین کرے۔

توحیدِ علمی اس کا تعلق باطن علم سے ہے جس کو اصطلاح میں علم الیقین کہتے ہیں۔ تصوف کے راستہ میں بندہ ابتداءً اس کا یقین کرتا ہے کہ موجود حقیقی اور موثر مطلق سوا خدا کے اور کوئی نہیں دنیا کی تمام چیزوں کو خدا کے صفات کے سامنے ہیچ سمجھتا ہے۔ اور تمام حقیقتوں کو خدا ہی کے نور سے موجود اور منور جانتا ہے۔

توحیدِ حالی توحید حالی یہ ہے کہ توحید ذات موحد پر اس طرح غالب آجائے کہ تمام تعینات اور وجود نورِ توحید کے سامنے چھپ جائیں "جاء الحق وزھق الباطل" اسی حقیقت کے جانب اشارہ ہے۔

توحیدِ الٰہی توحید الٰہی یہ ہے کہ ذات خداوندی کے متعلق یہ یقین رکھے کہ وہ ہمیشہ سے اسی حالت میں ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

ان کے علاوہ اور بھی مختلف توحیدیں ہیں جو صوفی پر راہ تصوف میں گامزن ہونے کی صورت میں طاری ہوتی ہیں۔ کبھی افعال خداوندی کے سوا دوسرے افعال اس کے نظر سے فنا ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے کو توحید افعالی کے مرتبہ پر پاتا ہے۔ یا تمام صفاتِ عالم یک قلم اس کے نزدیک محو ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے کو توحید صفاتی سے متصف پاتا ہے غرضکہ اس مسئلہ کشفی میں باعتبار اختلافاتِ کشف کے مختلف توحیدیں رونما ہوتی ہیں۔ مسئلہ توحید کے علاوہ دوسرے اعتقادات میں صوفیاء عام متکلمین اور فقہاء سے قریب قریب بالکل متحد ہیں۔ ہاں سلوکِ راہ الٰہی ان کے یہاں ایک مستقل فن کی صورت میں مدون ہوگیا۔

سلوک طریقت سلوک کے معنی چلنے کے ہیں اصطلاح میں ایسے ذرائع کے اختیار کرنے کو کہتے ہیں جو خدا تک پہونچنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ سلوک کے ہر طریقے کے لئے مجاہدات اور ریاضت ضروری ہیں۔

مجاھدہ کے معنی نفس کو مشقت میں مبتلا کرنا تاکہ قوائے بہیمیہ میں ضعف پیدا ہو اور ملکاتِ روحانی کا ظہور ہو۔ قرآن پاک میں یہ لفظ مختلف طریقوں پر استعمال ہوا ہے۔

وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ۔ (خدا کے بارے میں پوری کوشش کرو) اور ارشاد ہوتا ہے کہ "جو لوگ مجھ میں کوشش کریں گے ہم ان کو راستہ بتادیں گے۔" ان دونوں آیتوں سے صوفیہ کے مجاہدات پر روشنی پڑتی ہے۔ شیخ اکبر سلوک کی تشریح بالفاظ ذیل فرماتے ہیں۔ سالک کو راہ طریقت میں چار ابتدائی درجوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

۱۔ یہ وہ درجہ ہے جس میں ایسے صفات انسانی سالک میں پائے جاتے ہیں جو عمل کی ابتدا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ ان صفات میں سب سے پہلے قلب میں خطرۂ عمل پیدا ہوتا ہے۔ پھر ارادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس ارادے میں قوت ہوتی ہے پھر ہمت پیدا ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ عمل کرنے کو تیار ہوجاتا ہے۔

۲۔ اس مرتبہ میں آنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے قلب میں کسی چیز کی جانب رغبت ہو یا اس کا خوف ہو، یا کسی کی تعظیم کا خیال ذہن میں پیدا ہو۔ یہ دونوں مرتبے ایک دوسرے سے بالکل وابستہ ہیں۔ (۳) جب یہ دونوں حالتیں طاری ہوجاتی ہیں، تو عملی دنیا میں انسان قدم رکھتا ہے جس میں وہ ہر برے اخلاق کا علاج کرکے اسے ترک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنے اخلاق سے اسے متصف کرتا ہے۔ (شیخ نے پھر اخلاقیات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے)

۴۔ ان تینوں مرتبے کے بعد اب عالم مشاہدات میں سالک قدم رکھتا ہے اور حقائق و معارف اس پر القا ہونا شروع ہوتے ہیں۔ (ان حقائق کی شیخ نے بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں) اس کے بعد مقامات کی تشریح کرتے ہیں کہ جو ہم نے مراتب بیان کئے انہیں کو مقامات اور حالات کہتے ہیں، لیکن حالات برابر بدلتے رہتے ہیں اور مقامات کو قیام اور سکون رہتا ہے (فتوحات جلد اول ص۱۳۷)

سلوک کے متعلق شیخ کی تشریح بہت واضح ہے۔ سالکین راہ الٰہی چونکہ مختلف طبیعتوں کے ہوتے ہیں، اس لئے ان کے اعتبار سے سینکڑوں راستے وصال الٰہی کے خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کردیئے۔ ارباب تصوف نے ان طریقوں کو بہت تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور فن سلوک پر کثرت سے تصانیف موجود ہیں۔ حضرت جدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وصول الی اللہ کے راستے گو بے شمار ہیں مگر باوجود کثرت کے تین طریقوں میں منحصر ہیں۔

۱۔ ارباب معاملات جن کو عباد کہتے ہیں ان کا کاروبار اعمال حسنہ کے ساتھ ہے۔ کثرت سے نمازیں پڑھنا، روزہ رکھنا اور دیگر خیرات و حسنات و اعمال بدنی کا برتنا۔ اس راستے کے چلنے وا

مقصد تک پہنچتے ہیں، مگر بدیر۔

۲- ارباب مجاہدہ - یہ لوگ ہمیشہ اخلاق ذمیمہ کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاضات و مجاہدات کے ذریعہ سے تزکیہ نفس اور تجلیہ قلب کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس طریقے کے چلنے والے اگرچہ کم ہیں مگر پہلے طریقے کے بہ نسبت اس طریقے میں واصلین الی اللہ زیادہ ہیں۔

۳- سائرین الی اللہ۔ اس کو طریقہ شطاریہ بھی کہتے ہیں یہ طریقہ اہل محبت کا ہے ان کی روش کا دارومدار صرف جذب اور کشش الہی پر ہے۔ گو یہ لوگ عبادت ظاہری اور ریاضت و مجاہدہ میں پہلے دونوں طبقہ والوں کے نسبت گھٹے ہوئے نہیں ہوتے۔ مگر ان کی نظر اپنے افعال اور اعمال پر نہیں ہوتی۔

ریاضت اور مجاہدہ ان کا بہ تحریک محبت اور شغف قلبی ہوتا ہے۔ وہ وسیلۂ وصول ذات الہی کو سمجھتے ہیں اور اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس طریقے کے مبتدی بھی اس قدر واصلین میں سے ہیں کہ اور طریقے کے منتہی نہیں۔

خاتم المتاخرین آیتہ من آیات اللہ حضرت حاجی امداد اللہ رح نے بھی ضیاء القلوب میں انہی طریقوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ملا جامی نے سالکین کی مختلف قسمیں تحریر فرمائیں جن سے سلوک کی وضاحت ہوتی ہے۔

۱- وہ واصلانِ حق، جو بارگاہ الہی کی حضوری کے بعد خدمت خلق کے لئے مخلوق کی جانب رجوع ہوتے ہیں۔

۲- وہ جو عالم استغراق میں مشاہدات صفات الہی سے لذت اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ اور مخلوق سے علیحدہ رہتے ہیں وغیر ذالک۔ غرضکہ سلوک راہ الہی کے طریقوں کی کوئی انتہا نہیں

نہ حسنش آخرے دارد نہ سعدی راسخن پایاں

انہیں طریقوں کے اختلاف سے مختلف سلسلے پیدا ہو گئے جن کی تفصیل سے تمام ارباب ذوق واقف ہیں۔

مذکورۂ بالا سمع خراشی سے تصوف پر گونہ روشنی پڑتی ہے کاش کہ اتنی فرصت اور استطاعت ہوتی کہ کوئی مفصل کتاب اس موضوع پر تحریر کر سکتا۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

سندھ کے سُہروردی مشائخ

میمن عبدالمجید سندھی۔ لیکچرار اسلامیہ کالج سکھر

شیخ عبداللطیف کلاں صدیقی

لنواری[1] والے بزرگوں کے مورث اعلیٰ شیخ عبداللطیف صدیقی کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے[2]۔

حاجی عبداللطیف بن شیخ طیب بن شیخ ابراہیم بن شیخ عبدالواحد بن شیخ عبداللطیف بن شیخ احمد بن شیخ بقا بن شیخ محمد بن شیخ نفیر اللہ بن شیخ عابد بن شیخ عبداللہ بن شیخ طاؤس بن شیخ علی بن شیخ مصطفیٰ بن شیخ مالک بن محمد بن الحسن بن محمد بن طیار بن عبدالباری بن عزیز بن فضل بن علی بن اسحاق بن ابراہیم بن ابی بکر بن قائم بن عتیق بن محمد بن عبدالرحمان بن حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

صدیقی خانوادہ کی یہ شاخ غالباً ۱۷۰ھ میں خلیفہ مہدی یا خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں

۱۔ ضلع حیدرآباد کا ایک قدیم شہر ہے۔ جس میں صدیقی بزرگوں کی درگاہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق روایت ہے کہ ایک عورت لنواری نامی کی وجہ سے یہ نام پڑا۔ صاحبِ لطیفت التحقیق (سندھی ترجمہ ص ۲۹) نے لکھا ہے کہ لنواری "لون واری" کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ "لون واری" کے معنی ہیں "نمک والی"۔ حضرت سلطان اولیاء خواجہ محمد زماں کے زمانے میں یہ قدیم شہر ویران ہونے لگا۔ اس لئے آپ نے اس شہر کے نزدیک ۱۷۳۷ء میں نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام بھی لنواری ہی رکھا۔ اب یہ نیا شہر ہی موجود ہے، جس میں درگاہ ہے۔

۲۔ لطیفت التحقیق۔ از سید رفیق علی شاہ لشنگی کچھی، سندھی ترجمہ از۔ محترمی غلام حسین مکانی، ص ۱۳

سندھ میں متوطن ہوئی۔ صاحب "لطیفت التحقیق" نے تاریخ "دُرِنا سفتہ مروارید" کے حوالے سے لکھا ہے کہ تقریباً ۱۷۰ھ میں علی بکری اپنے عزیزوں سے ناراض ہو کر سندھ میں آئے اور سکونت پذیر ہوگئے۔ صاحب تحفتہ الکرام نے بھی تصدیق کی ہے کہ ۶۲۳ھ سے پہلے سندھ میں صدیقی بزرگ موجود تھے اور ۱۷۰ھ میں ثقفیوں تمیموں اور عباسیوں کے ۱۸ قبیلے موجود تھے۔

حضرت علی بکری سندھ میں تشریف لانے کے بعد نواح ٹھٹھہ میں توطن پذیر ہوئے جب سندھ میں عربوں کی حکومت کو زوال آیا تو یہ خانوادہ ملک کچھ چلا گیا اور لکھپت، وینجھان، چھکور اور گونڈھاری وغیرہ کے نواح میں آباد ہوا۔ ۹۱۰ھ میں شیخ عبداللطیف مریدوں کی درخواست پر سندھ میں آئے اور یہیں سکونت پذیر ہوئے۔ سندھ میں آنے کے بعد آپ گوشہ نشین ہوگئے اور مریدوں کے گھر پر کبھی نہیں گئے۔ آپ بڑے عالم فاضل اور صاحب معرفت بزرگ گزرے ہیں مریدوں کی رشد و ہدایت کے لئے آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ بڑے عابد زاہد اور متقی تھے ایک سو برس سے بھی زیادہ آپ نے عمر پائی۔ اور پیری میں بھی آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ آپ کے بہت مرید تھے۔ لیکن راٹھوڑ قوم کے شہر "راٹھوڑ" پر آپ کی خاص نظر کرم تھی۔ آپ کا مقبرہ بھی شہر "راٹھوڑ" میں ہے۔ اس لئے آپ کو "راٹھوڑی" بھی کہتے تھے۔ راٹھوڑ چونکہ دیہہ راہوٹ میں ہے، اس لئے آپ کو "راہوٹی" بھی کہتے تھے۔ شیخ عبداللطیف کے شیخ شمس الدین نامی ایک بھائی بھی تھے۔ جن کا مزار لواری قدیم میں ہے۔ شیخ شمس الدین بھی بڑے صاحب کمال بزرگ تھے[1] صاحب لطیفت التحقیق نے لکھا ہے کہ شیخ علی بکری کی اولاد میں سے شیخ مالک حج کو گئے۔ وہاں ایک سہروردی بزرگ شیخ محمد یمانی سے ملے اور ان کے مرید ہوئے۔ چنانچہ ۱۲ سال ان کی خدمت میں رہ کر ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور واپس آئے۔ اگرچہ یہاں آپ کے بہت مرید ہوگئے۔ لیکن آپ نے پیر کہلوانا پسند نہ فرمایا۔ ہمیشہ "فقیر" ہی کہلواتے رہے۔ اور مریدوں کے پاس بھی کبھی نہ گئے۔ اپنے آباء و اجداد کی طرح شیخ عبداللطیف کا طریقہ بھی سہروردی تھا[3]

---

[1] لطیفت التحقیق سندھی ترجمہ ص ۳۰، ۳۶، ۳۷

[2] " " " ص ۲۸، ۳۲

[3] " " " ص ۱۷، ۲۸، ۳۲

شیخ عبداللطیف کے تین فرزند ہوئے۔ شیخ عبدالواحد کے سوا دوسرے بچپن ہی میں فوت ہوگئے۔ شیخ عبدالواحد کے صرف ایک فرزند شیخ ابراہیم تھے جن کی عمر اپنے والد کی وفات کے وقت صرف ایک برس کی تھی۔ شیخ ابراہیم کا مقبرہ ملک کچھ کے شہر "نر بیہ" میں ہے شیخ ابراہیم کے چار لڑکے تھے۔ جن میں سے شیخ طیب آپ کے سجادہ نشین ہوئے۔ بڑے عابد اور زاہد تھے۔ طریقت کی راہ میں آپ نے سخت ریاضتیں اور مجاہدے کئے۔ یہ سب بزرگ سہروردی طریقے کے تھے۔

شیخ طیب کے بعد آپ کے فرزند شیخ حاجی عبداللطیف سجادہ نشین ہوئے۔ موصوف لواری قدیم میں رہتے تھے۔ آپ نے شیخ فیض اللہ بن مخدوم آدم نقشبندی کی صحبت کی وجہ سے نقشبندی طریقہ اختیار کیا۔ اس لئے اس خانوادے کا سہروردی طریقہ یہاں ختم ہوگیا۔ شیخ حاجی عبداللطیف نے ۱۷۳۶ء میں وفات پائی۔ آپ کے فرزند حضرت سلطان الاولیاء خواجہ محمد زمان بھی نقشبندی تھے آپ کی ولادت ۱۷۱۳ء میں اور وفات ۱۷۷۳ء میں ہوئی۔ آپ کے لاکھوں مرید تھے جن میں سے بہت سے بڑے بزرگ بھی ہوئے۔ ان میں سے مخدوم شہید عبدالرحیم گرہوڑی قابل ذکر ہیں۔ استاذی و مخدومی حضرت پیر سعید حسن صاحب قبلہ صدر شعبہ سندھی و وائس پرنسپل سندھ مسلم کالج کراچی حضرت سلطان الاولیاء کے خاندان میں سے ہیں۔

شیخ شہاب الدین صدیقی پاٹائی

مخدوم حبیب اللہ صدیقی صاحب کرسی نامہ نے مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ پاتری کی کتاب عین المعانی صفحہ ۲۷۶ کے حوالے سے لکھا ہے کہ پاٹ[۱] کو شیخ شہاب الدین صدیقی سہروردی نے آباد کیا۔

---

[۱] پاٹ، ضلع دادو میں ایک قدیم شہر تھا۔ جس میں بڑے بڑے عالم، فاضل اور شاعر پیدا ہوئے۔ قدیم زمانے میں یہاں بڑی درسگاہیں تھیں اور دور دور سے اکابر عالم اور اولیائے کرام یہاں آتے رہتے تھے قدیم تذکروں میں اسے قبۃ الاسلام کہا گیا ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے یہاں باغات کی کثرت تھی اور آم اور انار ہوتے تھے۔ انار تو اتنے ہوتے تھے کہ برآمد بھی کئے جاتے تھے۔ تجارتی مرکز تھا اور دور دور سے اس کے تجارتی روابط تھے۔ شاہ حسن ارغون نے اسے زیادہ رونق بخشی اور مرزا ہندال سے اپنی لڑکی کی شادی یہیں کی۔ ہمایوں جب ۱۵۴۱ء میں سندھ سے گذرا تو یہاں بھی اس نے قیام کیا۔ یہیں اس کی شادی شیخ علی اکبر جامی کی لڑکی سے ہوئی۔ خوشحالی اور آسودگی کی وجہ سے اٹھارویں عیسوی (باقی ص۵۴ پر)

لیکن[1] ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر اس سے بھی پہلے آباد تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سید عثمان مروندی معروف بہ قلندر لعل شہباز سیوہانی ساتویں صدی ہجری میں یہاں حاجی اسماعیل پنوہر سے ملے[2]۔ شیخ اسمٰعیل کا مقبرہ پاٹ قدیم کے کھنڈرات میں موجود ہے شیخ شہاب الدین نویں صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ البتہ اس کا امکان ہے کہ شیخ شہاب الدین نے یہاں آکر اس شہر کو زیادہ رونق اور علمی فضیلت بخشی ہو۔ کرسی نامہ کے مصنف نے آپ کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے[3]۔

"مخدوم شیخ شہاب الدین صدیقی (۸۰۳ - ۸۹۴ھ) ابن شیخ نورالدین (۷۲۶ - ۷۹۴ھ) شیخ سراج الدین (۷۳۶ - ۸۱۱ھ) ابن شیخ وجیہ الدین (۶۹۹ - ۷۸۰ھ) شیخ شہاب الدین کے فرزند معروف نامی تھے۔ جن کے نام سے "پاٹ" شہر کے نزدیک "معروفانی جھیل" موجود ہے۔ شیخ معروف کی ولادت ۸۴۴ھ اور وفات ۹۰۷ھ میں ہوئی۔ آپ کے فرزند شیخ رکن الدین (۸۷۵ - ۹۵۲ھ) دو بڑے خاندانوں کے مورث اعلیٰ ہیں۔ جن میں سے ایک برہانپور ہندوستان میں جاکر آباد ہوگیا اور دوسرا پاٹ میں رہا اور بعد میں سیوھن میں جا بسا۔ شیخ رکن الدین کے فرزند شیخ یوسف برہانپور میں متوطن ہوگئے"[5]

شیخ یوسف کے خاندان میں بڑے بڑے عالم، فاضل اور بزرگ پیدا ہوئے ان کا تذکرہ برہانپور کے سندھی اولیاء میں موجود ہے یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ نے شائع کی ہے۔

(بقیہ حاشیہ) میں اس شہر پر حملے ہونے لگے۔ ۱۲۰۳ھ میں محب النبی نے قدیم شہر کے نزدیک دوسرا شہر آباد کیا "جونٹی پاٹ" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ نیا شہر اب ایک گاؤں کی صورت میں موجود ہے۔ اس نئے شہر نے بھی بہت سے بلندپایہ عالم اور فاضل پیدا کئے۔ سندھ کے مشہور مفکر اسلام علامہ آئی آئی قاضی صاحب سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی اس شہر کے قدیمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پرانا شہر غالباً انیسویں عیسوی کے شروع میں برباد ہوگیا۔ اب یہ ایک ویران کھنڈر ہے۔

[1] بحوالہ محترم مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی کا مضمون "سیوھانی قاضیوں کا کتب خانہ" شائع شدہ ماہنامہ نئیں زندگی مارچ ۱۹۶۱ء ص ۶۔

[2] Mayne, 1956, P.43. Gazetter 1927, P36; Research Article on "Pat" by a Swiss socialogist John. J. Honigmann, published in Anthropos.

[۳ - ۴ - ۵] - تحریری مولانا قاسمی صاحب کا مضمون۔

مخدوم دین محمد صدیقی سیوھن میں صدیقی خاندان کے موسس اعلیٰ مخدوم دین محمد (۱۱۱۳ - ۱۱۹۲ھ) ہیں جو سندھ کے حاکم خدایار خاں ثانی کلھوڑہ کے شرعی امور کے وزیر تھے۔ آپ پاٹ کے صدیقی سہروردی خاندان میں سے تھے۔ ملازمت کے سلسلہ میں سیوھن آئے اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ صاحب کرسی نامہ نے آپ کا شجرہ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔

"مخدوم دین محمد ابن مخدوم عبدالواحد کبیر (۱۰۴۱ - ۱۱۲۳) ابن مولانا محمود سہروردی (۱۰۱۹ - ۱۰۸۵) ابن شیخ عیسیٰ ثانی پاٹائی (۱۰۰۴ - ۱۰۷۰) ابن مخدوم حسن قاری (۹۹۰ - ۱۰۸۲) ابن شہراللہ رمضان (۹۶۷ - ۱۰۰۲م)

اس کے بعد اختلاف ہے۔ کرسی نامے نے شیخ شہراللہ رمضان کو مسیح الاولیا شیخ عیسیٰ پاتری برہانپوری (۹۶۷ - ۱۰۳۱) کا فرزند بتایا ہے۔ جس کا ثبوت ہندوستانی تذکروں میں نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ شیخ عیسیٰ برھانپوری دوسری اولاد کے ساتھ برہانپور گئے ہوں اور آپ کے فرزند شہراللہ رمضان پاٹ میں ہی رہے ہوں۔ کیونکہ صاحب کرسی نامہ نے مزید لکھا ہے کہ مخدوم دین محمد کے والد بزرگوار مخدوم عبدالواحد کبیر کو اورنگ زیب عالمگیر نے پاٹ میں ۵ ہزار ایکڑ جاگیر اس لئے دی تھی کہ وہ مسیح الاولیاء شیخ عیسیٰ پاتری کی اولاد میں سے تھے۔ یہ جاگیر حضرت شیخ عبداللہ پاٹائی سہروردی صدیقی کی جاگیر کے نزدیک تھی۔ صاحب کرسی نامہ نے مخدوم دین محمد کے متعلق لکھا ہے۔

"ابن مفتی اسلام شاہی فخرالدین عبدالواحد کبیر پاتری صاحب کشف الاسرار زائر روضۂ جدی مسیح الاولیاء در برھانپور ومقرب سلطان اورنگ زیب"

سندھ کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی مخدوم دین محمد کے خاص دوست تھے۔ بھٹائی صاحب آپ کی ملاقات کے لئے سیوھن اکثر آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں نے آپس میں دستاریں بھی تبدیل کیں۔ مخدوم دین محمد کے فرزند مخدوم عبدالواحد بھی بڑے عالم فاضل اور صاحب معرفت بزرگ گذرے ہیں آپ کی "فتویٰ" سندھ میں مشہور رہی ہے اور سندھ کے مسلمان اس پر عمل کرتے رہے ہیں۔ مخدوم عبدالواحد صاحب وفات ۱۲۲۴ھ نوشہرہ فیروز کے حضرت خواجہ صفی اللہ نقشبندی سے بیعت تھے۔ اس لئے سہروردی سلسلہ یہاں ختم ہوا۔ سیوھن کے اس خاندان میں بڑے بڑے عالم فاضل، ادیب اور بزرگ پیدا ہوئے، جن میں سے مخدوم نصیرالدین اور مخدوم بصرالدین قابل ذکر ہیں۔ مخدوم بصرالدین تو ایک مجذوب مفکر تھے۔ مخدوم بصرالدین اور مخدوم نصیرالدین مخدوم عبدالواحد کے بھائی مخدوم محمد حسن بن مخدوم دین محمد کی اولاد میں سے تھے۔ سیوھن ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین مخدوم محمد مراد صدیقی اس خاندان میں سے ہیں

---

[1] لطف اللطیف۔ از دین محمد وفائی ص ۸۹ - ۹۰ محترمی مولانا غلام مصطفیٰ صاحب کا مضمون ص ۵

روس میں پان ترکزم اور اسلام[1]

تلخیص و ترجمہ

اسماعیل بے گسپرنسکی

یہ وہ وقت ہے جب جدید سی تعلیم پائے ہوئے کریمیا کے ایک تاتاری اسمٰعیل بے گسپرنسکی آگے آتے ہیں اور وہ تاتاریوں کی تعلیمی ترقی، انکے قومی احساسات کی بیداری کے علمبردار بنتے ہیں۔ انیسویں صدی میں روسی ترکوں کی تاریخ میں گسپرنسکی (۱۸۵۱ء - ۱۹۱۴ء) کی شخصیت سب سے ممتاز ہے انہوں نے کریمیا اور ماسکو میں تعلیم پائی تھی بعد میں وہ استنبول میں رہے۔ اور وہاں سے پیرس گئے۔ ان دو شہروں کے قیام نے ان کی بعد کی سرگرمیوں پر جو آزادی پسند (لبرل) قوم پرستانہ جذبات سے بھرپور تھیں گہرا اور پائدار اثر ڈالا۔ گسپرنسکی پر سلاوزم[2] (اتحاد سلاو) اور فرانس کے تاثرات کے علاوہ ہم عصر عثمانی ترکی کی دو فکری تحریکوں کا بڑا اثر پڑا۔ ایک تو نوجوان عثمانی ترکی تحریک، جس کے بانی نامق کمال، شناسی اور ضیا پاشا اہل قلم تھے۔ یہ تحریک تنظیمات (۱۸۴۰ء - ۱۸۸۰ء) کے اصلاحی دور میں ابھری تھی، اور دوسری فکری تحریک جس نے ۱۸۶۰ء ۱۸۷۰ء میں

---

[1] یہ اس مضمون کی دوسری قسط ہے۔ اور یہ ملخص ہے (Pan Turkism & Islam in Russia) نام کی کتاب سے جو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے "روسی ریسرچ سنٹر" کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنف سر جے، اے، زنکووسکی ہیں۔ کتاب کا سن طباعت ۱۹۶۰ء ہے۔ روس کے مسلمان ترکوں کی علمی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں پر ۱۹۲۰ء تک بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ (مدیر)

[2] خاص روس کے باشندے سلاو نسل سے ہیں۔ اور ایک زمانے میں ان کے ہاں اتحادِ سلاو کی تحریک چلی تھی، جسے "سلاوزم" کہتے تھے۔ (مدیر)

استنبول کے نوجوان دانش وروں کو متاثر کیا اور جو اسماعیل بے گسپرنسکی کے لئے بھی منبعِ فیضان بنی، پان اسلامزم تھی یا آخر الذکر تحریک سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء - ۱۸۹۷ء) کی تخلیق تھی۔

کریمیا میں واپس آنے کے بعد اسماعیل بے گسپرنسکی نے پہلے تو درس و تدریس کی سرگرمیاں شروع کیں اور ۱۸۸۱ء کے بعد انہوں نے سید جمال الدین افغانی کی ہدایات کے مطابق روس کے تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کے پروپیگنڈے کا آغاز کیا۔ ۱۰ اپریل ۱۸۸۳ء کو ان کے اخبار "ترجمان" کا پہلا پرچہ نکلا۔ گسپرنسکی کے اس اخبار نے تقریباً پچیس سال تک روسی ترکوں کے ذہن کو بنانے میں مدد دی۔ موصوف کی علمی صلاحیتیں صرف درس و تدریس اور صحافت تک ہی محدود نہ رہیں، بلکہ وہ سب سے پہلے اور سب سے نمایاں ایک قومی اور سماجی رہنما تھے۔ وہ روس کے مختلف مسلمان صوبوں میں مسلسل دورے کرتے اور اپنے ہم وطنوں کو متحد کرنے کے لئے قلم کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے بھی کام لیتے۔ غرض ۱۸۸۰ء - ۱۸۹۰ء میں گسپرنسکی روس میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور سب سے زیادہ بااثر ترک لیڈر تھے، اور اس کے علاوہ بیرونی ملکوں میں ان کی بات غور و توجہ سے سنی جاتی تھی۔

نظریتاً اسماعیل بے گسپرنسکی اگرچہ تمام دنیائے اسلام کے اتحاد کے حامی تھے، لیکن عملاً ان کی دعوت روس کے تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی تھی، لعلان کی وجہ سے قدرتاً ان کی یہ دعوت روس کے تمام ترکوں کے اتحاد کی بن گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ترکوں کو قرون وسطیٰ کی نفسیات سے نکال کر جدید یورپی ثقافت کے دائرے میں بھی لانا چاہتے تھے۔ وہ مسلمان عورتوں کی آزادی کے حامی اور مسلمانوں کی سماجی زندگی میں بعض اصلاحات کے داعی تھے۔ لیکن وہ اسلامی ثقافت کے بھی مؤید تھے چنانچہ ایک طرف جہاں ان کا یہ اصرار تھا کہ اسلامی مدارس میں ترکی زبان پڑھائی جائے، وہاں وہ اس کی ضرورت بھی محسوس کرتے تھے کہ عربی جو قرآن مجید اور اسلامی ثقافت کی زبان ہے، اس کی بھی تعلیم ہو۔ البتہ وہ عربی گرامر کی فارسی میں لکھی ہوئی پرانی درسی کتابوں کے بجائے استنبول کی شائع کردہ ترکی زبان میں لکھی ہوئی عربی گرامر کی کتابیں پڑھانے پر زور دیتے تھے۔

مسلمانوں کے ثقافتی اتحاد کی اپنی اس جد و جہد میں گسپرنسکی روس کے اسلامی مدارس اور اس کی صحافت کے لئے عثمانی سلطنت کی ترکی زبان کو ادبی زبان بنانا چاہتے تھے چنانچہ ان کا اخبار "ترجمان" اسی زبان میں جسے اس وقت نوجوان عثمانی ترک عربی اور فارسی الفاظ سے پاک کر رہے تھے، نکلتا تھا۔ یہ زبان گو کریمیا والوں کے لئے تو ایک حد تک قابل فہم تھی لیکن وولگا اور یورال اور قازقستان اور وسط ایشیا کے ترکوں کے لئے اسے باقاعدہ پڑھے بغیر سمجھنا مشکل تھا۔ اس لئے گسپرنسکی تمام ترکوں کے لئے جس لسانی وحدت کے داعی تھے، وہ وجود میں نہ آسکی۔

اسلامی اور ترکی اتحاد کے ساتھ ساتھ اسماعیل بے گسپرنسکی روسی حکومت اور روسیوں سے بھی دوستانہ تعلقات رکھنے کے حق میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ روس کو ترکی اور ایران سے اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ بلکہ وہ

یہ بھی سوچتے تھے کہ آیندہ تاریخ تمام ترکوں کو اس طرف لے جاسکتی ہے کہ وہ روس کے ساتھ مل کر ایک ہی نظام میں رہیں۔ گسپرنسکی کی زیادہ تر توجہ تعلیم کی طرف رہی۔ انہوں نے خود ایک اصلاح شدہ نظام تعلیم کا مدرسہ قائم کیا۔ جو بعد میں نئے طریقۂ تعلیم یعنی "اُصول جدید" کے مدارس کے لئے نمونہ بن گیا۔ "اُصول جدید" ترقی پسند تاتاری مسلمین کا نعرہ تھا اور اسی مناسبت سے انہیں "جدیدیین" کہا جانے لگا۔ ان نئے قسم کے مدارس میں عصری پڑھانے کا نیا طریقہ رائج کیا گیا۔ اور اگرچہ ان مدارس میں قرآن مجید اور فقہ کی تعلیم بحالہ جاری رہی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ بھی شامل نصاب کیا گیا۔

آگے چل کر اصول جدید کے یہ مدارس آہستہ آہستہ پرانی روایات سے الگ ہوتے گئے۔ اور ان میں قدیم مذہبی فضا کی جگہ جدید سیکولر (غیر مذہبی) فضا پیدا ہونے لگی۔ اور یہی مسئلہ وجہ نزاع بن گیا۔ پرانوں جنہیں "قدیمیین" کہتے تھے اور اصول جدید کے حامیوں یعنی "جدیدیین" میں لیکن اُصول جدید کے مدارس نے بڑی سرعت سے ترقی کی، چنانچہ ۱۹۱۴ء میں کوئی پانچ ہزار کے قریب تاتاری اور بعض دوسرے مدارس میں یہ طریقہ رائج ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس وسط ایشیا کا کیشیا اور وولگا یورال کے بعض قدامت پسند مدارس میں حسب دستور پرانا طریقہ تعلیم ہی رائج رہا۔ مختصراً تاتاری معاشرے نے گسپرنسکی کی اصلاحات کو بہت حد تک قبول کر لیا، اور اس کے بورژوائی طبقے کا اس میں فی الحقیقت فائدہ بھی تھا، بیسویں صدی کے اوائل میں تاتاری دانشوروں کا کافی زور بڑھ گیا۔ اور ان کا مرکزی شہر قازان اپنی کثیر التعداد درس گاہوں، دارالاشاعتوں اور زبردست عقلی سرگرمیوں کی وجہ سے دنیائے اسلام کے چار علمی و ثقافتی مرکزوں میں سے ایک شمار ہونے لگا۔ اگرچہ تاتاریوں کی اکثریت پہلے کی طرح مذہبی معاملات میں بڑی راسخ رہی، لیکن سیاسی اور سماجی فکر و نظر کے اعتبار سے وہ بخارا اور دوسرے روایتی مسلم افکار کے مراکز کے بجائے ماسکو، پیٹرز برگ، استنبول اور ایک حد تک پیرس کے زیر اثر آ گئی۔

قومی جدوجہد کا آغاز

روسی ترکوں میں قومی جدوجہد کا آغاز پہلے پہل دراصل ۱۹۰۵ء کے ہی قریب ہو سکا، اس سے پہلے تاتاری جدیدیین کی تمام تر سرگرمیاں صرف ثقافتی و مذہبی نوعیت کی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں ایک پرجوش نوجوان تاتاری لیبرل کو جو اشتراکی پروپیگنڈے کے زیر اثر تاتاری معاشرے میں بھی طبقاتی جدوجہد اور داخلی تنازعات کے خواب دیکھنے لگا تھا، اسماعیل بے گسپرنسکی نے کہا تھا۔ "عزیز من! تم ابھی ناتجربہ کار ہو، اس لئے تم اصلاحات پر اسٹنے ریکھے ہوتے ہو...... وہ لوگ جن کی کوئی ثقافت نہ ہو، ان کے پاس صنعتیں کہاں سے آئیں گی، اور صنعتوں کے بغیر داخلی تنازعات نہیں ہو سکتے۔ ہمارے پیش نظر اس وقت اپنی ثقافت کی

تعبیر ہے:

لیکن وہ تاتاری اور آذربائیجانی نسل جس نے ۱۹۰۵ء میں سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا تھا، وہ زیادہ عرصے تک انتظار کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اسی میں سے ترک قوم پرستی کی تحریک کی نئی قیادت ابھری۔ اس میں سب سے پیش پیش ایک صاحب رشید ابراگیموف تھے، جو محکمہ امور مذہبیہ میں قاضی رہ چکے تھے۔ آپ ترک وطن کر کے استنبول گئے، اور وہاں روس کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کیا۔ ۱۹۰۴ء میں ترکی سے وہ واپس روس بھیج دیئے گئے، جہاں آکر انہوں نے "آئینہ" کے نام سے ایک رسالہ نکالا، جو روسی ترکوں کے اتحاد کا نقیب تھا۔ اسی سال ایک اور ترک اہل قلم علی کمال کے قاہرہ سے شائع ہونے والے ایک اخبار "ترک" میں ایک مضمون چھپا، جس کے ترکیت اور ترک قومی تحریک کے آئندہ ارتقاء پر بڑے دوررس اثرات پڑے۔ مضمون نگار ایک تاتاری دولت مند صنعت کار کا ایک صحافی نوجوان لڑکا یوسف نامی تھا۔ اس نے لکھا کہ اس دور میں جب کہ مسلمان ملکوں میں سیکولرزم آرہا ہے، جہاں جمال الدین افغانی اور گسپرلسکی کے پان اسلامزم کے خیالات فرسودہ ہو چکے ہیں وہاں عثمانی ترک سلطنت کے مختلف المذاہب اور مختلف النسل باشندوں پر مشتمل ایک متحد اور وفاقی عثمانی قومیت کی تعمیر بھی نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ ترکی سلطنت کے ان مسیحی اور مسلمان ہر دو مذہب کے باشندوں میں قومی تحریکیں ابھر رہی ہیں ان دونوں نظریوں کے خلاف اس مضمون نگار نے یہ خیال پیش کیا کہ عثمانی ترک سلطنت اور روسی سلطنت کے تمام ترکوں کو سیاسی طور پر متحد کیا جائے، اور ان کے ساتھ ارد گرد کے دوسرے ملکوں میں جو ترکی اقلیتیں ہیں وہ بھی شامل کی جائیں۔ اس نئے سیاسی عقیدے کو "ترکزم" یا "پان ترکزم" کا نام دیا گیا۔ ظاہر ہے یہ نظریہ کافی خطرناک تھا، کیونکہ اس کی سب سے پہلی زد تو روس پر پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں مضمون نگار کی یہ رائے تھی کہ روس کی مخالفت کو اس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ طاقتیں جو زار روس کی سلطنت کے خلاف ہیں، ان سے اتحاد کر لیا جائے۔ ایک مشترک ترک قومی تحریک" کے نصب العین کے متعلق یہ پہلا بیان تھا جو قاہرہ کے اخبار "ترک" میں شائع ہوا۔ بہت جلد یہ نظریہ "پان ترکزم" کے لئے ایک دینی عقیدہ بن گیا۔ اور اس کے ترکوں کے افکار اور رجحانات کے ارتقاء پر بڑے گہرے اور پائیدار اثرات پڑے۔ بعض اور روسی ترک اخبار نویسوں نے جو روس سے ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں آگئے تھے، اس زمانے میں ان خیالات کی تائید کی۔

۱۹۰۵ء میں سلطنت روس میں جو عام انقلابی جدوجہد ہوئی، اس کے نتیجے میں روس کے ترک مہاجر دوسرے ملکوں سے واپس وطن آگئے، اور اب ان کی سرگرمیاں اندرون روس شروع ہو گئیں۔ اوائل مارچ ۱۹۰۵ء میں کوئی اسّی تاتاری صنعت کار، ایڈوکیٹ، مذہبی اور سماجی رہنما، معلم اور تاجر قازان میں

جمع ہوئے اور انہوں نے "آل روسی مسلم کانفرنس" بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد اس کانفرنس کے باقاعدہ اجلاس ہونے لگے، ان میں روسی ترکوں کے حقوق کے متعلق اہم فیصلے کئے جانے۔ اسی دوران میں روسی پارلیمنٹ (ڈوما) کے انتخابات ہوئے، جن میں ترک نمائندے بھی منتخب کئے گئے۔ جب اس طرح سیاسی سیاسی جدوجہد کا آغاز ہوگیا تو روسی ترکوں میں مختلف سیاسی گروہ بھی ظہور پذیر ہونے لگے۔ ایک پارٹی "اتفاق" کے نام سے بنی۔ اور جو قدرے انتہا پسند تھے انہوں نے "تاتاری سوشلسٹ انقلابی" نام کا اپنا ایک گروپ بنایا۔ ایک چھوٹا سا گروہ سوشل ڈیموکریٹس[1] کا تھا۔ جس نے آگے چل کر تاتاری بالشویک گروپ کی شکل اختیار کی۔ جہاں تک روسی ترکوں میں سے دائیں بازو والوں کا تعلق ہے، ان میں ایک تو محکمہ امور مذہبیہ کے قدامت پسند علماء تھے دوسرے پیٹرز برگ کے مسلمان سوداگر۔ انہوں نے اپنی پارٹی کا نام "صراط مستقیم" رکھا، یہ لوگ روسیوں کے دائیں بازو سے تعاون کرتے تھے۔ اور "تجدید پسین" کے مقابلے میں "قدیمین" کہلاتے تھے، ان کا اپنا اخبار بھی تھا۔ "قدیمین" کے روحانی رہنما ولی حضرت کو "جدیدیین" اور "اتفاق" پارٹی کے لیڈروں سے، جنہیں وہ ملحد اور خدا اور رسول صلعم کے دشمن سمجھتے تھے، اتنی سخت نفرت تھی کہ اس نے زار روس کی پولیس سے یہ مخبری کرنے سے بھی تامل نہ کیا کہ "اصول جدید" کے ترک مدارس میں "پان ترکزم" کا پروپیگنڈہ ہوتا ہے (اس کی وجہ سے بعض مدارس بند کر دیئے گئے۔) ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد یہ سب رپورٹیں جو "صراط مستقیم" سے تعلق رکھنے والے قدامت پرست ملاؤں نے "اصول جدید" والوں کے خلاف زار کی پولیس کو دی تھیں، شائع کر دی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملّا ان ائمہ اور خطباء تک کو انقلابی سمجھتے تھے، جو جمعہ کی نمازوں میں عربی کی جگہ تاتاری زبان میں خطبہ دیتے تھے۔

قازقستان

قازقستان پر گو روسی تسلط کی ابتداء ۱۷۲۶ء میں ہوئی، لیکن ۱۸۴۶ء میں کہیں جا کر اس پر روس کا پورا قبضہ ہو سکا۔ گو قازقستان میں پہلے پہل اسلام ترکوں کے گروہ ازبکوں کے ذریعے پہنچا تھا، لیکن قازقوں میں اسلامی زندگی اور اسلامی ثقافت کو فروغ روسی قبضے کے بعد وولگا یورال کے تاتاریوں کے ہاتھوں ہوا۔ قازقستان میں یہ تاتاری تاجروں اور روسی سلطنت کے اہل کاروں

---

[1] روس کے بالشویک اس وقت اس نام کی پارٹی میں تھے۔ (مدیر)

کی حیثیت سے پہنچے تھے۔ قازقوں کا ایک طبقہ ان روسی دانشوروں سے بھی، جو اُن کے ہاں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے، متاثر ہوا۔ قازقوں کے اس طبقے میں سے ایک شخص ولی خانوف (۱۸۳۵ء - ۱۸۶۵ء) نامی تھا۔ یہ ایک اعلیٰ قازقی خاندان سے تھا، جسے براہ راست چنگیز خاں کی اولاد میں سے ہونے کا فخر تھا۔ اس نے روسی کیڈٹ اکیڈمی میں تعلیم پائی پھر وہ روس کی فوج میں داخل ہوا۔ اور بعد میں اس کی ایک جغرافیہ دان اور ماہر علم الانسان کی حیثیت سے شہرت ہوئی۔ ولی خانوف روسی افسروں اور مالدار قازقوں ہردو سے اپنے غریب اور خانہ بدوش عوام کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لئے وہ قازقوں میں تعلیم اور روسی اور یورپی ثقافت پھیلا کر ان کا ذہنی اور اقتصادی معیار بلند کرنے کا داعی تھا۔ ولی خانوف دولت مند قازقی طبقہ اشراف کے خلاف تھا اس کا کہنا تھا کہ قبائلی نظام اور فرسودہ نام نہاد اسلامی ثقافت قازقوں کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اس ضمن میں وہ لکھتا ہے :- آج ماوراء النہر (دریائے جیحوں اور دریائے سیحوں کا دوابہ) میں جہالت اور افلاس کا دور دورہ ہے۔ سمرقند، تاشقند، فرغانہ، خیوا اور بخارا کی شہرۂ آفاق لائبریریاں اور سمرقند کی تاریخی رصدگاہ تاتاریوں (یہاں مراد چنگیز خاں اور ہلاکو کے دور کے منگول ہیں) کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے تباہ ہو چکی ہیں۔ اور اب بخارا کی عقلیت دشمنی اور رجعت پرستی کا یہ حال ہے وہاں سوائے مذہب میں اپنے خاص فرقے کے ہر چیز مردود ہے اور تو اور اپنی .... عظیم تاریخی یادگاروں کو اس بنا پر برا بھلا کہا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ کی تخلیقی قوت کا مقابلہ کیا گیا ہے[1]۔ ولی خانوف تاتاری ملاؤں کے بھی خلاف تھا[2]۔ اور وہ اسلامی دینی مدرسوں کے بجائے اپنے خانہ بدوش قازق عوام کے لئے روسی قازقی سکول چاہتا تھا۔ بدقسمتی سے اس کی عمر نے دفا نہ کی ایک تو سخت دماغی محنت اور دوسرے روس کی سخت سردی نے اس کی صحت تباہ کردی اور وہ تیس سال ہی کی عمر میں انتقال کر گیا۔

---

[1] اشارہ ہے تصویر کشی کی حرمت کے بارے میں اس "شرعی" دلیل کی طرف کہ جانداروں کی شبیہہ بنانا گویا اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا مقابلہ کرنا ہے۔ (مدیر)

[2] وولگا یورال کا تاتاری علاقہ سب سے پہلے روسی تسلط میں آیا۔ وہاں سے جب روسی شمال مشرقی اور جنوب کے دوسرے ترک علاقوں کی طرف بڑھے، تو وولگا یورال کے تاتاری بھی اون کے پیچھے پیچھے ان علاقوں میں آئے، یہ یا تو روسی حکومت کے اہل کار تھے یا تاجر یا ان کا تعلق مذہبی طبقے اور مذہبی تعلیم پھیلانے والوں سے تھا۔ (مدیر)

ملی قانون کے دو ہم نوا اور تھے، ایک شاعر اباتی اور دوسرا ایک معلم الت بن سربان، یہ دونوں بھی اس کی طرح روسی دانشوروں سے متاثر ہوئے، بات یہ ہے کہ ایک تو قازقوں کی اکثریت خانہ بدوش تھی، دوسرے وہ لگا یدال کے تاتاریوں سے جغرافیائی لحاظ سے دور ہونے کی وجہ سے ان کی ترکی زبان قازقوں کی ترکی سے الگ تھی، پھر وہاں اسلامی معاشرت بھی زیادہ نہ پھیلی تھی، اس لئے قازق بالعموم آل روسی مسلم سیاسی و ثقافتی سرگرمیوں سے بے تعلق رہے۔

وسط ایشیا کے ترک علاقے

وسط ایشیا کو روس نے ۱۸۶۵ء - ۱۸۷۶ء میں فتح کیا۔ روسی سلطنت کے کسی مسلم علاقے میں یورپی ثقافت اور نئے حریت پسندانہ خیالات کی اتنی سخت مخالفت نہیں ہوئی، جتنی کہ وسط ایشیا میں ہوئی۔ اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہاں کی آبادی ابھی انسانی ارتقا کی ابتدائی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اور اس کے لئے ان نئے ترقی یافتہ خیالات کو اپنانا مشکل تھا۔ بلکہ اس کا سبب تھا ان کی زمانہ ماضی کی شاندار تہذیب و ثقافت، جواب بے جان اور فرسودہ ہو چکی تھی۔ وسط ایشیائی تہذیب کا ایک مستند ترین مورخ لکھتا ہے:۔ "قرون وسطے کے مقابلے میں انیسویں صدی کا ترکستان دنیائے اسلام کے سب سے پست ملکوں میں ہے"۔ وسط ایشیا کی یہ سرزمین جس نے صدیوں پہلے دنیا کو الفارابی اور ابن سینا جیسے عہد وسطی کے عظیم الشان مفکر، البیرونی اور الخوارزمی جیسے ممتاز سائنس داں، اور رودکی اور نوائی جیسے عظیم شاعر دیئے، وہ سولہویں صدی کے اوائل ہی سے ثقافتی اور اقتصادی طور پر فرسودگی کا شکار ہونا شروع ہو گئی تھی جب مشرق بعید سے براہ راست سمندر کے راستے تجارت ہونے لگی، اور چین اور ہندوستان کی بر اعظمی تجارت میں وسط ایشیا کے ان نخلستانوں کو جو اجارہ داری حاصل تھی، وہ ختم ہو گئی۔ تو ان لوگوں کی اقتصادی فارغ البالی کی عمارت ایک دم زمین پر آ رہی۔ تقریباً اسی زمانے میں ایران میں شیعہ حکومت برسر اقتدار آ گئی، اور اس کی وجہ سے اس حکومت کے بخارا اور سمرقند میں جو سنی مخالف تھے، ان کا بحیرۂ روم کے اردگرد مشرق قریب کے ملکوں میں آباد مسلمانوں سے تعلقات منقطع ہو گئے۔ ایک تو وسط ایشیا جغرافیائی اعتبار سے یوں بھی دور افتادہ تھا، دوسرے وہ اس طرح بتدریج دنیائے اسلام سے زیادہ سے زیادہ علیحدہ ہوتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں معنوی اور روحانی جمود غالب آتا چلا گیا۔

وسط ایشیا کے تہذیبی و ثقافتی زوال کے یہ اسباب کچھ کم نہ تھے کہ اس کے علاوہ وہاں ۱۰۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک خانہ بدوش ترک تاتاریوں کے مسلسل سیلاب آتے رہے جن سے وہاں کا تمام نظام

آب پاشی تہ وبالا ہوگیا، بڑے بڑے شہر تباہ ہوگئے۔ نخلستانوں کی مستقل آبادیوں کا بڑا حصہ مر کھپ گیا۔ اور ان کی جگہ نسبتاً کم تہذیب یافتہ خانہ بدوش آگئے خاص طور سے پندرہویں صدی کے اواخر میں ازبک جو ماوراالنہر میں ساڑھے تین سو سال سے سلط چلے آتے تھے، وسط ایشیا کی طرف بڑھے اور وہاں ان کا قبضہ ہوگیا۔ ازبک حکمراں خوانین اپنی روایتی معاشرت میں ہر تبدیلی اور اپنے سخت قسم کے جامد سنی مسلک سے ہر انحراف کی مخالفت کرتے تھے۔ چنانچہ عہد وسطیٰ کے فلسفے اور سائنس کی تعلیم ممنوع کردی گئی اور اس کی جگہ کٹر قسم کا علم کلام رائج ہوا، جس نے وسط ایشیائی ذہنی زندگی کو بالکل بے جان کردیا۔ اور آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ اس سرزمین کی تہذیب و ثقافت جامد ہوکر رہ گئی۔

بخارا

روس نے برطانیہ کی برہمی کے خیال سے وسط ایشیا کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھائے تھے، اور وہاں بجائے براہ راست حکومت کرنے کے مقامی خوانین کو ہی رہنے دیا تھا۔ اور یوں بھی وسط ایشیا کے معاملے میں روس کی شروع ہی سے وہاں کے باشندوں کی ثقافتی اور مذہبی زندگی میں کم سے کم عدم مداخلت کی پالیسی رہی۔ اسی طرح اسلامی دینی مدارس کے نظام کو بھی اس نے حسب سابق رہنے دیا۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق وسط ایشیا میں ۶ ہزار مکتب اور ۳۲۸ مدرسے تھے، جن میں مجموعی طالب علم دس لاکھ تھے۔ خان بخارا کی مملکت میں ۴۴۰۰ مکاتب اور ۲۰۰ ۱۳۱ مدرسوں میں کوئی بارہ لاکھ طالب علم تھے۔ ان مدارس میں زیادہ تر عام مذہبی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن ان میں سائنس داخل نصاب تھی نہ "آرٹس" کے فنون، بلکہ تاریخ اسلام تک بھی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود وسط ایشیا اور بالخصوص بخارا کے بہت سے مدرسے جیسا کہ میر عرب کا ایک مشہور مدرسہ تھا۔ اعلیٰ قسم کی مذہبی، فقہی اور علم کلام کی تعلیم دیتے تھے، اور ان کی انیسویں صدی تک پوری اسلامی دنیا میں سب سے بڑھ کر راسخ العقیدہ درسگاہوں کی حیثیت سے بڑی شہرت تھی۔

گو روسی ثقافتی اثرات کو مقامی آبادی میں پھیلانے کے لئے حکومت روس کی طرف سے وسط ایشیا میں جو روسی سکول کھولے گئے تھے، ان کی طرف مسلمان طالب علموں کو مرغوب کرنے کے لئے کافی کوششیں کی گئیں، لیکن مسلمان والدین اس کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ اپنے بچوں کو عیسائی سکولوں میں بھیجیں حکومت کی جملہ مراعات کے باوجود ۱۹۱۲ء میں وسط ایشیا کے روسی ثانوی سکولوں میں کل ۴ ہزار طالب علموں میں سے مسلمان طلبا صرف ۱۹۷ تھے۔ البتہ ایک دوسری قسم کے سرکاری سکول جہاں

ابتدائی جماعتوں میں تو مقامی زبان میں اور اعلیٰ جماعتوں میں روسی میں تعلیم دی جاتی تھی، زیادہ کامیاب رہے۔ لیکن مقامی آبادی کی طرف سے ان کے راستے میں بھی طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں۔ ۱۹۰۵ء میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کی طرف سے حکومت روس سے جو مطالبات کئے گئے، ان میں سے ایک اہم مطالبہ یہ تھا کہ یہ دو لسانی سرکاری سکول بند کر دیئے جائیں اور دینی مکاتب سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کو نئے سکولوں میں مزید تعلیم کے لئے جو وظائف دیئے جاتے ہیں، وہ بند دیئے جائیں۔ بہرحال ان تمام رکاوٹوں کے باوجود پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء – ۱۹۱۸ء) سے کچھ پہلے ان سکولوں کی طرف مقامی آبادی کی زیادہ توجہ ہونے لگی تھی۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں جب وسط ایشیا کے ترک علاقے سلطنت روس کی اقتصادی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئے[1] تو قدرتاً ان پر نئے اثرات زیادہ پڑنے لگے۔ اس مرحلے پر ایک اور تاجک متوسط طبقہ، جسے آزادی پسند مسلم طالب علموں کی تائید حاصل تھی، آگے آتا ہے، اور ایک طرف جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں اور دوسری طرف علماء کا معاشرے میں جو مقام تھا، اس پر فائز ہونے کی کوشش کرتا ہے، وسط ایشیا کے اس نئے رجحان کا اولین نمائندہ ایک بخاری سیاستدان اور شاعر احمد مخدوم دانش (۱۸۲۷ء – ۱۸۹۷ء) تھا۔ وہ امیر بخارا کے سفیر کے سیکرٹری کی حیثیت سے پیٹرزبرگ گیا۔ اور وہاں وہ روسی سکولوں، بے پردہ عورتوں، کتابوں اور رسالوں کی کثرت، روسی دانشوروں اور لوگوں کے اعلیٰ معیار زندگی سے بڑا متاثر ہوا، جب وہ روسی دارالسلطنت سے واپس وطن لوٹا، تو وہ وسط ایشیا کا پہلا یورپیت اور مغربیت کا نقیب تھا۔ اپنی ایک کتاب میں وہ بخارا کے شاہی خاندان پر یوں برستا ہے:-

> "امیر، وزیر، مذہبی طبقے اور اشراف سب ایک سے ہیں۔ اے قاری! تم خود ہی دیکھو۔ یہ امیر، جو پارسا اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کا سربراہ اور تنہا رہا سلطان ہے کس قماش کا آدمی ہے۔ تم اگر اپنے گرد و پیش دیکھو گے، تو تم

---

[1] جب روس میں صنعتی کارخانے قائم ہوئے، تو ان کی تیار کردہ مصنوعات ان ترک علاقوں میں پہنچنے لگیں۔ اور یہ علاقے روسی صنعت کی منڈیاں بن گئیں اب سیاسی اثر و نفوذ کے ساتھ ساتھ روس کا اقتصادی اثر و نفوذ بھی وہاں غالب آنے لگا۔ (مدیر)

ایک عیاش اور مستبد وجابر پادشاہ ہے۔ اس کا قاضی القضاۃ پیٹو اور منافق ہے۔ ایسے ہی اس کا محتسب اور پولیس کا اعلیٰ افسر ہے۔ آخر الذکر ہر وقت پیئے رہتا ہے۔ وہ جواری ہے اور چوروں اور ڈاکوؤں کا سرپرست ہے۔"

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں دانش کے یہی الفاظ تھے، جنہوں نے امیر بخارا کے خلاف آزادی پسند (لبرل) بخاریوں کی جدوجہد میں سب سے موثر دلیل کا کام دیا۔

احمد مخدوم دانش کے بعد اس کے شاگردوں نے اس مہم کو جاری رکھا، اور جب حکومت بخارا کی طرف سے ان پر سختیاں شروع ہوئیں۔ تو ان میں سے اکثر ترکِ وطن کر گئے، عین اسی زمانے میں کریمیا اور وولگا یورال کے تاتاریوں کے اثرات ازبکوں اور تاجکوں تک پہنچے اور ان نواح میں بھی اسماعیل بے گسپرنسکی کے نئے آزادانہ (لبرل) خیالات کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ مسلم لبرل تحریک کے اولین علمبرداروں اور قدامت پسند اکثریت میں سخت ٹکر ہوئی یہ لبرل نئے طریقہ تعلیم اور پرانی روایتی معاشرت میں تبدیلیوں کو مسلم معاشرے کو تباہی سے بچانے کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے، اور اس کے برعکس قدامت پسند ان تبدیلیوں کو مسلمانوں کی خاندانی زندگی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیتے تھے۔

جدیدیین اور قدیمیین میں ٹکر

ان دو مخالف نظریوں کے تصادم کا سب سے نمایاں مظاہرہ سکولوں کے بارے میں ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں اسماعیل بے گسپرنسکی خود وسط ایشیا آئے، اور ان کے زیر اثر وہاں نئے قسم کے اصلاح شدہ مدارس کھلنے لگے اور لبرل تحریک نے بھی زور پکڑنا شروع کیا۔ تاشقند جو روسی وسط ایشیا کا انتظامی اور ثقافتی مرکز تھا لبرل تحریک کے حامیوں کا محور بن گیا۔ جب خاص روس میں انقلابی سرگرمیاں عام ہوئیں۔ تو وسط ایشیا کے لبرل مسلمان لیڈروں کے بھی حوصلے بڑھے اور تاشقند سے "جدیدیین" نے متعدد رسالے نکالنے شروع کئے جن میں "خورشید" "شہرت" "ایشیا" اور "ندائے ترکستان" خاص طور پر نمایاں تھے۔ تاشقند کے بعد لبرل تحریک کا دوسرا اہم مرکز سمرقند تھا۔ اسی طرح فرغانہ میں بھی ترک لبرل تحریک کے قدم پہنچے۔ اور وہاں سے بھی جدیدیین نے اپنے رسالے نکالے ترکوں کی سب صحافتی سرگرمیاں ۱۹۰۵ء میں روسی آئین کے نفاذ کے بعد شروع ہوئی تھیں ۱۹۰۹ء میں "جدیدیین" نے اپنی تحریک کو مزید تقویت دینے کے لئے ایک ثقافتی سوسائٹی قائم کی، جو

لبرل صحافت' کو ترقی دینے اور تعلیمی اصلاحات کو مزید تقویت دینے کے لئے ایک ثقافتی سوسائٹی کی نشر واشاعت کے لئے وقف تھی۔ یہ سوسائٹی روسی حکام کی اجازت سے وجود میں آئی تھی۔

لیکن ایک وقت آیا کہ روس کے سرکاری حلقوں میں ترکوں کی اس لبرل تحریک سے خدشے پیدا ہونے لگے۔ لہذا انہوں نے اس کے خلاف اقدامات کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ وسط ایشیا میں شائع ہونے والے وولگا یورال کے تاتاریوں کے اخبارات اور مدارس بند کئے جانے لگے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک طرف ازبکوں اور تاجکوں اور دوسری طرف وولگا یورال کے تاتاریوں میں جو دراصل لبرل تحریک کے ہراول تھے، روسی حکام کی طرف سے اختلاف و منافرت کے بیج بونے کی پالیسی شروع کی گئی۔ جدیدیین کے اس بڑھتے ہوئے اثر کی مخالفت کے لئے حکومت روس نے قدامت پسند مسلمانوں کی تائید حاصل کی۔ اور اب اس کی نظر عنایت خاص طور پر قدامت پسند مسلم مدارس و علماء کی طرف ہو گئی۔ یہ قدامت پسند گروہ اتفاق سے "جدیدیین" کی اصلاحی سرگرمیوں کو روسی حکومت سے بھی زیادہ ناپسند کرتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں تاشقند کے اخبار "ترقی" نے قدامت پسند مدارس اور ان کے استادوں پر اعتراض کیا، تو اس سے قدامت پسند اور "قدیمین" اتنے بگڑ گئے کہ تاشقند کے علماء کے ایک اجتماع میں اخبار مذکور کے ایڈیٹروں اور حامیوں کو کافر قرار دیا گیا۔ اور وہ مساجد سے نکال دیئے گئے۔

بخارا اور خیوا میں جو براہ راست حکومت روس کے زیر انتظام نہ تھے، "جدیدیین" کے لئے حالات اور بھی زیادہ ناسازگار تھے۔ بخارا میں تو خاص طور سے علماء کا غیر محدود اثر و نفوذ تھا۔ اور بخارا کے فرمانروا لبرل خیالات سے مطلق کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کی مخالفت کے باوجود وولگا کے تاتاریوں کی کوششوں سے اور مقامی روسی حکام کی سرپرستی میں بخارا میں بھی بعض نئے سکول قائم ہو گئے۔ اس ڈر سے کہ نئے سکولوں کی کامیابی کی بخارا کے قدامت پسند مدارس پر زد پڑے گی، علماء نے ان سکولوں کو بند کرانے کے لئے ایسی متعصبانہ مذہبی فضا پیدا کر دی کہ ۱۹۱۰ء میں سخت قسم کے سنی شیعہ فسادات ہو گئے۔ جنہیں روسی فوج نے آکر دبایا۔ گو بخارا کے امیر اور وہاں کے علماء کو دوسرے علاقوں کے روسی و مسلم سیاسی حلقوں کے دباؤ کے تحت وقتی طور پر جھکنا پڑا تھا۔ اور بخارا میں بعض نئے سکول کھل گئے تھے۔

لیکن جونہی ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم چھڑی، امیر بخارا نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور دو سال قبل اس نے بخاری لبرلوں کو جو مراعات دی تھیں، وہ اس نے واپس لے لیں۔ اور علماء کے مطالبے کے سامنے "سر تسلیم خم" کرتے ہوئے تمام نئے سکول بند کر دیئے۔ ان سکولوں کے بہت سے استاد مشرقی بخارا کی طرف جلاوطن کر دیئے گئے۔ اور بعض خاص روس بھاگ گئے۔ لیکن لبرل خیالات اور نئے طریقۂ تعلیم کی جڑیں ذہنوں میں جم چکی تھیں، اس سے اس کے اثرات بالکل زائل نہ کئے جا سکے، اور نئی روشنی کا عمل برابر جاری رہا۔

دوسرے روسی وسطی ایشیائی صوبوں کی طرح بخارا میں بھی تعلیمی اصلاحات کی تحریک کے بعد سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ ان میں پیش پیش ایک تو بخارا کے دولت مند تاجر خاندان تھے، جو بعد میں امیر بخارا کے خلاف بالشویکوں کے حلیف بنے، دوسرے لبرل تحریک کو دینی مدارس کے محروم و مایوس طالب علموں میں سے بھی استاد اور پروپیگنڈا کرنے والے ملے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کے اکثر لیڈر خود بخارا کے ان دینی مدرسوں کے فارغ التحصیل تھے جہاں کی علم الکلام کی بحثوں کی مشق و تربیت نے انہیں جدلیاتی اور نظریاتی انداز میں غور و فکر کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔

عبدالرؤف فطرت

بخارا کے ان لبرلوں کا مسلّمہ نظریاتی لیڈر عبدالرؤف فطرت تھا۔ بخارا کے دینی مدارس میں تعلیم پانے کے بعد اسے لبرل "جدیدیین" کے دولتمند حامیوں نے مزید تعلیم کے لئے قسطنطنیہ بھیجا۔ وہاں اتحاد و ترقی کے نوجوان عثمانی[1] ترکوں سے اس کا ربط ضبط ہوا۔ اس کی پہلی کتاب "مناظرہ" بخارا کے جدیدیین" کا ایک لحاظ سے منشور بن گئی۔ (مسلسل)

---

[1] سلطان عبدالحمید کی آمریت کے خلاف عثمانی ترکوں میں اتحاد و ترقی کے نام سے ایک تحریک چل رہی تھی۔ جس کے حامیوں کو نوجوان ترک کہا جاتا تھا۔ نوجوان ترک آخر میں کامیاب ہوئے۔ سلطان عبدالحمید ۱۹۰۸ء میں معزول کر دیا گیا۔ اور نوجوان ترکوں نے سلطان کے ماتحت ایک دستوری حکومت بنا لی۔

(مدیر)

حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ

مولانا عزیز الرحمٰن مفتی[1]

حضرتؒ ۱۲۸۸ھ میں ابھی پورے طور پر فارغ التحصیل بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ کو معین مدرس کر دیا گیا تقریباً پورے ایک سال آپ نے مدرسہ میں معین مدرس کی حیثیت سے طلباء کو مختلف کتابیں پڑھائیں. جب طلباء کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا تو منتظمین حضرات کو اسٹاف بڑھانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس وقت تک (۱۲۹۲ھ) شاہ رفیع الدین صاحب نے (جو اس وقت مہتمم تھے) مدرس چہارم کے لئے حضرت شیخ الہندؒ کو منتخب کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد چونکہ ایک متمول آدمی تھے وہ تنخواہ لے کر پڑھانا پسند نہ کرتے تھے. اس لئے معاوضہ سے انکار کر دیا۔ لیکن حضرت شاہ صاحب موصوفؒ کے سامنے ان کو بھی مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح حضرت شیخ الہندؒ کو ۱۵ روپیہ ماہوار پر مدرس چہارم بنایا گیا۔ اس طرح ۱۲۹۲ھ میں مدرسہ عربیہ دیوبند کے باضابطہ چار استاد ہو گئے۔

۱۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین

۲ " " سید احمد صاحب دہلوی مدرس دوم

۳۔ " " ملا محمود صاحب " سوم

۴۔ " " محمود حسن صاحب شیخ الہند " چہارم

---

[1] یہ مضمون "مدینہ" بجنور سے شکریہ کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن مفتی صاحب نے حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند صاحب کے سوانح حیات مرتب کئے ہیں، جو اس وقت زیر طبع ہیں، "مدینہ" کا مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے جس کا ایک حصہ یہاں شائع کیا گیا ہے۔

(مدیر)

حضرت مولاناؒ اگرچہ مدرس چہارم تھے لیکن طلبار کو بڑی بڑی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

میں ابتداء میں قطبی اور قدوری پڑھا لینے کو بھی غنیمت سمجھتا تھا (از میاں اصغر حسین صاحب ص۱۱)

۱۲۹۳ھ میں یعنی تقرر کے دوسرے سال آپ نے ترمذی، مشکوٰۃ، ہدایہ وغیرہ نو کتابوں کے اسباق پڑھائے۔ اس وقت مدرسہ مسجد قاضی اور جامع مسجد سے منتقل ہو کر اپنی موجودہ عمارت میں آچکا تھا، ۱۲۹۴ھ میں آپ حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں سے واپسی پر ۱۲۹۵ھ سے بخاری شریف وغیرہ بھی پڑھانا شروع کر دیں۔

۱۲۹۷ھ میں جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا وصال ہو گیا تو آپ نے چند دنوں کے لئے پڑھانا بند کر دیا تھا، لیکن حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے سمجھانے سے پھر پڑھانا شروع کر دیا اور ۱۳۰۲ھ یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے وصال تک مدرس دوم کی حیثیت سے درس دیتے رہے۔ ۱۳۰۵ھ میں جب مولانا سید احمد صاحب مدرس اوّل بھوپال تشریف لے گئے تو آپ صدر مدرس بنا دیئے گئے۔ اس وقت یعنی ۱۳۰۵ھ لغایت ۱۳۳۹ھ تک آپنے دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی کے فرائض انجام دیئے۔ اس طرح دارالعلوم دیوبند میں آپ نے از ۱۲۸۹ھ لغایتہ ۱۳۳۹ھ تقریباً پچاس سال علم نبوت کی اشاعت فرمائی۔

اس مدت میں حضرتؒ نے کبھی ترتیب درجات اور مقدار مشاہرہ پر توجہ نہیں دی اور نہ اس کا خیال کیا۔ وہ ہمیشہ دارالعلوم دیوبند کی خدمات خدا کا کام سمجھ کر کرتے رہے جیسے صحیح روایات کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ آپ مشاہرہ قبول ضرور فرماتے تھے۔ لیکن بکراہت اور بضرورت (از میاں اصغر حسین ص۲۰) کیونکہ متاخرین فقہار حنفیہ نے تعلیم پر ضرورتاً اجرت کو جائز قرار دیا ہے اور مشہور قاعدہ ہے۔ الضرورۃ بقدر الضرورۃ۔ (ضرورت قدر ضرورت تک ہی محدود ہے۔) چنانچہ خلفائے راشدین اور اسلاف کہ جن کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں، کا یہی معمول رہا ہے کہ انہوں نے قومی اور ملی خدمات پر بقدر ضرورت رزق پر اکتفا کیا ہے بلکہ بہت سے واقعات تو اس قسم کے موجود ہیں کہ وہ حضرات ضرورتوں کو بھینٹ ہوئے تھے اور عسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ افسوس کہ آج ان اوصاف کے حامل نظر نہیں آتے۔

حضرت شیخ الہند کو بہت سے ایسے مواقع پیش آئے کہ وہ چاندی اور سونے کے چبوترے پر بیٹھتے مگر انہوں نے ہر حال میں دارالعلوم دیوبند کی فقیرانہ زندگی کو ترجیح دی۔ پیسہ جی

عبدالرزاق صاحب گنگوہی نے ہرچند کوشش کی کہ مولانا دہلی تشریف لے آئیں اور شاہ ولی اللہ کی درس گاہ کو پھر سے آباد کریں۔ لیکن مولانا نے ہرگز یہ گوارا نہ کیا (از میاں اصغر حسین صاحب ص ۳۰)

۱۳۱۲ھ میں جب بوجہ گرانی دیگر مدرسین کے مشاہروں میں اضافہ ہوا تو بحکم مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ آپ کا مشاہرہ پچاس روپے ہوگیا۔ آپ نے خاموشی سے قبول فرمایا۔ دو مرتبہ استاد شفیق کو خواب میں فرماتے دیکھا "محمود حسن کب تک مشاہرہ لیتے رہوگے" دونوں مرتبہ پورا عزم کر لیا کہ اب نہ لوں گا مگر حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ادب سے مجبور تھے۔ اجازت نہ دی ہنس کر فرمایا نہیں، ان کو کہنے دو ہرگز نہ چھوڑو، مگر جب حضرت مولانا ممدوح کی وفات ہوگئی اور ماتحت مدرسین کے اضافہ کے ساتھ آپ کے پھر روپے مقرر ہوئے تو آپ نے اضافہ بالکل قبول ہی نہ فرمایا اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہرہ لینا بالکل بند کر دیا اور پھر بھی اسی پابندی اور دلسوزی سے درس دیتے رہے۔

حضرت شیخ الہند پابندی کے ساتھ صبح کی نماز ادا فرماکر درس کے لئے تشریف لے آتے تھے کبھی وضو یا پیشاب کے لئے درمیان میں اٹھتے تو مضائقہ نہیں تھا۔ ورنہ مسلسل درس دیتے دیتے گیارہ بارہ بج جاتے تھے اور ظہر کے بعد بھی یہی مشغلہ موجود رہتا تھا۔ ۱۳۲۰ھ سے پانچ چھ گھنٹہ درس دینا شروع کر دیا تھا اور بوجہ ضعف بقیہ اوقات درس سے فارغ رہتے تھے۔ پھر جب علامہ انور شاہ کشمیری، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مدرس ہوگئے تو بخاری اور ترمذی کا دو تین گھنٹہ درس دینے پر اکتفا کیا تھا۔

حضرت نے تمام عمر چٹائی پر بیٹھ کر درس دیا۔ آخر عمر میں جب مرض بواسیر نے شدت اختیار کی تو خدام نے اسپرنگ دار گدا بنوا دیا تھا۔ لیکن آپ اس پر بیٹھتے ہوئے کراہت محسوس کرتے تھے۔ مولانا کا حلقہ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا۔ جس میں ہر طرف سکون و وقار سایہ فگن ہوتا تھا۔ دور دور سے ہر استعداد کے طلباء آتے اور آپ ہر ایک کو مطمئن فرما دیتے تھے۔ بہت سے طلباء تو کئی سال دورہ حدیث پڑھانے کے بعد شریک درس ہوتے اور آپ ان سب کے شکوک و شبہات کا ازالہ فرماتے تھے۔

حضرت مولانا کی تقریر نہایت سلیس اور رواں ہوتی تھی نہ کرختگی اور نہ نرمی، بلکہ آپ متوسط آواز میں مسلسل بولا کرتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جب آپ کو جوش آیا تو بولنے میں گلے کی رگیں پھولنے لگیں اور چہرہ کی رنگت بدل گئی۔ بلکہ پورے وقار و متانت کے ساتھ سلسلہ تقریر جاری رہتا تھا۔

اور سامعین مضامین اور دلائل و شواہد کے اظہار سے محسوس کرتے کہ اس وقت مولانا پورے جوش و خروش سے تقریر فرما رہے ہیں۔

طرز استدلال اتنا عجیب تھا کہ پہلے ہر مسئلہ کا اثبات قرآن پاک کی آیات پھر احادیث اور پھر آثار صحابہ سے ترتیب وار بیان فرماتے۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر جب قرآنی آیات تلاوت فرماتے تو سامعین یہ یقین کرکے اٹھتے تھے کہ یہی حق ہے۔ تمام ائمہ کا ادب و احترام حد درجہ ملحوظ رکھتے تھے۔ کسی بھی مصنف اور امام کی شان میں کوئی گرا ہوا لفظ نہ بولتے۔

امام مسلم نے جو اپنی کتاب میں امام بخاری پر تعریض کرکے گرفت کی ہے اس پر فرمایا جیسے ملاقات ہوئی تو بخاری کے خادم اور عقیدت مند ہوگئے۔ کاش اس طرح امام بخاری اور امام ابوحنیفہ کی ملاقات ہو جاتی تو اپنے سب اعتراض واپس لے لیتے، لیکن افسوس کہ آج ۔۔۔۔۔۔۔۔ امام بخاری اور امام مسلم اور کسی بھی امام کی خیر نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں تھوکا چاٹا چاہیے گھنا۔

"جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے"

حضرت شیخ الہند اسباق پوری تیاری اور پورے مطالعہ کے بعد پڑھاتے تھے شروحات حدیث اور فقہ کو نہ معلوم کتنی کتنی مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ میاں اصغر حسین صاحب فرماتے ہیں ایک دن حضرت نے فرمایا ذرا عینی لاؤ۔ میں نے عرض کیا! بخاری کی شرح عینی فرمایا، نہیں اس کو تو دسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوں بلکہ ہدایہ کی شرح عینی لاؤ۔

حضرت شیخ الہند کا طریقہ درس اور جمع بین الاقوال والاحادیث وہی تھا جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی درس گاہ کا تھا۔ آپ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اقوال کو نہایت اعتماد اور احتیاط کے ساتھ پیش فرماتے تھے۔

اگرچہ آپ کو حدیث میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب پانی پتی اور بلاواسطہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے بھی اجازت حاصل تھی لیکن آپ حلقہ درس میں اپنی سند اس طرح بیان فرمایا کرتے تھے۔

۱۔ عن مولانا الشیخ محمد قاسم صاحب عن مولانا الشیخ عبدالغنی عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہ دہلوی۔

۲۔ عن مولانا الشیخ احمد علی سہارنپوری، عن مولانا الشاہ محمد اسحٰق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہ الخ

افتتاح حدیث کراتے وقت اسلاف کا یہی طریقہ رہا ہے۔ اس لئے آپ بھی ہر سال پابندی سے اسی پر قائم رہے۔

ربیع الاول ۱۳۰۲ھ میں حلقہ دارالعلوم دیوبند کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس مدرسہ عربیہ دیوبند کی وفات حسرت آیات کا جانکاہ صدمہ پیش آیا، مولانا کی شخصیت شریعت و طریقت کو جامع تھی۔ آپ اپنے زمانہ میں مولانا محمد قاسم کے جانشین سمجھے جاتے تھے ان کی وفات کے بعد، حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی (جو علوم عقلیہ کے ماہر تھے) کو چالیس روپے ماہوار پر صدر مدرس منتخب کیا گیا۔ اور ملا محمود صاحب دیوبندی ۳۵ روپے ماہوار پر مدرس دوم اور حضرت شیخ الہند صاحب تیس روپے پر مدرس سوم اور مولانا عبدالعلی صاحب مدرس چہارم مقرر ہوئے۔

دو سال کے بعد حضرت ملا محمود صاحب کا انتقال ہو گیا تو حضرت شیخ الہند ان کی جگہ ۳۵ روپے مشاہرہ پر مدرس دوم مقرر ہو گئے۔ جب ۱۳۰۵ھ میں حضرت مولانا سید احمد صاحب اپنی ذاتی ضروریات سے بھوپال تشریف لے گئے تو حضرت شیخ الہند کو ان کی جگہ مدرس اول مقرر کر دیا گیا۔ ویسے تو حضرت ۱۲۹۵ھ ہی سے درسیات کی بڑی کتابیں پڑھایا کرتے تھے منطق، فلسفہ، علم معانی و بیان، تفسیر، حدیث تمام علوم کو بلا لکان پڑھاتے تھے۔ لیکن ۱۳۰۵ھ لغایتہ ۱۳۳۹ھ تقریباً ۳۴ یا ۳۳ سال آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث دونوں منصبوں کے تنہا مالک رہے۔

حضرت شیخ الہند نے ۱۲۹۵ھ لغایتہ ۱۳۳۹ھ کم و بیش چوالیس سال دارالعلوم دیوبند کے ایک مستقل مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور تقریباً ۳۰ سال تو اس طرح پڑھایا کہ بجز چند اسفار کے کوئی سفر اختیار نہیں کیا۔ پڑھانے کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے دارالعلوم دیوبند کی توسیع و ترقی کے لئے بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ حقیقت یہی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے جو بھی خاکہ اس مدرسہ کے لئے مرتب کیا ہوگا اس کو مکمل کرنا اور دیوبند کے اس چھوٹے سے مدرسہ کو دارالعلوم دیوبند کی شکل دیکر اسلامی ممالک میں ممتاز مقام پر پہنچا دینا یہ صرف تنہا حضرت شیخ الہند کا کام تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے اس مدرسہ میں آپ کے زمانے میں دوسرے ملکوں (کشمیر، پنجاب، سندھ، افغانستان، بخارا، سمرقند، تاشقند، برہما، رنگون، آسام، مدراس، وغیرہ) کے طلبا آنے شروع ہو گئے تھے اور

یہاں کے فارغ طلبا عرب، حجاز اور مذکورہ تمام ممالک میں پھیل کر یہاں کے نقطۂ نظر کے مطابق اشاعت دین کر رہے تھے۔ اگر ترقی ہی کی حیثیت کو سامنے رکھ کر کسی کو بانی قرار دیا جا سکتا ہے تو یہ سعادت حضرت شیخ الہند کو بھی حاصل ہے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کے بانی ہونے کی سعادت حضرت سید حاجی عابد حسین صاحب کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء

ممتاز تلامذہ

حضرت شیخ الہند کے تمام تلامذہ کی فہرست مرتب کرنا دشوار ہے۔ البتہ اس جگہ ان چند ممتاز تلامذہ کی فہرست مولانا محمد میاں صاحب کے رسالہ "علماء حق حصہ اول" سے[1] نقل کی جا رہی ہے جو مشہور و متعارف ہیں۔

۱۔ سیدی و مرشدی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی
۲۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
۳۔ علامہ بطل حریت عبیداللہ صاحب سندھی
۴۔ علامہ انور شاہ صاحب کشمیری
۵۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب
۶۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند
۷۔ مولانا محمد میاں صاحب عرف مولانا منصور انصاری
۸۔ مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب
۹۔ مولانا سید فخر الدین احمد صاحب صدر جمعیتہ علمائے ہند و شیخ الحدیث
۱۰۔ مولانا عبدالسمیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند
۱۱۔ مولانا احمد علی صاحب مفسر قرآن لاہوری
۱۲۔ مولانا محمد صدیق صاحب مہاجر مدنی
۱۳۔ مولانا محمد صادق صاحب کراچی
۱۴۔ مولانا عزیر گل صاحب

---

[1] معلوم ہوتا ہے مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کا اسم گرامی سہواً رہ گیا ہے۔ (مدیر)

۱۵- مولانا عبدالوہاب صاحب دربھنگہ
۱۶- مولانا سید احمد صاحب مدنی بانی مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ
۱۷- مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی
۱۸- مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزئی (علماء حق ص ۱۱۱)
۱۹- استاذی مولانا سید حامد حسن صاحب گنگوہی ثم نہٹوری
۲۰- مولانا رحمت اللہ صاحب نہٹوری۔

...... میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ (جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے) کے فرستادہ کی حیثیت سے حضرت الاستاذ شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بطور پیغام رساں حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا صحیح سیاسی مسلک کیا ہے؟۔ یہ پیغام سنتے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے ارشاد فرمایا

حضرت الاستاذ (نانوتوی) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلّم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔

آخر میں ارشاد فرمایا۔

(صرف) تعلیم و تعلم، درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔

مدرسہ دیوبند کی یہی وہ اساسی خصوصیت تھی، جس نے اس مدرسہ کے تمام کاروبار حتیٰ کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرور خصوصیات پیدا کیں اور وہ دینی اور مذہبی حمیت وغیرت کا ہندگیر ہی نہیں، عالمگیر جامعہ اور آفاقی ادارہ بن گیا۔

(سوانح قاسمی مولفہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

تنقید و تبصرہ

مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

طابع و ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ (انڈیا)

جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب ایک عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اردو اور عربی کے ایک ممتاز اہل قلم و انشا پرداز ہیں، بلکہ عالم اسلام اور بالخصوص عربی دنیا پران کی بڑی وسیع اور عمیق نظر ہے۔ نیز حال ہی میں آپ نے یورپ کی سیاحت فرمائی ہے۔ ان تمام خوبیوں پر مستزاد یہ کہ موصوف ایک صاحب دعوت بزرگ ہیں۔ اور ان کی مخاطب بالعموم ساری اسلامی دنیا ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب بھی آپ کی اسی دعوت کی ایک کڑی ہے۔ اصل کتاب عربی میں تھی۔ اس میں کافی اضافہ کرکے اسے اب اردو قالب میں پیش کیا گیا ہے۔

آج کل اکثر و بیشتر مسلمان ملکوں میں قومیت، تجدد پسندی اور مغربی تہذیب کو اپنانے کی جو تحریکیں چل رہی ہیں، مصنف نے اس کتاب میں بڑی تفصیل سے ان کا جائزہ لیا ہے، اور ان تحریکوں کے قائدین کی تقریروں و تحریروں کے اقتباسات دے کر بتایا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کیا سوچتے اور کیا کرتے ہیں۔ اور اپنی اپنی قوموں کو وہ کس طرف لے جانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ مصنف نے یہ حالات و واقعات بیان کرکے ان سے جو نتائج نکالے ہیں، ان کے بارے میں موصوف سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے ان ملکوں کی موجودہ صورت حال کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ بہت حد تک صحیح اور مبنی برحقیقت ہے اور اس سے دنیائے اسلام کی اس کشمکش کو سمجھنے میں بڑی مدد

ملتی ہے، جو اس وقت وہاں اسلامیت اور مغربیت میں برپا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب عالم اسلام کو مغربی تہذیب کا سامنا کرنا پڑا تو اس وقت بقول مصنف کے یہ تہذیب "تازہ دم، زندگی اور نشاط، حوصلہ و عزم اور ترقی و وسعت کی صلاحیت سے بھرپور" تھی اور اس کی مستحق تھی کہ اس "کا شمار تاریخ انسانی کی طاقتور ترین اور وسیع ترین تہذیبوں میں کیا" جاتا۔ لیکن "اس تہذیبی مجموعہ میں ناقص اجزا بھی تھے اور مکمل بھی۔ مضر بھی اور مفید بھی۔ صحیح بھی اور غلط بھی۔۔۔۔"

دنیائے اسلام کے لئے جو ظاہر ہے اس وقت سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ذہنی اور بہت حد تک روحانی زوال کے نرغے میں تھی، مغربی تہذیب کی اس یلغار نے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی تھی۔ مصنف کے نزدیک اس کا ردعمل تین طرح ہوا۔ ایک تو منفی اور سلبی رویہ تھا۔ یعنی یہ کہ "عالم اسلام اس تہذیب کے سارے نتائج اور فوائد کا یکسر انکار کردے اور اس کی کوئی اچھی بری بات سننے کا روادار نہ ہو، ۔۔۔۔ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائے نہ ان علوم کو ہاتھ لگانے پر تیار ہو، جن میں اہل مغرب کو تفوق و امتیاز حاصل ہے ۔۔۔"

مصنف نے سعودی عرب افغانستان اور یمن کی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ انجام کار یہ سلبی رویہ کتنا مضرت بخش ثابت ہوا۔ اور اس تفریط کا نتیجہ آج کس قسم کی افراط میں نکل رہا ہے۔

مثال کے طور پر ایک زمانے میں سعودی عرب میں مغرب سے ہر آوردہ چیز سے انتہائی نفرت کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض نجدی قبائل کو ٹیلیفون کی "بدعت" تک گوارا نہ تھی اور ان میں سے ایک مشہور قبیلے غط غط نے تو سلطان ابن سعود کی ان "بدعات" سے مشتعل ہو کر بغاوت بھی کر دی تھی۔ لیکن مصنف کے نزدیک "اب سعودی حکمراں خاندان پہلے زمانے کے صحرا میں حکومت کرنے والے وہابی شیخ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ وہ معاشرتی شان و شوکت کے ساتھ ہر قسم کے سامان عیش و راحت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں ۔۔۔۔ جس جوش و خروش کے ساتھ کسی زمانے میں وہابی قبائل نے اسلام کے بنیادی اصول کا دفاع کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے جس سادگی پر زور دیا تھا وہ اب بالکل غائب ہے۔ اب غیر ملکی سامان تعیش کے خلاف تہدید آمیز احتجاج نہیں ہوتے۔ آج ان سب کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا ہے، بلکہ سوسائٹی کے سب ہی طبقے ان کو حاصل کرنے میں

کو شاں نظر آتے ہیں (ایک امریکی کتاب سے اقتباس)

اسی طرح قدامت پسندی اور مغربیت سے نفرت میں افغانستان بھی سعودی عرب سے پیچھے نہ تھا۔ لیکن اب بقول مصنف کے "ٹائمز آف انڈیا" کے ایک یورپین نامہ نگار کے الفاظ میں:۔

"...... افغانستان میں عورتوں نے اگست ۱۹۵۹ء سے بے نقابی شروع کی ہے۔ ایک شاہی فرمان کی رو سے عورتوں کو برقع سے باہر نکلنے کا حکم تو نہیں دیا گیا، لیکن اجازت دے دی تھی۔ میں نے کابل یونیورسٹی کی ایک میڈیکل انڈر گریجویٹ، زندگی اور زندہ دلی کی مجسم تصویر مساۃ معصومہ کاظمی سے پوچھا کہ تم نے (اس فرمان کے اجراء کے بعد) کیا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میری بہن اور میں نے اپنی برقع کی چادروں کو نذر آتش کر دیا اور ہم نے قسم کھائی کہ اب کبھی برقع اور چادر نہ استعمال کریں گی... آج افغانستان کی یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم جاری ہے، جہاں پہلے طالبات چادر اوڑھ کر آنے اور طالب علموں سے علیحدہ پڑھنے کی عادی تھیں۔"

مصنف فرماتے ہیں:۔" قریب قریب یہی یمن اور ان تمام ممالک کا حشر ہوتا نظر آ رہا ہے۔ جنہوں نے عرصہ تک نئی چیزوں کا انکار کیا۔ اور مفید علوم، بے ضرر وسائل، نئے تنظیمی تجربوں، رفاہی تدابیر اور فوجی استحکامات کو بھی اپنے حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔"

جب دنیائے اسلام کے ان سب سے بڑھ کر قدامت پسند اور مغربیت بیزار ملکوں میں تجدد پسندی کی لہر اس زور شور سے اٹھ رہی ہے، تو جہاں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے مغربیت کا اثر و نفوذ شروع ہو چکا ہے، وہاں یہ تجدد پسندی کس انتہا کو پہنچ چکی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

دوسرا موقف مصنف کے الفاظ میں "شکست خوردگی"، مکمل سپردگی اور ایک عقیدت مند اور سرگرم مقلد اور ایک ایسے ہونہار و سعادت مند شاگرد کا ہے جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا، اور وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا کوئی حصہ اس مادی، مشینی اور اپنا مخصوص مزاج و ذہن رکھنے والی تہذیب کو جوں کا توں قبول کرے اور اس کے سارے بنیادی عقائد، فکری رجحانات، مادی افکار و خیالات اور سیاسی و اقتصادی نظام پر ایمان لے آئے...."

مولانا سید ابوالحسن علی فرماتے ہیں کہ "اس طرزِ فکر اور طریقہ کار کا سب سے پہلے ترکی میں تجربہ کیا گیا" اور اب ایک ایک کرکے جو مسلمان ملک بھی آزاد ہوتا ہے، وہ ترکی ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ترکی میں اس طرز فکر اور طریقہ کار کا کس طرح تجربہ کیا گیا۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے اسے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے نامق کمال اور ضیا، گوک الپ جیسے اہل فکر و قلم اور اتا ترک جیسے عملی آدمی کے اقوال و اعمال پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد ایک ایک کرکے دوسرے مسلمان ملکوں میں اس ضمن میں جو انقلابات ہو رہے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔

اسلامیت اور مغربی تہذیب کی اس کش مکش نے ہندوستان میں جو شکل اختیار کی، اسے بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ یہاں اس سلسلے میں "دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ پہلی قیادت دینی قیادت تھی، جس کے علمبردار علمائے دین تھے، دوسری قیادت کے علمبردار سر سید احمد خاں، ان کے حلقہ بگوش اور جدید مکتب خیال کے افراد تھے۔"
مصنف کے نزدیک جہاں تک علمائے کرام کا تعلق تھا، انہوں نے خیر اسی میں سمجھی کہ وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائیں، اور اس طرح "اسلامی زندگی کے مظاہر اور اسلامی تہذیب کے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں، ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔" موصوف کے الفاظ میں دیوبند اس رجحان کا علمبردار اور ہندوستان میں اسلامی ثقافت و تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔"

دوسری قیادت کا علم سید احمد مرحوم نے بلند کیا۔ وہ مصنف کے نزدیک "مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب و نقائص کے ساتھ اور بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کے داعی تھے" اسی ضرورت کے تحت انہوں نے اسلام اور قرآن کی انیسویں صدی کے آخر کے سائنسی معلومات اور مغربی تمدن کے معیاروں کے مطابق قرآن کی توجیہ کی۔ سر سید کے اس "تقلیدی رجحان" کے خلاف جو ردّ عمل ہوا، مصنف کے خیال میں اس کے فکری تائد اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال تھے، اور عملاً اس ردّ عمل نے خلافت تحریک اور بعد میں تحریک پاکستان کی شکل اختیار کی۔ ظاہر ہے مصنف کے اس خیال سے اتفاق کرنا ذرا مشکل ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل ان کے اس خیال سے اتفاق کرنا ہے۔ چوں کہ پاکستان کے عائلی قانون میں بعض اصلاحات کی گئی ہیں، اس کی وجہ سے بقول ان کے پاکستان

اپنے بنیادی مقاصد سے انحراف کا مرتکب ہوا ہے۔ لیکن شاید مصنف اس سے واقف نہیں کہ پاکستان تحریکِ مسلم لیگ کا حاصل ہے۔ اور اگر مصنف مسلم لیگ کی پوری تاریخ اور اس کی سیاسی جدوجہد کی نوعیت کو ملحوظ نظر رکھتے تو وہ اس قسم کا فیصلہ نہ دیتے۔ افسوس ہے کہ جس طرح وہ ترکی، ایران، مصر اور دوسرے مسلم ممالک کی سیاسی و معاشرتی تبدیلیوں کا سراغ لگاتے وقت اکثر سطحی باتوں میں الجھ کر رہ گئے، یہی کیفیت ان کی پاکستان کے متعلق بھی ہے پاکستان پر فردِ جرم لگاتے وقت ان کے سامنے تحریکِ پاکستان کی تاریخ اور اس کی قیادت کی صحیح تصویر ہونی چاہیئے تھی، پاکستان سرسید کے مکتبِ فکر کا ردِّ عمل نہیں، بلکہ وہ ردِّ عمل ہے اس مکتبِ فکر کا، جو نئے زمانے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں سے آنکھیں بند رکھنے کا داعی تھا۔ اور گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں انگریزی عمل داری کی وجہ سے اس برصغیر میں جو سیاسی معاشرتی اور اقتصادی تغیرات رونما ہو چکے تھے، ان کو اپنانے سے انکار کرتا تھا۔

مصنف فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی اوپر کی دو قیادتوں کے علاوہ اسی زمانے میں ندوۃ العلماء کی فکری تحریک بھی ابھری" اور اس کے قائم کردہ دارالعلوم میں اس کی صلاحیت تھی کہ وہ اسلامی اور مغربی ثقافت اور علمائے دین و جدید طبقے کے درمیان پل کا کام کر سکے، اور ایک ایسا متوازن فکر تیار کر سکے، جو قدیم و جدید دونوں کے محاسن کا جامع ہو...."

لیکن خود انہی کے الفاظ ہیں۔

"اس تحریک کو قدیم و جدید دونوں طبقوں کا (اس وسیع خلیج کی وجہ سے جو ان کے درمیان حائل تھی) وہ ضروری تعاون حاصل نہ ہو سکا، جس کی وہ مستحق تھی...."

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ "قوم کا ایک بڑا حصہ ان دونوں طبقوں کے درمیان ہچکولے کھاتا رہا جس میں ایک طبقہ قدیم طرزِ تعلیم اور مسلک سے سرمو انحراف ایک قسم کی تحریف بدعت سمجھتا تھا، دوسرا طبقہ مغرب سے ہر آنے والی چیز کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتا اور اس کو ہر عیب اور نقص سے پاک سمجھتا تھا۔.... ان دو طبقوں کے درمیان فکر و معیار کا جو تضاد تھا اور جس طرح وہ انتہائی سروں پر تھے اس کی تصویر لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے اس شعر میں کھینچی ہے:

ادھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ رٹ ہے کہ ساقی صراحی مے لا"

مصر میں انیسویں صدی کے اوائل سے جس طرح مغربی تہذیب کا اثر و نفوذ شروع ہوا اور اب جمال عبدالناصر کے دور اقتدار میں اس نے عرب قومیت اور عرب اشتراکیت کی جو ہئیت اختیار کی ہے، مصنف نے بڑی تفصیل سے اسے قلم بند فرمایا ہے۔ اسی طرح شام و عراق کی مشہور سیاسی پارٹی حزب البعث کے اغراض و مقاصد کے (شام میں اب بھی اور عراق میں اس سے پہلے اس پارٹی کی حکومت تھی) نہایت دلچسپ اقتباسات دیئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایران، ٹیونس، الجزائر اور انڈونیشیا کے حالیہ تغیرات پر بھی تبصرے ہیں اور ان کے حکمران طبقوں کی تجدد پسندی پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

اس بارے میں مصنف کو شکایت یہ ہے کہ ان مسلمان ملکوں کے قائدین کو جب ضرورت ہوتی ہے تو وہ مسلمان عوام کے اسلامی جذبے سے اپیل کرتے ہیں، لیکن جب جنگ ختم ہو جاتی ہے اور اقتدار کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آجاتی ہیں تو وہ قومی و وطنی نعرے دہرانے شروع کر دیتے ہیں۔ موصوف کی یہ شکایت بظاہر بے محل نظر نہیں آتی، لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ عوام کے مقابلے میں قائدین کی ذمہ داری کچھ زیادہ ہوتی ہے، انہیں ایک ملک کو آزاد کرانے کے بعد اس کا نظم و نسق چلانا پڑتا ہے، اس میں امن عامہ قائم کرنا ہوتا ہے، پھر یہ کہ ان عوام کے لئے روزگار، زندگی کی بنیادی ضروریات، ان کے لئے تعلیم۔ طبی امداد اور اس طرح کی ہزاروں چیزوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور یہ چیزیں محض نعروں سے حاصل نہیں ہو سکتیں عوام اور قائدین اور سپہ اور سپہ سالار میں یہی فرق ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے وقتی جذبات اور ہنگامی نعروں کی سطح پر زندگی کے ٹھوس حقائق کو دیکھنے کی اس کتاب میں زیادہ تر کوشش کی گئی ہے، اور منطقی و سائنٹیفک استدلال کے بجائے اکثر ناصحانہ و داعیانہ انداز کو مقدم رکھا گیا ہے۔ نیز اس امر کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے کہ مسلم ممالک کی موجودہ قیادتوں کو اپنے ہاں کی معاشرتی پس ماندگی، افلاس، بے کاری، جہالت، ذہنی انتشار اور جمود و مردہ دلی کو ختم کرنے میں جو مشکلات پیش آرہی ہیں، ان کا جائزہ لیا جاتا، اس راہ کی دقتوں کا ذکر ہوتا، اور یہ قیادتیں جو کچھ کر رہی ہیں۔ ان کی مجبوریاں بتائی جاتیں، لیکن افسوس ہے مصنف نے سارا زور اپنے مفروضات پر دیا ہے، اور انہیں رنگین سے رنگین تر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور شاید اس معاملے میں وہ معذور ہوں۔ کیونکہ ان کا بنیادی فکر ہی کچھ ایسا ہی ہے، کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر وہ فرماتے ہیں:—

"یہ بے شک صحیح ہے کہ مسلمان ممالک مادی ساز و سامان کے اعتبار سے فقیر ہیں۔ کمزور و نہتے ہیں۔ علم و صنعت کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں سیاست اور اقتصادی حالت میں اور قوموں کو نہیں پہنچتے۔ ان چیزوں میں ان میں اور اقوام مغرب میں صدیوں اور قرنوں کا فرق ہو گیا ہے۔ اور بڑی حد تک یہ ضروری بھی ہے کہ یہ چیزیں ممالک اسلامیہ کے قائدین و زعماء کے فکر و اہتمام کا موضوع بنیں اور یہ باتیں خاصی توجہ و التفات کی مستحق ہیں۔"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

"لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان رہنماؤں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ وہ اس کے بغیر بھی دنیا میں عظیم طاقت ہیں۔ ان کے پاس وہ پیغام دعوت اور وہ دین ہے جو انسانیت کی غذا اور اس کی روح ہے۔"

اس لئے موصوف کے نزدیک "..... مسلمانان عالم مغرب کے ان علوم و فنون اور ان کی ایجادات و صناعات کے اتنے محتاج و ضرورت مند نہیں، جتنا مغرب ان کے ایمان و یقین کا محتاج ہے۔"

ایک تو مصنف کی یہ رائے کہ مسلمان ممالک فقیر اور کمزور و نہتے ہونے اور علم و صنعت کی دوڑ دوڑ میں بہت پیچھے رہ جانے کے بغیر بھی دنیا میں عظیم طاقت ہیں" کچھ خود فریبی سی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے یہ سمجھ لینا کہ ہمارے پاس جو دین ہے اس پر جمیں (یہاں چند افراد کا نہیں بلکہ مسلمان قوموں کا بحیثیت مجموعی سوال ہے) وہ ایمان و یقین حاصل ہے کہ اس کی وجہ سے مغرب ہمارا محتاج ہے نہ کہ ہم مغرب کے علوم و فنون اور ایجادات و صناعات کے محتاج ہیں۔ اور اس سے ہماری زیادہ ضرورتیں حقیقت واقعی سے بہت دور ہے اس قسم کا نقطۂ خیال جو اس کتاب کا اساسی نکتہ ہے، عام طور سے غلط قسم کی آسودہ خاطری اور دل جمعی پیدا کرتا ہے۔ اور اس سے ہمیں اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں تو نظر نہیں آتیں البتہ ہم خواہ مخواہ پندار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے اس کتاب کو پڑھ کر قاری پر مجموعی تاثر یہی ہوتا ہے اور ہمارے نزدیک یہ کوئی صحت مند چیز نہیں، اس کی وجہ سے جس جس اعلیٰ مقصد کی خاطر یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ پورا ہونا مشکل ہے۔

کتاب مجلد ہے

ضخامت ۲۷۰ صفحات، قیمت پانچ روپے

صحابہ کرام کا عہدِ زریں (حصہ اول) فضائل و مناقب، عظیم الشان کارنامے، طرزِ حکمرانی، اندازِ جہاں بانی، اور ان کی مثالی حکومتیں

زیر نظر کتاب کا سبب تالیف یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ موجودہ دور میں احترام صحابہ کے عقیدہ کو چیلنج کیا جا رہا ہے، اس لئے اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دلائل و براہین کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیا جائے کہ صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) واجب الاحترام کیوں ہیں؟

صحابہ کرام کے فضائل و مناقب اور ان کے واجب الاحترام ہونے کے بارے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو دلائل و براہین مروی ہیں، ان کے لئے مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی مشہور تصنیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء کو اپنا مرجع و اساس بنایا ہے، اور دراصل ان کی پوری کتاب، جس کا زیر نظر تصنیف پہلا حصہ ہے، شاہ صاحب کی اسی کتاب کی تفسیر و تشریح ہو گی۔ اس کتاب کے کوئی بارہ سو صفحے ہوں گے، یعنی اس کا حجم ازالۃ الخفاء سے دگنا ہو گا۔

زیر نظر کتاب "صحابہ کرام کا عہد زریں" کے مصنف مشہور عالم دین، برصغیر کے ممتاز سیاسی رہنما اور "علمائے ہند کا شاندار ماضی" جیسی ہر دلعزیز و مقبول کتاب کے مصنف جناب مولانا سید محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیت العلماء ہند ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ازالۃ الخفاء جیسی مستند کتاب کو اساس بنا کر صحابہ کرامؓ کے مناقب و فضائل اور ان کے اجتماعی و سیاسی کارنامے مرتب کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے لیکن ہمارے مخدوم و محترم بزرگ جناب مصنف نے جس انداز سے اس کتاب کی بنیاد اٹھائی ہے ہمیں یہ شبہ ہے کہ اس سے شاید ان کے سامنے جو عظیم و مبارک مقصد ہے، وہ مشکل سے پورا ہو سکے گا۔

اس قسم کی تاریخی و علمی کتاب کے لئے ایک تو زبان اور اسلوب بیان آسان اور سیدھا سادا ہونا چاہیئے۔ دوسرے زیادہ زور دلائل و براہین پر، ظاہر ہے یہ دلائل و براہین روایتی بھی ہوں گی اور منطقی بھی، دینا چاہیئے خواہ مخواہ کا مبالغہ، غیر علمی قیاس آرائی۔ اور روایات سے دور دراز کے معنی نکالنے ہمارے خیال میں اس سے کتاب کی افادیت پر زد پڑے گی، اور فاضل مصنف جس غرض سے یہ کتاب لکھ رہے ہیں، وہ شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکے گی۔

کتاب کے شروع میں کوئی ۰۰ م صفحے کا مقدمہ ہے، اس مقدمے میں جو مطالب بیان کئے گئے

ہیں جن ان سے تو چنداں بحث نہیں، لیکن کتاب کے اصل موضوع سے یہ بالکل بے تعلق ہیں۔ چنانچہ خود مصنف نے اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ "سیدنا شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو اتنا ضروری یا اتنا واضح نہیں سمجھا، اس لئے نظرانداز فرمادیا ہے، احقر کا خیال یہ ہے کہ اس غیر ضروری کو بھی یہاں ضروری سمجھا جائے تاکہ مطالعہ مکمل ہوجائے۔ بے شک منطقی استدلال کے لحاظ سے غیر ضروری ہے، مگر اضافۂ معلومات اور تکمیل مطالعہ کے لحاظ سے غیر ضروری نہیں" غرض مصنف نے جماعت صحابہ کی بحث "قصۂ ازل" سے شروع کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ "انبیاء علیہم السلام کے بعد جماعت صحابہؓ اس پوری کائنات کا تارا ہے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے"

زیر نظر تصنیف پوری کتاب کا صرف حصہ اول ہے، اور اس کے کل ۹۶ صفحے ہیں۔ ہم محترم مصنف کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ اگر وہ اپنے آپ کو صرف ازالۃ الخفا کے ترجمے، اس کی مفصل تشریح اور اس سلسلے میں جن ضروری فوائد کی ضرورت ہے انہی تک اپنے آپ کو محدود رکھیں، اور حضرت شاہ صاحب کے مطالب کو آج کی زبان اور موجودہ ذہنی پس منظر میں پیش کردیں۔ تو یہ ان کا بہت بڑا کام ہوگا، افادیت اور کثرت اشاعت ہر دو اعتبار سے۔

اختصار، سلاست، براہ راست (Straight Direct) بات کہنی اور صرف ضروری بات کہنی، آج کے برق پا زمانے کی ضرورتیں ہیں، اگر انہیں پیش نظر رکھ کر لکھا جائے، تو وہ زیادہ مقبول بھی ہوتا ہے۔ اور اس کی تاثیر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارے اہل قلم علماء کے لئے مولانا سید ابوالاعلیٰ کا اسلوب تحریر ایک اچھا نمونہ ہے، محترم مصنف نے ایک جگہ مقدمے میں تقویٰ پر بحث کی ہے، اس ضمن میں وہ فرماتے ہیں،

> .... اب اس تمہید کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح کسی بھی دور میں ترقی یافتہ مہذب اور متمدن اس شخص کو کہا جاتا ہے، جو اس دور کے تہذیبی اور تمدنی قدروں کو پہچانتا ہو اور ان کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو، اسی طرح کوئی بھی دور ہو، اس دور کا متقی اس عابد و زاہد کو کہا جائے گا، جو زہد اور عبادت گزاری کے ساتھ اس دور کے تقاضوں کو پہچانتا ہو اور ان تقاضوں کے لحاظ سے جو خداوندی احکام ہوں، ان کی پوری پابندی کرتا ہو۔ اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماؤ

اللہ کے بندوں میں صرف علماء ہی ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے
ہیں اور خشیہ رکھتے ہیں۔ یہ انحصار بظاہر اس وجہ سے ہے کہ
عالم کہلانے کا مستحق وہی صاحب بصیرت ہے جو اپنے دور
اور اپنے ماحول کے تقاضوں کو پہچانتا ہو۔ اور اتنی بصیرت رکھتا
ہو کہ ان تقاضوں کے بموجب احکام الٰہی کا استنباط کر سکے اور ان
پر عمل پیرا ہو سکے "

تقویٰ کی یہ تعریف و تعبیر یقیناً ان لوگوں کو تو جنہیں "نئی روشنی والے" یا "عصریین یا جدیدیین"
کہتے ہیں، اغلباً بہت اپیل کرے گی، لیکن کیا ہمارے علماء کرام اس معاملے میں اس
حد تک جانے کو تیار ہوں گے۔

کتاب بے جلد ہے۔ کتابت و طباعت بڑی اچھی ہے۔ اور قیمت دو روپے ۵۰ پیسے
ناشر کتب بستان۔ قاسم جان اسٹریٹ دہلی (انڈیا)

(۱-س)

فیض الغفور

مولانا محمد ادریس الانصاری صاحب کی مرتب کردہ یہ کتاب ادارہ تبلیغ الاسلام
جامع رئیس غازی محمد صادق آباد (بہاولپور) نے شائع کی ہے۔ فاضل مصنف کے
الفاظ میں "چونکہ اس مجموعہ کے وجود میں آنے کا سبب حضرت ممدوح حضرت
مولانا عبدالغفور المدنی کی ذات ستودہ صفات ہے۔ اس لئے کتاب کا نام تبرکاً
حضرت مولانا کے نام نامی کی مناسبت سے فیض الغفور" رکھا گیا۔

" زیر نظر کتاب میں نہایت اختصار کے ساتھ قرآن مجید، احادیث نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم، اقوال عارفین نیز احوالِ صالحین سے مسائل ضروریہ کو جو سالکین راہ و
طالبین ذات خداوندی کو اثنائے سفر میں پیش آتے ہیں، اخذ و استنباط کر کے ایک
ترتیب سے جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے "

اس سلسلے میں بقول مصنف کے کتاب و سنت کے بعد زیادہ تر حضرت دا تا گنج بخش کی
"کشف المحجوب" امام غزالی کی "کیمیائے سعادت" اور عارف کامل سید احمد کبیر رفاعی
کی کتاب "البرہان المؤید" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مصنف نے شریعت و طریقت کی تعریف حضرت مولانا عبدالغفور مدنی کی زبانی یوں کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا نام شریعت اور ان پر عمل کرنا طریقت ہے۔ آگے چل کر سید احمد رفاعی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

تم ایسا نہ کہو جیسا جاہل صوفی کہا کرتے ہیں کہ ہم اہل باطن ہیں اور وہ اہل ظاہر ہیں، یہ بات غلط ہے کیونکہ یہ دین ظاہر و باطن کا جامع ہے۔ اس کا باطن ظاہر کا مغز ہے اور باطن ظاہر کا ظرف یعنی محافظ ہے"

شریعت و طریقت یا ظاہر و باطن دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ سید احمد رفاعیؒ فرماتے ہیں:۔ .. ظاہر (شریعت) باطن (طریقت) کا محتاج ہے اور باطن (طریقت) ظاہر (شریعت) کا محتاج ہے۔ یہ علم جس کا نام بعض لوگوں نے علم باطن رکھا ہے، اس کی حقیقت دل کی اصلاح ہے۔ اور علم ظاہر کی حقیقت عمل بالارکان اور تصدیق بالجنان ہے، یعنی ظاہری بدن سے ارکان اسلام کو ادا کرنا اور دل سے توحید و رسالت اور فرائض، عقائد کی تصدیق کرنا"

طریقت کو بیان کرنے کے بعد حسن اخلاق، ایثار، ریاضت و مجاہدہ، خواہش و ہوس، ولایت، کرامت اولیاً، نبی اور ولی کا فرق، فنا و بقا، معرفت حق، توبہ، صحبت نیکاں۔ اور اس طرح کے بیسیوں موضوعات پر بڑا مفید اور نصیحت آموز مواد جمع کیا گیا ہے۔ کتاب کے کل ۴۰۸ صفحے ہیں اور اس کی قیمت پانچ روپے ہے

" محبت" کے ذیل میں مصنف نے حضرت ابوالقاسم قشیری کا یہ قول نقل کیا ہے:۔ محبت یہ ہے کہ اپنے محبوب کی ذات کے اثبات کے لئے اپنی صفات بشری اور اپنی تمام خواہشات کو نیست نابود کر دے۔ یعنی محب اپنی محویت تامہ سے خود فانی ہو جائے، لیکن محبوب باقی رہ جائے"

" فرقہ بندی نہ کرو" کے تحت مصنف لکھتے ہیں:۔ تم اللہ کے دین کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کرو۔ تم کو چاہیئے کہ تم سب مل کر اسلام کے خادم بنو۔ دین رسول اللہ کی خدمت کرو۔ تم میں جو عالم ہو، وہ جاہل کو نرمی کے ساتھ نصیحت کرے، جو کامل ہے وہ ناقص کو کمال کی طرف کھینچے تم کو چاہئے کہ اللہ تعالےٰ کے ارشاد پر عمل کرو تعاونوا علی البر والتقویٰ۔

غرض اخلاق و اعمال اور نیات و عقائد کو سنوارنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بڑا مفید رہے گا، اور ظاہری و باطنی اصلاح کے طالب اس کو بڑے شوق سے پڑھیں گے۔

(ا۔ س)

افکار و آراء

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے جب حضرت شیخ الہند کے حکم کے مطابق کابل جانے کا قصد کیا تو سوائے ان چند خاص الخاص رفیقوں کے جو آپ کے یار غار تھے کسی کو یہ علم نہ تھا کہ مولانا ہجرت کر کے اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہنے والے ہیں۔ اگر مدرسہ کے عام مدرسوں اور طلباء کو اس بات کا علم ہو جاتا تو نہایت شاندار نمونہ میں آپ کو الوداعی دعوت دیتے مگر جانے سے چند روز قبل خود آپ نے مدرسہ کے طلبا اور اساتذہ کو ایک پرتکلف دعوت دی۔

اس دعوت کے لئے جو جگہ تجویز فرمائی وہ جگہ اس وقت ایک عمدہ تفریح گاہ تصور کی جاتی تھی۔ مدرسہ دارالرشاد اور گوٹھ پیر جھنڈو کے مغربی سمت قریباً ایک فرلانگ دور ایک نہر تھی جس کا نام "مار کھو واہ" تھا اس نہر کے کنارے پیپل کے بہت بڑے درخت تھے ان کا ٹھنڈا سایہ اور چھوٹی نالی میں بہتا ہوا پانی ایک دلکش اور پرلطف نظارا تھا۔ وہاں مدرسہ کے تمام اساتذہ اور طلبا جمع ہوئے۔ سندھ کی مشہور اور لذیذ ترین "پلا مچھلی" اور آم کافی مقدار میں منگائے گئے اور وہیں کھانا پکانے کا انتظام کیا گیا۔ کھانا تیار ہونے تک اکثر طلبا نہر میں غسل کرنے اور دیگر تفریحوں میں مشغول تھے۔ جب کھانا تیار ہوا تو سب نے مل کر خوب اچھی طرح پیٹ بھر کر کھایا اس طرح شام کے تین چار بجے یہ پرتکلف دعوت ختم ہوئی۔

اس دعوت کو ہم آخری دعوت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس دعوت کے بعد جلد ہی حضرت مولانا نہ صرف مدرسہ دارالارشاد کو بلکہ سندھ اور ہند کو آخری سلام کہکر نہایت خاموشی کی حالت میں ہجرت کر کے سرزمین افغانستان میں جا پہنچے۔ وہ دعوت آجتک یاد ہے۔ اس کے بعد اس مختصر زندگی میں بے حساب دعوتیں دیکھیں۔ مگر وہ لطف کبھی حاصل نہ ہوا۔ کیونکہ اس دعوت میں اخلاص اور محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس ہجرت سے پہلے جب حضرت مولانا سندھی۔ مدرسہ

دارالارشاد کے صدر مدرس اور مہتمم تھے اس وقت حضرت مولانا کے تلامذہ میں چند ایسے طلبا بھی تھے جو بعد میں بڑے جید عالم ہو گئے اور عوام کو فیض پہنچاتے رہے بعض ظاہری اور باطنی علوم دینیہ کی ترویج اور تبلیغ میں مشغول رہے اور بعض طبیب بن کر خلق خدا کی خدمت کرتے رہے۔ ان میں سے چند شخصیتیں قابل ذکر یہ ہیں۔

۱۔ حضرت الحاج مولانا حکیم پیر ضیاء الدین شاہ صاحب العلم خامس[۱]۔ (۲) شیخ الحدیث حضرت مولانا الحاج احمد علی لاہوری (۳) مولوی حکیم ولی محمد قادری[۲] کراچی (۴) حکیم مولوی محمد معاذ نواب شاہ (۵) مولوی محمد عثمان پارچہ فروش مرحوم (نواب شاہ) (۶) مولوی حافظ محمد اکرم صاحب ہالائی مرحوم (۷) مولوی حکیم عبدالقادر لغاری (۸) سید محمد علی شاہ (جو بعد میں دکن حیدرآباد کے محکمۂ اوقاف کے ناظم ہو گئے تھے۔ (۹) مولوی محمد علی[۳] جو کابل میں آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ (۱۰) پیر محمد امام شاہ خلف الحاج حضرت مولانا پیر رشد اللہ شاہ صاحب العلم رابع مرحوم (۱۱) مولوی محمد اکرم ہالائی مرحوم یہ حضرت مولانا کا فیض تھا کہ ان میں اکثر طلبار بڑے عالم اور عامل بن گئے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق قومی اور دینی خدمت زندگی کے آخری دم تک کرتے رہے۔

یہ صرف چند خاص الخاص (سندھی طلبار کا ذکر ہے، ویسے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی سے دینی علم اور روحانی فیض حاصل کرنے والے طلبار کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے ریاست لسبیلہ۔ اپر سندھ۔ پنجاب صوبہ سرحد بلوچستان تمام علاقوں میں آپ کے شاگرد موجود ہیں۔ اور ہجرت کے ۲۵ سال بعد واپس ہندوستان میں آنے کے بعد جو آپ نے دینی اور سیاسی بیداری پیدا کی وہ اخبار بین حضرات سے مخفی نہیں ہے خدا حضرت مولانا کو خلد بریں میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

احقر العباد۔ حکیم محمد یعقوب قادری

---

[۱] موجودہ سجادہ نشین حضرت مولانا پیر میاں وہب اللہ شاہ صاحب العلم سادس کے والد مرحوم۔

[۲] راقم الحروف کے حقیقی بھائی

[۳] مولوی محمد علی حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے حقیقی بھائی تھے جن کا انتقال افغانستان میں ہو گیا۔

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے

فی پرچہ:- پچھتر پیسے

جلد ۲ جمادی الاول ۱۳۸۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۴ء نمبر ۵

فہرست مضامین

شذرات

خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ صاحب ان رجالِ عظام میں سے نہ تھے، جن کی عظمت کو خود ان کے زمانے والے تسلیم نہیں کیا کرتے، اور ان کے بعد کہیں جا کر ان کی حقیقی قدر و قیمت پہچاننے والے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب خود اپنے دور کی ایک مانی ہوئی شخصیت تھی۔ ان کے حلقۂ درس و تدریس، ان کی تصنیفات اور ان کے معارفِ باطنی سے استفادہ کرنے والوں کا سلسلہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور ان کی زندگی میں علم و حکمت اور طریقت و حقیقت کے طالبوں کی ایک کثیر تعداد ان سے مستفیض ہوئی۔ پھر اللہ تعالےٰ نے ان کی اولاد اور ان کی اولاد کی اولاد اور ان سے استفادہ کرنے والے حضرات کو بڑی برکت دی اور ان کی بدولت اس سرزمین میں نہ صرف علوم دینی کو بڑا فروغ ہوا۔ بلکہ ان بزرگوں کی جدوجہد اسلام اور مسلمانوں کے احیاء کا بھی باعث و محرک بنی۔

بے شک یہ باتیں اُس دور کی ہیں۔ جو گزر گیا۔ لیکن یہ اپنے پیچھے جو علمی، فکری روحانی اور عملی اثرات چھوڑ گیا ہے۔ اور گزشتہ دو سو سال میں یہ اثرات ہماری ملی زندگی میں جس طرح کارفرما رہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ آج اس کی وجہ سے خود ہمارے اُس دور کا اساس بن سکتا ہے، جس کا آغاز ہمارے ہاں اب ہو رہا ہے۔ خدا کے فضل سے اب ہم سیاسی طور پر آزاد ہیں۔ ہمارے ہاں صنعتی انقلاب بسرعت آ رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں یقیناً ایک بالکل نیا معاشرہ ظہور پذیر ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اس نئے صنعتی معاشرے کا فکری و روحانی اساس کیا ہو؟ مارکسیت کی قسم کی خالص مادیت یا مغربی مادیت جس پر برائے نام مذہب کا ملمع ہوتا ہے۔

صدر مملکت محمد ایوب خاں کچھ عرصے سے اپنی تقریروں میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان کے لئے اسلام کے سوا اور کسی فکری و روحانی اساس کا تو خیال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس مملکت کا وجود ہی برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے جذبۂ اسلامیت کا رہین منت ہے، اور اس اصل کا انکار خود اس مملکت کے وجود کے انکار کے مرادف ہے لیکن آخر اس مملکت کے مخصوص جغرافیائی حدود بھی ہیں۔ اور اس میں بسنے والے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستانی بھی ہیں۔ چنانچہ صدر مملکت بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پاکستان کا فکری اساس صرف اسلامی قومیت ہی ہو سکتا ہے یہی اسے استحکام بخش سکتی ہے، اور اسی کے طفیل ہم مسلمان رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکتے ہیں۔

ہر تحریک کے لئے کسی نہ کسی فکر کا ہونا ضروری ہے۔ اور جس فکر کی اپنی کوئی تاریخ نہ ہو وہ فکر ایک جذباتی ترنگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور اس کے اثرات بھی پائیدار نہیں ہوتے۔ صدر مملکت پاکستان کی اس اسلامی قومیت کے فکر اور اس کی تاریخ کے لئے بجا طور پر شاہ ولی اللہ اور انکی تحریک کی طرف رجوع کر رہے ہیں چنانچہ وہ پاکستان کی موجودہ ملی زندگی کی ابتدا اس دور سے کرنا چاہتے ہیں، جو شاہ ولی اللہ کی بدولت وجود میں آیا۔ جس میں پوری راسخ العقیدگی بھی تھی اور آفاقیت وہمہ گیریت بھی، جو دین اسلام کا خصوصی امتیاز ہے۔ شاہ صاحب نے نہ تو گزشتہ ملی تاریخ کا انکار کیا۔ نہ اسلام کو صرف ایک مکتب فکر تک محدود کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے فکر کے دروازے مستقبل کے لئے بھی کھلے رکھے، اور ماضی کے سلسلے کو برقرار رکھتے ہوئے مستقبل کے لامحدود امکانات کو اپنانے کا رجحان پیدا کیا۔

آج پاکستان کو معنوی و فکری لحاظ سے اسی کی ضرورت ہے۔ اور ہمارے اس کارواں کی، جو اب گم کردہ راہ نہیں، بلکہ ایک راہ ڈھونڈنے میں بڑی مستعدی سے کوشاں ہے یہی اولیں و آخری متاع ہے یعنی اسلامی قومیت جس کا اساس فکر ولی اللہی ہو، اور اس کی تاریخ شاہ صاحب کی تجدید سے شروع ہوتی ہو۔ شاہ صاحب نے حتی الوسع مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کو چند بنیادی نکات پر جمع کرنے کی سعی فرمائی۔ اور صدیوں سے ان میں جو اختلافات چلے آتے تھے، ان میں مطابقت کی راہ نکالی۔ آج پوری ملت کو بالعموم اور پاکستان جیسی اسلامی مملکت کو بالخصوص اس طرح کی مذہبی و فکری یگانگت کی جتنی شدید ضرورت ہے، اس کا ہر ہوش مند مسلمان کو احساس ہے اب فکر ولی اللہی اس معاملے میں ہماری سب سے زیادہ رہنمائی کر سکتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں شاہ صاحب کی دعوت مسلمانوں کی اسلامی عوامی تحریکات کا حرف

آغاز تھی۔ اسلامی تعلیمات کو عام مسلمانوں کے لئے قابل فہم بنا کر انہوں نے صحیح اسلامیت کی بنیادوں پر قومی تعمیر کے کام کو شروع کیا، جسے ان کے جانشینوں نے اور آگے بڑھایا۔ یہ دور عوام کے اقتدار کا ہے۔ اس اقتدار کا سرچشمہ ان عالمگیر انسانی قدروں سے پھوٹنا چاہیئے، جن کا حامل اسلام ہے۔ شاہ صاحب اسلام کی ان عالمگیر انسانی قدروں کے بہترین شارح ہیں۔

بدقسمتی سے تحریک ولی اللہی اپنے اُس دور میں وہ عملی نتائج پیدا کرنے سے قاصر رہی جن کی وجہ سے مسلمان سات سمندر پار سے آنے والوں اور خود اس برصغیر کی غیر مسلم طاقتوں سے مغلوب ہونے ان بزرگوں کی یہ کوتاہی تھی یا احوال و ظروف ایسے تھے کہ مسلمانوں کی اس تجدیدی عوامی تحریک نے اُس وقت سائنسی و مادی ترقی کی ضرورت کا کما حقہ احساس نہ کیا اور اس طرح مسلمان نہ صرف غیر مسلموں کے غلام ہو گئے بلکہ وہ عام ترقی کی دوڑ میں بھی ان سے بہت پیچھے رہ گئے۔ صدر مملکت نے اپنی تقریروں میں خاص طور سے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ اسلامی قومیت جس کا فکری اساس شاہ ولی اللہ صاحب کی حکمت ہو اور عہد جدید کی سائنسی و ٹیکنیکل مہارت۔ ان دونوں کو اپنا کر پاکستان دنیا میں اپنا ایک بلند مقام بنا سکتا ہے۔

آج سے کوئی پچیس سال قبل مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی اپنے ہم وطن مسلمانوں کو انہی باتوں کی دعوت دی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ صنعتی و ٹیکنیکل ترقی کے بغیر اس زمانے میں نہ کسی ملک کی سیاسی آزادی کو استحکام نصیب ہوتا ہے اور نہ اہل ملک کو روٹی اور کپڑا مل سکتا ہے۔ آپ کے ملک میں آزادی کے ساتھ ساتھ مشین کا دور دورہ ہوگا۔ اور یہ مشین ایک نئے ذہن کو جنم دے گی۔ جسے تمہارے پرانے طریقے اور قدیم روایات زیادہ دیر تک مطمئن نہیں رکھ سکیں گی۔ آزادی لامحالہ آئے گی۔ اس کے ساتھ مشین کا آنا بھی لازمی ہے۔ اور جب مشین آئے گی، تو وہ ایک نیا ذہن اور ایک نیا معاشرہ پیدا کرے گی اب اگر تم اس ذہن اور معاشرے کو اسلامیت سے وابستہ رکھنا چاہتے ہو، تو شاہ ولی اللہ کی حکمت کو اپناؤ، اور اس کی رہنمائی میں نئے دور کے نئے تقاضوں کے اسلامی حل ڈھونڈو۔

اسلامی ملکوں میں مشین کا آنا مقدر ہو چکا ہے، اور مشین اپنے اثرات پیدا کر کے رہے گی اس سے تمہیں مفر نہیں، اسے اپناؤ، اور اسے حسنۃ فی الدنیا کے ساتھ ساتھ حسنۃ فی الاخرۃ کا ذریعہ بھی بناؤ

مولانا مرحوم کی بات اس وقت دب گئی، لیکن خدا نے کیا؟ آج اس دعوت کے علمبردار صدر ایوب ہیں، اور انہیں قدرت نے جو وسائل دیئے ہیں، یقین کامل ہے وہ اس بات کو منوا کے اور نافذ کر کے رہیں گے۔

قرآن مجید کا طرزِ استدلال

افتخار احمد بلخی۔ استاذ شعبۂ معارف اسلامیہ جامعہ کراچی

سلسلۂ رسالت کے جاری کئے جانے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مبعوث ہونے اور کتب الہیہ کی تنزیل کا مقصد اگر دو لفظوں میں بیان کیا جائے تو وہ ہے ــــ "تزکیۂ نفس"۔ یہی تزکیہ نفس رسالت محمدی کی غرض اور قرآن مجید کے نازل کئے جانے کا بھی مقصد ہے۔

لقد منّ اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ (القرآن)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا جبکہ اس نے ان میں خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان میں اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس لئے تزکیۂ نفس کے لئے ضروری تھا کہ ایک طرف تو حق وصداقت پر قلوب کو پوری طرح مطمئن کیا جائے اور دوسری طرف باطل کی ساری تشکیکات کا قلع قمع کیا جائے۔ اس بنا پر قرآن نے نہ صرف یہ کہ حق کو پیش کیا ہے، بلکہ حق کے حق ہونے اور باطل کے فساد سے متعلق مسکت براہین بھی دیئے ہیں، چنانچہ مذکورہ آیت اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کیونکہ اس میں رسولؐ کی ذمہ داری سے متعلق تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے تلاوت آیات (یتلوا علیھم آیاتہ) اس کے بعد بعثت رسول یا نزول قرآن کی غرض وغایت یعنی تزکیۂ نفس (یزکیھم) پھر تعلیم کتاب وحکمت (یعلمھم الکتاب والحکمۃ) تاکہ اس کتاب کی تعلیم کے بعد حق کھل کر سامنے آجائے اور باطل کا فساد پوری طرح عیاں ہو جائے۔

قرآن کے یہ دلائل و براہین، جیساکہ علماء کا قول ہے، علم مباحثہ کی تقریباً تمام انواع واقسام پر مشتمل ہیں لیکن قرآن نے متکلمین کے طریقوں اور علم بحث ومناظرہ کے اسلوبوں کی اتباع کئے بغیر بالکل سادہ انداز سے اور اہل عرب کی عادت کے مطابق ان دلائل و براہین کو پیش کیا ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لہم (القرآن)

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، تو اس کی قوم ہی کی زبان میں پیغام بھیجا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے

ظاہر ہے کہ قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب تھے اور نزول قرآن کے وقت نہ متکلمین کا طرز استدلال رائج تھا اور نہ اہل عرب اس اسلوب سے آشنا تھے، اس لئے تبیین و توضیح کیلئے (لیبین لہم) وہی انداز اور وہی اسلوب اختیار کیا گیا جو اہل عرب کی عادت سے مطابقت رکھتا تھا تاکہ انہیں یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے کہ خداوندا! تیری بھیجی ہوئی تعلیم تو ہماری سمجھ میں نہ آئی تھی پھر ہم اس پر ایمان کیسے لاتے۔

اس کی ایک وجہ، جیسا کہ علامہ سیوطی نے "اتقان" میں ذکر کیا ہے، یہ بھی ہے کہ برہان و حجت کے پیش کرنے کے غامض طریقوں اور ثقیل انداز استدلال کو وہی اختیار کرتا ہے جو واضح ترین کلام کے ساتھ حجت قائم کرنے سے قاصر ہوتا ہے، ورنہ وہ شخص کبھی غامض کلام اور چیستاں بنانے کا طرز اختیار نہیں کرے گا۔ جو اتنا قادر الکلام ہو کہ نہایت وضاحت اور سہل انداز سے اس طرح مدعا بیان کرے کہ ہر شخص اور ہر مرتبہ ذہن والا انسان سمجھ سکے اور جب قرآن کلام الہی ہے تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ زبردست حجت اور مستحکم سے مستحکم استدلال کو نہایت واضح اور نہایت سہل انداز میں پیش کرنے سے قاصر ہونے کے نقص و عیب سے پاک ہے اور جب اللہ تعالیٰ اس طریقہ پر قادر ہے، تو پھر وہ ایسا غامض اسلوب اختیار کیوں کرے، جس کی سمائی معدودے چند افراد ہی کے فہم تک ہو سکے اور اسکے بقیہ سارے بندے مفہوم و مدعا سے محروم رہیں۔

غرض، جیسا کہ ماحولات نے کہا ہے، کہ قرآن فن مباحثہ اور علم کلام کے قواعد و نظائر سے بھرا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود منطقی اور کلامی طرز و اسلوب سے خالی ہے، اور اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو پہلے بیان ہوئی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ منطقی طرز استدلال اور کلامی اسلوب بیان اکثر و بیشتر مخاطب کو لاجواب اور ساکت تو کر دیتا ہے، لیکن اس کے دل سے تردد اور شک کے کانٹے نکال کر انشراح و اطمینان کی ٹھنڈک نہیں پہنچاتا، کیونکہ ایک مناظر کی ساری کاوشیں اس بات میں منحصر ہوتی ہیں کہ وہ مخاطب کو کسی نہ کسی طرح ساکت کر دے، اس لئے وہ ذہنی کشتی کے سارے داؤ پیچ سے مسلح ہو کر حریف پر حملہ آور ہوتا ہے۔ کبھی الزام و معارضہ سے کام لیتا ہے کبھی اپنے استدلال کے مقدمات مغالطوں سے تیار کرتا ہے اور کبھی مخاطب کے کلام کی جراحی کر کے اس کی دو جنوں شقیں نکالتا ہے۔ ہر شق کے مختلف گوشے پیدا کرتا ہے اور پھر ہر گوشے پر نقض و ایراد کی بارشیں شروع کر دیتا ہے تاکہ مخاطب کا ذہن مرعوب اور اس کا دماغ مفلوج ہو کر رہ جائے۔

لیکن دعوت حق کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، داعی حق کی شان متکبرانہ چیلنج بازی کی نہیں ہوتی

بلکہ اس کا مقصد ہدایت ہوتا ہے جو صرف اذعان و یقین سے حاصل ہو سکتی ہے اور یہ اذعان و یقین بحث و نزاع کے الجھادے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ مخاطب کے دل سے شکوک کے کانٹے نکال کر اس میں حق اتارنے کی سعی سے ہی ممکن ہے، اس لئے قرآن نے استدلال کے اسالیب اور براہین کے جو پیرا یہ اختیار کئے ہیں، ان سے باطل کا سارا زور بھی ٹوٹ جاتا ہے اور تردد و شک کے سارے کانٹے بھی دل سے نکل جاتے ہیں اور انسان اگر معقولیت پسند ہے تو وہ محض ساکت اور لاجواب ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ انشراحِ صدر کے ساتھ حق کے قبول کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ بھی پاتا ہے۔

اب ہم چند مثالیں بیان کرتے ہیں، جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن کس طرح فن مباحثہ اور علم کلام کے قواعد و نظائر اپنے اندر رکھنے کے باوجود برہان و حجت کی وہ زبان استعمال نہیں کرتا جو منطق اور کلام کی زبان ہے۔

۱۔ توحید کے باب میں قرآن نے ایک جگہ یوں استدلال کیا ہے۔

لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا۔ یعنی اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین و آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا

اس استدلال کی نوعیت وہی ہے، جسے فن مناظرہ اور علم مباحثہ میں برہانِ تمانع کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن برہان تمانع سے کام لیتے وقت جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس کے بجائے اسلوب ایسا اختیار کیا گیا کہ غامض انداز اور تعقیدی پیرایہ سے ایک طرح کی جو وحشت پیدا ہوتی ہے وہ بھی پیدا نہ ہو اور فائدہ وہی حاصل ہو جو برہان تمانع سے کام لینے کا ہوتا ہے۔ ہر شخص عوام میں سے ہو یا خواص میں سے، ذہین اور طباع انسان ہو یا متوسط یا ادنیٰ درجہ کا ذہن رکھنے والا سب کی سمجھ میں بات یکساں طور پر آ جائے، ورنہ اگر فنی طریقہ اختیار کیا جاتا تو بقول صاحب "اتقان" یوں کہا جاتا کہ اگر دنیا کے دو یا زیادہ صانع ہوتے تو نظام کائنات کے باب میں ان کی تدبیریں ہر قدم اور ہر مرحلہ پر یکساں اور ہم آہنگ نہ رہتیں اور ان کے احکام میں اتحاد و اتفاق نہ ہوتا اور یقیناً ان دونوں صانعوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو عاجز و مغلوب ہونا پڑتا، کیونکہ اگر ان میں سے ایک صانع مثلاً کسی جسم کی زندگی چاہتا اور دوسرا صانع اس جسم کو مارنے کا ارادہ کرتا تو ایسی شکل میں یا تو ان دونوں کے ارادوں کی تنفیذ کے سبب فساد و تناقض پیدا ہو جاتا کیونکہ اگر اتفاق کو فرض کیا جائے تو فعل کا تجزی محال ہے اور اگر اختلاف کو فرض کیا جائے تو اجتماعِ ضدین لازم آتا ہے جو محال ہے یا دونوں میں سے کسی صانع کا ارادہ نافذ نہ ہوتا تو دونوں صانع عاجز قرار پاتے حالانکہ خالق و صانع کو عجز سے پاک اور قادر ہونا چاہیئے۔ یا دونوں میں سے کسی ایک صانع کے ارادے کی تنفیذ ہوتی تو پھر اس کا عجز ثابت ہوتا ہے حالانکہ خدا کو عاجز نہ ہونا چاہیئے۔

بطلا بتائیے کہ اس گورکھ دھندے والے انداز استدلال کو پوری طرح کتنے لوگ سمجھیں گے پھر اس انداز گفتگو سے اس بات کا پورا امکان ہے کہ انسان کے دل کو وحشت ہونے لگے اور وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگ کھڑا ہو، لیکن قرآن نے یہی بات بیان کی اور اسی برہان سے کام لیا۔ لیکن کس قدر عام فہم اور دلکش طریقہ اختیار کیا، اور ایسا پیرایہ اختیار کیا جو سہل ممتنع ہے اور جس سے فائدہ وہی سب کچھ حاصل ہو جو برہان تمانع سے کلام کے فنی زبان استعمال کرنے کا ہوتا ہے۔

۲۔ فن بحث و مناظرہ کی ایک اصطلاح "قول بالموجب" ہے جس کی حقیقت ابن ابی الاصبع کے قول کے مطابق یہ ہے کہ فریق مخالف کے کلام کو اسی کے فحوائے گفتگو سے رد کر دیا جائے، مثلاً قرآن حکیم نے منافقین کے ایک قول کی حکایت اس طرح کی ہے۔

یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل وللہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنافقین لا یعلمون

یہ منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہنچے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے، حالانکہ عزت تو خدا کے لئے ہے اور اس کے رسول کی اور مومنوں کی لیکن منافق نہیں جانتے۔

منافقین نے اپنے اس جملہ میں لفظ اَعَزّ اپنے گروہ کے لئے اور اَذَلّ کا لفظ مومنین کے لئے بطور کنایہ استعمال کرکے اپنی جماعت کے لئے یہ بات کہی تھی کہ وہ مومنین کو مدینے سے نکال دیں گے۔ اس کی تردید میں صفتِ عزۃ منافقین کے برعکس مومنین کی جماعت کے لئے ثابت کی گئی، گویا یوں کہا گیا کہ ٹھیک ہے معزز لوگ وہاں سے ذلیل لوگوں کو باہر نکال دیں گے، مگر وہ ذلیل اور نکالے ہوئے لوگ خود منافقین ہوں گے اور اللہ اور اس کا رسول اور مومنین وہ معزز ہیں جو نکالنے والے ہوں گے۔

۳۔ فن مباحثہ کی ایک اصطلاح "تسلیم" بھی ہے، یعنی امر محال کو فرض کر لیا جائے، خواہ منفی بنا کر یا حرف امتناع سے مشروط کرکے، تاکہ شرط کے ممتنعُ الوقوع ہونے کی بنا پر امر مذکور کا واقع ہونا بھی محال ہو اور پھر اس کے بعد اس امر کا وقوع بہ طور تسلیم جدلی مان لیا جائے پھر اس کے واقع ہونے کے مفروضہ سے اس کے بے فائدہ ہونے پر دلیل قائم کی جائے، مثلاً:۔

ما اتخذ اللہ من ولدٍ وما کان لہٗ من الٰہٍ اذاً لذھب کل الٰہٍ بما خلق ولعلا بعضھم علی بعض۔ (القرآن)

اللہ نے کسی کو نہ تو اپنا بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔

مطلب یہ کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ شریک نہیں اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ الٰہ واحد کے علاوہ اس کا کوئی شریک بھی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ہر خالق و صانع اپنی اپنی مخلوق کو الگ کر لے

اور ہر ایک دوسرے پر برتری اور غلبہ چاہے اور پھر دنیا میں کوئی امر اور کوئی حکم نافذ نہ ہوسکے۔ حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ واقعہ اس کے خلاف ہے، نہایت نظم و ترتیب اور نہایت ہم آہنگی کے ساتھ نظام کائنات کارفرما ہے، لہٰذا چونکہ دو یا اس سے زیادہ الٰہ کے فرض سے فرض محال لازم آتا ہے، اور یہ فرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے وقوع کا مفروضہ ایک عبث دلیل فائدہ ہوگا اس لئے اسے فرض کرنا ہی محال ہے۔

۴۔ فن مباحثہ کی ایک اور اصطلاح "انتقال" ہے یعنی ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف رجوع۔ اس کی مثال وہ حجت ابراہیمی ہے، جس کی حکایت قرآن مجید نے کی ہے اور جس سے منجملہ اور تعلیم کے یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ دعوت حق کی راہ فلسفیانہ موشگافیوں کی راہ نہیں ہے، اس لئے داعی حق کے مکالمے منطقیانہ ردّ و قدح سے نہیں بلکہ حکمت اور موعظۂ حسنہ اور جدال احسن کی جلوہ سامانیوں سے معمور ہونے چاہئیں۔

یہ حجت ابراہیمی وہ مکالمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور نمرود کے درمیان ہوا تھا۔ قرآن اس کی حکایت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ان آتاہُ اللہ الملک۔

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا، جس نے ابراہیم سے حجت و تکرار کی تھی، حجت و تکرار اس بات پر کہ ابراہیم کا رب کون ہے اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔

یعنی۔ نمرود اپنے اقتدار و فرماں روائی کے گھمنڈ میں اپنے آپ کو حاکم مطلق سمجھ رہا تھا اور اپنے اوپر کسی ایسے بالاتر اقتدار کا منکر تھا جس کے سامنے وہ جوابدہ ہو اور اس فریب میں مبتلا تھا کہ چونکہ اہل ملک کی معاشی ضروریات، ان کی عزت و ناموس اور ان کی جان و مال اس کے قبضۂ اقتدار میں ہیں، اس لئے وہ ان کا "رب" ہے لیکن حضرت ابراہیم اس کے اس غرور حکمرانی پر ضرب لگاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ربی الذی یحیی و یمیت" میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اس کے جواب میں نمرود نے مجادلانہ روبہ اختیار کیا اور اس نے حضرت ابراہیمؑ کی دلیل کے جواب میں کہا کہ "انا احیی وامیت" (جلانے اور مارنے والا تو میں ہوں) اہل ملک کی گردنیں میرے قبضے میں ہیں، میرے ایک اشارۂ ابرو سے انسان کا سر اس کے دوش سے جدا ہوتا ہے اور جسے چشم عنایت سے دیکھ لوں، وہ زندگی کی نعمتوں سے کھیلتا ہے، چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ نمرود نے ایک واجب القتل قیدی کی جاں بخشی کر کے اسے آزاد کر دیا اور ایک بے گناہ شہری کو قتل کرا دیا اور کہا کہ دیکھا، میں جس کو چاہوں مارتا ہوں اور جسے چاہوں نہیں مارتا۔

ظاہر ہے کہ نمرود کا یہ جواب نہایت نامعقول اور انتہائی مضحکہ خیز تھا، اس نے حضرت ابراہیمؑ کے استدلال میں ذکر کردہ الفاظ "احیاء" (جلانا) اور "اماتت" (مار ڈالنا) کا یا تو مفہوم و مدعا ہی نہیں سمجھا یا سمجھ کر رکیک تاویل اور سطحی مغالطہ کا سہارا لینا چاہا۔

نمرود کی اس کج فہمی اور سفیہانہ جواب پر ایک مناظر اسے اس طرح آڑے ہاتھوں لے سکتا تھا کہ اس کا ناطقہ بند ہو جاتا، مگر حضرت ابراہیمؑ ایک داعی حق تھے کوئی مناظر نہ تھے، ان کی راہ دعوت و تلقین کی راہ تھی نہ کہ جدل و خصومت کی، اور داعی حق کے پیش نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے مخاطب کے دل میں کسی طرح حق اتار دے نہ یہ کہ اسے بحث و نزاع میں سراسیمہ کر کے چھوڑے، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ ان کے طرز استدلال کو نمرود کا دماغ ہضم نہ کر سکا تو وہ اپنی دلیل پر اڑے نہ رہے بلکہ فوراً دوسری بات پیش کر دی کہ اچھا، اگر تیری قدرت و اختیار کی وسعت ایسی ہی ہے تو :۔

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب۔	اللہ جو میرا رب ہے) سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اس کو مغرب سے نکال کر دکھا۔

تیر نشانہ پر لگا فبھت الذی کفر۔ وہ نمرود جس نے کفر و سرکشی کی روش اختیار کی تھی، یہ جواب سن کر مبہوت و ششدر رہ گیا۔

اس طرح ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف رجوع کر کے حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کو یہ حقیقت بتائی کہ جو ہستی اس کائنات کی خالق ہے اور جس کے تکوینی امر کی اطاعت یہ نظام عالم کر رہا ہے وہی ہستی حاکم مطلق اور "رب" ہونے کی مستحق ہے، اور جس طرح وہ خالق کائنات ہے، اسی طرح وہ کائنات کی حاکم و مالک بھی ہے اور حکومت و اقتدار کا یہ تخت اسی کا بخشا ہوا ہے جس پر تو بیٹھا ہے، لہٰذا تجھے چاہیئے کہ اس احکم الحاکمین کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ تصور کرتے ہوئے کارِ حکومت اس طرح انجام دے کہ اس کی زمین پر اس کی مرضی پوری ہو۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ آپ کے سامنے رکھی گئی ہیں، ورنہ استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو بحث و استدلال کی تقریباً ساری انواع اپنی اصلیت و حقیقت کے لحاظ سے قرآن میں موجود ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، بحث برائے بحث اور اسکاتِ مخاطب چونکہ مقصودِ قرآن نہیں، اس لئے پیرایۂ بیان اور طرز استدلال کلامی نہیں ہے بلکہ خطیبانہ ہے اور نہایت موثر ہے۔

قرآن حکیم نے بحث و استدلال کی تمام انواع کو اپنے دامن میں رکھنے کے باوجود وہ طرز اور وہ پیرایہ اختیار نہیں کیا جو بحث و مناظرہ کا فنی طرز اور پیرایہ کہا جاتا ہے اور وہ زبان

استعمال نہیں کی جو علمی اور فنی زبان کہی جاتی ہے۔ اس میں جو حکمتیں ہیں، ان کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، ان حکمتوں کے علاوہ ایک حکمت اور ایک بڑا سبب اور ہے، وہ یہ کہ قرآن کریم رہتی دنیا تک کے لئے ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے اور زمانے کے حدود میں مقید بحث و استدلال کے کسی فن کا طرز پیرایہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ ہر زمانے کے کام آسکے۔ ایک زمانے میں جس قسم کا علمی مذاق ہوتا ہے اور گفتگو کے جیسے کچھ اپروچ (Approach) کا چلن ہوتا ہے دوسرے زمانے میں وہ بدل جاتا ہے، یونانی فلسفے کے عروج کے زمانے میں جو پیرایۂ استدلال تھا، وہ آج نہیں ہے، آج کا جو طرز استدلال اور طریقۂ حجت ہے [illegible] گردشِ زمانہ اسے کب بدل دے اور کونسا پیرایۂ بیان اور طرز استدلال دورِ حاضر کے طرزِ استدلال کی جگہ لے لے۔

آج اذہان و قلوب پر اثر ڈالنے کے لئے سائنٹفک طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یہ سائنٹفک طریقہ یونانی فلسفے کے طریقہ سے قطعی مختلف ہے۔ لیکن قرآن کے طرز استدلال کی یہ خوبی بلکہ صحیح تر لفظوں میں معجزانہ شان ہے اور جو بجائے خود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک دلیل ہے کہ رہتی دنیا تک کے ہر دور کی ہر ذہنی سطح اس سے مستفید ہو سکتی ہے اور ہر زمانہ کا انداز استدلال، اگر اسے زبان مل جائے تو وہ بے اختیار بول اٹھے کہ:-

دیکھنا تقریر کی خوبی کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چنانچہ قرآن کا طرز استدلال اپنے اندر سائنٹفک طریقۂ استدلال کے سارے لوازم اور ساری بنیادیں بھی رکھتا ہے اور آج کا انسان بھی قرآن کے پیرایۂ بیان اور طریقۂ استدلال سے اسی طرح متاثر ہو سکتا ہے جس طرح قدیم زمانے کا ذہن متاثر ہو سکتا تھا۔

اسے اگر آپ سمجھنا چاہیں تو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہر زمانے کا انسان اپنے ذہن و فکر کے مراتب کے لحاظ سے چند طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- نہایت ذہین اور طباع لوگ، جن کے لئے اشارات و کنایات کافی ہوتے ہیں اور جو محض اجمالی و اشاراتی طریقہ سے بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں انہیں حقیقت تک پہنچنے کے لئے توضیحات و تفصیلات کی ضرورت نہیں ہوتی، قرآن میں ایسے اذہان و قلوب کی ہدایت کے لئے اجمالی اور اشاراتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ العصر اس کی بہترین مثال ہے، کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے اور جس کی وسعتِ معنی تک رسائی زیرک اور ذکی انسان کی ہو سکتی ہے اور وہی اس سے کما حقہٗ فائدہ اور حقیقی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

۲- وہ لوگ جو اپنے ذہن کے لحاظ سے بلند تو کہے جا سکتے ہیں، [illegible] پہنچنے [illegible]

کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے معتدل طریقہ تعلیم اختیار کیا جاتا ہے، یعنی بات کو قدرے وضاحت اور تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ فرمایا کہ:-
یا ایھا الناس اعبدوا ربکم (یعنی، لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے رب کی تو خدا ہی کی عبادت واطاعت کے مطالبے کی علت اور وجہ کے طور پر آگے یہ فرمایا:-

الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون الذی جعل لکم الارض فراشاً والسماء بناء وانزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقاً لکم فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون۔

(اس رب کی، جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گذرے ہیں ان سب کا خالق ہے تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے (ہاں) وہی (رب) جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا اور آسمان کی چھت بنائی اور آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھیراؤ۔

گویا اللہ کی عبادت واطاعت کے مطالبہ کی دلیل کے طور پر آگے کی توضیحات وتشریحات ہیں، مطلب یہ کہ تمہیں اللہ ہی کی عبادت واطاعت اس لئے کرنی چاہیئے کہ وہی تمہارا رب ہے، وہی تمہارا اور تم سے پہلے کے لوگوں کا خالق بھی ہے، اسی نے تمہارے لئے زمین کا فرش بنایا........ الخ

۳- ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جس کی ذہنی سطح ایسی ہوتی ہے کہ اس کے لئے نہ صرف یہ کہ اشارات وکنایات ناکافی ہوتے ہیں بلکہ بات کو پوری وضاحت کے ساتھ بھی رکھ دیا جائے، تو بھی وہ حقیقت کو نہیں پاتا، ایسے طبقہ کے لئے محسوس اور مشاہد طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے اذہان وقلوب کو متاثر اور مطمئن کرنے کے لئے جو طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہے، اسے تمثیلی طریقہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، چنانچہ امثال القرآن اسی لئے ہیں کہ ان سے ایسے لوگ فائدے اٹھائیں، مثلاً قرآن میں انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق ایک یہ مثال بیان ہوئی ہے کہ اس کی مثال اس بیج کی سی ہے جسے زمین میں بویا جاتا ہے کہ جب اس کو بویا گیا تو محض ایک دانہ تھا، لیکن بار آور ہوا تو ایک دانہ سے سات بالیں نکل آئیں اور ہر بال میں سو دانے نکل آئے۔ اسے دور حاضر کی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ طریقہ From Known to unknown کا ہے یعنی مخاطب کو اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کہ ملی ضرورتوں میں اور دین کی سربلندی کے لئے خرچ کرنا کتنی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے فوائد وبرکات کتنے عظیم الشان ہیں، لیکن وہ یہ جانتا

ہے کہ ایک دانے کا صحیح وقت پر زمین میں ڈالنا کیا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور وہ ایک دانہ کتنے بے شمار دانوں کے ساتھ خود اسی کی طرف لوٹ آتا ہے، لہٰذا اس کے اس علم سے کام لیتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ بات راسخ کی گئی کہ دینی مطالبات اور ملی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر ایک پیسہ کا خرچ بھی اپنے اندر کتنی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے ثمرات و نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ اور اس کا وہ ایک پیسہ اس کے حق میں کتنا بڑا سرمایہ بنے گا۔

۴۔ کچھ لوگوں کا ذہن تاریخی قسم کا ہوتا ہے یعنی وہ واقعات سے متاثر ہوتے ہیں، ان کے لئے جو طریقہ استعمال کیا جاتا ہے، وہ آجکل کی زبان میں Story Method کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ہدایت اور انشراح صدر کے لئے قصص القرآن کا حصہ ہے۔

پھر یہی قصص القرآن ہیں، جو استقرائی طریقۂ استدلال کا کام دیتے ہیں اور آج کل قدیم منطق کی جگہ جس منطق نے لی ہے، اس کا نام استقرائی منطق ہے۔ اگرچہ یہ کچھ دور جدید کی مخترعانہ علمی کاوش نہیں ہے بلکہ صدیوں پیشتر فارابی نے ارسطو کی "استخراجی منطق" کے مقابلہ میں جس "تحلیلی منطق" کا علمی دنیا کے سامنے فتح باب کیا تھا، آج وہی "تحلیلی منطق" ہے جس نے "استقرائی منطق" کے نام سے اپنی بساط بچھا رکھی ہے۔ بہرحال، اس استقرائی طریقہ کی مختصر توضیح یہ ہے کہ قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف انبیاء کی دعوتِ حق کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے ردّ و انکار کے نتائج بیان کئے ہیں۔ اس طریقۂ استشہاد سے مخاطبین کے ذہن میں یہ بات بٹھانی مقصود ہے کہ جب ہر زمانے میں دعوت حق کے قبول و انکار کے ردّ عمل کے طور پر یہ عواقب و نتائج نکلے ہیں تو قرآنی دعوت کے ردّ و قبول کے بھی یہی نتائج نکلیں گے گویا قرآن اپنی صداقت میں استقرائی طریقۂ استدلال سے کام لیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ تم سارے داعیانِ حق کو دیکھ جاؤ، ان کی دعوت کو دیکھ جاؤ۔ سب کی زندگی میں یکسانیت نظر آئے گی، سب کی دعوت بھی ایک ہی رہی ہے، سب کی دعوت کے قبول کرنے والوں کے ساتھ معاندین نے یکساں معاملات کئے ہیں، سب کی دعوت کو ردّ کر دینے والوں کے سامنے نتائج ایک ہی قسم کے سامنے آئے ہیں۔ یہ یکسانیت، یہ تسلسل، یہ غیر منقطع اعادہ اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ یہ اللہ کی سنت ہے، جو ہمیشہ سے ایک ہی طرح کارفرما رہی ہے، لہٰذا آج قرآن کے ساتھ اور رسول کی دعوت کے ساتھ، رسول اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ جو طرزِ عمل انسان اختیار کریں گے، نتائج و عواقب ویسے ہی نکلیں گے جیسے ہمیشہ نکلتے آئے ہیں، یعنی قبول کرنے والوں کی فلاح اور انکار کرنے والوں کے لئے خسران۔

دوسری طرف ان قصص القرآن کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف بھی ہے، اور انھیں گویا متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا کہ تم اس سنت اللہ کی کارفرمائیوں سے مستثنیٰ رہ جاؤ گے اور اگر تم نے اپنے آپ کو امم سابقہ کے اعمال کا مظہر بنایا تو محض زبان سے تمہاری "مسلمانیت" کا ادعا

تمہارے لئے سپر کا کام دے گا اس لئے گذشتہ قوموں پر گذرے ہوئے حالات سے تمہیں سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ کہ اگر تم نے بھی اللہ کی ہدایتوں پر عمل سے گریز کیا تو اسی تباہی و بربادی سے تمہیں بھی دو چار ہونا پڑے گا جو ہمیشہ سے گمراہی اور فساد پر اصرار کرنے والی قوموں کے حصہ میں آتی رہی ہے کیونکہ خدائے لم یلد ولم یولد سے تمہارا کوئی رشتہ تو ہے نہیں؟ "نحن ابناءُ اللہ واحباءُہٗ" (ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں) کے زعم فاسد میں اگر تم بھی مبتلا ہوگئے تو "ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباءُوا بغضبٍ من اللہ" (ذلت وخواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے) کے تم بھی مصداق بنوگے اور جب اللہ کی سنت اور قدرت کا اٹل قانون اپنی گرفت میں لینے کے لئے حرکت میں آجائے گا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس تقدیر الہی کو پلٹ نہ سکے گی۔ اس سنت کے مقابلہ میں کسی شخص، کسی گروہ اور کسی قوم کے ساتھ کوئی رعایت نہیں، یہ قدرت کا اٹل قانون ہے، جس کے لئے کسی زمانے کی قید نہیں اور جو سب کے لئے برابر ہے۔

سنۃ من ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلاً (القرآن) — یہ ہماری سنت ہے، جسے ان سب رسولوں کے معاملہ میں ہم نے برتا ہے جنہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا اور ہماری سنت میں تم کبھی تغیر نہ پاؤگے

۵۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اذہان وقلوب کے لئے عبرت وبصیرت کے سامان سیر و سیاحت میں ہوا کرتے ہیں۔ خدا سے سرکش قوموں کی بستیوں کے وہ کھنڈر جو زبان حال سے اپنی بپتا سنا رہے ہیں یا آثار قدیمہ کی کھدائی اور اکتشافات کے ذریعہ ان کے دلوں پر دستک دی جا سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ARCHEOLOGY سے دلچسپی اور مناسبت رکھنے والوں کے لئے بھی قرآن نے ایک طرز استدلال اختیار کیا ہے، یعنی قرآن نہ بیان وتشریح سے کام لیتا ہے، نہ تمثیل وقصص سے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ اقطار عالم میں جاکر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ مجرمین کو کن حالات سے دو چار ہونا پڑا اور انہیں ان کے انکار واعراض کے عمل نے کیسے روز بد دکھائے۔ "من اشدُّ منّا قوۃ" (ہم سے بڑھکر طاقتور اور زبردست کون ہے) کے پندار میں مبتلا ہوکر انہوں نے جب دعوت حق سے روگردانی کی تو اس کا خمیازہ انہیں کیا بھگتنا پڑا۔ خدائی ہدایتوں سے ان کی بے نیازی اور خدا کی زمین کو فواحش ومنکرات سے بھر دینے والی ان کی سرگرمیاں کیا رنگ لائیں۔ اپنے رب سے غفلت اور آخرت فراموشی نے کس طرح اپنی شامت آپ بلائی۔

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان — تم میں سے پہلے بہت سے دور گذر چکے ہیں، تو زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ہدایات ربانی کی

عاقبۃ المکذبین۔ (القرآن) — تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا

فمنهم من ارسلنا علیه حاصباً ومنهم من اخذته الصیحة ومنهم من خسفنا به الارض ومنهم من اغرقنا وما کان الله لیظلمهم ولکن کانوا انفسهم یظلمون۔ (القرآن)

تو ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دہماکے نے آلیا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کردیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المجرمین (القرآن)

کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قسم کے واقعات اب کیوں نہیں پیش آتے، اگرچہ قومیں گرتی بھی ہیں اور ابھرتی بھی ہیں، لیکن اس عروج وزوال کی نوعیت دوسری ہوتی ہے، یہ تو نہیں ہوتا کہ ایک نوٹس کے بعد زلزلہ یا طوفان آئے اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھدے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں اخلاق اور قانونی اعتبار سے اس قوم کا معاملہ جو کسی نبی کی براہِ راست مخاطب ہو، دوسری تمام قوموں کے معاملہ سے بالکل مختلف ہے۔ جس قوم میں نبی پیدا ہوا ہو اور وہ بلاواسطہ اس کو خود اسی کی زبان میں خدا کا پیغام پہونچائے اور اپنی شخصیت کے اندر اپنی صداقت کا زندہ نمونہ اس کے سامنے پیش کردے، اس پر خدا کی حجت پوری ہو جاتی ہے، اس کے لئے معذرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کے رسول کو دو بدو جھٹلا دینے کے بعد وہ اس کی سزاوار ہو جاتی ہے کہ اس کا فیصلہ برسرِ موقع چکا دیا جائے۔ معاملہ کی یہ نوعیت ان قوموں کے معاملہ سے بنیادی طور پر مختلف ہے جن کے پاس پیغام الٰہی براہِ راست نہ آیا ہو بلکہ مختلف واسطوں سے پہونچا ہو۔

لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ اب ان قوموں پر عذاب آنے بند ہوگئے جو خدا سے برگشتہ اور فکری و اخلاقی گمراہیوں میں سرگشتہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ایسی تمام قوموں پر عذاب آتے رہتے ہیں، چھوٹے چھوٹے جھنجوڑنے والے عذاب بھی اور بڑے بڑے فیصلہ کن عذاب بھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ "پومپی آئی" کا مشہور زلزلہ وہاں کے باشندوں کی بداعمالیوں کی بنا پر عذاب الٰہی نہ تھا، لیکن وحی کا سلسلہ بند ہو جانے کے سبب وقت سے پہلے آگاہ کئے جانے کا سوال نہیں اور کوئی

نہیں جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور آسمانی کتابوں کی طرح ان عذابوں کے اخلاقی معنی کی طرف انسانوں کو توجہ دلائے، بلکہ اس کے برعکس مادہ پرستانہ ذہنیت اس قسم کے تمام واقعات کی توجیہہ طبیعیاتی قوانین سے کر کے انسان کو بھلاوے میں ڈالتی رہتی ہے اور اسے کبھی یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتی کہ اوپر کوئی خدا بھی موجود ہے جو اپنی کائناتی قوتوں کے ذریعہ غلط کار قوموں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دیتا ہے۔

قرآن کے ان اسالیبِ استدلال سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن سائنس اور دوسرے علوم جدیدہ کو شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیتا۔ ہر زمانے کا ہر علم، وقت کا ہر فن اور عروج و ارتقا کی ہر حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے، جسے وہ جہاں پائے لے لینی چاہیئے، بلکہ کائنات کا ہر خزانہ اور دنیا کا ہر سرمایہ انسان ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کے خالق و مالک کے نام لیوا دوسروں کی بہ نسبت اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھائیں، لیکن فرق ہے اور بہت بڑا فرق، ان سرمایوں اور حکمتوں کے حصول ہی کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں اور ان کو خدا کی زمین پر خدا کا کلمہ بلند کرنے کے وسائل کے نقطۂ نظر سے حاصل کرنے میں جس طرح فرق ہے چراغ سے راستہ دیکھنے کا فائدہ اٹھانے میں اور چراغ پر پروانوں کی طرح نچھاور ہونے میں۔ فزکس ہو یا کیمسٹری، زولوجی ہو یا جیالوجی، کوئی علم اور کوئی فن ہو، آپ اسے بشوق حاصل کریں، بلکہ آپ کو ضرور حاصل کرنا چاہیئے، لیکن ان علوم و فنون سے فلسفۂ الحاد کی نری تقلید میں اگر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ دنیا کا یہ سارا کارخانہ اور یہ نظامِ کائنات ایک اندھی فطرت، بے جان مادہ اور بے حس الکٹرون (Electrons) کی خاصیتیں اور کرشمہ سازیاں ہیں، تو یہ آپ کے لئے وہ "روشنی طبع" قرار پائے گی جو انسان کے حق میں "بلا" ثابت ہوتی ہے، اس کے برخلاف اگر آپ نے ان علوم و فنون سے حاصل کردہ اپنی معلومات کو کام میں لا کر یہ عینِ معلوم حقیقت پالی کہ آپ کا، یعنی انسان کا فرضِ منصبی کیا ہے اور وہ کیوں آیا ہے، تو پھر ان علوم کی بدولت آپ کے حق میں آسمان اپنی برکتیں نازل کرے گا اور زمین اپنے خزانے اگل دے گی۔

اب اخیر میں قرآن حکیم کی یہ ایک اور آیت بھی سن لیجئے کہ :-

کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم آیاتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمۃ ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون	چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہیں میں سے بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس آیت کریمہ کے جملہ۔ "ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون" (اور تم کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے) پر خاص طور سے غور کیجئے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ قرآن عزیز نے اپنے دلائل و براہین میں انسان کے مشاہدوں اور اس کے تجربوں اور اس کی مختلف النوع سابقہ معلومات ہی کو اس کے سامنے رکھکر ان غیر معلوم حقائق سے اس کو آگاہ کیا ہے۔ جنہیں وہ نہیں جانتا تھا؟ تو پھر اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو کیا غلط ہوگا کہ "معلوم سے نامعلوم کی طرف" بڑھنے (From Known to un-Known) کا اصول سیکھنے والوں نے دراصل اسلام ہی سے سیکھا ہے جسے ایک بھاری بھرکم اصطلاح کا لباس پہنا کر خود کو "کریڈیٹ" لینا چاہتے ہیں؟

قرآنی قصص سے دراصل مقصود بنی نوع انسان کو ذکر و تذکیر کے ذریعہ راہِ راست پر لانا ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے تمام کتب الہیہ کے اس طرح کے مضامین کے لئے تین اصول مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ اگر ان اصولوں کے پیش نظر قرانی قصص کو پڑھا جائے تو یہ قصے اعلےٰ روحانیت پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

قرانی قصص سے دراصل مقصود بنی نوع انسان کو ذکر و تذکیر کے ذریعہ راہ راست پر لانا ہے۔ قرآن شریف سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذکر یعنی مطلق تذکیر کے لئے نازل ہوا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر۔ غلطی یہ ہوئی کہ لوگوں نے ان قصوں کو محض کہانیاں سمجھ لیا۔ کسی نے تذکیر کے خیال سے ان پر مطلق غور نہ کیا۔ عام واعظ اور قصہ گو محفل کی دلچسپیوں کی خاطر ان آیات میں حسب مرضی تصرف بھی کرتے رہے۔ اسی طرح انہوں نے قرآن کے قصوں کو بازیچہ اطفال بنالیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان تمام قصوں کو حسب ذیل تین اصولوں کے ماتحت ترتیب دی ہے ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم ان قصوں کے ذریعہ "الاء اللہ" "ایام اللہ" اور موت "ما بعدہ" کا بار بار ذکر کرکے انسان کو گمراہیوں سے بچنے اور راستی پر چلنے کی تلقین کرتا ہے ان قصوں سے اس کا مقصود اصلی ان تین باتوں کی تذکیر ہے۔

(از شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ مصنفہ مولانا عبید اللہ سندھی رح)

الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

شاہ ولی اللہ دہلوی کی خود نوشت سوانح عمری

مترجمہ و مرتبہ - محمد ایوب قادری ایم اے

شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم دہلوی نے اپنے حالات میں ایک مختصر سا رسالہ "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" فارسی زبان میں لکھا ہے، یہ رسالہ شاہ صاحب کی کتاب "انفاس العارفین" کے آخر میں شامل ہے جو شاہ صاحب کے بزرگوں، اساتذہ اور مشائخ کے حالات کا ایک مفصل تذکرہ ہے انفاس العارفین میں مندرجہ ذیل سات رسالے شامل ہیں۔

۱۔ بوارق الولایت (حالات شاہ عبدالرحیم دہلوی، والد)

۲۔ شوارق المعرفت (حالات شاہ ابوالرضا دہلوی، تایا)

۳۔ امداد فی ماثر الاجداد (حالات شیخ وجیہہ الدین، دادا)

۴۔ النبذۃ الابریزیہ فی اللطیفۃ العزیزیہ (حالات شیخ عبدالعزیز دہلوی شاہ عبدالرحیم کے پرنانا)

۵۔ العطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ (حالات شیخ محمد پھلتی، نانا)

۶۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین (حالات مشائخ حرمین)

۷۔ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (خود نوشت حالات)

الجزء اللطیف، دوسرے مجموعۂ رسائل کے ساتھ بھی مطبع احمدی دہلی سے طبع ہوا ہے اس رسالہ کا انگریزی ترجمہ مولوی محمد ہدایت حسین نے اپنے ایک مضمون Persian autobiography of Shah Waliullah b. Abdur-rahim al-Dehlavi - its English Translation and a list of his works.

کے عنوان سے جنرل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) (جلد
ہشتم ۱۹۱۲ء) میں شائع کیا ہے اور الجزء اللطیف کا عربی ترجمہ مولانا عطاء اللہ
حنیف صاحب نے کیا ہے جو شاہ صاحب کی تالیف، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر
کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہوا ہے اس پر مولانا عطاء اللہ صاحب نے مختصر
مفید حواشی لکھے ہیں۔ الجزء اللطیف کا اردو خلاصہ مولانا محمد منظور نعمانی نے
اپنے ایک مضمون "حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے کام کا مختصر تعارف"
میں شامل کیا ہے جو الفرقان (بریلی ۱۹۴۰ء) کے شاہ ولی اللہ نمبر میں
شائع ہوا ہے[1] "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" کا مکمل
اردو ترجمہ مع ضروری حواشی شائع کیا جارہا ہے۔"

محمد ایوب قادری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی بدأ بالنعم استحقاقھا و خص من شاء بمعرفۃ الاسماء واذواقھا والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد المتحلی بتیجان الکرامات واطواقھا المکرم بعنوف العطیات واطباقھا وعلی الہ واصحابہ الذین بھم قیام الملۃ ورواج اسواقھا۔

(اللہ تعالیٰ کے واسطے تعریف کہ جس نے استحقاق سے قبل
نعمتیں شروع کیں اور جس کو چاہا اپنے ناموں کی معرفت اور
ان کے ذوق سے مخصوص کر دیا اور صلوٰۃ والسلام سیدنا محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو کرامات کے تاجوں اور اس کے ہاروں سے آراستہ کئے گئے
اور ان کو مختلف عطیات اور درجات سے معزز کیا۔ اور (صلوٰۃ وسلام) ان کی
اولاد اور اصحاب پر ہو کہ جن سے ملت کا قیام اور اس کے طریقوں کا رواج ہے)

---

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" میں اردو خلاصہ کو نقل کر دیا ہے
ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" مرتبہ خلیق احمد نظامی ص ۱۷۹ تا ۱۸۵
(علی گڑھ ۱۹۵۰ء)

اس کے بعد فقیر ولی اللہ[1] بن عبدالرحیم[2] غفر اللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ (اللہ اس کو اور اس کے والدین کو بخشے اور ان دونوں (والدین) اور اس کی طرف اچھائی کرے) کہتا ہے کہ یہ چند کلمے ہیں کہ جن کا نام "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" رکھا ہے جاننا چاہیئے کہ اس فقیر کی ولادت بدھ کے دن، سورج نکلنے کے وقت ۴ ارشوال ۱۱۱۴ھ[3] کو ہوئی[4]

بعض منجمین نے علم نجوم کی بنا پر حکم لگایا کہ میری پیدائش کے وقت حوت کا درجہ دوم، طالع میں تھا اور شمس بھی اس درجہ میں تھا اور مشتری پندرھویں درجے میں اور وہ سال علوئین کے قِران کا سال تھا اور وہ (قِران) درجہ اوّل میں تھا اور مریخ اس سے دوسرے درجہ میں اور راس سرطان تھا، واللہ اعلم بالصواب[5]

---

[1] شاہ صاحب کے "ولی اللہ" نام کی بجائے "قطب الدین احمد" نام بھی تھا کیونکہ شاہ عبدالرحیم کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے ان کے تولد کی بشارت دی تھی ملاحظہ ہو انفاس العارفین (بوارق الولایت) ص ۴۴۔ ۴۵، (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۵ھ) و تفہیمات الالٰہیہ جلد دوم ص ۱۵۴ (مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۵۵ھ) اور شاہ صاحب نے اپنی اکثر تالیفات میں اپنا نام "احمد" بھی لکھا ہے،

[2] شاہ عبدالرحیم دہلوی کی پیدائش ۱۰۵۴ھ / ۱۶۴۴ء اور وفات ۱۲ رصفر ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء کو ہوئی شاہ عبدالرحیم کے حالات میں شاہ ولی اللہ نے ایک فارسی رسالہ بوارق الولایت لکھا ہے جو انفاس العارفین میں شامل ہے نیز دیکھئے تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری ص ۲۹۶ (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء)

[3] ۴ رشوال ۱۱۱۴ھ مطابق ۱۰ رفروری ۱۷۰۳ء (ملاحظہ ہو تقویم عیسوی و ہجری مرتبہ ابوالنصر خالدی ص ۶۴ ۵ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۴ء)

[4] شاہ ولی اللہ کی پیدائش ان کی ننھیال موضع پھلت ضلع مظفر نگر، یوپی (انڈیا) میں ہوئی۔

[5] اس بیان کی روشنی میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا زائچہ اس طرح مرتب ہوتا ہے۔

ذنب جدی میں تھا اور قمر بھی برج حمل میں تھا، یہ زائچہ پروفیسر حبیب اللہ خان غضنفر صاحب نے مرتب فرمایا ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں

بعض دوستوں نے تاریخ (پیدائش) "عظیم الدین" سے نکالی ہے[1] ماں باپ، قدس اللہ تعالیٰ سرہما (اللہ تعالیٰ ان دونوں کی خاک کو مقدس رکھے) اور صالحین کی ایک جماعت نے اس فقیر سے متعلق پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد بعض بشارتیں پائیں[2] چنانچہ ایک عزیز ترین بھائی اور خاص دوست نے ان واقعات کی تفصیل دوسرے واقعات کے ساتھ ایک رسالہ میں قلم بند کی ہے اور اس رسالہ کا نام "قول جلی" رکھا ہے[3]

جزاہ اللہ خیر الجزاء واحسن الیہ والی اسلافہ واعقابہ وادخلہ الی ما یتمناہ من دینہ ودنیاہ۔

اللہ اسے اچھا بدلہ دے اور اس کے، اس کے اسلاف اور اس کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرے اور دین و دنیا میں سے اس چیز میں داخل کرے جس کی وہ تمنا کرے۔

جب پانچواں سال ہوا تو میں مکتب میں بیٹھا[4] اور ساتویں سال میں والد بزرگوار نے نماز شروع کرائی اور روزہ رکھنے کا حکم دیا اور اسی سال میں ختنہ ہوا اور میرے خیال میں ایسا ہے کہ اس سال کے آخر میں میں نے قرآن عظیم ختم کیا۔ فارسی کتابیں اور ابتدائی عربی کتابیں پڑھنی شروع کیں، اور دسویں سال میں شرح ملا پڑھتا تھا اور ایک حد تک مطالعہ کی راہ کھل گئی۔

چودھویں سال میں شادی ہو گئی اور اس سلسلہ میں والد بزرگوار کو بہت جلدی تھی جب سسرال والوں نے اسباب کے مہیا نہ ہونے کا عذر کیا تو والد بزرگوار نے ان لوگوں کو لکھا کہ (اس

---

[1] عظیم الدین سے "۱۱۱۵ھ" برآمد ہوتے ہیں۔

[2] شاہ ولی اللہ دہلوی کی پیدائش سے متعلق بعض بشارات "بوارق الولایت" میں موجود ہیں ملاحظہ ہو ۴۴۔ ۴۵۔ وغیرہ

[3] شاہ ولی اللہ دہلوی کے حالات کے متعلق یہ اہم دستاویز ہے جسے شیخ محمد عاشق پھلتی نے مرتب کیا ہے افسوس کہ یہ کتاب کہیں دستیاب نہیں ہے حیات ولی کے مؤلف حافظ رحیم بخش دہلوی کو بھی نہ مل سکی البتہ تذکرۂ علمائے ہند کے مؤلف مولوی رحمان علی کے پیش نظر تھی اور انہوں نے اپنے ماخذ میں اس کا ذکر کیا ہے (تذکرۂ علمائے ہند ص ۵۵۶)

[4] پانچویں سال میں مروجہ رسم کے مطابق تسمیہ خوانی ہوتی ہے۔

عجلت میں ایک راز ہے اور وہ راز بعد کو ظاہر ہوگیا کہ شادی کے بعد جلد ہی میری بیوی[1] کی والدہ فوت ہوگئیں اور اس کے بعد جلد ہی میری بیوی کے نانا اور اس کے بعد جلد ہی شیخ فخر العالم ابوالرضا[2] کے صاحبزادے فوت ہوگئے اور اس کے بعد ہی اس فقیر کے بڑے بھائی شیخ صلاح الدین کی والدہ انتقال کر گئیں[3]

اس کے بعد ہی والد بزرگوار بہت ضعیف ہوگئے اور مختلف بیماریوں نے ان پر غلبہ کرلیا اور اس کے بعد ان کی وفات کا واقعہ پیش آیا غرض کہ بزرگوں کی یہ جماعت منتشر ہوگئی اور خاص و عام کو معلوم ہوگیا کہ اگر اس زمانے میں شادی نہ ہوتی تو اس کے بعد کئی سال تک امکان نہ ہوتا کہ یہ بات (شادی) ہوتی۔

میں پندرہ سال کا تھا کہ والد بزرگوار سے بیعت کی اور صوفیہ کے اشغال، خاص طور سے نقشبندیہ مشائخ کے اشغال میں مشغول ہوا۔ ان کی توجہ، تلقین اور آداب طریقت کی تعلیم اور خرقہ صوفیہ پہن کر میں نے اپنی نسبت درست کی۔

اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا، والد بزرگوار نے کھانے کا بہت اہتمام کیا اور خاص و عام کی ضیافت کی اور (اس موقعہ پر) درس کی اجازت دی غرض کہ اس ملک کے رواج کے مطابق فنون متعارفہ سے پندرہ سال میں فراغ حاصل کیا۔

علم حدیث میں مشکوٰۃ کو پورا پڑھا لیکن کتاب البیع سے کتاب الآداب تک چھوڑ دی اور اس سب کی اجازت مل گئی، صحیح بخاری کا ایک حصہ کتاب الطہارت تک پڑھا تمام شمائل النبی والد بزرگوار سے سماع کی کم و بیش اس کو پڑھا علم تفسیر میں کچھ حصہ تفسیر بیضاوی کا اور کچھ حصہ تفسیر مدارک

---

[1] شاہ ولی اللہ کا عقد شیخ عبیداللہ بن محمد پھلتی کی صاحبزادی کے ساتھ ہوا تھا جو شاہ صاحب کے ماموں تھے۔ شیخ محمد پھلتی کے حالات میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے ایک رسالہ "العطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ" لکھا ہے جو انفاس العارفین میں شامل ہے اور علیحدہ بھی خمسہ رسائل کے ساتھ طبع ہوچکا ہے۔

[2] شیخ ابوالرضا، شاہ ولی اللہ دہلوی کے تایا تھے جن کا ۱۷ محرم ۱۱۰۱ھ کو انتقال ہوا ان کے حالات میں شاہ ولی اللہ نے ایک رسالہ "شوارق المعرفۃ" لکھا ہے جو انفاس العارفین میں شامل ہے۔

[3] شیخ صلاح الدین، شاہ عبدالرحیم کی پہلی بیوی سے تھے دوسری بیوی سے شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ دہلوی پیدا ہوئے۔

ڑھا۔

اس ضعیف پر سب سے بڑا احسان (اللہ تعالیٰ) کا یہ تھا کہ میں نے چند مرتبہ مدرسہ میں والد
گوار کی خدمت میں قرآن عظیم، معانی اور شان نزول کو سمجھتے ہوئے اور تفاسیر کی کتابوں
طرف رجوع کرتے ہوئے پڑھا اور یہ طریقہ فتح عظیم کا سبب ہوا، والحمد للہ
علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ دونوں کتابیں تھوڑے حصہ کے سوا پوری پڑھیں،
ول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کسی قدر حصہ پڑھا اور منطق میں مکمل شرح شمسیہ، شرح
الع کا کچھ حصہ، کلام میں شرح عقائد اور خیالی کا کچھ حصہ اور شرح مواقف کا کچھ حصہ اور سلوک
عوارف کا کچھ حصہ اور کچھ رسائل نقشبندیہ[1] وغیرہ حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی
ائح۔ مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص، خواص اسماء و آیات میں والد بزرگوار کا خاص
عہ، جس کی انہوں نے چند مرتبہ اجازت دی، طب میں موجز القانون، حکمت میں شرح ہدایۃ الحکمۃ
رہ، نحو میں کافیہ و شرح ملا، معانی میں مطول کا بڑا حصہ، اور مختصر معانی اس قدر پڑھی جس پر ملا زادہ
اشیہ ہے۔ ہندسہ و حساب میں بعض مختصر رسالے پڑھے اور اس عرصہ میں ہر فن کے متعلق
س خاص نکتے ذہن میں آتے تھے، اور جتنی کوشش کی جاتی تھی اس سے زیادہ مقصد حاصل
جاتا تھا۔

فقیر سترہویں سال میں تھا کہ والد بزرگوار بیمار ہوگئے اور اس مرض میں ان کا انتقال ہوگیا[2]
مرض موت میں انہوں نے (مجھے) اجازت بیعت و ارشاد دی اور کلمہ "یدہ کیدی" (اس کا
تھ میرے ہاتھ کی طرح ہے) مکرر فرمایا۔

ان رسائل نقشبندیہ کے نام نہیں بتائے۔ المقالۃ الوضیہ فی النصیحۃ والوصیۃ میں بھی رسائل نقشبندیہ
لکھا ہے۔ حضرات کبرائے نقشبندیہ کا ایک مجموعہ چھپتا رہا ہے جس میں چھ رسالے شامل
، ممکن ہے یہ مجموعہ ہو اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل چھ رسالے شامل ہیں۔
رسالہ انفاس نفیسہ از خواجہ عبید اللہ احرار (۲) رسالہ خواجہ عزیزاں (۳) رسالہ انسیہ از
ا یعقوب چرخی (۴) رسالہ قدسیہ از حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند نوشتہ خواجہ محمد پارسا۔
رسالہ نور وحدت از خواجہ عبید اللہ معروف بہ خواجہ خرد فرزند خواجہ باقی باللہ۔ ۶۔ رسالہ
عشق از خواجہ خرد، ہمارے پیش نظر یہ مجموعہ مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۹۳۴ء کا مطبوعہ ہے۔
شاہ عبد الرحیم کا انتقال ۱۲ صفر سنہ ۱۱۳۱ھ بروز بدھ ہوا (بوارق الولایۃ ص ۸۵)

سب سے بڑی نعمت جو سمجھنی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ والد بزرگوار اس فقیر سے بہت رضامند رہے اور نہایت رضامندی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی توجہ اس فقیر پر ایسی تھی کہ باپوں کو بیٹوں پر ایسی توجہ نہیں ہوتی ہے اور میں نے کسی باپ، کسی استاد اور کسی مرشد کو نہیں دیکھا کہ وہ بیٹے اور شاگرد کے ساتھ ایسی خاص شفقت برتتے جیسی کہ والد بزرگوار نے مجھ فقیر کے ساتھ برتی۔

اللھم اغفر لی ولوالدی وارحمھما کما ربیانی صغیرا وجازھما بکل شفقۃ ورحمۃ ونعمۃ معیماً علی مائۃ الف اضعافھا انک قریب مجیب۔

اے پروردگار میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔ اور ان پر رحم فرما، جیسے کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا اور ان کی ہر شفقت، رحمت اور نعمت کا انہیں ہزار دو ہزار گنا اجر عطا کر بے شک تو نزدیک اور دعا قبول کرنے والا ہے

والد بزرگوار کے انتقال کے بعد کم و بیش بارہ برس کتب دینیہ و عقلیہ کے درس میں مستقل شغول رہا۔ اور ہر علم میں مہارت حاصل ہو گئی، جب میں (والد بزرگوار کی) قبر مبارک پر توجہ کرتا تھا اس زمانے میں توحید کے راز کھل جاتے تھے۔ جذب کا راستہ کشادہ ہوتا اور سلوک کا ایک بڑا حصہ میسر آتا اور علوم وجدانیہ خوب خوب حاصل ہوتے تھے۔ مذاہب اربعہ اور اصول فقہ کی کتابوں اور وہ احادیث جو اس سلسلہ میں مددگار ہیں، ان کے ملاحظہ کے بعد غیبی روشنی کی مدد سے فقہائے محدثین کی روش مجھے پسند آئی اور ان بارہ سال کے بعد مجھے حرمین محترمین کی زیارت کا شوق ہوا۔ اور ۱۱۴۳ھ کے آخر میں حج سے مشرف ہوا۔ ۱۱۴۴ھ میں مکہ معظمہ میں قیام، مدینہ منورہ کی زیارت اور شیخ ابو طاہر[1] قدس سرہٗ وغیرہ مشائخ حرمین محترمین سے روایت حدیث کی سعادت حاصل کی[2]

---

[1] شیخ ابو طاہر المتوفی رمضان ۱۱۴۵ھ حالات کے لئے ملاحظہ ہو "انسان العین فی مشائخ الحرمین" ص۱۱ (مجموعہ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہ دہلوی مطبع احمدی دہلی، سال طباعت نامعلوم)

[2] شاہ ولی اللہ دہلوی نے حرمین شریفین میں ان مشائخ و محدثین سے استفادہ فرمایا اور اجازت و سند حاصل کی ان کے حالات ایک "رسالہ انسان العین فی مشائخ الحرمین" میں لکھے یہ رسالہ انفاس العارفین میں شامل ہیں اور مجموعہ خمسہ رسائل شاہ ولی اللہ دہلوی" میں طبع ہوا ہے، اس رسالہ میں شیخ احمد سناوی، شیخ احمد قشاشی، سید محمد بن علوی شمس الدین محمد بن العلاء البابلی، شیخ عیسیٰ الجعفری المغربی، محمد بن محمد بن سلیمان، شیخ حسن عجمی، شیخ احمد نخلی، شیخ عبداللہ بن سالم البصری، شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی، اور شیخ تاج الدین قلعی حنفی کے حالات شامل ہیں۔

اسی دوران میں حضرت سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ واتم التحیات کے روضۂ منورہ کی طرف متوجہ ہوا اور بہت فیوض حاصل کئے اور حرمین کے رہنے والے علماء وغیرہ سے مختلف صحبتیں رہتی تھیں اور شیخ ابوطاہر سے جامع خرقہ پہنا جو صوفیوں کے تمام سلاسل کے خرقوں کا جامع تھا۔ اس سال کے آخر میں حج ادا کیا۔ ۱۱۴۵ھ کے شروع میں وطن کے لئے روانہ ہوا بروز جمعہ ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ کو صحت وسلامتی کے ساتھ وطن پہنچا۔

واما بنعمۃ ربک فحدث اور اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کر

سب سے بڑی نعمت فقیر پر یہ ہے کہ اس کو خلعت فاتحیہ عطا فرمائی اور اس آخری زمانے کی کشود کار میرے سپرد کردی اور رہنمائی کی کہ فقہ میں جو پسندیدہ ہے اس کو جمع کر کے فقہ حدیث کی از سر نو بنیاد رکھی جائے، حدیث کے اسرار، احکام کی مصلحتیں، ترغیبات اور جو کچھ حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم، خدا تعالیٰ سے لائے تھے اس کی تعلیم دی جائے۔ وہ ایک ایسا فن ہے کہ اس فقیر سے پہلے فقیر سے زیادہ مرتب طریقہ کی اس کو قلم بند نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ایک جلیل القدر فن تھا۔ اور اگر کسی کو اس بات میں شک ہو تو اس سے کہو کہ وہ کتاب "قواعد کبریٰ" کو دیکھے کہ شیخ عزالدین نے اس میں کس قدر کوشش کی ہے اور پھر بھی اس فن کے عشر عشیر سے بھی عہدہ برآ نہ ہو سکے۔

طریقہ سلوک جو حق تعالیٰ کا پسندیدہ ہے اور اس زمانے میں اس کا تقاضا ہونا چاہیئے۔ وہ مجھے الہام فرمایا اس کو میں نے دو رسالوں میں مرتب کیا ہے ان رسالوں کا "لمحات" اور "الطاف القدس" نام رکھا ہے[1]۔ اور قدمائے اہل سنت کے عقائد کو دلائل اور حجت سے ثابت کیا ہے اور ان کو معقولیوں کے شبہات کے خس وخاشاک سے پاک کیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ اب بحث کا موقعہ نہیں رہا۔

علم کمالات ۔ جس میں چار لفظ، ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کے معنی دیئے ہیں اور جو اس دنیا کے عرض وطول میں پائے جاتے ہیں۔ اور انسانوں کے نفوس کی استعداد کا علم کہ وہ کیونکر کامل ہوتا ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے فقیر پر واضح کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں علم (علم کمالات وعلم استعداد) بہت اہم ہیں کہ فقیر سے پہلے کوئی ان علوم تک نہیں پہنچا ہے۔

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کے دونوں مشہور ومعروف رسالے ہیں۔ متعدد مرتبہ چھپ چکے ہیں "لمحات" کو شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد نے مولانا غلام مصطفٰے قاسمی کے مقدمہ وتصحیح کے ساتھ ابھی حال میں شائع کیا ہے۔

حکمت عملی کہ جس کے ذریعہ سے اس زمانے کی درستی ہو سکتی ہے، پوری وسعت کے ساتھ مجھے بخشی گئی ہے اور اس کو مضبوط کرنے کی توفیق، قرآن، سنت اور آثار صحابہ سے مجھے دی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم دین منقول ہے اور جو اس میں داخل کر دیا گیا ہے یا اس میں تحریف کر دی گئی ہے اور جو کچھ سنت یا بدعت ہے اس کی شناخت مجھے بخشی گئی ہے۔[1]

ولوان لی فی کل منبت شعرۃ	اور اگر میرا ہر بن مو زبان بن جائے تو بھی
لساناً لما استوفیت واجب حمدہٖ	میں خدا کی حمد اس کے حق کے بموجب نہ کر سکتا
والحمد للہ رب العالمین۔	اور تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، جو دونوں جہانوں کا پالنے والا ہے۔

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کا وصال ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ (۲۰ اگست ۱۷۶۲ء) بروز جمعہ دہلی میں ہوا اور آپ مہندیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

شیخ ابن عربیؒ اور امام ربانیؒ کی طرح شاہ ولی اللہ بھی ایک نئے فلسفی فکر کے بانی ہیں۔ ابن عربی کے تصور وحدت الوجود سے امام ربانی کو اختلاف تھا۔ اس کے خلاف امام ربانی نے اپنا نیا فکر پیش کیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب شیخ ابن عربی کے تصور وحدت الوجود کو صحیح مانتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ امام ربانی کے فکر کو بھی ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ دونوں بزرگوں میں اصلاً کوئی فرق نہیں۔ امام ربانیؒ نے جس تصور کو وحدۃ الشہود سے تعبیر کیا ہے۔ وہ ابن عربی کے تصور وحدت الوجود میں موجود ہے امام ربانی اور ان سے پہلے امام ابن تیمیہ کو ابن عربی سے یہ شکایت تھی کہ ان کے تصور وحدت الوجود سے اسلام کی حقانیت پر زد پڑتی ہے، شاہ صاحب نے ابن عربی کے وحدت الوجود کی اس طرح تشریح کی کہ اس میں اور اسلام کے عقیدہ توحید میں کوئی بنیادی تضاد نہ رہا۔

(مولانا عبید اللہ سندھی)

برِ صغیر پاک و ہند میں علم حدیث[1]

احمد اقبال ایم اے لیکچرار اسلامیات سندھ یونیورسٹی

دسویں صدی ہجری کی سب سے عالی منزلت شخصیت حضرت شیخ المحدثین علی متقی برہانپوری کی تھی، جن کا فیض درحقیقت ہند و پاک کی تاریخ میں علم حدیث کے دور استقلال کا بانی ہے۔ شیخ کے استاذ حافظ ابن حجر ہیثمی کے دوسرے ہندی تلامذہ کا تذکرہ جولائی ۱۹۶۴ء کے شمارے میں ہو چکا ہے۔ اب ذیل میں شیخ علی متقی برہانپوری سے مستفیض ہونے والے تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شیخ موصوف کے شاگردوں میں علامہ مجد الدین محمد بن طاہر پٹنی ایسے بلند پایہ محدث تھے، جن کے فضل و کمال کی شہرت سارے عالم اسلام میں ہے اور ان کی تصنیفات سے علمائے حجاز و یمن اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں، جیسے کہ ہند و پاک کے علماء۔ آپ نہر والا گجرات میں ۹۱۴ھ میں پیدا ہوئے ملا مہتہ شیخ ناگوری، مولانا یداللہ اور مولانا برہان الدین سے علم حاصل کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے، وہاں شیخ ابوالحسن بکری، علامہ ابن حجر مکی، شیخ علی العراقی اور شیخ جاراللہ بن فہد سے سندات حدیث حاصل کرنے کے علاوہ شیخ علی متقی برہانپوری کے خصوصی تلمیذ ہوئے۔ اور ایک عرصہ تک ان سے اکتساب فیض کیا۔ حجاز سے واپس آکر آپ تصنیف و تدریس اور تبلیغ و اصلاح میں مشغول ہوئے آپ کے خاندان کا تعلق فرقہ بوہرہ سے تھا جس کی اصلاح میں آپ نے سعی بلیغ فرمائی آپ کے عہد میں اکبر نے گجرات میں فتح کیا تھا اور آپ کی تبلیغی مساعی میں آپ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ جب خان اعظم گجرات کا گورنر مقرر ہوا چونکہ وہ خود راسخ العقیدہ سنی تھا تو اس نے اپنے دور حکومت میں شیخ کی پوری مدد کی مگر جب خان خاناں گورنر ہوا تو شیعہ بوہرے پھر دلیر ہو گئے۔ ۹۸۶ھ میں شیخ اس مورخ(؟) کی

---

[1] اس سلسلہ کا پہلا مضمون ماہ جولائی ۱۹۶۴ء کے شمارے میں ملاحظہ ہو۔

شکایت کے لئے آگرے اکبر کے پاس جارہے تھے کہ اجین کے قریب آپ کے مخالفین نے آپ کو شہید کر دیا (رود کوثر از شیخ محمد اکرام ص ۳۳۸)

شیخ عبدالقادر حضرمی "النور السافر" میں لکھتے ہیں "حتی لم یعلم ان احداً من علماء گجرات بلغ مبلغہ فی فن الحدیث کذا قالہ بعض مشائخنا" [1] (ہمارے بعض شائخ نے فرمایا ہے کہ یہ بھی معلوم نہیں ہے علماء گجرات میں سے فن حدیث کے اندر کوئی ان کے مرتبہ کو پہنچا") ان کی سب سے مشہور تصنیف لغت حدیث میں "مجمع بحار الانوار فی غرایب التنزیل ولطائف الاخبار" ہے، جس کو صحاح ستہ کی شرح کہنا چاہیئے۔ نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم اتحاف النبلا میں اس کی نسبت لکھتے ہیں۔ "کتاب متفق علی قبولہ بین اہل العلم منذ ظہر فی الوجود ولہ منۃ عظیمۃ بذلک العمل علی اہل العلم" [2] (یعنی جب سے یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے، اس وقت سے اہل علم میں یہ مقبول ہے اور سب کو اس پر اتفاق ہے شیخ نے اس کو تصنیف کر علماء پر بہت احسان کیا ہے) علاوہ اس کے ان کی تصنیفات میں سے المغنی فی ضبط اسماء الرجال (مسودہ بانکی پور) [3] تذکرۃ الموضوعات (مسودہ بانکی پور) اسماء الرجال (مسودہ بانکی پور) قانون الموضوعات فی ذکر الضعفا والوضاعین اور رسالہ فی لغات المشکاۃ بہت معروف ہیں۔

شیخ علی متقی برہانپوری کے ایک اور شاگرد شیخ عبدالوہاب المتقی ابن شیخ ولی اللہ ہیں جو علوم متداولہ اپنے وطن برہانپور اور گجرات میں حاصل کرنے کے بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے اور ۹۶۳ھ سے ۹۷۵ھ تک یعنی بارہ سال شیخ علی متقی برہانپوری کی خدمت میں رہے اور شیخ کی تصنیف وتالیف اور کتابت میں معاونت کی آپ کو اپنے استاد کی طرح بڑی قدر ومنزلت حاصل ہوئی۔ شیخ عبدالحق محدث "اخبار الاخیار" میں یمن کے رہنے والے کسی بزرگ کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس میں شیخ عبدالوہاب کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا علیکم یا اہل الحرمین بالشمعۃ المضیئۃ من اللہ فیکم فاستفیئوا بہ

---

[1] بحوالہ یاد ایام۔ سید عبدالحیٔ ناظم ندوۃ العلماء ص ۶۴

[2] " " " " ص ۶۵

[3] Contribution of India to Arabic Literature by Doctor Zubaid Ahmad. P. 254.
والثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند لعبدالحی الحسنی ص ۱۳۷

جی اے اہل حرمین! اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن کی ہوئی اس شمع سے روشنی وہدایت حاصل کرو۔ شیخ عبدالحق نے آپ کو اپنے استاتذہ میں شمار کیا ہے۔ آپ زندگی بھر درس وتدریس، غریب الوطن طلبہ کی امداد واعانت اور اپنے شیخ کی تصانیف کی کتابت میں مشغول رہے آپ بڑے خوش نویس تھے۔ شیخ عبدالحق محدث نے آپ کی تصنیفات کا ذکر نہیں کیا مگر حال ہی میں حاجی عبداللہ لائبریری کلکتہ میں آپ کے فن حدیث کے متعلق کچھ غیر مطبوعہ رسائل دریافت ہوئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔[1]

بشارۃ المجیب فی فضل الغریب

رسالۃ مساۃ بنصیحۃ الفطنۃ فی الخلاص عن الفتنۃ

رسالۃ فی فضائل کلمۃ التوحیدیۃ

آپ کی وفات ۱۰۰۱ھ میں ہوئی۔

شیخ رحمۃ اللہ سندھی در بیلہ ضلع نواب شاہ میں پیدا ہوئے۔ تکمیل علوم اپنے والد قاضی عبداللہ سے کی۔ پھر مدینہ تشریف لے گئے۔ جہاں شیخ علی متقی برہانپوری کی خدمت میں رہے اور ان سے سند حدیث حاصل کی۔ احکام حج پر آپ کی کتاب المنسک المتوسط بہت مشہور ہے جس پر شیخ الحدیث ملا علی قاری نے شرح لکھی۔ حرمین شریفین میں آپ کو جو عزت و منزلت حاصل ہوئی اس کا اندازہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات سے کیا جاسکتا ہے۔ جن میں وہ شیخ رحمۃ اللہ سندھی کو شیخ الحرمین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کی تاریخ وفات "رحمۃ اللہ قد نال مرادہ" سے نکالی گئی ہے یعنی ۹۹۲ھ[2]۔ شیخ رحمۃ اللہ سندھی کے شاگردوں میں شیخ بہلول دہلوی بہت مشہور ہوئے۔ آپ دہلی میں درس حدیث دیتے تھے اور ساری عمر اس فن شریف کی خدمت میں گذار دی۔ شیخ رحمۃ اللہ سندھی کے بھائی شیخ حمید سندھی بھی اپنے بھائی کی طرح بڑے صاحب فضل وکمال محدث تھے۔ سندھ سے گجرات تشریف لے گئے۔ میر معصوم مصنف تاریخ معصومی نے گجرات میں آپ سے سند حدیث حاصل کی تھی۔ گجرات سے پھر آپ نے حرمین شریفین کو ہجرت فرمائی۔ وہاں شیخ

---

[1] Life and Works of Shah Abdul Wahhab Al-Muttaqi by Doctor S. A. Masumi (Journal Al-Hikmah)

[2] سرزمین سندھ میں علم حدیث از مخدوم امیر احمد صاحب "الرحیم" جولائی ۱۹۶۳ء ۳۰۲

علی متقی برہانپوری سے سند حدیث حاصل کی۔

اسی عہد کے ایک سندھی بزرگ شیخ عبداللہ بن سعد ہیں جو اپنے عہد کے بے نظیر عالم تھے آپ نے بھی سندھ سے گجرات اور پھر حرمین شریفین کو ہجرت فرمائی۔ جہاں آپ شیخ علی متقی برہانپوری کے درس میں شریک ہوئے۔ موصوف نے شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب عوارف المعارف پر حاشیہ لکھا ہے آپ کا ۹۸۴ھ میں انتقال ہوا[1]

شیخ علی متقی برہانپوری سے مستفیض ہونے والے محدثین کے علاوہ اس عہد کے بعض دوسرے محدثین حسب ذیل ہیں۔

مولانا میر کلاں محدث اکبرآبادی۔ آپ ظاہری و باطنی کمالات کے مالک تھے۔ خاص طور سے علم حدیث میں کمال حاصل تھا۔ علم حدیث میں ان کو سند سید میرک شاہ شیرازی سے حاصل تھی اور میرک شاہ اپنے والد سید جمال الدین محدث مصنف روضۃ الاحباب سے سندِ حدیث رکھتے تھے۔ آپ کی عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ آپ کے شاگردوں میں شیوخ میں شیخ الحرمین ملا علی قاری اور بادشاہوں میں مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر شامل ہیں[2] آپ نے اکبرآباد میں ۹۸۱ھ میں وفات پائی[3]

شیخ محمد لاہوری بن عبدالملک :۔ آپ لاہور کے رہنے والے تھے تکمیل علم کا شوق آپ کو حرمین شریفین لے گیا، جہاں کے شیوخ سے آپ نے تفسیر و حدیث کی تکمیل کی اور وطن مالوف واپس آکر زندگی بھر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ حضرت سید سلیمان ندوی مرحوم[4] کی تحقیق کے مطابق آپ ہند و پاک میں سب سے پہلے محدث ہیں جنہوں نے بخاری شریف کو داخل درس کیا۔ ورنہ اس سے پہلے ہند و پاک کی درسگاہوں میں مشارق الانوار کو ہی بڑی اہمیت حاصل تھی شیخ محمد لاہوری بخاری شریف کا ختم بڑے اہتمام کے ساتھ فرمایا کرتے تھے اور اس موقع پر شاندار دعوت دیتے تھے[5] انہی کے معاصر شیخ عبدالنبی بن شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی ہیں۔ شیخ موصوف علوم متداولہ ہندوستان میں حاصل کرکے حرمین شریفین گئے۔

---

[1] سرزمین سندھ میں علم حدیث از مخدوم امیر احمد۔ الرحیم جولائی ۱۹۶۳ء

[2] تذکرہ علماء ہند ص ۵۰۶

[3] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الهند۔ عبدالحی الحسنی ص ۱۳۶

[4] معارف ج ۲۲ نمبر ۵

[5] تذکرہ علماء ہند ص ۵۹۱

وہاں شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی اور دوسرے محدثین سے سندات حدیث حاصل کیں۔ ہندستان تشریف لائے تو اکبری عہد میں صدرالصدور مقرر ہوئے۔ اکبر شروع میں آپ کی بڑی عزت کرتا تھا مگر بعد میں حاسدین نے اکبر کے خیالات بدل دیئے یہاں تک کے صاحب فہمی کے ایک قضیہ میں اس پاکباز صاحب علم وفضل عالم کو ۹۹۱ھ میں اکبر نے گلا گھونٹواکر شہید کرادیا۔[1] آپ کی تاریخ شہادت "واصل بحق شد" سے نکالی گئی ہے۔ شیخ نے متعدد تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں وظائف النبی اور سنن الھدی فی متابعۃ المصطفیٰ بہت مشہور ومعروف ہیں۔

اسی عہد میں گجرات میں علامہ وجیہ الدین علوی بن نصراللہ علوی بڑے پائے کے عالم گزرے ہیں۔ آپ ان برگزیدہ علماء میں سے ہیں جن کے احسان سے اہل ہند کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ آپ علامہ عمادالدین محمد طاری کے شاگرد تھے۔ چالیس برس تک احمد آباد میں علوم دینیہ کے درس وتدریس میں مشغول رہے۔ تیس درسی کتابوں پر حواشی وشروح قلم بند فرمائے۔ جن میں تفسیر حدیث فقہ عقائد معانی، منطق اور علم نحو سب ہی علوم کی کتابیں شامل ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں احمد آباد سے لاہور تک ان کے شاگرد پھیل کر علمی خدمتوں میں مصروف ہوگئے تھے۔ آپ نے علامہ ابن حجر عسقلانی کی اصول علم حدیث کی مشہور کتاب نخبۃ الفکر کی شرح تصنیف فرمائی۔ انتقال ۹۹۸ھ میں ہوا۔[2]

علامہ وجیہ الدین علوی کے شاگردوں میں حکیم عثمان بوبکانی ابن شیخ عیسیٰ سندھی بہت مشہور ہوئے آپ مقام بوبکان سندھ میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے بوبکانی کہلاتے ہیں۔ آپ کو حصول علم اور خدا طلبی کا ذوق اوائل شباب ہی میں کشاں کشاں مرکز علوم احمد آباد لے آیا۔ وہاں آپ نے علامہ وجیہ الدین علوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جملہ علوم میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کا مشغلہ اختیار فرمایا آپ کے علمی فضائل وکمالات کا شہرہ نزدیک ودور پھیل گیا اور جب آپ ۹۸۳ھ میں برہانپور تشریف لائے تو بادشاہ وقت محمد شاہ ابن مبارک شاہ فاروقی نے عزت واحترام کے ساتھ خیر مقدم کیا اور درس وفتویٰ نویسی کے اعلیٰ منصب پر مامور فرمایا۔ ستائیس سال تک آپ انہی خدمات میں مصروف رہے۔ اور بے شمار طالبان اس سرچشمہ علوم وفنون سے

---

[1] شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات از اعجاز الحق قدوسی ص ۵۲۲

[2] یاد ایام مصنفہ سید عبدالحی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ ص ۹۶

فیض حاصل کرتے رہے۔ آپ سے مستفیض ہونے والے علماء میں شیخ الاولیا شیخ عیسیٰ جنداللہ قاضی عبدالسلام سندھی، ملا غوثی مصنف گلزار ابرار اور شیخ صالح سندھی شامل ہیں۔ ملا غوثی حسن نے اپنی تصنیف گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں منجملہ ان کے تفسیر بیضاوی کا حاشیہ اور فن حدیث میں صحیح بخاری شریف کی شرح بہت ممتاز ہیں۔[1] آپ کی وفات ۱۰۰۰ھ میں ہوئی۔

علامہ وجیہ الدین کے ایک شاگرد شیخ محمد برھانپوری تھے۔ آپ کے والد کا نام فضل اللہ تھا، جو جونپور کے رہنے والے تھے اور اپنے زمانے کے مشہور صوفی اور عالم حدیث تھے۔ اور نائب رسول اللہ کے لقب سے معروف تھے۔ شیخ محمد برہانپوری نے اپنے والد سے بھی زیادہ عزت و شہرت حاصل کی تکمیل علوم شاہ وجیہ الدین گجراتی سے کی حرمین شریفین جاکر شیخ علی متقی برہانپوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ بالآخر برہانپور میں مقیم ہوکر مدرسہ اور مسند ارشاد و ہدایت کو زینت دی آپ کی تصنیف "تحفۃ المرسلۃ الی النبی" نے آپ کے نام کو تصنیف و تالیف کی دنیا میں ہمیشہ کے لئے روشن کردیا۔ اس کی ایک شرح خود الحقیقت الموافق للشریعت کے نام سے تحریر فرمائی[2] جس کی ایک نقل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ شیخ عبدالغنی نابلسی اور شیخ ابراہیم کردی جیسے جلیل القدر علماء نے بھی اس کی شروح لکھی ہیں[3] انڈونیشیا میں اس کا بہت چرچا تھا۔ ملایائی زبان کے اہل قلم نورالدین رانیری نے اس کا ترجمہ ملایائی میں کیا[4]

اسی زمانے میں حضرت شیخ طاہر محدث سندھی بھی بڑے صاحب فضیلت عالم حدیث گذرے ہیں۔ آپ قصبہ پات سندھ کے رہنے والے تھے شیخ شہاب الدین اور دوسرے شیوخ سندھ سے علوم متداولہ میں مہارت حاصل کی۔ سندھ سے برار تشریف لے گئے۔ وہاں سے آپ محمد شاہ فاروقی کے دعوت و اصرار پر برہانپور پہنچے اور درس و تدریس کا فیض جاری فرمایا۔ علم حدیث میں آپ کے علوئے مرتبہ کا یہ حال تھا کہ مولانا فرحی نے لکھا ہے

---

[1] برھانپور کے سندھی اولیا ص۲۲۰ نیز الثقافتہ الاسلامیہ از عبدالحی ص۱۵۰

[2] رود کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام ص۳۴۲

[3] معارف ج ۲۲ نمبر ۵

[4] رود کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام ص۳۴۳

کہ آپ کو تیس ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں[1] اس زمانے کے بزرگ ترین علماء و صوفیا آپ کی صحبت اور درس سے فیض یاب ہوئے تھے۔ مولانا سید جمال نے جو خود صاحب علم و فضل تھے شیخ سے مکمل صحیح بخاری پڑھی آپ کی عجوبہ روزگار تصانیف کا تذکرہ علامہ غوثی حسن نے اذکار ابرار میں کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کس پائے کے صاحب فضیلت بزرگ اور جامع العلوم تھے۔ فن حدیث میں ملتقط جمع الجوامع للسیوطی، اسامی رجال صحیح بخاری اور ریاض الصالحین[2] کے علاوہ منظوم موجز قسطلانی بھی تحریر فرمائی[3] امام قسطلانی ۹۲۳ھ نے صحیح بخاری کی شرح ارشاد الساری دس ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی ہے۔ جو بخاری کی عظیم ترین شرحوں میں سے ایک ہے۔ علامہ غوثی کی تصریح کے مطابق شیخ طاہر نے اس شرح کا اختصار دو لاکھ ابیات میں قلم بند فرمایا، جو بڑے بڑے بارہ دفتروں پر مشتمل تھا، افسوس ہے کہ علم حدیث سے بے پناہ محبت و شفقت اور اس کی خدمت کے اس حیرت انگیز کارنامہ کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کا مسودہ اب کہیں محفوظ ہے یا نہیں۔

اسی عہد میں ساحل ہند ملابار میں ایک صاحب تصنیف محدث کا حال معلوم ہوتا ہے۔ جن کا نام زین الدین بن عبدالعزیز ملاباری ہے۔ آپ کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ آپ ملابار کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور یہ کہ علی عادل شاہ بیجاپوری آپ کا عقیدت مند تھا۔ اور اس کے دربار میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی آپ کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف تحفۃ المجاہدین ہے۔ علم حدیث میں آپ کی کتاب متضمن للاحادیث والآثار المتعلقۃ بالموت وما بعدہ ہے۔ آپ ہی کے معاصر سید ہبۃ اللہ المعروف بہ شاہ میر شیرازی گجراتی ہیں، جنہوں نے اپنی ساری زندگی اس فن شریف کی خدمت میں صرف کی۔ آپ نے فن حدیث میں ایک رسالہ "سود مند" تحریر فرمایا جس میں تمام اقسام

---

[1] برہانپور کے سندھی اولیاء

[2] ریاض الصالحین کی ترتیب تین روضوں پر ہے روضہ اول۔ احادیث صحیحہ پر مشتمل ہے۔ برہانپور کے سندھی اولیا ص ۹

[3] شیخ عبدالحی الحسنی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند۔ شیخ کی اس شرح بخاری کے منظوم ہونے کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔ شرح علیہ للشیخ طاہر بن یوسف السندی و ہو ماخوذ من القسطلانی ص ۱۰۵

حدیث کو نہایت سلیقہ سے جمع کیا گیا تھا آپ نے ۱۰۰۵ھ میں وفات پائی

دسویں صدی ہجری کے اب تک جن علمائے حدیث کے تذکرے پیش کئے گئے ہیں ان کی وطنی نسبت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو پاک کے ساحلی علاقوں اور جنوبی صوبوں میں علم حدیث کے درس کا بہت زیادہ چرچا تھا اور وہاں کتب احادیث کی شرحوں خلاصوں اور علم حدیث کے دوسرے موضوعات پر نئی تصنیفات کا کام بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہو رہا تھا جب کہ پنجاب دہلی اور یوپی میں محدثین اور ان کی خدمات کے تذکرے خال خال ملتے ہیں۔ اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر خلیق نظامی استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے اپنی کتاب حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں مندرجہ ذیل اسباب کی نشان دہی کی ہے۔

محمد بن تغلق نے جب علماء و مشائخ کو ملک کے دور دراز حصوں میں بھیج دیا تھا شمالی ہندوستان میں علمی محفلیں سرد پڑ گئیں۔ فیروز تغلق نے اس بکھری ہوئی مجلس کو سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد جو سیاسی ابتری پیدا ہوئی اس سے تنگ آکر علماء صوبوں میں چلے گئے اور یہ علاقہ علماء سے یکسر خالی ہوگیا۔ تیمور کے حملہ نے تباہی کو مکمل کر دیا۔ سکندر لودھی نے اس بزم کو پھر رونق دینی چاہی لیکن سیاسی انتشار اور غیر یقینی حالات کے باعث زیادہ کامیابی نہ ہوئی پھر اکبر کی بے راہ روی سے متاثر ہو کر اکثر علماء و مشائخ اس علاقہ سے ہٹ گئے انہوں نے یا تو حرمین شریفین کی راہ لی یا پھر دارالسلطنت سے دور ساحلی علاقوں میں اقامت اختیار کر لی۔ [1]

بات ناتمام رہے گی اگر ہم ان اسباب کے ساتھ ساتھ شاہان گجرات کی علم نوازی اور علماء و مشائخ کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت و محبت بھی اس ضمن میں شامل نہ کریں گے جو اوائل نویں صدی سے لیکر دسویں صدی کے خاتمہ تک علماء کی خدمت کرتے رہے جن میں مظفر شاہ حلیم شاگرد علامہ جمال محمد بن عمر بحرقی اور محمود شاہ دوم جیسے خدا ترس اور علم دوست بادشاہ شامل ہیں، محمود شاہ دوم جس کے شغف علمی اور علماء سے عقیدت کی مثال شاید ہی ہندوستان کی تاریخ میں مل سکے۔ اس کی علم پروری کا یہ حال تھا کہ اس نے نہ صرف گجرات میں مدارس قائم کئے بلکہ مکہ معظمہ میں باب العمرہ کے متصل ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا جس میں علامہ شہاب الدین ابن حجر مکی اور عزالدین عبدالعزیز زمزمی وغیرہ علماء مکہ تدریس

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی تالیف پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۴۲، ۴۳

کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس نے خلیج کھمبایت میں ایک بندرگاہ کی آمدنی محض حرمین محترمین کے علمار شیوخ اور مستحقین پر صرف کرنے کے لئے وقف کررکھی تھی[1] پھر اس کی علمار سے عقیدت کا حال یہ تھا کہ وہ دعوتوں میں اپنے ہاتھ میں تشلہ لے کر علمائے کرام کے ہاتھ دھلواتا تھا حسن اتفاق سے ان بادشاہوں کو لیسے وزرار بھی ملے جو خود صاحب علم اور علم دوست تھے۔ آصف خاں جو بہادرشاہ کے زمانے میں وزارت اور محمد شاہ کے عہد میں وکالت مطلقہ کے عہدے پر متمکن تھے، علامہ ابن حجر مکی نے ایک رسالہ ان کے حالات میں لکھا ہے۔ اس میں ان کے فضل وکمال اور تقوی وتقدس کی بڑی مدح سرائی کی ہے[2] علامہ عزالدین عبدالعزیز مکی نے آصف خاں کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

وای نازلۃ فی الھند قد نزلت
بلفحھا کل حبر فی الحجاز صلی[3]
اعظم بنازلۃ فی الکون طاربھا
برا وبحرا مسیر السفن والابل[4]

ان مثالوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاہان گجرات اور ان کے امراء کے علمار کرام سے کس قدر گہرے روابط قائم تھے جس کے نتیجہ میں علوم دینیہ کی ترقی و ترویج لازمی تھی۔ علامہ عبدالحی حسنی یادایام میں شاہان گجرات کی علوم وفنون کی قدردانی پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شاہان گجرات نے اپنی ڈیڑھ دو سو برس کے زمانۂ فرمانروائی میں جس قدر علوم وفنون کی سرپرستی کی ہے دہلی کی شش صد سالہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی۔ یہ صرف ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ شیراز دیمن اور دیگر ممالک اسلامیہ کے چیدہ برگزیدہ علمانے گجرات میں آکر بود و باش اختیار فرمائی جن کے فیوض سے

---

[1] ظفرالوالہ مصنفہ محمد بن عمر آصفی بحوالہ یادایام از عبدالحیٔ الحسنی ناظم ندوۃ العلماء صـ۱۸
[2] یادایام از عبدالحیٔ الحسنی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ صـ۴۶
[3] ترجمہ۔ وہ کون سی خوفناک مصیبت ہے جو ہندوستان پر نازل ہوئی جس کی لپیٹ سے تمام حجاز کے فضلا جل رہے ہیں۔
[4] عالم میں وہ کونسی مصیبت نازل ہوئی ہے جس کی خبر کو بحر و بر میں کشتیوں اور اونٹوں نے پھیلا دیا ہے۔

چند دنوں میں گجرات مالامال ہوگیا اور خود گجرات میں اس پائے کے علما پیدا ہوئے جن کے فیوض علمی کی آبیاری سے اب تک ہندوستان کی درس گاہیں سیراب ہو رہی ہیں[۱] ساحلی علاقوں میں علم حدیث کی خصوصیت سے اشاعت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب شاہان گجرات نے عرب و ہند کے بحری راستے کو دوبارہ استوار کیا' تو گجرات اور مرکز حدیث حجاز کے مابین رسل و رسائل کا سلسلہ قائم ہوگیا اور جو اہل علم سرزمین حجاز سے گجرات اور اس سے ملحقہ علاقوں میں تشریف لائے ان میں محدثین کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند میں علماء کا ورود زیادہ تر خراسان و افغانستان وغیرہ سے ہوا' جو اپنے ساتھ زیادہ تر علم فقہ' منطق اور فلسفہ لائے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز عہد سلطنت سے لیکر دسویں صدی ہجری کے خاتمہ تک شمالی ہند میں فقہ و منطق اور دوسرے علوم عقلیہ کے درس و تدریس کا بہت زیادہ چرچا نظر آتا ہے بالخصوص تغلق عہد میں تو فقہی علوم کی ترویج پر بہت زیادہ توجہ دی گئی' جس کی وجہ سے نیز الکلام فی اختلاف ائمۃ الاعلام' فقہ فیروز شاہی' فتاویٰ تاتارخانیہ اور دوسری اعلیٰ درجہ کی کتب فقہ میں تصنیف ہوئیں۔ اس عہد میں فقہ سے مانوسیت کا یہ عالم تھا کہ مولانا رکن الدین ایک فقیہ نے فقہی مضامین سے متعلق ایک طویل مثنوی طرفۃ الفقہا کے نام سے لکھی تھی جس میں تیس ہزار سے زیادہ اشعار تھے[۲] عہد لودہی کے حالات میں شیخ عبداللہ و شیخ عزیز اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بدایونی رقم طراز ہے۔

"ایں ہر دو عزیزاں ہنگام خرابی ملتان آمدہ علم معقول را دراں دیار رواج دادہ"

غرض شمالی ہند جس دولت علمی سے مالامال تھا' اس میں علوم عقلیہ کا زیادہ حصہ تھا مگر جب ۹۸۰ھ میں اکبر نے گجرات فتح کیا اور اس کا الحاق اپنے ممالک محروسہ سے کرلیا تو حجاز کا سمندری راستہ شمالی ہندوستان والوں کے لئے بھی کھل گیا اور اب طالبانِ علم حرمین شریفین پہنچنے لگے۔ وہ وہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کرتے اور واپس آکر شمالی ہندوستان کو سیراب کرتے۔ اس طرح درس حدیث کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں جاری ہوگیا۔

---

[۱] یاد ایام مصنفہ علامہ عبدالحی الحسنی ص۳۳

[۲] آب کوثر مصنفہ شیخ اکرام ص۱۹۶

شیخ عبدالحق محدث دہلوی شاگرد رئیس المحدثین شیخ علی متقی برہانپوری اس قافلے کے میر کارواں تھے جن کے فیض نے اس فن شریف کے مرکز ثقل کو گجرات سے دہلی منتقل کرکے وقف عام کیا۔

جو شخص ان ائمہ حدیث کے مذاہب کو بنظرِ تعمق دیکھے گا۔ اور انصاف سے پورا کام لے گا تو وہ لامحالہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ مالکؒ کے مذہب کا انحصار اور اساس تو خود ان کی کتاب مؤطا ہے اسی طرح شافعی کے مذہب کی بنیاد اور اس کا دار و مدار بھی موطا پر ہے۔ نیز ابو حنیفہ اور ان کے دو ساتھیوں محمدؒ اور ابو یوسف کے مذہب کی شمع یہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ فقہ کے ان مذاہب اور موطا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک متن ہے اور باقی اس کی شرحیں۔ ایک اصل ہے اور دوسرے مذاہب اس کی شاخیں۔ بے شک امام مالک کے استنباط کے بارے میں تو لوگوں کو اختلاف ہے، بعض ان کے استنباطات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ بعض ان کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ بعض ان میں ضعف ثابت کرتے ہیں۔ اور بعض ان کی تصحیح کرتے ہیں، لیکن جہاں تک نفسِ موطا کا تعلق ہے، اس کی ترتیب اور تہذیب میں امام مالک نے جو کوشش اور جد و جہد کی ہے اس بنا پر ان تمام مذاہب فقہ کے لئے موطا کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ اس سلسلے میں امام شافعی کا یہ قول بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دین کے معاملے میں مجھ پر مالک سے زیادہ کسی نے احسان نہیں کیا۔

بہر حال جو شخص انصاف سے کام لے گا۔ وہ اس بات کو ضرور تسلیم کرے گا کہ کتب احادیث میں سے سنن کی یہ کتابیں جیسا کہ صحیح مسلم، ابوداؤد اور نسائی اور فقہ کے اعتبار سے احادیث کے یہ مجموعے مثلاً بخاری اور ترمذی وغیرہ ہیں۔ یہ سب کے سب موطا سے مستخرج ہیں۔ اور ان ائمہ کے پیش نظر گویا امام مالک کی مؤطا تھی چنانچہ انہوں نے یہ کیا کہ موطا میں اگر کوئی روایت مرسل تھی، تو اسے موصول ثابت کیا اور اگر موطا میں کوئی روایت موقوف تھی، تو اسے انہوں نے مرفوع کر دیا۔

(از المسوی شاہ ولی اللہ)

صدر اسلام میں مسلمانوں کے علمی مرکز[1]

محمد سرور

کوفہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک کافی بڑی تعداد کوفہ میں آباد ہوئی تھی۔ علمی لحاظ سے ان سب میں ممتاز ترین حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ تھے۔ حضرت علی تو عراق کے دوران قیام میں سیاسیات میں لگے رہتے۔ اور جنگ و جدل نے انہیں مہلت نہ دی کہ وہ کوفہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر سکتے البتہ حضرت عبداللہ ابن مسعود نے سرزمین کوفہ میں سب صحابہ کرام سے زیادہ اپنے علمی اثرات چھوڑے۔ آپ سابقین اولین میں سے تھے، بلکہ مروی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سب سے پہلے ایمان لانیوالوں میں سے آپ چھٹے تھے۔ ابن مسعودؓ ہجرت حبشہ اور بعد میں مدینہ منورہ کی ہجرت میں شریک تھے۔ آپ اکثر رسول اللہ کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ حضرت ابن مسعود کو قرآن مجید سے غیر معمولی شغف تھا۔ اور وہ زیادہ تر اسے پڑھتے رہتے اور اس پر غور کرتے اسی وجہ سے احکام اسلام کے فہم و ادراک اور معانی قرآن اور احادیث نبوی کے سمجھنے میں ان کا شمار اکابر صحابہ میں ہوتا تھا۔

حضرت عمر بن خطاب نے اپنے دور خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ بھیجا تاکہ وہ کوفہ والوں کو دین کی تعلیم دیں۔ چنانچہ کوفہ کے کثیر التعداد لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ اور شاگردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی۔ یہ حضرت ابن مسعودؓ سے

---

[1] اس سلسلہ کا پہلا مضمون ستمبر ۱۹۶۴ء کے شمارے میں ملاحظہ ہو۔ یہ احمد امین (مصری) کی کتاب فجر الاسلام سے ماخوذ ہے۔

پڑھتے، اور ان کے نقوش علمی پر چلنے کی کوشش کرتے۔ ان کے بارے میں سعید بن جبیر کا قول ہے: "ابن مسعود اور ان کے اصحاب کوفہ کی مشعلیں ہیں"۔ حضرت ابن مسعود قرآن کا درس دیتے، اس کی تفسیر بیان کرتے اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا لوگوں کو سناتے جب احکام و مسائل کے بارے میں ان سے پوچھا جاتا، تو اول تو وہ قرآن و حدیث سے استنباط کر کے ان کا جواب دیا کرتے۔ اور اگر قرآن و حدیث میں ان کا ذکر نہ ہوتا، تو وہ اپنی ذاتی رائے سے کام لیتے۔ ابن مسعود کے مکتب فکر کے یہ چھ بزرگ مشہور ہوئے۔ علقمہ، اسود، مسروق، عبیدہ، حارث بن قیس اور عمرو بن شرجیل۔ حضرت ابن مسعود کے بعد یہی بزرگ تعلیم و تدریس اور افتار میں ان کے جانشین ہوئے۔ یہ قرآن مجید کا درس دیتے، اور احکام و مسائل کے بارے میں ان سے جو استفسارات ہوتے ان کا جواب دیا کرتے۔

اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رہے کہ تمام علمائے کوفہ ابن مسعود کے شاگرد نہ تھے کوفہ کے بعض علماء اخذ علم کے لئے مدینہ گئے اور وہاں عمرؓ علیؓ، ابن عباسؓ معاذؓ اور دوسرے صحابہؓ سے انہوں نے اکتساب علم کیا۔ یہی اسباب تھے جن کی وجہ سے اس دور میں کوفہ جلیل القدر علمی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ بعد میں اس سرزمین نے شریح، شعبی نخعی اور سعید بن جبیر ایسی بلند پایہ علمی شخصیتیں پیدا کیں۔ ان علمی سرگرمیوں کا سلسلہ مدارج ترقی طے کرتا ہوا آخر امام ابو حنیفہ کی ذات گرامی میں اوج کمال کو پہنچا۔

بصرہ

کوفہ کی طرح بصرہ میں بھی صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد وارد ہوئی۔ اس جماعت کے علمی سرتاج ابو موسیٰ اشعریؓ اور انس بن مالکؓ تھے۔ ابو موسیٰ اشعری یمنی تھے یمن سے آپ مکہ آئے اور وہیں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ہجرت حبشہ میں آپ شریک تھے۔ اہل علم صحابہ میں ابو موسیٰ اشعری کی ایک ممتاز حیثیت تھی۔ وہ بصرہ آئے، اور یہیں اپنی مسند درس و تدریس بچھائی ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے انس بن مالک سے پوچھا: "تم نے اشعری کو کس حال میں چھوڑا ہے" انہوں نے کہا کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔ "ابو موسیٰ ضعیف ہیں، لیکن اس کا ذکر ان سے نہ کرنا" احکام و مسائل کے متعلق ان کے فیصلوں اور فتووں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فقہ میں مہارت قرآن و حدیث کی معرفت سے زیادہ تھی۔

انس بن مالک انصاری تھے وہ ابھی بچے ہی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی۔ حضرت انس کو کوئی دس سال تک آپؐ کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آخر میں وہ بصرہ آگئے تھے۔ انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ بصرہ میں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کی جو جماعت مقیم ہو گئی تھی۔ ان میں سب سے آخر میں وفات پانے والے یہی حضرت انس بن مالک تھے۔ یہ واقعہ اغلباً ۹۲ھ کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے انس بن مالک حضرت ابو موسیٰ اشعری اور عبداللہ بن مسعود کے مبلغ علم تک نہ پہنچ سکے۔ ان کو فقہ سے زیادہ حدیث میں ملکہ حاصل تھا۔

اموی دور خلافت میں بصرہ کے مکتب فکر کو حسن بصری اور ابن سیرین کی تابناک شخصیتوں نے خاص امتیاز بخشا، یہ دونوں بزرگ غیر عرب موالی تھے۔ اور دونوں کو اپنے عرب حلیفوں سے علمی سرمایہ ترکے میں ملا۔ حسن بصری حضرت زید بن ثابت کے موالی تھے اور حضرت زید کی علمی عظمت اور ان کا فضل و کمال صحابہ کرام میں مسلم تھا۔ ابن سیرین حضرت انس بن مالک کے موالی تھے اور ان کی شخصیت حضرت انس کی علمیت اور ان کے فیوض صحبت کی پرتو تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسن بصری اور ابن سیرین کی زندگی میں بصرہ میں انہی کا سکہ چلتا تھا، حضرت حسن بصری اخلاق کی پختگی، نیک روی، علم و حکمت اور فصاحت و بلاغت کے اوصاف کے مظہر تھے۔ ان کے اخلاق کی پختگی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے کے اظہار میں کسی بڑی سے بڑی مادی طاقت کی پروا نہیں کرتے تھے ایک دفعہ ان سے یزید بن معاویہ کی خلافت کے بارے میں پوچھا گیا۔ ابن سیرین اور شعبی نے تو اس کے متعلق رائے دینے سے احتراز کیا لیکن حسن بصری نے صریح طور پر اس کے بارے میں اپنی عدم موافقت کا اعلان کیا۔ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اشعث اور یزید بن مہلب کی بغاوتوں کے موقع پر کس طرح انہوں نے ایک سائل کے جواب میں بے دھڑک کہا تھا کہ نہ تو ان کا ساتھ دو اور نہ امیر المومنین ہی کا۔ امویوں کا عراق کا والی حجاج بن یوسف ثقفی ایک جابر و مستبد حاکم ہونے کے علاوہ ایک زبردست خطیب اور صاحب بیان بھی تھا۔ حسن بصری اپنے زمانے میں خطابت اور زور بیان میں اسی حجاج کے مدمقابل سمجھے جاتے تھے۔ ان کا سب سے نمایاں وصف ان کا زہد و اتقار تھا۔ اسی بنا پر اہل تصوف ان کو صوفیائے کرام میں شمار کرتے ہیں۔ آپ کے حکیمانہ مقولے بطور ضرب المثل بیان کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح معتزلہ انہیں رئیس المعتزلہ مانتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے قضا و قدر کے مسئلہ پر بحث کی اور یہ کہ وہ شخصی ارادہ کی

آزادی کے قائل تھے۔ حسن بصری فقیہہ بھی تھے۔ لوگوں کو جو نئے نئے مسائل پیش آتے تھے، وہ ان کے بارے میں آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اور آپ ان کے متعلق فتوے دیتے۔ قصہ گوئی میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ اپنے زمانے میں قصہ گویوں کے سرتاج اور ان میں سے صادق ترین سمجھے جاتے تھے غرض حسن بصری کی شخصیت ان تمام گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی۔ اور ان میں سے ہر خصوصیت اُن میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ۱۱۰ھ میں جب حضرت حسن بصری کا انتقال ہوا، تو تمام اہل بصرہ ان کے جنازے کے ساتھ تھے، یہاں تک کہ نماز عصر پڑھنے کے لئے مسجد میں کوئی نمازی نہ رہا۔

ابن سیرین نے حضرت زید بن ثابت، حضرت انس بن مالک اور شریح وغیرہ سے تحصیل علم کیا۔ آپ قابل وثوق محدث اور فقیہہ تھے۔ مسائل و احکام میں آپ سے استفتاء کیا جاتا تھا۔ ابن سیرین اور حسن بصری ہم عصر تھے۔ کبھی تو دونوں میں خوب دوستی رہتی اور کبھی آپس میں ناچاقی بھی ہو جاتی تھی۔ ناچاقی کا سبب ان دونوں بزرگوں کی طبیعتوں کا اختلاف تھا۔ حسن بصری بڑے صاف گو اور برملا بات کہنے والے تھے، آپ عصبی مزاج کے تھے۔ غم و غصہ کے اثرات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے اور اپنی رائے کے اظہار میں خواہ وہ خطرناک سے خطرناک سیاسی مسئلے کے متعلق ہو، ذرا نہیں جھجکتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ابن سیرین حلیم الطبع اور ہنس مکھ بزرگ تھے۔ ایسی بات کہنے سے جس پر خواہ مخواہ تعزیر و مواخذہ ہو، ہمیشہ احتراز کرتے۔ بعد میں خوابوں کی تعبیر کی وجہ سے ان کو شہرت دی گئی۔ اور اس موضوع پر ان کے نام سے ایک جعلی کتاب بھی منسوب کر دی گئی۔ گو ابن الندیم نے الفہرست میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے، اور اسے ابن سیرین کی تصنیف قرار دیا ہے، لیکن متقدمین کی تالیفات مثلاً طبقات ابن سعد" میں تعبیر رؤیا کے سلسلے میں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ ابن سیرین کا ۱۱۰ھ میں انتقال ہوا۔ وہ اور حسن بصری دونوں اپنے زمانے میں سرداران بصرہ شمار ہوتے تھے۔

ان مذہبی اور علمی سرگرمیوں کے علاوہ اسی زمانے میں عراق میں ایک اور تحریک بھی اُبھر رہی تھی، جسے ہم عربوں کے دور قبل از اسلام یعنی عہد جاہلیت کی یادگار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس تحریک میں روح تو عہد جاہلیت کی بروئے کار تھی، البتہ اس کا جامہ اسلامی تھا۔

بصرہ و کوفہ میں جو عرب قبائل آباد ہوئے، ان کے ہاں پہلے سے رؤسائے قبائل کا جو رواج چلا آتا تھا، وہ ان میں ان کے اس نئے وطن میں بھی جاری رہا۔ ان رؤساء کا

وجود اوران کے ساتھ افراد قبائل کی وابستگی دراصل عہد جاہلیت کے قبائلی نظام کا ایک مظہر تھی۔ کوفہ و بصرہ میں آباد ہونے والے عرب قبائل میں عہد جاہلیت کی طرح رؤسائے قبائل کی سیادت تسلیم کی جاتی تھی۔ افراد قبائل ان کے گرد جمع ہوتے اور صلح و جنگ میں ان کا حکم مانتے تھے۔ شعرا حسب دستور ان کی شان میں قصیدے کہتے، اور ان کے دشمنوں کی ہجو کیا کرتے۔

ان سرداران قبائل میں سے جن کے جاہ و جلال اور مروت و فیاضی کا اس دور میں بڑا شہرہ ہوا، ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں :۔ بنی تمیم بصرہ کے رئیس احنف بن قیس، بنی عبدالقیس بصرہ کے رئیس حکم بن منذر، بنی بکر بصرہ کے رئیس مالک بن تسمع، بنی قیس بصرہ کے رئیس قتیبہ بن مسلم، بنی تمیم کوفہ کے رئیس محمد بن عمیر، بنی ضبہ میں سے حسان بن منذر، بنی کندہ کوفہ کے رئیس حجر بن عدی اور محمد بن اشعث وغیرھم یہ اور ان کے ہم مثل دوسری شخصیتیں اس عہد کی شاندار ادبی زندگی کا سرچشمہ تھیں ان کے دم سے عربی شعر و سخن میں عہد جاہلی کا رنگ نمایاں ہوا، یہاں ان ادبی سرگرمیوں کی تفصیل مقصود نہیں۔ صرف ان ممتاز شخصیتوں میں سے ایک نمائندہ شخصیت کے ذکر پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بصرہ کے قبیلہ بنی تمیم کے رئیس احنف بن قیس تھے ان کے متعلق مشہور تھا کہ احنف کے برافروختہ ہونے پر ایک لاکھ تلواریں نیام سے نکل پڑتی تھیں، اور کوئی یہ نہیں پوچھتا تھا کہ احنف کے برافروختہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ جس قبیلے سے احنف کی پرخاش ہو جاتی، بنی تمیم اس سے بھڑ جاتے اور جب ان کی طرف سے اشارہ ہوتا۔ تو تلواریں نیام میں ہوتیں۔ امیر معاویہ احنف کے اس اثر و نفوذ سے واقف تھے، اسی لئے انہوں نے احنف کو اپنا مقرب بنایا اور ان پر اعزاز و اکرام کی بارش کی۔ امیر معاویہ نے اپنے والیوں کو بھی یہ تاکید کی تھی۔ چنانچہ جس والی سے احنف ناراض ہوتے، امیر معاویہ اس کو معزول کر دیتے۔ وہ احنف کی سخت بات بھی برداشت کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ امیر معاویہ نے ان سے کہا کہ اے احنف! جب بھی جنگ صفین کا خیال آتا ہے، دل میں سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ (جنگ صفین میں احنف حضرت علیؓ کے ساتھ مل کر امیر معاویہ کے خلاف لڑے تھے) احنف نے جواب دیا۔ "خدا کی قسم۔ معاویہ! وہ دل جو تم سے نفرت کرتے تھے، ابھی تک ہمارے سینوں میں موجود ہیں۔ اور وہ تلواریں جو تمہارے خلاف نکلی تھیں، منہوز نیاموں میں

ہیں۔ اگر تم لڑائی کی طرف ایک انگل بھی بڑھوگے، تو ہم ایک بالشت بڑھیں گے۔ اور اگر تم اس کی طرف چلوگے، تو ہم دوڑیں گے۔

احنف بن قیس کا وجود بصرہ کے باہم مخالف قبائل کو متحد کرنے میں بڑا کام آتا تھا اخلاق کی بلندی، فیاضی و کرم اور فضل و مروت میں ان کا نام بطور ضرب المثل لیا جاتا تھا جب ان کا انتقال ہوا تو کہا گیا کہ آج عرب کا راز جاتا رہا۔ ان کی بیوی نے ان کی وفات پر بین کرتے ہوئے کہا: "تو قبیلے کا سردار تھا۔ خلیفہ کے ہاں تیری بات سنی جاتی تھی اور تیسری رائے پر چلا جاتا تھا۔"

عراق میں فلسفیانہ سرگرمیوں کو فروغ بنی امیہ کے بعد عباسی خلافت کے دور میں ہوا چنانچہ جہاں سرزمین کوفہ نے بعض نامور فلسفی پیدا کئے، وہاں بصرہ میں اخوان الصفا نے شہرت پائی۔

شام

شام کا خطہ بڑا شاداب و زرخیز اور اس کی آب و ہوا بڑی خوشگوار اور معتدل ہے! اس ملک میں کثیر التعداد انبیاء مبعوث ہوئے، اور ان کی تعلیمات یہاں خوب پھیلیں۔ نیز یکے بعد دیگرے کئی قوموں اور تہذیبوں کا یہاں دور دورہ رہا۔ جو اس سرزمین پر اپنے علمی و تمدنی اثرات چھوڑ گئیں۔ سب سے پہلے فینقین کو عروج ہوا۔ پھر کلدانی۔ مصری۔ عبرانی، یونانی اور رومی یہاں آئے۔ ان میں سے ہر ایک قوم اپنی مستقل تہذیب و تمدن رکھتی تھی۔ اور اس کے ہاں علوم و فنون کی بھی کمی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ شام میں علوم و فنون بکثرت پھیلے۔ سرزمین شام میں صور، انطاکیہ، صیدا، بیروت، حمص اور دمشق علمی و فلسفی تحریکات کے مرکز رہ چکے تھے۔ شام کو فنیقین سے حروف کتابت ورثے میں ملے۔ بنی اسرائیل نے اپنی دینی تعلیمات اسے دیں یونان نے یہاں فلسفہ و حکمت کو فروغ دیا۔ اور رومیوں سے اسے قانون ملا۔ غرض اہل شام کی ذہنی تشکیل میں ان سب اثرات کا عمل دخل رہا۔ علاوہ ازیں شام اور اس کے گرد و نواح کے ملکوں میں سریانیوں کے بھی علمی مرکز تھے۔

اسلام سے قبل عرب سرزمین شام سے کافی واقف تھے۔ اور اس کی زرخیزی و ثروت کی کشش انہیں اپنی آغوش میں کھینچ بھی لائی تھی۔ چنانچہ دوسری صدی قبل از مسیح میں حمص اور بطرہ میں عربی ریاستیں معرض وجود میں آئیں۔ بعد ازاں پانچویں صدی عیسوی

میں یہاں بنی غسان کے عرب قبیلے کا دور دورہ رہا - اور جب یہاں عیسائیت پھیلی، تو وہ بھی دائرہ عیسائیت میں داخل ہوگئے۔ اور انہوں نے مسیحی تہذیب و تمدن کو بھی ایک حد تک اپنالیا۔ بنی غسان آرامی و عربی زبانوں سے مخلوط زبان بولتے تھے - اور اپنے آپ کو اہل شام میں سے تصور کرتے تھے۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ ہی شام میں عربی زبان اور اسلامی تعلیمات کی نشر واشاعت شروع ہوگئی- اور شامی عرب قریش کی زبان (قرآن کی زبان) سیکھنے لگے نیز شام کے دیگر باشندوں نے بھی اپنے ہاں کی مروجہ زبانوں آرامی و یونانی کے علاوہ عربی بولنا اور اس کا سیکھنا شروع کردیا۔ اسی طرح ان میں نصرانیت اور یہودیت کی جگہ اسلام پھیلنے لگا۔ دوسرے نو مفتوحہ ممالک کی طرح حضرت عمرؓ نے شام میں بھی اسلام کی تعلیم دینے کے لئے مبلغ اور معلم بھیجے چنانچہ معاذؓ، ابوالدرداؓ اور عبادہؓ بن صامت آئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہی تینوں بزرگ شام کے مکتب فکر کے اولیں بانی تھے۔ حضرت معاذ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اس کی فتح کے بعد اپنا نائب مقرر فرمایا تھا اور ان کی آخری عمر شام میں درس وتدریس میں گزری۔ عبادہ بن صامت انصاری تھے، اور قرآن جمع کرنے کی سعادت انہیں ملی تھی۔ ابو عبیدہ بن الجراح شام کی افواج اسلامیہ کے سپہ سالار نے انہیں حمص کا والی مقرر کیا اور ساتھ ہی ان کو فلسطین کا قاضی بنایا گیا۔ عبادہ بن صامت تعلیمات اسلامیہ میں معرفت تامہ رکھنے والے صحابہ میں سے شمار ہوتے تھے۔ اور اس کے ساتھ وہ حق کی حمایت میں بڑے سخت تھے۔ آپ نے امیر معاویہ کے بہت سے کاموں کو ناپسند کیا اور حضرت عثمان سے ان کی شکایت کی۔ حضرت عبادہ بن صامت کا شام میں ہی انتقال ہوا۔ حضرت ابوالدرداء بھی انصار میں سے تھے۔ اور اہل علم صحابہ میں سے گنے جاتے تھے۔ وہ دمشق میں قاضی مقرر ہوئے، اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان تینوں بزرگوں نے شام کے مختلف شہروں میں درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے علاوہ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن غنم کو بھی شام بھیجا تھا۔ تابعین میں سے اکثر علمائے شام انہی بزرگوں کے شاگرد تھے، ان میں سے مشہور یہ ہیں:- ابوادریس الخولانی، مکحول، عمر بن عبدالعزیز، اور رجاء بن حیوٰۃ۔ آخر میں شام کے مکتب فکر سے امام عبدالرحمٰن اوزاعی مشہور ہوئے، یہ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے معاصر تھے۔ بعلبک میں پیدا ہوئے۔ اور دمشق و بیروت میں پرورش پائی۔ آپ کو امام اہل شام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اہل شام نے ان کا فقہی مذہب قبول کیا اور مراکش اور اندلس میں بھی اس مذہب کو فروغ ہوا، لیکن امام شافعی اور امام مالک کے

مذاہب نے اسے پنپنے نہ دیا اور وہ جلد ہی ختم ہو گیا۔

اموی عہد میں دمشق خلافت کا صدر مقام تھا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ سلطنت کے طول و عرض سے علماء دمشق کا رخ کرتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، کیونکہ خلفائے بنی امیہ نے دینی و علمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ نہ کی اور ان کی تمام تر سرپرستی شعر و سخن اور ادب و خطابت تک ہی محدود رہی لیکن چونکہ مسلمانوں میں مذہبی حمیت و جوش تھا نیز انہیں آئے دن احکام شرع کو جاننے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس لئے دینی و علمی تحریکات اپنے آپ پھیلتی رہیں۔

شام میں کافی تعداد میں عیسائی آباد تھے۔ ان میں سے بہت سے تو مسلمان ہو گئے اور باقی اپنے دین پر قائم رہے اور بطیب خاطر جزیہ دیتے رہے اب ایک طرف تو یہ نو مسلم تھے اور دوسری طرف انہی کے بھائی بند غیر مسلم تھے، جو عیسائی تھے اور دونوں کے دونوں شام میں جو مسیحی تہذیب و تمدن مروج تھا، اس کے زیر اثر تھے پھر ایک طرف گرجے اور راہب خانے تھے اور دوسری طرف مسجدیں آباد ہو رہی تھیں۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ اسلام اور نصرانیت میں ذہنی کش مکش ہوتی، اور بحث و مناظرہ کی راہیں کھلتیں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس کا ثبوت ہمیں مسیحی اہل قلم یحیٰ دمشقی کی کتابوں سے ملتا ہے۔ اسلام اور نصرانیت کی باہمی کش مکش اور دوسرے متضاد خیالات کی آپس کی آویزش سے شام میں قضاء و قدر اور جبر و اختیار کے مسائل چھڑے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق کہ آیا وہ عین ذات ہیں۔ یا غیر عین ذات، بحثیں ہونے لگیں۔ غالب قیاس یہ ہے کہ علم کلام کی بنیادی اینٹ شام ہی میں رکھی گئی۔

مصر

مسلمانوں نے جب مصر فتح کیا تو وہاں یونانی رومی تہذیب و تمدن کا دور دورہ تھا۔ اس سے پہلے ایک زمانے میں اسکندریہ کا علمی و فلسفی مرکز بڑے عروج پر رہ چکا تھا۔ فتح مصر کے بعد بہت بڑی تعداد میں عرب وہاں پہنچے۔ فسطاط آباد ہوا، تو اس کی آبادی میں وہی قبائلی تقسیم مدنظر رکھی گئی۔ اس کے علاوہ عرب قصبوں اور دیہات میں بھی پھیل گئے اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔ مصر کے اصلی باشندے قبطی بھی کافی بڑی تعداد میں اسلام لائے پھر عربوں اور قبطیوں میں آپس میں بکثرت شادی بیاہ ہوئے اور اس طرح دونوں قومیں ایک دوسرے سے خلط ملط ہو گئیں۔

صحابہ کرام میں سے جو بزرگ مصر آئے، اور یہاں انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ

شروع کیا۔ اور مصر کے مکتب فکر کے بانی بنے، ان میں سب سے مشہور عبداللہ بن عمرو بن عاص تھے، انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی حدیثیں یاد تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے، قلم بند کرتے جاتے۔ مجاہد کا بیان ہے میں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کے پاس ایک صحیفہ دیکھا۔ میں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ سچا صحیفہ ہے۔ اس میں صرف وہ حدیثیں ہیں، جو میں نے آنحضرت صلعم سے خود سنیں اور ان میں میرے اور آپؐ کے درمیان کوئی سلسلۂ روایت نہیں۔" احادیث کے علاوہ عبداللہ بن عمرو کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ بیان کیا جاتا ہے کہ عبداللہ تورات پڑھتے تھے۔ ابن سعد نے طبقات میں شریک سے روایت کی ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمرو کو سریانی پڑھتے دیکھا۔ ان سے مدینہ، شام اور مصر میں کثیر التعداد صحابہ اور تابعین نے احادیث روایت کیں جب امیر معاویہ نے عمرو بن عاص کو مصر کا والی بنایا، تو یہ اپنے والد کی معیت میں مصر پہنچے۔ عمرو بن عاص نے مرتے وقت ان کو اپنا جانشین بنایا، امیر معاویہ نے پہلے تو انہیں والی رہنے دیا، بعد میں برطرف کر دیا۔ وہ مصر ہی میں رہ پڑے، اور وہیں ان کا ایک روایت کے مطابق عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں انتقال ہوا۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص مصر کے مکتب فکر اور مرکز علمی کے حقیقی مؤسس تھے۔ مصر کے کثیر التعداد لوگوں نے ان سے اکتساب علم کیا۔ ان کے شاگرد جو کچھ ان سے سنتے قلم بند کر لیتے۔ عہد صحابہ کے بعد مصر کے علمی مرکز میں یزید بن حبیب نے بڑی شہرت پائی۔ وہ نوبیہ کے باشندے تھے، اصل وطن دنقلہ تھا انہوں نے بہت سے صحابہ سے جو مصر میں تشریف فرما ہوئے، علم حاصل کیا۔ کندی لکھتے ہیں۔ موصوف پہلے شخص تھے جنہوں نے سرزمین مصر میں حلال و حرام کے احکام اور مسائل فقہ کی اشاعت کی اس سے پہلے زیادہ تر فتن و ترغیبات پر زور تھا۔ یزید بن حبیب اور دو اور حضرات کو عمر بن عبدالعزیز نے مصر میں افتاء کی خدمت سپرد کی، جسے عربوں نے ناپسند کیا اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے موالی بام عروج پر چڑھ رہے ہیں، اور تم اس سے قاصر ہو۔ یزید بن حبیب جنگوں کی تاریخ پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اور فتح مصر سے متعلق تاریخی معلومات، اس کے دیگر امور اور مصر کے والیوں کے تفصیلی حالات میں خاص طور سے انہیں درک تھا۔ ان کے شاگردوں میں عبداللہ بن لہیعہ اور لیث بن سعد بہت مشہور ہوئے۔ اول الذکر عرب تھے، اور حضرموت کے

باشندے ۔ اور مصر میں حضرمیت کے لوگ کثرت سے تھے ۔ ابن لہیعہ بہت سے تابعین سے ملے ۔ اور ان سے علم حاصل کیا ۔ وہ کچھ سنتے ، قلم بند کر لیتے ۔ بہت سے محدثین مثلاً بخاری اور نسائی وغیرہ ان کو ثقہ نہیں مانتے ، چنانچہ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مصر کی اسلامی تاریخ کی بیشتر روایات انہیں کے ذریعہ پہنچی ہیں ۔ ابن لہیعہ تقریباً نو سال تک مصر کے منصب قضا پر فائز رہے ۔

صحیح ترین قول کے مطابق لیث بن سعد موالی میں سے تھے ۔ وہ اصل میں اصفہان کے تھے ، لیکن مرجح قول یہی ہے کہ وہ مصر میں پیدا ہوئے ۔ تحصیل علم کے لئے بہت سے شہروں کی سیاحت کی ۔ تقریباً ۹۹ تابعین سے ملے اور ان سے حدیثیں روایت کیں ۔ امام مالک کے ساتھ بھی ان کے تعلقات تھے اور فقہ و تشریع کے متعلق ان سے خط و کتابت رہتی تھی ۔

روایت ہے کہ امام شافعی نے کہا کہ لیث فقہ میں مالک سے آگے ہیں ، لیکن لیث کے ساتھیوں نے ان کو چھوڑ دیا ۔ لیث بن سعد کا اپنا مستقل فقہی مذہب تھا ، جو اُن کے نام سے مشہور ہوا ۔ اہل مصر نے اس کو اختیار کیا لیکن آخر میں وہ شام کے مذہب اوزاعی کی طرح زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا لیث ثقہ مانے جاتے تھے اور اہم معاملات میں والی اور قضاۃ ان سے مشورہ کرتے تھے ۔

مذکورہ بالا بیان سے پوری طرح واضح ہو گیا کہ فتوحات کے بعد اسلامی سلطنت کے مختلف شہروں میں اہل علم صحابہ کرام پہنچے ، ان سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا ، اور اس طرح ان شہروں میں مختلف مراکز علمی اور مکاتب فکر وجود میں آئے ۔ ان علمی مراکز میں اثر و نفوذ کے اعتبار سے یہ شخصیتیں سب سے فوقیت لے گئیں :- مدینہ میں عبداللہ بن عمر ، کوفہ میں عبداللہ بن مسعود ، مکہ میں عبداللہ بن عباس اور مصر میں عبداللہ بن عمرو بن عاص ۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں میں سے فرداً فرداً ہر ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال اور اعمال کے علم پر حاوی تھا ۔ تعلیمات اسلام کے متعلق ان میں سے ہر ایک کے پاس مکمل معلومات تھیں ۔ اکثر ایسا ہوا کہ بعض وقت ایک صحابی رسول اللہ صلعم کی خدمت میں موجود ہوتا ۔ اور وہ آپ کا کوئی ارشاد سنتا ، یا آپ کو کوئی عمل کرتے دیکھتا لیکن اس وقت دوسرا صحابی وہاں موجود نہ ہوتا ، اور وہ آپ کے اس قول اور عمل سے بےخبر رہتا ۔ چنانچہ بعض صحابہ کے پاس آپ کی کچھ احادیث تھیں ، اور بعض کے پاس

دوسری اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں یہ صحابہ گئے، وہ اپنے ساتھ اپنی احادیث کو لے گئے، جن کا ان کو علم تھا۔ چنانچہ بعض شہروں میں آپؐ کی کچھ حدیثیں پہنچیں اور کچھ نہ پہنچ سکیں۔ صحابہ کے بعد تابعین آئے۔ انہوں نے صحابہ سے تحصیل علم کی اور وہ اس کی نشر و اشاعت میں لگ گئے۔ تابعین میں سے بعض نے محسوس کیا کہ کچھ ایسی بھی حدیثیں ہیں، جو بعض شہروں میں ہیں، اور بعض میں نہیں۔ چنانچہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ احادیث حاصل کرنے کے لئے کثرت سے سفر کئے اور اس طرح تحصیل علم کے لئے سفر و سیاحت کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہوگیا ایک مصری مدینہ پہنچتا، اور مدینے کے طالب علم کو تحصیل علم کا شوق کوفہ لے جاتا۔ کوفہ کے طالبین علم شام کا رخ کرتے اور شامی مصر جاتے۔ غرض اس طرح کی علمی سیاحتوں اور اہل علم کے باہمی روابط نے اسلامی سلطنت کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے علمی مراکز کو متحد کرنے میں بڑا کام کیا۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ صحابہ کرام کی الگ الگ علمی شخصیتوں کے جو جدا جدا اثرات مرتب ہوئے تھے، ان کے باہمی اختلافات بہت کم ہوگئے، تابعین نے علمی سیاحتوں کے ذریعہ مختلف شہروں سے اکتساب علم کیا۔ اور ان کے بعد دوسرے ان کے نقش قدم پر گامزن ہوئے۔ اور اس طرح علمی مراکز ذہنی طور پر ایک دوسرے قریب ہوتے گئے۔

اس زمانے میں مدارس کے بجائے علماء کے بڑے بڑے حلقہ ہائے درس تھے۔ دنیائے اسلام کے جن جن حصوں میں اصحاب علم صحابہ و تابعین موجود تھے، وہاں ان کے حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا، جس میں ہر فن کی تعلیم ہوتی تھی ...... اور یہ درس و افاضہ کسی ایک فرد کے ساتھ مخصوص نہ تھا، بلکہ ہر صحابی و تابعی کے علم و استعداد کے بقدر اس کے حلقۂ درس بھی تھے۔ اور تمام بڑے بڑے مرکزی شہروں میں ان کا فیض جاری تھا... مدینۃ العلم مدینہ طیبہ میں کئی حلقہ درس تھے۔ ان میں ربیعۃ الرائی کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا۔ اس میں طلبہ کا ہجوم رہتا تھا اور مدینہ کے علماء، اور عمائد و اشراف سب اس میں شریک ہوتے تھے۔ امام مالک اور امام اوزاعی، یحییٰ بن سعید انصاری اور شعبہ وغیرہ جیسے علماء، اسی حلقۂ درس کے فیض یافتہ تھے۔ حضرت عمر کے غلام اسلم کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ ایک وقت میں چالیس چالیس فقہا اس میں شریک ہوتے تھے ان میں امام زین العابدین جیسے بزرگ بھی تھے۔

(از تاریخ اسلام بنی امیہ۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ)

شاہ ولی اللہ کا نظریۂ ریاست

عمر فاروق خان ملک پور مانسہرہ

اس سلسلے کے پہلے مضمون میں میں یہ بتا چکا ہوں کہ شاہ ولی اللہ صاحب اس برصغیر کے اُس دور میں ہوئے ہیں، جب یہاں کا جاگیرداری نظام رو بہ زوال تھا۔ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کی طرح اس برصغیر میں ابھی نمائندہ طرز حکومت کا تصور اہل فکر و نظر کے دماغوں میں نہیں آیا تھا۔ ان حالات میں ظاہر ہے، ملت کی حفاظت اور اس کے احوال کی اصلاح کی عملی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ شاہ صاحب ہندوستان کی مرکزی حکومت کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے روہیلوں کے سردار نجیب الدولہ اور ماورائے دریائے سندھ کی نئی ابھرتی ہوئی افغان طاقت کے سربراہ احمد شاہ ابدالی کی طرف خاص طور پر شاہ صاحب کا رجوع کرنا اور ان سے استمداد اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم شاہ صاحب کے ہاں یہ رجحان فکر بھی پاتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی ہیئت حاکمہ ان کی حفاظت نہ کر سکے، تو پھر عام مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز نے ان کے اسی رجحان فکر کو ایک تنظیمی شکل دی، اور بعد میں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے اسے ایک عوامی تحریک میں بدلا اس کے تحت اپنا سیاسی مرکز بنایا، اور دشمنوں سے جہاد کیا۔

شاہ ولی اللہ کے دور میں اور اس سے پہلے ایک عرصہ دراز تک مسلمانوں کے ہاں بالعموم "السلطان ظل اللہ" کا تصور پایا جاتا تھا، جس کے عملاً معنی یہ ہوتے تھے کہ اقتدار کا مصدر و سرچشمہ بادشاہ ہے۔ شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ہیئت حاکمہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، وہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ حاکمیت کو منزل من اللہ نہیں، بلکہ لوگوں کی مقرر کردہ مانتے ہیں۔ چنانچہ آپ ارتفاق ثالث کے ضمن میں لکھتے ہیں :-

جب لوگوں میں باہم معاملات ہوتے ہیں، تو ان میں بخل، حرص، حسد، سستی اور انکار و اقرار کی بنا پر منازعت کے جراثیم پھیل جاتے ہیں۔ اور یہ جراثیم ان کی طبیعتوں میں سرایت کر جاتے ہیں۔ اور اس سے باہمی اختلافات کی طرح پڑتی ہے۔ ایسے لوگ ان میں پیدا ہو جاتے ہیں، جن پر ناپاک خواہشات غالب ہوتی ہیں، یا ان میں ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں، جن کی جبلت میں قتل و غارت گری کی جرأت ہوتی ہے۔ اور ان میں جو باہمی فائدے کے ارتفاقات ہوتے ہیں، ان میں کا کوئی ایک شخص ان کو قائم نہیں کر سکتا۔ یا یہ کہ ان ارتفاقات کا ان میں قائم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یا یہ کہ ان کو نافذ کرنے کی ہمت نہیں رہتی۔ اس لئے لوگ مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے لئے ایک ایسا حاکم منتخب کریں، جو عدل و انصاف کے ساتھ ان میں قضایا کا فیصلہ کیا کرے۔"

یعنی باہمی فائدے کے ارتفاقات کے قیام کے لئے معاشرے کو حاکم کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے لوگ خود مقرر کرتے ہیں۔ اب اس حاکم کے کیا فرائض ہیں؟ ان کی تفصیل شاہ صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

اس کا فرض ہے کہ وہ عدل و انصاف کے ساتھ قضایا کا فیصلہ کرے۔ مجرموں کو سزا دے سرکشوں سے بدلہ لے۔ ان سے خراج وصول کرے اور اسے صحیح مصارف اور اصلاحی امور میں خرچ کرے۔"

شاہ صاحب کے نزدیک یہ معاشرے کا ارتفاق ثالث ہے اور اس سے ارتفاق رابع منتج ہوتا ہے، جس کا حاصل "خلافت کبریٰ" ہے۔ یعنی اپنے لئے لوگ ایک خلیفہ مقرر کرتے ہیں، جو مختلف ملکوں کے حاکموں کو قابو میں رکھتا ہے۔

علم سیاست کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ جیسے لوگ ہوتے ہیں، ویسی ہی ان کو حکومت میسر آتی ہے۔ شاہ صاحب نے بھی حجۃ اللہ البالغہ میں ایک جگہ کم و بیش یہی بات کہی ہے فرماتے ہیں :- "خلفاء میں ایک دوسرے سے اختلاف رعایا کے حالات اور ان کی عادات کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جس قوم کے طبائع سخت ہوا کرتے ہیں، وہ ملوک و خلفاء کی زیادہ محتاج ہوا کرتی ہے، بہ نسبت ان لوگوں کے جن میں بخل و تنگ نظری ان کی نسبت کم ہوتی ہے"

قیادت خود عوام ہیں سے ابھرتی ہے، اور وہ انہیں منظم کر کے اور ان کے بل پر عنان اقتدار کی حامل بن جاتی ہے۔ اس اجتماعی مظہر کی شاہ صاحب یوں نشان دہی فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں :- لوگوں کو باہمی معاملات کے لئے ایک دوسرے کی اعانت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں میں کوئی ایسا شخص آگے آتا ہے جس کی رائے

صائب اور قوتِ گرفت سخت ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو اپنی قوت سے مسخر کر سکتا، ان پر کسی نہ کسی انہج سے اپنی سرداری کا سکہ جما سکتا ہے اور انہیں صراط مستقیم پر چلانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ قدرتاً یہ شخص ان لوگوں کا سردار اور قائد بن جاتا ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک یہ اجتماعی مظہر انسانی معاشرے کا ایک فطری تقاضا ہے اسی طرح معاشرے کا اپنے لئے قوانین بنانا، یہ بھی اس کا فطری تقاضا ہے۔ فرماتے ہیں:۔ اسی میں سے یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے پاس کچھ ایسے مسلّمہ قوانین موجود ہوں، جن کے ذریعہ وہ اپنے باہمی تنازعات کا فیصلہ کر سکتے ہوں۔ ظالموں اور سرکشوں کو زیر کر سکتے ہوں۔ اور جو لوگ ان کے خلاف برسرِ پیکار ہوں، ان سے جنگ کر سکتے ہوں۔ اور یہ تو ایک لابدی امر ہے کہ ہر قوم میں کچھ لوگ ایسے موجود ہوا کرتے ہیں، جو مہتم بالشان امور میں ایسے اصول و قوانین مستنبط کرتے رہتے ہیں، جن کی عام لوگ پیروی کرتے رہتے ہیں۔

قیادت خواہ وہ ایک شخص کی ہو، یا ایک خاندان کی، یا ایک پارٹی کی، نیز معاشرے میں ایسے اصول و قوانین کا ہونا، جن کی عام لوگ پیروی کریں۔ یہ ایک منظم ریاست کے اوّلیات میں سے ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک ان دونوں چیزوں کا سرچشمہ خود معاشرہ ہے۔ اور انہیں وہ ارتفاق اول کے تحت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔ "اللہ تعالےٰ کا اپنے بندوں پر یہ عظیم ترین احسان ہے کہ اس نے قرآن حکیم میں ارتفاق و تدابیر کے تمام الہامی شعبوں کو واضح کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کو یہ علم تھا کہ قرآن حکیم کے مکلف عموماً ہر قسم کے لوگ ہوں گے۔ اور تمام لوگوں پر ارتفاق کی جو نوع مشتمل ہو سکتی ہے، وہ یہی ہے۔"

ریاست کے سربراہ بادشاہ کی سیرت پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔ ضروری ہے کہ بادشاہ میں اخلاق فاضلہ ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوگا، تو وہ ملک کے لئے بارگراں ثابت ہوگا۔ اگر بادشاہ بہادر نہ ہوگا، تو وہ اپنے مخالفین جنگجو لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور رعایا اس کو حقارت کی نظر سے دیکھے گی۔ اگر حلیم و بردبار نہ ہوگا، تو اس کی سطوت سے رعایا ہلاک اور برباد ہو جائے گی۔ اگر عقل مند نہ ہوگا تو اصلاحی تدابیر مستنبط کرنے سے قاصر رہے گا۔ بادشاہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عاقل بالغ ہو، حر ہو، مرد ہو۔ صاحب رائے و تدبیر ہو سننے والا ہو۔ بہرہ نہ ہو۔ آنکھوں والا ہو۔ نابینا نہ ہو۔ صاحب بیان ہو۔ گونگا نہ ہو۔ اس کی اور اس کی قوم کی شرافت لوگوں میں مسلّم ہو۔ اس کے اور اس کے آباء و اجداد کے مآثر حمیدہ لوگ دیکھ چکے ہوں۔ لوگ جانتے ہوں کہ وہ ملک کی اصلاح میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرے گا۔ حکمراں کے لئے یہ امور ایسے ہیں، جن کی عقل راہ نمائی کرتی ہے

اور بنی آدم کی تمام قومیں اس پر متفق ہیں۔ گو وہ دور دراز ممالک میں ایک دوسرے سے دور ہی کیوں نہ آباد ہوں۔ اور ان کے ادیان و مذاہب میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ کیونکہ دنیا کی تمام قوموں کو اس کا احساس ہے کہ بادشاہ مقرر کرنے میں جو مصلحت ہے۔ اور بادشاہت کا جو اصل مقصود ہے، وہ ان امور کے بغیر پورا ہی نہیں ہو سکتا۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاہ صاحب بادشاہ کے اور اوصاف کے علاوہ اس کے متعلق یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ بادشاہ کا تقرر ہوتا ہے، اور یہ لوگ ہی ہوتے ہیں، جو اس کا تقرر کرتے ہیں۔ غرض وہ اس کے قائل نہیں کہ بادشاہ چونکہ بادشاہ ہے اس لئے اسے لوگوں پر مسلط ہونے کا حق ہے۔ نیز بادشاہت کے چند مقاصد ہوتے ہیں۔ کہ اگر بادشاہ انہیں پورا کرتا ہے، تو وہ اس منصب کا اہل ہوتا ہے ورنہ نہیں، اس ضمن میں شاہ صاحب نے ایک بادشاہ کے جو اوصاف گنائے ہیں، وہ آج بھی ایک ریاست کے سربراہ کے لئے ضروری ہیں، خواہ وہ سربراہ وزیر اعظم ہوں یا صدر یا کسی پارٹی کا لیڈر۔ اگر کسی سیاسی پارٹی کے لیڈر کو سربراہ ریاست بننا ہے تو لازمی ہے کہ اسے اور اس کی پارٹی کو لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھیں، اور انہیں یقین ہو کہ ان کے برسر اقتدار آنے سے ملک و قوم کا بھلا ہو گا۔

آگے چل کر شاہ صاحب بادشاہ کے مزید اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- "بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ رعایا کے قلوب میں اپنی جاہ و حشمت کا سکہ بٹھائے اور جاہ و حشمت قائم ہو جانے کے بعد اس کی حفاظت کرے۔ اور اس میں رخنے نہ پیدا ہونے دے۔ اور اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ ان اخلاق فاضلہ سے اپنے آپ کو آراستہ کرے، جو اس کی سیادت کے لئے مناسب ہوں۔ مثلاً شجاعت، حکمت، سخاوت، اور عفو و درگزر۔ وہ عامۃ الناس کے فوائد و منافع کا پورا پورا خیال رکھے۔ وہ یہ امور اس طرح سرانجام دے کہ رعایا کے قلوب اس کے فضل و کرم اور اس کی برتری سے مطمئن ہو جائیں۔ ان کے قلوب اس کی محبت و تعظیم سے بھر جائیں۔ کوئی کام اس سے ایسا سرزد نہ ہونے پائے جس کی آڑ لیکر کوئی اس کی مخالفت پر اتر آئے۔ اور اگر کہیں کسی امر کے متعلق کسی قسم کی کچھ کوتاہی ہو جائے تو فوراً لطف و احسان سے اس کا تدارک کرے اور ظاہر کرے کہ جو کچھ کیا گیا ہے تمہاری ہی مصلحت کے لئے کیا گیا ہے۔"

اس ضمن میں وہ بادشاہ کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ کسی پر سخت گیری نہ کرے۔ جب تک کہ وہ ارباب شوریٰ سے اس امر کی تحقیق نہ کرے کہ وہ سزا کا حق دار ہے اور یہ بھی دیکھ لے کہ مصلحت کلی بھی اس کی مقتضی ہے۔

اس زمانے میں ایک حکومت کو جو حیثیت انتظامیہ کی ہوتی ہے، بادشاہت میں یہ فرائض بادشاہ کے معاونین سرانجام دیا کرتے تھے۔ معاونین کا وجود بادشاہ کے لئے ضروری ہوتا تھا۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں "یہ ظاہر ہے کہ بادشاہ تن تنہا جملہ خدمات انجام نہیں دے سکتا اس لئے لابدی ہے کہ ہر ضرورت کے لئے اس کے معاونین ہوں۔ معاون کی شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ وہ امانت دار ہو۔"

شاہ صاحب بادشاہ کے لئے یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ ایسے شخص کو اپنا معاون نہ بنائے جس کا معزول کرنا دشوار ہو۔ ایسے شخص کو بھی معاون نہ بنائے، جو اس کا رشتہ دار ہو یا اس قسم کا کوئی اور تعلق رکھتا ہو۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا معزول کرنا بہت سی خرابیوں کا موجب ہوا کرتا ہے۔

جو معاون نااہل ہو، اور معاون ہونے کی جو شرائط ہیں، انہیں پورا نہیں کرتا، شاہ صاحب کے نزدیک وہ برطرفی کا مستحق ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر بادشاہ ایسے شخص کی معزولی میں سستی کرتا ہے، تو وہ ملک کے ساتھ خیانت کرتا ہے اور خود اپنی ذات کے لئے خرابیاں پیدا کر رہا ہے۔

ٹیکس لگانے میں بادشاہ کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ٹیکس انہی پر لگایا جائے، جو اسے دینے کے اہل ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔ "...... اور یہ عشر و خراج عدل و انصاف کے طریقہ پر لیا جائے، جو رعایا کے حق میں کسی طرح ضرر رساں نہ ہو۔ اور ضروریات شہر کے لئے بھی کافی ہو جائے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ ہر ہر شخص اور ہر قسم کے مال پر یہ بار ڈالا جائے آخر کوئی نہ کوئی وجہ ہے، جس کی بنا پر مشرق و مغرب کے سلاطین نے ارباب ثروت اور دولت مندوں کے بڑھنے والے مال پر ہی یہ محصول لگایا ہے" مسلمان اہل نظر و فکر کے ہاں ہمیشہ سے ایک عالمی سلطنت کا تصور رہا ہے۔ اور وہ اس کے قائل رہے ہیں کہ الگ الگ شہروں اور ملکوں کے فرمانرواؤں کے اوپر ایک اور فرمانروا ہونا چاہیئے، جو ان میں صلح و آشتی رکھ سکے۔ اس فرمانروا کو اصطلاحاً وہ خلیفہ کا نام دیتے ہیں۔

شاہ صاحب عالمی سلطنت کے اس تصور کو یوں پیش کرتے ہیں:۔ "......... جب ہر شہر کا ایک بادشاہ ہو گیا۔ اسے محصولات آنے لگے اور جبری لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے تو ان کے طبائع اور استعدادوں کے اختلاف کی وجہ سے اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ وہاں ظلم وجود ہوا اور لوگ راہ راست چھوڑ دیں۔ ایک دوسرے کے شہر پر حرص کی نگاہیں اٹھنے لگیں! بغض و عداوت کی بناء پر ایک دوسرے کی تخریب کی فکر، معمولی سے معمولی

جزئیات مثلاً مال و دولت کی طمع، زمین کی لالچ اور بغض و عناد کے ناپاک جذبات کی بنا پر باہم جنگ و جدال کے میدان گرم ہونے لگے۔ جب سلاطین میں اس قسم کے مہلک امراض کی کثرت ہو جاتی ہے، تو یہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنے لئے کوئی خلیفہ منتخب کریں"

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں :۔ جب خلیفہ کا تقرر ہو جائے اور وہ ملک کے سامنے اچھی سیرت پیش کرے اور تمام جابر اسی کے سامنے سرنگوں ہوں اور تمام بادشاہ اس کے فرماں بردار ہو جائیں تو سمجھ لو کہ خدا کی نعمت اپنے بندوں پر پوری ہو گئی خدا کی زمین اور خدا کے بندوں کو پورا اطمینان اور کامل سکون میسر آگیا۔

شاہ صاحب مسلمانوں کے لئے خلیفہ کا ہونا واجب ٹھہراتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک بے شمار قومی اور ملی مصلحتیں ایسی ہیں، جو بغیر خلیفہ کے سرانجام نہیں پا سکتیں۔ یہ مصلحتیں اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن یہ تمام کی تمام دو قسموں پر مشتمل ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق شہری سیاست اور ملکی تنظیم سے ہے اور دوسری وہ جن کا مرجع و مقصد اصلاحِ امت ہے۔ خلیفہ کے لئے شاہ صاحب نے کم و بیش وہی اوصاف ضروری قرار دیئے ہیں جن کا ذکر اوپر بادشاہ کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ :۔ نیز عام طور پر اس کے متعلق لوگوں کا خیال یہ ہو کہ شہری اور ملکی سیاست کے بارے میں وہ سرتاپا حق ہی کا اتباع کرتا ہے۔

وہ شرائط جو خلیفہ کے لئے ضروری ہیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ "ایسی ہیں کہ خود عقل انسانی اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ تمام دور دراز شہروں اور ملکوں کے باشندے اور تمام مختلف ادیان و مذاہب کے پیرو مذکورہ شرائط پر متفق ہیں۔ کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ ایسی شرائط ہیں کہ جن کے بغیر نصبِ خلیفہ سے جو اصل مقصود ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔ اور انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ ان شرائط میں سے جب کوئی شرط مفقود ہوتی ہے، تو لوگ اسے خلیفہ بنانا مناسب نہیں سمجھتے اور اس سے دلی کراہت محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر مجبوراً خاموش ہونا پڑتا ہے، تو دلوں میں غیظ و غضب کی آگ لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔

یہ تو خلافت عمومی کا ذکر تھا۔ شاہ صاحب نے خلافتِ نبوت کی بعض اور صفات گنائی ہیں ریاست اور اس کے لوازم، سربراہِ ریاست اور اس کے ضروری اوصاف کا شاہ صاحب کے ہاں جو تصور ہے، اس کا مختصراً اوپر بیان ہو چکا۔ نظم و نسق ریاست کی اساس، ظاہر ہے، شہری اور عمرانی سیاست پر ہوتی ہے۔ اگر وہ صحت مند رہتی ہے تو یقیناً ریاست

کا وجود قائم رہتا ہے، اور اگر اس میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، تو پھر ریاست کے شیرازہ کو پارہ پارہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ شہری اور عمرانی سیاست پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں :۔ اہل شہر کے باہمی روابط کے لحاظ سے پورا شہر گویا ایک وحدت ہوتی ہے، جو چند اجزائے اجتماعیہ سے مرکب ہے۔ اور چونکہ شہر ایک اجتماع عظیم ہوتا ہے، اور مختلف قسم کی جماعتیں اور مختلف جذبات کے لوگ اس میں آباد ہوتے ہیں، اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اس کے تمام کے تمام باشندے کسی سنت عادلہ پر متفق الرائے ہو جائیں اور یہ بھی ناممکن ہے کہ بعض بعض کو ظلم و تعدی سے باز رکھ سکے۔ جب تک کہ ان میں کوئی ایک شخص ایک ایسے منصب عالی پر فائز نہ ہو، جو اپنی قوت سے تمام کو قابو میں رکھ سکے۔ جب تک ایسا نہیں ہے، ان میں باہمی جنگ و جدال کا بازار گرم رہے گا۔ اور لوگوں کی تنظیم اسی وقت ممکن ہو سکے گی، جب کہ جمہور کے اہل حل و عقد کسی ایک آدمی پر متفق ہو جائیں۔ اس کی اطاعت کریں۔ اور اس کے ساتھ اعوان و انصار کی ایک جماعت بھی موجود ہو اور وہ اپنی ذات سے صاحب شوکت و قسمت بھی ہو۔

شہری و عمرانی سیاست میں انتشار اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب اس میں کئی طرح کے خلل در آتے ہیں۔ اخلاقی خلل، معاملات کے خلل، جو شاہ صاحب کے نزدیک شہری زندگی کے لئے سخت مضرت رساں ہوتے ہیں۔ مثلاً قمار بازی، سود در سود، رشوت ستانی۔ ناپ تول اور وزن میں دھوکا، لین دین کی چیزوں میں عیوب کو چھپانا، بے جا نفع اندوزی، غلط مقدمہ بازی اور کاروباروں میں عدم توازن جیسے مثال کے طور سے سب کے سب تجارت پیشہ بن جائیں اور زراعت وغیرہ کے کام ترک کر دیں یا تمام کے تمام جنگ کا پیشہ اختیار کر لیں۔

شاہ صاحب کے نزدیک یہ خلل اندازیاں شہری و عمرانی سیاست کو خراب کرتی ہیں اس کے برعکس وہ فرماتے ہیں :۔ شہروں کی کامل محافظت کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی عمارات بنوائی جائیں، جن سے تمام اہل ملک کو فائدہ پہنچے۔ مثلاً شہر پناہیں بنائی جائیں سرائیں اور قلعے تعمیر کئے جائیں۔ ملک کی سرحدی حدود کا استحکام کیا جائے۔ بازار اور پل بنائے جائیں کنوئیں کھدوائے جائیں۔ چشمے اور نہریں نکالی جائیں۔ نہروں اور دریائے کے کناروں پر کشتیوں اور جہازوں کا نظام قائم کیا جائے اور تاجروں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ باہر سے اجناس فراہم کر کے لائیں اور شہر کے باشندوں کو سمجھایا جائے کہ وہ باہر سے آنیوالوں کے ساتھ خوش معاملگی سے پیش آئیں۔ اس سے وہ زیادہ آئیں گے اور کسانوں کو ترغیب

دی جائے تاکہ وہ پوری توجہ کے ساتھ کھیتی باڑی کریں اور زمین کا کوئی حصہ بھی بیکار اور غیر آباد نہ چھوڑیں۔ صنعت و حرفت والوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی مصنوعات کو عمدہ سے عمدہ اور بہتر سے بہتر بناکر بازار میں لائیں۔ اور باشندگان شہر کو کہا جائے کہ وہ فضائل و اخلاق کی تحصیل کی طرف پوری توجہ کریں نوشت و خواند حساب اور تاریخ و طب وغیرہ سیکھیں۔ اور علم و معرفت کو ترقی دینے کے صحیح وسائل حاصل کریں اور یہ بھی ضروری ہے کہ شہر کی تمام خبریں ملتی رہیں تاکہ اچھے اور بڑے اور ضرورت مند لوگوں کا پتہ چلتا رہے۔ تاکہ ان کی اعانت کی جاسکے اور دست کاروں کے حالات کا بھی علم ہوتا ہے تاکہ قومی استفادہ کے لئے ان کی امداد اور اعانت کی جاسکے۔

شاہ صاحب کے زمانے میں معاشرے کی حالت بڑی خوار و زبوں تھی۔ اور اس کا اثر ریاست و مملکت پر بھی پڑ رہا تھا۔ اس پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں شہروں کی بربادی کے دو بڑے اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ خزانے پر مفت خوروں کا بہت بڑا بوجھ ہے، دوسرے کسانوں تاجروں، پیشہ وروں اور دست کاروں پر گراں بہا ٹیکس لگائے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ایک جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعید میں قیصر و کسریٰ کی جو حکومتیں تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غیر معتدل مرفہ الحالی اور مفرطانہ عیش پرستی نے انہیں کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس لئے قضائے الٰہی کی طرف سے مقدر ہوا کہ انہیں ختم کر دیا جائے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ریاست اور معاشرے کے متعلق یہ ساری بحثیں آج سے دو سو سال پہلے ایک بالکل مختلف ماحول میں کی تھیں جس کی یقیناً ذہنی و علمی فضا اور تھی اور اس کے معاشی، اجتماعی اور سیاسی مسائل بالکل دوسرے تھے۔ اس لئے لامحالہ ان کو وہ زبان اور اصطلاحات استعمال کرنی پڑیں جو آج ہماری زبان اور اصطلاحات نہیں ہیں، لیکن شاہ صاحب کے پیش نظر جو اصل مقصود تھا، وہ آج بھی ہمارے لئے اتنا ہی اہم ہے، جتنا اس زمانے میں تھا۔ ایک صحت مند معاشرہ ہی ایک مضبوط اور پائدار ریاست کی بنیاد بن سکتا ہے اور ایک ریاست اس وقت تک مضبوط اور پائدار نہیں ہو سکتی، جب تک وہ مقامی ملکی اور قومی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ہمہ جہتی انسانی و عالمی ضروریات کا لحاظ رکھے۔ شاہ صاحب نے ان مباحث میں انہی امور کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

روس میں پان ترکزم اور اسلام

(۳)

تلخیص و ترجمہ

عبدالرؤف فطرت

بخارا کے لبرلوں کے مسلمہ لیڈر عبدالرؤف فطرت کی کتاب "مناظرہ" بخارا کے "جدیدیین" کی ایک لحاظ سے منشور بن گئی۔ اس کتاب میں فطرت نے دینی مدارس کے اپنے سابق استادوں پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اسلامی دنیا کو ثقافتی اور ٹیکنیکل ترقی سے علیحدہ رکھ کر اور اس طرح اسے ذہنی و روحانی جمود میں مبتلا کر کے درحقیقت اسلام کی قوت کو نقصان پہنچایا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"وہ ضرب جو تم نے ہمارے دین پر لگائی ہے، ذرا اس کا خیال کرو۔ تم نے جس غلط طریقے سے شرع محمدی کو پیش کیا، اس سے ہم پر کیا کیا مصیبتیں ٹوٹیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی عظمت کو گھن تمہارے ہی ہاتھوں سے لگا اور تمہاری ہی وجہ سے عنقریب اسلام پورے زوال میں آجائے گا۔ تم نے ترقی میں رکاوٹ بن کر مسلمانوں پر جہالت کا ایک موٹا پردہ ڈال دیا ہے"

فطرت نے مسلمانوں کی فوجی طاقت کی کمزوری کا ذمہ دار بھی علماء اور مدرسوں کے استادوں کو ٹھیرایا۔ وہ لکھتا ہے :- "تم نے ہمارے اس ملک کے لئے اسلحہ کو صرف خنجروں، تلواروں، کمانوں اور تیروں تک محدود کر دیا اور ہمیں توپیں، رائفل، بم، ڈائنامیٹ اور دوسرے اسلحہ بنانے سے روک دیا۔ تم نے مسلمانوں کو سنیوں، شیعیوں، زیدیوں اور وہابیوں میں تقسیم کر کے ایک کو دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا اور تم نے قرآن مجید کو اپنی خواہشات کے تابع کر لیا ہے۔" فطرت صرف علماء ہی پر نہیں برسا اس نے امیر بخارا کی بھی خوب خبر لی۔

فطرت اور اس کے "جدیدی" ساتھیوں کی تحریروں میں روس کی دشمنی اور پان اسلامزم کی حمایت

ء یہ مضمون ہارورڈ (امریکہ) یونیورسٹی سے شائع شدہ ایک انگریزی کتاب سے، ماخوذ ہے (مدیر)

کے بھی رجحانات ملتے ہیں وہ یورپ کے ہاتھوں عالم اسلام کی تباہی پر غم وغصہ کا اظہار کرتے تھے اور اس کا مجرم اصلاح وترقی کے مخالف علماء اور بخارا کے حکمرانوں کو گردانتے تھے کہ یہ وسط ایشیا کو عیسائیت کے غلبے سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ اسی ضمن میں فطرت یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جہاد کو فرض قرار دیا تھا، اور یہ کہ نئی تعلیم اور نئے خیالات سے مسلمان اس قابل ہو سکیں گے کہ دین اسلام کے دفاع اور کفار کے ہاتھوں سے مادر وطن کو آزادی دلانے کے لئے بہتر سے بہتر اسلحہ بنا سکیں۔

عبدالرؤف فطرت کی ان کوششوں کی وجہ سے بخارا میں بھی سیاسی جدوجہد تیز ہو گئی اور جب نئے امیر نے اپنے وعدے پورے نہ کئے، تو یہ تحریک "زیر زمین" چلی گئی اور اس نے نظام حکومت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ جہالت، توہمات اور مذہبی تعصب کو ختم کرنے کی کوششوں کا بھی آغاز کر دیا۔ بخارا کے "جدیدیین" کے عثمانی ترکی کے "نوجوان ترکوں" سے بڑے گہرے روابط تھے، اور انہی کی تقلید میں انہوں نے بھی اپنے لئے "نوجوان بخاری" کا نام اختیار کیا۔ بخارا سے متصل خیوا تھا وہاں بھی بیسویں صدی کے شروع سے "جدیدیین" کے پاؤں جم گئے تھے۔ وہاں کے لبرلوں کو اس سلسلے میں خان خیوا کے دو مشیروں اسلام خواجہ اور حسین بیک سے بڑی مدد ملی۔ خیوا میں بخارا کی طرح نئے سکولوں کا زیادہ چرچا نہ ہو سکا، اور جہاں تک وہاں کی سیاسیات کا تعلق تھا وہ ازبکوں اور ترکمانوں کے باہمی نزاع کی شکار رہی۔

مختصراً مصنف کے الفاظ میں۔

> پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) اور ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس سے کچھ قبل تک وسط ایشیا والوں کی زندگی اور ان کے ذہن پر بدستور اسلام کو غلبہ حاصل رہا۔ نیز ایک طرف اگر زار حکومت کی طرف سے ازبکوں اور تاجکوں کو روسی ثقافت کے رنگ میں رنگنے کی جو بہلے جوڑی سی کوششیں ہوئیں وہ نسبتاً ناکام رہیں۔ تو دوسری طرف ان کے ہاں ایک لبرل قومی تحریک کے فروغ میں قدامت پسند طاقتیں سد راہ بنیں۔ اس ضمن میں "جدیدیین" کو شروع شروع میں جو کامیابی ہوئی، تو وہ زیادہ تر (دو لنگا اور یورال کے) تاتاریوں کی وجہ سے تھی، اور اس کا دائرہ اثر بھی انہی علاقوں تک محدود رہا، جو روسی نظم ونسق کے تحت تھے یہاں کہ روسی استعمار کے کارندے بالقصد یا بغیر کسی مقصد کے مسلمان مذہبی تشدد پسندوں کے انتقام سے ان لبرل "جدیدیین" کو بچاتے تھے۔ لیکن جب بھی اور جہاں بھی وسط ایشیا میں ترقی خواہ (پروگریسو) قومی تحریک

کا قدامت پسندوں سے کھلم کھلا مقابلہ ہوا، تو اول الذکر وسط ایشیائی معاشرے کی ہئیتِ ظاہری اور اس کی روح پر غلبہ پانے میں بہت کمزور ثابت ہوئی اس کے علاوہ وسط ایشیائیوں میں جو نئی نئی ترکی قومیت کی لہر ابھری تھی وہ اس بنا پر کوئی واضح شکل اختیار نہ کر سکی، کہ اس کے ذریعہ ترکی قومیت کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصلاح اور اسے زندہ کرنے کی توقعات بھی کی جاتی تھیں۔

روسی آذربائیجان

روسی آذربائیجان میں، جو بحیرہ کیسپین سے متصل ہے، انیسویں صدی کے دوران ہونے والے ثقافتی وسیاسی تبدیلیوں میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ ایرانی اثر ونفوذ جو وہاں کئی صدیوں سے غالب تھا، ترکیت کی اس سے کش مکش ہوتی ہے۔ قسطنطنیہ میں ترکیت کو ایرانی اثرات سے پاک کرنے کی جو تحریک اٹھی تھی، وہ ترکی کے اندر اور باہر دونوں جگہ ترکوں کے قومی احیاء کی ایک مشترک خصوصیت بن گئی۔ اور روس کے تمام ترک علاقوں میں چونکہ آذربائیجان میں ایرانی اثر ونفوذ سب سے زیادہ اور قدیم زمانے سے تھا۔ اس لئے روسی آذربائیجان کے لئے اس نئی تحریک کی خاص اہمیت تھی۔ ایران میں صفویوں کے برسر اقتدار آنے سے ترکیت اور ایرانیت کی کش مکش نے سنیت اور شیعیت کی شکل اختیار کرلی تھی، چنانچہ ۱۹۱۷ء میں روسی آذربائیجان کی مسلم آبادی کا ۶۰ فیصدی حصہ شیعہ تھا۔

۱۸۰۴ء میں روسی فوجیں ادھر بڑھیں، اور ۱۸۱۳ء کے معاہدہ گلستان کے تحت موجودہ آذربائیجان روسی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ روسی قبضے کے باوجود ان علاقوں کی نظم ونسق کی زبان ۱۸۴۰ء تک زیادہ تر فارسی رہی۔ مقامی حکام یا تو خود ایرانی تھے، یا وہ ایسے آذربائیجانی اعلیٰ طبقوں میں سے تھے، جو فارسی بولتے تھے۔ اس طرح ۱۸۷۰ء تک عدالتوں میں فارسی زبان مستعمل ہوتی رہی۔ شیعہ علماء جن کے ہاتھ میں دینی مدارس تھے اور عدالتوں کا کنٹرول تھا، وہ ایرانی اثر ونفوذ کے سب سے بڑے محافظ تھے اور اونچے طبقوں اور ادب کی زبان تو فارسی تھی ہی۔

باکو

۱۸۵۹ء میں ایک آذربائیجانی ڈرامہ نویس فتح علی اخوندزادہ نے آذربائیجانی زبان میں ڈرامے لکھے۔ اس نے اپنے اہل وطن کو روسی اور مغربی یورپی ثقافت سے واقفیت پیدا کرنے کی دعوت دی۔ بلکہ اس نے یہ بھی تجویز کی کہ آذربائیجانی زبان عربی رسم الخط کے بجائے روسی لاطینی حروف میں لکھی جائے۔ اخوندزادہ نے شیعہ علماء کے مذہبی تعصب اور تنگ دلی کے خلاف بھی جدوجہد کی، ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول ٹیچر نے آذربائیجانی زبان میں سب سے پہلا اخبا

نکالا اس اخبار میں بھی شیعہ علماء کی تنگ دلی اور تعصب کے خلاف لکھا جاتا تھا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب (۱۸۷۰ء - ۱۸۸۳ء) باکو میں تیل کے ذخیرے ملے اور وہ جلدی
ایک بین الاقوامی صنعتی مرکز بن گیا۔ ۱۸۸۳ء میں وہاں تک ریل بھی پہنچ گئی۔ اور اب نہ صرف
آذربائیجان کی روسی منڈیوں اور مغربی یورپ سے بلکہ استنبول سے بھی آمد و رفت آسان ہوگئی
اور اس کے ساتھ ساتھ آذربائیجان میں عثمانی ترکی اثر و نفوذ بڑھنے لگا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں آذربائیجان کے اعلیٰ اور تجارت پیشہ طبقوں میں سے ایک پڑھا
لکھا گروہ، جو باکو کی نئی زندگی سے متاثر تھا، ابھرنے لگا۔ دانشوروں کے اس نئے گروہ کا رجحان
شروع ہی سے پان اسلامزم اور ترکی قومیت کی طرف تھا، اسماعیل بے گسپرنسکی کے اخبار "ترجمان"
نے آذربائیجانیوں کے اندر اسلامی اور ترک دنیا کا ایک حصہ ہونے کا احساس جو ایرانی اور شیعہ
بالادستی کی وجہ سے عرصہ دراز سے دبا ہوا تھا، بیدار کر دیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں ایک مزاحیہ رسالہ
"ملا نصیر الدین"[1] کے نام سے نکلا جس نے ایرانی اور شیعی روایات کے خلاف پھر اسی جدوجہد کو شروع
کیا، جس کی طرح فتح علی اخوندزادہ پہلے ڈال چکا تھا۔

آذربائیجان میں لبرل خیالات اور ترکی قومیت کا پہلا داعی علی بے حسین زادہ تھا جس نے باکو اور
پیٹرزبرگ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک فعال سیاسی لیڈر بھی تھا اور با اثر اہل قلم بھی۔ وہ ۱۸۸۹ء
میں ترکی گیا۔ جہاں نوجوان ترکوں سے اس کے روابط پیدا ہوئے ترکی کے زمانۂ قیام میں ترکی
سیاسیات میں اس نے عملی حصہ بھی لیا۔ ۱۹۰۵ء کے بعد وہ واپس باکو آیا، اور وہاں سے "فیوضات"
نام کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالا، اسی کا ہمعصر ایک اور بڑا ممتاز اور حرکت و قوت سے بھرپور
آذربائیجانی احمد بے آغا اوغلو تھا، جو پندرہ سال روس سے باہر رہ کر ۱۹۰۵ء میں باکو لوٹا حسین زادہ
کی طرح اوغلو کی تعلیم بھی باکو اور پیٹرزبرگ میں ہوئی تھی پھر وہ پیرس چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے
مشہور فرانسیسی مورخ ارنسٹ رینان اور بعض دوسرے مستشرقین کی شاگردی کی۔ رینان کے
قومی اور سیاسی نظریوں نے جو قومیت کو نسلی شعور پر مبنی قرار دیتے تھے، اس نوجوان آذربائجانی
کے دل و دماغ پر بڑے گہرے اثرات ڈالے اور یہ آگے چل کر نہ صرف تمام ترکوں کو متحد کرنے کا
ایک بڑا نقیب و داعی بنا، بلکہ اس نے تمام تورانی نسل کے لوگوں کو متحد کرنے کے لئے "پان تورانزم"
کا تصور پیش کیا۔ اپنے دور کے دوسرے لبرلوں کی طرح اوغلو نے بھی علماء، اور بالخصوص شیعہ
علماء کی سخت مخالفت کی، اور ان پر الزام لگایا کہ وہ عوام کی جہالت اور توہم پرستی سے غلط فائدہ

---

[1] مشرق قریب کے ملکوں میں "ملا نصیر الدین" کا وہی مزاحیہ کیرکٹر ہے جو ہمارے ہاں "ملا دوپیازہ" کا ہے۔ [illegible]

اٹھاتے ہیں اس کا کہنا تھا کہ مسلم ممالک کے افلاس کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کی ثقافتی اور تہذیبی سماجی زندگی پر ان علماء کا تسلط ہے آغا اوغلو نے مسلم معاشرے کی اصلاح اور مسلمان عورتوں کی آزادی کی بھی دعوت دی۔

ایک تیسرا شخص جو آذربائیجانیوں کی اس جدوجہد میں بڑا نمایاں تھا، علی بے مردادن ہے، یا پیڈوکیٹ تھا۔ اور اس نے ۱۹۰۵ء میں روسی مسلمانوں کی مشہور جماعت "اتفاق" کے اجتماع کی صدارت کی تھی۔ وہ دوسری روسی پارلیمنٹ "ڈوما" میں مسلم گروپ کا لیڈر بھی رہ چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یورپی تہذیب، مغربی استعمار اور جدید قومیت کے زیر اثر اسلامی دنیا لامحالہ متحد ہو کر رہے گی۔ ۱۹۱۸ء - ۱۹۲۰ء میں جمہوریہ آذربائیجان کی آزادی کے مختصر سے عرصے میں علی بے مردان اپنے ملک کے سب سے فعّال سیاسی رہنماؤں میں سے تھا۔ اور بعد میں وہ جمہوریہ آذربائیجان کا صدر بھی بنا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے وقفے میں جب کہ روس میں قدرے آزادی تھی۔ آذربائیجان میں کافی اخبارات نکلے۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں :- ضیا۔ کشکول۔ ضیائے قفقاز۔ صدا۔ صدائے وطن۔ صدائے حق۔ صدائے قفقاز۔ حقیقت۔ اینی (جدید) حکمت۔ اقبال۔ معلومات۔ میزان۔ اور تجارت وغیرہ۔

روس کے تمام ترک علاقوں میں آذربائیجان ہی میں سب سے پہلے مسلمان عورتوں کو مساوی حقوق دینے کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ ایک خاتون خدیجہ خانم نے "عشق" نام کا رسالہ نکالا۔ اسی طرح بعض اور ممتاز خواتین اس جدوجہد میں پیش پیش تھیں۔ سوائے مذہبی اخبارات کے، باقی تمام آذربائیجانی صحافت نے مسلمان عورتوں کی آزادی کی اس تحریک کی تائید کی تھی۔

باکو میں تیل کے ذخیروں کی وجہ سے آذربائیجان میں دوسری قوموں کے لوگ بھی آ گئے تھے۔ اور پھر مزدور تحریک بھی وہاں تھی۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سوشل ڈیموکریٹس[1] کا اثر و نفوذ مزدور تحریک میں سرایت کر چکا تھا۔ اور اسی زمانے میں اسٹالین باکو میں اپنی انقلابی سرگرمیوں میں سرگرم کار تھا۔ ۱۹۰۴ء میں سوشل ڈیموکریٹس نے "ہمت" کے نام سے ایک مخصوص مسلمان گروپ کی تشکیل کی، جس کے لیڈر آذربائیجانی تھے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد ان میں سے ایک عزیز بیکوف باکو میں بالشویک سربراہ بنا، اور اس نے کاکیشیا کے علاقوں میں سوویت نظام کے نفاذ میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ آذربائیجان کے دانشوروں کے ایک گروہ کی ہمدردیاں استنبول کے ساتھ تھیں۔ اور جب ترکی میں اتحاد و ترقی کے نوجوان ترک برسر اقتدار آئے تو آذربائیجان میں پان ترکیت کا پروپیگنڈہ کافی تیز ہو گیا۔

---

[1] روس کی یہی پارٹی آگے چل کر بالشویک اور کمیونسٹ بنی (مدیر)

مساوات پارٹی

باقاعدہ طور پر پہلی آذربائیجانی سیاسی پارٹی کہیں ۱۹۱۱ - ۱۲ ۱۹ء میں بن پائی۔ محمود امین سہلے رسول زادہ کی قیادت میں چند دانشور جمع ہوئے اور انہوں نے "مساوات" کے نام سے ایک زیر زمین (انڈر گراونڈ) بائیں بازو کی بورژوا پارٹی کی بنا رکھی۔ احمد بے آغا اوغلو اور دوسرے بہت سے آذربائیجانوں کی طرح رسول زادہ اپنی سیاسی زندگی کے شروع میں ترک نیشنلسٹ سے زیادہ اتحاد اسلامی کا حامی ایک لبرل تھا۔ بعد میں اسٹالن کے ساتھ مل کر اس نے مسلمانوں کا ایک سوشل ڈیموکریٹ گروپ "ہمت" کے نام سے بنایا۔ اور باکو میں وہ روس کی زار حکومت کی مخالفانہ سرگرمیوں میں بھی شریک رہا۔ اس کے بعد وہ بھاگ کر ایران چلا گیا۔ اور وہاں اس نے شاہ ایران کی استبدادی حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لیا۔ جب ایرانی انقلاب ناکام ہوا تو وہ جان بچا کر استنبول پہنچ گیا۔ اور وہاں وہ نوجوان ترکوں میں جو برسر اقتدار آچکے تھے، شامل ہو گیا۔ رسول زادہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں کا مسلمہ ادیب تھا۔ چنانچہ ایران میں وہ ایرانی اخبارات میں مضمون نگاری کرتا رہا۔ اور استنبول میں ایک انتہاپسند ترکی قوم پرست اخبار میں جسے اس کے باکو کے اپنے ہم وطن اور رفیق کار احمد بے آغا اوغلو نے جاری کیا تھا۔ لکھنے لگا۔ ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں وہ واپس باکو آیا، اور آتے ہی اس نے مقامی سیاسات میں بڑی مستعدی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔

"مساوات" باوجود اپنے نام کے اور باوصف اس کے کہ اس کے قائم کرنے والے پہلے سوشل ڈیموکریٹس رہ چکے تھے۔ ایک سوشلسٹ پارٹی سے کہیں زیادہ ایک قوم پرست ترک یا پان اسلامزم کی حامی پارٹی تھی، پارٹی کے قیام کے وقت اس کا جو منشور شائع کیا گیا، اس میں "مساوات" کی مرکزی کمیٹی نے اس دور کا ذکر کیا تھا جب کہ صاحبِ اقبال مسلمانوں کا ایک ہاتھ پیکنگ کو چھو رہا تھا ...... اور دوسرے ہاتھ سے انہوں نے یورپ کے دوسرے سرے پر الحمرا کو وجود بخشا تھا" اس منشور میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ "ایشیا، افریقہ اور یورپ کے اتنے وسیع و عریض ملکوں پر حکمرانی کرنے کے بعد آج اسلام کے حصے بخرے ہو گئے ہیں۔" "مساوات" کے پروگرام کی بنیادی باتوں میں مساوات و برابری سے زیادہ مسلمانوں کو جن سے کہ ان کی مراد لامحالہ ترک تھے، متحد کرنے کا مسئلہ تھا، "مساوات" کے پروگرام کی بعض دفعات یہ ہیں :-

۱- تمام مسلمان قوموں کو بلا تمیز فرقہ و قوم متحد کرنا

۲- جو مسلمان ممالک غلام ہیں، ان کی آزادی کو بحال کرنا

۳- جو مسلمان ملک اپنی آزادی کی حفاظت یا اپنی آزادی کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں ان کی اخلاقی و مادی مدد کرنا۔

۴۔ مسلمان اقوام کا ان کی دفاعی اور اقدامی طاقت کو مضبوط بنانے میں ہاتھ بٹانا۔
۵۔ ان خیالات کی نشر و اشاعت کی راہ میں جو بھی رکاوٹیں حائل ہوں، انہیں دور کرنا۔
۶۔ وہ جماعتیں جو مسلمانوں کے اتحاد و ترقی میں کوشاں ہیں، ان سے ربط قائم کرنا۔
۷۔ وہ غیر ملکی پارٹیاں جو انسانیت کی بہبود اور ترقی کے لئے کام کر رہی ہیں، حسب ضرورت ان سے روابط قائم کرنا۔ اور ان سے تبادلہ خیالات کرنا۔
۸۔ مسلمانوں کی بقا و حفاظت اور ان کی تجارتی، صنعتی اور معاشی ترقی کی جدوجہد کے تمام وسائل کو تقویت دینا۔

جیسا کہ ظاہر ہے "مساوات" کا یہ منشور اور پروگرام ایک معجون مرکب تھا قوم پرستانہ اور مذہبی اور سماجی نعروں کا، اور اسی وجہ سے یہ غیر واضح اور مبہم رہا۔ اور عملاً یہ جماعت آذربائیجان کی سیاست میں زیادہ مثبت کردار انجام نہ دے سکی۔

اگرچہ "مساوات" بہت جلد آذربائیجان کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی، لیکن ملک میں متعدد ایسے گروہ بھی تھے، جو اس کے مخالف تھے۔ ایک تو شیعہ علماء جو صدیوں سے ایران کے ساتھ وابستہ تھے، وہ مساوات کی "سُنّی ترکی سے اس بڑھتی ہوئی ہمدردی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ دوسرے مُلّا اور عام قدامت پسند مسلمان عوام اس جارحانہ سیکولرزم کو جو مسلم ترکی سلطنت کے حامیوں میں پائی جاتی تھی۔ قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے علاوہ خود مساوات والوں کے حلقوں میں یورپی فیشنوں کا فروغ متناقض تھا اس روایتی تصور کے، جو مسلمانوں میں عام طور سے عائلی زندگی اور عورتوں کے بارے میں تھا۔ وہ عورتوں کی برابری اور آزادی جیسی چیزوں کو بڑا خطرناک سمجھتے تھے۔ پھر نئے طور طریقوں اور یورپی ادب و آرٹ کی کشش تھیٹروں کی ہردلعزیزی، جس کی وجہ سے نمازیوں کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی اور عربی اور فارسی کلاسیکی کتابوں کے بجائے فرانسیسی اور جدید ترکی ادب کا مطالعہ۔ ان سب چیزوں کا اثر پرانے مسلم معاشرے پر پڑ رہا تھا۔ پگڑیوں کی جگہ ہیٹ کا رواج ہو رہا تھا۔ نئے قسم کے فرنیچر اور تصویروں سے مسلمان گھروں کی ہیئت بدل رہی تھی۔ اور روسی اور فرانسیسی یا ترکی خیالات کے زیر اثر مذہبی تصورات ختم ہوتے جا رہے تھے۔ اب حالت یہ تھی کہ "مساوات" سے تعلق رکھنے والے لبرل دانشوروں کے ان دعووں کے باوجود، جو انہوں نے اسلام کے شاندار مستقبل کے بارے میں کئے تھے، علماء یہ دیکھ رہے تھے کہ ان لوگوں کی تجدیدی بدعات کی وجہ سے پرانا نظام اور روایات ختم ہو رہی ہیں۔ مزید براں پرانے نظام کے حامیوں کے لئے، جو مذہبی عالمگیریت کی روح اور اسلام کے بین الاقوامی اور ہمہ گیریت کے عقیدے کے جو قومی حد بندیوں سے بالاتر ہے، حامل تھے۔

"پان ترکزم" کے تنگ ولانہ نسلی اور لسانی نظریئے بڑے تشویشناک تھے۔ بسااوقات دونوں گروہوں کی یہ مخالفت کھلی دشمنی کی صورت اختیار کرلیتی، جس کے نتیجے میں علماء وملّا ان لبرلوں کو زندیق وملحد قرار دیتے۔

جنگ عظیم (۱۹۱۴ - ۱۹۱۸ء) کے دوران اور اشتراکی انقلاب کے موقع پر "مساوات" کے بعض حامی آذربائیجان کلیارست کے بائیں بازو میں چلے گئے۔ سوشل ڈیموکریٹس کا گروہ "ہمت" جس سے پہلے رسول زادہ اور اس کے بہت سے متبع منسلک تھے، آذربائیجانی مزدوروں میں "مساوات" سے زیادہ ہر دلعزیز تھا۔ اور پھر سوشل ڈیموکریٹس کے مانشویک اور بالشویک میں تقسیم ہونے کے باوجود "ہمت" میں کوئی تفرقہ نہیں ہوا تھا۔

روسی سلطنت کے دوسرے حصوں کی طرح ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصے میں تیز رفتار معاشی اور تعلیمی ترقی نے آذربائیجانی سماجی لیڈروں کی توجہ خالصاً سیاسی مسائل سے ہٹادی تھی، یہاں تک کہ جب پہلی جنگ عظیم میں ترکی روس کے مخالفین کے ساتھ شامل ہوگیا، تو کاکیشیا کے ان علاقوں میں بظاہر جو امن وسکون تھا، اس میں کوئی فرق نہ پڑا۔

پان ترکزم کا فروغ

۱۹۰۷ء کے بعد روسی حکومت نے "ڈوما" میں ترک نمایندوں کی نشستیں کم کردیں اور بقول مصنف، اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ روس کے کیڈٹس اور مزدور گروپ مسلمانوں کے تیس ارکان ڈوما سے محروم ہو جائیں۔ اور دوسرے بڑھتی ہوئی مسلم یا دوسرے لفظوں میں ترک قوم پرست تحریک کے وقار کو کاری ضرب پڑے۔" بات یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۷ء کے درمیانی عرصے میں ترکوں کی روزافزوں سیاسی سرگرمیوں نے روسی حکومت کو خوفزدہ کردیا تھا۔ اور یہ ظاہر تھا کہ یورال اور وولگا کے تاتاری روس کی تمام ترک اقوام یعنی تمام مسلمانوں کو متحد کرکے ان کی قیادت حاصل کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کررہے تھے۔ تاتاریوں کے مدارس، اخبارات اور ان کی کوششوں سے روسی مسلمانوں کی جو کانفرنسیں ہوئیں، ان کی کامیابی نے یہ ثابت کردیا تھا کہ تاتار اب ایک قابل ذکر قوت ہیں، اور یہ کہ ان کی سیاست کا رخ ترکی کی طرف ہے۔

سیاسی سرگرمیوں کی راہ اس طرح مسدود پاکر ۱۹۰۸ء - ۱۹۱۰ء میں بہت سے روسی ترک لیڈر ترکی چلے گئے۔ اور استنبول ایک بار پھر روس کے پان ترکزم کے حامیوں کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۰۸ء میں اتحاد وترقی کے نوجوان ترک ترکی میں برسراقتدار آگئے۔ سلطان عبدالحمید کی پان اسلامزم کی پالیسی کے برخلاف وہ ترکوں کے اتحاد کے حامی تھے۔

اسی زمانے میں ترکی زبان اور ترکوں کی زندگی کو تمام مضرت بخش غیر ترکی عناصر سے پاک کرنے کی مہم کا آغاز کیا گیا۔ اور ترکی کی انجمن اتحاد و ترقی کی مرکزی کمیٹی تین مشہور ترک قوم پرست لیڈروں اسماعیل بے گسپرنسکی (کریمیا) علی بے حسین زادہ (آذر بائیجانی) اور یوسف اکچورن (تاتار) کو ارکان منتخب کیا گیا۔ اور ایک آذر بائیجانی احمد بے آغا اوگلو قسطنطنیہ کے تمام تعلیمی اداروں کے جنرل انسپکٹر مقرر ہوئے، غرض پہلی جنگ عظیم سے قبل کے پانچ چھ سالوں میں قسطنطنیہ پان ترکزم کے پروپیگنڈے اور اس سے آنے والے ترکوں کی قوتوں کو یکجا و مستحکم کرنے کا مرکز بن گیا۔

۷ر دسمبر ۱۱۹۱ء کو یوسف اکچورن کا اخبار ترک یوردو (ترک یا پائے وطن) جو پان ترکزم کا علم بردار تھا، نکلنا شروع ہوا۔ اور یہ اتنا کامیاب رہا کہ اس کے پہلے شمارے کے چار ایڈیشن، دوسرے کے تین اور تیسرے اور چوتھے شمارے کے دو دو ایڈیشن نکلے۔ اس اخبار کے تقریباً ہر شمارے میں "پان ترکزم" کی آئیڈیا لوجی کا بانی اور اس کا نظریاتی ماہر احمد بے آغا اوگلو لکھتا۔ گو اوگلو اور اکچورن دونوں گسپرنسکی کے دور سے زیادہ قریب تھے، لیکن اسلام اور اس کی ثقافت کے بجائے اب ترکیت اور تورانیت تھی جو "ترک یوردو" کے بانیوں کے لئے محرک جذبہ تھا۔ اوگلو اپنے مضامین میں دنیا کی تاریخ و تہذیب میں ترکوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، ان کا ذکر کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر سات آٹھ کروڑ تورانی (ان میں وہ ترکوں کے ساتھ ساتھ ایشیا اور یورپ کے منگولوں اور فن لینڈ والوں کو بھی شامل کرتا تھا) متحد ہو جائیں، تو وہ ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر سکتے ہیں۔ وہ اسی کی پرزور دعوت دیتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:-

> ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاپانیوں کو چھوڑ کر تمام ایشیائی قوموں میں سب سے ترقی یافتہ اور ثقافت میں سب سے آگے ترک قومیں ہیں۔

اس پان تورانزم کے داعی اور بھی بہت سے تھے، اور تورانیت کے گن گانے میں وہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ پان تورانی عرب اور عثمانی خلافت کو نظر انداز کر کے تورانی (ترکی و منگولی) ماضی سے فیضانِ روحانی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے تاریخی ہیرو اٹیلا، اگوز خاں، چنگیز خاں اور تیمور تھے اور انہی کی اساس پر وہ اپنی تورانیت کا ایک تاریخی اور قومی افسانوی ڈھانچہ تیار کرنے میں کوشاں نظر آتے تھے۔ ہنوں اور منگولوں کی شاندار سلطنت کی یادیں جو کسی زمانے میں بحیرہ جاپان سے بحیرہ روم تک اور ہندوستان کے میدانوں سے شمالی روس تک پھیلی ہوئی تھی، ان کے لئے غیر معمولی کشش رکھتی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء - ۱۹۱۸ء

کے درمیانی عرصے میں ان نوجوان ترکوں کے لئے ایک ایسی ہی ترک منگولی تورانی سلطنت کا از سر نو قیام اور ایک نئی تورانی مملکت کی تخلیق، جو تمام ترکوں، منگولوں، یہاں تک کے فن لینڈ والوں پر مشتمل ہو، اور اس میں چنگیز خاں اور اٹیلا کے خانہ بدوش قبائل کے تمام علاقے شامل ہوں، جنون کی حد تک ایک ذہنی امنگ سی بن گئی۔

پان ترکزم کی یہ سیاسی ایجی ٹیشن پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ محب الوطن ترک اخبار نویس یہ سمجھنے لگے کہ بس اب روس ختم ہو جائے گا۔ اور اس کی جگہ تورانی سلطنت لے لے گی، لیکن جہاں تک اخبار "ترک یوردو" کے گروپ کا تعلق تھا، اس نے کھلم کھلا روس دشمن پروپیگنڈے سے اجتناب کیا۔ اور روسی حکومت نے بھی ملک میں اس کا داخلہ بند نہیں کیا۔

مختصراً حکومت زار کے آخری سالوں میں روسی و ترکی تعلقات کی عام طور پر کیفیت یہ تھی کہ روسیوں اور ترکوں کی باہمی مخالفت کی چند ایک مثالوں کے باوجود، صورت حال ایک حد تک اچھی ہی تھی، اور دونوں قومیں بالخصوص روسی اور تاتاری ایک دوسرے کی فراست اور افادیت کو سمجھنے لگی تھیں۔ جنگ عظیم سے ذرا پہلے تاتاری سماجی اور ثقافتی لحاظ سے کافی آگے تھے اور ۱۹۱۷ء میں مسلمانوں کے مدنی (سول) حقوق روسیوں کے برابر تھے۔ ۱۹۱۲ء میں ترکی زبانوں کے مدارس کی تعداد پچیس ہزار تک پہنچ چکی تھی اور اسی سال کوئی ۴۰۸ کتابیں "اسلامی زبانوں" میں چھپیں، جن میں صرف چار میں سنسر کی زیر ہدایت کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ یورال و دولگا کے تاتاریوں کا شہر قازان روس میں ترکی مطبوعات کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اور ۱۹۱۲ء میں کوئی ۲۶۴ کتابیں ۲۳۲ لاکھ کی تعداد میں وہاں سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ روس کے طول و عرض سے درجنوں ترکی رسالے اور اخبار نکلنے لگے دور دراز شہروں میں مسلم سوسائٹیاں اور مساجد تھیں۔ زار کی افواج میں کئی مسلمان جنرل روسی جنرلوں کے ہم پایہ تھے اور اسی طرح متعدد تجارتی و صنعتی مسلمان اداروں کا شمار ملک کے دولت مند ترین اداروں میں ہوتا تھا۔

یہ ایک اجمالی نقشہ تھا، سلطنت زار روس کے مسلمان ترکوں کا جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا، دوسرے اہل ملک کی طرح روسی ترکوں نے بھی بالعموم حکومت کی تائید کا اعلان کیا۔ اور مالی امداد پیش کرنے کے علاوہ وہ فوج میں بھی بھرتی ہونے لگے۔ لیکن اس میں ظاہر ہے، کچھ مستثنیات بھی تھیں۔ روسی پولیس کے ۱۹۱۴ء - ۱۹۱۶ء کے ریکارڈ بتاتے ہیں کہ شمال میں کریمیا سے لے کر جنوب میں خیوا اور فرغانہ تک کہیں کہیں ترکی سے ہمدردی

کا اندر اندر پروپیگنڈہ ہوتا رہا۔ جہاں تک استنبول میں پناہ گزین روسی ترک لیڈروں کا تعلق تھا، وہ جنگ کے دوران میں بڑی مستعدی سے روس کے خلاف برسرکار رہے ان کے وفد اسٹریا، ہنگری اور جرمنی کے وزراء سے ملے۔ اور روس کے مقبوضہ ترک علاقوں کو آزاد کرانے کے لئے ان سے مدد چاہی۔ لیکن وہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود روسی ترکوں کو حکومت روس کے خلاف نہ اٹھا سکے۔ البتہ جب روسی حکومت نے وسط ایشیا کے مسلمانوں کو جبراً فوج میں بھرتی کرنے کی کوشش کی تو کرغیزیا میں عام بغاوت ہوگئی، جہاں کافی کشت و خون ہوا اور کوئی تین لاکھ کرغیزی چین کے مقبوضہ حصہ کی طرف چلے گئے۔ اس ہنگامے میں دو ہزار کے قریب روسی آبادکار مارے گئے تھے۔ غرض جنگ عظیم کے دوران روس کے کسی بھی ترک علاقے میں آزادی کے لئے باقاعدہ طور پر حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہوا۔ اور بالعموم حالات معمول پر رہے

انقلاب فروری ۱۹۱۷ء

جب روس میں فروری ۱۷ ۱۹ء کا انقلاب ہوا تو ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک نئی آزاد و جمہوری زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مصنف کے الفاظ میں "اس سے قبل مشرقی یورپ کی تاریخ میں کبھی بھی اتنی تقریریں، اعلانات اور درخواستیں نہیں کی گئیں اور لکھی گئیں، جتنی کہ فروری ۱۹۱۷ء سے لے کر نومبر ۱۹۱۷ء تک کے ان افراتفری کے آٹھ مہینوں میں" روس کے دوسرے قومی گروہوں کی طرح مسلمان لیڈر بھی نومولود جمہوریت کی ڈیموکریٹک تشکیل نو کی تائید میں تھے۔ اور اس کے اندر وہ روس کے تمام مسلمانوں کی وحدت اور باہمی تعاون کا تصور کر رہے تھے۔ لیکن جب ۱۹۱۷ء میں خالص سیاسی اور قومی مقاصد کو مذہبی نعروں میں چھپا کر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی تھی تو اس وقت بھی روسی ترکوں اور ان کی طرح دوسرے غیر ترک مسلمانوں کو پہلے کی طرح باہم متحد رکھنے والی چیز صرف مذہب اسلام اور اس کی ثقافت تھی۔ اور کسی قومی اور نسلی پروگرام سے کہیں زیادہ موثر اور طاقتور اسلام ہی کارشتہ ثابت ہوا۔

روسی تاریخ کے اس نازک ترین موڑ پر "مسلم سیاسی محاذ" کئی گروہوں میں بٹ گیا۔ انتہائی دائیں بازو میں علماء اور قدامت پسند تھے، جن کا شمالی کاکیشیا اور وسط ایشیا میں اب بھی کافی زور تھا۔ بیچ میں سابق "اتفاق" پارٹی کے اعتدال پسند بورژوازی لبرل تھے۔ جنہوں نے "اتحاد" کے نام سے اپنی نئی تنظیم قائم کی تھی۔ بائیں بازو میں بڑی سرعت سے سوشلسٹ گروپ وجود میں آگیا، جس کا سب سے ہر دلعزیز گروہ "مسلم برانڈ" کے سوشلسٹ انقلابیوں کا تھا۔ جو مزدوروں کے مسائل سے زیادہ قومی اور زرعی مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اور انتہائی بائیں بازو میں بین الاقوامی مانشویک اور بالشویک گروپ بن رہا تھا، لیکن

۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں یہ بہت کمزور تھے۔
"مسلم سیاسی محاذ" ایک تو یوں بٹ گیا۔ اور دوسری طرف ان میں یہ اختلاف بھی تھا کہ ان کے سرحدی علاقے تو جیسے کہ کاکیشیا، کریمیا، قازقستان، بشکیریا، اور وسط ایشیا کے خطے تھے، قومی علاقائی خود مختاری پر زور دیتے تھے، لیکن دوسری طرف دو لگا یورال کے تاتاری اس کے بجائے تمام روسی مسلمانوں کے لئے ثقافتی خود مختاری کا اصول پیش کرتے تھے۔ جس کا کہ ایک مرکزی نظام ہو۔

فروری ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روسی مسلمانوں کی پہلی کانگریس مئی ۱۹۱۷ء میں ماسکو میں ہوئی، جس میں نو سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ اس میں ہر خیال کے نمائندے تھے۔ اور ہر ایک نے کانگرس میں اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تھا بقول مصنف کے :۔ "اس کانگرس کے نتیجے میں جو آل روسی مسلم کونسل وجود میں آئی، وہ باہمی جھگڑوں کا اڈا بن گئی۔ روس کے دوسرے لوگوں کی طرح روسی مسلمان بھی ۱۹۱۷ء میں غیر حقیقت پسندانہ سیاسی تصورات کے عارضے کا شکار ہو گئے۔ سب کے سب آزادی اور مساوات چاہتے تھے، اور اس معاملے میں وہ اتنا آگے چلے گئے کہ ان کے ہاتھ سے سماج اور مملکت کی تشکیل کے تمام حقیقی مواقع جاتے رہے۔ جمہوری انفرادیت پسندی انارکی اور مزاح میں بدل گئی۔ اصولوں یا شخصیات کی اطاعت کا کوئی خیال نہ رہا۔ اور آزادی کی محبت کے معنی تمام ذمہ داریوں اور سماجی اور ریاستی پابندیوں کا انکار ہو گیا۔"

اشتراکی انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء

۲۶ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو پیٹرز برگ میں لینن اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا۔ اس بالشویک انقلاب کے بارے میں روسی مسلمانوں کا رویہ تمام تر معاندانہ نہیں تھا گو بہت تھوڑے سے تعلیم یافتہ تاتاری اور آذر بائیجانی ہی مارکس اور لینن کے نظریات سے واقف تھے۔ لیکن بعض مسلمان سیاست داں بالشویکوں کے قومیتوں کی خود مختاری کے متعلق جو تصورات تھے، ان کی وجہ سے وہ ان کے حامی تھے۔

پہلی سوویت حکومت بنتے ہی لینن اور اس کے رفقاء نے قومیتوں کے مسئلے کی طرف خصوصی توجہ کی۔ اور استالن جو خود سلاو نہیں تھا، اس شعبے کا سربراہ بنایا گیا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو استالن کے ایما پر حکومت نے "روس اور مشرق کے تمام مسلمان محنت کشوں" کے نام ایک منشور جاری کیا، جس میں مسلمانوں کا مریڈوں اور بھائیوں" کو مخاطب کیا گیا تھا۔ یہ بالشویکوں کی سیاسی چال کا ایک شاہکار تھا۔ اور اس میں مارکس اور لینن کی تعلیمات کے تمام مذہب دشمن

اور بین الاقوامی عناصر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مذہبی و قومی جذبات سے اپیل کی گئی تھی۔ اس منشور کے کچھ اقتباسات یہ ہیں۔

"...... روس، کرغیز، وسط ایشیا اور سائبیریا کے مسلمانو! کاکیشیا اور ماورائے کاکیشیا کے ترکو اور تاتاریو! وہ سب جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں مسمار کی گئیں اور جن کے عقائد اور روایات کو زاروں اور روس کے مستبدوں نے پاؤں تلے روندا۔ آج سے تمہاری روایات و عقیدے، تمہارے قومی اور ثقافتی ادارے آزاد اور مداخلت سے محفوظ ہیں۔ تم آزادی سے اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی قومی زندگی کی تنظیم کرو۔ تمہارے حقوق جیسے کہ روس کے دوسرے لوگوں کے حقوق ہیں، آج سے انقلاب کی پوری قوت اور اس کے درست و بازو مزدوروں کی سوویتوں، فوجیوں، اور کسانوں کی حفاظت میں ہیں۔ اس انقلاب کی پشت و پناہ ہو۔ یہ تمہاری خود اپنی حکومت ہے۔ مشرق کے مسلمانو! ایرانیو! ترکو! عربو! ہندوستانیو! اے سب لوگو! جن کی زندگیاں، جائدادیں، وطن اور آزادیاں یورپ کے لٹیروں کے رحم پر تھیں، جن کی زمینیں ان ڈاکوؤں نے چھین لی تھیں، اور جنہوں نے اس جنگ کو شروع کیا تھا۔ ہمارے جھنڈے دنیا کے مظلوم اور پسے ہوئے لوگوں کے لئے آزادی کا نشان ہیں۔"

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ اعلانات محض خالی خولی الفاظ نہیں ہیں، اسٹالن نے قرآن مجید کا ایک پرانا نسخہ جو حضرت عثمانؓ سے منسوب تھا، پیٹروگریڈ کی شاہی لائبریری سے نکلوا کر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں تاتاریوں کے بعض تاریخی آثار قدیمہ مقامی قومی کمیٹیوں کے سپرد کئے گئے اور اسلامی امور کے لئے تاتاری علاقے میں ایک خصوصی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ جس کا چیئرمین ایک تجربہ کار سوشل ڈیموکریٹ اور پرجوش انقلابی ملا نور واحتوف تھا۔ اس کمیٹی کے متعدد ارکان بھی تھے غرض مصنف کے الفاظ میں۔

سوویت حکومت کے ان اقدامات اور ان کے ساتھ ساتھ بڑی ہوشیاری سے جو پروپیگنڈا کیا گیا اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں اپنی قسم کی ایک نرالی تحریک ابھری، جس میں اسلام اور مارکسزم ایک دوسرے سے مخلوط تھے۔ یہ تحریک سوویت شریعت والوں کی تھی (یعنی وہ سوویت والے جو شریعت اسلامی کے حامی ہیں) ان کا لیڈر ایک والغتانی تاری کو

حاجی تھا۔ چیچنوں میں ایک ملا سلطان۔ ادو کیار دینا میں کاٹ خونوف تھا رسولوف نے وولگا یورال کے تاتاریوں میں سوویت شریعت والوں کے پروپیگنڈے کی مہم چلائی۔

سوویت حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد روسی سلطنت کے مختلف علاقوں میں خودمختاری کی تحریک زور پکڑ گئی تھی۔ چنانچہ فن لینڈ، لیتھونیا، استونیا اور یوکرین وغیرہ نے فرداً فرداً مستقل مملکت ہونے کا اعلان کر دیا۔" نہ صرف ان قومی گروہوں نے بلکہ خالص روسی رقبوں یا ان خطوں نے جن میں مخلوط آبادی تھی، بلکہ بعض اوقات چھوٹے چھوٹے اضلاع، یہاں تک کہ دیہات نے حق خوداختیاری کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بڑی سرعت سے کام لیا، تاکہ اس طرح وہ سوویت کنٹرول سے محفوظ رہیں۔

قومی خودمختاری کی جدوجہد

انہی لوگوں میں مسلمان بھی تھے، جنہوں نے اپنی قومی خودمختاریوں کا اعلان کرنے کی طرف قدم اٹھائے.... لیکن ان میں سے اکثر آزاد خودمختار ریاستیں زیادہ دیر تک قائم نہ رہیں۔ اور سوویت حکومت نے پرولتاری انقلاب کے "مفاد" کے پیش نظر اس حق خوداختیاری کو معطل کر دیا۔" وولگا یورال کے تاتاری مسلمان روسی ترکوں میں سب سے زیادہ بااثر تھے، اور ان کی جو خودمختار ریاست بنی، وہ کافی مضبوط تھی۔ لیکن تاتاری قوم پرست اپنے متصل بشکیری ترکوں کے علاقے کو بھی اس ریاست میں رکھنا چاہتے تھے، جس سے دونوں میں اختلاف ہوا، اور سوویت حکومت نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یہ تاتاری ریاست ختم کر دی گئی، اور اس کی جگہ سٹالن کی زیر ہدایت ایک تاتاری بشکیری جمہوریہ تشکیل ہوئی، جس سے تاتاری کمیونسٹ بہت خوش ہوئے۔ ان تاتاری کمیونسٹوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:۔

> "یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ مسلم کمیونسٹ اپنے آپ کو مارکسٹ، انٹرنیشنلسٹ اور پرولتاری سے جو اصل مراد ہے، وہ محسوس کرتے تھے۔ بے شک انقلاب سے ان کی وفاداری صدق دلانہ تھی۔ بلکہ وہ سب سے پہلے اسے یورپی آبادکاروں کے اوپر مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق کی فتح سمجھتے تھے۔
>
> ۱۹۲۰ء میں ایک تاتاری مصنف نے ملا نور واہتوف کے حالات میں جو اسٹالن کا پہلا مسلمان رفیق کار تھا۔ (بعد میں وہ انقلاب دشمن روسیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا) لکھا ہے۔ "ملا نور کو یقین تھا کہ عالمگیر سوشلسٹ تعمیر نو کے نتیجے میں عالمی ثقافت پر قدیم عرب ثقافت کا زبردست اثر پڑیگا

وہ اس اسلامی ثقافت کے خواب دیکھتا تھا، جس کا اثر و نفوذ سرزمین عرب
سے مقدس دریا گنگا تک پھیلے گا، اور وہ اپنی معنویت کے اعتبار سے عظیم
بڑی حسین اور عمیق ہو گی۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا زوال اور خاتمہ
ممکن ہے۔ وہ یہ خواب دیکھتا تھا کہ مستقبل میں یہی ثقافت تمام انسانیت کو منور
کرے گی۔ اور اسے ان باتوں کا یقین تھا۔"

ملا نور کے نزدیک جیسا کہ اس نے ۷ مارچ ۱۹۱۷ء کو قازان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تاتاری
انقلاب کا یہ تجربہ حرف آغاز ہے پورے مشرق کی عام سیاسی بیداری کا، اس کا کیمونسٹ نائب
مشہور تاتاری ناولسٹ اور ماہر علم اللسان گلیم جان بھی مشرق اور اسلام سے اسی طرح روحانی
طور پر وابستہ تھا۔ ایک اور تاتاری کیمونسٹ سلطان گالیف نے اپنے ایک سلسلۂ مضامین میں
لکھا کہ تاتاری کیمونسٹ "مشرق اور اسلام کے سچے انقلابی ہیں" اور ان کے لئے مقدم ترین سوال
عالمی انقلاب کا نہیں بلکہ یورپی "استحصال پسندی" کی زنجیروں سے مشرق کو آزاد کرانا ہے۔
اسٹالن، جس نے اس زمانے میں ان تقریروں اور تحریروں کی حوصلہ افزائی کی تھی، اچھی
طرح جانتا تھا کہ مسلم کیمونسٹوں کی آیڈیالوجی اور مقاصد یورپی کیمونسٹوں سے بہت زیادہ
مختلف ہیں" لیکن ۱۹۱۸ء کے نازک دنوں میں بالشویکوں کو جہاں سے بھی مدد ملتی تھی
وہ اسے قبول کر لیتے تھے۔ وہ ہر اس شخص کو حلیف بنانے کے لئے تیار تھے، جو بین الاقوامی
انقلاب کا حامی ہوتا، اور وہ سفید روسی افواج اور سابق کیمونسٹ دشمن قوم پرست روس
کے آخری نمائندوں سے لڑنا چاہتا تھا۔ اس لئے بائیں بازو والوں کی مخالفت نیز خود اپنے
ان تاتاری حلیفوں پر عدم اعتماد کے باوجود اسٹالن نے ہر طرح سے ان کی مدد کی۔"
۱۰-۱۶ مئی ۱۹۱۸ء کو اسٹالن نے مسلم کیمونسٹوں کی ایک کانفرنس بلائی، اس میں
خود افتتاحی تقریر کی اور اس طرح تقریباً ایک کروڑ آبادی پر مشتمل ایک تاتاری بشکیری
خود مختار جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس پر ملا نور نے بڑے خلوص سے ان جذبات کا
اظہار کیا:-

ہم کامریڈ لینن اور اسٹالن کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے یہ سمجھا
.... مسلم پرولتاری کی آرزوں کی تکمیل ایک شاندار انقلابی کارنامہ ہے

اس کانفرنس سے چند دن ہی بعد پورے مشرقی روس میں خانہ جنگی (سول وار) شروع ہو گئی
اس سلسلے میں "مسلم مزدوروں" اور کسانوں "کی سوویت مسلم فوج بنائی گئی اور ملا نور نے
اپیل کرتے ہوئے لکھا کہ "اس خطرے کے وقت مسلم پرولتاریہ کو سوویت جمہوریہ کے دفاع

کے لئے اٹھ کھڑا ہونا چاہیئے" اسی کشمکش میں ملا نور ۱۹ ر اگست ۱۹۱۸ء کو مارا گیا۔

ترک قومیتوں میں کش مکش

۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل بشیکریوں اور تاتاریوں میں کوئی خاص مخاصمت نہیں تھی، لیکن انقلاب کے بعد بشیکری لیڈروں نے بھی اپنی ایک مخصوص قسم کی قومیت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا ان کا سب سے بڑا مسئلہ زمین کا تھا، اور وہ ان تمام آبادکاروں کے خلاف تھے اپنے مسلمان تاتاری بھائیوں سمیت، جو باہر سے آکر ان کی زمینوں پر آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ مئی ۱۹۱۷ء میں (فروری انقلاب کے بعد اور اشتراکی انقلاب اکتوبر سے قبل) ماسکو میں جو پہلی آل روسی مسلم کانگرس ہوئی تھی اس کی اس قرارداد سے کہ "ساری زمین لوگوں کی ہے" بشیکری خوش نہ تھے۔ وہ اس پر مصر تھے کہ "بشکیریا کی ساری زمینیں صرف بشکیریوں کے لئے ہیں" اس پر جولائی ۱۹۱۷ء میں پہلی آل بشیکری قومی کانفرنس وجود میں آئی، جس کا روح رواں ایک فعال سیاست داں احمد زکی ولید وف تھا۔ پوری بشیکری قومیت کی تحریک بہت حد تک اس کی کوششوں کا نتیجہ تھی، اور اگر یہ نہ ہوتا تو تاتاری بشیکری کشمکش اتنی شدت اختیار نہ کرتی اس کے ایما پر اس بشیکری کانفرنس میں قومی علاقائی خود مختاری، بشیکری فوجی یونٹ بنانے اور ۱۹۱۸ کے بعد وہ تمام زمینیں جو آبادکاروں نے لی ہیں، وہ واپس بشیکریوں کو لوٹانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کانفرنس نے یہ بھی اعلان کیا کہ بشیکری لسانی خصوصیات کی بنا پر دوسرے مسلمانوں سے جو بشیکریا میں آکر آباد ہوئے ہیں، ظاہر ہے اس سے مراد تاتاری تھے، مختلف ہیں، اور یہ مزید اثبات تھا اس امر کا کہ وہ تاتاریوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔ (مسلسل)

ا بشیکری بھی ترک تھے اور تاتاریوں سے نسلاً بہت زیادہ قریب تھے، فرق صرف یہ تھا کہ تاتاری زمینوں پر آباد تھے کسان تھے اور بشیکری نیم خانہ بدوش ۔ ان میں اختلاف سماجی اور ثقافتی بنیادوں پر تھا، وہی خانہ بدوشوں اور کسانوں کا فطری اختلاف۔ تاتاری بشیکریوں کو اپنے ہی خانہ بدوش اور پس ماندہ قبیلے سمجھتے تھے، اور ان کا یہ رویہ بشیکری سیاست دانوں اور سرداروں کو سخت ناپسند تھا۔

تنقید و تبصرہ

ملفوظات مولانا احمد علی رحمتہ اللہ علیہ

ایک زمانے میں لاہور شہر کی پرانی آبادی کے ارد گرد کی ساری زمینیں مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ پھر کاریگر اور دست کار طبقہ بھی زیادہ تر مسلمان تھا، گویا اس دور میں لاہور کے مسلمان مجموعی طور سے صاحب جائیداد بھی تھے اور با روزگار و خوشحال بھی۔ لیکن برطانوی اقتدار کے بعد جب نئی قسم کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ غیر مسلم طبقوں نے اس میں سبقت کی اس کے ساتھ ساتھ سماجی احوال و ظروف بھی بدلے۔ اور ایک نیا معاشی نظام جنم لینے لگا تو مسلمانوں کے قدم زندگی کی دوڑ میں غیر مسلموں کے مقابلے میں سست پڑنے لگے چنانچہ جیسے جیسے غیر مسلم آگے بڑھتے گئے مسلمان پیچھے ہوتے گئے۔

اس پر مستزاد یہ کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں بعض اور خرابیاں بھی زور پکڑ گئیں انفرادی بے راہ رویوں اور بداخلاقیوں کے علاوہ ان میں اجتماعی طور پر بے شمار مسرفانہ رسمیں عام ہو گئی تھیں۔ ان میں بعض تو برادری میں اپنی شان قائم رکھنے کے لئے اور بعض مذہبی اثرات کے تحت کی جاتی تھیں جن کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان زمینیں اور مکان بیچ کر اور انہیں گرو رکھ کر یہ رسمیں سرانجام دیتے تھے، اور اس طرح ان کا صاحب جائداد اور کاریگر طبقہ قلاش ہوتا جا رہا تھا۔ شادی و بیاہ کے معاملات میں برادری میں ناک نہ کٹے، اور میت کی روٹی، فاتحہ اور اس سے متعلقہ دوسری رسموں میں مروجہ مذہب کی روایات کی خلاف ورزی نہ ہو، یہ بات اتنی اہم سمجھی جاتی تھی کہ مسلمان اپنی آخری پونجی تک ان مسرفانہ رسوم میں خرچ کرنے سے گریز نہ کرتے، اور جن کے پاس کچھ نہ ہوتا وہ زیادہ سے زیادہ شرح سود پر قرض لینے پر مجبور ہو جاتے۔

اس میں شک نہیں کہ لاہور کے مسلمانوں کے بعض حلقوں میں اس دور میں انگریزی

تعلیم حاصل کرنے کا رواج شروع ہوگیا تھا، لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ جو مسلمان نوجوان انگریزی کالجوں سے فارغ التحصیل ہوتے، وہ مسلمانوں کے راسخ العقیدہ گروہ سے نکل کر نئے مذہبی فرقوں سے وابستگی کو ترجیح دیتے۔

کم و بیش اسلامی لاہور کا یہ مذہبی سماجی معاشی اور ذہنی پس منظر تھا جب غالباً پہلی جنگ عظیم کے دوران مولانا احمد علی مرحوم کو خود ان کے الفاظ میں دہلی سے ہتھکڑیاں لگا کر لاہور لایا گیا اور یوں انہیں یہ موقع ملا کہ وہ شیرانوالہ دروازہ کے باہر ایک ایسی مسجد میں جہاں "دن کو گیدڑ جوتیاں اٹھا کر لے جاتے تھے"۔ قرآن مجید کا درس شروع کریں۔ قرآن مجید کا درس ہر عالم دین دیتا ہے، لیکن مولانا مرحوم کے درس قرآن کے عملی مضمرات کچھ اور تھے چنانچہ اس کی وجہ سے جہاں ایک طرف انگریز انہیں اپنا دشمن سمجھتا رہا، وہاں دوسری طرف ابتداء میں ان عوام نے بھی آپ کی مخالفت کی جو بلے سمجھی سے مسرفانہ رسوم کو جزو مذہب مانتے تھے۔ مولانا مرحوم نے اپنے شروع کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا۔

> "اب تو محلہ والے ٹھیک ہو گئے ہیں، لیکن ابتداء میں انہوں نے مجھے بڑا ستایا ایک دفعہ تنگ آکر میں نے ان سے کہا کہ میں قرآن مجید ہاتھ میں لے لیتا ہوں۔ تم مجھے دھکے دیکر مسجد سے نکال دو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ یہ جرأت ان کو نہ ہوئی"

حضرت مولانا احمد علیؒ کا ۱۳۸۱ھ میں انتقال ہوا، گویا تقریباً چوالیس پینتالیس سال تک لاہور اور خاص طور سے شیرانوالہ دروازہ ان کی جملہ سرگرمیوں کا مرکز رہا جن کے عملی نتائج آج سب لوگوں کے سامنے ہیں۔

مولانا کے درس قرآن کی برکت سے لاہور اور لاہور سے باہر بھی انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کا ایک اچھا خاصا طبقہ موجود ہے، جو اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ دین سے پورا شغف رکھتا ہے، پوری طرح راسخ العقیدہ ہے اور اپنے اپنے دائرے میں حسب حیثیت دینی و ملی خدمات سرانجام دے رہا ہے

مسرفانہ رسوم کی اصلاح کے سلسلے میں مولانا مرحوم کو جو کامیابی ہوئی راقم الحروف اس سے ایک حد تک خود شخصی طور سے واقف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے درس قرآن، جمعہ کے خطبوں اور دعظ و تلقین نے ہزاروں خاندانوں کو معاشی تباہی سے بچا لیا۔ اور ان میں سے بہت سے ایسے خوش نصیب بھی ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ

نے اپنی رحمت سے بہت نوازا، اور انہوں نے بھی مولانا کے اصلاحی کاموں میں دل کھول کر مدد کی۔ بس ان کا اشارہ ہوتا، اور ہزاروں روپیہ ان کے قدموں میں پہنچ جاتا۔ صرف ایک واقعہ ملاحظہ ہو، مولانا فرماتے ہیں۔

> ایک دفعہ شام کے وقت میں لیٹا ہوا تھا کہ دو شخص آئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ ہمیں بھی کوئی دین کی خدمت کا کام بتلائیے۔ میں نے کہا یہ قرآن مجید چھپوانا ہے۔ میرے دوست کے حساب کے مطابق ۵۰ ہزار روپیہ لگتا ہے....
>
> ابھی آٹھ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ پچاس ہزار روپیہ دونوں کی طرف سے آگیا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نہ انہیں جانتا تھا اور نہ ہی پہچانتا تھا، نہ معلوم کون تھے۔

ان دینی، اصلاحی، تعلیمی اور علمی کاموں کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم ہر اسلامی عوامی تحریک میں بھی پیش پیش رہے، چنانچہ اس طویل مدت میں اہل لاہور نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ وہ ان کے کسی عوامی مطالبے میں ان کے بجائے حکومت وقت کے ساتھ ہوں، اس لئے آپ کو کئی بار جیل جانا پڑا۔ اور وہ بڑی خوشی سے جیل گئے۔

غرض مولانا کی ذات گرامی اور ان کا شیرانوالہ دروازہ کا دینی، اصلاحی علمی اور تعلیمی مرکز ایک اخلاقی پاور ہاؤس تھا۔ جس کی "کرنٹ" ان تمام سالوں میں دور دور تک پہنچتی رہی، اور اس سے ان دیار کے عوام و خواص کے ایک بڑے حصے کو نئی زندگی ملی

زیر نظر کتاب میں اس بابرکت شخصیت کے ملفوظات کو جناب محمد عثمان غنی بی اے نے مرتب کیا ہے۔ ایک باب میں "خطبات جمعہ کے اقتباسات" ہیں۔ دوسرا باب مشتمل ہے "مجالس ذکر کے چیدہ چیدہ فقرات" پر تیسرے باب میں "نصیحت آموز واقعات" ہیں۔ باب چہارم میں وہ اشعار ہیں، جو مولانا مرحوم وقتاً فوقتاً پڑھا کرتے ہیں "خطبات جمعہ کے اقتباسات" میں بعض ایسے اقتباسات ہیں جو سراسر وقتی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا اس مجموعہ میں ہونا کچھ اچھا نہیں لگتا، خاص طور سے وہ جن میں چند بیگم دولتانہ اور ناظم الدین سے خطاب ہے۔ بالجملہ اس مجموعہ میں بڑی اثر کرنے والی باتیں ہیں۔ اور اس کا مطالعہ ایک دینی و اخلاقی نعمت ہے۔ ان ملفوظات میں پند و موعظت ہے۔ خدا اس کے رسولؐ اور بزرگوں کے ارشادات ہیں۔ بری عادتوں اور غیر شرعی رسموں کی مذمت ہے اور راہ راست پر چلنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

مثال کے طور پر چند الفاظ میں قرآن کا خلاصہ بتاتے ہیں :۔ "اللہ کو عبادت سے، رسول کو اطاعت سے، مخلوق کو خدمت سے راضی رکھو۔" ایک اور ارشاد گرامی ہے :۔ "ماں باپ کو ستانے والوں کو نہ نماز اور نہ روزہ جہنم سے بچائے گا۔ نہ زکوٰۃ اور نہ ڈبل حج۔ ان کے لئے میں دوزخ کا فتویٰ دے رہا ہوں۔" فرماتے ہیں :۔ "سب کچھ بنتا ہے آسان، سب سے مشکل بنتا ہے انسان۔ انسان بناتا ہے قرآن"

حضرت مولاناؒ کے روحانی بزرگ پہلے حضرت دین پوریؒ اور بعد میں حضرت امروٹی صاحب رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ اور استاد مولانا سندھیؒ تھے فرماتے ہیں :۔ "مجھے استاد مولانا سندھی ملے اور شیخ حضرت امروٹیؒ۔ ان حضرات کی دعاؤں سے اللہ تعالےٰ نے اشاعت قرآن کی توفیق دی۔"

مولانا مرحوم عالم دین بھی تھے، اور صاحب طریقت صوفی بھی۔ آپ کا ایک ارشاد ہے :۔ "قال کے مربی علمائے کرام اور حال کے مربی صوفیائے عظام ہیں۔ عالم پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا، جب تک قال حال نہ ہو جائے۔" خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں "۔ میں فقہ میں حضرت امام اعظمؒ اور طریقت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا متبع ہوں۔ گویا کہ میں حنفی بھی ہوں اور قادری بھی ہوں۔" آپ تصوف کو بدعت کہنے والوں کو بے سمجھ قرار دیتے تھے۔ اور اہل اللہ کی صحبت تزکیہ نفس کے لئے ضروری مانتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے "قال کے بعد حال کے لئے صاحب حال کی صحبت کی ضرورت ہے۔" نیز "صحبت کے بغیر نہ ہستی مرتی ہے اور نہ دنیا پرستی کی بیماری جاتی ہے ....."

مولانا مرحوم بحیثیت عالم کے تعلیم دین بھی دیتے، بحیثیت ایک مصلح و مرشد کے بری عادتیں اور غیر شرعی رسمیں بھی چھڑاتے اور بحیثیت ایک صاحب حال بزرگ کے اپنے فیض صحبت سے تزکیہ نفس بھی فرماتے تھے مرحوم کی ذات ان سب حیثیات کی جامع تھی۔ اب اگر ان کی صرف "صاحب حال" حیثیت پر زیادہ زور دیا گیا، جیسا کہ ان سے انتساب رکھنے والے بعض حلقوں میں دیا جا رہا ہے۔ اور ان کی شخصیت کے اردگرد کرامات اور مافوق العقل روایات کا تانا بانا بن دیا گیا، تو چند سالوں کے بعد دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی ذات بھی محض ایک روحانی افسانہ سا بن جائے گی، اور بعد کی نسلوں کے لئے یہ جاننا مشکل ہو جائے گا کہ ان کی صحیح شخصیت کیا تھی۔ اور چالیس پچاس سال تک اس سرزمین میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی کتنی بڑی خدمت کی۔

بے شک تصوف میں اپنے مرشد سے حد درجہ عقیدت رکھنا عملاً ضروری ہوتا ہے۔ اور مسلکِ "توحید فی الشیخ" کے تحت اسے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کا واسطہ بنانا فطری ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس معاملے میں توازن لازمی ہے، ورنہ اگر غلوئے عقیدت نے تخیل کو اس طرح بے عنان رکھا، تو جس مقصدِ عظیم کے لئے حضرت مولانا چالیس بیالیس سال تک سرگرم کار رہے، ہمیں یہ ڈر ہے، ان کی ذات سے اس طرح کرامات کے منسوب کرنے سے وہی مقصد فوت ہو جائیگا۔

زیر نظر کتاب مجلد ہے، ۲۲۴ صفحات ہیں، اور ہدیہ تین روپے۔

ملنے کا پتہ :- دفتر انجمن خدام الدین۔ اندرون دروازہ شیرانوالہ، لاہور ۲

(ا - س)

Development of Religious Thought in India (ہندوستان میں مذہبی فکر کی ارتقاء)

تاریخ کے کسی بھی دور میں جب دو مذاہب، دو تہذیبیں یا دو قومیں شروع میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ان میں آپس میں ربط بڑھتا ہے، پھر انہیں ایک ہی جغرافیائی ماحول میں مل کر رہنا پڑتا ہے، تو اس دوران میں ان میں باہم ایک دوسرے پر غالب آنے، ایک دوسرے کو متاثر کرنے یا اس سے اثر پذیر ہونے یا ایک دوسرے کو اپنے اندر ضم کرنے کی جو مسلسل کشمکش ہوتی رہتی ہے، اس کا مطالعہ تاریخ کا ایک بڑا اہم اور دلچسپ باب ہے۔
جناب بی اے ڈار ریڈر اسلامک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور نے زیر نظر ۷۴ صفحے کے انگریزی کتابچے میں اس کشمکش پر مختصر تبصرہ کیا ہے، جو آٹھویں صدی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی افکار میں ہوتی رہی۔
ڈار صاحب کا یہ تبصرہ بڑا پر از معلومات اور فکر انگیز ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر اس کا اردو ترجمہ بھی ہو جائے،

۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا۔ ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے جن کے نتیجے میں لاہور غزنوی سلطنت کا مستقل مرکز بن گیا۔ مصنف کے نزدیک اس تین سو سال کے عرصے کی اس فکری ارتقا کے اعتبار سے زیادہ اہمیت نہیں، دونوں مذاہب اور دونوں تہذیبوں میں اصل کشمکش محمود غزنوی کے بعد شروع ہوتی ہے بقول مولانا سندھی کے اس دور میں جب مسلمان ہندوستان کی طرف بڑھے ہیں، تو ان کے دانش ور طبقے بغداد

بخارا اور وسط ایشیا کے دوسرے تہذیبی مراکز میں ہندوستان کے علوم و فنون اور ہندوستانی دانش سے ایک حد تک واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ان کا اور ہندو دانش وروں کا فکری و تہذیبی سطح پر باہم مقابلہ ہوتا تھا تو وہ ان علوم و فنون میں بھی جو ہندوؤں کے خاص تھے، ہندو دانش وروں سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ یہاں ذکر مسلمان دانش وروں کا ہے، ان کے فوجی طبقوں کا نہیں، جو زیادہ تر ترک تھے۔ اور کچھ ہی عرصہ پہلے ان ترکوں کی سفاکی سے خود بغداد کے عباسی خلفاء پر جو گزر چکی تھی، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔

تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد اور بغداد کے ساتھ پورے وسط ایشیا کے علمی و تہذیبی مرکزوں کی جس طرح مکمل تباہی ہوئی، اس کی وجہ سے دنیائے اسلام کے علم و دانش کے وہ سرچشمے جن کی سوتیں محمود غزنوی کے بعد ہندوستان پہنچی شروع ہوئی تھیں، تقریباً خشک ہو گئے۔ اور اس طرح اسلامی ہند اپنے ہاں بغداد قاہرہ اور قرطبہ کو وجود میں نہ لا سکا۔ ورنہ اس کا قوی امکان تھا کہ جس طرح عباسی دور میں ایرانی اور دوسری غیر عرب قوموں کے دانشوروں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کو اپنا کر ان کے علمی و تہذیبی خزانوں کو مالا مال کیا تھا، ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا اس کے برعکس۔ اسلام اور ہندو مذہب کے باہمی ردّ عمل کے نتیجے میں ہندوؤں کے ہاں احیاء پرست اور تجدید خواہ فکری مذہبی تحریکوں نے جنم لیا، جو شروع میں اگرچہ مصالحت و مفاہمت کا رجحان رکھتی تھیں، لیکن بعد میں وہ سیاسی سطح پر آ کر اسلام و مسلمان دشمن ہو گئیں۔ ڈار صاحب نے اس کتابچہ میں ان تحریکوں پر کافی بحث کی ہے۔

اسلامی ہند کی تاریخ میں شروع ہی سے دو مستقل مکاتب فکر رہے ہیں۔ جن میں باہم کبھی کم اور کبھی زیادہ برابر کشمکش رہی۔ ایک تو اہل فقہ کا مکتب فکر تھا، اور دوسرا اہل تصوف کا۔ اول الذکر بالعموم ان فقہ حنفی کی روایات کے حامل تھے۔ جو بغداد سے منتقل ہونے کے بعد ترکستان کی غلو و شدّت پسند فضا میں بڑی بے لوچ اور سخت ہو گئی تھیں۔ اور دوسرا مکتب فکر کم و بیش ان روایات پر عامل تھا، جن کی نشو و نما بغداد اور بغداد سے متاثر آزاد فکری و تہذیبی مرکزوں میں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس مکتب کا عقیدہ وحدت الوجود جسے ہر جگہ ڈار صاحب نے Pantheism لکھا ہے جو صحیح نہیں، ابن عربی، ابن فارض، رومی وغیرہ سے مستفاد تھا، اور یہ اس فکری عالمگیریت اور وسعت مشربی کا نتیجہ تھا جس کا تخم مسلمانوں کے قدیم تہذیبی مرکزوں میں اُگا تھا۔

بے شک مصنف نے اسلام اور ہندو مذہب کے باہمی عمل و ردّ عمل کا اجمالی خاکہ بڑی خوبی کر

پیش کیا ہے لیکن اس معاملے میں ان کی بحث صرف فکر کی نظری حدود تک رہی ہے۔ ان جیسا مبصر اور صاحب تحقیق اہل قلم اس حقیقت سے تو واقف ہے کہ ایک فکر کو جب ایک مخصوص انسانی گروہ ایک مخصوص زمانے میں اور ایک مخصوص خطے میں اپناتا ہے، تو اس فکر کا اپنے عملی نتائج میں ان چیزوں سے متاثر ہونا فطری ہوتا ہے۔ موصوف نے ہندوستان میں "فکری ارتقا" کی اس تمام بحث میں اس تاریخی حقیقت واقعی کو کلیتہً نظر انداز کیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک مذہبی افکار ریاضی کے سوالات ہیں جو دو اور دو چار اور دو چھ کے اصول پر طے ہونے چاہئیں۔

خود عربی تہذیب کی تاریخ کے ایک خاص دور میں وحدت الوجود ڈار صاحب کا (Pantheism نہیں) کو کیوں فروغ ہوا۔ پھر ایرانی دانش وادب و شعر کا یہ کیوں محبوب موضوع بنا، اور ہندوستان کے صوفیاء کی غالب اکثریت نے حضرت امام ربانیؒ کی وحدۃ الشہود کی تردید کی کوششوں کے باوجود کیوں اس حد تک اسے اپنائے رکھا۔ اس کے تاریخی اسباب کا سراغ لگانے کی آج ضرورت ہے واقعہ یہ ہے کہ ایک ہمہ گیر جامع اور Inclusive قسم کے انسانی معاشرے کے لئے وحدت الوجود کی طرح کا کثرت میں ایک وحدت کو ماننے کا عقیدہ ایک فطری ضرورت ہے۔ جس کا آج کے مادی دور میں بقائے باہمی Co-Existence کی شکل میں مطالبہ ہو رہا ہے۔ اور Exclusive قسم کے معاشرے کو وحدۃ الشہود جیسا تصور چاہیئے۔ ان دونوں تصورات کی تاریخ میں اپنی اپنی جگہ ضرورت ہوتی ہے، اور دونوں کی افادیت بھی مسلّم ہے۔

ڈار صاحب کا یہ علمی مقالہ کافی حد تک معروضی ہے، لیکن اگر اس فکری بحث میں وہ اور زیادہ تاریخی حقیقت پسندی سے کام لیتے، تو بہتر ہوتا۔ اس معاملے میں مسلمان دانش وروں کا نقطہ نظر اکثر و بیشتر یک رخہ ہوتا ہے آج ضرورت اور شدید ضرورت تصویر کے دونوں رخوں کو دیکھنے کی ہے۔ (۱۔ س)

تذکرۃ المہدی

مصنف مولانا محمد الخیر اسدیؒ نے اس رسالے میں حضرت مہدی کے صحیح حالات، منکرین مہدی کے دلائل کی تردید اور دوسرے علمی مباحث" پر بحث کی ہے مصنف کے نزدیک حضرت مہدی کے بارے میں بکثرت احادیث مروی ہیں۔ اور بعض ائمہ محدثین نے تو اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔

رسالے کی ضخامت ۶۴ صفحے ہے قیمت صرف دس آنے اسے مجلس نشر السنہ مخدوم رشید (ملتان) نے شائع کیا ہے

گانا بجانا　(قرآن و سنت کی روشنی میں)

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب نے یہ رسالہ مرتب فرمایا ہے۔ اور پاک ثقافت زیر جامع مسجد ایبٹ آباد نے اسے شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ دراصل ایک کتاب "اسلام اور موسیقی" کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے قرآن مجید، احادیث نبوی اور مسلمانوں کے ہر فرقے کے علمائے کرام کے حوالوں سے ثابت کیا ہے۔ اسلام گانے بجانے کو حرام قرار دیتا ہے۔ اور "لہو الحدیث" کے حکم میں داخل ہے۔ مولانا موصوف نے ان لوگوں کو جو مسلمانوں میں گانے بجانے کی ترویج کے داعی ہیں، قرآن مجید کی اس آیت سے متنبہ فرمایا ہے۔ ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والاخرۃ واللہ یعلم وانتم لا تعلمون۔

جمال صابر کلیریؒ۔　مرتبہ مولوی وحید احمد مسعود صاحب

یہ کوئی ۵۸ صفحے کا رسالہ ہے، جس میں مصنف نے حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح صحیح حالات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم صابر کلیری کی آج تک کوئی سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ معاصرین نے ان کا ذکر نہیں کیا، اور ان کے بارے میں جو تذکرے ملتے ہیں، وہ ان کے وصال سے چار سو سال بعد لکھے گئے اور وہ محض فرضی ہیں۔

مولوی وحید احمد مسعود صاحب نواب قطب الدین خاں کوکہ کی اولاد میں سے ہیں، جن کا تعلق بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور حضرت بدر الدینؒ کی شاخ سے ہے۔ موصوف کے خاندان میں برسہا برس سے بابا گنج شکر کے تبرکات محفوظ ہیں، اور موصوف ہی اس وقت ان کے محافظ ہیں۔

زیر نظر رسالہ نظامی پریس بدایوں (یو پی) نے چھاپا ہے اور قیمت ایک روپیہ ہے۔

جہاد انگیز اور امن افزا مکتوب　الجہاد　ایک نہایت ہی اہم مکتوب

گوجرانوالہ (مغربی پاکستان) کے دار العلوم نعمانیہ نے یہ رسائل شائع کئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی طرف سے اور بھی متعدد رسالے شائع ہوئے ہیں جو "اسلامی تبلیغی لٹریچر" کے طور پر مفت تقسیم ہوتے ہیں۔ دار العلوم کے مہتمم مولانا ابو احمد عبداللہ صاحب ہیں اور مذکورہ بالا رسائل انہی کے مرتب کردہ ہیں۔ صاحب موصوف کا تبلیغ اسلام کا یہ جذبہ واقعی قابل تعریف ہے اللہ تعالیٰ انہیں اور ہمت دے۔ دار العلوم کے شائع کردہ رسائل ہر موضوع پر ہیں لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ بجائے اپنی دعوت کو اس قدر عمومی بنانے کے وہ پوری توجہ اپنے اردگرد کے مسئلوں پر دیں، اور ان کے بارے میں عام مسلمانوں کی ٹھوس رہنمائی کریں۔　(ا۔ س)

شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

فیسر جلبانی ایم۔اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے
ا میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل
بحثیں کی ہیں قیمت ۷٫۵۰ روپے ہے۔

(فارسی)

سطعات

نسان کی نفسی تکمیل و ترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعین فرمایا ہے
ں رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے ذریعہ جس طرح حظیرۃ القدس
سے اتصال پیدا کرتا ہے، "سطعات" میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

ہمعات (فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔
ں میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی
بیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 25

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمتِ ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

قیمت سالانہ:۔ آٹھ روپے   فی پرچہ:۔ پچھتر پیسے

جلد ۲ جمادی الآخر سنہ ۱۳۸۴ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۶۴ء نمبر ۶

فہرست مضامین

شذرات

حال ہی میں گورنر مغربی پاکستان کے ایک خصوصی حکم کے ذریعہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی قانونی حیثیت متعین کردی گئی ہے۔ اس حکم کے تحت اب اسے باقاعدہ طور پر یہ اختیارات دیئے گئے ہیں کہ جو عربی و دینی مدارس اور دارالعلوم اس سے الحاق چاہیں، انہیں اپنے ساتھ ملحق کرے۔ اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو ڈگریاں اور ڈپلومے دے۔ تعلیم و تدریس اور اسلامی علوم میں ریسرچ کا خاطر خواہ انتظام کرے۔ نیز ائمہ اور خطباء کو تربیت دے۔ جامعہ کے امیر گورنر مغربی پاکستان ہوں گے۔ اور ان کا یہ عہدہ یونیورسٹیوں کے چانسلر کے ہم مرتبہ ہے۔
جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا قیام محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کی طرف سے عمل میں آیا ہے۔ اور اکتوبر ۱۹۶۳ء میں صدر پاکستان نے اس کا باقاعدہ افتتاح فرمایا تھا۔

آزادی کے بعد پاکستان میں مسلمانوں کی قومی و ملی زندگی کے ہر شعبے کو منظم کیا جا رہا ہے۔ محکمہ اوقاف کا قیام اور وقف املاک، مساجد و مزاروں کا اس کی نگرانی میں آنا، اس سلسلے کا پہلا قدم تھا۔ اب جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی تشکیل اور اسے اس امر کا اختیار دینا کہ وہ صوبے کے دوسرے عربی و دینی مدارس و دارالعلوموں کا اپنے ساتھ الحاق کر سکتی ہے، ہماری ایک بڑی اہم دینی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ انشاءاللہ یہ سلسلہ اور آگے بڑھے گا اور جس طرح پاکستان میں سیاسی، تعلیمی، صنعتی اور معاشی تنظیمات بروئے کار آ رہی ہیں، اسی طرح مسلمانان پاکستان کے دینی شعبہ ہائے حیات بھی منظم ہوتے جائیں گے۔ اور پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی و قومی مملکت کی حیثیت سے دنیا میں اپنا ایک ممتاز مقام پیدا کرے گا۔
تنظیم اور منصوبہ بندی اس دور کی اولین ضروریات میں سے ہیں اور کوئی قوم اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں انہیں نظر انداز کر کے آج کی دنیا میں اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔

خدا کے فضل سے اس وقت پاکستان میں عربی و دینی مدارس کی کوئی کمی نہیں، اور خاص طور پر قیام پاکستان کے بعد ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ بے شک یہ بڑی خوشی کی بات ہے، اور ہم علمائے کرام کی اس ہمت اور دینی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے ان مدارس کا قیام اکثر و بیشتر کسی نظم و ضابطے کے بغیر ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف ان سے خاطر خواہ نتائج کا نکلنا امر محال ہے، بلکہ اس سے ایک طرح ملت میں انتشار بڑھ رہا ہے۔ محکمہ اوقاف نے ایک مرکزی جامعہ اسلامیہ قائم کر کے اور اس سے مدارس اور دارالعلوموں کے الحاق کا حق دے کر یقیناً دینی تعلیم کی موجودہ بدنظمی و انتشار کے سدباب کی ایک راہ کھولی ہے۔

موجودہ دینی مدارس کی تنظیم کی شدید ضرورت کا احساس خود ہمارے علمائے کرام کو بھی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے امیر مولانا محمد اسماعیل صاحب نے مشرقی پاکستان کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

تعلیم کو منظم ہونا چاہیئے۔ چھوٹی درسگاہوں کا تعلق بڑی جامعہ یا کلیہ سے ہونا چاہیئے۔ نصاب میں توازن ہونا چاہیئے۔ طلبا کی نقل و حرکت پر پابندی ہونی چاہیئے۔ سرٹیفیکیٹ کے سلسلے سے انہیں پابند کر دینا چاہیئے۔ صحیح طور پر تو یہ نظام اس وقت چل سکتا ہے کہ حکومت اس ذمہ داری کو عقیدت اور ہمدردی کے جذبات سے سنبھالے۔

گزشتہ مہینے ضلع لائلپور میں مولانا موصوف نے اپنی ایک تقریر میں پھر اسی مسئلے پر زور دیا اور فرمایا

"ملک میں دینی مدارس کی کافی تعداد موجود ہے۔ ان میں چند مدارس اچھی خدمت سرانجام دے رہے ہیں، مگر ہماری ہونے والی پود اور ہمارے مدارس کے نوآموز نوجوان تعلیمی انتشار اور بدنظمی کے موجب ہو رہے ہیں۔ وہ دیہات میں چھوٹے چھوٹے مدارس کھول رہے ہیں جن کا نہ صرف یہ کہ باہم ربط نہیں، بلکہ رقابت ہے۔ باہم آویزش ہے۔ تعلیمی ترقی کے بجائے یہ مدارس معاشی جنگ کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔ یہ حضرات جماعت کی جیب پر بوجھ ہیں — اور باہم رقابت اور بدنظمی کی وجہ سے مضر ثابت ہو رہے ہیں۔"

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نہ صرف ہمارے پرانے برگزیدہ علمائے کرام میں سے ہیں، بلکہ ان کا خود عمر بھر کا درس و تدریس کا تجربہ ہے، اور ظاہر ہے اس بارے میں ان کی رائے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں موجودہ دینی مدارس کی بدنظمی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا، "ان میں کوئی باقاعدہ نصاب نہیں۔ طلبہ کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں۔ مدارس تعلیم کے بجائے آوارگی کی درس گاہیں بن گئی ہیں۔ سالہا سال صرف کرنے کے باوجود جو لوگ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں، وہ ملت کے لئے کوئی مفید خدمت سرانجام نہیں دے سکتے، بلکہ بسا اوقات انتشار اور تفریق بین المسلمین کا موجب بنتے ہیں۔"

آخر میں آپ نے بڑی دردمندی سے حضرات علماء اور با اثر افراد سے استدعا کی ہے کہ وہ اس تعلیمی انتشار کو روکنے کی کوشش کریں ورنہ موصوف کے الفاظ میں "اگر چند سے ہم نے ان نقائص کی اصلاح نہ کی تو تعجب نہ ہوگا کہ آپ کے یہ مدارس خالی ہو جائیں۔"

دینی تعلیم اور دینی مدارس کے روز افزوں انتشار و بدنظمی میں محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کا یہ اقدام کتنا ضروری، مفید اور دور رس اثرات کا حامل ہے، اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ جس طرح عباسیوں کے بغداد میں جامعہ نظامیہ کے قیام نے سلجوقیوں کے وزیر خواجہ نظام الملک کو شہرت دوام بخشی، اسی طرح بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ کا قیام محکمہ اوقاف مغربی پاکستان کے ناظم اعلیٰ شیخ محمد اکرام کے نام کو ہماری ملی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے۔ اور اس سے ہمارے ہاں دینی تعلیم کے ایک نئے دور کا آغاز ہو۔

محکمہ اوقاف نے تصوف اور تراجم رجال کی بعض بنیادی کتابیں شائع کرنے کا جو پروگرام بنایا تھا بحمد اللہ وہ بھی اب تکمیل کے قریب ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ آئندہ دو ماہ کے اندر اس سلسلے کی متعدد کتابیں چھپ کر تیار ہو جائیں گی۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے قیام کی طرح ان کتابوں کی اشاعت بھی محکمہ اوقاف کا ایک زرین کارنامہ ہے جس سے کہ ملت کی تعمیر میں بڑی مدد ملے گی۔

مولانا سندھیؒ کے امالی تفسیر القرآن[1]

از علامہ موسیٰ جاراللہؒ[2]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی اصطفانا۔ و اورثنا کل کتاب انزلہ من قبلنا

الحمد للہ الذی ھدی البشر کافۃ بالقرآن الکریم الذی جعل بہ نبیہ

رحمۃً للعالمین۔ و بالفرقان الذی انزلہ علی عبدہ یکون بہ نذیراً للعالمین۔

---

[1] ۲۶ جولائی ۱۹۳۷ء سے ۱۲ جنوری ۱۹۳۸ء تک کے درمیانی عرصے میں مولانا سندھی نے مکہ معظمہ میں علامہ موسیٰ جاراللہ کو قرآن مجید کی تفسیر املا کرائی تھی یہ املا عربی میں تھی مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے اس املا شدہ (امالی) تفسیر کو از سرِ نو مرتب کیا ہے۔ ان امالی کے شروع کے حصے کا مولانا ابوالعلا محمد اسمٰعیل گودھروی مرحوم نے اردو ترجمہ کیا ہے یہاں ان امالی پر علامہ موسیٰ جاراللہ کا جو پیش لفظ ہے اس کا اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

[2] علامہ موسیٰ جاراللہ مرحوم دنیائے اسلام کی ایک بڑی بلند پایہ اور نامور علمی شخصیت تھے وہ روسی ترک تھے اکتوبر ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد بھی روس میں انکی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ اسٹالین کے دور میں وہ روس چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اس کے بعد انکی ساری زندگی جلاوطنی میں گزری وہ کافی عرصہ ہندو پاک میں بھی رہے علامہ جاراللہ کی تصانیف عربی فارسی اور ترکی میں ہیں اور دنیائے اسلام کے اعلیٰ علمی حلقوں میں ان تصانیف کا بڑا بلند مقام ہے علامہ مرحوم کو ترک قوم پرستی کی وجہ سے روس سے نکلنا پڑا تھا۔ "برہان" دہلی کے ستمبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں ایک جاپانی عالم و مصنف کے ذکر میں علامہ موسیٰ جاراللہ کا ایک واقعہ مذکور ہے، جو درج ذیل ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی میک گل (کینیڈا) کے اسلامی انسٹی ٹیوٹ میں اپنے مشاہدات و تاثرات کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر ازتسو دس بارہ زبانوں کے فاضل اور ماہر ہیں، جن میں انگریزی، فرنچ، (باقی حاشیہ ص ۲۶ پر)

اللھم صل وسلم علی سیدنا محمد وعلی آل سیدنا محمد۔ کما صلیت علی سیدنا ابراھیم وعلی آل سیدنا ابراھیم انك حمید مجید اللھم بارك علی سیدنا محمد وعلی آل سیدنا محمد کما بارکت علی سیدنا ابراھیم وعلی آل سیدنا ابراھیم انك حمید مجید۔

اما بعد۔ اللہ جل جلالہ نے اپنا جلال وجمال خوب واضح اور روشن فرما دیا ہے۔ اور اس کا انعام ہر عام وخاص پر پھیلا ہوا ہے۔ مجھے اس نے طلب قرآن، فہم کتاب اللہ اور قرآن کے علوم کے حصول میں اپنی زندگی وقف کرنیکی توفیق عنایت فرمائی۔ اگر خدا ہمیں اس کی ہدایت نہ فرماتا تو ہم ہدایت نہیں پا سکتے تھے۔ الحمدللہ کہ اس نے ہمیں ہدایت بخشی۔

میں نے قرآن کریم اور وہ تمام علوم جو متقدمین سلف نے اس بارے میں مدون وتحریر کئے تھے ان کا مطالعہ کیا اور اسی طرح معارفِ عمومی کی، جن کا فہم قرآن کریم کے سلسلے میں انسان محتاج ہے، طلب وجستجو کی اور جیسے جیسے ان کی طلب وجستجو میں میں نے اجتہاد وکوشش کی میرا شوق ورغبت قرآن کریم کی طلب وجستجو میں بڑھتا ہی گیا۔

ہمارے مدارس کا یہ حال ہے کہ علوم مطلوبہ کی تحصیل تعلیم وتعلم کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اور کتابوں کے اندر جو کچھ لکھ دیا گیا ہے، اسے پڑھ لیا جاتا ہے۔ کتاب اللہ کی آیتوں کے ساتھ ساتھ "کون کبیر" کی آیتوں پر غور وتدبر کرنا نہیں سکھایا جاتا۔ اور طالب علم کو معلومات مستحضر ہوں۔ اور

(بقیہ حاشیہ) جرمنی عبرانی، ترکی اور عربی شامل ہیں۔ ان کا موضوع تحقیق جس پر انہوں نے بہت کچھ لکھا اور لکھ رہے ہیں، قرآن کا مطالعہ علم المعانی کے نقطہ نظر سے ہے۔ انہوں نے عربی زبان کس طرح سیکھی؟ اس کی داستان بھی بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ کہتے تھے کہ میں ٹوکیو کے قرب وجوار کا رہنے والا ہوں میرے وطن میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا، جس سے میں عربی پڑھ سکوں اتفاق سے روس کے ایک بہت بڑے مگر جلا وطن عالم جن کا نام موسی جار اللہ تھا (انڈوپاک کے علمی اور دینی حلقے موصوف سے خوب واقف ہیں۔ تقسیم سے قبل دہلی آتے تھے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیام کرتے تھے اپنے استاد مولانا عبید اللہ سندھی کی طرح علم کے بحر ناپیدا کنار ہونے کے باوصف غضب کے درویش منش اور قلندر

(بقیہ حاشیہ صٹ پر)

جس مطلوب کے لئے وہ کوشاں اور سرگرم ہیں اس کی طرف اس کا ذہن موڑنا جس سے وہ آگے اقدام کرسکے، یہ نہیں سکھایا جاتا۔ یہ طریقہ حفظ و اخذ اور مضامین کتب کے محفوظ کرنے کا ہے۔ یہ طریقہ نظر و بصیرت، غور و تدبر اور علوم میں تعمق کا نہیں ہے۔

طلبِ علم میں میں بھی اسی راہ پر گامزن ہوا۔ اور وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو عام طلبہ کا حفظ و اخذ کا تھا۔ میں نے مطالعہ کا وہی طریقہ اپنایا جو شائع مدارس کا تھا۔ اور اسی طرح کتابوں کا مطالعہ کیا، جس طرح شائع مدارس کیا کرتے تھے۔ میں نے تمام تفاسیر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کا مطالعہ کرنا شروع کیا، مختلف لائبریریوں میں پہنچا جن میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تفاسیر موجود تھیں مثلاً میں نے کتاب ابصار صاحب قاموس اور نظم الدرر امام بقاعی کا جو آیات قرآنی اور اس کی سورتوں کی مناسبت پر لکھی گئی ہیں، مطالعہ کیا، ان بے شمار تفاسیر میں میں نے مطلوبہ افادیت اور وضاحتِ بیان نہ پائی اور تمام کو ایک ہی راہ پر چلتے دیکھا۔ اور وہ یہ ہے کہ "ہم کہتے ہیں۔ اور ایسا کہتے ہیں" میں نے ان میں تکرارِ مضامین اور اختصار کے سوا کچھ نہ پایا۔ یہ لکھتے لکھتے ان مفسرین کے قلم تھک گئے۔ لیکن اس سے افکار اور عقلیں سیراب نہ ہوسکیں،

جب میں ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء) میں سیاحت نجد و یمن کے لئے مکہ مکرمہ پہنچا

(بقیہ حاشیہ)
صفت تھے، مطالعہ نہایت وسیع اور حافظہ بلا کا اور دماغ بڑا روشن تھا۔ راقم الحروف کو ان کے ساتھ بارہا شرف صحبت و تکلم حاصل ہوا ہے۔ اور اس زمانے میں ان کی ذہانت و ذکاوت اور غزارتِ علم و فضل کے جو حیرت انگیز مناظر اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں، ان کو قلم بند کیا جائے، تو ایک مستقل مقالہ تیار ہوجائے) جاپان میں تشریف لائے اور ٹوکیو کی مسجد کے ایک کمرہ میں (یا کسی مکان پر؟ اب ٹھیک یاد نہیں رہا) قیام کیا مجھے اطلاع ہوئی تو ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عربی پڑھنے کا شوق ظاہر کیا۔ علامہ نے شروع میں تو ٹال مٹول کی، مگر جب دیکھا کہ میرا اشتیاق واقعی طلب صادق ہے تو انہوں نے فرمایا اچھا! میں تم کو عربی ضرور پڑھاؤں گا مگر پہلے ایک بات کا وعدہ کرو اور وہ یہ کہ تم اپنی عربی کے علم کو قرآن اور اسلام پر حملہ کرنے کے لئے استعمال نہیں کروگے اس کے جواب میں جب میں نے یقین دلایا کہ میں محض ایک طالب علم ہوں اور میرا مقصد علمی نقطہ نظر سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ)

(بقیہ حاشیہ)
قرآن کا مطالعہ کرنا ہے تو علامہ راضی ہوگئے۔ اساب انہوں نے عربی پڑھانی شروع کی تو اس طرح کہ چند مہینوں میں جب تک کہ موصوف کا وہاں قیام رہا، برسوں کی مسافت طے کرادی۔ علامہ مجھے صرف عربی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ قرآن پر لیکچر بھی دیتے رہتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھ کو قرآن سے خاص شغف پیدا ہوگیا۔ اور میں نے اس کو اپنے مطالعہ اور تحقیق کا خاص موضوع بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ علامہ صحیح معنوں میں ابن بطوطۂ وقت تھے۔ کسی ایک جگہ جم کر رہنا جانتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ چند ماہ کے بعد یہاں سے بھی روانہ ہوگئے۔" (مدیر)

تو میں نے حرم مکہ میں امام عبیداللہ بن[1] اسلام کو پایا۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں برکت عطا فرمائے[2] اور ان کے افادات میں جو اسلام کے طلباء اور استاذانِ ہند اُن سے حاصل کر رہے ہیں خیر و برکت عطا فرمائے۔

میں پہلے سے اس استاذ شفیق کو جانتا تھا اور مجھے بھی وہ جانتے تھے میں نے دیکھا کہ وہ مکہ مکرمہ میں فارغ بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے پاس تک کوئی نہیں پھٹکتا۔[3] اور شاذ و نادر ہی کوئی شخص ان کے پاس جاکر بیٹھتا اور وہ بھی استفادہ کی غرض سے نہیں بلکہ حسب عادت تبرک حاصل کرنے کی غرض سے۔

---

[1] عربوں کے ہاں چونکہ والد کا نام لکھنا ضروری سمجھا ہے اس لئے مولانا عبیداللہ سندھی عربی میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام لکھا کرتے تھے، یہ گویا اشارہ تھا ان کے نو مسلم ہونے کی طرف۔ (مدیر)

[2] اس وقت مولانا سندھی زندہ تھے۔

[3] میں ۱۹۳۷ء میں حج بیت اللہ کے لئے گیا ہمارا قافلہ ہندوستان سے پہلا قافلہ تھا۔ ظہر کی نماز کے لئے ہم حرم میں گئے تو جماعت سے پہلے ایک شخص آیا اور میرا نام لیکر کہا کہ اس نام کا آدمی کون ہے؟ میں نے کہا میں ہوں، وہ مجھے بلاکر مولانا عبیداللہ صاحب کے پاس لے گیا پہلے تو انہوں نے مجھ سے بات کرنے میں تامل کیا لیکن چونکہ میری کتاب "ولی اللہ" سوانح حیات شاہ ولی اللہ پہلے ہی پڑھ چکے تھے اس لئے بہت جلد بے تکلف ہوگئے اور مجھ سے بلا تکلف باتیں کرنے لگے۔ (مدیر)

امام سندھی نے اپنی ساری عمر قرآن کریم اور اس کے فلسفہ کے لئے وقف کردی ہے ۔ وہ قرآن کریم کے فلسفہ کو جیسا کہ اس کے جاننے کا حق ہے، جانتے ہیں۔ اور امام شاہ ولی اللہ دہلوی کے اصول پر جانتے ہیں۔ امام سندھی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی تحصیل اور اس کی شرح میں مدتیں گزاریں یہاں تک کہ انہیں اس پر یقین کامل ہوگیا۔ انہوں نے اس فلسفہ کو تمام فلسفوں پر ترجیح دی۔ اور پھر امام ولی اللہ دہلوی کے اس فلسفہ پر پورے قرآن کی تعبیر کی۔

امام سندھی شاہ ولی اللہ دہلوی سے ایک خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ایسی عقیدت میں کسی کے اندر نہیں پاتا۔ وہ امام ولی اللہ دہلوی کا غایت درجہ کا احترام کرتے تھے۔ اور انہیں تمام اماموں سے افضل اور امام الائمہ مانتے تھے۔ بلکہ امام سندھی کا یہ اعتقاد تھا کہ سارے عالم کو امام ولی اللہ کا احترام کرنا چاہیئے۔ ایسا احترام جیسا کہ صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتے تھے۔ اس سے پیشتر میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ[1] اور ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء پڑھ چکا تھا۔ ان کتابوں کو میں نے ایسا پایا جس کی مثال اور نظیر کتب اسلام میں نہیں مل سکتی۔ ان ہر دو کتابوں سے میں کافی مستفید و مستفیض ہوا۔ اس کے بعد میں نے امام سندھی سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی دوسری کتابیں پڑھیں مثلاً الخیر الکثیر، بدور البازغہ، سطعات، الطاف القدس، اور تاویل الاحادیث۔ از خود التفہیمات کا مطالعہ کیا اور العیقات امام سندھی سے پڑھی۔

جب میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ سے بہت کچھ آگاہ ہوگیا تو مجھے اور بھی شوق و رغبت ہوئی کہ امام شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کے مطابق قرآن کی تفسیر پڑھوں۔ میں نے مولانا سندھی سے اس کی درخواست کی اور ان سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور حق یہ ہے کہ

---

[1] الحمد للہ کہ ہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ ۱۹۴۶ء میں کرچکے ہیں جس کو شیخ غلام علی اینڈ سنز نے کشمیری بازار اور بندر روڈ کراچی سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب حقیقتاً وہی شان رکھتی ہے جو امام موسیٰ جار اللہ نے بیان کی ہے۔

ابو العلاء محمد اسمٰعیل گودھروی کان اللہ لہٗ

مجھ سے زیادہ وہ میرے ان خیالات سے خوش ہوئے اور اس بارے میں بڑے شوق کا اظہار کیا۔

میں نے امام شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کو اپنانے میں پوری پوری کوشش کی ہر روز طلوع آفتاب سے لے کر ظہر کی نماز یا عصر کی نماز تک امام سندھی سے استفادہ کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ وہ عربی میں جو کچھ فرماتے میں اس کو لکھ لیتا۔ اور میری پوری پوری کوشش تھی کہ اس املاد کتابت میں ایک جملہ بھی نہ چھوٹ جائے چنانچہ میں نے ایک سو پچاس دنوں میں ایک ہزار چار سو صفحات لکھ ڈالے۔ ۱۸ جمادی الاولیٰ پیر کے دن ۱۳۵۶ھ سے لیکر ۱۳ ذی قعدہ ۱۳۵۶ھ تک یا ۲۶ جولائی ۱۹۳۷ء سے لیکر ۱۳ جنوری ۱۹۳۸ء تک یہ کام میں نے انجام کو پہنچا دیا۔

میرے استاد مولانا سندھی املا کرانے سے تھکنے کا نام نہ لیتے۔ اور میری خوشی کا یہ عالم تھا کہ مجھ میں سننے اور لکھنے کا اشتیاق بڑھتا ہی جاتا تھا باوجود اس کے کہ بعض اوقات میں سخت بیمار ہوتا تھا جب میں درس سے فارغ ہوا تو میں نے امام سندھی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ لیکن میرے اس شکریے سے ہزار گونہ زیادہ امام سندھی نے میرا شکریہ ادا کیا۔ یہ ان کا کرم تھا کہ جب انہوں نے میرا عزم و ثبات میری مسرت و خوشی اور میری کوشش بلیغ دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔ جب امام سندھی نے اپنے امالی کو پوری طرح دیکھ لیا، اور یہ بھی دیکھا کہ میں نے اس سلسلے میں ضبط و نظم پر پوری توجہ دی ہے اور پورے اہتمام سے لکھا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اور اپنی مسرت کا اظہار کیا

امام سندھی جب قرآن کریم کی تفسیر کرتے تو اس میں معترضہ جملہ بھی گاہ گاہ کہہ دیتے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ یہ جملہ معترضہ ہے چنانچہ میں اسکو جملہ معترضہ کرکے لکھ دیتا یہ معترضہ جملے چھوٹی بڑی فصلوں کی مانند ہوتے۔ اور مختلف فوائد کے حامل ہوتے اور میں بھی اس طریقہ کو پسند کرتا تھا۔ ان معترضہ جملوں میں زیادہ تر حکایتیں، لطائف اور نوادر ہوتے تھے۔ اور یہ بہت سے فوائد پر مشتمل ہوتے تھے۔ جب مناسب ہوتا اور انہیں فرصت ہوتی تو امام سندھی سیاسی باتیں شروع کردیتے اور میں سمجھتا تھا یہ باتیں امانت ہیں، قابل اظہار نہیں ہیں لیکن جب اسلام کی تعلیم کے دوران امور سیاسیہ اجتماعیہ کی بحث ہوتی تو صاف صاف کہہ دیتے اور صریح اور قطعی طور پر بتا دیتے۔ اور کسی سے نہ ڈرتے وہ خواہ مخواہ خوشامد نہیں کرتے تھے اللہ لگتی کھری باتیں کرتے تھے۔ والسلام

موسیٰ جار اللہ غفرلہٗ

علامہ کبیر موسیٰ جار اللہ نے جنہوں نے اس تفسیر کا املا کیا ہے آپ کی وفات پر ایک رسالہ شیخ محمد مدنی کو لکھا ہے اسمیں لکھتے ہیں
امام مجاہد مجتہد عبید اللہ سندھی نے اللہ تعالیٰ کی دعوت قبول کر لی۔ خوشی خوشی نفس مطمئنہ کے ساتھ آپ اپنے رب کی طرف چلے گئے اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے خاص بندوں میں شامل کیے اور آپ کو جنت الفردوس عطا فرمائے اس آیت کے بموجب جو سورۃ البلد میں ہے۔

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی	اے روح مطمئن اپنے پروردگار کی طرف چل
الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی	تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ ہمارے
فی عبادی وادخلی فی جنتی	بندوں میں شامل ہوجا ہماری بہشت میں جا داخل ہو

امام سندھی کا اعتقاد تھا کہ عبادی سے مراد ملاء اعلیٰ ہے چنانچہ سورۃ ص میں ہے۔
ماکان لی من علم بالملاء الاعلیٰ اذ یختصمون — عالم بالا کے رہنے والے فرشتے جب آپس میں بحث کرنے لگے مجھکو ان کی بحث کی کچھ خبر نہیں

ملاء اعلیٰ کا نام امام شاہ ولی اللہ نے حظیرۃ القدس رکھا ہے اور حظیرۃ القدس کا اعتقاد فلسفہ امام شاہ ولی اللہ کی اصل اساس ہے جس کو فلسفۂ حکمائے یونان میں وظیفۂ عقل عاشر کہا گیا ہے۔ جس قدر فیضان اور فیوضات الہیہ عالم انسانی پر عرش سے نازل ہوتی ہیں وہ حظیرۃ القدس کے ذریعہ نازل ہوتی ہیں۔ میں امام سندھی کو اچھی طرح جانتا ہوں میں نے پہلی مرتبہ انکو اس وقت دیکھا جب وہ ماسکو میں تشریف لائے اور بالشویکوں کا لیڈر لینن زندہ تھا۔ حکومت کے آدمیوں نے ان کا پرزور خیر مقدم کیا تھا حکومت بالشویک امام سندھی کا بڑا احترام کرتی تھی اور امام کے افکار سے مستفید و مستنیر ہوتی تھی وہ ان کے افکار عالیہ در ارشادات کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کرتی تھی۔ میرے پاس ان کی فارسی کاپیاں بجنسہٖ موجود ہیں۔ میں ماسکو میں استقبال کی غرض سے پہنچا تاکہ آپکی زیارت کروں اور آپ سے فائدہ اٹھاؤں۔ چنانچہ کئی دنوں تک میں آپ کی صحبت میں رہا آپ اکثر میرے غریب خانے پر صبح و شام تشریف لاتے تھے۔ پھر میں نے آپ کو لینن گراڈ آنے کی دعوت دی میں نے وہاں آپکا پرزور استقبال کیا۔ اور حکومت نے بھی آپ کا پرزور استقبال کیا لیکن قیام کیلئے امام سندھی نے دوسروں پر مجھے ترجیح دی اور میرے غریب خانہ پر قیام فرمایا۔ اور مجھے یہ شرف بخشا آپ رمضان شریف میں تقریباً دو ہفتے میرے مکان پر قیام فرما ہوئے اس اثنا میں نہ تو انہوں نے نہ ان کے اصحاب اور شاگردوں میں سے کسی نے عذر سفر پیش کرکے روزہ چھوڑا۔ میری گھر والی مہمانوں کے لئے خود کھانا اور چائے تیار کرتی تھیں۔ افطار کے وقت امام سندھی دسترخوان پر تشریف لاتے تو بڑا وسیع دسترخوان بچھتا۔ دسترخوان کے اردگرد آپ کے اصحاب اور شاگردوں کا ہجوم ہوتا۔ بعض اوقات روس کے بڑے بڑے علماء آپ سے مستفید ہوتے

لے آتے۔ اور آپ کی زیارت و صحبت سے مشرف ہوتے۔ امام سندھی اور ان کے شاگرد مرکز بالشویزم میں جو کچھ دیکھنا چاہتے بڑی توجہ سے دیکھتے بہت سی ایسی چیزیں آپ نے دیکھیں جو دوسروں کو بہت کم دیکھنا نصیب ہوتی۔

اس مدت میں میں آپ سے جدا نہیں ہوتا تھا سوائے استراحت کے وقت یا اس وقت کے جب وہ اپنے اصحاب اور شاگردوں کے ساتھ ہوتے۔ میں نے امام کو اچھی طرح سمجھا اور ایسا سمجھا جیسا سمجھنے کا حق تھا۔ میں آپ کو ایک پکا حنفی اور حنیفی مخلص پایا۔ آپ کی عبادت میں ریا نہ تھی نہ آپ کے کلام اور سیرت میں ریا تھی میں نے آپ کو اپنے علم میں مجتہد مجاہد صادق اور اپنے اعمال میں سچا پایا۔ آپ بڑی بڑی امیدیں رکھتے تھے۔ آپ کا ایمان و یقین بہت قوی اور مضبوط تھا اپنے طریقہ کی کامیابی پر انہیں قوی امید تھی اور اس بارے میں فوز و فلاح کی امیدیں رکھتے تھے۔

روس سے آپ ۱۹۲۳ء میں نکلے۔ پھر میں نے آپ کو ۱۹۲۷ء میں استنبول میں دیکھا پھر حرمین میں آپ کو پایا۔ اور بہت مدت تک حرم مکہ میں آپ کی صحبت میں رہا اور کئی کئی ماہ آپ کی صحبت میں گذارے۔ میں نے پورے اتقان و یقین کے ساتھ آپ کے اَمالی تفسیر قرآن لکھے۔ جو فلسفہ امام ولی اللہ دہلوی کے مطابق تھے میں آپ کے افکار اجتماعیہ سے خوب واقف ہوں۔ اور قرآن حکیم کے جو مقاصد حکمیہ ان کے پیش نظر تھے ان سے بھی آگاہ ہوں بعض اوقات آپ فرمایا کرتے تھے میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کو مؤتمر ادیان میں ثابت کرنا چاہتا ہوں جب ہر شخص اپنے اپنے دین کی کتاب لے کر آئے گا تو ہم کتاب اللہ کی تفسیر فلسفہ امام ولی اللہ کے بموجب لکھ کر آئیں گے وہ قول یہ ہے۔

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً　　اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو تم تمام کی طرف میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں

ہندستان اور سارے عالم اسلامی پر ایک بہت بڑی مصیبت آئی کہ ایک بہت بڑا عالم اور زبردست فاضل دنیا سے رخصت ہوا۔

پس امت کے علماء کرام، سادات عظام، سرداران قوم اور اغنیاء و امرا کا فرض ہے کہ امام سندھی کی امیدوں اور مقاصد کو زندہ رکھیں اور انہیں زندہ رکھنے کا طریقہ یہی ہے کہ امام سندھی نے جو ارشادات قرآن کریم کے بارے میں فرمائے ہیں عملاً انہیں زندہ رکھیں، خدا کا فرمان ہے۔

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ (عن آیت ۹۷)　　جو شخص عمل صالح کرتا ہے، مرد ہو یا عورت، وہ ایمان والا ہے تو ہم اسکی زندگی نہایت اچھی بسر کرائینگے۔

تفسیر کا دورِ اول

محمد سرور

تاریخ اسلام کی پہلی صدی میں، جیسا کہ گزشتہ دو مضامین میں بتایا جا چکا ہے، مسلمانوں کی سب سے زیادہ توجہ مذہبی امور کی طرف تھی۔ اور اس عہد میں زیادہ تر علوم دینی ہی کا چرچا رہا۔ اور ایسا ہونا بالکل فطری بھی تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے دلوں پر مذہب کا اثر و نفوذ حد کمال کو پہنچ چکا تھا۔ پھر مذہب ہی ان کے لئے امت کا شیرازہ بند اور قومی و ملی عظمت کا سرچشمہ بھی تھا۔ اور روحانی اور دنیاوی جو نعمت بھی انہیں حاصل ہوئی تھی، وہ اسی کی بدولت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام کا وجود مسعود سرزمین عرب میں جلوہ فرما نہ ہوتا، تو اہل عرب پہلے کی طرح قبیلوں اور گروہوں میں بٹے رہتے اور ان میں آپس میں بدستور لڑائیاں ہوتی رہتیں۔ وہ جزیرہ عرب کی حدود سے باہر نکلنے کے بجائے حسب سابق بدویانہ زندگی گزارتے اور اپنے ہی خیموں میں مگن رہتے۔ صحرا، اونٹ اور بکریاں ان کی کل کائنات ہوتی۔ اور کشورکشائی اور جہانگیری وہ کبھی خواب میں بھی نہ دیکھتے۔ یہ طبعی امر تھا کہ اہل عرب اسلام کو اپنی دنیاوی بہبود کی سب سے بڑی متاع اور اُخروی سعادت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے اور اس کی تعلیمات و احکام سے بہرہ ور ہونے میں لگ جاتے۔

اسی عہد میں عربوں کے علاوہ غیر عربوں نے بھی اسلام قبول کیا، اور وہ بڑے خلوص سے جوق در جوق اس دین میں شامل ہوئے۔ ان غیر عرب مسلمانوں کے دلوں میں بھی عرب مسلمانوں کی طرح اسلام کی صداقت اور حقانیت جاگزیں تھی۔ اور اسلام سے عقیدت و شیفتگی میں یہ نو مسلم غیر عرب ان عربوں سے جو ان سے پہلے اسلام لا چکے تھے، کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ ان فاتحین اور مفتوحین نے جب ایک ہی دین کے حلقہ بگوش تھے،

؎ ستمبر اور اکتوبر ۱۹۶۶ء کے شماروں میں یہ مضامین چھپے ہیں یہ مضمون بھی فجر الاسلام سے ماخوذ ہے۔ (محمد سرور)

سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف توجہ کی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کو معلوم کرنے اور انہیں جمع کرنے کا ان کو شوق ہوا۔ صدر اسلام میں قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت کے سلسلے کا یوں آغاز ہوتا ہے۔ آگے چل کر جب دولت اسلامیہ کا دائرہ وسیع ہوا، مختلف علاقے اور ان کے مختلف نسلوں اور مذاہب کے باشندے اس کے زیر تسلط آئے۔ ان سے مسلمانوں کا سابقہ ہوا۔ اور مسلمانوں کو نئے نئے حوادث اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ تو ان کا حل ڈھونڈنے کے لئے انہیں لامحالہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اور اس طرح ان سے پیش آمدہ مسائل کے حل استنباط کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس عہد میں دینی علوم کے علاوہ دوسرے علوم کی طرف کم توجہ کی گئی۔ اور اگر ان میں سے کسی علم کو کچھ فروغ ہوا بھی، تو وہ یوں کہ پہلے اسے دینی رنگ دیا گیا۔ اور اس کے لئے دینی حجت حاصل کر لی گئی۔ مثال کے طور پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے طب کی ایک کتاب کی اشاعت کے لئے کئی دن تک استخارہ کرنے رہے[۱]

اس عہد میں غزوات، اسلامی فتوحات اور باہمی خانہ جنگیوں کے متعلق بھی روایات کے سلسلے کا آغاز ہوا۔

غرض اس دور میں مسلمانوں کے ہاں مذہبی سرگرمیوں کا تمام تر دارومدار ان تین چیزوں پر تھا۔ قرآن مجید اور اس کی تفسیر۔ احادیث نبوی اور ان کی روایت اور تالیف۔ اور نئے حوادث کے بارے میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، قرآن اور حدیث سے ان کے جوابات کا استنباط۔

قرآن مجید

قرآن مجید تقریباً بائیس سال کے عرصہ میں مختلف آیات کی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس پوری مدت میں حوادث اور احوال کے مطابق آیات نازل ہوا کرتی تھیں۔ جب آپ کا انتقال ہوا، تو قرآن ایک مصحف میں جمع نہ ہوا تھا۔ وہ محفوظ تو تھا لیکن کاتبین وحی کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے متفرق کتبوں اور حفاظ کے سینوں میں۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں پہلی دفعہ قرآن جمع کیا گیا۔ لیکن ایک مصحف میں نہیں، بلکہ مختلف کتبوں کو جمع کر دیا گیا۔ اور جو کچھ حفاظ کو یاد تھا، وہ لکھ لیا گیا

---

[۱] وہ قرابادین جو عمر بن عبدالعزیزؒ نے شائع کی تھی، ایک روایت کے مطابق مروان کے زمانے سے خزانۂ کتب میں محفوظ چلی آتی تھی۔

(تاریخ اسلام۔ بنی امیہ، شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ) (محمد سرور)

یہ مجموعہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رکھا گیا ان کی وفات کے بعد یہ صحیفے حضرت عمرؓ کی تحویل میں آئے، اور ان سے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس پہنچے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں قرآن کے ان صحائف کی کتابت و تدوین حضرت زید بن ثابت کی زیر نگرانی ہوئی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور خلافت میں اہل الرائے کے اصرار پر حضرت حفصہؓ سے قرآن کے وہ متفرق صحائف لے کر حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر، اور سعید بن عاص کے سپرد کئے۔ اور اس طرح وہ سب ایک مصحف کی شکل میں مدون کر دیئے گئے۔ پھر اس مصحف کے متعدد نسخے کرا کے مختلف شہروں میں بھجوا دیئے گئے۔ اور اس متفق علیہ مصحف کے خلاف بعض افراد کے پاس از قسم صحائف جو کچھ تھا انہیں جلا دیا گیا۔

قرآن اہل عرب کی زبان اور ان کے اسلوب کلام اور محاورے کے مطابق نازل ہوا۔ اس کے الفاظ عربی ہیں سوائے قلیل التعداد الفاظ کے، جو معرّب ہیں اور دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں، لیکن اہل عرب نے ان اجنبی الفاظ کو اپنا لیا تھا، اور ان پر عربی زبان کے قواعد نافذ ہوتے تھے۔ قرآن کا اسلوبِ بیان اہل عرب کے اسلوب کے مطابق ہے۔ اسی کی طرح اس میں مجاز، کنایہ اور دوسری اصناف سخن کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور چاہیئے بھی یہی تھا۔ کیونکہ اس کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے۔ اس لئے اس کا اُن کی زبان میں اور ان کے اسلوب بیان کے مطابق ہونا لازمی تھا۔ خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ وما ارسلنا من رسولٍ الاّ بلسان قومه ليبيّن لهم (اور ہم نے رسولوں میں سے کسی کو نہیں بھیجا لیکن اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ ان سے صاف صاف بات کہہ سکے)

قرآن کے عربی زبان میں اور عربوں کے اسلوب بیان کے مطابق ہونے کے یہ معنی نہیں تھے کہ تمام کے تمام صحابہ قرآن کا ہر ایک حصہ سننے کے ساتھ ہی اس کے سارے مطالب سمجھ جاتے تھے۔ ہمیں ابن خلدونؒ کے اس قول کے آخری حصے تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ "قرآن اہل عرب کی زبان اور ان کے اسلوب بیان کے مطابق نازل ہوا۔ اور وہ تمام کے تمام اس کو سمجھتے اور اس کے مفردات اور اس کی ترکیبوں کے معانی کو جانتے تھے"۔[1] ہمارے خیال میں قرآن کے عربی زبان میں نازل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اہل عرب اس کے مفردات اور ترکیبوں پر حاوی تھے۔ اس کی دلیل ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔

---

[1] مقدمہ ص ۳۶۶

کسی زبان میں ایک کتاب کا ہونا اس امر کا مترادف نہیں ہوتا کہ تمام اہل زبان اسے سمجھتے ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں کتنی کتابیں ہیں، جو خود انگریز اور فرانسیسی نہیں سمجھتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک کتاب کو سمجھنے کے لئے صرف اس کی زبان جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس کتاب کے علمی معیار کے مطابق استعداد عقلی[۱] کا ہونا ضروری ہے۔ یہی حال قرآن کے بارے میں اکثر اہل عرب کا تھا۔ وہ سارے کے سارے پورے قرآن مجید کو سمجھنے پر قادر نہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور ذہانت کے مطابق اس علم لدنی سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ بلکہ ہماری رائے میں اہل عرب میں سے ہر فرد قرآن کے تمام الفاظ کے معانی سے بھی آگاہ نہ تھا۔ جیسا کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ قوم کا ہر فرد اس قوم کی زبان کے تمام الفاظ کے معانی پر عبور رکھتا ہے۔

مزید ثبوت کے لئے حضرت انس بن مالک کی ایک روایت ملاحظہ ہو:۔ آپ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے "وفاکھتہ[۲] وابا" میں "ابا" کے معنی پوچھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تکلف اور تعمق سے منع فرمایا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ سے ایک اور روایت ہے کہ آپ نے منبر سے یہ آیت پڑھی۔ "او یأخذھم علی تخوف[۳]" اور تخوف کے معنی دریافت کئے۔ بنی ہذیل میں سے ایک شخص نے کہا کہ "تخوف" ہمارے ہاں تنقص کو کہتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھا۔

---

[۱] مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے تھے کہ بعثت نبوی کے وقت مکہ اور کسی حد تک مدینہ بین الاقوامی شہر تھے اور ان کی ذہنی فضا کافی ترقی یافتہ تھی چنانچہ قرآن مجید ان دونوں شہروں کے اہل عقل ودانش کے لئے بالکل قابل فہم تھا باقی یہ کہنا کہ عرب کے ہر بدو کی جس کی عربی زبان تھی قرآن کے اعلیٰ ودقیق معانی تک رسائی تھی، صحیح نہیں۔ (محمد سرور)

[۲] فاکھتہ میوے۔ ابّاً چارہ۔ الابّ اس گھاس کو کہتے ہیں، جو جانوروں کے چرنے اور کٹنے کے لئے بالکل تیار ہو۔ (مفردات القرآن اردو ترجمہ از مولانا محمد عبدہ)

[۳] او یأخذھم علی تخوف۔ یا جب ان کو عذاب کا ڈر پیدا ہو گیا ہو اس وقت پکڑ لے (مفردات القرآن اردو ترجمہ) نیچے حاشیئے میں ہے۔ یہاں فراء نے تخوف کے معنی تنقص ہی کے لئے ہیں، جیسا کہ مصنف نے تخوفنا کا محاورہ پیش کیا ہے۔ مگر زجاج نے اس کے معنی اضافہ کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو لسان العرب تخ و فنی۔

تخوض الرحل منہا تامکا قتر دا
کما تخوض عود النبعۃ السفن

حضرت عمر کی علم اور دین میں جو منزلت ہے، وہ دیکھئے اور پھر یہ روایت بھی ملاحظہ کیجئے[1] بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد آیات کے صرف اجمالی معنوں پر اکتفا کیا کرتی تھی اور الفاظ کی تحقیق اور ان کے معانی کی تفصیل میں زیادہ نہیں جاتے تھے۔ مثلاً وہ آیت "وفاکھۃ واباً" سے مراد لیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا ذکر کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لئے زبان کے الفاظ اور اس کے اسالیب کا جاننا کافی نہیں۔ مثلاً والعادیات ضبحاً والذاریات ذروا۔" اور یہ کہ آیت والفجر ولیال عشر" میں لیال عشر" یعنی دس راتوں سے کیا مراد ہے۔ "وانزلناہ فی لیلۃ القدر" سے کون سی رات مراد ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ نیز قرآن مجید میں تورات اور انجیل کی بہت سی چیزوں کی طرف اشارے ہیں اور عیسائیوں اور یہودیوں کا رد کیا گیا ہے۔ ان کے سمجھنے کے لئے بھی صرف زبان کی معرفت کافی نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ھوالذی انزل علیک الکتاب منہ آیات محکمات ھن ام الکتاب واخر متشابھات فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا۔ وہی ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو، جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں کتاب کا اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں، سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ اس کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ جو مشتبہ المراد ہے۔ شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کا مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے۔ حالانکہ اس کا مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا۔ اور جو لوگ

---

[1] یہ دونوں روایتیں کتاب الموافقات ج ۲ ص ۸۷ ص ۸۸ مطبوعہ مصر میں ہیں۔

علم میں پختہ ہیں، وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر یقین رکھتے ہیں سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے[1]
حاصل یہ ہے کہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ فہم قرآن اور معرفت معانی قرآن کے معاملے میں صحابہ کے
افراد استعداد کے مختلف مدارج تھے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں تمام قرآن حفظ کرنے کا رواج، جیسا کہ بعد میں عام ہوا، نہیں تھا۔
صحابہ ایک سورت یا چند آیتیں حفظ کرتے اور ان کے مطالب سمجھتے، جب اس میں کما حقہٗ درک ہو جاتا تو پھر
آگے بڑھتے۔ اس طرح سے کئی صحابہ مل کر قرآن کے حافظ ہوتے تھے، ابو عبدالرحمٰن السلمی کا بیان ہے کہ
عثمان بن عفان اور عبداللہ بن مسعود وغیرہم ایسے قرآن پڑھنے والوں نے ہم سے ذکر کیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم سے دس آیات پڑھتے اور جب تک وہ یہ جان لیتے کہ ان میں علم و عمل کیا ہے، وہ ان سے آگے نہ بڑھتے۔
حضرت انس کہتے ہیں کہ ہم سے جو شخص سورۂ بقرہ اور سورہ آلِ عمران پڑھ لیتا، اس کی قدر و منزلت ہماری
نظروں میں بہت بڑھ جاتی (امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں اس کی روایت کی ہے) عبداللہ بن عمر نے
سورۂ بقرہ حفظ کرنے پر آٹھ سال لگائے[2] ایک آیت یاد کرتے اور اس کے معانی اور مطالب سمجھتے پھر
آگے بڑھتے۔

تفسیر کی ضرورت کیوں پیش آئی

قرآن میں بہت سی آیات محکمات میں سے ہیں اور ان کا مطلب صاف و واضح ہے۔ ان میں دین کے
اصول اور احکام بیان کئے گئے ہیں۔ خاص طور سے مکی آیات میں اصول دین کی دعوت دی گئی ہے۔ مثال
کے طور پر سورہ الانعام کو لیجئے اس قسم کی آیات کا عوام الناس کے لئے اور خاص طور سے وہ جو عرب
ہوں، سمجھنا زیادہ دشوار نہیں۔ ان کے علاوہ قرآن میں غامض آیات بھی ہیں، جنہیں متشابہات کہا گیا ہے
ان کا سمجھنا مشکل ہے، اور خواص ہی ان کے کنہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ صحابہ کرام بالعموم فہم قرآن کی تمام لوگوں
سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی زبان میں اترا تھا۔ نیز وہ ان احوال اور حوادث کے عینی شاہد
تھے، جن کے بارے میں آیات نازل ہوتی تھیں اس کے باوجود پھر بھی فہم قرآن کے متعلق ان میں

---

[1] ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ہے۔ (محمد سرور)

[2] الاتقان جزو ۲ صفحہ ۲

اپنی اپنی استعداد کے اعتبار سے مختلف مدارج تھے مثلاً:

۱- اس میں شک نہیں کہ تمام صحابہ کی زبان عربی تھی، لیکن عربی زبان جاننے کے معاملہ میں بھی ان میں تفاوت تھا۔ ان میں سے بعض ادب جاہلی سے زیادہ واقف تھے اور غیر مانوس اور مشکل الفاظ سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ فہم قرآن میں مدد دیتے۔ اور بعض ایسے تھے، جو اس میں ان سے پیچھے تھے

۲- بعض صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ شرف صحبت ملا۔ اور وہ آپؐ کی حضوری اور رفاقت میں اوروں سے زیادہ عرصہ رہے۔ اس کی وجہ سے وہ آیات کی شان نزول سے زیادہ واقف تھے اور دوسرے اس نعمت سے محروم رہے۔ آیات کے مطالب سمجھنے کے لئے شان نزول سے غیر معمولی مدد ملتی ہے۔ اور اس کے نہ جاننے سے لغزشوں کا احتمال رہتا ہے۔ مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے قدامہ بن مظعون کو بحرین کا عامل مقرر کیا۔ جارودؓ نے حضرت عمرؓ سے آکر شکایت کی کہ قدامہ نے شراب پی، اور اسے نشہ بھی ہوا۔ حضرت عمر نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، اس کا کوئی گواہ ہے۔ جارودؓ نے ابو ہریرہؓ کا نام لیا۔ اس پر حضرت عمر نے کہا کہ قدامہ! میں تمہیں کوڑے لگاؤں گا۔ قدامہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر میں نے شراب پی ہے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو تمہیں مجھے کوڑے لگانے کا کوئی حق نہیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ کیوں؟ قدامہ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی۔

"لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا وآمنوا وعملوا الصالحات ثم اتقوا وآمنوا واحسنوا" [1]

اور کہا کہ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے۔ پھر وہ اللہ سے ڈرے اور ایمان لائے اور پھر وہ اللہ سے ڈرے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔ بیشتر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر، احد، خندق اور دوسرے معرکوں میں شریک ہوا یہ سن کر

---

[1] ترجمہ، ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے، جو کچھ انہوں نے کھایا اس پر کوئی گناہ نہیں جب کہ وہ اللہ سے ڈرے اور ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ پھر اللہ سے ڈرے، اور ایمان لائے۔ پھر اللہ سے ڈرے اور اچھے کام کئے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی اس کا جواب دیتا ہے۔ ابن عباس نے کہا کہ یہ آیات گزشتہ زاصلوٰۃ اور آئندہ زاحتیاط کا حکم رکھتی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔ یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان[1]۔

حضرت عمر کہنے لگے کہ تو نے صحیح کہا۔

ایک اور روایت ہے کہ ایک آدمی ابن مسعود کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے مسجد میں ایک آدمی کو دیکھا ہے، جو قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کر رہا تھا۔ وہ اس آیت کی "یوم تاتی السماء بدخان مبین" تفسیر یوں کرتا ہے کہ قیامت کے دن آدمیوں پر دھواں چھا جائے گا اور ان کے دم گھٹنے لگیں گے، اور ان کو زکام کا سا ہو جائیگا۔ یہ سن کر ابن مسعودؓ نے کہا۔ جو علم رکھتا ہو، وہ کہے اور جو علم نہیں رکھتا ہو اسے یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی چنانچہ آپ نے ان کے لئے حضرت یوسفؑ جیسے قحط کی بد دعا کی، آخر ان کو قحط نے آگھیرا، اور ان کا یہ حال ہو گیا کہ وہ ہڈیاں تک کھانے لگے۔ ہوتا یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی آدمی آسمان کی طرف نظر کرتا تو وہ اپنے اور آسمان کے درمیان بھوک کی شدت کی وجہ سے دھواں جیسا دیکھتا۔

۳۔ اہل عرب کے اپنے اعمال اور اقوال میں جو مختلف عادات و اطوار تھے، ان سے بعض صحابہ زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور بعض کم۔ اور اس بارے میں ان میں تفاوت پایا جاتا تھا۔ وہ صحابہ جو ایام جہالت کی رسومات حج سے زیادہ باخبر ہوتے وہ حج سے متعلق آیات کو ان صحابہ سے جو رسومات حج سے ناواقف تھے، زیادہ بہتر طریقے سے سمجھتے۔ علیٰ ہذا القیاس ان آیات کو جن میں عرب کے معبودان باطل اور ان کے طریقہ عبادت کی مذمت کی گئی ہے۔ وہی پوری طرح سمجھ سکتا تھا، جو یہ جانتا تھا کہ وہ کیا کرتے تھے۔

۴۔ اسی طرح نزول قرآن کے دوران جزیرۂ عرب میں بسنے والے یہود اور نصاریٰ جو کچھ کرتے

---

[1] (ترجمہ) اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو، شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں۔

تھے، اس کا جاننا بھی فہم قرآن میں مدد دیتا تھا۔ کیونکہ قرآن میں ان کے اعمال کی طرف بھی اشارے ہیں، اور ان کا رد کیا گیا ہے، چنانچہ ان سے متعلق آیات کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہود اور نصاریٰ کیا کرتے تھے۔ غرض یہ اور اس طرح کے دوسرے اسباب تھے، جن کی وجہ سے قرآن مجید کے سمجھنے میں صحابہ میں فرقِ مراتب پایا جاتا تھا۔ اور ان کے بعد جب تابعین کا دور آیا، تو ان میں اور بھی زیادہ فرقِ مراتب پیدا ہو گیا۔

تفسیر کے مآخذ

تفسیر کی ایک شق تفسیر بالمنقول ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ آیات کی وہ تفسیر یا تشریح جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی۔ مثلاً آپؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا الصلوٰۃ الوسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اسی طرح حضرت علی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوم الحج الاکبر کے متعلق دریافت کیا، تو آپؐ نے فرمایا فرمایا کہ وہ قربانی کا دن ہے۔ نیز مروی ہے کہ آپؐ سے پوچھا گیا کہ حضرت موسیٰؑ نے کون سی مدت پوری کی تھی[1]۔ آپؐ نے فرمایا، جو دونوں مدتوں میں زیادہ بہتر تھی۔ اس قسم کی بہت سی روایات آپؐ سے مروی ہیں، جو صحاح ستہ میں مذکور ہیں۔ ان پر قصہ گوؤں اور جعلی احادیث گھڑنے والوں نے بھی بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے، علمائے حدیث نے ان سب روایات کی چھان بین کی۔ چنانچہ بعض کو تو انہوں نے صحیح مانا اور بعض کو ضعیف قرار دیا۔ اس بارے میں گھڑی ہوئی روایات کے داخل پا جانے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ہمیں ایک ہی آیت کی دو متناقض تفسیریں ملیں گی، جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صدور ناممکن ہے۔ جیسا کہ مثال کے طور سے حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس قول "والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ" کی بابت پوچھا گیا۔ تو آپؐ نے فرمایا قنطار ایک ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے، اور حضرت ابوہریرہ سے

---

[1] اشارہ ہے حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ کے قصے کی طرف جس میں حضرت شعیب نے آخر الذکر سے اپنے ساتھ ایک خاص مدت (اجل) گزارنے کا فرمایا تھا۔
(سورۂ قصص ۲۸)

روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہوتا ہے۔[1]
اسی لئے بعض علماء نے تفسیر کے بارے میں تمام روایات کا انکار کیا ہے۔ یعنی اس بارے میں جو روایات مروی ہیں وہ ان کی صحت تسلیم نہیں کرتے۔ امام احمد بن حنبل سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا تین چیزیں ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں۔ تفسیر، جنگوں اور مغازی کی روایات[2]۔ اس باب میں جو روایات وارد ہوئی ہیں، ان پر خود مفسرین کے اعتماد نہ کرنے کی دلیل ہے کہ وہ ان وارد شدہ روایات پر رُکے نہیں، بلکہ انہوں نے ان روایات پر اپنے اجتہاد سے اضافہ کیا۔ اب اگر یہ تفسیری روایات ان کی نظر میں صحیح ہوتیں، تو وہ ان کی نصوص کی حدود پر رک جاتے۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، اس منقول تفسیر کا ذخیرہ بڑھتا گیا۔ اور اس میں صحابہ اور تابعین سے مروی شدہ روایات بھی داخل ہوتی گئیں۔ چنانچہ عہد اول کی مؤلفہ کتب تفسیر اس نوع کی تفسیر پر مشتمل ہیں

۲۔ تفسیر کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ اجتہاد ہے۔ یا اسے دوسرے لفظوں میں "رائے" کہہ لیجئے۔ مثلاً مفسر کلام عرب اور ان کے اسالیب بیان سے واقف ہے۔ وہ عربی الفاظ اور ان کے معانی سے جیسا کہ وہ شعر جاہلی وغیرہ میں وارد ہوئے ہیں، باخبر ہے پھر آیات کی شان نزول کے بارے میں جن روایات کو وہ صحیح سمجھتا ہے۔ ان کا علم رکھتا ہے۔ وہ تفسیر میں ان اسباب سے مدد لیتا ہے۔ اور اپنے اجتہاد سے تفسیر کرتا ہے۔ بہت سے صحابہ آیات قرآنی کی اس طرح تفسیر کرتے تھے۔ چنانچہ ابن عباس اور ابن مسعود سے تفسیر کی جو روایات مروی ہیں، ان میں سے اکثر اس قبیل کی ہیں۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد **واذ اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور** میں جو "الطور" آیا ہے، مفسرین نے اس کے کئی معنی کئے ہیں۔ مجاہد کے نزدیک "الطور" سے مراد مطلق پہاڑ ہے۔ ابن عباس اس سے ایک خاص پہاڑ مراد لیتے ہیں۔ اور انہی کا قول ہے کہ جس پہاڑ

---

[1] پہلی حدیث کی تخریج الحاکم نے اور دوسری کی امام احمد اور ابن ماجہ نے کی۔

[2] الاتقان جزو ۲ ص ۲۱۱۔ منقول ہے کہ اصحاب امام احمد میں سے محققین کا قول ہے کہ امام احمد کی اس سے مراد یہ ہے کہ اس قبیل کی روایتوں کے غالب حصے کی صحیح متصل اسناد نہیں ہیں۔

پر رد پیدگی ہو، وہ "الطور" ہے اور جہاں پیدگی نہ ہو وہ "الطور" نہیں۔ تفسیر میں اس طرح کا اختلاف "رائے" میں اختلاف کا نتیجہ ہے، روایات منقولہ میں اختلاف کا نتیجہ نہیں۔ اسی طرح الفاظ کے معانی میں اختلاف سے آیات کے معانی میں اختلاف ہوا۔

غرض تفسیر کے سلسلے میں صحابہ اور تابعین کی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک جماعت قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے دینے سے مطلقاً گریز کرتی۔ جیسا کہ سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ جب ان سے قرآن کے بارے میں کچھ پوچھا جاتا، تو آپ فرماتے "قرآن میں میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا"۔ ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے قرآن کے بارے میں کچھ پوچھا، تو انہوں نے جواب دیا۔ "اللہ سے ڈرو اور راستی کو لازم پکڑو۔ وہ لوگ گزر گئے جو جانتے تھے کہ قرآن کی فلاں آیت کس بارے میں نازل ہوئی ہے" ہشام بن عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد کو کتاب اللہ کی کسی آیت کی "تاویل" کرتے نہیں سنا۔ لیکن اس جماعت کے پہلو بہ پہلو دوسری جماعت بھی تھی۔ جو اسے جائز سمجھتی تھی۔ بلکہ ان کے نزدیک اس سلسلے میں جن مطالب تک ان کا اجتہاد پہنچتا تھا، انہیں چھپانا علم کو چھپانا تھا۔ یہ جماعت تعداد میں کافی تھی۔ ابن مسعود، ابن عباس اور عکرمہ وغیرہم اسی رائے کے تھے البتہ یہ اور ان کے ہم خیال لوگ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص استعداد رکھے بغیر تفسیر کرنے لگے۔ یعنی اسے کلام عرب پر اتنا عبور نہ ہو کہ وہ اسے صحیح طرح سمجھ سکے۔ یا اس نے قرآن کا اس قدر مطالعہ نہ کیا ہو کہ وہ اس کی اجمالی باتوں کو ان باتوں پر جن کا ذکر تفصیل سے ہے، حمل نہ کر سکے۔ اسی طرح وہ اس کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ ایک شخص مثال کے طور پر معتزلہ، مرجئہ اور شیعہ عقائد میں سے کسی ایک کو مان لے، اور اسے اصل اساس بنا کر اس کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنے لگے۔ واجب تو یہ ہے کہ عقیدہ قرآن کے تابع ہو، نہ کہ قرآن کسی خاص عقیدے کے تابع۔

یہی اجتہاد تھا جو سبب بنا صحابہ اور تابعین میں قرآن کے الفاظ اور اس کی آیات کی تفسیر کے بارے میں واضح اختلاف کا، جسے آپ ابن جریر الطبری کی تفسیر کے ہر صفحے پر دیکھ سکتے ہیں۔

ادب جاہلی اور اس کا شعری اور نثری سرمایہ، دورِ جاہلیت اور صدر اسلام میں عربوں کی عادات اور ان کے حالات و وقائع، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ رسالت کے سلسلے میں جو دشمنی، مخالفت، ہجرت، جنگوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس دوران میں جو اور واقعات ہوئے۔ وہ مقتضی

ہوئے کہ ان کے متعلق احکام نازل ہوں اور قرآن کی آیات اتریں۔ چنانچہ یہ سب چیزیں صحابہ وتابعین میں سے جو اہل علم تھے، ان کے لئے مصدر و ماخذ بنیں کہ وہ ان سے تفسیر میں مدد لیں

۴۔ مذکورہ بالا ماخذوں کے علاوہ تفسیر کا ایک اور ماخذ بھی تھا، جس سے مفسرین نے کافی فائدہ اٹھایا۔ ذہنوں کو تفصیلات معلوم کرنے اور بات کی ٹوہ میں بہت دور تک جانے کا جو شغف اور میلان ہوتا ہے، اس کے تحت جب قرآن کی بہت سی آیتیں سنی جاتی تھیں، تو ان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پوچھے جاتے۔ مثلاً جب انہوں نے اصحاب کہف کے کتے کا قصہ سنا تو کہنے لگے کہ اس کا رنگ کیا تھا؟ یا جب یہ آیت "فقلنا اضربوہ ببعضھا" سنی تو پوچھنے لگے کہ وہ "بعض" چیز کیا تھی۔ جس سے مارنے کا حکم دیا گیا۔ نوح کے سفینہ کی جسامت کیا تھی؟ اس لڑکے کا نام کیا تھا، جسے حضرت موسیٰ کے قصے میں "العبد الصالح" نے قتل کر دیا تھا۔ جب ان کے سامنے آیت "فخذ اربعۃ من الطیر" پڑھی گئی، تو سوال کیا کہ وہ کون سے پرندے تھے۔ اور وہ کون سے کواکب تھے، جو حضرت یوسف نے خواب میں دیکھے تھے۔ اسی طرح جب انہوں نے حضرت شعیب و حضرت موسیٰ کے قصے کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "فلما قضیٰ موسیٰ الاجل" تو پوچھا کہ اجلین (دو مدتوں) میں سے یہ کون سی اجل (مدت) تھی۔ پھر یہ کہ حضرت موسیٰ نے حضرت شعیب کی بڑی لڑکی سے شادی کی تھی یا چھوٹی سے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی جب وہ قرآن میں سے ابتدائے آفرنیش کی طرف اشارہ سنتے تو باقی کی تفصیل جاننا چاہتے۔ جب ان کے سامنے کوئی ایسی آیت پڑھی جاتی جس میں کسی نبی کے واقعہ کا ذکر ہوتا۔ تو انہیں اس کی تفصیل معلوم کئے بغیر اطمینان نہ ہوتا۔ اب ان سب خواہشات کی تسکین تورات اور اس پر جو حاشیے لکھے گئے تھے، نیز اس ضمن میں اس میں جو قصے کہانیاں (اساطیر) داخل ہو گئی تھیں، ان سے ہوتی تھی۔ ان یہود میں سے بعض دائرہ اسلام میں بھی داخل ہوئے۔ اور ان سے اس طرح کی بہت سی باتیں مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئیں۔ پھر یہی باتیں تفسیر قرآن میں داخل ہو گئیں، جن کی مدد سے شرح و تفصیل کی تکمیل کی جانے لگی اور ابن عباس جیسے کبار صحابہ نے بھی ان باتوں کو لینے سے احتراز نہ برتا۔

بے شک یہ روایت بھی ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "اہل کتاب کی باتوں کی نہ تصدیق

کرو، اور نہ ہی انہیں جھٹلاؤ" لیکن عمل اس کے خلاف ہوا۔ وہ ان باتوں کی تصدیق کرتے تھے اور ان سے نقل کرتے تھے۔ اگر اس کی مثال چاہیئے تو طبری وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام والملائکۃ" کی جو تفسیر ہے وہ پڑھیئے۔

بیان کیا جاتا ہے ابن عباس کعب الاحبار کی مجلس میں بیٹھتے تھے اور اس سے روایت لیتے تھے۔

اس بارے میں مجھے ابن خلدون کی رائے پسند ہے۔ وہ کہتا ہے "اہل عرب اصحاب کتاب و علم نہ تھے ان پر بدویت اور امیت (ان پڑھ ہونا) کا غلبہ تھا۔ جب انہیں ابتدائے آفرینش کے اسرار اور موجودات کی تخلیق کے اسباب معلوم کرنے کا اشتیاق ہوتا، جیسا کہ انسانی نفوس کو اشتیاق ہوا کرتا ہے۔ تو وہ ان کے بارے میں اہل کتاب سے پوچھتے، اور ان سے استفادہ کرتے۔ یہ اہل کتاب یا تو یہودی تھے، جن کے پاس تورات تھی، یا نصاریٰ تھے۔ یہ اہل تورات یہودی جو اس وقت عربوں کے درمیان آباد تھے۔ انہیں کی طرح بادیہ نشین تھے۔ اور تورات اتنی ہی جانتے تھے، جتنی اہل کتاب میں سے عام لوگ جانتے ہیں۔ ان میں سے اکثر عربوں کے قبیلے حمیر میں سے تھے، جنہوں نے یہودیت قبول کرلی تھی۔ جب یہ اسلام لائے، تو وہ ان باتوں پر، جو ان کے ہاں تھیں اور ان کا احکام شرعیہ سے جن کے بارے میں وہ محتاط تھے، تعلق نہ تھا، قائم رہے جیسے کہ ابتدائے آفرینش، گزشتہ حوادث، جنگوں اور ایسے ہی امور کے بارے میں روایات۔ یہی وہ امور تھے، جن کے بارے میں کعب الاحبار، وھب بن منبہ، عبداللہ بن سلام اور ان جیسے دوسرے لوگوں سے نقل کی ہوئی روایات تفاسیر میں جمع ہو گئیں۔ ان روایات کا سرچشمہ یہی لوگ تھے اور چونکہ ان روایات کا اسلام کے احکام سے کوئی تعلق نہ تھا کہ ان کی صحت کی جانچ پڑتال ہوتی اور ان پر عمل کرنا ضروری ہوتا۔ اس لئے ان کے معاملے میں مفسرین نے نرمی برتی اور اپنی کتب تفسیر میں ان کی نقل کی ہوئی روایات کو بھرتے چلے گئے۔[1]

اس عہد کے مفسر

صحابہ کرام کی ایک قلیل تعداد تفسیر بالرائے میں مشہور ہوئی ان میں جن سے اس بارے میں زیادہ روایتیں کی گئیں، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب ہیں

---

[1] مقدمہ ص ۳۶۷

اوران کے بعد زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ بن زبیر ہیں۔ اس جگہ ہم صرف اوّل الذکر چاروں کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ یہی وہ بزرگ ہیں، جنہوں نے مختلف بلادِ اسلامیہ میں سب سے بڑھ کر تفسیر کی نشوونما کی۔ وہ صفات عامہ جن کی بدولت ان چاروں کو تفسیر میں تبحر حاصل تھا، وہ یہ تھیں:۔ عربی زبان پر قدرت اور اس کے اسالیب پر عبور، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صحبت، جس کی وجہ سے وہ ان حالات وواقعات سے واقف تھے، جن کے بارے میں آیات اتریں۔ پھر ان کا اجتہاد سے احتراز نہ کرنا، اور جو نتائج اجتہاد سے نکلیں ان کا اقرار واثبات۔ اس معاملے میں ان چاروں میں سے صرف ابن عباس مستثنیٰ ہیں۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحبت میسر نہیں آئی، لیکن اس کی تلافی اہل علم صحابہ کی صحبت سے ہوگئی۔ ان سے ابن عباس نے استفادہ کیا، اور ان سے روایات بھی کیں۔

ان چاروں سے جو روایات مروی ہیں، اگر ان روایات کی کثرت کے اعتبار سے ہم ان بزرگوں کی درجہ بندی کریں، تو ابن عباس سب سے پہلے ہیں۔ پھر عبداللہ بن مسعود اس کے بعد علی بن ابی طالب اور پھر ابی بن کعب ہیں۔ یہ درجہ بندی کثرتِ روایات کے اعتبار سے ہے نہ کہ صحتِ روایات کے لحاظ سے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس اور حضرت علی کی طرف اوروں سے کہیں زیادہ موضوع روایات منسوب کی گئی ہیں۔ اور اس کے کئی اسباب ہیں۔ اہم ترین سبب یہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس خاندان نبوت سے تھے۔ اور ان کی طرف موضوع روایات منسوب کرنے سے دوسروں کی طرف منسوب کرنے کے مقابلہ میں زیادہ تقدس اور اعتماد پیدا ہوتا تھا۔ اور ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت علی کے جتنے حامی (شیعہ) تھے، اتنے کسی اور کے نہیں تھے۔ چنانچہ ان کے نزدیک جو چیزیں حضرت علی کے علمی مرتبے کو بلند کر سکتی تھیں، وہ انہیں وضع کر کے حضرت علی سے منسوب کرنے لگے۔ ابن عباس کی نسل سے عباسی خلفا تھے ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کے جدِّ اعلیٰ (ابن عباس) سے بکثرت روایات کی جانے لگیں۔ اگر آپ اس کا ثبوت چاہتے ہیں تو ابن ابی جمرہ نے حضرت علی سے جو روایت کی ہے، اسے دیکھئے وہ کہتا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا "اگر میں چاہوں تو اُمّ القرآن (سورہ فاتحہ) کی تفسیر سے ستر اونٹ لاد دوں۔ اسی طرح ابو طفیل سے مروی ہے کہ میں نے حضرت علی کو خطبہ دیتے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ مجھ سے سوال کرو۔ خدا کی قسم، تم کسی چیز کے بارے میں سوال کرو، میں

اس کا جواب دوں گا۔ مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو، خدا کی قسم۔ اس کی کوئی آیت نہیں کہ میں اس کے متعلق یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ دن کو اتری تھی یا رات کو، میدان میں اتری تھی یا پہاڑ میں[1]
ان دو روایات کا مجرد نقل کر دینا ہی کافی ہے۔ ان پر کسی قسم کی رائے زنی کی ضرورت نہیں۔

ابن عباس سے اتنا کچھ مروی ہے کہ اس کا شمار نہیں۔ قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں، جس کے بارے میں ان کے ایک یا ایک سے زیادہ اقوال نہ ہوں۔ اور ان سے اتنے زیادہ لوگوں نے روائتیں کی ہیں کہ ان کا کوئی حد وحساب نہیں۔ ناقدین نے مجبور ہو کر ان کے راویوں کے سلسلے میں چھان بین کی بعض کو انہوں نے ثقہ مانا اور بعض کو مجروح قرار دیا۔ مثال کے طور پر ان میں سے معاویہ بن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس کا سلسلہ روایت سب سے بہتر ہے اور بخاری نے اس پر اعتماد کیا ہے۔ جو یبر عن ضحاک عن ابن عباس کا سلسلہ روایت غیر پسندیدہ ہے۔ ابن جریج نے صحت کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھا۔ اور اس نے ہر آیت کے متعلق جو صحیح اور غیر صحیح روایت تھی، وہ بیان کر دی۔ کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس سب سے کمزور سلسلہ روایت ہے اور اگر اس کے ساتھ محمد بن مروان السدی الصغیر کی روایت بھی شامل ہو، تو اکثر صورتوں میں یہ کذب ہوتا ہے۔

ابن عبدالحکم کے طریقہ سے مروی ہے کہ میں نے امام شافعی کو کہتے سنا کہ ابن عباس سے سو سے زیادہ احادیث ثابت نہیں[1]۔ اگر یہ قول صحیح ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ موضوع روایات گھڑنے والوں نے کس قدر روایات گھڑیں اور اس معاملے میں لوگوں کی جرأت کس حد تک پہنچ گئی تھی

وضعِ روایات کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ اکثر ابن عباس سے دو روایتیں مروی دیکھیں گے۔ وہ باہم متناقض ہوں گی اور ان دونوں کا ابن عباس کی طرف انتساب کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ابن جریر طبری میں اس ارشادِ ربانی فخذ اربعۃ من الطیر فصرھن الیک ثم اجعل علی کل جبل منھن جزءا ثم ادعھن یاتینک سعیا" کی تفسیر کے ذیل میں معاویہ عن علی ابن ابی طلحہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ یہ ایک مثال ہے۔ نیز ابن جریر میں ہے کہ (حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا)

---

[1] الاتقان جز ۲ ص ۲۲۵

انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرو، پھر انہیں چار حصوں میں تقسیم کرو، اور ہر چوتھا حصہ ادھر ادھر رکھو۔ پھر انہیں بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اس کے کچھ آگے یہ بھی کہا ہے محمد بن سعد نے ہم سے بیان کیا، ان کو ان کے والد نے کہا ان کے والد کو ان کے چچا نے کہا۔ ان کے چچا کا بیان ہے کہ مجھ سے میرے والد نے کہا اور ان سے ان کے والد نے ابن عباس سے روایت کی کہ صُرھُنّ سے مراد اوثقہن[۲] ہے الخ۔ غرض ایک جگہ صُرھُنّ کے معنی قطعھن کہا گیا ہے، اور دوسری جگہ اوثقہن[۲] اب یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ ایک وقت میں انہوں نے ایک تفسیر کی، اور دوسرے وقت میں دوسری تفسیر کی۔ ابن جریر کی تفسیر میں ایسی مثالیں بکثرت ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود بڑی بات یہ ہے کہ یہ موضوع تفسیر علمی قدر و قیمت سے خالی نہیں یہ وضعِ تفسیر محض تک بندی نہیں تھی، بلکہ اکثر اوقات یہ نتیجہ ہوتی تھی مستقل علمی اجتہاد کا۔ ہاں اس میں اگر کوئی چیز ایسی تھی، جس کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی تو وہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس کی طرف اس کی نسبت تھی۔

ابن عباس وغیرہ سے تفسیر کے سلسلے میں جو کچھ مروی ہے، اس پر اگر ہم عمومی نظر ڈالیں تو اس کے تین ماخذ ملتے ہیں، جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث۔ ان واقعات کی روایات جو صحابہ کے سامنے ہوئے، اور وہ آیات کی وضاحت کرتے ہیں۔ صحابہ کا اجتہاد جس میں وہ ادبِ جاہلی اور عربوں کی زبان اور ان کی عہد جاہلیت اور صدر اسلام کی عادات سے اپنی واقفیت اور اسرائیلیات وغیرہ پر اعتماد کرتے تھے۔

دورِ تابعین

صحابہ کرام کے بعد بعض تابعین نے ان صحابہ سے جن کا ہم ذکر کر آئے ہیں، تفسیر کی روایت کی، اور اس میں مشہور ہوئے۔ ابن عباس سے سب سے زیادہ مجاہد، عطاء بن ابی رباح، عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور سعید بن جبیر نے روایت کی ہے۔ یہ چاروں مکہ میں ان کے شاگرد تھے اور

۱؎ ابن جریر جزء ۳ ص ۳۴، ۳۸

۲؎ قطعھن، انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرو، اوثقہن۔ انہیں اپنے ساتھ عادی بنالو۔

سب کے سب موالی تھے، ابن عباس سے روایات کی کثرت اور قلت کے اعتبار سے ان کے مختلف درجے ہیں، اسی طرح ان کے ثقہ ہونے کے متعلق بھی علماء نے مراتب قائم کئے ہیں۔ مجاہد نے ابن عباس سے سب سے کم روایتیں کی ہیں، اور وہ سب سے زیادہ ثقہ ہیں۔ اسی لئے امام شافعی، امام بخاری اور دوسرے اہل علم ان کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں، لیکن بعض علماء مجاہد سے تفسیر کی روایات نہیں لیتے۔ ابن سعد "طبقات" میں لکھتے ہیں "اعمش سے پوچھا گیا کہ لوگ مجاہد کی تفسیر سے کیوں پہلوتہی کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اہل کتاب سے پوچھا کرتے تھے"[1] لیکن ہمارے نزدیک کسی نے بھی مجاہد پر ان کے عدم ثقہ ہونے کا الزام نہیں لگایا۔ اسی طرح عطاء اور سعید میں سے بھی ہر ایک ثقہ اور صادق تھے باقی رہے عکرمہ، تو انہوں نے ابن عباس سے سب سے زیادہ روایت کی ہیں، اور وہ ابن عباس کے موالی تھے وہ اصلاً مغرب (شمالی افریقہ) کے رہنے والے بربر تھے۔ ان کے ثقہ ہونے میں علماء میں اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض علماء تو ان پر اعتماد کرتے ہیں، اور نہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری نے ان کو ثقہ مانا ہے اور ان سے روایت کی ہے۔ بعض کی رائے تھی کہ وہ اپنے علم میں بڑی جرأت رکھتے ہیں اور ان کو زعم ہے کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ اسے جانتے ہیں۔ سعید بن المسیب سے ایک شخص نے قرآن کی ایک آیت کے معنی پوچھے۔ آپ نے کہا کہ مجھ سے قرآن کی آیت کے معنی نہ پوچھو اس سے یعنی عکرمہ سے پوچھو جسے یہ زعم ہے کہ قرآن کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں[2]

تفسیر میں عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں سے عراق میں مسروق بن اجداع مشہور ہوئے یہ عربی النسل تھے، اور ہمدان کے تھے۔ بڑے پرہیزگار، زاہد اور ثقہ تھے۔ کوفہ میں رہتے تھے مشکل مسائل میں قاضی شریح ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بصرہ میں قتادہ بن دعامہ السدوسی مشہور ہوئے۔ وہ نابینا تھے۔ وہ بھی عربی النسل تھے اور بصرے میں رہتے تھے۔ تفسیر میں ان کی شہرت عربی زبان میں مہارت کی وجہ سے تھی۔ موصوف عربی شاعری، عربوں کے مشہور واقعات اور ان کے انساب کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے تھے۔ وہ ثقہ تھے، لیکن قضاء و قدر کے

---

[1] جزء ۵ صفحہ ۳۴۴ [2] تفسیر ابن جریر ج ۱ صفحہ ۲۹

مسائل میں زیادہ الجھنے کی وجہ سے بعض علماء ان سے روایت کرنے میں احتراز کرتے تھے۔

اس عہد یعنی تابعین کے عہد میں اسرائیلیات اور نصرانیات سے تفسیر کی ضخامت بہت بڑھ گئی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ بکثرت اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ دوسرے یہودیت اور نصرانیت کے احوال و اخبار کے متعلق قرآن میں جو اشارے ہیں، ان کی تفصیل سننے کا دلوں میں میلان تھا۔ تفسیر ابن جریر میں بنی اسرائیل کے بارے میں وارد شدہ آیات کے متعلق کافی روایات ہیں، اور ان روایات کا بطل (ہیرو) وہب بن منبہ ہے وہ یہودیمن میں سے تھا۔ بعد میں اسلام لایا۔ وہ یہودی کتابوں کے مندرجات اور یہودیوں کے حالات جانچے پرکھے اور ان کی علمی تحقیق کئے بغیر بیان کیا کرتا۔ اور جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے چونکہ ان روایات سے کسی قسم کا کوئی حکم شرعی وغیرہ استنباط نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں نے اس سے ان روایات کو لینے میں نرمی برتی۔ اسی طرح بہت سی آیات جو نصاریٰ کے بارے میں ہیں، ان کے متعلق تفسیر ابن جریر میں اکثر روایات ابن جریج سے مروی ہیں۔ اور یہ ابن جریج، عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج تھا۔ الذہبی تذکرۃ الحفاظ میں اسے رومی النسل بتاتے ہیں وہ اصلاً نصرانی تھا۔ اس کے متعلق بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا اور اس نے نوے عورتوں سے بطریق متعہ نکاح کیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے، "وہ پہلا شخص ہے جس نے اسلام میں سب سے پہلے کتاب تصنیف کی۔"[1] ابن جریج مذکور ۸۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۱۵۰ کے لگ بھگ اس نے وفات پائی۔ اس نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی تھی اس کی پیدائش مکہ کی ہے، اس کے بعد وہ بصرہ، یمن اور بغداد گیا

صحابہ اور کبار تابعین کے عہد کے بعد علماء نے فن تفسیر میں کتابیں تالیف کرنی شروع کیں ان کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ رائج تھا۔ اور وہ یہ کہ پہلے آیت دی جاتی۔ پھر صحابہ اور تابعین سے جو بھی اس کی تفسیر مروی ہوتی، اسے بالاسناد نقل کر دیا جاتا۔ سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح اور عبدالرزاق وغیرہم کی اس نوع کی تفسیریں ہیں۔ گو یہ تفاسیر ہم تک نہیں پہنچیں، لیکن ان کے بعد جو طبقہ آیا، اس کی تفسیریں ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے سب سے مشہور ابن جریر الطبری ہیں

---

[1] ابن خلکان جزء ۱ صفحہ ۳۰۵

اس ضمن میں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تمام عرصے میں ہر عہد میں جو علمی سرگرمیاں ہوتی تھیں، ان سے اس عہد کی تفسیر قرآن متاثر ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ایک عہد میں جو بھی خیالات، علمی نظریے اور مذہبی فرقے ہوتے، ان کا عکس اس عہد کی تفسیر میں ملتا ہے۔ اس کا سلسلہ ابن عباس سے لے کر شیخ محمد عبدہ تک چلا گیا ہے۔ اگر آپ کسی عہد میں لکھی ہوئی تفسیروں کو جمع کریں تو آپ ان سے اس عہد کی علمی سرگرمیوں اور اس میں جس قسم کے افکار و آراء کو فروغ تھا، انہیں معلوم کر سکتے ہیں۔

صحابہ اور تابعین اولین سے تفسیر قرآن کے سلسلے میں جو کچھ مروی ہے، اگر آپ اس پر غور کریں، تو دیکھیں گے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت اس آیت کے جو لغوی معنیٰ ان کی سمجھ میں آتے ہیں، ان کی مختصراً وضاحت کر دیتے ہیں مثال کے طور پر "غیر متجانف لاثم" کی تفسیر غیر متعرض لمعصیۃ کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وان تستقسموا بالازلام" کی تفسیر یوں کرتے۔ عہد جاہلیت میں جب اہل عرب میں سے کوئی سفر کا ارادہ کرتا، تو تیر سے فال نکالتا، اگر فال نکل آتی تو کہتا کہ مجھے سفر کی اجازت ہوئی ہے، اور اگر میں سفر کروں گا، تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گا۔ اسی طرح جب اسے سفر نہ کرنا ہوتا تو تیر سے فال نکالتا، اور اگر سفر نہ کرنے کی فال نکلتی تو اسے یقین ہو جاتا کہ اس سفر میں اس کے لئے بھلا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اگر صحابہ اور تابعین اولین اس پر کچھ اور اضافہ کرنا چاہتے، تو آیت کی شان نزول کے متعلق جو کچھ مروی ہوتا، اسے بیان کر دیتے۔ ان کے بعد یہود اور نصاریٰ سے روایات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ صحابہ اور تابعین اولین کی تفسیروں میں آپ کسی فقہی حکم کے استنباط اور کسی مذہبی فرقے کی تائید کے آثار نہیں پائیں گے۔ ان کے بعد جو دور آیا، اور اس میں قضاء وقدر وغیرہ کی بحثیں شروع ہوئیں، تو آپ تفسیر کو ان مذاہب کے خیالات سے بھرا ہوا پائیں گے۔ چنانچہ اس دور میں ہر ایک جبر و قدر کے بارے میں اپنے مخصوص فرقے کے نقطہ نظر سے قرآن کی تفسیر کرنے لگ گیا۔ اس کے بعد جب فقہی سرگرمیاں عام ہوئیں تو آپ مفسرین میں سے فقہاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ تفسیر کرتے وقت آیات سے جو فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں، ان سے بحث کرتے ہیں اسی طرح نحو و بلاغت کے قواعد اور اصول اخلاق کے سلسلے میں ہوا۔

وصیت نامہ نواب سید صدیق حسن خاں

قاسم حسن سید جام شورہ (حیدرآباد)

نواب، سید صدیق حسن خاں صاحب مرحوم ہندوپاک کی جانی پہچانی شخصیت ہیں جو اپنے بے بہا علمی کارناموں، اپنی بصیرت، تبلیغ و اشاعتِ اسلام اور ردِّ بدعت و ضلالت کے باعث بلند مقام کے حامل ہیں اور اپنی گرانمایہ دینی تصنیفات و تالیفات کے سبب پورے ہندوستان میں مشہور و معروف ہیں سطور ذیل میں نواب صاحب موصوف کا مختصر تعارف ان کے وصیت نامہ کے سلسلہ میں ہدیہ ناظرین ہے۔

یہ مختصر رسالہ موصوف نے اپنے صاحبزادگان نواب سید نور الحسن خانصاحب مرحوم و نواب سید علی حسن خانصاحب مرحوم اور اپنی صاحبزادی صفیہ بیگم صاحبہ مرحومہ کے لئے ۱۳۰۷ھ میں تحریر فرمایا ہے۔

گو وصایا رسالہ مذکور کا زیادہ تعلق، بقول صاحب وصایا موصوف کی اولاد ہی سے ہے۔ لیکن موضوعاتِ وصایا سے عامۃ المسلمین کو بھی استفادہ کا موقع ہے۔ بقول صاحب وصایا "یہ وصایا و نصائح اگرچہ خاص میری اولاد کے لئے ہے۔ لیکن بعض مطالب اس کے بکار آمد جملہ مومنین ہیں" اس لئے استفادہ عام کے لئے پیش خدمت ہیں جس کے مطالعہ سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ قیام و اشاعت دین کے ساتھ آزادیٔ ہند کی کوششوں میں نواب صاحب مرحوم و مغفور کا کتنا بڑا حصہ رہا ہے۔ اور موصوف نے اس سلسلہ میں کتنی قربانیاں دی ہیں۔

"۴ یا ۱۳۰۵ھ میں مرحوم نے ایک رسالہ جہاد اسلامی پر تحریر فرمایا۔ جس کی مخبری وائسرائے ہند لارڈ کرزن کو ہوئی اور حکومت انگریزی کے ایما پر کسی عاقبت ناشناس نے رسالہ مذکور کتب خانہ مرحوم سے چرا کر وائسرائے ہند لارڈ کرزن کو پیش کردیا، جس پر نواب صاحب مرحوم کے جملہ اختیارات

ریاست۔ اعزازات، ۲۱ توپ سلامی، اور خطابات نوابی، والاجاہ، امیرالامراء ذریعہ گریفن زریڈنٹ سنٹرل انڈیا۔ ایک اعلان کے ساتھ سوخت کر دیئے گئے۔ سرکار نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ جنت مکانی زوجہ نواب صاحب مرحوم ریاست بھوپال نے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہاکر نہ یہ کہ نواب صاحب مرحوم کو قید و بند سے محفوظ رکھا جس کا شدید اندیشہ تھا بلکہ جملہ اعزازات و خطابات واپس لے لئے لیکن ان کا اعلان اس روز ہوا جس دن نواب صاحب مرحوم نے اس دار فانی کو چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

نواب صاحب مرحوم کی سب سے زیادہ قابل قدر بات جو موصوف کو وقت کے دیگر اکابرین و علمائے امت سے ممتاز کرتی ہے، وہ نواب صاحب مرحوم کا دینی جذبۂ خدمت ہے، جو اوج اعلیٰ اقتدار و امتیازی جاہ ثروت حاصل ہونیکے باوجود موصوف کے فکر و عمل میں ہمیشہ ہمیشہ قائم رہا۔

نواب صاحب مرحوم ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش (U.P) کے شہر قنوج میں پیدا ہوئے صغر سنی ہی میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ محترمہ نے تعلیم و تربیت متداولہ کا انتظام کیا۔ رسالہ مذکور کی وصیت پنجم فصل چہارم میں اپنے والد صاحب مرحوم کے متعلق رقمطراز ہیں۔

میرے والد ایک عالم متقی قانع صابر شاکر موحد متبع سنت تھے کبھی علم و عبادت کو ذریعہ کسب مال نہیں ٹھیرایا۔ بلکہ ان کے باپ امیر کبیر ملقب بہ نواب انور جنگ بہادر تھے۔ اور ملک وراثت کافی چھوڑ گئے تھے۔ ان کو بھی ترک کر دیا اور جو اہل قرابت شیعہ تھے ان سے رشتہ داری ترک کر دی اور دین خالص توحید اختیار کیا اور کتب توحید وغیرہ کو بہ کمال شوق بقلم خود لکھا جیسے تقویۃ الایمان ونحوہ اور ان پر عمل کیا اور خود بھی رد شرک و بدعت میں رسائل لکھے جیسے راہ جنت و راہ سنت وغیرہما۔ معاصر و معاشر مولف تقویۃ الایمان اور شاگرد اخلاف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ گھر میں کوئی رسم بدعت کھیل تماشا باقی نہ چھوڑی
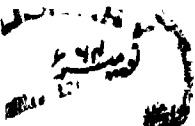
اللہ کے لئے برادری ترک کردی۔ ہم نے آنکھ کھول کر بعد ان کے کوئی کھیل تماشہ یا رسم بدعت گھر میں نہ پائی اور اب تک اپنے علم میں تمہارے گھروں میں کسی رسم دنیاوی یا بدعت کا رواج ہونے نہ دیا۔ اب تم پر بھی واجب ہے کہ اسی طرح عمر بسر کرو۔

فصل سوئم۔ وصیت چہارم میں اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

بندہ اپنے زمانہ میں تبلیغ بنو بہ مصداق ان آیات کریمات کا ہوا ہے۔ الم یجدک یتیما فاوی و وجدک ضالا فھدی و وجدک عائلا فاغنی۔ میں پنج سالہ طفل تھا کہ میرے والد نے انتقال فرمایا۔ اور جوار رحمت و مغفرت و عفو الہی میں گئے۔ میری مادر مہربان نے مجھکو اپنے کنار شفقت میں پرورش کیا۔ ہمارا گھر بہرحال قناعت وکفاف کا گھر تھا۔ ہم دو بھائی تین خواہر تھے کوئی وظیفہ و آمدنی ہماری نہ تھی۔ و فی السماء رزقکم وما توعدون جب ہم سن شعور کو پہنچے واسطے اہل وعیال فکر مکتسب ہوئی۔ فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ اس شہر بھوپال میں آئے جہاں اسی دم موجود ہیں۔ اللہ تعالی نے اس جگہ ابواب رزق حوصلہ سے زیادہ بلا فکر و جستجو بتدریج اوقات وقتاً فوقتاً مفتوح فرمائے۔ اقران و اماثل پر ترقی بخشی۔ فقر کو غنا سے مبدل کر دیا۔ احتیاج کو بے نیازی سے بدل دیا والحمدللہ اس نعمت و تفضل الہی کا شکر یہ مجھ پر اور میرے اخلاف ذکور واناث پر واجب ہے، علاوہ میرے ان کو بھی رزق وافر عطا ہوا ہے۔

رسالہ وصایا سات (۷) فصول اور ستر (۷۰) وصایا پر مشتمل ہے۔

وصیت نامہ

الحمدللہ الذی اوصی عبادہ فی کتابہ المبین الوصایا تنفعھم فی الدنیا والدین والصلوۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد الذی

حث المسلمین علی الوصیۃ و فتحا لھم من الحیف فیھا وھو الصادق المصدوق الامین و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔

امّا بعد یہ چند وصایا و نصائح ہیں جو میں اپنی اولاد کو کرتا ہوں اگرچہ اس سے پہلے مقالہ فصیحہ وغیرہ میں بھی وصیت لکھدی ہے مگر وہ اور رنگ تھا۔ یہ دوسرا رنگ ہے۔ اس جگہ جو مقتضا اُس وقت کا تھا، وہ لکھا گیا تھا اور اس جگہ جو مقتضا اِس وقت کا ہے لکھا جاتا ہے۔ یہ وصایا و نصائح اگرچہ خاص میری اولاد کے لئے ہیں لیکن بعض مطالب اس کے بکار آمد جملہ مومنین بھی ہیں۔ یہ رسالہ مشتمل ہے ایک مقدمہ چند فصل، ایک خاتمہ پر۔ واللہ المستعان۔

مقدمہ

وجہ اس وصیت و نصیحت کی یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرن الوصیۃ اور حدیث ابن عمر میں آیا ہے۔ ما حق امری مسلم یبیت لیلتین و لہ شئ یرید ان یوصی فیہ الا و وصیتہ مکتوبۃ عند اللہ رواہ شیخین و اھل السنن لطرق۔
آیت کریمہ دلیل ہے وجوب وصیت بروقت حضور موت کہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ صرف دم احتمال حضور موت کا ہر جوان و پیر و مرد و عورت کو لگا ہوا ہے خصوصاً جو پیرِ سالخوردہ ہوگیا ہو۔ اس کے لئے زیادہ مدت حیات کی توقع نہیں ہے۔ وہ تو حکم چراغ سحری میں ہے۔

پرتوِ عمر چراغیست کہ در بزم وجود
بہ نشیمن مژہ بر ہم زدنی خاموش شد

حدیث میں آیا ہے کہ اعمار میری امت کی درمیان ساٹھ ستر کے ہیں اور اس مقدار سے متجاوز کرنیوالے کمتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ مصداق اس حدیث مشاہدہ ہوا کرتا ہے بلکہ بوڑھوں کی نسبت جوان اور جوانوں کی نسبت اطفال زیادہ مرتے ہیں۔ میری عمر کہ اب پنجاہ و ہفت سال کو پہونچی اور میں اکثر بیمار رہا کرتا ہوں عین وقت وصیت کا ہے۔ اور میں صاحب مال بھی ہوں دو پسر اور ایک دختر رکھتا ہوں جن کے فرائض تعلیم علم و رزق و نکاح وغیرہ سے فارغ ہو چکا ہوں اگرچہ ان کی مؤنت اب تک برادو شفقت مجھ پر ہے۔ مجھکو ضرور ہوا کہ اپنے مال میں وصیت کروں اور ان کی خیرخواہی

کر جاؤں۔ آگے وہ جانیں اوران کا کام۔ آیت شریف میں لفظ "خیر" کا آیا ہے مراد "خیر" سے مال ہے۔ زہری (امام) نے کہا ہے۔ اطلاق اس لفظ کا مال کثیر اور قلیل دونوں پر آتا ہے۔ تو اب وصیت کرنا کل مال میں واجب ہوا۔ تھوڑا ہو یا بہت، اور اکثر کا قول یہ ہے کہ اطلاق مال کثیر پر ہوتا ہے نہ قلیل پر۔ پھر اہل علم نے مقدار "خیر" میں اختلاف کیا ہے۔ کسی نے کہا سات سو دینار سے مال زیادہ ہو۔ بعض نے کہا ہزار دینار ہوں۔ کسی نے کہا پانچسو دینار سے زیادہ ہوں۔ بعض نے کہا ساٹھ دینار یا اس سے زیادہ ہوں۔ کسی نے کہا پانچسو سے ہزار تک ہوں۔ بعض نے کہا وہ مال کثیر جو فاضل عیال سے ہوئے اس مال کا نام "خیر" رکھا۔ اس سے آگاہ کیا ہے اس بات پر کہ استحباب وصیت کا مال طیب حلال میں ہے نہ حرام میں۔

اب میں کہتا ہوں کہ میرا مال کثیر ہے نہ قلیل اور طیب ہے نہ خبیث، یہ مال مجھکو اس طرح ملا ہے کہ رئیسہ عالیہ اہل بیت خاکسار نے مجھکو جاگیر پچھتر ہزار روپیہ سالانہ کی عطا کی ہے جس کی آمدنی بعد انتظام پیمائش کے مقدار جمع اصلی جاگیر سے فی الحال کچھ زیادہ ہے۔ جاگیر کا عطا کرنا مسلمان کو سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔ حضرتؐ نے بعض صحابہ کو زمین وغیرہ املاک جاگیر میں دی تھیں اس جاگیر میں جتنی رقوم سوائے ناجائز تھے[1] ان کی آمدنی ریاست میں واپس کر دی۔ اور اس کے عوض میں رئیسہ موصوفہ نے بہ طیب خاطر مجھکو قریہ علیحدہ عطا کیا، اب فقط وہ آمدنی باقی ہے، جو بظاہر شرح شریف ناجائز نہیں ہے۔ وللہ الحمد میں اس جاگیر سے مواسات اولاد کے اولاً اور اس کی زکوٰۃ وغیرہ سے مواساتِ مسافرین و طلبہ علم و امیدواران روزگار و محتاج اہل و مساکین و نحو ہم کے بحکم اوّل خویش بعدہٗ درویش ثانیاً کیا کرتا ہوں اور ہزار زبان و دل و ارکان سے شکر گذار اپنے منعم رزاق کا ہوں کہ اس نے مجھے یہ نعمت بلاکسی استحقاق و لیاقت محض اپنے فضل و رحمت سے بخشی ہے۔

اگرچہ درحقیقت بحکم وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا۔ اس کے شکر واجب سے قاصر محض ہوں لیکن کافر نعمت بھی نہیں ہوں۔ انشاءاللہ تعالیٰ حدیث شریف ابن عمرؓ

---

[1] سوائے ناجائز سے مراد وہ آمدنیات تھیں جو مواضعات جاگیر پر سرکانہ و چیچکانہ کے نام سے کاشتکاران سے وصول کی جاتی تھیں۔ (ق۔ح)

ہیں واسطے وصیت کی قید دو شب کی ارشاد فرمائی ہے یہ درحقیقت تقریب ہے نہ تحدید۔ لیکن تین شب تک تاخیر کرنا غائت تاخیر سمجھا گیا ہے و لہذا ابن عمرؓ نے فرمایا ہے۔ لم ابت لیلۃ منذ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم یقول ذالک الا و وصیتی عندی۔ اہل علم نے کہا ہے کچھ مستحب نہیں ہے کہ وصیت میں ساری اشیاء و امور مختصرہ کا ذکر کرے۔ بہر حال جمہور کے نزدیک وصیت کرنا مستحب ہے اور آیت و حدیث سے وجوب نکلتا ہے حاصل یہ ہے کہ وصیت کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی مندوب۔ جب کہ امید کثرت اجر کی ہو اور کبھی مکروہ ہوتی ہے اس کے عکس میں اور جس جگہ ہر دو امر یکساں ہیں، وہاں مباح ہوتی ہے اور کبھی حرام ہوتی ہے جب کہ اس میں کسی کو ضرر پہونچانا مقصود ہو ابن عباسؓ نے مرفوعاً اضرار فی الوصیۃ کو منجملہ کبائر کے لکھا ہے۔ رواہ النسائی و رجالہ ثقات۔

فصل (۱) قرآن کریم سے معلوم ہوا کہ وصیت سنت انبیا علیہم السلام ہے۔ و لہذا ہمارے حضرت نے بھی وقت وفات وصیت فرمائی تھی کہ نماز کو نگاہ رکھو اور ممالیک کے ساتھ سلوک حسن کرتے رہو الی غیر ذلک بلکہ خود اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو قرآن میں چند وصایا فرمائے ہیں۔ مراد مزید نگاہداشت ان امور موصی بہا کی ہے۔ وصایائے الہیہ رسالہ تخریج الوصایا من خبایا الزوایا بحوالہ سورہ کریمہ ترتیب وار فرزند صغیر میر علی حسن خاں نے لکھے ہیں:۔

ان وصایا کے ضمن میں وصایائے انبیا علیہم السلام بھی آگئے ہیں اور طرف وصیت مومنین کے بھی اشارہ فرما دیا ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم اولاً وصایائے الہیہ کی پابندی کریں۔ پھر وصایائے انبیا علیہم السلام کی۔ پھر وصیت مومنین کی۔ جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے کہ خیریت دارین و عافیت کونین اور مغفرت نشاتین اسی میں ہے بلکہ اگر اپنے وصایا پر اقتصار کریں تو پھر حاجت نہ کسی اور وصیت کی ہے اور نہ نصیحت کی لیکن اکثر خلق اس فائدہ عظمیٰ سے غافل و عاطل اور اپنے خیال باطل میں مختبط اور اس پر عامل ہے۔ وہ وصایا جو قرآن کریم میں بالفاظ و عبارات معجزہ تفصیلاً واجمالاً آئے ہیں گنتی ان کی اس جگہ لکھی جاتی ہے۔ اور حوالہ بسط کا تفسیر ترجمان القرآن و نحوہ پر ہے وہ وصایائے قرآنیہ اور مسائل ایمانیہ یہ ہیں۔

(۱) مسئلہ میراث (۲) تقوی اللہ عزوجل (۳) نہی اشراک باللہ کسی شے میں (۴) احسان کرنا ساتھ

والدین کے ۵ نہی قتل اولاد بخوف افلاس ۶ نہی قرب فواحش سے ظاہرۃً و باطناً ۷ نہی قتل نفس محرمہ سے مگر براہ حق ۸ نہی قرب مال یتیم مگر براہ نیک ۹ امر ایفاء کیل و میزان ۱۰ امر بعدل بات کہنے میں ۱۱ وفا بعہد خدا ۱۲ نہی طاعت والدین سے معصیت خدا میں ۱۳ امر بشکر ابوین اور صحبت رکھنا ان سے ساتھ معروف کے ۱۴ امر باتباع طریقہ اہل انابت اہل کتاب و سنت ۱۵ امر با قامت دین و عدم تفرق اس میں نہی مذہب سے بھی بدخول اولیٰ داخل ہے۔ ۱۶ نہی موت سے مگر اسلام پر ۱۷ امر با ایصاء وقت حضور موت ۱۸ امر بوصیت ندہات وقت وفات ۱۹ شہادت و عدل وقت وصیت ۲۰ وصیت نماز و زکوٰۃ کی مادام حیات ۲۱ تواصی بہ جبر و مرحمت ۲۲ تواصی بحق۔

یہ مسائل ہیں جن کی وصیت اللہ تعالیٰ نے سلین و مومنین کو قرآن میں فرمائی ہے۔ پس ہر ایک کو لازم ہے۔ حتی الاستطاعت پابندی ہر وصیت کی اپنے حق میں اور جملہ اخوان اسلام کے حق میں کریں۔ اگر باوجود امکان ہم ایسا نہ کریں گے تو جرم عدول حکمی ہم پر ثابت اور اسکی جزائے لازم و واجب ہو گی۔ الامین رحمہ اللہ تعالیٰ۔

فصل دوم۔ بعض صحابہ حضرتؐ سے طالب وصیت ہوتے تھے اور آپؐ انکو مناسب حال ان کے وصیت فرماتے تھے۔ اسی جگہ سے سلف صلحاء خلفاء اسلام و علمائے آخرت و صوفیہ کرام میں یہ سنت جاری تھی کہ وہ بھی اپنے اساتذہ و مشائخ و اکابر اسلام سے وصیت چاہتے تھے اور مادام الحیات اس پر استقامت کرتے۔ یہ استقامت فوق کرامت ہوتی ہے۔

برا ہل استقامت فیض نازل می شود مظہر
نمی بینی تجلی گرد کوہِ طور می گردد

یہ وصایائے نبویہ دواوین سنت مطہرہ میں مذکور ہیں۔ اگر یہ متفرق طور پر آئے ہیں۔ اس جگہ گنتی ہم ان کی لکھتے ہیں۔ یہ سب وصایا جوامع الکلم ہیں۔ ہر جملہ ان وصایا کا ایک دفترِ معرفت و حکمت ہے۔

۱۔ تقویٰ اللہ ۲ تلاوت قرآن ۳ ذکر اللہ ۴ طول صمت ۵ ترک کثرت ضحک ۶ سچی بات کہنا اگرچہ تلخ ہو ۷ ترک خوف ملامت درراہِ خدا ۸ باز رہنا لوگوں سے یعنی ان کی عیب جوئی میں

مشغول نہ ہونا ۹ ہر صبح و شام یا حیُّ یا قیومُ اعن برحمتک استغیث کہنا ۱۰ سبحہ کے بعد حسنہ کرنا ۱۱ کلمۂ شہادت کہنا کہ یہ افضل حسنات ہے۔ ۱۲ اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک بعد ہر نماز کہنا ۱۳ بستر پر جاتے وقت سورہ حشر کا پڑھنا ۱۴ اللھم اسلمت نفسی الیک تا آخر دعا کہنا وقت خواب کے ۱۵ آنا مجلس میں جب کوئی اچھی بات سنے اور نہ آنا مجلس میں جب کوئی امر مکروہ سنے۔ ۱۶ خالص کرنا دین کا واسطے اللہ وحدہٗ لاشریک کے لئے ۱۷ ہمیشہ نماز کو قائم رکھنا ۱۸ مال کی زکوٰۃ نکالنا ۱۹ رمضان کے روزہ رکھنا ۲۰ حج ادا کرنا ۲۱ عمرہ بجالانا ۲۲ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا ۲۳ ہمراہ حق کے رہنا ۲۴ جہاد کرنا ۲۵ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا ۲۶ صلہ رحم کرنا ۲۷ ہر ماہ میں تین روزہ رکھنا ۲۸ دو رکعت ضحیٰ پڑھنا ۲۹ وتروں سے پہلے پڑھنا ۳۰ نظر نہ کرنا طرف اس کے جو فوق ہے آپ سے بلکہ اس کی طرف جو کم درجہ ہے ۳۱ محبت رکھنا مساکین سے ۳۲ مساکین کے نزدیک رہنا ۳۳ کثرت کے ساتھ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھنا ۳۴ شریک نہ کرنا ساتھ خدا کے کسی شے کو ۳۵ عمل کرنا اللہ کے لئے اس طرح کہ گویا اس کو دیکھتا ہے ۳۶ اپنی جان کو مُردوں میں گننا ۳۷ اللہ کا ذکر کرنا نزدیک ہر شجر و حجر کے ۳۸ تدارک کرنا شبہ کا مخفی کا مخفی میں علانیہ کا علانیہ میں ۳۹ ترک کر دینا غصہ و غضب و خشم کا ۴۰ ناامید ہونا اس چیز سے جو لوگوں کے ہاتھ میں ہے ۴۱ دور رہنا طمع سے ۴۲ اپنی زبان سے بجز امر معروف کے کچھ نہ کہے ۴۳ ہاتھ نہ بڑھائے مگر طرف خیر کے ۴۴ ترک کرنا قیل وقال کا۔ یہ دفاتر مدونہ علم فروع و قیاس اسی قبیل سے ہیں ۴۵ ترک کرنا کثرت سوال کا ۴۶ نہی اضاعتِ مال سے ۴۷ دوست رکھنا موت کو اور بے فکر نہ ہو جانا اس سے ۴۸ ترک کرنا معاصی کا ۴۹ محافظت رکھنا فرائض کی ۵۰ ترک شرک باللہ ۵۱ نہی ترک نماز سے عمداً ۵۲ ترک شرب خمر ۵۳ ترک فرار از موت ۵۴ ترک عصیان والدین ۵۵ عدم وضع ؟ اہل کی ۵۶ انصاف کرنا ۵۷ کہنا سبحان اللہ العظیم وبحمدہ کا ۵۸ ترکِ کبر یعنی ردِ حق واحتقار مردم ۵۹ سچی بات کہنا ۶۰ عہد کا وفا کرنا ۶۱ امانت کا واپس کرنا ۶۲ ترک کرنا خیانت کا ۶۳ حفظ قرآن جاری کرنا ۶۴ یتیم پر رحمت کرنا ۶۵ نرم بات کہنا ۶۶ بدل سلام کرنا ۶۷ بازو نیچا کرنا یعنی متواضع و خاکسار ہونا ۶۸ تکبیر کہنا ہر بلندی پر ۶۹ جہاد کرنا راہ خدا میں ۷۰ عیب نہ لگانا لوگوں کو ۷۱ ایذا نہ دینا اور حقیر نہ کرنا ہم نشیں کو ۷۲ سمع وطاعت کرنا امیر کی اگرچہ غلام ہو ۷۳ تمسک کرنا ساتھ سنّت نبویہ و سنت خلفاء راشدین کے ۷۴ حذر کرنا محدثات امور سے ۷۵ نماز و ممالیک کا تحفظ کرنا ۷۶ میدان جنگ سے نہ بھاگنا ۷۷ موت

پر ثابت رہنا جب لوگ مرنے لگیں ۷۸ اپنے اہل و عیال پر نفقہ کرنا ۷۹ اعتصام کرنا ساتھ قرآن کے ۸۰ مرنا اس حال میں کہ خفیف الظہر ہو ۸۱ ترک کرنا نزاع کا امر میں ساتھ اہل امر کے ۸۲ اپنے اصحاب کی توقیر کرنا ۸۳ احسان کرنا بعد اساءت کے ۸۴ خلق کے ساتھ احسان کرنا ۸۵ ترک کرنا سوال کا لوگوں سے ۸۶ ترک کرنا خیانت کا امانت میں ۸۷ ترک کرنا قفا کا درمیان دو شخص کے ۸۸ زیارت کرنا قبور کی بغرض عبرت ۸۹ نہلانا مُردوں کو ۹۰ نماز جنازہ پڑھنا ۹۱ پاس بیٹھنا مساکین کے ۹۲ کھانا ساتھ مبتلا کے براہِ تواضع للہ تعالٰی ۹۳ پہننا سخت کپڑے کا کبھی کبھی نہ ہمیشہ ۹۴ آراستہ ہونا واسطے عبادت کے گاہ گاہ ۹۵ ترک کرنا تعذیب بالنار ۹۶ روزہ میں کنگھی و تیل لگا کر صبح کرنا ۹۷ قبول کرنا دعوت مسلمین کا ۹۸ نماز پڑھنا اہل قبلہ پر ۹۹ گواہی دینا اہل قبلہ پر ۱۰۰ نہانا جمعہ کے دن ۱۰۱ اول وقت جانا جمعہ کے دن ۱۰۲ ترک کرنا لغو و لہو کا جمعت میں ۱۰۳ ہمیشگی کرنا دو رکعت فجر پر ۱۰۴ ترک کرنا اسبال آزار کا ۱۰۵ ترک کرنا بے دنی کا ۱۰۶ شرمانا اللہ سبحانہ تعالٰی سے ۱۰۷ ترک کرنا لعن کا زندوں و مردوں کے ۱۰۸ تمسک کرنا ساتھ کتاب اللہ کے ۔

یہ سب ایکسو آٹھ وصایائے نبویہ ہیں ان کا پیرایۂ وصیت میں ارشاد فرمانا اگرچہ جواب میں بعض سائلین کے ہوں' دلیل واضح ہے ۔ مزید اہتمام اعانت ان اشیار و امور پر ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جس امر کی استطاعت ان امور میں سے اپنے اندر پائے اس کو حتی الامکان بجا لائے ہرگز ترک نہ کرے امتثال اس امر کا اور حذر اس نہی سے ایک کیمیائے سعادت دارین ہے اللھم وفقنا

مفتی صدرالدین اپنے شاگرد (نواب صاحب) کی سند میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"مولوی صدیق حسن صاحب قنوجی ذہن سلیم و قوتِ حافظہ و فہم درست و مناسبت تام با کتاب و مطالعۂ صحیح و استعداد تام دارند جملہ کتب معقول رسمیہ از منطق و حکمت و از علم دین اکثر از بخاری و چیزے از تفسیر بیضاوی و معاملات ہدایہ و فقہ و اصول فقہ و عقائد و ادب از فقیر اکتساب نمودند و مستعدانہ فہمیدہ خواندند و با وجود سعادت و رشد و صلاح و نیک نہادی و صفائی طینت و غیرت و اہلیت و شرم و حیا در اقران و اماثل خود ممتاز اند۔

(تراجم علمائے حدیث ہند از ابو یحییٰ امام خاں)

امام غزالی بحیثیتِ صوفی

ابوسلمان شاہجہان پوری

اسلامی تاریخ اپنے صفحات میں انسانی فضل وکمال کی بہت سی داستانیں رکھتی ہے۔ بڑے بڑے فلاسفہ ہیں جنہوں نے اس کائنات اور انسانی زندگی کے راز معلوم کرنے کی کوشش میں اپنی زندگیاں ختم کردیں۔ اولوالعزم سیاح ہیں، جنہوں نے دنیا کے مختلف خطوں کا پتہ چلانے اور حالات دریافت کرنے کے شوق میں زندگی کی راحتوں کو تج دیا تھا۔ بڑے بڑے مناظر و متکلم اور معقولی ہیں۔ جن کی حاضر جوابیوں، نکتہ آفرینیوں قوت استدلال اور زورِ بیان کا ایک عالم نے لوہا مانا ہے، ایسے مدرسین ہیں جن کی تعلیمی و تدریسی خدمات کا شہرہ افکارِ عالم میں پھیلا، بڑے بڑے مصنفین یا عزوشان نظر آتے ہیں جن کی گرانقدر تصنیفات نے صدیوں کی الٹ پھیر کے بعد بھی اہمیت نہ کھوئی اور دنیا کے علماء وفضلاء نے سر آنکھوں پر ان کو جگہ دی۔ جلیل القدر علماء ہیں جن کی اسلامی خدمات کو تذکرہ آتا ہے تو نگاہ عقیدت سے جھک جاتی ہے، پاک باطن صوفیاء کی دنیا سے بے نیازی اور مجاہدات کے حیرت میں ڈالنے والے قصے ہیں، وہ جسور و غیور صاحبانِ دعوت وعزیمت ہیں کہ راہِ حق میں جن کی سرفروشیوں، جاں سپاریوں اور عزیمت کا سنہرے حرفوں میں لکھا جانے والا باب کھلا، جن کے قدموں میں دنیا کی جاہ وحشمت تھی، راحتوں اور دلفریبیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے گئے تھے۔ لیکن ایک کلمۂ حق کے مقابلے میں ان کی غیرت علمی اور حمیت اسلامی نے اس ننگ کو گوارا نہ کیا، پائے حقارت سے اس جاہ وحشمت کو ٹھکرادیا اور ان کی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھا۔ لیکن اگر ہم کسی ایک ہی شخصیت کو تذکرے کے لئے منتخب کرنا چاہتے ہیں، جس میں مذکورہ بالا تمام طبقاتِ علماء کی تقریباً تمام خصوصیات موجود ہوں تو ابوحامد محمد بن محمد غزالیؒ کے سوا شاید ہی ایسی جامع صفات شخصیت ملے گی۔

امام محمد غزالی بیک وقت ایک ماہر اصولی، دکنہ سنج مناظر اور متکلم، بالغ نظر فلسفی کامیاب مدرس، انسانی نفسیات کے ماہر، پاک باطن صوفی، تصوف کے رمز شناس حق و اطمینان و سکون قلب کی تلاش میں گھر بار کو تج دینے والے اور زندگی کی راحتوں اور آسائشوں سے بے نیازانہ منہ پھیر لینے والے دنیادی وجاہتوں اور حشمتوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دینے والے اللہ کے عشق کے سودائی، اس کی محبت میں سرشار اور مقام زہد کے حقیقی آشنا تھے۔ شیخ فراغیؒ نے ان کی شخصیت کی اس جامعیت کی نسبت فرمایا تھا کہ۔

"جب مختلف علماء کا ذکر آتا ہے تو اس سے ذہن ان خصوصیات کی طرف منتقل ہوتا ہے جو ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، یا جن کی وجہ سے ان کو دوسروں پر امتیاز حاصل ہے مثلاً جب ابن سینا اور فارابی کا نام آئے گا تو ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ حیثیت نکھر کر قلب و ذہن کے سامنے آجائے گی ابن عربی کا تذکرہ ہوگا تو اس انداز کا تاثر ابھرے گا کہ کسی بلند پایہ صوفی کے حالات بیان کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح بخاری، مسلم امام احمد بن حنبل کا تذکرہ ہوگا تو معلوم ہوگا حفظ و صدق کے اونچے پیمانوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو معرفت رجال میں ملکۂ راسخہ رکھتے تھے۔ لیکن غزالی کا معاملہ اس سے جدا ہے ان کا نام آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک ہی آدمی کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ بیک وقت کئی اشخاص زیر بحث ہیں جن میں کا ایک ایک علم و فضل کی مستقل بالذات اقلیم کا تاجدار ہے"

امام محمد غزالی ۴۵۰ھ میں طوس کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ان کے والد صوفی مشرب اور مذہب صفت بزرگ تھے ان کے ایک بھائی احمد غزالی بھی تھے۔ جو اپنے وقت کے مشہور صوفی تھے۔ وعظ و ارشاد کے علاوہ تصنیفی و تعلیمی ذوق بھی تھا۔ ان کی محافلِ وعظ و تلقین میں لوگ بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ ان کی تصانیف میں امام محمد غزالی کی احیاء العلوم کی شرح اور کئی دیگر رسائل کا پتہ چلتا ہے۔ امام صاحب کی عدم موجودگی میں کئی سال تک نظامیہ میں طلباء کو درس دیتے رہے۔

امام غزالی جس زمانے میں پیدا ہوئے بغداد سے نیشاپور تک مدارس کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ گھر گھر علم کا چرچا تھا۔ زیادہ توجہ فقہ، اصول فقہ اور اختلاف مذاہب پر دی جاتی تھی۔ اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے اور اپنی استعداد و صلاحیت کا لوہا منوانے کے لئے مناظرہ و کلام کے میدان تھے۔ امام صاحب کو ایک بہترین علمی دور ہی میسر نہیں آیا بلکہ ان کی خوش قسمتی نے ان کو وقت کے بڑے بڑے علماء کا شاگرد ہونے

ادوان سے استفادہ کرنے کا شرف بھی بخشا۔ احمد بن محمد الرازکانی جو اپنے وقت کے جید عالم تھے، امام ابونصر الاسمعیلی جن کے درس کا شہرہ دور دور تھا اور امام الحرمین علامہ ضیاء الدین الجوینی جن کو استاد شرق و غرب کے نام سے پکارا جاتا تھا، امام غزالی نے ان حضرات سے مختلف علوم میں استفادہ کیا۔

امام محمد غزالی کی ذہانت، طباعی اور ذکاوت کی شہرت ان کی طالب علمی کے زمانہ ہی میں پھیلنے لگی تھی۔ علامہ جوینی کے فیوض صحبت سے دامن بھر کر نیشاپور سے نکلے تو ان کی شہرت وزیر السلطنت نظام الملک کے دربار تک پہنچ چکی تھی اس نے امام صاحب کی بڑی آؤ بھگت کی۔ مدرسہ نظامیہ کی مسند تدریس پیش کی گئی۔ یہاں سے ان کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے گرد بیک وقت تین تین سو جید علما کا حلقہ رہتا تھا۔ سلاطین سلجوقیہ اور عباسیہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ تقریباً دس سال تک وہ اس منصب جلیلہ پر فائز رہے لیکن اس دوران میں ان پر ایک ایسا دور بھی آیا جب کہ وہ ایک مدت شکوک و شبہات میں مبتلا رہے، فرماتے ہیں۔

" جب اس طرح کے اندیشے دل میں ابھرے اور اس انداز کے جذبات شکوک و شبہات کا باعث ہوئے تو میں نے ہر چند چاہا کہ اس بیماری کا علاج کروں لیکن یہ نہ ہو سکا کیونکہ اس بیماری کا علاج تو دلائل ہی سے ممکن ہے اور دلیل اس پر موقوف ہے کہ اولیات سے مرکب ہو مگر اولیات جب اعتبار کھو بیٹھے تو دلیل قائم کرنا اور ثبوت مہیا کرنا سخت دشوار ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" لیکن یہ تشکیک ذہن کی ایک کیفیت اور قلب کے ایک اضطراب سے تعبیر تھی۔ نطق و مقال میں اس کا اعتبار نہیں ہوا تھا (سرگذشت غزالی ص ۱۱۵/۱۱۶) جب امام غزالی کو اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑا تو ان کے سامنے تلاش حقیقت کے چار راستے تھے۔

۱۔ متکلمین کا راستہ، یہ لوگ اپنے آپ کو اہل الرائے اور اہل النظر کہتے ہیں۔ ۲۔ باطنیہ کا طریقہ تعلیم، یہ لوگ امام معصوم پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ امام معصوم ہی سے انوار و معارف کا اکتساب ممکن ہے۔ ۳۔ فلاسفہ کا طریق فکر و استدلال۔ یہ خیال کرتے ہیں کہ تمام حقائق کا ادراک عقل کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے، یہ لوگ منطق و برہان کے شکار ہیں۔ ۴۔ چوتھا اور آخری گروہ ان کے سامنے صوفیاء کرام کا آیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کے خاص مقرب ہیں اور مشاہدہ و

مکاشفہ سے براہ راست بہرہ مند ہیں۔ امام غزالی فرماتے ہیں۔

"جب میں نے ان چاروں قسموں پر غور کیا تو دل نے کہا حق و صداقت کی راہ ان چاروں ہی میں منحصر ہوگی ان سے باہر سچائی کا امکان نہیں انہیں میں وہ لوگ پائے جاسکتے ہیں جن میں حقیقت کی تلاش و جستجو کا جذبہ کارفرما ہے۔ اگر ان گروہوں کا دامن حق و صداقت کی طلب و یافت سے تہی رہا تو پھر اس کو پالینے کا موقع اور کہاں میسر آسکتا ہے؟ ...."

یہ سوچ کر میں نے طے کیا کہ ان چاروں فرقوں کے عقائد کی چھان بین کرنا چاہیئے اور ان کی راہ پر چند قدم چلنا چاہیئے کہ ان کے پاس کیا کچھ ہے"۔ چنانچہ امام صاحب نے ان گروہوں کو موضوع بنایا، ان کے افکار و عقائد کا جائزہ لیا۔ ان کے دعاوی کو جانچا پرکھا اور پھر اس کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کی۔ فرماتے ہیں۔ "میں نے ہر ہر گروہ کے عقائد کی چھان بین کی اور ہر ہر مذہب کے اسرار معلوم کرنے کی تگ و دو کی تاکہ اہل حق اور اہل باطل میں خط امتیاز کھینچ سکوں۔ اور یہ جان سکوں کہ سنی کون ہے اور بدعتی کا اطلاق کس پر ہوتا ہے۔ میں نے نہ کسی باطنی کو اس کی باطنیت کا جائزہ لئے بغیر چھوڑا اور نہ کسی ظاہری کو یہ جانے بغیر معاف کیا کہ اس کی ظاہریت کا حاصل کیا ہے۔ اسی طرح نہ میرے ہاتھ سے کوئی فلسفی ہی چھوٹا اور نہ متکلم۔ فلسفی کا فلسفہ جاننے کی کوشش کی اور متکلم کے بارے میں یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس کا کیا مقصد ہے اور اس کی قیل و قال اور بحث و جدال کن امور تک وسیع ہے۔ صوفی اور عابد کو بھی پرکھا تاکہ اندازہ ہوسکے کہ اس کی پاک بازی کن چیزوں میں منحصر ہے اور اس کی عبادت کے کیا ثمرات ہیں؟ اس طرح میرے حلقہ تنقید میں زندیق و معطل تک آگئے"۔

سب سے پہلے امام غزالی نے علم الکلام کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کے بعد فلسفہ و حکمت، پھر باطنیہ کی تعلیمات اور سب سے آخر میں صوفیاء کے افکار و احوال سے علماً و عملاً واقفیت بہم پہنچائی اور پھر پوری ذمہ داری کے ساتھ ایک شناسا اور واقف احوال و افکار کی حیثیت سے تصوف اور صوفیاء کرام کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ہمارے پیش نظر موضوع کا تعلق اسی آخری گروہ کے بارے میں امام غزالی کی رائے اور ان کے خیالات سے ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ امام صاحب سب سے پہلے متکلمین، پھر فلاسفہ اور پھر باطنیہ کی طرف متوجہ ہوئے لیکن ان کے افکار و دعاوی انہیں مطمئن نہ کرسکے۔ امام غزالی نے اپنی کتاب

"المنقذ من الضلال" میں اپنے فکر و مطالعہ کی سرگزشت بیان کی ہے اور اپنی دیگر تصانیف میں ان فرقوں کی تعلیمات اور ان کے افکار کا رد کیا ہے۔ ان تمام علوم کے مطالعہ کے بعد وہ صوفیاء کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے ان کتابوں کا مطالعہ کیا جن میں اسرار و رموز تصوف کی نقاب کشائی کی گئی تھی۔ لیکن اس ابتدائی مطالعہ کے دوران ہی میں انہیں معلوم ہو گیا کہ تصوف کی راہ صرف علم کی راہ نہیں بلکہ علم و عمل دونوں کی راہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ نفس کی دشوار گذار گھاٹیوں کو عبور کیا جائے۔ اخلاق ذمیمہ کو ترک کر کے دل کو اس لائق ٹھہرایا جائے کہ اس میں غیر اللہ کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہ رہے اور اللہ کے ذکر اور یاد کے ساتھ اس کی آبادی اور زینت کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے بغیر تصوف کے لطائف اور خصوصی اسرار کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ امام صاحب نے صوفیاء کی صحبت سے بھی استفادہ کیا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حضرات اصحاب اقوال نہیں اصحاب احوال ہیں۔ اب جہاں تک سماع و تعلیم کے فوائد کا تعلق تھا، وہ اپنا دامن بھر چکے تھے لیکن ذوق و سلوک کی منزل ابھی دور تھی اور اس منزل میں ایک قدم بھی نہ اٹھایا جا سکتا تھا جب تک قلب کو تمام علائق دنیوی اور نفس کو خواہشات سے پاک نہ کر لیا جائے۔ اس اعتبار سے انہوں نے اپنے احوال کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نفس خواہشات میں مبتلا اور قلب علائق دنیوی میں گھرا ہوا ہے۔ طلب حق کا تقاضا یہ تھا کہ تمام علائق کو قطع کیا جائے۔ خواہشات پر قابو پایا جائے اور پوری توجہ اور ہمت سے اللہ کی طرف عنانِ التفات پھیری جائے لیکن یہ مقام آسانی سے میسر آنے والا نہ تھا۔ اس کے عزت و جاہ کو ٹھکرانا پڑتا ہے۔ مال و دولت کی محبت اور ہر طرح کے لگاؤ اور شور و غل سے دل کو ہٹانا پڑتا ہے۔ امام صاحب کے لئے اگرچہ موانع راہ کم نہ تھے لیکن انہوں نے سب پر قابو پایا۔

کوئی زنجیر نہ تھی جو اس طالب صادق کے پیروں میں ڈالی جاتی۔ کوئی تعلق و علاقہ نہ تھا جو اس کے ارادہ کو بدل دیتا یا توجہ کو کسی دوسری جانب پھیر دیتا۔ وہ مسند تعلیم و تدریس سے دامن جھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ مداحوں اور عقیدت مندوں کی مدح سرائیوں اور عقیدت کیشیوں کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ مال و دولت کو بقدر کفالت بچوں کے لئے چھوڑ کر باقی سب اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ اگرچہ زندگی کی راحتوں اور دلفریبیوں نے اپنے جال پھیلائے لیکن یہ طالبِ صادق بیک جنبش عزم و حرکت عمل ہر دام سے نکل گیا۔ راہِ سلوک کی یہ شرط اول ہے کہ قلب کو ماسوا اللہ سے پاک کر لیا جائے

اور دل کو اللہ کے ذکر میں مستغرق رکھا جائے۔

یہ سوچ کر وہ بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ دو سال تک شام میں مجاہدہ وریاضت میں مشغول رہے یہاں سے بیت المقدس کا رخ کیا۔ ایک مدت تک وہاں خلوت کی نعمتوں سے بہرہ مند اور عبادت میں مصروف رہے۔ پھر حج کے شوق نے دل میں کروٹ لی اور مکہ اور مدینہ کے فیوض و برکات سے مشرف ہوئے اس کے بعد وطن لوٹ آئے۔ جس مقصد کے لئے انہوں نے یہ سفر کیا تھا، اس میں مجاہدہ وریاضت کی کس منزل سے گزرے تھے، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں۔

"بغداد چھوڑنے کے بعد میں نے شام کا رخ کیا۔ اور تقریباً دو سال تک یہاں رہنا پڑا۔ ان دو سالوں میں عزلت وخلوت اور مجاہدہ وریاضت شب و روز کا شغل تھا۔ غرض یہ تھی کہ تزکیہ نفس کی نعمت کو پاؤں۔ اخلاق سنوریں اور قلب اللہ کے یاد کے لئے یکسوئی حاصل کرلے۔ یہ لائحہ عمل وہی تھا جس کو میں نے صوفیا سے سیکھا تھا۔ میرا یہ روزانہ کا معمول ہو گیا تھا کہ دمشق کی ایک مسجد کے منارہ پر چڑھ جاتا اور دروازہ بند کر کے ذکر وشغل میں دن بھر لگا رہتا۔ پھر یہاں سے بیت المقدس کو منتقل ہو گیا اور مقام صخرہ میں ہر روز جا کر عبادت میں مشغول رہنے لگا۔"

بیت المقدس سے فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے حجاز تشریف لے گئے بعدہٗ وطن تشریف لائے لیکن اب دل ذوق وسلوک کی جس کیفیت سے آشنا ہو چکا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ عزلت وخلوت کا انتظام کیا جائے۔ فرماتے ہیں مجبوریوں کے باوجود تصفیہ قلب کی خاطر خلوت وعلیحدگی کا انتظام کرتا۔ اور جس طرح بھی بن پڑا ذکر و فکر اور خلوت وعزلت کے لمحوں سے استفادہ کرنے میں کوتاہی نہ ہونے دی (سرگزشت غزالی ص ۱۵۹، ۱۶۰)

امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس کشاکش اور خلوت ومراقبہ پر دس سال گذر گئے اس عرصہ میں ایسے ایسے امور کا انکشاف ہوا کہ ان کا شمار ناممکن ہے۔ اس مرحلہ پر صرف اس قدر بتاؤں گا جن کا جاننا مفید ہو۔

مجھے قطعیت کے ساتھ معلوم ہوا کہ صوفیاء ہی کا گروہ ہے جو خصوصیت سے اللہ کی راہ کا رہرو ہے۔ انہیں کی سیرت سب سے بہتر ہے انہیں کا طریقہ سب سے صاف ہے اور انہیں کے اخلاق زیادہ پاکیزہ اور بلند ہیں۔ بلکہ اگر تمام عقلاء وحکماء کی عقل وحکمت کو جمع کر لیا جائے اور وہ واقفان

شریعت کے اسرار وحکم کو بھی ملا لیا جائے تاکہ ان سے بہتر سیرت کی تشکیل ہو سکے تب بھی ان کے اخلاق وسیرت کے ڈھانچہ کو بدلنا ضروری نہ ہوگا۔ کیونکہ صوفیاء کی تمام حرکات وسکنات چاہے ظاہری ہوں چاہے باطنی، مشکوٰۃ نبوت ہی سے مستنیر ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر کوئی روئے زمین پر اس لائق نہیں کہ اس سے روشنی حاصل کی جائے "

آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"جس نے تصوف کی بہرہ مندیوں سے اپنا دامنِ طلب نہیں بھرا اس نے حقیقت نبوت کی بو بھی نہیں سونگھی اور بجز نام کے اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ لیکن تصوف کی بہرہ مندیاں حاصل نہیں کی جاسکتیں جب تک کہ صوفیاء کرام کی صحبت میں نہ بیٹھا جائے اور ان کے طریق پر نہ چلا جائے۔ یہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جو اس راہ میں امام غزالی کو میسر آئی۔ فرماتے ہیں۔ "صوفیاء کرام کے ساتھ نشست وبرخاست رکھنے اور ان کے طریق پر چلنے سے مجھ پر جو سب سے بڑی چیز منکشف ہوئی وہ نبوت کی حقیقت اور اس کے خواص ہیں "

اس کے بعد امام صاحب نے ثابت کیا ہے کہ نبوت عقل وشعور سے آگے کا مقام ہے جس کا ادراک ہم خواہ حاسہ ومدرکہ سے نہیں کر سکتے۔ البتہ خود ہمارے اندر اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی چیزیں رکھ دی ہیں جو برابر ہمارے مشاہدہ وتجربہ میں آتی ہیں جن سے نبوت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے آپ نے اس موقع پر خواب ورویاء کی مثال دے کر نبوت کو ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ خواب ورویا کے سوا نبوت کی تصدیق کا کوئی عملی ذریعہ نہیں۔ یا پھر پیغمبر کے حالات زندگی اس کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں بس نبوت کیلئے ثبوت بہم پہنچا دیتی ہیں، خواصِ نبوت تک اُن کے ذریعہ رسائی ممکن نہیں۔ لیکن ایک سالک کو سلوک کی ابتدائی منازل ہی میں ایسے ایسے مشاہدات او تجربات ہوتے ہیں کہ پھر اسے نہ خواب کے نمونہ اور تمثال کی ضرورت پڑتی ہے نہ عقلی دلائل کی۔ امام صاحب فرماتے ہیں۔

"اس نمونہ اور تمثال کو پالینے کے لئے زیادہ ریاضت کی ضرورت نہیں۔ یہ سلوک کی ابتدائی منزلوں میں حاصل ہو جاتا ہے اور اتنے ہی سے ایک طرح کے ذوق کی چاشنی سے سالک آشنا ہو جاتا ہے اور ان امور نبوت کی تصدیق سے بہرہ مند ہو جاتا ہے جن کی تصدیق عقل وقیاس آرائی سے ہونیوالی نہیں۔ غور کیجئے گا تو تنہا یہی خصوصیت نبوت پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے "

اور یہ بات خود تصوف کی عظمت اور اس کی ضرورت واہمیت کے ثبوت کے لئے بھی کافی ہے جب سالک سلوک کی ابتدائی منزلوں سے آگے بڑھتا ہے تو اس پر خواص نبوت بھی منکشف ہو جاتے ہیں۔ خواص نبوت تک رسائی نہ عقل کے ذریعے ممکن ہے نہ کوئی نمونہ و تمثال یہاں مفید ہو سکتا ہے یہاں تک صرف ذوق تصوف ہی رہنمائی کرتا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں۔

"اس کے سوا جو نبوت کے خواص ہیں، ان کا علم صرف اس ذوق ہی سے حاصل ہو سکتا ہے جو جادۂ تصوف پر چلنے سے حاصل ہوتا ہے۔"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا امام غزالی کے واردات تھے یہ سوال ابھی باقی ہے کہ علمی نقطۂ نظر سے تصوف کی کیا قدر و قیمت اور علوم ظاہری کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت ہے۔ انہیں ہی کے الفاظ میں ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی۔

جس طرح صوفیاء کرام کو ارباب قلوب، اصحاب احوال اور علمائے باطن بھی کہا جاتا ہے اسی طرح تصوف کا دوسرا نام علم آخرت یا علم باطن بھی ہے۔ اس کے مقابلے میں علوم ظاہری ہیں جن میں فقہ و معقولات وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ علم باطن کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ جیساکہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ "وہ علمائے ظاہر جنہیں زہد و ورع کا ذوق بھی عطا ہوا ہے، ہمیشہ ارباب قلوب کے مداح رہے ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ شیبان الراعی کے سامنے اس ادب و احترام سے کے ساتھ بیٹھتے تھے کہ جیسے مکتب میں کوئی بچہ استاد کے سامنے بیٹھتا ہے اور مختلف مسائل کے بارے میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ جیسا جلیل القدر امام اور بدوی سے یوں مسائل پوچھے تعجب ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ان هذا وفق لما اغفلناه، اسے کچھ ایسی چیزوں سے بہرہ ملا ہے جس سے ہم غافل رہے۔ احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ اور یحییٰ بن معین برابر معروف کرخیؒ کے پاس آتے جاتے حالانکہ علم ظاہر میں یہ ان کے پایہ کے نہ تھے۔"

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علوم ظاہر اور علوم باطن میں کسی قسم کا اختلاف ہے اس کی وجہ شاید بعض علماء ظاہر کا تشدد اور تصوف کی مخالفت ہے یا بعض جاہل صوفیاء کا علماء ظاہر کے متعلق سخت رویہ۔ لیکن واقعتاً دونوں قسم کے علوم میں کوئی تضاد اور کوئی مخالفت نہیں۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ علماء ظاہر و باطن کے متعلق یہ قول بالکل صحیح ہے۔

علماء الظاھر زینۃ الارض والملک — علماء ظاہر زمین اور ملک کی زینت ہیں اور
وعلماء الباطن زینۃ السماوٰ والملکوت — علماء باطن سے آسمان وملکوت کی رونق ہے
ان کے نزدیک دونوں سے استفادہ کیا جانا چاہیئے لیکن اس میں وہ ایک ترتیب کے قائل ہیں یعنی پہلے علم حدیث حاصل کیا جائے پھر تصوف کی طرف توجہ کی جائے۔ اس کی ضرورت کے ثبوت کے لئے انہوں نے حضرت جنید اور ان کے شیخ سری رحمتہ اللہ علیہ کے ایک واقعہ سے اور حضرت سریؒ کی جنیدؒ کو نصیحت اور دعا سے استدلال کیا ہے۔ حضرت سری نے جنید کو دعا دی تھی کہ
جعلک اللہ صاحب حدیث صوفیا — اللہ تمہیں صاحب حدیث صوفی بنائے
ولا جعلک صوفیاً صاحب حدیث — ایسا صوفی نہ بنائے جو صاحب حدیث ہو
پھر اس کی وضاحت فرماتے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ جو شخص پہلے حدیث وعلم سے اپنی پیاس بجھا لیتا ہے اور پھر تصوف سے سیرابی حاصل کرتا ہے وہ کامیاب رہتا ہے اور جو علم حاصل کئے بغیر اس میدان میں قدم رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا خطرہ مول لیتا ہے۔

لیکن ابھی یہ سوال تشنہ ہے کہ آخر تصوف یا علم آخرت ہے کیا؟ یہ علم کن چیزوں سے عبارت ہے؟ اگرچہ یہ چیز آگے چل کر جہاں ہم علم مکاشفہ اور علم معاملہ کی تعریفات اور ان کے حدود کے بارے میں امام غزالی کے افکار پیش کریں گے، بوضاحت آرہی ہے لیکن یہاں ہم بالاختصار ان کے الفاظ میں اس علم کے موضوع کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں۔

"علم آخرت سے ہماری مراد ہے کہ قلب کو پاک کرنے اور چمکانے کا فن سیکھا جائے۔ کیونکہ یہ آئینہ ایسا ہے کہ اس پر سے جہاں گرد وغبار دور ہوا اور یہ چمکا، حجاب اٹھ گیا اور اللہ تعالےٰ کی صفات وافعال کا علم اس میں اپنا عکس ڈالنے لگا۔ دل کا یہ آئینہ کیونکر پاک ہوتا ہے اور کب اس لائق ہوتا ہے کہ حقائق اشیاء اس پر اپنا پرتو ڈالیں ..... یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ جس قدر انسان شہوات وخواہشات کی پیروی سے اپنا دامن بچاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتا ہے اور اپنے نفس کو حق تعالےٰ کے روبرو کرتا ہے، اسی نسبت سے اس پر معارف وحقائق کے دروازے کھلنا شروع ہو جاتے ہیں لیکن دلوں کو چمکانے اور صیقل کرنے کا یہ علم کتابوں میں مدوّن نہیں اور

جن کو یہ علم حاصل ہے وہ اس وقت تک کسی کو نہیں بتاتے جب تک اس کی صلاحیت اور اہلیت سے وہ پوری طرح مطمئن نہ ہو جائیں۔ اس حدیث میں اس گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

علم کی ایک ایسی قسم بھی ہے جو دلوں میں پنہاں رہتی ہے اور اس کو سوائے اہل معرفت کے اور کوئی نہیں جانتا، سو جب وہ اس کا اظہار کریں تو وہی لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جو اللہ تعالےٰ کے بارے میں دھوکے میں ہیں۔ تم ایسے عالم کی تحقیر نہ کرو جس کو اللہ تعالےٰ نے اس علم سے نواز رکھا ہے۔ کیونکہ جب اس نے اس علم کو عطا کر کے اس کی عزت افزائی کی ہے تو تم تحقیر کرنے والے کون ہو؟

(افکار غزالی ص۱۷۱)

علوم آخرت کے اقسام کے بارے میں امام صاحب فرماتے ہیں کہ اتنا سمجھ لیجئے کہ ان کی موٹی موٹی دو قسمیں ہیں۔ (۱) علم مکاشفہ (۲) علم معاملہ۔ امام غزالی نے دونوں اقسام کی جو تعریف کی ہے اس میں تصوف کی پوری حقیقت اور اس کی تعریف اور موضوع کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ موضوع کی اس وضاحت کے بعد کسی انصاف پسند کے لئے اعتراض و مخالفت کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ علم مکاشفہ علم باطن کا دوسرا نام ہے اور یہ کہنا کہ یہ علوم کی غرض و غایت ہے، ذرہ بھر بھی مبالغہ پر مبنی نہیں۔ چنانچہ ایک عارف کا قول ہے کہ "جس شخص کا اس میں حصہ نہیں اس کے بارے میں سوء عاقبت کا اندیشہ ہے اور اس حصہ کی ادنیٰ مقدار جو ہر مسلمان میں ہونا چاہیئے یہ ہے کہ اس کی اہمیتوں کو تسلیم کیا جائے اور جو گروہ اس علم سے بہرہ مند ہے، اس کو مانا جائے۔ اس علم کی ایک شرط بھی ہے، اس کے بغیر اس کا تحقق نہیں ہو پاتا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کبر و بدعت کے مصائب سے اپنے دامن عمل کو بچائے رکھے۔ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ جس شخص کے دل میں دنیا کی محبت ہو اور جو خواہشات نفس پر اصرار کرنے کا عادی ہو، وہ اس علم کی برکات سے فائدہ اٹھانے کے لائق نہیں۔ اور اس سے محروم رہنے کی کم از کم عقوبت یہ ہے کہ انسان ذوقِ آخرت سے محرومی اختیار کرے۔

" یہ صدیقین و مقربین کا علم ہے اس سے باطن و قلب میں ایک طرح کا نور پیدا ہو جاتا ہے، بشرطیکہ تزکیہ و تطہیر کی ضروری منزلیں طے کر لی جائیں اور قلب کو ذمائم اخلاق سے پاک کر لیا جائے۔ یہ نور جب دل کی گہرائیوں میں ابھرتا ہے تو انسان پر حقیقی معرفت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور پہلے جن چیزوں کے صرف نام ہی سے یہ آشنا ہوتا ہے، اب ان کی حقیقت اور معنی کا بھی اس پر انکشاف ہونا شروع ہو جاتا ہے

اب یہ اس نور کی وساطت سے جاننے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کن اسرار کی حامل ہے، اس کی صفات کا کیا عالم ہے، اور اس کا کائنات سے کیا تعلق ہے؟ دنیا کی حقیقت کیا ہے اور یہ کیونکر عقبیٰ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے، نبی کسے کہتے ہیں اور نبوت و وحی کس چیز سے تعبیر ہے؟ فرشتے کیونکر اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آتے ہیں اور انبیاء کو کس طرح زمین و آسمان کی بادشاہت کا علم ہو جاتا ہے؟ اب یہ اس آویزش سے بھی باخبر ہو جاتا ہے جو خود اس کے دل کے اندر بپا ہوتی ہے اور اپنی چشم معرفت سے دیکھنے لگتا ہے کہ عساکر شیطان ملائکہ رحمانی سے کیونکر دست و گریباں ہوتے ہیں؟ ملائکہ کی تحریک کیا شے ہے اور شیطان کی ترغیب کسے کہتے ہیں؟ آخرت کی پہچان کیا ہے اور جنت و دوزخ کا عرفان کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ اب اس پر عذاب قبر، پل صراط اور میزان وغیرہ کی حقیقتیں خود بخود واضح ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

جنت و دوزخ اور عقبیٰ و آخرت کے مسائل کی تعبیر میں اہل ظاہر میں اختلاف موجود ہے اجر و ثواب کی صورت کہ حواس ظاہری کی وہاں تک رسائی نہیں لیکن علم مکاشفہ ہی ہے جس سے ان تمام اشیاء کا حقیقی مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے اور اس طور سے چیزیں منکشف ہوتی ہیں گویا ان کو جسم کی ظاہری آنکھ سے دیکھا جا رہا ہے۔

علم آخرت کی دوسری قسم علم معاملہ ہے اس کے بارے میں امام صاحب فرماتے ہیں علم معاملہ کے معنی یہ ہیں کہ احوال قلب سے تعرض کیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ کیا کیا اخلاق و عادات خوب اور محمود ہیں۔ اور کن سے احتراز لازم ہے۔ اور اگر کوئی شخص سوء اخلاق کا مریض ہو تو یہ جاننا بھی اس کے علم کے دائرہ بحث میں ہے کہ معالجہ کی کیا کیا شکلیں ہیں۔

عمدہ اور بہترین اخلاق جن کا حصول ضروری ہے، یہ ہیں۔ صبر و شکر، خوف و رجاء، زہد و تقویٰ، قناعت و سخاوت، اللہ تعالیٰ کے تمام احسانات کا احساس، اس کے ساتھ حسن ظن، خلق اللہ کے ساتھ اچھا معاملہ اور صدق و اخلاص وغیرہ۔

اور جن کی مذمت آئی ہے اور جن سے پرہیز کرنا واجب ہے وہ اس انداز کے ہیں جیسے۔ فقر و افلاس کا دھڑکا لگا رہنا اور جو چیز میسر ہو اس سے خفا اور بیزار رہنا، کیونکہ حسد و کینہ، دھوکا اور طلب جاہ اپنی تعریف کا خواہاں اور طالب ہونا، دنیا میں زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی آرزو رکھنا، کبر و ریا، غضب و عداوت اور طمع و بخل یا خواہشات کی فراوانی اور غرور۔ اغنیاء کی تعظیم و احترام اور فقہاء

کی توہین، تنافس و مباہات، حق سے اعراض اور لایعنی باتوں میں شغف۔ زیادہ بات چیت اور گفتگو کی عادت، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے سامنے بن سنور کر آنا، مداہنت، اپنے عیوب سے غافل رہنا اور دوسروں کے نقائص کا کھوج لگانا۔ دل سے خشیت و خوف کا زوال، اپنے لئے انتقام کا شدید جذبہ اور حق کے لئے غیرت کا فقدان وضعف۔ یہ اور ان کی طرح کئی اور عادتیں ایسی ہیں جو اعمال مذمومہ کا باعث ہوتی ہیں اور دل میں ان کی وجہ سے فواحش و منکرات کی بیماریاں جڑ پکڑتی ہیں۔"

امام غزالی نے علم المعاملہ کو "اخلاق و عادات کی اصلاح کا علم" سے تعبیر کیا ہے ان کے نزدیک یہ علم فرض عین ہے اور اس سے روگردانی ہلاکت و بربادی کا موجب۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ "ہمارے نزدیک جہاں تک علم المعاملہ، اخلاق و عادات کی اصلاح کا تعلق ہے، فرض عین ہے اور اس سے روگردانی اسی طرح ہلاکت و بربادی کا موجب ہے جس طرح اعمال ظاہرہ سے اعراض فقہاء کے نزدیک تباہی کا سبب ہے۔" (افکار غزالی ص۱۷۵)

یہ تھے تصوف کے بارے میں امام غزالی کے تصورات بلکہ یقینیات یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ موصوف جو ابتدا میں ایک کامیاب مناظر و متکلم تھے اور علوم ظاہریہ کی بہت سی خصوصیات و کمالات کے حامل تھے۔ تشکیک و تذبذب میں مبتلا رہے۔ اس چیز نے ان کو مختلف گروہوں کے علوم و افکار کی تحقیق پر متوجہ کیا۔ تصوف سے ان کو خاص شغف پیدا ہوا۔ ذوق و سلوک کی منازل طے کیں اور جن اولیات کے یقین کے لئے نہ فلسفہ کے دامن میں کچھ ملا۔ نہ باطنیہ کے علوم و عقائد ان کی اس بیماری کا مداوا کر سکے۔ نہ علم کلام و مناظرہ نے ان کی دستگیری کی، ذوق و سلوک نے نہ صرف یقین و ایمان کی دولت سے مالا مال کر دیا بلکہ وہ تمام حقائق ان کے مشاہدات میں آچکے تھے۔ اب وہ ان حقائق کو اس طرح دیکھ رہے تھے، گویا جسم کی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں۔ اب وہ اس مقام پر فائز تھے جہاں کسی حقیقت کے یقین کے لئے دلیل و برہان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اس روحانی سفر میں امام صاحب کن کن مقامات سے گذرے، ان کی کیفیات کیا تھیں اور معارف و حقائق کی کن کن جلوہ طرازیوں کا مشاہدہ کیا۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنہیں تحریر و بیان کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا اور اگر لے بھی آیا جائے تو یہ بات محل نظر ہے کہ اس سے ہدایت ہی حاصل کی جائے گی۔ ممکن ہے علماء ظاہر پرست اور نا اہل صوفیاء، دونوں گروہ ایک اپنی شدت مخالفت سے جا کی

وجہ سے اور دوسرا بیجا غلو کی وجہ سے راہِ حق سے بھٹک جائیں اور اپنی عاقبت خراب کرلیں۔ اس لئے اس مقام سے غزالی یہ کہتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔

وکان ماکان مما لست اذکرہ فظن خیراً ولا تسئل عن الخبر

(جو ہوا سو ہوا۔ میں اس کی تفصیلات بیان کرنے والا نہیں پس حسن ظن سے کام لو اور حقیقت حال دریافت نہ کرو۔)

البتہ یہ بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ذوق وسلوک کی منازل بلندی سے گذرنے کے بعد آپ کی زندگی کے شب و روز کن حالات و مشاغل میں بسر ہوئے اور جس سفر کی تیاری کے لئے انہوں نے تقریباً دس سال خلوت و ریاضت اور مجاہدہ کی شدتیں برداشت کی تھیں، اس سفر (آخرت) پر کس انداز میں روانہ ہوئے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے "افکار غزالی" میں چند سطروں میں ان کے دس سالہ طلب و مجاہدہ کی غرض، اس کے نتائج و ثمرات، آخری دور کے مشاغل اور ان کے سفر آخرت کی بڑی موثر تصویر کھینچ دی ہے۔ انہیں سطروں پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

" زہد و ریاضت اور مجاہدہ و طلب کی شدتیں دراصل اس لئے جھیلی جاتی ہیں کہ سالک جب دنیا اور اس کے مشاغل کی طرف دوبارہ پلٹے تو اس حالت میں پلٹے کہ اس کا نفس رذائل سے پاک ہو چکا ہو۔ خواہشات نے اس پر قابو پانا چھوڑ دیا ہو اور دین و دنیا کے بارے میں ایسے زاویۂ نگاہ کا مالک ہو چکا ہو جو صد درجہ عادلانہ ہو۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہیے کہ مراقبہ و استغراق اور خلوت و انزوا یا زہد و ریاضت کی سختیاں برداشت کرنے سے اونچے درجے کے صوفیاء کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم و ادراک کے اس سرچشمہ تک رسائی حاصل کرلیں جہاں حقائق دینی کو صرف ادلہ و براہین کی روشنی میں نہیں دیکھا جاتا بلکہ خود ان کا تجربہ بھی کیا جاتا ہے اور قلب و ذہن میں ان مصالح و حکم کو محسوس کریں کہ جن کی بنا پر ان کو خلق اللہ کے لئے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور جب یہ کیفیت ان کو حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ ایک عام مصلح کی طرح زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی امور میں حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔

" غزالی نے بھی اس اصول پر عمل کیا۔ چنانچہ پہلے تو یہ نظامیہ نیشاپور میں سلطان وقت کے ایماء سے درس و تدریس کی مہم میں مصروف ہوئے اور پھر اپنے وطن طرطوس میں آرہے۔ یہاں رہ کر تعلیم و

تربیت کے دو مرکز قائم کئے ایک مسجد تعمیر کی جس میں علوم ظاہریہ کی تکمیل کرائی جاتی اور ایک خانقاہ بنوائی جس میں طالب علموں کو تزکیہ وتطہیر کی منزلوں سے گذارا جاتا تھا۔ گویا یہ دو سرچشمے تھے جن سے تشنگان حق سیر ہوتے تھے۔ یہاں یہ نہ دیکھئے کہ مسجد و خانقاہ کی غزالی نے کیوں تفریق پیدا کی اور کیوں مسجد ہی سے وہ کام نہ لیا جو خانقاہ سے لیا جاتا تھا۔ دیکھنے کی چیز یہاں یہ ہے کہ غزالی کی ژرف نگاہی نے دینی تعلیم کے سلسلے میں کس طرح اصل نقص کو بھانپ لیا۔ اور یہ جان لیا کہ آج کے علماء میں حرص وآز کی جو فراوانی اور دین سے حقیقی و سچی محبت کا جو فقدان ہے، اس کا واحد سبب ان کی روحانی وباطنی تعلیم کا نہ ہونا ہے اور پھر اس نقص کے ازالہ کا باقاعدہ اہتمام کیا۔ چنانچہ غزالی جب تک زندہ رہے ان دونوں مرکزوں کو بلا شرکت غیرے چلاتے رہے اور تعلیم وارشاد کے دوگونہ فرائض خوش اسلوبی سے بنھاتے رہے۔ مگر افسوس ادراک وبینش اور معرفت وکشف کے بعد یہ جلیل القدر خدمات زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکیں یعنی ۴۹۹ھ کے لگ بھگ یہ دس برس کی عزلت گزینیوں سے نکلے اور ۵۰۵ھ میں وفات پائی۔

ابن الجوزی نے اپنی کتاب "الثبات عند الممات" میں موت سے پہلے کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

پیر کے دن اول وقت صبح کی نماز پڑھی پھر کفن منگوایا۔ اور اس پر بوسہ دیا۔ پھر آنکھوں سے لگا کر کہا کہ مالک الملک کے دربار میں حاضر ہوں یہ کہہ کر قبلہ رو ہو کر لیٹ گئے اور سپیدۂ صبح نمودار نہیں ہوا تھا کہ اللہ کو پیارے ہوئے۔

قاضی عبدالمالک المعانی ایسے مشاہیر نے دردناک مرثیے لکھے جو ادب وتاریخ کی کتابوں میں اب تک ثبت ہیں۔"

حضرت ابو[illegible]اء فرماتے ہیں کہ اگر میں ایک مسئلہ سیکھوں میرے نزدیک تمام رات کی شب بیداری سے اچھا ہے۔

(احیائے علوم الدین از امام غزالی)

سندھ کے سہروردی مشائخ

میمن عبدالمجید سندھی

مخدوم ضیاء الدین

ٹھٹہ کے بہت بڑے عالم اور فاضل ہو گذرے ہیں۔ آپ کے نسب کا سلسلہ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی (متوفی ۶۳۲ھ) سے ملتا ہے[1] جن کی اولاد میں سے مخدوم الیاس سومرہ حکمرانوں کے عہد میں عراق سے نقل مکانی کر کے سندھ میں آئے اور "دریاہ" نامی ایک گاؤں میں آکر رہے[2]۔ مخدوم الیاس کے پوتے مخدوم ہارون بن مخدوم عجائب "دریاہ" سے ٹھٹہ آکر سکونت پذیر ہوگئے۔ مخدوم ضیاء الدین آپ کے فرزند تھے اور ٹھٹہ میں ۱۰۹۱ (مطابق ۱۶۷۷ء) میں پیدا ہوئے۔ ٹھٹہ کے مشہور عالم اور متقی بزرگ حضرت مخدوم عنایت اللہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی۔ سندھ کے بہت بڑے محقق، محدث، صوفی اور فلسفی حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی آپ کے ہم درس تھے۔ تحصیل علم کے بعد آپ نے ٹھٹہ میں ہی اپنا الگ مدرسہ جاری کیا، جس سے بڑے مشہور عالم اور فاضل فارغ التحصیل ہوئے۔ حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی بھی آپ کے شاگرد تھے۔

---

[1] تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۲۲۸

[2] " " ص ۱۶۳۔ "تاریخ سندھی ادب" ص ۱۳۱ کے مصنف محمد صدیق میمن مرحوم نے لکھا ہے کہ "جون" نامی ایک شہر میں آرہے دراصل "دریاہ" نامی گاؤں جون علاقے کے حدود میں تھا۔

[3] تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۲۲۸۔ حضرت مخدوم محمد معین، حضرت شاہ ولی اللہ کے دوست خاص تھے۔ حضرت شاہ ولی نے آپ کو سندِ حدیث بھی دی تھی۔

مخدوم محمد ہاشم صاحب نے ابتدائی کتب کے علاوہ باقی تمام کتابیں مخدوم ضیاء الدین کے یہاں مکمل کیں۔
آپ کے استاد کے استاد علامہ میاں احمد کے پوتے میاں احمد اور آپ کے نواسے مخدوم نعمت اللہ ابن
مخدوم عبدالجلیل آپ کے شاگرد تھے۔ مخدوم نعمت اللہ بہت بڑے عالم اور درویش گذرے ہیں۔
بیس سال کی عمر میں آپ نے اپنا علیحدہ مدرسہ جاری کیا، جو بہت کامیاب رہا۔ سندھ کے حاکم میاں سرفراز
کلہوڑے نے آپ کے یہاں تعلیم حاصل کی اور آپ سے بیعت بھی ہوئے۔[1]

مخدوم ضیاء الدین نے ۸۰ برس کی عمر میں ۱۱۷۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کے دو فرزند تھے۔

میاں یار محمد اور مخدوم غلام حیدر۔

قدیم زمانے میں سندھی علماء صرف عربی اور فارسی میں کتابیں تصنیف کیا کرتے تھے۔ مخدوم ضیاء الدین کے زمانے میں مخدوم ابوالحسن ٹھٹوی نے مذہبی کتب سندھی زبان میں لکھنے کی ابتدا کی آپ نے ۱۱۰۰ھ میں "الف اشباع" کی صنف نظم میں ایک ضخیم کتاب "مقدمتہ الصلوٰۃ" تصنیف کی، جو نماز کے مسائل کے متعلق ہے۔ مخدوم ابوالحسن کے بعد مخدوم ضیاء الدین دوسرے عالم ہیں، جنہوں نے فقہی مسائل کے متعلق سندھی میں ایک کتاب تصنیف کی، جو مخدوم ضیاء الدین کی سندھی کے نام سے مشہور ہے اس کے بعد حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی اور دوسرے علماء نے سندھی میں مذہبی کتابیں لکھیں۔ مخدوم ضیاء الدین نے لکھنے کا سبب یہ بیان فرمایا ہے۔

"میں نے دینی مسائل سندھی میں اس لئے لکھے کہ سندھی آسان ہے اور سب آسانی سے پڑھ سکینگے"

مخدوم ضیاء الدین کے بیان مطالب کا سلسلہ زیادہ عمدہ اور با ترتیب ہے۔ انہوں نے زیادہ تر "الف اشباع" کی صنف نظم سے حصہ لیا ہے۔ لیکن صحیح قافیہ والی نظم کا استعمال بھی ان کے ہاں بکثرت ہے۔

مخدوم احمد بھٹی

آپ بہت بڑے بزرگ تھے۔ آپ کا زمانہ مشہور درویش حاکم جام نظام الدین سمہ کا ہے

---

[1] تحفتہ الکرام ج ۳ ص ۲۲۸۔ الوحید سندھ آزاد نمبر ص ۳۲

[2] " " " "

جس نے نویں صدی ہجری کے آخر اور دسویں صدی ہجری کے شروع میں حکومت کی۔ مخدوم احمد بھٹی کا خاندان حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کا عقیدتمند تھا اور ہالا میں متوطن تھا۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام مخدوم اسحاق تھا۔ آپ نے ظاہری اور باطنی تعلیم مخدوم عبدالرشید سے حاصل کی۔ حضرت مخدوم احمد بھٹی صاحب بہت بڑے متقی تھے۔ ہمیشہ گوشۂ عزلت میں رہتے تھے البتہ کبھی کبھی سماع اور ذکر کے جلسوں میں تشریف لے جاتے تھے۔ سماع سے آپ کو بہت دلچسپی تھی۔ آخری عمر میں ایک مرتبہ نیرون کوٹ (حیدرآباد) گئے اور وہاں ایک سماع کی مجلس میں شرکت کی۔ دوران سماع ایک سنار لڑکے نے ایک سندھی بیت بہت خوش الحانی سے گایا، جس کا مطلب یہ ہے

"جو محبوب کی آواز پر ایک دم نہیں آتے
وہ جھوٹے دعوے کیوں کرتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی آپ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور اسی حالت میں آپ نے وصال فرمایا اس کے بعد اس لڑکے نے یہ بیت پڑھا۔

"سر دے کر بادہ فروشان وحدت سے رابطہ پیدا کر
موت سے نہ ڈر کیونکہ اس کے بعد ہی کامیابی ہے۔"

مخدوم صاحب کا جنازہ نیرون کوٹ (حیدرآباد) سے ہالا لایا گیا اور وہیں آپ مدفون ہیں۔ یہ واقعہ ۹۳۴ھ مطابق ۱۵۲۸ء کا ہے۔ آپ کے صاحبزادہ فتح اللہ تھے جو آپ کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔[1]

مخدوم محمد

آپ مخدوم احمد کے بھائی اور مخدوم اسحاق کے دوسرے فرزند تھے۔ آپ بڑے عالم اور فاضل تھے۔ شرع کی مخالفت آپ کبھی گوارا نہیں کرتے تھے اور خلق خدا کی حاجت روائی کے لئے کارداروں اور حاکموں کے پاس جانے سے گریز نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ ایک حاجت مند کے ساتھ سندھ کے حاکم جام نظام الدین کے پاس ٹھٹہ گئے۔ جام نے آپ سے کہا کہ میں نے آپ کے بھائی

---

[1] تحفۃ الکرام ج ۳ ص۱۴۸

مخدوم احمد کی بہت تعریف سنی ہے۔ جب تک وہ یہاں نہیں آئیں گے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔"
آپ نے جواب دیا کہ "میرے بھائی کو نہ آپ کی پروا ہے اور نہ میری" یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مخدوم احمد
صاحب مجلس میں آوارد ہوئے۔ حاکم نے آپ کا بہت احترام کیا اور حاجتمندوں کی حاجت روائی
بھی کردی۔

مخدوم عبدالرؤف

آپ مخدوم احمد کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب یوں ہے:- مخدوم عبدالرؤف
بن مخدوم عمر بن مخدوم عبدالحمید بن مخدوم احمد ثانی بن مخدوم فتح اللہ بن مخدوم احمد۔ موصوف اپنے
وقت کے بڑے عارف اور کامل بزرگ تھے۔ ہمیشہ عبادت اور ریاضت میں مشغول رہتے تھے
سندھ کے حاکم میاں نور محمد کلہوڑہ آپ کے بڑے معتقد تھے۔ اور آپ کی تابعداری کے لئے دل و
جان سے تیار رہتے تھے۔ ۱۱۶۶ھ میں آپ نے وفات پائی اور ہالا میں مدفون ہوئے۔ ہالا
کے قاضی شیخ ابراہیم نے آپ کی تاریخ وفات "کان دلیاً رؤف الخلق" سے نکالی ہے۔ ٹھٹہ
کے مشہور بلند پایہ فارسی شاعر محمد پناہ رجاؔ نے آپ کے حالات فارسی میں منظوم کئے ہیں آپ
کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی[1]

درویش رکن بھرا

ہالا کے بہت بڑے درویش گذرے ہیں۔ مخدوم احمد کے مرید اور خادم خاص تھے۔[2]
سید اسمٰعیل اور سید عمر یہ دونوں بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سے
تھے اور سید حاجی حمید نظام الدین کے فرزند تھے۔ نقل مکانی کرکے آپ تعلقہ بدین کے
ایک گاؤں "داہر سادات" میں آکر سکونت پذیر ہوگئے۔
سید عمر کے دو فرزند تھے۔ سید "میو" اور سید "لوھو"۔ سید "میو" کے ہاں دو بیٹے ہوئے
سید حمید اور سید احمد۔ سید حمید کے ہاں ۷ لڑکے اور ۱۲ لڑکیاں ہوئیں۔ آپ کے فرزندوں میں سے
سید عبدالرحیم بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ سید عبدالرحیم کے چار فرزند تھے۔ سید بھلو۔ سید امین

---

[1] تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۱۹۱ [2] ایضاً ص ۱۹۲

سید عبدالکریم اور سید صالح

سیّد محمود بخاری

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سے کچھ لوگ اچ سے نقل مکان کر کے گجرات میں جا بسے تھے۔ ارغون حکمرانوں کے زمانے میں ان کی اولاد میں سے سید محمود بخاری بن سید حاجی حمید نظام الدین، گجرات سے ٹھٹہ آئے اور "سیتہ" محلہ میں سکونت پذیر ہوئے آپ بڑے عالم اور فاضل تھے۔ آپ کو مسجد فرخ اور عیدگاہ کا امام اور خطیب مقرر کیا گیا۔

سید رحمت اللہ

آپ سید محمود کی اولاد میں سے تھے اور سید طیب کے فرزند تھے۔ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ مسجد فرخ سے باہر آرہے تھے کہ فقیر سید ابراہیم گودڑیو نے سید طیب سے سوال کیا کہ "یہ فرزند خدا کے نام پر مجھے دے دو"۔ سید طیب نے اللہ کے نام پر آپ کو فقیر کے سپرد کر دیا۔ فقیر آپ کو کوہ مکلی پر اپنے آستانہ پر لے آئے۔ آپ کی تربیت کی اور علم ظاہری اور باطنی سے سرفراز کیا۔ فقیر کی وفات کے بعد سید رحمت اللہ اپنے خاندان میں واپس آئے اور علم و فضل میں بڑا نام پیدا کیا۔ آپ کی اولاد میں سے بڑے عالم اور کامل پیدا ہوئے۔

مخدوم رکن الدین

مخدوم بلال کا ذکر گذشتہ قسطوں میں آچکا ہے مخدوم رکن الدین، مخدوم بلال کے خلیفہ تھے اور ٹھٹہ میں رہتے تھے۔ بڑے عالم، فاضل اور صاحب زہد تقویٰ تھے۔ علم حدیث میں آپ کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کیں جن میں سے "شرح اربعین" اور "شرح گیلانی" قابل ذکر ہیں۔ کثیر التعداد ظاہری اور باطنی علم کے طالبوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے ۹۳۹ھ میں وفات پائی اور مکلی پر مدفون ہوئے۔

سیّد ابراھیم

سید راجو قتال، حضرت غوث بہاءُ الحق ملتانی کے دوست اور مرید [illegible] جلال سرخ بخاری کے پوتے اور سید احمد کبیر کے فرزند تھے۔ سید ابراہیم، سید راجو قتال کے پوتے ہوتے ہیں۔ آپ ٹھٹہ میں آکر رہے۔ روایت ہے کہ آپ کے خاندان میں ایک لکڑی کا پیالہ یادگار کی طور پر رکھا تھا جب

وہ پیالہ آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے اسے توڑ دیا۔ حاضرین نے کہا آپ نے یہ کیا کیا؟ یہ تو بڑوں کی نشانی تھی"۔ آپ نے جواب دیا" ہیں اس سے سوائے شہرت کے اور کیا حاصل ہوتا ہے؟ اس کے بعد آپ وہاں سے نقل مکان کرکے ٹھٹہ میں آئے اور وہیں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار "کشتیین محلہ" میں ہے۔ بہت سے آدمی آپ سے فیضیاب ہوئے۔

عارف بلوچ

یہ بزرگ سید راجو قتال کے فیض یافتہ تھے سرزمین سندھ کے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس شہر کے تھے۔ بڑے عارف اور کامل تھے۔ قاضی نوراللہ شوستری نے "مجالس المومنین" میں آپ کو صاحب حال بزرگوں میں شمار کیا ہے۔ میر عبدالرشید نے آپ کے اشعار اپنے منتخب مجموعہ میں نقل کئے ہیں۔

شیخ محمود قطب

آپ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے فیض یافتہ تھے بڑے عابد اور زاہد تھے آپ کا مزار "اروڑ" کے نواح میں زیارت گاہ عام و خاص ہے۔ اروڑ سندھ کی قدیم راجدھانی ہے۔ عربی اور فارسی تاریخوں نے اس شہر کو "الور" "ارور" اور "رور" وغیرہ لکھا ہے۔ محمد بن قاسم کی راجا داھر سے اس شہر کے نواح میں لڑائی ہوئی تھی۔ بعد میں یہ شہر ویران کھنڈرات ہوگیا اور اس کی جگہ "بکھر" شمالی سندھ کا دارالحکومت بنا۔ اب یہ ویران کھنڈرات کی شکل میں موجود ہے اور اس کے نزدیک ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ روہڑی سے ۷ میل کے فاصلہ پر ہے۔

سید حسن شاہ بخاری

بڑے بے غرض اور بے طمع بزرگ تھے۔ سندھ کے حکمران کلہوڑے آپ کے بڑے معتقد تھے خلق کے بہت سے بندے آپ کے فیض سے مستفیض ہوئے آپ کا مزار "دادو" کے نزدیک "پھکا" نامی گاؤں میں ہے۔ آپ کے بھتیجے "نور شاہ" بھی بڑے بزرگ ہو گزرے ہیں۔

سیّد راجن

آپ سیّد جلال بخاری کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا مزار شمالی سندھ میں "سیتپور" نامی گاؤں میں ہے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

فسادِ زمانہ اور عمومِ بلویٰ

مولانا مجیب اللہ ندوی

اسلامی شریعت نے معاملاتی اور تمدنی امور میں انسان کو غیر معمولی مشقت سے بچانے اور ناسازگار حالات میں اسلامی احکام کے منشاء و مقصد کے تحفظ کے لئے رفعِ حرج اور تیسیر و تسہیل کی جو صورتیں پیدا کی ہیں، ان میں عمومِ بلویٰ کا لحاظ اور فسادِ زمانہ کی رعایت بھی ہے، مگر اس لحاظ و رعایت کا مقصد ہمارے شریعت کا استحلال، یا احکامِ شریعت کا تعطل نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد اس کی دوامی حیثیت کی حفاظت اور اس کو بالکلیہ تعطل سے بچانا ہے۔

اسلامی عقائد و عبادات میں تو کسی وقت بھی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا تعلق زندگی کی تغیر پذیر قدروں سے نہیں ہے، مگر معاملاتی، معاشرتی اور تمدنی احکام کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ ان کا مدار انسانی زندگی کی مادی قدروں پر ہے، جو ہر آن تغیر پذیر رہتی ہیں۔ ان میں روزانہ نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان پر معاشرہ کے فساد و صلاح کا براہِ راست اثر پڑتا ہے اس لئے اسلامی شریعت نے معاملاتی و تمدنی معاملات کے سلسلہ میں جو ہدایت دی ہیں، ان میں حلال و حرام کی بنیادی و دوامی قدروں کے تحفظ کے ساتھ قیاس و اجتہاد کی ایسی صورتیں رکھی ہیں، جن سے شریعت کا منشاء و مقصد بھی فوت نہیں ہونے پاتا اور اسلامی احکام معاشرہ کے ارتقاء میں حائل بھی نہیں ہوتے۔ یہ تیسیر و تسہیل کی آزادی اس حد تک ہے، جب تک کہ حلال و حرام کی وہ بنیادی قدریں متاثر نہیں ہوتیں جن کا رشتہ دین و ایمان سے جڑا ہوا ہے، مثلاً اسلامی شریعت نے بہت سی چیزیں حرام، مکروہ

لہ یہ مضمون شکریہ کے ساتھ "معارف" اعظم گڑھ سے نقل کیا جاتا ہے۔ (مدیر)

اور نا جائز قرار دی ہیں، یا اس کے بارے میں کچھ اصولی ہدائیتیں دے دی ہیں، مگر بعینہ ان پر تعامل سے انسان کو مستقل شدید دقتیں محسوس ہوتی ہیں، یا عارضی تکلیف کا امکان ہوتا ہے اس لئے فقہار شریعت کے منشا کے مطابق اس میں تخصیص و تقیید کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ تخصیص و تقیید اس لئے ضروری ہوتی ہے کہ نہ تو شریعت کا منشار بالکلیہ فوت ہونے پائے اور نہ انسان غیر معمولی تکلیف میں مبتلا ہو جائے جیسا کہ شریعت نے حکم دیا ہے،

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (بقرہ)

اللہ تعالیٰ تم پر آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا،

اسی طرح بہت سے احکام ایک خاص ماحول اور زمانہ میں بہت ہی مفید ہوتے ہیں، مگر ایک مدت کے بعد ماحول، ذرائع اور اخلاق عامہ کے بدل جانے کی وجہ سے ان کی افادیت یا تو باقی نہیں رہتی یا اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اب اگر شرعی حکم کی علت اور منشار کو نظرانداز کر کے بعینہ اس حکم پر عمل کیا جائے تو یا عمل کرنے والا تکلیف مالایطاق میں مبتلا ہو جائے گا یا پھر شریعت کا منشار یا اس حکم میں رخصت، تیسیر اور نفیِ حرج کا جو پہلو ہے وہ نظرانداز ہو جائے گا، چنانچہ اسی بنا پر تمام ہی مسالک کے متاخر فقہار نے اپنے مسلک کے ائمہ اور متقدم فقہا کے بہت سے فتاوی کے خلاف فتوے دیئے ہیں اور اپنے پیش روؤں سے اختلاف کی وجہ متاخر فقہا نے اختلاف الزمان اور فساد الاخلاق ہی بیان کی ہے۔ متاخرین کا متقدمین سے یہ اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر متقدم فقہا و ائمہ بھی ان کے زمانہ میں موجود ہوتے تو حالات کی تبدیلی اور فساد اخلاق کی بنا پر وہی رائے دیتے، اسی عموم بلویٰ اور فساد زمانہ کی بنیاد پر فقہا نے یہ اصول مقرر کئے ہیں[1]

لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان۔ الامر اذا ضاق اتسع۔ الضرر یدفع بقدر الامکان۔ الضرورۃ مستثناۃ من قواعد الشرع۔ المشقۃ تجلب التیسیر۔ الضرورات تبیح المحظورات۔

---

[1] نشر العرف ج ۲ ص ۱۲۵

حالات کے بدلنے سے احکام کی تبدیلی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب کوئی تنگی کی صورت پیدا ہوجائے تو اس میں وسعت ہوتی ہے تکلیف حتی الامکان دفع کی جاتی ہے ضرورت شریعت کے قواعد سے مستثنیٰ ہوتی ہے مشقت آسانی لاتی ہے۔ ضرورتیں ممنوع چیزوں کو مباح کردیتی ہیں۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عموم بلویٰ مشقت وحرج اور فساد زمان کا ہر صورت میں لحاظ کیا جائے گا۔ یا کسی تخصیص اور تقیید کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے گا، اس سلسلہ میں فقہا نے احکام اسلامی کی دو صورتیں قرار دی ہیں، ایک یہ کہ اس تغیر و تبدل یا حرام و مکروہ میں تخصیص کا تعلق شریعت کے منصوص و صریح احکام سے ہو، دوسرے یہ کہ ان کا تعلق اجتہادی مسائل سے ہو، پہلی صورت کے بارے میں ان کا عام اصول تو یہ ہے کہ

المشقۃ والحرج انما یعتبر فی موضع لا نص فیہ (الاشباہ ص ۷۰)

مشقت اور تنگی کا لحاظ اس امر میں کیا جائے گا جس میں کوئی نص موجود نہ ہو۔

فقہ کا یہ اصول مسلمہ ہے کہ منصوص احکام میں کوئی تغیر و تبدل جائز نہیں ہے، مگر چونکہ شریعت نے اسلامی احکام کے نفاذ میں انسان کے مزاج، ماحول اور اس کے مصالح اور مضار کا بھی لحاظ کیا ہے اس لئے جب کسی حکم پر بالکلیہ عمل کرنے میں شدید مشقت یا مجبوری لاحق ہو رہی ہو، یا ماحول کے بگاڑ یا کسی اور سبب سے کسی برائی سے بالکلیہ بچنا ممکن نہ رہ گیا ہو تو فقہا یا تو اس حکم میں تخصیص کرتے ہیں یا پھر اس کے مثبت پہلو کے بجائے اس کے منفی پہلو یعنی نفی حرج والے پہلو کو اختیار کرتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ چند افراد کا مسئلہ نہ ہو بلکہ پورے معاشرہ کا معاملہ ہو، یا اگر وہ مخصوص افراد کا معاملہ ہو تو وہ مشقت اور حرج غیر معتاد قسم کا ہو، امام شاطبی نے اس پر بڑی عمدہ بحث فرمائی ہے۔

حیث تکون المشقۃ الواقعۃ بالمکلف فی التکلیف خارجۃ عن معتاد المشقات فی الاعمال العادیۃ حتی یحصل بہا فساد دینی او دنیوی فمقصود الشارع فیہا الرفع علی الجملۃ۔

اگر یہ مشقت جو واقع ہوئی ہے ایسی ہے جس سے عمل کرنے والے کو غیر معتاد قسم کی تکلیف ہو سکتی ہے یہاں تک کہ اس سے دینی و دنیاوی کوئی خرابی کے پیدا ہونے کا امکان ہے، تو شریعت کا منشا یہ ہے کہ اس کو بالکلیہ رفع کیا جائے پھر آگے لکھتے ہیں۔

اذا کان الحرج فی نازلة عامة فی الناس فانه یسقط واذا کان خاصاً لم یعتبر عندنا[1] (ج ۱ ص ۱۰۱)

اگر یہ تنگی کسی ابتلائے عام کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے تو اس کو بہرحال رفع کیا جائیگا اور اگر یہ خاص ہے تو اسکا اعتبار نہیں ہے

لیکن فساد زمانہ یا عموم بلویٰ کی وجہ سے جو حرج و مشقت پیدا ہوتی ہے اس کی تعیین اور اس کو دفع کرنے کے سلسلے میں منصوص حکم کی تخصیص و تقیید کی جائے یا نہ کی جائے، اور اگر کی جائے تو کس حد تک کی جائے یہ بڑا نازک مسئلہ ہے، اس لئے فقہائے کرام نے اس میں کافی ردو قدح کی ہے، اسی نزاکت کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے موجودہ دور کے متجدد فقہا ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، اور شریعت کے بہت سے احکام کو انہوں نے بازیچۂ اطفال بنالیا ہے اس سلسلہ میں فقہائے کچھ خیالات کی تفصیل آگے آتی ہے۔ اب رہی دوسری صورت تو اس کے بارے میں بات صاف ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی قیاسی واجتہادی مسئلہ کی وجہ سے یہ دقت ومشقت پیش آتی ہے، تو اس کو ترک کرکے اس وقت کے حالات اور مقتضیات کے مطابق پیش آمدہ مسائل کو شریعت کے منشا کے قریب لانے کی کوشش کی جائے گی، جیساکہ عُرف میں ہوتا ہے،

عموم بلویٰ اور فساد زمانہ میں رفع حرج، تیسیر کی خاطر کسی منصوص حکم کی تخصیص کرتے ہوئے یہ بات بہرحال ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ان کی وجہ سے دین کے مقاصد اور ان بنیادی ضرورتوں پر کوئی اثر نہ پڑے جن کو شریعت اسلامی انسانی زندگی کا قوام اور مدار سمجھتی ہے، شریعت میں یہ ضروریات پانچ ہیں۔

مجموع الضروریات خمسة حفظ الدین والنفس والنسل والمال والعقل (موافقات ج ۲ ص ۱۰)

ان ضروریات کی پانچ قسمیں ہیں۔ دین، نسل، جان، مال، اور عقل کی حفاظت۔

ان ضروریات کا مطلب کیا ہے۔ اس کی طرف عزالدین عبدالسلام متوفی ۶۶۰ھ نے قواعد الاحکام میں اشارہ کیاہے، اور امام شاطبی متوفی ۷۹۰ھ نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

فمصالح الدنیا والاٰخرة ثلاثة اقسام کل قسم منها فی منازل متفاوت فاما مصالح

---

[1] بعض ائمہ کے نزدیک خاص حرج بھی معتبر ہے مگر اس میں انہوں نے معتاد اور غیر معتاد کی قید لگادی ہے، اس لئے اس اختلاف کا شریعت کے حکم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

الدنیا فتنقسم الی الضروریات والحاجات والتتمات والتکملات فالضروریات کالماکل والمشارب والملابس ـــــ والمناکح والمراکب الجوالب للاقوات وغیرھا تمس الیہ الضرورات واقل المجزی من ذالک ضروری وما کان فی ذالک فی اعلی المراتب کالماکل الطیبات والملابس الناعمات والغرف العالیات والمراکب النفیسیات فھو من المتممات وما توسط بینھما فھو من الحاجات واما مصالح الاخرۃ ففعل الواجبات واجتناب المحرمات من الضرورات وفعل السنن الموکدات الفاضلات من الحاجات وعدا ذالک فھی من المتممات۔

دنیا وآخرت کی بھلائیوں کی تین قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم کے مختلف درجے ہیں، تو دنیا کے مصالح کی تین قسمیں ہیں، ضرورات حاجات اور تکملات، ضرورات سے مراد کھانا پینا، پہننا، شادی بیاہ کرنا سواری جو رزق کے حصول میں معاون ہو، اسی طرح جس کی ضرورت بھی پیش آجائے ان کا اقل درجہ تو ضروری ہے، مگر اس کا اعلیٰ درجہ یعنی اچھا کھانا عمدہ لباس، شاندار مکانات بہترین سواریاں تو یہ تکملات وتممات ہیں ہیں اور ان دونوں کے درمیان جو ضرورتیں ہیں وہ حاجات ہیں، اسی طرح آخرت کے مصالح تو واجبات کی بجاآوری محرمات سے اجتناب ضروریات میں ہیں اور سنن موکدات فاضلات حاجات میں ہیں اور ان کے علاوہ متممات ہیں۔

امام شاطبی اس کی مزید توضیح کرتے ہیں:۔

فاما الضروریۃ فمعناھا انھا لابد منھا فی قیام مصالح الدین والدنیا بحیث اذا فقدت لم تجر مصالح الدنیا علی استقامۃ بل علی فساد وتھارج وفوت حیاۃ وفی الاخری فوت النجاۃ والنعیم والرجوع بالخسران المبین۔ (ج ۲ ص۸)

ضروریات میں کسی چیز کے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حفاظت پر دین ودنیا کے بقا کا اس حیثیت سے مدار ہے کہ اگر ان کی رعایت وحفاظت نہ کی جائے تو صرف یہ کہ دنیا کے وجود کے سارے مصالح مفقود ہو جائیں گے، بلکہ اس میں فساد واختلال رونما ہو جائیگا اور انسانی زندگی معطل ہو کر رہ جائے گی۔ دوسری طرف آخرت کی کامیابی اور اسکی نعمتیں حرمان وخسران سے بدل جائیں گی۔

ان ضروریات کی مثبت ومنفی حفاظت کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

والحفظ لها یکون بامرین احدهما یقیم أركانها ويثبت قواعدها وذالك عبارة عن مراعاتها من جانب الوجود والثاني مايدرأ عنها الاختلال الواقع أو المتوقع فيها وذالك عبارة عن مراعاتها من جانب العدم فاصول العبادات راجعة الی حفظ الدین من جانب الوجود كالايمان والنطق بالشهادتين والصلوة والزكوة والصيام والحج وما أشبهما ذالك والعادات راجعة الى حفظ النفس والعقل من جانب الوجود ايضا كتناول الماكولات والمشروبات والملبوسات والمسكونات وما اشبه ذالك والمعاملات راجعة الى حفظ النسل والمال من جانب الوجود والى حفظ النفس والعقل ايضا لكن بواسطة العادات والجنايات ويجمعها الامر بالمعروف والنهي عن المنكر ترجع الى حفظ الجميع من جانب العدم۔

ان کی حفاظت دو طریقوں سے ممکن ہے، ایک یہ کہ جن چیزوں پر ان کی بنیاد ہے اور جن ستونوں پر یہ قائم ہیں ان کو باقی اور قائم رکھا جائے۔ یہ اس کی رعایت وحفاظت کا مثبت پہلو ہے، دوسرے یہ کہ اس کو حال و مستقبل کے اختلال و انتشار سے بچایا جائے اور ان کی حفاظت کا منفی پہلو ہے، چنانچہ اصولِ عبادت مثبت طور پر دین کی حفاظت کرتے ہیں، جیسے ایمان بالقلب اور اقرار باللسان، نماز، زکواۃ، روزہ، حج وغیرہ۔ اسی طرح عادات انسانی اس کے نفس وعقل کی وجودی طور پر حفاظت کرتی ہیں۔ مثلاً کھانا پینا، پہننا، مکان وغیرہ اسی طرح معاملات نسل و مال کے وجود کا تحفظ کرتے ہیں، اور ساتھ ہی عقل اور نسل انسانی کی حفاظت بھی ان سے ہوتی ہے، لیکن عادات کے واسطے سے اور جنایات جن کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ یہ عبادات معاملات اور سبھی کے حفاظت منفی طور پر کرتے ہیں۔ (مسلسل)

روس میں پان ترکزم اور اسلام[1]

(۴)

تلخیص و ترجمہ

بشکیریا کی خود مختار جمہوریہ

اشتراکی انقلاب کے بعد جب ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بشکیریا کے صدر مقام اوفا پر سوویت حکومت کا قبضہ ہوگیا، تو بشکیری قوم پرستوں نے اس خیال سے کہ نہ تو انہیں تاتاریوں سے تعاون کرنا پڑے اور نہ بالشویکوں سے، اپنا مرکز اوفا سے اورن برگ منتقل کرلیا۔ اس وقت ان کا سارا زور اس پر تھا کہ بشکیریا کی اپنی ایک خود مختار جمہوریہ بن جائے۔ بالشویکوں اور ان کے مخالفوں کی کشمکش کے ابتدائی دور میں بشکیری قوم پرست تقریباً غیر جانبدار رہے۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۱۷ء کو ان کی مرکزی کمیٹی کی طرف سے جو پہلا منشور شائع ہوا، اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا۔

> "ہم نہ بالشویک ہیں، نہ مانشویک۔ ہم صرف بشکیری ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ ہمیں کس طرف ہونا چاہیئے، تو ہم صرف اپنی طرف ہیں۔"

خانہ جنگی کے دوران بالشویک دشمن فوجی قیادت نے بشکیریا کی خود مختاری کی تائید کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر بشکیری قوم پرستوں نے ولیدوف کی زیر سیادت سوویت فوجی کمان سے مصالحت کرلی اور ولیدوف خود اور دوسرے بشکیری کمیونسٹ پارٹی میں داخل ہوگئے۔ کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کے بعد بھی بشکیری قوم پرستوں کے پیش نظر اپنا وہی خود مختار جمہوریہ بشکیریا کا مقصد رہا۔ اس کی وجہ سے ان کی سوویت حکومت کے علاوہ خود تاتاریوں سے بھی برابر اَن بن ہوتی رہی۔

---

[1] یہ مضمون ہارورڈ (امریکہ) یونیورسٹی سے شائع شدہ ایک انگریزی کتاب سے ماخوذ ہے (مدیر)

ولیدوف اپنے ساتھی کمیونسٹوں سے اثنائے گفت گو میں یہ بات نہیں چھپاتا تھا کہ اس کے پروگرام کا ایک بنیادی نقطہ ایک خود مختار بشکیریا کا قیام ہے جہاں بشکیری ہی حکمراں سیاسی قوت ہوں اور نہ صرف بشکیریا میں روسی آبادکاری کو روکا جائے بلکہ آبادکاروں سے بشکیری زمینیں واپس لی جائیں۔ ولیدوف اپنے ہاں مسلمان ترکوں کو آباد کرنا چاہتا تھا تاکہ اس طرح بشکیریا ایک خالص ترکی علاقہ بن جائے۔ اس سے بشکیریوں اور سوویت فوج میں تصادم ہوتا رہتا۔ جب تک کہ خانہ جنگی جاری رہی، اسٹالن بشکیری قوم پرستوں کو ٹالتا رہا، لیکن جیسے ہی سوویت حکومت کو ادھر سے قدرے اطمینان ہوا، اس نے اس معاملے میں دو ٹوک فیصلہ کر دیا۔

غرض احمد زکی ولیدوف کی یہ ساری کوشش بے کار گئی۔ بشکیری قوم پرستوں کی تنظیم توڑ دی گئی۔ اسی زمانے میں (۱۹۱۷ء۔ ۱۹۲۲ء) بشکیریا میں سخت قحط پڑا جس میں کوئی ۲۵ فیصدی آبادی ہلاک ہو گئی ہلاک ہونے والوں میں جہاں روسی اور تاتاری آبادکار بڑے اور پڑے تھے، وہاں نیم خانہ بدوش بشکیری پڑے تھے، بشکیریوں کی ان توقعات پر کہ ان کی نسلی حدود کے اندر ان کا صحیح معنوں میں ایک قومی خود مختار علاقہ ہو، آخر میں ۱۹ جون ۱۹۲۲ء کو سوویت حکومت کے ایک فرمان نے خط تنسیخ کھینچ دیا۔

قازقستان کی علاقائی خود مختاری

قازقستان کا رقبہ دس لاکھ مربع میل سے کچھ زیادہ ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اس کی ایک تہائی آبادی روسی یوکرینی آبادکاروں اور شہر میں رہنے والوں کی تھی، باقی کی دو تہائی آبادی خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قازقوں کی تھی جن میں سے ۱۵ فی صد شہروں میں رہتے تھے، اور ان میں سے ۵ فی صد سے زیادہ خواندہ نہ تھے۔ ظاہر ہے ایسے علاقوں میں سیاسی سرگرمیاں کیا ہوں گی۔ قازقوں کا سب سے بڑا مسئلہ باہر سے آنے والے آبادکاروں کا تھا۔ بشکیریوں کی طرح قازق بھی تاتاری قیادت سے آزاد رہنے کے خواہاں تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد انہوں نے بھی قازق علاقے کی علاقائی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

قازقستان میں روس کی خانہ جنگی کے دوران دونوں فریقوں کے حامی آپس میں لڑتے رہے۔ جہاں تک شہروں کا تعلق تھا، وہاں تو سفید اور سرخ فوجوں کا قبضہ رہا۔ لیکن سطح مرتفع اور دور افتادہ دیہات تک ان میں سے کسی کی پہنچ نہ تھی۔ آخر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں پہلی قازق سوویت

کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا، جس میں ۲۷۷ نمائندوں نے حصہ لیا، جن میں سے صرف ۲۷۳ کو ووٹ کا حق تھا، اور ان میں سے ۱۹۷ کمیونسٹ تھے۔ اس اسمبلی نے ایک منشور شائع کیا، جس کی رو سے قازقستان کو آزاد سوویت سوشلسٹ جمہوریتوں کی وفاقی یونین میں ایک خود مختار رکن کی حیثیت سے شامل ہونے کا مجاز قرار دیا گیا۔ قازق آئین ساز اسمبلی میں بین الاقوامی صورت حال بھی زیر بحث آئی۔ سٹالن کے نمائندے نے اپنی طویل تقریر میں کہا کہ قازقوں کو مشرق میں انقلاب کا ہراول ہونا چاہیئے۔ ایک خصوصی اپیل میں مشرق کے عوام پر زور دیا گیا کہ وہ سوویت انقلاب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے استعمار پرستوں کی زنجیروں کو اتار پھینکیں۔

جمہوریہ قازقستان کے ابتدائی سالوں میں قازق قوم پرستوں اور قازق کیونسٹوں میں برابر کشمکش رہی۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں جو قحط پڑا، جس سے کہ بیس لاکھ قازق متاثر ہوئے۔ اس نے بلشکیریوں کی طرح قازقوں کی بھی کمر ہمت توڑ دی۔ ۱۹۲۲ء میں ایک قازق نیشلسٹ کمیونسٹ نے لکھا ہے "مستقبل کے لئے ہمارا طریقہ کار یہ ہونا چاہیئے۔ ہم اس وقت قازقستان کی سیادت کے لئے جدوجہد نہیں کر رہے۔ لیکن ہمارا نصب العین اب بھی یہی ہے۔ اگر ہم اس کے لئے لڑتے بھی تو کامیابی ممکن نہ تھی۔ اس لئے ہماری تمام تر کوششیں نوجوانوں کو تعلیم دینے اور ان کو آئندہ کبھی زور آزمائی کے لئے تیار کرنے پر صرف ہونی چاہئیں۔"

وسط ایشیا کے ترکمانوں کی بے حسی

معاصر وسط ایشیا کے دو جرمن مورخوں نے لکھا ہے کہ جہاں ایک طرف انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء میں سوویت کے حامی تاشقند کی مسند اقتدار پر قبضہ کر رہے تھے، وہاں دوسری طرف مقامی ترکمان روس کے اور خود اپنے انقلابی لیلیے کو بڑی بے حسی سے بطور تماشائی دیکھ رہے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ فروری ۱۹۱۷ء سے اکتوبر ۱۹۱۷ء تک بلکہ اس کے بعد کے مہینوں میں بھی جب کہ آنے والے زمانوں کے مقدر کا فیصلہ ہوا تھا، وسط ایشیا کے مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت نے گرد و پیش ہونے والے سیاسی واقعات سے بہت کم دلچسپی لی۔ اور ان کا یہ طرز عمل بہت حد تک نخلستانی زندگی کا لازمہ تھا۔

۱۹۱۷ء میں وسط ایشیا کی کل آبادی کا ۴/۵ حصہ دریائے جیحوں و سیحوں کے دوابے

میں واقع نخلستانوں میں آباد تھا۔ اور اس آبادی کو متحد کرنے والی صرف اسلام اور اس کے علماء و مساجد کی طاقت تھی لیکن جب تک مذہب پر کوئی زد نہ پڑتی، اور اسے خطرے میں نہ محسوس کیا جاتا یہ طاقت بھی عام طور پر خوابیدہ ہی رہتی۔ پھر دوسری وقت یہ تھی کہ اگر سیاسی اور فوجی معاملات کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوتا، تو علماء اور دین دار مسلمان بالعموم ان کے بارے میں غیر جانبدار رہتے۔

علاوہ ازیں وسط ایشیا کے نیم خانہ بدوش اور پہاڑی قبائل دیہات اور شہروں میں رہنے والوں سے اپنے مزاج، ذہنیت اور فوجی استعداد میں بالکل مختلف تھے۔ خشک میدانوں میں رہنے والے بہت سے ترک اور تاجک قبائل میں ۱۹۱۷ء تک قبائلی قسم کا ہی نظام رائج تھا، جس میں کہ سرداروں کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد جب سوویت اقتدار ان اطراف میں مستحکم ہوا، تو انہی قبائل کی طرف سے اس کے خلاف بغاوت ہوئی۔ جس کا سبب کوئی نظریاتی نزاع نہ تھا۔ بلکہ یہ ان قبائل کی اپنی قدیم قبائلی روایات کی حفاظت کے لئے جدوجہد تھی۔ باقی جہاں تک دوسری آبادی کا تعلق تھا۔ وہ سیاسی جمود اور ثقافتی پس ماندگی کی وجہ سے ہر زبردست کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی مدتوں سے عادی ہو چکی تھی، چنانچہ جب زار روس کا اقتدار ختم ہوا، تو اس کی جگہ سوویت اقتدار نے بڑی آسانی سے لے لی۔

۱۹۱۷ء میں وسط ایشیا میں مسلم سیاسی سرگرمیوں کا آغاز یوں ہوا کہ حسب معمول مقامی تاتاریوں نے وولگا یورال کے مسلمانوں کی دوسرے لفظوں میں "تاتاریوں کی ایک کانفرنس بلائی (۱۳-۲۰ اپریل ۱۹۱۷ء)۔ ۱۳ اپریل کے اجلاس میں اس میں بعض وسط ایشیائی دانشور جو اکثر "جدیدین" تھے، اور مارچ میں "شوراے اسلامی" کے نام سے ایک جماعت بنا چکے تھے، شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں اس وقت کے خصوصی معمول کے مطابق (مارچ۔ اپریل ۱۹۱۷ء) بعض قراردادیں منظور کی گئیں۔ جن میں روسی دستور کو جمہوری اور وفاقی اصولوں پر تشکیل کرنے، مسلمانوں کو مساوی حقوق دینے اور مسلمان علماء کی حالت کو بہتر بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ نیز ایک جمعیت العلماء قائم کی گئی، جس نے فوراً ہی ایک انتہا پسندانہ قدامت پرست مسلک اختیار کر لیا۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں ترکستان مسلم سنٹرل سوویت (ترکستان مسلمان مرکزی

شورائیہ) قائم کی گئی۔ جس کا بعد میں نام "ملی مرکز" رکھا گیا۔ اس میں تاتاری اور مقامی "جدیدیین" خاص طور سے نمایاں تھے۔ "ملی مرکز" کی پالیسی کافی حد تک اعتدال پسند اور غیر جارحانہ تھی۔

رجعت پسند علماء اور جدیدیین

مئی ۱۹۱۷ کی پہلی کل روسی مسلم کانگریس کے بعد "ملی مرکز" کے جدیدیین ارکان نے خود مختاری کا سوال اٹھایا۔ وہ صرف داخلی خود مختاری کے حامی تھے۔ روس سے سیاسی طور پر الگ ہونے کے وہ حق میں نہ تھے۔ دراصل ۱۹۱۷ء میں جدیدیین روسی طاقت اور انقلاب سے کہیں زیادہ مسلم علماء کی رجعت پرستی سے خوف زدہ تھے اور ان کا یہ خوف بہت حد تک صحیح تھا۔ اگست ۱۹۱۷ء میں وسط ایشیا کے سب سے زیادہ یورپین اور ترقی یافتہ شہر تاشقند میں جو شہری کونسل کے انتخابات ہوئے، تو ان میں قدامت پسندوں کی غالب اکثریت کامیاب ہوئی۔ رجعت پسند مسلمان علماء نے روسی دائیں بازو والوں سے مل کر ۶۰ فیصد ووٹ لئے۔ "شورائے اسلام" کے جدیدیین اور ترک قوم پرستوں کو ۱۰ فی صد اور سوشلسٹ انقلابیوں کو ۲۵ فی صد ووٹ ملے، سوشلسٹ ڈیموکریٹ اور بالشویک دونوں مل کر کونسل کے کل ۱۰۰ نمائندوں میں سے صرف تین نمائندے منتخب کرا سکے (جن میں از بک صرف ایک تھا) تاشقند کے اس انتخاب کے بعد جدیدیین کو اچھی طرح سے معلوم ہو گیا کہ صوبوں کے انتخابات میں قدامت پسند علماء کا پلہ اور بھی بھاری ہوگا۔ چنانچہ علماء کے بارے میں ان کا رویہ بہت زیادہ محتاط ہو گیا۔

اب جہاں تک علماء اور مذہبی طبقوں کا تعلق تھا، انہیں نہ تو داخلی خود مختاری سے دلچسپی تھی اور نہ مکمل آزادی سے۔ ان کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وسط ایشیا کی مسلمان آبادی پر ان کا مذہبی اثر و نفوذ بحال رہے۔ انہوں نے روسی دائیں بازو والوں سے محض جدیدیین اور دوسری بائیں بازو والی پارٹیوں سے مخالفت کی وجہ سے تعاون کیا تھا۔ جنہیں یہ علماء بے دین ملی کہتے تھے۔ ۱۹۱۷ء کے موسم گرما و خزاں میں اس کشمکش میں بعض مسلمان لبرل اور سوشلسٹ مارے بھی گئے تھے۔ جب "ملی مرکز" نے وسط ایشیا کی داخلی خود مختاری کا آئین بنانا شروع کیا۔ تو علماء نے اصرار کیا کہ اس میں ایسی دفعات رکھی جائیں جن میں خود مختار مملکت کے قانون ساز اور عاملہ (ایگزیکیٹو) اداروں کی نگرانی کی علماء کو ضمانت دی جائے اور انہیں انتظامیہ

(ایڈمنسٹریشن) پر بھی کنٹرول ہو۔

ظاہر ہے جیسا کہ انتخابات سے واضح ہو چکا تھا، وسط ایشیا کی آبادی کی غالب اکثریت کے نمائندہ علماء تھے۔ اور شورائے اسلام کے جدیدیین اور دوسرے مسلمان سوشلسٹ عملاً بے سہارا تھے۔

جب اکتوبر ۱۷ ۱۹ء میں لینن پیٹرز برگ میں عنان اقتدار ہاتھ میں لینے میں کامیاب ہو گیا تو تاشقند پر اس کے حامیوں کے ایک گروہ نے قبضہ کر لیا۔ جو روسی خانہ جنگی کے دوران اس تمام عرصے میں ۱۹ ۱۹ء کے اواخر تک وہاں برسر اقتدار رہے۔ انقلاب اکتوبر کے بعد تاشقند کے مسلمانوں نے سوویت طاقت کو مسلمانوں کے خلاف نہیں جانا، بلکہ وہ اسے تمام اقوام کی مساوات کے اصولوں کا علم بردار سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے لبرل گروہ نے وسط ایشیا میں بالشویک اقتدار کا خیر مقدم کیا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ غیر متوقع بات یہ ہوئی کہ تیسری مسلم وسط ایشیائی کانفرنس منعقدہ ۱۵ر نومبر ۱۷ ۱۹ء کی قدامت پرست اکثریت نے تاشقند کے "فاتحین انقلاب اکتوبر" کے ساتھ تعاون کرنے اور ان سے مل کر مشترکہ حکومت بنانے کا فیصلہ کیا۔ جس میں کہ چھ نمائندے علماء کے ہوں، تین میونسپلٹیوں کے اور تین تاشقند سوویٹ کے۔ اس کانفرنس پر تمام تر علماء ہی حاوی تھے۔ اور جدیدیین اور شورائے اسلام والوں کو اس میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن تاشقند کی سوویت کانگرس نے علماء کی یہ پیش کش مسترد کر دی اور بالشویکوں اور بائیں سوشلسٹوں کے ایک مختصر سے گروہ نے تاشقند کی حکومت سے مقامی آبادی کو خارج ہی رکھا۔

جب تاشقند کی سوویت حکومت نے علماء کے اس تعاون کو مسترد کر دیا تو انہوں نے ایک متحدہ اسلامی جمعیت بنانے کے لئے شورائے اسلام کے لبرلوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس جمعیت کا نام "اتفاق المسلمین" تھا۔ نومبر کے اواخر میں فرغانہ کے شہر خجند میں چوتھی مسلم وسط ایشیائی کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں روسی جمہوریہ کے اندر ترکستان کی داخلی خود مختاری کا اعلان کیا گیا۔ خجند کی یہ حکومت تاشقند کے ماتحت نہ تھی۔ اور دونوں حکومتیں بیک وقت اپنے احکام جاری کرتی تھیں۔ وقتی طور پر مصلحتاً ماسکو کی سوویت حکومت نے خجند اور

تاشقند کی حکومتوں کے اس جھگڑے میں مداخلت نہیں کی لیکن کچھ عرصہ بعد تاشقند کے فوجی دستے
خجند کی طرف بڑھے اور ۱۹ فروری ۱۹۱۸ء کو خجند پر ان کا قبضہ ہوگیا، اور اس طرح ترکستان کی
یہ خود مختار حکومت ختم ہوگئی۔ لیکن خجند کی اس حکومت کے ختم ہوتے ہی ترک قبائل کی مزاحمت
شروع ہوگئی، جس نے "بسمچی" تحریک کی شکل اختیار کی۔

تاشقند سوویت حکومت کے ہاتھوں خجند کی خود مختار حکومت کے خاتمے کے بعد بظاہر
تو وسط ایشیا کی مسلم آبادی اور بالشویکوں میں کسی قسم کے تعاون کا امکان نہیں رہنا چاہیئے تھا
لیکن فروری ۱۹۱۸ کے واقعات (خجند کا سقوط)۔ کے فوراً ہی بعد ازبکوں کی ایک جماعت تاشقند
پہنچی اور اس نے سوویت حکام سے تعلقات قائم کرنے پر آمادگی ظاہر کی اسی کی وجہ سے
وسط ایشیا میں سوویت اقتدار کو مستحکم ہونے میں بڑی مدد ملی۔ یہ ازبک نوجوان بخاری
لبرل تھے، جو امیر بخارا کے خلاف اپنی جدوجہد میں حلیف ڈھونڈنے تاشقند پہنچے تھے۔

بخارا میں اصلاح پسندوں کا قتل

بات یہ ہوئی کہ جب فروری ۱۹۱۷ء میں زار کی حکومت گئی، تو نوجوان بخاری لبرلوں نے
اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امیر بخارا سے کچھ آئینی اصلاحات تسلیم کرا لی تھیں۔ چنانچہ اس کے
نتیجے میں امیر کے سابق رجعت پسند مشیر جلاوطن کردیئے گئے۔ اور نظر یہ آتا تھا کہ اب قرون
وسطیٰ کے دور کے اس شہر میں پارلیمانی اور جمہوری نظام معرض وجود میں آگیا ہے۔ لیکن
اپریل میں پھر رجعت پسند غالب آگئے۔ اور امیر کے سابق مشیر خواجہ نظام الدین نے جلاوطنی
سے واپس آکر لبرلوں کے خلاف مہم شروع کردی، انہوں نے بخارا کے عوام کو مشتعل کر کے
اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور اب آئینی اصلاحات کے بجائے بے دین جدیدیین اور شرع محمدی
کے باغیوں کو سخت سزا دینے کے حق میں مظاہرے شروع ہوگئے۔ اس عوامی سیلاب
کے سامنے نوجوان بخاری لبرلوں کے پاؤں ٹھہر نہ سکے، ان کی اکثریت کو گرفتار کر لیا گیا باقی
بھاگ گئے۔ اور بہت سے عوام اور امیر کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا ان کو سخت
اذیتیں دی گئیں۔ اگر بخارا میں روسی سفیر بیچ میں نہ پڑتا۔ اور اس کی طرف سے مداخلت
کی دھمکی نہ دی جاتی، تو نوجوان بخاری لبرلوں کا بالکل صفایا کر دیا جاتا۔

یہ انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء سے پہلے کے واقعات ہیں۔ اس انقلاب کے بعد نوجوان بخاریوں کے ایک وفد خجند گیا اور وہاں کی مسلم کانگرس سے اعانت چاہی، پھر وہ تاشقند پہنچے، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس وفد کی قیادت فیض اللہ خواجہ، جو بخارا کے ایک دولت مند ترین خاندان میں سے تھا، کر رہا تھا۔ خواجہ فیض اللہ کے اصرار پر مارچ ۱۹۱۸ء میں امیر بخارا کے خلاف ایک فوجی مہم تاشقند سے بھیجی گئی، جو بری طرح ناکام ہوئی۔ اس کے بعد کچھ نوجوان بخاری کوئی نشان تک سمرقند اور تاشقند میں بطور پناہ گزینوں کے رہے۔ اور تاشقند کے بالشویک ان کی مدد کرتے رہے۔ وہ جدیدین میں شامل ہو گئے جن میں سے ایک مختصر سا مگر مضبوط گروپ سوویت حکومت سے تعاون کا حامی تھا۔ اسی زمانے میں جدیدین نے کمیونسٹ پارٹی سے بھی روابط پیدا کرنے شروع کر دیئے اور ۱۹۱۹ء ۔ ۱۹۲۰ء میں ماسکو کی مدد سے ان کی پارٹی کے اندر کافی طاقت ہو گئی۔

تاشقند کے بالشویک حکمرانوں کی بعض بے اعتدالیوں کی طرف حکومت ماسکو کی توجہ ہوئی، تو ماسکو سے ایک خصوصی کومیسار بھیجا گیا، جس کی زیر ہدایت پانچویں وسط ایشیائی سوویتوں کی کانگرس نے ۳۰ اپریل ۱۹۱۸ء کو "ترکستان خود مختار جمہوریہ" کے قیام کا اعلان کیا، جو سوویت جمہوریتوں کے وفاق سے ملحق تھی۔ اور اس کے لئے ۳۶ ارکان کی ایک مرکزی کمیٹی چنی گئی، جن میں دس مسلمان تھے اور یہ زیادہ تر جدیدین تھے لیکن تاشقند کا حکمران بالشویک گروپ ماسکو کی اجازت سے مزید ایک سال تک مقامی آبادی کو اپنے ساتھ شامل کئے بغیر آزادی سے برسر کار رہا۔

جمہوریہ ترکستان کا قیام

ماسکو کے فرستادہ کومیسار کی زیر نگرانی نئی خود مختار جمہوریہ ترکستان کا نظام کار بنانے کے لئے ۱۷۔ ۲۲ جون ۱۹۱۸ء کو جو پہلی علاقائی پارٹی کانگرس ہوئی اس نے ماسکو کے دباؤ کے تحت اور کومیسار مذکور کی رہنمائی میں مقامی مسلم آبادی کا تعاون حاصل کرنے کے سلسلے میں یہ قراردادیں منظور کیں۔

۱۔ پارٹی کی تنظیمات اور سوویت کے نمائندوں سے ملحق مسلم سیکشنوں کا قیام

۲۔ روسی زبان کی ساری سطح پر کاروبار حکومت کے لئے "مسلم" زبان کا اجرا۔

۳۔ "مسلم" زبان میں مطبوعات کی اشاعت

۴۔ مقامی حالات سے واقف تجربہ کار کارکنوں کو نظم ونسق میں شامل کیا جائے۔
۵۔ مسلم فوجی دستوں کی بھرتی۔
۶۔ مقامی زبانوں میں کمیونسٹ لٹریچر کی اشاعت

خانہ جنگی کے دوران حکومت ماسکو نے تاشقند کے معاملات میں زیادہ مداخلت نہیں کی لیکن فروری ۱۹۱۹ء کے کچھ بعد ماسکو کی طرف سے پھر اسی کو میسارکو لو زیف کو تاشقند بھیجا گیا تاکہ وہ وہاں کی مقامی مسلم آبادی میں کمیونسٹ تحریک کی ترویج کرے۔ اس دفعہ اسے بڑی کامیابی ہوئی، انہی دنوں وسط ایشیائی سو دیتوں کی جو ساتویں کانگرس ہوئی اس میں مقامی دانشوروں بالخصوص جدیدیین نے کیونسٹ پارٹی میں بڑی دلچسپی لی، اس کانگرس میں نصف ڈیلیگیٹ مسلمان تھے۔ تاشقند کا بالشویک حکمراں گروپ اب عملاً بے اثر ہوچکا تھا۔ کچھ دنوں بعد کو لوزیف نے دوسری علاقائی پارٹی کانفرنس سے مسلمان تنظیموں کے علاقائی بیورو کے قیام کی تجویز منظور کرالی۔ اس بیورو میں سابق جدیدی قوم پرست تحریک کے ممتاز رہنما جیسے طرسون خواجہ، ریسکولوف اور نظام الدین خواجہ شامل تھے۔ اس بیورو نے مسلمانوں کو کیونسٹ پارٹی میں بھرتی کرنے کی مہم شروع کی اس میں اسے بڑی کامیابی ہوئی، اور اس طرح وسط ایشیائی علاقائی (ریجنل) کیمونسٹ پارٹی میں مسلمان کیمونسٹوں کا اپنا گروہ منظم ہوگیا۔ اور سابق جدیدی رہنما ایک باثر طاقت بن گئے۔

۲۴۔ ۳۰ مئی ۱۹۱۹ء کو وسط ایشیا کے مسلم کیمونسٹوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس دفعہ ازبک کیمونسٹوں کو اپنی سیاسی شکایات پیش کرنے کا صحیح معنوں میں موقع دیا گیا چنانچہ مسلم ڈیلیگیٹوں نے بڑے جوش سے تاشقند سوویت کے کو میساروں پر تنقید کی اور پارٹی سے اپنے بعض مطالبات منوا بھی لئے۔ کانفرنس نے مشرق کے عوام سے اپیل کی کہ وہ "ہندستان افغانستان، ایران، چین، بخارا ایشیائے کوچک اور مشرقی ایشیا کے پسے ہوئے عوام میں سے۔۔۔" ایک ایک، ایک ایک ایک ایک " کے اس انقلاب کی تائید کریں۔

ماسکو اور اس کے فرستادہ کو لوزیف کی پیہم کوششوں سے جدیدیین جو حال ہی میں کیمونزم میں داخل ہوئے تھے، بہت بڑی تعداد میں سوویت کی انتظامی مشنیری میں

داخل ہوگئے۔ تاشقند کی تیسری علاقائی پارٹی کانگرس منعقدہ یکم جون ۱۹۱۹ء میں وسط ایشیائی سپریم پارٹی آرگن کی گیارہ نشستوں میں چار مسلمانوں کو دی گئیں پانچویں علاقائی پارٹی کانفرنس (وسط جنوری ۱۹۲۰ء) نے مسلمانوں یا زیادہ صحیح الفاظ میں جدیدی گروپ کی پوزیشن وسط ایشیائی پارٹی کی انتظامی مشینری میں اور مضبوط کردی، اور اس دفعہ پارٹی کی علاقائی بیورو میں مسلمانوں کی غالب اکثریت آگئی، اور اس کا سیکرٹری مشہور جدیدی لیڈر طرسون خواجہ مقرر کیا گیا۔

مسلمان کمیونسٹوں اور سوویت کمیونسٹ پارٹی میں اختلافات

اب ان مسلمان کمیونسٹوں اور سوویت کمیونسٹ پارٹی میں اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ مصنف کے الفاظ میں :- " تاشقند کا بالشویک آبادکار حکمراں گروہ تو ختم ہوگیا، لیکن ان کی جگہ زیادہ خطرناک جدیدی کمیونسٹوں نے لے لی۔ اور انہوں نے جیسے ہی اقتدار ہاتھ میں آیا اپنے مقاصد کا اظہار کرنا شروع کردیا۔ اسی پانچویں علاقائی پارٹی کانگرس میں، جس میں مسلمانوں کو اس کی بیورو میں اکثریت حاصل ہوئی تھی، نیز مسلم کمیونسٹوں کی تیسری کانفرنس میں جو اسی پارٹی کانگرس کے ساتھ ہی منعقد کی گئی تھی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ خود مختار جمہوریہ ترکستان کا نام سرکاری طور سے خود مختار جمہوریہ ترک ہو۔ اور ترکستان کی علاقائی کیمونسٹ پارٹی کا نام بدل کر ترک (Turkic) کیمونسٹ پارٹی رکھ دیا۔ مسلمان کیمونسٹ صرف یہیں نہیں رکے، انہوں نے اپنی کیمونسٹ انقلابی تحریک شروع کرنے اور روس کے تمام ترکوں کو ایک ہی علاقائی اور سیاسی وحدت کے تحت متحد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ بظاہر وولگا یورال کے تاتاری سیاست دانوں کے ۱۹۱۷ء کے اقدام کی تقلید کر رہے تھے، لیکن اس دفعہ روسی ترکوں کی اس پان ترک تحریک کا مرکز قازان کے بجائے تاشقند تھا " (مسلسل)

افکار و آراء

پچھلے دنوں جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے نصاب پر دارالعلوم دیوبند کے ادبی اور دینی ماہنامے "دارالعلوم" میں ایک تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اہل علم اور اصحاب درس و تدریس حضرات کے افادے کے لئے یہ تبصرہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ (مدیر)

مغربی پاکستان کی سابق مسلمان ریاست بہاولپور میں "جامعہ عباسیہ" ایک پرانی اسلامی درسگاہ تھی۔ جسے اب "جامعہ اسلامیہ" کا نام دے کر نئے انتظامات اور نئے ارادوں کے ساتھ جدید شکل دی گئی ہے نئے انتظامات کے ماتحت جامعہ نے اپنا نیا نصاب تعلیم مقرر کیا ہے۔ جس میں قدیم و جدید علوم کو باہم جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جامعہ نے اپنی تعلیم و انتظامات کا جو خاکہ شائع کیا ہے اگر یکسوئی اور شغف و محنت کے ساتھ اس خاکہ میں عملی رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی اور جامعہ کے ارباب انتظام نے مسلمانوں کی نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق اپنے فرائض کو محسوس کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس جامعہ کے فضلا قدیم و جدید علوم کے جامع اور ملت اسلامیہ کی موجودہ نسل کے بعض شفا بن سکیں۔

مولانا جمیل الدین صاحب فاضل دیوبند کنٹرولر آف ایگزامنیشنز نے جامعہ کے نصاب اور لائحہ عمل کی ایک ایک کاپی ہمیں بھی اس خیال سے بھیجی تھی کہ ہم اس پر اپنی رائے ظاہر کریں۔ ہمارے محترم مولانا ظفیر الدین صاحب نے احقر اور دوسرے حضرات سے مشورہ کے بعد جامعہ کے نصاب اور لائحہ عمل پر ذیل کی مختصر تحریر میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ امید ہے کہ جامعہ کے ارباب انتظام ذیل میں پیش کردہ مشوروں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ جو حضرات جامعہ کے نصاب اور لائحہ عمل کو دیکھنے کے خواہش مند ہوں وہ مولانا جمیل الدین احمد صاحب سے جامعہ اسلامیہ بہاولپور (مغربی پاکستان) کے پتہ پر رجوع فرمائیں۔

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

خاکسار نے جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا تعارف، نصاب تعلیم، داخلہ فارم کا بغور مطالعہ کیا، جامعہ اسلامیہ بہاولپور جن مقاصد کو لے کر سامنے آیا ہے، وہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے باعث مسرت ہے۔ جن چیزوں کی کمی بری طرح کھٹکتی تھی، پاکستان میں بہاولپور نے ان کی تلافی کے لئے جس عزم کے ساتھ قدم اٹھایا ہے، اس کے لئے ارباب جامعہ مستحق مبارکباد ہیں۔ اللہ تعالٰے ان کے حوصلوں میں بلندی، ارادے میں پختگی اور عمل میں سرگرمی عطا فرمائیں۔

جامعہ کے مقاصد یہ بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ علوم اسلامیہ کا مطالعہ، تحفظ اور اشاعت

۲۔ طلبہ کو اس انداز سے تعلیم دینا کہ وہ دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے سرفراز ہو سکیں۔

۳۔ ساتھ ہی ان میں ایسی وسیع النظری پیدا کی جائے کہ وہ جدید طبعی اور معاشرتی علوم کی روح اور طریق کار کو سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہو جائیں۔

۴۔ سیاسیات سے بلند رہ کر تحقیق اور خدمت دین میں مصروف رہنا۔

۵۔ محکمہ اوقاف کیلئے ایسے علماء فراہم کرنا جو محکمہ کی گوناگوں ضروریات کو پورا کر سکیں۔

۶۔ عام اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم کے لئے جن اساتذہ کی ضرورت ہے ان کی فراہمی میں جامعہ مدد دے گا۔

۷۔ ایک تعلیمی ادارہ کا اصل کام طلبہ کی ذہنی، علمی، اخلاقی اور روحانی تربیت ہے۔ جامعہ اسلامیہ میں یہ حقیقت پوری طرح پیش نظر رکھی گئی ہے۔

اس کے علاوہ لائحہ عمل کے تحت اس کی وضاحت بھی موجود ہے۔

۱۔ اساتذہ بھی اچھے سے اچھے حاصل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

۲۔ طلبہ بھی منتخب اور محدود تعداد میں ہوں گے۔

۳۔ نصاب کی تشکیل میں قدیم اور جدید کی بہترین خوبیاں اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴۔ اہم تعلیمی تجربہ کے لئے مناسب اسلامی ماحول تیار اور مہیا کیا جائے گا۔

۵۔ جہاں اسلامی اخلاق اور اسلامی طرز زندگی پر زور ہوگا۔

۶۔ ہر ممکن کوشش اس امر کی ہوگی کہ ادارہ وسیع المطالعہ، وسیع النظر، سچے مسلمان اور

سچے پاکستانی علماء کی تربیت کر سکے۔ یہ مقاصدان تمام ارباب فضل و کمال اور اصحاب فکر و نظر کے نزدیک لائق تحسین و ستائش ہیں جن کی انگلیاں زمانہ اور رفتار زمانہ کی نبض پر رہتی ہیں، اور جو اپنے دلوں میں ملت اسلامیہ کی سربلندی و اشاعت کا بھرپور جذبہ رکھتے ہیں۔

اتنے اہم کام کی انجام دہی کے لئے جن اساتذہ اور علماء کا انتخاب عمل میں آیا ہے ان کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارباب جامعہ نے پوری بصیرت و دوراندیشی سے کام لیا ہے۔ قدیم و جدید دونوں علماء اس فہرست میں نظر آتے ہیں۔ اساتذہ کے انتخاب میں خالص علمی فکر کار فرما ہے جس کی آج کل بے انتہا کمی محسوس ہوتی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات اور قدیم علوم شرقیہ کے ماہرین میں دن بدن جو بُعد بڑھتا جا رہا ہے، اور جو نتائج کے اعتبار سے بہت زیادہ مہلک ہے، انشاء اللہ جامعہ کے طرز تعلیم، اساتذہ، اور نصاب سے یہ بُعد بتدریج ختم ہو جائیگا۔

اس بات سے بے حد مسرت ہوئی کہ ارباب جامعہ کمیت سے زیادہ کیفیت پر نظر رکھنے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اس پر پوری پختگی دکھلائی تو جامعہ کی سعی اور جد و جہد انشاء اللہ نتیجہ خیز ثابت ہوگی اور جو مقاصد پیش نظر ہیں ان میں کامیابی یقینی بن جائیگی۔

داخلے کے لئے جو شرائط ہیں وہ بھی مناسب ہیں۔ قواعد میں غالباً نظر کی چوک کی وجہ سے کہیں کہیں ناہمواری سی نظر آئی۔ مثلاً داخلہ جن درجات میں ہو سکیں گے ان میں درجۃ الاجازۃ کا صرف سال اول بتایا گیا مگر تفصیل میں سال سوم میں داخلہ کی شرط بھی بیان کی گئی ہے۔　　(تعارف ص۱۵)

توسیعی مشاغل کا سلسلہ بھی پسند آیا۔ تجربات کی روشنی میں حسب ضرورت مناسب تغیر و تبدل بھی ہوتا رہے تو اچھا ہے۔ مجلۃ الجامعہ کا اجراء بھی ہر طرح انشاء اللہ مفید ثابت ہوگا اور اس کے ذریعہ طلبہ اور اساتذہ میں علمی ذوق کی پرورش کا بہترین سامان مہیا کیا جا سکتا ہے۔ مختلف درجات کے لئے جامعہ نے جو وظائف مقرر کئے ہیں وہ بھی مناسب ہیں۔ درجۃ التخصص کے لئے سو روپے ماہانہ اور نیچے درجوں کے لئے پچاس یا طعام و قیام کا نظم۔ تعطیلات کے خانے میں یہ بات اجنبی سی معلوم ہوئی کہ رمضان کے بجائے گرمی کی چھٹی رکھی گئی۔ گو موسم کی شدت کے باعث ایسا کرنا کچھ زیادہ غیر مناسب بھی معلوم نہیں ہوتا۔

نصاب پر نظر ڈالی نصاب بڑی حد تک ٹھیک ہے مگر پھر بھی کہیں کہیں　　ناہمواری نظر آئی ممکن ہے کہ آئندہ تجربہ سے وہ کمی بھی دور ہو جائے۔ گو موجودہ دور میں نصاب سے زیادہ اساتذہ کرام کی علمی مناسبت، لیاقت، تعلیم و تربیت اور طلبہ عزیز کی محنت و شوق کو علمی ترقی کے منازل طے کرنے میں دخل ہے، صرف نصاب کے رد و بدل سے کبھی بھی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک اساتذہ اور طلبہ کی توجہ جیسی چاہیئے نہ ہو۔

چھٹی جماعت میں ہماری قراۃ الرشیدہ، اور معلم الانشاء حصہ اول کے بعد ساتویں سال ترجمہ الم کچھ مناسب نہیں کیونکہ طلبہ ترجمہ میں دلچسپی نہیں لے سکیں گے۔ تیسیر القرآن کے نام سے مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی بہاری کا ایک رسالہ ہے۔ جس میں قرآن کے تمام مفرد و مرکب الفاظ ایک سلیقے سے جمع کر دیئے گئے ہیں۔ پہلے یہ رسالہ پڑھا دیا جائے، پھر ترجمہ رکھا جائے تو بہت بہتر رہے گا۔ اور طلبہ بہت شوق سے ترجمہ پڑھ سکیں گے۔ منیۃ المصلی کی جگہ نورالایضاح ہوتی، اور نورالایضاح کی جگہ قدوری ہوتی تو بہتر ہوتا۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہوتا کہ دسویں جماعت میں قدوری کی جگہ ھدایہ جلد اول رکھ دی جاتی، اور گیارھویں سال کی جگہ ہدایہ جلد ثانی اصحاب درس و تدریس خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہدایہ کس پایہ کی کتاب ہے۔ اور اس سے طلبہ میں غیر شعوری طور پر غور و فکر اور استنباط و استخراج مسائل کی کیسی استعداد پرورش پاتی ہے اور عبارت شرح وقایہ سے بہت آسان اور دماغ ہدایہ اولین کو نظر انداز کر دینا نصاب کی ایسی خامی ہے جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ یہ ایک کتاب ایسی ہے جو ذہین و ذکی طلبہ کے جوہر خوابیدہ کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتی ہے، اور فہم و دانش کے گوشہ گوشہ کو ضیا بخشتی ہے۔

جلالین نصف اول کے ساتھ تلخیص الاتقان نامی رسالہ رکھنا بہت مناسب ہوگا تاکہ طلبہ روشنی میں چل سکیں بیضاوی کے ساتھ التبیان لبعض المباحث المتعلق بالقرآن پڑھائے جائیں۔ یہ ایک بہترین رسالہ ہے اساتذہ مطالعہ کر کے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں، کتاب ذرا لمبی ہے اس کے ضروری مباحث پڑھائے جائیں۔ درجۃ التخصص حدیث میں مطالعہ کے اندر حضرت علامۃ العصر محدث جلیل حضرت فضیلۃ الشیخ مولانا الورشاہ کشمیری کی امالی فیض الباری معارف السنن، اور العرف الشذی جیسی کتابیں ضرور رکھنی چاہئیں تاکہ طلبہ میں احادیث کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرز تدریس محققانہ و محدثانہ اور خالص عالمانہ ہے۔ درجۃ التخصص کے طلبہ کو ان کتابوں کے مطالعہ سے بڑا فائدہ ہوگا۔ اسی طرح درجۃ التخصص فقہ و قانون میں حضرت نانوتوی کے چھوٹے چھوٹے رسالے اور مکتوبات کا مطالعہ بھی بے حد مفید رہے گا۔

ان رسائل کے مطالعہ سے قانون کی گہرائی تک پہنچنے میں استعداد کو قوت و جلا حاصل ہوگی یہ رسائل گو اردو یا فارسی میں ہیں مگر ان میں جو طرز فکر ہے وہ ہر طرح درس نتیجہ خیز اور طرز استدلال میں نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نصاب مجموعی طور پر مناسب خوش گوار اور بہتر ہے ۔

شاہ ولی اللہ رح کے فلسفۂ تصوّف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفٰے قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ وردنا حت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت دو روپے

المسوّٰی من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ——— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۲۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم نے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّٰی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصّوں میں — قیمت ۲۰ روپے

ہمعات (فارسی)

تصوّف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوّف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفسِ انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

thly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کر

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طبا
واشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن
جو کتابیں دستیاب ہوسکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کر
کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم
کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُنہیں فروغ دینے
غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع ؟

قیمت سالانہ:- آٹھ روپے   فی پرچہ:- پچھتر پیسے

الرحیم
حیدرآباد

جلد ۲ رجب المرجب ۱۳۸۴ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۴ء نمبر ۷

فہرستِ مضامین

شذرات

حال ہی میں سعودی عرب میں شاہ سعود کو مسند اقتدار سے برطرف کرکے ان کے چھوٹے بھائی اور ولی عہد سلطنت امیر فیصل کو بادشاہ بنا دیا گیا ہے۔ گو یہ تبدیلی پرامن طریقے سے ہوئی اور اس سلسلے میں نہ کوئی ہنگامہ ہوا اور نہ کسی کا خون بہا، لیکن شاہ سعود کی جگہ امیر فیصل کا بادشاہ بننا سعودی عرب میں ایک بہت بڑے "انقلاب" کی نشان دہی کرتا ہے، اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربی ممالک میں اندر ہی اندر کیا اجتماعی تبدیلیاں آرہی ہیں اور آہستہ آہستہ سیاسی اقتدار کس طبقے کے ہاتھ میں جا رہا ہے۔ دراصل یمن میں صدیوں کی "اماموں" کی خاندانی حکومت کے بعد جنرل سلال کا وہاں جمہوریت قائم کرنا جزیرۂ عرب کے لئے ایک بڑے دور رس اور ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ ہے، اور سعودی عرب میں جو کچھ ہوا اسے اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔

شاہ سعود کے اقتدار کے پشت پناہ زیادہ تر وہ طبقے تھے جنہیں ہم قدامت پسند کہتے ہیں اور ان میں سے اکثریت نجد کے قبائل سرداروں کی تھی۔ گو انہوں نے نئے زمانے کی تمام مادی "طیبات" کو اپنا لیا تھا۔ اور بظاہر ان کا رہن سہن بالکل "ماڈرن" تھا، لیکن ذہناً وہ نئے زمانے کے تقاضوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہ تھے وہ نہ تو حکومت کے نظم و نسق کو آج کی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے حق میں تھے اور نہ وہ اس پر آمادہ تھے کہ مالیات میں شاہی تصرفات پر کوئی روک ٹوک ہو۔ گو فیصل کو برسر اقتدار لانے میں علماء اور مشائخ کے علاوہ خود شاہی خاندان کے بعض افراد کا بھی ہاتھ ہے لیکن فیصل کی اصل طاقت حجاز و نجد کا وہ طبقہ ہے جسے عربی میں "متنورین" یعنی روشن خیال کہا جاتا ہے، خود شاہ فیصل عربی کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقف ہیں اور ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ نجد کے بجائے حجاز میں گزرا ہے پھر اپنے مرحوم والد کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی وہ برابر وزیر خارجہ رہے۔ اور اس حیثیت سے وہ سعودی عرب سے باہر کی دنیا کو خوب جانتے ہیں۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک عربی دنیا میں دو طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار تھیں، ایک طرف سعودی عرب

اور یمن کی خاندانی وشخصی اور بہت حد تک مطلق العنان بادشاہتیں تھیں۔ اور دوسری طرف مصر و شام و عراق کی جمہوری قوتیں تھیں، اس تصادم کا پہلا نشانہ یمن بنا، جہاں جنرل سلال یمن کے فرمانروا امام بدر کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب عرب جمہوری قوتوں کی زد سعودی عرب پر تھی۔ خدانخواستہ اگر وہاں کچھ دیر وہی نظام حکومت رہتا، جس کے مظہر شاہ سعود تھے۔ تو کچھ بعید نہ تھا کہ سعودی عرب کا بھی وہ حشر ہوتا، جو یمن کا ہوا۔ لیکن شاہ فیصل کے برسر اقتدار آنے اور حجاز ونجد کے طبقۂ "متنورین" کے شریک حکومت ہونے سے بہت اغلب ہے کہ ضروری اصلاح احوال بغیر انتہا پسندانہ ذرائع کے ہی ہو جائے۔

گذشتہ صدی کے اوائل ہی سے مسلمان ملکوں میں قدامت پسندی اور تجدید کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے ترکی اس کے نرغے میں آیا، اور چونکہ وہاں کے قدامت پسند گروہ نے زمانے کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے وہاں اس کا ردِ عمل بھی بڑا شدید ہوا۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے کچھ بعد کا واقعہ ہے۔ اب دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک ایک کر کے تمام عرب ملکوں میں بھی قدامت پسندی اور تجدید کی یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے مصر بہت حد تک تجدید کا ہراول ہے۔ اور وہ اس لئے کہ وہاں نیا تعلیم یافتہ "متنورین" کا طبقہ دوسرے عرب ممالک سے بہت زیادہ ہے اور ناصر یا ناصریت دراصل اسی طبقے کی فطری امنگوں کا ایک عملی مظہر ہے۔

خدا کرے شاہ فیصل کے برسر اقتدار آنے سے سعودی عرب اس افراط و تفریط سے بچ کر راہ اعتدال پر گامزن ہو سکے۔ اور اس طرح یہ سر زمین مقدس جو مہبط وحی ہے اور جہاں دنیا کے کونے کونے سے ہر سال لاکھوں مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے آتے ہیں، وہ نہ صرف عربی ممالک کے لئے بلکہ کل دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ بن سکے

زندگی کے کسی دور میں بھی نہ تو قدامت سے انکار ممکن ہے اور نہ جدید سے ہی آنکھیں بند کی جا سکتی ہیں ضرورت زندگی کے معنوی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے قدیم وجدید کو ہم آہنگ کر کے آگے بڑھنے کی ہوتی ہے۔ ہم مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے قدیم اور جدید طبقے ایک دوسرے سے الگ الگ دو متوازی راہوں پر چل رہے ہیں۔ غیر ملکی حکومتوں کے دوران تو ان کی باہمی کشمکش جو فطری ہے، دبی رہی، لیکن جیسے جیسے یہ مسلمان ملک سیاسی طور سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں، ان کے قدیم اور جدید طبقوں کی یہ کشمکش بلکہ مخاصمت اوپر سطح پر آتی جا رہی ہے، اور اکثر جگہ اس نے باقاعدہ تصادم کی شکل اختیار کر لی ہے اس میں شک نہیں کہ

مسلمان ملکوں کے جدید طبقے ان کی کل آبادی میں اقلیت میں ہیں، لیکن اتفاق سے بیشتر مادی وسائل ان کے قبضے میں ہیں، پھر ان ملکوں کا نیا معاشی و صنعتی نظام بھی انہی کے لئے زیادہ سازگار ہے، چنانچہ اس ڈیڑھ صدی میں جس مسلمان ملک میں بھی قدیم و جدید کا کھلم کھلا تصادم ہوا۔ یہی دیکھنے میں آیا کہ اس میں جیت جدید طبقوں کی ہوئی اور قدیم گروہ کو مجبوراً ان کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس کی تازہ ترین مثال وہ سیاسی تبدیلی ہے جو حال ہی سعودی عرب میں ہوئی اس کی ابتدا ترکی میں سلطان محمود ثانی (۱۸۰۸ء - ۱۸۳۹ء) اور مصر میں محمد علی پاشا سے ہوئی جنہوں نے سب سے پہلے فوج کو یورپی طرز پر منظم کیا۔ اور جو اس کے مخالف تھے انہیں بڑی سفاکی سے کچل دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں قدیم و جدید کا اس طرح کا تصادم مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی معنوی و مادی دونوں حیثیتوں کے لئے بڑا نقصان دہ ہے۔ اب جب کہ غیر ملکی حکومتوں اور خود اپنے مستبد و مطلق العنان ملکی حاکموں کے بجائے سیاسی اقتدار خود مسلمان جمہور کو منتقل ہو رہا ہے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ قدیم و جدید طبقوں میں پچھلی ڈیڑھ صدی میں جو بعد پیدا ہو گیا ہے، اسے دور کرنے کی کوششیں ہوں۔ اور مسلمان بحیثیت مجموعی نہ کہ ان کا ایک مخصوص طبقہ زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھے۔ اور قدیم و جدید کی موجودہ کشمکش ختم ہو۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، یہاں کی صورت حال یہ ہے کہ قدیم یا دوسرے لفظوں میں دینی طبقوں کی اپنی دنیا ہے، اور وہ طبقے جو نئے طریقہ تعلیم کی پیداوار ہیں، ان کی اپنی دنیا ہے۔ دینی طبقے اپنے پرانے مسلک پر بدستور گامزن رہنا چاہتے ہیں اور انہوں نے مذہبی انجمنوں اور عربی مدارس کی اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجد یں بنا رکھی ہیں، وہ انہیں ہر حال میں قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آج اس دور میں نو آزاد مسلمان قومی حکومتوں کو جس قسم کی فکری و عملی اجتماعیت کی ضرورت ہے وہ اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں اسی طرح جدید طبقے بے عنان آگے کو سرپٹ دوڑنا چاہتے ہیں۔

اس قدیم اور جدید کے روز افزوں بعد کو بعض مسلمان ملکوں میں محکمہ اوقاف اور اس سے متعلق جامع ازہر جیسے تعلیمی اداروں سے دور کرنے کی کوشش ہو رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی اس بعد کو صرف اس طرح دور کیا جا سکتا ہے، ورنہ آگے چل کر اس کا نتیجہ وہی ہوگا، جو بعض دوسرے مسلمان ملکوں میں ہو چکا ہے

شریعت کا جادۂ قویمہ شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں

غلام مصطفیٰ قاسمی

شریعت کے لغوی معنی اگرچہ شاہراہ، منہاج اور پانی کا گھاٹ وغیرہ آئے ہیں، لیکن اصطلاحی معنوں میں شریعت سے مراد وہ الٰہی احکامات ہیں جنہیں اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اتارا ہے تاکہ وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لائے۔ اور ان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرے۔

شریعت کے یہ احکامات دو قسم کے ہیں۔

۱۔ معتقدات یہ کیفیتِ اعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں علم کلام کی تدوین ان احکام کے لئے ہوئی ہے۔

۲۔ وہ احکام جن کا تعلق کیفیتِ عمل سے ہے۔ احکام کی اس دوسری قسم کا نام فرعی اور عملی ہے۔ علم فقہ میں ان ہی احکام سے بحث کی جاتی ہے۔ احکام کی ان دو اقسام کی تفصیل میں اگرچہ اسلام کے مختلف طبقوں کا اختلاف رہا ہے لیکن اجمالی طور پر یہ سب فرقے اس پر متفق ہیں کہ شریعت نام ہے اس قانون الٰہی کا، جس کو پیغمبر اسلام انسانیت کی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے لئے اپنے پروردگار کی طرف سے لائے۔ اس لحاظ سے شریعت کے احکام کی اہمیت مسلم ہے۔ اور اکراہ و اضطرار کے علاوہ اس کے کسی ابدی حکم سے انحراف ناروا ہے۔

ائمۂ فقہا کی طرف سے شریعت کے ماخذ اگرچہ چار بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی کتاب اللہ سنت، اجماع امت اور قیاس۔ مگر سب نے اصل ماخذ کتاب اللہ کو ہی مانا ہے، گویا نص صریح کے ہوتے ہوئے کسی بھی دوسری دلیل کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ علمائے اسلام

میں سے بعض محققین کی تو یہ رائے ہے کہ احادیث نبوی کا ایک حصہ خود قرآن مجید سے ہی مستنبط اور اس کے لئے بمنزلہ شرح کے ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ایک جگہ حدیث کے علوم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ومن علومہ تفسیر القرآن والاستنباط منہ وھو اعظم العلوم. وسنورد علیك منہ کفافا۔	اور حدیث کے علوم میں سے ایک علم قرآن کی تفسیر اور اس سے احکام کا استنباط ہے، اور یہ بہت بڑا علم ہے ہم اس سے یہاں کچھ ذکر کرتے ہیں
امر اللہ سبحانہ باشیاء مطلقۃ کالصلوۃ، والزکوۃ۔ وکقولہ: سبح اسم ربك الاعلی، وسبح بحمد ربك وغیر ذلك فوقتھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوقات معینۃ۔ وامر اللہ بامور کقوموا وکبروا واتل ما اوحی الیك، وارکعوا واسجدوا فبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھا ارکان الصلوۃ۔	(مثلاً) اللہ پاک نے چند اشیاء کے متعلق اجمالی حکم فرمایا ہے جیسے نماز، زکوٰۃ اور جیسے یہ قول باری تعالیٰ کہ تو اپنے بلند پروردگار کے نام سے تسبیح پڑھ اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کہہ۔ اسی طرح دوسری کئی آیات ہیں۔ اس کے بعد پیغمبر علیہ السلام نے اس کے لئے اوقات معین فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے قیام، تکبیر، تلاوت قرآن، رکوع اور سجدہ کا حکم فرمایا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے ان کو اس طرح بیان فرمایا کہ ان سب احکام کو نماز کے ارکان بتائے۔

اسی جگہ آیات قرآنی کی چند دوسری مثالوں کے ذکر کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

ونحن قد تتبعنا جمیع ما وصل الینا من الاحادیث الواردۃ فی کتاب الصلوۃ فوضح لنا انھا مستنبطۃ کلھا من کتاب اللہ سبحانہ وتعالیٰ	اور کتاب الصلوۃ میں جتنی احادیث وارد ہمیں ملی ہیں، ان میں غور و فکر کرنے کے بعد ہمیں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ سب احادیث حکمی استنباط کے ساتھ کتاب اللہ سے ماخوذ اور مستنبط ہیں

استنباطا علميا وعسى ان نخيطه في رسالة منفرزة۔[1]

اور ہم اس موضوع پر ایک جامع اور مستقل رسالہ لکھنے کا خیال رکھتے ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں جب اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوا۔ اور اس کے ساتھ نئے واقعات و مسائل بھی درپیش آئے تو امت محمدیہ کا ایک طبقہ جن کو "مجتہدین" کہا جاتا ہے، اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنی علمی کوششیں شروع کیں، ان کو احکام کی علل تلاش کرنا پڑیں، جنہیں شارع علیہ السلام نے بصراحت یا بدلالت بیان فرمایا تھا۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

ان من جملة احكام الشرع انه صلى الله عليه وسلم عهد الى امته صريحا او دلالة انه متى اختلف عليهم نصوصه او اختلف عليهم معانى نص من نصوصه فهم مامورون بالاجتهاد واستفراغ الطاقة فى معرفة ما هو الحق من ذلك[2]

من جملہ احکام شریعت کے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بصراحت یا بدلالت یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب ان میں آپ کے منصوص احکام کے بارے میں اختلاف ہو۔ یا آپ کی نصوص میں سے کسی نص کے معنی میں وہ باہم مختلف ہوں تو ان کو حکم ہے کہ اجتہاد کریں اور ان اختلافی احکام اور معانی میں سے امر حق معلوم کرنے میں خوب طبیعت کا زور لگائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء کی یہ متفقہ رائے ہے کہ جس حکم شرعی کو مجتہد اپنی کوشش اور اجتہاد سے استنباط کرتا ہے، وہ شارع علیہ السلام کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ

---

[1] الخیر الکثیر (عربی) صفحہ ۹۶ مطبوعہ مجلس علمی

[2] عقد الجید تالیف شاہ ولی اللہ صفحہ ۳۰ مطبوعہ مجتبائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ سے لیا گیا ہو، یا وہ اس علت کی طرف منسوب ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ماخوذ ہے۔

شاہ صاحب کے الفاظ میں اسے یوں زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

کل حکم یتکلم فیہ المجتھد باجتھادہ منسوب الی صاحب الشرع علیہ الصلوات والتسلیمات اما الی لفظہ او الی علۃ ماخوذۃ من لفظہ[1]

جس حکم میں مجتہد اپنے اجتہاد سے گفتگو کرتا ہے، وہ شارع علیہ الصلوات والتسلیمات کی طرف منسوب ہوتا ہے خواہ آپ کے الفاظ مبارکہ کی طرف منسوب ہو یا اس علت کی طرف جو آپ کے الفاظ سے لی گئی ہے۔

جب ان مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مساعی جمیلہ سے شریعت کے مسائل اور احکام مدون ہو چکے، تو ان سے بلا ضرورت باہر جاکر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ شاہ صاحب نے ان مجتہدین کے مذاہب اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو چھوڑنے اور ان سے باہر جانے کی ممانعت کے بارے میں ایک جگہ ایک باب باندھا ہے۔ جس کے شروع میں وہ فرماتے ہیں۔

اعلم ان فی الاخذ بھذہ المذاھب الاربعۃ مصلحۃ عظیمۃ وفی الاعراض عنھا کلھا مفسدۃ کبیرۃ ونحن نبین ذلک بوجوہ۔[2]

جاننا چاہیئے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب کے سب سے روگردانی کرنے میں بڑا فساد ہے اور ہم اس بات کو کئی وجہوں سے بیان کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے ان وجوہ کی تفصیل کے بعد علامہ ابن حزم اندلسی پر تقلید کو حرام قرار دینا پر مبسوط رد فرمایا ہے۔

اسلام کے اوائل دور سے لے کر تیسری اور چوتھی صدی تک شریعت کے بارے

---

[1] عقد الجید صہ ۲۹ [2] ایضاً صہ ۳۱۔

میں بڑا اہتمام رہا اور اس سلسلے میں اجتہادی رنگ کی تعلیم بھی جاری رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنے صحابہ کو دینی مسائل کی علمی اور عملی تعلیم فرماتے تھے۔ آپ کے چند صحابہ تو ایسے عظیم مجتہد اور قانون شریعت کے بڑے عالم نکلے کہ آپ کے عہد مبارک میں بھی وہ فتوے دیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ کو پیارے ہوگئے تو دوسرے صحابہ ان فقہاء صحابہ ہی کی طرف شرعی مسائل میں رجوع کرتے تھے۔ پھر تابعین نے صحابہ سے شریعت کی تعلیم حاصل کی۔ اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔

مدینہ منورہ چونکہ مہبط وحی تھا۔ پھر تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے آخری دور تک جمہور صحابہ کا مسکن اور مقر مدینہ طیبہ ہی رہا اسلئے مدینہ منورہ کے کئی تابعی بزرگوں نے فقہ و حدیث کے متعلق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے جو متعدد روایتیں اور اقوال منقول تھے ان کو جمع کرنے کی کوشش کی مدینہ منورہ میں سات فقہاء ایسے ہوئے جنہوں نے فقہ میں عظیم مرتبہ حاصل کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اگرچہ صحابی تھے لیکن اپنے والد بزرگوار فاروق اعظمؓ کے فیصلوں کے متعلق فقہائے سبعہ میں سے ایک فقیہہ سعید بن میسب سے دریافت کرتے تھے کیونکہ سعید بن میسب کو صحابہ کے فیصلوں پر بڑی دسترس تھی[1]۔ ان سات فقہا کے علوم اور مسائل امام مالکؒ کے اساتذہ اور مشائخ تک پہنچے، جن کو امام دار الہجرہ مالک نے جمع کیا اور ترتیب دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح یہ مذہب ان کی طرف منسوب ہوا جس کو بڑے بڑے علماء دلائل کی بنا پر قرناً بعد قرن مانتے آئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

لانها (ای المدینۃ) ماوی الفقهاء و مجمع العلماء فی کل عصر ولذلک تری مالکا یلازم محجتهم[2]

اور یہ اس لئے کہ مدینہ طیبہ ہر عہد اور ہر زمانہ میں فقہائے اسلام اور علماء کا ملجا و ماوی اور مرکز رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام مالک ان کے طریق کو نہیں چھوڑتے۔

---

[1] مقالات الکوثری صفحہ ۱۳۰ مطبوعہ مصر

[2] حجۃ اللہ البالغۃ صفحہ ۱۴۵ طبع مصر

باقی مذاہب کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ مثلاً کوفہ جس کی بنیاد حضرت فاروق اعظم نے رکھی اور ان کے ارشاد کے مطابق عرب کے مختلف قبائل وہاں بسائے گئے اور جن کی تعلیم کے لئے فاروق اعظم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کی طرف یہ کہہ کر روانہ فرمایا اے اہل کوفہ! عبداللہ بن مسعود جیسے فقیہہ کی تو مجھے بھی ضرورت تھی لیکن میں اپنے اوپر تمہیں ترجیح دے کر اسے تمہاری طرف بھیج رہا ہوں۔

جملہ کتب حدیث اور کتب طبقات عبداللہ بن مسعود کی عظمت شان سے مملو ہیں آپ کے مخصوص تلامذہ میں سے علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، عمرو بن میمون، ربیع بن خیثم اور مسروق شمار کئے جاتے ہیں بہت زیادہ مستفید ہوئے اور یہ سب بالعموم اور علقمہ بالخصوص حضرت ابن مسعود کے فیض صحبت سے بہت زیادہ مستفید ہوئے۔ بقول علامہ ذہبی یہ کسی دوسرے صحابی کو علم میں ان پر ترجیح نہیں دیتے تھے[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود خلافت فاروق اعظم سے لے کر حضرت عثمان کی خلافت کے آخری دور تک کوفہ میں فقہ اور شریعت کی تعلیم دیتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کوفہ فقہا سے بھر گیا اور جب حضرت علی رضؓ نے اپنے دار السلطنت کو کوفہ کی طرف منتقل کیا تو کوفہ میں فقہا کی کثرت کو دیکھکر بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔

رحم اللہ ابن ام عبد (ابن مسعود)	اللہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) پر رحمت فرمائے۔ تحقیق اس نے اس شہر کو
قد ملاء ھذہ القریۃ علماً[1]	علم سے مالا مال کر دیا ہے۔

اس کے بعد سیدنا علیؓ کے علوم سے بھی اہل کوفہ مستفید ہوتے رہے۔ پھر تو یہ شہر کثرت فقہا، محدثین و مفسرین اور علوم لغت عربیہ کے لحاظ سے جملہ بلاد اسلامیہ میں بے مثال شہرت کا مالک بن گیا۔ اور اس کے حضرت علیؓ کے دار الخلافت بننے سے بڑے بڑے فقہا نے اس میں سکونت اختیار کی اور اس شہر کی علمی وقعت بہت بڑھ گئی۔ صرف کوفہ میں بروایت عجلی پندرہ سو صحابہ کرام نے سکونت اختیار فرمائی تھی۔ اور وہ صحابہ ان کے علاوہ ہیں جو کوفہ کے گرد و نواح یا عراق میں سکونت پذیر ہوئے۔

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صلا طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

اب اگر سیدنا علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے تلامذہ کی فہرست تیار کی جائے تو اسکے لئے ایک ضخیم دفتر چاہیئے۔ یہ تو سب ائمہ حدیث کے ہاں مسلم ہے کہ صحابہ کرام عبداللہ بن مسعودؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے مشابہ رکھنے والے سمجھتے تھے۔ بالکل اسی طرح ابن مسعودؓ کے مخصوص شاگرد علقمہ کے متعلق تابعین کی یہ رائے تھی کہ وہ عبداللہ بن مسعودؓ کی سیرت کے حامل ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ان تلامذہ کی تعلیم اور تربیت سے ابراہیم نخعی، ابو اسحاق سبیعی اعمش اور منصور جیسے ائمہ پیدا ہوئے۔

حافظ ذہبی، ابوداؤد سجستانی کے تذکرے میں بعض ائمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعی سیرت میں علقمہ سے مشابہت رکھتے تھے۔ علقمہ عبداللہ بن مسعود سے اور عبداللہ بن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے تھے۔ نقادان حدیث نے تو ابراہیم نخعی کے مراسیل کو بھی صحیح مانا ہے۔ امام شعبی کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ رائے بھی سن لیجئے۔

هو احفظ لها منى وان كنت قد شهدتها مع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی شعبی مغازی کو مجھ سے زیادہ یاد رکھنے والا ہے اگرچہ میں ان مغازی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔

اس جماعت فقہا کی صحبت اور تربیت سے امام ابوحنیفہ پیدا ہوئے ان فقہا کے آثار کو امام ابوحنیفہ کے دو بڑے شاگردوں امام ابویوسف اور امام محمد نے جمع کیا اور کچھ آثار مصنف ابن شیبہ میں مدون ہوئے۔ امام ابوحنیفہ نے اس طریقہ میں ایک اور تحقیقی اضافہ کیا اور وہ یہ کہ ان ائمہ فقہا کے آراء اور علوم کو چالیس تلامذہ (جو کہ بذات خود بہت بڑے فقہا تھے) کی مجلس شوریٰ کے سامنے بحث و تمحیص کے لئے رکھا اور بحث و تحقیق کے بعد جو رائے متفقہ یا کثرت آراء سے منظور کی جاتی تھی اس کو مدون کیا جاتا تھا۔ اور پھر یہ سب آراء امام محمدؒ کی کتب ظاہر الروایۃ میں مدون ہو گئیں۔

خطیب بغدادی ابن کرامہ کی سند سے لکھتے ہیں کہ ہم ایک دن وکیع کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے کسی مسئلے کے متعلق یہ کہا کہ ابوحنیفہ نے اس میں خطا کی۔ یہ سن کر وکیع فرمانے لگے کہ ابوحنیفہ کیسے خطا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ابویوسف اور زفر جیسے قیاس کے ماہر تھے یحییٰ بن ابی زائدہ اور حفص بن غیاث جیسے حفاظ حدیث تھے قاسم بن معن جیسے لغت

عربیہ کے ماہر تھے، اور داود طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد اور متورع تھے جس شخص کے اس قسم کے ہمنشین ہوں وہ خطائیں کر بیٹھے اور اگر خطا کرتے تو یہ سب اس کی تردید فرماتے
امام ابوحنیفہ کے بعد امام شافعیؒ آتے ہیں۔ انہوں نے مدینہ طیبہ اور کوفہ کے علوم کے ساتھ مکہ مکرمہ کے علوم کو ملا دیا۔ امام شافعیؒ نے مکہ کے علوم کو مسلم بن خالد سے حاصل کیا۔ انہوں نے ابن جریج سے اور ابن جریج نے عطا سے اور عطا نے ابن عباسؓ سے یہ علوم حاصل کئے۔ یہاں تک تو ائمہ اہل سنت کے مذاہب فقہ کے متعلق مختصر عرض کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جملہ مذاہب فقہ قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہیں اور اجتہادی مسائل میں ہر ایک امام کا طرز استنباط دوسرے سے الگ ہے اس میں طبائع اور خطوں کے اختلاف کو بھی بڑا دخل ہے، جس کی علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں تصریح فرما دی ہے۔ لیکن آج کا دور ان اختلافات اور امت کے تشتت و افتراق کا متحمل نہیں ہو سکتا چاہے ہم نئے دور کے تقاضوں سے کتنی ہی چشم پوشی کریں اور ان سے آنکھیں بند کر لیں اور کوشش کریں کہ انہیں نہ دیکھیں لیکن حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہو گی اور ہماری اس چشم پوشی سے قوم کا نوجوان طبقہ کبھی مطمئن نہیں ہو گا، یہی وجہ ہے کہ طبقہ علماء سے بصیرت اور غائر نظر رکھنے والے علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے، ہمارے بزرگ دوست اور وقت کے محدث مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے اس سلسلے میں پہل فرمائی ہے۔ جزاہ اللہ خیرا الجزاء۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی مولفات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اپنے دور میں ان اختلافات سے خوش نظر نہیں آتے اور جیسے موصوف نے تصوف کے مختلف مشارب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش فرمائی۔ اسی طرح فقہی اختلافات کو کم کرنے کے بھی وہ بڑے کوشاں تھے۔ آپ کی تصنیفات میں تطبیق کا یہ پہلو اکثر نظر آئے گا، اس لئے آپ کو شریعت کے جادۂ قویمہ کے تعین کے لئے بھی سوچنا پڑا اور آپ نے اس سلسلہ میں اپنی مشہور تالیف تفہیمات الٰہیہ میں جو تحقیق فرمائی ہے اس کو ہم قارئین کے لئے پیش کرتے ہیں۔ یہاں طوالت

لہ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۲۴۷

سے اجتناب کرتے ہوئے اصل عبارت کو چھوڑ کر صرف ترجمہ پر اقتصار کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

دنیا کا مختلف طرق اور مذاہب میں بٹ جانا اور امت کا گروہ در گروہ ہونا ایک ایسا بڑا سانحہ ہے جس نے امت کے عوام اور خواص دونوں کو ڈرا دیا ہے۔ بعض اہل اللہ پر فقہائے اسلام کے ہر قول کا ارتباط شریعت محمدیہ سے منکشف تو ہوا لیکن اس کے لئے اس جادۂ قویمہ کا انکشاف نہ ہوا، جس کو اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کے لئے منکشف کیا۔ اور اس سے اللہ تعالےٰ راضی ہوئے۔ (اصل میں) جس کو یہ طریقہ ہاتھ آیا، اس نے حظ وافر پایا اور جس نے اس کو نہ پایا وہ اس حظ وافر کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اگرچہ تکلیف اٹھانے کی وجہ سے وہ بھی ماجور ہوگا۔ اس قسم کے اہل اللہ فقہا کے بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کے بارے میں خاموش رہے اور مختلف اقوال کے درمیان تطبیق دینے کی یہ صورت نکالی کہ اختلاف کو عزیمت اور رخصت پر حمل کیا (اور یہ کہا کہ) جو شخص عزیمت کی ادائیگی پر قوت رکھتا ہے تو عزیمت پر عمل کرے اور جس کی قوت جسمانی یا قوت روحانی اس کا تحمل نہیں کر سکتی تو وہ رخصت کو اختیار کرے۔ شعرانی نے (اپنی کتاب) میزان میں اس کو مفصل بیان کیا ہے، اور شعرانی سے پہلے اس اصل اور قاعدے کی طرف شیخ محی الدین محمد بن علی بن عربی نے سبقت فرمائی ہے۔

کچھ اہل اللہ ایسے بھی گذرے ہیں کہ ان کو شریعت کا وہ جادۂ قویمہ نظر آیا جو کہ ظاہر شریعت کی طرف رہنمائی کرتا ہو اور وہ طریقہ جس کو جمہور مسلمانوں نے کبار تابعین سے اور تابعین نے کبار صحابہ سے اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح حاصل کیا ہے جیسے کوئی چیز ہاتھ کے ذریعہ لی جائے۔ یا اگرچہ وہ بعینہٖ متوارث نہ ہو، لیکن متوارث سے قوی مشابہت رکھتی ہو، اور ایسے شخص کو اہل الرائے کے مذاہب کناروں کی طرح نظر آئے پھر اس بحث کنندہ متکلم دین کی نصرت اور اس سے مدافعت کا خیال کرتے ہوئے (اپنے زعم میں) راجح کو ترجیح دیتے رہے۔ یہ طریقہ اکثر محدثین کا ہے، انہوں نے اس میں بڑی سعی فرمائی۔

کچھ اہل اللہ ایسے بھی ہیں جن کو (مذکورہ) دونوں باتوں پر اطلاع ہوئی۔ انہوں نے سب مذاہب کو اس طرح مانا کہ سب شریعت کے دائرہ میں داخل ہیں اور ان پر عمل کرنے کی دین میں گنجائش ہے مگر ان میں سے فضیلت جادۂ قویمہ کو ہے، اور یہی طریقہ اللہ تعالےٰ کے ہاں کامل طور پر مرضی اور پسندیدہ ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ مجھے اس نے تیسری جماعت میں سے بنایا۔ اور میرے لئے شریعت کی اصل اور تبیان کو منکشف فرمایا۔ یہ تبیان وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لتبین للناس ما نزل الیھم۔ یعنی تم لوگوں سے اس کو بیان کرتے رہو جو کہ لوگوں کی طرف اترا ہے۔

اس کی مثال (اس طرح سمجھئے کہ) اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ یعنی نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اقامت کا لفظ "قامت السوق" کے عربی محاورے سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں بازار لگ گیا۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بازار میں خرید و فروخت شروع ہو جائے۔ اس سے یہاں مقصد ہے رواج اور اشاعت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد ترویج کو اس طرح بیان فرمایا کہ اوقات نماز کی تعیین فرمائی رکعات نماز کے عدد بتلائے، صفت (یا ہیئت) نماز کی تعلیم فرمائی۔ اذان کو مشروع فرمایا جماعت سے نماز پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ مساجد کی تعمیر اور ان میں حاضر ہونے کو مستحب قرار دیا۔ یہ تمام چیزیں "اقامت صلوٰۃ" کی تبیان اور تفسیر ہیں۔ اگر اس طرح واضح اور مفصل بیان نہ ہوتا تو ہم اس کو کبھی سمجھ نہ سکتے اسی طرح زکوٰۃ دینے کو اس طرح بیان فرمایا کہ نصاب کی تعیین کی اور مقدار واجب، جنس واجب اور دوسری چیزوں کو واضح فرمایا۔

اس کے بعد پھر اس تبیان اور تفسیر کی وضاحت اور تفسیر صحابہ اور تابعین کی طرف سے ہوئی۔ اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اشارہ بھی فرمایا۔ اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔ یعنی میرے بعد ابوبکر اور عمرؓ کی پیروی کرنا اور یہ فرمایا۔

اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم - میرے صحابہ ستاروں کی طرح (روشن) ہیں جس کسی کی پیروی کروگے تو راستہ پاؤ گے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں نماز کو قصر فرمایا۔ سفر ہمارے ہاں مبہم چیز تھی۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رض کے عمل سے اس کی وضاحت ہوگئی کہ وہ چار برد یا منازل سے عبارت ہے۔

اس کے بعد پھر قدمائے مجتہدین کے ہاتھوں اس کی وضاحت اور اس کے اصول اور فروع کی تدوین ہوئی۔ جس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق الآیۃ

اس آیت میں صرف تین اعضا کے دھونے اور چوتھے کے مسح کا ارشاد ہے۔ یعنی چہرہ ہاتھ کہنیوں تک اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا جائے اور سر کا مسح کیا جائے۔ اب مجتہدین نے اس میں اس طرح بحث کی کہ غسل کے معنی ہیں صرف پانی کا بہانا یا اس میں دلک بھی شرط ہے اور وجہ یا چہرے کی حد فلاں جگہ سے فلاں تک ہے اور "الی المرافق" کے معنی ہیں "مع المرافق"۔ یعنی کہنیوں کے ساتھ۔ اور مسح میں صرف مسح کا نام کافی ہے اگرچہ ایک یا دو بال پر ہو یا رُبع راس (چوتھائی سر) یا پورے سر کا مسح ضروری ہے (اس طرح یہ مذاہب وجود میں آئے)۔ اس کے بعد ہر مذہب کے پیروکار متاخرین فقہا نے ائمہ مذاہب کے قواعد کو سامنے رکھکر ان سے دوسرے مسائل کی تخریج کی اور ان مذاہب کی شرح بیان فرمائی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ میرے لئے یہ تمام چیزیں جس طرح نفس الامر میں اپنی ترتیب سے واقع ہیں، اس طرح واضح کی گئی ہیں جیسے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اور دین میں جو بھی کچھ کہا گیا ہے اس کو میں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اصل شریعت میں پایا۔ (مذاہب کے) اس اختلاف کے متعلق یہ گفتگو کتنی صادق آتی ہے کہ اس کی مثال ایک درخت کی ہے جس سے بڑی بڑی ٹہنیاں پھوٹیں۔ پھر ان ٹہنیوں سے دوسری چھوٹی ٹہنیاں نکلیں اور ٹہنیوں پر پتے اور پھول نکل آئے۔ یا اس کی مثال ایک ایسے پانی کے چشمے

کی ہے جس سے بڑی نہریں نکلیں اور بڑی نہروں سے دوسری چھوٹی چھوٹی نہریں نکلیں اور ان چھوٹی نہروں سے برتنوں کو بھر اگیا۔ اور اس سے زمین بھی سیراب ہوگئی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں (کہ جادۂ قویمہ کے سلسلہ میں) میرے لئے شاہراہ اور وسط طریق کا بھی انکشاف ہوا، جس کی رات (بھی) اس کے دن کی طرح روشن ہے۔ اس کا اول آخر کی طرح ہے اور ان مخفی اور مٹے ہوئے آثار کے راستے بھی معلوم ہوئے جن پر چل کر آنحضرت صلعم اور ان کے صحابہ کے راستے تک کبھی رسائی نہیں ہوتی۔ جب تک رائے سے کام نہ لیا جائے اور اوہام اور ایسے شخص کی تقلید کے بارے آزاد نہ ہو، جو خطا اور ثواب کا حامل ہے اور اسکے صحیح اور خطلی قول سے تخریج ہوتی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جب رائے سے کام لیا جائے اور اوہام اور ایسے شخص کی تقلید کا بوجھ اٹھایا جائے جو خطا اور ثواب کا صاحب ہو اور پھر مصیب اور مخطی کے قول پر تخریج کا بوجھ اٹھانا پڑے۔

میرے لئے اس رائے کی حقیقت بھی منکشف کی گئی جس کی سلف نے مذمت کی ہے۔ اور چند فقہاء کو اس کی طرف منسوب کیا ہے۔

امام ابو منصور عبدالقاہر تیمی اپنی کتاب "اصول الدین" میں لکھتے ہیں:۔ "صحابہ کرام میں سے چار بزرگ ایسے ہیں، جنہوں نے فقہ کے جملہ ابواب پر گفتگو فرمائی ہے۔ اور وہ علیؓ، زیدؓ، ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ ہیں۔ جب یہ چاروں کسی مسئلے میں متفق القول ہوتے ہیں، تو اس میں سرے سے کوئی اختلاف پیدا ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کسی مسئلہ میں علیؓ دوسروں سے الگ رائے رکھتے ہیں، تو ابن ابی لیلیٰ، شعبی اور عبیدہ سلمانی حضرت علیؓ کی پیروی کرتے ہیں اور جس مسئلہ میں زیدؓ اپنے تینوں ساتھیوں سے الگ ہوتے ہیں، تو مالک اور شافعی ان مسائل میں ان کے ہمنوا ہوتے ہیں۔ اور خارجہ تو لازمی طور پر حضرت زید ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور ابن عباس جن مسائل میں دوسروں سے اختلاف کرتے ہیں، تو عکرمہ، طاؤس اور سعید بن جبیر ان کا اتباع کرتے ہیں۔ اگر ابن مسعود دوسروں سے کسی مسئلے میں الگ ہوتے ہیں، تو علقمہ اور اسود ان کی رائے کو لے لیتے ہیں"۔

(شاہ ولی اللہ کا فلسفہ۔ از مولانا سندھیؒ)

شاہ عبدالکریم بُلڑی والے سندھی

سخاوت مرزا قادری

سید عبدالکریم سندھیؒ کے مختصر حالات ایک تالیف "سندھی ادب" [1] میں موجود ہیں۔ اور حضرت موصوف کو "بلڑی" تحریر کیا گیا ہے۔ مکرمی سید حسام الدین راشدی صاحب نے آپ کا اس طرح تعارف کرایا ہے:-

شاہ عبدالکریم بلڑی ۹۴۴ھ - اس دور کا ایک اور بیلے مثل شاعر شاہ کریم ہے۔ پورا کلام بھی محفوظ نہ رہ سکا، البتہ بیان العارفین تدوین ۱۰۴۴ھ کے ذریعہ ۹۴ اشعار ہم تک پہنچے ہیں۔ ان اشعار میں کئی الفاظ قدیم سندھی کے ہیں، آج متروک ہو چکے ہیں ان کے علاوہ عربی کے ۲۹ لفظ اور فارسی کے ۸ الفاظ ہیں۔ شعر کا انداز بیان بے حد دلکش ہے۔

مولانا قدوسی مؤلف صوفیاء سندھ [2] نے بھی شاہ عبدالکریم سندھی کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ جن کا ماخذ زیادہ تر تحفۃ الکرام مؤلفہ علی شیر قانع ہے۔ تحفۃ الکرام کے مندرجہ بعض واقعات بیان العارفین سے ماخوذ ہیں۔ بیان العارفین کا نسخہ تعجب ہے کہ سندھ کے کسی کتب خانہ میں موصوف کو نہیں ملا۔ مولانا نے تحریر فرمایا کہ "سید عبدالکریم کے بچپن کے حالات اور تحصیل علم کے متعلق تذکرے نگار خاموش ہیں۔ لیکن آپ کی تصانیف بیان العارفین اور رسالہ کریمی سے آپ کے تبحر کا اندازہ ہوتا ہے۔"

---

[1] سندھی ادب مؤلفہ پیر حسام الدین راشدی

[2] تذکرہ صوفیاء سندھ مؤلفہ اعجاز الحق قدوسی۔

بیان العارفین آپ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ آپ کے ایک مرید یا معتقد محمد رضا ابن ملا یائی بن دارد عرف کہڑے نے آپ کے ملفوظات آپ کے صاحبزادوں اور رفقاء سے سن کر مرتب کئے ہیں۔ جس میں آپ کے لڑکپن کے حالات بھی درج ہیں۔ بیان العارفین کا سندھی ترجمہ کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ البتہ فارسی متن اب تک شائع نہیں ہوا، لیکن اس کے متعدد قلمی نسخے بعض حضرات کے پاس موجود ہیں۔ سید عبدالکریم سندھی کے حالات چونکہ اردو زبان میں کم یاب ہیں، اس لئے ہم آپ کے ملفوظات کی اصل شہادتوں سے آپ کے مختصر جامع حالات اور تعلیمات پر یہاں روشنی ڈالتے ہیں۔

شاہ عبدالکریم سندھی رحمۃ اللہ علیہ موضع متعلوی میں جو سندھ کا ایک پرگنہ ہے ۹۴۴ھ میں متولد ہوئے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا میاں سید جلال تھے۔ آپ نے لڑکپن میں ایک مرتبہ ساع سنا، بھائی صاحب کو معلوم ہوا تو ان کو ایک طمانچہ رسید کیا۔ آپ نے والدہ ماجدہ سے شکایت کی اور کہا کہ میں نے کچھ پڑھا لکھا نہیں، میری عمر برباد ہوگی۔ جب سید جلال اپنی والدہ ماجدہ کے پاس گئے، تو وہ سخت برہم ہوئیں اور فرمایا کہ تم شاہ عبدالکریم کو کچھ مت کہا کرو تمہیں اس کے مرتبے کی کچھ خبر نہیں ہے۔

آپ کے معمولات یہ تھے۔

صبح نماز فجر باجماعت ادا فرماتے۔ اور اشراق کی نماز پڑھنے کے بعد گھر تشریف لے جاتے گھر کا کام کاج خود کرتے، خود ہی کھانا پکا لیتے، اور اپنے بچوں کے ساتھ کھانا کھاتے اور خوش ہوتے فقراء کو بھی کھانا کھلاتے۔ بیلوں کو ساتھ لے کر اپنے کھیت میں تشریف لے جاتے۔ اور ہل چلاتے عصر کے وقت گھر واپس آتے۔ ایام ضعیفی میں ہمیشہ آدھی رات کو آپ کی آنکھ کھل جاتی۔ تو صبح تک سندھی زبان کے اشعار گاتے رہتے۔ آپ کے حجرہ کے باہر دور کر فقراء جو حاضر ہوتے انہیں شوق سے سنتے۔ آپ اکثر اپنے گاؤں سے دور کسی موضع کی طرف نکل جاتے وہاں کی مسجدوں میں پانی بھرتے جو کوئی مسافر وہاں مقیم نظر آتا اس کی خاطر تواضع فرماتے۔ حتیٰ کہ اس کے ہاتھ پاؤں دبانے میں دریغ نہ فرماتے۔ پھر راستہ کاٹ کر کوہ مکلی کے اس پار بعض بزرگوں مثلاً جدہ ہالوی، گو ئیر خواجہ (گودیر) مقبرہ ہفت دختراں وغیرہ کی زیارت سے مشرف ہو کر شہر ٹھٹھہ میں داخل ہوتے اور وہاں کی بعض مساجد کی ضروریات کی تکمیل کر کے اپنے گاؤں واپس تشریف لاتے۔ اور حسب معمول

نماز اور اوراد میں مشغول ہو جاتے۔

ایک مرتبہ دو طالب علم ٹھٹہ جا رہے تھے راستہ میں دریا حائل تھا۔ ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے اور منزل مقصود کو پہنچے۔ ان طالب علموں نے کھانا پکایا اور آپ کو بھی کھانے کے لئے مجبور کیا۔ مگر آپ نے نہ کھایا۔ اور عذر کر دیا اس خیال سے کہ کہیں وہ بھوکے نہ رہ جائیں۔
ایک مرتبہ قریہ ہالہ کے ایک رئیس نے آپ کو سر پر لکڑی کا گٹھا لاتے ہوئے دیکھا۔ وہ آپ کے پیچھے دوڑا اور قدم مبارک پہ گر پڑا، اور معذرت چاہی آپ نے فرمایا کہ میں نے لکڑی کا گٹھا اس خیال سے اٹھایا تھا کہ مسجد میں رات کو پڑا رہوں گا، اور آگ روشن رکھوں گا تاکہ مسجد میں اجالا رہے۔ اپنی والدہ ماجدہ کی خدمت کا آپ کو بڑا خیال تھا۔

ایک مرتبہ ایک ظالم نے ایک شخص کی گائے اس سے زبردستی چھین لی اس نے آپ سے فریاد کی آپ فوراً اس کی حمایت کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ اس نے عرض کی کہ آپ نے صرف ایک گائے کی خاطر اتنی زحمت فرمائی، تو فرمایا کہ میاں گائے تو بڑی چیز ہے۔ اگر کسی کی مسواک بھی کوئی چھین لیتا تو میں ضرور جاتا۔ ایک مرتبہ مزاج ناساز تھا ایک شخص آیا اور عرض کی کہ فلاں شخص سے میری سفارش فرمادیجئے، آپنے اپنی علالت کی۔ کوئی پروا نہیں فرمائی اپنے مریدین سے فرمایا کہ مجھ کو ذرا اٹھاؤ تاکہ میں اس شخص کے ساتھ چلا جاؤں اور اس کی ضرورت پوری کروں۔
ایک روز حاجی سوزہ بطور مہمان تشریف لائے تو آپ نے طرح طرح کے کھانے پکوائے اور خوب خاطر تواضع فرمائی۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ آپ نے اس قدر کیوں تکلیف فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ یہ تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے مہمان کی دل کھول کر خاطر تواضع کریں۔ ایک مرتبہ حضرت مخدوم نوح رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو سلام کہلا بھیجا۔ تو آپ بڑے خوش ہوئے اور اس مسرت میں ایک گائے ذبح کرکے فقرا کو تقسیم فرما دی اور حاضرین سے فرمایا کہ حضرت مجھ کو اس طرح یاد فرماتے ہیں کہ کوئی اپنے بچوں کو بھی یاد نہ کرتا ہوگا۔

شاہ عبدالکریم قدس سرہ نے ۱۰۳۲ھ[1] میں میں وفات پائی مگر صوفیائے سندھ[2] میں

---

[1] سندھی ادب مؤلفہ پیر حسام الدین راشدی۔ [2] صوفیائے سندھ مؤلفہ اعجاز الحق قدوسی

آپ کی تاریخ وفات ۱۰۳۰ھ درج ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتی آپ کا مزار شریف بلڑی سندھ میں مرجع خاص وعام ہے۔

آپ کے آٹھ صاحبزادے تھے جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ سید للہ اوّل جو صغیر سنی میں اللہ کے پیارے ہوگئے

۲۔ سید عبدالرحیم ۳۔ سید جلال شہید

۴۔ سید برہان ۵ سید للہ ثانی

۶۔ سید دین محمد ۷ سید محمد حسین

۸۔ سید عبدالقدوس

سید عبدالرحیم بقول میاں ابراہیم ابن مخدوم نوح بڑے متقی تھے۔ گویا اپنے والد کا صحیح نمونہ تھے۔ بحیات والد ماجد وفات پائی۔ نیز سید برہان، سید للہ ثانی اور سید عبدالقدوس بڑے متقی پرہیزگار عارف تھے۔ سید عبدالکریم کے بعد سید دین محمد سجادہ نشین ہوئے۔ آپ کفنی پہنتے اور سیاہ چادر اوڑھا کرتے تھے آپ کی اولاد میں سے سید شاہ عبداللطیف بھٹائی بڑے مشہور عارف اور شاعر گزرے ہیں۔

مشہور و معروف صوفی شاعر سید شاہ عبداللطیف بھٹی قدس سرہٗ شاہ عبدالکریمؒ کی چوتھی پشت میں ہوئے ہیں۔ مؤلف صوفیار سندھ نے آپ کے جدّ کا نام سید جمال ابن عبدالکریم بلڑی لکھا ہے۔

آپ کے صاحبزادوں میں سید جمال کا نام تو موجود نہیں البتہ سید جلال ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹی عالمگیر کے آخری دور میں $\frac{۱۱۰۱}{۱۶۸۹}$ میں پیدا ہوئے۔

شاہ صاحب کی ولادت $\frac{۱۶۸۹}{۱۰۱۱}$ بیان کی گئی ہے (تذکرہ صوفیار سندھ) مگر سنہ ۱۰۱۱ھ عالمگیر کا دور نہیں ہے۔ ممکن ہے سہو کتابت ہو۔

غرض شاہ عبداللطیفؒ بھٹی شاہ عبدالکریمؒ کے ایک سو ستر سال بعد پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۶۵ھ میں بعمر ۶۴ سال راہی ملک بقا ہوئے۔

بعض ملفوظات

علماء کی انتہا فقراء کی ابتدا ہے ۔ شمۃ من المعرفتہ خیرٌ من کثرۃ العلم ۔ طالب علم تو بہت ہیں، لیکن طالب علیم بہت کم ہیں۔ حافظ قرآن بہت ہیں لیکن حافظ حدود کم ہیں ۔ العلم بلا عمل کشجرۃ بلا ثمر ۔ علم سے انسان بہشت میں پہنچ جاتا ہے اور ذکر الٰہی سے خدا تک ۔ بقول قاضی قادن

کنز قدوری کافیہ کبي کونہ پڙھیوم

اوپاڙدي ہیو ھیان پریت لڌ وم

یعنی کنز و قدوری و کافیہ یہ تینوں کتاب کے نام ہیں جو میں نے نہیں پڑھیں ۔ یعنی یہ سب کچھ پڑھ لیا ۔ مگر افسوس تو یہ ہے ایک چیز کوئی دوسری ہی تھی ۔ جس سے میں نے دوست کو پالیا ۔ (بقول زاہد شدی و شیخ شدی و قاضی شدی و این جملہ شدی لیک مسلمان نشدی) ۔

مخلوق کے لئے تو صرف و نحو کافی ہے اور میرے لئے دوست کا مطالعہ میں نے وہی پڑھا ۔ اور وہی پڑھتا رہتا ہوں ، مجھے وہی ایک حرف کافی ہے ۔ فرمایا کہ علم ایک چراغ ہے اور عمل فیتلہ اور روغن اگر وہ روشنی نہ دے تو پھر کس کام کا ۔

ارشاد ہوا کہ بعض لوگوں نے علم تو سیکھا مگر بعض دوسرے اشغال میں مصروف ہوگئے ، اور میں نے جو کچھ سیکھا سماع سے سیکھا ۔ کسی اور کی طرف متوجہ نہ ہوا ۔ ایک مرتبہ بعض فقرا سماع کے بجائے ذکر میں مشغول ہوگئے تو فرمایا کہ کیا سماع ذکر نہیں ہے کہ اس سے منہ پھیر کر ذکر میں مشغول ہوئے ۔

نیز آپ فرماتے ہیں ۔

خدائے عز و جل کی ہستی آفتاب کی سی ہے ۔ اور پیغمبر اس کے پرتو ہیں ۔ اور مخلوقات اس پرتو کا پرتو ہیں ۔ سایہ کا وجود پرتو سے ہے اور پرتو کا وجود آفتاب سے ۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ آفتاب کی ہستی ہے تو بجا و درست ہے ۔ اور اگر یہ کہے کہ یہ روشنی آفتاب کی ہے ۔ آفتاب نہیں ہے ، تو یہ بھی درست ہے ۔

عالمے ہست برزخ جامع ۔۔۔ صورتِ خلق و حق درو لامع

عالمے ہست ورے ہست نما ۔۔۔ حق بلیت و لیک نیست نما

ابو العلاء معرّی اور اسماعیلی داعی الدعاۃ کی خط و کتابت

پروفیسر وائی ایس طاہر علی۔ سندھ یونیورسٹی

ابو العلاء المعرّی کا تعارف علامہ اقبال مرحوم نے اردو داں حضرات سے پہلے ہی سے کرا دیا ہے جب کہ انہوں نے وہ شعر کہا تھا کہ "کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی"۔ لیکن چونکہ ذیل میں چند خطوط جو ان کے اور اسماعیلی داعی الدعاۃ سیدنا ھبۃ اللہ المؤید فی الدین الشیرازی کے درمیان لکھے گئے تھے ان کا ترجمہ دیا جا رہا ہے لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں داعیٔ روزگار کے متعلق کچھ بطور تمہید لکھا جائے۔

ابو العلاء المعرّی کا تعارف یورپ میں پہلی دفعہ پروفیسر مارگو لیوتھ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ایک مقالہ لکھ کر کرایا۔ لیکن مارگولیوتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ المؤید فی الدین الشیرازی کون ہیں۔ بعد میں نکلسن نے ان خطوط کا ترجمہ اسی سوسائٹی کے جرنل میں شائع کیا۔ انہیں بھی موقع نہ ملا کہ المؤید فی الدین پر کچھ روشنی ڈالیں۔ پھر ڈاکٹر حسین الھمدانی نے اس شخصیت پر اسی سوسائٹی کے جرنل میں روشنی ڈالی۔ اب ھبۃ اللہ المؤید فی الدین کا دیوان مصر سے پروفیسر کامل حسین نے شائع کیا ہے اور ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں رہی۔ پھر بھی یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ وہ شخصیت ہے جس کی روحانی تعلیم کا سلسلہ اب تک اسماعیلیوں میں مروج ہے اور جو کچھ علوم اہل بیت اسماعیلیوں کے ہاں ہیں وہ سب ان ہی کی فیضان تربیت کا نتیجہ ہیں۔ یمن سے ایک بزرگ جن کا نام لمک تھا مصر جا کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں پھر یمن میں آکر اسی تعلیم کی ترویج کرتے ہیں۔ اس طرح مصر سے وہ تعلیم ہندوستان میں پھیلتی ہے۔ المؤید فی الدین الشیرازی نے جب ابو العلاء المعرّی کے متعلق سنا کہ وہ گوشت

نہیں کھاتے۔ دودھ اور شہد سے گریز کرتے ہیں۔ جانوروں کی کھال اور اون کو بھی استعمال کرنا نا روا سمجتے ہیں تو انہوں نے ان سے خط لکھ کر بحث شروع کی یہ بحث پانچ خطوط کی شکل میں اب تک موجود ہے۔ ذیل میں ان خطوط کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔

پہلا خط از داعی الدعاۃ

جناب والا۔ خدا آپ کو نیک توفیق دے۔ آپ کے علم و فضل نے غیروں کے لبوں پر مہر سکوت لگادی ہے۔ اور آپ کی فضیلت کا ہر شخص معترف ہے۔ آپ کو علم و ادب میں وہی شہرت حاصل ہے، جو جالینوس کو علم طب میں تھی۔ اور بے شک آپ کو اس پر کامل دسترس ہے مگر اس سے آپ کو دنیوی اور دینی امور میں کوئی نمایاں فائدہ نہیں، سوائے اس کے کہ تمام عالم آپ کی شہرت سے گونجے اور جب تک آپ زندہ رہیں اسے باعث فخر سمجھیں۔ مگر جب آپ دار بقا کی طرف کوچ کریںگے تو اس دنیا کی شہرت اور گمنامی سے آپ کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہوگا۔ جب صورت حال یہ ہے تو کیسے ممکن ہے کہ آپ جیسے دانشمند شخص اپنی پوری لیاقت کو عربی زبان کے حاصل کرنے اور اس کے الفاظ و معانی پر غور و پرداخت کرنے میں صرف کردیں، جس سے کہ عمر بھر کوئی نتیجہ ہاتھ نہ لگے اور یہ بھی کیونکر ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی لیاقت کو اپنی جان کے خاطر عاقبت کے کاموں میں نہ لگائیں (جو زیادہ کارآمد ہے) تاکہ پھر کف افسوس ملنا پڑے لہذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا نقطۂ نظر کچھ اور ہی ہے جسے آپ مصلحتاً چھپائے ہوئے ہیں۔

اس کا ثبوت آپ ہی کی راہ عمل ہے۔ آپ نے زہد و پرہیزگاری اختیار کی ہے معمولی کھانا اور گاڑھا پہننے پر اکتفا کیا ہے۔ اور اپنے شکم کو جانوروں کے گوشت، دودھ اور ان تمام چیزوں سے جن کو تیار کرنے میں محنت سے کام لیا گیا ہو پاک رکھا ہے۔ بے شک ایسا وہی لوگ کرتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان جیسا کرے گا ویسا بھریگا۔ جب بے زبان جانوروں کے ساتھ آپ کا یہ طرز عمل ہو تو پھر حیوان ناطق (یعنی انسان) آپ کی زبان اور قلم سے کیوں نہ محفوظ رہے میدان زہد میں آپ یقیناً بازی لے گئے ہیں اور اس میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

میں نے دور رہ کر یہ بھی دیکھا کہ جیسا لوگ کہتے ہیں ویسے ہی آپ فاضل ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی فہم و فراست سے ایسا زہد اختیار کئے ہوئے ہیں جو اوروں (جاہلوں) کے زہد سے نرالا ہے۔

جن کی بابت (قرآن مجید میں) اشارہ ہے کہ "فی کل وادٍ یھیمون" میں نے آپ کے شعر کو بھی سنا

غدوت مریض العقل والدین فالقنی

لتعلم انباء الامور الصحائح

(ترجمہ) اگر دین و عقل کا بیمار ہے تو مجھے مل تاکہ تجھے صحیح صحیح باتیں معلوم ہوں

جس میں گمراہ کو راستہ دکھانے کی دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ اپنے آپ کو مریض عقل و دین سمجھ کر فوراً سچی باتیں جاننے کے لئے تیار ہوا۔ اب میں آپ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہتا ہوں کیونکہ مجھے آپ کی علم و دانش کا اعتراف ہے اور میں آپ کے سرچشمۂ ہدایت سے مستفیض ہونا چاہتا ہوں۔ کیا خوب ہو کہ آپ وضاحت سے کام لیں اور میری جہالت کی تاریکی کو اپنے چراغ علم سے دور کردیں۔ اور مجھے بے سود باتوں میں نہ لگائیں اور جو کچھ کہیں اس میں حق اور باطل کا پورا خیال رکھیں۔

سب سے پہلے جو بات میں دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ ایک معمولی سی ہے تاکہ میں آپ کے جواب کو دیکھوں۔ اگر اس سے میری تشفی ہوئی تو پھر اصلی مقصد پر آؤں گا۔ اور اگر تشفی نہ ہوئی تو پھر آگے نہ بڑھوں گا۔ وباللہ التوفیق۔

میں آپ کو بحیثیت ایک شخص کے جو ہر بات کو عقل کی میزان سے تولتا ہے، پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے لئے گوشت اور دودھ اور تمام چیزیں جو جانوروں سے ہمیں بطور فائدہ ملتی ہیں کیوں حرام کر رکھا ہے۔ کیا نباتات حیوان کے لئے نہیں اگائے گئے۔ بے شک نباتات میں قوت نامیہ ہوتی ہے اور قوت حاسہ نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ حیوانات نباتات پر فائق ہیں۔ اگر حیوانات نہ ہوں تو نباتات کا ہونا لغو اور بے معنی ہو جائے۔ اسی طرح انسان بھی حیوان پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ حیوان ناطق ہے، اور عقل رکھتا ہے۔ اور تمام جانور اسی کے مفاد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ چند جانوروں کا گوشت اور دودھ اس کے کام میں آتا ہے اور کئی جانوروں کی کھال اور اون اس کے کام میں آتے ہیں۔ کچھ جانور ایسے بھی ہیں جو باربرداری کا کام دیتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے دانت اور پنجے بھی کارآمد ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو حیوانات کا ہونا بے معنی ہو جائے، جیسے نباتات بغیر حیوانات کے۔

جب نظامِ عالم کا یہ دستور ہو تو جناب کا اپنی مفید مطلب چیزوں سے گریز کرنا نظامِ عالم کو غلط ثابت کرنا ہوا۔ آپ کا گوشت نہ کھانا دو وجہ سے ہو سکتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ آپ جانوروں پر ترس کھاتے ہیں۔ مگر اس میں آپ کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ مہربان ہونے کی ضرورت نہیں جس نے انہیں انسانی مفاد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ جانوروں کو حلال و حرام ٹھہرانے والے انبیاء ہوتے ہیں (جو خود بھی انسان تھے) ورنہ اللہ تعالیٰ نے کسی جانور کا خون بہانا یا گوشت کھانا روا نہیں رکھا۔ تو یہ بات بھی غلط ہے۔ درندوں اور شکاری جانوروں کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لئے پیدا کیا ہے کہ دیگر حیوانات کو پھاڑ کھائیں۔ جب یہ ایک فطری بات ہے تو پھر انسان کا گوشت خور ہونے میں کیا قصور؟ اور جن لوگوں نے گوشت کھانا جائز رکھا ہے وہ بھی حق بجانب ہیں۔ ایک تو یہ وجہ ہو سکتی ہے اور دوسری یہ کہ شاید خونریزی اور جان کنی کو آپ روا نہیں رکھتے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر اعتراض ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کی مصلحت کو خوب جانتا ہے

اگر جناب والا از راہِ لطف و کرم کوئی دلیل پیش کریں کہ جس سے میری بیماری کا ازالہ ہو تو یہ ایک قابلِ تعریف کام ہوگا۔ مجھے ہدایت ملے گی اور اس سے آپ کی نیکی میں اضافہ ہوگا اور عند اللہ آپ ماجور ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دوسرا خط

از بندۂ ناتواں احمد بن عبداللہ بن سلیمان المعری

مجھے سب سے پہلے یہ لکھ دینا چاہیئے کہ میرے نزدیک سیدنا الرئیس الاجل المؤید اُن چند اشخاص میں سے ہیں، جنہیں پیغمبروں کی حکمت ہاتھ لگی ہے۔ میں بذاتِ خود جاہل مطلق ہوں مجھ سے خط و کتابت کرنے میں جناب کی کسرِ شان ہوئی ہے۔ آپ جیسے سپہر مرتبت کا ایک ایک لفظ دشمنوں کے لئے بھاری ہے۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس میں بڑی باریکیاں ہیں جو سمجھنے سے حقائق معلوم ہوتی ہیں۔

ہاں! تو میں کون ہوں کہ آپ جیسے فاضل مجھے خط لکھیں۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ثریا آسمان سے زمین پر اتر آئے۔ اللہ جانتا ہے کہ میں چار برس ہی کی عمر میں آنکھوں اور کانوں سے معذور ہو چکا ہوں۔ میرے لئے ایک نو سالہ اونٹ اور اس کے بچے میں فرق کرنا مشکل ہے۔ صرف

یہی نہیں بلکہ پے درپے مصیبتیں سہنے سے میرا قد بھی خمیدہ ہو چکا ہے۔ اور بڑھاپے میں تو کھڑے ہونے سے بھی لاچار ہوں۔ رہی میری شہرت تو خدا گواہ ہے کہ میں نے اس کی کبھی خواہش نہیں کی میں تو خود کو ایک بے وقوف آدمی سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میرے بارے میں نیک خیال کرے تو وہ قابل ملامت ہے۔ البتہ یہ ضرور پایا گیا ہے کہ بھلے لوگ ساری دنیا کو بھلا سمجھتے ہیں گرچہ بھلے تو بھلے ہی ہیں اور برُے برُے۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق اب بندہ کچھ خامہ فرسائی کرے گا۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ازل سے قسمت میں زھد و تقویٰ لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا مجھے ہمیشہ افلاس سے دوچار ہونا پڑا میں نے دیدۂ و دانستہ اس ناپائدار دنیا سے گریز کیا کیونکہ اس کے معاملات میں الجھنے سے کوئی کام بر نہیں آتا۔ پھر اہل دنیا نے بھی مجھے ایک کونے میں پھینک دیا۔ اور کہہ دیا کہ تجھ جیسے سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔

میرے شعر میں روئے سخن جاہلوں کی طرف ہے نہ کہ آپ جیسے سر برآوردہ حضرات سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ حیوانات کو اپنے درد و غم کا احساس ضرور ہے بین متقدمین کے اختلافات کو سنا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اگر ایک جملہ بنایا جائے جس میں مبتدا اور خبر کے درمیان دو اور لفظ ہوں۔ ایک ان میں سے نافیہ ہو اور دوسرا استثنائیہ۔ مثلاً اللہ لا یفعل الا خیرا۔ تو یہ جملہ یا تو صحیح ہوگا یا غلط۔ اگر وہ صحیح ہے تو پھر دنیا میں برائیاں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک راز نہانی ہے جسے علما ہی جانتے ہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے "اگر ان کو کوئی اچھی بات ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی بری بات ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دو اے محمد! سب چیزیں اللہ کی طرف سے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ بات نہیں سمجھتے"۔ رسول خدا جب سفر کرنے نکلتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ "اللھم انا نعوذ بک من وعثاء السفر وکابۃ المنقلب وسوء المنظر فی الاہل والمال والولد" تو کیا وہ چیزیں جن سے رسول مقبول نے پناہ مانگی اچھی ہیں یا بری؟ اگر کہا جائے کہ یہ چیزیں خوفناک ہیں تو اگلی بات باطل ہو جاتی ہے اور اگر کہا جائے کہ

بات غلط ہے تو پھر سوء ادب ہوتا ہے۔

دیندار لوگ ہمیشہ گوشت خوری سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گوشت خوری سے جانوروں کو درد پہنچتا ہے اور جانور ہر حالت میں درد سے گریز کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بکری کو لیجئے جب تک وہ حاملہ ہے، گھر میں رکھی جاتی ہے۔ مگر جونہی وہ بچہ دیتی ہے اور بچہ ایک ماہ کا ہوتا ہے تو لوگ اسے ذبح کر ڈالتے ہیں اور اس کا گوشت کھاتے ہیں اور بکری کے دودھ کو بھی اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی اسے غبن تصور نہیں کرتے۔ بیچاری بکری رات رات بھر چلاتی ہے اور اگر اس کا بس چلے تو بچے کو بھی ڈھونڈتی پھرے۔

عربی ادب میں بھی اکثر جانوروں کی آہ و بکا کا ذکر ہے۔ مثلاً اونٹنی اپنے بچے کے فراق میں کیسی سرگرداں رہتی ہے یہ ذیل کے شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

فما وجدت کوجدی ام سقب
اضلتہ فرجعت الحنینا

(ترجمہ) میری بے چینی اس اونٹنی سے فزوں تر ہے جو اپنے بچے کو کھو کر چلاتی پھرتی ہے اور تڑپتی ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ سوائے خیر کے کچھ نہیں کرتا تو شر کے متعلق دو صورتیں ہوں گی۔ یا تو اللہ شر سے باخبر ہے یا (نعوذ باللہ) بے خبر۔ اگر وہ شر سے باخبر ہے تو دو شرطوں میں سے کسی ایک کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اس کی مشیت سے ہوتا ہے یا بلا مشیت؟ اگر اس کی مشیت سے ہوتا ہے تو بالفعل وہی اس کا کرنے والا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ حاکم نے ڈاکو کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ گرچہ حاکم نے بذات خود وہ کام نہیں کیا۔ اگر خدا کی مشیت کے بغیر شر ہوا ہے تو خدا نے ایسی چیز ہونے دی ہے جو ایک مخلوق حاکم بھی نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ اگر ایسی کوئی بات ہو بھی جائے جو اسے ناپسند ہو تو ایسی بات کرنے والے کو دھمکی دے گا اور اعلان کر دے گا کہ آیندہ اس کی سلطنت میں ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جسے متکلمین نے حل کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر حل نہ ہو سکا۔

انبیاء کرام بھی فرماتے ہیں کہ خدا بہت مہربان ہے۔ اگر وہ نوع انسان پر مہربان ہے تو یقیناً ہر جاندار پر مہربان ہونا چاہیئے۔ جو درد والم سے بھاگتا ہو۔ بعض اوقات ایک شہسوار چراگاہ میں چرتے ہوئے جانوروں پر حملہ کرتا ہے اور اپنے نیزے سے کسی نر یا مادہ کو شکار کرتا ہے تو پھر یہ شہسوار کیونکر خدا کی مہربانی کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اکثر دو قوموں کو دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر فریق اپنے اعتقاد میں چست ہوتا ہے اور جب میدان کارزار میں آتا ہے تو دشمنوں کے مقتولین کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔ آخر یہ کیوں۔

میں نے اس قبیل کے کئی متنازعہ فیہ مسائل کو اکثر سنا اور جب تیس سال کی عمر کو پہنچا تو خدا سے دعا مانگی کہ وہ مجھے تازیست روزہ رکھنے کی توفیق دے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مہینوں کیا سال سال بھر سوائے دو عید روزہ رکھتا چلا جا تا ہوں اور کئی دن اور رات ایسے بھی گذرتے ہیں کہ کھانا بھی نہیں چھوتا۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نباتات کے کھانے سے میری تندرستی اچھی رہتی ہے۔

جناب والا نے بے شک متقدمین کی کتابوں اور جالینوس کے اقوال کو دیکھا ہے جس سے ان کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پروردگار مہربان ہے تو پھر شیر کو کیوں بے گناہ انسان کا شکار کرنے دیتا ہے۔ کتنی جانیں سانپ کے ڈسنے سے تلف ہو گئیں! خدا نے عقاب اور شاہین کو ان پرندوں پر جو دانے چگتے ہیں کیوں مسلط کیا ہے؟ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ تیتر صبح سویرے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر پانی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ جب پانی منہ میں لے کر واپس جاتا ہے تو راستے میں چیل اس پر جھپٹتی ہے اور اس کے بچے پیاس کے مارے تڑپتے رہتے ہیں۔

(ابوالعلا اس قسم کی اور بھی باتیں لکھتا ہے اور پھر کہتا ہے)

میں دعا مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ذیل کے اشعار کہنے سے روکے۔

(ترجمہ) اُم بکر سلام کہتی ہوئی آئی۔ تم بھی اسے خوش آمدید کہو۔

بدر کے گڑھے میں کتنے ہی سربرآوردہ اور شریف لوگ ہیں۔

اس گڑھے میں کتنے ہی پیالے مع اونٹوں کی سنام ہیں۔

ام بکر مجھے ھشام کے بھائی کی موت کے بعد اب شراب نہ پلا۔
اس کا چچا بڑا شرابی تھا اور سردار تھا۔ وہ بھی مارا گیا۔ اب شراب نہ پلا۔
ہاں خدا سے کہدے کہ میں رمضان کی فرضیت کو ادا نہیں کرتا۔
جب سر تن سے جدا ہوا اور ہار سیر ہو چکا
تو کیا ابن کبشہ ہمیں ڈراتا ہے کہ ہم زندہ رہیں گی۔ پھر "صدی" اور "ھامہ" کے متعلق کیا کہتا ہے۔

خدا ایسے شاعر کو غارت کرے جس نے ذیل کے اشعار کہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ولید بن یزید تھا۔ ایک روایت اور ہے کہ وہ ولید بن عبدالملک تھا۔ مگر ولید بن عبدالملک ایسے صحیح شعر کہاں کہہ سکتا تھا۔؟

(ترجمہ) میرے محبوب کو نزدیک لاؤ۔ مجھے یقین کامل ہے کہ میں دوزخ میں نہیں جاؤں گا میں لوگوں کو تلقین کروں گا کہ وہ گدھے کا مذہب اختیار کریں۔ جنت کے طالب کو چھوڑو کیونکہ وہ نقصان اٹھانے والا ہے۔

ابن رعیان (عبدالسلام بن رعیان الملقب بہ دیک الجن) کا بھی بُرا ہو اگر اس نے یہ کہا ہے۔
(ترجمہ) یہ دنیا ہے۔ دنیا والوں سے آخرت کا وعدہ ہے۔ مگر دیر سے برآنے والی امیدوں کو کٹا کردیتی ہے۔ اگر جو کچھ کہا گیا ہے صحیح ہے تو جو پھنسانے والا ہے وہ بچانے والا بھی ہے۔

ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے میں نے گوشت خوری ترک کی ہے۔ وہ یہ ہے۔ میری سالانہ آمدنی بیس دینار سے کچھ زائد ہے۔ میرا نوکر اس میں سے جو رقم اسے ضرورت ہوتی ہے لے لیتا ہے۔ پھر جو کچھ بچتا ہے وہ اتنا کم ہے کہ مجھے دال بھات پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ جب نوکر ہی اتنی رقم لے لے جسے میں زیادہ سمجھتا ہوں اور وہ کم سمجھتا ہے تو میرے حصے میں تو بہت کم بچتی ہے میرا ارادہ نہ اپنی روزی بڑھانے کا ہے اور نہ درد کا کوئی درماں ڈھونڈنا ہے۔ والسلام۔

تیسرا خط

ازداعی الدعاۃ

خدا کرے آپ ان لوگوں میں سے نہ ہوں۔ جو دین وعقل کے بیمار ہیں۔ اور نہ ان لوگوں

ہیں سے ہوں جو اپنے شعر میں صلائے عام دیں کہ آؤ عقل کے اندھو۔ ہم سے بصیرت حاصل کرو۔ اور جب جویائے حق ان کی طرف بڑھے تو ایسی بات کہیں کہ جس سے وہ اور پریشان ہوں۔ ایسے لوگوں کے مصداق حال متنبی نے کیا خوب کہا ہے۔

اظمتنی الدنیا فلما جئتھا

مستقیا مطرت علی مصائبا

(ترجمہ) دنیا نے میری پیاس بڑھادی اور جب میں اپنی پیاس بجھانے لگا تو مجھ پر اور مصیبتیں نازل کیں۔

میں نے تو آپ سے پوچھا تھا کہ کس بنا پر آپ نے گوشت کھانا چھوڑا ہے۔ درآں حالیکہ گوشت خوری سے جسم کی نشو و نما ہوتی ہے۔ آپ نے کچھ ایسا جواب دیا کہ میں بے ساختہ کہہ بیٹھا "کیا یہی پکی باتیں ہیں؟" یہ وہ جواب نہیں کہ جس سے بیماری کا ازالہ ہو۔ اس سے تو دین اور عقل کے اندھے کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ آپ کے جواب کا میرے سوال سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

آپ نے فرمایا کہ گوشت بغیر ایذارسانی حاصل نہیں ہو سکتا تو اس کا جواب دیا جا چکا ہے آپ کو اپنے خالق سے زیادہ مہربان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا پیدا کرنے والا یا تو عادل ہے یا ظالم۔ اگر وہ عادل ہے تو یہ مسلم امر ہے کہ وہ حلال جانور اور اس کے کھانے والے انسان دونوں کو ہلاک کرتا ہے۔ اگر وہ ظالم ہے تو ہمیں ہمارے خالق سے سبقت لے جانے اور زیادہ عادل ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ جب کہ وہ خود غیر عادل ہے۔

آپ نے ان لوگوں کے بارے میں بھی کچھ فرمایا ہے جو خیر و شر کے مسئلہ میں اعتراض کرتے ہیں۔ میرے لئے اس کے جواب میں ایک قصہ لکھ دینا ہی کافی ہے۔" ایک شخص نے قرآن پاک کا نسخہ کھو دیا۔ اس کے کسی دوست نے کہا۔ "والشمس وضحٰھا کو خوب پڑھ۔ وہ تیرے ہاتھ لگے گا" اس نے کہا "بھئی یہ سورہ بھی اسی قرآن میں تھی"۔ علی ھذا القیاس یہ عقدہ بھی تو انہی لاینحل عقدوں میں سے ہے۔ سب کا سب اندھیرا ہے۔ روشنی کا نام و نشان نہیں۔ میرا مقصد تو صحیح باتوں کا جاننا تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ مختلف آراء کی وجہ سے اور دنیا کی بے ثباتی کی بنا پر آپ نے دعا مانگی کہ خدا آپ کو مسلسل روزہ رکھنے کی توفیق دے اور آپ صرف سبزیوں پر اکتفا کریں۔ میں نہ سمجھ سکا کہ یہ کون سا خدا ہے ؛ آیا یہ وہی خدا ہے جو صرف خیر کو چاہتا ہے یا وہ خدا ہے جو صرف شر کو چاہتا ہے یا خیر و شر دونوں کو چاہنے والا ہے۔ رہا روزہ تو وہ نبی کی شرع کا حکم ہے اور نبی کا تعلق اس کے بھیجنے والے خدا سے ہے۔ اسی بھیجنے والے ہی کی تو بات مشکوک ہے۔ کیا وہ رسول کو اس لئے بھیجتا ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں۔ یا اس لئے بھیجتا ہے کہ اس کی اطاعت نہ کریں اگر وہ اطاعت کی غرض سے بھیجتا ہے تو پھر اس کی مشیت مغلوب ہے کیونکہ نہ ماننے والے زیادہ ہیں بہ نسبت ماننے والوں کے اگر وہ چاہتا ہے کہ رسول کی نافرمانی کی جائے تو پھر رسول کا بھیجنا نہ صرف لغو ہے بلکہ کمزوروں کو ستانے کا ایک بہانہ ہے ہاں تو پھر آپ کا مسلسل روزہ اگر اسی بنیاد پر ہے تو بالکل بے سود ہے لیکن اگر کسی بیّن وجہ سے ہے تو وہی میں جاننا چاہتا ہوں

آپ نے بعض ملاحدہ کے اقوال کو بیان کیا ہے اور دعا مانگی ہے کہ اللہ آپ کو قرآنی آیات میں مثلاً وانہ اھلک عاد الاولی وثمود فما ابقیٰ" وغیرہ گرفت کرنے سے روکے۔ اگر اللہ نے عاد اور ثمود کو یہ جانتے ہوئے پیدا کیا کہ وہ بدکار ہیں اور ہرگز توبہ نہ کریں گے تو یقیناً مہربان خدا کو لازم تھا کہ انہیں عذاب کی خاطر نہ پیدا کرے اور اگر اللہ یہ نہ جانتا تو پھر ہم اور وہ یکساں ہیں کہ آنکھ بند کر کے کام کرتے جاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم ایسا کیونکر کہہ سکتے ہیں ہم کو تو سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے اور اس آیۂ کریمہ کی تلاوت کرنی چاہیئے۔ من یھد اللہ فھو المھتدو من یضلل فلن تجد لہ ولیا مرشدا" ایک ملحد بھی کہے کہ شکر میٹھی ہے اور سرکہ کھٹا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ قائل ملحد ہے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ بات کا معقول جواب دینا چاہیئے اگر آپ کے پاس کوئی کافی وشافی جواب ہو تو از راہ کرم مرحمت فرمایئے ورنہ آپ کا خاموش رہنا ملاحدہ کی بات ماننے کے مترادف ہے۔

آپ نے ان اشعار کو درج کیا ہے جو" المت بالنتیجۃ ام بکر" سے شروع ہوتے ہیں اور ان کے کہنے والے پر لعنت بھیجتے ہیں۔ مگر آپ کو کون ایسے خیالات والا سمجھتا ہے ؟ میں نے حاشا وکلا کبھی آپ کے متعلق ایسا خیال نہیں کیا۔ چنانچہ آپ کو ایسے کفر والحاد کے اشعار بیان کرنے

کی قطعاً ضرورت ہی نہ تھی۔

خط کے آخر میں آپ نے گوشت نہ کھانے کی اور وجہ بیان کی ہے کہ آپ کی سالانہ آمدنی بیس دینار سے کچھ زائد ہے جس کا بیشتر حصہ آپ کا خادم لے لیتا ہے اور بہت کم حصہ آپ کے لئے بچتا ہے اور لکھتے ہیں کہ لذیذ کھانوں میں صرف کرنے سے کیسے پورا پڑ سکتا ہے؟ تو میں اس سلسلے میں تاج الامرا کو لکھ رہا ہوں کہ وہ کوئی معقول انتظام کردے جو آپ کو برابر ملتا رہے اور اس تکلیف سے آپ نجات پائیں۔

اگر آپ جواب دیں تو ضرور اس بات کا خیال رکھیں کہ مجھے مسجع اور مقفی عبارت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا مقصود تو خیالات ہیں نہ کہ عبارت آرائی۔ والسلام

چوتھا خط

از ابی العلا المعری

جناب والا! مجھے تو پہلے ہی سے اپنی کم مائیگی اور بے چارگی کا اعتراف ہے میں اب بھی دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے نوازے۔

مجھے اپنی بے مائیگی کے باوجود آپ کی استعداد و قابلیت کا پورا یقین ہے۔ میں تو ایک بے زبان جانور کے مانند ہوں۔ پھر حیرت ہے کہ آپ جیسے فاضل مجھ جیسے گمراہ سے ھدایت چاہیں۔ کیا چاند بھی جو شب و روز اپنے خالق کی اطاعت میں مصروف ہے، کسی چوپائے سے مدد چاہتا ہے؟ ہرگز نہیں بیچارے چوپائے کی کیا بساط ہے جو کسی ندی یا نالے پر پانی پینے جائے تو فوراً ایک شکاری اسے تیر مار کر موت کے گھاٹ اتار دے۔

آپ نے میرے قصیدۂ حائیہ کے چند اشعار کا ذکر کیا ہے۔ میری غرض ان اشعار سے لوگوں کو بتانا تھا کہ میں کیسا متدین ہوں۔ اور "من یھد اللہ فھو المھتد" والی آیۂ کریمہ میں کیا رائے رکھتا ہوں اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

غدوت مریض العقل والدین فالقنی
لتعلم انباء الامور الصحائح

اور پھر۔

فلا تاکلن ما اخرج الماء ظالما
ولا تبغ قوتا من غریض الذبائح

(ترجمہ) پانی میں پیدا ہونے والی چیز کو زبردستی نہ کھا۔ اور حلال جانور کے تازہ گوشت کو اپنی قوت نہ بنا۔

کون شخص انکار کرسکتا ہے کہ آبی جانور اپنی مرضی کے خلاف پانی سے نکالا جاتا ہے۔ اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو حلال گوشت کا ترک کرنا کوئی بری بات نہ ہوگی۔ مذہبی لوگوں نے ہر زمانے میں ایسی ایسی چیزیں ترک کی ہیں جو بذات خود حلال تھیں۔

وابیض امات ارادت صریحہ
لاطفالھا دون الغوانی الصرائح

(ترجمہ) اور جانوروں کا دودھ نہ پی۔ کیونکہ وہ ان کے بچوں کے لئے ہے نہ کہ نازک اندام عورتوں کے لئے۔ ابیض کے معنی یہاں دودھ کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بکری کے بچے کو ذبح کرنے سے بکری کئی دن اور رات بیتاب رہتی ہے۔ لوگ نہ صرف اس کا گوشت ہی کھاتے ہیں بلکہ اس کے دودھ کو بھی اپنے لئے مخصوص کر دیتے ہیں۔ جو قدرت نے اس کے بچے کے لئے غذا بنائی تھی۔ اگر بچے کو ذبح نہ کیا جائے اور دودھ سے پرہیز کیا جائے تو کون سا گناہ ہے؟ ایسا کرنے والا یہ نہیں کہتا کہ دودھ اور گوشت حرام ہیں وہ تو بچے پر ترس کھاتا ہے اور ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا خواہاں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کو یکساں طور پر مخلوقات میں تقسیم کرتا ہے تو پھر ان بے زبان جانوروں کا کیا قصور ہے کہ وہ خدا کی مہربانی سے محروم رہیں۔

فلا تفجعن الطیر وھی غوافل
بما وضعت فالظلم شر القبائح

(ترجمہ) پرندوں کو اس وقت نہ ستاؤ کہ جب وہ اپنے انڈوں میں مست ہوں کیونکہ ظلم بہت بری چیز ہے۔

نبی کریم نے رات کو شکار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور یہ آپ کی حدیث "اقروا

الطلیر فی وکنا تھا" کے دو مطلبوں میں سے ایک ہے قرآن میں بھی ارشاد ہوا ہے۔ "ایمان والو احرام کی حالت میں جانور کو نہ مارو۔ اگر تم میں سے کوئی ارادۃً مارے گا تو اتنے ہی جانور کا کفارہ دینا پڑے گا۔" وغیرہ

معمولی فہم و فراست والا بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ وہ بالکل حق بجانب ہوگا اگر وہ ہر جگہ جانور کو خواہ حلال ہی کیوں نہ ہو مارنے سے گریز کرے اور سمجھے کہ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی۔

ودع ضرب النحل الذی بکرت لہ
کواسبُ من ازھار بنت فوائحُ

(ترجمہ) شہد کو بھی چھوڑ۔ کیونکہ مکھیاں اسے صبح سویرے اکٹھا کیا کرتی ہیں۔

جب مکھیاں شہد کی حفاظت میں جان دے دیں تو پھر اس سے انسان کے احتراز کرنے میں کیا حرج ہے۔ وہ مکھیوں کو بھی حلال جانوروں کے مانند سمجھتا ہے جن کو عورتیں تر و تازہ ہونے کے لئے کھاتی ہیں۔ اس خیال کا ذکر بہت سے شاعروں نے کیا ہے۔ دیکھئے ابوذویب الھذلی شہد اکٹھا کرنے والے کے بارے میں کہتا ہے۔

اذا لسعتہ النحل لم یرج لسعھا
وخالفھا فی بیت نوب عوامل

(ترجمہ) اگر مکھیاں کاٹیں تو پرواہ نہیں۔ وہ تو برابر چھتے کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔
مشہور ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس ستو کا ایک تھیلا تھا جس کو آپ مہر لگایا کرتے تھے مگر جب آپ روزہ رکھتے تھے تو اسے مہر نہیں لگاتے تھے۔ آپ غلہ کی فراوانی کے باوجود قلیل مقدار پر بسر کیا کرتے تھے اور سب غلہ خیرات کر دیتے تھے۔

ایک اور عالم کے متعلق روایت ہے کہ اس نے اپنے خطبہ میں کہا۔ "میں نے سال بھر میں پچاس ہزار دینار کا غلہ اکٹھا کیا اور خیرات میں دے دیا۔" ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام اور علماء عظام نے بہت کم اپنے لئے صرف کیا۔ زیادہ تر حاجتمندوں کو دیا۔
جناب نے یہ بھی فرمایا کہ گوشت ترک کرنے والا قابل ملامت ہے۔ اگر بفرض محال یہ

بات مان لی جائے تو ہر شخص کو فرض کی نماز کے سوا اور کوئی نماز نہیں پڑھنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ خواہ مخواہ کی تکلیف ہے اور تکلیف کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔ یہ بھی کہنا پڑے جائز ہوگا کہ امیر لوگ مقررہ زکوٰۃ کے سوا اور کوئی رقم خرچ نہ کریں۔ حالانکہ قرآن مجید میں بارہا خرچ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

یہی ایک جواب ہے جو میں دے سکتا ہوں۔ اگر میں بذات خود آپ کے سامنے حاضر ہو جاؤں تو بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے تو قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ ہاتھ پاؤں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ حدیہ ہے کہ میں نماز کے لئے بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسے بھی بیٹھے بیٹھے ادا کرتا ہوں۔ خدا رحم کرے۔ کاش میں لکڑی کے سہارے چل پھر سکتا۔ (ابوالعلا اپنی ناتوانی کے متعلق بہت سے عربی اشعار بیان کرتا ہے) میرا تو یہ حال ہے کہ اگر ایک دفعہ سو جاؤں تو کسی کی مدد کے بغیر نہیں اٹھ سکتا۔ اور جب کسی شخص کی مدد سے اٹھتا ہوں تو ہڈیاں جن پہ گوشت کا نام نہیں بجتی ہیں۔

جناب والا نے متنبی کا جو شعر بطور شہادت بیان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص مجھ جیسے کم مایہ اور بے بس سے ہدایت چاہتا ہے تو گویا وہ ببول کے جھاڑ سے آم چاہتا ہے جو کچھ آپ کو میرے متعلق حسن ظن ہے وہ محض آپ کی نیک نیتی اور شرافت کی دلیل ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

آپ نے میری روزی بڑھانے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بھی آپ کی نیک نفسی کی دلیل ہے نہ مجھے کسی اضافے کی ضرورت ہے اور نہ اچھے کھانوں کی رغبت بلکہ ان سے گریز کرنا میرے لئے طبع ثانی (فطری امر) ہو چکا ہے۔ پینتالیس سال سے میں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور اب بوڑھا کھوسٹ ہونے آیا۔ اس عادت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تاج الامراء بے نظیر شخصیت کے مالک ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے حلب کے قلعے کو اور شام کے تمام پہاڑوں کو سونے کا بنادے اور تاج الامراء ان کو اہل بیت کی مدد میں صرف کریں اور مجھے کچھ نہ دیں تب بھی میں خوش ہونگا۔ مجھے تو ایک قسم کی شرم دامنگیر ہوتی ہے کہ تاج الامراء اتنے عرصے کے بعد مجھے اہل ہوس تصور کریں۔ کیا ہی خوب

ہو کہ روز حشر مجھ سے سوائے گوشت ترک کرنے کے اور کوئی پرسش نہ ہو۔

(یہاں ابوالعلا مسجع عبارت کے متعلق عذر خواہی کرتا ہے اور جواب میں بہت سی باتیں پیش کرتا ہے)

خدا آپ کا بول بالا کرے اور آپ دن دونی اور رات چوگنی عزت حاصل کریں۔ ثعلبۃ بن صغیر نے کیا خوب کہا ہے۔

ولرب قوم ظالمین ذوی شذی   تغلی صدورھم بکلم عاتر

ولقد ظأتھم علی ماساءھم   وخبأت باطلھم بحق ظاھر

(ترجمہ) کتنے ہی بدکردار اشخاص تھے جن کے سینے جھوٹی باتوں سے ابل رہے تھے۔ میں نے ان کی غلط باتوں کو سچی باتوں سے دبا دیا۔

آپ جیسے عالم و فاضل اگر ارسطو سے مناظرہ کریں تو وہ بھی پریشان ہو جائے اور اگر افلاطون سے بحث کریں تو وہ بھی آپ کا لوہا مان لے۔ اللہ تعالیٰ اپنی شریعت کو آپ کے دم سے تازہ رکھے اور دین اسلام آپ کی دلیلوں سے پروان چڑھے۔ وحسبی اللہ ونعم الوکیل۔

پانچواں خط

از داعی الدعاۃ

میں آپ سے پوشیدہ رہ کر خط و کتابت کرنا چاہتا تھا تاکہ آپ کے جوابات بھی بڑے بڑے خطابات مثل "سیدنا" اور "الرئیس" وغیرہ سے خالی ہوں۔ ہماری خط و کتابت کے مضمون کو دنیوی جاہ و حشم سے کوئی تعلق نہیں۔ درحقیقت میں آپ کے زہد و تقوے سے متوقع تھا کہ ضرور کوئی چیز ہاتھ لگے گی۔ مگر حالات ہی بدل گئے۔ آپ نے نہ معلوم کیسے پہچان لیا کہ مجھے "سیدنا" اور "الرئیس" سے خطاب کرنے لگے۔ میں تو نہ دینی اور دنیوی اصل سے آپ پر فائق ہوں۔ اس تگ و دو سے میرا مقصد آپ سے کچھ حاصل کرنا تھا۔ اگر مراد بر آتی تو میں شکر گذار رہتا۔

واضح رہے کہ میں نے اپنے دور دراز وطن سے مصر تک سفر کیا ہے اور اہل دنیا کو دو گروہوں میں پایا ہے۔ ایک گروہ اپنے مذہب کا اس قدر دلدادہ ہے کہ اگر ان کی مقدس

کتابیں یہ کہیں کہ ایک ہاتھی اڑدہا تھا یا ایک اونٹ نے انڈے دیئے تو وہ آمنا و صدقنا کہے بغیر نہ رہیں گے۔ بلکہ اپنے مخالفین پر لعنت بھیجیں گے۔ ان لوگوں کو عقل سے کیا سروکار اور ان کو کون سمجھائے کہ جب تک عقل رہبری نہ کرے شریعت پر کیسے عمل درآمد ہو سکتا ہے اور یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ابتدا تو عقل سے ہو اور پھر عقل ہی سے گریز کیا جائے۔

جب قسمت مجھے شام کی سرزمین میں لائی تو میں نے وہاں آپ کے علم و فضل کا شہرہ سنا اور تمام اشخاص کو اس امر میں متفق پایا لیکن میں نے آپ کے مذہبی خیالات کے متعلق لوگوں میں اختلاف پایا۔ ہر شخص آپ کے عقائد کے متعلق اپنی اپنی رائے رکھتا ہے۔ اتفاق سے میرا گذر ایک ایسی محفل میں ہوا جہاں آپ کا چرچا تھا۔ وہاں بھی لوگ ہر قسم کی باتیں کر رہے تھے میں نے آپ کی طرفداری کی اور کہا کہ ایسا زاہد تمام شکوک سے بالاتر ہے۔ مجھے تو پورا یقین تھا کہ آپ کے پاس کچھ "اسرار لدنی" ہیں جنہیں آپ عوام سے چھپانا چاہتے ہیں اور کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو آپ کو جھک جھک بک بک کرنے والوں سے ممتاز بناتی ہیں۔ چنانچہ میں نے آپ کا یہ شعر سنا۔

غدوت مریض العقل والدین فالقنی لتعلم انباء الامور الصحائح

تو میرے یقین کی انتہا نہ رہی۔ میرا خیال تھا کہ جس کا یہ دعوی ہو وہ یقیناً ہر شخص کو خواہ کتنا ہی فاضل کیوں نہ ہو، قائل کر سکتا ہے۔ بس میں مثل "موسیٰ آپ کے "طور" پر پہنچا کہ شاید کوئی "تجلی" ہو اور میں فخر کر سکوں کہ مجھے ایسی چیز ہاتھ لگی ہے جس سے اغیار غافل ہیں یا جس کے متعلق وہ چہ می گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ابتدا ایک چھوٹی سی بات سے کی گئی تاکہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا جائے۔

مگر آپ نے تو یہ جواب دیا کہ آپ میری رہنمائی نہیں کر سکتے۔ میں نے اس جواب کو آپ کی نیک نفسی پر محمول کیا کیونکہ بڑے آدمی اپنے منہ سے میاں مٹھو نہیں بنتے۔ بالآخر آپ کی باتوں سے میں اس مطلب پر پہنچا ہوں کہ سب لوگ کسی نہ کسی منزل پر حیران و سرگرداں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ نیک و بد کا خالق خدا ہے۔ اس پر دوسرا اعتراض کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ سفر کی مصیبتیں اور تمام باتیں جن سے نبی کریم نے پناہ مانگی نیک ہیں یا بد۔ اگر وہ نیک

ہیں تو دعا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اور اگر بد ہیں مگر خدا کی مشیت کے مطابق ہیں تو پھر دعا اتنی ہی بلکہ زیادہ بے سود ہے۔ اس قسم کے اور بھی سوالات ہیں مثلاً امام حسنؑ کا زہر دیا جانا یا امام حسینؑ کا جام شہادت پینا۔ اگر ان دونوں کا شہید ہونا اچھا تھا تو قاتلین پر لعنت بھیجنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اگر ان کا شہید کیا جانا برا تھا مگر مشیت ایزدی کے مطابق تھا تو قاتلین بے گناہ ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ نیک کام اللہ سے ہوتے ہیں اور برے کام کسی اور سے تو اس کا بھی مسکت جواب دیا جاتا ہے ساتھ ہی آپ نے کچھ اور باتیں اور کفر آمیز اشعار نقل کئے ہیں مگر مجھے تو ایسے لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ جب ان لوگوں سے بحث مباحثے سے میری تسلی نہیں ہوئی تب ہی تو میں نے آپ سے یہ بات پوچھی تھی۔ میرے نزدیک ان کے اقوال کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ صرف آپ کا عندیہ جاننا مطمح نظر تھا مگر آپ نے تو کچھ نہ بتایا۔

میں نے آپ سے گوشت چھوڑنے کا سبب دریافت کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے جانوروں کو ایذا ہوتی ہے جو آپ کو ناپسند ہے میں نے اس کی تردید کی اور کہا کہ خدا نے چند جانوروں کو دوسرے جانوروں پر مسلط کیا ہے گرچہ وہ جانتا ہے کہ ان کی بہتری کس چیز میں مضمر ہے چنانچہ آپ کو اس خدا سے زیادہ عادل اور مہربان ہونے کی ضرورت نہیں بعد ازاں آپ نے بات بدل دی اور گوشت نہ کھانے کا عذر اپنی مفلسی اور تنگدستی بتایا۔ کیونکہ آپ کے وظیفہ کا بیشتر حصہ نوکر کی تنخواہ میں صرف ہوتا ہے اس کی تلافی کے لئے میں نے آپ کو تدبیر بتائی کہ میں ایسے شخص کو آپ کے لئے لکھوں گا جو کبھی احسان نہیں جتاتا۔ اس سے آپ کو اچھا کھانا مل سکتا تھا مگر آپ نے تو اپنے دوسرے خط میں اسے بھی نامنظور کر دیا۔ آپ نے لکھا کہ یہ تدبیر آپ کو ناپسند ہے اور آپ سبز ترکاریوں کا کھانا ہی پسند کرتے ہیں جس کے آپ اب عادی ہو گئے ہیں۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں ایسے شخص سے مدد کا طالب ہوں جو خود ہی حیران ہے اور وہ شعر جس پر میں نے اپنی خط و کتابت شروع کی ہے صرف آپ کے مذہبی جوش و خروش کا مظہر ہے۔ "ومن یھد اللہ فھو المھتد۔ ومن یضلل فلن تجد لہ ولیا مرشدا" کے کیا معنی ہیں

مگر اس میں تو دو متضاد باتیں ہیں۔ اگر ارشاد صحیح ہے تو کوشش بے سود ہے۔

ہاں آپ یہ بھی لکھتے ہیں کہ خدا کے راز کو کوئی نہیں جان سکتا سوائے اولیا کے یہی تو چیز ہے جس کے لئے ہم دریوزہ گری کر رہے ہیں۔ جب ہم آپ کے عقل و دین کو صحیح و سالم سمجھتے ہیں جیسا کہ شعر سے واضح ہے اور دوسروں کا عقل و دین ناقص، تو پھر طرہ یہ ہے کہ آپ رہبری نہیں کر سکتے۔ یقیناً اس معاملہ میں جو کچھ آپ خط میں لکھتے ہیں آپ کے شعر سے مختلف ہے اس حالت میں کیا کیا جائے؟

آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلے شعر کے معنیٰ دوسرے شعر سے پورے ہوتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ عقل و دین کا نقص گوشت دودھ اور شہد کے استعمال کرنے سے ہے لہٰذا دونوں کی تکمیل ان کو ترک کرنے سے ہو سکتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ عقل و دین کی تکمیل ان کے ترک کرنے سے نہیں ہوتی۔ اس صورت میں دوسرا شعر پہلے شعر کے معنیٰ کو رد نہیں کر سکتا جس کا صریح مطلب یہ ہے کہ عقل و دین کی تکمیل گوشت دودھ اور شہد کے استعمال سے ہو سکتی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ پانی کے جانور خشکی پر آنا پسند نہیں کرتے اور ان کو کھانے سے احتراز کرنا کوئی بے جا بات نہیں ہے خواہ وہ حلال ہی کیوں نہ ہوں۔ نیز مذہبی لوگوں نے ہر زمانے میں ایسی ایسی چیزیں اپنے لئے حرام کر دیں کہ جو ان کے لئے حلال تھیں ظاہر ہے کہ بحر و بر میں کوئی جاندار انسان سے بڑھ کر نہیں ہے۔ جو باوجود موت کو ناپسند کرنے کے مرتا ہے اسے یہ بات کبھی گوارا نہیں ہو سکتی کہ اسے کوئی چیز کھائے۔ پھر بھی قبر میں اسے کیڑے کھاتے ہیں اگر یہ بات پُر حکمت ہے تو تمام قسم کے جانور بھی اسی حکمت میں آتے ہیں۔ اگر حکمت سے خالی ہے تو غیر ممکن ہے کہ صانع بے وقوف ہو اور مخلوق عقلمند۔ آپ نے یہ دلیل بھی بیان کی کہ نبی کریم اتنی عبادت کرتے تھے کہ پاؤں میں چھالے پڑ جاتے جب لوگوں نے آپ سے کچھ کہا تو آپ نے فرمایا "افلا احب ان اکون عبدا شکورا" مضمون زیر بحث کو اس دلیل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک انسان نماز کے وقت جتنی نماز پڑھنا چاہے پڑھے۔ صرف فریضت کی نماز میں کمی و بیشی نہیں کر سکتا۔ مزید برآں یہ بات شرع سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ہماری بحث معقولات سے ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ قرآن کا حکم ہے کہ حرم میں شکار نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ حلال شکار سے بھی گریز کریں تاکہ انہیں تقرب الٰہی حاصل ہو۔ اس کے متعلق میرا جواب یہ ہے کہ خدا ہی کسی چیز کو حلال یا حرام کرسکتا ہے۔

آپ نے یہ بھی کہا کہ حضرت علی کے پاس لوگ چھوارے کی مٹھائی لائے آپ نے اسے نہیں کھایا اور پوچھا کہ کیا نبی کریم اس کو کھاتے تھے۔ لوگوں نے کہا نہیں۔ تو یہ دلیل بھی آپ کے حق میں نہیں بلکہ آپ کے خلاف ہے کیونکہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول کریم نے گوشت کا کھانا ترک نہیں کیا حالانکہ آپ عمر بھر گوشت سے کنارہ کش رہے ہیں۔

کاش آپ عقلی دلائل ہی سے کام لیتے اور شرع کو بیچ میں نہ لاتے۔ تو میں بھی شرعی باتوں سے آپ کی تردید نہ کرتا کہ جس سے آپ بے چین ہوں۔

آپ اپنی ناتوانی کی شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نہ سن سکتے ہیں نہ کہہ سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھی آپ عجوبۂ روزگار ہیں اور شہرۂ آفاق قسمت نے آپ کو کتنا ہی کیوں نہ ستایا ہو آپ نے خود بھی اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اگر ان تکالیف کو برداشت کرنے کی غرض و غایت سعادت اخروی ہے تو خیر۔ پھر تو آپ کا شعر بھی بالکل مناسب ہے اور اگر حالت اس سے برعکس ہے تو پھر آپ بے جا تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ اور وقت ضائع کر رہے ہیں اور جو دعویٰ آپ نے شعر میں کیا ہے بالکل باطل ہے۔

ان سوالات و جوابات سے میرا منشا صرف استفادہ تھا۔ جب استفادہ کی بات ہی نہ ہو تو پھر جواب کے کیا معنیٰ مسجع عبارت سے گریز اس لئے تھا کہ خیالات مقصود تھے نہ کہ جامع بیاشی کیوں ہو اگر آپ کی ادبی موشگافیاں مطلوب ہوتیں تو آپ کے ادبی کارنامے کیا کم تھے کاش میں آپ کے پوشیدہ مذہبی خزانہ کو اتنا ہی سمجھ سکتا جتنا کہ نظم و نثر کے کارناموں کو۔

میں آپ سے معافی کا طالب ہوں کہ آپ نے میرے خطوط پڑھے اور جواب دینے میں اپنا وقت ضائع کیا۔ میں نے اگر فائدہ نہیں پہنچایا تو نقصان ضرور کیا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ میرا مقصد آپ کے علم و فضل سے استفادہ کرنا تھا۔ والسلام
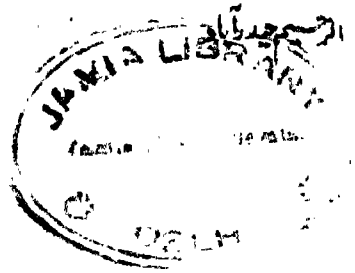
اسلام کا معاشی انقلاب

محمد سرور

انسانیت کی تباہی اور زبوں حالی کا اکثر یہ سبب ہوتا ہے کہ عام جمہور کو کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ وہ فاقے پر مجبور ہوتے ہیں، اور اس طرح انہیں محتاج رکھ کر ان کو معاشی اور اخلاقی حیثیت سے تباہ کیا جاتا ہے۔ معاشی تباہ حالی سے یہ بھی ہوتا ہے کہ خالی پیٹ کی فکر میں انسانوں کو کسی اور چیز کی سُدھ بدھ نہیں رہتی، اور انسانی زندگی کی جو اعلیٰ ضرورتیں ہیں وہ سب بہم نہیں پہنچتیں اور اس طرح انسانیت ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانیت کے اعلیٰ تقاضے بہت حد تک معاشی اسباب و حالات سے متاثر ہوتے ہیں اس لحاظ سے اشتراکیت کے معاشی اصولوں سے اختلاف کرنا بڑا مشکل ہے لیکن بحیثیت مسلمان کے ہمارا کہنا ہے کہ بیشک انسان کی معاشی ضروریات کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ لیکن ساتھ ہی انسانیت کے اس رخ کو بھی جو اخلاق اور فکر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ تشنہ نہ چھوڑا جائے۔

اخلاق اور فکر کے بغیر کوئی تمدن پائدار نہیں ہوتا۔ چنانچہ سرمایہ داروں پر جہاں یہ الزام ہے کہ انہوں نے انسانیت کے بہت بڑے حصے کو محتاج رکھ کر انہیں انسانیت کی سطح سے نیچے گرا دیا۔ ان پر دوسرا الزام یہ بھی ہے کہ اس بڑے حصے میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو انسانی اخلاق اور فکر کو اپنی صلاحیتوں سے بڑی ترقی بخش سکتا تھا۔ لیکن سرمایہ داروں نے اسے روٹی کا محتاج کرکے اس سے محروم کر دیا۔ چنانچہ ان کی وجہ سے انسانیت کی ترقی مجموعی طور پر رک گئی۔

جب کسی وجہ سے قوم کا ذہنی طبقہ جو اخلاق اور افکار کا مالک ہوتا ہے۔ اپنے فرض منصبی

سے غفلت برتتا ہے تو اس کی صلاحیتیں ذلیل کاموں میں صرف ہونے لگتی ہیں ان کی ذلت کا پہلا قدم تملق ہے۔ یعنی حکمران طبقے کی خوشامد کرکے ان سے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی کوشش۔ اور یہی مرض ہے جو آگے چل کر ان کو غیراللہ کی عبادت کا داعی بنا دیتا ہے یہی جذبہ بت پرستی سکھاتا ہے۔ اور اس منزل میں انسانیت کے اعلیٰ خصائل سارے تباہ ہوجاتے ہیں، اور انسانیت فاسد ہوجاتی ہے۔ اس طرح کی مسخ شدہ انسانیت کے برباد کرنے کے لئے قدرتی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر اس برباد شدہ انسانیت کے کھنڈرات پر صالح انسانوں کی آبادی بستی ہے۔

اس زوال آمادہ اور فرسودہ تمدن کی تباہی کے لئے انسانوں کا ایک نیا گروہ اٹھتا ہے قدرتی اسباب ان کے موید ہوتے ہیں۔ اس گروہ کی قیادت ایک شخص کو ملتی ہے جو انقلاب کا امام ہوتا ہے۔ ان ائمہ انقلاب کا ایک اونچا درجہ ہے جنہیں انبیاء کا نام دیا جاتا ہے، انبیاء کے لائے ہوئے نظام میں انسانی فطرت کی زیادہ رعایت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نظام دیر تک قائم رہتا ہے۔

قرآن مجید میں انبیاء کے جس قدر قصے ہیں وہ اسی انقلاب کا نمونہ پیش کرتے ہیں، جو رسول اکرم کے مبارک ہاتھوں سے ہونے والا تھا۔ رسول اللہ انسانیت کے عالمگیر انقلاب کے داعی تھے آپ کے اصحاب خلافت راشدہ کے دور میں اس کو ایک درجہ تک عالمگیر بنا دیتے ہیں۔ یعنی اس انقلابی حکومت کا دائرہ اتنا وسیع کر دیتے ہیں کہ دنیا کی ساری رجعت پسند حکومتیں جمع ہو کر بھی اس انقلابی حکومت کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتیں۔ قرآن کا یہ انقلاب ختم نہیں ہوا بلکہ یہ ہمیشہ برسر پےکار رہے گا۔ کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں آسکتا جس میں رجعت پسندی کی طاقتیں بالکل معدوم ہوجائیں۔ اگر اقدام پسندی اور رجعت پسندی کی یہ کشمکش نہ رہے تو پھر انسانیت کا بھی خاتمہ ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں میں ان نظریات کا بار بار ذکر ہے۔ اور آپ نے اپنے زمانے کی گری ہوئی سوسائٹی کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ قوم کی نجات اس فرسودہ نظام کو توڑے بغیر کسی طرح ممکن نہیں حجۃ اللہ البالغہ کی دوسری جلد ص۱۰۵ میں فرماتے ہیں۔

دس ہزار آدمیوں کی ایک بستی ہے۔ اگر اس کا اکثر حصہ نئی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف نہیں رہتا تو وہ ہلاک ہوجائے گی۔ ایسے ہی اگر ان کا بڑا حصہ تعیش میں

مبتلا ہوگیا تو وہ قوم کے لئے وبال بن جائے گا جس کا ضرر بتدریج ساری آبادی میں
پھیل جائے گا اور ان کی حالت ایسی ہو جائے گی جیسے انہیں دیوانے کتے نے
کاٹ کھایا۔"

اسی کتاب کی پہلی جلد میں ص ۳۵ پر مذکور ہے۔

"اس زمانے میں اکثر بلاد کی بربادی کا بڑا سبب دو چیزیں ہیں۔ ایک تو سرکاری
خزانے سے بناوٹی حقوق کا نام لے کر لوگ روپیہ وصول کرتے ہیں، جس نام سے
وہ روپیہ لیتے ہیں، اس کے حق کو وہ کسی طرح پورا نہیں کرتے دوسری چیز یہ ہے کہ
کمانے والی جماعتوں یعنی کاشت کار، تاجر اور پیشہ وروں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس
لگائے جاتے ہیں۔ ان میں سے نرم مزاج تو ٹیکس ادا کر رہے ہیں۔ لیکن جن میں
مقابلے کی ہمت ہے وہ بغاوت اختیار کرتے ہیں اس طرح ساری سلطنت
کمزور ہو جاتی ہے۔

شاہ صاحب کی تعلیمات میں معاشی مسئلے کی اہمیت پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اور نہایت وضاحت
سے بتایا گیا ہے کہ اگر انسانوں کی معاشی حالت درست نہ ہو تو نہ ان کے اخلاق اچھے ہوں گے اور
نہ ان کی انسانیت صالح ہو سکے گی۔ آپ نے دہلی کے محمد شاہی دور کو قیصر و کسریٰ کا مماثل ٹھیرایا
ہے۔ یعنی تعیش اسراف سرمایہ داری اور لوٹ کھسوٹ خواہ کافروں کے ہاتھ سے ہو یا نام کے
مسلمانوں کے ہاتھ سے۔ دونوں مٹائے جانے کے قابل ہیں۔ اور مٹانے کا یہ کام صرف انقلاب
کرتا ہے۔ یہ انقلاب کرنا اسلام کا مقصد اصلی ہے۔ اور اس کو آج عملی شکل میں پیش کرنا مسلمانوں
کا فرض۔

شاہ صاحب کے نزدیک رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد ہی یہی تھا کہ ان کے
ذریعے خدا کے دین کو باقی سب دینوں پر غالب کر دیا جائے۔ اور اسلام انسانوں کو ایک ایسا نظام
حیات دے جو سب نظاموں سے بہتر اور اعلیٰ ہو۔ آپ کی بعثت کا یہ مقصد اس صورت میں پورا ہوا
کہ قیصر و کسریٰ کا نظام جو ایک حد تک ساری دنیا پر حاوی تھا، پاش پاش ہو گیا اور انسانیت
کو قیصریت اور کسرویت دونوں سے نجات ملی۔

قیصر و کسریٰ کے نظام کو تباہ کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس کی بناء مفادِ عامہ کے خلاف جمہور کی لوٹ کھسوٹ استحصال Exploitation پر تھی بادشاہ اس کے امیروں اور مذہبی طبقوں کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ رعیت کی خون پسینہ ایک کرکے کمائی ہوئی دولت سے عیش کریں۔ حجۃ اللہ کے ص ۱۰۵ پر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"عجم اور روم کے شاہنشاہ اس قدر تعیش میں مبتلا ہوگئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری لاکھ روپے سے کم قیمت کی ٹوپی یا کمر بند پہنتا تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا"

لوٹ کھسوٹ کی اس گرم بازاری میں عوام کی حالت حیوانوں سے بدتر ہوگئی تھی۔ اور پھر اوپر کے طبقوں کو جب بغیر مشقت کے ثروت ملے تو ان میں ہر قسم کے اخلاقی عیوب پیدا ہو جاتے ہیں نہ ان کی صحتیں ٹھیک رہتی ہیں اور نہ ذہنی قوائے۔ اور چونکہ ان کی زندگی کا مقصد مفت خوری و ہوس ناکی بن جاتا ہے۔ اس لئے ان میں آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ اور شاہی دربار سازشوں کا مرکز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح عوام تو بھوک سے بے جان ہوگئے اور "اشراف" کو ثروت نے بے کار کر دیا۔ کلیلہ و دمنہ کے مصنف ایرانی حکیم برزویہ نے اس وقت ایران کی جو حالت تھی اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے صداقت سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ جو چیز مفید ہے، وہ موجود نہیں ہے۔ اور جو موجود ہے وہ مضر ہے جو چیز اچھی ہے وہ مرجھائی ہوئی ہے، اور جو بری ہے وہ سرسبز ہے دروغ کو فروغ ہے اور نیکی بے رونق ہے۔ علم پستی کے درجے میں ہے۔ اور بے عقلی کا درجہ بلند ہے۔ بدی کا بول بالا ہے۔ اور شرافت نفسی پامال ہے۔ محبت متروک ہے۔ اور نفرت مقبول ہے۔ فیض و کرم کا دروازہ نیکوں پر بند ہے اور شریروں پر کھلا ہے۔ حکام کا فرض صرف عیاشی کرنا اور قانون کو توڑنا ہے۔ مظلوم اپنی ذلت پہ قانع ہے اور ظالم کو اپنے ظلم پر فخر ہے۔ حرص اپنا منہ کھولے ہوئے ہے اور دور و نزدیک کی ہر چیز کو نگل رہی ہے۔ تسلط لائقوں سے نالائقوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مسرت کے نشہ میں یہ کہہ رہی ہے کہ

میں نے نیکی کو مقفل اور بدی کو رہا کردیا ہے۔"

کم و بیش یہی حالت روم کی تھی۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں ان کا یہ روگ بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر یہ ہوا کہ خدا اور اس کے مقرب فرشتوں کی آتش غضب بھڑکی النبی امی (صلعم) مبعوث ہوئے جن کی زبان سے قیصر اور کسریٰ کی عادات کی مذمت فرمائی گئی۔ اور ان کے ذریعہ دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کردیا گیا ــــ اور ان کی جگہ ایک اور نظام نافذ ہوا، جو عدل و مساوات پر مبنی تھا چنانچہ اوپر کے لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے یا تو سرے سے ناپید ہو گئے۔ یا ان کے ہاتھوں سے اقتدار چھن گیا۔ قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ہر ملک کے عوام کو سر اٹھانے کا موقعہ ملا۔ اور اس واقعہ پر زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ کہ مصر، شام، افریقہ اور ایران میں وہاں کے عوام جماعتی زندگی میں پیش پیش نظر آنے لگے۔

قیصریت اور کسرویت کی عادات کی مذمت ان کے نظام کی تخریب اور ایک صالح اور مفید نظام کا نفاذ قرآن کی تنزیل کا مقصد تھا۔ جو گروہ اور قوم قیصریت کو اپنا شعار بنالے اور عوام کی لوٹ کھسوٹ پر ان کی گذران ہو قرآن ان کے خلاف دعوت جہاد دیتا ہے۔ قرآن کا یہ پیغام کسی جماعت یا قوم کے لئے مخصوص نہیں۔ قرآن ہر ظلم کا انکار کرتا ہے اور ہر مظلوم کے دل میں یہ ولولہ اور حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ ظلم کو مٹانے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے۔ اور اس کے اصرار پر اس کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

خود مکہ کی زندگی میں چند بنیادی خامیاں تھیں جن کی بنا پر مکہ کی شہری زندگی میں اندر ہی اندر ناراضگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مکہ میں ایک طرف سرمایہ دار تاجروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا۔ اور دوسری طرف حبشی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ مکہ میں سودی کاروبار زوروں پر تھا۔ اور خود رسول اللہ کے چچا حضرت عباس تک اسلام لانے سے پہلے سود کا بڑے پیمانے پر کام کرتے تھے۔ یہ امیر طبقہ مال مست تھا۔ تجارت اور سرمایہ سے انہیں دولت ملتی اور دولت سے یہ لوگ خدمت کے لئے حبشی غلام خریدتے اور حظِ نفس کے لئے لونڈیاں لاتے چنانچہ ناچ اور گانے کی محفلیں جمتیں، شراب کا دور چلتا، سفر کے سلسلہ میں جب ان لوگوں کا ایران اور شام میں گذر ہوتا۔ تو وہاں سے یہ عیش و عشرت کے نئے نئے انداز سیکھ

کر آتے۔ مکہ کا یہ گنتی کا اوپر کا طبقہ اس لہو لعب میں منہمک تھا۔ لیکن مکہ کے باشندوں کی اکثریت اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہی تھی۔

دنیا کا سب سے مشکل مسئلہ اور سب سے بڑی گتھی جس کو سلجھانے کے لئے ہمیشہ بڑے آدمیوں کو ضرورت پڑی۔ اور ہر نئے نظام کو اس کے متعلق اپنا خاص نقطۂ نظر متعین کرنا لازمی ہوا۔ وہ انسانیت کے مختلف طبقوں کے درمیان جن میں اکثر کشمکش رہتی ہے صلح وصفائی اور میل ملاپ کی راہ پیدا کرنا ہے۔ امیر و غریب کا فرق آسودہ حال و قلاش کی چپقلش، زمینداروں اور کسانوں کا تفاوت، زرداروں اور بے زر والوں کی آپس میں کھینچا تانی، کارخانوں کے مالکوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی بے اعتمادی۔ اس کش مکش اس اختلاف اور اس دشمنی کو جو ایک قوم کے مختلف طبقوں میں قدرتاً ہوتی ہے۔ دور کرنا ہر صاحب مذہب اور ہر نئے نظام کا فرض ہوتا ہے اس لحاظ سے اسلام کو بھی اس مسئلہ کا حل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مذہب اسلام اعلان جنگ تھا۔ ظالم، فاجر، عام مفاد کے ذرائع کے اجارہ داروں کیخلاف جو پسماندہ اور غریبوں کی محنت سے اپنے ہاتھ رنگتے اور مذہب کے نام سے عام عربوں کی سادہ لوحی اور توہمات پرستی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مکہ کے قریشی تاجر نہ صرف غیر قریشی عوام کو ذلیل سمجھتے تھے بلکہ دولت اور زرداری کے ساتھ ساتھ انہوں نے رنگ اور نسب کے عجیب و غریب تصورات بنا رکھے تھے۔ یہ لوٹ کھسوٹ ہر ذریعہ سے روا رکھی جاتی تھی، مذہب ہو یا سیاست، تجارت ہو یا اجتماع ان سب کا حاصل یہ ہو گیا تھا کہ قریشی تاجروں کی اس چھوٹی سی جماعت کو اور فروغ ملے۔

اسلام نے اس وقت کی دنیا کو کیسے پایا تھا، اور اس کی کایا پلٹ کر دی۔ اسلام کے ان زریں کارناموں کی صدائے بازگشت دوسروں کی زبان سے سنیئے۔ ایم۔ این رائے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں وہ ایک آواز تھی جس نے عرب کے قبائل کو متحد کر دیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد اس سیاسی اور مذہبی مرکزیت کے جھنڈے تلے سلطنت روما کے وہ تمام ایشیائی و افریقی صوبے آ گئے جو قدیم متزلزل نظام سے نکلنا چاہتے تھے عیسائیت

میں نہ تو اگلا سا جوش تھا اور نہ اس کی انقلابی اہمیت ہی باقی تھی۔ وہ اپنے کم زور کندھوں پر خانقاہیت کا پشتارہ لئے کانپ رہی تھی۔ ایسے نازک وقت میں عربستان سے امید کی کرن پھوٹی۔ اسلام کی تلوار بظاہر خدا کی خدمت کے لئے بلند ہوئی لیکن درحقیقت اس نے ایک ایسے ترقی پسند سماجی اور مذہبی نظام کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس نے تمام فرسودہ خیالی، توہم پرستی اور قدیم مذاہب کو موت کی گہری نیند سلادیا۔"

اسلام کی اس انقلاب آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے فرانس کا مشہور اجتماعی مصنف موسیو لیبان لکھتا ہے۔

"اسلامی تہذیب کی تاریخ میں یہ نہایت اہم واقعہ ہے اور اس زمانے کی عربی تہذیب کے اثر اور اس کی اہمیت کا غالباً سب سے اہم اور قطعی ثبوت بھی۔ ایرانی، بازنطینی اور قبطی سب ایک لاعلاج کاہلی کا شکار ہو رہے تھے اور اس قابل نہ تھے کہ از خود زمانے کی ترقی کا ساتھ دے سکیں۔ عربوں سے ربط وضبط پیدا ہونے کی وجہ سے ان کی سستی دور ہو گئی۔ اور ان میں ایک نئی طرح کی ذہنی بیداری پیدا ہو گئی۔"

بدقسمتی سے ہماری تاریخ نے تیغ آزماؤں کے کارناموں پر بہت زور دیا۔ یا حکم راں طبقوں کی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کو اچھالنے کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ رکھی لیکن اسلامی انقلاب سے جو شاندار اور دوررس نتائج برآمد ہوئے ان کی تحقیق نہ کی۔ اموی تلواریں مشرق میں پاکستان، ہندوستان، افغانستان، ترکستان، خراسان اور ایران اور ادھر مغرب میں فرانس کی حدود تک عربی نفوذ اور اقتدار کے لئے راستہ صاف نہ کرتیں تو ان ممالک میں اسلام کو کیسے بار ملتا۔ سچ پوچھئے تو ان فتوحات کی وجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہو سکے کہ پسماندہ انسانیت کو نئی زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ ملا۔

"اس وقت دول فارس و روما کے کھنڈر صاف کرنے کی ضرورت تھی تاکہ ایک نیا سماجی نظام نئے خیالات اور مقاصد کی شمع لے کر اٹھے اور تیرہ و تار دنیا میں علم کا نور پھیلا دے۔ مجوسی تصوف کے گندے توہمات اور یونانی کلیسا کے

ناگفتہ بہ ماحول نے فارس اور بازنطینی ممالک کے عوام کو ذہنی پستی اور اخلاقی کمزوریوں کے قعر مذلت میں پھینک دیا تھا۔"

بنو امیہ کی عربی حکومت نے دول فارس و روما کے کھنڈرات کو صاف کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور دوسرے اپنی فتوحات سے اسلام کے بین الاقوامی پیغام کو عام بھی کیا۔ اس طرح مفتوحہ قومیں اسلام سے متعارف ہوئیں اور ان کا اثر یہ ہوا کہ یہی قومیں ایک صدی کے اندر اندر اس قابل ہوگئیں کہ عرب ان کو اپنے ساتھ حکومت میں برابر کا شریک کرنے پر مجبور ہوگئے۔ موسیو لیبان کے الفاظ ہیں۔

"خون ریزی کے اس گرداب میں نئے تمدن کا بیج جو ایک قدیم سرزمین میں بویا گیا تھا، از سرنو پھوٹتا ہے اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو امویوں کا ستارہ غروب ہوتا ہے اور عباسیوں کے کوکب اقبال کی درخشانی سے افق روشن ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں عظمت و جلال کے ایک شاندار منظر سے دوچار ہوتی ہیں۔"

سورۂ "جمعہ" میں رسول اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق یہ تصریح کی گئی ہے کہ آپ کے پہلے مخاطب اُمیین ہیں۔ "اُمیین" سے مراد عرب کے وہ قبیلے ہیں جنہوں نے قریش کی امامت کو تسلیم کرلیا تھا۔ دوسرے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد قرآن عظیم نے اس طرح واضح کیا ہے کہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے مل کر دعا کی تھی کہ ہماری نسل سے ایک امت مسلمہ پیدا کی جائے اور "بیت" یعنی خانہ کعبہ اس کا منبع اور مرکز ہو ظاہر ہے اس امت مسلمہ کو ایک نبی کی ضرورت تھی جو دین ابراہیمی کی صحیح معنوں میں تعلیم دے اور اسے تعلیم و تزکیہ کے ذریعہ اس قابل بنادے کہ وہ ابراہیمی دین دنیا کی تمام قوموں میں پہنچا سکیں۔ مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے مبعوث ہوئے تھے کہ وہ قریش کی اصلاح کریں۔ ان کو تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کرکے ان کو اقوام عالم میں اسلام کا نقیب اور اس کی نشر و اشاعت کا حامل بنائیں۔

(مولانا سندھیؒ)

ابنِ خلدون

سلمان مسعود

بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ابنِ خلدون مسلمانوں کا سب سے بڑا مورخ تھا۔ اور اس بات کو بھی آج ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ تاریخ کو علم و فلسفہ کی نظر سے دیکھنے کا فخر سب سے پہلے اس مورخ کو ہوا۔ دوسرے لفظوں میں ابن خلدون فلسفہ تاریخ کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ ابن خلدون نے کئی جلدوں میں تاریخ عالم لکھی ہے۔ لیکن اس کی شہرت اس تاریخ سے نہیں بلکہ اس کتاب کے مقدمہ سے ہے۔ ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ دنیا کی چند مشہور ترین کتابوں میں سے ہے۔ اور یورپ کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں تاریخ پر تنقید کی ہے اور چونکہ تاریخ اس کے نزدیک زندگی سے عبارت ہے، اس لئے اس کی تاریخ پر تنقید گویا زندگی پر تنقید ہے۔ یہ مقدمہ کیا ہے؟ چند الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ آٹھ سو برس تک مسلمانوں نے جو کچھ کیا، کہا اور سوچا۔ ابن خلدون نے اس کتاب میں اس کو جانچا اور پرکھا ہے اس پر تنقید کی ہے۔ الغرض اس طویل زمانے کی ساری سرگرمیوں کا ایک خاکہ مرتب کر دیا ہے۔ اور اس پر محاکمہ بھی کیا ہے۔

ابن خلدون اپنا شجرۂ نسب یمنی عربوں سے ملاتا ہے اس کے آباؤ اجداد عربی حملہ آوروں کے ساتھ اسپین پہنچے۔ بعد میں جب عربی حکومت کمزور ہوگئی اور شمال کے عیسائی اسپین کے بعض حصوں پر قابض ہونے لگے تو ابن خلدون کے بزرگ ہجرت کرکے تیونس آگئے۔ اور یہیں ۲۷ مئی ۱۳۳۲ء مطابق یکم رمضان ۷۳۲ھ میں ابن خلدون پیدا ہوا۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد ابن خلدون نے اپنے زمانہ کا نصاب تعلیم مکمل کیا۔ تیونس اس وقت علم و ادب کے باکمالوں

کا مرکز تھا۔ اسپین کی خانہ جنگی اور بدامنی سے تنگ آکر جو عالم بھی نکلتا وہ شمالی افریقہ کا رخ کرتا

ابن خلدون کو ٹیونس میں اپنے عہد کے بڑے بڑے علماء سے استفادہ کا موقعہ ملا۔ موصوف نے اپنی خود نوشتہ سوانحعمری میں ایک ایک استاد کا نام گنایا ہے۔ جن سے اس نے پڑھا۔

ابن خلدون کوئی اٹھارہ سال کا تھا کہ شمالی افریقہ میں طاعون کی وبا آئی۔ اور اس میں ابن خلدون کے والدین اور اس کے وطن کے بڑے بڑے علماء و فضلا انتقال فرما گئے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ اس صدمہ سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ اور میں نے ترک دنیا کا خیال کر لیا۔ لیکن بڑے بھائی کے کہنے سے ابن خلدون نے ٹیونس کے سلطان کی ملازمت قبول کر لی۔ اور وہ سلطان کا مہر بردار مقرر ہو گیا

اس زمانے میں شمالی افریقہ میں کئی حکومتیں تھیں اور ہر حکومت دوسرے سے برسر پیکار رہتی پھر خود حکومتوں کے اندر آئے دن انقلابات ہوتے رہتے تھے۔ ایک بادشاہ بنتا تو اس کے خلاف سازشیں ہوتیں۔ اور جب سازشیں کرنے والے کامیاب ہو جاتے اور اپنی پسند کا بادشاہ مقرر کر لیتے تو اسی دم ایک نئی سازش کھڑی ہو جاتی ہے اور پہلی حکومت کا تختہ الٹنے کی تدبیریں ہونے لگتیں۔ ہر شخص دوسرے کا دشمن تھا۔ ایک دوسرے کے خلاف دن رات منصوبے سوچنا ان کا کام تھا۔ قول اقرار ہوتے لیکن ان کا کوئی پاس نہ کرتا۔ وعدے کئے جاتے لیکن ایفاء کا کسی کو خیال نہ آتا۔ وزیر بادشاہوں کا زوال چاہتے۔ بادشاہ اپنے وزیروں سے خائف رہتے۔ بیٹا باپ کو تخت سے اتارنے کے لئے سازشیں کرتا۔ بھائی بھائی کے خلاف صف آرا نظر آتا۔ ابن خلدون نے شمالی افریقہ کی اس سیاست میں پورا حصہ لیا۔ وہ سازشوں میں شریک ہوا۔ اس نے وفاداری کی قسمیں کھا کر توڑ دیں۔ ایک حکومت سے بھاگ کر وہ دوسری حکومت میں پہنچا۔ وہاں کسی سازش کا پتہ چل گیا تو کسی تیسری حکومت کے ہاں پناہ لی۔ اس نے پارٹیاں بنائیں۔ اور اگر اپنی پارٹی ہارتی دکھائی دی۔ وہ کامیاب پارٹی میں جا شامل ہوا۔ ایک بادشاہ کا معتمد بنا لیکن جب اس بادشاہ کے خلاف منصوبے کئے جانے لگے تو ابن خلدون اس میں پیش پیش تھا۔ الغرض مراکش ہو یا ٹیونس یا الجزائر۔ شمالی افریقہ کی کسی حکومت میں کہیں کوئی انقلاب ہوا۔ تو مخالف یا موافق جماعت میں آپ کو ابن خلدون ضرور نظر آئے گا۔ تعجب یہ ہے کہ اپنی ان تمام وعدہ خلافیوں، سازشوں، دھڑا بندیوں، سیاسی چال بازیوں اور ابن الوقتیوں کو اس نے خود اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے۔ گو وہ اپنی ان تمام حرکتوں

کے جواز میں دلیلیں بھی دیتا ہے لیکن اس نے اپنے اعمال پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔

شمالی افریقہ کے ان انقلابات سے سیر ہو کر ابن خلدون نے اسپین کے پایۂ تخت غرناطہ میں جانے کی ٹھانی۔ بدقسمتی سے اسپین کی اس بچی کھچی اسلامی سلطنت کا حال بھی شمالی افریقہ کی حکومتوں سے زیادہ بہتر نہ تھا۔ یہاں بھی آئے دن خون خرابہ ہوتا۔ اور سازشوں کا بازار گرم رہتا اتفاق سے غرناطہ کا وزیر سلطنت ابن خلدون کا دوست اور ہم مشرب تھا۔ ابن الخطیب اپنے وقت کا بہت بڑا ادیب، شاعر عالم اور مدبر تھا۔ ابن خلدون جب افریقہ میں تھا تو ان دونوں کی آپس میں خط و کتابت رہتی تھی۔ ابن الخطیب اپنے دوست کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد اسے شمالی اسپین کے عیسائی بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔

ابن خلدون نے سفارت کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے ادا کئے۔ لیکن جب وہ واپس لوٹا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا زیادہ دیر غرناطہ میں رہنا مشکل ہے۔ اسی زمانہ میں شمالی افریقہ کے ایک حکمران کا اسے بلاوا آگیا۔ اور وہ اسپین کو الوداع کہہ کر پھر وطن لوٹ آیا۔

شمالی افریقہ میں واپس آکر ابن خلدون پھر سازشوں میں الجھ گیا۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ ایک حکمران کا معتمد خاص ہے اس کے دشمن اس پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔ اور جب شکست یقینی ہو جاتی ہے تو ابن خلدون اپنے آقا کا ساتھ چھوڑ کر حملہ آور سے مل جاتا ہے۔ اور اس کے ماتحت پہلے سے بڑا عہدہ قبول کر لیتا ہے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ابن خلدون کی جان پر بن گئی۔ اور وہ مرتے مرتے بچا۔ لیکن اس کے باوجود ان سازشوں سے باز نہ آیا۔ ابن خلدون کی خطر پسند طبیعت ہر انقلاب کا استقبال کرتی تھی۔ اسے نہ اپنی جان کی پرواہ تھی۔ اور نہ کسی کی وفاداری یا اپنا قول و اقرار اسے مانع ہوتا۔ وہ بے دھڑک خطرات میں پڑتا۔ اور بڑی سے بڑی سازش میں شرکت کرتے اسے باک نہ ہوتا۔ آخر ہوتے ہوتے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شمالی افریقہ کی ساری حکومتوں کے دروازے ابن خلدون پر بند ہو گئے۔ ناچار اس نے ترک وطن کی ٹھانی۔ اور ایک بار پھر وہ غرناطہ چلا گیا۔ لیکن غرناطہ میں بھی اسے امن نہ ملا۔ اور اسے مراکش کے سلطان کے کہنے پر واپس شمالی افریقہ بھیج دیا گیا۔

آئے دن کے ان انقلابات سے ابن خلدون کی طبیعت اکتا گئی۔ اور اس نے سیاسی زندگی

سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ اٹھارہ برس کا تھا کہ اس نے تیونس کے دربار میں مہربردار کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ چوبیس سال کی گردشوں کے بعد ابن خلدون نے سنہ ۱۳۷۴ء میں سیاست کو خیرباد کہا۔ اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا۔

وہ ۴ برس تک سیاسی جھگڑوں سے الگ اپنے ایک دوست قبیلہ بنوعارف کے پاس مقیم رہا۔ اس زمانے میں اسے مطالعہ کا خوب موقع ملا۔ اس کا شہرہ آفاق مقدمہ تاریخ اسی عہد کی تصنیف ہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ میں نے یہ کتاب کل چار مہینے کے عرصہ میں مکمل کر لی تھی۔ مقدمہ کے بعد ابن خلدون نے تاریخ لکھنی شروع کی ابتدا میں اس کا خیال تھا کہ صرف عربوں اور شمالی افریقہ کے بربروں کے حالات لکھے۔ لیکن بعد میں اس نے ساری دنیا کی تاریخ لکھ دی۔

ابن خلدون چاہتا تھا کہ وہ اب کسی سیاسی جھگڑے میں نہ پڑے۔ لیکن شمالی افریقہ کے سیاسی حالات اسے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ تنگ آکر اس نے حج کا ارادہ کیا چنانچہ تیونس سے روانہ ہو کر وہ اسکندریہ پہنچا۔ اور بجائے اس کے کہ وہ حجاز روانہ ہوتا اس نے قاہرہ کا قصد کیا۔

ابن خلدون کے قاہرہ پہنچنے سے پہلے وہاں کے اہل علم اس کے نام اور اس کے افکار سے واقف ہو چکے تھے۔ مصر کے علمی حلقوں میں اس کی آؤ بھگت ہوئی۔ اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اسے حکومت نے فقہ مالکی کا سب سے بڑا قاضی بنا دیا۔ سیاسی مخالفتوں نے ابن خلدون کو یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ یہاں بھی اسے سازشوں اور دھڑا بندیوں سے پالا پڑا۔ چنانچہ کئی بار اسے قضائت کے عہدے سے برخاست کیا گیا۔ اور کئی بار پھر اس کا تقرر عمل میں آیا۔ مصر کے علماء کی ایک جماعت ابن خلدون کی دشمن بن گئی۔ اور اسے بدنام کرنے اور اس کے خلاف الزامات لگانے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ابن خلدون غریب الوطن ہونے کے باوجود ان مخالفتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا۔

ابن خلدون کو مصر پہنچ کر قدرے اطمینان نصیب ہوا۔ تو اس نے تیونس سے اپنے بال بچوں اور سامان کو منگوا بھیجا۔ سمندر کا سفر تھا۔ راستہ میں وہ کشتی جس میں یہ قافلہ سوار تھا، ڈوب گئی۔ ابن خلدون کو اس کا صدمہ بڑا شاق ہوا۔ اہل و عیال کی اس حسرت ناک موت کا رنج ایک طرف اور مصر میں مخالفوں کی سازشیں دوسری طرف، ابن خلدون اس

زمانے کے حالات رقم کرتے لکھتا ہے۔ "میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گوشۂ تنہائی میں پناہ لوں"۔ لیکن ابن خلدون جیسی چلتی طبیعت کا آدمی اور مائل بہ سکون ہو۔ وہ آخری دم تک دشمنوں سے لڑتا رہا اسے بارہا منصب قضاء سے دست بردار ہونا پڑا۔ لیکن اس نے مطلق ہمت نہیں ہاری اور موت کے قریب جب اس کی عمر ۷۴ برس کے قریب تھی وہ قاضی بنتا ہے۔

شام کا ملک اس وقت مصر کے ماتحت تھا۔ خبر پہنچی کہ امیر تیمور دمشق کی طرف بڑھ رہا ہے مصر سے سلطان خود فوج لے کر تیمور کے مقابلہ کو روانہ ہوا۔ دوسرے علماء کے ساتھ ابن خلدون بھی سلطان کی رکاب میں تھا۔ شروع شروع میں مغلوں اور مصریوں کا پلہ لڑائی میں برابر رہا۔ لیکن اسی دوران میں سلطان کو پتہ چلا کہ مصر میں اس کی غیر موجودگی میں بغاوت ہو گئی ہے۔ یہ سنتے ہی سلطان شہر کو خدا کے سپرد کر کے فوج لے کر واپس مصر کو چل دیا۔ علماء نے یہ حالت دیکھی تو یہ طے ہوا کہ صلح کی گفتگو کی جائے۔ اس واقعہ کو ابن خلدون کی زبانی سنئے

"میں نے سلطان کے جانے کا واقعہ سنا تو مجھے خیال ہوا کہ اب شہر والوں کی شامت آئے گی۔ میں نے علماء کو کہا کہ یا تو مجھے شہر کے دروازے سے باہر جانے دو۔ یا فصیل کے اوپر سے ٹوکری میں نیچے لٹکا دو۔ چنانچہ میں فصیل سے نیچے اترا۔ تو مجھے امیر تیمور کا بیٹا شاہ ملک ملا۔ اور وہ مجھے امیر کے پاس لے گیا۔ میں امیر کے خیمہ میں داخل ہوا۔ امیر کہنی پہ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اور اس کے سامنے کھانے کی طشتریاں رکھی جا رہی تھیں۔ میں امیر کے سامنے گیا تو احترام کے خیال سے جھکا۔ امیر نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے بوسہ دیا اور اس نے مجھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ اور پھر ایک ترجمان کے واسطے سے ہماری گفتگو شروع ہوئی۔"

ابن خلدون نے امیر تیمور سے طویل ملاقات کی اور امیر نے اس سے شمالی افریقہ کے متعلق بہت سی باتیں پوچھیں۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ میں نے امیر کے کہنے سے شمالی افریقہ کے حالات کتابی شکل میں قلمبند بھی کر دیئے۔ مورخ لکھتا ہے کہ امیر میری باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اور مجھے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔

اس عمر میں ابن خلدون کا اتنی دشوار گزار مہم پر خود چل دینا واقعی اسی کا کام تھا۔

وہ شخص جو جوانی میں سیاسی وہڑا بندیوں میں پیش پیش رہا۔ اور جس نے ہر انقلاب کو لبیک کہا۔ بڑھاپے میں بھی اس میں اتنا دم باقی تھا کہ جب سب علماء ششش و پنج میں تھے وہ امیر تیمور سے ملنے کے لئے جان پر کھیلنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابن خلدون کو قدرت سے خطر پسند طبیعت ملی تھی۔ وہ علم و فکر کی دنیا میں بھی اپنے لئے نئی راہ نکالتا تھا اور واقعات کی دنیا میں بھی سب سے الگ رہتا تھا۔

ابن خلدون پہلا شخص ہے جس نے تاریخ کو اجتماع اور ماحول کا قرار دیا۔ اس نے ثابت کیا کہ کسی قوم کا مزاج اس کی عادات اس کے اخلاق و عقائد اپنے گرد و پیش کے حالات سے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ مثلاً وہ مصریوں کے متعلق لکھتا ہے کہ اہل مصر عیش و عشرت کے بڑے شوقین ہیں زندگی میں رنگ رلیاں ان کا مقصد ہے اور اس میں وہ انجام کے متعلق پرواہ نہیں کرتے۔" ابن خلدون کے نزدیک اس کی وجہ مصر کی آب و ہوا ہے۔

ابن خلدون نے قوموں کے عروج و زوال کے بھی علمی اسباب دریافت کئے ہیں وہ لکھتا ہے کہ قوم کی پہلی منزل یہ ہوتی ہے کہ اس کے افراد مختلف گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ تہذیب و تمدن سے بہت کم مانوس ہوتے ہیں۔ ریوڑ چرا کر یا کوئی اور محنت طلب کام کر کے وہ روزی کماتے ہیں۔ اس منزل میں قوم کے افراد بڑے مشقت پسند اور توانا ہوتے ہیں۔ دوسری منزل میں ان میں کوئی بڑا آدمی پیدا ہوتا ہے جو مختلف گروہوں کو ایک کرتا ہے اور سب ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر فتوحات کو نکلتے ہیں۔ تیسری منزل میں فتوحات کی جگہ تہذیب و تمدن لے لیتا ہے۔ قوم کشور کشائیوں کو چھوڑ کر علم و فن کی فتوحات میں لگ جاتی ہے اس کے جسمانی قوائے کمزور پڑنے لگتے ہیں۔ اور ذہن کی ترقی پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ ہے قوم کے زوال کی ابتدا۔ چوتھی منزل میں یہ قوم مجبور ہو جاتی ہے کہ لڑائیوں کے لئے دوسروں کو بھرتی کرے۔ اور ان کی مدد سے اپنے دشمنوں سے محفوظ رہے۔ جب کوئی قوم اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ دن دور نہیں ہوتا کہ جن لوگوں کو لڑنے کے لئے وہ نوکر رکھتی ہے۔ وہی اس کے ہاتھ سے اقتدار چھین لیتے ہیں۔

ابن خلدون نے اپنے اس نظریہ کی تائید میں تاریخ سے بہت سی عملی مثالیں دی ہیں

اس نے اپنے مقدمہ میں مسلمانوں کی سیاست پر بھی بحث کی ہے۔ گذشتہ حکومتوں کے نظام سیاست کو پرکھا ہے۔ ان کی خوبیاں اور خامیاں بتائی ہیں اور معاشرت اور اجتماع کے بنیادی اصولوں کو جو زندگی میں موثر ہوتے ہیں واضح کیا ہے۔

ابن خلدون کے مقدمہ تاریخ کو یورپ کے اہل علم بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کا ترجمہ یورپ کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اور بڑے بڑے عالموں نے اس مورّخ کے آرا و افکار پر تنقیدیں بھی لکھی ہیں۔ یورپی اہل علم نے متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ ابن خلدون پہلا شخص ہے جس نے تاریخ کے فلسفہ کی بنا ڈالی۔ بعض اسے علم الاجتماع کا بانی مانتے ہیں۔ ایک عالم لکھتا ہے کہ ابن خلدون بیک وقت مورخ فلسفی اور اجتماعی تھا۔ اس کے نظریوں نے تاریخ کے معموں کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اور اس نے ایک ایسے علم کی بنا ڈالی، جس کو اس سے پہلے کوئی نہ جانتا تھا۔ اور نہ کوئی اس نے اپنا جانشین چھوڑا۔ جو اس کے افکار کو اور آگے لے جاتا۔ تا آنکہ یورپ میں نیا دور شروع ہوا۔ اور کہیں صدیوں بعد جا کر اہل فکر نے ابن خلدون کے فلسفہ معیشت، اجتماع اور سیاست کو پروان چڑھایا۔

ابن خلدون کے سیاسی نظریات ہی سے اس کا عظمت کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے وہ اپنے مسلم اور غیر مسلم پیشرو مفکرین سے گوئے سبقت لے گیا ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سیاسیات کو اخلاق، کلام، اور فقہ سے جو اس زمانے تک باہم مخلوط تھے، بالکل الگ کر دیا، اور اس کو ایک مستقل علم کی حیثیت دی۔ ماوردی کے سیاسی افکار پر تمام تر فقہ کا رنگ غالب ہے۔ فارابی کے نزدیک سیاسیات فلسفہ کی ایک شاخ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ غزالی اس میں اور اخلاق میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ ابن خلدون ہی پہلا مفکر ہے جس نے سیاسیات پر کسی اور علم کو غالب نہیں ہونے دیا۔

(مسلمانوں کے سیاسی افکار از پروفیسر رشید احمد)

فسادِ زمانہ اور عمومی بلویٰ

مولانا مجیب اللہ ندوی

(۲)

ان بنیادی ضرورتوں کے ساتھ دو طرح کی اور ضرورتیں ہیں، جن کی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، ان کا نام امام شاطبی نے حاجیات اور تحسینیات رکھا ہے، ان دونوں کی دین میں کیا حیثیت ہے، اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

واما الحاجیات فمعناها انها مفتقر الیها من حیث التوسعة ورفع الضیق المؤدی فی الغالب والی الحرج والمشقة بفوت المطلوب فاذا لم تراع دخل علی المکلفین علی الجملة الحرج والمشقة ولکنه لا یبلغ مبلغ الفساد العادی المتوقع فی المصالح العامة وهی جاریة فی العبادات والعادات والمعاملات والجنایات ففی العبادات کالرخص المخففة بالنسبة الی لحوق المشقة بالمرض والسفر وفی العادات کاباحة الصید والتمتع بالطیبات مما هو حلال مأکلا ومشربا وملبسا ومسکنا ومرکبا وما اشبه ذالك وفی المعاملات کالقراض والمساقاة والسلم والغاء التوابع فی العقد علی المتبوعات کثمرة الشجر ومال العبد

واما التحسینات فمعناها الأخذ بما یلیق من محاسن العادات وتجنب الاحوال المدنسات التی تانفها العقول الراجحات ویجمع ذالك قسم مکارم الاخلاق وهی جاریة فیما جرت فیه الاولیات ففی العبادات کازالة النجاسة وبالجملة الطهارات کلها وستر العورة واخذ الزینة والتقرب بنوافل الخیرات من الصدقات والقربات واشباه ذالك

وفی العادات کآداب الاکل والشرب ومجانبۃ الماکل النجسۃ والمشارب المستخبثات والاسراف والاقتتار فی المتناولات وفی المعاملات کالمنع من بیع النجسات وفضل الماء والکلأ وسلب العبد منصب الشہادۃ والامامۃ وسلب المرأۃ منصب الامامۃ وفی الجنایات کمنع قتل الحر بالعبد او قتل النساء والصبیان والرھبان فی الجھاد۔

اور حاجیات سے مراد وہ امور ہیں جن کی ضرورت زندگی میں سہولت پیدا کرنے اور ایسی تنگی کے دفع کرنے میں پڑتی ہے جن کی وجہ سے عموماً مشقت وتکلیف پیدا ہوجاتی ہے اگر ان کی رعایت نہ کی جائے تو زندگی سراسر تکلیف ومشقت سے پر ہو جائے گو ان سے فساد عام نہ پیدا ہو، یہ عبادات، عادات، معاملات اور جنایات تمام ہی شعبوں میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے عبادات میں مرض اور سفر کی دقتوں سے بچانے کے لئے کچھ رخصتیں دی گئی ہیں، عادات میں جیسے شکار کی اباحت یا پاکیزہ حلال چیزوں کا کھانے پینے اور کپڑے، سواری میں استعمال وغیرہ اسی طرح معاملات میں مضاربت مساقات بیع سلم، یا تابع کی بیع کو متبوع کے تحت لانا، مثلاً، درخت کے ساتھ پھل کی بیع یا غلام کا مال وغیرہ، اسی طرح جنایات میں قسامت پیشہ وروں پر تاوان وغیرہ لگانا۔

اور تحسنیات کا مقصد ان چیزوں کا استعمال ہے جو عادات انسانی میں حسن پیدا کرتی ہیں یا ایسی چیزوں سے بچنا جن سے عقل سلیم ابا کرتی ہے یہ مکارم اخلاق کی ایک قسم ہے اس کا تعلق بھی پہلی دونوں قسموں کی طرح احکام اسلامی کے تمام ہی شعبوں سے ہے، عبادات میں جیسے ازالۂ نجاست تمام طہارتیں، ستر عورت اخذ زینت، نوافل کے ذریعہ تقرب وغیرہ عادات جیسے کھانے پینے کے آداب کھانے پینے میں ناپاک اور گندی چیزوں سے پرہیز اخراجات میں اسراف اور بخل سے گریز وغیرہ معاملات میں جیسے ناپاک چیزوں کی بیع سے روکنا ضرورت سے زیادہ پانی اور گھاس کا روکنا یا غلام اور عورت کی شہادت اور امامت سے محرومی وغیرہ۔ اسی طرح جنایات مثلاً غلام کے بدلے آزاد کے قتل سے روکنا، یا جہاد میں عورتوں، بچوں اور راہبوں کے قتل سے منع کرنا، وغیرہ۔

ان تینوں طرح کے احکام کی حیثیت ایک دوسرے کے معاون اور مکمل کی ہے۔

ومن امثلة هذا المسئلة ان الحاجيات كالتتمة للضروريات وكذالك التحسينات فان الضروريات هى اصل المصالح (ص ۲ ج۲)

اس مسئلہ میں جو مثالیں دی گئی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حاجیات کی حیثیت ضروریات کے لئے تتمہ کی ہے۔ اسی طرح تحسینیات کی حیثیت حاجیات کے تکملہ کی ہے، اس لئے کہ ضروریات ہی پر دراصل مصالح شریعت کا مدار ہے،

نفاذ احکام میں ان تینوں کا لحاظ کس ترتیب سے کیا جائیگا، اور کس کو اس وقت مقدم اور کس کو موخر رکھا جائے گا اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

كل تكملة فلها من حيث هى تكملة شرط وهو ان لا يعود اعتبارها على الاصل بالابطال وذالك ان كل تكملة يفضى اعتبارها الى رفض اصلها فلا يصح اشتراطها عند ذالك لوجهين احدهما ان فى ابطال الاصل ابطال التكملة لان التكملة مع ما كملته كالصفة مع الموصوف فاذا كان اعتبار الصفة يؤدى الى ارتفاع الموصوف لزم من ذالك ارتفاع الصفة ايضاً فاعتبار هذه التكملة على هذا الوجه مؤدى الى عدم اعتبارها وهذا محال والثانى انا لو قدرنا تقديرا ان المصلحة التكميلية تحصل مع فوات المصلحة الاصلية لكان حصول الاصلية اولى لما بينهما من التفاوت وبيان ذالك ان حفظ المهجة مهم كلى وحفظ المروات مستحسن فحرمت النجاسات حفظا للمروآت واجراء لاهلها على محاسن العادات فان دعت الضرورة الى احياء المهجة بتناول النجس كان تناوله اولى وكذالك اصل البيع ضرورى ومنع الغرر والجهالة مكمل فلو اشترط نفى الغرر جملة لانحسم باب البيع كذالك والاجارة ضرورية اوحاجية واشتراط حضور العوضين فى المعاوضات من باب التكميلات ولما كان ذالك ممكنا فى بيع الاعيان من غير عسر منع من بيع المعدوم الا فى السلم وذالك فى الاجارات ممتنع فاشتراط وجود المنافع فيها وحضورها يسد باب المعاملة بها والاجارة محتاج اليها فجازت وان لم

يحض العوض او لم يوجد مثله جاز فى الاطلاع على العورات للمباضعة والمداواة وغيرهما وكذالك الجهاد مع ولاة الجور قال العلماء بجوازه قال مالك لو ترك ذالك لكان ضررا على المسلمين فالجهاد ضروری والوالى فيه ضروری والعدالة فيه مكملة للضرورة والمكمل اذا عاد للاصل بالابطال لم يعتبر ولذالك جاء الامر بالجهاد مع ولاة الجور عن النبى صلى الله عليه وسلم وكذالك ما جاء من الامر بالصلوٰة خلف الولاة السوء فان فى ترك ذالك ترك سنة الجماعة والجماعة من شعائر الدين المطلوبة والعدالة مكملة لذالك المطلوب ولا يبطل الاصل بالتكملة ومنه اتمام الاركان فى الصلوٰة مكمل لضروراتها فاذا ادى طلبه الى ان لا تصلى كالمريض غير القادر سقط المكمل او كان فى اتمامها حرج ارتفع الحرج عمن لم يكمل وصلى على حسب ما اوسعته الرخصة

تمام تکمیلی احکام کے تکمیل کی شرط یہ ہے کہ وہ اصل کو باطل نہ کردیں، ایسا اس لئے ہے کہ جو تکمیلی امور اصل کو معطل کردینے والے ہوں تو دو وجہوں سے ان کا مشروط ہونا صحیح نہیں ہوگا، ایک یہ کہ اصل کے ابطال سے خود تکملہ بھی باطل ہو جائیگا، اس لئے کہ اس کی حیثیت صفت موصوف کی ہے، یعنی ضروریات موصوف ہیں اور تکملات صفت، جب موصوف نہ ہو تو صفت کا وجود کیسے ہو سکتا ہے،

دوسرے یہ کہ اگر ہم فرض کرلیں کہ مصلحت اصلیہ کے فوت ہونے کے باوجود مصلحت تکمیلی کا حصول ممکن ہے تو مصلحت اصلیہ ہی کا اعتبار کرنا چاہیئے اس لئے کہ دونوں کے مرتبہ میں فرق ہے۔ اس اعتبار سے اصل کا حصول زیادہ بہتر ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً جان کی حفاظت اہم بنیادی ضرورت ہے اور انسانی شرافت وغیرت کی حفاظت بہ مستحسن ہے تو نجاست کی حرمت اسی انسانی شرافت و نیک نفسی کی حفاظت کے لئے تاکہ لوگوں میں اچھی عادتیں پیدا ہوں تو اب اگر جان بچانے کے لئے نجاست کے استعمال کی ضرورت پڑ جائے تو اس کو استعمال کرکے جان بچالینا زیادہ بہتر ہے، اسی طرح اصل بیع ضروری ہے۔ اور اس میں دھوکہ، عدم علم کا نہ ہونا اس بیع کی تکمیل ہے، تو اگر اس میں دھوکہ کی نفی کی شرط لگادی گئی ہو تو اس سے ہم بیع کو

ختم نہیں کر سکتے، اس طرح اجارہ ضروری یا حاجی ہے، اور معاوضات میں معوضین کے سامنے ہونے کی شرط یہ تکمیلات میں ہے، تو چونکہ اعیان کی بیع بیع بغیر کسی وقت کے ممکن تھا اس لئے بیع سلم کے علاوہ اور دوسرے طریقوں میں بیع معدوم کو ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن اجارات میں منافع کا حاضر کرنا اور سامنے ہونا ناممکن ہے، اس لئے کہ اگر یہ شرط لگادی جائے تو اجارات کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ اور اجارہ کی ضرورت ہے اس لئے بغیر حضور منافع بھی اس کو جائز قرار دیا گیا باوجودیکہ یہ معاوضات میں سے ہے، یہی صورت معاشرت اور علاج وغیرہ کے وقت شرمگاہ کے کھولنے کی ہے۔ اسی طرح ظالم حکمرانوں کے ساتھ جہاد کو علماء نے جائز قرار دیا ہے، امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو مسلمانوں کو اس سے نقصان پہنچے گا تو جہاد اور والی کا ضروری ہیں اس کا ثقہ وعادل ہونا اس ضرورت کی تکمیل ہے اور جب مکمل اصل ہی کو باطل کر دے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ولاۃ جور کے ساتھ جہاد کا حکم دیا ہے اسی طرح حکمرانوں کے پیچھے نماز کا مسئلہ ہے کہ اس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، کیونکہ ان کے ترک سے جماعت کا ترک لازم آتا ہے، اور جماعت شعار دین میں ہے جو مطلوب ہے۔ اور عدالت اور ثقاہت سے اس مطلوب کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور اصل مطلوب تکمیلی امور سے باطل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ارکان نماز کا پورا کرنا نماز کی اصل ضرورت کی تکمیل ہے، اب اگر یہ اصل مطلوب بغیر اسکی ادائیگی کے ادا ہو جائے، جیسا کہ مریض جو اسکی ادائیگی کی قدرت نہ رکھتا ہو، کے بارے میں حکم ہے۔ یا اس کی ادائیگی میں شدید تکلیف کا اندیشہ ہو تو تکلیف اس سے دور کیجائیگی اور جس طرح بھی ممکن ہو وہ نماز پڑھ سکتا ہے، اسی طرح بہت سی شرعی چیزوں کا حکم ہے۔

وانظر فیما قالہ الغزالی فی الکتاب المستظھری فی الامام الذی لم یستجمع شروط الامامۃ واحمل علیہ نظائرہ۔

اس سلسلہ میں امام غزالی نے اپنی کتاب المستظہری کہ جس میں امامت کی تمام شرطیں نہ پائی جائیں اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور اس کی جو نظیریں دی ہیں اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ کسی معاشرہ میں ایسا فساد و بگاڑ پیدا ہو جائے کہ اس میں اسلامی احکام پر بعینہ عمل کرنا ممکن نہ ہو یا ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کسی

معصیت سے بچنا ناممکن ہو جائے۔ تو منصوص احکام میں تخصیص اور تقیید سے اور غیر منصوص احکام میں تغیر فتاوی سے کام لیا جا سکتا ہے، ایسا اس لئے کرنا ضروری ہے کہ خود شریعت کا یہ منشا ہے کہ اس کی روح اور اس کے حدود کے احترام کو باقی رکھتے ہوئے اہل تکلیف کو حرج و مشقت سے حتی الامکان بچایا جائے، چنانچہ ایسے مواقع کے لئے شریعت نے جو اسباب تیسیر جن میں ایک عموم بلوی بھی ہے بیان کئے ہیں، اس پر فقہا نے تفصیلی گفتگو کی ہے، ابن نجیم نے الاشباہ میں اس پر بڑی مفصل اور عمدہ بحث کی ہے۔

پھر اوپر کی تفصیلات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی احتیاجات اور اس کی حفاظت کے لحاظ سے اسلامی احکام کے مختلف مدارج ہیں اور اسلامی احکام کے نفاذ کے وقت ان کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے، چنانچہ اسی وجہ سے ایک ہی چیز ایک وقت میں حلال اور جائز ہوتی ہے اور وہی چیز دوسرے وقت پر حرام یا مکروہ ہو جاتی ہے، اسی طرح کسی موقع پر حرام و مکروہ چیز حلال و جائز ہو جاتی ہے کہیں تو اس پر مطلقاً عمل کیا جاتا ہے اور کہیں اس میں تخصیص و تقیید سے کام لیا جاتا ہے، مثلاً کشف عورت حرام ہے۔ مگر علاج و معالجہ میں نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے، مردہ کے ساتھ اعزاز و احترام ضروری ہے لیکن فقہا نے لکھا ہے کہ اگر حاملہ عورت مر جائے اور یہ گمان غالب ہو کہ اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہے تو اس کا پیٹ چاک کیا جا سکتا ہے، اسی کی روشنی میں موجودہ پوسٹ مارٹم کے طریقہ پر بھی کچھ قیود کے ساتھ غور کیا جا سکتا ہے، آگے دونوں طرح کی اور بھی مثالیں آرہی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامی شریعت میں تحلیل و تحریم کا کوئی پائیدار اصول اور مضبوط بنیاد نہیں ہے، اور یہ اضافی قدروں کی قسم کی چیز ہے جو کسی وقت بھی بدلی جا سکتی ہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہر حکم شریعت کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک مثبت دوسرے منفی یا ایک حفظ ضرورت، دوسرے نفی حرج، چنانچہ شریعت اسلامی نفاذ احکام کے وقت ہمیشہ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتی ہے، اس لئے کہ کسی حکم میں تخصیص یا اس کا عدم نفاذ کی صورت ان نصوص کی وجہ سے اختیار کی جاتی ہے جو نفی حرج کے سلسلہ میں وارد ہوتے ہیں تو حقیقت میں یہ کسی نص کا ترک نہیں، بلکہ موقع و محل کے لحاظ سے دوسری نص پر تعامل

ہے منصوص احکام میں تخصیص کس صورت میں کی جا سکتی ہے، اور کس حد تک جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، یہ بڑی نازک بحث ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان یہ ہے کہ اگر ضروریات اولیہ میں کوئی حرج واقع ہو تو اس کی حفاظت کا تقاضا یہ ہے کہ منصوص احکام میں تخصیص کی جائے۔ مثلاً اگر کسی انسان کی جان بچانے کے لئے اگر حرام چیز کے استعمال کی ضرورت ہو تو اس کے استعمال کی اجازت ہے۔ مالکی فقہا میں امام شاطبی کی رائے اوپر معلوم ہو چکی ہے، اس سلسلہ میں قاضی ابن عربی مالکی کا خیال یہ ہے کہ اگر کوئی مخصوص مصلحت بھی تخصیص کی متقاضی ہو تو نص کی تخصیص کی جا سکتی ہے۔ مثلاً امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی باحیثیت اور شریف عورت اپنے بچہ کو دودھ نہ پلائے تو اس کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، بشرطیکہ اس کا بچہ کسی دوسری عورت کا دودھ پی سکتا ہو، ان کا کہنا ہے کہ قرآن کے حکم یرضعن اولادھن کے لئے یہ مصلحت مخصص قرار دی جائے گی اسی طرح الیمین علی من انکر کے سلسلہ میں ان کا خیال یہ ہے کہ اگر دونوں میں پہلے سے کچھ ربط و تعلق ہو اور دونوں کے اندر برائی سے تنفر اور دفع شر کا جذبہ موجود ہو تو مدعا علیہ سے قسم لے جائیگی ورنہ نہیں، اگر یہ تخصیص نہ کی جائے اور اس کی مطلقاً اجازت دیدی جائے تو شریف اور معقول آدمیوں کو شر پسند لوگ سخت مصیبت اور پریشانی میں مبتلا کر دیں گے، اور ان کا نہ جانے کتنا نقصان کر دیں گے۔

ظاہر ہے کہ جب شافعی اور مالکی نقطۂ نظر میں دفع حرج اور مصلحت مخصوصہ کے لئے نص میں تخصیص کی جا سکتی ہے، تو فساد زماں اور عموم بلوی کی صورت میں تو بدرجۂ اتم تخصیص ممکن ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی جزیہ تو نظر سے نہیں گذرا، مگر چونکہ فساد زمانہ اور عموم بلوی میں اس سے زیادہ دفع حرج اور مصلحت متقاضی ہوتی ہے کہ اس میں تخصیص کی جائے۔ اس لئے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ ان صورتوں میں بھی شافعی اور مالکی فقہا تخصیص کے قائل ہیں۔

یہ شافعی اور مالکی نقطہ نظر ہے اس سلسلہ میں حنفی نقطۂ نظر وہی ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے یعنی

المشقۃ والحرج انما یعتبر فی موضع لا نص فیہ (الاشباہ)

حرج و مشقت کا اعتبار اس صورت میں ہوگا جس میں کوئی نص موجود نہ ہو۔

چنانچہ حشیش حرم کے سلسلہ میں امام ابو یوسف کی رائے کو عام فقہائے احناف نے اس لئے رد کر دیا ہے کہ یہ نص صریح کے خلاف ہے، یعنی حدیث میں حرم کی گھاس چرانے یا کاٹنے کی ممانعت ہے، اس لئے امام ابو حنیفہ اور امام محمد اسکی حرمت کے قائل ہیں مگر امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ حجاج کو اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے انہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ امام ابو یوسف نے نص کے حکم کو منسوخ قرار نہیں دیا ہے بلکہ حجاج کے لئے اس میں تخصیص کر دی ہے، مگر امام ابو یوسف کی رائے کی تردید کرتے ہوئے زیلعی لکھتے ہیں :۔

ولئن کان فیہ حرج فلا یعتبر انما یعتبر فی موضع لا نص فیہ واما مع النص بخلافہ فلا۔

اگر نص پر عمل کرنے میں کوئی حرج واقع ہو تو اس حرج کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ حرج و مشقت کا اعتبار اس جگہ کیا جاتا ہے جہاں کوئی نص موجود نہ ہو۔ لیکن نص کے اختلاف کے ساتھ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اسی طرح امام سرخسی عموم بلویٰ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

انما تعتبر البلوی فیما لیس فیہ نص فاما مع وجودہ فلامعتبر (مبسوط ج ۲ ص ۲۵)

عموم بلویٰ کا اعتبار وہاں ہوگا، جہاں نص موجود نہ ہو، نص کی موجودگی میں اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح گوبر کی نجاست کے سلسلہ میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف اسی بنیاد پر ہے کہ امام صاحب اس کو نجاست غلیظہ قرار دیتے ہیں، صاحبین نجاست خفیفہ کہتے ہیں۔ صاحبین عموم بلویٰ کی بنیاد پر اسے نجاست خفیفہ قرار دیتے ہیں۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اس لئے نجاست غلیظ کہا ہے کہ اس کی نجاست منصوص ہے، یعنی حدیث نبوی میں اسے رکس کہا گیا ہے، اب وہی عموم بلوی کی بات تو اس کے بارے میں فقہاء امام صاحب کی طرف سے یہ جواب دیتے ہیں کہ

والبلوی لا تعتبر فی موضع النص فان البلوی للآدمی فی بوله کثیر

عموم بلوی نص کے مقابلے میں معتبر نہیں ہے۔ اب رہی عموم بلوی کی بات تو آدمی کے پیشاب میں یہ اور زیادہ ہوتا ہے مگر اس میں اس کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔

لیکن نص کی موجودگی میں عموم بلوی کی رعایت کے بارے میں بعض محققین فقہائے احناف نے پہلے مسئلہ میں امام ابو یوسف اور دوسرے مسئلہ میں صاحبین کی رائے کو امام صاحب کی رائے پر ترجیح دی ہے اور اب یہی مفتی بہ قول ہے، مثلاً اسی گوبر کی نجاست کے سلسلہ میں علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں۔

"وہ جو یہ کہا جاتا ہے کہ گوبر کے سلسلہ میں عموم بلوی نص کی موجودگی میں امام صاحب کے یہاں معتبر نہیں اس لئے کہ انسان کو اپنے پیشاب کے سلسلہ میں زیادہ عموم بلوی پیش آتا ہے تو یہ اصول ناقابل تسلیم نہیں۔"

بل تعتبر اذا تحقق بالنص النافی وهو لیس معارضته للنص بالرای والبلوی فی بول الانسان فی الانتفاخ کرؤس الابر فیما سواء لانها انما تحقق باغلبیة عسر الانفکاک وذالك ان تحقق فی بول الانسان فکما قلنا

بلکہ عموم بلوی نص کی موجودگی میں بھی معتبر ہوگا بشرطیکہ کسی نفی حرج والی نص سے اس عموم بلوی کی تائید ہو جائے اور اس صورت میں عموم بلوی محض رائے کی وجہ سے نص سے معارض نہیں ہوگا بلکہ دوسری نص معارض ہے، اور انسان کے پیشاب کے سلسلہ میں عموم بلوی کا اس طرح لحاظ کرتے ہیں کہ سوئی کے ناکے کے برابر پیشاب کی چھینٹوں سے بچنا چونکہ انتہائی دشوار ہے اس لئے ناپاکی کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اور اگر انسان کے پیشاب میں یہی صورت پیش آجائے گی تو گوبر کی طرح ہم اس کے بارے میں بھی وہی رائے دیں گے۔

اسی طرح خلیش حرم کے بارے میں جو لوگ ابو یوسف کی رائے کی تردید کرتے ہیں ان کا جواب دیتے ہوئے شیخ سعدی آفندی عنایہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

اقول فایت قولهم مواضع الضرورة مستثناة من قواعد الشرع۔

میں کہتا ہوں اگر یہی صورت ہے کہ نص کی موجودگی میں حرج و مشقت کے باوجود تخصیص ممکن نہیں ہے تو پھر ان فقہا کے اس اصول کے برتنے کا کونسا موقع آئے گا کہ ضرورت قواعد شرع سے مستثنیٰ ہے۔

اوپر کی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ متقدمین اور متاخرین فقہاء میں بہت سے محققین ایسے ہیں جو عموم بلویٰ کی وجہ سے نص میں تخصیص کے قائل ہیں، البتہ وہ اس تخصیص و تقیید میں نفی حرج کی نصوص عام کو اپنا مستدل ٹھہراتے ہیں، خواہ کسی مخصوص نص کو وہ استدلال پیش نہ کریں مثال کے لئے اگر کسی نجس چیز کی حقیقت تبدیل ہو جائے اور اس میں عموم بلوی بھی پایا جائے تو امام محمد اس کی پاکی کا حکم دیتے ہیں، اور انہی کے قول پر فتویٰ ہے صاحب درمختار کے اس جزیہ۔

ویطھر زیت تنجس بجعلہ صابونا بہ یفتی للبلویٰ کتنور رش بماء نجس لا باس بالخبز فیہ۔ (ج ۱ ص ۳۲۵)

وہ ناپاک تیل جسے صابن میں ڈال کر صابن بنالیا جائے وہ پاک ہے، اسی پر عموم بلویٰ کی وجہ سے فتویٰ ہے جیسے تنور پر ناپاک پانی کے چھینٹے دیئے جائیں اور پھر اس پر روٹی پکائی جائے۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کی تشریح کرتے ہوئے صاحب ردالمحتار المجتبیٰ کی عبارت نقل کرتے ہیں۔

جعل الدھن النجس فی صابون یفتی بطھارتہ لانہ تغیر والتغیر یطھر عند محمد ویفتی بہ للبلوی۔

ناپاک تیل کے صابن میں مل جانے پر صابن کی پاکی کا فتویٰ دیا جائے گا کیونکہ اس میں تغیر ہو گیا ہے اور تغیر امام محمد کے یہاں پاکی کا سبب ہوتا ہے اور اس پر فتویٰ عموم بلوی کی وجہ سے دیا جائیگا۔

پھر آگے اس کی علت بیان کر کے اس پر بہت سے مسائل متفرع کرتے ہیں۔

ثم اعلم ان العلۃ عند محمد ھی التغیر وانقلاب الحقیقۃ وانہ یفتی بہ للبلوی ومقتضاہ عدم اختصاص ذالک الحکم بالصابون فیدخل فیہ کل ما کان فیہ تغیر وانقلاب حقیقۃ وکان فیہ بلوی عامۃ (ج ۱ ص ۳۲۵)

پھر یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ امام محمد کے نزدیک اس میں علت تغیر اور انقلاب حقیقت ہے اور اس بنا پر بلوی کی وجہ سے اسکی پاکی کا فتویٰ دیا جائیگا اس کلیہ کا تقاضا ہے کہ اس حکم کو صرف صابن تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ جس چیز میں تغیر اور انقلاب حقیقت پایا جائے اور اس میں عموم بلویٰ بھی موجود ہو تو اسکی پاکی کا حکم دیا جائے گا۔

اس میں بظاہر امام محمد نے کسی نص خاص کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر ان کے اس استدلال میں نفی حرج کی نصوص سے مدد لی گئی ہے۔

ائمہ فقہ کی ان تفریعات کی روشنی میں موجودہ دور کے بہت سے مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اگر واقعی ضرورت متقاضی ہو تو ہم ان میں عموم بلوی کی بنیاد پر تخصیص و تقیید بھی کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک مخصوص طبقہ کے عموم بلوی کا لحاظ کر کے گوبر کو نجاست خفیفہ قرار دیا جا سکتا ہے جب ایک مخصوص صنعت میں عموم بلوی کی رعایت کی جا سکتی ہے، تو ان بے شمار مسائل کو ہم کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں جنھوں نے عموم بلوی نہیں بلکہ اعم بلوی کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ علماء کو ان مسائل کی فہرست تیار کر کے ان کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے اسلامی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔ مثلاً انشورنس کمرشل انٹرسٹ، گورنمنٹ کے سودی قرضے، تحدید نسل، شادی کی تحدید، دواؤں اور دوسری استعمال کی چیزوں میں نجس چیزوں کا استعمال وغیرہ وغیرہ مگر اس سلسلہ میں چند باتیں بہر حال ملحوظ رکھنی ہوں گی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ان قیود و حدود کا لحاظ ضروری ہوگا جن کا لحاظ ہر فن کے ماہرین کسی فنی مسئلہ میں رکھتے ہیں، محض اس بنیاد پر کسی نص میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی کہ اس کے خلاف رواج عام ہو گیا،

دوسری بات جو پیش نظر رکھنی ضروری ہے وہ یہ کہ اس کا مقصد احکام شریعت کا نسخ نہ ہو، بلکہ محض تخصیص و تقیید یا عارضی عدم نفاذ ہو۔

تیسری سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس غور طلب مسئلہ میں تخصیص و تقیید کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا ہو یعنی در پیش مسئلہ کے لئے اس کے معارض نص میں اگر تخصیص نہ کی جائے تو معاشرہ کے عام افراد ضروریات اولیہ میں شدید قسم کی دقت و پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے یا بعض فقہا کی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر ضروریات اولیہ کی حفاظت میں خلل واقع ہو رہا ہو تو تخصیص کرنا صحیح ہے ورنہ نہیں، ایک مصری عالم فہمی ابوسینہ نے امام شاطبی کی تصریحات کی روشنی میں عرفی مسائل میں تخصیص پر بحث کرتے ہوئے آخر میں جو تنبیہ کی ہے اسے پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے

وهذا العمر الله مو ضع احتياط بالغ وحذر شديد اذ ليس مجرد مشقة

نزع الناس من عاداتهم بما تنزل به النصوص و لو كان من الامور الكماليه او الحاجية التي يمكن الخروج عنها بكثير من الطرق المشروعة

خدا کی قسم اس موقع پر انتہائی احتیاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ محض اس بنا پر کہ لوگوں کو ان کی عادات سے ہٹانے میں شدید قسم کی پریشانی اور دقت ہوتی ہے صریح نصوص کو چھوڑ دیا جائے یہ صحیح نہیں، خاص طور پر اگر وہ ان امور سے متعلق ہوں جو کمالی اور حاجی قسم کے ہیں جن سے نکلنے کی دوسری شرعی صورتیں ممکن ہیں۔

اگر ایسا نہ کیا جائے بلکہ اس کی عام اجازت دیدی جائے، تو اس کے نتائج انتہائی بھیانک ہوں گے۔

ولو فتحنا هذا الباب لاستباح الناس كثيراً من المحرمات واستحسنوا كثيراً من الرذائل واذن لهوت حالة المسلمين الاجتماعية الى الحضيض

اگر ہم نے یونہی بغیر تبصرہ اس دروازہ کو کھولدیا تو لوگ بہت سے محرمات کو مباح بنالیں گے اور بہت سی برائیوں کو اچھائیاں قرار دے لیں گے اور اس صورت میں مسلمانوں کی اجتماعی حالت قعر مذلت میں جا پڑے گی۔

فقہ اسلامی کے اور بہت سے قواعد کلیہ ایسے ہیں جن سے عموم بلوی والے مسائل میں مدد لی جاسکتی ہے مثلاً

الضرر يزال — تکلیف زائل کی جائیگی۔

يتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام (الاشباه ص۹۵)

ضرر عام کو دفع کرنے کےلئے ضرر خاص کو برداشت کرنا ہوگا۔

ابن نجیم ان کلیات پر بہت سے مسائل متفرع کرتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص ایسی جگہ پر کوئی عمارت بنا لیتا ہے جن سے عام راہ گیروں کو تکلیف ہوتی ہے تو اسکے گرانے کا حکم دیدیا جائیگا اگر غلہ کے بیوپاریوں کے طرز عمل سے عام لوگوں کو تکلیف ہورہی ہو تو بھاؤ مقرر کیا جا سکتا ہے یا ذخیرہ اندوزوں کا اسٹاک جبراً لیکر بازار میں فروخت کیا جاسکتا ہے ایک جاہل ڈاکٹر کو پریکٹس سے روکا جاسکتا ہے، غرض یہ کہ یہاں ان اشخاص کی ملکیت میں جس کا احترام شریعت میں

واجب ہے، اس لئے دخل اندازی کی گئی کہ اس ضرر خاص کو نقصان پہنچا کر لوگوں کو ضرر عام سے بچا لیا جائے۔ اب اگر عموم بلوی میں بھی یہی صورت پیدا ہو جائے تو بہر حال اس کا لحاظ کیا جائے گا۔

تغیر زمانہ ۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ جس طرح عموم بلوی سے احکام میں تغیر یا تخصیص کی جاتی ہے اسی طرح زمانہ کی تبدیلی، حالات کے بگاڑ کی وجہ سے بھی احکام میں تخصیص یا تبدیلی ہوتی رہی ہے نیز یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ جس طرح عموم بلوی کے ذریعہ بنیادی احکام میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح تغیر زمانہ اور فساد زمانہ کی دست اندازی سے بھی یہ احکام باہر ہیں۔

کن احکام میں زمانہ کے تغیر سے تبدیلی ہو سکتی ہے ۔ اس بات پر تمام ہی فقہا متفق ہیں کہ ماحول کی تبدیلی اور اخلاق کی خرابی کی بنا پر وہی احکام تبدیل ہوتے ہیں، جس کی بنیاد قیاس و اجتہاد اور مصلحت پر ہے، رہے وہ اصولی احکام جن پر شریعت کی بنیاد قائم ہے اور جس کی بنیاد کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے ہی کے لئے اوامر و نواہی کا ورود ہوا ہے۔ مثلاً محرمات شرعیہ سے نکاح یا معاملات میں تراضی اور انسان کا معاملہ کرنے کے بعد اس کا پابند ہو جانا، اور بغیر عقد کے جو نقصان ہو اس کا تاوان اپنے اقرار کا اپنے ہی اوپر نافذ ہونا، تکلیف دہ چیزوں کو ہٹانا، اور جرائم کا انسداد کرنا، ان ذرائع کو بند کرنا جو معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والے ہیں، حقوق کا تحفظ ہر شخص کا اپنے عمل اور اپنی غلطی کا ذمہ دار ہونا، وغیرہ بے شمار احکام ہیں جن کا قیام، اور جو ان سے مزاحم ہیں ان کا مقابلہ کرنا شریعت کا مقصد اولین ہے، تو ایسے تمام بنیادی احکام حالات کی تبدیلی سے نہیں بدل سکتے، بلکہ یہی اصولی احکام ہیں جن کو معاشرہ کی اصلاح کے لئے شریعت نے پیش کیا ہے البتہ ان کے نفاذ کے وسائل اور حالات پر ان کے انطباق کی صورتیں زمانہ اور ماحول کی تبدیلی سے ضرور بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً حقوق کے تحفظ کا ذریعہ عدالت ہے، جس میں فیصلہ کا مدار تنہا ایک منصف یا جج کی رائے پر ہوتا ہے، اور اس کا فیصلہ بالکل قطعی ہوتا ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ زمانے کے حالات و مصالح اور برائیوں کے انسداد میں غایت احتیاط کی وجہ سے یہ فیصلے جوری کے سپرد کر دیئے جائیں اور عدالت کے مختلف درجے بنا دیئے جائیں، جیسا کہ آجکل ہے۔

روس میں پان ترکزم اور اسلام

تلخیص و ترجمہ

تیسری علاقائی مسلم کانفرنس میں جدیدی کمیونسٹوں کا آخری نصب العین یہ قرار دیا گیا کہ (۱) روس کے تمام ترکوں کو ترک سودیت جمہوریہ یعنی ترکستان جمہوریہ کے طور پر متحد کیا جائے۔ (۲) دوسرے ترکوں کو بھی جو روس کے اندر شامل نہیں ہیں، اس سیاسی وحدت کی طرف لایا جائے جیسے کہ افغانستان، چین، ایران اور ترکی کے ترک تھے۔ (۳) سودیت جمہوریہ کے وہ ترک جو جغرافیائی اعتبار سے ترکستان سودیت جمہوریہ میں شامل نہیں ہو سکتے، ان کی بڑی علاقائی وحدتیں بنا دی جائیں، جیسے کہ تاتاری اور بشکیری تھے۔ یہ قرارداد ترک قومی مملکت اور پان ترک سیاسی مقاصد کا ایک حقیقی منشور تھا اور اس کے پیش نظر کمیونسٹ پارٹی کے وسط ایشیا کی سیکشن کو نیشنلسٹ ترک کمیونسٹ پارٹی میں بدلنا اور اس کی قیادت جدیدی کمیونسٹوں کے ہاتھ میں دینا تھا۔ ماسکو کی مرکزی حکومت اس وقت وسط ایشیا کے ان حالات سے بے خبر رہی۔

ازبک جدیدیین اور کمیونسٹ انقلاب

اس میں شک نہیں کہ ازبک جدیدیین، جو اس وقت تاشقند میں کمیونسٹ پارٹی اور مقامی نظم و نسق کو کنٹرول کر رہے تھے، پکے انقلابی تھے۔ جیسا کہ ان کی اپیلوں سے ظاہر ہے، جو انہوں نے مشرق کے عوام سے "استعمار، ملائیت (clericalism)

---

[1] یہ مضمون ہارورڈ امریکہ، یونیورسٹی سے شائع شدہ ایک انگریزی کتاب سے ماخوذ ہے (مدیر)

اور جاگیرداری کی زنجیروں کو تار تار کرنے کے لئے کی تھیں۔ لیکن انقلابی نعروں سے ان کی دلچسپی کا منبع و مصدر معاشی و سماجی تبدیلیوں کے جذبے کے بجائے وہ بیس سالہ طویل جد و جہد تھی جو انہوں نے اپنے ہاں ملائیت کے خلاف کی تھی۔ نیز وہ نفرت جو انہیں نوآبادیاتی استعماری نظام سے تھی، جدیدیوں کا، جو یا تو تاجروں یا وسط ایشیا کے عربی مدرسوں کے طالب علموں میں سے تھے، مسلم یا روسی مزدور طبقوں سے برائے نام ہی تعلق تھا، چنانچہ وہ طبقاتی کشمکش اور پرولتاری آمریت کے نظریات کو چھوتے ہی مسترد کر دیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ اسماعیل بے گسپرنسکی کے پیروکار تھے، جس نے ۱۹۰۵ء میں کہا تھا کہ چونکہ روسی مسلمانوں کا غالب مذہبی معاشرہ طبقات میں بٹا ہوا نہیں ہے، اس لئے اس میں طبقاتی کشمکش کا ظہور نہیں ہو سکتا۔ یہ از بک جدیدیین ترک نیشنلسٹوں اور ترک کمیونسٹوں میں سب سے پہلے تھے جنہوں نے ۱۹۲۰ء میں اس نظریے کو، جسے سب سے پہلے گسپرنسکی نے پیش کیا تھا آگے بڑھایا اور یہی نظریہ ان میں اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں میں سب سے بڑی وجہ نزاع بن گیا جدیدیین کا ترک اتحاد پر یقین اور طبقاتی کشمکش سے انکار ان کی تعلیمی پالیسیوں اور پارٹی کے ارکان کی بھرتی کے معاملے میں بھی بہت جلد بروئے کار آ گیا وسط ایشیا میں جدیدی کمیونسٹ منتظمین نے جو نئے سکول کھولے، ان میں قومی مسائل کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی اور طالب علموں کو مارکسی نظریات کے بجائے ترک قومیت کی تلقین ہوتی تھی۔ ان سکولوں میں پرولتاری اتحاد کے نہیں بلکہ ترکی اتحاد کے بیج بوئے جاتے تھے تاشقند کی اس نئی حکومت کا محکمہ تعلیمات کا کومیسار ازبک نہ تھا۔ بلکہ وہ عثمانی ترکی کے توپ خانے کا ایک فوجی افسر اور سابق جنگی قیدی آفندی تھا نیز ماسکو نہیں بلکہ استنبول اور انقرہ جہاں کمال پاشا فاتح مغربی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما تھے، ترکستان کمیونسٹ پارٹی کے ان جدیدی ارکان کی ہمدردیوں اور دلچسپیوں کا مرکز بن گئے تھے۔

جدیدی کمیونسٹوں کی تقریروں میں طبقاتی کشمکش اور بین الاقوامی مقاصد کا نہیں بلکہ خود اپنے ملک کے مستقبل کا ذکر ہوتا تھا کہ ان کے ممتاز نظریاتی ماہر ریسکولوف نے کہا :۔ ترکستان کے لوگوں کے بارے میں جس تاریخی غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے، یہ اشارہ تاشقند کی دو سالہ

سابق بالشویک حکومت کی طرف سے ترک قوم پرستوں کو اس کا تدارک کرنا ہوگا۔ ترک کمیونسٹ صرف فیکٹری اور ریلوے مزدوروں کے مفاد کے لئے نہیں لڑ رہے ۔ (تاشقند میں دو سال تک انہی کا نمائندہ بالشویک جتھا برسر اقتدار رہا تھا) بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا یہ بھی فرض سمجھتے ہیں کہ وہ اس ایک ہزار میل وسیع سرزمین میں آباد لوگوں کے ثقافتی اور معاشی مفادات کی حفاظت کے لئے ان سے جا کر ملیں۔ مزید برآں ریسکولوف نے قازقوں اور ازبکوں سے پارٹی کی صفوں میں شامل ہونے اور فوج میں بطور رضاکار بھرتی ہونے کی اپیل کی اس طرح وہ اپنے ترک محب الوطنوں کی مدد سے وسط ایشیا میں سوویت انتظامی مشینری اور فوج میں جدیدین کا اثر و نفوذ مضبوط کرنا چاہتا تھا کیں ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں سوویت حکومت کے مقرر کردہ ترک کمیشن کو محسوس ہونے لگا کہ تاشقند میں عنان اقتدار ترک قوم پرستوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دوسری سوویت جمہوریتوں میں بھی مسلم کمیونسٹ ابھر رہے تھے اور وہ ترکستان کے جدیدی کمیونسٹوں کی تائید میں تھے۔

قازقستان، وولگا یورال تاتار اور بشکیریہ میں ترکوں کی داخلی خود مختاری کی جدوجہد سے ترکستان کے جدیدیین کے اور حوصلے بڑھ گئے تھے ۔ اس وقت سوویت حکومت کو خانہ جنگی اور بیرونی مداخلت کے خطرے سے مکمل طور پر نجات نہیں ملی تھی۔ اس لئے لینن اور سٹالن نے ترکستان اور بشکیری ترکوں کے وفدوں کو کوئی واضح جواب نہ دیا۔ لیکن جب اواخر جون میں پولینڈ کے حملہ آوروں نے یوکرین خالی کر دیا، تو ان وفدوں کو بتا دیا گیا کہ "ترک کمیشن" میں کسی مسلمان کا تقرر نہیں کیا جائیگا۔ کمیشن مذکور کے نئے ارکان فوراً ہی ازبک کیمونسٹوں کے عزائم سے واقف ہو گئے

امیر بخارا کی حکومت کا خاتمہ

اسی دوران میں نئے "ترک کمیشن" اور ترکستان میں متعین سرخ فوج نے امیر بخارا کی حکومت کو ختم کر کے ان اطراف میں سوویت اقتدار کو اور مضبوط کر دیا۔ ہوا یوں کہ تاشقند میں جدیدیین کے برسر اقتدار آنے سے نوجوان بخاریوں کے بھی حوصلے بڑھے اور انہوں نے بخارا کو زیر کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ "ترک کمیشن" اور ازبک کیمونسٹوں کے دباؤ کے تحت انہوں نے بخارا کیمونسٹ پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ اور بعد میں وہ اسی میں مدغم بھی ہو گئے۔ ۲۹ راگست کو سرخ

فوج بخارا کی طرف بڑھی اور دو دن کی سخت جنگ کے بعد بخارا کا شہر ان کے قبضے میں آگیا۔ امیر بھاگ کر مشرقی بخارا کے پہاڑوں میں چلا گیا، جہاں اس نے اپنے حامیوں کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش کی۔

نوجوان بخاری سرخ فوج کے ساتھ پایۂ تخت بخارا شہر میں داخل ہوئے۔ اور انہوں نے حکومت کی تنظیم کو شروع کر دی۔ بخارا میں عوامی جمہوریہ کا اعلان کیا گیا۔ جس میں کہ کمیونسٹ یا سوشلسٹ حکومت کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ اکثر نظارتیں۔ (وزارتیں) دولت مند تاجر خاندانوں کے ہاتھ میں آئیں۔ جو شروع سے بخارا کی لبرل تحریک کی حمایت کر رہے تھے۔ نوجوان بخاریوں نے اپنے اقدامات کی تائید میں قرآن اور شریعت کے احکام پیش کئے اور آبادی سے یہ وعدہ کرکے کہ "یورپی سوشلزم کی زیادتیوں کے خلاف پوری قوت سے لڑا جائیگا" اسے پرسکون رکھا یورپی سوشلزم سے ان کی مراد غیر کمیونسٹ یورپی نوآبادیاتی قوتیں تھیں۔ اسی طرح ان کے تعلیمی پروگرام میں بھی کمیونزم کے بجائے قطعی طور پر پان ترکزم کا رجحان تھا۔ مقامی زبان صرف پرائمری سکولوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ سیکنڈری (ثانوی) درجوں میں "قومی ترکی ادبی" زبان... یعنی عثمانی ترکی کو مروج کیا گیا۔ ان کے پروگرام کے انقلابی نکات وہ وعدے تھے، جو ملائیت کی زیادتیوں کے سد باب، ایشیا سے یورپی صنعت کاروں اور کارخانہ داروں کے صنعتی و تجارتی اثر و نفوذ کو ختم کرنے نظم و نسق حکومت کو بہتر بنانے اور امیر بخارا اور طبقہ اشراف کی زمینوں کو ضبط کرنے کے سلسلے میں کئے گئے تھے۔ اس ضمن میں نہ تو پرولتاری آمریت کے قیام اور نہ نجی جائداد ہی کو ختم کرنے کے بارے میں کچھ کہا گیا۔ غرض نوجوان بخاریوں کے پورے پروگرام کی امتیازی خصوصیت کمیونسٹ عقائد سے کہیں زیادہ ترک قوم پرستانہ نعرے تھے۔

بخارا اور عین انہی دنوں خیوا میں جو سیاسی نظام بروئے کار لایا گیا، وہ مشتمل تھا اس عہد کی مشرق وسطیٰ کی سوسائٹی کے بورژوائی ڈھانچے اور کمیونسٹ سسٹم کنٹرول پر۔ بہرحال بخارا عوامی جمہوریہ کے قیام سے وقتی طور پر یہ ضرور ہوا کہ وسط ایشیا میں کوئی غیر کمیونسٹ مخالف سیاسی مرکز نہ رہا اور کسی غیر ملکی مداخلت کے لئے بخارا کی امارت جو ایک اڈا

تی تھی، اس کا سدِ باب ہوگیا۔[۱]

فتح بخارا ہی کے دنوں میں باکو میں مشرقی اقوام کی پہلی کانگرس منعقد ہوئی، جو ایشیا میں
لوہیکوں کی انقلابی قوتوں کا سب سے موثر مظاہرہ تھا۔ اس میں نہ صرف روس کی تمام ترک
توں اور اس کے مشرقی حصوں کے لوگوں کے ڈیلیگیٹ شریک ہوئے بلکہ ایشیا کے اکثر
؛ اور محکوم ملکوں کے نمائندے بھی آئے۔ یہ کانگرس "تھرڈ انٹرنیشنل" کے زیرِ اہتمام ۱-۹ ستمبر ۱۹۲۰ء
ہوئی اس میں ایک جدیدی کمیونسٹ نربوت بیکوف نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"ہم ترکستان کے انقلابیوں کے نمائندے ان ہزار ہا ہزار سیاہ رُو ملاؤں
میں سے کسی ملا سے نہیں ڈرتے ہم نے سب سے پہلے ان کے خلاف علَم
بغاوت بلند کیا تھا۔ اور آخر وقت تک ہم اس جھنڈے کو نیچا نہیں ہونے
دیں گے۔ یا تو ہم اس جدوجہد میں مٹ جائیں گے یا فائز و کامیاب ہوں گے"

ں موصوف کی اس تنقید سے خود سوویت لیڈر بھی نہ بچے۔ اس ضمن میں اس نے کہا۔

"ترکستان کے عوام کو دو محاذوں پر لڑنا ہے ایک تو خود اپنے ہاں ان
سیاہ رُو مُلاؤں سے۔ اور دوسرے مقامی یورپیوں کے تنگ دلانہ قومی
رجحانات کے خلاف، نہ تو کامریڈ زینوف، نہ کامریڈ ٹراٹسکی ہی بلکہ یہاں تک

بعد میں ان "نوجوان بخاریوں" کو سوویت یونین نے اقتدار سے برطرف کر دیا، اور
ین سے کئی ایک بھاگ کر ترکی پہنچے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم جب کابل سے بخارا
ر ہوتے ہوئے روس گئے، اور وہاں سے استنبول تشریف لے گئے۔ تو آپ کی بخارا کے
نوجوان زعماء سے استنبول میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مولانا مرحوم فرماتے تھے۔
نوجوانوں نے مجھ سے کہا کہ ہم مانتے ہیں، ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئیں۔ اور ان غلطیوں کا ہمیں
نہ بھی بھگتنا پڑا۔ لیکن اب تک ہمارا یہ یقین اپنی جگہ پر قائم ہے کہ ہم نے امیر بخارا کا تختہ الٹا تھا
سے بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ تو یہ ہمارا صحیح اقدام تھا، اور ہمیں آج بھی اس کے متعلق کوئی افسوس نہیں۔

(محمد سرور)

کہ کامریڈ لینن تک بھی ترکستان کی صحیح صورت حال کو نہیں جانتے۔ ہم محض صفحۂ کاغذ پر نہیں بلکہ حقیقی زندگی میں حریت، مساوات اور اخوت کے اصولوں کے عملی نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

عین اس مرحلے پر سوویت حکومت اور کمیونسٹ قیادت نے اس صورت حال پر پوری طرح قابو پانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو وسط ایشیا سے کمیونسٹ دشمن روسی آبادکاروں کا صفایا کیا گیا اس کے بعد ازبک کمیونسٹوں کی جو زیادہ تر جدیدی تھے، باری آئی۔ ان میں سے وہ لوگ جو پرولتاری آمریت اور طبقاتی کشمکش پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس کے بجائے ترکی قوم پرستانہ آئیڈیالوجی کے علمبردار تھے، وہ اپنے عہدوں سے الگ کردیئے گئے۔ اور "ترک کمیشن" کی سفارشات پر ماسکو کی طرف سے ایک نئی بیورو کا تقرر عمل میں آیا۔ غرض مصنف کے الفاظ میں۔

"تقریباً تین سال کی نسبتاً آزادی کے بعد ترکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی علاقائی تنظیم آخرکار بلا شرکت غیرے ماسکو کے کنٹرول میں آگئی اور بجائے "ترکی" ہونے کے "بین الاقوامی" بن گئی۔"

لیکن ۱۹۲۰ء میں جدیدیوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا گیا، جس کا نشانہ بہت سے کمیونسٹ دشمن روسی بنے تھے۔ انہیں صرف قیادت سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہیں "ازبک مزدوروں" سے پر کی گئیں۔ اس کے علاوہ دیہات کے بڑے بڑے زمینداروں (بیوں۔ بے کی جمع) اور "لوٹ کھسوٹ کرنے والوں" کے مقابلے کے لئے دہقانوں یعنی کسانوں کی یونینوں کی تنظیم کی گئی۔

ایک طرف تو ۱۹۲۰ء۔ ۱۹۲۱ء کے موسم سرما کے دوران ترکستان میں پارٹی مشنیری اور نظم و نسق میں مزید تبدیلیاں کی جاتی رہیں اور دوسری طرف مقامی آبادی کو تعلیمی اور مذہبی زندگی میں متعدد معمولی سی مراعات دی گئیں۔ اتوار کے بجائے ہفتہ وار چھٹی جمعہ کو کر دی گئی۔ نظم و نسق حکومت اور پارٹی کے علاوہ ڈاک و تار کے محکموں میں بھی ازبک زبان رائج کی گئی اور بہت سے مقامی لوگوں کو سرکاری ملازمتوں میں لے لیا گیا لیکن علاقائی نظم و نسق کے اہم شعبے بدستور ماسکو کے سخت کنٹرول میں رہے۔

۱۹۲۴ء میں روسی ترکستان اور خیوا و بخارا کی امارتوں کی سابق انتظامی حدود بالکل ہی ختم

کردی گئیں چنانچہ خالص قومیتوں کی بنیادوں پر یہ چار نئی جمہوریتیں بنیں وہ ازبکستان، کرغیزیا، ترکمانستان، اور تاجکستان۔ ان میں سے دو۔ ترکمانستان اور ازبکستان۔ کو تو فوراً ہی یونین جمہوریہ کا درجہ مل گیا۔ اور وہ سوویت یونین کی پوری رکن بن گئیں۔ تاجکستان ۱۹۲۹ء تک ازبکستان کے اندر ایک خود مختار جمہوریہ رہا، اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں اسے بھی یونین جمہوریہ کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ نئی تقسیم جدیدیین کی ان آرزؤں پر کہ تمام وسط ایشیا کو ایک ترک مملکت کے تحت متحد کیا جائے، ایک ضرب کاری تھی۔ وسط ایشیا کی ترک آبادی کو اب تین قومی وحدتوں میں متفرق کر دیا گیا، اور ان میں سے ہر ایک کی مقامی زبان کو قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ اس ضمن میں وسط ایشیا کے مستقبل کے لئے اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہوئی کہ تاجکستان کو فارسی زبان والی ایک غیر ترک جمہوریہ بنا دیا گیا تاکہ وہاں مزید ترکیت کے فروغ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔

آذربائیجان کی آزاد ریاست

دونگا سے لے کر سطح مرتفع پامیر تک کے اس "ترک خطے" کی مختلف قومیتوں میں جو تاتاریوں بشکیریوں، قازقوں اور وسط ایشیائی ترکوں پر مشتمل تھا، قومی تحریکیں ایک دوسرے سے مربوط رہیں کیونکہ یہ قومیتیں جغرافیائی لحاظ سے باہم متصل تھیں لیکن روس کی وہ ترک قومیں جو اس "ترک خطے" سے باہر تھیں، جیسے کہ کریمیا کے تاتاری اور آذربائیجانی، اس انقلابی دور میں ان کی تاریخ بالکل مختلف تھی۔ کریمیا میں اگرچہ تاتاری کل آبادی میں ایک تہائی سے بھی کم تھے لیکن انہوں نے اس جزیرہ نما پر جنوری ۱۹۱۸ء میں سوویت قبضے سے قبل دوبارہ اپنی الگ ریاست بنانے کا عملی مظاہرہ کیا۔ پہلی بار جب جرمن فوجیں کریمیا سے نکلیں تو یہ ریاست ختم ہو گئی، دوسری بار اکتوبر ۱۹۲۱ء میں خود سوویت حکومت نے کریمیا کی تاتاری جمہوریہ کو زندہ کیا اور باوجود اس کے کہ وہاں غیر ترک اکثریت تھی، نظم و نسق اور تعلیم کی اہم زبان تاتاری قرار دی گئی۔

کوہستان کاکیشیا کے ماوراء آرمینیا، جارجیا اور آذربائیجان میں اس عرصہ میں بڑے اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے۔ آذربائیجان میں مسلمانوں کی سب سے موثر سیاسی پارٹی "مساوات"

تھی جو عثمانی ترکی سے ہمدردی رکھتی تھی۔ سوشل ڈیموکریٹس کے اس گروپ میں جسے اسٹالن نے ۱۹۰۴ء میں "ہمت" کے نام سے منظم کیا تھا، اور دوسرے مقامی سوشلسٹ گروپوں اور "مساوات پارٹی" میں ایک حد تک باہم رواداری پائی جاتی تھی۔ اپریل ۱۹۱۷ء کے آغاز میں قدامت پسند مغربی آذربائیجانیوں کے طبقہ اشراف نے جو آغا لرگروہ (خان، بے، اور سلطان) اور علماء پر مشتمل تھا گنجہ[1] میں اپنی ایک قوم پرست ترکی فیڈرل پارٹی بنائی، یہ "مساوات" سے زیادہ اعتدال پسند اور بڑی شدت سے اسلامیت کی علم بردار تھی۔ اس نے آغالر گروہ کی زمینداریوں کو قومی ملکیت میں لینے کی مخالفت کی۔ دیہاتی عوام میں اس پارٹی کا کافی اثر و نفوذ ہوگیا۔ اور اس طرح یہ مساوات کی جو زیادہ تر شہروں میں تھی۔ ایک حریف بن گئی۔ آخر "مساوات" کے لیڈر رسول زادہ نے اس پارٹی سے مفاہمت کرلی۔ چنانچہ دیہات میں تو اس فیڈرل پارٹی کا اثر رہا، اور باکو میں "مساوات" کا گروپ کام کرتا رہا۔

انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء کے فوراً بعد ماورائے کاکیشیا کی تین قوموں۔ آرمینیوں۔ جارجیوں اور آذربائیجانیوں۔ نے سوویت حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، "مساوات" والوں کا چونکہ پہلے سٹالن اور "ہمت" کے بالشویک گروپ سے تعاون رہ چکا تھا، اس لئے وہ انقلاب اکتوبر کے بعد کافی مہینوں تک سوویت منشوروں کی ان دفعات سے جو قومیتوں کی حق خود ارادی کے متعلق تھیں، متاثر رہے لیکن اسی دوران میں باکو میں آرمینیوں اور آذربائیجانیوں میں (۳۱ مارچ ۱۹۱۸ء) تصادم ہوا جس میں آخر الذکر کو کافی جانی نقصان پہنچا۔ اس کے بعد "مساوات" والے کلی طور پر عثمانی ترکی کی طرف دیکھنے لگے۔ اسی زمانے میں عثمانی ترک افواج آذربائیجان میں داخل ہوگئیں۔ ان کا آذربائیجانی مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا۔ اور انہیں باکو سوویت اور آرمینیوں کے خلاف اپنا محافظ سمجھا نیز "مساوات" والوں نے بھی خیال کیا کہ آخر کار عثمانی ترکی سے متحد ہو جانے کی توقع پوری ہو رہی گئی۔ آذربائیجان کے وزیر اعظم خان خوئسکی نے ان الفاظ سے ترک فوجوں کا استقبال کیا تھا۔

> آذربائیجان نے آخر کار اپنا مقصود پا لیا اور ایک صدی سے تمام ترکوں کو سلطان کے جھنڈے تلے جمع کرنے کا جو نصب العین تھا، اس کی تکمیل ہوگئی

---

[1] فارسی کے مشہور شاعر نظامی گنجوی اسی گنجہ سے منسوب تھے (مدیر)

اب وولگا کے تاتاری، ماورائے کیسپین کے سارٹس، وسط ایشیا کے
ازبک، کرغیزی اور خیوا و بخارا کے لوگ بڑی آرزوؤں سے آزادی دلانے
والی ترک افواج کی آمد کی راہ دیکھ رہے ہیں۔"

اس تقریر کے بعد آذربائیجانیوں اور ترکوں دونوں نے "زندہ باد افواج ترکیہ اور زندہ باد اتحاد اتراک" کے نعرے لگائے۔ ۷ ستمبر ۱۹۱۸ء کو رسول زادہ اور آذربائیجانی وفد کے دوسرے ارکان نے بھی استنبول پہنچ کر انہی الفاظ میں اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ سلطان کی مشفقانہ سرپرستی کے تحت آذربائیجان ترقی کرے گا۔

اس وقت "مساوات" والوں کو واقعی یہ یقین تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں ترکی جرمنی فتح کے نتیجے میں وہ ترکی کی مدد سے تمام روسی ترکوں کی ایک مملکت یا فیڈریشن بنا سکیں گے۔ باکو پر قابض ہونے کے بعد ترکی فوجیں داغستان کی طرف بڑھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ارادہ روس کے دوسرے مسلمان علاقوں کو بھی اپنے زیر اثر لانے کا تھا۔ لیکن جیسے ہی جرمن آسٹریا اور ترکی پر برطانیہ فرانس اور ان کے اتحادیوں کو فتح ہوئی، مشرق قریب کی تمام صورت حال بدل گئی روس میں ترکی افواج کی پیش قدمی رک گئی۔ اور برطانیہ کے مطالبے پر ۱۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو ترکی افواج نے صرف دو ماہ کے قبضے کے بعد باکو اور دوسرے ماورائے کاکیشیا کے علاقے خالی کر دیئے۔ اور برطانوی فوجیں وہاں داخل ہو گئیں۔

خارجی اور داخلی مشکلات میں برابر گھرے رہنے کی وجہ سے آذربائیجان میں "مساوات پارٹی" کی حکومت کوئی خاص قابل ذکر اصلاحات نافذ نہ کر سکی۔ اس نے ایک دو بار زرعی اصلاحات نافذ کرنی چاہیں، لیکن پارٹی کا دایاں بازو سابق فیڈرل گروپ اس میں آڑے آیا، اور پھر چونکہ باکو کے تیل کی برآمد میں مشکلات پیدا ہو گئی تھیں اس لئے ملک اقتصادی بحران کی لپیٹ میں آ گیا جس کی وجہ سے ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ صرف ایک میدان میں آذربائیجان کی یہ چند روزہ حکومت کچھ کر پائی۔ اور وہ اس کا تعلیمی نظام کا ترکیت کے قالب میں ڈھالنا تھا۔ غرض تمام سرکاری سکولوں میں روسی زبان کی جگہ آذربائیجانی یا عثمانی ترکی رائج کر دی گئی، کئی نئے ثانوی سکولوں اور ایک یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور قومی صحافت کو بھی بڑا فروغ ہوا۔

ترکی افواج کے انخلاء (موسم سرما ۱۹۱۸ - ۱۹۱۹) کے بعد "مساوات" کے متعلق برطانوی

خدشات کو دور کرنے کے لئے ایک آذربائیجانی پارلیمنٹ بھی منتخب کی گئی، جو زیادہ مؤثر نہ تھی۔ کیونکہ اقتدار زیادہ تر "مساوات" کے سیاست دانوں، تیل کے تاجروں اور صنعت کاروں اور گنجہ کے زمینداروں کے ہاتھ میں رہا۔ پارلیمنٹ کے ایک سو ارکان میں سے مساوات نے ۳۸، خان خوئسکی کے گروپ نیشنل ڈیموکریٹس نے حکومت کے حلیف مسلم سوشلسٹوں نے ۱۲ اور شمال مغربی آذربائیجان کے ایک ترقی پسند (پروگریسو) "سنی گروپ احرار" نے ۔ نشستیں حاصل کیں۔ "مساوات" کے سخت ترین مخالف انتہائی دائیں بازو کے "اتحادیوں" کو جو قدامت پسند علماء پر مشتمل تھے ۱۳ نشستیں ملیں۔ باقی اقلیتوں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے نمائندے تھے۔

آذربائیجان کی آزاد ریاست کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کی سب سے بڑی حکمران پارٹی "مساوات" ایک ہم آہنگ سیاسی تنظیم نہ تھی۔ اس کے بائیں بازو کی قیادت رسول زادہ وغیرہ باکو کے دانشوروں کی تھی، جو لبرل ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی انتہا پسندی کی طرف بھی چلے جاتے تھے اس کا دایاں بازو طبقہ اشراف کا تھا، اور ان دونوں میں برابر نزع رہا۔ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں رسول زادہ کی کوششوں سے سوویت یونین سے روابط قائم کئے گئے۔ آذربائیجان میں کمیونسٹ پارٹی کی قانونی حیثیت تسلیم کر لی گئی اور مقامی کمیونسٹوں کے بارے میں زیادہ رواداری کی پالیسی کا نفاذ کیا گیا۔

اس ضمن میں غیر متوقع بات یہ ہوئی کہ سوویت حکومت سے مصالحت کی اس نئی پالیسی کی تائید نہ صرف "مساوات" کے بائیں بازو اور مسلم سوشلسٹوں نے کی، بلکہ انتہا پسند دائیں بازو والے "اتحادی" بھی اس کے حق میں تھے۔ یہ گروہ "مساوات" سے کم قوم پرست تھا۔ اور اپنی پارٹی کے پروگرام کی بنیاد اسلام کے مذہبی اصولوں پر رکھتا تھا۔ اتحادیوں پر شیعہ علماء کا غالب اثر تھا۔ ایک تو شیعوں اور سنیوں کی روایتی مخالفت، دوسرے شیعہ علماء کا ایران کی مذہبی زندگی اور اسکی ثقافت سے جو تعلق تھا اس کی وجہ سے "اتحادی" ترکیت کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک پان ترکزم کے حامیوں کی قوم پرستی جو مذہبی اصولوں کے مقابلے میں لسانی اور نسلی اتحاد کو مقدم سمجھتے تھے، تعلیمات نبویؐ کے مخالف تھی۔ ان کا کہنا تھا:- اسلام ہمیشہ سے ایک عالمگیر مذہب رہا ہے۔ اور اس کا قومی تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں۔ (مسلسل)

تنقید و تبصرہ

فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ　　تالیف شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ شارح مولانا محمد عبدالحلیم چشتی

"عجالہ نافعہ" نام کا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فارسی زبان میں ایک مختصر سا رسالہ "در فوائد متعلق بعلم حدیث" ہے، جو آپ نے سید قمرالدین الحسنی کے شوق و خواہش پر رقم فرمایا تھا۔ حضرت شاہ صاحب اس رسالے کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ اگر مضامین ایں رسالہ را کسے نصب العین خود سازد و در فنون حدیث خوض نماید از غلط و خطا مامون و از تصحیف و تحریف مصئون باشد و در تصحیح و تضعیف معیارے درست بدست داشتہ باشد'

اس رسالے میں شروع میں "طبقات کتب حدیث" کا ذکر ہے اس کے بعد بعض راویوں کے ناموں کی تحقیق کی گئی ہے پھر کتب حدیث کے اقسام کا بیان ہے۔ ایک فصل "در ذکر سند علم حدیث" ہے۔ عجالہ نافعہ کا فارسی متن کل ۲۶ صفحے کا ہے

مولانا محمد عبدالحلیم چشتی (فاضل دارالعلوم دیوبند) نے پہلے تو اس فارسی متن کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جو ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ پھر اس پر "فوائد جامعہ" لکھے ہیں جو زیر نظر کتاب کے صفحہ ۶۳ سے شروع ہو کر ۴۰۴ پر ختم ہوتے ہیں ان فوائد کی نوعیت یہ ہے کہ رسالہ عجالہ نافعہ میں مترجم نے جو بات بھی تشریح طلب پائی ہے موصوف نے ان "فوائد جامعہ" میں اسے بڑی تفصیل سے بیان کر دیا ہے، مثلاً یہ رسالہ سید قمرالدین حسنی کی خواہش پر لکھا گیا۔ ایک فائدہ میں صاحب موصوف کے حالات مذکور ہیں۔ اور ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ حالات کے لئے "نزہۃ الخواطر" ملاحظہ ہو۔

رسالے کی تمہید میں شاہ صاحب نے ایک حدیث اِنَّ للّٰہ فی ایام دھرکم نفحات الخ نقل فرمائی ہے مترجم نے فوائد میں بتایا ہے کہ اس حدیث کی کس نے تخریج کی اسی طرح اصل متن میں ایک جگہ یہ عبارت ہے "ایں علم بمنزلہ صرافی است" اس پر مترجم کا فائدہ یوں شروع ہوتا ہے "۔۔۔ اسی لئے نقاد حدیث کو صیرفی الحدیث کہتے ہیں۔ امام اعمش المتوفی ۱۴۸ھ ابراہیم نخعی کو صیرفی الحدیث کہتے تھے۔۔۔۔"

"طبقات کتب حدیث" کے ذیل میں شاہ صاحب نے قاضی عیاض کی مشارق الانوار کا ذکر کیا ہے۔ مترجم نے اس پر ایک مبسوط فائدہ لکھا ہے۔ اسی طرح عجالہ نافعہ میں جو بھی اسماء و اعلام آئے ہیں، مترجم نے بڑی تفصیل سے ان کے بارے

میں جملہ تصانیف جمع کر دی ہیں، اور ساتھ ہی مراجع کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ "طبقات کتب حدیث" کے سلسلے میں شاہ صاحب نے مثال کے طور پر چند کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ جن میں کتب "بیہقی" اور کتب طحاوی" کا بھی ذکر ہے مترجم نے فائدے میں حافظ البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ اور حافظ طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ کی جملہ تالیفات کے نام اور ان کے بارے میں ضروری معلومات جمع کر دی ہیں۔ اور ساتھ ہی مراجع کا بھی ذکر ہے۔

مولانا چشتی صاحب نے بعض مقامات میں صرف رسالے کی شرح پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس میں کچھ ضروری اضافے بھی کئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں کہ "شاہ عبدالعزیز نے فقہاء محدثین کے سلسلے میں چند ہی ناموں پر اکتفا کیا ہے ہم نے اس سلسلے میں چند ناموں کا اضافہ کر کے بڑی حد تک اس خلا کو پر کر دیا ہے"۔ یہ اضافہ کوئی ۱۱۲ صفحات کا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا اصل رسالہ علم حدیث کے طالبوں کے لئے بے حد مفید ہے اور اس سے یقیناً ان میں اس علم کے بارے میں ایک تنقیدی نظر پیدا ہو جاتی ہے مولانا چشتی نے اس کا اردو ترجمہ کر کے ایک بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ اور اس سے بھی بڑی خدمت وہ فوائد جامعہ ہیں، جو موصوف نے غیر معمولی محنت، تحقیق اور عرق ریزی کے بعد مرتب کئے ہیں، یہ فوائد اس موضوع پر گویا انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور انہیں اتنی اچھی زبان اور دل نشین اسلوب میں مرتب کیا گیا ہے کہ آدمی ان کو ایک تاریخ کی کتاب کی طرح پڑھتا جاتا ہے۔ یہ فوائد معلومات افزا بھی ہیں اور دلچسپ بھی اور اس کی وجہ سے زیر نظر کتاب محض ایک مخصوص فن کی نہیں رہی، بلکہ عام مطالعہ کی ایک علمی کتاب بن گئی ہے۔

نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی نے اسے بڑے اہتمام و سلیقے سے شائع کیا ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ ضخامت تقریباً ۶۵۰ صفحے بڑا سائز قیمت قسم اول ۱۵ روپے قسم دوم ۱۲ روپے۔

ترجمے اور فوائد کی ترتیب میں مولانا چشتی صاحب نے واقعی تحقیق کا حق ادا کیا ہے اور تلاش و تفحص میں کوئی کمی نہیں رہنے دی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ اتنا اور کرتے کہ زیر نظر رسالے کے مرتب حضرت شاہ عبدالعزیز کے مفصل حالات (اس سے زیادہ جتنے کہ وہ کتاب کے بیچ میں آئے ہیں) شروع میں دے دیتے۔ تو اس کتاب کی افادیت اور زیادہ ہوتی، رسالے کے "فوائد جامعہ" ۵۰۰ صفحوں سے بھی زیادہ کے ہیں، لیکن صاحب رسالہ پر صرف چھ صفحے ہیں، کیا یہ بہتر نہ تھا کہ شروع میں شاہ صاحب کے حالات زندگی۔ ان کے عہد، ان کی علمی حیثیت اور ان کے افکار و خیالات کا بیان ہوتا تاکہ رسالہ کے ساتھ ساتھ صاحب رسالہ کا پورا تعارف ہو جاتا۔

۱۔ س

(عربی)

شاہ ولی اللہ رح کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت دو روپے

شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم۔ اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ وتحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں قیمت ۷/۵۰ روپے ہے۔

(فارسی)

سطعات

انسان کی نفسی تکمیل وترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعین فرمایا ہے اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے ذریعہ جس طرح حظیرۃ القدس سے اتصال پیدا کرتا ہے "سطعات" میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

nthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱- شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع

۲- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳- اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُ جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا۔ تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کا کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴- تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵- شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶- حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل

۷- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُنہیں فروغ دینے غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شا

غلام مصطفیٰ قاسمی پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبۂ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ صدر حیدرآباد
شعبان المعظم ۱۳۸۳ھ جنوری ۱۹۶۴ع

قیمت سالیانہ :- آٹھ روپے
فی پرچہ :- پچھتر پیسے

جلد ۱ شعبان المعظم ۱۳۸۳ھ مطابق جنوری ۱۹۶۴ء نمبر ۸

فہرست مضامین

کتبہ ـ عبدالمجید

شذرات

علمی و دینی حلقوں کے علاوہ ملک کے ہر طبقے میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے انتقال پر جس گہرے رنج و اندوہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا مرحوم کی کتنی ہردلعزیز شخصیت تھی، اور آپ ایک مخصوص مذہبی مسلک کے حامل اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ان اعلیٰ خوبیوں کے بھی مالک تھے، جو انسان کو مقبولِ عوام و خواص بناتی ہیں اور جب وہ اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہر شخص اس طرح یاد کرتا ہے، جیسے اس کے قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا۔

مولانا مرحوم امرتسر کے مشہور و معروف علمی و دینی خاندان غزنویہ میں سے تھے۔ آج سے کوئی چالیس سال قبل جب استخلاص وطن کی جدوجہد شروع ہوئی، تو مولانا سید محمد داؤد غزنوی اس میں پیش پیش تھے عمر کا ایک بڑا حصہ غیر ملکی حکومت کی جیلوں میں گزارا، ملک آزاد ہوا، تو جہاں تک ہو سکا اس کی خدمت کی، اور آخر جب وہ وقت آ گیا۔ جس سے کسی کو مفر نہیں تو ۱۶؍ دسمبر کو اپنے رب کو پیارے ہو گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

دنیائے اسلام کے اکثر و بیشتر ملک سیاسی لحاظ سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اور اب وہ کہیں بڑی سرعت سے اور کہیں دھیرے دھیرے اس منزل کی طرف گامزن ہیں، جہاں جمہور کی حاکمیت اپنے صحیح معنوں میں بروئے کار ہوتی ہے۔ اس دور میں جمہور کی حاکمیت صرف آئین و قانون تک محدود نہیں بلکہ وہ آئین و قانون کے ساتھ ساتھ سماجی اور اقتصادی میدانوں میں بھی اپنی عملداری کو نافذ دیکھنا چاہتی ہے اور وہ کسی طرح یہ برداشت کرنے کو تیار نہیں کہ آزاد جمہوری

حکومتوں کے اس دور میں بھی پہلے کی طرح ناداروں اور زرداروں کے دو مستقل طبقے ہوں اور ان کے درمیان سماجی اور اقتصادی ناہمواری کی ایک اونچی دیوار حائل رہے۔ ہر آزاد مسلمان ملک میں حاکمیتِ جمہور کی اس منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے اسی لئے ان میں سے اکثر کے ہاں اس وقت بڑا اضطراب اور خلفشار پایا جاتا ہے اور کبھی کبھی خون خرابے تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

یہ اپنی جگہ صحیح ہے یا غلط اس سے قطع نظر مسلمان ملکوں میں جمہور کی حاکمیت کو مِنْ کُلِّ وجہٍ بروئے کار لانے کی یہ جدوجہد ہو رہی ہے، اس میں اسلام کا بھی اپنا مقام ہے کیونکہ مسلمان جمہور کے ہاں اس کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ اپنے لئے سیاسی آزادی کے بعد سماجی انصاف اور اقتصادی خوش حالی حاصل کرنے کی بلکہ سچ یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ چنانچہ علامہ اقبال کا یہ شعر

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

واقعی مسلمان جمہور کے ذہن و عقیدہ کی آج بھی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

اسلام کا احیاء و قیام اور سیاسی آزادی کے بعد سماجی انصاف اور اقتصادی خوش حالی کا حصول۔ اس وقت یہ دو سب سے بڑے عوامل اور محرکات ہیں مسلمانوں کی جمہوری جدوجہد کے قومی زندگی سے اسلامی موثرات کو خارج کرنے کی جس تحریک کا آغاز ۱۹۲۳ء میں ترکی میں ہوا تھا اس کا رد عمل ترکی کے سابق وزیر اعظم عدنان مندریس مرحوم کے عہد اقتدار میں جس طرح ہوا اس کا ترک حکمرانوں کو تلخ تجربہ ہوا ہے، اور اب ان کا نقطۂ نظر کچھ بدل رہا ہے۔

استنبول کی ایک حالیہ اطلاع ہے کہ وہاں ایک جدید اسلامی درس گاہ کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جس کے مقاصد یہ ہیں:- ترکوں میں اسلام سے شیفتگی پیدا کرنے، اس کی تہذیب و ثقافت کو اپنانے، قرآنی تعلیمات کو اپنی زندگی میں عملی جامہ پہنانے، دینی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور مشرق وسطیٰ میں اسلامی قدروں کے احیاء اور مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کے وجود میں لانے کی صلاحیت پیدا کرنا۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو افتاء، وعظ و ارشاد خطابت اور امامت

کی خدمات سر انجام دے سکیں۔ اور ثانوی اور دوسری درس گاہوں میں اسلامی علوم و فنون کی تعلیم دینے کے قابل ہوں۔

اسی اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت استنبول کی اس درس گاہ میں تقریباً تین سو طالب علم ہیں۔ اور پہلے سال اس سے جو طلبہ فارغ ہوئے ہیں، ان میں سے بعض ائمہ و خطباء بعض مدارس میں عربی ادب اور اسلامی علوم کے استاد اور بعض مفتی اور واعظ مقرر کئے گئے ہیں۔

ترکی میں اس "رجعت قہقری" کی ضرورت کیوں پڑی۔ صرف اس لئے کہ ترک جمہوریہ چاہتے تھے اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ اس دور میں حکومت کو مرضئ جمہور کے سامنے کرہاً و طوعاً سر خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

عرب ممالک میں پوری قومی زندگی کو نئی اساس پر تعمیر کرنے کی جدوجہد میں سب سے تیز سب سے آخر میں سیاسی آزادی حاصل کرنے والے ملک الجزائر ہے چنانچہ یہ اس معاملے میں متحدہ عرب جمہوریہ سے بھی زیادہ تیز ہے مثال کے طور پر الجزائر کی موجودہ قیادت ملک میں اشتراکیت (سوشلزم، کمیونزم نہیں) بڑی سرعت سے لا رہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے پروگرام میں اسلام کا احیاء بھی داخل ہے اور اسے اس سلسلے میں بھی کوشاں ہونا پڑتا ہے۔

قومی زندگی میں اتحاد و یک جہتی اور نظم و انضباط کا قیام اور اس کے علاوہ سماجی انصاف اور اقتصادی خوش حالی کا حصول — ہر مسلمان ملک میں اسلام کو ان مقاصد کی تکمیل میں بھی ممد و معاون ہونا ہے بلکہ ان کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ علمائے کرام اور دعوتِ احیائے اسلام کے علم بردار حضرات اپنی فکر و نظر اور عمل و کردار میں جس قدر اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے اسی قدر وہ قومی قیادتوں کو اسلام کے اصول و نظریات سے زیادہ ہم آہنگ کر سکیں گے۔

حضرت امام ربانی کی تجدیدی دعوت

محمد سرور

بابر سے پہلے دہلی کے تخت پر جو بھی مسلمان خاندان بیٹھے، ان کی اسلامیت کے بالعموم دو امتیازی نشان تھے، ایک فقہی مشرب میں حنفیت اور دوسرے تصوف۔ گویا حنفیت اور تصوف، اس دور میں ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقوں کا سرکاری مذہب تھا۔ مغل سلطنت کا بانی ظہیرالدین بابر ترکستان یعنی ماوراءالنہر سے آیا تھا، جہاں حنفیت بھی پورے زور پر تھی اور اس کے ساتھ ساتھ تصوف کا بھی غیر معمولی اثر و نفوذ تھا۔ ماوراءالنہر میں ان دنوں تصوف کا ایک نیا طریقہ نقشبندی جس کے موسس حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندی تھے۔ فروغ پر تھا، اور عوام کے علاوہ خواص بھی اس کے حلقہ بگوش تھے[1]

بے شک یہ زمانہ مطلق العنان بادشاہوں کا تھا۔ اور عام طور سے ایک بادشاہ کا حکم قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امراء و عمائد جو بادشاہ کے اردگرد ہوتے تھے۔ اور جو اس کے اقتدار کو عملاً نافذ کرنے کے ذمہ دار تھے، سلطنت کی پالیسیاں بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہوتا تھا۔ چنانچہ کوئی بادشاہ خواہ وہ کتنا بھی زبردست اور باجبروت کیوں نہ ہوتا اپنے امراء و عمائد کے تعاون کے بغیر دہ زیادہ عرصہ برسر

---

[1] شہزادہ داراشکوہ اپنی کتاب "سفینۃ الاولیاء" میں حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند کے حالات میں لکھتا ہے، حضرت کے مریدین باصفا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ماوراءالنہر کے اکثر و بیشتر باشندے آپ ہی کے مریدوں میں شامل ہیں۔ شریعت مطہرہ کی پابندی آپ کا شعار تھا حنفی المذہب شیخ تھے اور امام اعظم ابوحنیفہ سے آپ کو خصوصی عقیدت تھی۔ اس سلسلے کے جتنے بھی مشائخ گزرے ہیں وہ سب کے سب حنفی المذہب تھے۔ (اردو ترجمہ)

اقتدار نہیں رہ سکتا تھا۔ [۱]

بابر کے بعد ہمایوں اور ہمایوں کے بعد اکبر آتا ہے۔ اپنے باپ کے تلخ تجربے کے بعد اکبر نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ کاروبار سلطنت میں تمام تر انحصار اپنے ترکمانی و تورانی سرداروں پر نہ رکھے بلکہ وہ اس وسیع و عریض برصغیر میں مغل سلطنت کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لئے دوسرے بااثر عناصر سے بھی مدد لے، اس طرح ایک طرف سے راجپوت اور دوسری طرف سے ایرانی امراء اکبر کی سلطنت میں شریک ہوتے ہیں، اور وہ تورانی، افغانی، راجپوت اور ایرانی سرداروں اور امیروں کی مدد سے عظیم مغل سلطنت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ان مختلف نسلوں، ملتوں اور مذہبی فرقوں کے حکمراں عناصر کو جن پر کہ مغل سلطنت قائم تھی، بادشاہ کا وفادار رکھنے کے لئے کسی قسم کی ایک ذہنی ہم آہنگی جسے اس زمانے میں "آئیڈیالوجی" کہا جاتا ہے، چاہیئے تھی، چنانچہ وہ اس فکر سے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، جو تاریخ میں "دین الٰہی" کے نام سے مشہور ہے۔ سلطنتوں کے بانیوں کو اکثر ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مامون الرشید نے ایرانیوں اور عربوں کو ہم آہنگ کرنے کے لئے معتزلیت کی حوصلہ افزائی کی، لیکن وہ فکر زیادہ عرصہ تک پنپ نہ سکا۔ اس سے پہلے اموی فرمانرواؤں نے عرب قبیلوں کو باہم لڑا کر اپنا اقتدار بحال رکھنا چاہا تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے نہ صرف امویوں کے ہاتھ سے بالکل ان عرب قبائل کے ہاتھوں سے بھی اقتدار جاتا رہا۔ اور عباسی خاندان غیر عرب عناصر کی مدد سے برسر اقتدار آگیا۔

---

[۱] دورانِ گفت گو میں ایک دفعہ مولانا عبیداللہ سندھی نے فرمایا:۔ داراشکوہ کی شکست کے بعد جب شاہ جہاں آگرے کے قلعے میں محصور ہو گیا، تو اس نے عالمگیر کو ملنے کے لئے بلایا، لیکن وہ امراء و عمائد جو عالمگیر کے ساتھ مل کر داراشکوہ کے خلاف لڑے تھے، وہ اس میں مانع ہوئے اور انہوں نے باپ بیٹے کی ملاقات نہ ہونے دی۔ بقول مولانا مرحوم اُس مطلق العنان شاہی دور میں بھی ایک حکمراں طبقہ ہوتا تھا' جس کی مدد سے بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ البتہ یہ طبقہ امراء و عمائد کا تھا جنہیں اس دور کا حکمراں طبقہ کہا جاسکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مغل سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لئے اکبر نے جو پالیسی اختیار کی وہ کوئی اَن ہونی نہیں تھی کہ اس پر آج ہم بہت زیادہ بگڑیں اسے دراصل استحکام سلطنت کے لئے اُس وقت کے زیادہ سے زیادہ بااثر عناصر کے تعاون کی ضرورت تھی، اور اس تعاون کو حاصل کرنے کی راہ اسے یہی نظر آئی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک اکبر کے جانشینوں کو ان تمام عناصر کا تعاون حاصل رہا وہ داخلی طور سے بھی مضبوط رہے، اور باہر سے بھی ان پر حملے نہیں ہو سکے لیکن جیسے ہی اکبر کی سیاسی پالیسی کو شکست ہوئی مغل سلطنت کا شیرازہ بھی بکھرنا شروع ہو گیا۔

بہر حال اکبر کی اس سیاسی پالیسی کو جس آیڈیالوجی کے ذریعہ فکری تقویت دینے کی کوشش کی گئی اس کے خلاف مسلمان حکمران طبقوں کا شدید ردّعمل ہوا۔ اور بتدریج اس کی مخالفت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ عالمگیر اورنگ زیب کا دورِ حکومت آتا ہے، جو اکبر کی اس فکری اساس کا بالکل ضد تھا۔ اس ردّعمل کو ایک مثبت تحریک کی شکل میں بدلنے کا سہرا اگر ایک طرف تورانی اور ان کے ہم خیال دوسرے امراء و عمائد پر ہے تو دوسری طرف اس میں نقشبندی سلسلے کے بزرگوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

تصوّف کے چشتی، سہروردی اور قادری سلسلوں کے برعکس جو بالعموم شاہی درباروں سے دور ہی رہنا مناسب سمجھتے تھے نقشبندی سلسلے کے بزرگ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ارباب اقتدار سے ربط ضبط رکھنا ضروری قرار دیتے تھے چنانچہ اس سلسلے کے ایک مشہور بزرگ خواجہ عبیداللہ احرار کا ایک قول حضرت مجدّد الف ثانی نے کئی مکتوبات میں نقل کیا ہے۔

"اگر ما شیخی مے کردیم۔ دریں روزگار ہیچ شیخ مریدے نیافت، لیکن ما را کارِ دیگر فرمودہ اند کہ مسلماناں را از شرِ ظلم نگاہداریم۔ بواسطۂ ایں بپادشاہاں بایست اختلاط کردن و نفوس ایشاں را مسخر گردانیدن و بتوسط ایں عمل مقصود مسلمین برآوردن[1]"

خواجہ بہاءالدین نقشبند کے اتباع میں سے خواجہ عبیداللہ احرار کی روحانیت سے مستفید اسی نقشبندی

---

[1] رودِ کوثر

سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ محمد باقی اللہ انہی دنوں دہلی تشریف لائے۔ ان کے عقیدت مندوں میں عہد اکبری کے بڑے بڑے سردار اور امراء شامل تھے، بالخصوص نواب مرتضٰی خاں[1] جن کی مدد سے جہانگیر کی تخت نشینی کے سب مراحل طے ہوئے اور جنہوں نے جہانگیر سے پاس شریعت کا عہد لیا۔ حضرت خواجہ کے بڑے معتقد تھے ان کے علاوہ طبقہ امراء کے اور با اثر افراد بھی خواجہ باقی اللہ سے عقیدت وارادت رکھتے تھے حضرت مجدّد الف ثانی انہی خواجہ صاحب کے مرید اور تربیت یافتہ تھے چنانچہ رودِ کوثر کے مصنف کے الفاظ ہیں۔

"حضرت خواجہ باقی اللہ نے ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلے کی مستحکم بنیاد رکھ دی اور طبقۂ امراء میں مذہب سے وہ انس پیدا کر دیا جس کے سامنے اکبر کے مذہبی خیالات کا فروغ ناممکن تھا لیکن انہیں بہت دن جینا نصیب نہیں ہوا۔ ان کے کام کی کما حقہ تکمیل ان کے بلند اقبال اور بلند ہمت مرید حضرت مجدد الف ثانی نے کی، جنہوں نے ہوا کا رخ ایک جانب سے بالکل دوسری سمت پھیر دیا۔"

---

[1] نواب مرتضٰی خاں شیخ فرید بخاری سید تھے دور اکبری کے آخر میں ان کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا تھا جہانگیر کے عہد میں وہ سب امرا پر بازی لے گئے تھے۔

خواجہ باقی اللہ کے ذریعہ سلسلۂ نقشبندیہ کو ہندوستان میں مستحکم کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا عبدالرحیم خانخاناں بھی حضرت خواجہ صاحب کا معتقد تھا۔ ایک اور امیر صدر جہاں تھے۔ ان کو بھی حضرت نے ذکر کی تلقین فرمائی۔ عہد اکبری کا ایک سر برآوردہ سردار قلیج خاں تھا جو بڑا متدین مسلمان تھا۔ جب وہ لاہور کا گورنر تھا تو ہر روز مدرسے میں جا کر تین گھنٹہ تک فقہ و تفسیر و حدیث کا درس دیتا اور علوم شرعی کی ترویج کرتا۔ اس کے بھی حضرت خواجہ باقی اللہ سے گہرے تعلقات تھے۔ ایک اور امیر حسام الدین جو ابوالفضل و فیضی کے بہنوئی تھے، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ سے متعلق ہو گئے۔ اور ان کی بیوی یعنی ابوالفضل و فیضی کی بہن حضرت خواجہ باقی اللہ کی خانقاہ کے خرچ کے لئے برابر نذرانہ بھیجتی رہی۔

(رودِ کوثر)

غرض ان نقشبندی بزرگوں اور ان کے عقیدت مند بڑے بڑے امراء کی کوششوں سے وہ سیاسی، تہذیبی ذہنی اور مذہبی رجحان جو اکبر کی پالیسیوں کا قدرتی نتیجہ تھا، نہ صرف رک گیا، بلکہ ہوا کا رخ دوسری طرف مڑ گیا، اور اکبر کے جانشین یکے بعد دیگرے اس سے زیادہ دور ہوتے گئے۔

حضرت خواجہ باقی اللہ کی طرح حضرت مجدد الف ثانی کے بھی امرا سے بڑے گہرے تعلقات تھے، چنانچہ ان کے بہت سے مکتوبات انہی عقیدت مند امراء کے نام ہیں، جن میں وہ انہیں اکثر ترویج شریعت کی تلقین کرتے ہیں[1] ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں :- کہ "دولتِ اسلام کی جو مانع طاقت تھی، اسے زوال آگیا اور بادشاہِ اسلام[2] کے جلوس کی بشارت خاص و عام کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔ اب اہل اسلام کو بادشاہ کا ممد و معاون ہونا چاہیئے اور ترویج شریعت اور تقویتِ ملّت کی طرف رہنمائی کرنی چاہیئے۔" اکبر اور اس کے بعد ایک حد تک جہانگیر کے عہد میں شیعیت اور ہندویت کا جو اثر بڑھ گیا تھا آپ اس کے سدباب میں بھی بڑے کوشاں تھے۔ اور اس معاملے میں آپ کا لہجہ کافی سخت تھا، اپنے ایک مکتوب میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں :-

پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے، جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا، اس نے اہل اسلام کو خوار کیا، ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں، بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفت گو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دور کرنا چاہیئے، اور اگر دنیاوی اغراض ان کے متعلق ہوں، جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہوں، تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مدنظر رکھ کر بقدر ضرورت ان کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیئے۔ اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی

---

[1] عبدالرحیم خانخاناں کے نام ۱۴۔ حسام الدین کے نام ۱۵۔ شیخ فرید بخاری نواب مرتضیٰ کے نام ۲۱ اور مرزا فتح اللہ حکیم کے نام ۳ مکتوب ہیں۔ اسی طرح ممتاز امراء میں مندرجہ بالا امراء کے علاوہ مرزا داراب، صدر جہاں محمد قلیج خاں، مرزا ایرج، خان اعظم، حکیم صدرا وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کے نام مکتوب کی تعداد ۱۰۰ سے اوپر ہی ہے (حیات مجدد از پروفیسر محمد فرمان ایم اے)

[2] یعنی جہانگیر

دور گزیں اور ان کی طرف نہ جائیں" (ترجمہ[۱])

انہیں شیخ فرید کے نام اور ایک خط ہے، جس میں ان کے نیک کاموں کی تعریف کرنے کے بعد لکھا ہے:۔ "اسلام اور اہل اسلام کی عزت کفر اور اہل کفر کی خواری میں ہے۔ جزیہ سے منصور کفار کی خواری اور ان کی اہانت ہے۔ جس قدر اہل کفر کی عزت ہو اسی قدر اسلام کی ذلت ہوتی ہے۔ اس سر رشتہ کو اچھی طرح نگاہ میں رکھنا چاہیئے اکثر لوگوں نے اس سر رشتہ کو گم کر دیا ہے، اور دین کو برباد کر دیا ہے[۲]"

جہانگیر نے شیخ فرید کو کانگڑے کی مہم پر بھیجا تھا۔ اس موقع پر ان کے نام حضرت مجدد نے ایک خط لکھا ہے۔ جو موصوف کے نام حضرت مجدد کا آخری خط ہے۔ کانگڑے میں ہندوؤں کا ایک بڑا تیرتھ تھا جس میں پرانی مورتی تھی۔ حضرت مجدد کی بڑی خواہش تھی کہ شیخ فرید اس بت کو توڑ دیں۔ اور اس تیرتھ کی اہانت کریں چنانچہ لکھتے ہیں:۔ "ان بدبختوں اور ان جھوٹے خداؤں کی تحقیر اور توہین میں بہت کوشش کرنی چاہیئے اور ظاہر اور باطن میں جس قدر ہوسکے، ان لوگوں کی بربادی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ امید ہے کہ بعض سستیاں جو آپ سے وقوع میں آئی ہیں اس عمل سے ان کی تلافی اور کفارہ ہو جائے گا۔ بدن کی کمزوری اور سردی کی شدت مانع ہے۔ ورنہ فقیر خود حاضر خدمت ہو کر اس امر کی ترغیب دیتا اور اس تقریب سے اس پتھر پر تھوکتا اور اس کو اپنی سعادت کا سرمایہ جانتا[۳]"

ایک اور خط مرزا جعفر بیگ کے نام ہے، جس میں لکھتے ہیں:۔ "میرے مخدوم! جب کفار قریش نے اپنی کمال بدنصیبی سے اہل اسلام کی ہجو اور برائی میں کمال مبالغہ کیا تو حضرت پیغمبر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلامی شاعروں کو حکم دیا کہ کفار ننگوں سار کی ہجو کریں"۔ ایک ہندو ہردے رام نے حضرت مجدد کے نام اپنے دو خطوں میں فقراء و صوفیہ سے محبت کا اظہار کیا اور لکھا کہ رام اور رحمان حقیقت میں ایک ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت مجدد نے لکھا۔ "..... رام و کرشن وغیرہ جو ہندوؤں کے معبود ہیں۔ اس (پروردگار) کی کمینہ مخلوقات میں سے ہیں۔ اور ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں رام جسرتھ کا بیٹا اور لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند ہے۔

---

[۱] رودِ کوثر

[۲] رودِ کوثر [۳] رودِ کوثر

جب رام اپنی بیوی کو نگاہ میں نہ رکھ سکا تو پھر دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے۔[1]

حضرت مجددؒ کے مکتوبات میں سے یہ اقتباسات دینے کے بعد مصنف رودِ کوثر لکھتے ہیں :- حضرت مجدد کا غیر مسلموں کے متعلق جو خاص نقطۂ نظر تھا اور جو فی الحقیقت ہندوؤں کی جارحانہ احیائی تحریک کے خلاف ردِّ عمل تھا، اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ اکبر کے زمانے سے ہندوؤں کی تالیفِ قلب کے لئے جو مصالحانہ کوششیں ہوئی تھیں، ان کے خلاف ردِّ عمل شروع ہوا۔ اکبر کے زمانے میں جزیہ موقوف ہوا تھا۔ اور ذبحِ بقر پر پابندیاں لگائی گئیں۔ حضرت مجددؒ کو یہ دونوں باتیں ناگوار تھیں۔ اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ جزیہ نئے سرے سے لگایا جائے اور ذبحِ بقر عام طور پر رائج ہو۔ کئی خطوں میں اس بات پر افسوس کیا ہے کہ ہندوؤں سے جزیہ لینا برطرف کر دیا گیا ہے ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں "جزیہ از اہلِ کفر[2] کہ در ہندوستان برطرف شدہ است، بواسطۂ شومئ مصاحبتِ اہلِ کفر است با سلاطینِ ایں دیار" ایک اور خط میں ذبحِ بقر کی تائید کی گئی ہے۔ "ذبحِ بقر در ہندوستان از اعظم شعائرِ اسلام است۔ ور ابتدائے بادشاہت اگر مسلمانی رواج یافت فبہا و اگر عیاذاً باللہ سبحانہٗ در توقف افتاد کار بر مسلمانان بسیار مشکل خواہد شد" جہانگیر اور شاہ جہاں نے تو ملکی مصلحتوں کی بنا پر ان خیالات پر عمل نہیں کیا، لیکن اورنگ زیب نے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت مجددؒ کے خلیفہ خواجہ محمد معصوم کا مرید تھا، حضرت مجددؒ کی بیشتر خواہشیں پوری کر دیں۔ اور جزیہ اور ذبحِ بقر کے متعلق وہی احکام جاری کئے، جن کی حضرت مجدد کو تمنا تھی :

ہندوؤں کی طرح شیعوں کی مخالفت بھی حضرت مجددؒ کی تعلیمات کا ایک ضروری جزو تھی۔ اور وہ خلفائے اربعہ کے احترام میں ذرا بھی کمی گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر سامانہ کے خطیب نے خطبۂ عید کے دوران خلفائے راشدین کا نام نہ لیا تو آپ نے فوراً اس شہر کے مشائخ و قضاۃ کو خط لکھا کہ خطیب کی اس فروگذاشت پر اس کے ساتھ سختی کیوں نہ کی گئی ..... خواجہ محمد معصوم کا بھی اس مسئلے میں وہی طرزِ عمل تھا جو ان کے والد بزرگوار کا تھا ان کے مکتوبات میں ایک اہم خط ہے (دفتر اول شمارہ ۴۶) جو کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شاہزادہ اورنگ زیب کو لکھا

---

[1] رودِ کوثر

[2] حضرت مجددؒ نے ہنود کے لئے ذمی کا لفظ کہیں نہیں استعمال کیا۔ ہمیشہ اہلِ کفر کہتے ہیں۔

اور جس میں تکفیرِ روافض اور ان کو قتل کرنے کے حق میں کئی حدیثیں درج کی ہیں۔ ایک حدیث ہے۔

ابو دواء میں لکھا ہے کہ ابن عباس نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے، جنکو روافض کہیں گے۔ جو اسلام کی توہین کریں گے۔ ان کو قتل کرنا۔ کیونکہ یہ مشرک ہوں گے۔" [1]

شیعہ سنی اختلافات میں شدت کی یہ نوعیت دراصل ماوراء النہر کی سرزمین کا اثر ہے، جہاں ایران اور توران کی پرانی مخالفت نے یہ شکل اختیار کر لی تھی۔ عہد مغلیہ میں شیعہ سنی مناقشات زیادہ تر نقشبندیہ سلسلے کی ایک اور شاخ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوئے۔ ہندوستان میں اس سلسلے کے بانی .... حضرت خواجہ ایشان تھے، جو شیخ سرہندی کے ہم عصر تھے، وہ بخارا میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ اور سمرقند ہوتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے ..."

اکبر کی پالیسیوں کے خلاف جو ردّعمل ہوا، اور اس ضمن میں نقشبندی بزرگوں اور ان کے معتقد ارباب اقتدار نے جو طریقۂ کار اختیار کیا، جس کا مختصراً ذکر اوپر ہے، اس کے بارے میں ظاہر ہے دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک فریق کے نزدیک یہ حضرت مجدد کی مساعی جمیلہ تھیں، جن کی بدولت دورِ اکبری کا عظیم ترین دینی فتنہ فرو ہو سکا اور اس کے بعد اس سرزمین میں اسلام کو نئی زندگی نصیب ہوئی۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی حقیقتاً دوسری ہزاروین ہجری کے مجدد تھے اور اللہ نے انہیں بروقت خبردار کیا تھا۔"

مولانا مناظر احسن گیلانی حضرت مجدد کے اس کارنامے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "..... وہ (نہر) جاری ہوئی بلکہ اور بڑھتی چڑھتی رہی۔ تاآنکہ ایک صدی بھی پوری نہ گزرنے پائی تھی کہ اس کی یہی تجدیدی نہر ایک بحرِ بیکراں کی شکل میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی آفاق کے کناروں سے ٹکرانے لگی۔ جس مغل بادشاہ نے فقیہہ کا ترجمہ بزور شمشیر "احمق" مشہور کیا تھا، خدا کی شان دیکھو کہ اسی کے تخت پر اس کا حقیقی پوتا اس تجدیدی معرکے کے بعد بیٹھتا ہے اور قرآن و حدیث تو بڑی چیزیں ہیں، دینی و علمی حیثیت سے جس کا درجہ نسبتاً فروتر ہے۔ یعنی فقہ اور فقہاء جنہیں اس کے دادا نے اپنی آنکھوں سے گرایا تھا۔ انہیں وہ اپنے سر پر بٹھاتا ہے ......" [2]

---

[1] رود کوثر ... [2] تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ

مولانا مودودی اپنی کتاب "تجدید و احیائے دین" میں حضرت مجدد کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: "...... وہ ایک اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لئے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلے میں یکہ و تنہا احیائے دین کی جدوجہد کی .... جہانگیر جس نے سجدۂ تحیہ نہ کرنے پر شیخ کو گوالیار کے قیدخانہ میں بھیج دیا، آخرکار شیخ کا معتقد ہو گیا اور اپنے بیٹے خرم کو، جو بعد میں شاہ جہاں کے لقب سے مشہور ہوا، اس کے حلقۂ بیعت میں داخل کیا .... شیخ کی وفات کے تین سال بعد عالمگیر پیدا ہوا اور وہ غالباً شیخ ہی کے پھیلائے ہوئے اصلاحی اثرات تھے جن کی بدولت تیموری خاندان کے اس شاہزادے کو وہ علمی اور اخلاقی تربیت مل سکی کہ اکبر جیسے ہادم شریعت کا پرپوتا خادم شریعت ہوا ......"

"تذکرہ" میں ایک زمانہ ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت مجدد کے اصل کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:- "...... دوسری طرف عہد اکبری کی بدعات تخت و تاج حکومت کے زور سے ہر طرف پھیل چکی تھیں اور علمائے سوء و مشائخ دنیاپرست خود ان کے احداث و اشاعت کے نقیب تھے۔ کون تھا کہ اس وقت امن و عافیت کے مدرسوں اور سلطانی و فرمانروائی کی خانقاہوں سے نکلتا اور دعوت و اصلاح کی امتحان گاہوں میں قدم رکھتا اور پھر نصرت الٰہی کے لشکروں اور نفوذ باطنی کے سامانوں سے ایسا مسلح ہوتا کہ نہ شہنشاہِ ہند کا تاج و تخت اس کی راہ روک سکتا اور نہ وقت کی حکمرانی و فرمانروائی اس کے سلطانِ حق و سطوتِ الٰہی پر غالب آسکتی ...."

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے حضرت مجدد کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:- "حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں اللہ تعالیٰ دو شخصوں کو پیدا نہ کرتا اور ان سے اپنے دین کی دست گیری نہ فرماتا، تو یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے دین کا نگہبان ہے، اس کی حفاظتِ دین کے طریقے ہزار ہیں، لیکن بظاہر تیرھویں صدی تک یا تو اسلام ہندوستان سے بالکل فنا ہو جاتا یا اتنا بگڑ جاتا، جتنا ہندو مذہب۔ یہ دو بزرگ ہندوستان کے مسلمانوں کے جلیل القدر محسن اور اسلام کے عظیم الشان پیشوا حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ احیائے اسلام اور خدمت شرع کے تذکرے میں ان نائبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور درویشوں کے ساتھ ایک دنیادار بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر مرحوم

کا نام بھی زبان پر آتا ہے [۱]"

یہ تو ایک فریق کی رائیں ہوئیں اور عوام کے علاوہ خواص کی بھی غالب اکثریت اسی طرف گئی ہے لیکن ایک فریق جو بہت مختصر ہے، وہ ان واقعات کو بتمام کمالی اس نظر سے نہیں دیکھتا۔

مولانا عبیداللہ سندھی حضرت مجدد صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے تجدیدی کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:- "اُن (شاہ ولی اللہ) کے نزدیک اکبر کا کام سب مذاہب اور ساری قوموں کو باہمی منافرت اور عداوت کے بجائے دوستی و آشتی کے رشتے میں پرونا تھا۔ چنانچہ اس کا یہ اقدام عین صواب تھا کیونکہ مختلف مذاہب اور دوسری ملتوں کے متعلق اس قسم کا جامع انسانیت تصور رکھے بغیر کوئی بین الاقوامی اور وسعت پذیر نظام وجود میں نہیں آسکتا۔ اور اکبر کو اس میں ابن عربی کے وحدت الوجود کے فکر سے مدد ملی چنانچہ یہ تصور انسانیت کے بقا اور اس کی ترقی کے لئے بے حد مفید ہے [۲]"۔

اکبر کے اس جامع انسانیت اور بین الاقوامی تصور کے برعکس اورنگ زیب عالمگیر نے جس تصور کو مشعل راہ بنایا۔ اس میں ملت اور ملت میں بھی اہل السنت والجماعت کے ایک مخصوص گروہ کی سالمیت و استحکام اور برتری پر زیادہ زور تھا۔ بقول مولانا سندھی کے، اسے اس مقصد کے لئے حضرت امام ربانی ایسے پیر و مرشد مل گئے، جنہوں نے ابن عربی کے وحدت الوجود کے مقابلے میں اپنا وحدت الشہود کا تصور پیش کیا اور ساتھ ہی ایک روحانی پیشوا اور اسلام کے مجدد کی حیثیت سے مسلمانوں میں غیر معمولی جوش اور ولولہ پیدا کر دیا ان کی کوششوں سے جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانوں میں اکبری طریقہ کار میں بعض تبدیلیاں ہوئیں اور نگ زیب عالمگیر کی کامیابی بہت حد تک اس تصور والے گروہ کی رہین منت تھی، چنانچہ اس کے بادشاہ بننے سے سلطنت میں اس گروہ کو اپنے حریف راجپوتوں اور شیعوں پر پورا غلبہ حاصل ہو گیا [۳]"

---

[۱] سیرت سید احمد شہید

[۲] تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی

[۳] تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی

حضرت مجدد الف ثانی کی دعوت تجدید اوران کی اصلاحی کوششوں کا عملی نتیجہ دورِ عالمگیر ہے اور اس میں جو مسلک اختیار کیا گیا۔ اس کے بارے میں مولانا سندھی فرماتے ہیں :۔ "عالمگیر کی اس سیاست سے ہندو بدک اٹھے۔ اور شیعوں میں ناراضی پھیل گئی۔ اکبر کے عہد سے راجپوت اور شیعہ مغلیہ سلطنت کی دو بڑی طاقتیں بن گئی تھیں .... اب جو حکومت کا طرز بدلا تو سلطنت سے ان طبقوں کی پہلی سی وفاداری نہ رہی اور ملک کے اندر تفرقہ اور انتشار کے جراثیم پیدا ہونے لگے ..... نتیجہ یہ نکلا کہ جن طبقوں کے بل پر عالمگیری سیاست کا ڈول ڈالا گیا تھا۔ وہ اتنی بڑی سلطنت کا بار اٹھانے کے قابل نہ رہے اور اس طرح مخالفوں کو موقع مل گیا کہ وہ عالمگیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بننے کے لئے ہاتھ پاؤں ماریں[1]"

گویا اورنگ زیب عالمگیر جس تجدیدی دعوت کا عملی پیکر تھا، وہی آخر کار موجب بنی اس خلفشار اور افراتفری کا، جو مغل سلطنت کو لے ڈوبی اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی مختلف قومیں متحد نہ رہیں، بلکہ خود مسلمانوں میں یکجہتی پیدا نہ ہو سکی۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ دراصل عالمگیر کے پیش نظر یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو بحیثیت ایک جماعت[2] کے منظم کرے اور اکبر کے بین الاقوامی اور جامع انسانیت تصور کو عملی جامہ پہنانے میں جماعتی زندگی کے اندر جو بے عنوانیاں پیدا ہو گئی تھیں، ان سے اسلامی زندگی کو پاک کرے اس کام میں امام ربانی کے فیوض سے اسے رہنمائی ملی لیکن ہندوستان میں اور قومیں اور مسلمانوں کے اور فرقے بھی تھے۔ اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جہاں ایک طرف مسلمانوں کو بحیثیت ایک جماعت کے منظم کیا جاتا' وہاں دوسری قوموں اور دوسرے فرقوں سے بھی ان کی ہم آہنگی ہوتی۔ کیونکہ جہاں تک زندگی کی اصل ضرورتوں کا تعلق ہے ایک طرف جماعتی و قومی اور دوسری طرف قومی و بین الاقوامی مصلحتوں میں تعارض نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن عالمگیر کے دور میں یہ تعارض پیدا ہوا، اور اس کے نتائج بھی تباہ کن ثابت ہوئے۔ یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی ذمہ داری

---

[1] تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی

[2] اس سے مراد اہل السنت والجماعت ہے۔

کم یا زیادہ حضرت امام ربانی کی دعوت تجدید پر نہیں عائد ہوتی، شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی رودِ کوثر میں بڑی تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی ہے، وہ "حضرت مجدد کی مذہبی خدمات" کے ضمن میں لکھتے ہیں :- ....

"اکبری الحاد کے خاتمے میں اس زمانے کے مسلمان امراء کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ اور ان مسلمان امراء کو حضرت مجدد جس طرح ترویج شریعت پر آمادہ کرتے رہتے تھے، اس کا ذکر بھی ہم کر چکے ہیں۔ لیکن حضرت مجدد کی کوششیں صرف مسلمانوں کے با اثر طبقے کو اپنے فرائض یاد دلانے اور امراء کے خیالات کی اصلاح تک محدود نہ تھیں۔ انہوں نے عامۃ المسلمین بلکہ جمہور علماء اور صوفیہ کے خیالات کی بھی اصلاح کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد اکبری کی مذہبی بے قاعدگیوں کے خلاف جو ردِّ عمل ہوا اور شرع و دین نے جو بتدریج دوبارہ فروغ حاصل کیا، اسے حضرت مجدد کی ذات والا صفات سے بڑی تقویت ملی۔

"حضرت مجدد کی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ آپ نے اس سلسلۂ تصوف کی اشاعت کی جو ہندوستان طریقوں میں شریعت سے قریب ترین ہے ....

"اس کے علاوہ نہ صرف آپ نے طریقت کا صحیح سلسلہ اختیار کیا اور اسے ترقی دی، بلکہ طریقت کے مقابلے میں شرع کی اہمیت واضح کر دی۔ چنانچہ آپ تعلیم دینی کو تعلیم سلوک پر مقدم رکھتے تھے ....

"آپ نے عقیدۂ وحدت الوجود کی نئی توجیہہ کی اور وحدت الشہود کا نظریہ قائم کر کے مسلمان صوفیاء اور علماء کے اختلافات رفع کر دیئے .....

"شرع کی حمایت اور ترجمانی کے علاوہ آپ کا ایک بڑا کام ردِّ بدعت تھا۔

".... ردِّ روافض کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ مکتوبات میں سنئی فرقے کی مخالفت کی۔ اور خود جہاں جاتے یا جہاں ان کے خلفاء اور مرید ہوتے، اس فرقے کے عقائد کی مخالفت کرتے، یہی وجہ ہے کہ جہانگیر کے مزاج میں نورجہاں اور آصف خاں کو بہت دخل ہونے کے باوجود شیعہ عقائد ہندوستان میں بہت عام نہ ہو سکے۔

"شرع کی ترویج، طریقۂ نقشبندیہ کی اشاعت، شریعت اور طریقت کی تطبیق اور شیعیت کی مخالفت کے علاوہ حضرت نے جو اہم کام کیا، وہ اسلام کا احیاء تھا۔ اس زمانے میں جب عام علماء و مشائخ نے ایک گوشے میں بیٹھ جانا ہی سلامتی کا راستہ سمجھ رکھا تھا، آپ نے جہانگیر کے سامنے سجدہ نہ کر کے قید و بند کی سختیاں

جھیلیں اور اپنی جرأت اور اتباعِ شرع سے مغلوں کے خلاف شرعی احکام کا سدِ باب کیا ......

"حضرت مجدد نے خود احیائے اسلام کی کوشش کی اور اس کے علاوہ ایک ایسا نظام قائم کر دیا، جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی۔ آپ کے صدہا خلفاء تھے، جو ہندوستان کے کونے کونے میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی آپ کے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے ....." علاوہ ازیں رودِ کوثر میں حضرت مجددؒ کے بعض طریقہ ہائے کار پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے۔ "...... ان (حضرت مجدد اور ان کے جانشینوں) سے پہلے بزرگان اہل طریقت نے غیر مسلموں کے ساتھ سختی اور شدت کی تلقین نہیں کی مسلمان بادشاہوں کا ملکی اور فوجی مصلحتوں کی بناء پر ان سے خواہ کیا سلوک ہو، اور فقہا اور علماء ان کے متعلق خواہ کچھ ہی فتوے دیں، لیکن حضرات صوفیہ نے کبھی ان کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار نہیں کیا"

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں :- "...... ان خیالات اور ان کی اشاعت کا نتیجہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نیک نکلا یا برا۔ اس کے متعلق رائیں مختلف ہیں۔ معتقد عہد عالمگیری کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو اس زمانے میں اسلام کی کتنی شان تھی۔ اس کا عہد اکبری کی بے قاعدگیوں سے مقابلہ کرو اور پھر حضرت مجدد اور ان کے فیض کا قیاس کرو۔ معترض کہتے ہیں کہ ذرا عہد عالمگیری سے آگے بڑھ کر بھی دیکھو ملکی معاملات میں سیاسی مصلحتوں اور فیض عام کے اصولوں کو چھوڑ کر جوش اور غصے کی پیروی کرنے سے حکومت کو جو زوال ہوا اور اس ملک میں اسلامی نظام بالکل درہم برہم ہو گیا، اس کا ذمہ وار کون تھا؟ وہ سکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جنہوں نے سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور کہتے ہیں کہ اگرچہ عہد اکبری یا عہد جہانگیری میں ہندو بعض پابندیوں سے بری تھے، لیکن اسلام اور اہل اسلام کے لئے وہ زمانہ اچھا تھا یا مرہٹوں اور سکھوں کے عروج کا زمانہ؟"

شاہ ولی اللہ کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک اور جگہ موصوف نے لکھا ہے :- "...... حضرت مجدد کی امتیازی خصوصیت ان کی "رگ فاروقیہ"، یعنی شدید اسلامی احساس ہے وہ بار بار اپنے مکتوبات میں اس ترکیب کو دہراتے ہیں۔ سامانہ کے خطیب نے خلفائے راشدین کا نام خطبہ میں نہ لیا تو حضرت کی رگ فاروقی حرکت میں آئی .... اس طرح کے اور موقع کئی تھے۔ یہ رگ فاروقی ایک بڑی خوبی ہے اور جس وقت

فی الحقیقت اسلام خطرے میں ہو، اس سے بڑھ کر کوئی خوبی نہیں، لیکن شدت احساس میں واقعات کو صاف اور ان کی اصلی صورت میں دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اور گاہے گاہے انسان صحیح قرآنی اور فلاح قومی کی راہ سے دور جا پڑتا ہے ہم غیر مسلموں کی نسبت حضرت مجدد کے خیالات نقل کر چکے ہیں۔ شیعوں کی نسبت بھی ان کی رائے اسی طرح انتہا پسندانہ تھی، وہ انہیں کافر سمجھتے تھے ....."

شاہ ولی اللہ کے ضمن میں مصنف لکھتے ہیں:۔ "سرہند سے بے شک ایک تحریک اٹھی تھی، جس نے کئی مخلص اور سمجھ دار ہستیوں کو متاثر کیا، لیکن یہ تحریک تجدیدی تھی، اصلاحی نہ تھی۔ اس کی بنیاد اپنی فوقیت کے احساس اور اغیار سے نفرت اور عداوت پر تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا اس کا مقصد نہ تھا۔ اور پھر اس تحریک میں مفید ہونے کی جتنی صلاحیت تھی، اس کا راستہ واقعات نے بند کر دیا۔ مشائخیت روحانیت پر غالب آگئی اور تجدیدی تحریک قیومیت کے سراب میں گم ہو گئی ....."

حضرت مجدد نے ابن عربی کے وحدت الوجود کے جواب میں وحدت الشہود کا تصور پیش کیا تھا۔ اول الذکر میں خلق اور خالق کی غیریت پر اتنا زور نہیں دیا جاتا۔ جتنا آخر الذکر میں، اسی لئے وحدت الوجود کا عملی نتیجہ مشرب صلح کل ہے اور اس کے برعکس وحدت الشہود سے ایک خاص گروہ کی برتری کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ ایک میں جمالی رنگ نمایاں ہے دوسرے میں جلالی۔ حضرت مجدد نے سلسلۂ نقشبندیہ کو وحدت الشہود کا تصور دے کر جس رنگ میں رنگا، اس کے بارے میں شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:۔ "خواجہ باقی باللہ کا طریقہ نقشبندیہ باقویہ۔ اس میں جمالی رنگ زیادہ نمایاں تھا۔ اور اصل زور تزکیۂ نفس اور اصلاح حال پر تھا سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں جلالی شان غالب تھی۔ اس کا طریقہ کار احیائی تھا۔"

اسی سلسلہ میں آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں:۔ "خاص طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت کے علاوہ حضرت مجدد کی تعلیمات ہونے کا ایک بڑا نتیجہ احیائی اور شرعی زندگی کا غلبہ تھا، جو آہستہ آہستہ اسلام میں ظاہر ہوا۔ نقشبندی سلسلہ جسے ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ لائے اور بعد میں ان کے مرید حضرت مجدد نے اسے غیر معمولی وسعت و استحکام دیا، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کا اصل مولد و وطن ترکستان یعنی ماوراء النہر تھا جو مشتمل تھا بخارا، سمرقند، تاشقند، خیوہ اور کاشغر وغیرہ کے علاقوں پر چنگیز خاں اور ہلاکو کی تباہ کاریوں کے بعد ان علاقوں

ہیں ترکمانوں کا جنہیں عام طور سے تورانی کہا جاتا تھا، عروج ہوا، اور ایک بار یہ تیمور کی زیر قیادت دہلی سے اناطولیہ تک کے سارے ملک روندتے چلے گئے، اور اس کے بعد بابر فرغانہ سے کابل آتا ہے اور وہاں سے ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد رکھتا ہے بابر کے ساتھ ظاہر ہے اس کے اہل وطن کی ایک بڑی جمعیت آئی ہوگی۔

بابر سے لیکر مغل حکومت کے اواخر تک ترکستان سے آنے والوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ قاضی عبدالغفار حکیم اجمل خاں کے سوانح حیات میں جن کے مورث اعلیٰ بابر کے ساتھ ۱۵۲۶ء کے لگ بھگ ہندوستان آئے لکھتے ہیں۔

"جب وسط ایشیا سے سمرقند و بخارا کے یہ دل بادل دہلی کی طرف امنڈ رہے تھے تو ان کے ساتھ ساتھ اس ملک کے لاکھوں سپاہی اور اہل لشکر جن میں ترکان تیموری اور اس ولایت کے ہزارہا خوانین اور سردار بھی شامل تھے، اپنی تہذیب و تمدن کا سرمایہ لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اس ہنگامہ خیز عہد میں جب سمرقند سے دلی اور دلی سے دکن و گجرات و بنگال تک ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا ساز و سامان تیار ہو رہا تھا۔ خدا جانے ہندوستان میں کتنے مشاہیر وقت علماء، فضلاء، سپاہی اور مفکر بابر کے ہم رکاب آئے"

ترکستان سے ان آنے والوں میں اکثر و بیشتر نقشبندی سلسلے کے بزرگوں سے متاثر تھے اور یہ سلسلہ کافی مقبول تھا۔ اور ایک عرصے سے چلا آرہا تھا۔ حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند خواجگان نقشبند کے سرخیل ہیں[1]۔ مولانا سندھی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تیمور کو آپ کے ساتھ ربط تھا[2]۔ اسی سلسلے کے ایک بزرگ خواجہ عبیداللہ احرار تھے، جو مولانا چرخی کے مرید تھے، اور وہ حضرت نقشبند سے فیض یافتہ تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ ان کے ذکر میں لکھتا ہے۔ "ماوراءالنہر اور خراسان کے باشندے آپ کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے اور

---

[1] سفینۃ الاولیاء از شہزادہ دارا شکوہ

[2] بعض لوگ تیمور کا ایک خواب نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندوستان پر حملہ کرنے سے اس کا مقصد کفر و شرک کی بیخ کنی تھا۔ وہ "خراسان کے خوشامدی لوگوں کی باتوں میں آکر اپنے آپ کو مجدد بھی یقین کرنے لگا تھا" (آئینہ حقیقت نما از شاہ اکبر خاں نجیب آبادی) - آب کوثر

سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ آپ سے بے شمار کرامات کا ظہور ہوا ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی آپ کے عقیدت کیش اور ارادت مند تھے۔[1]

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار ملکی سیاسیات میں بھی حصہ لیتے تھے۔ کتاب "مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ کو ترویج شریعت و تمدید ملت کے لئے سلاطین سے اختلاط پیدا کرنے کا حکم ہوا۔ آپ والی سمرقند مرزا عبداللہ سے ملاقات کو گئے۔ اس کے مصاحبین نے آپ کو ملنے نہ دیا اور آپ کے ساتھ حقارت سے پیش آئے، آپ اسی روز متوجہ تاشقند ہو گئے۔ ایک ماہ بعد سلطان ابو سعید مرزا والی سمرقند عبداللہ پر حملہ آور ہوا اور اسے قتل کر کے سمرقند پر قابض ہو گیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ مرزا موصوف آپ کے پاس تاشقند میں حاضر ہوا تھا۔ اور آپ کی توجہ سے اس کے پاس بہت سا لشکر جمع ہو گیا اور اس نے سمرقند فتح کیا۔ اس کے بعد مرزا بابر (بابر) سمرقند پر حملہ آور ہوتا ہے اور محض حضرت خواجہ کی برکت سے اس کا حملہ ناکام رہتا ہے۔ اور اسے مرزا ابو سعید سے صلح کرنی پڑتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف حضرت خواجہ کا یہ قول نقل کرتا ہے۔

فرمایا کہ اگر میں پیری کروں تو اس زمانے میں کسی پیر کو مرید نہ ملے لیکن میرے سپرد اور ہی کام کیا ہے وہ مسلمانوں کو ظالموں کے شر سے محفوظ رکھوں اور شریعت کو رواج دوں اور اسی وجہ سے تسخیر سلاطین کرتا ہوں۔ فرمایا اللہ تعالےٰ نے مجھ کو اس قدر قوت عطا فرمائی ہے کہ اگر بادشاہ ختا کو ایک رقعہ لکھ بھیجوں تو ترک سلطنت کر کے سر و پا برہنہ میرے آستانہ پر حاضر ہو، مگر میں بلا فرمان الٰہی خود نہیں کرتا ہوں۔

---

[1] "اس وقت کتاب تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ العالی نے ظہیرالدین بابر پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں بابر کے باپ کا ایک واقعہ درج ہے۔ کہ حضرت عبیداللہ احرار کی مجلس میں ایک دن حاضر ہوا اور نوکیلی ہڈی پر اتفاق سے بیٹھ گیا۔ گھنٹوں یہ ہڈی چبھتی رہی لیکن ادباً اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔"

(تذکرہ شاہ ولی اللہ از مولانا مناظر احسن گیلانی)

اور ادب بھی یہی ہے کہ اپنے ارادے کو اللہ تعالٰے کے ارادے کے تابع کرے، نہ کہ اللہ تعالٰے کے ارادے کو اپنے ارادے کے تابع کرے۔[۱]

خواجہ عبید اللہ احرار کے مرید کے مرید مولانا خواجہ امکنگی ہیں، جن سے خواجہ باقی باللہ حضرت امام ربانی کے مرشد کو انتساب تھا۔ "مشائخ نقشبندیہ مجددیہ" میں ہے کہ عبداللہ خاں والی توران نے مولانا امکنگی کو خواب میں رسول مقبول علیہ الصلوۃ والسلام کے دربار میں دیکھا اور یہ کہ آپ نے ایک شمشیر مولانا موصوف کے ہاتھ عبداللہ خاں کو بھیجی چنانچہ صبح کو وہ مولانا کی خدمت حاضر ہوا، اور پھر برابر حاضری دیتا رہا۔ اسی کتاب میں ہے کہ ایک دفعہ سمرقند پر ایک بادشاہ بڑی فوج لے کر چڑھ آیا، لیکن آپ کی دعا و ہمت سے اسے شکست ہوئی۔

بقول مولانا عبید اللہ سندھی، خواجہ عبید اللہ احرار جن کا مولوی جامی اس طرح تعارف کراتے ہیں۔

چو فقر اندر قبائے شاہی آمد بتدبیر عبید اللہی آمد

ان کے اتباع میں سے خواجہ محمد باقی باللہ خاص ہدایتوں کے ساتھ دلی آتے ہیں اور یہ اکبر اعظم کا دور تھا۔[۲] آپ ترکستان سے لاہور آئے۔ ایک سال تک قیام فرمایا۔ تمام علماء و فضلاء آپ کے شیفتہ ہوگئے۔ بعد ازاں دہلی روانہ ہوئے اور وہاں قلعہ فیروزی میں سکونت اختیار کی۔

خواجہ باقی باللہ کو اگرچہ ہندوستان میں چار پانچ سال سے زیادہ رہنا نصیب نہیں ہوا۔ لیکن جس طرح

---

[۱] مشائخ نقشبندیہ مجددیہ از مولوی محمد حسن نقشبندی

[۲] آپ کو مولانا خواجگی امکنگی رحمتہ اللہ علیہ کی غلامی نصیب ہوئی۔ آپ کو وہ خلوت میں لے جا کر تین دن پے در پے توجہ دیتے رہے، ۔۔۔ یہاں تک آپ کی تکمیل ہوگئی ایک دن مولانا نے فرمایا۔ بابا باقی باللہ! تم اب بلاد ہند میں جاؤ۔ وہاں تم سے اس طریقۂ عالیہ نقشبندیہ کی رونق ظاہر ہوگی۔۔۔۔۔"

(گلزار اولیا از سید عبداللہ شاہ)

اس مختصر سے عرصے میں سلطنت کے بڑے بڑے امراء ان سے متعارف ہو گئے اور وہ خانقاہ کے مصارف کے لئے گراں رقمیں بطور نذرانہ دینے لگے [1] پھر خواجہ باقی باللہ جیسے ان امراء کا اپنے مرید امام ربانی سے تعارف کرا گئے۔ اس سے بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کے حکمراں طبقوں میں نقشبندیہ سلسلے کی جڑیں کافی دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان پر اس کا بڑا اثر تھا۔ نیز خود اکبر کے آخری زمانے ہی میں یہ امرا سلطنت میں کافی دخیل ہو گئے تھے۔ اکبر کے بعد تو ان کا عمل دخل برابر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ عالمگیر انہیں کی مدد سے دارا شکوہ پر غالب آیا اور کلیتہً سلطنت کی پالیسی ان کے رجحانات کے مطابق بن گئی اکبر کے بعد جہانگیر، شاہ جہاں اور عالمگیر کی پالیسیاں جس طرح بتدریج بدلتی چلی گئیں۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ کاروبار سلطنت میں ان تورانی [2] امراء کا جنہیں عالمگیر "برادران ہمشہری بزرگان مانند" کہتا ہے بڑا اثر و رسوخ تھا۔

خواجہ باقی باللہ کابل میں پیدا ہوئے تھے، اور علوم و معارف کی تکمیل انہوں نے ماوراء النہر میں کی تھی آپ کے بعد حضرت مجدد الف ثانی کے مرید اور خلفاء گو ہندوستان میں تو تھے۔ لیکن ہندوستان سے باہر افغانستان اور ترکستان میں بھی ان کا سلسلہ دور تک پھیل چکا تھا۔ اب اکبر کے بعد ایران کے علاوہ اسلامی دنیا کے یہی دو خطے تھے، جہاں سے تیغ زنوں سے لے کر ارباب علم و قلم تک اپنی قسمت آزمانے کے لئے بڑی کافی تعداد میں

---

[1] "نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید اور خواجہ (حضرت باقی باللہ) کے تعلقات کچھ اس قسم کے تھے کہ حضرت خواجہ کی زندگی میں ہی نکتہ چین کہتے تھے کہ حضرت خواجہ کی کامیابی شیخ فرید کی وجہ سے ہے" (رود کوثر) حضرت مجدد الف ثانی بھی شیخ فرید کے نام اپنے مکتوبات میں حضرت خواجہ کا حوالہ دیا ہے ایک خط میں شیخ فرید کو لکھتے ہیں "حضرت قبلہ گاہی قدس سرہ (یعنی حضرت خواجہ باقی باللہ) فرمایا کرتے تھے کہ شیخ جیو (شیخ فرید) کے حقوق تم سب پر ثابت اور مقرر ہیں۔ اس جمعیت کا باعث آپ ہی ہیں" (رود کوثر)

عبدالرحیم خانخاناں، صدر جہاں، قلیچ خاں اور کئی ایک دوسرے نامور افراد بھی حضرت خواجہ سے ارادت رکھتے تھے۔

[2] ابوالفضل کے قتل کے بعد اکبر کے سب سے زیادہ حاضر باش اور معتمد شیخ فرید ہی تھے (باقی حاشیہ صفحہ

ہندوستان کا رخ کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ خواہ نقشبندی طریقے سے عملاً منسلک نہ بھی ہوتے لیکن عام طور سے جن عقائد، خیالات اور رجحانات کے وہ حامل ہوتے تھے وہ زیادہ تر وہی تھے جن کی نمائندگی اُس دور میں حضرت مجدد الف ثانی اور ان سے منتسب اہل معرفت کرتے تھے[۳]۔ غرض ہندوستان میں پہلے سے اس خیال کے جو حکمران مسلمان طبقے تھے وہ، اور افغانستان اور افغانستان سے اُدھر ماوراالنہر سے آنے والے یہ نووارد طبقے تھے، جن کی وجہ سے اسلامی برصغیر میں وہ ذہنی فضا اور جذباتی ماحول وجود میں آیا، جس میں اُس وقت بھی حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی دعوت زیادہ مقبول تھی اور آج بھی ہے، اور جہاں وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود کا تصور زیادہ دل کش اور ولولہ خیز ہے۔ کیونکہ عملاً یہ منتج ہوتا ہے اسلام کی سیاسی حاکمیت اور مسلمانوں کی بحیثیت مسلمان کے جماعتی برتری وسیادت پر، اور ظاہر ہے یہ چیز ہر مسلمان کو بہت اپیل کرتی ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ اس نقطہ نظر والوں کے نزدیک حقیقی اسلام صرف ان کے فرقے تک محدود ہو اور سچے مسلمان وہ صرف اپنے گروہ والوں کو ہی سمجھیں۔ بہر حال یہ اسلام کی شان جلالی ہے اور اگرچہ علامہ اقبال نے بہت عرصہ پہلے یہ فرمایا تھا کہ

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

(بقیہ حاشیہ) اور انہیں ہر قسم کے فرائض سپرد ہوتے تھے۔ خسرو کے بجائے جہانگیر کو بادشاہ بنانے میں بھی ان کے بڑا ہاتھ تھا۔ عہد جہانگیری میں شیخ کا مرتبہ بہت بڑھ گیا اور وہ اپنے ساتھیوں بلکہ تمام اعیان سلطنت سے بازی لے گئے"۔ (رود کوثر)

۳؎ شاہ ولی اللہ صاحب تصوف کے مختلف طریقوں کی نسبتیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "طریقہ نقشبندیہ بمنزلہ جوئے است کہ پیوستہ ظاہر می رود ومتوسل ایں طریقہ مظہر اسم قوی ومقتدا است درمیان عالم ناسوت" (ہمعات)

ترجمہ۔ طریقہ نقشبندیہ کی مثال ایک ندی کی ہے (جو ظاہرا طور پر برابر بہی جاری ہے۔ اس طریقے سے تعلق رکھنے والا اس مادی عالم میں اسم قوی اور مقتدا کا مظہر ہوتا ہے۔

لیکن مسلمان ذہن کے لئے زیادہ جاذب اب بھی اسلام کی یہی شان جلالی ہی ہے ۔

ابن عربی وحدت الوجود کے قائل تھے ۔ اس کی وجہ سے دوسرے مذہبوں کی نسبت ان کا جو طرز عمل تھا اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے ۔

آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا، میں اس کا انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا۔

لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے ۔ وہ ایک چراگاہ بن گیا ہے غزالوں کی، دیر راہبوں کا، اور آتش کدہ آتش پرستوں کا اور کعبہ حاجیوں کے لئے'' اور وہ الواح ہے تورات کی اور صحیفہ ہے قرآن کا، میں اب مذہب عشق کا پرستار ہوں ۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی چاہے مجھے لے جائے ۔ میرا دین بھی عشق ہے، میرا ایمان بھی عشق ہے ۔ (ترجمہ)

حضرت مجدد وحدت الشہود کے حامل تھے ۔ دوسرے مذاہب کی نسبت ان کا جو خیال تھا اس کا اندازہ اس مکتوب سے ہو سکتا ہے، جو انہوں نے ایک ہندو ہردے رام کو لکھا اور جس میں رام اور رحمان کو ایک سمجھنے کی بڑی خفگی سے تردید کی تھی ۔

غرض کہ صوفیائے کرام کی مقدس جماعت نے ہند پاکستان میں اشاعت اسلام کی پوری پوری کوشش اور ان کی مساعی جمیلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہند پاکستان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس ملک کے رہنے والے تھے اور پھر مشرف بہ اسلام ہوئے ۔

کاش مسلم سلاطین، علماء امراء، سپہ سالار نیز دوسرے بااثر طبقے کے لوگ اشاعت اسلام میں پورا حصہ لیتے تو برصغیر کا سیاسی نقشہ ہی اور ہوتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہند پاکستان کی جن قوموں، قبیلوں اور برادریوں نے اسلام قبول کیا تھا، ان کی تعلیم و تربیت اور فلاح و بہبود کا پورا پورا حق ادا نہیں ہوا، بلکہ بعض اوقات تو معاشرے میں دوسرے درجہ پر ان کا شمار ہوا، اگرچہ یہ بات اسلامی تعلیم اور اصولوں کے سراسر خلاف ہے ۔''

(مخدوم جہانیاں جہاں گشت - از محمد ایوب قادری)

ایک تعلیمی سند[1]

حضرت شاہ ولی اللہؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم - سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جس کی نعمت سے اچھائیاں اتمام پاتی ہیں اور جس کے فضل وکرم پر تمام حالات میں تکیہ کیا جاتا ہے اور افضل ترین درود وسلام پہنچے ہمارے آقا محمدؐ سیّد مخلوقات کو، نیز آپؐ کی آل، آپؐ کے اصحاب اور ان سب مومنین اور مومنات کو جنہوں نے ان کی خلوص دل سے متابعت کی۔

اما بعد۔ رب کریم کی رحمت کا یہ محتاج احمد المدعو بہ ولی اللہ بن عبدالرحیم (اللہ تعالیٰ اسے سلف صالحین کے

---

[1] پنجاب کے کسی عالم کو جن کا نام شیخ جاراللہ بن عبدالرحیم ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے یہ تحریری سند یا "ڈگری" (اجازہ) عطا فرمائی تھی۔ اصل سند عربی میں ہے اور المسوّی کے مکہ معظمہ کے مطبوعہ نسخے میں شائع کی گئی ہے۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا حاشیہ ملاحظہ ہو:۔

اس اجازہ (سند اور ڈگری) کا یہ نسخہ العبد الحمید مولانا محمد اسحاق الدھلوی کے وارثوں سے الشیخ عبدالستار الکتبی الہندی کے ہاتھ لگا۔ آخر الذکر ممتاز محدثین اور حرم مکی کے اساتذہ حدیث میں سے ہیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ اجازہ کا یہ نسخہ خود اجازہ دینے والے یعنی امام ولی اللہ دہلوی کے قلم سے ہے۔ باقی حقیقت حال سے اللہ زیادہ باخبر ہے۔

عبیداللہ بن الاسلام السندھی ثم الدھلوی الدیوبندی

ساتھ شامل کرے) لکھتا ہے کہ اللہ کے راستے میں میرا یہ نیک بخت بھائی شیخ جاراللہ بن عبدالرحیم، جو اہل پنجاب میں سے ہے، اور کتاب اللہ کی قرأت اور تجوید سے بہرہ ور ہے اور سنت رسول اللہ کا ایک کافی حصہ اخذ کیا ہے، قریباً چھ سال میرے ساتھ رہا اس نے مجھ سے اس مدت میں حفص بن عاصم کی روایت سے قرآن مجید پڑھا۔ اور اس ضمن میں قرآن مجید کے غیر مانوس الفاظ، اس کے معانی اور شان نزول کے بارے میں اسے جو مشکلات پیش آئیں۔ ان کے متعلق اس نے بحث و تمحیص کی۔ میں نے بغیر کسی تفسیر کی طرف رجوع کیے اپنے حافظے سے جو کچھ اسے بتانا تھا، بتایا۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہا جب تک قرآن مجید ختم نہیں ہوگیا۔ شیخ جاراللہ بن عبدالرحیم نے مجھ سے تفسیر بیضاوی کے شروع کے بعض حصے سنے اس نے مجھ سے سورۂ بنی اسرائیل سے لے کر سورہ الاحزاب کے حصے پڑھے۔ اور تفسیر الجلالین سورۂ یونس سے سورہ الکہف تک مجھ سے پڑھی۔ نیز مجھ سے صحیح البخاری اول سے لے کر کتاب التفسیر تک پڑھی اور اس کے بعض حصے مجھ سے سنے اسی طرح صحیح مسلم اول سے لے کر کتاب البیوع تک اور اس کے آخر کے حصے مجھ سے سنے سنن ابوداؤد اول سے لے کر کتاب الجہاد تک اور جامع الترمذی اول سے لے کر آخر تک مجھ سے پڑھی۔ سنن نسائی اول سے لے کر آخر تک مجھ سے سنی۔ اسی طرح سنن ابن ماجہ اول سے آخر تک مجھ سے پڑھی۔ مسند الدارمی کے مجھ سے اول کے دو تہائی حصے سنے اور آخر کا ایک تہائی مجھ سے پڑھا۔ نیز مجھ سے مسند امام احمد اور مسند عبداللہ بن عمر وغیرہ کا ایک حصہ پڑھا اور مشکوٰۃ کا ایک حصہ اور مصابیح کا ایک حصہ مجھ سے سنا۔ اسی طرح مجھ سے الترمذی کی شمائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور الحصن الحصین پوری کی پوری پڑھی۔ موصوف نے مجھ سے بعض میری کتابیں اور رسالے بھی پڑھے، جو میں نے مختلف علوم کے متعلق تالیف کیے ہیں ان میں سے ایک احادیث الموطا پر مشتمل "المسوی" ہے، جو اس نے اول سے آخر تک مجھ سے پڑھا۔ اور آثار الموطاء اور اس کی احادیث کے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تک اپنا سلسلہ اسناد ملایا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اکثر مباحث فقہی سے واقفیت بہم کی۔

میری کتابوں اور رسالوں میں سے جو اس نے مجھ سے پڑھے، ایک حجۃ اللہ البالغۃ بھی ہے، جو علم اسرار شریعت کے بارے میں ہے۔ نیز مجھ سے "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف"۔ "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" نقشبندیہ، گیلانیہ اور چشتیہ، ان تین طریقوں کے اشغال کے بارے میں "القول الجمیل" پڑھی۔ اسی طرح

حدیث نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر المسلسلات اور سلسلہ صحابہ میں النخبۃ اور علم اصول تفسیر میں الفوز الکبیر پڑھی

موصوف نے مجھ سے باقی فنون میں سے بھی جو کچھ کہ اس سے میسّر ہو سکا، پڑھا اور سنا، جیسے فقہ حنفی میں الہدایۃ کے بعض حصّے، علم الکلام میں شرح المواقف کے بعض اجزا، علم اصول حدیث میں النخبۃ اور اس کے مصنف کی شرح اور اسناد میں شیخ ابراہیم کردی مدنی کی کتاب الامم۔ اس نے مجھ سے تصوف میں عوارف المعارف از اوّل تا آخر پڑھی۔ احیاء علوم الدین کے شروع کے بعض حصّے پڑھے اور اس کے علاوہ اور بھی کتابیں پڑھیں جنہیں ان اوراق میں گنانا ممکن نہیں۔

مختصراً جو کچھ اس نے مجھ سے پڑھا یا مجھ سے سنا اور وہ سب جس کی کہ مجھ تک صحیح صحیح روایت پہنچی ہے۔ میں نے اسے پڑھانے کی اجازت دی۔ نیز میں نے اسے خرقۂ فقر پہنایا۔ کھجور[1] اور پانی سے اس کی ضیافت کی۔ اس سے معانقہ کیا اور اسے اشغال صوفیہ کی تلقین کی، جو اس نے مجھ سے اخذ کئے تھے۔ اور خرقۂ فقر پہنانے کی اجازت دی۔

میں اس کے حق میں، اللہ کے لئے، اللہ کے دین کے لئے، اللہ کو گواہ بناتا ہوں کہ وہ مرد صالح ہے۔ دنیا سے اعراض کرنے والا اور نیک اعمال برابر کرنے والا ہے۔ اور اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم حاصل کیا جائے۔ اور یہ جو ہم نے کہا ہے، اللہ اس کا نگہبان و وکیل ہے۔

میں نے اسے یہ بھی بتایا ہے کہ علمائے متاخرین میں یہ جو سات علماء ہیں، جن میں سے ہر ایک اسناد میں مستحکم مقام رکھتا ہے، میں نے ان سے ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کی روایت کرنے کی اجازت لی ہے، اور اس کے لئے میں تعریف کرتا ہوں اللہ کی جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ سات علماء یہ ہیں۔

الشیخ عیسیٰ المغربی اور ان کی کتاب مقالید الاسانید۔ اور ایک کتاب اور ہے۔ جس میں البابلی کی اسناد ہیں۔

---

[1] ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث بیان فرمائی اور اس سے پہلے ان کو کھجور کھانے کو دی اور پانی پلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ضیافت کے متعلق تھی۔ (مترجم)

الشیخ ابراہیم کردی اور ان کی کتاب الامم ۔ الحسن العجیمی کی کتاب الاشاد ۔ محمد بن محمد بن سلیمان الردانی کی کتاب صلۃ الخلف، الشیخ احمد النخلی کا رسالہ اور الشیخ عبداللہ البصری کا رسالہ

میں نے یہ سطور اوائل ۱۱۵۳ھ کے ماہ محرم کی اکیس تاریخ کو جمعہ کے دن لکھیں۔

راقم فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم، جسے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے۔ دعا کرتا ہے کہ اس دنیا اور دوسری دنیا میں اللہ تعالیٰ اس کا حامی و ناصر ہو، اور سب تعریف ہے اللہ کے لئے اوّل میں اور آخر میں اور ظاہراً و باطناً۔

تصوف میں ہمارا سلسلۂ صحبت اور طریقت و سلوک کے آداب میں ہمارے اخذِ علم کا واسطہ صحیح، مشہور اور متصل روایت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جاتا ہے، گو تصوف کے ان مخصوص آداب اور اشغال کا تعین آپ سے ثابت نہیں۔ اس بندۂ ضعیف ولی اللہ نے خدا اسے مغفرت عطا کرے اور اسے اس کے پیش رو صالحین سے ملائے، اپنے والد شیخ اجلّ عبدالرحیم کی صحبت سے، اللہ ان سے راضی ہو، اور ان کو راضی رکھے، ایک طویل مدت تک فیض حاصل کیا۔ اور ان سے میں نے ظاہری علوم پڑھے اور طریقت کے آداب سیکھے .....

باقی رہی علوم ظاہری کی تحصیل، میں نے تفسیر حدیث فقہ عقائد نحو صرف کلام اصول اور منطق وغیرہ علوم اپنے والد سے پڑھے۔ انہوں نے ان علوم کی چھوٹی کتابیں تو اپنے بھائی ابوالرضا محمدؒ سے پڑھیں اور بڑی کتابیں امیر زاہد ہروی سے جو مشہور حواشی کے مصنف ہیں، پڑھیں۔ انہوں نے مرزا فاضل سے، انہوں نے ملّا یوسف کوسج سے، انہوں نے مرزا جان وغیرہ سے، انہوں نے مشہور محقق جلال الدین دوّانی سے، انہوں نے اپنے والد اسعد وغیرہ سے، اور انہوں نے علامہ تفتازانی اور علامہ شریف جرجانی کے شاگردوں سے پڑھا۔

حدیث میں مشکواۃ المصابیح، صحیح بخاری اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں کی اجازت ثقہ اور مستند عالم حاجی محمد افضل نے مجھے عطا فرمائی .....

(از القول الجمیل مصنفہ شاہ ولی اللہؒ)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

علامۃ الشام الشیخ محمد بہجۃ البیطار[1]

یہ میری حدِّ وسعت سے باہر ہے کہ میں علامۃ الشرق امام احمد المعروف بہ ابن تیمیہ حرّانی دمشقی کے علمی کمالات کا احاطہ کر سکوں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں اپنے علم اور اصلاحی کوششوں کے ذریعہ تمام دنیا پر چھا گئے۔ ان کی اعلائے کلمۃ الحق اور جہاد کی دعوت سے کون و مکان گونج اٹھے۔ ان کے علوم قافلوں کے ذریعہ دور دور تک پہنچے اور ان کی عادات و شمائل اور ان کے اخلاق و اعمال کی خوشبو نے فضاؤں کو معطر کر دیا امام ابن تیمیہ کی بدولت دمشق کی سرزمین میں اصلاح کا ایک ایسا درخت لگا، جو آگے چل کر بڑا بار آور ہوا۔ اس کے آسمان سے درخشاں سنت کا وہ آفتاب ابھرا، جس نے سب کو روشن کر دیا اور اس دمشق کے اطراف میں ایک ایسی صدائے حق بلند ہوئی، جس سے بدعات و توہمات کے لشکر گھبرا اٹھے۔ اس وقت میرے پیش نظر اس عظیم نابغہ (جینیس) کے بارے میں، جو کچھ کہا گیا ہے، اسے پورے کا پورا بیان کرنا نہیں۔ میرا مقصد یہاں ان کی علمی خدمات کے انوار سے نور کی ایک شعاع اخذ کرنا ہے، جو ہمارے لئے علمی زندگی کی راہ روشن کر سکے۔

---

[1] علامۃ الشام الشیخ محمد بہجۃ البیطار۔ موصوف نے اس موضوع پر دمشق کے مجمع علمی عربی کے ہال میں لیکچر (محاضرہ) دیا تھا۔ پھر نظر ثانی اور اضافے کے بعد اپنی کتاب "حیاۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ" میں شامل کیا ہے۔ یہ مضمون اسی باب کا اردو میں خلاصہ ہے۔

(مدیر)

امام ابن تیمیہ ۶۶۱ھ دس ربیع الاول پیر کے دن حرّان[1] میں پیدا ہوئے۔ جب اس شہر پر تاتاریوں نے قبضہ کیا تو آپ کے والد محترم آپ کو اور آپ کے بھائیوں کو ساتھ لے کر دمشق آ گئے۔ یہ ۶۶۷ھ کا واقعہ ہے۔ ابن تیمیہ نے فقہ اور اصول فقہ کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ اس کے علاوہ دوسرے بہت سے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ آپ نے عربی ادب ابن عبد القوی سے پڑھا۔ پھر نحو میں کتاب سیبویہ پڑھی، اور اس کو خوب سمجھا۔ اور اس پر غور و خوض کیا۔ تحصیل حدیث کا اہتمام فرمایا اور صحاح ستّہ اور مسند کئی بار اساتذہ سے سنی آپ قرآن کریم کی تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اصول فقہ، فرائض، حساب جبرو مقابلہ اور دوسرے علوم میں پختہ ہوئے۔ کلام اور فلسفہ میں غور و خوض کیا۔ ان میں وہ خود ان کے اصحاب پر بازی لے گئے، اور ان کے جو بڑے اکابر تھے، ان کا رد کیا۔ ابھی آپ بیس سال کے بھی نہیں تھے فتوے اور درس دینے کے قابل ہو گئے اور علم حدیث میں عبور حاصل کر لیا۔ اور اتنی احادیث حفظ کیں کہ آپ کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ہر وہ حدیث جسے ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت سے امام ابن تیمیہ کو مطالعہ کے لئے بہت سی کتابیں ملیں۔ اور انہیں جلد حفظ کرنے اور ادراک و فہم کی قوت بھی عطا ہوئی۔ آپ جس چیز کو ایک بار یاد کر لیتے، پھر وہ بھولتی نہیں تھی امام صاحب نے بہت سے علوم پر کثیر التعداد کتابیں لکھیں۔ تفسیر، فقہ، اصول فقہ، حدیث، کلام اور ارباب بدعات کی تردید، ان سب علوم پر آپ کی تصنیفات ہیں۔ آپ کے مفصل فتاویٰ ہیں، جن میں مشکل مسائل کے حل پیش کئے گئے ہیں۔ حافظ الذہبی کا بیان ہے کہ امام صاحب کی تصانیف کی مجموعی تعداد پانچسو تک پہنچتی ہے آپ ہی کا کہنا ہے کہ امام صاحب کی نشو و نما نیکی و پرہیزگاری اور خدا پرستی و عبادت کی فضا میں ہوئی۔ آپ کا کھانا اور لباس بڑا سادہ ہوتا تھا۔ آپ کم عمر ہی تھے کہ مدارس اور مجالس میں شریک ہوتے۔ بڑوں سے مناظرے کرتے اور انہیں لاجواب کر دیتے۔ اور اس بارے میں آپ سے ایسی باتوں کا اظہار ہوتا کہ شہر میں جو بڑے بڑے اہل علم تھے، وہ حیران رہ جاتے۔ آپ انیس سال یا اس سے بھی

---

[1] شمالی عراق میں موصل سے مشرق کی طرف حرّان واقع ہے۔

کم کے تھے کہ آپ نے فتوے دینے شروع کر دیئے۔ اور اسی عمر میں آپ نے ترتیب و تالیف کے کام کا بھی آغاز کر دیا۔ آپ کی اکیس سال کی عمر تھی کہ آپ کے والد محترم کا، جو ممتاز حنبلی ائمہ میں سے تھے انتقال ہو گیا۔ آپ ان کے جانشین ہوئے، اور ان کے فرائض منصبی ادا کرنے لگے۔ اسی وقت سے آپ کا شہرہ بلند ہونا شروع ہو گیا اور دور دور تک آپ کا نام پہنچا،

امام ابن تیمیہ کے مناقب کے بیان میں بہت سے جلیل القدر علماء نے کتابیں لکھی ہیں۔ حافظ المزی کا قول ہے کہ نہ میں نے امام ابن تیمیہ کی مثل کوئی دیکھا، نہ انہوں ہی نے اپنی مثل کوئی دیکھا تھا۔ اور نہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ؐ کی سنت کا زیادہ عالم اور ان سے زیادہ ان کی اطاعت کرنے والا پایا۔ قاضی ابو الفتح بن دقیق العید کہتے ہیں کہ جب میں ابن تیمیہ سے ملا تو میں نے انہیں ایک ایسا آدمی پایا کہ سب علوم اس کی نظروں کے سامنے ہیں وہ ان میں سے جو علم چاہتا ہے، لے لیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے، چھوڑ دیتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے خیال میں اللہ تعالےٰ مشکل ہی سے آپ جیسا پیدا کرے گا۔ شیخ ابراہیم الرقی کا قول ہے کہ تقی الدین (ابن تیمیہ) وہ بزرگ ہیں کہ ان سے استفادہ کیا جاتا ہے اور علوم میں ان کی تقلید ہوتی ہے۔ اگر ان کی عمر لمبی ہوتی تو وہ اپنے علم سے دنیا کو بھر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ حق پر تھے اور یہ ضروری تھا کہ لوگ ان کی مخالفت کرتے۔۔ کیونکہ علمِ نبوت کے وارث تھے قاضی القضاۃ ابن الحریری کہتے ہیں کہ اگر ابن تیمیہ شیخ الاسلام نہیں، تو پھر کون شیخ الاسلام ہو سکتا ہے آپ کے بارے میں علمائے نحو کے شیخ ابو حیان کا قول ہے کہ جب میں ان سے ملا تو میں نے پایا کہ ان جیسا شخص میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ آپ کی تعریف میں شیخ ابو حیان کے اشعار بھی ہیں۔

الحافظ زملکانی امام ابن تیمیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ آپ کو تصنیف و تالیف اور بیان و ترتیب میں حسن آفرینی کا ملکہ عطا ہوا تھا۔ اور اللہ تعالےٰ نے آپ کے لئے علوم یوں نرم کئے جیسے اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم کر دیا تھا۔ جب آپ سے ایک علم کے کسی خاص فن کے بارے میں پوچھا جاتا۔ اور آپ اس کا جواب دیتے تو دیکھنے والا اور سننے والا یوں محسوس کرتا کہ گویا آپ اس فن کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں اور وہ اس فیصلے پر پہنچتا کہ اس فن میں ان جیسا عالم کوئی نہیں۔ عماد الدین ابو العباس احمد بن ابراہیم الواسطی

آپ کے متعلق لکھتا ہے :۔ آپ خلفائے راشدین اور ہدایت یافتہ ائمہ کے نمونہ تھے۔ جن کی کہ سیرت کے نقوش دلوں سے محو ہو گئے تھے اور امت ان کے طریقے بھول گئی تھی۔ چنانچہ آپ انہی کے مٹے ہوئے راستے پر چلنے والے اور انہی کے اصول و قواعد کے محافظ تھے۔

قاضی القضاۃ ابوالحسن السبکی کا امام ابن تیمیہ کے بارے میں حافظ الذہبی کے نام ایک خط ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں :۔ باقی شیخ کے متعلق آپ کا قول۔ تو جہاں تک اس خاکسار کا تعلق ہے، وہ ان کی قدر و منزلت کی بڑائی، ان کے بحرِ علم کی گہرائی، علوم شرعی و عقلی میں ان کی وسعت، ان کی غیر معمولی ذہانت اور اجتہاد اور ان سب چیزوں میں ان کا اس مقام تک پہنچنا جس کا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، ان سب کا معترف ہے۔ اور یہ خاکسار ہمیشہ یہ کہتا رہا ہے میرے دل میں ان کی عزت اس سے بھی زیادہ ہے کیونکہ ان اوصاف کے علاوہ اللہ تعالےٰ نے انہیں تقویٰ و پرہیزگاری، زہد اور دین داری، حق کی حمایت اور صرف حق کی خاطر اس کو قائم کرنا۔ ان خوبیوں سے بھی سرفراز فرمایا۔ نیز وہ سلف کے طریقوں پر چلنے والے تھے۔ اور ان سے انہیں حصہ وافر ملا تھا۔ ان جیسا اس زمانے میں، بلکہ دوسرے زمانوں کا بھی شاذو نادر ہی ہوگا۔

ابن فضل اللہ العمری کہتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ کے پاس ہر سال بکثرت روپیہ آتا تھا۔ اور وہ سب کا سب حاجت مندوں پر صرف کر دیتے تھے اس ضمن میں ایک اور روایت ہے ایک ثقہ شخص بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن امام ابن تیمیہ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی آیا اور اس نے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے دیکھا کہ اس کو عمامے کی ضرورت ہے، آپ نے بغیر اس کے سوال کے، اپنا عمامہ سر سے اتارا۔ اس کے دو حصے کئے ایک حصہ اسے دے دیا اور ایک خود باندھ لیا۔ اور مجلس میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان کی وجہ سے جھجکے نہیں۔ ایک اور ثقہ شخص کی روایت ہے کہ امام صاحب شہر کی ایک گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ایک فقیر نے ان سے سوال کر دیا۔ امام صاحب نے محسوس کیا کہ وہ واقعی حاجت مند ہے، آپ کے پاس اس وقت کچھ نہیں تھا۔ آپ نے اپنے جسم سے ایک کپڑا اتارا، اسے دے دیا اور کہا کہ جاؤ اسے بازار میں بیچ لو۔ ساتھ ہی معذرت کی کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔

امام صاحب بڑے بہادر اور نڈر تھے۔ تاتاریوں کے سلطان قازان کے ساتھ آپ کی ملاقات کا

مشہور واقعہ ہے۔ الکواکب الدریہ میں شیخ کمال الدین کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ میں اس موقع پر شیخ کے ساتھ تھا آپ نے عدل کے متعلق سلطان کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی سنانی شروع کیں۔ آپ بڑی بلند آواز سے بول رہے تھے اور باتیں کرتے کرتے سلطان کے نزدیک ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ آپ کے گھٹنے سلطان کے گھٹنوں کو چھونے لگے تھے۔ اس دوران میں سلطان پوری طرح آپ کی طرف متوجہ تھا۔ اور جو کچھ آپ کہتے تھے، اسے سن رہا تھا۔ اس کی نظریں آپ کی طرف تھیں اور آپ سے ہٹتی نہیں تھیں۔ سلطان کے دل میں اللہ تعالےٰ نے شیخ کی جو محبت اور ہیبت ڈال دی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ پوچھنے لگا کہ یہ شیخ کون ہے میں نے اس جیسا اور اس سے بڑھ کر مضبوط دل والا کوئی نہیں دیکھا۔ نہ اس سے زیادہ کسی کی باتوں نے میرے دل پر اثر ڈالا ہے اور نہ میں نے اپنے آپ کو اس سے بڑھ کر کسی کا فرمانبردار و مطیع پایا ہے۔ چنانچہ سلطان کو آپ کے اور آپ کے علم و عمل کے بارے میں بتایا گیا۔ شیخ نے ترجمان سے کہا کہ سلطان قازان سے کہو کہ تم اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہو۔ اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور موذن ہیں۔ اور اس کے باوجود تم نے ہم پر حملہ کیا۔ تمہارا باپ اور تمہارا دادا دونوں کافر تھے۔ لیکن انہوں نے وہ نہیں کیا، جو تم نے کیا، انہوں نے عہد کیا، اور اسے نبھایا تم نے عہد کیا اور اس کی خلاف ورزی کی اور جو کچھ کہا، اسے پورا نہیں کیا۔ شیخ یہ سب کچھ کہہ کر سلطان کے ہاں سے بڑی عزت و احترام سے لوٹے اور ان کی وجہ سے ہی مسلمان قیدی رہا ہوئے۔ شیخ فرمایا کرتے تھے :۔ اللہ کے سوا دوسروں سے وہی ڈرتا ہے جس کے دل میں مرض ہوتا ہے۔

قاضی القضاۃ ابو العباس بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سب سلطان قازان کی مجلس میں پہنچے، تو ان کے سامنے کھانا چنا گیا۔ ابن تیمیہ کے سوا سب نے کھانا کھایا۔ سلطان نے پوچھا آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے آپ نے کہا کہ میں تمہارا کھانا کیسے کھاؤں جب کہ یہ سب کچھ تم نے لوگوں کا لوٹا ہے۔ اس کے بعد سلطان نے آپ سے دعا کرنے کے لئے کہا۔ آپ نے دعا کی اور کہا :۔ اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ اس لئے لڑا ہے کہ تیرا نام بلند ہو اور اس لئے تیری راہ میں جہاد کیا ہے تو اس کی مدد کر اور اسے کامیاب بنا۔ اور اگر یہ ملک، دنیا اور کثرت مال کے لئے لڑا ہے، تو اس سے نمٹ۔

الکبتی نے امام کی شجاعت کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے۔ کسی شخص نے آپ سے ایک حاکم قطلوبک کی

شکایت کی کہ اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ یہ قطلوبک بڑا جابر تھا۔ لوگوں کے مال زبردستی لے لیا کرتا تھا اور اس کے ظلم و ستم کی بڑی حکایتیں تھیں۔ شیخ اس قطلوبک کے پاس گئے اور اس معاملے میں اس سے بات کی۔ قطلوبک نے کہا۔ میں تو خود آپ کے پاس آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ آپ بڑے عالم اور زاہد ہیں۔ یہ بات اس نے دراصل تمسخر کے انداز میں کہی تھی۔ اس پر امام صاحب نے کہا۔ حضرت موسیٰؑ مجھ سے بہتر تھے اور فرعون تم سے زیادہ سرکش تھا۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ دن میں تین بار اس کے دروازے پر جایا کرتے تھے اور اس کے سامنے اسلام پیش کرتے تھے۔

ایک دفعہ جب امام صاحب نے تاتاریوں کو مسلمان قیدی رہا کرنے کو کہا، تو انہوں نے انہیں تو رہا کر دیا، لیکن جو شام و فلسطین سے انہوں نے عیسائی اور یہودی قیدی گرفتار کئے تھے، انہیں رہا نہ کیا، آپ نے کہا کہ یہ عیسائی اور یہودی ہمارے اہل ذمہ ہیں۔ اور تمہیں مسلمان قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی رہا کرنا ہوگا۔ چنانچہ امام صاحب نے انہیں بھی رہا کرایا۔

امام صاحب کی شجاعت کا ایک اور واقعہ ہے جو "الکواکب الدریہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ مصر و شام کے فرمانروا ملک ناصر سے آپ کے خلاف چغلیاں کی گئیں۔ چنانچہ اس نے آپ کو اپنے پاس بلوایا اور من جملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کی بہت سے لوگوں نے اطاعت کر لی ہے اور آپ کے دل میں ملک پر قبضہ کرنے کا خیال ہے آپ نے یہ سنا تو اس پر کسی تردد کا اظہار نہیں کیا اور بڑے اطمینان اور سکونِ قلب سے کہا اور اتنی بلند آواز سے کہا کہ مجلس میں جو لوگ بیٹھے تھے، انہوں نے بھی سن لیا۔ کیا میں یہ کروں گا؟ خدا کی قسم میرے نزدیک تیرے اور تیرے ساتھ مغلوں کے ملک دونوں کی ایک پیسے کی بھی حیثیت نہیں۔ اس پر سلطان مسکرایا۔ اللہ تعالےٰ نے امام صاحب کی اس کے دل میں اتنی ہیبت ڈال دی تھی کہ وہ کہنے لگا:۔ بے شک آپ سچ کہتے ہیں اور جس شخص نے آپ کے خلاف میرے پاس چغلی کی ہے، وہ جھوٹا ہے۔ غرض ملک ناصر کے دل میں امام صاحب کے لئے دینی محبت راسخ ہو گئی۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے پاس امام صاحب کے خلاف اتنی زیادہ باتیں پہنچائی گئی تھیں کہ وہ کبھی کا آپ کے خلاف اقدام کر چکا ہوتا۔

شیخ مرعی الکواکب میں لکھتے ہیں۔ اس دنیا میں ارباب فضل و دین میں سے کوئی ہی ہوگا جو امتحان و ابتلا سے

محفوظ رہا ہو۔ اور یہ اس لئے کہ ایسا شخص لوگوں سے دنیاداری نہیں کرتا اور نہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ سفیان ثوریؒ کا قول ہے جب تم کسی شخص کو پاؤ کہ اس کے ہمسائے اس کی تعریف کرتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ مداہنت کرنے والا ہے۔ شیخ مرعی کہتے ہیں:۔ ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد اور بخاری جیسے ائمہ کو جن ابتلاؤں سے دوچار ہونا پڑا، وہ معلوم و مشہور ہیں، اور ہم ان کو بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ابتلاؤں سے گزرنا پڑا۔ بہت سے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔ اور ان پر بدعات اور تجسیم کا الزام لگایا۔ حالانکہ وہ اس سے بری تھے سب سے پہلی ابتلا تو اس سوال کے جواب میں پیش آئی، جو حماۃ شہر سے آیا تھا۔ اور جسے العقیدہ الحمویہ الکبریٰ[1] کا نام دیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنے جواب میں مذہب متکلمین پر سخت تنقید کی تھی۔ اور مذہب سلف کو ترجیح دی تھی۔ اس ضمن میں آپ نے لکھا:۔ یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ سلف کا طریقہ بغیر غور و فکر کے محض قرآن و حدیث کے الفاظ پر ایمان لانا تھا، جیسا کہ ان پڑھوں (امیین) کا طریقہ ہے اور خلف کا طریقہ یہ ہے کہ تشبیہ و استعارہ اور نامانوس الفاظ کی تاویل کر کے نصوص سے معانی کا استخراج کیا جائے۔ اس طرح گمان کرنا بالکل غلط ہے اور یہ اس اعتقاد کا نتیجہ ہے کہ جس طرح عوام میں بھلے لوگ ہوتے ہیں، اسی طرح ہمارے ان پڑھ سلف تھے۔ وہ اللہ کے بارے میں علمی حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور نہ وہ علم الٰہیات کی باریکیوں کو سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس خلف فاضل لوگ ہیں اور انہوں نے ان سب امور میں کمال حاصل کیا ہے" امام صاحب نے اس غلط نقطہ نظر کی سخت مذمت کی اور اس کے اصحاب کی گمراہیاں واضح فرمائیں۔ اور بتایا کہ وہ خود کس اضطراب و تشویش میں زندگی گزارتے تھے۔

---

[1] اس سوال میں دریافت کیا گیا تھا کہ صفات و اعضاء و جوارح خداوندی اور عرش وغیرہ کے متعلق جتنی آیتیں اور حدیثیں آئی ہیں، ان کے ظاہری معنی لئے جائیں گے یا ان کی تاویل کی جائے گی۔۔۔۔ (آپ نے جواب میں کتاب و سنت ہی کے الفاظ کی پابندی کی اور آیتوں و حدیثوں کے الفاظ میں تاویل اور ردّ و بدل کرنے کو بالکل ناجائز قرار دیا۔ (امام ابن تیمیہ۔ مولانا محمد یوسف کوکن) از مترجم

بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ معتقدات کے معاملے میں سلف صالح کے مذہب کو ترجیح دیتے تھے۔ اور اس کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو اس طرف لائیں وہ سلف صالح کے مذہب کے زبردست حامی تھے اور عقلی و نقلی دلائل سے اس کی مدافعت کرتے تھے ان کے ساتھ مصر و شام میں جو مناظرے ہوئے ان میں سے اکثر اسی مسئلے کے اردگرد گھومتے تھے۔ الکواکب الدریہ کے مصنف شیخ علم الدین سے نقل کرتے ہیں کہ ۶۹۸ھ میں امام تقی الدین ابن تیمیہ کو دمشق میں ابتلاسے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس کی وجہ آپ کا صفات خداوندی کے معاملے میں متکلمین کے مذہب پر سلف کے مذہب کو ترجیح دینا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے آپ ستاروں اور افلاک کی تاثیر کا انکار کرچکے تھے اور نجومیوں کا گروہ آپ سے بگڑا ہوا تھا۔ اسی دوران میں مصر و شام میں آپ کے ساتھ مناظرے ہوئے۔ جن کی بنا پر وہ شام اور مصر دونوں ملکوں میں یکے بعد دیگرے قید کئے گئے۔ الکواکب الدریہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ جب امام صاحب مصر میں قید کئے گئے تو علمی و دینی مصروفیتوں کے اعتبار سے ان کی یہ قید زاویوں، خانقاہوں اور مدارس سے کہیں بہتر ثابت ہوئی۔ وہاں کے بہت سے قیدی رہا ہونے کے بعد یہی چاہتے تھے کہ انہیں پھر قید خانے میں واپس بھیج دیا جائے۔ امام صاحب کے پاس قید خانے میں لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ قید خانہ ان سے بھر جاتا۔

جب امام صاحب کو دمشق کے قلعہ میں قید کردینے کا حکم ہوا، تو آپ نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں تو اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس میں بڑی بھلائی ہے۔ آپ کے شاگرد اور آپ کے علوم کے وارث علامہ ابن قیم الجوزیہ سے جو آپ کے ساتھ ہی قلعہ دمشق میں محبوس کئے گئے تھے، منقول ہے کہ امام صاحب نے فرمایا:۔ میرے دشمن میرے خلاف کیا کرسکتے ہیں۔ میری بہشت اور میرے گل و گلزار میرے سینے میں ہیں۔ جہاں بھی میں جاؤں گا، وہ میرے ساتھ ہوں گے اور مجھ سے جدا نہیں ہوسکیں گے۔ میری قید میرے لئے خلوت ہے۔ اور میرا قتل شہادت، اور مجھے اپنے شہر سے نکالنا میرے لئے سیاحت ہے۔ علامہ ابن قیم کہتے ہیں کہ امام صاحب قلعہ میں دوران حبس فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں اس قلعہ کے برابر سونا خرچ کروں تو اس نعمت کا جو مجھے یہاں میسر ہوئی ہے بدل نہیں ہوسکتا۔ ایک دفعہ امام صاحب نے مجھ سے فرمایا اصل محبوس وہ ہے

جس کا دل اپنے رب سے حبس میں ہوں۔ اور اصل اسیر وہ ہے، جسے اس کی خواہشات نے اسیر کر رکھا ہو۔
جب آپ قید کر کے قلعے میں لائے گئے اور آپ قلعے کی فصیل کے اندر پہنچے تو اس کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی
فضرب بینھم بسور لہ باب باطنہ فیہ الرحمۃ وظاھرہ من قبلہ العذاب[1]
اللہ جانتا ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ کو تنگی تھی اور آرام و آسائش سے محروم تھے، میں نے آپ سے بڑھ کر کسی کو
آرام میں نہیں دیکھا۔ اور باوصف اس کے کہ آپ قید کر دیئے گئے تھے۔ آپ کو دھمکیاں دی جاتی تھیں اور
آپ کے خلاف الزامات تراشے گئے تھے، آپ سے بڑھ کر میں نے کسی کو زندگی میں مطمئن، زیادہ انشراحِ صدر والا
زیادہ دل کا مضبوط اور مسرور نہیں دیکھا۔ آپ کے چہرے پر تازگی و بشاشت نمایاں تھی۔ جب کبھی ہم پر خوف
طاری ہوتا، ہمیں طرح طرح کے خیالات آتے اور ہم پر فضا تنگ ہونے لگتی تو ہم آپ کے پاس آتے اور جیسے ہی آپ
کو دیکھتے آپ کی باتیں سنتے تو ہماری ساری پریشانی دور ہو جاتی۔ اور اس کی جگہ ہمیں انشراحِ صدر اور یقین و اطمینان
کی نعمت حاصل ہو جاتی۔

آپ آخری بار دمشق کے قلعہ میں ۶ شعبان ۷۲۶ھ کو قید کئے گئے۔ اور ۷۲۸ھ ذی القعدہ کے آخری
ہفتے میں آپ کا دوران حبس ہی میں انتقال ہوا، آپ کا جنازہ جامع اموی میں لایا گیا۔ اور وہیں نماز جنازہ ادا ہوئی
بیان کیا جاتا ہے کہ پورا دمشق جنازے کی نماز میں شریک ہونے کے لئے ٹوٹ پڑا تھا۔ اس دن بازار بند تھے اور ہر
مرد عورت، امیر غریب اور بڑے چھوٹے سب امام صاحب کے جنازے میں شامل تھے، اتنا بڑا اجتماع
دمشق کی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

---

[1] (ترجمہ) پھر کھڑی کر دی جائے ان کے بیچ میں ایک دیوار، جس میں ہوگا دروازہ، اس کے اندر
رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب۔

تصوف کی ایک بنیادی کتاب — عوارف المعارف

انطاف جاوید - کراچی

شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کی تصنیف "عوارف المعارف" تصوف کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور سالکین طریقت کے لئے اس کا پڑھنا ہمیشہ سے ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ اکثر مشائخ اپنے مریدوں اور منتسبین کو یہ کتاب سبقاً سبقاً پڑھایا کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے ایک پنجابی شاگرد اور مرید کو جو سند دی ہے، اس میں آپ لکھتے ہیں :- "وقرأ علی کتاب عوارف المعارف فی التصوف من اولہ الی آخرہ، وطرفاً من اول احیاء علوم الدین وغیر ذلک[1]"
سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء نے حضرت بابا فرید شکر گنج سے عوارف المعارف کے چند باب پڑھے تھے اور حضرت بابا صاحب کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا[2]۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت

---

[1] ترجمہ :- انہوں نے مجھ سے تصوف کے باب میں اول سے لے کر آخر تک عوارف المعارف اور احیاء العلوم کا شروع کا کچھ حصہ پڑھا۔

[2] حضرت بابا فرید کو شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کی شہرہ آفاق تصنیف عوارف المعارف ہر وقت پیش نظر رہتی تھی۔ اور اسے درس کے طور پر پڑھاتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ آپ کے پڑھانے میں یہ اثر تھا کہ سننے والے کے ہوش بجا نہیں رہتے تھے۔ میں نے اس کتاب کے پانچ ابواب آپ ہی سے پڑھے اور آپ کے بیان کی لذت سے مجھ پر ایسی بے خودی طاری ہو جایا کرتی کہ اگر ایسی حالت میں موت آجاتی تو ایک بڑی دولت ملتی۔ (حضرت بہاء الدین زکریا از مولانا نور احمد خاں فریدی)

نے جو سلسلہ سہروردی سے منسلک تھے شیخ عبداللہ مطری سے مدینہ منورہ میں حدیث نبوی کے ساتھ عوارف المعارف پڑھی۔ آپ کے پاس عوارف کا وہ نسخہ تھا جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے مطالعہ میں رہ چکا تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے عراق جاکر شیخ شرف الدین محمود شاہ تستری سے بھی جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے، عوارف پڑھی۔ علاوہ ازیں حضرت مخدوم تفسیر، حدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ تصوف میں عوارف المعارف کا درس دیا کرتے تھے[1]۔ منقول ہے کہ آپ اپنی مجالس میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی شخص کو کوئی پیر و مرشد میسر نہ آئے، وہ عوارف المعارف غور سے پڑھے اور اس پر عمل کرے تو بلاشک و شبہ وہ ولی ہو جائے گا۔"

شیخ جمال خنداں رُو جو اوچ شریف کے تھے، اور جن سے حضرت مخدوم جہانیاں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، اپنے زمانے کے بڑے محدث، متورع عالم صاحب نسبت درویش تھے۔ آپ جہاں دوسرے علوم کی تعلیم دیتے تھے، وہاں آپ کو عوارف کی تدریس سے غیر معمولی دلچسپی تھی[2]۔

غرض شروع ہی سے عوارف المعارف تصوف کی ایک اہم درسی کتاب رہی ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ ابتدا سے اہل سلوک و معرفت کے نصاب تعلیم میں شامل رہی۔ بلکہ بزرگان کرام نے ہر زمانے میں اس پر حواشی اور تعلیقات لکھیں، مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کئے۔ حضرت چراغ دہلی کے خلیفہ سید گیسو دراز نے جن کی برکت سے دکن میں اسلام پھیلا، معارف العوارف کے نام سے عوارف کی شرح لکھی[3]۔ یہ شرح عربی میں تھی، جو آپ نے دہلی میں لکھی، دکن کے شہر گلبرگہ پہنچ کر آپ نے عوارف کی ایک شرح فارسی میں کی[4]۔ اسی زمانے کے ایک اور بزرگ مخدوم مہائمی ہیں جن کی تفسیر قرآن مجید "تبصیر الرحمٰن" ہے۔ آپ توحید وجودی کے قائل اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے پیرو تھے۔ آپ نے

۱؎ تذکرہ صوفیائے پنجاب از اعجاز الحق قدسی

۲؎ تذکرہ صوفیائے پنجاب ۳؎ آب کوثر

۴؎ عوارف المعارف (اردو ترجمہ از سید رشید احمد ارشد)

عربی زبان میں عوارف کی شرح کی جو ۳ر محرم ۸۱۸ھ کو مکمل ہوئی۔[1]

مشہور چشتی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی متوفی ۹۴۴ھ نے بھی عوارف المعارف کی عربی میں شرح لکھی ہے، جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں:۔ خود حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ ابتداءً عوارف کا نسخہ میرے حجرے میں برکت کے لئے رکھا رہتا تھا۔ اور مجھے اس موضوع میں کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن پھر میرا شغف یہاں تک پہنچا کہ میں نے عوارف کی شرح عربی میں لکھی۔[2]

اس کے بعد اور بھی بہت سے لوگوں نے عوارف کی عربی اور فارسی میں شرحیں لکھیں اور اس کے خلاصے ترتیب دیئے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے تعلیقات عوارف میں عوارف المعارف کے بعض رموز کی شرح و توضیح فرمائی۔ اس موضوع پر ایک عمدہ رسالہ ہے۔[3]

عوارف کا فارسی میں سب سے پہلا ترجمہ ۷۱۶ھ میں کیا گیا۔ ترکی میں امیر تیمور کے فرزند سلطان شاہ رخ کے عہد میں پہلی بار اس کا ترجمہ ہوا، عوارف کا اردو ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۱ء میں مطبع نول کشور نے شائع کیا۔

عوارف المعارف کی اس غیر معمولی اہمیت، مقبولیت اور شہرت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ علم تصوف، اُس سے متعلق جملہ مسائل اور تصوف نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے میں ایک مخصوص خانقاہی نظام کی جو شکل اختیار کر لی تھی، اس کے فرائض و آداب پر مشتمل ایک جامع تصنیف ہے۔ اور اس میں وہ سب باتیں آگئی ہیں، جو ایک سالک راہ طریقت کے ساتھ ساتھ ایک صاحب ارشاد شیخِ طریقت کو جاننی چاہئیں۔ دوسرے شیخ شہاب الدین[4] سہروردی کا وہ زمانہ ہے جب حجتہ الاسلام

---

[1] عوارف المعارف (اردو ترجمہ از سید رشید احمد ارشد)

[2] شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات　　[3] حیات مجدد از پروفیسر محمد فرمان

[4] شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرشد شیخ ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی جو آپ کے چچا بھی تھے حجتہ الاسلام امام محمد غزالی کے برادر حقیقی عالم باعمل احمد غزالی کے صحبت یافتہ اور مرید تھے۔

امام محمد غزالی کے زیر اثر تصوف شریعت سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرف مائل تھا۔ اسی لئے تصوف کا مذاق رکھنے والے اہل شرع کے حلقوں میں اس کتاب کی قدر ہوئی اور اسے پڑھا اور پڑھایا جانے لگا۔ ؎[1]

صاحبِ عوارف المعارف حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی ولادت خزینۃ الاصفیاء کے مصنف کے نزدیک ۵۴۲ھ میں اور رحلت ۶۳۲ھ ہوئی۔ یہ بغداد کی شان و شوکت اور اس کی علمی عظمت کے آخری ایام تھے (۶۵۵ھ میں بغداد پر ہلاکو حملہ آور ہوا تھا) اس دور میں عباسی خلفا، سلجوقی سلاطین کے اقتدار سے آزاد ہو گئے تھے اور بغداد میں صرف انہی کا سکہ چلتا تھا۔ ان میں سے بعض خلفا بڑے اچھے بھی تھے۔ ابن اثیر مستضی (۵۶۶ھ - ۵۷۵ھ) کے متعلق لکھتا ہے۔ عادل اور رعایا کے ساتھ شفیق تھا۔۔۔ اس کے زمانے میں ملک کو اس قدر امن و سکون اور راحت و طمانیت حاصل تھی، جس کی مثال نہیں ملتی۔۔۔ رعایا کے لئے اس کا زمانہ ہر روز عید اور ہر شب شب برات تھی (خلافت عباسیہ از شاہ معین الدین احمد ندوی)۔ مستضی کے بعد ناصر لدین اللہ (۵۷۵ھ - ۶۲۲ھ) خلیفہ ہوا۔ اس کا ۴۷ سال کا یہ عہد حکومت بغداد کے لئے امن و اماں اور خوش حالی کا زمانہ تھا۔ اس نے رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کیا ابن طقطقی کا بیان ہے کہ اس کے کار خیر اور اوقاف حد شمار

---

[1] شیخ شہاب الدین سہروردی اپنی کتاب "اعلام الہدیٰ" میں لکھتے ہیں:۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اولیاء اللہ ہیں، جن سے کرامات صادر ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر ایک رسول کے زمانے میں ان کے تابعین ہوتے تھے، جن سے کرامات اور خوارق عادت ظاہر ہوا کرتے تھے۔ اولیاء کی کرامات انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا نتیجہ ہیں، لیکن جو شخص کہ احکام شرعیہ کا ملتزم نہیں۔ اور اس کے ہاتھ پر خوارق عادت کا ظہور ہوا، تو ہمارے اعتقاد میں وہ شخص زندیق اور بے دین ہے۔ اور جو کچھ اس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ مکر و استدراج ہے۔

(حضرت بہاء الدین زکریا از مولانا نور احمد فریدی)

سے باہر ہیں۔ اس نے بکثرت مسجدیں، خانقاہیں اور مسافر خانے بنوائے[1] اس خلیفہ ناصر سے شیخ شہاب الدین کے بڑے گہرے تعلقات تھے اور آپ کو وہ اکثر دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا کرتا تھا۔[2]

شیخ شہاب الدین اگرچہ شمالی ایران کے شہر سہرورد میں پیدا ہوئے، لیکن وہ بچپن ہی میں اپنے چچا شیخ ابو نجیب کے پاس بغداد آگئے تھے، جہاں ان کی دریائے دجلہ کے کنارے ایک بڑی خانقاہ تھی۔ اس کے علاوہ شیخ ابو النجیب بغداد کے مشہور واعظ بھی تھے اور ایک عرصہ دراز تک بغداد کی مشہور جامعہ نظامیہ کی مسند درس و وعظ پر فائز رہ چکے تھے۔ آپ نے احادیث نبوی کے ذریعہ تصوف کے اصول اور اس کے اسرار و رموز کو ثابت کیا۔[3] آپ کا ۵۶۳ھ میں انتقال ہوا، اور آپ کی خانقاہ اور مسند ارشاد و طریقت شیخ شہاب الدین کو ملی۔

خزینۃ الاصفیاء کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری شیخ شہاب الدین کے متعلق لکھتے ہیں کہ "وے در وقت خود قطب الوقت و شیخ الشیوخ بغداد بود و ارباب طریقت از بلادِ دور و نزدیک استفتائے مسائل طریقت از وے کردندے۔" خزینۃ الاصفیاء ہی میں مذکور ہے کہ آپ ۱۷ سال کی عمر میں علوم صرف و نحو و منطق و معانی و فقہ و حدیث میں فاضل و کامل ہوگئے تھے اور باوجود اپنے عم محترم شیخ ابو النجیب کے اصرار کے کہ اب علم کلام کو چھوڑ کر وہ علم طریقت سے بہرہ ور ہوں، شیخ شہاب الدین کو علم کلام کا اس قدر اشتیاق تھا کہ وہ شب و روز اس کی تحصیل میں مستغرق رہتے تھے۔ آخر عم محترم انہی حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں لے گئے۔ اور ان کی توجہ سے موصوف از علوم ظاہری دست بردار شدہ بدل و جان تحصیل باطنی پرداخت۔"

---

[1] خلافت عباسیہ از شاہ معین الدین احمد ندوی۔ البتہ ابن اثیر نے ناصر کی کافی مذمت کی ہے
[2] عوارف المعارف اردو ترجمہ از سید رشید احمد ارشد۔
[3] " " " " "

شیخ شہاب الدین کی بہت بڑی خانقاہ تھی،[۱] جہاں کثیر مقدار میں نذرانے آتے تھے۔ اور آپ انہیں درویشوں اور مستحقوں میں تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا یہ دستور تھا کہ ہر سال حج کو تشریف لے جاتے اور فرائض حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں حاضری دیتے، زندگی بھر آپ کا یہی معمول رہا، آپ نے تقریباً نوے سال کی عمر پائی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتان والے آپ ہی کے مرید تھے، اور انہی کے ذریعہ ہندوستان میں سہروردی طریقے کی توسیع ہوئی۔

عوارف المعارف کافی ضخیم کتاب ہے۔ حال ہی میں اس کا حافظ سید رشید احمد ارشد صاحب کا کیا ہوا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کی مدد سے کتاب کے مندرجات کے چند اہم نکات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

علمائے تفسیر، محدثین اور فقہاء نے کتاب و سنت کے ذریعہ مذہبی علوم کا احاطہ کر لیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ ان کے ذریعہ دین کی حفاظت کرتا ہے۔ صوفیہ کرام کے قلوب اسرار الٰہی کے محافظ ہیں، کیونکہ انھوں نے تقویٰ کی بنیاد کو مضبوط کرنے کے بعد دنیا سے کنارہ کشی کی ہے۔ تقویٰ کے ذریعہ ان کا نفس پاکیزہ بنا ہے اور زہد کے ذریعہ ان کے دل صاف ہوئے ہیں۔

علم و ہدایت کا پہلا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ آپؐ نے علم و ہدایت کا فیض خدائی سرچشمہ سے حاصل کیا۔ اور آپ کا ظاہر و باطن اس سے پوری طرح سیراب ہوگیا۔ آپ کی ظاہری سیرابی سے دین کا ظہور ہوا۔ دین، اطاعت و تواضع کے مرادف ہے۔ یہ دون سے مشتق ہے اور جو چیز پست ہو، وہ دون

---

[۱] یوں تو اہلِ تصوف طریقت کی تاریخ کا آغاز رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کرتے ہیں لیکن صوفیہ کے ہاں خانقاہ یا زاویہ بحیثیت ایک مستقل "انٹی ٹیوشن" کے کب وجود میں آیا۔ اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ مولانا شبلی نے "الغزالی" میں لکھا ہے:- "فخر الملک کی وفات (۵۰۰ھ) کے تھوڑے ہی دن بعد امام صاحب نے عہدہ تدریس سے کنارہ کشی کر کے طوس میں خانہ نشینی اختیار کی۔ گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ جہاں مرتے دم تک ظاہری اور باطنی دونوں علموں کی تلقین کرتے رہے۔" شیخ شہاب الدین نے اہل خانقاہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اہل صفہ سے مشابہت دی ہے۔ پروفیسر ڈی اولیری لکھتا ہے:- خانقاہی اداروں کے آثار دمشق میں تقریباً ۴۱۰ھ میں ملتے ہیں اور خراسان میں ۵۰ سال بعد (ثقافۃ اسلام)

ہے۔ لہٰذا دین کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے پست کردے (جھکا دے)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ مذہبی بصیرت سے بہتر کوئی عبادت نہیں ہے اور شیطان کے لئے ایک صاحب بصیرت ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت ہے۔ ہر چیز کا ایک ستون ہوتا ہے۔ اور اس مذہب کا ستون مذہبی بصیرت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا۔ بہترین عبادت مذہبی بصیرت ہے۔

علم و ہدایت کا دارومدار طینت کی پاکیزگی پر ہے۔ آدمی جس قدر پاک طینت ہوگا، اسی قدر وہ علم و ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت رکھے گا۔ چونکہ صوفیہ کے قلوب زیادہ پاک ہیں، اس لئے انہیں علم و ہدایت کا بڑا حصہ ملا۔ اور ان کے باطن علم و ہدایت کے تالاب بن گئے۔ انہوں نے خود علم سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا صوفی سے ہماری مراد مقرب بارگاہ سے ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں صوفی کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ مقرب کہا گیا ہے، بہر حال الفاظ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ صوفیہ سے ہماری مراد مقربین سے ہے۔ خدا کے نیک بندوں میں سے جو مقربین الٰہی کے مقام تک پہنچنا چاہے، وہ اس وقت تک متصوف کہلائے گا، جب تک وہ صاحب حال نہیں ہوتا۔ جب اس کے صاحب حال ہونے کی تصدیق ہو جائے گی تو وہ صوفی کہلائے گا۔

کتاب میں کوئی بیس "علوم صوفیہ" گنائے گئے ہیں۔ اس ضمن میں ایک "علم النفس" ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں :- "علم النفس، نفس شناسی اور اخلاق نفس کا علم بھی اہم ہیں۔ علم النفس اور علم نفس شناسی اہل تصوف کے نزدیک بہت اہم ہے، جو اس سے زیادہ واقف ہوگا، وہ سیدھی راہ دیکھ سکتا ہے۔

علاوہ ازیں دنیا کی انواع و اقسام کا علم، نفسیاتی خواہشوں کی باریکیوں یا مخفی شہوات نفسانیہ کا علم بھی (ان علوم صوفیہ میں سے ہے)

صوفیائے کرام کے علوم دنیا کی محبت کے ساتھ ساتھ نہیں حاصل کئے جاسکتے ہیں، بلکہ ان کا انکشاف اسی وقت ہوتا ہے، جب نفسانی خواہشوں کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ اس طرح ان کی تعلیم زہد و تقویٰ کے مدرسے میں ہوتی ہے۔

عالم و صوفی میں فرق ـــ ایک عالم ایک محفل میں شریک ہوا۔ وہاں وہ اس امتیازی مسند پر

بیٹھ گیا، جہاں وہ اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق اپنے علمی مرتبہ کا لحاظ رکھتے ہوئے بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے ہم جنسوں میں سے ایک اور عالم بھی داخل ہوا۔ اور وہ اس سے اوپر کے درجے پر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر پہلا عالم بہت گھبرایا۔ اور دنیا اس پر تاریک ہو گئی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اس شخص پر حملہ کر دیتا۔ مگر ایک درویش عالم کی مثال دوسری ہے وہ دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی امتیازی شان نہیں قائم کرتا۔ نہ اپنے آپ کو کسی محفل میں ممتاز مسند کے قابل سمجھتا ہے۔

ہمارے شیخ ضیاء الدین ابو احمد عبدالوہاب بن علی نے اپنے مشائخ کی اسناد سے ترمذی کی یہ حدیث حضرت انس بن مالک کی روایت سے بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "اے میرے فرزند! اگر تمہارے لئے ممکن ہو کہ تم صبح و شام اس طرح زندگی گزارو کہ تمہارے دل میں کسی کے خلاف کھوٹ نہ ہو، تو ایسا ضرور کرو"۔ پھر فرمایا۔ "یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کیا اور جس نے مجھے زندہ کیا، وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا"۔۔۔ اس سلسلے میں حضرت صوفیائے کرام کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے اس سنت کو زندہ کیا۔ کیونکہ کھوٹ اور کینہ سے ان کے سینے پاک ہیں اور ان کی جوہر شناسی اور پرکھنے کا یہی سب سے بڑا معیار ہے۔

ہمارے شیخ نے۔۔۔ حضرت ابو سعید الخراز کا یہ قول بیان فرمایا ہے "وہ باطن جو ظاہر کے خلاف ہو، مردود ہے"۔ حضرت جنید بغدادی فرماتے تھے "ہمارا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ملا ہوا ہے" ابو محمد الجریری سے تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا "تصوف اعلیٰ اخلاق کو اختیار کرنا اور پست اخلاق سے پرہیز کا نام ہے"

صوفی کی وجہ تسمیہ۔ شیخ ابوزرعہ طاہر بن محمد بن طاہر نے اپنے مشائخ کی اسناد سے حضرت انس بن مالک کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلام کی دعوت قبول فرماتے تھے گدھے کی سواری کرتے تھے۔ اور اون پہنتے تھے۔ اس حدیث کی بنا پر ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ انہیں صوفیہ کا نام ان کے ظاہری لباس پر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے صوف (اون) کا لباس پہننا پسند کیا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ صوفی کی نسبت صُفّہ سے ہے، جو رسول اللہ کے زمانے میں غریب مہاجروں ......

کا ایک چبوترہ تھا۔ اگرچہ لفظی اشتقاق کے لحاظ سے یہ وجہ تسمیہ درست نہیں مگر مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہے کیونکہ صوفیہ کا حال ان کے مشابہ ہے . . . . بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یہ نام رسول اللہ کے زمانے میں نہیں رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تابعین کے زمانہ میں رکھا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ نام دوسو ہجری تک مشہور نہ ہو سکا۔

جب عہد رسالت کو کافی عرصہ گزر گیا اور آسمانی وحی اور نور مصطفوی کو پوشیدہ ہوئے ایک زمانہ ہو گیا، تو اس وقت خیالات میں اختلاف ہونے لگا اور لوگوں کے راستے جدا ہو گئے اور ہر اہل رائے اپنی رائے میں آزاد ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نفسانی خواہشوں نے بھی علمی فضا کو مکدر کر دیا . . . . ایسے زمانے میں ایک جماعت دنیا سے الگ ہو کر نیک کاموں میں مشغول ہو گئی۔ ان کے عزائم میں خلوص اور دین کی طاقت تھی۔ انہوں نے دنیا اور اس کی محبت سے منہ موڑا۔ تنہائی اور گوشہ نشینی کو غنیمت جانا۔ اپنی جماعت کے لئے کچھ زاویئے بنائے۔ جہاں کبھی کبھی جمع ہو جاتے تھے۔ مگر اہل صفہ کی تقلید کرتے ہوئے اکثر تنہا رہتے تھے۔ دنیاوی اسباب کو انہوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ اور رب الارباب کی طرف لو لگائی تھی۔ ان کے نیک اعمال نے بلند احوال کی صورت میں اچھا ثمرہ دیا، ان کا دماغ اور ان کی قوتِ ادراک صاف ہو کر علوم الٰہی کو قبول کرنے کے قابل ہو گئی۔ اس طرح ان کو ظاہری زبان کے بعد ایک دوسری زبان ملی اور گزشتہ عرفان کے بعد ایک نیا عرفان کامل حاصل ہوا، بلکہ سابقہ ایمان کے بعد ایک تازہ ایمان حاصل ہوا . . . . ان مراتب تک پہنچنے کے بعد وہ نئے علوم سے واقف ہوئے، جن کے لئے نئے نئے اشارے کرنے پڑے۔ اس لئے انہیں نئی نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑیں جو ان کے حال اور وجدانی کیفیات کو ظاہر کر سکیں۔ . . . ان بزرگان سلف سے ان کے جانشینوں نے یہ علم حاصل کیا۔ یہاں تک کہ ہر زمانے میں اس نے ایک باقاعدہ اور مستقل علم اور رسوم کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ صوفی کا نام بھی ان میں رائج ہو گیا۔

ایک گمراہ جماعت نے اپنے آپ کو ملامتیہ کا نام دے کر صوفیوں کا لباس پہن رکھا ہے تاکہ وہ بھی صوفی کہلائے جائیں حالانکہ ان کا صوفیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ دھوکے اور غلطی میں مبتلا ہو کر ان کا لباس اختیار کئے ہوئے ہیں . . . . وہ حقیقت جو شریعت کے خلاف ہو، بے دینی اور جہالت ہے۔

یہ فریب خوردہ حضرات اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ شریعت حقِ بندگی ہے اور بندگی کی اصل حقیقت ہے۔۔۔۔ ان گمراہوں میں سے ایک جماعت وہ ہے، جو حلول کی قائل ہے۔۔۔۔ انہیں یہ اشارے بعض ان صوفیہ کے کلمات سے ملے ہیں، جو انہوں نے اپنے روحانی جذبے کی شدت میں کہے تھے جیساکہ منصور الحلاج نے انا الحق کہا تھا۔ اور حضرت ابویزید بسطامی سے سُبحانی (میں پاک ہوں) منقول ہے ہم حضرت ابویزید کے متعلق یہ تصور نہیں کر سکتے کہ انہوں نے یہ کلمات اپنے بارے میں کہے ہوں گے۔۔۔۔ اسی طرح منصور الحلاج کے قول کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ تاہم اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ اس قسم کے اقوال کے ذکر کرنے سے یہی مراد ہے کہ خدا ان میں حلول کر گیا، تو ہم اس قول کو قطعی طور پر ردّ کر دیں گے۔ کیونکہ رسول اکرمؐ ہمارے سامنے ایک ایسی واضح اور کھلی شریعت لائے ہیں، جس کے ذریعہ ہر کج رو کو سیدھا کیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں ہماری عقل ہمیں یہ صحیح رہنمائی کرتی ہے کہ کس طرح خدا کی صفات کو بیان کرنا جائز ہے اور کس طرح ناجائز ہے۔ بلکہ خدا اس بات سے پاک و صاف ہے کہ کوئی شے اس میں حلول کرے یا وہ کسی شے میں حلول کرے۔

باطنی الہامات — ممکن ہے کہ ان فریب خوردہ اور گمراہ حضرات میں سے کسی فرد۔۔۔۔ نے باطنی طور پر چند کلمات سُن لئے ہوں پھر وہ اپنی قوت فکر سے ان کلمات کو ترتیب دے کر اسے خدا کی طرف منسوب کر دے۔۔۔۔۔ مگر یہ سب گمراہی ہے۔ اسے اس دعویٰ کی جرأت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس نے بعض اہل حقیقت سے وہ کلمات سُنے ہوں، جو انہیں ظاہری اور باطنی طویل واردات کے بعد حاصل ہوئے تھے۔ مگر اس سے پہلے وہ اپنی جماعت کے اصولوں کے مطابق زہد و تقویٰ کے پابند رہ چکے تھے۔ اس لئے جب ان کا باطن صاف ہوا تو ان کے اندر کتاب و سنت کے مطابق الہامات باطنی استغراق کے موقع پر نازل ہوتے تھے۔ وہ ایسا کلام نہیں بولتے، جسے سنا جاسکے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ دل ہی دل میں باتیں کی جارہی ہیں۔ یہ الہامات کتاب اور سنت کے علم کے موافق ہوتے تھے۔ اہل علم بھی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دراصل ان کی باطنی مناجات ہے۔ اس طرح وہ اپنے لئے مقام بندگی اور اپنے مولا کے لئے مقام ربوبیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ اس میں برابر اضافہ کرتے رہتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ ایک

فانی علم ہے۔ جسے اللہ تعالےٰ نے ان کے باطن پر نمودار کیا ہے اس لئے ہوش مند صوفیہ کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ اپنے نفوس کے ہر فعل میں خدا کی طرف فرارڈ ہونڈتے ہیں۔ اور جب نفسانی خواہشوں سے ان کا میلان صاف ہو جاتا ہے تو ان کے باطن میں کچھ الہامات ہونے لگتے ہیں، جنہیں وہ اللہ کی طرف اس حیثیت سے منسوب کرتے ہیں کہ وہ ان افعال کا خالق ہے، نہ یہ کہ وہ متکلم کا کلام ہے۔ اس لئے وہ تحریف اور کجروی سے محفوظ رہتے ہیں۔

مشائخ کا مرتبہ ـــ حدیث شریف میں منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر تم چاہو تو میں تمہارے سامنے قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ خدا کو وہی افراد محبوب ہیں، جو اس کے بندوں میں خدا کی محبت پیدا کرتے ہیں۔ اور انہیں خدا کا محبوب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ روئے زمین پر ہر شخص کے ساتھ خیر خواہی کے ساتھ گامزن ہیں۔ مذکورہ حدیث میں جو بیان کیا گیا ہے، وہ مشائخ کا مرتبہ ہے۔ وہ خدا کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور درحقیقت خدا کے بندوں میں خدا کی محبت کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا بھی ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اسی بنا پر طریقۂ صوفیہ میں شیخ کا مرتبہ ایک اعلیٰ مرتبہ ہے۔ بلکہ وہ خدائی دعوت کے سلسلے میں پیغمبروں کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ شیخ اپنے مرید میں خدائی محبت اس طرح پیدا کرتا ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی اتباع کے راستے پر لگا دیتا ہے۔ چنانچہ جو صحیح طریقہ سے آپؐ کی اتباع کرے، اس سے خدا بھی محبت کرے گا شیخ بندوں کو خدا کا پیارا اس طرح بناتا ہے کہ وہ مرید کو تزکیۂ نفس کے طریقہ پر چلاتا ہے۔۔۔

اہل صفہ اور اہل خانقاہ ـــ ۔۔۔ اس قسم کے آداب خانقاہ کے صوفیہ کا روزانہ کا معمول ہے۔ وہ ہر وقت اپنی خانقاہ میں رہتے اور اس کی خبر گیری کرتے ہیں۔ کیونکہ خانقاہ ان کا گھر اور خیمہ ہے ہر جماعت کا کوئی نہ کوئی گھر ہوتا ہے۔ اس لئے صوفیہ کا گھر ان کی خانقاہ ہے، اسی وجہ سے وہ اہل صفہ سے مشابہ ہیں۔ اہل خانقاہ میں بہت ربط وضبط ہوتا ہے وہ محض ایک مقصد، ایک ہی عزم اور مشترکہ حالات کے ماتحت متفق ہو کر کام کرتے ہیں۔

صوفیہ اور ازدواجی زندگی ـــ مجرد رہنا درویش کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اس سے اس کے

خیالات میں یکسوئی اور جمعیت خاطر رہتی ہے۔ اور اس کی زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ لہٰذا ابتدائی زمانے میں درویش کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ تمام تعلقات کو قطع کرے اور تمام رکاوٹوں کو دور کرکے سفر اختیار کرے اور خطرات برداشت کرے۔ اسے ظاہری اسباب سے الگ تھلگ رہ کر تمام حجابات کو اپنے سامنے سے ہٹانا چاہیئے۔ اس کے برخلاف ازدواجی زندگی سے روحانی عزم وارادہ کے بجائے پستی آجاتی ہے۔ اور بے فکری کی زندگی کے بجائے پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ بلکہ انسان اہل وعیال میں مقید ہوکر رہ جاتا ہے۔ کجروی کے شتبہ مقامات کے اردگرد گردش کرتا ہے۔ ترک دنیا کے بعد دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے اور اپنے مزاج اور عادت کے مطابق نفسانی خواہش کی طرف راغب ہوتا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کا قول ہے کہ ہم سختی اور تنگ دستی میں مبتلا ہوئے تو ہم نے صبر کیا۔ مگر جب ہمیں خوشحالی میں آزمایا گیا تو ہم صبر نہ کرسکے۔ مجھے جن فتنوں کا اندیشہ ہے، ان میں سب سے زیادہ خطرناک عورتوں کا ہے، جب کہ وہ سونے کے کنگن شام کی ریشمی چادریں اور یمن کے سرخ سنجاب کا لباس پہن کر دولت مندوں کو عاجز کردیں گی اور فقیروں کو وہ چیز مہیا کرنے پر مجبور کریں گی، جو وہ حاصل نہیں کرسکتے"۔

بہرحال کامل بندگان خدا کی روحانیت نکاح سے ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اور انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ وہ علم کامل حاصل کرنے کے بعد مختلف اشیاء کے فوائد اخذ کرلیتے ہیں، مگر ان کی برائی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں "مجھے بیوی کی اتنی ضرورت ہے جتنی کھانے کی ضرورت ہے"۔

اخلاق رسولؐ — حضرت ابو الدرداء فرماتے ہیں :- "میں نے رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے سنا کہ کوئی چیز جو حساب کے ترازو میں رکھی جائے گی، حسن اخلاق سے زیادہ بھاری نہیں۔ اور ایک خوش اخلاق انسان خوش اخلاقی کی بدولت روزے نماز والے انسان کے درجے تک پہنچ جاتا ہے"

آپؐ کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ آپؐ سب سے زیادہ سخی تھے۔ آپؐ کے پاس کوئی درہم و دینار باقی نہیں رہتا تھا۔ اگر کوئی رقم بچ جاتی اور آپؐ کو کوئی آدمی ایسا نہ ملتا جسے آپؐ وہ رقم دے سکیں اور رات ہوجاتی، تو آپؐ اس وقت تک گھر جاکر آرام نہیں فرماتے تھے، جب تک کہ اسے خرچ نہ کرلیتے تھے۔ آپؐ دنیا کو نہیں حاصل کرتے تھے۔ آپ کی غذا وہ تھی، جو آسانی سے میسر ہوسکے۔ یعنی چھوارے اور جو آپ کی عام غذا تھی۔

اس کے علاوہ اور کوئی چیز ہوتی تو اسے خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے ۔ اگر آپؐ سے کوئی مانگتا تھا تو فوراً اس کا سوال پورا کرتے تھے ۔ اس کے بعد اپنی عام غذا پر قناعت کرتے تھے ۔ آپؐ جوتے گانٹھ لیتے ۔ کپڑوں پر پیوند لگا لیتے تھے ۔ گھر والوں کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے ۔ سب سے زیادہ حیادار اور متواضع تھے ۔

تواضع ۔ صوفیہ کا بہترین اخلاق تواضع ہے ۔ تواضع سے افضل بندگی کا کوئی لباس نہیں ۔ جو تواضع کا خزانہ حاصل کرتا ہے ، وہ ہر شخص کے سامنے اپنی اصل حیثیت کو قائم رکھتا ہے ۔ اور خود بھی ہر ایک کو اس کے صحیح رتبے پر برقرار رکھتا ہے ۔ جسے یہ چیز حاصل ہوئی ، وہ خود بھی آرام سے رہتا ہے اور دوسروں کو بھی آرام پہنچاتا ہے ۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا " اللہ تعالےٰ نے میری طرف یہ وحی نازل فرمائی " تم تواضع کرو اور کوئی شخص ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے ۔ "

آپؐ کی تواضع یہ تھی کہ آزاد اور غلام کی دعوت اور ان کا تحفہ قبول فرماتے تھے ، خواہ دودھ کا گھونٹ اور خرگوش کی ران ہی کیوں نہ ہو ۔ آپؐ اس کا صلہ بھی دیتے تھے اور خود بھی کھاتے تھے ۔ کسی کنیز یا غریب کو جواب دینے میں غرور نہیں کرتے تھے ۔

حضرت شعیب کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ۔

" تواضع کی بنیاد یہ ہے کہ جس سے ملو ، اسے پہلے سلام کرو اور جو تمہیں سلام کرے اس کا جواب دو ۔ محفل میں کم درجہ کی نشست کو پسند کرو اور یہ نہ چاہو کہ کوئی تمہاری تعریف و توصیف کرے یا تم پر احسان کرے "

" وہ شخص کتنا اچھا ہے جو اپنی کوتاہی یا برائی کے بغیر تواضع اختیار کرے اور محتاجی کے بغیر اپنے آپ کو عاجز سمجھے ۔ "

ایک دفعہ میں اپنے شیخ ابوالنجیب ضیاء الدین سہروردی کے ساتھ شام کے سفر میں تھا ۔ کچھ دنیا داروں نے فرنگی قیدیوں کو (جو صلیبی جنگ میں قید ہو گئے تھے) بیڑیوں میں جکڑ کر اور ان کے سروں پر کھانا رکھوا کر ہمارے پاس بھیجا ۔ جب دستر خوان بچھایا گیا تو قیدی برتنوں کے خالی ہونے کا انتظار کرنے لگے ۔ اس وقت شیخ محترم نے خادم کو حکم دیا کہ قیدیوں کو لایا جائے تاکہ وہ بھی ان درویشوں کے

ساتھ دستر خوان پر بیٹھیں۔ چنانچہ جب انہیں لا کر ایک ہی صف میں دستر خوان پر بٹھا دیا گیا تو ہمارے شیخ محترم اپنے سجادہ سے اٹھ کر ان کے ایک فرد کی طرح ان کے درمیان بیٹھ گئے۔ اور انہی کے ساتھ کھانا کھایا اس وقت ہمیں ان کے چہرے پر ان کے باطنی پُر خلوص تواضع، عاجزی اور انکساری کی وہ جھلک نظر آئی جس سے ان کے ایمان اور وسیع علم و عمل کا پتہ چلتا ہے۔

اس ضمن میں مصنف فرماتے ہیں:۔ بعض مشائخ نے تواضع کو ذلت کا قائم مقام قرار دیا ہے، جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ حدِ اعتدال سے انحراف کیا گیا ہے۔ مصنف اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔

چونکہ انہیں اپنے مریدوں سے غرور و تکبر کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ان کی نفسانیت کا قلع قمع کرنے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ روحانی حالت کے غلبے کے ظہور کے ابتدائی دور میں شاذ و نادر ہی کوئی مرید خود پسندی سے خالی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اکابر صوفیہ کی طرف سے خود پسندی کے بہت سے اقوال منقول ہیں، جو غالباً حالت سکر کے آثار ہوتے ہیں۔

علم تصوف، صوفیائے کرام اور ان کے معاملات، حالات و مقامات نیز ان کے قائم کردہ خانقاہی نظام کے فرائض و آداب کے متعلق حضرت شہاب الدین سہروردی کی یہ کتاب "عوارف المعارف" گویا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اور صرف ان موضوعات پر ہی یہ جامع کتاب نہیں، بلکہ اپنے وسیع معنوں میں یہ علم الاخلاق کی بھی ایک مہتم بالشان کتاب ہے۔ اس لئے یہ تصوف کی ان چند کتابوں میں سے شمار ہوتی ہے۔ جو گزشتہ سات آٹھ سو سال میں سب سے زیادہ پڑھی اور پڑھائی گئی ہے۔ اور اہل تصوف اور اہل شرع دونوں حلقوں میں مقبول رہی ہے۔

جب میں ان علوم سے فارغ ہو کر صوفیا کے طریقہ کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کا طریقہ علم و عمل سے تکمیل کو پہنچتا ہے ان کے علم کا حاصل نفس کی گھاٹیوں کا قطع کرنا، اخلاقِ ذمیمہ اور صفاتِ خبیثہ سے پاک و منزہ ہونا ہے تاکہ اس کے ذریعہ قلب کو غیر اللہ سے خالی کیا جائے اور اس کو ذکرِ الٰہی سے آراستہ کیا جائے۔ از امام غزالی

(قرآن اور تصوف تالیف ڈاکٹر میر ولی الدین)

میرا سفرِ حجاز

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی

"ایک انسان کے عزم کی پختگی سماوی اور ارضی اسباب کو حرکت میں لے آتی ہے" اصفیاء کے اس قول کی صداقت کا تجربہ مجھے حج کے سلسلے میں اپنی ذات پر ہوا۔ فریضۂ حج کے لئے سفر کرنے پر جو پابندیاں عائد ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی بھی سال حج کے سلسلے میں حتمی فیصلہ کر لینا ناممکن نہ سہی، لیکن دشوار ضرور ہے اس کے ساتھ ہی میں نے یہ عزم کر رکھا تھا کہ اس سال ۱۹۶۳ء میں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مجھے مشرق وسطیٰ کے عالم اسلام کی سیاحت بھی کرنی ہے۔

سفر میں کسی اچھے ساتھی کی رفاقت سے سفر کی صعوبات میں بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے میری ترغیب پر میرے دو مخلص دوست سندھ مسلم کالج کراچی کے دو استاذ پروفیسر ظہور احمد صاحب اور پروفیسر سید فخرالحسن صاحب بھی میرے ساتھ سفر حجاز کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم نے ایک طرف تو باقاعدہ طور پر سفر حج کے لئے درخواست دے رکھی تھی اور دوسری طرف انٹرنیشنل پاسپورٹ کے لئے بھی کوشش شروع کر دی تھی۔ کیونکہ حج کا پاسپورٹ صرف حجاز تک کام دیتا ہے اس سے آگے کی سیاحت نہیں ہو سکتی۔

انٹرنیشنل پاسپورٹ تو اپنے کالج کے بعض مخلص تلامذہ کی کوششوں سے گھر بیٹھے ہی مل گیا۔ اس سلسلہ میں سید غلام مصطفیٰ شاہ ناظم تعلیمات کراچی کی عنایتیں خاص طور سے شامل حال رہیں موصوف نے میری طرف سے ضروری گارنٹی اور ضمانت دی جس سے پاسپورٹ ملنے میں آسانی ہو گئی۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

جس روز کراچی کے امیدوارانِ حج کی درخواستوں کا فیصلہ بذریعہ قرعہ ہونا تھا اللہ پاک کی اعانت پر بھروسہ کرتے ہوئے

اپنے رفیق شفیق پروفیسر ظہور احمد صاحب کی معیت میں قرعہ کی جگہ پہنچا۔ کوئی آٹھ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ہمارا نام کامیاب امیدواروں میں پکارا گیا، تو ہماری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کیونکہ اب خدا کے فضل و کرم سے ادائیگی فریضہ حج یقینی ہو گئی تھی۔

اس کے بعد سامان سفر کی تیاری شروع ہوئی۔ میں سفر میں بھاری بوجھ سے ہمیشہ گھبراجاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے کم سے کم سامان ساتھ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس سفر کی غائت حصول برکات اور ادائیگی فریضہ تھی اور اس میں تشہیر نامناسب تھی لیکن اسے اپنے کالج کے رفقار اور دوسرے مخلص اور قریبی احباب سے کیسے چھپا سکتا تھا۔ اس لئے مجبوراً ان کی کئی الوداعی دعوتیں قبول کرنی پڑیں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ اخلاص و محبت کا مظاہرہ کالج کے جملہ شاگردوں نے بالعموم اور اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ نے بالخصوص کیا اور مجھے الوداع کہنے کے لئے کئی تقریبیں کیں۔

۱۴ اپریل کو ہمیں "سفینۂ حجاج" جہاز پر سوار ہونا تھا۔ اس روز آٹھ بجے صبح میرا ایک مخلص شاگرد محمد الیاس پراچہ اپنی موٹر لے کر گھر پر پہنچا، اسی طرح میرے ایک دوست مولوی محمد جامی صاحب نے بھی یہی زحمت فرمائی۔ غرض بال بچوں کی معیت میں بندرگاہ پر پہنچا۔ کالج کے کئی ایک ساتھی اساتذہ، بعض مخلص تلامذہ اور دوسرے کئی کرم فرما حضرات الوداع کہنے کے لئے بندرگاہ پر موجود تھے۔ اتنے احباب کی وجہ سے سامان کی دیکھ بھال اور دوسرے امور میں بڑی آسانی ہوئی۔

قرآن مجید نے اولاد کو من جملہ آزمائش کے بتایا ہے میرا بڑا لڑکا سعید جو آٹھ برس کا ہے، اس خیال میں تھا کہ میں بھی ابا جان کے ساتھ جا رہا ہوں، کیونکہ یہاں بھی وہ حضر و سفر میں ہمیشہ میرے ساتھ ہی ہوتا ہے وہ بندرگاہ پر پھولوں کے ہار ڈالے میرے ساتھ پھر رہا تھا۔ لیکن عین موقعہ پر جب میں "سفینۂ حجاج" میں سوار ہونے کے لئے چلا تو مجھے سعید کو چھوڑنا پڑا۔ اس پر اس نے چیخ پکار کا ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ چنانچہ اسے زبردستی پکڑ کر موٹر میں بٹھانا پڑا۔ اور دو تین آدمیوں نے بمشکل اس کو موٹر میں روکے رکھا۔ اولاد کی محبت انسان کا فطری تقاضا ہے اس منظر کو دیکھ کر ایک گونہ رقت تو طاری ہوئی لیکن قرآن مجید کی مذکورہ آیت کو یاد کرتے ہوئے میں جہاز پر چلا گیا۔

تین بج کر پینتالیس منٹ پر جہاز نے لنگر اٹھایا۔ اور جملہ عازمین حج تسبیح و تہلیل اور عبادت میں لگ گئے

چھ دن تک مسلسل ہمیں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ عدن سے آگے جہاز کو کافی ہچکولے بھی لگتے رہے، جن کا کہ ہم پر کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ ہم فسٹ کلاس میں تھے۔ جہاز میں کھانے پینے کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ راستے ہی میں ہم نے احرامِ تمتع باندھا۔ اور اس طرح کفن بدوش حالت میں ہماری زبانوں سے لبیک لبیک کی آوازیں سارے جہاز میں گونج اٹھیں۔ احرام سے قبل تو پروفیسر ظہور احمد صاحب اپنی طبعی ظرافت اور فطری خوش دلی کی بنا پر کبھی کبھی دل بہلانے کا سامان فرماتے رہتے تھے۔ لیکن احرام باندھنے کے بعد تمام وقت ذکر و عبادت میں گزرنے لگا اور ہر لحظہ دیارِ حبیب میں داخل ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ آخر الامر چھٹے روز صبح کو بندرگاہ جدہ قریب آگئی جیسے ہی جہاز بندر پر لنگر انداز ہوا، بہت سے عرب قلی سامان اتارنے کے لئے جہاز پر چلے آئے۔ کراچی بندرگاہ پر تو ہر ایک مسافر کو اپنی حفاظت میں اپنا سامان قلی کے ذریعہ جہاز پر چڑھانا یا اتارنا پڑتا ہے، لیکن بندرگاہ جدہ پر اس سے مختلف انتظام نظر آیا، قلی سب سامان جہاز پر ایک جگہ اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر مشین کے ذریعہ وہ اتارا جاتا ہے۔ اس طرح ایک تو حاجیوں کا سامان ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ کہ بعد میں بڑی دقت سے انہیں تلاش کر کے نکالنا پڑتا ہے۔ دوسرے سامان جمع کر کے یوں اتارا جاتا ہے کہ بھاری بوجھ کے تلے کئی صندوق ٹوٹ بھی جاتے ہیں اور حجاج کا کچھ سامان ضائع بھی ہو جاتا ہے۔ بہر حال ہم اپنا سامان جہاز پر چھوڑ کر نیچے اتر آئے۔

جہاز سے اترتے ہی ہم سے معلموں کے متعلق پوچھ گچھ شروع ہوئی معلموں کے وکیل غول در غول ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم نے تو کراچی ہی سے اپنے ایک قدیم دوست محمد ہاشم سندھی کو اپنا معلم مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ گیٹ پر اس کا نام بتا کر اب ہم آگے بڑھے تو معلم موصوف کے وکیل ابو زید نامی سے تعارف ہوا۔ اب وکیل کے آدمیوں کے ساتھ سامان کی تلاش شروع ہوئی۔ میرے ساتھیوں کا تو سب سامان مل گیا، لیکن میرا آدھا سامان غائب تھا۔

بعد ازاں اس غائب شدہ سامان کی کسٹم والوں کی طرف سے تلاش شروع ہوئی، میں چونکہ بفضلہ تعالیٰ عربی اچھی بول سکتا تھا اس نے وہاں بڑا کام دیا۔ لیکن غائب شدہ سامان نہ ملا۔ میرے پاس حدیث اور فقہ کی کچھ کتابیں تھیں جن میں کچھ تو مجلس علمی کی طرف سے مولوی عبدالرزاق صاحب کے لئے جو کہ جامعہ مدینہ

میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، امانت کے طور پر ملی تھیں، اور کچھ اپنی بھیں جنہیں حجاز کے چند احباب کے لئے بطور تحفہ لئے جا رہا تھا' وہ سب کسٹم والوں نے روک لیں، اور ان کتابوں کی مجھے رسید دے دی گئی۔ معلوم ہوا کہ حکومتِ حجاز کتابوں کو اندرون ملک لے جانے کے معاملہ میں بڑی سختی سے کام لیتی ہے تاکہ اس کے مذہبی عقائد کے خلاف یا اس کے متعلق کوئی مخالف کتاب حجاز میں داخل نہ ہونے پائے۔ حفظ ماتقدم کے لئے حکومت کا یہ حفاظتی اقدام بے شک ٹھیک ہے لیکن اس کام پر علما متعین ہوں جو وہیں کتابوں کو دیکھ لیا کریں، تو مشہور کتب حدیث اور دوسری دینی کتابیں اس دارو گیر سے محفوظ رہیں۔ میں نے کسٹم والوں کو بہت کہا کہ ان کتابوں میں ایک کتاب "نصب الرایۃ فی تخریج، احادیث الہدایۃ" تو بہت مشہور ہے جو مصر میں چھپی ہے اور فن حدیث میں ہے۔ لیکن انہوں نے میری ایک بھی نہ سنی، مجبوراً وہاں سے نکل کر ہم حاجی کیمپ میں پہنچے۔ حاجیوں کی وجہ سے وہاں بڑی چہل پہل تھی خورد و نوش کے لئے ہوٹل کھلے ہوئے تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ سامان جو مالکوں کو نہیں مل سکا تھا حاجی کیمپ کے میدان میں پڑا ہوا نظر آیا، میں نے اس میں اپنے کھوئے ہوئے سامان کی تلاش شروع کی جو اس ڈھیر میں مل گیا اس سے حکومت کی مستعدی اور اہل کار کی دیانت و کارکردگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حکومت و مطوف کے واجباتِ مقررہ اور بس کا کرایہ وہیں مطوف کے وکیل ابو زید کو ادا کرنا پڑا۔ رات ہم نے حاجی کیمپ میں گذاری، صبح بس کے انتظار کو چھوڑ کر ہم نے "تنازل" کا درقہ لے لیا، ورنہ بس کے انتظار میں سارا دن ضائع جاتا۔ "تنازل" کے معنی ہیں اپنے حقوق سے دستبردار ہونا۔ جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ایک مخصوص فارم پر یہ لکھ دینا پڑتا ہے کہ ہم نے دستور کے مطابق بس کا جو کرایہ ادا کیا ہے، اس سے ہم دستبردار ہوتے ہیں، ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم اپنی مرضی سے سفر کریں۔ اس کے بعد حکومت کے متعلقہ افسر کے دستخطوں سے اجازت نامہ مل جاتا ہے اور آپ کوئی بھی ٹیکسی کر کے جا سکتے ہیں" تنازل" کا درقہ لئے بغیر آپ موٹر ٹیکسی پر سواری کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی اس پر سامان لادا اور اللہ کا نام لے کر چل دیئے۔ جدہ سے مکہ تک کی شاہراہ بڑی اچھی اور پختہ ہے۔ آنے اور جانے کے لئے الگ الگ راستے تھے۔ ٹیکیاں بڑی پُر تکلف اور آرام دہ ہیں۔ ان ٹیکسیوں کی طرح کی کاریں اپنے ہاں

تو صرف وزراء اور بڑے بڑے افسروں کو ہی نصیب ہوتی ہیں۔ ہماری ٹیکسی کے ڈرائیور نے جیسے ہی کار چلانی شروع کی، ریڈیو سیٹ سے عربی گانے بھی شروع ہوگئے۔ ہم چونکہ احرام کی حالت میں تھے جو کہ ایک عبادت ہے اس لئے ہمیں یہ گانا بجانا پسند تو نہیں تھا لیکن وہاں اس معاملہ میں اتنی آزادی ہے کہ الامان والحفیظ مجبوراً خاموش رہنا پڑا۔ آگے چل کر خود حرم یعنی مسجد الحرام کے دروازوں پر ہم نے لوگوں کے ہاتھ میں ریڈیو ٹرانسسٹر بجتے ہوئے دیکھے۔ ڈرائیور سے میں نے عربی میں بات چیت شروع کی تو وہ یمنی نکلا سچ ہے کہ زبان باہمی تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، وہ میرے ساتھ اتنا مانوس ہوگیا کہ کھل کر اپنے ملک یمن اور وہاں کی حالات کے متعلق میرے سوالات کا جواب دیتا رہا۔

سعودی حکومت اور متحدہ عرب جمہوریہ کی باہمی پرخاش کی وجہ سے حجاز میں ریڈیو سے مصری پروگرام سننا ممنوع ہے، لیکن وہاں کے عوام سرکاری لوگوں کے سامنے تو اس قانون کا احترام کرتے ہیں، باقی ویسے وہ زیادہ تر مصری پروگرام ہی سنتے ہیں۔ ہمارا اپنا مشاہدہ تو یہی ہے۔ جدہ سے چل کر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ہم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، ہمارے ذہن میں تو قدیم مکہ کا نقشہ تھا جہاں مکہ کی ناہموار گلیوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم لوگوں کو توحید اور امن وسلامتی کا پیغام سناتے اور ان کی طرف سے اذیتیں جھیلتے تھے لیکن اب تو وہ حالت نہیں رہی، جس راستے سے ہم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ اس پر واقع چوراہوں میں چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے، جو پھولوں سے اٹے ہوئے تھے۔ پُرپیچ گلیوں کی جگہ بڑی بڑی سڑکیں تھیں، ڈرائیور ہمیں محلہ مسفلہ کے اندر معلم محمد ہاشم سندھی کے ہاں لے گیا۔ معلم صاحب کو اپنے جدہ کے وکیل کے ذریعہ ہماری آمد کا پہلے سے ہی علم تھا اور وہ ہمارے خیر مقدم کے انتظار میں تھے، انہوں نے ہمیں شروع میں تو اپنی کوٹھی پر مہمان رکھا اور دوپہر کو عربی دستور کے مطابق ہماری پُرتکلف دعوت کی اور پھر ہم سب ایک کرائے کے مکان میں منتقل ہوگئے جو صرف موسم حج کے لئے ایک ہزار ریال پر حاصل کیا گیا تھا۔ حسن اتفاق سے یہ مکان ایک مدنی نوجوان عالم سید حافظ عبدالجلیل کا تھا، جو حنبلی مشرب کے تھے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے پیرو معلوم ہوتے تھے، لیکن ان میں تعصب کا نام ونشان تک نہ تھا۔ بدقسمتی سے یہ مرض اپنے ہاں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور یہیں معمولی معمولی اختلافی مسائل پر لڑائیاں ہو جاتی ہیں۔

ان صاحب سے میری آزادانہ علمی باتیں ہوتی تھیں، مجھے اگرچہ وہ حنفی مذاق کا عالم سمجھتے تھے۔ لیکن وہ میری وسعت معلومات سے بڑا متاثر ہوتے تھے۔ وللہ الحمد۔ ان نوجوان عالم سے اعلام حجاز کے متعلق عموماً اور مکہ مکرمہ کے متبحر علماء کے متعلق خاص طور پر بڑی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

مناسکِ حج کے سلسلہ میں ہمارا احرام عمرہ کا تھا، لہٰذا طوافِ بیت اللہ، سعی صفا و مروہ اور سر منڈانے کے بعد ہم لوگ حالت احرام سے نکل آئے۔ اس کے بعد بارگاہ خداوندی میں عبادت کا یہ عالم تھا کہ بس طواف پر طواف اور صبح و شام حرم بیت اللہ کی حاضری رہتی تھی۔ مجھے تو وہاں کے مدارس اور علما کی مجالس میں بھی جانا پڑتا تھا۔ باقی میرے دونوں ساتھی شب و روز عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

بیت اللہ میں پہلے ہی روز ایک بخاری عالم سے ملاقات ہوئی جنہیں وہاں مخدوم بخاری کہا جاتا ہے۔ مسجد الحرام میں یہ دستور ہے کہ مکہ مکرمہ کے وہ علما اور صلحاء جو کہ حرم میں وعظ کرنے اور درس دینے کے مجاز ہیں مغرب کی نماز سے پہلے وہاں پہنچ جاتے ہیں، جیسے ہی نماز مغرب سے فراغت ہوتی ہے ہر ایک عالم طلبہ یا عوام کے ایک اجتماع سے خطاب کرتا ہے۔ اسی طرح سارے حرم میں آپ کو مختلف اجتماع نظر آئیں گے، باب عمرہ کے قریب مجھے اس قسم کا ایک اجتماع نظر آیا۔ عین وسط میں ایک معمر بخاری عالم عالمانہ رعب و داب سے بیٹھے ہیں، لوگ آتے ہیں۔ ان سے مصافحہ کرتے ہیں مسائل پوچھتے ہیں، کچھ ہندوستانی اور پاکستانی حجاج ہاتھ چومنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ بزرگ جھٹکا دے کر ایسے لوگوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتے ہیں اور پھر ان کو سمجھاتے ہیں میں بھی آگے بڑھا۔ اپنا مختصر تعارف کرایا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نے علامہ عبیداللہ سندھی سے استفادہ کیا ہے، علامہ موسیٰ جاراللہ کو جانتا ہوں اور ان کی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔ اور انقلاب روس سے لے کر اب تک کے واقعات اپنی پرانی یادداشت سے سنانے لگے۔

میں نے ان کو تفسیر الہام الرحمٰن جلد اوّل جمع و ترتیب علامہ موسیٰ جاراللہ کا ایک نسخہ ہدیہ کے طور پر پیش کیا اسے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے، اور علامہ موسیٰ جاراللہ کے متعلق یہ قصہ سنایا۔ حضرت علامہ سے میری پہلی ملاقات انقلاب بخارا سے پہلے ہوئی تھی جب وہ بخارا میں علماء کے ایک اجتماع میں شامل ہونے کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ جوان تھے اور میں چھوٹا تھا۔ اور ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک

مقامی عالم نے میرے استاد سے یہ دریافت کیا کہ علامہ موسیٰ کی مونچھیں بڑی معلوم ہوتی ہیں میرے استاد نے اس کو ڈانٹ کر یہ جواب دیا کہ خاموش ہو جا! موسیٰ کی مونچھ کا ایک بال ان باریش بزرگوں کی داڑھیوں پر فضیلت رکھتا ہے۔

مخدوم بخاری فرمانے لگے کہ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب علامہ موسیٰ جاراللہ کے بعض تحقیقی رسائل کے خلاف استنبول کے شیخ الاسلام علامہ مصطفیٰ صاحب موقف العقل والنقل نے فتویٰ صادر کیا تھا فرمانے لگے کہ علمائے حق کے خلاف ہر زمانے میں اس قسم کا شور و غوغا ہوتا رہا ہے پھر شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نام لیا اور کہا کہ ان کے خلاف کیا نہیں ہوا۔ کہنے لگے کہ جب روس کا بخارا پر تسلط ہوا تب کہیں جاکر ہمارے بزرگ علماء کی آنکھیں کھلیں اور ان کو علامہ موسیٰ جاراللہ کی قبل از انقلاب والی نصیحتیں یاد آئیں۔ علامہ موسیٰ اگرچہ حنفی المشرب تھے لیکن ان میں وہ جمود نہیں تھا جو دوسرے علماء میں تھا۔ انقلاب روس کے بعد جب وہ ہمارے ہاں تشریف لائے تو وہاں کے چند علماء ان سے ملے اور ان سے یہ استفسار کیا جو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہاں موسیٰ صاحب! یہ بتلائیے کہ ماوراء النہر کے مسلمانوں پر روس کا کیوں تسلط ہوا؟ خدا تعالیٰ نے ہماری کیوں مدد نہ فرمائی؟ وغیرہ وغیرہ' علامہ مرحوم جوش میں آکر فرمانے لگے کہ خدا تمہاری مدد کیونکر کرتا۔ تم نے تو عدالتوں میں فیصلہ سناتے ہوئے کبھی یہ نہ کہا کہ اللہ نے یہ فرمایا یا اس کے پیغمبرؐ کا یہ فرمان ہے" تم تو صرف فقہا کا نام لیتے رہے، اب فقہاء ہی آکر آپ کی مدد کریں!!

مخدوم بخاری نے علامہ موسیٰ جاراللہ مرحوم کی دیار حبیب اور حرم مکہ سے محبت کا ایک قصہ سنایا۔ کہنے لگے کہ مجھے جب مکہ مکرمہ میں یہ معلوم ہوا کہ علامہ موسیٰ جاراللہ مصر میں صاحب فراش ہیں اور یہ ان کا مرض موت تھا تو میں نے صرف ان کی مزاج پرسی اور زیارت کے لئے قاہرہ کا سفر کیا۔ علامہ مرحوم نہایت علیل تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ ایک بخاری عالم مکہ مکرمہ سے ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوا ہے، تو انہوں نے فوراً اندر بلا لیا اور مجھے دیکھ کر رونے لگے اور کہا کہ کیا میں اتنا بڑا آدمی ہوں کہ حرم مکہ سے ایک شخص تکلیف اٹھا کر مجھے دیکھنے کے لئے قاہرہ پہنچے۔ یہ کہہ کر پھر رونے لگ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ یا شیخ! آپ کی آنکھوں نے شیخ محمد عبدہ اور رشید رضا جیسے بزرگوں کو دیکھا اور ان کے درس میں بیٹھنے کا آپ کو فخر حاصل ہے۔ میں تو اس کو بڑی بات تصور کرتا ہوں۔ یہ سن کر فرمانے لگے کہ ہاں! میں ہوں تو گنہگار لیکن یہی ایک امید ہے کہ بزرگوں کے طفیل

بخشا جاؤں۔

مخدوم بخاری چالیس سال سے مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہیں۔ وہ دن کو مدرسہ تحفیظ القرآن میں درس دیتے ہیں اور مغرب کے بعد حرم میں وعظ و نصیحت فرماتے ہیں۔ دو بار مجھے بھی مسجد الحرام میں ان کی عربی تقریر کی اردو میں ترجمانی کرنی پڑی، لیکن میں نے دیکھا کہ حرم میں اس طرح خطاب کرنے سے طبیعت میں کچھ بڑائی پیدا ہونے لگی اس لئے عمداً میں نے ترجمانی چھوڑ دی باقی مخدوم بخاری سے علمی ملاقاتیں میں ان کے دولت خانہ واقع گلی بخاری متصل باب سعود پر حاضر ہو کر کرتا رہا۔ مخدوم بخاری نے مجھے کئی کتابیں ہدیہ کے طور پر عنایت فرمائیں، ان میں کچھ وہ رسائل بھی ہیں جو کہ علامہ موسیٰ جاراللہ کے خلاف یا تائید میں لکھے گئے ہیں۔

مکہ مکرمہ میں چار بڑے عالم مانے جاتے ہیں، جن کو "علم حجاز" کہا جاتا ہے، ان میں سے دو تو گوشہ نشین ہو گئے ہیں اور لوگوں سے کم ملتے ہیں۔ ایک صاحب حکومت کی ملازمت میں ہیں، باقی چوتھے عالم سید علوی مالکی ہیں، جن کی علمی محفل کے متعلق سنا تھا ہمیشہ گرم رہتی ہے۔ وہ حرم میں بعد نماز مغرب مقام ابراہیم کے محاذات میں مسجد الحرام کی چھت کے نیچے درس حدیث دیتے ہیں۔ ۲۴ اپریل کی شام کو حرم میں ان کی خدمت میں پہنچا، جب میں نے انہیں اپنا نام بتایا تو نہایت ہی بے تکلفانہ انداز میں مجھ سے معانقہ کیا اور فرمانے لگے کہ میں آپ کو غائبانہ جانتا ہوں، اور میں نے آپ کا نام سنا ہے۔ یہ مشفقانہ جملے فرما کر مجھے بالکل اپنے قریب بٹھایا۔ اس کے بعد صحیح بخاری کا درس دینے میں مشغول ہو گئے۔ سامعین کا بڑا ہجوم تھا۔ ایک حضرمی شاگرد جس کے چہرہ پر ابھی بال بھی نہیں آئے تھے عربی لہجہ میں عبارت پڑھ رہا تھا اور شیخ فصیح عربی میں اس کی شرح کرتے جاتے تھے۔

سید علوی مالکی کی اپنے ہمعصروں میں جو امتیازی خصوصیت ہے وہ ان کی فصاحت ہے آپ بہت بڑے ادیب اور فصیح اللسان عالم ہیں، میرے بزرگ دوست مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث دارالعلوم نیو ٹاؤن کراچی جو کہ عرب کے علماء سے اچھا تعارف رکھتے ہیں اور بالعموم سال بسال حج کے لئے جاتے رہتے ہیں اور اس سال بھی تشریف لے گئے تھے وہ بھی سید علوی مالکی کی فصاحت بیانی کے معترف ہیں۔

شیخ علوی مالکی کے درس کی دوسری خاص چیز جو مجھے نظر آئی، وہ تھی ان کی رجالِ سند پر بحث۔ اپنے

ہاں شرح حدیث پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور کہیں کہیں اختلافی مسائل میں اسناد کے رجال پر کچھ کہا جاتا ہے، لیکن سید علوی مالکی کو دیکھا کہ وہ درس کے دوران ہر سند کے ایک ایک راوی کے سلسلۂ نسب اور اس کے سوانح حیات بیان کرتے چلے جاتے تھے یہ ان کی غیر معمولی قوت حافظہ کی دلیل ہے۔ یہ درس عشاء کی اذان تک جاری رہا درس سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے شام و عبر کے علماء اور اپنے صاحبزادہ سید محمد علوی سے میرا تعارف کرایا اور دوسرے دن بعد صلوٰۃ عصر اپنے دولت خانہ پر حاضر ہونے کے لئے کہا۔

دوسرے روز بعد صلوٰۃ عصر پروفیسر سید فخرالحسن صاحب کو ساتھ لے کر علامہ علوی مالکی کے دولت خانہ پر پہنچا جو کہ سلیمانیہ میں واقع ہے۔ شیخ کی علمی محفل گرم تھی۔ علماء اور معتقدین کا ایک جم غفیر حاضر تھا۔ اور آپ سوڈانی علما سے خطاب فرما رہے تھے۔ سوڈان میں زیادہ تر مالکی مذہب رائج ہے اس لئے اکثر سوڈانی شیخ علوی کے ہاں آتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی سید علوی مرجع علماء و صلحا ہیں۔ جیسے ہی انہوں نے مجھے آتے دیکھا مرحبا کہتے کے لئے اٹھے۔ معانقہ اور مصافحہ کیا اور جس تکیہ سے لگ کر خود بیٹھے تھے وہیں مجھے بٹھا دیا۔ یہ ان کی کرم فرمائی تھی۔ میں نے پروفیسر فخرالحسن صاحب کا بھی شیخ سے تعارف کرایا بڑے خوش ہوئے، اور پھر سوڈانی زائرین سے مصروف گفتگو ہو گئے۔ اس وقت سوڈانیوں سے یہ فرما رہے تھے

> یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ عوام کو علما سے الگ رکھا جائے اور اس کا نتیجہ الحاد ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب علما صالح اور اچھے ہیں۔ ان میں سے کچھ علماء سوء اور فتنہ پرداز بھی ہوتے ہیں۔ ان سے بچیں، صلحا کا کہا مانیں اور ان سے علم دین سیکھیں۔ جب تک قرآن موجود ہے کوئی اس کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اس مرحلے پر سوڈانیوں نے سید صاحب سے استفسار کیا کہ ہمارے مالکی علماء کی دو جماعتیں ہیں ایک جماعت نماز میں ہاتھ باندھنے پر زور دیتی ہے اور دوسری اس کی زبردست مخالفت کرتی ہے جواب میں سید علوی مالکی نے فرمایا کہ:۔

> اس مسئلہ میں امام مالک سے دو روایتیں ہیں ایک روایت مؤطا کی ہے جس سے عقد (ہاتھ باندھنا) ثابت ہوتا ہے اور دوسری روایت مدونہ کی ہے جس سے اِرسال (ہاتھ

چھوڑ کر نماز پڑھنا) کا ثبوت ملتا ہے اور یہی روایت فقہ مالکی میں رائج ہے، لیکن میرا دونوں روایتوں پر عمل رہا ہے کبھی عقد کرتا ہوں تو کبھی ارسال۔

اور پھر فرمایا۔

جو کوئی اس مسئلہ میں جھگڑا کرتا ہے وہ دراصل فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتا ہے ایسے لوگوں سے بچنا چاہیئے۔

سوڈانیوں نے پھر سوال کیا کہ ہمارے ہاں اولیاء اللہ کے طُرق میں اختلاف پایا جاتا ہے اس کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟

سید علوی صاحب اس سوال کے جواب میں فرمانے لگے کہ قادریہ، شاذلیہ اور دوسرے سب طریقے اصل میں وصول الی اللہ کی شاہراہیں ہیں۔ ان کے بارے میں آپس میں جھگڑنا مناسب نہیں آپ لوگوں کو تمام اولیاء اللہ کی عزت کرنی چاہیئے کیونکہ حدیث میں کسی بھی ولی اللہ سے دشمنی رکھنے پر وعید وارد ہوئی ہے۔ اولیاء اللہ کے مختلف طرق کی مثال یوں سمجھئے کہ دیکھئے حرم کے کئی دروازے ہیں ان میں سے کسی بھی دروازے سے کوئی شخص داخل ہو وہ حرم میں پہنچ جائے گا۔ اولیاء اللہ کے طریقے بھی اسی طرح ہیں۔

اس کے بعد سید صاحب نے مندرجہ ذیل کتابیں مجھے ہدیتاً عنایت فرمائیں:۔

۱۔ فتح القریب المجیب علی تہذیب الترغیب والترہیب (۲) العقد المنظم فی اقسام الوحی المنظم۔ (یہ دونوں کتابیں ان کی اپنی تالیف ہیں) (۳) رسائل ہامۃ فی الصلوۃ۔ سید زینی دحلان۔ (۴) عقیدۃ الاسلام تالیف شیخ عبداللہ بن علوی الحداد۔

میں نے لمحات تالیف شاہ ولی اللہ صاحب مع مقدمہ و حواشی از احقر راقم ان کی خدمت میں ہدیتاً پیش کی۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور شاہ صاحب کے علوم اور کتابوں کی تعریف کرنے لگے اور فرمایا کہ میں نے شاہ صاحب کی وہ کتابیں جو مجلس علمی کی طرف سے شائع ہوئی ہیں (ڈابھیل۔ سیدہ) المسوی شرح الموطا کی اجازت علامہ عبیداللہ سندھی سے حاصل کی تھی۔

سید علوی صاحب نے علامہ سندھی کی بھی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ میں نے ان سے تبرکاً صحاح ستہ کی

ابتدائی روایات پڑھ کر ان کے طریقے کی اجازت حاصل کی اور فرمایا کہ شیخ سیاست اور انگریزوں کی مخالفت میں منہمک تھے۔

میں سید علوی کی علمی مجالس میں اکثر حاضر ہوتا تھا۔ ان کے صاحبزادہ سید محمد علوی نے اس احقر سے حجۃ اللہ اور شیخ الرئیس کا ایک رسالہ پڑھنے پر اصرار کیا، مشاغل کثیرہ کے باوجود ان کے اصرار پر مجھے اس کے لئے کچھ وقت نکالنا پڑا۔

۲۶ راپریل کو جیسے ہی عصر کی نماز سے فارغ ہوا، اپنے ایک قدیم دوست قاری رعایت اللہ صاحب سے ملاقات ہو گئی ان کی معیت میں دار الندوہ کو دیکھا جو کعبۃ اللہ کے شمال میں واقع ہے۔ حرم کی توسیع کے سلسلہ میں اس طرف تعمیر ہو رہی تھی اس لئے دار الندوہ کا کچھ حصہ گرایا جا چکا تھا۔ آئندہ تو اس کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ افسوس ہے اس قسم کے آثار قدیمہ کی طرف حکومت کوئی توجہ نہیں دیتی شاید اس کے نزدیک غالباً ان کو بھی بدعت شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مولد النبیؐ کی زیارت نصیب ہوئی، جہاں اب ایک لائبریری قائم کی گئی ہے، وہاں سے لوٹ کر مدرسہ صولتیہ کے دفتر میں پہنچا جو باب السعود کے قریب روڈ پر واقع ہے اور اکثر و بیشتر پاکستان اور ہندوستان کے علما آتے رہتے ہیں۔ اسی روز مدرسہ صولتیہ میں بعد نماز جمعہ علما کا بڑا اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں پاکستانی علماء میں سے مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں ہندوستان کے علماء میں سے مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کو پہچانتا تھا۔ دفتر مہمانوں سے پُر تھا، مدرسہ کی طرف سے عربی طرز کا کھانا پیش کیا گیا۔ میزبانی کے فرائض حضرت مولانا حافظ محمد سلیم صاحب ناظم مدرسہ صولتیہ فرما رہے تھے۔ اور ان سے میرا تعارف پہلے ہی ہو چکا تھا، دوسرے بزرگوں سے مولانا بنوری صاحب نے میرا تعارف کرایا۔

اس اجتماع میں خاص طور پر زیر بحث مسئلہ اس فحش اور عریاں عربی لٹریچر کا تھا، جو کہ لبنان اور امریکہ کی طرف سے مکہ مکرمہ میں دھڑادھڑ پہنچ رہا ہے، سب علماء نے متفق طور سے علی میاں سے کہا کہ حکومت کی توجہ ادھر مبذول کرائیں لیکن آپ نے معذرت کی۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ کے مدارس کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ مکہ مکرمہ میں صرف

تین مدارس تھے جو حکومت کے تسلط سے آزاد تھے۔ ان کا نصاب تعلیم بھی اپنا تھا۔ (۱) مدرسہ صولتیہ (۲) مدرسہ الفلاح (۳) مدرسہ دارالحدیث خیریہ۔ مدرستہ الفلاح کے منتظمین نے تو حال ہی میں اپنا مدرسہ حکومت کے حوالہ کر دیا ہے اور اب وہاں سرکاری مدارس والا نصاب جاری ہے۔ اپنے دونوں ساتھی بر دفیسر دن کی معیت میں اس مدرسہ کی زیارت کی۔ اچھی خاصی بلڈنگ ہے۔ سید علوی مالکی اور سید محمد مغربی بتانی جیسے مشاہیر علماء اس مدرسہ میں درس دیتے تھے۔

دارالعلوم حرم صولتیہ کے موسس مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ہیں۔ حضرت مولانا قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ماہ جمادی الاول ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عثمانؓ سے ملتا ہے بارہ برس کی عمر میں قرآن ختم کرنے کے ساتھ ساتھ دینیات اور فارسی کی کتابیں اپنے بزرگوں سے پڑھیں اس کے بعد دہلی لبغرض تعلیم تشریف لے گئے اور مولانا محمد حیات صاحبؒ کے مدرسہ میں داخل ہوئے تحصیل علم کا شوق مولانا کو لکھنو لے گیا اور مفتی سعد اللہ صاحب سے آپ کو شرف تلمذ حاصل ہوا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کے اساتذہ کے اسمار گرامی درج ذیل ہیں۔

۱۔ مولانا محمد حیات صاحب (۲) مفتی سعد اللہ صاحب (۳) مولانا احمد علی صاحب بڈولی ضلع مظفر نگر جو آخر میں وزیر ریاست پٹیالہ ہوگئے تھے۔ (۴) عارف باللہ مولانا عبد الرحمٰن صاحب چشتی۔ یہ استاد شاہ وقت تھے تمام علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

ہندوستان میں مولانا رحمت اللہ کے درس و تدریس کا زمانہ بہت کم ہے کیونکہ نصاریٰ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی فکر نے آپ کو اس کا موقع نہ دیا، چند سال دربار کیرانہ کی مسجد میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسہ کے فیض یاب طلبہ میں سے چند خاص نام درج ذیل ہیں۔ ہندوستان میں مولانا کے جو خاص تلامذہ تھے ان میں سے بعض اصحاب نے مکہ معظمہ بھی پہنچکر مولانا نے شرف تلمذ حاصل کیا۔

۱۔ مولانا عبد السمیع صاحب۔ رامپوری۔ مصنف حمد باری (۲) مولانا احمد الدین صاحب چکوالی۔ یہ بزرگ بہت بڑے ادیب اور عالم تھے۔ کراچی سندھ میں بھی انہوں نے دیکھا تھا۔ سندھ کے مشہور عالم مولانا صادق صاحب کھڈہ والہ نے مولانا چکوالی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ (۳) مولانا نور احمد صاحب امرتسری (۴)، مولانا شاہ

ابوالخیر صاحب (۵) مولانا عبدالوہاب صاحب دیلوری بانی مدرسہ باقیات الصالحات مدراس (۶) مولانا بدرالاسلام صاحب عثانی کیرانوی مہتمم حمیدیہ کتب خانہ شاہی قسطنطنیہ وغیرہم مولانا رحمت اللہ صاحب ہندوستان میں درس وتدریس کے ساتھ ردِّ نصاریٰ کی مہمات میں بھی مصروف رہے یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی مشنریوں نے ہندوستان میں اسلام کے خلاف زبردست مہم جاری کر رکھی تھی۔ پادری فنڈلا Revd. C. G. Fander) اور اس کی جماعت کے لوگ اسلام کے خلاف بڑی دل شکن تقریریں کرتے پادری فنڈر کی کتاب "میزان الحق" سے عوام سہمے ہوئے تھے عیسائی مشنریوں کی ان جارحانہ کارروائیوں کے خلاف علمائے اسلام نے تیاری شروع کی اور مقابلہ کے لئے میدان میں آگئے اسلام کی حقانیت اور اللہ کا نام بلند کرنے کے لئے ردِّ نصاریٰ کی اس مذہبی جنگ کے قائدِ اوّل حضرت مولانا رحمت اللہ تھے۔ آپ نے اعلان فرمایا۔

"میں نے ہندوستان کے سب سے بڑے پادری جو علمائے مسیحین میں ممتاز حیثیت کا مالک اور میزان کا مصنف تھا اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرے ساتھ مجمع عام میں مناظرہ کرے تاکہ حق واضح ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ علمائے اسلام نے ان رسائل کی تردید اس لئے نہیں کی کہ وہ عاجز تھے بلکہ جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے[1]

بالآخر وہ مناظرہ ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو کٹرہ عبدالمسیح اکبرآباد آگرہ میں منعقد ہوا۔ مولانا کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فنڈر کے ساتھ پادری فرنچ تھے۔ مولانا رحمت اللہ نے نسخ وتحریفِ انجیل پر فاضلانہ بحث کی اور خود عیسائیوں کی مطبوعات سے نسخ وتحریف ثابت کر دی چنانچہ پادری فنڈر کو اعتراف کرنا پڑا کہ انجیل میں سات آٹھ جگہ تحریف ہوئی ہے اور یہ لکھ کے بھی دے دیا۔ تین دن تک مسلسل یہ مجلس مناظرہ منعقد رہی اور پادری صاحب کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔

حضرت مولانا نے فتنۂ مسیحیت کے استیصال کی غرض سے جو کتابیں ردِّ نصاریٰ میں تالیف کیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اظہار الحق۔　　　　(مسلسل)

---

[1] اظہار الحق ص۳

تنقید و تبصرہ

مفردات القرآن

تصنیف امام راغب اصفہانی رحمتہ اللہ علیہ

ترجمہ و حواشی الاستاذ محمد عبدہ الفلاح الفیروزپوری

مولانا محمد عبدہ، جامعہ محمدیہ اوکاڑہ ضلع منٹگمری (مغربی پاکستان) نے امام راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ کی مشہور و معروف کتاب "المفردات فی غریب القرآن" کو اردو قالب میں ڈھال کر ایک بڑا کام کیا ہے قرآن مجید کے مفرد الفاظ کی تشریح میں امام صاحب کی یہ تصنیف اس باب میں سب سے بہتر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ گو اس موضوع پر اور کتابیں بھی تصنیف ہوئیں، لیکن جو شہرت اور امتیاز امام راغب کی مفردات کو حاصل ہوا، دوسری کتابیں اس سے محروم رہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ کا مفہوم معین کرنے میں سب سے زیادہ مدد اس کتاب سے لی جاتی رہی ہے اور نہ صرف اصحاب تفسیر اس کی طرف رجوع کرتے تھے، بلکہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی جیسے جلیل القدر شارحین حدیث بھی المفردات سے استفادہ کرتے رہے ہیں نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:۔

از رجال این طبقہ ابوالقاسم حسین راغب اصفہانی است صاحب احتجاج القرآن در قرأۃ مفردات القرآن و دریں باب اعتماد جمہور مفسرین بر تحقیقات اوست (المتوفی ۵۰۲ھ)

قرآن مجید کے غریب و مشکل الفاظ کی تشریح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں۔

"و من احسنها المفردات للراغب"

مولانا محمد عبدہ کا یہ ترجمہ ۱۰۰۰ صفحات پر ہے۔ اور اسے دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ ترجمہ کا

یہ کام کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ اصل عربی کتاب اور اس کے ترجمے کا مقابلہ کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

راقم الحروف نے جستہ جستہ مقامات پر اصل عبارت اور اس کا جو ترجمہ کیا گیا ہے دونوں کا مقابلہ کیا ہے ترجمے میں مولانا محمد عبدہ کو جو محنت عرق ریزی اور تحقیق کرنی پڑی ہے اور اپنی طرف سے حاشیئے لکھنے کے لئے انہوں نے جو حوالے بہم پہنچائے ہیں، اور اس کے لئے جتنی جان کاہی کی ہے، یہ سب دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس طرح کا مہتم بالشان کام غیر معمولی دلی لگن اور خدمتِ دین کے سچے اور حقیقی جذبے سے ہی ہو سکتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مترجم کو اس کا حصہ وافر عطا فرمایا ہے۔

اصل کتاب میں، ظاہر ہے، قرآن مجید کے مفردات عربی میں ہیں۔ اور ان کے مشتقات اور ان سے متعلق حوالے بھی عربی ہی میں ہیں البتہ جہاں جہاں مصنف نے ضرورت محسوس کی ان مفردات اور ان کے مشتقات اور حوالوں کی مختصراً تشریح کردی ہے۔ مترجم کو اصل الفاظ و عبارات بعینہٖ نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں ان سب کا ترجمہ بھی کرنا پڑا ہے۔ اور یہ واقعی بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ موصوف نے ایک اور کام یہ بھی کیا ہے کہ ہر آیت جو مفردات کے ضمن میں دی گئی ہے، اس کے ترجمے کے ساتھ ساتھ اس کے اور جس سورۃ میں وہ آئی ہے اس سورۃ کے نمبر بھی دے دیئے ہیں، جس سے قرآن مجید میں انہیں تلاش کرنا بڑا آسان ہو گیا ہے۔

راقم الحروف کو اصل کتاب اور زیر نظر ترجمہ دونوں کے بالتفصیل تو نہیں، البتہ سرسری طور سے مطالعے اور مقابلے کا موقع ملا ہے اور جہاں تک میں دونوں کا جائزہ لے سکا ہوں مولانا محمد عبدہ صاحب اس کار عظیم میں بڑے کامیاب رہے ہیں اور انہوں نے امام راغب کی مفردات کا بڑا اچھا ترجمہ کیا ہے۔

مثال کے طور سے لفظ بکّۃ لیجئے۔ اس لفظ کی تشریح کا ترجمہ یوں دیا گیا ہے :- بکّۃ مجاہدؓ سے منقول ہے کہ یہ اصل میں مکّۃ ہے اور اس میں باء میم سے بدل ہے جیسا کہ سبد راسہ و سمدہ و ضربۃ لازب و لازم میں ہے، قرآن میں ہے انّ اوّل بیتٍ وُضع للنّاس للّذی ببکّۃ مبارکاً۔ پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکّے میں ہے بابرکت (۳-۹۶)

بعض کا قول ہے کہ بکّہ سے اندرون مکّہ مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مسجد کا نام ہے۔ بعض کا

خیال ہے کہ یہ تَبَاکٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ازدحام کے ہیں۔ اور وہاں چونکہ طواف کے لئے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لئے اس کو بکّۃ کہا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بکتہ بکٌ (ن) سے مشتق ہے، جس کے معنی مزاحمت کرنے اور پہاڑ ڈالنے کے ہیں۔ چونکہ سنت الٰہی جاری ہے کہ جو ظالم وہاں الحاد و ظلم پھیلانا چاہتا ہے اس کی گردن توڑ دی جاتی ہے۔ اس لئے اس کا یہ نام ہے۔"

امام راغب کی "المفردات فی غریب القرآن" قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ایک کلید کی حیثیت رکھتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اہل علم اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ اسی کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کتاب کے اردو میں ترجمہ ہو جانے سے کم عربی جاننے والے حضرات جو اردو جانتے ہیں خود قرآن مجید کو براہ راست سمجھنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اس اعتبار سے مولانا محمد عبدہ صاحب کی یہ علمی خدمت خیر و برکت اور رشد و ہدایت کا ایک مستقل منبع ثابت ہوگی۔

ہمیں امید ہے، کوئی کتب خانہ اس کتاب سے خالی نہیں رہے گا، نیز جن حضرات کو خداوند تعالےٰ نے قرآن مجید کے مطالعے کا شوق ودیعت کیا ہے، وہ اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے۔

"مفردات القرآن" اردو ترجمے کے دو حصے ہیں، اور دونوں کی مجموعی قیمت قسم اوّل چالیس روپے اور قسم دوم تیس روپے ہے۔

ملنے کا پتہ:- محمد شمس الدین بک سیلر زیر مسلم مسجد بیرون لوہاری گیٹ، لاہور

(ا۔ س)

مخدوم جہانیاں جہاں گشت

از محمد ایوب قادری
ناشر ادارہ "تحقیق و تصنیف" ۱۴۱/۱ حیدرآباد ۱۸

جناب محمد ایوب قادری ایم اے لیکچرار اردو۔ اردو کالج کراچی "تذکرہ علمائے ہند" اور "علم و عمل" جیسی تاریخی و تحقیقی کتابوں کے سلسلے میں علمی دنیا میں کافی متعارف ہیں موصوف نے زیر نظر کتاب میں حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری اچی المتوفی ۷۸۵ھ / ۱۳۸۳ء کے مفصل حالات و سوانح مرتب فرما کر اپنے ذوق تحقیق کا ایک بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اپنے دور کی ایک بڑی اہم شخصیت تھے۔

ایوب صاحب نے ان تمام علمی مصادر سے جن تک کہ ان کی رسائی ممکن تھی، حضرت مخدوم کے حالات جمع کر کے ان کا تاریخی محاکمہ کیا ہے۔ اور ہمارے سامنے آپ کی ایک صحیح تاریخی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت میں ۷۰۷ھ میں اوچ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں ریاست بہاولپور میں واقع یہ شہر روحانی اور تبلیغی سرگرمیوں کا بڑا مرکز تھا۔ اور اس کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عہد اکبر میں لکھا تھا۔

"گویند زمین اوچ و صحرائے او کیفیتے و حالتے دارد کہ در زمین ہائے دیگر نیست"

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے جد امجد حضرت جلال سرخ بخاری بخارا سے ان دیار میں تشریف لائے تھے۔ آپ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی سے جن سے برصغیر ہند و پاکستان میں سہروردی سلسلے کو فروغ ہوا، مستفیض ہوئے اور پھر اوچ میں سکونت فرمائی۔ آپ کے فرزند احمد کبیر سہروردی تھے، جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے والد ماجد ہیں حضرت مخدوم کا خاندان صاحب رشد و ہدایت تھا۔ اور اوچ میں اس کی اپنی خانقاہ تھی۔ حضرت مخدوم نے اوچ ہی میں اس زمانے کے مروجہ علوم پڑھے پھر آپ ملتان تشریف لے گئے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کے پوتے اور ان کے سجادہ نشین شیخ رکن الدین ابو الفتح نے آپ کے لئے تعلیم کا انتظام کیا۔ آپ جب علوم ظاہری سے فارغ ہو کر واپس اوچ پہنچے تو سلطان محمد تغلق نے آپ کو شیخ الاسلام مقرر کیا، جسے آپ نے قبول نہ کیا اور حجاز مقدس کو روانہ ہو گئے۔

حضرت مخدوم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔ "سلطان محمد تغلق نے مجھ کو شیخ الاسلام کیا اور چالیس خانقاہیں میرے تصرف میں کر دیں۔ شیخ (رکن الدین ابو الفتح)[1] مجھ کو خواب میں دکھائی دیئے۔ کہا تو حج کو چلا جا تو غرق ہو جائے گا۔ صبح کو شیخ کے امام نے کہا کہ جلد روانہ ہو جا۔ کیا تیاری کرتا ہے، شیخ نے تجھے اشارہ کیا ہے۔ میں نے مخدوم والد سے اجازت چاہی، روانہ ہو گیا۔۔۔"

مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم اس طرح کم و بیش دس بارہ سال باہر رہے۔ ان میں سے سات سال

---

[1] اس وقت آپ کا وصال ہو چکا تھا۔

آپ کے مکہ معظمہ میں اور دو سال مدینہ منورہ میں گزرے، ان دونوں مقامات میں آپ نے بعض مشائخ سے تحصیل علم کیا اس کے علاوہ سفر و سیاحت کے دوران میں آپ جہاں بھی گئے وہاں کے علماء و صوفیاء سے استفادہ فرمایا۔ چنانچہ آپ جب لوٹے تو علوم شریعت و طریقت میں آپ کا کوئی نظیر نہ تھا۔ بقول مصنف :۔ حضرت مخدوم کے علم و فضل کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں ۔ " مخدوم جہانیاں) جامع است میان علم و ولایت " اور صاحب تاریخ فرشتہ کا بیان ہے :" سید جلال الدین حسین بخاری عالم متبحر تھے۔ اور علوم عقلی و نقلی میں آپ نے نہایت مشقت کھینچی تھی اور مقید اس امر کے نہ تھے کہ ایک سے مرید ہو کر دوسرے سے رجوع نہ کریں ۔۔۔"

صاحب مآثر صدیقی نے لکھا ہے " آپ علوم کتاب و سنت کے جوہر فرد اور کمالات باطنی کے معدن تہذیب اخلاق اور ملکات روحانی کے سہیل یمن تھے ۔"

چشتیہ سلسلے کے بزرگ عام طور سے بادشاہوں اور حاکموں سے دور رہتے تھے۔ اس کے برعکس ایوب صاحب لکھتے ہیں :۔ سہروردی سلسلے کے شیوخ کا مسلک ان سے جداگانہ تھا۔ وہ درباروں سے قریب رہ کر بادشاہ کو نصیحت کرنے، صحیح رائے اور مشورہ دینے، رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کرنے اور شریعت کے مطابق ان سے عمل کرانے کو ضروری خیال کرتے تھے ۔ چنانچہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی حضرت صدرالدین عارف، اور حضرت شاہ رکن الدین اسی مسلک پر قائم تھے۔ حضرت مخدوم نے بھی اپنے خانوادہ کے ان بزرگوں کی پیروی کی ۔ ان کا تعلق فیروز شاہ تغلق کے دربار سے نہایت مستحکم تھا۔ یہ نیک و عادل بادشاہ ان کے صلاح و مشورہ کو قبول کرتا اور اس پر عمل پیرا ہوتا۔ حضرت مخدوم بھی اس کے ساتھ پوری طرح تعاون کرتے ۔ ان کے نزدیک ہر سلطان عادل کی ہستی برگزیدہ تھی ۔ اور وہ اس کی اطاعت کو اطاعت خداوندی کے مترادف قرار دیتے تھے ۔"

آپ کی تصنیف خزانہ جلالی میں والیوں کی تعلیم کے بارے میں ایک باب ہے جس میں فرماتے ہیں :۔ مکہ مدینہ اور خراسان کے مشائخ نے اس خاکسار کو وصیت کی ہے کہ ہر حال میں حکمراں کا مخلص اور نیک خواہ رہنا چاہیئے اور ان کے پاس لوگوں کے کام کے لئے جانا چاہیئے ۔ اور ان کے تحائف قبول کرنے چاہیئں۔ اور یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ تمہارے پاس آئیں ۔ ایک مرتبہ حضرت مخدوم نے فرمایا کہ بادشاہ کے لئے

بددعا نہ کرنی چاہیئے، بلکہ اصلاح کی دعا کرنی چاہیئے کہ اے اللہ! تو امام و اُمت کو اور حاکم و محکوم کو صالح و درست کردے۔

سہروردی سلسلے کے بزرگوں کا بالعموم اور حضرت مخدوم کا بالخصوص اپنے عہد کے مسلمان سلاطین کے معاملے میں یہ نقطہ نظر تھا، چنانچہ وہ فیروز شاہ تغلق سے ملنے ہر دوسرے تیسرے سال دہلی جایا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کا بہت احترام کرتا تھا اور جہاں بھی قیام فرما ہوتے تھے، وہاں ملنے آیا کرتا تھا۔ کئی ایک ملکی مہمات میں حضرت مخدوم نے حصہ بھی لیا، اور ان کی کوششوں سے صلح و امن بحال ہوا۔

حضرت مخدوم صرف ایک صاحب طریقت بزرگ ہی نہ تھے کہ شاہی درباروں میں ان کا بڑا رسوخ تھا اور روحانی فیض کے طالب دور دور سے ان کی بارگاہ کا قصد کرتے تھے، بلکہ ان کے ہاں درس و تدریس کا بھی باقاعدہ انتظام تھا۔ دور و نزدیک سے طلبا "مدرسہ جلالی" میں آکر تعلیم حاصل کرتے۔ نامور عالم و واعظ مطالب قرآن و احادیث حل کرتے تھے۔ مریدین و معتقدین بالالتزام تفسیر و حدیث اور کتب تصوف کا درس لیتے تھے ..... (آپ) سات قرأتوں کے قاری تھے۔

..... حضرت مخدوم کے یہاں حدیث کا باقاعدہ درس ہوتا تھا۔ (آپ) فقہ میں مجتہدانہ حیثیت کے مالک تھے۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب پر کامل نگاہ رکھتے تھے۔ درس کے دوران ہر مذہب کا فرق بیان فرماتے اور پھر فقہ حنفی کی جامعیت کو ذہن نشین کراتے تھے۔

حضرت مخدوم سے جو جعلی و وضعی باتیں منسوب کردی گئی ہیں، ایوب صاحب نے بڑی تحقیق سے ان کی تغلیط بھی کی ہے۔ جیسے آپ کا مکہ معظمہ سے قدم شریف لانا اور ایک سفر نامہ جو آپ کے نام سے چھپا ہوا ملتا ہے۔

ایک باب حضرت مخدوم کے علمی آثار و ملفوظات کے متعلق ہے۔ مصنف نے بڑی محنت سے ان کے بارے میں جملہ معلومات اکٹھی کی ہیں اور بتایا ہے کہ آپ کے علمی آثار کس شکل میں اور کہاں کہاں ملتے ہیں۔ "کتابیات" کے ذیل میں کوئی ۱۶۰ کتابوں کے نام درج ہیں جن کی طرف اہل علم رجوع کرسکتے ہیں آخر میں اعلام اور کتابوں کے بارے میں اشاریہ (انڈکس) بھی دیا گیا ہے۔

غرض حضرت مخدوم جہاں گشت کے حالات و سوانح پر ایوب صاحب کی یہ ایک جامع کتاب ہے اور اس ضمن میں جہاں سے بھی ان کو مواد مل سکتا تھا، اسے حاصل کرنے میں انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

کتاب مجلد ہے، ضخامت ۳۰۴ صفحے اور قیمت مجلد کی سات روپے اور غیر مجلد کی چھ روپے

فلسفۂ اسلام

مصنفہ ڈی اولیری ڈی ڈی۔ لیکچرار آرامی و سریانی برسٹل یونیورسٹی

ترجمہ احسان احمد بی۔ اے (علیگ)

ڈاکٹر ڈی اولیری کی اس کتاب کا اردو ترجمہ بہت پہلے حیدرآباد دکن میں چھپا تھا اور وہاں جامعہ عثمانیہ میں یہ داخل نصاب رہا۔ اب چونکہ یہ اردو ترجمہ نایاب تھا اس لئے نفیس اکیڈمی کراچی نے اسے شائع کیا ہے اسلام سے قبل یونانی فلسفہ و حکمت اپنے یونانی ماحول سے جس طرح مشرق قریب میں آباد سریانی زبان بولنے والی قوموں میں پہنچا۔ وہاں سے یہ دنیائے اسلام میں عربی بولنے والوں کے ہاں منتقل ہوا اسے عربی زبان کا قالب ملا۔ اور اس کے مسلمانوں کے علوم و فنون اور نظریات و عقائد پر دور رس اثرات پڑے اور پھر جیسے سسلی اور اندلس کے راستے وہ مغربی یورپ کی لاطینی درس گاہوں میں پہنچا۔ اس نے عیسائی اور یہودی فکر کو متاثر کیا اور اس طرح یورپ میں پاپائی کلیسا کے خلاف ذہنی فضا پیدا کر کے وہاں نشاۃ ثانیہ کے لئے راستہ صاف کیا، جس نے کہ یورپ کے عہد حاضر کو جنم دیا۔ مصنف نے اپنی کتاب میں اس کا جائزہ لیا ہے۔

مصنف نے شروع میں ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عام طور سے انگریزی طریق تعلیم میں فلسفہ پر کچھ اس طرح بحث ہوتی ہے کہ فلسفہ کی ابتدا یونان سے ہوئی، اور وہ ارسطو پر آ کر ختم ہو گیا۔ پھر کئی صدیوں کے بعد ڈیکارٹ پیدا ہوا اور جدید فلسفہ کی طرح پڑی۔ اس درمیانی وقفے میں بقول مصنف "قدما کے بعض نالائق و ناخلف ورثا گزرے ہیں جو اس لائق نہیں کہ ان پر سنجیدگی سے سا تھ غور کیا جائے۔" مصنف اس نقطۂ خیال کی تردید کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ زندگی اسباب و نتائج کی ایک مسلسل کڑی ہے۔ اور جو حادثہ رونما ہوتا ہے، اس کی کوئی علت ہوتی ہے۔ جس دور کو ہم قرون وسطیٰ کہتے ہیں، اس کا ہمارے اس زمانے کے ثقافتی ارتقا میں بڑا اہم حصہ ہے اور وہ بہت کچھ اس ثقافتی ورثے کا مرہون احسان ہے

جو قدیم یونان سے سریانی، عربی اور عبرانی سے اس تک پہنچا۔ قرون وسطی کا یہ دور ظاہر ہے مسلمانوں کا دور ہے۔

کتاب کا پہلا باب "سریانی زبان میں یونانیت کی ترجمانی" ہے اس میں یہودیت اور عیسائیت پر یونانیت کے جو اثرات پڑے، ان کا ذکر ہے اور نو افلاطونیت اور نسطوری عیسائی فرقہ کا بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب "عربی دور" پر ہے اس میں عہد رسالت و خلافت راشدہ، اور عہد اموی کی سیاسی و ذہنی زندگی پر بحث کی گئی ہے مصنف کے نزدیک مدینہ کی زندگی مکہ کی زندگی سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اور وہاں آرامی و یہودی نو آبادکاروں کے اثرات راسخ تھے اس لئے مسلمانوں کی جماعتی زندگی بآسانی وجود میں آسکی مصنف لکھتا ہے کہ اموی دور ہی میں یونانی اثرات مسلمانوں میں متعدد جہتوں سے سرایت کرنے لگے۔ نیز اسی دور میں ان تمام قوموں نے عربی زبان کو اپنانا شروع کر دیا۔ جو اسلام کے زیر نگیں آئی تھیں۔ اس کے بعد دور عباسی آتا ہے۔ جس میں بڑے وسیع پیمانے پر یونانی علوم کے عربی میں تراجم ہوئے۔ اور ان کے نتیجے میں مسلمانوں میں طرح طرح کے فکری تحریکیں اٹھیں۔ اس ضمن میں مصنف معتزلہ اور اصحاب فلسفہ (کندی، فارابی، ابن سینا اور اخوان الصفا اور اسماعیلی اہل فکر) کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ معتزلہ کی تائید اور ان کی مخالفت میں ایک عرصہ دراز تک جو ہنگامہ بحث و مناظرہ گرم رہا اس کی وجہ سے مسلمانوں میں تین رجحان فکر وجود میں آئے۔ ایک فلسفیانہ رجحان جس کے حامل یونانی فلسفے کا براہ راست یونانی زبان میں یا اس کے ترجموں و شرحوں سے مطالعہ کرتے تھے دوسرا رجحان اشعریوں کا تھا جنہوں نے اسلامی الہیات کو یونانی فلسفے سے مطابقت دے لی تھی۔ اور ان میں بعد میں آنے والے معتزلی بھی منضم ہو گئے تھے اور تیسرا رجحان صوفیہ کا تھا۔ جس میں نو افلاطونی عناصر، ہندوستان اور ایران کے دوسرے عناصر سے مخلوط نظر آتے ہیں۔

مصنف کے نزدیک ابن سینا اسلام کی دنیائے مشرق کے بڑے فلسفیوں میں سے آخری ہے اس کے بعد مشرق میں فلسفے کو زوال آگیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں، ایک یہ کہ فلسفے کے ساتھ بہت سی شیعی بدعتیں وابستہ ہو گئیں اور راسخ العقیدہ اہل سنت والجماعت نے اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا، دوسرے دنیائے اسلام کے اس حصے پر ترکی عناصر کو غلبہ حاصل ہو گیا جو کٹر سنی تھے اور ہر اس چیز سے جس کا تعلق شیعوں سے ہو یا جو عقلیت کی طرف مائل ہوتی، نفرت کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود فلسفے نے اسلامی مشرق پر

اپنے دو مستقل اثر چھوڑے ہیں - ایک علم کلام پر اور دوسرا تصوف پر۔

یوں تو اسلام کے ابتدائی دور میں ہی سادگی، پرہیزگاری، صبر وقناعت اور ایثار ونفس کشی کے وہ اوصاف موجود تھے جنہیں صوفیانہ زندگی کا امتیاز سمجھا جاتا ہے لیکن بقول مصنف کے، تیسری صدی ہجری کے آخری حصے میں جو تصوف وجود میں آتا ہے، وہ ان مثالی مقاصد سے مختلف تھا جن کا اوائل اسلام میں زور رہا تھا۔ اس تصوف کی الہیات کا مرکزی فکر نو افلاطونیت تھا۔ جس کے اثرات اسلام سے پہلے شامیوں اور ایرانیوں پر پڑ چکے تھے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شروع کے صوفیہ میں سے اکثر نومسلم ہیں۔ جامی کا بیان ہے کہ جنید ایرانی تھے اور زیادہ تر ایرانیوں ہی کے ذریعہ تصوف کے نظریات نے ترقی کی اور وحدت الوجود کی طرف میلان ہوا، امام غزالی کے ذکر میں مصنف لکھتا ہے کہ ان سے پہلے راسخ العقیدہ اسلام میں تصوف کو بار نہیں ملتا تھا، یہ امام غزالی ہی تھے جن کی بدولت تصوف کو اس میں اپنا مقام حاصل ہوا اور اہل سنت والجماعت میں تصوف کو فروغ ہو سکا۔

علم کلام کے تحت اشعریہ اور ماتریدیہ کا ذکر کرنے کے بعد اس باب میں امام غزالی نے جو دیرپا نقوش چھوڑے ہیں، مصنف نے ان کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن رشد کے برخلاف امام غزالی نے فوق العقلی وجدان پر زور دیا، جس سے انسانی روح اس عالم سے بلند ہو کر حقیقت کو پالیتی ہے۔ میکڈانلڈ کے الفاظ میں امام غزالی کے یہ چار کارنامے ہیں۔

۱۔ اُنہوں نے اہل سنت والجماعت میں تصوف کو فروغ دیا

۲۔ فلسفیانہ استدلال کو مقبول عام بنایا۔

۳۔ فلسفے کو الہیات کے تابع کیا

۴۔ اس دور میں خوف خدا کے جذبے کو بحال کیا۔ جب کہ وہ تعلیم یافتہ طبقے کے ہاں سے کمزور ہو رہا تھا۔

اس کے بعد مصنف "مغرب" میں — جو اس وقت عبارت تھا تیونس سے لے کر اسپین تک کی اسلامی دنیا سے۔ فلسفے کے فروغ سے بحث کرتا ہے۔ اس ضمن میں ابن باجہ، ابن طفیل، اور ابن رشد، نیز بعض یہودی فلسفیوں کا جو عربی میں لکھتے تھے۔ ذکر آتا ہے۔ اور ابن رشد کو جس طرح یورپ میں قبولیت عامہ حاصل ہوتی ہے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اندلسی مسلمان سخت قسم کے قدامت پسند تھے اور بنو عباس کے

دور میں اِدھر مشرق میں جس قسم کی آزاد خیالی کا دور دورہ تھا، اس کو یقیناً وہ ناپسند کرتے تھے۔ انہیں صرف تفسیر، حدیث اور فقہ کے مطالعے سے دلچسپی تھی۔ ان کی اس قدامت پسندی کی ایک نمائندہ مثال ابن حزم ہے جو اندلس کا پہلا مشہور عالم الہیات اور فقیہہ ہے۔ اس نے نہ صرف اہل سنت کے چاروں فقہی مذاہب کو ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ وہ ابن حنبل تک کے سخت نظام کا ہم خیال نہ تھا۔ کیونکہ اس کی رائے میں یہ کافی حد تک سخت نہ تھا۔ اہل اندلس کی اس قدامت پسندی کے باوجود ان کے ہاں ابن رشد جیسے فلسفی کا پیدا ہونا، جو مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی سمجھا جاتا تھا۔ واقعی عجیب ہے۔

ابن رشد (۵۳۰ھ - ۵۹۵ھ) علوم فلسفہ میں بہرہ وافر رکھنے کے ساتھ ساتھ قاضی اور طبیب بھی تھا بقول مصنف کے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ فلسفہ مذہباً جائز و مستحسن ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں انسانوں کو حقیقت کی جستجو کا حکم دیا گیا ہے۔ جہلا جو آزادی فکر سے ڈرتے ہیں، تو یہ ان کا محض تعصب ہے، جن لوگوں کا علم ناقص ہے انہیں فلسفے کے حقائق مذہب کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک ابن رشد عوام کے عقائد کو تسلیم نہیں کرتا، مگر وہ انہیں مبنی بر حکمت سمجھتا ہے۔ کیونکہ یہ عقائد لوگوں کو اخلاق سکھاتے اور ان میں تقویٰ اور نیکی پیدا کرتے ہیں۔ ارسطو کو وہ انسانوں کے لئے خدا کا سب سے بڑا الہام مانتا ہے اور اسے مذہب سے متفق سمجھتا ہے عوام کو مذہب کا جو علم ہوتا ہے، اس میں صرف جزوی طور پر حقیقت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ مذہب اکثریت کی عملی اغراض پورا کرتا ہے۔ مذہب میں جو عمیق تر حقائق ہیں ان کا عوام پر ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف ہے۔

مختصراً یہ ہے کتاب کے جملہ مطالب کا ایک اجمالی خلاصہ۔ کتاب کا مصنف ایک انگریز ہے اور یورپ کے عام مستشرقین کی طرح اس نے بھی دین اسلام، اسلام کی مشہور شخصیات اور تاریخ اسلام کے احوال و واقعات اور اس کی مختلف سیاسی، فکری و مذہبی تحریکوں کے بارے میں اسی قسم کے جانبدارانہ اور مخالفانہ آراء کا اظہار کیا ہے، جو ایک عرصہ دراز سے ان کا معمول رہا ہے، لیکن اس سے قطع نظر مصنف نے اس کتاب میں اپنے پیش نظر موضوع پر بہت کافی، نہایت مفید اور پر از معلومات مواد جمع کر دیا ہے۔

اس کے بعد سوال آتا ہے۔ کتاب کے اردو ترجمے کا۔ بڑے افسوس سے یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حد سے زیادہ ناقص ہے۔ زبان و اسلوب بیان اور جملوں کی ترتیب و ترکیب کے لحاظ سے بھی اور کتاب کے اصل مطالب کو

صحیح اور واضح طرح ادا نہ کر سکنے کے اعتبار سے بھی۔ چونکہ اصل کتاب سامنے نہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ترجمہ کس حد تک اصل مطابق ہے۔ لیکن اردو ترجمہ پڑھ کر مصنف کا مقصود و مفہوم پانا کافی دقت طلب ہے۔

باقی مترجم نے اشخاص، مقامات اور اسماء میں جو غلطیاں کی ہیں وہ بھی کافی زیادہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ترجمہ بہت زیادہ رواروی میں کیا گیا تھا۔ اور نئے ناشر نے بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ ترجمے کی نظرثانی کرا لیتے۔

ترجمے میں زبان و اسلوب بیان کی خامیاں کتاب کی پہلی سطر سے شروع ہوتی ہیں اور آخر تک چلی جاتی ہیں اس لئے ان کی نشان دہی کرنا ناممکن ہے۔ البتہ ناموں کے لکھنے میں جو غلطیاں کی گئی ہیں، ان میں سے چند ایک یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

(صفحہ ۳۱ — "ایک اور مدرسہ نس بس یا جدید نبیس"۔ صفحہ ۳۶ — کچھ عرصہ پہلے نس بس کا مدرسہ (اگلی سطر میں، شہر نس بس — صحیح نام "نصیبین" ہے جو شمالی عراق میں تھا

صفحہ ۵۸ — حمیری عربوں کے ایک قبیلے نے جس کا نام قدا تھا — صحیح نام قضاعہ ہے (دیکھئے ارض القرآن جلد دوم صفحہ ۸۱) اسی صفحے پر "اس قبیلے کی جگہ صالح نے لے لی"۔ صحیح سلیح ہے۔ (دیکھئے ارض القرآن جلد دوم صفحہ ۸۱ —

صفحہ ۷۵ — معبد الیوحنی — صحیح معبد الجہنی ہے۔

صفحہ ۷۸ — عبد بن صبا — اسی صفحے پر ابن صبا — صحیح عبداللہ بن سباء ہے۔

اسلوب بیان ملاحظہ ہو — اسلام میں راسخ العقیدہ مدرسیت یا علم کلام کی تحریک ایسے نشوونما کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو چوتھی اور پانچویں صدی ہجری ۔۔۔ میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کے تین طبقے ہیں۔ یعنی اشعری، باقلانی اور غزالی۔ اس قسم کا نشوونما دراصل اسلام کی داخلی تاریخ اور اسلامی الہیات کے ارتقاء سے متعلق ہے۔

صفحہ ۷۰ میں ہے۔ داخلی اعتبار سے دونوں کی معاشری بافت

صفحہ ۷۲ — عرب دل سے ارتیابی اور مادیتی ہے۔

صفحہ ۸۷ ۔ خود کو متنفر ضرور محسوس کرتے تھے ۔

اصل کتاب ظاہر ہے اچھی خاصی ہے اور اس میں کافی کام کی باتیں بھی ہیں ۔ لیکن اس ترجمے نے اسے اس قابل نہیں رہنے دیا کہ اس کا ایک سنجیدہ علمی کتاب کی حیثیت سے مطالعہ کیا جاسکے ۔

کتاب مجلد ہے ۔ بڑے صفحے کے ۲۲۸ صفحے اور قیمت ۷۵ - ۶ روپے

ملنے کا پتہ :- نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ، کراچی ۱

مخزن الولایت

(اردو ترجمہ)

ملفوظات حضرت شاہ خادم صفی محمدی صفی پوری المتوفی ۱۲۸۷ھ

یہ ملفوظات جناب منشی محمد ولایت علی عزیز صفی پوریؒ نے مرتب فرمائے اور ان کا ترجمہ محمد خصلت حسین صابری ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشنر نے کیا پاک اکیڈمی ۱/۱۷۱ وحید آباد، گولی مار کراچی ۱۸ نے انہیں شائع کیا ہے، کتاب مجلد ہے ۔ صفحات ۲۰۸ ۔ اور قیمت تین روپے ۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ حضرت چراغ دہلی متوفی ۷۵۷ھ کے ایک مرید مخدوم شیخ قوام الدین دہلی سے لکھنؤ (اودھ) تشریف لائے ۔ اور اس طرح ان دیار میں نظامیہ چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل پڑی ۔ ان کے برادرِ عزیز شیخ قطب الدین بھی دہلی سے لکھنو آئے، آخرالذکر کے صُلب سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس سے یہ سلسلہ آگے چلا، اور اس سے بڑے بڑے نامور صوفیاء منسلک ہوئے ان میں مخدوم شاہ صفی المتوفی ۹۴۵ھ بڑے مشہور تھے ۔ حضرت خادم صفی کے آباؤ اجداد مخدوم شاہ صفی کی درگاہ میں خدمت گزار تھے ۔ آپ ۱۲۰۹ھ کو پیدا ہوئے ۔ ساری عمر ریاضتوں میں گزری اور بڑی سختی سے شریعت کے پابند رہے آپ کا انتقال ۱۲۸۷ھ میں ہوا اصل ملفوظات فارسی میں تھے ۔ اور زیر نظر کتاب اردو ترجمہ ہے ۔

حضرت خادم صفی کے ان ملفوظات کے مُرتب حضرت عزیز صفی پوری بڑے متبحر عالم اور باکمال شاعر تھے ! ور انہیں مرزا غالب سے تلمذ تھا ۔ آپ کی کوئی چالیس بیالیس تصانیف ہیں ۔

کتاب کے شروع میں صاحب ملفوظات کے مختصر سوانح جات ہیں ۔ اس کے بعد آپ کے ارشادات ہیں حضرت شاہ خادم صفی محمدی باوجود شریعت کی سختی سے پابندی کرنے کے صلح کُل بزرگ تھے ۔ ان کا ایک ارشاد

ملاحظہ ہو۔

"جو پیرو شریعت ہو اور طریق سنت و جماعت پر کاربند ہو۔ تعصب نہ رکھتا ہو، اور سلسلہ اس کا صحیح اور درست ہو، تو طالب کو ایسے شخص سے بیعت کر لینے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔" اسی ضمن میں فرماتے ہیں:۔

"بعض باتیں فقہاء اور مشائخ کے مابین متنازع فیہ ہیں، مثلاً وحدت وجود اور سماع۔ ظاہر میں یہ مختلف فیہ ہوں، مگر باطن میں ان میں اختلاف نہیں۔ دوم یہ کہ تعصب کرنا درویشی کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس بارے میں آپ نے عین اللہ شاہ صاحب سے فرمایا تھا۔

نہ شیعہ ام کہ کنم طعن سُنّی برحق — نہ سُنّیم کہ کنم طعن را فضی مطلق

کدام برسر باطل کدام برسرحق — غلامِ حضرت عشقم دگر نمی دانم

شریعت کی پابندی کے ذیل میں ان کا ارشاد ہے۔

"ایک شخص آسمان پر اڑتا ہو اور دقائق شرع میں سے ایک دقیقہ بھی مہمل گزار رہے، تو وہ قابل اعتبار نہیں۔ اس کی کشف و کرامت پر فریفتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایسی مثالیں ریاضت کی وجہ سے جوگیوں اور سنیاسیوں سے بھی ظہور میں آتی ہیں۔"

آپ کا ایک اور ارشاد ہے:۔ مظاہر مختلف ہیں۔ حقیقت حال ایک ہے جیسا مولوی معنوی قدس سرہ نے فرمایا۔

در نظر بہ ظرف داری گمرہی — گر بمظروفش نظر داری شہی

آپ کا ایک اور ارشاد ہے:۔ فقیر کو باوجود اختلاف مذہب کسی سے کج خلقی سے پیش نہ آنا چاہیئے کیونکہ رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کافروں کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دیتے تھے۔ پھر کلمہ گو کے ساتھ ترش روئی سے پیش آنا کب روا ہے۔ اور ہر کام کا انجام اس کے خاتمے پر ہے۔ اور حقیقت اس کی معلوم نہیں۔ اور یہ الفاظ آپ نے شیعہ و سُنّی کے تفرقے کے سلسلے میں فرمائے تھے۔

حضرت خادم صفی نے قرآن مجید شیخ چراغ علیؒ سے پڑھا تھا، جنہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھا تھا۔

صاحبِ ملفوظات کا انتقال آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے ہوا تھا مرتب نے موصوف کے جو "ارشادات، احوال، افعال، اعمال" اس کتاب میں جمع کئے ہیں، ان سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن دنوں مسلمان عوام و خواص کی زندگیوں پر تصوف اور صوفیائے کا کتنا اثر تھا۔ ان کے ہاں کسی پیر سے بیعت ہونا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا کتنا ضروری تھا اور پیری اور خلافت کا سلسلہ کس قدر وسیع تھا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُس زمانے میں پیری مریدی اور "خلافت" مسلمانوں کی مذہبی روحانی اور اجتماعی زندگی کی ایک اساس تھی۔ اور اس افراتفری کے دور میں یہ چیز ان کے معاشرے میں باہمی ربط کا ذریعہ بھی تھی۔ اور اس سے ان کو سکون اور طمانیت بھی ملتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اب وہ حالات نہیں رہے۔ اور تصوف کی یہ اثر آفرینی و ہمہ گیری کم ہوتی جارہی ہے سوال یہ ہے کہ اِس وقت ہم مسلمانوں کے معاشرے میں جو اختلال اور خلفشار رونما ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ کیا اس قسم کی پیری مریدی اس کا علاج ہو سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مسئلہ کافی محل نزاع ہے۔

مثال کے طور سے صاحب ملفوظات کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو۔ "ایک پیر نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا کہ نماز چھوڑ دے۔ وہ چلا گیا اور صرف نماز سنت ترک کی۔ اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ تو نے میری سنت کو کیوں چھوڑا۔ وہ اپنے پیر کی خدمت میں آیا اور ماجرا سنایا۔ پیر نے جواب دیا کہ اگر فرض نماز بھی چھوڑ دیتا تو خدا کا دیدار ہوتا۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ مرید کو پیر کے حکم سے چارۂ کار نہیں۔"

اگرچہ اس طرح کے تصوف اور ایسی پیری مریدی کا اب وہ رنگ نہیں رہا۔ لیکن اس زمانے میں مخزن الولایت جیسی کتابوں کی اشاعت بے مصرف نہیں، کیونکہ ان سے ہم ان پاک نفوس بزرگوں کے احوال سے واقف ہوتے ہیں۔ جن کے دم سے مسلمانوں کے ہاں رواداری، وسیع المشربی۔ محبت و رافت جیسی انسانیت عامہ کی اعلیٰ قدریں فروغ پاتی تھیں۔ اور انہیں کی آج ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

افکار و آراء

جناب مدیر صاحب الرحیم

الرحیم کا پہلا شمارہ جون کا تھا۔ اور آخری شمارہ جو مجھے ملا ہے، وہ دسمبر کا ہے گویا اب تک الرحیم کے سات شمارے نکل چکے ہیں۔ میں نے سرسری نہیں، بلکہ بڑے غور اور استیعاب سے یہ سارے پرچے پڑھے ہیں الرحیم میں یہ خوبیاں ہیں، یا وہ خوبیاں ہیں۔ یہ لکھنے سے تو میں رہا۔ ان ساتوں پرچوں کے مطالعہ کے بعد میں نے جو مجموعی تاثر لیا ہے، وہ میں مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو میں نے زیادہ نہیں پڑھا، اردو زبان میں ان پر فرداً فرداً جو لکھا گیا ہے وہ البتہ نظر سے گزرا ہے۔ اور اتفاق سے اس میں شاہ صاحب کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر شاہ صاحب کی کوئی واضح و معین تصویر سامنے نہیں آتی۔ چنانچہ اس لکھے پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

کہیں تو انہیں سلف صالح کی پیروی پر زور دینے والا مصلح ثابت کیا گیا ہے، گویا ایک امام ابن تیمیہؒ عربی دنیا میں ہوئے اور دوسرے یہ امام تیمیہ تھے جو اس برصغیر میں مبعوث کئے گئے۔ بعض کا اصرار ہے کہ وہ مقلد تھے اور پکے مقلد اور اپنے فقہی مسلک میں وہ حنفیت سے باہر نہیں جاتے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ان کا اوران کی حکمت کا جس طرح تعارف کرایا ہے وہ ظاہر و باہر ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، مولانا سندھی کے نزدیک شاہ صاحب نے دین اسلام کی جو تعبیر فرمائی ہے وہ مرادف ہے انسانیت عامہ کے اپنی پوری

ہمہ گیریت اور وسعت کے ساتھ۔ اور اسلام کے جو احکام اور شعائر ہیں وہ ایک مخصوص زمان و مکان میں اس اُنہ عامہ کی ایک عملی شکل ہیں۔ مولانا سندھی کے الفاظ میں شاہ صاحب کے نزدیک قرآنی مقاصد کا لب لباب وہ حکمت ہے، جو انسانیت کی طرح عالمگیر ہے اور اگرچہ مختلف ادوار میں وہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی لیکن

دم بدم گر شود لباس بدل   مرد صاحب لباس را چہ خلل

اس کے برعکس اس دور کے ایک بہت عالم اور محقق مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔

"حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تعبیرات ایسی نازک ہیں کہ کفر و اسلام کے درمیان پل صراط کا فرق رہ جاتا ہے۔"

اسی ضمن میں مرحوم یہ بھی فرماتے ہیں :- "شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مردِ فقہ و حدیث و کلام اسرار و رموزِ شریعت ہیں۔ تصوف کی کتابوں میں ان کا پیام ان کے دوسرے علوم کے مطابق نہیں ہے اس لئے ان سے نہ گھبرائیے اور نہ ان کی صوفیانہ کتابوں کی طرف توجہ کیجئے۔"

مختصراً یہ ہے تصویر شاہ صاحب کی جو اب تک پیش کی گئی ہے، مجھے تو توقع تھی کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا جرنل الرحیم اس معاملے میں کچھ زیادہ واضح ہوگا۔ اور اس کی مندرجہ تحریروں سے شاہ صاحب کی کوئی معین تصویر Emerge ہو سکے گی۔ ضرورت ہے کہ شاہ صاحب کے فکر کے بنیادی مفہومات کا تعین ہو۔ اور ان کی اساس پر شاہ صاحب کی علمی شخصیت اور ان کی حکمت کا ایک واضح خاکہ ترتیب دینے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ شمع ہدایت بنے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے اور معاملہ محض مضمون نگاری اور کتاب سازی تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ مثال کے طور سے شاہ صاحب کا کائنات کے بارے میں کیا تصور ہے ان کے نزدیک دین کی عمومی حیثیت کیا ہے اور مذاہب عالم میں اسلام کا کیا مقام ہے وغیرہ وغیرہ۔

مانا صاف صاف بات کہنا مشکل ہے، لیکن زمین تو ہموار کی جا سکتی ہے۔ لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ است

عبدالقادر۔ عزیزآباد۔ کراچی
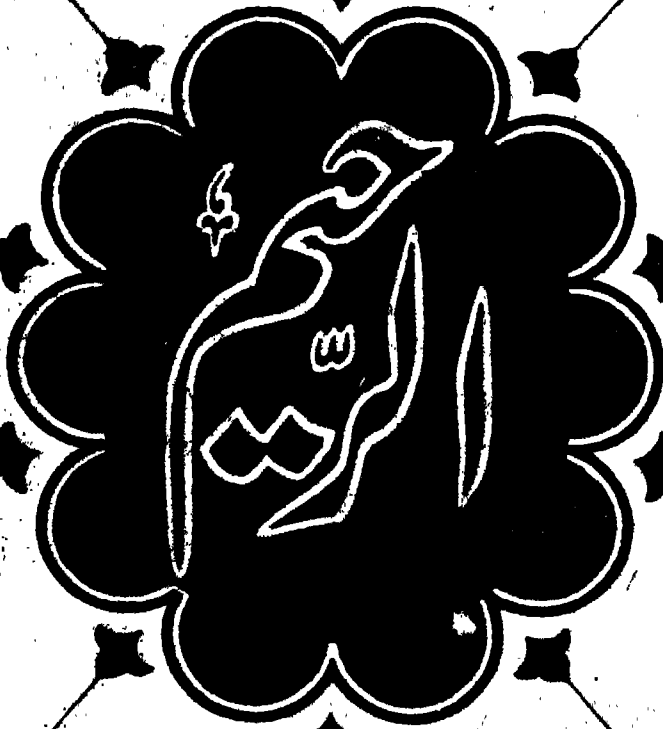
محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس سے چھپوا کر شائع کیا

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم

قیمت سالانہ۔ آٹھ روپے

فی پرچہ:— پچھتر پیسے

الرحیم
حیدرآباد
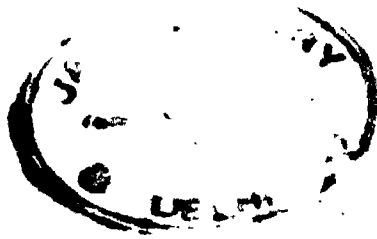
جلد ۲ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ مطابق فروری ۱۹۶۵ء نمبر ۹

فہرست مضامین

شذرات

ایک عظیم فکر اور وسعت پذیر دعوت کی یہ امتیازی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کی کئی جہتیں اور متعدد حیثیتیں ہوتی ہیں، جن میں سے ہر ایک کی اہمیت اور افادیت جیسے جیسے زمانہ گزرتا ہے، اس کے حالات کے مطابق نمایاں ہوتی ہے۔ بے شک ان جہتوں اور حیثیتوں کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، لیکن یہ ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہوتیں اور ایک عظیم فکر اور وسعت پذیر دعوت ان سب کی حامل ہوتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے ایک پہلودار ہیرا ہوتا ہے، جس کا ہر پہلو اپنی ایک الگ شعاع دیتا ہے۔

فکر ولی اللہی کا شمار بھی دنیا کے ان عظیم فکروں میں سے کرنا چاہیئے۔ برصغیر کی گذشتہ دو سو سال کی اسلامی تاریخ میں اس فکر کی مختلف حیثیتیں مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے خود حضرت شاہ ولی اللہ کو بھی اپنی فکری دعوت کی اس خصوصیت کا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا ہے کہ ہماری اولاد کے پہلے طبقے میں تو علم حدیث پھیلے گا اور دوسرے طبقے میں علم حکمت کی اشاعت ہوگی۔

"الرحیم" کے پچھلے شمارے میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کا ایک مضمون چھپا ہے، جس میں شاہ ولی اللہ کی فکری تحریک کے ارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ مولانا مرحوم کا اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر تھا اور ظاہر ہے اس مضمون میں تحریک ولی اللہی کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ ضروری نہیں کہ اس ضمن میں جن نتائج پر مولانا مرحوم پہنچے تھے ان سے سب کا اتفاق ہو۔

لیکن یہاں ہم ایک بات کا ضرور اثبات کریں گے اور ہماری یہ دلی آرزو ہے کہ تحریک ولی اللہی کے بارے میں اسے ایک بنیادی نقطہ قرار دیا جائے۔ اور وہ یہ جیسا کہ مولانا سندھی نے اس مضمون میں لکھا ہے۔ ہم

امام ولی اللہ کے علوم میں نقل عقل کشف کے تطابق کو مابہ الامتیاز مانتے ہیں۔ اور یہ کہ امام ولی کے بعد اس درجے کا کامل ہم فقط امام عبدالعزیز کو مانتے ہیں۔ جن میں یہ تینوں کمالات جمع تھے۔ اس سلسلے میں مولانا سندھی نے اس رجحان پر بھی تنقید کی ہے۔ جس میں غلو کی حد تک امام عبدالعزیز سے انکار پایا جاتا تھا۔

ہمارے نزدیک آج جو حالات ہمیں درپیش ہیں، اور جن مسائل سے ہمیں اس وقت عہدہ برآ ہونا پڑ رہا ہے ان کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس نقطے پر خاص طور سے زور دیں۔ اور ولی اللہی تحریک کے ضمن میں امام عبدالعزیز کی جامعیت ہمارے پیش نظر رہے۔ ملت میں وسیع تر اتحاد کا یہی ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا قیام مغربی پاکستان کی دینی تاریخ میں ایک خوش آیند مستقبل کی تمہید ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اکثر دینی اداروں نے قومی بنیادوں پر علوم اسلامیہ کی ایک درسگاہ کے قیام کا خیر مقدم نہیں کیا اور اس کی وجہ ظاہر ہے بدقسمتی سے ان اداروں کے ماتحت جو دینی مدارس چل رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایک قسم کی اجارہ داریاں سی بن گئی ہیں۔ اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب امیر جماعت اہل حدیث کے الفاظ میں "یہ بسا اوقات انتشار اور تفریق بین المسلمین کا موجب بنتے ہیں۔"

انہی دنوں مغربی پاکستان اسمبلی میں جب جامعہ اسلامیہ بہاولپور کا آرڈی ننس، اسمبلی کے ارکان کی منظوری کے لئے پیش ہوا تو سرکاری بنچوں کے علاوہ حزب اختلاف نے بھی جامعہ کے قیام کا بڑے زوردار الفاظ میں خیر مقدم کیا۔ اور اس طرح یہ آرڈی ننس باتفاق رائے منظور کیا گیا۔ حزب اختلاف کے لیڈر نے جامعہ اسلامیہ کے قیام پر حکومت کو مبارک باد دی، اسمبلی کے ایک ممتاز رکن علامہ ارشد نے بہاولپور میں اسلامی علوم کی درسگاہ کے قیام پر صدر ایوب اور گورنر مغربی پاکستان کو خود ان کے الفاظ میں "بغیر کسی ذہنی تحفظ کے" دلی مبارک باد پیش کی۔ اور اس کے ساتھ ہی رکن موصوف نے موجودہ ناظم اعلیٰ اوقاف جناب شیخ محمد اکرام کی ان کوششوں کو سراہا جو اس جامعہ کے قیام میں منتج ہوئیں۔ خدا کرے یہ جامعہ پھلے پھولے تاکہ مستقبل میں ہماری تمام دینی تعلیم کا یہ مرکز و محور بن سکے

اس ماہ ہمارے دو محترم بزرگ جن کا ولی اللہی تحریک سے قریبی تعلق تھا۔ ہم سے رخصت ہو گئے ہجرت سے قبل مولانا عبیداللہ سندھی کی عمر کا ایک حصہ سرزمین سندھ کے مشہور صاحب طریقت

بزرگ حضرت پیر رشد اللہ صاحب العلَم خلافت والہ کے ساتھ مدرسہ دارالرشاد پیر جھنڈو میں گزرا تھا ان کے فرزند رشید جناب پیر مہدی شاہ جھنڈیوالہ صاحب پچھلے دنوں انتقال فرما گئے ہیں، مرحوم بڑے علم دوست اور مخیر بزرگ تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جب مولانا سندھی واپس وطن آئے اور آپ نے سندھ میں علوم ولی اللہی کی نشر و اشاعت کی ازسرنو کوششیں شروع کیں اور اس ضمن میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ میں بیت الحکمتہ کی بنیاد رکھی گئی تو پیر مہدی شاہ صاحب نے اس کی مالی سرپرستی فرمائی تھی۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور ان کی ذات مصدر فیوض تھی اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت شاملہ سے نوازے اور دارالبقا میں درجات عالیہ عطا فرمائے۔

اس سلسلے کے دوسرے بزرگ جو ہمیں داغ مفارقت دے گئے، مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی ہیں۔ ۱۳۳۱ھ میں جب مولانا سندھی نے دہلی میں ادارہ نظارۃ المعارف قائم کیا تو اس کے اولیں طالب علموں میں سے مولانا احمد علی صاحب کے ساتھ ساتھ مرحوم و مغفور بھی تھے۔ آپ کو پہلی جنگ عظیم کے دوران سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر نظر بند رکھا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس میں تفسیر القرآن کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور برصغیر کی تقسیم تک اس منصب پر فائز رہے اب کئی سالوں سے مرحوم اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے پروفیسر تھے۔

خواجہ صاحب مرحوم نے حضرت مولانا سندھی سے ان کی ہجرت سے قبل تفسیر القرآن پڑھی تھی جب آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تھے تو آپ نے مولانا سندھی کے ان افادات کو کتابی شکل میں مرتب فرمایا تھا۔ آپ کی یہ کتابیں اس زمانے میں بڑی مقبول ہوئی تھیں۔ مرحوم بڑے صاحب علم بزرگ اور شفیق استاد تھے اور ان کے شاگردوں کے حلقہ بڑا وسیع ہے۔ ہم خواجہ صاحب مرحوم و مغفور کے اہل خاندان سے دلی تعزیت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنی مغفرت کاملہ سے سرفراز فرمائے اور علیین میں داخل کرے۔ آمین

شہروں کی بربادی اور آبادی کے اسباب

از افادات امام ولی اللہؒ

مولانا عبدالحمید سواتی

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ شہر ایک شخص واحد کی طرح ہوتا ہے۔ اور یہ وحدت اس کے باہمی مربوط ہونے کی وجہ سے ہے۔ شہر مختلف اجزا سے مرکب ہوتا ہے۔ اور یہ ایک مسلّم بات ہے کہ ہر مرکب میں خلل اور خرابی واقع ہونے کا امکان رہتا ہے یہ خرابی کبھی تو اس کی صورت میں ہوتی ہے اور کبھی اس کے مادہ میں اور اسے امراض کے لاحق ہونے کا بھی ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے۔ شہر (تمدن) کی بیماری سے مراد یہ ہے کہ اس میں نامناسب حالات پیدا ہو جائیں۔ اور اس کی صحت سے مراد یہ ہے کہ اس کی حالت ایسی ہو جو اس کے حسن اور خوبصورتی کا باعث ہو۔ شہر میں خرابیاں کئی طرح پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً کچھ ایسے شریر لوگ ملک پر مسلط ہو جائیں جو خواہشات پر چلنے والے ہوں۔ وہ منصفانہ قانون کی پیروی ترک کر دیں اور ناحق لوگوں کے اموال ہتھیانے لگ جائیں یا لوگوں کی جانوں کی ناحق ہلاک کرنے لگ جائیں۔ یا لوگوں کی عزت و آبرو میں دست انداز ہوں۔ اسی طرح شہر کو بگاڑنے والے اسباب میں ایسے مضر افعال بھی ہیں جو اس کی زندگی کے لئے پوشیدہ طور پر نقصان رساں ہوتے ہیں۔ جیسے جادو اور سحر اور لوگوں کی خوراک وغیرہ میں زہریلی اشیاء شامل کرنا۔ اسی زمرہ میں وہ لوگ آتے ہیں جو زیادہ منافع کمانے کی خاطر آٹے، ہلدی، دودھ، مرچ، گھی وغیرہ میں بعض اوقات نہایت ہی مضر صحت اشیاء شامل کر دیتے ہیں، اسی طرح لوگوں کو فساد پر ابھارنا، عورتوں کو اپنے خاوندوں کے خلاف بھڑکانا۔ یہ سب تمدن کو فاسد کرنے والے اعمال ہیں۔ اسی طرح تمدن کو بگاڑنے والی کچھ عادات فاسدہ بھی ہیں۔ جن کے مرتکب لوگ ارتفاقات واجبہ کو ترک کر دینے کی وجہ سے تمدن کو بگاڑ دیتے ہیں اسی طرح عادات قبیحہ میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں مثلاً عورتیں مرد بننے کی کوشش میں لگ جائیں یعنی مردوں جیسی وضع قطع اختیار کر لیں۔ یہ چیزیں تمدن کے

لئے مہلک ہیں۔ اسی طرح لمبے چوڑے جھگڑوں اور تنازعات کا پیدا ہو جانا۔ یا شراب نوشی کی عادت اختیار کرنا اس سے بھی تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح کچھ معاملات ہیں جو تمدن کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں جیسے قماربازی، سودخوری، رشوت ستانی، ناپ تول میں کمی، سامان تجارت میں عیب کو ظاہر نہ کرنا بلکہ اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنا۔ تلقی جلب (ضرورت کے وقت چند آدمی سامان تجارت کو اپنے قبضہ میں کرلیں اور اس سے منافع کمانے کی سوچیں) اور اسی طرح تمدن کو برباد کرنے والی چیز ذخیرہ اندوزی ہے۔ اور بغیر خریدنے کی خواہش کے محض گاہکوں کو نقصان پہنچانے کے لئے قیمت زیادہ بولنا تاکہ خریدار کو نقصان ہو ایسے ہی شہر کو فاسد کرنے والے اسباب سے یہ بھی ہے کہ موذی جانور زیادہ ہو جائیں اور اسی طرح حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں کی زیادتی سے بھی شہر میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے ایسے حالات میں شہر کی حفاظت کی خاطر انہیں ہلاک کرنا ضروری ہوگا۔

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ شہر اور تمدن کی حفاظت کا کامل درجہ یہ ہے کہ ایسی عمارتیں تعمیر کی جائیں جن سے سب لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً شہروں کی فصیلیں اور پناہ گاہیں، سرائیں، قلعے، سرحدی چوکیاں۔ بازار اور پل تعمیر کئے جائیں۔ اسی طرح کنوئیں کھودے جائیں اور چشموں سے پانی نکالنے کا بندوبست کیا جائے۔ دریاؤں اور نہروں میں کشتی رانی کا انتظام کیا جائے اور اسی طرح تاجروں کو تاکید کی جائے۔ کہ وہ سامان خورد ونوش اور مختلف اجناس کو شہروں میں لائیں اور شہر والوں کو تاکید کی جائے کہ باہر سے آنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور ان سے بدسلوکی سے پیش نہ آئیں۔ اس سے تجارت کی ترقی کے وسیع امکانات پیدا ہونگے۔ نیز کسانوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ زمین کے کسی حصہ کو بغیر کاشت کے نہ چھوڑیں۔ اسی طرح صنعت وحرفت والوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ صنعتی اشیا اچھے طریقہ سے تیار کریں۔ اسی طرح لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ فضائل کا اکتساب کریں۔ لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ حساب کی مہارت بہم کریں۔ تاریخ اور طب جیسے مفید فن سیکھیں۔ علم ومعرفت کی وہ تمام چیزیں حاصل کریں، جن سے صحیح طور پر منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ملک اور شہر کی خبریں حاصل کریں تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ ملک میں مفسد لوگ کون ہیں اور اچھے لوگ کون۔ اسی طرح غرباء اور مساکین کا پتہ چل سکے تاکہ ان کے ساتھ تعاون کیا جاسکے اور اچھی قسم کے کاریگر اور صنعت کاروں کا علم ہوسکے تاکہ ان کی عمدہ اور مفید قسم کی صنعتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں شہروں کی تباہی اور بربادی کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک سبب یہ ہے کہ لوگ بیت المال اور سرکاری خزانے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ مختلف بہانوں سے ناحق مال بٹورنے لگ جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ میں فوج سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لئے مجھے وظیفہ ملنا چاہیئے۔ کچھ علماء وغیرہ کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم علم کی خدمت کرتے ہیں اس لئے ہمیں جاگیر یا منصب ملنا چاہیئے۔ کچھ لوگ شعراء اور ناصح بن کر آتے ہیں، جن پر انعام و اکرام کرنا بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے۔ اسی طرح کے اور بہانے بناتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح گداگری کے وجوہ میں سے ہوتے ہیں۔ لیکن کام اس کے بدلہ میں کچھ نہیں کرتے۔ اس قسم کے لوگوں کی تعداد جب رفتہ رفتہ بڑھ جاتی ہے۔ تو یہ ایک دوسرے کے لئے تنگی کا باعث بنتے ہیں اور شہر پر بوجھ بن جاتے ہیں۔

شہروں کی بربادی کا دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ حکومتیں کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بڑے بھاری ٹیکس لگاتی ہیں اور ان ٹیکسوں کی وصولیابی کے لئے ان لوگوں کو تنگ کرتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرمانبردار لوگ جو بغیر جبر کے ٹیکس ادا کرتے ہیں آہستہ آہستہ ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور جو لوگ طاقتور اور سخت ہوتے ہیں وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں اور حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

امام ولی اللہ اس موقعہ پر دور حاضر کے لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

انما تصلح المدینۃ بالجبایۃ الیسیرۃ واقامۃ الحفظۃ بقدر الضرورۃ فلیتنبّہ اہل الزمان لہذہ النکتۃ

(حجۃ اللہ البالغہ باب سیاستہ المدنیہ)

(یعنی ملک اور شہر کی اصلاح آسان ٹیکس لگانے اور بقدر ضرورت محافظ رکھنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے لوگ اس نکتہ سے باخبر رہیں۔)

امام ولی اللہؒ کے اس بیان میں کتنی بڑی صداقت پوشیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں تمام ممالک میں حد سے بڑھے ہوئے فوجی مصارف ایسے ہیں کہ جن سے تمام ممالک کی معیشت ابتر ہو جاتی ہے اسی طرح طاقت سے زیادہ ٹیکس وغیرہ لگانے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں حکومتیں ان کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں مگر افسوس کہ اس ظلم کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔

امام ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ معاش کے وہ ذرائع جن کو اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کے لئے مباح

فرمایا ہے، ان میں سے کچھ تو وہ ہیں، جن سے مباح زمین (ایسی زمین جس پر کسی کا قبضہ نہ ہو) سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ ذرائع گلہ بانی یا مویشیوں کی پرورش، زراعت، صنعت و حرفت تجارت، سیاست مدن اور سیاست ملت ہیں (امام ولی اللہ نے سیاست مدنی و ملّی کو مستقل پیشہ شمار کیا ہے) اب اگر لوگ ان مفید پیشوں کے بجائے ایسے پیشے اختیار کریں جن کا تمدن میں دخل نہ ہو تو یقینی بات ہے کہ یہ تمدن اور شہریت کو تباہ و برباد کرنے والے ہوتے ہیں اس لئے لوگوں کو خدا کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ یہ پیشے حرام ہیں۔ "وھذہ کلہا مضرۃ للمدنیۃ فالہموا انہا محرمۃ"[۱] نافرمان لوگ اپنے شریر نفوس کی وجہ سے ان امور کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور عادل حکمران ان کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں اس کے بعد امام ولی اللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ناجائز ٹیکس وصول کرنا بمنزلہ ڈاکہ زنی کے ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ تمدن کے فساد و خرابی کے سلسلہ میں ہی امام ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ کے باب "الرسوم السائرہ" میں لکھتے ہیں۔

"کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ صحیح قوانین پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ باطل بھی مل جاتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگوں پر صحیح قوانین خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ملک میں ایسے لوگ برسر اقتدار آ جاتے ہیں جن میں آراء جزیہ (ذاتی خواہشات و اغراض) غالب ہوتی ہیں اور مصالح کلیہ (مفاد عامہ) کو یہ لوگ بالکل ترک کر دیتے ہیں لہذا کبھی تو یہ لوگ اعمال سبعیہ (درندوں جیسے کاموں) کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جیسے کہ راہ زنی، لوٹ کھسوٹ یا شہوت رانی کے کام۔ یا یہ لوگ اکساب ضارہ یعنی نقصان دہ پیشوں کو اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسے سودی لین دین، ناپ تول میں کمی، یا ایسی عادات جو اسراف پر مبنی ہوتی ہیں، یا ایسی چیزوں کو اختیار کرتے ہیں جو غافل بنانے والی ہوں، ان کے اختیار کرنے سے امور معاش میں بہت سی باتوں کو مہمل چھوڑنا پڑے گا اور یہ معاد سے بھی غافل بنا دیں گی جیسے مزامیر اور گانے بجانے کے آلات، شطرنج کھیلنا شکار کے درپے ہو جانا، کبوتر بازی اور ایسے دوسرے اشغال۔

امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جو بنیادی پیشے ہیں۔ مثلاً زراعت، گلہ بانی، اموال مباح کو حاصل کرنا

---

[۱] (ترجمہ) یہ سب شہریت کو تباہ کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ان کے حرام ہونے کا الہام کیا گیا۔

مختلف قسم کی صنعتیں، نجاری، آہنگری، کپڑے بُننا۔ یہ اہم ترین پیشے ہیں پھر تجارت ایک بہت بڑا پیشہ ہے اسی طرح شہریت اور تمدن کے مصالح کی حفاظت ایک مستقل پیشہ ہے۔ پھر تمام وہ ضروریات جن کی لوگوں کو احتیاج ہوتی ہے ان کی بہم رسانی میں مشغول ہونا اس کے الگ الگ پیشے ہیں نیز جس قدر لوگ ترقی کرتے جاتے ہیں مختلف پیشوں کی شاخیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ اب ہر انسان کسی خاص پیشے کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر شخص میں خاص قسم کی قوتیں ہوتی ہیں، جو کسی خاص پیشے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔ ایک بہادر آدمی کے لئے فوجی ملازمت ہی مناسب ہوتی ہے۔ ایک بیدار مغز انسان کے لئے حساب داں ہونا ہی مناسب ہوگا۔ جس شخص کا جسم مضبوط ہو وہ بوجھ اٹھانے یا مشقت کے کام کرنے کے لائق ہو سکتا ہے کبھی اتفاقات کی بنا پر بھی بعض کام بعض لوگوں کے قابل ہوتے ہیں مثلاً ایک لوہار کے بیٹے اور اس کے پڑوسی کے لئے لوہار کا کام زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت دوسرے لوگوں کے اسی طرح ساحل دریا پر رہنے والے شخص کے لئے مچھلی کا شکار زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت دوسرے لوگوں کے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں مناسب پیشہ نہیں ملتا یا وہ کسی وجہ سے اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اس صورت میں وہ مضر پیشوں کی طرف جھک پڑتے ہیں۔

شہریت اور تمدن کی اصلاح کے لئے جن چیزوں کا ہونا ضروری ہے، ان پر بحث کرتے ہوئے امام ولی اللہ فرماتے ہیں۔ معاملات کے سلسلہ میں اس بات کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ایک چیز کے دوسری چیز سے تبادلے کو بیع کہتے ہیں اور عین چیز کا تبادلہ منافع کے عوض، اس کو اجارہ (مزدوری) کہتے ہیں۔ شہریت اور تمدن کا انتظام کبھی استوار نہیں رہ سکتا جب تک کہ آپس میں الفت و محبت نہ ہو اور یہی الفت و محبت بعض اوقات ضرورت کی چیزوں کو بلا معاوضہ صرف کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسی بنا پر ہبہ و عاریت وغیرہ کی صورتیں پیش آتی ہیں نیز الفت کبھی تام نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ فقراء و مساکین کے ساتھ ہمدردی نہ ہو۔ اس لئے صدقات وغیرہ کا نظام قائم ہو جاتا ہے۔ انسانی تمدن قائم کرنے والے بعض اسباب کو سرانجام دینے والے بعض لوگ بے وقوف اور احمق ہوتے ہیں۔ بعض نہایت ہی اچھی طرح کارکردگی رکھنے والے ہوتے ہیں۔ بعض مفلس ہوتے ہیں اور بعض دولت مند۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اعمال خسیسہ کے انجام دینے سے عار کرتے ہیں اور بعض آدمی ایسے اعمال سے کچھ بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں بہت سی ضروریات کا سامنا ہوتا ہے اور بعض لوگ

فارغ البال ہوتے ہیں اس لئے ہر انسان کی معیشت کبھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسروں کا تعاون اسے حاصل نہ ہو اس لئے معاملات میں شروط کی پابندی لازمی ٹھہری۔ اسی بنا پر مزارعت، مضاربت، اجارہ شرکت، وکالت وغیرہ مختلف پیشوں کا وجود عمل میں آیا اور انسانی ضرورتوں کے پیش نظر قرض کی لین دین اور امانت وغیرہ کا سلسلہ قائم ہوا۔ پھر انسانی معاشرے میں تجربہ سے لوگوں نے معلوم کیا کہ خیانت اور حق سے ٹال مٹول کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس لئے شہادت، کتابت، وثائق، رہن، کفالت اور حوالت وغیرہ معرض وجود میں آئے۔ پھر جس قدر انسانوں میں رفاہیت (خوش حالی) زیادہ ہوتی گئی، اسی طرح تعاون کی صورتیں بھی مختلف ہوتی گئیں، غرض تم کسی قوم کو نہیں پاؤ گے جو یہ معاملات نہ کرتی ہو۔ اور ان میں عدل و انصاف یا ظلم و زیادتی کی معرفت نہ رکھتی ہو۔ شہر کی اصلاح امام ولی اللہ کے نزدیک کن عوامل سے ممکن ہے، انہیں بیان کرنے سے پہلے انہوں نے شہر کی تعریف کی چنانچہ اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں جہاں ابواب ابتغاء رزق کی بحث کی ہے وہاں فرماتے ہیں۔ "جان لو کہ جب کسی شہر میں دس ہزار انسان مجتمع ہو جائیں تو سیاست مدنی لوگوں کے پیشوں سے بحث کرے گی اب اگر اکثر لوگ صنعت کا پیشہ اختیار کرلیں یا زیادہ تر لوگ شہری سیاست میں حصہ لینے لگ جائیں اور تھوڑے سے لوگ جانوروں کی پرورش اور زراعت کا پیشہ اختیار کریں تو دنیا میں ان لوگوں کا حال خراب ہو جائیگا اور اگر لوگ شراب سازی کا پیشہ اور بت فروشی کا مشغلہ اختیار کرلیں تو اس سے لوگوں کو ترغیب ہوگی کہ وہ ان چیزوں کو استعمال کریں اس سے ان لوگوں کی دین میں تباہی ہوگی۔ اور اگر پیشوں کو اس طرح تقسیم کیا گیا جس طرح حکمت تقاضا کرتی ہے اور ان لوگوں کو برے اور قبیح پیشوں کو اختیار کرنے سے روکا گیا اور قانوناً ان کے ہاتھوں کو پکڑا گیا تو لوگوں کی حالت درست ہو جائے گی۔"[1]

---

[1] مسلم شریف کی شرح میں امام نوویؒ نے ایک جگہ فرمایا ہے۔ وقال الامام ابوالحسن الماوردی من اصحابنا فی آخر کتابہ "الاحکام السلطانیۃ" ویمنع المحتسب من یکتسب بالکہانۃ واللھو، ویؤدب علیہ الآخذ والمعطی، ج۔۲ ص۱۵

اور ہمارے اصحاب میں سے امام ماوردی نے اپنی کتاب احکام سلطانیہ کے آخر میں فرمایا ہے کہ محتسب (کوتوال) منع کرے ایسے لوگوں کو جو کہانت (رمل، دست شناسی، غیب دانی کے ذریعہ کمائی کرتے ہیں یا کھیل تماشہ کے ذریعہ کمائی کرتے ہیں کوتوال اس پر دونوں کو تنبیہ کرے لینے اور دینے والے کو، تنبیہ سے مراد تعزیر لگاتا ہے۔ (سواتی)

ون کی خرابی اس سے بھی ہوتی ہے کہ بڑے لوگ باریک زیورات، نفیس لباس اور عمدہ قسم کی عمارتوں
درجہ کے کھانوں اور حسین وجمیل عورتوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ اوران کی یہ رغبت اس سے زائد
تی ہے، جس کا تقاضا ارتفاقات ضروریہ کرتے ہیں یا جن کا پایا جانا ضروری ہے۔ اوران کے بغیر لوگ
نہیں سکتے۔ اور جن پر عرب وعجم کے سب لوگ متفق ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایسے پیشے
ار کر لیتے ہیں جن سے ان امراء کی خواہشات پوری ہوتی ہیں۔ جب انسانوں کی ایک اچھی خاصی جماعت
پیشوں کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے زراعت اور تجارت کے پیشوں کو مہمل چھوڑ دیا جاتا ہے اور شہر
بڑے بڑے لوگ ان پیشوں میں بڑے بڑے اموال خرچ کرتے ہیں اور شہر کے دوسرے مصالح
وڑ دیتے ہیں تو آخر کار یہ چیز لوگوں کے لئے تنگی کا باعث بن جاتی ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو ضروری
ں میں مشغول ہوتے ہیں جیسے کسان، تاجر، کاریگر۔ ان پر دگنے ٹیکس لگا دیئے جاتے ہیں اس سے
یت اور تمدن کو ضرر پہنچتا ہے اور یہ ضرر ایک عضو سے دوسرے عضو کی طرف سرایت کرتا ہے
ں تک کہ سب لوگ اس آفت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بیماری اس طرح تمدن اور شہر کے
ے وریشے میں پھیل جاتی ہے۔ جس طرح باولے کتے کے کاٹنے کا زہر ایک شخص کے تمام جسم میں پھیل
تا ہے۔ یہ تو وہ نقصان ہے جو انہیں دنیا میں پہنچتا ہے لیکن وہ نقصان جو دینی طور پر انہیں لاحق ہوتا ہے
تاج بیان نہیں۔ جب یہ بیماری عجم کے تمام شہروں میں پھیل گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
قلب مبارک میں یہ چیز ڈال دی کہ وہ اس بیماری کا علاج کریں اور اس کی جڑ کاٹ دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ
وسلم نے جب ان مضر چیزوں کے موقع ومحل کی طرف دیکھا جن میں کہ یہ پائی جاتی ہیں جیسے کہ گانے والی
تیں ریشم کے لباس، سونا چاندی کمی سے فروخت کرنا اور ان سے اس قسم کے زیورات تیار کرنا
ہننے ان سب سے منع فرمایا۔

امام ولی اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" کے باب "الاحکام التی یجر بعضہا البعض" میں شریعت کے جو مختلف
ول بیان کئے ہیں، ان میں ایک اصل (قانون) یہ بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب شارع نے ایک چیز
تی اور قطعی حکم دیا ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ اس کے مقدمات اور دواعی کی ترغیب دی جائے۔ اسی
ح جب اس نے کسی چیز سے منع کیا ہے تو اس کے تقاضا یہ ہے کہ اس کے ذرائع بھی بند کئے جائیں
اس چیز کے دواعی اور اسباب کو کالعدم بنایا جائے چنانچہ جب عبادتِ اصنام سے منع کیا۔ اور اس کو

گناہ قرار دیا گیا تو چونکہ اصنام کے ساتھ میل جول کرنا بھی ان کی پرستش کی طرف پہنچاتا ہے جیسا کہ پہلی امتوں میں ہو چکا ہے۔ اس لئے وہ بھی ممنوع قرار دیا۔ اسی طرح جب شراب نوشی حرام قرار دی گئی تو لازم ٹھہرا کہ شراب سازی کرنے والوں کو پکڑا جائے۔ اور ایسی دعوتوں میں شرکت سے منع کیا جائے۔ جن میں دسترخوان پر شرابیں لائی جائیں۔

امام ولی اللہ فرماتے ہیں۔ تمدن اور شہر کو پاک کرنے کے لئے اسلامی حکومت کا فرض ہوگا کہ برے پیشے ممنوع قرار دیئے جائیں۔ اور وہ تمام ذرائع بھی بند کر دیئے جائیں جو معصیت کی ترویج کا باعث بنتے ہیں

الاعانۃ فی المعصیۃ وترویجھا — معصیت میں اعانت کرنا اور اس کو رواج دینا اور

وتقریب الناس الیھا معصیۃ وفساد — اسی طرح لوگوں کو معصیت کے قریب کرنا یہ

فی الارض — سب خود معصیت اور فساد فی الارض ہے۔

اس طرح امام ولی اللہ نے اپنی کتاب "بدور بازغہ" میں ایک فصل باندھی ہے۔ الفساد فی اھل المدینۃ فیما بینھم علیٰ وجوہ یعنی اہل شہر یا ملک میں فساد کئی طرح ہوتا ہے۔ اور پھر شق وار سات صورتیں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ فساد کی ایک صورت یہ ہے کہ لوگ آپس میں عقیدہ کے لحاظ سے مختلف ہوں اور ان کے فرقے بن جائیں۔ یہ تفرقہ بازی باطل سے خالی نہ ہوگی اب اگر یہ باطل عبادات میں شامل ہو جائے تو یہ لوگ معاد کے متعلق ضرر میں پڑ جائیں گے۔ اور اگر یہ تفرقہ بندی معاملات میں ہو تو دنیاوی کاروبار میں نقصان اٹھائیں گے۔ اور ضرر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ تفرقہ بازی اکثر جھگڑوں کی طرف پہنچاتی ہے اور یہی فساد کی اصل ہیں۔

اس کا علاج یہ ہے کہ مرتدین (دین اسلام سے برگشتہ ہو جانے والے) اور زنادقہ (دین کے اصولوں کو

ل ان چیزوں کی حرمت کے متعلق قطعی احکام شریعت موجود ہیں چنانچہ مسلم جلد ثانی میں یہ روایت موجود ہے عن جابر بن عبداللہؓ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول عام الفتح وھو بمکۃ ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام

حضرت جابر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فتح مکہ کے سال جب کہ آپ مکہ مکرمہ میں تھے آپ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے۔ (سواتی)

غلط معانی پہنانے والے) سے توبہ کرائی جائے اور ان کے شکوک وشبہات رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ نہ مانیں تو ان کا علاج قتل سے کیا جائے۔

۲۔ پوشیدہ طور پر ملک اور شہر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے جیسے سحر اور جادو سے اور لوگوں کی خوراک میں زہریلی اشیاء ملانے سے، یا جیسا کہ عیار لوگ کرتے ہیں کہ خالی ہاتھ خرید و فروخت کرتے ہیں ان کے پاس مال بالکل نہیں ہوتا۔ اور ان کی غرض صرف یہی ہوتی ہے کہ لوگوں کے حقوق کو ضائع کیا جائے۔ یا جیسے مسخرے قسم کے مفتی جو لوگوں کو حیلوں کی تدبیریں سکھلاتے ہیں یا جیسے دوسرے ممالک کے جاسوس جو ملک کی تباہی اور بربادی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان کو قید کیا جائے یا اگر قتل مناسب ہو تو قتل کیا جائے۔

۳۔ فساد کی تیسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کے اموال کو نقصان پہنچایا جائے۔ ایسے لوگوں پر جس طرح مناسب ہو تعزیر لگائی جائے۔ یا جیسے چوری کرنے والے یا ڈاکہ ڈالنے والے (ان کے لئے قرآن کریم میں جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں وہ دی جائیں مثلاً چوروں کے ہاتھوں کو کاٹا جائے۔ اور ڈاکہ ڈالنے والوں کو سولی پہ لٹکایا جائے)

۴۔ فساد کی چوتھی صورت یہ ہے کہ لوگوں کے خون بہائے جائیں اور قتل کے ذریعہ ان کی جانیں تلف کی جائیں قتل یا عمد کی صورت میں ہوگا (جس کی سزا قصاص ہے) یا قتل خطا کی صورت میں ہوگا (اس کی حد دیت اور کفارہ ہے) یا شبہ عمد ہوگا (اس کی حد بھی دیت مغلظہ اور کفارہ ہوگا) یا زخم لگانے کی صورت میں ہوگا (زخموں کی دیت اور قصاص کا حکم قرآن وسنت میں موجود ہے۔

۵۔ فساد کی پانچویں صورت یہ ہے کہ لوگوں کی عزت آبرو برباد کی جائے۔ ان کے انساب کو برباد کیا جائے ان پر جھوٹی تہمتیں لگائی جائیں۔ گالی گلوچ بکنا یا سخت سست اور نامناسب باتیں کرنا بھی اس میں داخل ہے

۶۔ چھٹی صورت یہ ہے کہ لوگوں کو فساد پر ابھارا جائے اور برائی کی ترغیب دی جائے۔ جیسے زنا کی ترغیب دینا یہ ایک ایسی قباحت ہے جو فطرت کے خلاف ہے۔

اسی طرح قمار بازی اور سود خوری ہے کیونکہ ان میں جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں اسی طرح شراب نوشی ہے کیونکہ اس سے دین کی خرابی پیدا ہوتی ہے اور لڑائی جھگڑے پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے۔

۷۔ فساد تمدن کی ساتویں صورت یہ ہے کہ انسان کی پیدائشی فطرت کو تبدیل کیا جائے۔ اس سے

تمدن اور شہریت میں فساد اور بگاڑ، طرح طرح کی قباحتیں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے مردوں کو ایسی صفات پر پیدا کیا جو فحول (نروں) کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں اور عورتوں کو ایسی صفات پر پیدا کیا ہے کہ جن کے ساتھ پردۂ ستر مناسب ہے۔ اب مردوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی عادات اور لباس کو ترک نہ کریں، اور عورتوں پر ضروری ہے کہ وہ بھی اپنی عادات اور لباس کو ترک نہ کریں۔

یہ ہیں فساد تمدن کے اسباب (جن کو امام ولی اللہ نے بیان فرمادیا) ان فسادات کی اصلاح ضروری ہے مصلح کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ ان سب اسباب فساد پر نظر کرے اب لامحالہ یا تو جرم کسی خاص شخصیت میں یقینی اور قطعی طور پر جرم ثابت نہ ہو سکے گا۔ بلکہ جرم کی طرف اس کا میلان اور اس سے ملوث ہونا ثابت ہوگا تو ایسی صورت میں حاکم کے لئے ضروری ہے کہ موثر قسم کی زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) کرے۔ نیز یہ بات ملحوظ رہے کہ ہر جرم کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے۔ بعض جرائم بعض سے کم موثر ہوتے ہیں اور اسی طرح جرائم کا وزن بعض اوقات اس طرح کم و بیش ہوتا ہے کہ بعض لوگ زیادہ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور بعض کم۔

امام ولی اللہ فرماتے ہیں کہ شہریار (سربراہ مملکت یا حاکم) کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان جرائم پر نظر عمیق سے غور کرے اور پھر فیصلہ کرے۔ نیز یہ ضروری ہے کہ وہ ملک کے لوگوں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھے اور ان کے لئے وہی بات پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ اور اہل ملک کی طرف اس کی توجہ و نگاہ ہر وقت رہے اور اس کی شفقت زیادہ سے زیادہ ان کی طرف مبذول رہے۔

یہ بات خرابیوں کی اصلاح اور علاج کی طرف صحیح طور پر رہنمائی کرنے والی ہوگی بشرطیکہ وہ شہر یار اس طریق پر قائم رہے، اور اگر کسی وقت اس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے تو پھر وہ بات اختیار کرے جو سہل ہو۔

" قیصر و کسریٰ کے نظام کو تباہ کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس کی بنا جمہور کی لوٹ کھسوٹ پر تھی۔ بادشاہ، اس کے امیروں اور اس کے مذہبی طبقوں کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ رعیت کی خون پسینہ ایک کرکے کمائی ہوئی دولت سے عیش کریں، شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں :- عجم اور روم کے شاہنشاہ اس قدر تعیش میں مبتلا ہوگئے تھے کہ اگر ان کا کوئی درباری لاکھ روپے سے کم قیمت کی ٹوپی یا کمربند پہنتا، تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا "

حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹیؒ

ابوبکر شبلی

عمدۃ العارفین حضرت مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب امروٹی رحمۃ اللہ علیہ سرزمین برصغیر عظیم روحانی پیشوا اور مشہور سیاسی و سماجی رہنما تھے۔ وادیٔ سندھ کے ماضی قریب میں جو بزرگ ہستیاں اور مشہور دینی و ملی شخصیتیں گذری ہیں، حضرت مولانا امروٹیؒ کو ان سب میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

آپ کی ولادت قصبہ دیوانی تحصیل روہڑی ضلع سکھر میں ہوئی آپ کی تاریخ تولد متعین نہیں ہو سکی۔ اندازہ یہ ہے کہ آپ ۱۸ ویں صدی کے نصف آخر کے ابتدائی سالوں میں پیدا ہوئے آپ حسب نسب کے لحاظ سے سید تھے۔ آپ کا خاندان اپنے علاقہ میں رشد و ہدایت کا مرکز تھا آپ کے والد حضرت مولانا سید عبدالقادر صاحب علوم ظاہریہ و باطنیہ میں با کمال بزرگ تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کے مراحل اپنے والد کے ہاں طے کئے اور علوم ظاہریہ کی تکمیل حضرت مولانا عبدالقادر صاحب بیہوڑوی تحصیل پنو عاقل ضلع سکھر کے ہاں کی۔ علوم شرعیہ کے حصول کے بعد آپ علوم باطنیہ حاصل کرنے کے لئے قدوۃ العارفین سید السالکین حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈویؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور مسلسل ریاضت کے بعد نہایت قلیل عرصہ میں خرقۂ خلافت سے نوازے گئے۔ جب آپ روحانی تربیت کے سلسلہ میں بھرچونڈی شریف میں مقیم تھے، انہی دنوں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ بھرچونڈی شریف آئے اور حضرت حافظ صاحبؒ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے یہیں دونوں حضرات کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ اور یہ تعارف آگے چل کر اشاعت اسلام اور احیائے ملت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ یہ ۱۸۸۷ء کا واقعہ ہے۔

حصول خلافت کے بعد آپ نے اپنے مرشد کے حکم سے امروٹ شریف تحصیل گڑھی یاسین ضلع سکھر کو اپنا مستقل مسکن بنایا اور دعوت الی اللہ و دعوت الی الاصلاح کے لئے ہمہ تن مشغول ہو گئے امروٹ میں آپ کے ابتدائی ایام نہایت صبر آزما تھے۔ کئی کئی اوقات آپ کو فاقے ہوتے اور بعض دفعہ آپ صرف ساگ بھات پر اکتفا کرتے لیکن آپ عزم و عمل

کا پیکرین کر دعوت و عزیمت کے کام میں برابر مصروف رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی طرف عوام کے رجوع میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور نہایت قلیل عرصہ میں امروٹ شریف دعوت الی اللہ کا ایک عظیم مرکز بن گیا۔ امروٹ شریف میں عوامی ضروریات کے پیش نظر آپ نے ایک وسیع مسجد کی بنیاد رکھی اور کئی حجرے تعمیر کرائے اس میں آپ دوسرے خدام کے ساتھ ملکر کام کرتے اور کسی قسم کا امتیاز برتنے نہ دیتے، جب مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ آپ نے حفظ قرآن اور ناظرہ کے لئے مسجد کے اندر ہی ایک مدرسہ کھولا جس کے تمام اخراجات کے آپ خود ذمہ دار تھے ۱۳۰۸ھ میں سید السالکین حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے آپ ہمہ وقت مغموم اور متفکر رہنے لگے۔ اس المیہ نے آپ کے اندر شعر و شاعری کو جنم دیا۔ آپ نے اپنی شاعری کا آغاز نعتیہ کلام سے کیا۔ مدح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپنے سندھی زبان میں جو اشعار کہے ہیں وہ آج تک عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ اپنے بیٹے سید حسن شاہ کی عین نوجوانی کی موت نے آپ کے شاعری کے اور اضافہ کیا۔ آپنے فارسی کی "یوسف زلیخا" کی طرز پر سندھی زبان میں "پریت ناموں" کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی۔ یہ کتاب عوام و خواص میں بیحد مقبول ہوئی ہے آج تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ آپ نے سورۃ یٰسین کا سندھی زبان میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

۱۳۰۸ھ میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر سندھ میں واپس آئے آپ کی آمد سے دو دن قبل حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی اس دار فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ آپ بھرچونڈوی شریف سے ہوتے ہوئے سیدھے امروٹ شریف آئے اور یہیں مستقل سکونت کا ارادہ کیا حضرت مولانا امروٹی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے ارادہ کو بہت پسند کیا اور رہنے کی تمام سہولتیں مہیا کر دیں۔ حضرت مولانا امروٹیؒ نے آپکی شادی کرا دی۔ اور آپ کی والدہ کو پنجاب سے بلوالیا۔ نیز آپ کے لئے عربی کتابوں کا ایک بہترین ذخیرہ جمع کیا جس میں مصر، استنبول اور قاہرہ کی اہم و نادر کتابیں تھیں۔ حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ مسلسل سات سال تک نہایت سکون و اطمینان سے امروٹ شریف میں قیام پذیر رہے۔ اس دوران آپ نے ایک دارالعلوم کھولا جس میں علوم اسلامیہ عربیہ خصوصاً فلسفہ ولی اللّٰہی کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ نے امروٹ شریف میں ایک مطبع بھی قائم کیا جس میں سندھی زبان میں کئی دینی کتابیں چھپیں۔ اسی پریس سے "ھدایۃ الاخوان" نامی سندھی زبان میں ایک دینی ماہنامہ بھی کچھ عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔

انہی دنوں حضرت مولانا امروٹیؒ نے سندھی زبان میں ترجمہ قرآن شروع کیا جسے کئی سال کی جد و جہد کے بعد آپنے شائع کرایا۔ اس ترجمہ کے کام میں دیگر مقتدر علماء کے علاوہ حضرت مولانا سندھیؒ سے بھی آپ خصوصی مشورے لیتے رہے۔

یہ ترجمہ آپ کی زندگی میں ہی طبع ہو کر شائع ہوا اور بہت زیادہ مقبول ہوا۔ آپ کی وفات کے بعد یہ ترجمہ حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور سے شائع ہوتا رہا اور اب بھی یہی انجمن اس کی اشاعت میں مصروف ہے۔

گو حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سات سال کے بعد امروٹ شریف سے پیر جھنڈہ سندھ منتقل ہو گئے لیکن امروٹ شریف سے آپ کا رابطہ برابر قائم رہا۔ آپ نے حضرت مولانا شیخ الہندؒ کو حضرت مولانا امروٹیؒ سے متعارف کرایا اور حضرت شیخ الہندؒ دوبار امروٹ شریف تشریف لائے اسی طرح حضرت مولانا امروٹیؒ بھی دیوبند تشریف لے گئے اور مدرسہ دیوبند کی پچاس سالہ جوبلی کے جشن میں بھی شریک ہوئے۔

۱۳۳۳ھ میں حضرت مولانا شیخ الہندؒ کے حکم سے جب حضرت مولانا سندھیؒ نے کابل جانے کا ارادہ کیا تو حضرت مولانا امروٹیؒ نے ان کو وہاں تک پہنچنے میں ہر طرح کی مدد کی کابل جانے کے بعد بھی حضرت مولانا سندھی نے امروٹ شریف سے رابطہ قائم رکھا۔ چنانچہ آپ نے جو ریشمی خطوط اندرون ہند بھیجے تھے ان میں سے ایک خط حضرت مولانا امروٹیؒ کے نام تھا جو فتح محمد شیخ نامی ایک شخص لایا تھا۔ حکومت کو اس خط کا بر وقت علم ہو گیا آپ کو نظر بند کر کے کراچی بلوایا گیا۔ کراچی کے کمشنر نے اس سلسلہ میں آپ سے سوال و جواب کئے لیکن کافی ثبوت نہ ملنے پر آپ کو رہا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نظربندی سے آپ کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ عملی آغاز ہوا اس کے بعد جتنی بھی عوامی اور دینی تحریکیں اٹھیں آپ نے باقاعدہ ان میں حصہ لیا۔ تحریک خلافت میں آپ سندھ میں سب سے پیش پیش تھے۔ اس تحریک کے دوران امروٹ شریف سندھ کا عظیم سیاسی مرکز بن گیا تحریک سے متعلق تمام امور آپ کے مشوروں سے ہی طے ہوتے تھے اس تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے آپ نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود سندھ اور بیرون سندھ کئی دورے کئے آپ دیوبند، دہلی، میرٹھ، ناگپور اور اجمیر شریف گئے اور کئی جلسوں کی صدارت کی۔ ترک موالات کو کامیاب بنانے کے لئے آپ نے بڑے جوش و خروش سے سندھ کے دورے کئے اور اس مقصد میں آپ کو نمایاں کامیابی بھی ہوئی۔ خلافت عثمانیہ کے بقا کے لئے مسلمانان پاک و ہند نے کابل کی طرف جو احتجاجی ہجرت کی آپ اس کے روح رواں تھے۔ آپ مہاجرین کی اسپیشل ٹرین کے قائد بن کر لنڈی کوتل تک گئے لیکن یہ اسکیم کامیاب نہ ہوئی اور آپ بادل ناخواستہ وطن آ گئے۔

تحریک خلافت کے بعد آپ جمعیت العلماء ہند سے منسلک رہے اور تا زیست اس جماعت کیساتھ مل کر کام کرتے رہے احیائے ملت اسلامیہ اور حریت وطن کے علاوہ آپ کو غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کا بھی بہت شوق تھا۔ کیسلئے آپ نے اس سلسلے میں جو کام کیا وہ آج بڑی بڑی انجمنیں سر انجام نہیں دے سکتیں، آپ نے اپنی زندگی میں کم و بیش،

پانچ ہزار غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ آپ نے غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کا کام جس طرح شروع کیا وہ نہایت پرکشش اور زود اثر تھا۔ آپ کسی مجمع کے سامنے اسلام پر لیکچر نہ دیتے اور نہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی کسی کو دعوت دیتے۔ اس قسم کی نمائشی تبلیغ سے آپ بچتے۔ آپ ذاتی طور پر غیر مسلموں سے روابط قائم کرتے اور وہ لوگ آپ کے اخلاق حسنہ سے اتنے متاثر ہوتے کہ فوراً اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے آپ کسی پر اسلام قبول کرنے کے لیے جبر نہ کرتے بلکہ اگر کوئی مسلمان ہونے کے لئے آپ کی خدمت میں آتا تو آپ تلقین کرتے کہ "بیٹا اسلام قبول کرنے میں اتنی جلدی نہ کرو اور سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھاؤ" جب وہ ہر طرح اطمینان کرنے کے بعد اسلام قبول کرنے پر اصرار کرتا تب آپ اس سے باقاعدہ طور پر بیعت لیتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ باہر کے کچھ ہندو مسلمان ہونے کے لئے امروٹ تشریف آتے، مقامی ہندوؤں کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ وفد بنا کر آپ کی خدمت میں آتے اور عرض کرتے "حضور ان لوگوں نے جذبات میں آکر یہ فیصلہ کیا ہے آپ موقع دیجئے کہ ہم ان سے علیحدگی میں بات چیت کرلیں" آپ ان لوگوں کی درخواست قبول کر لیتے اور مسلمان ہونے والے افراد سے ان سے بات چیت کرنے کی اجازت دیتے۔ وہ لوگ ان کو اپنے گھروں میں لے جاتے، مندروں میں جا کر ان کو مسلمان نہ ہونے کی تلقین کرتے، لیکن ان کو اسلام قبول کرنے سے باز آنے پر ہرگز آمادہ نہ کر سکتے اس طرح یہ بڑے شوق و ذوق سے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے لیکن جب آپ کے ہاتھ پر اسلام لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، متعصب آریہ سماج ہندوؤں میں آپ کے خلاف نفرت کا جذبہ شدید ہو گیا اب وہ کھل کر آپ کے مقابلہ پر آگئے ایک بار ایک متمول ہندو گھرانے کا ایک نوجوان لڑکا آپ سے متاثر ہو کر آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا آپ نے اسے اپنے ساتھ رکھا۔ ایک بار آپ اس لڑکے کے ساتھ ایک دعوت میں شریک ہونے کے لئے باگڑجی ریلوے اسٹیشن پہنچے تو مقامی ہندوؤں کو اس کا علم ہو گیا وہ لوگ راستہ میں جمع ہو گئے اور زبردستی اس لڑکے کو چھین کر اپنے ساتھ لے گئے۔ رات بھر اس کو بند رکھا، اور اسلام سے باز آنے کے لئے اسے آمادہ کرنے لگے انھوں نے اس کو ہر طرح دھمکایا اور ہر قسم کے لالچ دیے لیکن یہ نوجوان کسی طرح بھی ان کی باتوں میں نہ آیا۔ حضرت مولانا امروٹی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حملہ کی پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ پولیس نے تفتیش کے بعد اس لڑکے کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور متعلقہ ہندو لیڈروں کو گرفتار کر کے معاملہ عدالت کے سپرد کر دیا۔ کافی عرصہ تک مقدمہ چلتا رہا اس نوجوان نے ہر بار یہ بیان دیے کہ میں عاقل و بالغ ہوں اور میں نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا ہے ہندوؤں نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ لڑکا نابالغ ہے اس کو اپنے والدین کی مرضی کے بغیر مذہب تبدیل کا کوئی اختیار نہیں ہندوؤں نے متحد ہو کر یہ مقدمہ لڑا عدالت نے کافی عرصہ کے بعد آخر کار فیصلہ دیا کہ لڑکا بالغ ہے۔ اس کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کا اختیار ہے۔

جس طرف چاہے وہ جاسکتا ہے۔ اس وقت عدالت میں ایک طرف حضرت مولانا امروٹی معہ اپنی جماعت کے کھڑے تھے۔ دوسری طرف اس لڑکے کے والدین، اعزہ واقارب اور سینکڑوں ہندو کھڑے تھے۔ اس لڑکے نے جونہی عدالت کا فیصلہ سنا وہ سیدھا مولانا امروٹیؒ کے قدموں میں گر پڑا اس کے والدین نے اسے اپنی طرف بہت کھینچا لیکن وہ نہ گیا۔ یہ لڑکا اب مولوی نورالحق ہیں، موصوف ضلع لاڑکانہ کے ایک قصبہ میں مقیم ہیں اور دینی تعلیم وتدریس میں مشغول ہیں۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک ہندو پنڈت کا بیٹا از خود آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ ہندوؤں نے بڑے جوش وخروش سے آپ کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی، لیکن ناکام ہوئے۔ وہ لڑکا بعد میں شیخ عبداللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جو جماعت امروٹی کے ایک اہم رکن تھے۔

آریہ سماج والے جب آپ کے مقابلے میں ناکام ہوئے تو انھوں نے شدھی کی تحریک شروع کردی وہ نومسلم افراد کے پاس جاتے اور ان کو ہر طرح کے لالچ دے کر دوبارہ ہندو مذہب اختیار کرنے پر آمادہ کرتے۔ حضرت مولانا امروٹیؒ نے اس فتنہ کو دبانے کے لئے مثبت قدم اٹھایا۔ آپ نے چند علماء کی ایک جمعیت بنائی جس میں اس وقت کے مشہور علماء حضرت مولانا عبدالکریم صاحب چشتی، حضرت مولانا دین محمد صاحب وفائی، حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب قاسمی، حضرت مولانا عبدالکریم صاحب، حضرت مولانا نبی بخش صاحب عودوی اور دیگر مقتدر علماء شامل تھے آپ نے اس آریہ سماجی اقدام کا منظم مقابلہ کیا اور اس فتنہ کو سرزمین سندھ میں سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔

اشاعت اسلام کی طرح حضرت امروٹیؒ میں جہاد کا بھی شوق تھا۔ آپ ہر وقت اپنے آپ کو جہاد کے لئے مستعد رکھتے۔ آپ فرماتے "کاش کہ میں جہاد میں شریک ہوکر جام شہادت نوش کروں" اس مقصد کے لئے آپ نے چند گھوڑے بھی پال رکھے تھے۔ آپ بذات خود ان گھوڑوں کی ہر طرح خدمت کرتے۔ فرماتے تھے جہاد کے لئے گھوڑے پالنا سنت ہے اور ان کی خدمت کرنا کار ثواب ہے"

آپ کی زندگی کے آخری ایام میں سکھر بیراج کی کھدائی ہورہی تھی نہروں کی کھدائی کی زد میں تین مساجد آرہی تھیں محکمہ انہار نے طے کیا کہ ان مساجد کو منہدم کرکے راستہ صاف کیا جائے۔ جب آپ کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے تحفظ مساجد کی خاطر اس محکمہ کے خلاف حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر ان مساجد کو شہید کردیا گیا تو مسلمانان سندھ حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد کا اعلان کردیں گے شروع میں حکومت نے اس اعلان کو کوئی اہمیت نہ دی اور انہار کی کھدائی کا کام جاری رہا۔ حضرت مولانا امروٹیؒ نے بالآخر جہاد کا اعلان کردیا اور معہ اپنی جماعت کے سر پر کفن باندھ کر گھروں سے نکل آئے اور ان مساجد کے گرد خیمہ زن ہوگئے۔ اس لئے وہ فوراً مصالحت پر آمادہ ہوگئی۔ آخر طے ہوا کہ مساجد کو اپنی اصلی حالت پر

سپنچ دیا جائے اور نہروں کو ان کے گرد کھودا جائے۔ یہ مساجد اب تک ان انہار کے وسط میں قائم ہیں۔

حضرت مولانا امروٹی جس طرح .... ایک عظیم مبلغ اسلام تھے ویسے ہی بے مثل سیاسی رہنما بھی تھے برطانوی استعمار کے خلاف آپ کی جدوجہد زریں حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ حکومت برطانیہ کے لئے آپ کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ مشہور ہے کہ حکومت نے خفیہ طریقہ سے آپ کو زہر دلوایا۔ یہ زہر دیر میں اثر کرنے والا تھا اس کی وجہ سے آپ کا جسم آہستہ آہستہ نحیف ہوتا گیا اور آپ کے تمام بدن پر چھالے نکل آئے اور باوجود بہترین علاج کے طبیعت دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ آپ فرماتے تھے مجھے انگریزوں نے زہر دلوایا ہے۔ میں اب زندہ نہیں رہ سکتا چنانچہ یہ عظیم پیشوا اور بطل حریت ۱۹۲۹ء کے آخر میں اس دار فانی سے رخصت ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔

آپ نے اپنے پیچھے ایک عظیم جماعت چھوڑی۔ یہ جماعت توحید اور اتباع سنت میں اپنی مثال آپ ہے۔ یوں تو جماعت کا ہر فرد اسلام کا بہترین عملی نمونہ ہے لیکن آپ کے خلفاء وقت کے اہم اور نامور لوگوں میں شمار ہوتے ہیں آپ کے خلفا کی کافی تعداد ہے لیکن حسب ذیل حضرات زیادہ مشہور ہوئے۔

۱۔ حضرت مولانا محمد صالح صاحب باجی شریف۔ ضلع سکھر
۲۔ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب تھریجانی شریف "
۳۔ حضرت مولانا حماد اللہ صاحب ہالیجی شریف "
۴۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہور

یہ تمام خلفا اپنے وقت کے عظیم دینی و سیاسی رہنما تھے۔ توحید اور سنت کے مبلغ تھے۔ ان حضرات کے آثار ابھی تک منظر عام پر ہیں۔

حضرت مولانا امروٹی کی وفات کے بعد آپ کے بھتیجے حضرت میاں نظام الدین صاحب آپ کی جگہ مسند آرائے خلافت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند حضرت مولانا محمد شاہ صاحب امروٹی ان کے جانشین ہوئے جو اشاعت دین متین میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

دین کے زوال کے اسباب

حافظ عباد اللہ فاروقی

انبیاء کے ظہور قدس کے زمانہ میں ان کے اصحاب میں سے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جسے اخلاق و اعمال میں اپنے پیغمبر سے مناسبت نہ رہی ہو۔ ان لوگوں کی اخلاقی اور عملی زندگی بے مثل تھی ان کے بعد طبقہ ثانی کا ظہور ہوا، جسے پیغمبر کی تعلیم گویا بالواسطہ نصیب ہوئی۔ تاہم اس کی دینی اور اخلاقی حالت بدستور درست رہی۔ لیکن ان کے بعد جس قدر امت میں کثرت ہوتی گئی زیادہ سے زیادہ اغراض و خواہشات پیدا ہوتی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ امتداد زمانہ اور اختلاف طبائع سے لوگوں کے اتفاق میں بھی خلل پڑنے لگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دینی ولولہ ضعیف ہوتا گیا۔ اسی طرح دلوں کی وہ پاکی اور نیتوں کی وہ صفائی جو طبقہ اولیٰ کے اکثر افراد میں تھی، طبقہ ثانیہ کے افراد میں بتدریج کم ہوتی گئی اس کے بعد وہ پر آشوب زمانہ آیا، جس میں نہ تو خود لوگوں نے بانی مذہب کو نہ اس کے دیکھنے والوں کو دیکھا تھا۔ اور نہ اپنی سعی و شوق سے انہوں نے اس دین و مذہب کو اختیار کیا تھا بلکہ انہوں نے جس مذہب پر اپنے باپ دادا کو پایا اسے اختیار کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کے معاملے میں بجائے تحقیق و تلاش کے یہ لوگ باپ دادا کی تقلید کرنے لگے۔ اور امتداد زمانہ سے ان میں خود پسندی اور نفسانیت آگئی دین کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ مختلف قومیں جو اس دین میں شامل ہوئی تھیں، ان کی باتیں اس میں داخل ہو گئیں اور ان پر بھی دین کا اطلاق ہونے لگا۔

جتنے بھی پہلے ادیان گذر چکے ہیں، ان کا کم و بیش یہی حشر ہوا۔ لوگوں نے اپنے اپنے پیغمبر کی کتاب کو چھوڑ کر رسم و رواج پر اکتفا کیا اور انا وجدنا علیہ آباءنا اور بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا کہہ کر تحقیق سے ہاتھ اٹھا لیا۔ عقیدہ اس کو سمجھنے لگے، جو آباؤ اجداد سے سنا۔ اور عمل اس پر کرنے لگے جو ساتھیوں کو کرتے دیکھا۔ خاندانی طریق پر چلنے کو اصل دین اور اس کو چھوڑ کر دین کی باتوں کی تحقیق کو بدعت

کہنے لگے غرض جب غفلت، پابندی رسم ورواج اور تقلیداً باء واجداد کے باعث دین کی اصل حالت باقی نہ رہی، تب اصلاح حال کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوسرا پیغمبر مبعوث فرمایا جس نے دین کی تحریف کو واشگاف کیا اور باپ داداکے نقش قدم کی سند پکڑنے والوں کو متنبہ فرمایا۔ نیز لوگوں کو جمود اور تعطل کی حالت سے بیدار کیا۔ چنانچہ دنیا میں کثیر التعداد پیغمبر مبعوث ہوئے، جنہوں نے ذہنی جمود، غلط رسم ورواج اور تقلید جامد کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اس سلسلے میں جو تکالیف انہوں نے اٹھائیں وہ تمام تر تقلید اور پابندی رسوم کی بدولت تھیں۔ لیکن ان تمام اولوالعزم پیغمبروں نے ناساعد حالات کی پروانہ کرتے ہوئے سب سے پہلے دین سابق کی اصلاح کی۔ اور جو تحریف لوگوں نے اس میں کی تھی اسے واشگاف کیا اور جس قدر رسم ورواج کے عناصر دین میں گھل مل گئے تھے ان کو الگ کیا اور خالص دین لوگوں کے سامنے پیش فرمایا

اس ضمن میں شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ پہلا سبب زوال مذہب کا بانی ملت اور صاحب شریعت کے اعمال او راقوال سے چشم پوشی کرنا۔ اور اپنے عقائد اور اعمال میں اس کے عقائد اور اعمال کی مخالفت کرنا ہے۔

دوسرا سبب ان کے نزدیک تعمق یعنی تکلیف بے جا کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص شارع کے کسی امر ونہی کی علت کو دوسری شے پر مطابق کرکے مثل شارع کے اس شے کے امر ونہی کا حکم دے۔ یا نبی کے جملہ افعال کو عبادت سمجھکر ان کے ان افعال کو جو انہوں نے عادتاً کئے ہوں، فرائض میں شامل کرے۔

شاہ صاحب زوال مذہب کا تیسرا سبب یہ قرار دیتے ہیں:۔ ان عبادات شاقہ کا اختیار کرنا جن کا اسی طرح شارع نے حکم نہیں دیا۔ اسی طرح آداب کا مثل فرائض وواجبات کے التزام کرنا ہے۔ یہ وہی بیماری ہے جس میں یہود ونصاریٰ گرفتار ہوگئے تھے۔

زوال مذہب کا چوتھا سبب ان کے نزدیک اجماع کا اتباع کرنا ہے۔ یعنی اگر کسی بات پر متعدد علماء متفق ہوجائیں تو ان کے اس اتفاق کو اس امر کے ثبوت کی دلیل قاطع سمجھنا۔ واضح رہے کہ اجماع کی دو صورتیں ہیں ایک تو وہ اجماع ہے جس کی سند کتاب وسنت میں ہو۔ یہ اجماع واجب الاتباع ہے دوسرا وہ اجماع ہے جس کی کتاب وسنت میں کوئی سند نہ ہو اور محض رسم ورواج کی بنا پر اجماع ہوگیا ہو۔ بعض حالات میں اس قسم کے اجماع کی مخالفت کرنا واجب ہوتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں جائز۔ یہ وہ اجماع ہے جس کی برائی قرآن مجید میں بار بار بیان فرمائی

گئی ہے۔ اس اجماع ہی کے اتباع نے لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے سے روکا تھا۔ اور اکثر لوگ اس اجماع کو بل نتبع ما الفینا علیہ آبائنا کہہ کر اپنے اوپر واجب قرار دیتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اجماع کی ان دونوں قسموں میں فرق نہیں کیا گیا بلکہ بلاتمیز ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دین کو زوال آگیا۔ لوگ اس اجماع کی دلیل سے اپنے بزرگوں کی رسموں اور خاندانی عادات کو واجب العمل سمجھتے تھے اور ان باتوں کو جو صریح مخالف کتاب و سنت ہیں، مخالفتِ اجماع کے ڈر سے ترک نہیں کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک مذہب کے زوال کا پانچواں سبب غیر معصوم کی تقلید کرنا ہے یعنی کسی مجتہد کی، یہ سمجھ کر کہ تمام مسائل میں اس کا اجتہاد صحیح اور درست ہے اور جو کچھ اس نے کتاب اور سنت سے استنباط کیا ہے وہ خطا اور غلطی سے محفوظ ہے، ایسی تقلید کرنا کہ اگر کوئی مسئلہ جس کا اس نے استخراج کیا ہو، صحیح نہ ہو اور اس کی غلطی ثابت ہو، نیز حدیث صحیح بھی صریحاً اس کے مخالف موجود ہو، اس حدیث کو چھوڑ کر اس مسئلہ میں اس مجتہد کے اجتہاد پر عمل کرنا باعث زوال دین ہوگا۔ یہ تقلید ہرگز وہ نہیں ہے جس پر امت کا اجماع ہے۔ یعنی اکثر علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ مجتہدین کی تقلید جائز ہے اور ان کے استخراجی مسائل پر عمل کرنا درست ہے۔ بلکہ اکثر حالت میں نہایت مفید اور ضروری بھی ہے۔ مگر اس میں دو شرطوں کا ہونا لازم ہے۔

اول یہ سمجھنا کہ مجتہد اپنے اجتہاد میں خطا بھی کرتا ہے۔ اور صواب بھی۔ دوسرے منصوصات نبوی پر اس کو مقدم نہ کرنا۔ یعنی اگر کسی مسئلہ میں مجتہد کے اجتہاد کے خلاف صحیح حدیث مل جائے تو حدیث کا اتباع کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور تقلید کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ ان شرائط کے بغیر مجتہد کی تقلید یقیناً زوال دین کا موجب ہوگی۔ اگلے اہل کتاب ایسی ہی تقلید کرتے تھے جن کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے۔ واتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔

(اہل کتاب نے اپنے احبار و رہبان کو رب ٹھہرا لیا ہے۔ اور خدا کو چھوڑ دیا ہے)

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی اہل کتاب اپنے احبار و رہبان کی عبادت نہ کرتا تھا بلکہ ان کو معصوم سمجھ کر ان کی ہر بات کی پیروی کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ جس شے کو وہ حلال کہتے وہ اسے حلال مانتے جس کو وہ حرام قرار دیتے وہ اس کی حرمت کے قائل ہو جاتے اس طرح یہ لوگ انبیاء کے اقوال و احکام کو اپنے

اقوال و احکام کے مقابلہ میں پس پشت ڈالتے تھے اور اس کا لازمی نتیجہ زوال دین میں ظاہر ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک ایک علت کا دوسری علت میں خلط ملط کرنا زوال دین کا سبب ہے۔ شاہ صاحب نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے دین کی باتوں کو پسند کر کے کسی ضعیف وجہ یا اس کی موضوع سند سے اس کا جواز ثابت کرے اور اسے اپنے مذہب میں اس طرح داخل کرے کہ پھر یہ تمیز نہ رہے کہ یہ باتیں کس مذہب کی ہیں۔ بلکہ وہ اس قدر خلط ملط ہو جائیں کہ اسلام ہی کی باتیں معلوم ہوں۔ زوال دین کا سبب ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب فقہ حنفی کو ابو حنیفہ کے شاگرد محمد بن حسن الشیبانی متوفی ۱۸۹ھ کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں اور شافعی فقہ کو براہ راست امام شافعی کی تصانیف سے لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام محمد اور امام شافعی دونوں کے دونوں امام مالک سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ درحقیقت فقہ کا اصل الاصول امام مالک کی موطا ہے۔ اور اسی سے مالکی، شافعی اور حنفی مذاہب فقہ پیدا ہوئے۔ اس قاعدہ کلیہ کے بعد وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں چنانچہ وہ دیکھتے ہیں کہ موطا امام مالک تمام تر اہل مدینہ کی فقہ پر مشتمل ہے۔ اور اہل علم مدینہ کی فقہ کا مرکز حضرت عمر فاروقؓ کو قرار دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مالکی، شافعی اور حنفی فقہ کے مذاہب سارے کے سارے شاہ صاحب کے نزدیک حضرت فاروق اعظمؓ کے مذہب کی تشریحیں ہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب اپنی کتاب "ازالۃ الخفا" میں حضرت فاروق اعظم کو مجتہد مستقل اور ان تین ائمہ کو مجتہد منتسب تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اہل سنت کے ان تین اماموں کے مذہب کو قرآن و سنت کی تشریح قرار دیتے ہیں۔

(مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

تعلیم اقبال کی نظر میں

پروفیسر ضیاء

علامہ اقبال بنیادی طور پر ایک فلسفی اور مفکر تھے شاعری کا درجہ ان کے ہاں ثانوی تھا۔ اور وہ بھی محض اظہار خیال کے ذریعہ کے طور پر، موصوف نے زندگی کے مسائل پر بڑا غور کیا ہے اور ان کے حسن و قبح کو بڑی تحقیق اور تفحص سے پرکھا ہے۔ اپنی اس ذہنی کاوشوں کا نتیجہ کبھی وہ اشعار میں پیش کرتے رہے اور کبھی نثر میں۔ ضرورت ہے کہ ان کے افکار کو سمجھا جائے۔ اور زندگی کے بنانے۔ اس کی گتھیوں کو سلجھانے اور اسے نئے نصب العین دینے میں ان افکار سے جو روشنی ملتی ہے اس کی طرف توجہ کی جائے شاید بعض لوگوں کو اقبال کے تعلیمات کے فلسفی اور مفکر ہونے پر تعجب ہو اس میں شک نہیں کہ تعلیم کو اگر محدود اور اصطلاحی معنوں میں لیا جائے تو علامہ اقبال کو مفکر تعلیمات کہنا مشکل ہوگا۔ لیکن اگر تعلیم کو عام اور وسیع معنوں میں لیں تو اقبال بے شک مفکر تعلیمات ہیں۔ اور ان کے فلسفے میں تعلیم کے مربوط نظریئے آپ کو ملیں گے۔

تعلیم کا کوئی نظام اس وقت تک ناقص ہے، جب تک وہ فرد اور اس کی شخصیت کے متعلق کوئی مثبت اور واضح خیال پیش نہ کرے سچ پوچھئے تو تعلیم نام ہے فرد کا ماحول سے متاثر ہونا، اور ماحول کو متاثر کرنا۔ احوال و اسباب کے رنگ میں اس کا رنگا جانا اور ان کو اپنے رنگ میں رنگنا اس عمل اور ردِ عمل کا تجزیہ ماہر تعلیم کا کام ہے۔ ایک فلسفی کی طرح ایک معلّم کو بھی فرد اور ماحول کے مفہوم کی حدیں قائم کرنی پڑتی ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کی اصلیت کو جاننے پر ہی اس کے سارے مسائل کا دار و مدار ہے۔

لے اس مضمون کے لکھنے میں جناب غلام السیدین کی کتاب Iqbal's Philosophy of Education سے مدد لی گئی ہے۔

علامہ اقبال کے فلسفے کا بنیادی مسئلہ نظریۂ خودی ہے۔ انہوں نے اپنی فارسی مثنوی اسرارِ خودی میں اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور اردو کلام میں بھی خودی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ موصوف نے اپنے انگریزی لیکچروں میں بھی اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک خودی کا استحکام زندگی کا اصل الاصول ہے۔ فرد اگر اپنی خودی کو مضبوط نہیں کرتا تو وہ مردہ ہے۔ خواہ وہ زندگی کے سانس ہی کیوں نہ لے رہا ہو۔ اگر زندگی میں نمود کا ذوق نہ ہو تو وہ موت ہے اور اگر فرد اپنی خودی کی تعمیر کرے تو وہ خدائی کرتا ہے۔ خودی کی اس اہمیت کے متعلق ماہرین تعلیم علامہ اقبال کے اس نظریہ سے متفق ہیں

اب سوال یہ ہے کہ خودی کے ارتقاء اور اس کی تکمیل کی کیا صورت ہے۔ اس مسئلہ میں نفسیات اور تعلیمات کے تمام ماہرین علامہ موصوف سے ہم نوا ہیں کہ خودی ایک مستقل جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہے جو انسان کو اپنے ماحول کے ناسازگار حالات اور اپنی ذات کے غیر ترقی کن رجحانات کے خلاف کرنی پڑتی ہے خود حضرت علامہ کے الفاظ ہیں۔

"خودی کا وجود اس کش مکش کا رہین منت ہوتا ہے، جو فرد ماحول کے خلاف کرتا ہے، یا ماحول فرد کے خلاف"

ظاہر ہے اس کے لئے اشد ضروری ہے کہ فرد کا اپنے ماحول سے تعلق اور ربط رہے۔ فرد اور ماحول کے اس باہمی ربط و کش مکش، تاثیر و تاثر اور ہم آہنگی اور مخالفت کے دوران میں خودی کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ ترقی پاتی ہے اور اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ اقبال کا تصورِ حیات بڑا زندگی بخش ہے۔ وہ عزلت نشینی اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھنے کے حامی نہیں، وہ آزمائش، تجربۂ عمل اور حرکت کو زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ وہ خودشناسی کی دعوت دیتے ہیں اور دوسروں کی تقلید یا ان سے سوال کرنا ان کے ہاں مذموم ہے۔ کیونکہ اس سے خودی فنا ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال فرد کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے آزاد فضا چاہتے ہیں۔ چنانچہ شخصیت کی تکمیل کے لئے ان کے خیال میں آزادی شرطِ اول ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

وہ فرد کو خود اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے ان کی رائے یہ ہے کہ فرد کو بے خطر ہو کر زندگی کی کش مکش میں کود پڑنا چاہیئے وہ اپنے تیشہ سے فرد کو اپنا راستہ بنانے کو کہتے

اور دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا گناہ قرار دیتے ہیں اگر انسان سے کوئی نادر کام ہو جائے تو اس کا گناہ بھی ان کے نزدیک ثواب ہو جاتا ہے۔

تراشش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است
اگر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

کیوں کہ آزادیٔ فکر اور جرأت عمل کا ولولہ اگر انسان میں پیدا ہو جائے تو آگے چل کر اس سے بڑے بڑے شان دار نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

تعلیم کا یہ نظریہ جامد بے جان اور بے روح نظام کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا جو ایک خاص ڈھرے پر بچوں کو چلانا چاہتا ہے۔ اور انہیں وہ بنانا نہیں دینا چاہتے جو وہ بن سکتے ہیں۔ بلکہ جو وہ خود انہیں بنانا چاہتا ہے وہ بناتا ہے۔ اقبال آزادی فکر اور آزادیٔ عمل کے قائل ہیں۔ اور فرد کو آزادی سے کسی قیمت پر محروم نہیں کرنا چاہتے۔ موصوف کتابی علم کے زیادہ حق میں نہیں۔ ان کے خیال میں وہ علم جو طالب علم کو زندگی سے دور رکھتا ہے بے کار ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

فلسفی فکر میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ آیا تصوراتی دنیا اور واقعاتی دنیا۔ یعنی مادہ اور روح لو نیچر اور ذہن، یہ دو الگ الگ ایک دوسرے سے بے تعلق اور بے جوڑ چیزیں ہیں، یا دونوں ایک دوسرے

سے مربوط اور متعلق اور ایک دوسرے کو مکمل کرنے والی تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی اس بات کو جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب تک حقائق اور تصورات کی حدیں معین نہ ہو جائیں تعلیم کا کوئی نصب العین اور مقصد واضح نہیں کیا جا سکتا۔ فرض کیا اگر ہم بعض پرانے فلسفیوں کے نقش قدم پر چل کر دنیا کو مایا اور بے حقیقت سمجھ لیں تو اس کا اثر تعلیم کے ہنج پر بھی پڑے گا۔ اور ان کے برعکس اگر عہد حاضر کے مفکرین کے خیال کے مطابق کائنات محض مادہ ہی مادہ رہ جائے تو نظام تعلیم پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوگا۔ ان دو نظریوں کے علاوہ زندگی کا ایک اور تصور بھی ہے۔ اس کے نزدیک مادہ اور روح دو الگ الگ اور آپس میں مخالف عنصر نہیں ہیں۔ بلکہ مادہ ابتدا ہے اور زندگی کا کارواں اس سے اپنا راستہ شروع کرتا ہے اور ترقی کرتا کرتا روح یا تصورات کی دنیا میں پہنچتا ہے۔ علامہ اقبال اس تیسرے نظریئے کے حامیوں میں سے ہیں۔ وہ کائنات کی اصل روح کو مانتے ہیں۔ لیکن یہ روح مادہ میں اپنی ذات کا اظہار کرتی ہے۔ اس مادہ کی تسخیر اس کی ترقی اور اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ منزل پر لے جانا حقیقی روحانی زندگی ہے' اپنے اس مطلب کو موصوف نے فارسی کی اس رباعی میں یوں بیان کیا ہے۔

دلا رمزِ حیات از غنچہ دریاب
حقیقت در مجازش بے حجاب است
ز خاک تیرہ می روید ولیکن
نگاہش بر شعاعِ آفتاب است

زندگی کا راز غنچہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کی شکل میں حقیقت بے نقاب نظر آتی ہے وہ مٹی میں اگتا ہے۔ لیکن اس کی نگاہ شعاعِ آفتاب پر ہوتی ہے۔ علامہ موصوف زندگی سے بے تعلقی کی تعلیم نہیں دیتے۔ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ آدمی زندگی کو اپنے نصب العین کے مطابق ڈھالے۔ وہ اس سے معرکہ آرا ہو' اس کو پرکھے' اس کو بدلے۔ جانچے۔ تولے اور اپنی جدوجہد سے اسے اپنی راہ پر لے آئے۔ فرد کی خودی کی تکمیل جماعت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ فرد جماعت کا ایک رکن ہوتا ہے۔ اور جماعت جن روایات اور قدروں کو اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں پاتی ہے ان کے صالح حصہ کو مان کر ہی فرد صحیح نشوونما پا سکتا ہے۔ اقبال نے "اسرارِ خودی" میں فرد کی خودی سے بحث کی ہے اور دوسری مثنوی "رموزِ بے خودی" میں فرد اور جماعت کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے ان کے نزدیک۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں   موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اقبال فرد کو جماعت کے شکنجہ میں کسنے کے روادار نہیں وہ اس معاملہ میں نازی اور فسطائی نظریۂ حیات کے کلیتہً خلاف ہیں۔ لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ فرد جماعت سے الگ ہو کر کچھ نہیں کرپاتا وہ ایک جماعت کا رکن ہو کر ہی فعال بن سکتا ہے۔ جماعت کو زندگی اعلیٰ مقاصد سے ملتی ہے۔ اور ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کا عزم جماعت کے افراد میں جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے جس طرح فرد کی زندگی جان و تن کے ربط سے ہے اسی طرح قوم اپنی پرانی روایات کو محفوظ رکھنے سے زندہ رہ سکتی ہے۔ جب زندگی کی جوئے آب خشک ہو جائے تو فرد مر جاتا ہے اور اگر قوم کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ رہے تو وہ بھی مر جاتی ہے۔

علامہ موصوف نے اس سلسلہ میں تاریخ کے متعلق بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں "تاریخ ماضی کی داستان اور قصہ نہیں۔ یہ تو تمہیں خود اپنے آپ سے آگاہ کرتی ہے تجھے آشنائے کار اور مرد راہ بناتی ہے۔ تاریخ کی شمع قوموں کی قسمتوں کے لئے ستارہ کا کام کرتی ہے اور اسی کی ضو سے قوم کا حال اور ماضی درخشندہ ہوتا ہے۔"

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

فرد کو قدرت سے آزاد شخصیت ودیعت ہوتی ہے اور وہ زندگی میں قدم رکھ کر اپنے احول سے نبرد آزمائی کرتا ہے اس سے فرد کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ملتا ہے وہ آگے بڑھتا ہے۔ اس کی ترقی کی کوئی حد نہیں ہوتی وہ جدوجہد کرتا ہے زمانہ سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ناسازگار حالات کو وہ اپنا سازگار بناتا ہے۔ یہ کش مکش، یہ نبرد آزمائی اس کی تعلیم کے مراحل کا کام دیتی ہے اقبال کے نزدیک انسان کی زندگی کا حاصل اس کا اندھی تقدیر کے ہاتھوں آلۂ کار بننا نہیں۔ کائنات کی وسعتیں غیر محدود ہیں، وہ ہر دم راہ ترقی پر گام فرسا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

جب کائنات کی ترقی کا کوئی حد حساب نہیں، تو ظاہر ہے کہ اس کائنات کے سب سے برتر

لیکن انسان کی ترقی کے امکانات کیسے محدود ہو سکتے ہیں۔ انسان کو خدا نے اتنی صلاحیتیں دی ہیں کہ وہ کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ وہ اپنے آپ کو خدائی اوصاف کا حامل بنانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ خالق بن سکتا ہے۔ قدرت نے اس کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ اس کائنات کو بہتر سے بہتر بنادے۔ انسان کی ان جبلی صلاحیتوں کے بارے میں اقبال نے ایک جگہ خداوند عالم سے یوں خطاب کیا ہے۔

"تو نے اندھیری رات بنائی، میں نے چراغ پیدا کیا۔ تو نے مٹی بنائی میں نے اس سے پیالہ بنالیا۔ تیرے دست قدرت نے بیابان و کہسار پیدا کئے اور خیابان و گلزار و باغ میں نے بنائے۔ میں وہ ہوں کہ پتھر سے شیشہ بناتا ہوں اور زہر سے تریاق۔"

آگے بڑھنے کا یہ ولولہ اور اپنی صلاحیتوں کے غیر محدود ہونے کا یہ یقین، کائنات کے بیکراں ہونے اور اپنی ذات کے کمال بے اندازہ کا یہ تصور تعلیم کے نظریوں کی جان ہے۔ اس سے فرد میں بڑی زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اظہارِ ذات کے لئے اپنے سامنے بڑی جولان گاہ پاتا ہے۔

اقبال اس عقلیت کو جو بے روح ہو۔ اور محض مادیات اور حقائق و اسباب میں الجھ کر رہ جائے انسانی ترقی کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ تعلیم کے لئے وہ وجدان، محبت یا عشق کی نشوونما کو ضروری قرار دیتے ہیں، وہ عقل کے مخالف نہیں بوصوف عقل کے فریضہ اور اس کی ضرورت کو مانتے ہیں، مادیات اور اسباب کی تسخیر کے لئے عقل کی اہمیت مسلم ہے لیکن عقل منزل نہیں یہ چراغ راہ ہے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور

چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل سوچ کی غاعوں کو تو گرفتار کر سکتی ہے، لیکن زندگی کی شب تاریک اس کی وجہ سے روشن نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے وجدان کی، عشق کی، خواجہ غلام السیدین صاحب کو ایک خط میں علامہ مرحوم نے لکھا تھا۔

علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیئے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطانی

ہے یہ علم علم حق کی ابتدا ہے، جیسا کہ انہوں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے۔

علم حق اول حواس آخر حضور آخر او می نگنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے علم و عشق کے متعلق جاوید نامے میں کئی اشعار ہیں۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں

علم با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے "بو لہب را حیدر کرار کن" اگر یہ بو لہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہئے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کیلئے سراسر رحمت ہے۔"

ہر نظام تعلیم کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ وہ کس قسم کا انسان بنانے کا خیال اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کی تعلیمات انسان کو کیا بنانا چاہتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک اچھے آدمی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فعال ہو۔ وہ سرتاپا عمل ہو۔ زندگی اس کی جدوجہد سے عبارت ہو۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رہے کہ یہ عمل، اور یہ حرکت پہلے کے بندھے ٹکے نظام کے عین مطابق نہ ہو۔ انسان کی جدوجہد تخلیقی ہونی چاہیئے۔ محض تقلیدی جدوجہد کسی کام کی نہیں ہوتی۔ وہ مشکلات کا سامنا کرے اور انہیں آسان بنائے اور وہ نو آفریں اور تازہ کار ہو۔ اقبال یہ نہیں چاہتے کہ انسان بندہ تقدیر ہو۔ اور قسمت کے لکھے پر شاکر و قانع۔ اس کو خود اپنے آپ سے لڑنا چاہیئے، اور تقدیر سے نبرد آزما ہونے میں باک نہیں ہونا چاہیئے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے!

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

"خوف" علامہ موصوف کی نظر میں ام الخبائث ہے۔ خوشامد، مکاری، کینہ اور جھوٹ سب خوف کے نتائج ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دل کے اندر جو بھی شر ہے اس کی اصل خوف ہے اور صرف خوف۔ اقبال انسان کے دل کو خوف کے اس مرض سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کا علاج وہ

توحید بتاتے ہیں۔ اللہ کو ماننے سے غیر اللہ کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔

وہ خواہشات جو انسان کو دوسروں کا غلام بنا دیں اقبال کے ہاں سر تا پا مردود ہیں۔ وہ رزق جس سے پرواز میں کوتاہی آئے، اس رزق سے تو موت اچھی ہے۔ علامہ موصوف قبائل پرستی اور قوم و ملک پرستی کے سخت دشمن تھے۔ ان کے خیال میں یہ باعث ہے تمام خانہ جنگیوں کا اور انسانوں کو انسان سے لڑانے کا۔ وہ یک رنگی افکار اور وحدت عقائد کو جماعت کا اساس مانتے ہیں۔ اور کسی جغرافی طبعی یا ملکی تقسیم کے سرے سے قائل نہیں۔ احترام آدمی اصل آدمیت ہے۔ اور اگر تہذیب یہ نہیں سکھاتی تو وہ تہذیب نہیں بربریت ہے۔ اقبال کا مثالی انسان فقیر ہے۔ یہ فقیر عام اصطلاحی معنوں سے بالکل الگ ہے۔

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری — میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

ایک اور مقام پر وہ "فقر" کی یوں تعریف فرماتے ہیں۔

چیست فقر اے بندگان آب و گل — یک نگاہ راہ بیں، یک زندہ دل
فقر کار خویش را سنجیدن است — بر دو حرف لا الٰہ پیچیدن است
فقر خیبر گیر با نان شعیر — بستۂ فتراک او سلطان و میر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم این متاع مصطفیٰ است
فقر بر کرّوبیاں شب خوں زند — بر نوامیس جہاں شب خوں زند
بر مقام دیگر اندازد ترا — از زجاج الماس می سازد ترا
برگ و ساز او ز قرآن عظیم — مرد درویشے نہ گنجد در گلیم

حکمتِ ولی اللہی میں تاریخ کا مرتبہ

ڈاکٹر مسیح احمد کمالی[1]

قدرت عادت اور رحمت

ایام اللہ کے تصور کا ذکر مختلف وجہوں سے ضروری تھا۔ اوّل تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ شاہ صاحب فلسفۂ تاریخ کو بالواسطہ یا بظاہر بعید و مختلف عنوانات کے تحت لاتے ہیں۔ دوسری چیز یہ بھی قابل غور ہے کہ وہ روایتی مواد کو .... روایتی طریقے سے استعمال کرتے ہوئے ان راہوں میں آنکلتے ہیں جو علم و حکمت کی جولانگاہ ہیں۔ مثلاً انسانی زندگی کے مقاصد کو مطلق طور سے "حکم دورہ" مان کر وہ اس (Anthropocentric) طرز فکر سے ہم عنان ہو جاتے ہیں جس پر فلسفۂ تاریخ کی اساس ہے۔

بہر حال ابھی ہم اس سوال کی طرف نہیں آئے ہیں کہ شاہ صاحب تاریخ کے خصوصی اور جزوی مسائل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ بلکہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس سوال کو کچھ دیر کے لئے اور ملتوی کر دیا جائے تاکہ ہم تاریخ فکر اسلامی کے چند اہم سوالوں کا تذکرہ کر لیں۔ شاہ صاحب کے نظریۂ تاریخ کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم تاریخ اسلام میں تعلیل (Causality) اور انکار تعلیل کے نزاع کو ذہن میں رکھیں یہ ایک مشہور و معروف امر ہے کہ اشاعرہ کے حلقے میں اللہ تعالےٰ کی قدرت کا اثبات کرنے کے لئے اسباب اور نتائج کے باہم تلازم سے انکار کو ضروری سمجھا گیا۔ اس انکار میں انہوں نے جس شدت سے کام لیا تھا اس کا ردعمل یہ ہوا کہ "فلاسفۂ اسلام" نے ان کی بات کو

---

[1] ڈاکٹر مسیح احمد کمالی ریڈر ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ یہ مضمون مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ بابت دسمبر ۱۹۶۱ء سے بشکریہ نقل کیا جاتا ہے۔

لغو سمجھا اور انہیں اصحاب جدل کا نام دے کر علم اور سچائی کے طلب گاروں کی فہرست سے خارج کر دیا۔ پھر خود ان فلاسفہ نے نظریۂ اسباب کو از سر نو منضبط کیا۔ یہ لوگ بھی انتہا پسند نکلے۔ ان کے "شیخ رئیس" ابن سینا نے اسباب کو اس طرح سے ثابت کیا کہ اس نے علت اور معلول اور تعلیل سب کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا۔ ابن سینا یہ سمجھتا تھا کہ علت و معلول کے درمیان کچھ ایسا عمل (Phenomena) واقع ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ایک ہی طبیعت جو یہاں فعالیت کے حال میں تھی، وہاں منفعل ہو کر ابھرتی ہے۔ اس وحدت کی بنا پر اس نے دعویٰ کیا کہ کسی سبب کے بروئے کار ہونے پر اس کے مناسب اثر کا ظاہر نہ ہونا یا کسی غیر مناسب اثر کا ظاہر ہو جانا محال ہے۔ اس نظریے کی زد میں الہیات کے بہت سے مسلّمات آتے تھے۔ اگر اسباب کا بذات خود منظم اور مکمل ہونا ہی اثرات کے متحقق ہونے کا باعث ہے (بلکہ اس سے عبارت ہے) تو سبب اولین (یعنی ذات باری تعالیٰ) اور معلول اول (یعنی کائنات) کی ہستیاں بھی بغیر کسی تقدیم و تاخیر کے ایک دوسری کے ساتھ رہی اور رہتی ہوں گی۔ گویا الہیات کی یہ تعلیم کہ

" نہ تھا کچھ تو خدا تھا ..."

اس نظریے کی رُو سے باطل ہو جاتی ہے۔ الہیات کا دوسرا مسئلہ جس پر اس نظریے کا اثر پڑتا تھا ارادہ یا مشیئت کا سوال تھا۔ اشاعرہ کی انتہا پسندی سے ہٹ کر الہیات میں یہ عقیدہ قابل قبول تھا کہ اللہ تعالےٰ کی قدرت اشیاء کے وجود کا سبب ہے (اس لئے کہ چیزیں بے سبب نہیں ہوتی ہیں) لیکن کبھی کبھی اس کا ارادہ خالص طبیعی تعلیلات سے بالا بالا بھی ایجاد کرتا ہے۔ ابن سینا کے نظریے میں استثناء کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ الہیات کے ترجمان بن کر غزالی ابن سینا کے مقابلے میں آئے۔ انہوں نے "شیخ رئیس" کے نظریۂ اسباب پر بعض اٹل قسم کے اعتراض کئے، اور یہ محسوس کیا کہ یہ نظریہ مذہبی اعتقادات کے لئے ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اسباب و اثرات کے باہمی تعلق کی معقولیت اپنی جگہ پر مستحکم سہی، لیکن اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا بھی تو معقولیت سے عاری نہیں ہے۔ اور اس ایمان کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ دنیا کا نظام اپنے بل بوتے پر جس ڈھنگ سے چلتا رہتا ہے اللہ اس ڈھنگ کو کبھی کبھی بدل بھی دیتا ہے۔ اس قسم کی تبدیلی کی تفصیلات کچھ بھی ہوں، لیکن اس کے قاعدے کو قبول کر لینے پر خدا پرستی کا دار و مدار ہے اس لئے کہ اگر کائنات اپنے معبود کے اشارے پر نہ چلی

تو وہ خود معبود بن جائے گی۔ لیکن انسان کا ضمیر اور انسانیت کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اگر عبادت کی ان دو قسموں میں سے (یعنی خدا پرستی اور کائنات پرستی میں سے) انتخاب کرنے کی ضرورت آپڑے تو پہلی قسم قابل ترجیح اور افضل ہے۔

انکار تعلیل کی ضرورت کو اس پہلو سے مقرر کرنے کے بعد غزالی نے ابن سینا کے نظریۂ اسباب میں یہ عیب پایا کہ وہ تعریف (Definition) اور توجیہ (Explanation) یا تحلیلی (Analytical) اور ترکیبی (i.e. Synthetic) قضایا میں التباس کرتا ہے۔ عقل اس ضرورت کو تسلیم کرتی ہے کہ جب ہم انسان کا ذکر کریں تو اس کا دانشمند ہونا بھی ہمارا مفہوم ہو۔ اس لئے کہ انسانیت اور دانشمندی کے درمیان تعلق کی نوعیت تحلیلی ہے۔ لیکن علت و معلول کے درمیان تعلق تحلیلی نہیں بلکہ ترکیبی ہوتا ہے۔ یہ تو تجربے میں آنے والے (لیکن آنے سے باز رہ سکنے والے) حوادث ہیں سکھاتے ہیں کہ ایک خاص قسم کی ساخت رکھنے والے اجسام پر آگ ایک خاص طریقے سے اثر کرتی ہے ورنہ جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ آگ کی حقیقت کو ایسے اثرات سے اعراض کرتے ہوئے بھی سمجھ لیتی ہے چنانچہ یہ قول ناقابل قبول ہے کہ آگ اور اس کے اثرات کے درمیان تقدم و تاخر محال ہے جہاں آگ ہوگی وہاں ایک آتشیں طبیعت کا ہونا تو صحیح ہے، لیکن اثرات آتش کا حصول دوسری بہت سی شرطوں پر موقوف ہو سکتا ہے۔ ان اثرات کے حصول کو غزالی فیضان طبیعت (Influence Phy- nomena) کا نام نہیں دیتے۔ چنانچہ وہ اس دعوے کو ٹھکراتے ہیں کہ علت اور تعلیل اور معلول ایک ہی حقیقت یا طبیعت کے متعدد شیون و مظاہر ہیں اشاعرہ کے علی الرغم، وہ یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی اس حد تک نہیں پہنچتی کہ وہ طبیعت اشیاء کو منقلب اور مختل کر دے۔ مثلاً آگ جب تک آگ ہے اس وقت تک وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہو سکتی جس کو طبیعت آتش سے تضاد ہے اگر اس قسم کے انقلاب کو کوئی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا موضوع یا اسکی آیت سمجھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جو الفاظ مفہوم سے خالی ہوں ان سے کسی قسم کی بڑائی ثابت نہیں ہوتی اس طرح سے قدرت کو قاعدۂ تناقض اور قاعدۂ تعین (Laws of Contra- diction and Identity) کے سانچے میں ڈھال لینے کے بعد غزالی اس کے موارد میں ان تمام علوم کو شامل کر لیتے ہیں جن کو ہم (یعنی نوع انسانی) تجربے کے ذریعے سے سیکھتے ہیں۔ ہم اسباب

واقعات کے درمیان بار بار جس ایک قسم کے تعلق کو دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں اس کے قائم رہنے کی توقع ہماری عادت ہی کا شاخسانہ ہے۔ بعض ضروری شرطوں کی تکمیل کے ساتھ ہماری توقعات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی مستقبل کے حوادث ان توقعات کو غلط ثابت کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بھی حماقت ہے کہ ہمیں اپنی جھٹلائی ہوئی توقعات کے پھندے میں نہیں پڑنا چاہیئے تھا۔ (اس لئے کہ انہیں توقعات سے علم کی تشکیل ہوتی ہے) اور یہ فعل بھی لغو ہوگا کہ ہم توقعات کے جھٹلائے جانے ہی کا انکار کرنے لگیں۔ ان دونوں چیزوں کے برخلاف سچا اور صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے علم کی اصلاح کریں تاکہ اب اس کی بنیاد اشیاء کے ایک زیادہ صحیح اور وسیع تر اندازے پر رکھی جا سکے۔ جس قاعدے کی رو سے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ناقص علم پر مصر نہ ہوں بلکہ اسے مستقبل کے چہرے سے یکے بعد دیگرے ہٹتے ہوئے حجابات کے حوالے سے بدلنے یا چھانٹنے یا بڑھانے کے لئے تیار رہیں، وہی قاعدہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہد یا مبلغ یا مفسر بھی ہے۔

غزالی اشاعرہ کے عام طریقۂ انکار تعلیل سے بہت کچھ ہٹ کر چلے تھے۔ انہوں نے تعلیل پر تنقید کرنے کے وقت اس بات پر زور دیا کہ اس مسئلے میں ہم جن بہت سی چیزوں کو خارجی حقائق سے تعبیر کر لیتے ہیں، دراصل ان کی اساس ہمارے اپنے ذہن کے اندر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ابن سینا کے یہاں علت و معلول کی ہم رفتاری (Simultaneity of Cause and Effect) کے نظریئے پر اعتراض کرنے میں اس علمی تصور سے کام لیا جس کا اعتراف ارسطو نے "تعریف" اور "توجیہ" کی بحثوں میں کیا تھا (اور جس کو بعد والوں نے تحلیلی اور ترکیبی قضایا کے درمیان تفریق کا معیار بنایا) اور جس کے سہارے سے غزالی نے اپنی تنقید کا رخ تعلیل کی ذہن پر وری (Subjectivity) کی طرف موڑ دیا۔ سب سے زیادہ قابل ذکر یہ بات ہے طبائع کو تھوڑی بہت رد و کد کے بعد مان لینے کے ذریعے، غزالی نے انکار تعلیل کو اس غیر ذمہ داری اور عقل دشمنی سے بچایا جس کی طرف اشاعرہ کے جوش عقیدت نے ان کی اکثریت کو جا پہنچایا تھا۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس نزاع سے شاہ صاحب کیا سبق لیتے ہیں۔ اس مسئلے میں (اور دوسرے بہت سے مسائل میں) وہ جب دو فریقوں کا جھگڑا چکانے کے لئے بیٹھتے ہیں تو وہ فیصلہ کرنے کا ایک خاص قاعدہ یا نصب العین اختیار کر لیتے ہیں جس کو انہوں نے "تطبیق" کا نام دیا ہے۔

اس قاعدے کی رو سے، بالعموم وہ اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ دونوں فریقوں کے مرکزی تصورات قبول کریں یا ان پر صاد کریں، لیکن ان کے تعارض یا ٹکراؤ کو اسلام کے لئے غیر ضروری بلکہ خطرناک کہہ کر ٹال دیں یا اس کو متعارض اشخاص کے ذاتی جوش وخروش پر محمول کریں۔ اس طرز کار کی بجاآوری کا بہترین موقع موجودہ (مسئلہ تعلیل سے تعلق رکھنے والے) نزاع نے مہیا کیا ہے۔ اس لئے کہ یہاں پر لڑنے والوں نے ایک دوسرے کی طرف جو پتھر پھینکے ہیں، ان کو زمین پر سے اٹھا کر شاہ صاحب نے اس طرح سے رگڑ دیا ہے کہ اب ان کے اندر سے شعلہ برآمد ہوتا ہے۔ اس استعارے کی تفصیل یہ ہے کہ شاہ صاحب ابن سینا کو اس کی عقل پرستی پر داد دیتے ہیں اور غزالی کی اس اعتبار سے تائید کرتے ہیں کہ انہوں نے مذہبی فکر کے تقاضوں کی ترجمانی کی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان دونوں پر ان کا اپنا اعتراض یہ ہے کہ ان دونوں نے جن حدوں کے اندر بحث کی ہے، وہ خالص مذہبی فکر کے افق سے نیچی اور الگ اور دور ہیں۔ ان دونوں کا موضوع علم طبیعی تھا۔ اس علم کے خصوصی مسائل کو موجودہ (یعنی شاہ صاحب کی رائے میں ان کے اپنے) زمانے میں الہیات کے ساتھ کوئی بہت گہرا ربط بھی باقی نہیں تھا۔ اس کے اندر جن قواعد سے بحث کی جاتی ہے وہ اچھے اور سچے سہی، تاہم ان کے اثرات ایسے نہیں ہیں کہ وہ حقائق کی مکمل طور سے نشان دہی کر سکیں۔ اس امر کی وضاحت کے لئے شاہ صاحب ایک عمدہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالےٰ کے افعال کی مختلف قسمیں بتائی ہیں۔ ان قسموں میں سے ایک، جو تقدم زمانی سے بہرہ مند بھی ہے، یہ ہے کہ اللہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لے آئے۔ یہ فعل جو (تخلیق کائنات کے وقت) صرف ایک ہی بار ظہور میں آیا اللہ کی "قدرت" کا اظہار ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ نے اسباب کا ایک سلسلہ مرتب کر دیا ہے۔ چنانچہ اب آگ جلاتی ہے اور بھاری اجسام زمین کی طرف جھکتے ہیں اور غذا پاکر جاندار چیزیں پھلتی پھولتی ہیں۔ اس قسم کے سب کاموں کا سلیقہ کے ساتھ پورا ہونا اللہ کی "عادت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تیسری قسم میں اللہ کے وہ افعال ہیں جن کے ذریعہ سے کسی مقصد یا غایت کی تکمیل ہوتی ہے۔ جس طرح انسانی زندگی میں عادت اپنے استمرار اور تسلسل سے اپنے وجود کو قائم رکھتی ہے اور اپنی جڑوں کو مضبوط بنا لیتی ہے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی عادت کا استمرار اور تسلسل ان نوامیس (*nomos or laws*) کی تشکیل کرتا ہے جو کائنات پر چھائے ہوئے ہیں

اور جو علم طبیعت (Phenomena) کا موضوع ہیں انسان کی اور خدا کی عادت میں مماثلت کا [illegible] ہے کہ جس طرح انسان اپنی زندگی میں معنویت پیدا کرنے کے لئے اپنے ارادے کی تحریک اور تائید سے اپنا اوقات عادت کو موقوف یا متغیر کر دیتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی عادت کی تخفیف کے ذریعے سے اپنے ارادے کو کام میں لاکر حوادث عالم کو نئے معانی کا مظہر یا نئے مقاصد کی دلیل بناتا ہے معاملہ انسان کا ہو یا خدا کا، بہر صورت یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ارادہ جو شخصیت (Personality) کا سب سے زیادہ مناسب اور اہم منصب یا مصرف ہے کوئی اتفاقی یا عارضی چیز نہیں ہے، لہذا اگر عادت ارادے سے شکست پاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب کام اہمال یا اتفاقات یا عوارض کو سونپ دیا گیا۔ چنانچہ انسانی زندگی میں عادت کا مسترد ہونا نئی عادتوں کے ظہور کی تمہید ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارادے سے قوانین طبیعت کا برطرف ہونا قانون شکنی نہیں ہے، بلکہ یہ واقعہ بجائے خود ایک قانون یا عادت ہے[1]۔

"و لذلک اقول خرق العادۃ عادۃ مستمرۃ"

گویا اب یہ ثابت ہوا کہ خرق عادت کا قاعدہ تو شاہ صاحب کی نظر میں مسلّم ہے لیکن اس سے معجزے یا کرامت کا استخراج کرنے کی بجائے وہ اسے طبیعی تعلیلات سے صرف معنویت اور مقصدیت کے اعتبار سے ممتاز سمجھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ نکتہ بہت اہم اور قابل توجہ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی عادت کو ایک معقول علم (Phenomena) کا موضوع سمجھتے ہیں، اسی طرح ان کی دانست میں اس عادت سے اعراض بھی (جو بجائے خود ایک عادت ہے) ایک معقول علم کا موضوع ہو سکتا ہے (اور ہے) یہ آخر الذکر علم تاریخ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی جس صفت کے کارنامے اس علم کا موضوع ہیں اس کا نام رحمت ہے۔ قدرت اور عادت کی طرح یہ صفت بھی اپنے اظہار کے لئے ایک بالکل الگ میدان رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ تینوں ایک ہی ذات اقدس کی صفات ہیں، اس لئے ان میں سے ہر ایک کو دوسری صفتوں کے اندر نفوذ بھی حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً رحمت میں (خرق عادت کی) عادت متضمن ہے، اور عادت کا قیام بغیر قدرت کے ممکن نہیں، اور قدرت کا کارنامہ (یعنی تخلیق عالم)

---

[1] تفہیمات ۱ - ۹۹

... بجائے خود رحمت کی دلیل ہے۔ لیکن ان متقارب اثرات میں رحمت کی تاثیریں سب سے زیادہ باریک اور دور رس ہیں، اس لئے کہ یہ جب دوسری صفتوں میں نفوذ پاتی ہے تو ان کے مفہوم میں وسعت بھی پیدا ہوتی ہے اور ان کے لئے مقاصد بھی مہیا ہوتے ہیں (رحمت کی اس ہمہ گیری کا ... دوسری شکل میں اس طرح سے ہوتا ہے کہ تاریخ جو دوسرے علوم سے ممیز ہے ان سب کے اندر نفوذ بھی کرتی ہے، اس لئے کہ دیگر موجودات کی طرح ہر علم خود اپنی تاریخ رکھتا ہے)

مقصد و معنی اور ان کے ٹھکانے

جس معنی میں تاریخ کو ایام اللہ کا نام دیا گیا ہے اس کی رو سے وہ ان کوششوں کا مجموعہ ہے جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کا ارادہ "عادت" کی تہاری اور اس کے میکانکی تسلسل کو توڑ دیتا ہے تاکہ ایک طرف تو حوادث عالم قوانین طبیعت کے ساتھ بعض روحانی محرکات او مصالح کے بھی پابند ہو جائیں۔ اور دوسری طرف خود صاحب ارادہ شخصیت کے ضمیر میں انفعال اور انکسار کی وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو عادت سے مغلوب ہو جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس نظریئے کو فطرت انسانی کے ان تصورات سے ملا دیجئے جو شاہ صاحب نے تصوف سے اخذ کئے ہیں تو واضح ہو جائے گا کہ تاریخی عمل طبیعی تعلیلات سے جن مقاصد کی بنا پر ممتاز ہوتا ہے ان کا سرچشمہ شخصیت اور (Spirit [1]) میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسان اور پروردگار عالم کے درمیان رابطۂ اتحاد ہیں لہٰذا مجموعی طور پر شخصیت یا Spirit کی خودداری ان مقاصد کی کفیل ہے جن پر تاریخ کا امتیاز قائم ہے

اس حد تک شاہ صاحب کے فلسفۂ تاریخ کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ تصوف کے بنیادی عقائد و بصائر سے ہم آہنگ ہیں۔ لیکن اب جب کہ ہم تاریخ کے ضروری مسائل کی طرف گریز کر رہے ہیں ہم شاہ صاحب کو ان تصورات سے استفادہ کرتے ہوئے پائیں گے جو اسلام کے فلسفۂ قانون میں

---

[1] اس لفظ سے نظام وجود کا وہ حصہ مراد ہے جو طبیعت (Nature) کا جواب اور اس کی ضد ہے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اس لفظ کا مروج اردو ترجمہ روح یا اردو رسم الخط میں اس کی تحریر (اسپرٹ) دونوں ناکافی ہوں گے۔

متضمن ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں بار بار یہ جتایا ہے کہ انہیں اس تجاوز کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ اگر تصوف کے مباحث کو تاریخ کے فلسفے اور اخلاقیات کے مسائل سے ہم رشتہ نہ کر دیا جائے تو علمی تحقیق کے تشنہ رہ جانے کے ساتھ ساتھ روحانی ارتقاء کے معطل بلکہ معکوس ہو جانے کا بھی احتمال ہے[1]

اس دعوے کے ثبوت میں کتابوں کے حوالے کے ساتھ ساتھ بعض تشریحات کی بھی ضرورت ہے تفہیمات میں شاہ صاحب نے تصوف کے بعض نظریات کو ان عوارض سے تعبیر کیا ہے جو اسلام کے بنیادی جوہر پر طاری ہوئے۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح سورج کی روشنی پھل پھول کے ساتھ خار و خس کی پرورش بھی کر دیتی ہے اسی طرح کلام اللہ بھی ان سب اضافی چیزوں کو سہارا دے دیتا ہے جو اسلام کی مرکزی اور خالص تعلیمات کے ساتھ آملی ہیں۔ تصوف کے بہت سے نظریات کو شاہ صاحب اسی قسم کے اضافوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ خاص طور سے اس ایک نظریئے پر تو انہیں شدید اعتراض ہے جو انمٹ طریقے سے بار بار تصوف میں ظاہر ہوتا رہا ہے اور جس کی رو سے عالم اور پروردگار عالم کا اتحاد ہو جاتا ہے چونکہ شاہ صاحب کی دانست میں اس نظریے کے اندر اخلاقی قدروں کا اور مقاصد شریعت کا انکار متضمن ہے اس لئے وہ اس کے قائل کی تکفیر میں تامل نہیں کرتے (حالانکہ اس حربے کا استعمال انہیں بہت زیادہ مرغوب نہیں ہے)

اسی طرح وحدت وجود اور وحدت شہود کی تطبیق کی کوشش میں بھی شاہ صاحب اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگرچہ اول الذکر مسلک تصوف کی جان ہے، تاہم اس کا اخلاقیات کو ٹھکرا دینا یا ان سے بالا بالا گذرنا ایک ایسی چیز ہے جس کو تطبیق کے ذریعے سے سنبھال لینا یا سدھار دینا ضروری ہو جاتا ہے

"تفہیمات" کے مذکورہ بالا حصے میں (جو مکتوبات مدنی کے نام سے مشہور ہے) شاہ صاحب کی تطبیق بہت سے گول مول لفظوں میں الجھ گئی ہے۔ لیکن اس کتاب میں ایک اور جگہ شاہ صاحب نے ایک مراسلہ نگار کے جواب میں بات بہت صاف اور محکم طریقے سے کہہ ڈالی ہے۔ ان سے پوچھا گیا تھا کہ مکہ اور ہردوار کے درمیان کیا فرق ہے۔ جواب میں وہ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر

---

[1] دیکھئے تفہیمات ۱۔ ۲۰۵، ۲۔ ۲۱۶، ۱۸۷، ۱۸۵

وحدت وجود کے بنیادی تصورات سے کام لیا جائے تو دو امتوں کے ان مقدس مقامات میں تفریق کرنا واقعی مشکل ہوگا۔ لیکن وہ مُصر ہیں کہ وحدت وجود کے معیاروں کو اخلاقی اصول اور تاریخی بصائر کے ساتھ ملادینے پر مسلمان مکہ کی افضلیت کو علمی نقطۂ نظر سے ثابت کر سکتا ہے۔

رحمت کی کارفرمائیوں کو (یعنی تاریخ کے عمل کو) سمجھنے کے لئے ان چند اصطلاحوں کے تجزیئے اور تاویل کی ضرورت ہے جن کو شاہ صاحب نے مختلف مقامات وجود کے لئے استعمال کیا ہے ان میں سے پہلی اصطلاح "عالم مثال" ہے اس اصطلاح میں افلاطونی فلسفے کی جھلک تو ملتی ہے لیکن اس کا مفہوم ذرا بدلا ہوا ہے۔ کسی چیز کی مثال سے شاہ صاحب کوئی ایسا واحد اور منفرد جوہر مراد نہیں لیتے جس کا ایک ٹھوس اور مادی شکل میں ڈھل جانا اس چیز کے وجود کا باعث ہو۔ بلکہ وہ تو فرداً فرداً اس ایک چیز کی یا اس ایک چیز کی مثال کی بجائے "عالم مثال" کا تذکرہ کرتے ہیں جس سے یہ بھی نسبت رکھتی ہے اور وہ بھی، بہر حال یہ عالم وہ جگہ ہے جہاں دنیا کے تمام حوادث روئے زمین پر نازل ہونے سے پہلے ہی نمودار ہوتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ بالفرض ایک تاریخی واقعہ دنیا میں پہلی جنوری ۱۹۶۵ء کی صبح میں ہونے والا ہے۔ شاہ صاحب کا عقیدہ ہے کہ یہ (یا کوئی اور) واقعہ محض اتفاقی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کا کوئی سبب ہوگا۔ لیکن جس معنی میں اللہ تعالیٰ سبب الاسباب ہے یہ لازم ہے کہ ہم اس واقعہ کے سبب کو کسی اکیلے یا اکہرے اور دور افتادہ جوہر سے تعبیر نہ کریں اس لئے کہ اللہ تعالےٰ کے مسبب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پورا نظام وجود اس واقعہ کا سبب ہے۔ یعنی اس واقعہ کے ہونے سے پہلے، ساری کائنات کی جو صبح وضع (۳۱ دسمبر ۱۹۶۴ء کے ختم پر) ہوگی وہی اس واقعہ کا سبب ہوگی۔ کائنات کی اس مستعد ہیئت کے اندر اس ہونے والے واقعے کے جو سررشتے پائے جاتے ہیں، ان کا مجموعہ (اس واقعہ کے حق میں ہیں) عالم مثال ہے۔

شاہ صاحب کی دوسری اصطلاح "ملاء اعلیٰ" ہے۔ درحقیقت عالم مثال کا تصور "ملاء اعلیٰ" کے نظریئے سے اسی طرح ملا ہوا ہے جس طرح لمحۂ موجودہ کے حوالے سے ماضی اور مستقبل ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے فلسفۂ تاریخ میں "ملاء اعلیٰ" کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، لیکن چونکہ مستقبل کے مقامات پر (جن میں سے ایک "ملاء اعلیٰ" ہے) علمی دلیل قائم نہیں ہو سکتی، اس لئے بالواسطہ اس کو ثابت کرنے کے لئے شاہ صاحب ماضی

کی طرف رجوع کرتے ہیں جو مستقبل کے بر خلاف علمی دلیل کا موضوع ہے ، لیکن جو عقلی تعریفات میں مستقبل کا پیمانہ یا نمونہ ہی سمجھا جاتا ہے ۔ بہرحال شاہ صاحب کے یہاں "ملاء اعلیٰ" کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح آنے والے واقعات کا نقش ساری کائنات پر مرتسم ہوتا ہے ۔ اسی طرح حال سے ماضی کی طرف جاتے ہوئے واقعات بھی تمام وجود پر ایک گہرا اور راسخ نشان چھوڑ کر جاتے ہیں اس نشان کی تفصیل کو سمجھنے سے پہلے ہمیں یاد کرنا چاہیئے کہ انسان کا دنیا میں ظہور شاہ صاحب کے نزدیک تاریخ عالم کا سب سے بڑا نقطۂ انقلاب ہے ۔ اس نقطہ تک پہنچنے سے پہلے دنیا ہر اس واقعہ کا نشان قبول کر لیتی تھی جو ہو چکا ہوتا تھا لیکن انسان کے ظہور کے بعد سے قاعدہ یہ ہو گیا ہے کہ صرف وہ واقعات اپنا نشان چھوڑتے ہیں جنہوں نے انسان کے وجود کو تقویت پہنچائی ہے اور جو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے حامل اور ناقل رہے ہیں ۔ باقی ہر قسم کے واقعات جو انسان کے لئے بے فائدہ یا مضر ہوتے ہیں اور جو رحمت باری کے بروئے کار آنے میں مزاحم ہوتے ہیں اس طرح سے جاتے ہیں کہ کائنات ان کی چھیڑی ہوئی کہانی کو دہرانے یا انجام تک پہنچانے کا بوجھ اپنے سر نہیں لیتی بلکہ اسے فراموش کر دیتی ہے ۔ "فاما الزبد فیذھب جفآء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض"[۵]

اچھائیوں کو اس طرح سے رفتہ رفتہ اپنے اندر جذب اور محفوظ کر لینے کی وجہ سے "ملاء اعلیٰ" کی حیثیت ایک ایسے خزانے کی سی ہے جس سے تاریخ کے ہر دور میں انسانی افراد اور جماعتیں خیر و شر کا معیار حاصل کرتی ہیں ۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ایک آئینہ ہے جس کے اندر آدمی اپنی ہی شکل کو دیکھ کر اپنی انفرادیت کی تعریفوں سے آگاہ اور اس کے تقاضوں پر مطلع ہو جاتا ہے البتہ اصل اور عکس میں فرق صرف اتنا ہے کہ اصل تو زندگی کے مسائل کے ساتھ بالفعل نبرد آزما ہونے کی وجہ سے کچھ دھندلی ہیں یا گرد و غبار میں اٹی ہوئی سی ہوتی ہے ۔ لیکن دوسری طرف آئینہ سازنے آئینے کے اندر اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کے کچھ ایسے گن ودیعت کئے ہیں کہ اس کے اندر غبار آلود

---

۵ سورہ رعد ۱۳ : ۱۷ ، سو وہ جو جھاگ ہے سو جاتا ہے سوکھ کر ، اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے سو رہتا ہے زمین پر ۔

(ترجمہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ)

انسانی چہرے کا عکس صرف چہرے کے محاسن کو پیش کرتا ہے، عیوب کو نہیں۔ بالفاظ دیگر "ملاء اعلیٰ" میں جو کچھ ہے وہ اس اعتبار سے Empirical ہے کہ اس کے اندر (انسانی) تجربات کا لب لباب ہے لیکن انتخاب کے وہ قاعدے جن کے اثر سے تجربات چھن چھن کر یہاں تک پہنچے ہیں (اور پہنچے بغیر رہتے بھی نہیں) تجرید یا تنزیہہ کا کرشمہ ہیں یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب "ملاء اعلیٰ" کے ساکنوں میں فرشتوں کو بھی شمار کرتے ہیں اور ان انسانی نفوس کو بھی جنہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں ہدایت پائی اور سعادت حاصل کی اور اب جن کا نقشِ قدم ہدایت اور سعادت کی جستجو کرنے والوں کے لئے نشان راہ ہے[1]۔

ان دو منزلوں کی طرح، شاہ صاحب کے یہاں "حظیرۃ القدس" اور "حملۃ العرش" کو بھی اصطلاحات کی سی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن فلسفۂ تاریخ میں جن مسائل کو ملاء اعلیٰ کے مقابل رکھا جا سکتا ہے وہی "حظیرۃ القدس" اور "حاملین عرش کے لئے بھی کفایت کریں گے۔ بہرحال ان سب منزلوں میں جو قدریں قرار پاتی ہیں انہیں اخلاقیات کی مروجہ اقدار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کا رواج یہ ہے کہ (انسانی) افعال کی قدر و قیمت ان نتائج کی روشنی میں مقرر ہوتی ہے جن کو پہلے سے مقصد بنا کر سامنے رکھا گیا ہو اور جن کی وسعتیں افعال مذکورہ کے ذہنی اور قلبی محرکات کے مساوی (Commensurate) ہوں لیکن عمل تاریخی کی نشان دہی کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے ایک ایسی صورت کا تصور بھی کیا ہے جو مروجہ اقدار اخلاقی کو توڑ دیتی ہے یا انہیں بالائے طاق رکھتی ہے۔

اس صورت کا ظہور وجود کی اس سطح پر ہوتا ہے جو عالم مثال یا "ملاء اعلیٰ" وغیرہ سب سے ارفع ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بسا اوقات خود انسان انسانی زندگی کے کمالات کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ مثلاً کسی فاتح عالم کی قیادت میں کچھ غیظ و غضب سے بھرے ہوئے آدمی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح قتل و غارت کا بازار گرم کرتے ہوئے

---

[1] دیکھئے حجۃ اللہ البالغہ حصہ اول، پہلا مبحث تیسرا باب۔
(اور دیگر متفرق صفحات)

جاتے ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، اللہ کی زمین اس کے بندوں کے خون سے رنگین ہو جاتی ہے، ساری کی ساری آبادیاں خانماں برباد ہو جاتی ہیں، حکومتوں کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، قانون کے اصول اور اس کے ادارے دم توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور تمدن کا نظام ایسی بری طرح سے گھائل ہوتا ہے کہ اب مدتوں تک اس کے زخموں کے اندمال کا کوئی آسرا بھی نہیں ہوتا اور یہ سب کچھ ایسے اندھے اور فرومایہ اشخاص کے ہاتھوں سے ہوتا ہے جن کی ذاتی اغراض اور ان عالمگیر نتائج کے درمیان مساوات نہیں ہوتی یہ لوگ دنیا کو سر پر اٹھا لیتے ہیں، لیکن ان کے سر کے اندر جہالت کے سوا، اور ان کے دلوں کے اندر بہت ہی چھوٹی قسم کی خود غرضی یا شہوت پرستی یا خونخواری کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا اس تفاوت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اس عالم آزار اور انسانیت سوز فعل کا فاعل درحقیقت کوئی اور ہے جو ان کو اس طرح سے استعمال کرتا ہے۔ جس طرح کوئی افسانہ نگار اپنی کہانی کے اشخاص Dramatis Personae سے کام لے۔ یہ فاعل اللہ تعالیٰ ہے جو ایسے موقع پر سفینۂ عالم کی ناخدائی خود کرتا ہے۔ چنانچہ یہی ایک موقع ایسا ہے جب تاریخ کی معنی خیزیاں اور مقصد روائیاں موقوف کر دی جاتی ہیں اس لئے کہ اس قسم کے واقعات کو اخلاقیات کے مروجہ پیمانوں سے ناپا نہیں جاسکتا۔ ان سے ڈرنا تو برحق ہے لیکن ان پر تنقید کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور اگر کوئی تنقید پر اتر بھی آئے تو حاصل کیا ہوگا؟ بجلی کے کڑاکے یا زمین کے بھونچال یا دریاؤں کی طغیانی پر کس کی تنقید کا اثر ہوتا ہے؟ چنانچہ جب تاریخی واقعات ان آخر الذکر حوادث کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیں، تو کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے باب خلق کو باب تدبیر پر مقدم کر دیا ہے[1]۔

لہٰذا تاریخی عمل اب گھٹ کر اور سمٹ کر طبیعی تعلیلات کی سادہ اور معنویت سے استغناء رکھنے والی شکلوں میں رونما ہو رہا ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۱ - ۱۷

انسانی معاشرے میں ارتقا کے اصول
حضرت شاہ ولی اللہ کی نظر میں

شمس الرحمن محسنی

معاشرہ اور جماعت کی حقیقت سمجھنے اور ان کی نگرانی کرنے والے اصول و قوانین منضبط کرنے کے لئے ارتقائے جماعت کا تفصیلی مطالعہ بہت ضروری ہے۔ جب تک یہ بات ذہن نشین نہ ہو جائے کہ معاشرہ کی ابتداء نہایت سادہ صورتوں سے عمل میں آئی ہے۔ اور اس کے تمام مظاہر و عناصر آہستہ آہستہ ترقی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ اس وقت تک ہم نہ معاشرہ اور جماعت کے مختلف مظاہر کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور نہ معاشرہ کے لئے ان کی ضرورت ہماری سمجھ میں آسکتی ہے عمرانیات کے ماہرین اسی لئے سب سے پہلے جماعت کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر ہر اجتماعی عنصر کی ارتقائی تاریخ کی روشنی میں وہ اصول معلوم کرتے ہیں جو معاشرہ کے عروج و زوال اور صلاح و فساد کا باعث بنتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے معاشرۂ انسانی میں اصول ارتقاء کی کارفرمائی پر اتنی وضاحت اور صراحت کے ساتھ تو کہیں بحث نہیں کی، جس طرح کہ آج کل عمرانیات میں ہوتی ہے۔ البتہ اجتماعی اداروں کے مختلف درجات مقرر کرکے انہوں نے جو مباحث مدون کئے ہیں، ان کے پیش نظر یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ معاشرہ میں ارتقاء کے قائل ہیں۔ اس خیال کی وضاحت اس وقت اور بھی ہو جاتی ہے جب ہمیں ان کے اجتماعی اداروں کے تذکرہ میں وحدت الوجود کے اثرات ملتے ہیں۔ وحدۃ الوجود کائنات میں ارتقاء کا قائل ہے معاشرہ بھی اس سے باہر نہیں۔ کائنات میں ارتقاء کی کارفرمائی معدنیات نباتات اور دوسری مخلوقات کے باہمی ربط کو سامنے رکھ کر سمجھائی جاتی ہے۔

"تفہیمات الہیہ" (جزو اوّل) میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔

"ہر زمانے میں نیا ظہور ہوتا ہے، اور ہر ظہور کے اپنے احکام ہوتے ہیں چنانچہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے اس کے ساتھ احکام بھی بدلتے ہیں، اور نئے نئے ترجمان حق آتے ہیں۔ منشاء الہی کا پہلا ظہور معدنیات کی صورت میں ہوا معدنیات کے بعد عالم نباتی قدرت حق کا محور تھی، نباتات سے حیوانات نے یہ منصب لیا اور پھر انسان کی شکل میں ارادۂ حق کا ظہور ہوا۔"

وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہمیں بتاتا ہے کہ نظام عالم ترقی پذیر ہے وہ ابتدائے آفرینش سے اب تک سینکڑوں قالب بدل چکا ہے۔ جمادات ارتقائی قوتوں کے ذریعے نباتات کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ اور نباتات کے بعد حیوانی مظاہر کی منزل شروع ہوتی ہے۔ حیوانات کی ارتقائی منزل کی سرحد سے انسانیت کی سرحد نمودار ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحبؒ مخلوقات کے ان ارتقائی مدارج ہی کی مثال سے اجتماعی اداروں یا انسانی معاشرہ کے مختلف درجات کا باہمی ربط و تعلق سمجھاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معاشرۂ انسانی میں ارتقا کو اسی طرح کارفرما مانتے ہیں جس طرح کائنات کے دوسرے مظاہر میں "بدور بازغہ" میں فرماتے ہیں:۔

"انسانی معاشرہ کے ابتدائی درجہ میں اجتماعی اداروں کی تشکیل جانوروں کے اجتماع سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی فرق اتنا ہے کہ حیوانات میں یہ ارتقاء بطور اجمال پایا جاتا تھا۔ انسانوں میں آکر یہ پوری طرح نشوونما پاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی معاشرہ اپنی اس ابتدائی شکل میں بھی حیوانات کے اجتماع کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور بلند درجہ ہوتا ہے۔ حیوانی معاشرہ کے بعد معاشرہ انسانی کا یہ ابتدائی درجہ بالکل اس طرح وجود میں آتا ہے جیسے عناصر کائنات سے جمادات پیدا ہوتے ہیں انسانوں میں معاشرہ کا دوسرا درجہ پہلے درجہ کے بعد آتا ہے اس سے پہلے نہیں آسکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی سمجھنا چاہیئے جیسے جمادات کے بعد نباتات کا آنا۔ انسانی معاشرہ کے اس درجہ میں

پہلے درجہ کی تمام باتیں پائی جاتی ہیں لیکن اب ان میں لطافت عمدگی اور بہتر تنظیم پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے درجے کے بعد معاشرہ انسانی کے تیسرے درجہ کا آنا نباتات کے بعد حیوانات کی تخلیق کے مانند ہے۔ جس طرح حیوانات میں نباتات کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اسی طرح اس تیسرے درجہ میں دوسرے درجہ کی صفات بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ذرا مختلف شکل میں۔ حیوانیت کے بعد انسانیت کی منزل آتی ہے۔ ارتفاقات (اجتماعی اداروں) میں اس کی مثال تیسرے اور چوتھے درجے کو سمجھنا چاہیئے۔"

اداراتِ اجتماعی کے مندرجہ بالا چار درجات کی تفصیل تو آئندہ اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ شاہ ولی اللہؒ وحدۃ الوجود کی ذہنیت کے ماتحت معاشرۂ انسانی کو جامد نہیں بلکہ ارتقاء پذیر مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاشرہ کبھی ایک حالت پر نہیں ہے جس میں آج نظر آتا ہے اس اس درجہ تک وہ بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد پہنچا ہے۔ انسانی معاشرہ میں پہلے اتنی بہتر تنظیم اور خوبی نہ تھی جتنی کہ آج پائی جاتی ہے انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ جتنی قوت کا آج مالک ہے اس سے پہلے نہ تھا۔ شاہ صاحب نے ارتفاقات کے عنوان سے جو مباحث مدون کئے ہیں ان کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں اصول ارتقا کی کارفرمائی ثابت ہوتی ہے بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ارتقائے جماعت میں یہ کہاں تک مدد دیتے ہیں اور انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ کس طرح ترقی کرتا ہے۔

نوعی تقاضے اور ارتقاء

انسانوں میں جماعت پسندی کا جذبہ ان اعمال و افعال کے ذریعے تربیت پاتا ہے جو اجتماعی طور پر انجام دیئے جاتے ہیں۔ انسان کے یہ عمل بدلتے رہتے ہیں اور اس تبدیلی کا نتیجہ اجتماعیت کی ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہر اجتماعی عمل ایک جماعتی مظہر کی تشکیل کرتا ہے۔ مظہر اجتماعی کا تنوع ہی ارتقائے جماعت کا کفیل ہے۔ مختصر یہ کہ اجتماعی اعمال و افعال ارتقائے معاشرہ کا

زمینہ میں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انسان بعض خاص خاص کام کیوں کرتا ہے اور اس کے یہ اعمال اپنی شکلیں کیوں بدلتے ہیں تو ہماری نگاہ سے ارتقائے جماعت کا کوئی راز پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ شاہ صاحبؒ انسان کے انفرادی اور اجتماعی تمام کاموں کا سرچشمہ اس کے نوعی اور جنسی تقاضوں کو قرار دیتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں فطری تقاضوں کی بحث کو اگر بحث ارتفاقات (اجتماعی اداروں کی بحث) سے ملاکر پڑھا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک معاشرۂ انسانی کا ارتقار بھی انسان کے فطری تقاضوں کا رہین منت ہے۔

انسان کے فطری تقاضوں میں ایک ترتیب پائی جاتی ہے۔ وہ سب ایک درجہ کے نہیں ہیں بعض تقاضوں کو پورا کئے بغیر انسان زندہ نہیں رہتا۔ اس لئے سب سے پہلے ان ہی کی تعمیل ضروری ہے۔ ایک خاص حد تک جب ان کی تعمیل ہو جاتی ہے تب کہیں دوسرے تقاضوں کی باری آتی ہے۔ انسان نے اپنے فطری تقاضوں کو کمال حسن و خوبی کے ساتھ پورا کرنا رفتہ رفتہ سیکھا ہے۔ وہ ابتدا میں صرف اپنی حیوانی خواہشات پوری کرتا تھا۔ وہ بھی نہایت ابتدائی شکل میں، کیونکہ وہ فطرت کے خزانوں سے ناواقف تھا، اور کائنات کی قوتیں اس کے قابو میں نہ آئی تھیں۔ جوں جوں وہ فطرت کی قوتوں کو تسخیر کرتا گیا اپنے فطری تقاضوں کو اچھی سے اچھی طرح پورا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہوتی گئی، اور آخر کار اس کی حیوانی خواہشات پورا کرنے کے طریقوں میں حسن و لطافت کا عنصر شامل ہو گیا۔ اس طرح اسے جنسی تقاضوں کے علاوہ اپنے نوعی تقاضوں کی تکمیل پر بھی قدرت حاصل ہو گئی۔

شاہ صاحبؒ نے بہت جگہ اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ خارجی حالات کا انسان پر اور اس کے فطری تقاضوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں، بدلتے ہوئے حالات ہر مرتبہ فطری تقاضوں کو ایک نئی شکل دیتے ہیں۔ فطری تقاضوں کی یہ نئی شکل خارجی حالات کو دوبارہ بدل دیتی ہے۔ اور یہ نئے فطری تقاضوں کو پھر دوسری شکل دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اس طرح معاشرہ برابر ترقی پذیر رہتا ہے۔

انسانی اور حیوانی معاشروں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے وہ یہ کہ معاشرۂ انسانی میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور اس کے ارتقار کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ اس کا سبب انسان کے نوعی تقاضے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جیسا کہ پہلے بھی گذر چکا ہے، ان نوعی تقاضوں کی بنیاد مذاقِ

لطیف رائے کلّی اور علم و تجربہ کی پیاس کو قرار دیا ہے ۔ غور سے دیکھئے تو انسانی معاشرہ میں ترقی کی تیز رفتاری اور ارتقائے جماعت کا اٹوٹ سلسلہ ان ہی کے دم سے قائم ہے۔ انسان کی فطرت کھانے پینے رہنے سہنے اور پہنے اوڑھنے کی طبعی ضروریات کو پورا کرنے ہی پر قناعت نہیں کرتی اگر ایسا ہوتا تو شاید انسانی معاشرہ کبھی ترقی کے منازل طے نہ کرتا ، یا اگر ان میں تبدیلی ہوتی تو محض حالات کے بدل جانے سے ، لیکن ایسا نہیں ہے وہ اپنی ضروریات کو لطافت و حسن اور عقلی نظریات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے ۔ ضروریات پورا کرنے کا جو طریقہ اس کے مذاق لطیف کو نہیں بھاتا اس کے عقلی نظریات پر پورا نہیں اترتا ۔ اور اس کے پہلے سے حاصل کئے ہوئے علوم و تجربات کے خلاف ہوتا ہے وہ اسے چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے عمدہ اور مفید طریقوں کی تلاش اسے ہر وقت سرگرداں رکھتی ہے ۔ اس کی بے چین طبیعت اس وقت ہی اطمینان کا سانس لے سکتی ہے جب اسے یہ طریقے معلوم ہو جاتے ہیں ۔ لیکن ان طریقوں کی دریافت جو نئے حالات پیدا کرتی ہے ان میں بھی اسے سکون نہیں ملتا وہ اس منزل پر ٹھہرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ۔ وہ چاہتا ہے کہ اس مقام پر زیادہ نہ ستائے ۔ بلکہ جلد ہی دوسری منزل کی طرف قدم بڑھائے ۔ خوب سے خوب تر حاصل کرنے کی یہ تڑپ انسان کو کبھی ایجادات و اختراع کی دنیا میں لے جاتی ہے ۔ وہ یہاں پہنچکر اپنے استعمال کے لئے نئی نئی چیزیں بناتا ہے ۔ اپنی جماعت کا نظام چلانے کے لئے بہتر سے بہتر ترکیبیں ایجاد کرتا ہے اور اپنی ہر قسم کی ضروریات پورا کرنے کے لئے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا رہتا ہے کائنات کی یہ تسخیر اس کے جماعتی نظام کو یکسر بدل دیتی ہے ۔ اور اسے جماعتی نظام کا دوسرا ڈھانچہ تیار کرنا پڑتا ہے ۔ کبھی وہ عقلی نظریات رائے کلّی اور علوم و تجربات کے وسیلے سے کام لیتا ہے ۔ اور یہ غور کرتا ہے کہ اس کی جماعت کن بنیادوں پر قائم ہے اور انسانی معاشرہ کی بنیاد کن باتوں پر ہونی چاہیئے ۔ وہ علی حدہ معاشرہ کے ہر ہر مظہر پر غور کرتا ہے ۔ انقلاب امم کی داستان اس کے سامنے رہتی ہے ۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معلوم کئے جاتے ہیں اور جماعت کے لئے ایک صالح نظام تیار ہوتا ہے ۔ یہ کسی ایک گروہ کا نصب العین بن جاتا ہے اس نصب العین سے عقیدت رکھنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح یہ ایک انقلابی تحریک بن جاتی ہے اس انقلاب کی کامیابی پر جماعت کا نظام بدل جانا یقینی ہے ۔ ایجادات و اختراعات اور عقلی نظریات ہی وہ انقلابی مظاہر ہیں جو انسان کے نوعی تقاضوں کی تحریک پر وجود میں آتے ہیں ، اور انسان کے معاشرہ

میں ترقی اور ارتقاء کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ اس لئے ان مظاہر کا ذرا تفصیل سے مطالعہ ضروری ہے۔

ایجادات و اختراعات

ایجاد اور اختراع کے اظہار کا میدان فطرتِ خارجی ہے ہر زمانے میں اور ہر مقام پر انسان اور فطرت کے خارجی مظاہر میں کش مکش نظر آتی ہے۔ تاریخ کے ابتدائی دور میں انسان کو حفظ نفس اور بقاء نسل کے لئے سردی، گرمی، وحشی جانوروں، دریاؤں، جنگلوں اور زمین کی قوتوں سے برسرِ پیکار رہنا پڑتا تھا۔ اس کش مکش نے فطری طور پر اسے ایسے طریقے دریافت کرنے اور ایسے اوزار ایجاد کرنے پر مجبور کیا جن کے ذریعے وہ فطرت کے ان خارجی مظاہر پر قابو پا سکے۔ ابتدائی معاشرے میں زندگی بہت سادہ تھی اور انسان کی ضرورتیں فطرت کے چند سرچشموں سے پوری ہو جاتی تھیں۔ انسان اس وقت جڑیں جھڑ بیریاں کھاتا چٹانوں اور غاروں میں رہتا، اور درخت کے پتوں سے اپنا بدن ڈھک لیتا تھا۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک اپنی ان ایجادوں پر قناعت نہیں کر سکا۔ اسے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ فطرت کے بے پایاں سرمائے پر قبضہ و اقتدار حاصل کرنے کے ذرائع دریافت کرتا جائے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ترکیبیں ایجاد کرتا رہے آخر اس تمام جدوجہد کی انسان کو کیوں ضرورت پیش آئی۔

شاہ صاحبؒ اس کا بڑی وضاحت سے جواب دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ انسان کے دو فطری تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ ایک تو علم و تجربات کی خواہش انسان کو کائنات کی ہر شئے کی حقیقت کی تلاش اور دنیا کی ہر چیز کے خصائص اور امتیازات کی جستجو میں سرگرداں رکھتی ہے وہ ہر اس نئی چیز کو جسے وہ پہلی مرتبہ دیکھتا ہے نہایت غور و خوض سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح اشیائے کائنات کے بارے میں اس کا مطالعہ روز بروز وسیع ہوتا رہتا ہے، دوسرے وہ ہمیشہ ہر چیز میں لطف و خوبی اور حسن و نزاکت تلاش کرتا ہے اور اپنی ضروریات پورا کرنے کے طریقوں کو ہمیشہ بہتر سے بہتر دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں جذبے انسان کو ہمیشہ نت نئی دریافتوں اور جدید سے جدید ایجادوں پر اکساتے رہتے ہیں۔ اس طرح ایجادات کا یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔

شاہ صاحبؒ نے اجتماعی زندگی میں ایجاد و اختراع کی اہمیت کسی جدا عنوان کے ماتحت واضح کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن کسی اجتماعی ادارے کو ایک درجے سے دوسرے درجے تک پہنچنے میں جدید

دریافتوں اور نئی نئی ایجادوں کے ذریعے جو مدد ملتی ہے شاہ صاحبؒ اس سے ناواقف نہیں ہیں۔ ارتفاقات کا بیان ارتقائے معاشرہ کے اس پہلو پر کافی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے وہ ہر اس موقعہ پر جب معاشرہ ایک درجہ سے بلند تر درجہ کی طرف ترقی کرتا ہے۔ بعض اہم ایجادات اور ضروری دریافتوں کا ذکر فرماتے ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی معاشرہ کی پہلی منزل میں کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ انسان کی ایجاد و اختراع کی صلاحیت اسے برابر بدلتی رہتی ہے۔ معاشرہ کو درجہ اول کی تکمیل تک پہنچنے میں جن اشیاء کی ضرورت پیش آتی ہے اور جنھیں وہ ایجاد و اختراع کے ذریعے حاصل کرتا ہے، بہت ہیں۔ شاہ صاحب نے ارتفاقات کے مباحث میں ان کی ایک فہرست تحریر فرمائی ہے جسے ہم مختصراً ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ زبان ۲۔ مکان ۳۔ لباس ۴۔ پکانے کے طریقے ۵۔ برتن بنانا۔
۶۔ جانوروں کی تسخیر ۷۔ کاشت کاری ۸۔ ایسی صنعتیں جن پر کھیتی کا دارومدار ہے جیسے کدال ڈول، ہل، رسی وغیرہ۔

معاشرہ کی ابتدائی شکل میں انسان ان چیزوں کو معمولی شکل میں حاصل کرتا ہے۔ لیکن نیک سے نیک تر کی جستجو انسان کو ان چیزوں کو بہتر سے بہتر شکل میں حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لئے وہ ان میں سے ہر چیز کو عمدہ سے عمدہ شکل میں بنانا سیکھتا ہے۔ اور اس کی ضرورتیں برابر بڑھتی رہتی ہیں۔ ایک منزل ایسی آتی ہے کہ کوئی شخص یا خاندان اپنی ان تمام ضرورتوں کی اشیاء تیار اور فراہم نہیں کر سکتا۔ اس لئے معاشرہ میں مبادلہ امداد باہمی، اجرت وکسب میں مدد دینے والی اشیاء دریافت ہوتی ہیں، اور معاشرہ دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے۔ اس جگہ پر پہنچ کر ترقی کی رفتار پہلے سے بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اور اب انسانی زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں پر علم و تجربہ کی روشنی میں نظر ثانی کی جاتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ایک مستقل حکمت اور فن مرتب ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیشوں میں تنوع اور کثرت پیدا ہو جاتی ہے۔ پیشوں کی یہ کثرت اور تنوع ایجاد و اختراع کی رفتار تیز کر دیتی ہے۔ اور اب معاشرہ میں اتنے مختلف مفاد رکھنے والے پیشے معرضِ وجود میں آجاتے ہیں کہ ان کی اور اس نظام کی حفاظت کے

بغیر جس کے گرد یہ پیشے نشو ونما پاتے ہیں، انسانی زندگی کی بقا مشکل ہو جاتی ہے۔ ایک مستحکم سیاسی نظام کی یہ ضرورت معاشرہ کو ایک تیسری منزل میں داخل کر دیتی ہے نظام کے استحکام کے بعد ایجاد و اختراع کی رفتار میں نسبتاً اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح معاشرہ نئی نئی ضروریات کو پورا کر کے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس منزل میں ایجادات و اختراعات اور نظام معاشرہ میں ایک خاص ربط و تعلق اور موزونیت و مناسبت کی ضرورت رہتی ہے۔ جب کبھی یہ توازن بگڑتا ہے اس کا اثر معاشی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی نظام پر پڑتا ہے۔ اور اس میں تبدیلی ہو جاتی ہے

" شاہ ولی اللہ صاحب ایک عالم ربانی تھے۔ قدرتی بات تھی کہ ان کا موضوع بحث انسانی زندگی کا اخلاقی اور مذہبی پہلو ہوتا شاہ صاحب کے زمانے میں ربانی عالموں کا دستور تھا کہ وہ اسباب معیشت کے بارے میں سوچنا برا سمجھتے اور نیکی اور تقویٰ کے لئے ترک اسباب پر بہت زور دیتے۔ ان کے نزدیک دنیا نجس تھی اور دنیا کا کاروبار چلانے والے دنیا کو چھوڑنے والوں سے کم درجے پر سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم شاہ صاحب کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے تمام مابعد الطبیعاتی رجحان اور تصوف و ریاضت سے اس قدر دل بستگی کے ساتھ ساتھ انسان کی معاشی ضرورتوں کو اپنے عمرانی فلسفے میں غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ انسان کی اخلاقی زندگی کا دار و مدار بہت حد تک اس کی اقتصادی زندگی کے حسن انتظام پر ہے۔"

جمع الجوامع

مولانا محمد عبدالحلیم چشتی

کثیر التصانیف علمائے متاخرین میں علامہ سیوطیؒ کو جو مقام حاصل ہے اس میں ان کا کوئی سہیم و شریک نہیں لیکن علمی دنیا میں ان کی شہرت کثرت تالیفات ہی کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ اصل شہرت ان چند اہم تالیفات کی وجہ سے ہے جن سے اہل علم کو آج بھی استغنا نہیں ہے اور وہ حسب ذیل ہیں۔

تفسیر میں۔ الدر المنثور　　علوم قرآن میں۔ الاتقان

حدیث میں۔ الجامع الکبیر (جمع الجوامع)　　علوم حدیث میں۔ تدریب الراوی

علوم لغت میں۔ المزھر　　سیرت میں۔ الخصائص الکبریٰ

نحو میں۔ ھمع الھوامع شرح جمع الجوامع اور الاشباہ والنظائر

ان میں سے ہر کتاب اس قابل ہے کہ اگر علامہ سیوطی نے صرف ایک ہی کتاب لکھی ہوتی تو سچ یہ ہے کہ یہی ایک کتاب ان کی شہرت و قبولیت کے لئے کافی تھی لیکن مختلف موضوع پر ان کی جامع تالیفات نے علامہ موصوف کی شہرت کو کسی ایک حلقہ میں محدود نہیں کیا بلکہ اہل علم کے ہر طبقہ میں ان کی شہرت اور قبولیت کو بقاء و دوام عطا کیا ہے اسی سلسلہ کی ایک کتاب پر تبصرہ ہدیۂ ناظرین ہے

(محمد عبدالحلیم چشتی)

وجہ تسمیہ اور سال تالیف

یہ کتاب حدیث کی مبسوط کتابوں کی جامع ہے اس لئے جمع الجوامع اور جامع کبیر کے نام سے موسوم ہے۔ بعض

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کا آغاز ۹۰۲ھ میں ہوا[1] اور ۹۱۱ھ تک جو علامہ سیوطی کا سال وفات ہے اس کی ترتیب و تدوین کا کام جاری رہا۔

ترتیب کتاب

جمع الجوامع دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں قولی حدیثوں کو جمع کیا ہے اور دوسرے حصہ میں احادیث فعلی وغیرہ کا بیان ہے۔ علامہ موصوف آغاز مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

کتاب جمع الجوامع کی قولی حدیثوں کا حصہ جس میں ہر حدیث کے اول لفظ کو حروف معجم پر مرتب کرکے حدیث کو نقل کیا گیا ہے۔ تکمیل کو پہنچ گیا تو میں نے باقی حدیثوں کو جو اس شرط سے خارج تھیں اور محض فعلی حدیثیں تھیں یا قول و فعل دونوں کی جامع تھیں، یا سبب اور مراجعت وغیرہ پر مشتمل تھیں، ان کو جمع کرنا شروع کیا تاکہ یہ کتاب تمام موجودہ حدیثوں کی جامع بن جائے، یہ حصہ مسانید صحابہؓ پر مرتب ہے ترتیب میں عشرۂ مبشرہ کو تقدم حاصل ہے۔ پھر دیگر صحابہؓ کی مسانید ہیں۔ اسماء صحابہؓ کی ترتیب حروف معجم پر ہے پھر کنیتوں، مبہمات نسبتوں اور پھر مراسیل کو بیان کیا گیا ہے۔[2]

کیا یہ تمام احادیث کی جامع ہے

اس کتاب میں حافظ سیوطیؒ نے تمام احادیث کے حصر و استیعاب کا ارادہ کیا تھا فرماتے ہیں۔

قصدت فی جمع الجوامع الاحادیث النبویۃ باسرھا[3]

میرا مقصد تمام احادیث نبویہ کو جمع الجوامع میں جمع کرنا ہے

تمام احادیث سے مراد دو لاکھ سے زیادہ احادیث ہیں، شیخ عبدالقادر شاذلی المتوفی ۹۳۵ھ

---

[1] جیسا کہ علامہ سیوطی کے مندرجہ ذیل خواب سے ثابت ہوتا ہے، موصوف جمع الجوامع کے آخر ورق کے دوسرے صفحہ پر لکھتے ہیں شب پنجشنبہ ۸ ربیع الاول ۹۰۴ھ میں میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں دربار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوں اور میں نے آپ سے جمع الجوامع کی تالیف کا تذکرہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو اس میں سے کچھ پڑھ کر سناؤں، آپ نے فرمایا سناؤ، شیخ الحدیث! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مجھے شیخ الحدیث کے الفاظ سے یاد فرمانا دنیا و مافیہا سے اچھا معلوم ہوا اور میں اس کی ترتیب و تدوین میں منہمک ہو گیا، جمع الجوامع بحوالہ الفتح الکبیر فی ضم الزیادۃ الی الجامع الصغیر (مقدمہ از یوسف نبہانی، طبع قاہرہ ج۔ ۱ ص ۳ تا ۵۔ (اگلے صفحہ پر)

دیباچہ الجامع میں حافظ سیوطیؒ سے ناقل ہیں۔

یقول اکثر ما یوجد علی وجہ الارض من الاحادیث النبویۃ القولیۃ والفعلیۃ مائتا الف حدیث ونیف فجمع المصنف منہا مائۃ الف حدیث فی ھذا الکتاب یعنی الجامع الکبیر واخترمتہ المنیۃ ولم یکملہ ووقع فیہ تقدیم وتاخیر بسببہ تقلیب وتم فی ورق المصنف فراغ فی الترتیب الحرف فما بعدہ یستقیم لک التعقیب فی کل ما تجدہ مخالفاً انتہی۔

موصوف فرماتے تھے روئے زمین پر زیادہ سے زیادہ جو قولی اور فعلی حدیثیں پائی جاتی ہیں وہ دو لاکھ سے اوپر ہیں مصنفؒ نے ان میں سے ایک لاکھ حدیثیں اس کتاب یعنی جامع کبیر میں جمع کردی ہیں اثنار ترتیب میں مصنف کا انتقال ہوگیا اور کتاب مکمل نہ ہوسکی کتاب کے اوراق الٹ پلٹ ہوجانے سے آگے پیچھے ہوگئے ہیں اگر تم نے ترتیب حرفی کا خیال رکھا تو جہاں ترتیب میں خرابی ہوگی تم درست کرلوگے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ جمع الجوامع ناقص ہونے کے باوجود بھی ایک لاکھ حدیثوں کی جامع ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالقادر شاذلی نے یہ تعداد تخمین و قیاس سے بیان کی ہے کیونکہ شیخ علی متقیؒ نے علامہ سیوطی کی تینوں کتابوں جامع صغیر زوائد جامع صغیر اور جامع کبیر کی حدیثوں کو ابواب پر مرتب کیا جن کی مجموعی تعداد پانچ ہزار نو سو بتیس ہے، حیرت ہے کہ شیخ علی متقی نے جمع الجوامع کے ناقص ہونے کی طرف کنز العمال میں اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

تعداد احادیث کے متعلق علامہ سیوطی کا مذکورہ بالا بیان ان کی اپنی معلومات کے اعتبار سے

بقیہ حاشیہ) مقدمہ جمع الجوامع بحوالہ کنز العمال طبع دکن ۱۳۱۲ھ ج ۱ ص

۳ھ الجامع الصغیر فی احادیث البشیر النذیر طبع قاہرہ ۱۳۵۸ھ ج ۱ ص ۳

۴ھ ملاحظہ الجامع بحوالہ الفتح الکبیر ج ۱ ص ۶

۵ھ جامع کی اصطلاحی بحث کے لئے ملاحظہ ہو فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ طبع کراچی ۱۹۶۴ء ص ۱۵۴ تا ص ۱۵۶

ہے۔ نفس الامر کے اعتبار نہیں شیخ عبدالرؤف مناوی، فیض القدیر میں لکھتے ہیں۔

ھذا بحسب ما اطلع علیہ المؤلف لا باعتبار ما فی نفس الامر لتعذر الاحاطۃ بھا وان انضم الیھا ما جمعہ الجامع المذکور سوتم وقد اخترمتہ المنیۃ قبل اتمامہ

مؤلف کا یہ بیان ان کی اپنی معلومات کے اعتبار سے ہے واقع کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ خارج میں جتنی حدیثیں پائی جاتی ہیں ان کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ اگر جمع الجوامع پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہوتی تو بھی اس کے علاوہ خارج میں حدیثیں پائی جاتیں پھر بھلا ایسی صورت میں جب کہ مؤلف کتاب کی تکمیل سے قبل ہی وفات پا گیا ہو پھر احاطہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

اس موقعہ پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعداد احادیث کے سلسلے میں علامہ سیوطی کی معلومات کا دائرہ سرزمین مصر تک محدود ہے اس کا تعلق تمام عالم سے نہیں ہے۔ پھر سرزمین مصر میں بھی تمام احادیث سے مراد تمام حقیقی نہیں بلکہ تمام عرفی ہے، جس سے مراد بہت بڑا حصہ ہے۔ کیونکہ جمع الجوامع کی تالیف کے بعد ایک زمانہ تک اہل علم اسی غلط فہمی میں رہے کہ تمام سے تمام حقیقی اور روئے زمین سے مراد سارا عالم ہے چنانچہ جب کسی حدیث کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا اور وہ ان کو اس کتاب میں نہیں ملی تو انہوں نے اسے حدیث ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چار و ناچار اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے شیخ عبدالرؤف مناویؒ نے البیان الازھر فی بیان احادیث النبی الانور لکھی چنانچہ موصوف اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے آغاز کتاب میں لکھتے ہیں۔

ومن البواعث علی تالیف ھذا الکتاب ان الحافظ الکبیر الجلال السیوطی ادعی انہ جمع فی الکتاب الجامع الکبیر الاحادیث النبویۃ مع انہ قد فاتہ الثلث فاکثر وھذا انما وصلت الیہ ایدینا بمصر وما لم یصل الینا منھا اکثر وفی الاقطار الخارجۃ عنھا من ذلک اکثر فاغتر بھذہ الدعوی کثیر من الاکابر فصار کل حدیث یسأل عنہ او یرید الکشف عنہ یراجع الجامع الکبیر فان لم یجدہ فیہ غلب ظنہ انہ لا وجود لہ فربما اجاب بانہ لا اصل لہ فعظم بذلک الضرر لکون

لہ ملاحظہ ہو فیض القدیر شرح الجامع الصغیر ج۔ ۱ صـ ۲۴

النفس الی الثقۃ زعمہ الاستیعاب وتوھم ان مازاد علی ذلک لایوجد فی کتاب[۱]

اس کتاب کی تالیف کے اسباب میں سے یہ ہے کہ حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے دعویٰ کیا ہے۔ کہ انہوں نے جامع کبیر میں تمام احادیث نبویہ کو جمع کر دیا ہے حالانکہ ان سے بھی اس کا ۱/۲ حصہ رہ گیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ، یہ تو وہ ہے جس تک مصر میں ہماری رسائی ہو سکی ہے۔ اور جس تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی وہ اس سے زیادہ ہے اور جو دیگر ممالک میں موجود ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے، موصوف کے اس دعوے کی وجہ سے بہت سے اکابر اہل علم کو دھوکا ہوا چنانچہ ہر وہ حدیث جس کے متعلق ان سے سوال ہوتا اور وہ اس کو جامع کبیر میں دیکھتے اگر اس میں نہ پاتے تو گمان غالب یہ ہوتا کہ اس کا وجود نہیں ہے بسا اوقات وہ یہی جواب دیتے کہ اسکی کوئی اصل نہیں ہے اس سے بڑا ضرر ہوا کیونکہ نفس کو علامہ سیوطیؒ کے استیعاب احادیث کے دعویٰ پر اعتماد و اطمینان ہو جاتا۔ اور یہی خیال ہوتا کہ اس کتاب کے علاوہ جو حدیثیں ہیں وہ کسی کتاب میں نہیں مل سکتیں۔

اگر علامہ سیوطی کے استیعاب احادیث کے دعوے پر غور کیا جاتا تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ ان کے اس دعوے کا تعلق ان کے بیان کردہ مآخذ سے ہے کیونکہ انہوں نے جتنی حدیثیں نقل کی ہیں وہ انہی کتابوں سے منقول ہیں، جن کا تذکرہ موصوف نے بیان ماخذ میں کیا ہے۔ اگر علامہ سیوطی نے سارے محدثین کی مرتب کردہ حدیث کی کتابوں کو دیکھا ہوتا تو اس وقت کسی حدیث کا انکار جو اس کتاب میں نہ ملتی، قرین قیاس بھی تھا۔ جب حدیثیں ان کتابوں میں منحصر نہیں تو ایسا خیال کرنا بھی درست نہیں۔ اس امر کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ علامہ موصوف نے اس خیال سے کہ موت کا وقت قریب آگیا ہے اور کتاب پوری ہوتی نظر نہیں آتی اگر یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اور کوئی بالغ نظر اس پر ذیل لکھنا چاہے تو اس کو وہ کتابیں دیکھنا چاہئیں جو ہمارے مطالعہ سے رہ گئی ہیں اس لئے موصوف نے اپنے ماخذوں کی نشاندہی کرنے کے بعد لکھا ہے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو الجامع الازھر فی احادیث النبی الانور (قلمی) اس کتاب کا قلمی نسخہ ہم نے ہمارے کرم فرما سید طلحہ صاحب کے ایک عزیز کے پاس ۱۹۵۸ء میں حیدرآباد سندھ میں دیکھا اسی موقعہ پر ہم نے یہ عبارت نقل کی تھی۔

ھذا تذکرۃ مبارکۃ باسماء الکتب التی انتہت مطالعتہا علی ھذا التالیف خشیۃ ان تہجم المنیۃ قبل تمامہ علی الوجہ الزی نقصدتہ فیقیض اللہ تعالیٰ من یذیل علیہ فاذاعرف ما انتہیت مطالعتہ استغنی عن مراجعتہ ونظر ما سواہ من کتب السنۃ[1]

اس کتاب کی تالیف میں جن کتابوں سے میں نے مراجعت کی ہے۔ ان کتابوں کے ناموں کا تذکرہ ہے جو اس اندیشہ سے کر دیا گیا ہے کہ کہیں موت کا مجھ پر اچانک حملہ ہو جائے اور میں اس کتاب کو اس طریقہ پر اس کی تکمیل کا میرا ارادہ ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ کسی اور شخص کو اس کا ذیل مرتب کرنے پر مامور فرمائے تو اس کو جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں ان کتابوں سے مراجعت کر چکا ہوں تو وہ ان کتابوں کی مراجعت سے مستغنی ہو جائے گا اور ان کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں کو دیکھے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب بعض نامور محدثین نے اس کتاب کو پڑھا تو اس پر بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ فخر مغرب حافظ ابوالعلاء ادریس حسینی فاسی المتوفی ۱۱۸۳ھ نے جب جامع کبیر کو پڑھا تو اس پر دس ہزار ۳ احادیث کا اضافہ کیا۔ حافظ سید عبدالحی کتانی فہرس الفہارس والاثبات میں رقمطراز ہیں۔

ولما قرأ الجامع الکبیر للحافظ السیوطی واستدرك علیہ نحو عشرۃ آلاف حدیث کان یقید ھا فی طرۃ نسختہ بحیث لونقل ذلك فی کتاب جاء مجلدا۔[2]

جب موصوف نے حافظ سیوطی کی جامع کبیر کا مطالعہ کیا تو بطور استدراک تقریباً دس ہزار احادیث کا اس میں اضافہ کیا اس طرح سے کہ احادیث کو اپنے مملوکہ نسخہ جامع کبیر کے حاشیہ پر قلمبند کرتے گئے اگر ان حدیثوں کو نقل کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔

جامع کبیر میں ماخذ حدیث کی نشاندہی کی گئی ہے

حافظ سیوطی نے اس کتاب میں حدیثوں کو صرف جمع ہی نہیں کیا ہے بلکہ ارباب تخریج کو بتا کر نہایت لطیف انداز میں ہر حدیث کا مرتبہ و مقام بھی متعین کر دیا ہے۔

شیخ عبدالرؤف مناوی دیباچہ جمع الجوامع سے ناقل ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو الفتح الکبیر ج ۱ ص ۵

[2] فہرس الفہارس والاثبات ج ۲ ص ۲۰۱

انه سالك طريقة يعرف منها صحة الحديث وحسنه وضعفه وذلك انه اذا عزا للبخاري او لمسلم او ابن حبان او الحاكم فی المستدرك او الضياء المقدسی فی المختارة فجميع ما فی هذه الكتب الخمسة صحيح فالعزو اليها يعلن بالصحة سوا ما فی المستدرك من المتعقب فانه تنبيه عليه وكذا ما فی موطا الامام مالك وصحيح ابن خزيمة وابی عوانة وابن السكن والمنتقى لابن الجارود والمستخرجات فالعزو اليها بالصحة ايضا وما عزى لابی داود فما سكت عليه فهو صالح وما عزاه للترمذی وابن ماجة وابی داود الطيالسی والامام احمد وابنه عبد الله وعبد الرزاق وسعيد بن منصور وابن ابی شيبة وابی يعلى والطبرانی فی الكبير والاوسط والدارقطنی وابی نعيم والبيهقی فهذه فيها الصحيح والحسن والضعيف وهو يبينه غالباً وكل ما كان فی مسند احمد فهو مقبول فان الضعيف الذی فيه يقرب من الحسن وما عزاه للعقيلی وابن عدی والخطيب وابن عساكر والحكيم الترمذی والحاكم فی تاريخه والديلمی فی مسند الفردوس فهو ضعيف[1]

سیوطی ایک ایسے طریقے پر گامزن رہے ہیں جس سے حدیث کے صحیح حسن اور ضعیف ہونے کا پتہ لگ جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ اگر وہ بخاری، مسلم ابن حبان مستدرک حاکم، مختارۂ ضیاء مقدسی کی طرف کسی حدیث کی نسبت کریں تو ان پانچ کتابوں میں سے جو حدیثیں ہیں وہ صحیح ہیں، لہٰذا ان کی طرف نسبت کرنا اس کے صحت کا اعلان ہے بجز مستدرک کی ان حدیثوں کے جن پر گرفت ہوئی ہے، یہ ان پر تنبیہ کی ہے یہی حکم موطا امام مالک صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابی عوانہ صحیح ابن السکن منتقی ابن جارود اور مستخرجات کا ہے۔ چنانچہ ان کی طرف نسبت بھی صحت کا اعلان ہے اور جس کی نسبت ابوداؤد کی طرف ہے اور ابوداؤد نے اس پر سکوت اختیار کیا وہ صالح عمل ہے جس کی نسبت ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد طیالسی امام احمد، ان کے فرزند عبد اللہ، عبدالرزاق، سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، ابویعلی، طبرانی کبیر، اوسط، دارقطنی ابونعیم اور بیہقی کی طرف ہے تو ان میں صحیح، حسن، ضعیف سب ہی ہیں اور وہ اکثر اس کو بتا دیتے ہیں، مسند احمد میں جو حدیث ہے وہ مقبول ہے کیونکہ جو ضعیف بھی اس

ہے وہ حسن کے قریب قریب ہے اور جس کے نسبت عقیلی، ابن عدی، خطیب، ابن عساکر، حکیم ترمذی، تاریخ حاکم اور مسند فردوس دیلمی کی طرف ہے وہ ضعیف ہے۔

علامہ سیوطی کے اس بیان سے شاہ عبدالعزیز کے اس قول کی کہ سیوطی بلاحوالہ و تحقیق کوئی بات نقل نہیں کرتے۔" صداقت و اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔

اس امر کا سب کو اعتراف ہے کہ حدیث کی جملہ کتابوں میں جمع الجوامع سب سے زیادہ جامع اور مبسوط کتاب ہے۔ شیخ خرم علی متقی برہانپوری ثم مکی المتوفی ۹۷۵ھ کا بیان ہے۔

انی وقفت علی کثیر مما دونہ الائمۃ من کتب الحدیث فلم ار فیہا اکثر جمعا ولا اکثر نفعا من کتاب جمع الجوامع الذی الفہ الامام العلامہ عبدالرحمن جلال الدین السیوطی سقی اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ حیث جمع فیہ من الاصول الستۃ وغیرہا الاتی ذکرہا عندہ من الکتاب واودع فیہ من الاحادیث الوفاً ومن الآثار صنوفاً واجاد فیہ کل الاجادۃ مع کثرۃ الجدوی وحسن الافادۃ۔

ائمہ فن نے حدیث کی جو بہت سی کتابیں مرتب کی ہیں ان پر میری نظر ہے میں نے ان میں جمع الجوامع سے جس کو امام علامہ عبدالرحمن جلال الدین سیوطیؒ نے اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے اور جنت میں ان کو جگہ دے، مرتب کیا ہے زیادہ جامع اور نافع کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ کیونکہ اس میں صحاح ستہ اور دوسری کتابیں جن کی علامتیں انہوں نے بتا دی ہیں سب ہی جمع کر دی ہیں اور اس میں مختلف اصناف کی ہزارہا احادیث و آثار یکجا کر دیئے ہیں اور کتاب کو خوب سے خوب تر اور مفید سے مفید تر بنا دیا ہے۔

اس کتاب کی جامعیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ سیوطی نے پچاس سے زیادہ حدیث کی کتابوں سے اس کو مرتب کیا ہے اور کوئی موضوع حدیث اس میں نقل نہیں کی ہے۔

(مسلسل)

وصیت نامہ نواب صدیق حسن خاں

قاسم حسن سید (جام شورو)

(۳)

نعمت کے لئے یہ طریقہ مجرّب اہل دین وشکر ہے کہ جب اپنی نعمتوں پر نگاہ کرے، ماشاء اللہ لا قوۃ الّا باللہ کہ لیا کرے اور ہر نعمت کو طرف خدا کے سمجھے نہ طرف کسی مخلوق کے۔ گو حصول میں اس نعمت کے کوئی واسطہ کیوں نہ ہو۔ اتنی بات ضرور ہے کہ اس واسطہ و محسن کا بھی شاکر و ثناخواں رہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے "جس نے آدمی کا شکر نہ کیا اس نے خدا کا بھی شکر نہ کیا" سو میں ہزار زبان و دل سے شکر گذار رئیسہ عالیہ ہوں جس کو اللہ تعالیٰ نے واسطہ اس غنا کا میرے حق ٹھیرایا۔ کیونکہ ان کی تفضیلات وانعامات واحسانات ورعایات میرے ساتھ بلا میری کارگذاری لیاقت واستحقاق کے اس قدر ہیں کہ ہنوز اس شکران کا بڑی عمر میں ادا نہیں کر سکتا ہوں۔ اور اللہ تعالےٰ سے اس امر کا سائل و داعی ہوں کہ مکافات ان نعم کی میری طرف سے ان کو عقبیٰ میں کرے تاکہ میں ان کے بار احسان سے اگر اس جگہ سبکدوش نہیں ہو سکا تو اس جگہ ہو جاؤں اور معاوضہ اس جگہ کا ان کے لئے بہتر ہوگا اس معاوضہ سے جو میں بصورت مقدرت اس جگہ کر سکتا۔ میں بائیس برس سے مشمول ان کے عواطف خسروانہ کا ہوں اور یوں تو ۱۲۷۰ھ سے متوسل اس ریاست کا ہوں جزاہا اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء۔ امر دوم یہ ہے کہ میں سن شعور میں ویسا ہی مسلمان تھا جیسے رسمی ہوتے ہیں یعنی مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا مسلمان ٹھیرا مگر باپ کو جو ایک عالم دیندار قانع وصابر و متبع و متقی حق پرست تھے، نہ پایا کہ ان کے فیض خدمت وصحبت سے کامیاب حقائق دین ہوتا۔ نہ کسی اور عالم آخرت کی صحبت زیادہ نصیب ہوئی۔ اگرچہ وعظ میں اکثر بزرگان دین کے بشوق خاطر بلا تحریک احدے ابتدائے عمر میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور علم دوست تھا پھر جب نوبت تحصیل علوم رسمیہ متداولہ کی آئی تو خدمت میں علمائے عصر کے حسب رواج ان ہی علوم کو پڑھا جو شیوۂ اہل دیار ہے یعنی دین میں فقہ واصول مذہب حنفی اور باقی علوم دینیہ الٰہیہ اور ایک شخص نوجوان واقف ان فنون کا ٹھیرا۔ یہاں تک کہ حکمت بالغہ الٰہی کا مقتضا بحسب قدرت ازل یہ ہوا کہ میں ربقہ مذہب کذائی تقلیدی محض سے خارج ہو کر دائرہ تحقیق سنت وکتاب میں داخل ہوں۔ چنانچہ خود بخود جاذبہ شوق طرف علوم قرآن وحدیث کے تہ دل سے فعوا علم

ے اٹھا اور بقیہ اوقات مستعار کو وقف قرأت و تحصیل و درس فنون سنت و دواوین حدیث و تفسیر و ذخائر فقہ و سنت و
اصول حدیث و اصول قرآن و اصول فقہ و سنت و اصول لغت و نحو کیا۔ تا آنکہ ایک ملکۂ راسخہ فہم و معرفت کا ان
علوم مبارکہ میں حاصل ہوا اور طرائق سلف صلحا و علما و قدما و مجتہدین پر اطلاع حاصل ہوئی اور ادلۂ مذاہب ائمہ اربعہ
معلوم ہوگئی۔ اور سلیقہ ترجیح دلیل اور تضعیف حال و قیل کا حاصل ہوا۔ اور رجحان طریقہ سلف کا شیوۂ خلف پر
برہان جلی ثابت ہوگیا اس طرح پر کہ شک و شبہ کو راہ طرف اس کے خلاف کے باقی نہ رہی۔ اور علم فقہ و حدیث و تفسیر
ہی اصول اسلام ہیں، ایسا سہل و آسان ہوگیا جیسا لوہا ہاتھ میں داؤد علیہ السلام کے موم ہوجاتا تھا۔

الین لابی داؤد الحدیث کما الین لداؤد الحدید۔ اب میں جملہ ابواب شرع شریف میں عبادات و معاملات فی نحوہا
سے مذہب اہل حدیث کو مع دلائل واضح بیان کرسکتا ہوں۔ وللہ الحمد والمنۃ اور اختیار کرنا میرا اس طریقہ کو کچھ ہوائے
نفس سے نہیں ہوا بلکہ یہ توفیق الٰہی ہوا اس لئے کہ میں سلف ارجمند اور زمرۂ خلف حق پسند میں جس کو دیکھتا ہوں،
وہ طرف اسی طریقہ متبع کے گیا ہے اور اقوال ان کے دربارہ ترغیب اتباع سنت و اجتناب عن البدعت شمار سے زیادہ
ہیں۔ کیا علمائے کرام کیا صوفیائے عظام

نہ ہمیں نکہت گل سوئے گلستان کشم ذوق ہم نغمگیٔ مرغ خوش الحان کشم
زخمی عشقم و صد درد و تمنا دارم دل بہ دو کانچۂ الماس فروشان کشم

الغرض پہلے میں باوجود حصول علوم و فنون رسمیہ کے ایک مرد عامی مقلد عارف اقوال لوگوں کا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ
مجھ کو اصول و حقائق با ایمان صحیح قوی، روش واضح السبیل پر علم و آگاہی بخشی اور ضلال سے مہدی کیا، لا احصی ثناء
علیہ ھو کما اثنیٰ علیٰ نفسہ۔ امر سوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عائل پاکر غنی کردیا۔ اس کا ذکر مطاوی فاوی سابقہ
میں گذر چکا ہے مع ذالک میں خفیف الحاذ بھی ہوں کہ اولاد کثیر نہیں رکھتا۔ عیال یسیر رکھتا ہوں۔ دو فرزند ایک
دختر۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بار گراں معاش سے بھی مجھ کو سبکدوش فرمادیا کہ رئیسہ عالیہ نے علاوہ مری جاگیر کے
ہر دو فرزند کو جاگیر بارہ بارہ ہزار روپیہ سالانہ کی اور دختر کو چھ ہزار سالانہ اور خوش سعادتمند کو تین ہزار کی استقلالاً
بلا شرکت یک دیگر نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ ابداً موبداً مع مدد معاش بموجب شرح مندرجہ اسناد و اقطاع عطا کی ہے۔ یہ
سب بچے اپنی مدذات میں میری مؤنت سے بے نیاز ہیں۔ ان کو چاہئے کہ قدر و قیمت اس نعمت غیر مترقبہ کی سمجھیں اور ہر
دم منعم حقیقی و محسنۂ مجازی کے شکر گذار اور ثنا خواں رہیں اور اسراف تبذیر سے بچ کر چلیں کیونکہ جن کو بے مشقت دولت ہاتھ آتی ہوگی
ہاتھ آتی ہے۔ وہ اپنی ناتجربہ کاری سے بذل صرف کرکے چند روز میں۔ بعد والدین کے تہی دست مفلس نادار ہوجاتے ہیں

پھر طلب معاش میں سرگرداں، پریشاں و حیران ہو کر انواع معاصی الہی اور امور خلاف غیرت و شرافت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت نادم ہوتے ہیں، لیکن وہ ندامت بجز حسرت و افسوس و ثبوت سفاہیت کے کچھ نفع نہیں دیتی۔ اس شکل کا نتیجہ ہمیشہ احسن ارذل ہوتا ہے

صد حیف کہ ما پیر نود سالہ نبودیم　　روزیکہ رسیدیم بہ ایام جوانی

خصوصاً اس زمانۂ آفت نشانہ میں افلاس سبب ذلت و کفر برائے مسلمان ہو جاتا ہے۔ جس کو دیکھو حیا و شرم کو چھوڑ کر مخلوق سے سوال حاجت کرتا پھرتا ہے حالانکہ یہ سوال منجملہ کبائر ذنوب کے ہے۔ یا قرض لیتا ہے جو شہدا سے بھی معاف نہیں ہوتا۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ باوجود ہزار احتیاج کے زمانہ ابتدائی عمر سے کبھی نہ لیا نہ کسی امیر و فقیر اجنبی و عزیز سے کوئی سوال حاجت کیا نہ بجز خدا کے اس امید پر کسی کے در کا سائل بنا۔ اور نہ کبھی اپنی غیرت و حمیت کے خلاف کسی امر ذلیل کا مرتکب ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ کسی علم و فضل و ہنر کی کسی جگہ کوئی قدر نہیں ہے۔ حصول دنیا و جاہ زر و مکر و فریب، دغابازی، دروغ و چالاکی و خیانت و جوڑ توڑ پر موقوف ہے۔ اکثر خلق ان ہی حیل سے رزق و معاش حاصل کرتی ہے۔ اور ہزار قالب فضائل میں ظاہر ہو کر تحصیل مال میں براہ ریاکاری مشغول رہتی ہے۔ مراتب دین کے واسطے تحصیل دنیا کے رہ گئے ہیں۔ نہ واسطے تکمیل اسلام و درستی عقبیٰ کے۔ پھر ان لوگوں کا کیا ذکر ہے جو محض بندۂ شکم و پرستار دینار و درہم ہیں۔ اس زمانہ کے ملّا و مولوی، فقیر و مشائخ بیزادہ غالباً ان لوگوں جیسے کام کرتے ہیں، جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور حرام کو حلال خالص جان کر ہر حیلہ و شعبدہ کے پیرائے سے جمع کرتے ہیں اور خود تو ہالک تھے اپنے اہل و عیال کو اور مریدین و معتقدین کو بھی رزق حرام سے پرورش کر کے اور تہمت تحصیل و رشوت و سرف و نحو باد لا کر دار البوار میں پہونچاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے قوا انفسکم و اھلیکم ناراً۔ اللہ کا شکر ہے جس نے ہیچ میرز کس میرس کو ایسے زمانہ نازک میں شیوۂ ناہنجار اہل زمان و ابنائے دہر سے محفوظ رکھ کر اپنے خزانہ غیب سے رزق طیب و حلال عنایت فرمایا۔ اور یہی فضل بعینہٖ میرے اخلاف پر کیا۔ اگر وہ اس نعمت کی قدر سمجھیں گے تو یہ نعمت جب تک خدا چاہے گا پاس ان کے باقی رہے گی۔ ورنہ شر خیر پر غالب رہتا ہے الا ماشاء اللہ تعالیٰ۔ میں ندیت خاتم الانبیاء میں ہوں اگرچہ مثل دود تنگ آتش اور مانند کرم عاصب ہوں لیکن بحکم وراثت ادنیٰ حصہ ان ہر صفات کا جو قرآن کریم میں دربارۂ رسول رحیم فرمایا ہے مجھ کو بھی مل گیا ہے۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا　　بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

عیال دار مفلس کے رشتہ دار و آشنا وقت تہیدستی بیگانہ اور اغیار ہو جاتے ہیں اور جب کوئی آدمی ثروت

وآسودہ حالی کو پہونچ جاتا ہے تو سینکڑوں بیگانہ آشنا و قریب دلسوز بن کر آتے ہیں۔ کوئی اس کو شاگرد بناتا ہے اور کوئی استاد و پیر۔ ایسی حالت پر ملالت میں عقلمند وہ ہے، جو ان کے دھوکے میں نہ آئے۔ اور ان کی آشنائی و جاں نثاری و مشیخت و استادی و مولویت و دوستی و رشتہ داری پر مغرور ہو کر آپ کو مفلس بنائے۔ صلہ رحم میں باوجود مواسات مطابق حال سائل و قریب کے کافی ہے نہ ایثار۔ اور اہل صلہ رحم چند نفر خاص ہیں جن کا ذکر رسالہ مستقلہ میں لکھا گیا ہے۔ ورنہ یوں تو سارے بنی آدم رشتہ دار یکدیگر ہیں۔ ناتجربہ کار لوگوں کو ان کے اعزہ قریب و بعید و آشنائے جدید و قدیم بہت جلد حالت افلاس کو پہونچا دیتے ہیں میں اپنے اخلاف کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ایسے کاروباریوں سے ہوشیار ہیں اور مسائل صلہ رحم و صدقات و خیرات کو بہ پابندی شرع شریف بجالائیں اور اہل دہر سے غافل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مسرفین و مبذرین کو قرآن شریف میں اخوان الشیاطین فرمایا ہے جو درہم و دینار روپیہ پیسہ و پول سیاہ خلاف اجازت شرع و نامرضی حق میں صرف ہوتا ہے وہ عقبیٰ میں ایک داغ آتش سوزان جہنم ہوگا اسی میں سارے مصارف اسباب و انواع۔ لہو لعب وجود و سخا داخل ہیں۔ مگر یہ کہ توبہ نصیب ہو اور عمل صالح سے تلافی مافات کی جاوے۔ اکثر وجہ افلاس خلق کے یہ ہیں۔ یہی سرف ناروا و حرص عیش خانی و یار باشی و ہوا و ہوس نفسانی و اغوائے شیطانی اور حبّ دنیائے فانی ہے ورنہ باوجود فساد زماں اس وقت میں اکثر لوگ بقدر کفاف بلکہ زیادہ اس سے حاصل رکھتے ہیں۔ جس کو طرز و قدر معیشت سلف پر اطلاع حاصل ہے وہ جانتا ہے کہ ہر مفلس اس زمانے کا ان کے مقابلہ میں باعتبار مقدرت ایک بادشاہ ہے۔ لیکن یہ تابع ہوائے نفس ہے اور وہ متبع حکم قدس تھے فبہداہم اقتدہ اس طریقہ پر جو شخص قانع و صابر ہوگا، وہ ہرگز شکوہ رزق نہ کریگا یہ شکوہ یوں پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص حرص عیش و کامرانی کا فوق الحد خود رو بیش از قسمت و بیش از وقت رکھتا ہے۔ اور آخرت کو بھول گیا ہے۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
آنچہ من درکار دارم اکثرش درکار نیست

(سلسل)

تنقید و تبصرہ

تکمیل الاذہان مع رسالہ مقدمۃ العلم از شاہ رفیع الدین و مع رسالہ دانشمندی از امام ولی اللہ

شاہ رفیع الدین صاحب کا مشہور رسالہ تکمیل الاذہان مکمل شکل میں اب تک نہیں چھپا تھا۔ مولانا عبدالحمید سواتی نے خانوادۂ ولی اللہی کو دوسری تصانیف کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر اور ان کا باہم مقابلہ کر کے اسے "ایڈٹ" کیا ہے، اور ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم کی طرف سے اسے شائع کیا گیا ہے۔ تکمیل الاذہان کے ساتھ شاہ رفیع الدین کا رسالہ مقدمۃ العلم اور امام ولی اللہ کا رسالہ دانشمندی بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

مولانا سواتی نے تکمیل الاذہان کی تصحیح، تحقیق اور اس کے متعدد نسخوں میں مقابلہ کر کے اسے "ایڈٹ" کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔ علوم ولی اللہی کے طالبوں پر موصوف کا یہ ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اور اس سلسلے میں دوسرا احسان مدرسہ نصرۃ العلوم کے کارکنوں کا ہے، جو باوجود اپنے محدود وسائل کے خانوادۂ ولی اللہی کی کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ شروع میں کتاب کا اجمالی تعارف ہے۔ جس میں مولانا سواتی نے بڑی دقت نظر سے تکمیل الاذہان کے مطالب کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ یہ اجمالی تعارف اردو اور عربی دونوں میں ہے۔

"تکمیل الاذہان" کا ایک باب "تطبیق الاراء" ہے یعنی متقابل و متضارب چیزوں کو ایک دوسرے سے تطبیق دینا، شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ ایک علمی خصوصیت تھی، شاہ رفیع الدین نے اسے ایک مستقل علمی فن بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

آیات قرآنی کی تطبیق میں مفسر الامت عبداللہ بن عباسؓ سبقت لے گئے۔ مختلف احادیث میں تطبیق دینے میں صاحب المغیث کو آراء مسلمین میں تطبیق دینے میں شیخ علاء الدولہ سمنانی کو شریعت اور فلسفہ میں تطبیق دینے میں اخوان الصفا کو، دو حکیموں (افلاطون و ارسطو) کی رائے میں تطبیق دینے

میں ابو نصر فارابی کو اور اسلام اور ہندیت میں تطبیق دینے میں داراشکوہ کو سبقت حاصل ہے۔ وحدۃ الشہود اور وحدۃ الوجود میں دو جلیل القدر عارفوں شیخ احمد سرہندی اور شیخ ولی اللہ دہلوی نے کوشش کی، اور اس ضمن میں شیخ ابن عربی کا کہنا ہے۔

عقد الخلائق فی الالٰہ عقائدا

وانا اعتقدت جمیع ما عقدوہ

تطبیق کے ذیل میں مولانا سواتی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "..... انسانی عقل کو انتشار و تضارب سے بچاکر ایک وحدت کی طرف متوجہ کردینا میرے خیال میں انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے ....." نیز یہ کہ تطبیق سے مراد یہ نہیں کہ دو آدمی جو ایک دوسرے کے خلاف رائے رکھتے ہیں، ان میں سے ایک کے دعوے کی سرے سے نفی کردی جائے۔ اور نہ تطبیق سے یہ مراد ہے کہ ایک شخص کے کلام کو بالکل دوسرے کے کلام کی مراد پر محمول کردیا جائے اور اسی طرح تطبیق سے یہ مطلب بھی نہیں کہ ہر ایک مذہب کے اصول و فروع کا واقعہ کے مطابق ہونے کا دعویٰ کردیا جائے۔ بلکہ تطبیق سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک مذہب میں جو حصہ واقعہ کے مطابق ہو، اور جتنا حصہ واقعہ سے منحرف ہو، اسے معلوم کیا جائے۔ نیز اس انحراف کے اسباب کا کھوج لگایا جائے ..... "

آخر میں ہم ایک بار پھر مولانا عبدالحمید سواتی اور مدرسہ نصرۃ العلوم کی اس علمی خدمت کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں کہ وہ علوم ولی اللہی کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اس قدر مفید کام کر رہے ہیں

ضخامت ۱۸۸ صفحات، بڑا سائز۔ قیمت ۳ روپے

ناشر ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ مغربی پاکستان

تذکرۂ شیخ رحمکارؒ۔ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات

مرتبہ مولانا سید میاں ح الدین کاکاخیل۔ شائع کردہ ادارہ اشاعت الاسلام جامع مسجد لائلپور (مغربی پاکستان)

حضرت شیخ رحمکارؒ، جو زیادہ تر حضرت کاکا صاحب کے نام نامی سے مشہور ہیں، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایک بڑے نامور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کا مزار تحصیل نوشہرہ

ضلع پشاور کے ایک گاؤں زیارت کاکا صاحب میں ہے اور مرجع عوام و خواص ہے، ان دیار میں حضرت کاکا صاحب کی وہی مرجعیت اور مقبولیت ہے، جو شال کے طور پر لاہور میں حضرت داتا گنج بخش صاحب کی ہے۔

اکبر اعظم کو تخت نشین ہوئے بیس سال گزرے تھے کہ حضرت کاکا صاحب ۹۸۳ء میں پیدا ہوئے جہانگیر اور شاہجہاں کا سارا زمانہ آپ کے سامنے گزرا اور اورنگ زیب عالمگیر کا عہد حکومت تھا کہ ۸۰ سال کی عمر میں آپ نے ۲۴ رجب ۱۰۶۳ھ میں انتقال فرمایا۔[1]

مولانا سید بہاء الدین کاکا خیل نے زیر نظر کتاب میں پوری کوشش کی ہے کہ اس نامور بزرگ کی بابرکت شخصیت کی زندگی کے سارے پہلو آ جائیں۔ چنانچہ ایک طرف جہاں مصنف نے آپ کے زمانے کے سیاسی حالات کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے، جن کے پس منظر میں حضرت کاکا صاحب اور ان کی اولاد امجاد کا اس دور میں جو اجتماعی کردار تھا، اسے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف مصنف نے طریقت کے بعض سلاسل کا بھی تعارف کر دیا ہے جس سے حضرت کاکا صاحب کے سلسلے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس ضمن میں ہمارا یہ احساس ہے کہ اگر مصنف اس دور کے سیاسی حالات کچھ زیادہ تفصیل سے لکھتے تو بہتر ہوتا اور کتاب کی افادی حیثیت بھی اور بڑھ جاتی۔ مسلمان قوموں میں عربوں اور شمالی افریقہ کے بربروں کی طرح پختونوں کا معاشرہ بھی قبیلہ واریت پر مبنی ہے عربوں اور بربروں میں تو بارہا ایسا ہوا کہ ان میں کوئی مذہبی شخصیت پیدا ہوئی اور اس کی دعوت نے اس قبیلہ واریت کی باہمی آویزش کو ایک حد تک وحدت میں بدل دیا۔ زمانہ حال میں اس کی مثال شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور شیخ سنوسی کی ہے، لیکن تعجب ہے کہ حضرت کاکا صاحب جیسے بزرگ جنہیں خٹک اور یوسف زئی دونوں مانتے تھے، ان دو مشہور پختون قبیلوں کی باہمی عداوت کو کم نہ کر سکے۔ اور ان کی بدولت قبیلہ وارانہ جنگوں کا خاتمہ نہ ہو سکا۔

---

[1] پشتو کے مشہور شاعر خوشحال خاں خٹک کا آپ کی وفات کے متعلق یہ قطعہ تاریخ ہے۔

چوں رفت از جہاں شیخ دیں رحمکار	رجب بود جمعہ بہ وسہ ہفت
چو تاریخ فوتش، بجستم ز عقل	چنیں گفت با کہ باقفر رفت

۱۰۶۳ھ

اگر فاضل مصنف کتاب کے آیندہ ایڈیشن میں اس تاریخی مسئلہ پر روشنی ڈالیں، تو یہ ان کی بڑی علمی خدمت ہوگی۔ اور اس طرح ماضی کی اس داستان سے مستقبل کی راہیں سوجھیں گی اور آخر تاریخ کا سب سے بڑا منصب تو یہی ہے۔

حضرت کاکا صاحب محض صاحب کرامات وخوارق بزرگ ہی نہ تھے، بلکہ جیسا کہ مصنف لکھتے ھیں۔
"آپ نے علوم ظاہری کی تمام کتابیں باقاعدہ طریقہ سے پڑھ کر تکمیل کی تھی۔ اور تفسیر وحدیث اور فقہ کی کتابوں کا ابتدا ہی میں کافی عرصہ تک مطالعہ کیا تھا" کیونکہ بقول صاحب مجمع البرکات "مشائخ کرام کی عادت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ علوم ظاہری کی تکمیل اور ان سے فراغ حاصل کرنے کے بعد ہی علوم باطنہ کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے اس لئے حضرت نے ایسا ہی کیا اور پچیس سال تک علم ظاہری کے استعمال میں لگے رہے۔"

علم تصوف وسلوک میں کامل تبحر اور پوری مہارت کے ساتھ ساتھ حضرت کاکا صاحب کا علوم دینی میں یہ انہماک ان کے ظاہر وباطن ہر دو میں جامع ہونے کی دلیل ہے۔ تقریباً اٹھارہ کتابیں تفسیر وحدیث اور فقہ واصول کی ہمیشہ آپ اپنے ساتھ مجلس میں رکھا کرتے تھے۔ تفسیر بحر المعانی کو اکثر وبیشتر استعمال میں رکھا اور اس کی طرف زیادہ توجہ رکھتے تھے۔

حضرت کاکا صاحب کے اوّلین سوانح نگاران کے صاحبزادے شیخ عبدالحلیمؒ لکھتے ہیں کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔

> یہ کتابیں میرے لئے چراغ راہ ہیں۔ ان کی روشنی میں زندگی کا سفر طے کر رہا ہوں اور کرتا ہوں۔ اور جو کچھ اس میں کرنے کے لئے لکھا گیا ہے اس کا عامل ہوں اور جس سے منع کیا گیا ہے، اس سے بچتا ہوں۔
>
> (مجمع البرکات ص۳۳۹)

حضرت کاکا صاحب نہ صرف ایک صاحب ریاضت ومعرفت صوفی اور ایک متبع شریعت اور وسیع المطالعہ عالم تھے، بلکہ آپ تعلیم دینی کی اشاعت میں بھی پیش پیش تھے۔ مصنف لکھتے ہیں:۔
"آپ کی نگرانی وسرپرستی میں سات مدرسے جاری تھے۔ تین مدرسوں میں تو قرآن مجید کی تدریس تعلیم ہو رہی تھی اور چار مدرسوں میں فنون مختلفہ کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان مدارس ومکاتب سے

متعلقہ کتب خانوں میں ایک روایت کے مطابق ۱۲ ہزار اور دوسری روایت کے مطابق ۱۲ ہزار کتابیں تھیں۔ جب کبھی کسی مسئلے کی تحقیق کی حاجت پیش آتی تو آپ متعلقہ کتابیں منگاتے اور مسئلہ نکال لیتے تھے۔"

مولانا سید سیاح الدین نے زیر نظر کتاب میں حضرت کاکا صاحب کے سوانح حیات کے ضمن میں ایک اور اہم تاریخی مسئلے پر بھی بحث کی ہے۔ تاریخ اسلام کی جہاں اور بہت سی بدقسمتیاں ہیں، وہاں ان صدیوں میں ایک بہت بڑی بدقسمتی مشرق وسطےٰ میں ترکوں اور عربوں اور اس برصغیر میں مغلوں اور افغانوں کا تصادم ہے۔ اگر مشرق وسطیٰ میں عرب اور ترک ایک دوسرے سے برسرپرخاش نہ ہوتے اور دونوں قوموں کے درمیان خلافت عثمانیہ کے ضمن میں اشتراک اقتدار کا کوئی سمجھوتہ ہو جاتا تو نہ ترکوں کی عظیم سلطنت کا یہ حشر ہوتا، اور نہ عرب ممالک یورپ کے استعماری طاقتوں کا یوں تر نوالہ بنتے۔ اسی طرح برصغیر پاک و ہند میں مغلوں اور افغانوں کی باہم چپقلش اس سرزمین میں اسلامی سیادت واقتدار کے بسرعت تمام زوال کا باعث بنی یہ چپلقش یوں تو شروع سے دونوں میں چلی آتی تھی لیکن اورنگ زیب عالمگیر اور خوشحال خاں خٹک کے باہمی اختلافات کے بعد اس نے ایک اور شکل اختیار کرلی اور معاملہ افغان قوم اور مغل اقتدار کا بن گیا۔

مصنف لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں کے آخری دورِ حکومت میں جب دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں تخت نشینی کی جنگ ہوئی، تو جہاں یوسف زئی سردار دارا شکوہ کا حامی تھا، وہاں خوشحال اللہ خٹک کی ہمدردیاں سرتاسر اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھیں۔ اور جب اورنگ زیب برسر اقتدار آگیا تو اس وقت بھی خوشحال خاں اس کے حامیوں میں سے تھا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ اورنگ زیب نے خوشحال خاں کو قید کر دیا۔ اور دونوں میں باقاعدہ ٹھن گئی۔

اس افسوس ناک صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں۔

"اور پھر قید خانہ سے رہائی کے بعد خوشحال خاں نے اورنگ کے خلاف کچھ شدید قسم کی انتقامی کارروائی شروع کی، جس سے ملک وملت کو سخت نقصان پہنچا۔ یہ ایک طویل اور غم انگیز داستان ہے ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر حضرت شیخ رحمکار اس وقت بہ قید حیات ہوتے تو یہ صورت حال پیش نہ آتی۔ وہ خوشحال خاں کو اپنے قابو میں رکھتے اور ایک صحیح اسلامی

حکومت اور نیک دل حکمراں کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کی اجازت نہ دیتے"

مولانا سید سیاح الدین نے لکھا ہے کہ خوشحال خاں کا ایک فرزند بہرام خاں اپنے باپ کی اس پالیسی سے اتفاق نہ رکھتا تھا۔ کیونکہ اس کے حضرت رحمکار کے صاحبزادے اور جانشین شیخ ضیاء الدینؒ کے ساتھ خصوصی تعلق اور صحیح عقیدت وارادت کی بنا پر اس نے اورنگ زیب کی مخالفت کو صحیح نہیں سمجھا اور اس بارے میں اس نے والد ماجد کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کیا چنانچہ خوشحال خاں نے اپنے اشعار میں اسے بہت برا بھلا کہا ہے۔

حضرت کاکا صاحب کی ذات گرامی کا فیض بڑا عام ہوا، روحانی طور پر بھی اور نسلاً بھی آپ کا خاندان جو کاکا خیل کہلاتا ہے اس وقت اپنی کثرت تعداد اور اثر ورسوخ کی بنا پر بڑا ممتاز ہے اور بقول مصنف کے "یہ خاندان، صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہے اور خصوصاً ضلع پشاور ضلع مردان اور ملحقہ علاقوں کے بارے میں اگر کہا جائے کہ کوئی بڑا قصبہ اور کوئی مشہور گاؤں ایسا گاؤں نہ ہوگا، جس میں قوم کاکا خیل کے کچھ افراد نہ بستے ہوں۔، تو شاید کہ مبالغہ نہ ہوگا۔" اور جہاں تک آپ کے روحانی فیض کا تعلق ہے، فاضل مصنف نے لکھا ہے۔

> صوبہ سرحد اور ملحقہ پنجاب کے وہ مشہور ومعروف بزرگ جو اس عصر میں گزرے ہیں، تقریباً سب کے سب حضرت شیخ رحمکار کے فیض یافتہ اور آپ کی کیمیا نظری سے زر خالص بلکہ سنگ پارس بن گئے۔

آپ کے کثیر التعداد خلفاء اور مسترشدین تھے۔ چنانچہ مصنف کے الفاظ میں "سرحد یاغستان کے بزرگوں میں سے شاید کوئی ایسا بزرگ ہو، جو اس اصل ثابت کی شاخوں میں سے کسی شاخ کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔"

بحیثیت مجموعی حضرت کاکا صاحبؒ کے سوانح حیات پر یہ ایک جامع کتاب ہے اور مصنف نے حتی الوسع اس میں آپ کے سارے پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کی زبان بڑی صاف ورواں اور اس کا اسلوب بڑا سلجھا ہوا ہے، اور مطالب کو بڑے اچھے ڈھنگ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خاص خوبی، جو اس قسم کے تذکروں میں عموماً بہت کم ملتی ہے، یہ ہے کہ اس میں کرامات وخوارق کا باب ضرورت سے زیادہ لمبا نہیں اور پھر ان کے ساتھ ساتھ حضرت کاکا صاحب کے دوسرے محامد ومحاسن

بھی پیش کئے گئے ہیں۔

ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ کاغذ معمولی، کتاب بے جلد ہے۔ اور قیمت تین روپے۔

تخلیق عالم۔ حقیقت محمدیہ و دین محمدی کا پس منظر۔ مرتبہ مولانا ابواحمد عبداللہ لودھانوی

زیر نظر کتاب میں تخلیق عالم کے وقت سے حقیقت محمدیہ کے موجود ہونے کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، جس سے آپ کا ابتدائے خلق سے اولاً و آخراً سرمداً نبی اللہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ بقول مرتب کے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تخلیق عالم کے لئے آپ بمنزلہ علتِ غائیہ کے ہیں۔

کتاب کے شروع میں تخلیق کائنات سے بحث کی گئی ہے، اور اسرائیلی روایات کے حوالے سے دنیا کی عمر بتائی گئی ہے اگرچہ ایک جگہ مرتب نے فرمایا ہے کہ "بہر حال رات اور دن کے الٹ پھیر کے واقعی اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، زمین گھومتی ہو یا آفتاب چکر لگا رہا ہو۔ یا آسمان گردش میں ہو۔ قرآنی مباحث کے دائرے سے یہ سوالات خارج ہیں" اور اس کی تائید میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے۔

> "اس سلسلے میں اپنی تعبیروں کو عام انسانی احساسات کے مطابق اگر قرآن رہنے نہ دیتا مثلاً رات دن کے اسی قصے میں اعلان کر دیتا کہ زمین کی گردش کا یہ نتیجہ ہے تو مطلب اس کا یہی ہوتا کہ جب تک زمین کی گردش کا مسئلہ طے نہ ہوتا، قرآن پر ایمان لانے سے لوگ محروم رہتے۔"

کتاب میں حضرت آدم کی پیدائش پر بھی بحث ہے، اور بتایا گیا ہے کہ وہ کب پیدا ہوئے۔ کہاں پیدا کئے گئے۔ کس چیز سے پیدا کئے گئے۔ وہ کہاں ٹھہرے۔ زمین پر کہاں اتارے گئے۔ وہ کس دن فوت ہوئے۔ اور ان کی نماز جنازہ کس طرح پڑھی گئی۔

اس تمہید کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا آغاز ہوتا ہے۔ مرتب نے یہ ثابت کیا ہے کہ "نبوت محمدیہ باقی نبوتوں کا منبع اور مخزن ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرچشمۂ نبوت و نقطۂ فیض اور دائرۂ نبوت میں فاتح و خاتم ہیں۔ آپ ہی سے نبوت چلی اور آپ ہی پر آ کر منتہی بھی ہوئی۔ ..." آخر میں ختم نبوت کے مسئلے پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب دارالعلوم نعمانیہ گوجرانوالہ کے "سلسلہ تبلیغ و اشاعت" کی سترھویں تالیف ہے اور یہ کتابیں غیر اسلامی تعلیم یافتہ فرزندان اسلام اور غیر مسلموں کی رہنمائی کے لئے شائع کی جاتی ہیں جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے، اس کے نیک اور بابرکت ہونے میں کسے کلام ہوگا۔ لیکن اگر دارالعلوم مذکورہ تبلیغ اسلام کے لئے اسی طرح کی کتابیں شائع کر رہا ہے، جیسی کہ یہ ہے تو ہمیں اس کوشش کے مفید و موثر ہونے میں شک ہے۔

کتاب پر قیمت نہیں۔ ضخامت ۔۔ ۸۰ صفحات ناشر شعبۂ نشر و اشاعت دارالعلوم نعمانیہ۔ گوجرانوالہ

قرآن پاک اور آسمانی کتابیں

اس کتاب میں کتاب اللہ اور احادیث شریفہ کے انوار میں علم و سائنس کے ظاہر کردہ معلومات کا سراغ لگانے اور ان کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ خلاء، ماوراء خلا اور افلاک و سماوات کے بارے میں جو انکشافات ہو رہے ہیں، ان کا قرآن پاک اور احادیث شریفہ کے ارشادات سے تصادم نہیں ہوتا۔

مصنفہ معین الدین رہبر فاروقی صفحات ۲۲۴۔ قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ { محمد رحیم الدین ایڈوکیٹ۔ ۸۵/۷ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی ۵
مؤلف سے بیرون یاقوت پورہ حیدرآباد دکن۔ انڈیا۔

لمحات (عربی)

حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفۂ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفٰی قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ ملا موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت دو روپے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی۔ صدر حیدرآباد (پاکستان)

حافظ سید ابوالخیر مدرسہ رحمانیہ عربیہ
کمبی پیٹ (حبیب نگر) جنوبی بنگلور ریاست میسور

افکار و آراء

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد اسمعیل صاحب بیارم پیٹھی کی ۱۳۱۱ھ میں ولادت ہوئی ۱۱ جولائی ۱۹۷۳ء میں آپ کا وصال ہوا۔ قدغاب قطب الصمد (شاکر) آپ کی تعلیم مولانا فقیر اللہ صاحب شاہپوری پنجابی المعروف بالمدراسی سے سات سال کی عمر سے ۲۷ سال کی عمر تک ہوتی رہی۔ مولانائے موصوف جنوب میں جماعت اہل حدیث کے بانی تھے۔ آپ نے معقول و منقول کی ساری کتابیں آپ ہی سے پڑھیں۔ پھر مولانا عبدالجبار غزنوی اور مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری وغیرہ کی صحبت میں رہے مسلم و مؤطا وغیرہ مولانا غزنوی کو سنائی تھی۔ حالانکہ آپ کے آباء و اجداد مشائخین بیجاپور سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر تربیت چونکہ اہل حدیث علماء کی صحبت میں ہوئی تھی، اس لئے اس کے اثرات غالب آگئے تھے۔ مگر اس وقت بھی آپ بقول مولانا یوسف کوکن مصنف امام ابن تیمیہ معتدل تھے۔ لیکن طالب علمی کے زمانہ ہی سے آپ کو تصوف وغیرہ سے خاصی دلچسپی رہی اس طرح آپ کی زندگی دو ادوار میں تقسیم ہو جاتی ہے پہلے دور میں جامعہ دارالسلام عمرآباد کی جو کہ آج جنوب کا ندوہ ہے، بنا کے محرک اول بنے جامعہ دارالسلام میں دس سال شیخ الحدیث اور صدر مدرس کے فرائض انجام دیئے۔ صحیح ابن حبان جو کہ اس وقت غیر مطبوعہ تھی اسکو حجاز سے نقل کروا کے منگوایا اور اس کی تصحیح میں لگے رہے، جس کا سلسلہ بعد میں چھوٹ گیا اور آج تک نامکمل ہے۔ آپ غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی کے پہلے قائدین سے ہیں لیکن ان سب ایام میں آپ مسئلہ وحدۃ الوجود کی تحقیق میں لگے رہے۔ آخر جب آپ پر اس کی حقیقت قرآن و حدیث کی روشنی میں ظاہر ہو گئی اور چاروں سلاسل کی خلافت ایک قطب وقت سے حاصل کر لی تو اپنے حلقوں میں اس کی اشاعت شروع کر دی۔ صرف اس مسئلہ کی تبلیغ و اشاعت کی وجہ سے آپ کو جماعت چھوڑنی پڑی۔ جس کا آپ کے اس خط سے اظہار ہوتا ہے جسے آپ نے امیر جماعت کو جواباً تحریر کیا تھا۔

" یہ فقیر خداداد بصیرت کے ماتحت اپنے مسلک کو اساس جماعت اسلامی قرار دیتا ہے اور کتاب و سنت سے اس مسلک کو بدلالۃ النص مؤید پاتا ہے۔ گویہ استدلال مخالف کی نگاہ میں صحیح نہ ہو اور صحیح نہ ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ تصور نظر پر وہ مطمئن ہے اور تصور نظر کا احساس بھی نہیں ہے زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے استدلال غامض ہے پس صحیح نہ ہونے کا حکم لگانا محض تحکم ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ رفع غموض کی کوشش کی جائے۔"

آخر میں آپ نے لکھا۔

" مختصراً یہ گذارش ہے کہ جماعتی سرگرمیوں پر میں اپنے مسلک کو ہرگز ہرگز ترجیح نہیں دے رہا ہوں۔ بلکہ میری ساری سرگرمی اساس جماعت کے مستحکم کرنے میں مصروف ہے اگرچہ موجودہ ارکان جماعت یا امیر جماعت اس کو جماعتی کام نہ سمجھتے ہوں۔ جماعت اسلامی صرف موجودہ ہیئت کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی شان اس سے بدرجہا اونچی ہے۔ چونکہ موجودہ ہیئت کو اس امر پر اصرار ہے کہ جماعت اسلامی موجودہ ہیئت ہی کے اندر منحصر ہے لہذا میں اپنے افکار کے ماتحت موجودہ ہیئت جماعت اسلامی کا ہمدرد رہ سکتا ہوں یا یہ کہ علماً و استدلالاً میری غلطی واضح کی جائے۔"

اس کی وجہ سے آپ کو جنوبی ہند کے اہل حدیث کا پورا حلقہ چھوڑنا پڑا۔ اور ذاتی طور پر لاکھوں کا مالی خسارہ آپ کو ہوا۔ جس کا اظہار آپ نے اس خط میں کیا ہے جسے مولانا صفوۃ الرحمٰن صاحب "ادارۂ الحق" حیدرآباد دکن کو ان کے ایک خط اور رسالہ "اصل ثابت" مولانا صوفی نذیر احمد کے جواب میں لکھا تھا۔

" صوفی نذیر احمد لاکھ صاحب احوال و مواجید لاکھ صاحب رشد و ہدایت لاکھ کثیر المطالعہ اور وسیع المعلومات سہی لیکن مکتب حقائق کے ابھی طفل مکتب یا پیر نابالغ ہیں وہ جلد باز اور عجیب پندار میں مبتلا ہیں۔ اور محض لفاظی سے میدان جیتنا چاہتے ہیں۔ یہی حال جناب والا کا ہے۔ تحسین ناشناس سے آپ لوگ مغرور ہو کر دنیا کو بھی اپنے جہل مرکب کی طرف دعوت دینا چاہتے ہیں۔ حقائق قرآنی کی ہوا بھی آپ لوگوں کو نہیں لگی۔ یاد رکھئے کہ جب تک علوم ابن عربی اور علوم ابن تیمیہ و مجدد صاحب میں کامل تطبیق نہیں دی جائے گی۔ یکطرفہ جہل مرکب سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے لئے کسی محقق قرآن کی طویل صحبت درکار ہے بشرطیکہ جہل مرکب کے پندار سے خالی الذہن ہو کر استفادہ کیا جائے۔ بلا مبالغہ تیس سال کی محنت، جانی و مالی ایثار و قربانی اور بلا مبالغہ ہر قسم کے رطب و یابس احوال و مواجید کی بدنامی سے گزرنے کے بعد ہی

یہ راہ تطبیق ہمیں نصیب ہوئی الحمد للہ ثم الحمد للہ آپ ہی غور کر لیجیے کہ راہ تطبیق حق ہو سکتی ہے یا راہ تفریق۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "مصدق لما بین یدیہ" ہو کر تشریف لائے نہ کہ مفرق۔ تطبیق ہی ایک میزان فاروقی بین الحق والباطل ہے۔

بہر حال یہ ایک طویل تاریخ ہے اور آپ کے ایسے سینکڑوں خطوط کا جو علماء وقت کے نام ہیں اور جن میں بڑے بڑے اکابر شامل ہیں ذخیرہ محفوظ ہے اور جو شخص بقول شاہ ولی اللہ مفہمین کے اعلیٰ منازل پر فائز ہو وہی اس فلسفہ کی تحصیل اور اس کی علمی تطبیقات کا حامل ہو سکتا ہے۔ آپ مجسم اخلاق اور صحابہ کرام کے دور کی زندہ مثال تھے۔ قرآن و حدیث سے آپ کو خاص شغف تھا۔ آپ نے ۴۰ سال کی عمر میں صرف چھ ماہ کے عرصے میں قرآن حفظ کیا تھا۔ اور پھر معلوم نہیں کتنے ہزار مرتبہ آپ نے قرآن کا دورہ کیا۔ آپ کو ہر علم میں کمال حاصل تھا۔ یہاں یہ لکھ دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے آپ سے حدیث پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ جب میں جاہل تھا تو ایک مخلوق میرے ساتھ تھی اب جب کچھ ملا ہے تو سارے روٹھ گئے ہیں شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کے متعلق اپنا عجز ظاہر کیا اور آپ کے ساتھ حضرت کی جو دو تین صحبتیں ہوئیں انہیں اپنے بہترین اوقات اور باعث ازدیاد علم سے تعبیر کیا مختصراً آپ طریقت کے علماً و حالاً امام تھے اور عرفاً اور اصلاً تحقیقات میں شیخ تھے آخر جب آپ کو اپنے قدیم حلقہ سے پوری مایوسی ہو گئی تو آپ نے ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں ۶۲ سال کی عمر میں مدرسہ کی بنا ڈالی اور آخری سانس تک اس کو اپنے خون سے سینچا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ مدرسہ ترقی پذیر ہے اور انشاء اللہ المستعان مستقبل عظیم ہوگا۔ آپ نے اس مدرسہ کی بنیاد ہی صرف اس غرض سے رکھی کہ تمام مسالک میں اتحاد پیدا ہو، اور شرقی اور مغربی علوم کے علماء میں جو بعد المشرقین پیدا ہو گیا ہے اس کو اس مسئلہ سے پاٹا جائے اور ایک دوسرے کو قریب کر لیا جائے۔

بدقسمتی سے جنوبی ہند کے اکثر فضلاء قلمی قوت سے محروم رہے ہیں۔ پھر بھی آپ کا غیر مطبوعہ ذخیرہ حاشیوں مکتوبات اور نامکمل مضامین کی شکل میں عربی اور اردو میں وافر ہے جسے مرتب کرنا کئی آدمیوں کا کام ہے آپ کی خواہش تھی کہ قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تشریح لکھوں جو ظاہر ہے بالکل الوکھا انداز لئے ہوئی ہوتی مگر ناقدری زمانہ نے اس کی فرصت نہیں دی آپ کا ایک مطبوعہ ۴۲ صفحاتی رسالہ مسماۃ البشریٰ مرسلت ہے۔ جس کا ایک نسخہ باقی رہ گیا تھا اور جس کو مصنف نے اصلاح و ترمیم کے بعد دوسرے ایڈیشن کیلئے محفوظ کر رکھا تھا۔ امید ہے کہ آپ مطالعہ کے بعد بحفاظت واپس بذریعہ رجسٹری فرما دیں گے "البشریٰ" کو آپ نے تمام علماء کی خدمات میں ارسال کیا۔ مگر کسی کو لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی۔ والسلام

مطبوعات دائرۃ المعارف العثمانیۃ
بحیدرآباد الدکن، الھند

التفسیر

			پیسے	روپے
اعجاز القرآن فی تاویل ام القرآن	صدرالدین القونوی	مجلد	-	۸
اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن	ابن خالویہ	؍؍	-	۱۱

اصول الحدیث

الاعتبار	ابوبکر الحازمی	؍؍	۵۰	٦
الکفایۃ	الخطیب البغدادی	؍؍	۷۵	۷

الحدیث

الاتحافات السنیۃ فی الاحادیث القدسیۃ	محمد المدنی	؍؍	۲۵	۵
شرح تراجم ابواب بخاری	شاہ ولی اللہ	؍؍	-	٤
کنز العمال جدید الطبع	علی المتقی الھندی من جزء الاول الی الحادی العشر	؍؍	—	۳۰۰
المعتصر من المختصر	القاضی یوسف الحنفی کامل ۲ جزء	؍؍	۵۰	۱۵

الرجال والاسانید

الجمع بین رجال الصحیحین	ابن القیسرانی فی جزئین	؍؍	۵۰	۱۵
کتاب الکنی والاسماء	ابو بشیر الدولابی	؍؍	—	۱۵

السیر والتراجم
الف۔ السیر

فتح المتعال	احمد المغربی	؍؍	۷۵	۷

الفقہ

احکام الوقف	ھلال البصری	؍؍	۵۰	٦
الامالی	الامام محمد الشیبانی	؍؍	—	٤

الکلام والعقائد (الف الکلام)

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
الاربعین فی اصول الدین	فخر الدین رازی	مجلد	۲۵	۱۰
استحسان الخوض	ابوالحسن الاشعری	″	۳۷	—
کتاب الروح	ابن القیم	″	۵۰	۱۶

(ب) العقائد

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
الرسائل السبع		″	۵۰	۶
شرح الفقه الاکبر ۱	ابو منصور الماتریدی			
شرح الفقه الاکبر	المغنیاوی			
الجوهرة المنیفة	ملا حسین اسکندری			
کتاب الابانة	ابوالحسن الأشعری			
الغنیمة الاولی والثانیة	عنایت علی			
الذب عن الاشعری	ابو القاسم درباس			
الرسائل التسع	جلال الدین السیوطی	مجلد	—	۱۵
مسالک الحنفاء	″			
الدرج المنیفة - المقامة السندسیة	″			
التعظیم والمنة - نشر العلمین	″			
السبل الجلیلة - انباء الاذکیاء	″			
تنزیه الانبیاء تبیض	″			
شفاء السقام	تقی الدین السبکی	مجلد	-	۹

التصوف والمتعلقات

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
الاربعین فی التصوف	ابو عبدالرحمن السلمی	″	۷۵	—
السمط المجید	صفی الدین القشاشی	″	۳۷	۴
المنحة السراء	ارتضا علی خان	″	—	۳

التاریخ والجامع العلوم

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
کتاب المحبر	ابو جعفر البغدادی	″	۳۰	۱۰
مرآة الزمان فی تاریخ الاعیان المجلد الثامن - جزء الاول والثانی	یوسف بن قزاوغلی سبط ابن الجوزی	″	—	۳۳
ذیل مرآة الزمان	قطب الدین الیونینی من جزء الاول الی الرابع	″	-	۷۱

المنتظم مع فہرس الاسماء			پیسے	روپے
(من جزء الخامس الی العاشر)	ابو الفرج ابن الجوزی	مجلد	۵۰	۴۶

جامع العلوم

معجم الأمكنة	معین الدین الندوی	″	۵۰	۲

الادب وما يتعلق به

احسن السبك فی شرح تفانبك	شرح معلقة امرئ القیس لمحمد یار جنگ	″	-	۴
الامالی الشجریة	ابن الشجری	″	۰	۱۳
كتاب الامالی مع الفهارس	ابو عبد الله الیزیدی	″	۵۶	۵
كتاب الحماسة	ابن الشجری	″	۵۰	۶
كتاب الخيل	ابو عبیدة معمر بن المثنی	″	۲۵	۵
كتاب المجتنی	ابن درید	″	۸۱	۶
مصداق الفضل	شهاب الدین الدولة آبادی	″	۲۵	۵

اللغة والنحو والمعانی

كتاب الافعال مع الفهرس	ابن القطاع كامل ۳ اجزاء	″	—	۳۰
كتاب الامثال	زید بن رفاعة	″	۳۷	۱
جوامع اصلاح المنطق	زید بن رفاعة	″	۶۳	۴

النحو والمعانی

الاشباه والنظائر	جلال الدین السیوطی فی اربع الاجزاء	″	-	۲۶

الفلسفة وما بعد الطبيعيات

الكتاب المعتبر	هبة الله البغدادی ۳ اجزاء	″	۵۰	۱۹

ما بعد الطبيعيات

رسائل ابن رشد	ابن رشد	″	۵۰	۱۶
رسائل ابن سینا	ابو علی ابن سینا	″	-	۴
رسائل الفارابی	ابو نصر الفارابی	″	۵۰	۶

الریاضیات والهیئة

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
رسائل ابن سنان	ابراهیم بن سنان الحرانی	مجلد	۵۰	۱۱
رسائل ابن قرة	ثابت بن قرة الحرانی	"	۳۷	۳
رسائل ابن الهیثم	ابن الهیثم	"	۵۰	۶
رسائل البیرونی	ابوریحان البیرونی	"	۵۰	۱۶
رسائل ابی نصر ابن عراق	ابو نصر منصور ابن عراق الجیلی	"	۲۵	۳۰
الرسائل المتفرقة فی الهیئة للمتقدمین و معاصری البیرونی		"	۵۰	۱۶
الرسائل السبع للطوسی	نصیرالدین الطوسی	"	۷۵	۷
الرسائل التسع للطوسی	"	"	-	۱۰
صور الکواکب	ابوالحسین عبدالرحمن الصوفی	"	-	٤٠
کتاب القانون المسعودی	ابوریحان البیرونی ۳ اجزاء	"	۵۰	٥٤
کتاب الانواء	ابن قتیبة	"	۶۲	۱٤

العلوم المختلفة

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
تنقیح المناظر فی علم المناظر	کمال الدین الفارسی فی جزئین	"	۵۰	۱۵
الازمنة والامکنة فی الزمان والمکان	ابو علی المرزوقی		۸۷	۸
انباط المیاه الخفیة	ابوبکر الکرخی	"	-	٤
الجماهر فی معرفة الجواهر	ابوریحان البیرونی	"	۵۰	۶
کتاب میزان الحکمة	السید عبدالرحمن الخازنی	"	۵۰	۹
تذکرة السامع (فی ادب) العالم والمتعلم	ابن جماعة الکنانی	"	-	۵
مناظرات الرازی	فخر الدین الرازی	"	۷۵	۲

الطب

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
کتاب العمدة فی صناعة الجراحة	ابن القف	"	٠	۱٤
المختارات	ابن هبل (فی اربعة الاجزاء)	"	۵۰	۳۱
کتاب الحاوی فی الطب	ابی بکر محمد بن زکریا الرازی	"	-	۲۶۰

المتفرقات

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
تذکرۃ النوادر من المخطوطات العربیۃ		مجلد		ے
مقالۃ تاریخیۃ فی العربیۃ		ـ	۷۵	-
الرسالۃ العلمیۃ		ـ	۵۰	-
المباحث العلمیۃ		ـ	۶۲	ع
لمعات دائرۃ المعارف العثمانیۃ		″	۳۱	۱
کتاب الھند	ابوریحان محمد بن احمد البیرونی	ـ	-	ع
دیوان ابن سناء الملک	ابن سناء الملک	ـ	-	۵۵
الموضح لاوھام الجمع والتفریق	الخطیب البغدادی کاملاً ۲ جز	″	-	۳۵
بیان خطا البخاری فی تاریخہ	ابن ابی حاتم الرازی	″	۵۰	۱۱
الاکمال	ابن ماکولا ثلاث الاجزاء	″	-	۹۲
کتاب العمل بالاسطرلاب	عبدالرحمن الصوفی	″	۵۰	۲۲
المستقصی فی امثال العرب	الزمخشری (کاملاً فی جزئین)	″	-	۵۵
الانساب	السمعانی (ثلاث الاجزاء)	ـ	-	۱۰۰

مطبوعات اردو

کتاب	مصنف		پیسے	روپے
کتاب الفلاحت	ابوزکریا بن محمد شبلی ترجمہ	″	۳۷	۱۲
(کاملاً فی جزئین)	سید محمد ہاشم ندوی	″	-	۱
مقالہ تحفظ علوم قدیمہ	مرتبہ سید محمد ہاشم ندوی	″	-	۱

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

اغراض ومقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت واشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہوسکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

غلام مصطفیٰ قاسمی پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپو کر شائع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم
ماہنامہ
شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی ○ صدر حیدرآباد

قیمت سالانہ :- آٹھ روپے

فی پرچہ :- پچھتر پیسے

جلد ۳	مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۶ء ذی قعدہ سنہ ۱۳۸۵ھ	نمبر ۱۰

فہرست مضامین

شذرات

کم وبیش آج دنیا کے ہر ملک میں ایک عام اضطراب پایا جاتا ہے۔ یہ اضطراب سیاسی و معاشی بھی ہے، معاشرتی و اخلاقی بھی ہے۔ اور فکری و جذباتی بھی۔ اس سے ہر ملک، ہر قوم اور ان کا ہر حصہ متاثر ہے۔ اور مسلمان جو صدیوں کی گہری نیند سے ابھی ابھی جاگے ہیں، اور اپنے کو زندگی کے ہر میدان میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے پاکر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ وہ آگے بڑھیں اور ترقی کریں، ان میں یہ اضطراب اور بھی زیادہ اور ہمہ گیر ہے۔

ہمارے نزدیک یہ اضطراب زندگی کی علامت ہے، زوال اور انتشار کا پیش خیمہ نہیں۔ بے شک ہم مسلمان زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے۔ لیکن اب ہمارے ہاں کا کوئی طبقہ ایسا نہیں، جس میں اس طرح پیچھے رہ جانے کا احساس نہ ہو، اور زیادہ یا کم اس کمی کو دور کرنے کا اس میں جذبہ نہ پیدا ہو گیا ہو۔

ہم مسلمانوں کے ہاں اس ہمہ جہتی و ہمہ گیر اضطراب کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نہ صرف مادی ترقی اور سائنسی وفنی علوم میں دوسری قوموں سے پیچھے ہیں، بلکہ ہمارا معاشرہ، ہماری جذباتی افتاد اور ہمارا فکری مزاج، جو ہمیں اپنی ملی تاریخ سے ورثے میں ملا ہے، اس میں اور موجودہ زمانے اور اس کے حالات میں نزاع ہے، موافقت نہیں۔ تضاد ہے ہم آہنگی نہیں۔

بات یہ ہے کہ مسلمان ان کے دینی معتقدات، ان کی اخلاقی و روحانی قدریں، ان کی تہذیبی و معاشرتی روایات اتنی سطحی اور کمزور نہیں کہ وہ آسانی سے عہد حاضر کے غلبے کے سامنے ہتھیار ڈالدیں اور ناپید ہونا منظور کرلیں۔ ان کی جڑیں ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں بڑی گہری ہیں۔ اب ایک طرف ہمارے دینی معتقدات، ہماری اخلاقی و روحانی قدریں اور تہذیبی و معاشرتی روایات ہیں، جو ہماری صبح شام

کی زندگی میں مؤثر ہوتی ہیں اور ہم ان کا شعوری اور غیر شعوری طور پر اثر قبول کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف نیا زمانہ، اس کے تقاضے، اس کی ضرورتیں، بلکہ اس کی جبریت اور قہریت ہے، جسے نظرانداز کرنا ناممکن ہے غرض ہم مسلمانوں میں اس وقت جو اضطراب ہے، اس کی ایک بڑی وجہ دراصل ان دو مؤثرات کی یہ باہمی کشمکش ہے

سائنسی و فنی علوم کی تحصیل اور معاشی و صنعتی ترقی کی ضرورت سے آج ہم میں سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن چند افراد یا مختصر جماعتوں کا تو سوال الگ ہے، مجموعی طور پر مسلمان اس کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہوں گے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اپنے دینی معتقدات، اپنی اخلاقی و روحانی قدروں اور تہذیبی و معاشرتی روایات سے بے تعلق ہونا منظور کر لیں۔ اور یہ صحیح بھی نہیں کہ اول الذکر کے حصول کے لئے کسی طرح بھی آخرالذکر کا انکار لازمی ہے۔ ہمیں آج کے سائنسی و فنی علوم بھی حاصل کرنا ہیں بلکہ ان میں اتنی مہارت پیدا کرنا ہے کہ ہم آج کی طرح ان میں دوسروں کے محتاج نہ رہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری یہ صرف خواہش نہیں، بلکہ فطری ضرورت ہے اور یہ کہنا اور بھی زیادہ صحیح ہے کہ ہم بحیثیت ایک انسانی جماعت کے اس پر مجبور ہیں کہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اپنے معتقدات و روایات کے تسلسل کو قائم رکھیں۔ کیونکہ ایک فرد اور قوم کا صحت مند، نتیجہ خیز اور مفید وجود صرف اسی طرح ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماضی کے تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے حاضر کے پہلو بہ پہلو آگے بڑھیں۔

ہم یہ مقصد کس طرح حاصل کریں؟ آج ہمارے یہاں سب سے مشکل سوال یہ ہے۔ بے شک نئے زمانے کی ضرورتوں اور جدید علوم کی اہمیت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے اکثر روشن خیال علمائے دین اپنے عربی مدارس کے ساتھ ساتھ ہائی اسکول کھول رہے ہیں، جن میں انگریزی و جدید مضامین پڑھائے جاتے ہیں نیز عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ میں دینی علوم کی تحصیل کے بعد انگریزی زبان پڑھنے کا رجحان ترقی کرتا جا رہا ہے۔

ماضی کی روایات صالحہ کو حاضر کی ضرورتوں کے ساتھ اسی طرح سمونا۔ یہ ایک اچھی فال ہے۔ اور اس سے امید بندھتی ہے کہ جہاں ہمارے ہاں جمود ٹوٹے گا، وہاں ہم تجدید میں اپنے ماضی سے بے تعلق نہیں ہوں گے، اور ہماری ترقی متوازن ہوگی۔

لیکن اس سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے‘ ایک تو اس کا دائرہ بہت محدود ہے‘ اور دوسرے اس کام کی رفتار حد سے زیادہ سست ہے اور ڈر یہ ہے کہ اس طرح زمانہ بڑی سرعت سے آگے بڑھ جائے گا‘ اور ہم پیچھے کے پیچھے رہ جائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ پیش نظر مقصد کا ایسی نجی کوششوں سے حاصل ہونا مشکل کیا ناممکن ہے۔ ہمارے روشن خیال علماء جدید تعلیم اور دینی تعلیم کو ایک مرکز میں جمع کرنے کی جو سعی فرما رہے ہیں‘ وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے لیکن اس کی افادیت معلوم۔ اس کام کو وسیع پیمانے پر اور زیادہ تیز رفتاری سے ہونا چاہیئے۔

مغربی پاکستان میں محکمہ اوقاف کا قیام اور وزارت کے علاوہ خاص طور سے مساجد اور دینی تعلیم کو ایک حد تک اپنے ہاتھ میں لینے کے سلسلے میں اس نے جو مثبت قدم اٹھایا ہے ہمارے نزدیک مذکورۂ بالا مقصد کو حاصل کرنے کی یہ صحیح راہ ہے‘ یہ تنظیم کا دور ہے۔ اور تنظیم کا دائرہ جتنا بھی وسیع ہوگا اس کے نتائج بہتر نکلیں گے۔ اس وقت ہم ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے پنج سالہ منصوبے کے ذریعہ اپنی "معیشت قومی" کو منظم کرنے اور اسے ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں‘ اور آج "معیشت قومی" کے تحت انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ آتا ہے یقیناً اس طرح کی منصوبہ بندی اس دور کی ضرورت ہے اور ہر ترقی پذیر ملک صحیح معنوں میں اس پر عمل پیرا ہو رہا ہے۔ چنانچہ کسی ترقی پذیر ملک کا اس منصوبہ بندی کے بغیر صحیح معنوں میں ترقی کرنا خیال خام سمجھا جاتا ہے! اس طرح ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمارے ہاں مذکورۂ بالا مقصد کے مطابق دینی تعلیم اور قومی زندگی کے دینی پہلوؤں کی ترقی کے لئے منصوبہ بندی کے اصول پر سوچا جائے۔ محکمہ اوقاف مغربی پاکستان نے اس کام کی شروعات تو کر رکھی ہے لیکن اب ضرورت اس کی توسیع اور اس کی رفتار کو تیز کرنے کی ہے۔

جدید تعلیم کے نصاب تعلیم و نظام کار‘ طباعت و اشاعت کے ذرائع‘ اخبارات‘ رسائل‘ کتابوں اور ریڈیو‘ غرض عوام کی تعلیم و تربیت اور ان تک ابلاغ کے جتنے بھی وسائل ہیں‘ ان پر ایک نہ ایک حد تک قومی حکومت‘ نگرانی کرتی ہے‘ لیکن منبر‘ وعظ‘ عربی مدارس اور دینی تعلیم جو تربیت و ابلاغ کے بڑے دوررس اور موثر عوامی ذرائع ہیں‘ وہ ہر قسم کی نگرانی‘ تنظیم اور منصوبہ بندی سے آزاد ہیں۔

محکمہ اوقاف کو اب ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہیئے‘ اور اسے ملک و قوم کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کا منصوبہ بنانا چاہیئے۔

اسلامی قانون کی تدوین

طفیل احمد قریشی

(۱)

قوموں کی زندگی میں قانون اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کا قانون ہی اس کے سیاسی سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ انسانی معاشرہ میں پہلے تو کچھ نظریاتی اصولوں کا تعین ہوتا ہے۔ پھر زمانے اور حالات کے ساتھ ساتھ ان اصولوں کی روشنی میں قانون وضع کئے جاتے ہیں۔ اور یہ قوانین افراد کو چند ضابطوں کا پابند کر دیتے ہیں۔

مذہبی نقطہ نظر سے وہ اصول جن کی روشنی میں انسان اپنے قانون کی تدوین کرتا ہے، صرف الہامی ہو سکتے ہیں اس لئے کہ انسان کے وضع کردہ اصول اس کے اپنے حالات یا مسلمات پر مبنی ہوتے ہیں، جنہیں حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مذاہب عالم میں جن میں شریعت یا قانون کا تصور موجود ہے، قانون کی اساس مذہبی کتب رہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ مذاہب کا قانون جس میں اتنی لچک موجود نہ تھی کہ زمانہ یا حالات کا ساتھ دے سکے یا تو غیر معروف ہو گیا یا پھر اتنا بدلا کہ اس میں مذہب کے قانون کا دور دور تک اثر نہ رہا، اور اس کی جگہ نئے قانون نے جنم لے لیا۔ جسے حالات نے مزید سہارا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب اور سیاست، قانون اور روحانیت، دین اور دنیا الگ الگ راستے اور مختلف راہیں متصور ہونے لگیں۔

چھٹی صدی عیسوی کے بعد قرآن مجید، سنت نبوی، آثار صحابہ اور اجماع کے تحت جو اسلامی قانون مدون ہوا۔ اس میں ایک طرف تو روح مذہب کو برقرار رکھا گیا اور دوسری جانب حالات اور نئے تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اسلامی قانون کی تاریخ تدوین اس کی جامعیت کا جائزہ ہے جسے

اس وقت تک محسوس نہیں کیا جاسکتا جب تک دوسرے عالمی قوانین کا تقابلی مطالعہ ہمارے سامنے نہ ہو۔ مذہب کا اثر ان قوانین پر کس حد تک رہا۔ سیاسی حالات ان حالات پر کہاں تک غالب رہے؟ ان قوانین نے انسانی معاشرہ میں "سماجی مساوات" کے اصول کو کس حد تک برقرار رکھا؟ غرض یہ کہ ان اور ایسے ہی دوسرے سوالات کی روشنی میں جب ہم عالمی قوانین کا مطالعہ کریں گے اور پھر اسلامی قانون کی "تدوین کا جائزہ لیں گے تو یہ دعویٰ حق بجانب ہوگا کہ اسلامی قانون میں اتنی لچک ہے کہ ہر زمانے کے لوگ اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ اور ہر قسم کے حالات میں اس کی افادیت کم نہیں ہوسکتی۔

عالمی قوانین کے تقابلی مطالعہ میں تفصیلی جائزہ ظاہر ہے طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لئے چند مشہور قوانین کے سرسری جائزہ پر ہی اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے قانون روما پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

قانونِ رُوما

تاریخی پس منظر

رومی تہذیب کا قانون چونکہ مختلف سیاسی تبدیلیوں اور حالات سے متاثر ہوا، اس لئے اس کے مطالعہ سے قبل اس کے تاریخی پس منظر کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔ رومی تہذیب کو تاریخی اعتبار سے تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ عہد ملوکیت جس کا زمانہ ۷۵۳ھ ق۔م سے ۵۰۹ھ ق۔م قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ عہد جمہوریت جو ۵۰۹ھ ق۔م سے ۳۱ھ ق۔م تک رہا

۳۔ عہد سلطنت عظمیٰ جس کا زمانہ ۳۱ھ ق۔م سے ۵۲۷ء یعنی دورِ ولادت رسالت مآب تک رہے۔

پہلا دور۔ عہد ملوکیت

رومی تہذیب کے اس ابتدائی دور میں قانونی لحاظ سے لوگوں کو چار حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا

۱- وہ لوگ جن کے آباؤ اجداد روما میں رہتے آئے اور فی الحقیقت جو بلا اختلاف شہری حقوق رکھتے تھے۔ ایسے لوگوں کو پا پولس کہا جاتا تھا۔ یہ ہر لحاظ سے آزاد متصور ہوتے تھے۔

۲- دوسری قسم کے لوگ آزاد تو متصور ہوتے تھے مگر چونکہ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق بیرونی قبائل یا علاقوں سے تھا، اس لئے ان سے بعض بنیادی اختیارات، حقوق و فرائض وغیرہ میں امتیاز رکھا جاتا تھا۔ اس قسم کے لوگ "کلائنٹس" (Clients) کہلاتے تھے۔

۳- تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جنہوں نے روما میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور کاشت کاری اور صنعت وغیرہ پیشوں کو اپنائے ہوئے تھے گو کہ حکومت اور قانون سازی میں ان کا نظریاتی طور پر کوئی دخل نہ تھا مگر عملاً روما کی سیاست اور اس کے قانون کے ارتقائی منازل میں اس طبقے نے اہم کردار انجام دیا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کو پلیبین (Plebeians) کہا جاتا تھا۔

۴- چوتھا گروہ غلاموں (Slaves) کا تھا جو یا تو پیدائشی طور پر غلام ہوتے یا بین الاقوامی قانون انہیں غلام قرار دے دیتا۔ یا پھر وہ خود قانون مروجہ کی مختلف دفعات کے تحت غلام بن جاتے یا بنا لئے جاتے تھے۔ رومی تہذیب کے اس پہلے دور میں اقتدار اعلیٰ کا مالک بادشاہ ہوتا تھا۔ جو قانون کے نفاذ کے لئے تین سو چیدہ لوگوں پر مشتمل ایک کونسل سے مشورہ کرتا تھا یہ سینٹ یا کونسل صرف مشورہ دیتی تھی۔ اور اس کی پابندی بادشاہ کے لئے ضروری نہ ہوتی تھی۔

اس دور میں رومی عوام کی اپنی ایک اسمبلی بھی ہوتی تھی جسے کومیٹیا کیوریاٹا (Comitia Curiata) کہا جاتا تھا۔ اس اسمبلی کا کام یہ تھا کہ وہ مذہبی اور خاندانی مسائل پر نظر رکھے اور مختلف امور میں اپنے فیصلے یا تجاویز سینٹ کو پیش کرے جہاں ان پر نظر ثانی کی جاتی تھی اور بادشاہ کی منظوری سے ان فیصلوں یا تجاویز کو قانونی حیثیت دی جاتی تھی۔ اس طرح نافذ ہونے والے قوانین کو "لیجس کیوریٹا" Leges Curiata یا "ریگیا" کہا جاتا تھا۔ اور ان قوانین کے مجموعوں کو "جوس پیپریانم" (Jus Papirianum) کہا جاتا تھا۔

عرصہ دراز تک اسی طرح قوانین بنتے رہے پھر ضرورت محسوس کی گئی کہ انہیں تحریری صورت دی جائے۔ اس کے لئے دس چیدہ قانون دانوں پر مشتمل ایک بورڈ بنایا گیا جسے ڈیسمو وِرے Decem کہا جاتا تھا۔ یہ بورڈ ۴۵۹ء ق۔م یا ۴۵۱ء ق۔م میں قائم کیا گیا۔ اس بورڈ نے روما کے رسم و رواج اور فیصلوں سے مرتب دس قانونی چارٹ تیار کئے جن میں دو کا بعد میں اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ بارہ جدول پر مشتمل یہ قانونی مجموعہ قانون روما کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔

اس عہد کے وسط میں بادشاہ نے قانون کے نفاذ کے لئے مختلف عہدہ دار مقرر کئے جنہیں کچھ اختیارات بھی دیئے گئے۔ عدلیہ کے لئے جو جج مقرر کئے گئے انہیں "پرائیٹرس" (Practors) کہا جاتا تھا۔ مردم شماری اور افراد کے چال چلن اور دیگر شہری ذمہ داریوں پر مبنی ریکارڈ رکھنے کی ذمہ داری "سنیرز" کے سپرد کی گئی۔ خزانہ اور مالیات کے لئے "کوائسٹرس" (Quaestors) کا تقرر ہوتا تھا۔ عوام کے مفادات مثلاً عمارات کی نگرانی، مارکیٹ میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی نگہداشت وغیرہ کے کام "ایڈلز" (Aediles) انجام دیتے تھے ان عہدوں کے فرائض اور اختیارات دوسرے دور میں اور بڑھ گئے۔

دوسرا دور یا عہدِ جمہوریت

بادشاہی دور کے آخری بادشاہ تارکوین (Tarquin) کے بعد روما میں جمہوریت کا آغاز ہوا لیکن اس عہد کے ابتدائی زمانے کو جمہوریت نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ نواب اور معززین حاکم یعنی پیٹریین (Patreians) حاکم رہے اور پیشہ ور یعنی پلیبین (Plebeians) اسی طرح محکوم۔ یہاں تک کہ عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کے عہدے عرصہ دراز تک ان کے لئے بند رہے۔ رومی قانون کے بارہ جدول

لہ ڈیسم (Decem) کے معنی ہیں دس اور وِری (Viri) آدمی کو کہتے ہیں یعنی دس افراد پر مشتمل ایک بورڈ۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری صفحہ ۳۰۸ آکسفورڈ پریس ۱۹۶۱ء

تک میں پیٹریشین اور پلیبین کے درمیان شادی کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طبقوں میں تصادم ہو گیا اور آخر میں کامیابی دوسرے طبقہ کو ہوئی۔

قانون کی تشکیل اور نفاذ کے طریقۂ کار کے لئے اس دور میں تین بڑے ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

۱۔ کومیٹیا سنچوریاٹا Comitia Certuriata

۲۔ کومیٹیا ٹریبوٹا Comita Tributa

۳۔ سینٹ Sanate

حقوق کے لحاظ سے پیٹریشین اور پلیبین کے ایک دوسرے سے قریب ہونے کے بعد رومی معاشرہ دولت کی بنیاد پر تقسیم ہو گیا اور اسی لحاظ سے نمائندگی کا اصول بنایا گیا۔ اس طرح مختلف طبقوں کے نمائندوں پر مشتمل رومی عوام نے جو اسمبلی بنائی اسے "کومیٹیا سنچوریاٹا" کہا جاتا تھا۔ یہ اسمبلی امن، جنگ دستوری اور عوامی مسائل کے بارے میں فیصلے کرتی تھیں جنہیں لیجس پاپولی (Leges Populi) کہا جاتا تھا۔

پلیبین کی حقوق کے لئے جد و جہد میں سب سے بڑی کامیابی "کومیٹیا ٹریبوٹا" کا قیام ہے۔ جسے ابتداء میں صرف اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ وہ پلیبین کے آپس کے گھریلو مسائل کا تصفیہ کیا کرے لیکن ۴۴۹ء ق۔م کے "لیکس ویلیریا ہوریٹیا" (Lax Valeria Horatia) کے مطابق اس کا تعلق کومیٹیا سنچوریاٹا اور سینٹ سے کر دیا گیا اور اس کے قانونی احکام کے نفاذ کا دائرہ اختیار بھی بڑھا دیا گیا۔ سنہ ۳۳۹ء ق۔م میں "لیکس پبلیلیا" (Lax Publilia) کے مطابق اس کے اختیارات اور زیادہ ہو گئے۔ سنہ ۲۸۷ء ق۔م میں "لیکس ہورٹینیا" کے مطابق اس ادارے نے باقاعدہ با اختیار مقننہ کے ایک شعبہ کی صورت اختیار کر لی چنانچہ اس ادارہ کے وضع کردہ یا نافذ کردہ قوانین کو "پلیبیسیٹا" (Plebiscita) کہا جاتا تھا۔

سینیٹ کو اس دور میں بھی برقرار رکھا گیا لیکن اس کا کام صرف قانونی امور میں مشورہ یا کسی اہم عوامی مسئلہ پر رائے دینے تک محدود رہ گیا جنہیں سینیٹس کنسلٹا ( ) کہا جاتا تھا۔

تیسرا دور یا عہدِ سلطنت عظمیٰ

آگسٹیوس قیصر کے پوتے جولیس سیزر نے سنہ ۳۱ ق م میں شہنشاہیت کی بنیاد رکھی اور آگسٹس کا لقب اختیار کیا۔ عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے رومی عوام کی اسمبلیاں توڑ دیں اور ان کی جگہ سینیٹ کے اختیارات میں توسیع کردی، جس سے اس ادارہ کی اہمیت بڑھ گئی۔ رومی شہنشاہ اپنے فرامین اور خواہشات کو قانون کا درجہ دینے کے لئے اسی سینیٹ کا سہارا لیتے تھے تاکہ وہ عوام میں مقبول رہ سکیں اور لوگ شہنشاہوں کو جمہوریت پسند سمجھ سکیں۔ چنانچہ سنہ ۱۴ء سے سنہ ۲۱۱ء تک اس سینیٹ کی کارکردگی بروئے زوروں پر رہی۔ لیکن جوں جوں شہنشاہوں کے پاؤں جمتے رہے اور سیاسی لحاظ سے وہ مستحکم ہوتے رہے سینیٹ کی وقعت گرتی رہی اور بالآخر جب عملی طور پر شہنشاہ انتظامیہ، عدلیہ اور فوج کا مکمل سربراہ بن گیا تو مقننہ کی حیثیت بھی ختم ہوگئی اور سینیٹ کی بجائے صرف "لیکس ریگیا" (Lex Regia) یا شاہی قانون نے اہم ترین مقام حاصل کرلیا۔

اس دور میں قانون سازی کا ایک نیا طریقہ رائج کیا گیا وہ یہ کہ شہنشاہ چند قانون دانوں کا تقرر کرتا تھا جو مختلف نہیہ یا تشریح طلب قانونی مسائل پر تحریراً اپنی آراء کا اظہار کرتے تھے۔ اور جنہیں جج اپنے فیصلوں میں قبول کرتے تھے ان آراء کو ہم قانون روما کی فقہی تشریح کہہ سکتے ہیں۔ ان قانون دانوں کو "جورس کنسلٹی" (Juris Consulti) کہا جاتا تھا۔ ابتداء میں مذہبی پیشوا ہی فقہی تشریح کرتے تھے۔ جن کا عہدہ سرکاری نہیں ہوتا تھا۔ آگسٹس (سنہ ۳۱ ق.م تا سنہ ۱۴ء) نے ان کی اہمیت اور بڑھادی اور انہیں سرکاری طور پر نامزد کیا جانے لگا۔ رومی قانون کے ان شارحین کے اختلاف رائے کی وجہ سے قانون کے دو مکاتب فکر پیدا ہوگئے۔ کیپیٹو (Capito) کے پیروکار سبینین (Sabinian) کا شمار قدامت پسندوں میں ہوتا ہے اور لیبیو (Lebeo) مکتب فکر کے لوگ جنہیں پروکیولین (Procuilian) کہا جاتا ہے تجدید پسند سمجھے جاتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان قانونی آراء و تشریحات کا ذخیرہ جمع ہوتا گیا یہاں تک کہ تھیوڈوسیوس ثانی (Theodosieos II) نے سنہ ۴۲۶ء میں پانچ قانون دانوں پیپی نین (Papinian) پال (Paul) گیئس (Gaius)

البین (Ulpian) اور موڈسٹی نس (Modostinus) کی آراء
دانشریحات کے مجموعہ کو قانون کی توضیح کے لئے بنیادی حیثیت قرار دیا جنہیں لیکس سٹاٹین Lex Citatian
یعنی "فقہائے خمسہ کی آراء" کا نام دیا گیا۔ بعض اوقات انہیں سینٹنیا ریسپٹا (Sententiarecepta)
یعنی "مسلمہ الآراء" بھی کہا جاتا ہے۔

قانونی ماخذ

رومی قانون کی تاریخ چونکہ مختلف سیاسی اور نظریاتی ادوار سے گذری اس لئے بنیادی طور پر رومی قانون
کے صرف ایک یا دو ماخذ نہیں ہیں بلکہ رومی قانون مختلف ادوار کے قوانین کا مجموعہ ہے ابتدائی زمانہ میں
جب رومی یونانی فلسفہ سے متاثر ہوئے" تو ان میں "جوس نیچرل" یا قانون فطرت کے تصور نے جنم
لیا۔ رومیوں کا خیال تھا کہ انسان کو اس کی پیدائش کے بعد ایک کائناتی قانون کا پابند بنایا گیا ہے جسے قدرت
نے اپنے وصف "انصاف" کے تحت پوری کائنات میں جاری و ساری کر رکھا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان
جو قانون بھی بنائے وہ اسی "قانون قدرت" کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بقول جسٹینین "فطرت
نے اپنا یہ قانون حیوانوں اور کائنات کی ہر جاندار شئے کو سکھا دیا ہے جس کی بدولت بحر و بر میں ایک مکمل
نظام جاری و ساری ہے" اور شاید اسی کی روشنی میں روما کے قدیم مقننین انسان کے جملہ حقوق کو صرف
اس ایک جملے میں بیان کرتے تھے کہ "وہ (انسان) اپنے اعمال کو فطرت کے تابع بنائے" تدوین قانون میں
مذہب نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قانون روما کی تدوین میں بھی مذہب کا کافی حصہ رہا۔ پرانے زمانے
کے مذہبی خیالات جنہوں نے مختلف رسموں کی شکل اختیار کر لی تھی قانون کا ایک حصہ بن گیئں۔ رومی عوام
جب بھی قانون بناتے' پہلے اس کی مذہبی حیثیت کا اندازہ ضرور کر لیتے تھے۔ کسی قانون کو مذہب کی کسوٹی
پر پرکھنے کے لئے مختلف ادوار میں مختلف طریقے استعمال کئے جاتے رہے۔ کبھی مذہبی پیشوا قانون کی تشکیل
میں حکمرانوں کی مدد کرتے تھے۔ کبھی حکومتیں کوئی ادارہ قائم کر دیتی تھیں جو قانون کے سلسلے میں مقننہ
اور عدلیہ کا ہاتھ بٹاتا۔ اس طرح رومی قانون کا جب مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا جائے تو اسے دو
حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جوس اسکرپٹم (Jus Scriptum) یا تحریری قوانین۔

۲- جوس نون اسکرپٹم (Jusnos Scriptum) یا غیر تحریری قوانین

قانون روما میں غیر تحریری قوانین یا تو وہ رسوم ہیں، جو صدہا سال تک رومیوں میں مروج رہیں یا پھر بیرونی لوگوں کے روم میں سکونت کے بعد وہ معاملات، جو ابتدا، میں لین دین اور دیگر امور سے متعلق ہوتے تھے۔ اور جنہوں نے بعد میں تحریری صورت اختیار کرلی۔

تحریری قوانین میں وہ تمام قوانین شامل ہیں جو ججوں کے فیصلوں مختلف قانونی اداروں کے وضع کردہ قوانین یا فرامین شاہی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ جن کا مختصراً تذکرہ درج ذیل ہے۔

(۱) لیجس کیوریاٹا Leges Curiata

کومیٹیا کیوریاٹا رومی تاریخ کے پہلے دور میں وہ اسمبلی تھی جو بادشاہ اور سینیٹ کی منظوری اور تعاون سے قانون وضع کرتی تھی۔ دوسرے دور میں طبقاتی لحاظ سے نمایندگی کی بنیاد پر یہ اسمبلی ایوان نمایندگان بن گئی۔ پہلے دور میں اس کا کام مذہبی، خاندانی اور دیگر نجی امور کی نگہداشت کرنا اور قانون وضع کرنا تھا، جنہیں لیجس کیوریاٹا یا اسمبلی کے قوانین کہا جاتا تھا۔ دوسرے دور میں چونکہ اسے کچھ اختیارات مل گئے لہذا اس کا کام دستور کی تشکیل، صلح و جنگ اور مختلف عوامی مسائل کے سلسلہ میں قوانین کی تشکیل ہوگیا جنہیں پاپولسکیٹا (Populiscita) کہا جاتا تھا۔ تیسرے دور میں اس اسمبلی ہی کو ختم کردیا گیا۔ ان اسمبلیوں کے قوانین رومی قانون کی تدوین میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں عہد حاضر کی اسمبلیوں کے عوامی ایکٹ بھی کہا جاسکتا ہے۔

(۲) پراکٹرس اڈکٹ (Practors edict)

رومی تہذیب کے ابتدائی دور میں جب غیر ملکی روم میں آکر آباد ہونے لگے تو ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک ایسے مجسٹریٹ کا تقرر کیا جائے جو غیر رومیوں کے باہمی جھگڑوں یا رومیوں اور نوآباد باشندوں کے درمیان فیصلے کرسکے۔ چنانچہ اس مجسٹریٹ کو پراکٹر (Practor) کہا جاتا تھا۔ وہ پراکٹر جو صرف رومیوں کے درمیان فیصلے کرتا اسے پراکٹر اربانس ... (Practor Urbanus) اور جو غیر رومیوں یعنی نوآباد لوگوں یا پھر دونوں

کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتا اسے پراکٹر پیریگرینس (Praetor Peregrinus) کہا جاتا تھا۔ اس عہدے کی میعاد ایک سال ہوتی تھی یہ جو فیصلے کرتا یا کسی مختلف فیہ مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتا یا اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرتا اسے اڈکٹ (Edict) کہا جاتا تھا۔ ان اڈکس کا رومی قانون کی تدوین میں کافی اثر ہے۔ اس عہدے کو ہم برطانیہ کے قدیم چانسلر کے عہدے سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ ایک دور وہ آیا جب یہ "اڈکس" بے شمار ہو گئے ۱۱۷ء میں شاہ ہیڈرین کے دور میں انہیں ایک جگہ مرتب کیا گیا۔

(۳) بارہ قانونی چارٹ Twelve tables

۴۵۲ء ق م سے پہلے رومی قانون منتشر صورت میں موجود تھا کومیٹیا کے فیصلے ہوں یا پراکٹرس کے اڈکٹ سب کسی ایک جگہ جمع نہیں کئے گئے تھے۔ جس سے رومی قانون کا مضمون کے اعتبار سے مطالعہ کیا جا سکتا چنانچہ (Decemviri) کو مقرر کیا گیا کہ وہ جملہ قوانین کو یکجا کریں۔ تین سو روز کی محنت کے بعد دس قانونی جدول تیار کر لئے گئے جسے کومیٹیا سینچوریاٹا نے ۴۵۱ء ق م میں منظور کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد دو جدول کا اضافہ کر دیا گیا جسے حسب سابق کومیٹیا نے منظور کر لیا یہ بارہ جدول مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہیں۔

۱۔ مجسٹریٹ کے روبرو حاضری کا پروانہ

۲۔ عدلیہ کی کارروائیاں

۳۔ قرض خواہ اور مقروض

۴۔ سربراہ خاندانوں کے حقوق

۵۔ وراثت اور ولایت

۶۔ ملکیت اور قبضہ

۷۔ ملکیت حقیقی

۸۔ قانونی حقوق کی خلاف ورزی

۹۔ قانون عوام

۱۰ - قانون مذہب

۱۱ و ۱۲ - پلیبین اور پیٹریکین کے مابین قانون امتناع ازدواج۔

ان جدولوں کو "قانونی حوالہ" کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ بقول لیوی انہیں "جملہ انفرادی اور عوامی قوانین کی اساس" بھی کہا جا سکتا ہے۔

(۴) سینیٹس کنسلٹم Senatus Consultum

سینٹ کی قراردادوں کا بھی رومی قانون کی تدوین میں کافی حصہ ہے۔ ابتدائی دور میں اس کی حیثیت صرف انتظامی اور مشاورتی ادارہ کی تھی بعد میں کچھ عرصہ اس کی حیثیت ٹریبونل کی بھی رہی۔ لیکن تیسرے دور میں جب عوامی اسمبلیاں توڑ دی گئیں تو سینٹ کی اہمیت بڑھ گئی۔ قانون بنانے کے لئے شہنشاہوں نے اس کا سہارا لیا اور تقریباً سنہ ۱۵۰ء سے اس کے ممبر شہنشاہ کی طرف سے نامزد کئے جانے لگے۔ اس طرح شہنشاہ کو اپنی مرضی کے قوانین بنوانے کا موقع مل گیا۔

(۵) پرنسپم پلسیٹا Principum Placita

رومی تاریخ کے تیسرے دور میں بادشاہ چونکہ عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ کا سربراہ بن گیا۔ چنانچہ حکومت کا اقتدار اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے وہ جو فرامین جاری کرتا تھا وہ بھی قانون روما کی تدوین میں اہم ثابت ہوئے ان فرامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱ - اڈکٹا (Edicta) وہ فرامین جو عدلیہ کے سربراہ کی حیثیت سے جاری کرتا تھا بعض اوقات یہ فرمان آرڈی ننس قسم کے بھی ہوتے تھے۔

۲ - ڈکریٹا (Decreta) وہ فرامین جو یا تو کسی ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کی سماعت کے بعد جاری کئے جاتے تھے یا براہ راست کسی مقدمہ کی سماعت پر دیئے جاتے تھے۔

۳ - ریسکرپٹا (Rescripta) مختلف سوالات کے جوابات جو شہنشاہ کی طرف سے دیئے جاتے تھے، وہ بھی قانونی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ جوابات جو وہ کسی سرکاری افسر کے جواب میں لکھتا، اپسٹولو (Epistolo) کہلاتے تھے اور جو کسی فرد یا غیر سرکاری

ادارہ کی کسی عرضداشت یا سوالنامہ کا جواب ہوتے وہ سبکرپشن (Subscription) کہلاتے تھے۔

۴۔ مینڈاٹا (Mandata) وہ فرامین جو سرکاری حکام کو کسی خاص حکم کے لئے جاری کئے جاتے۔

رومی بادشاہوں کے ان فرامین کو ہم انگلستان کے رائل پروکلیمیشن سے تشبیہ دے سکتے ہیں جنہیں ہنری ہفتم کے ایکٹ ۱۵۳۱ء کے تحت شاہی فرامین کو بھی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے مترادف قرار دیا گیا تھا۔

(۶) ریسپونسا پروڈینڈم Responsa Prudendum

رومیوں میں قانون کی تشریح کے لئے شروع ہی سے کچھ لوگ مقرر ہوتے تھے جو مذہبی پیشوا بھی ہوتے تھے لیکن زمانے اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان لوگوں کو بھی سرکاری طور پر نامزد کیا جانے لگا۔ اور قانون کی کسی دفعہ میں ان کی تشریح قابل حوالہ خیال کی جانے لگی۔ ان قانون دانوں یا "جورس کنسلٹی" (Juris Consulti) کی آرار بھی قانون کا ایک حصہ بن گئیں۔

(۷) کورپس جورس سول Corpus Juris Civils

شاہ جسٹینین نے رومی قانون کو نئے سرے سے مدون کرایا۔ رومی قانون جو منتشر صورت میں موجود تھا یکجا کیا گیا۔ چیدہ قسم کے قانون دان مقرر کئے گئے جنہوں نے رومی قانون کی ضخیم کتب تیار کیں۔ ان قانون دانوں کا سربراہ ٹریبونین (Tribonian) تھا۔ اس کے دو مددگار معاون تھیوفیلس (Theophilus) اور ڈورو تھیوس (Dorotheus) بھی قابل ذکر ہیں۔ جو قابل ذکر کتب مرتب کی گئیں ان کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے۔

۱۔ تعزیر اوّل (The first code) اس تعزیر کی کتاب کو دس چیدہ نامزد کمشنرو (قانون دانوں) نے مرتب کیا۔ اسے بارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

۵۲۹ء میں یہ تیار ہوئی اور اسی سال سے اس کا نفاذ ہو گیا۔

۲۔ پچاس فیصلے (The fifty decisions) قانون کے وہ مسائل و نکات جن میں قانون دانوں کا اختلاف رہتا تھا ان کا تذکرہ ان فیصلوں میں موجود ہے یہ ایک ہی وقت میں نہیں بلکہ مختلف موقعوں پر شائع ہوئے۔ ان میں سے اکثر ۵۲۹ء اور ۵۳۰ء میں شائع ہوئے۔

۳۔ ڈائجسٹ یا پینڈکٹس (Pandects) انتالیس ماہرین قانون کی تحریروں پر مشتمل یہ ڈائجسٹ ۵۳۳ء میں مکمل کیا گیا جو پچاس کتب پر مشتمل ہے۔ ان میں ہر کتاب یا حصہ کسی عنوان اور قانونی مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس انتخاب کی ترتیب قانون داں کے معروف یا غیر معروف ہونے کی بنیاد پر نہیں کی گئی بلکہ عنوانات اور اہم ابواب کا اس کی ترتیب میں خصوصی خیال رکھا گیا۔

۴۔ انسٹیٹوٹس (Institutes) ۵۳۳ء میں ایک اور کتاب مرتب کی گئی جسے قانون کے طلبہ کے لئے لکھا گیا۔ اس میں کچھ قوانین اور ماہرین قانون کا تذکرہ ہے اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس کے زیادہ تر عنوان انفرادی قانون (Private Law) اور عام قوانین (Public Law) وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ لیکن اس میں متر تبہ ابحاث کے ماخذ بیان نہیں کئے گئے۔

ماخذ

۱۔ مرتضیٰ احمد خاں، تاریخ اقوام عالم، لاہور، ۱۹۵۰ء

۲۔ تاریخ سلطنت روما (مترجم)

3. Jhabwala, Principles if Roman Law, P. 1-17, Bombay, 1953

4. A Guide to the Study of Roman Law, P. 1-12, Lahore.

5 Oxford Dictionary, Univerisity Press, 1961.

افاداتِ شاہ عبدالرحیم رح

ترجمہ از فارسی

(۲)

وہ طریقہ جس سے اس (کیفیت) کی نگاہداشت آسان ہو جاتی ہے، یہ ہے کہ سانس کو ناف کے نیچے روکے اور زبان کو تالو سے اور لب کو لب سے لگا کر سانس کو اس طرح روکے کہ سانس (سینے کے اندر تنگی کی حد تک نہ رُکے اور سانس کو باہر نکالتے اور اسے اندر لے جاتے اور دونوں سانسوں کے درمیان جو وقفہ ہے، اس کی آگاہی رہے تاکہ سالک کا نفس اس شغل سے غافل نہ ہو۔ اور اللہ کے ساتھ حضوری کی نسبت میں فتور واقع نہ ہو۔ اس کیفیت میں وہ اس مقام پر پہنچ جائے کہ اللہ کے ساتھ حضوری کی نسبت بغیر کسی تکلف کے دل میں موجود رہے اور آگاہی اس طرح دل کی لازمی صفت ہو جائے، جس طرح کہ آنکھ کے لئے بینائی اور کان کے لئے سننا لازمی صفت ہے۔ اگر کسی کو اپنے آپ سے اس طرح آگاہ کر دیں کہ بہت زیادہ آگاہی کی وجہ سے اس کو آگاہی کا شعور نہ رہے تو یہ نہایت استغراق (کی کیفیت) ہے۔

اس حالت کی ابتداء میں بعض کے ظاہری و باطنی حواس محسوسات و معقولات کو ادراک کرنے سے معطل ہو جاتے ہیں اور ان پر صدمہ کی بے خودی ظاہر ہوتی ہے، اور بعض کے تمام کے تمام حواس، باوجود اس کے کہ انہیں آگاہی کی یہ صفت اپنے کمال پر میسر ہوئی ہے، اپنا کام کرتے رہتے ہیں یہ حالت پہلی حالت سے اشرف اور قوی تر ہے۔

اگر کسی کو اربابِ ولایت کے مقاصد سے واقفیت ہو جائے، تو اسے یہ یقین حاصل ہو گا کہ اہل ولایت کو جو شہود و حضور و مشاہدہ ہوتا ہے، وہ عبارت ہے حصول یادداشت کے دوام سے اور اس کی تعبیر آگاہی سے کی گئی ہے۔ اگر اس مقام پر ایسا ہو جائے کہ اس نسبت کے شعور کا بھی شعور نہ رہے اور سوائے ہستی

حق کے کوئی اور نسبت نہ رہے اور ظاہری اشغال اس نسبت کے وجود میں مانع نہ ہوں اور اس نسبت کی موجودگی ظاہری اعمال میں مانع نہ ہو۔ شاہد و مشہود کی تخصیص دل کی نظر سے جاتی رہے اور سالک بحرِ ہستی میں اس طرح گم ہو جائے کہ اس سے نہ فعل (کا تعلق) رہے، نہ وصف، نہ اسم اور نہ ذات کا۔ اس حالت کو بزرگوں نے فنائے فنا سے تعبیر کیا ہے۔

اگر حق سبحانہ وتعالیٰ (سالک کو) اس مقام سے ترقی دے دے اور اسے بقا بعد الفنا پر پہنچا دے اور صرف اپنی عنایت سے اس کو ایسا نور بخشے کہ وہ اس نور سے یہ دیکھ سکے کہ مشاہدہ سوائے اللہ جل ذکرہ کے کچھ اور نہیں، اور یہ اشیاء اسی اللہ جل ذکرہ کے مظاہر اور جلوے ہیں۔ اور یہ کیفیت اس (سالک) کا ملکہ بن جائے۔ ایسے (سالک) کو بالغوں میں شمار کیا گیا ہے۔ وہ ناقصوں کی تکمیل کے لئے مقرر ہوتا ہے اور اس طریقہ کے مستعدین کی تربیت و صحبت کے لئے اسے اجازت دی جاتی ہے۔

اور اسی مقام پر اگر دل کو پختگی حاصل ہو جائے، تو اس کی حالت ایسی خوشی و مسرت کی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں دو جہاں رائی کے دانے کے برابر حیثیت نہیں رکھتے۔ اور اگر دل کی نظر ایسی کیفیت پر ہے کہ ابھی اس میں کوئی چیز رہ گئی ہے اور اس کیفیت پر سالک نہیں پہنچ پاتا ہے تو اس کی حالت سر تا سر شوق و قلق و اضطراب کی ہوگی۔ انبیاء اور غیر انبیاء میں سے کوئی بھی کامل ایسا نہیں ہوگا، جس سے اضطراب و اشتیاق کبھی بھی زائل ہوا ہو۔ حق سبحانہ وتعالیٰ اپنے دوستوں کو یوم قیامت تک اسی خوشی قلق و اضطراب اور اشتیاق میں رکھتا ہے۔ اس لئے کہ جس لحظہ وہ ایک تجلی سے مشرف ہوتے ہیں، اس تجلی سے ان کو دوسری تجلی کے لئے استعداد حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ سلسلہ غیر منتہی ہے۔ چنانچہ تجلیات کا آبِ مصفا جتنا زیادہ ہوگا، اتنی ہی پیاس زیادہ ہوگی۔ نہ آبِ حیاتِ حقیقی کا فیضان منقطع ہوگا اور نہ محبانِ جمال کی پیاس کو زوال ہوگا۔

شربت الحب کاساً بعد کاس
فما نفد الشراب ولا رویت

(ترجمہ) میں نے محبت کے جام کے بعد جام پیئے، پس نہ تو شراب ختم ہوئی، اور نہ میں سیراب ہوا۔

رابطہ

اس سلسلۂ طریقت کے سلوک و وصول کا تیسرا طریقہ رابطہ ہے۔ رابطہ ایک ایسے پیر سے کہ وہ مقام مشاہدہ پر پہنچا ہوا ہو اور اس کے لئے تجلیاتِ ذات متحقق ہو گئی ہوں اور اس کا دیدار بمصداق ھم الذین اذا رأوا ذکر اللہ (جب ان کو لوگ دیکھیں، تو اللہ کا ذکر کریں) ذکر کا فائدہ دے اور اس کی صحبت بموجب ھم جلساء اللہ (وہ اللہ کے ہم نشین ہیں) اللہ کی صحبت جیسا نتیجہ پیدا کرے۔ اگر ایسے بزرگ کی صحبت میسر آئے اور اس کی تاثیر سالک اپنے اندر پائے تو جس قدر بھی اس سے ہو سکے، اسے نگاہ میں رکھے۔ اگر وہ موجود حاضر ہو، تو اس کے دو ابروؤں کے درمیان نظر گاڑے اور اس سے ایسا رابطہ رکھے کہ اسی بزرگ کے وجود کے سوا کوئی اور چیز نہ رہے وہ خود اپنے وجود سے علیحدہ ہو کر اس کے وجود سے متصف ہو جائے۔ اگر اس کیفیت میں کوئی فتور واقع ہو، تو پھر اس کی صحبت کی طرف رجوع کرے تاکہ اس کی برکت سے وہ کیفیت پیدا ہو۔ اس طرح وہ اس وقت تک اسے بار بار کرے کہ یہ مذکورہ کیفیت اس کا ملکہ بن جائے۔

اگر وہ بزرگ موجود حاضر نہیں، غائب ہے، تو اس کی صورت کو تمام ظاہری و باطنی قویٰ کے ساتھ خیال میں لائے اور قلب صنوبری کی طرف متوجہ ہو ہر وہ خیال جو تشویش و پریشانی دے[1] اس کی اس وقت تک نفی کرے کہ بے خودی کی کیفیت رونما ہو جائے۔ اس سے کوئی طریقہ بھی (اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے) نزدیک تر نہیں ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر مرید میں یہ قابلیت ہو کہ پیر اس کے اندر تصرف کرے، تو پیر پہلے ہی قدم میں مرید کو مشاہدہ کے مرتبے پر پہنچا دیتا ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے۔ اصحبوا مع اللہ فان لم تطیقوا فمع من یصحب مع اللہ (اللہ کی صحبت میں بیٹھو۔ پس اگر اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ تو

---

[1] شاہ ولی اللہ القول الجمیل میں فرماتے ہیں
مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک اللہ تک پہنچنے کے تین طریقے ہیں۔ ایک ذکر، دوسرا مراقبہ اور تیسرا مرشد کے ساتھ کامل ربط۔ آخر الذکر کے لئے ضروری شرط یہ ہے کہ مرشد قوی التوجہ اور دائم یادداشت ہو۔ (مترجم)

پھر ان کی صحبت میں بیٹھو، جو اللہ کی صحبت میں بیٹھتے ہیں، یعنی ایسی ہمت رکھو کہ آگاہی سے جو ایک پر تو ہے تجلی ذاتی کا، مشرف ہو کر دو جہان کے تعلق سے رہائی پالو اور اگر تم میں اس طرح کے کام کی طاقت نہیں تو کسی ایسے شخص کے بارے میں آگاہی حاصل کرو کہ وہ اس تجلی کے پر تو سے مشرف ہو چکا ہو۔ اس نے اپنے آپ سے رہائی حاصل کر لی ہو اور اس کی ہمت عالی نے اس کے دل کو غیر کے تعلق سے نجات دے دی ہو۔ قرآن مجید کی آیت "کونوا مع الصادقین" میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور اگر کسی میں فطرت کا خلوص و صفا باقی ہو تو ایسے صاحب دولت کے اشارے سے کہ وہ شہود ذاتی کے مقام پر پہنچا ہوا ہو۔ تھوڑے سے وقت میں بغیر ریاضت اور زیادہ محنت کئے یہ دولت حاصل ہو جاتی ہے۔[۱]

آنکہ بہ تبریز دید یک نظرش شمس دیں

طعنہ زند بردہ و سخرہ کند بر چلہ

(ترجمہ) جس کو تبریز میں شمس دین نے اپنی ایک نظر سے دیکھ لیا وہ دہے (دس دن تک چلہ کھینچنے) اور چلہ (چالیس دن تک چلہ کھینچنے) پر ہنستا ہے۔

۱۔ شاہ ولی اللہ ہمعات میں "مراقبہ" کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں نفیس حقیقت یہ ظاہر کی گئی ہے کہ ذکر و اذکار اور مراقبہ و مجاہدہ کے معاملے میں حق سبحانہ کی رضا اس میں ہے کہ اذکار میں سے وہ ذکر کیا جائے، جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

اور مراقبہ ایسا ہو کہ سالک کی توجہ فوراً ذات باری کی طرف مبذول ہو جائے مراقبے کے سلسلے میں یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ سالک اس کی تمہیدی مشقوں میں ہی پھنس کر رہ جائے۔ کیونکہ اگر وہ اس حالت میں مر جائے گا تو اسے آخرت میں حسرت اور رنج ہوگا۔ مثلاً اگر سالک مراقبے کی تمہیدی مشقیں کر رہا ہو۔ یعنی وہ مسلسل آواز سننے میں مصروف ہو یا خلا کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی مشق میں لگا ہوا ہو یا وہ آفتاب کی طرف دیکھنے یا ناک پر نظر جمانے کی مشق کر رہا ہو اور اس کو موت آجائے تو اندازہ لگایئے کہ آخرت میں اسے کتنی محرومی ہوگی۔

(مترجم)

سلسلۂ خواجگان کے حلقۂ سردار خواجہ عبدالخالق غجدوانی کے کلمات کے بیان میں

بے شک یہ ان کے اصطلاحی الفاظ ہیں کہ ان بزرگ کے طریقہ کا جاننا ان پر موقوف ہے اور ان اصطلاحی الفاظ کے ساتھ میں نے اس فصل میں کچھ اور فوائد کا جن کے بغیر اس طریقہ کے سالکوں کو چارہ نہیں، اضافہ کردیا ہے، نیز حضرت خواجہ کا آداب طریقت کے بارے میں ایک وصیت نامہ ہے، جو آپ نے اپنے فرزند معنوی خواجہ اولیاء کبیر قدس سرہ کے لئے قلم بند فرمایا ہے اور مشتمل ہے بڑے بڑے فوائد اور جلیل القدر منفعتوں پر اور وہ تمام سالکوں اور مریدوں کے لئے ضروری و لازمی ہے۔

جملہ وصیتوں میں سے یہ چند جامع فقرے لکھے جاتے ہیں

اے فرزند! میں تمہیں علم و ادب کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تمام حالات میں تم اپنے اوپر تقویٰ لازم کرو، آثار سلف پر چلو، جماعت کی سنت کو بالتزام اختیار کرو، فقہ و حدیث پڑھو، ہمیشہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرو اس شرط کے ساتھ کہ نہ امام بنو نہ موذن۔ ہر گز شہرت کی خواہش نہ کرو کہ شہرت ایک آفت ہے۔ کسی منصب سے مقید نہ ہو۔ ہمیشہ گم نام رہو۔ قبالوں میں اپنا نام نہ لکھو محکمہ قضا میں نہ جاؤ اور نہ کسی کے ضامن بنو۔ لوگوں کی وصیتوں میں نہ پڑو۔ بادشاہوں اور بادشاہوں کی اولاد سے اٹھنا بیٹھنا نہ رکھو۔ خانقاہ نہ بناؤ اور نہ خانقاہ میں بیٹھو۔ بہت سماع نہ سنو کہ سماع نفاق پیدا کرتا اور دل کو مردہ کردیتا ہے۔ سماع کی مخالفت نہ کرو کیونکہ سماع کے بہت سے لوگ حامی ہیں۔ کم بولو۔ کم کھاؤ اور کم سوؤ۔ خلقت سے اس طرح بچو جیسے لوگ شیر سے بچتے ہیں۔ خلوت اختیار کرو اور مردوں اور عورتوں، بدعتیوں، تونگروں اور عامیوں کی صحبت میں نہ بیٹھو۔ حلال کھاؤ اور شبہ والی چیزوں سے پرہیز کرو۔ جب تک تم سے ہوسکے، نکاح نہ کرو کہ اس سے دنیا کے طالب ہوجاؤ گے اور دنیا کی طلب میں دین برباد کرلو گے۔ زیادہ نہ ہنسو، ہر ایک کو محبت و شفقت کی نظر سے دیکھو، اور کسی کو بھی حقیر نہ سمجھو۔ اپنے ظاہر کی آرائش نہ کرو کیونکہ ظاہر کی آرائش باطن کی خرابی ہوتی ہے۔ خلقت سے جھگڑا نہ کرو۔ کسی سے کوئی چیز نہ چاہو اور نہ کسی سے کوئی خدمت طلب کرو۔ مشائخ کی مال و تن و جان سے خدمت کرو اور ان کے افعال کا انکار نہ کرو کیونکہ ان کا انکار کرنے والا ہرگز فلاح نہیں پاتا دنیا اور اہل دنیا سے غرور نہ کرو۔ چاہیئے کہ تمہارا دل ہمیشہ اندوہ گیں تمہارا بدن بیمار، تمہاری چشم گریاں، تمہارا عمل

پُرخلوص، تمہاری دعا پُر خضوع، تمہارا لباس پرانا، تمہارا رفیق درویش، تمہارا سرمایہ فقر، تمہارا گھر مسجد اور تمہارا مونس حق سبحانہ تعالیٰ ہے۔

حضرت خواجہ کے کلماتِ قدسی

حضرت خواجہ کے کلماتِ قدسی میں سے یہ آٹھ کلمات ہیں کہ ان پر خواجگان قدس اللہ اسرارہم کے طریقہ کی بنیاد ہے۔ وہ کلمات یہ ہیں:۔ ہوش در دم۔ نظر بر قدم۔ سفر در وطن۔ خلوت در انجمن۔ یاد کرد۔ باز گشت۔ نگاہ داشت۔ یاد داشت۔

ان کے علاوہ جو کلمات ہیں، وہ سب نصیحتیں ہیں۔ اور پوشیدہ نہ رہے کہ اس طریقہ عالیہ کی جملہ مصطلحات میں تین کلمات اور ہیں۔ اور وہ ہیں۔ وقوف زمانی، وقوف عددی اور وقوف قلبی، یہ سب گیارہ کلمات ہوئے۔

ہوش در دم

مولانا سعد الدین کاشغری قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ ہوش در دم یہ ہے کہ ایک سانس کے بعد جو دوسرا سانس لیا جائے، وہ غفلت سے نہ ہو حضوری سے ہو اور ہر سانس جو سالک لے وہ حق سبحانہ و تعالیٰ سے خالی اور اس سے غفلت میں نہ ہو۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ اس طریقہ میں سانس کی رعایت اور اس کی حفاظت بڑی اہمیت رکھتی ہے یعنی چاہیئے کہ کہ تمام سانس حضوری اور آگاہی میں سے لئے جائیں اور اگر کوئی سانس کی حفاظت نہیں کرتا تو کہتے ہیں کہ فلاں گم کردہ ہے یعنی اس نے طریق درویش گم کردی ہے،

حضرت خواجہ بہاء الدین قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اس راہ میں کام کی بنیاد سانس پر ہونی چاہیئے۔ اور سانس کو اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیئے کہ وہ باہر نکلنے اور اندر جانے میں ضائع ہو اور دو سانسوں کے درمیان کے وقفے کی حفاظت میں کوشش کی جائے کہ سانس غفلت سے نہ آئے جائے۔

اے ماندہ ز بحر علم بر ساحل عین	در بحر فراغت ست و بر ساحل شین
بر دار صفا نظر ز موج کونین	آگاہ بہ بحر باش بین النفسین

(ترجمہ، اے بحر علم چھوڑ کر ساحل پر ٹھہرکر ہوئے۔ بحر میں فراغت ہے اور ساحل پر خرابی ہے دونوں جہاں کی موج سے اپنی صاف نظر اٹھالے اور دو سانسوں کے درمیان جو بحر ہے اس سے

آگاہ ہو جاؤ۔

حضرت خواجہ مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی قدس سرہ السامی شرح رباعیات کے اواخر میں لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالجناب نجم الدین کبری قدس اللہ روحہ نے رسالہ فواتح الجمل میں فرمایا ہے کہ وہ ذکر جو حیوانات کے نفوس پر جاری ہے، یہ ان کے ضروری سانس ہیں اس لئے کہ سانس کے باہر آنے اور اندر جانے میں وہ حرف جو حق سبحانہ و تعالیٰ کی غیب ہویت[1] کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے گئے ہیں خواہ چاہیں یا نہ چاہیں، وہ وہی حرف ہیں جو اللہ کے اسم مبارک میں ہیں۔ اور الف ولام تعریف کا ہے اور لام پر تشدید اس تعریف کے مبالغہ کے لئے ہے۔ پس چاہیے کہ ہوشمند طالب حق سبحانہ و تعالیٰ سے نسبت آگاہی میں ایسے درجے پر ہو کہ اس حرف شریف کے تلفظ کے وقت حق سبحانہ و تعالیٰ کی ہویت[2] ذات اس کو ملحوظ رہے اور سانس کو باہر نکلتے اور اندر کھینچتے وہ اس بات سے واقف رہے کہ حضوری مع اللہ کی نسبت میں کوئی فتور واقع نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچے کہ کسی نگاہ داشت کے بغیر اس کی یہ نسبت ہمیشہ اس کے دل میں موجود رہے اور اگر وہ اس نسبت کو دور کرنا چاہے بھی تو ا کلاوں سے بھی نہ کر سکے۔

رُباعی

با غیب ہویت آمدے حرف شناس	انفاس ترا بود براں حرف اساس
باش آگہ ازاں حرف دراُمید و ہراس	حرفے گفتم شگرف اگر داری پاس

(ترجمہ) اے حرف شناس ہویت غیب میں ہے۔ تیرے س[illegible]س حرف کی اساس ہیں امید و ہراس میں اس حرف سے آگاہ رہو۔ میں نے ایک نادر حرف کہا ہے اگر تم اس کا خیال رکھو۔

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ عارف ربانی حضرت عبدالرحمٰن جامی نے اس رباعی میں غیبت ہویت جو فرمایا ہے وہ اہل تحقیق کی اصطلاح میں حق سبحانہ و تعالیٰ کی ذات سے عبارت ہے باعتبار لاتعین

ا؎ غیب ہویت یا غیب مطلق۔ ذات حق کا وہ مرتبہ جو لاتعین ہے۔ مترجم

۲؎ ہویت۔ وہ مطلق حقیقت جو غیب مطلق میں حقائق پر اس طرح مشتمل ہو، جیسے بیج درخت پر مشتمل ہوتا ہے۔ (مترجم)

یعنی بشرط اطلاق حقیقی کے کہ وہ کسی اطلاق سے بھی مقید نہیں۔ نیز یہ ممکن نہیں کہ اس مرتبے میں کوئی علم اور ادراک اس سے متعلق ہو اور اس حیثیت سے وہ مجہول مطلق ہے۔

نظر بر قدم نظر بر قدم یہ ہے کہ شہر و صحرا اور ہر جگہ جاتے آتے سالک کی نظر اپنے پاؤں کی پشت پر ہو تاکہ اس کی نظر پراگندہ و پریشاں نہ ہو۔ اور جہاں اسے نہیں پڑنا نہ پڑے۔ اور شاید نظر بر قدم اشارہ ہو سالک کا تیز رفتاری سے ہستی کی مسافتیں قطع کرنے اور خود پرستی کی گھاٹیاں طے کرنے کی طرف۔ یعنی ہر وہ جگہ جہاں اس کی نظر کی انتہا ہوتی ہو، وہ فوراً قدم وہاں رکھ دے۔ اور وہ جو ابو محمد رویم قدس سرہ نے فرمایا ہے۔ ادب المسافر أن لا یجاوز ہمتہ قدمہ (مسافر کا ادب یہ ہے کہ اس کی ہمت اس کے قدم سے تجاوز نہ کرے) اس کا اشارہ اسی معنی کی طرف ہے۔ حضرت عارف سبحانی عبدالرحمن جامی قدس سرہ السامی نے کتاب تحفتہ الاحرار میں حضرت خواجہ بہاء الدین قدس سرہ کی منقبت میں اس مضمون کو یوں نظم فرمایا ہے۔

ابیات

کم زدہ بے ہمدمی و ہوش دم	ورنگزشتہ نظرش از قدم
بسکہ ز خود کردہ بسرعت سفر	باز نماندہ قدمش از نظر

بے ہمدمی اور ہوش دم سے وہ گم کیا ہوا ہے۔ اس کی نظر قدم سے نہیں گزری۔ اس نے اپنے آپ سے سرعت سفر کیا ہے۔ پھر اس کے قدم نظر پر نہیں رہے۔

سفر در وطن سفر در وطن یہ ہے کہ سالک طبیعت بشری سے سفر کرے یعنی بحکم تخلقوا باخلاق اللّٰہ (اللہ کے اخلاق اختیار کرو) صفات ملکی میں اور صفات ملکی سے صفات رحمانی میں منتقل ہو۔ حضرت مولانا سعدالدین کاشغری قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ خبیث شخص جس جگہ منتقل ہوگا اس سے خباثت دور نہیں ہوگی جب تک کہ وہ خود صفات خبیثہ سے الگ نہ ہو۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ مشائخ طریقت قدس سرہم کے سفر و اقامت اختیار کرنے کے احوال مختلف ہیں، ان میں سے بعض ابتدا میں سفر کرتے ہیں۔

اور آخر میں اقامت اختیار کرتے ہیں اور بعض ابتدا میں اقامت اختیار کرتے ہیں، اور آخر میں سفر کرتے ہیں اور بعض ابتدا و آخر دونوں میں اقامت اختیار کرتے ہیں اور سفر نہیں کرتے اور بعض ابتدا و آخر دونوں میں سفر کرتے ہیں اور اقامت اختیار نہیں کرتے ہیں، ان چار فرقوں میں سے ہر گروہ کی سفر و اقامت میں صادق نیت اور صحیح غرض ہوتی ہے جیسا کہ عوارف کے ترجمے میں بیان کیا گیا ہے۔

باقی خواجگان قدس اللہ تعالیٰ ارواحھم کا سفر و اقامت میں طریقہ یہ ہے کہ ابتدائے حال میں اس حد تک سفر کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پاس پہنچ جائیں پھر اس کی خدمت میں اقامت گزیں ہو جائیں اور اگر اس گروہ کے بزرگوں میں سے کسی ایک کو خود اپنے دیار میں پالیں، تو وہ سفر ترک کر کے اس کے پاس بسرعت پہنچ جاتے ہیں اور ملکہ آگاہی کی تحصیل میں سعی جمیل کرتے ہیں۔ اس صفت ملکہ کے حصول کے بعد سفر و اقامت دونوں برابر ہیں۔

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ مبتدی کو سفر میں پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جب طالب کسی بزرگ کی صحبت میں پہنچ جائے، اسے چاہیئے کہ وہیں مقیم ہو کر اس کی خدمت میں رہے، وصف تمکین حاصل کرے اور خواجگان قدس اللہ تعالیٰ ارواحھم کے ملکۂ نسبت کی تحصیل کرے۔ اس کے بعد جہاں بھی وہ ہو، کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

رباعی

یارب چہ خوش ست بے دہان خندیدن	بے واسطۂ چشم جہان را دیدن
بنشیں و سفر کن کہ بغایت خوب ست	بے منت پا گرد جہاں گردیدن

(ترجمہ) یارب بے منہ کے ہنسنا اور بے واسطۂ چشم جہان کو دیکھنا کتنا اچھا ہے۔
بیٹھے رہو اور سفر کرو کہ پاؤں کا احسان لئے بغیر جہاں کے گرد گھومنا بہت خوب ہے

حضرت عارف سبحانی عبدالرحمٰن جامی قدس سرہ نے اشعۃ اللمعات میں اس بیت

آئینہ صورت از سفر دور است
کان پذیرائے صورت از نور است

کی شرح کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے کہ آئینہ صورت کی جانب نہ سفر کرتا ہے اور نہ جنبش، اس لئے کہ اس کا صورت قبول کرنا خود اپنے جوہر کی نورانیت اور صفائی کی وجہ سے ہے۔ جو

چیز بھی اس کے سامنے آتی ہے اور اپنا منہ دکھاتی ہے اس کی صورت اس کے اندر منعکس ہو جاتی ہے بغیر صورت کی طرف اس کے حرکت کئے۔ اسی طرح جب دل کا آئینہ معنوی کون و مکان کی صورتوں کے حشو زوائد سے مبرا ہوتا ہے اور نور صفا اس کو گرفت میں لے لیتا ہے اور خواہشات طبعی کے اندھیرے اس سے زائل ہو جاتے ہیں تو پھر تجلیات ذات اور صفات الٰہی کو قبول کرنے کیلئے اسے سیر و سلوک کی حاجت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ سیر و سلوک عبارت ہے دل کے چہرے کو صاف اور صیقل کرنے سے اور جب وہ صاف اور صیقل ہو گیا تو اس کو سیر و سلوک کی حاجت نہ رہی۔

خلوت در انجمن حضرت خواجہ بہاء الدین قدس اللہ سرہ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے طریقے کی بنیاد کس چیز پر ہے۔ فرمایا خلوت در انجمن۔ ظاہر میں خلق کے ساتھ اور باطن میں حق سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ کہ حدیث میں ہے۔ الصوفی هو الکامن والباطن (صوفی وہ ہے جو پردہ خفا میں ہو)

اندرون شو آشنا واز برون بیگانہ وش

ایں چنیں زیبا روش کم مے بود اندر جہاں

(ترجمہ) باطن سے آشنا ہو اور باہر سے بیگانہ رہ۔ ایسی اچھی روش دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔

اور حق سبحانہ و تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے۔ رجالٌ "لا تلهيهم تجارة ولا بيع" عن ذکر اللہ (ایسے لوگ جن کو خدا کے ذکر سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت) اسی مقام کی طرف اشارہ ہے کہا گیا ہے کہ اس طریقہ میں نسبت باطنی ایسی ہے کہ دل کی جمعیت اژدحام میں اور تفرقہ کی صورت میں خلوت سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمارا طریقہ صحبت ہے۔ اور یہ کہ خلوت میں شہرت ہے اور شہرت میں آفت ہے۔ خیریت و جمعیت (دل) صحبت میں ہے۔ بشرطیکہ ایک دوسرے سے نفی ہو۔

خواجہ اولیاء کبیر قدس سرہ نے فرمایا ہے خلوت در انجمن یہ ہے کہ ذکر میں اشتغال و استغراق اس درجہ کو پہنچ جائے کہ اگر (سالک) بازار جائے تو وہ حقیقت دل پر ذکر کے غلبے کی وجہ سے اہل بازار میں سے کسی کی بھی آواز اور بات نہ سنے۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ نے فرمایا ہے۔ پانچ چھ روز تک کوشش اور اہتمام سے ذکر کے اشتغال سے (سالک) اس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے کہ تمام آوازیں اور لوگوں کی حکایتیں ذکر معلوم ہوتی ہیں اور جو بات کرتا ہے، وہ اسے ذکر سنائی دیتی ہے قاضی محمد قدس سرہ کی جمع میں منقول ہے۔ کہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نے فرمایا ہے کہ ابتدائے سلوک میں مجھ پر ذکر اس طرح مستولی ہو گیا کہ اگر ہوا چلتی یا درخت کا پتہ ہلتا یا میرے کان میں لوگوں کی گفتگو کی آواز آتی، میں ان سب کو ذکر سمجھتا۔ جو کوئی ابتدائے حال میں ایسا نہ ہو، آخر میں وہ کمالاتِ ذات کی غایت کو نہیں پہنچتا۔

یادکرد یہ عبارت ہے زبان اور دل کے ذکر سے۔ حضرت مولانا سعد الدین کاشغری قدس سرہ نے فرمایا ہے۔ ذکر کی تعلیم کا طریقہ یہ ہے۔ پہلے شیخ دل میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے۔ مرید اپنے دل کو حاضر کرے اور شیخ کے دل کے سامنے رکھے۔ آنکھیں بند کرے۔ منہ مضبوطی سے بند کرے۔ زبان کو تالو سے لگائے۔ دانت دانتوں پر رکھے اور سانس کو لے کر پوری قوت اور تعظیم سے ذکر شروع کرے۔ شیخ کی موافقت کرتے ہوئے دل سے ذکر کرے، زبان سے نہیں۔ سانس کو روکنے میں صبر سے کام لے ایک سانس میں تین بار (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کہے۔ اس طرح کہ ذکر کی حلاوت کا اثر دل تک پہنچے۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ نے اپنے بعض کلمات قدسی میں لکھا ہے کہ ذکر سے مقصود یہ ہے کہ دل محبت و تعظیم کے ساتھ حق سبحانہ و تعالیٰ سے ہمیشہ آگاہ رہے۔ اگر اربابِ جمعیتِ (دل)، کی صحبت میں یہ آگاہی حاصل ہو، تو ذکر کا مقصود خلاصہ حاصل ہو گیا۔ اور اگر اس صحبت سے آگاہی حاصل نہ ہو تو پھر اس طریقہ سے ذکر کرے جیسا کہ سابق فصل میں بیان کیا گیا ہے

بازگشت یہ عبارت ہے ذکر پر نظر رکھنے سے۔ یعنی ہر بار جب بھی (سالک) زبان دل سے کلمہ طیب کہے، اسے چاہیئے کہ اس کے پیچھے اسی زبان سے کہے۔ خداوندا مقصود من توئی و رضائے تو (اے خداوندا! میرا مقصود تو ہے اور تیری رضا) یہ کلمہ بازگشت اس لئے ہے کہ یہ ہر اچھے اور برے خیال کی جو آجاتا ہے، نفی کرتا ہے۔ اس طرح ذکر خالص ہو جاتا ہے اور اس کے دماغ سے ماسوا کے خیالات نکل جاتے ہیں اگر ابتدائے ذکر میں مبتدی کلمہ بازگشت

کو صدق دل سے اپنے اندر نہ پائے تو اسے چاہیئے کہ وہ اسے ترک نہ کرے اس لئے کہ آہستہ آہستہ وہ صدق کے آثار کو ظہور پذیر پائے گا۔

نگاہ داشت یہ عبارت ہے خیالات پر نظر رکھنے سے چنانچہ سالک ایک سانس میں چند بار کلمہ طیبہ کہے تو اس دوران میں کوئی دوسرا خیال نہ آئے۔ حضرت مولانا سعدالدین قدس سرہ نے اس کلمہ کے بارے میں فرمایا ہے۔ چاہیئے کہ ایک ساعت، دو ساعت اور دو ساعت سے بھی زیادہ جس قدر بھی ہو سکے اپنے خیال پر اس طرح نگاہ رکھے کہ کوئی دوسرا خیال نہ آئے۔

مولانا قاسم علیہ الرحمتہ سے جو حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے بڑے اصحاب اور مخصوصین میں سے ہیں، منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ نگاہ داشت کے متعلق ملکہ اس درجے تک پہنچے کہ طلوع فجر کے وقت سے اچھی خاصی چاشت تک دل پر اس طرح خیالاتِ غیر کے بارے میں نگاہ رکھی جا سکے کہ اس عرصے میں قوت متخیلہ اپنا کام کرنا چھوڑ دے۔ مخفی نہ رہے کہ قوت متخیلہ کا تمام تر اپنا کام چھوڑ دینا خواہ یہ نصف ساعت کے لئے ہو، اہل تحقیق کے نزدیک صد درجہ عظیم بات اور نادر اشیا میں سے ہے۔ بعض کامل تر اولیا کی کبھی کبھی اس معنی تک رسائی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ نے فتوحات مکیہ میں جہاں کہ سجود قلب کا بیان کیا گیا ہے، خواجہ محمد علی حکیم ترمذی قدس سرہ سے سوالوں اور جوابوں کے ضمن میں اس کی تحقیق کی ہے۔

یادداشت اس سے جو مقصود ہے وہ عبارت ہے بر سبیل ذوق حق سبحانہ و تعالیٰ کی دوام آگاہی سے بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ حضور بے غیبت ہے۔ اہل تحقیق کے نزدیک مشاہدہ، حضور یادداشت کا ایک کنایہ ہے۔ اور مشاہدہ یہ ہے کہ حُبّ ذاتی کے توسط سے دل پر شہود حق کا غلبہ ہو۔[1]

حضرت خواجہ احرار نے ان چار کلمات کی شرح میں جو اوپر گزر چکے ہیں، یہ فرمایا ہے۔ یاد کرد عبارت ہے ذکر میں تکلف کرنے سے۔ بازگشت عبارت ہے حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف اس طرح

---

[1] "یادداشت" تو وہ واجب الوجود کی حقیقت کی طرف خالص توجہ کرنے سے عبارت ہے ایسی توجہ جو الفاظ اور تخیلات سے مجرد ہو۔ (القول الجمیل اردو ترجمہ)

رغبت کرنے سے کہ ہر بار کہ (سالک) کلمہ طیبہ کہے۔ اس کے پیچھے وہ دل میں یہ خیال کرے کہ خداوندا مقصود من توئی (اے خداوندا تو ہی میرا مقصود ہے) اور نگاہ داشت[1] عبارت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف اس رجوع کی محافظت سے اور یادداشت عبارت ہے نگاہ داشت میں رسوخ حاصل کرنے سے۔

وقوف زمانی

حضرت بہاء الدین قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ وقوف زمانی، کہ وہ راہ کا کارگزار ہے، یہ ہے کہ بندہ اپنے احوال سے ہر زمانے میں خواہ اس کی حالت وصفت کیسی بھی ہو، موجب شکر ہو یا موجب عذر، واقف رہے اور حضرت مولانا یعقوب چرخی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ بسط کی حالت موجب شکر ہے۔ ان کا ارشاد ہے ان دونوں حالتوں کی رعایت وقوف زمانی ہے۔ یہ بھی حضرت خواجہ بزرگ نے فرمایا ہے کہ وقوف زمانی میں سالک کے کام کی بنیاد ساعت پر رکھی گئی ہے تاکہ وہ معلوم کرے کہ سانس جو ہے، وہ حضور میں گزرتا ہے یا غفلت میں۔ اگر وہ اس کی بنیاد سانس پر نہ رکھتے تو ان دونوں حالتوں وصفتوں کو معلوم نہ کیا جاسکتا۔ وقوف زمانی عبارت ہے محاسبہ سے حضرت خواجہ بزرگ نے فرمایا ہے کہ محاسبہ یہ ہے کہ ہر ساعت جو ہم پر گزری ہے ہم محاسبہ کریں کہ غفلت کیا ہے اور حضور کیا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سب گھاٹا ہے تو ہم بازگشت کرتے ہیں اور نئے سرے سے عمل کرتے ہیں[2]۔

---

[1] نگاہ داشت عبارت ہے دل سے ادھر ادھر کے خیالات کو ہٹانے اور وسوسوں کو دور کرنے سے۔ اور اس کے لئے سالک کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ چوکنا رہے اور دل میں کوئی ایک خیال بھی نہ آنے دے۔۔۔ نگاہداشت سے سالک کے اندر ذہن کو ہر طرح کے خیالات اور وسوسوں سے خالی رکھنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ (القول الجمیل - اردو ترجمہ)

[2] "ہوش در دم" کے معنی یہ ہیں کہ اپنے ہر ہر سانس پر طالب اپنے دل کو بیدار رکھے اور ہر ہر لحظہ اپنے نفس پر اس کی نگاہ رہے کہ آیا وہ غافل ہے یا ذکر میں مشغول۔ اس سے طالب بتدریج ترقی کرتے ہوئے "دوام حضور" کی منزل پر پہنچتا ہے۔ یہ شغل راہ سلوک کے مبتدی کا ہے۔ جو طالب سلوک میں اس سے آگے اور دوسرے درجے پر پہنچے تو اسے چاہیئے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے نفس کی ٹوہ لگائے اور دیکھے کہ یہ گھڑی جو اس پر گزری ہے، (باقی حاشیہ ۶۹۴ پر)

وقوف عددی یہ عبارت ہے ذکر میں تعداد (گنتی) کا خیال رکھنے سے۔ حضرت خواجہ بزرگ بہاء الدین قدس اللہ تعالیٰ سرہ نے فرمایا ہے کہ ذکر قلبی میں تعداد کا خیال منتشر خیالات کو دور کرنے کے لئے رکھا جاتا ہے اور یہ جو خواجگان قدس اللہ تعالیٰ ارواحھم کے کلام میں آیا ہے کہ فلاں نے فلاں کو وقوف عددی کرنے کا حکم دیا، تو اس سے مقصود قلبی ذکر کرنا ہے اس کی تعداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نہ کہ محض تعداد کو ملحوظ رکھنا قلبی ذکر میں (یعنی اصل مقصود ذکر قلبی ہے اور اس کی تعداد کی حیثیت ثانوی ہے) ذاکر کو چاہیئے کہ وہ ایک سانس میں تین بار یا پانچ بار یا سات بار یا اکیس بار ذکر کرے اور اس میں طاق عدد کو لازم قرار دے۔

حضرت خواجہ علاء الدین عطار قدس اللہ تعالیٰ روحہ نے فرمایا ہے کہ بہت بار کہنا شرط نہیں۔ چاہیئے کہ جس قدر بھی کہے، وقوف اور حضور سے کہے تاکہ اس کا فائدہ ہو۔ اور جب قلبی ذکر میں (ایک سانس میں) اکیس بار سے تعداد بڑھ جائے اور اثر ظاہر نہ ہو تو یہ اس عمل کے بے نتیجہ ہونے کی دلیل ہے اس ذکر کا اثر یہ ہے کہ نفی (یعنی لا الہ) کہتے وقت بشریت کا وجود منفی ہو جائے اور اثبات (یعنی الا اللہ) کہتے وقت جذبات الوھیت کے تصرف کے آثار میں سے کوئی اثر سامنے آجائے۔

اور یہ جو حضرت خواجہ بزرگ نے فرمایا ہے کہ وقوف عددی علم لدنی کا اول مرتبہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اہل ہدایت کی نسبت سے علم لدنی کا یہ پہلا مرتبہ ہو۔ اور اس میں جذبات الوھیت کے تصرفات کے یہ آثار رونما نے ہوں۔ چنانچہ حضرت خواجہ علاء الدین نے فرمایا ہے کہ وہ ایک کیفیت اور حالت ہے جو مرتبہ قُرب سے وصل رکھتی ہے اور اس مرتبے میں علم لدنی منکشف ہو جاتا ہے۔ اہل نہایت کی وقوف عددی کی، کہ وہ علم لدنی کا پہلا مرتبہ ہے، لذت وہ ہو گی کہ ذاکر کون و مکان

(بقیہ حاشیہ) اس میں اس پر غفلت کا اثر تھا یا نہیں چنانچہ اگر وہ محسوس کرے کہ اس پر غفلت کا اثر تھا تو توبہ استغفار کرے اور عزم کرے کہ آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس سے طالب "دوام" کے شغل پر پہنچ جاتا ہے۔ اور اسی "دوام" کا نام "وقوف زمانی" ہے۔

(القول الجمیل۔ اردو ترجمہ)

کے مراتب میں ایک واحد حقیقی کے جاری وساری ہونے سے واقف ہو جس طرح کہ وہ حساب کے اعداد کے مراتب میں ایک کے عدد کے جاری وساری ہونے سے واقف ہے۔

اعداد کون وصورت کثرت تماشا است
فالکلُّ واحدٌ یتجلّی بکلّ شان

ترجمہ۔ کون ومکان کے اعداد اور کثرت کی صورت ایک جلوہ گاہ ہے پس سب ایک ہی ہے۔ اور یہی ایک ہر شان میں جلوہ فرما ہے۔

محققین اکابرین سے ایک نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

کثرت چو نیک درنگری عین وحدت است | مارا شکے نماند دریں گر ترا شکے ست
در ہر عدد کہ بنگری از روئے اعتبار | گر صورتش نہ بینی در مادہ اش یکیست

(ترجمہ) کثرت کو جو غور سے دیکھو، عین وحدت ہے۔ ہمیں اس میں کوئی شک نہیں رہا۔ اگر تجھے کوئی شک ہے (تو ہوا کرے)۔ ہر عدد غور سے دیکھو اور اگر محض اس کی صورت تم نہ دیکھو، تو اس کا اصل مادہ ایک ہی ہے۔

اور شرح عبارات میں فرمایا گیا ہے۔

در مذہب اہل کشف وارباب خرد | ساری است احد درہمہ افراد عدد
زیرا کہ عدد گرچہ برون ست زحد | ہم صورت وہم مادہ اش ہست احد

(ترجمہ) اہل کشف اور ارباب خرد کے مذہب میں احد تمام افرادِ عدد میں جاری وساری ہے۔ عدد اگرچہ حد سے باہر ہو، اس کی صورت بھی اور اس کا مادہ بھی احد ہی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ قوت ہے جو علم لدنی کا پہلا مرتبہ ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ علم لدنی وہ علم ہے جو اہل قرب کو تعلیم الٰہی اور تفہیم ربانی سے معلوم ومفہوم ہوتا ہے نہ کہ عقلی دلائل اور نقلی شواہد سے، چنانچہ کلام قدیم (قرآن مجید) نے حضرت خضرؑ کے حق میں فرمایا ہے۔ "وعلمناہ من لدنا علما" (ہم نے اسے اپنے پاس سے علم سکھایا) علم یقینی اور علم لدنی میں فرق یہ ہے کہ علم یقینی عبارت ہے ذات الٰہی اور صفات الٰہی کے ادراک سے اور علم لدنی کنایہ ہے حق سبحانہ وتعالیٰ سے بطریق الہام، ادراکِ معنی اور فہم کلمات کا۔

وقوف قلبی اس کو دو معنوں پر محمول کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ ذاکر کا دل حق سبحانہ و تعالےٰ سے آگاہ ہو اور یہ از قبیل یادداشت ہے۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ نے اپنے بعض کلمات قدسی میں فرمایا ہے کہ وقوفِ قلبی عبارت ہے دل کی آگاہی اور اس کے حق سبحانہ و تعالیٰ کی جناب میں اس طرح حاضر ہونے سے کہ دل کو حق سبحانہ و تعالیٰ کے سوا کسی اور سے تعلق نہ رہے۔ اور اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ذاکر دل سے واقف ہو۔ یعنی وہ ذکر کے دوران صنوبری شکل والے گوشت کے ٹکڑے کی طرف متوجہ ہو، جسے مجازاً دل کہتے ہیں اور وہ بائیں طرف بائیں چھاتی کے قریب واقع ہے۔ اسے وہ ذکر میں مشغول و گویا کرے اور اس کو موقع نہ دے کہ وہ ذکر سے اور ذکر کے مفہوم سے غافل اور بے توجہ ہو۔

حضرت خواجہ بہاء الدین قدس اللہ تعالیٰ سرہ ذکر میں سانس کے روکنے اور ذکر کی تعداد کی رعایت کو لازمی شمار نہیں کرتے۔ البتہ وقوف قلبی کے ہر دو معنوں کو جن کا ذکر کیا گیا ہے، اہم قرار دیتے اور لازم شمار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ذکر سے جو مقصود ہے، اس کا خلاصہ وقوف قلب[1] میں ہے۔

مانند مرغے باش ہاں بر بیضۂ دل پاسباں

کز بیضۂ دل زاید ت مستی و ذوق و قہقہہ

(ترجمہ) مرغ کی طرح بیضہ دل کی پاسبانی کرو۔ کہ بیضہ دل سے مستی و ذوق و قہقہہ پیدا ہوتا ہے۔

---

[1] وقوف قلبی یہ ہے کہ سالک کی توجہ دل کی طرف رہے، جو چھاتی کے نیچے بائیں طرف واقع ہے اور نقشبندی طریقے میں دل کی طرف توجہ کرنے میں وہی حکمت ہے، جو قادری طریقے میں دورانِ ذکر میں ضربوں پر نگاہ رکھنے میں ہے یعنی اس سے دوسری طرف سے توجہ ہٹ کر صرف اپنی طرف مرکوز ہو جاتی ہے اور آگے چل کر یہی ذریعہ بنتی ہے توجہ الی الحق کا۔

(القول الجمیل - اردو ترجمہ)

فصلِ چہارم

توجہ

توجہ وغیرہ کے بیان میں

اس عالی مرتبت گروہ کے ہاں توجہ اور ان کی باطنی نسبت کی تربیت و پرورش کا طریقہ یوں ہے کہ جب دل کا شغل کرنا چاہیں، پہلے اس شخص کی صورت، جس سے کہ یہ نسبت ملی ہو، اس وقت تک خیال میں رکھیں کہ اس شخص والی کیفیت و حرارت کا اثر پیدا ہو جائے اس کے بعد اس خیال کی نفی نہ کریں، بلکہ اسے نگاہ میں رکھیں اور آنکھ، کان اور تمام قویٰ سے اس خیال کے ساتھ دل کی طرف متوجہ ہوں، جو کہ عبارت ہے حقیقت جامع انسانی سے، اور یہ جو کائنات علوی و سفلی کا مجموعہ ہے، وہ اسی کی تفصیل ہے۔ اگرچہ وہ (حقیقت جامع انسانی) اجسام میں حلول نہیں کرتی لیکن چونکہ اس کے اور صنوبری شکل والے گوشت کے ٹکڑے کے درمیان ایک نسبت پائی جاتی ہے۔ اس لئے صنوبری شکل والے گوشت کے ٹکڑے کی طرف توجہ ہونی چاہیئے۔ اور آنکھ، فکر، خیال اور تمام قویٰ کو اس پر متوجہ کرنا چاہیئے۔

ہمیں اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اس حالت میں غیبت و بے خودی کی کیفیت کے ظہور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کیفیت کو ایک راہ فرض کرنی چاہیئے اور جو خیال کہ اس میں حائل ہو، حقیقت قلب کی طرف توجہ کے ذریعہ اس کی نفی کی جائے۔ اگر اس خیال کی نفی نہ ہو سکے تو اس شخص کی صورت سے (جس سے کہ نسبت حاصل ہوئی ہے) التماس کرے تاکہ پھر وہ نسبت پیدا ہو۔ اس وقت خود اس خیال کی نفی ہو جائے گی۔ ضروری ہے کہ وہ توجہ کی حالت میں اس شخص کی صورت کی (جس سے کہ نسبت حاصل ہوئی ہے) نفی نہ کرے۔ اگر اس طرح وسوسوں اور خیالات کی نفی نہ ہو تو اسم "یا فعّال" کا اس کے معنی کے اعتبار سے چند بار دل میں شغل کرے۔ اور اگر اس سے بھی یہ وسوسے دور نہ ہوں تو بڑے غور و تامل سے چند بار کلمہ لا الہ الا اللہ کا اس طرح کہ "لا موجود الا اللہ" تصور کرے۔ اور وہ تشویش پیدا کرنے والا وسوسہ خواہ وہ کسی نوع کا ہو، جب وہ موجودات ذہنی میں سے ایک موجود شے ہے، تو وہ اسے حقیقت میں حق سبحانہ و تعالیٰ کے

ساتھ قائم دیکھے، بلکہ وہ اسے عین حق سمجھے۔ اس لئے کہ باطل بھی حق کے ظہورات میں سے ایک ظہور ہے۔ جیسا کہ شیخ ابوزید قدس سرہ فرماتے ہیں۔

لا تنکر الباطل فی طورہ — فانہ بعض ظہوراتہ

واعط منک بمقدارہ — حتی توفی حق اثباتہ

(ترجمہ) باطل کے حال کا انکار نہ کر کیونکہ وہ بھی اس (حق) کے ظہورات میں سے ہے تو اسے (باطل کو) اس کی مقدار کا حق دے تاکہ تو اس (ذات) کے اثبات کا حق پورا کرے۔

اور شیخ مؤیدالدین الجندی نے اس کے تتمہ میں کہا ہے۔

فالحق قد یظہر فی صورۃ — ینکرہ الجاھل فی ذاتہ

(ترجمہ) پس حق بعض دفعہ ایسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ جاھل اس (حق) کی ذات کا انکار کرتا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ یہ عمل کرنے سے ایک ذوق پیدا ہو۔ بزرگوں کی نسبت تقویت پکڑے سالک اس وقت اس فکر کی بھی نفی کرے اور بے خودی کی حقیقت کی طرف متوجہ ہو اور اس کی تحصیل میں لگ جائے۔ اگر اس کے ساتھ لا الہ الا اللہ دل میں کہے۔ اللہ کی مد کو خوب کھینچے۔ اسے اندر لے جائے اور اس حد تک مشغول ہو کہ زیادہ تنگ نہ ہو۔ جب دیکھے کہ تنگ ہو رہا ہے تو شغل کرنا چھوڑ دے اور یہ جانے کہ جب غنیمت بے خودی اور بزرگوں کی نسبت ترقی پر ہو، حقائق اشیاء میں فکر کرتے ہوئے جزئیات کی طرف توجہ کرنا عین کفر ہے۔

باخودی کفر و بے خودی دین است

بلکہ حق سبحانہ و تعالی کی صفات اور اس کے اسماء میں بھی فکر نہیں کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس عالی مرتبت گروہ کا مقصود اس نسبت کی طرف توجہ ہے کہ وہ وادی حیرت کی سرحد اور انوارِ ذات کی تجلی کا مقام ہے اور اس میں شک نہیں کہ اسماء و صفات کا ذکر اس سے مرتبے میں کم تر ہے۔

تو مباش اصلاً کمال این ست و بس

رو درو گم شو وصال این ست و بس

(ترجمہ) تو ہرگز باقی نہ رہے۔ کمال بس یہ ہے۔ جاؤ اس میں گم ہو جاؤ وصال بس یہ ہے۔

چاہیئے کہ بازار، گفتگو، اکل و شرب اور تمام حالات میں اس حقیقت جامعہ کو اپنا نصب العین بنائے اور اسے حاضر جانے اور جزوی صورتوں کی وجہ سے اپنے حضرت جامعہ سے غافل نہ ہو، بلکہ تمام اشیاء کو اس کے ساتھ قائم جانے اور کوشش کرے کہ اس حضرت جامعہ[1] کا تمام متحسن اور غیر متحسن موجودات میں مشاہدہ کرے۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچے کہ وہ خود کو ہی سب دیکھے اور تمام اشیاء کو اپنا آئینہ جمال یا کمال جانے اور بات کرتے وقت اسے چاہیئے کہ اس مشاہدہ سے غافل نہ ہو بلکہ اس کا چشم دل کا گوشہ اسی طرف رہے۔ اگرچہ ظاہر میں وہ دوسری چیزوں میں مشغول ہو۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

اندروں شو آشنا واز بروں بیگانہ وش

ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

(ترجمہ) باطن سے آشنا ہو اور ظاہر سے بیگانہ۔ اتنی اچھی روش جہاں میں کم ہوتی ہے اور جس قدر صحبت زیادہ ہوگی، یہ نسبت قوی تر ہوتی جائے گی اور جب سالک اس مرتبہ پر پہنچے کہ دل اور زبان کے درمیان تفرقہ نہ کر سکے اور اس کے لئے خلقت حق کا حجاب نہ ہو اور حق خلقت کا حجاب نہ رہے اس وقت وہ صفت جذبہ سے دوسروں میں تصرف کر سکتا ہے اور حق کی طرف خلقت کو ارشاد و دعوت کی اجازت اس شخص کو ہوتی ہے جو اس مرتبے کو پہنچ جائے۔

سالک کو چاہیئے کہ غضب میں آنے سے خود کو بچائے کہ غضب میں آنا ظرف باطن کو نور معنی سے خالی کر دیتا ہے۔ اگر ناگاہ غصہ آجائے۔ یا کوئی قصور ہو جائے جس سے سخت کدورت ظاہر ہو اور سر رشتۂ ثبات گم ہو جائے یا وہ کمزور ہو جائے تو غسل کرے اگر مزاج میں قوت ہے تو ٹھنڈے پانی سے۔ یہ صفائی باطن دیتا ہے، ورنہ گرم پانی سے غسل کرے اور صاف کپڑے پہنے اور تنہائی میں دو رکعت نماز ادا کرے اور کئی بار زور سے سانس کھینچے اور اپنے اندر کو خالی کرے بعد ازاں

---

[1] حضرت جامعہ مشتمل ہے حضرت الغیب المطلق، حضرت علمیہ، حضرت شہادۃ مطلقہ اور حضرت غیب مضاف پر اور اس کا عالم عالم الانسان جامع ہے مع جمیع عوالم اور ما فیہا کے (کتاب التعریفات للسید الشریف علی محمد بن محمد جرجانی)

اس طریقے پر جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، وہ توجہ کرے۔ اور ظاہر میں بھی اپنے حضرت جامعہ کے سامنے
تضرع و عاجزی کرے اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو اور یہ جانے کہ یہ حقیقتِ جامعہ حق کی
ذات و صفات کے مجموع کا مظہر رہے، یہ نہیں کہ حق سبحانہ نے اس کے اندر حلول کیا ہے بلکہ وہ
آئینہ میں بمنزلہ صورت کے ہے پس یہ تضرع و عاجزی حقیقت میں حق سبحانہ تعالیٰ سے ہے۔

اس عالی مرتبت گروہ کے بعض افراد شیخ کی توجہ اور اس کی صورت کو نگاہ میں رکھنے کے
بجائے کلمہ طیبہ یا اللہ کے اسم مبارک کی لکھی ہوئی شکل کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔ خواہ اسے وہ اپنے سے
خارج میں اچھی طرح ملاحظہ فرمائیں خواہ دل اور سینہ کے اردگرد اسے تخیل سے نگاہ میں
رکھیں۔ فقیر دس سال کا تھا کہ جب حضرت خواجہ ہاشم افاض اللہ علینا برکاتہ دہلی تشریف لائے اور انہوں
نے فقیر کو اللہ کا اسم مبارک لکھنے کا حکم دیا۔ ایک مدت کے بعد مجھے دل کے اردگرد تخیل سے
لکھنے کا حکم ہوا۔ اس سے بڑی غیبت و بے خودی رونما ہوئی کہ اس میں کسی خیال کی ہرگز گنجائش
نہ تھی اور بڑی لذت اور اطمینان قلب نصیب ہوا۔ وَمَنْ کَمْ یذق لم یدر (جس نے
چکھا نہیں، وہ نہیں جان سکا) ایک جانی بوجھی مثل ہے۔

مخفی نہ رہے کہ لفظ نسبت[1] اور لفظ بارد و کلمے ہیں کہ خواجگان قدس اللہ تعالیٰ ارواحہم کی

---

[1] تصوف کے یہ جتنے طریقے اوپر بیان ہوئے، ان سب کا مقصد یہ ہے کہ طالب کے نفس ناطقہ کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کیفیت کو صوفیہ نے "نسبت" کا نام دیا ہے۔ اور اس کو نسبت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیفیت عبارت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتساب اور ارتباط سے ...... طالب جب عبادات، طہارات اور ذکر و اذکار پر برابر عامل رہے، تو اس کے نفس ناطقہ کے اندر فرشتوں کے مشابہ ایک مستقل صفت اور عالم جبروت کی طرف "توجہ" کا راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دو شاخیں ہیں "نسبت" کی۔ اور ان میں سے ہر ایک شاخ کی بہت سی قسمیں ہیں...... طریقت کے اشغال و وظائف سے دراصل مطلب یہی ہے کہ طالب ان نسبتوں میں سے کسی ایک نسبت کو حاصل کرے۔ اس پر وہ برابر قائم رہے اور اس نسبت میں اسے استغراق حاصل ہو جائے، یہاں تک کہ یہ نسبت طالب کے نفس ناطقہ (بقیہ حاشیہ صلے پر)

عبارات و اشارات میں اکثر آئے ہیں۔ کبھی وہ لفظ نسبت فرماتے ہیں اور اس سے مراد اس عالی مرتبت گروہ کے طریقہ اور کیفیت مخصوصہ و معروفہ سے ہوتی ہے اور کبھی وہ اس سے صفت غالب اور سانس کھینچنے کا ملکہ مراد لیتے ہیں اور کبھی وہ لفظ بار کہتے ہیں اور اس سے مراد بے نسبتی کی گرانی لیتے ہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔ فلاں بارے آورد یا فلاں مارا در بار ساخت۔ یعنی جب کسی ایسے شخص سے ملاقات کرتے ہیں کہ اسے ان کے طریقے سے مناسبت نہیں ہوتی اور وہ اس کی نسبت سے متاثر نہیں ہوتے اگرچہ وہ شخص اہل سلوک، یا اہل علم و تقویٰ ہی سے ہو۔ اس لئے کہ ان بزرگوں کی نسبت اور نسبتوں سے فائق ہے اور جو ان کی نسبت کے علاوہ نسبت ہے وہ ان کے لئے بار خاطر ہے اور کبھی لفظ بار بولتے ہیں اور اس سے ان کی مراد کوئی مرض یا غرض ہوتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ فلاں بار فلاں برداشت یا فلاں بار فلاں انداخت۔ اس سے ان کی مراد مرض کا رفع کرنا یا مرض کو حوالے کرنا ہوتا ہے۔ مخفی نہ رہے کہ خواجگان قدس اللہ اسرارھم کے طریقہ میں اکثر مرض کو دفع یا مرض کو دوسرے کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ خانوادۂ خواجگان قدس اللہ ارواحھم کے اکابر سے جو منقول ہے کہ "در بار مردم می آیند" یعنی لوگوں کے بار میں آتے ہیں وہ ان دو صورتوں میں سے ایک نہ ایک ہوتی ہے ایک یہ کہ جب کسی آشنا یا عزیز کو کوئی مرض یا ملال کی بات یا کسی معصیت میں آلودگی و توجہ پذیر ہو، وہ طہارت کرتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں۔ تضرع و عاجزی کرتے ہیں اور حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اس شخص کو اس عارضے سے پاک و صاف کر دے۔

(بقیہ حاشیہ) کے لئے ایک مستقل ملکہ بن جائے۔

...... ان نسبتوں کے حصول کا ایک طریقہ یہ اشغال و وظائف ہیں لیکن اس کے علاوہ ان کے حصول کے اور طریقے بھی ہیں..... صحابہ اور تابعین سکینہ کی "نسبت" ان اشغال و وظائف کے علاوہ دوسرے طریقوں سے حاصل کرتے تھے.......

(القول الجمیل - اردو ترجمہ)

دوسری صورت یہ ہے کہ اس مرض یا معصیت کا صاحب یا مصدر اپنے آپ کو جانتے ہیں اور اس شخص کے بجائے اپنے لئے اس مرض یا معصیت کا اثبات کرتے ہیں اور طہارت اور نماز کے بعد تضرع وزاری کرتے ہیں اور صدق و اخلاص سے توبہ و انابت کرتے ہیں اور دل کو مشغول رکھتے ہیں اور ہمت[1] اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ اس کو اس ابتلاء سے پوری خلاصی اور نجات ہو۔

فرماتے ہیں کہ جب کوئی دوست اور عزیز بیمار ہو، اس کی ہمت سے مدد کرنا بہت اچھا ہے، مدد دو طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ ہمت پوری طرح مصروف ہو کہ مرض دور ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ مرض میں پریشانی خاطر بہت ہوتی ہے اور پھر آسانی سے جمعیت خاطر بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ ہمت سے مدد کرتے ہیں کہ پریشانی خاطر دور ہو جائے۔ یا جو مقصود اصلی ہے، وہ نصب العین ہو جائے۔

طریقہ توجہ خواجگان قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کا توجہ کا طریقہ۔ اس توجہ کو انھوں نے اس بنا پر تصرف کا نام دیا ہے کہ وہ دل سے طالب

---

[1] نقشبندیوں میں عجیب وغریب تصرفات کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ہمت کو کسی خاص مدعا پر اس طرح متوجہ کر دینا کہ وہ مدعا ہمت کے مطابق ہی سرانجام پائے۔ نیز مرید پر اپنا اثر ڈالنا، مریض کو مرض سے اچھا کرنا، گناہ گار سے توبہ کرانا لوگوں کے دلوں میں اس طرح تصرف کرنا کہ ان میں بڑے بڑے واقعات متمثل ہو جائیں۔ اللہ کے مقبول بندوں کی خواہ وہ زندہ ہوں یا قبروں میں مدفون، تصوف اور طریقت میں جو نسبت تھی، اس پر اطلاع پانا، لوگوں کے دلوں میں جو خیالات آتے ہیں، اور جو کچھ کہ وہ سوچتے ہیں، ان پر آگاہی حاصل کرنا مستقبل میں ہونے والے واقعات کو معلوم کرنا اور نازل ہونے والی بلاؤں کو دور کر دینا، یہ اور اس طرح کی اور چیزیں، یہ سب نقشبندی بزرگوں کے تصرفات میں شمار ہوتی ہیں۔

(القول الجمیل۔ اردو ترجمہ)

کے دل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس ارتباط کے راستے سے ان کے دل اور اس طالب کے باطن کے درمیان اتصال[1] و اتحاد واقع ہوتا ہے اور ان کے دل سے عکس کے طور پر اس کے باطن پر پرتو پڑتا ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے کہ ان کی استعداد سے نکل کر عکس کے طور پر اس طالب کے آئینہ استعداد میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر یہ ارتباط متصل ہو، تو جو کچھ عکس کے طریقے سے حاصل ہوا تھا، وہ صفت دائمی بن جاتا ہے۔ اور تصرف کی شرائط اور ان کی باریکیوں کا بیان اور اس کی روشں کی تفصیل مرشد کے ارشاد سے تعلق رکھتی ہے۔

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد یحییٰ قدس اللہ تعالیٰ سرہما سے منقول ہے کہ ارباب تصرف کئی انواع کے ہیں۔ بعض ماذون و مختار ہیں کہ حق سبحانہ و تعالیٰ کے اذن سے اور خود اپنے اختیار سے جب بھی چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں اور اس کو فنا و بے خودی کے مقام پر پہنچاتے ہیں۔ اور بعض دوسرے ایسے گروہ کے ہیں کہ قوتِ تصرف رکھنے کے باوجود امر غیبی کے بغیر تصرف نہیں کرتے۔ جب تک بارگاہ سے انہیں حکم نہ ملے، وہ کسی کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ کبھی کبھی ان پر ایک صفت اور ایک حالت غالب ہوتی ہے اور اس غلبہ کے حال میں وہ مریدوں کے باطن پر تصرف کرتے ہیں اور اپنے حال سے ان کو متاثر کرتے ہیں۔ پس جو شخص کہ نہ مختار ہو، نہ ماذون اور نہ مغلوب، اس سے تصرف کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

[جناب شیخ عبدالرحیم صاحب (والد حضرت شاہ ولی اللہ) ..... جس طرح علم حدیث و تفسیر میں عدیم المثال اور بے نظیر تسلیم کئے جاتے تھے، اسی طرح فقہ و

---

[1] تصرفات کے لئے شرط یہ ہے کہ تاثیر ڈالنے والے کے نفس کا اس شخص کے نفس سے جس پر کہ تاثیر ڈالی جارہی ہے، اتصال ہو، اور اس کا نفس دوسرے کے نفس سے مل جائے اور اس سے پیوست ہو جائے۔

(القول الجمیل - اردو ترجمہ)

ادب وغیرہ میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ باوجود ان شرعی علوم وفنون کے دہبی علوم کا کافی حصہ رکھتے تھے۔۔۔۔

شیخ عبدالرحیم صاحب کو قدرتاً علم سے زیادہ دلچسپی تھی۔ گویا فطرت سے اس مقدس نفس اور پاک طینت کی ذات میں علمی مذاق کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ اکثر اوقات علوم دینیہ کے مطالعہ اور قرآن وحدیث کی اشاعت میں مصروف رہتے اور علم سلوک کے رواج دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ آپ کی ممتاز زندگی، اتقاء پرہیزگاری، ترک دنیا واہل دنیا، نفس کشی، عام اخلاق، خدا ترسی کی بے نظیر شہادت دہلی کی چاردیواری سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اور علم وہنر، فہم وفراست، عزم وثبات نے آپ کی شہرت کو اور بھی چمکا دیا تھا۔ باوجود اس فضل وکمال کے مزاج میں غایت درجہ کا انکسار وعجز تھا۔ طرز معاشرت بالکل سادہ تھی۔ آپ کا لباس نہ تو زاہدانِ خشک اور فقہائے ظاہری کی ہیئت کا ہوتا تھا، نہ فقرائے آزاد کے طریقے پر، بلکہ مشائخ وصوفیہ کے مطابق ہوتا تھا۔۔۔۔۔۔ طبی معلومات میں آپ کا ذہن نہایت رسا وسلیم تھا اور علمی وعملی تجربات خاص طور پر مشہور تھے۔ آپ کا وظیفہ نوافل تہجد تھا۔ جن میں تعداد رکعت کی قید کچھ نہ ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ عذر کے سوا ہمیشہ تلاوت قرآن میں مصروف رہتے اور نہایت خوش الحانی اور قواعد تجوید کی رعایت سے پڑھتے۔ حلقہ یاراں کے علاوہ قرآن مجید کے دو تین رکوع تدبر معانی کے ساتھ پڑھنا آپ کا دستور تھا۔۔۔۔۔ جب جناب شیخ ابوالرضا محمد آپ کے برادر کلاں کا انتقال ہوگیا، تو آپ نے بعض یاروں کی استدعا واصرار سے وعظ کہنا شروع کیا۔۔۔۔۔ آخر میں قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنی شروع کی]

ماخوذ از "حیات ولی"

مصنفہ مولانا محمد رحیم بخش دہلوی

سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر۔ اردو ادب پر

مولانا عبدالحلیم چشتی

(۲)

حقیقۃ الصلوٰۃ کی طباعت میں نیا اہتمام

اس کے بعد انہی مصطفےٰ خاں لکھنوی کے برادر خورد مولوی عبدالرحمٰن خاں شاکر حنفی نے اپنے مطبع نظامی کانپور سے یہ دونوں رسالے خط نسخ جلی میں اعراب کے ساتھ چھاپے اور اس میں صحت کے ساتھ اعراب کا بھی اہتمام کیا تاکہ ہندوستان کے ہر صوبے کے لوگ اس کو آسانی سے صحیح صحیح پڑھ سکیں اور پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس دور میں اردو زبان کی غالباً یہ پہلی کتاب تھی جو خط نسخ میں اعراب کے ساتھ شائع کی گئی تھی۔ یہ اہتمام تو کسی اردو شاعر کے دیوان کے ساتھ بھی کبھی نہیں ہوا۔ اسی سے اس کی قبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے یہ متوسط تقطیع کے ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

چوتھی مرتبہ حقیقۃ الصلوٰۃ اور تفسیر سورہ فاتحہ مولوی ابو محمد جمیل کی حسب فرمائش پرکاش سٹیم پریس لاہور میں اب سے کوئی ۴۲ سال پہلے ۱۳۴۳ھ میں چھپی تھی جس کے ساتھ مثنوی "سلک نور" بھی طبع ہوئی تھی، ناشر نے حقیقت الصلوٰۃ اور مثنوی "سلک نور" کو ابن عبدالغنی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ عبدالغنی شاہ اسماعیل شہیدؒ کے والد کا نام ہے۔

مثنوی سلک نور، ابن عبدالغنی، یعنی شاہ اسمٰعیل شہید کی طبع زاد نظم ہے لیکن حقیقت الصلوٰۃ ان کی تصنیف نہیں بلکہ سید احمد شہیدؒ کی تالیف ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے اس کا انتساب ناقل یا ناشر کی غلطی ہے، حقیقۃ الصلوٰۃ تو سید احمدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی زندگی ہی میں سید احمد شہیدؒ کے نام سے شائع ہو چکی ہے لہٰذا اس کا انتساب سید احمد شہید سے قطعی طور پر درست اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

حقیقۃ الصلوٰۃ میں اضافہ والحاق

حقیقۃ الصلوٰۃ طبع چہارم میں اگرچہ لفظی تغیر تو کم ہوا ہے لیکن جملوں میں تقدم و تاخر بکثرت پایا جاتا ہے علاوہ ازیں اس میں چند ابواب کا اضافہ بھی ہے جیسے اذان کا بیان، نماز جنازہ کا بیان، ساتوں کلموں کی تشریح، دعائے الاستغفار، حقیقۃ الصلوٰۃ، طبع اول میں جو خود حضرت سید احمد شہیدؒ کی زندگی میں شائع ہوئی تھی، ان ابواب کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے لہٰذا یہ سب الحاقی ہیں۔

حقیقۃ الصلوٰۃ کی انوار الصلوٰۃ کے نام سے اشاعت

پھر پانچویں مرتبہ محمد ثناء اللہ خاں نے ۱۳۰۹ھ میں اس "حقیقۃ الصلوٰۃ" اور "تفسیر سورۂ فاتحہ" کو لاہور سے شائع کیا، سرورق پر مصنف کی حیثیت سے سید احمد شہید کا نام بھی دیا گیا ہے، البتہ کتاب کو اس کے اصلی نام حقیقۃ الصلوٰۃ کی بجائے انوار الصلوٰۃ کے نام سے شائع کیا گیا حالانکہ وہ عبارت جس میں اس کو حقیقۃ الصلوٰۃ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس مطبوعہ نسخے کے آخر میں بھی موجود ہے مگر مقدمہ نگار محمد یٰسین صاحب الہ آبادی نے اس کو پھر بھی انوار الصلوٰۃ ہی سے موسوم کیا ہے یہ طبع پنجم اگرچہ طبع چہارم کی بہ نسبت زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ ایک ایسے مخطوطہ سے منقول ہے جو اصل مطبوعہ نسخے کی نقل ہے جیسا کہ مقدمہ نگار کے حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہے وہ لکھتے ہیں۔

"حضرت جدی مولانا شاہ رحیم بخش گوپاموی رحمۃ اللہ علیہ کی قلمی کتابوں میں ایک تقریر دلپذیر قدوۃ العارفین مجدد الملۃ والدین حضرت مولانا سید احمد بریلویؒ کی نظر سے گذری جو طریقہ نماز اور ساتھ ہی سورۂ فاتحہ و قل ہو اللہ شریف کے دکی تفسیر کے متعلق تھی جس کو قطب وقت حضرت مولانا شاہ عبدالحی صاحب دہلویؒ نے قلمبند فرمایا تھا۔"

منقولہ نسخہ میں ناقل سے نقل کے وقت سنہ طباعت رہ گیا تھا جس کو مقدمہ نگار نے محض تخمین اور اندازہ سے ۱۲۴۱ھ کر دیا ہے حالانکہ اس کا سن طباعت ۱۲۳۷ھ ہے جیسا کہ ہم نے "بینات" کی جلد اول شمارہ نمبر میں بیان کیا ہے، یہ نسخہ چونکہ اصل مطبوعہ نسخہ کی نقل ہے اس لئے اس کے جملوں میں تو تقدم و تاخر نہیں ہوا لیکن معلوم نہیں کاتب یا ناشر کی بے احتیاطی سے بعض قدیم ساخت کے جملوں میں معمولی سا تغیر ہو گیا ہے مثلاً "جانا چاہیئے" کو "جانا چاہئے" کر دیا ہے اس سے زبان کی حد تک اس دور کی تو ہو گئی لیکن

اس نے زبان اردو کے ارتقائی تاریخ نگار کو جو مشکلات پیدا کردیں وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

اس مطبوعہ نسخے میں بعض جگہ بیاض بھی ہے جیسے صہ ۹ پر "مقر" کے بعد بیاض ہے حالانکہ یہاں صرف "ر" رہ گئی ہے۔ دراصل لفظ "مقرر" ہے ایک آدھ جگہ عبارت مسخ ہوکر بالکل مطلب ہی خبط ہوگیا ہے جیسے صہ پر ہے "مشقت میں ڈالنا نفس کا اس کی سنتوں کے اوقات میں، نماز اس کے واسطے جہاد ہے۔" یہاں لفظ "سنتیوں" کا ہے اور ایک جگہ صہ ۱۴ پر "بندہ کو خدمت پابوسی کی اس پر لازم ہے" اصل میں اس طرح ہے "بندہ کو خدمت پا چپے کی اس پر لازم ہے" تفسیر سورہ فاتحہ کا جو قدیم نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہے وہ ابتداء سے ناقص ہے اس لئے "حقیقۃ الصلوٰۃ" اس میں پوری نہیں ہے تاہم جتنا حصہ اس میں موجود تھا وہ ہم نے اسی نسخہ سے نقل کیا ہے اور بقیہ حصہ مطبع مصطفائی لکھنؤ[۲۲] سے مکمل کیا ہے، تصحیح و مقابلہ میں کامل احتیاط کی ہے زبان و بیان میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں کیا ہے تاکہ زبان کے تاریخ نگار کو زبان کی تدریجی ترقی کے ادوار کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔

ہم نے حقیقۃ الصلوٰۃ کی صحت میں مطبع مصطفائی کے مطبوعہ نسخہ کو معیار بنایا کیونکہ اس کی صحت مستند ہے، مطبع مصطفائی کا نسخہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ نسخہ کرم خوردہ ہے

حقیقۃ الصلوٰۃ کی تاریخی حیثیت

سید شہیدؒ کی اردو تصانیف میں حقیقۃ الصلوٰۃ سب سے پہلی اور آخری تصنیف ہی نہیں بلکہ اردو زبان میں اپنے طرز کی واحد کتاب ہے، حقیقۃ الصلوٰۃ کے موضوع پر یہ وہ تاریخی اور انقلاب آفریں تقریر ہے جو موصوف نے تیسری مرتبہ دہلی میں آمد کے موقعہ پر ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء میں شیخ الاسلام مولانا عبدالحئی[۲۳] بن ہبتہ اللہ بڈھانوی المتوفی ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء اور حجتہ الاسلام مولانا محمد اسمعیل[۲۴] بن عبدالغنی دہلوی شہید جیسے عبقریوں ([illegible]) کے سامنے انہیں دو رکعت نماز پڑھانے اور بیعت کرنے سے قبل کی تھی؛ چنانچہ صاحب مخزن احمدی مولوی سید محمد علی بن عبدالسبحان رائے بریلوی المتوفی ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء کا بیان ہے۔

سید المجاہدین داخل شاہجہاں آباد شدہ در ہموں مسجد کہ ذکرش بالا رفت مع چند رفقا فرد کش شدند، اتفاقاً حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب

سید مجاہدین (سید احمد شہید) شاہجہاں آباد دہلی میں آئے تو اسی مسجد میں جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ فروکش ہوئے اتفاقاً مولانا شاہ عبدالقادر

قدس سرہ کہ دراں مسجد، مقیم بودند، برائے ملاقات
ایشاں با مولانا عبدالحیٰ صاحب آمدند و در اثنائے گفتگو
ذکر اسرار صلوٰۃ و حضور قلب درمیان آمد، حضرت
مولانا عبدالقادر صاحب در جواب مولانا عبدالحیٰ ارشاد
فرمودند کہ شرح و بیان ایں مدعا در اکثر کتب
تصوف و اخلاق مثل احیاء العلوم وغیرہ اسلاف بکمال
تشریح و بیان فرمودہ اند بمجرد علم، حصول ایں
مقصد و وصول ایں مطلب، بدوں توسل مرشد کامل
خیلے دشوار، بلکہ قریب محال، اگر عاشق ایں معشوقی
بخدمت ایں جوان تازہ وارد کہ موسوم بسید احمد است
بشتاب، و کمر ہمت استوار بستہ خدمتش دریاب،
مولانا عبدالحیٰ صاحب بعد اصغاء ایں کلام بطلب
مقصد و مرام خود بشتافتند و بکمال ضراعت و انکسار
درخواست ایں مطلب عظمیٰ، رب کبریٰ کردند۔
امام المجاہدین کیفیت الصلوٰۃ بہ نہجیکہ در رسالہ موسومہ
بحقیقت الصلوٰۃ کہ مصنفہ آنحضرت است بیان فرمودہ
اختتام کلام برایں مرام نمودند کہ مولانا صاحب حصول
ایں مقصد بگفتگو راست نمی آید، ہمیں نماز است
کہ در بدء نبوت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم
حضرت جبرائیل امین بحکم رب العلمین برائے تعلیم
آں امامت فرمودہ اند بیا برخیز، و تحریمہ دو رکعت
نماز باقتدایم بربند، مولانا علیہ الرحمۃ حسب المامور
بعمل آوردہ، تحریمہ دو رکعت نماز باقتدار آں

جو اسی مسجد میں قیام پذیر تھے ان سے ملنے کے
لئے مولانا عبدالحیٰ صاحبؒ کے ہمراہ تشریف لائے
اثنائے گفتگو میں اسرار صلوٰۃ اور حضور قلب
کا ذکر آیا حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ نے
مولانا عبدالحیٰ کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ
تصوف و اخلاق کی کتابوں میں جیسے کہ احیاء العلوم
وغیرہ ہے قدماء نے نہایت تفصیل سے کلام کیا ہے۔
محض علم سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور بغیر
مرشد کامل اس مقصد تک رسائی بہت مشکل ہے۔
بلکہ قریب قریب محال ہے اگر اس مقصد سے تم
کو عشق ہے تو اس نووارد جوان کی خدمت میں رہو
جو سید احمد کے نام سے مشہور ہے اس امر کی
تحصیل میں تاخیر نہ کرو اور کمر ہمت کس لو اور اس
کی صحبت میں رہو مولانا عبدالحیٰ صاحب نے بغور
ان باتوں کو سنا اور اپنے مقصد کے حصول میں عجلت
سے کام لیا اور نہایت انکسار و تضرع سے اس
مقصد عظیم کے حصول کی درخواست کی۔ امام مجاہدین
نے نماز کی کیفیت اس طریقہ پر بیان فرمائی جو اس
رسالہ میں جس کا نام حقیقت الصلوٰۃ ہے مذکور
ہے یہ رسالہ سید شہید کی تصنیف ہے سید شہید
نے بات کو اس پر ختم کر دیا کہ مولانا صاحب یہ
مقصد گفتگو سے حاصل نہیں ہو سکتا یہی نماز
ہے جو حضرت جبرئیل امین نے پروردگار عالم

عالی جناب بربستند دریں مقام، اکثر آں عالی مقام بیان می فرمودند کہ انچہ درآں دو رکعت یافتہ ام، ہیچگاہ درعمر خود نیافتہ ام، مولانا موصوف بعد فراغ نماز مذکور، از خدمت شریف اجازت خواستہ، بخانہ خود تشریف آوردہ فی الفور مولانا محمد اسماعیل شہید کہ از اعاظم تلمیذان مولانا ممدوح اند، طلب داشتہ، حال آں دو رکعت نماز ہنیچ کہ در رسالہ حقیقت الصلوٰۃ است، من وعن بیان فرمودہ مولانا دستِ مولانا عبدالحیٔ صاحب گرفتہ بخدمت سید المجاہدین بشتافتند، وہمچوں مولانا مذکور حضرت مولانا شہید ہمہ فراغ صلوٰۃ مقصد و مطلب خود یافتند[۲۵]

کے حکم سے خود امام بن کر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو آغاز نبوت میں پڑھائی تھی آؤ اور کھڑے ہو کر دو رکعت نماز کے تحریمہ کی نیت میری اقتدا میں باندھو۔ مولانا علیہ الرحمہ نے حسب الارشاد موصوف کی اقتداء میں اسی جگہ میں دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی۔ موصوف اکثر فرماتے تھے کہ جو کچھ میں نے ان دو رکعتوں میں پایا ہے وہ کبھی عمر میں نہیں پایا۔

مولانا موصوف نے نماز سے فراغت کے بعد سید شہیدؒ سے اجازت لی، اپنے گھر تشریف لائے اور فوراً مولانا محمد اسمٰعیل شہید کو جو مولانا ممدوح کے نامور تلامذہ میں سے تھے بلاکر ان دو رکعتوں کا حال اسی طریقہ پر جو رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں مذکور ہے من وعن بیان فرمایا مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ مولانا عبدالحیٔ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر سید شہیدؒ کی خدمت میں آئے اور مولانا موصوف کی طرح مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے بھی بعد فراغت نماز اپنا مقصد پالیا۔

مذکورہ بالا اقتباسات میں رسالہ حقیقت الصلوٰۃ کا ذکر دو مرتبہ آیا ہے۔ جس میں اس امر کی بھی تصریح ہے کہ "مصنفہ آں حضرت است" لیکن تعجب ہے کہ سید صاحبؒ کے نامور سوانح نگار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "سیرت سید احمد شہید" میں اور مولانا غلام رسول مہر نے "سید احمد شہید" میں اس واقعہ کو مخزن احمدی کے حوالہ سے نقل کیا ہے مگر انہیں پھر بھی رسالہ حقیقت الصلوٰۃ کے سید صاحبؒ کی تصانیف سے ہونے پر متنبہ نہ ہو سکا۔

ان کے پیش رو منشی محمد جعفر تھانیسری المتوفی ۱۹۰۵ء نے تواریخ عجیبہ موسوم بہ سوانح احمدی

میں یہ واقعہ بیعت ہی کو نہیں بیان کیا بلکہ اس تقریر کو جو رسالہ حقیقت الصلوٰۃ میں مذکور ہے اختصار اور اپنے اضافہ کے ساتھ زینت کتاب بھی کر دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اختتام اقتباس پر لفظ انتہی بھی لکھ دیا ہے وہ خاتمہ اقتباس یہ ہے۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہہ کر دربار سے رخصت ہو جائے انتہی[٢٦] اور پھر یہ بھی تحریر فرمایا ہے یہ تقریر کا خلاصہ ہے جو سید صاحبؒ نے مولوی عبدالحی صاحب سے فرمائی تھی، ورنہ اس پوری تقریر اور تشریح کے بیان کرنے سے خود مولوی عبدالحی صاحب قاصر تھے[٢٧]

منشی محمد جعفر تھانیسری نے مذکورہ بالا اقتباس اگرچہ سید صاحبؒ کی تصنیف حقیقت الصلوٰۃ ہی سے نقل کیا ہے مگر اس کا نام تک نہیں لیا ہے اور نہ سید شہیدؒ کے سلسلۂ تصانیف میں کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔

مولانا کرامت علی جونپوری المتوفی ۱۲۹۰ھ نے مولانا عبدالحیؒ سے انہی کے الفاظ میں واقعہ بیعت کی جو تقریر "نور علی نور" میں نقل کی ہے اس میں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحیؒ نے جواب کو مسائل کے سوال کی حد تک محدود رکھا ہے اور صرف آپ بیتی کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ سید شہیدؒ کی تقریر سے تعرض نہیں کیا اسی لئے اس میں رسالہ حقیقت الصلوٰۃ کا ذکر نہیں آیا ہے مولانا کرامت علی جونپوریؒ کے اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مولف مخزن احمدی کا یہ لکھنا کہ شاہ عبدالقادر قدس سرہ کہ دراں مسجد مقیم بودند" یہ ان کا سہو ہے، موصوف کا بیان ہے۔

اب مرشد برحق سید احمد قدس سرہ جو مرشد صاحب تاثیر تھے اور ان کے صاحب طریقہ ہونے کا بیان جو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے فرمایا تھا اس حکایت کو سنو۔

حکایت، اس حکایت سننے کے پہلے یاد رکھو کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ حضرت سید احمد صاحب کو ان کے ابتدار وقت سے پیر صاحب کہا کرتے تھے اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب اور ہم سب معتقد لوگ میاں صاحب کہا کرتے تھے اور مولانا عبدالحی مولانا محمد اسمعیل کو میاں محمد اسمعیل کہا کرتے تھے، چونکہ اس حکایت کو ہم بجنسہ لفظ بلفظ بیان کریں گے اور یہ لفظیں اس میں آویں گے۔ اس واسطے ان لفظوں کے یاد رکھنے کو کہا اب وہ حکایت سنو؟

ایک روز اس عاجز مسکین نے حضرت عالم ربانی مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ سے عرض کیا کہ آپ

جو اس قدر میاں صاحب سے اعتقاد رکھتے ہیں اور روپے پیسے کپڑے وغیرہ دنیاوی چیزوں کو چھوڑ کے میاں صاحب کی صحبت اختیار کئے ہیں، اور آپ کے بدن پر جو کپڑا ہے اس کے سوا آپ کے پاس کہیں کپڑا بھی نہیں اور آپ جب میاں صاحب کے روبرو بات کرتے ہیں تو ترساں اور لرزاں رہا کرتے ہیں۔ تو للہ آپ ہم سے سچ بیان کیجئے کہ آپ نے میاں صاحب سے کیا پایا جو اپنا حال ایسا بنایا تب مولانا مغفور نے فرمایا کہ انشاءاللہ تعالیٰ میں سچ بیان کرونگا۔

سنو میرا یہ حال تھا کہ میں سلوک الی اللہ اور مشاہدہ حاصل ہونے کا بڑا مشتاق تھا۔ تب میں نے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ سے عرض کیا کہ مجھ کو آپ سلوک الی اللہ تعلیم کیجئے اور اس کے قبل میں بہت سے ہندی اور ولایتی مرشدوں سے توجہ لے چکا تھا مگر میرا مقصود حاصل نہ ہوا تھا تب آپ نے مجھ کو حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ کے پاس بھیجا وہاں بھی چند روز توجہ لیتا رہا مگر میرا مقصد حاصل نہ ہوا تب میں نے حضرت مولانا سے پھر عرض کیا کہ یہ خادم حضور کے توجہ کا محتاج ہے اور حضور دوسرے مقام میں بھیجتے ہیں ہم کو آپ خود تعلیم کیجئے۔

تب حضرت مولانا نے فرمایا کہ میاں میں بہت بڈھا اور کمزور ہوں اور مجھ میں بہت دیر تک بیٹھنے کی طاقت نہیں یہ مقصد تمہارا میر احمد صاحب سے حاصل ہوگا تم ان سے بیعت کرو تب اس جناب کا یہ فرمانا مجھ کو بہت شاق گزرا اور میں ناراض ہو کے چپ رہا پھر کئی بار اور بھی عرض کیا وہی جواب پایا۔

آخر کو بعد چند روز کے یہ واقعہ در پیش ہوا کہ میں اور حضرت میاں صاحب اور میاں محمد اسماعیل مدرسہ کے ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے ایک شب کو بعد عشا کے جب ہم تینوں شخص پلنگ پر سوئے تب میاں صاحب نے فرمایا کہ مولانا مجھ کو حضرت رب العلمین نے اپنے فضل و کرم سے بطور الہام کے خبر دیا ہے کہ فلانی تاریخ فلانے سفر میں تو جاوے گا فلانے مقام میں یہ ہوگا فلانے مقام میں وہ ہوگا اور اس قدر لوگ مرید ہوں گے۔ وعلی ہذالقیاس سب باتیں بیان کیا۔[۲۸] پھر دوسرے روز بھی ایسی عجیب و غریب باتیں بیان کیا اسی طرح سے کئی روز تک مکہ معظمہ کے سفر اور جہاد کے سفر اور جہاد کے واقعات کا بیان بتفصیل تمام فرمایا تب ہم نے اور میاں محمد اسمٰعیل نے مشورہ کیا کہ اگر یہ سب باتیں سچ بیان کرتے ہیں تو بلاشبہ یہ بہت بڑے شخص اور قطب ہیں ان سے کچھ فیض لینا بہت ضرور ہے۔ سوا کسی بات میں ان کا امتحان کریں تب میاں محمد اسمٰعیل نے کہا کہ آپ ہم سے بڑے ہیں آپ ہی

تجویز کر کے کسی بات میں امتحان کیجئے آخر کو جب پھر رات کو میاں صاحب نے پکارا کہ مولانا تب ہم نے عرض کیا کہ حضرتؒ آپ کی بزرگی میں کچھ شبہ نہیں مگر ہم کو ان سب باتوں سے کیا فائدہ کچھ ہم کو عنایت کیجئے تب فرمایا کہ مولانا کیا مانگتے ہو تب ہم نے کہا کہ حضرت یہی مانگتے ہیں کہ جیسی نماز صحابہ کرام ادا کرتے تھے، ویسی ہی دو رکعت ہم سے ادا ہو یہ کہا اور میاں صاحب ایک بارگی خاموش ہوگئے اور کئی روز پھر کچھ نہ بولے تب ہم لوگوں نے جانا کہ فقط زبانی باتیں تھیں اصل باتوں سے ان کو کچھ علاقہ نہیں مگر ہمیشہ کی دوستی اور صحبت کی مروّت سے ہم لوگ کچھ نہ بولے کہ اب شرم دینا کیا ضرور اور چپ کر کے سو رہتے پھر آدھی رات کے کچھ قبل یا بعد حضرتؒ میاں صاحب نے پکارا مولانا اس پکارنے سے مجھ کو قشعریرہ ہوا اور بدن پر رونگٹے کھڑے ہوگئے اور اس جناب سے مجھ کو بڑا اعتقاد آگیا، تب میں نے جواب میں کہا حضرتؒ تب فرمایا کہ جاؤ، اس وقت اللہ کے واسطے وضو کرو تب میرے بدن پر پھر قشعریرہ ہوا اور میں نے کہا کہ بہت خوب دو تین قدم میں چلا تھا کہ پھر پکارا مولانا سن لو میں پھر کے حضرتؒ کے پاس حاضر ہوا فرمایا تم نے خوب سمجھا میں نے کیا کہا کہ اللہ کے واسطے وضو کرو، پھر میں نے کہا بہت خوب، اور چلا دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا اور اسی طرح فرمایا، اسی طرح تین بار کیا اور تیسری بار جا کے میں وضو کرنے لگا تو ایسا حضور دل اور حق سبحانہ کے خوف سے میں نے ادب کے ساتھ وضو کیا کہ ایسا وضو کبھی نہ کیا تھا۔ پھر وضو کر کے حضرتؒ کے حضور میں حاضر ہوا، فرمایا کہ جاؤ، اللہ رب العالمین کے واسطے اس وقت دو رکعت نماز پڑھو تب میرے بدن پر قشعریرہ ہوا اور نماز کے واسطے چلا۔

دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا اور میں حضور میں حاضر ہوا فرمایا کہ تم نے خوب سمجھا یا نہیں میں نے کہا کہ بہت خوب اور نماز کے واسطے چلا پھر تیسری بار پکارا اور ویسا ہی سمجھا دیا تب میں نے ایک گوشہ میں نماز شروع کی تو تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہی ایسا مشاہدہ جلال میں غرق ہوا کہ ہوش نہ باقی رہا اور اس قدر رویا کہ آنسو سے ڈاڑھی تر ہوگئی .... اور اس قدر نماز میں غرق ہو گیا کہ دنیا کی یاد مطلق نہ باقی رہی اور نہایت خوف اور لذت کے ساتھ میں نے دو رکعت نماز پڑھی جب دو رکعت پڑھ لی تو خیال کیا کہ میں نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھا۔ پھر سلام پھیر کے دوبارہ دوسری بار دو رکعت کی نیت کیا پھر جب پڑھ چکا تو خیال کیا کہ فاتحہ میں سورہ کو ضم نہ کیا تھا پھر شروع کیا اسی طرح ہر بار ایک ایک ادب کے ترک کرنے کا خیال آتا تھا اور نماز کو ناقص سمجھ کے دہراتا تھا۔ واللہ اعلم۔

سو رکعت یا زیادہ کم پڑھا ہوگا کہ صبح صادق کا قریب ہوا پھر آخر کو ناچار ہو کے سلام پھیرا اور بہت شرمندہ ہوا کہ میری استعداد اس طرح کی ناقص ہے کہ دو رکعت پوری بھی حضور دل کے ساتھ نہ پڑھ سکا اور اتنے کامل شخص کو میں نے آزمایا اب اگر پوچھیں کہ تم نے دو رکعت اللہ کے واسطے پڑھا تو میں کیا جواب دوں گا، میں تو حضور دل کے ساتھ جیسا کہ حق نماز پڑھنے کا ہے ویسا دو رکعت بھی نہ پڑھ سکا اسی سوچ میں شرم کے دریا میں غرق ہوگیا اور اپنے قصور کا معترف ہو کے اللہ سبحانہ سے استغفر اللہ استغفر اللہ کہنے شروع کیا جب اذان ہوئی تب مجھ کو ہوش ہوا اور یاد پڑا کہ صحابہ کرام کا یہی حال تھا کہ تمام رات عبادت کرتے اور پچھلی رات استغفار کرتے تھے، ان کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا المستغفرین بالاسحار اور سوچا کہ بلاشبہ یہ بڑے کامل مرشد ہیں کہ ان کے کلام سے میرا مقصد پورا ہوا اور جو نعمت مدت دراز کی محنت میں حاصل نہ ہوئی تھی سو ان کے ایک دم فرمانے سے حاصل ہوئی۔

پھر میں مسجد میں گیا اور قبل نماز فجر کے میں نے حضرت میاں صاحب سے بیعت کیا اور صبح کی نماز کے بعد میاں محمد اسمٰعیل سے میں نے رات کا قصہ پورا بیان کیا اور اپنے بیعت کرنے کا بیان کیا آپ نے فرمایا بارک اللہ بارک اللہ خوب کیا میاں میں تم سے اس واسطے کہا کرتا تھا کیوں میاں تم نے میر صاحب کا کمال دیکھا تب میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے بہت درویشوں کی خدمت کیا اور بہت طریقوں کے موافق میں نے شغل اور مراقبہ کیا میرا مقصد کبھی نہ حاصل ہوا حضرت سید صاحب نے ایک بات زبان سے کہہ دیا اور میں دلی مقصد پاگیا حضرت کو یہ کون طریقہ کہلاتا ہے۔

تب فرمایا کہ میاں ایسے لوگ کسی طریقہ کے محتاج نہیں ہوتے ایسے لوگ جو زبان سے کہیں وہی طریقہ ہے ایسے لوگ خود صاحب طریقہ ہوتے ہیں، اور ایسے لوگ طریقہ نکالتے ہیں حضرت مولانا کے فرمانے سے اور بھی زیادہ مجھ کو حضرت میاں صاحب کے مرشد صاحب طریقہ ہونے کا یقین ہوا اور میرا اعتقاد اور بھی زیادہ ہوا اس سبب سے میں میاں صاحب کی غلامی میں حاضر ہوں اور ان کی غلامی کے قابل بھی میں اپنے تئیں نہیں پاتا۔

تمام ہوئی تقریر مولانا عبدالحی مرحوم کی۔

بس حضرت مرشد برحق کے صاحب طریقہ ہونے کے واسطے ہندوستان اور بنگالے کے سارے اہل سنت وجماعت کے نزدیک حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کا اس قدر فرمانا کفایت ہے۔[29]

واضح رہے صاحب مخزن احمدی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید شہیدؒ نے خود مولانا عبدالحی کو دو رکعت نماز پڑھائی اور نور علی نور میں جو تقریر نقل کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحی نے خود نماز پڑھی ہے یہ تعارض جو بظاہر ان دونوں بیانات میں نظر آتا ہے اس میں تطبیق اور جمع کی صورت یہ ہے کہ سید شہیدؒ نے پہلے خود دوگانہ پڑھائی اور پھر انہوں نے جدا جدا پڑھی چنانچہ مقالات طریقت (مطبع متین کرمان حیدرآباد دکن) صفحہ ۱۹۰ میں مذکور ہے۔

حضرت سید شہیدؒ نے اپنے ساتھ ان کو نماز میں کھڑا کیا جب نماز پڑھ چکے تو فرمایا کہ اب جدا جدا نیت باندھ کر ایک دوگانہ علیحدہ ادا کرو جب کھڑے ہوئے تو اس طرح استغراق ہوا کہ دو رکعت ہی میں شب بسر ہو گئی جب یہ فیض باطن مشاہدہ کیا تو صبح کو دونوں صاحبوں نے بیعت کی اور یہاں تک آپ کی کفش برداری میں حاضر رہے کہ کفش برداری کو فخر جانتے تھے، چند روز کے بعد آپ نے فرمایا کہ مولانا مشیت الٰہی میں یہ ہے کہ تم کو تکمیل اس علم کی اور تتمیم ان مراتب کی سفر میں حاصل ہو ان کو ہمراہ لے کر مکہ معظمہ کا سفر کیا۔

موضوع حقیقۃ الصلوٰۃ

حقیقت الصلوٰۃ اور اسرار صلوٰۃ کے موضوع پر حجۃ الاسلام ابو حامد غزالی المتوفی ۵۰۵ھ نے احیاء علوم الدین (طبع مصر ۱۳۵۸ھ ج۔ ا صفحہ ۱۵۱ تا ۲۱۰) میں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ طبع بریلی ۱۲۸۶ھ صفحہ ۱۲۵ میں اور ان کے شاگرد حافظ علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی ثم زبیری ثم عصری المتوفی ۱۲۰۵ھ نے اتحاف السادۃ المتقین لشرح احیاء علوم الدین (جلد سوم طبع مصر ۱۳۱۱ھ) میں اور خواجہ میر درد المتوفی ۱۱۹۹ھ نے رسالہ اسرار الصلوٰۃ میں محققانہ اور عالمانہ انداز میں نہایت دقیق نکات و اسرار کی نشاندہی کی ہے لیکن سید احمد شہیدؒ کی اس موضوع پر تقریر اپنے پیشروؤں سے مختلف اور جدا ہی نہیں بلکہ سادہ اور سہل اور آسان بھی ہے کہ عالم و جاہل ہر ایک اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے رسالہ حقیقۃ الصلوٰۃ اپنے بعض خوبیوں کے لحاظ سے یکتا ہے اور اس موضوع پر اردو زبان میں پہلی کتاب سید شہید کی عجیب یادگار ہے جس کا محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے

اس تصنیف سے سید احمد شہیدؒ کی دقت نظر، انداز فکر مسائل کی حقیقت اور روح شریعت تک رسائی پر بھی روشنی پڑتی ہے نیز معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مشکل سے مشکل مسائل کو سیدھی سادی مثالوں سے سمجھانے پر بڑی قدرت حاصل تھی۔

اس کتاب کے مطالعہ سے اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سید احمد شہیدؒ کو خانوادہ ولی اللہی سے

فہم مسائل میں گہری علمی مناسبت حاصل ہو گئی تھی چنانچہ وہ اسرار و معارف اور دقیق علمی نکتے بھی خوب بیان کرتے تھے اور یہ خانوادہ ولی اللہی کا طغرائے امتیاز ہے، ناظرین کو اس امر کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ جو محمد ابراہیم ضیار نے حاجی محمد حسین سہارنپوری کے واسطے سے ان کے استاد مولوی وحیدالدین پھلتی شاگرد شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ سے نقل کیا ہے کہ۔

ایک دن آپ (سید احمد صاحب) نے مولوی وحیدالدین صاحب مسطور (جن کا ذکر اوپر آیا ہے) سے فرمایا کہ تم مجھ سے کوئی علمی بات نہیں پوچھتے اس کا کیا سبب ہے انہوں نے عرض کی کہ میرے استاد مولانا اسماعیل حضرت سے جو پوچھتے ہیں اس کا جواب پاتے ہیں مجھ میں کیا حوصلہ ہے کہ کچھ پوچھوں آپ نے فرمایا خیر وہ پوچھیں تو پوچھیں تم بھی کچھ پوچھو۔ انہوں نے پوچھا کہ :۔

الرکن الاسود یمین اللہ فی الارض یصافح بھا عبادہ کما یصافح احدکم اخاہ کے کیا معنی ہیں۔

فرمایا یہ تو او رمتشابہات کی جیسی بات ہے جس طرح کہ "ید" اور "وجہ" آیا ہے ویسا یہ بھی ہے دوسری بات اس میں یہ ہے کہ کعبہ عوام کے واسطے ثواب کی جگہ ہے جیسا کہ فرمایا مثابۃ للناس موضع (ثواب کا آدمیوں کے واسطے) وہاں جانے اور طواف کرنے سے گناہ دور ہوتے ہیں۔ ثواب حاصل ہوتا ہے اور خواص کو ایک نسبتِ خاص ہے کہ عوام کو نصیب نہیں۔

اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب مرید مرشد کے روبرو بیٹھتا ہے اور مرشد کے انوار اور برکات اس میں حسب استعداد اس کے اثر کرتے ہیں تو مرید کا باطن نہایت پُرانوار اور شوق و ذوق سے بیقرار ہوتا ہے تو مرید چاہتا ہے کہ مرشد کے تصدق ہو جئے اور قدم چومئے۔ مرشد اس کا شوق و ذوق دیکھ کر ہاتھ بڑھاتا ہے تا وہ دست بوسی کرے اور اس کو تسکین ملے۔ اسی طرح ارباب نسبت جب طواف میں مشغول ہوتے ہیں تو ان کا باطن شوق و ذوق سے نہایت بے قرار ہوتا ہے حجر اسود کا بوسہ لیتے ہیں تو اپنے باطن میں تسکین پاتے ہیں۔

دفتر صوفی سواد حرف نیست — جز دل اسپید ہمچو برف نیست

زاد دانشمند آثار قلم — زاد صوفی چیست اسرار قدم

انچہ تو در آئینہ بینی عیاں — پیر اندر خشت بیند پیش از آں

در دلِ انگورِ مے را دیدہ اند   در فنائے محض شی را دیدہ اند[۳۲]

حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کو دہبی علوم سے جو حصہ وافر ملا تھا۔ اس سے سید شہیدؒ محروم نہیں رہے۔ انہیں بھی اس نعمت سے نوازا گیا۔ یوں سید شہیدؒ کو ظاہری و باطنی جامعیت حاصل ہوئی۔ دیکھو کمال باطنی کا یہ حال تھا کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو آپ کی صحبت ہی نے خدا رسیدہ بنا دیا تھا۔ اس امر کا اندازہ ناظرین کو صرف ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے، جو حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ تھانوی نے استاذ الاساتذہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی المتوفی ۱۳۰۲ھ سے نقل کیا ہے موصوف کا بیان ہے۔

استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ ایک عامی شخص نانوتہ کی مسجد میں نماز پڑھنے آتے اور وہ جب آتے تمام مسجد منور ہو جاتی تو پتہ نہ چلا کہ یہ انوار کس سبب سے ہیں۔ پھر بعد غور معلوم ہوا کہ فلاں شخص کے آنے پر ہوتے ہیں ان کی وضع سے اس کا گمان بھی نہ ہوتا تھا اس لئے اوّل اوّل تذکرہ ہی نہیں کیا۔ احتمال رہا کہ شاید اور کچھ سبب ہو مگر جب تکرار مشاہدہ سے اس کی تعین ہو گئی کہ یہی شخص اس کا سبب ہیں تو ان سے دریافت کیا کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ ذاکر شاغل بھی معلوم نہ ہوتے تھے، انہوں نے کہا کہ میں تو کچھ نہیں جانتا مگر حضرت صاحبؒ (سید احمدؒ) کی صحبت میں البتہ چند روز رہا ہوں۔ یہ اس کی برکت تھی[۳۳]

جب جہاد کی دعوت دی تو خلق خدا پر جو اثر ہوا ہے اس کا نقشہ حافظ محمد حسین مرادآبادی نے حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

مسلمانان ہندوستان را بر تحریض جہاد تعلیم ظاہر نمودہ نفیر عام کردند و نیز تسخیر قلوب مریدان و جذب معتقدان نمودند آنچناں ہمت باطن بر خاص و عام ریختند کہ مسلمانان دیار ہند برادر برادر را و پسر مادر را و پدر پسر و دختر را و زوج زوجہ را گذاشتہ ہمراہ آنجناب شدہ۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا اور پھر جہاد کی نفیر عام کی۔ مریدوں کے قلوب کو مسخر کیا۔ معتقدوں کو اپنی طرف کھینچا اور اپنے فیض باطنی سے عام و خاص پر ایسی توجہ فرمائی کہ دیار ہند کا مسلمان بھائی بھائی کو، بیٹا ماں کو، باپ بیٹے اور بیٹی کو اور شوہر بیوی کو چھوڑ کر حضرت ممدوحؒ کے ساتھ ہو لیا۔

توجہ، مراقبے اور اشغال تصوف کی تحقیق موصوف کو ایسی تھی کہ اوروں کو کم ہو گی صراط مستقیم اس پر شاہد عدل ہے۔

کمال ظاہری کا یہ حال تھا کہ مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جیسے جلیل القدر علماء جن کا ثانی کم پیدا ہوگا اپنے شبہات علمی پوچھتے اور جواب باصواب پاتے تھے،

اسی ذات قدسی صفات نے نماز کی حقیقت کو حقیقت الصلوٰۃ میں سمجھایا ہے یہ ایک مختصر رسالہ اردو زبان میں اس اعتبار سے خاص مقام رکھتا ہے کہ سید احمد شہیدؒ نے اس میں نماز کے طریقے اس کی حقیقت اور ارکان صلوٰۃ کی باہمی ترتیب ومناسبت کو عام فہم سادہ اور سلیس اردو میں لکھا ہے انداز بیان بھی بڑا دلکش اور دلنشین ہے[۳۵]

"حقیقۃ الصلوٰۃ" اور "حقیقت نماز" کے نام سے اردو کے بعض نامور اہل قلم نے بھی کتابیں لکھی ہیں ان کو پڑھ لیں اور اس چھوٹے سے رسالہ کو بھی آپ کو خود اندازہ ہوجائیگا کہ کس کی بات دل پر اثر کرتی ہے۔

رسالہ حقیقۃ الصلوٰۃ

الٰہی شکر تیرے احسان کا کہ تو نے ہمارے دل کو روشن اور زبان کو گویا کیا اور ایسے نبی مقبول کو خلق اللہ کی ہدایت کے واسطے بھیجا کہ جس کی ادنیٰ شفاعت سے دونوں جہان کی نعمت پاویں۔ اور اس کی رہنمائی سے عرفان کی لذت اٹھاویں۔

پس درود اس نبی مختار اور اس کے آل اطہار اور اصحاب کبار پر ہوجیو کہ جس نے بشر کو ضلالت اور گمراہی سے باز رکھا اور علماء وفضلاء کو زیور علم ودانش سے آراستہ کیا۔

پیچھے حمد خدا اور نعت رسول کے ارباب دانش پر ظاہر ہوجیو کہ مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے رب کو پہچانے اور اس کی صفات جانے اور اس کے حکم کو معلوم کرے اور مرضی نامرضی اس کی تحقیق کرے کہ بغیر اس کے بندگی نہیں اور جو بندگی بجا نہ لاوے بندہ نہیں۔

اور بڑی بندگی نماز ہے کہ بدون اس کے کوئی بندگی قبول نہیں کیونکہ سر سب بندگیوں اور بُرے کاموں سے بچنے کا یہی ہے اور اس نماز سے کوئی غافل نہیں، نہ درخت، نہ عمارات نہ پرند، نہ حیوانات، نہ حشرات، نہ زمین، نہ پہاڑ، نہ ستارہ، نہ آسمان نہ ارواح، نہ فرشتے جیسے کہ نماز درخت اور عمارات کی قیام ہے اور پرند و حیوانات کی رکوع اور تمام حشرات کی سجود اور زمین پہاڑ کی قعود اور ستاروں اور آسمان کی حرکت اور ارواح اور فرشتوں کی طہارت اور تسبیح اور کلمہ شہادت اور تلاوت قرآن اور ذکر و دعا

اور اس انسان کو کہ خاص چیلا سرکاری ہے، ساری خوبیاں تھوڑے عرصہ میں مرحمت فرمائیں اور خلیفہ کر کے سب پر اس کو حکم دیا، جس نے فرماں برداری کی اور حکم بجالایا اس کا منصب قائم رہا اور بہشتی ہوا۔ اور جس نے نافرمانی کی اور حکم پر قائم نہ رہا وہ بے منصب ہوا اور الٹے پاؤں دوزخ میں گرا۔

اور جاننا چاہیئے کہ جو کوئی نماز پنجگانہ ادا کرتا ہے اس کو ثواب ایسا ملتا ہے جیسا زکوٰۃ اور حج اور روزے اور جہاد کا، اس طرح کہ خرچ پانی اور کپڑے کا خدا کی بندگی کے واسطے کرے۔ بجائے زکوٰۃ کے ہے اور رخ ہونا طرف کعبے کے حج ہے تکبیر تحریمہ بجائے احرام کے اور منہ طرف قبلے کے کرنا بجائے طواف کے اور کھڑا ہونا بجائے وقوف عرفات کے اور رکوع اور سجود اور رکعتیں مانند دوڑنے درمیان صفا مروہ کے اور موقوف کرنا کھانا پینا بجائے روزہ کے ہے اس لئے کہ صوم بند کرنا نفس کا ہے اور بند کرنے سے نفس کے ایک ساعت بھی اس کی خواہشوں سے ایک صورت صوم کی ہو جاتی ہے بلکہ بہ نسبت روزے کے ایک طور سے زیادہ بند کرنا ہے اس واسطے کہ توجہ ظاہری اور باطنی طرف غیر کے کرنا نہیں چاہیئے۔ اور دفع کرنا شیطان کا اور مشقت میں ڈالنا نفس کا اس کی سستیوں کے اوقات میں نماز اسی واسطے جہاد ہے لیکن نماز میں حضوری دل کی شرط ہے کہ بدون اس کے نماز پوری نہیں لکھی جاتی بلکہ کبھی آدھی کبھی تہائی یا چوتھائی یا پانچواں حصہ یا چھٹا یا ساتواں یا آٹھواں یا نواں یا دسواں، اسی واسطے ہے کہ ہر رکن نماز میں اتنا ٹھہرے کہ کوئی لحظ حضوری میسر ہو۔

اور حضوری کئی طرح پر ہے، ایک یہ کہ مضمون ہر رکن کا خیال کرے اور آپ کو سامنے رب کے جانے اور اس کو متوجہ حال اپنے کا سمجھے اور جونسی سورت پڑھے مضمون اسی صورت کا خیال کرے اگر مقام عتاب اور غصے کا ہے خوف کرے اور پناہ چاہے اور جو مقام رحمت اور عنایت کا ہے اس کو خدا سے طلب کرے اور سوا اس کے اور بھی باتیں ہیں کہ وے واسطے خاص کے ہیں نہ واسطے عام کے۔

اور حضوری بغیر تاثیر دل کے میسر نہیں اور تاثیر دل کی بدوں دانست معانی الفاظ کے حاصل نہیں۔ اسی واسطے جو کچھ نماز میں ہے معنی اس کے ہندی زبان میں محاورے کے موافق لکھے ہیں اکثر غریب لوگ جو ان معنوں سے مطلق بے خبر ہیں سمجھ کے حضور دل سے نماز گزاریں اور بہت سی حلاوت پاویں۔

اور ایک فائدہ اور ہے اگر معنی الفاظ کے جانیں تو سب برے کاموں سے کہ جن سے نقصان ایمان کا ہے بچیں اور معلوم کریں کہ جو اقرار اپنے رب کے سامنے کیا ہے اسی پر قائم رہیں۔

اور ہر ایک طالب ایمان کو لائق ہے کہ حقیقت نماز کی اس طور پر جانے کہ حضرت حق نے مجھ کو تمام پیدائش میں بہتر پیدا کر کے بڑی تاکید سے واسطے حاضر ہونے دربار کے پانچ وقت اذن مطلق دیا ہے اور محتاج اوس کے اذن کا اور احسان مند کسی دربان یا نقیب کا نہیں کیا اور غیر حاضری پر وعدہ سخت عذاب کا فرمایا اور جاننا چاہیئے کہ ایسی نعمت عظمیٰ سے محروم رہنا اور وعدہ سخت عذاب کا سر پر لینا بڑی نادانی اور کمینہ پن ہے۔ پس اسی طرح عظمت نماز کی خوب سمجھ کر تمام آداب کہ لائق قبولیت بارگاہ بادشاہ حقیقی کے ہو دیں بجا لاوے۔

پہلے طہارت اور پاکیزگی کرے یعنی وضو کرے اور جو حاجت نہانے کی ہو غسل کرے جیسا کہ کوئی جب بادشاہی دربار کے جانے کا ارادہ کرتا ہے پہلے حمام کرتا ہے پھر کپڑے پہن کے جاتا ہے بعد اس کے منہ طرف کعبے کے کھڑا ہو کر کرے۔

(فائدہ) اس میں یہ ہے کہ کعبہ ناف زمین ہے اور تمام زمین اسی سے پھیلائی گئی ہے اور پیدائش جسم آدمی کی خاک سے ہے جب ظاہر جسم اپنے کو طرف اس کی اصل کے متوجہ کیا باطن کو بھی یعنی روح کو طرف اس کی اصل کے یعنی حق تعالیٰ پیدا کرنے والا اس کا ہے متوجہ کیا چاہیئے اور ہمیشہ اوقات پنجگانہ نماز بلا شبہ وقت دربار اور حضور کا جان کر حاجات اپنی عرض کرے۔

اب بیان نماز کا اور معنی الفاظ کے مثال پر سمجھیے۔ مثلاً جس وقت کوئی بندہ قصد مناجات اور عرض حاجات کا دل میں مقرر کر کے حاضر دربار خاص کا ہو اور بہایت تعظیم اور عقیدہ درست اور نیت خالص سے روبرو اس بادشاہ عالی جاہ کے کھڑا ہو کر اور رخ التفات کا اور طرف سے پھیر کر کہے اللہ اکبر اللہ بہت بڑا ہے۔

(فائدہ) تو اسی وقت بادشاہ عالی جاہ اپنے بندے کے قصد اور ارادے پر مطلع ہو کے عنایت خاص مرحمت فرماتا ہے۔

(فائدہ) اور اٹھانا دونوں ہاتھوں کا تکبیر میں دست بردار ہونا دونوں جہان سے ہے۔

(فائدہ) نیت اور تکبیر فرض ہے بعد اس کے دعا استفتاح ہے اور اس میں تعظیم اور توحید ہے وہ یہ ہے۔

(فائدہ) سبحانک اللھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جدک ولا الٰہ غیرک

یعنی ساتھ پاکی کے یاد کرتا ہوں میں تجھ کو اے اللہ اور ساتھ تعریف تیری کے اور بہت خوبیوں کا ہے نام تیرا ہے اور بہت بلند ہے مرتبہ تیرا اور نہیں کوئی لائق بندگی کے سوا تیرے۔

(فائدہ) یہ دعا سنت ہے کہ جس قدر کلام تعظیم اور توحید کے اس بندے کی زبان سے صادر ہوتے ہیں عنایت شاہی اس پہ دوچند نازل ہوتی ہے ایسے وقت نزول رحمت الٰہی کے خیال سے کہ حضور بادشاہ کا میسر ہے دل اپنا حاضر کر کے حاجات اپنی عرض کرے لیکن پہلے عرض سے مضمون دفع شیطان کا کہ وہ بڑا حارج اور دشمن قدیم ہے ہوشیار ہو کر دل میں لاوے اور زبان سے کہے۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم (مسلسل)

شیخ محی الدین ابنِ عربی

ابو بکر شبلی

شیخ محی الدین ابن عربی اندلس کے مشہور عالم صوفی اور شاعر تھے۔ نظریۂ وحدۃ الوجود کے سرگرم مبلغ تھے۔ شیخ اکبر اور رئیس المتکلمین کے القاب سے آپ کو یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کا نسب یہ ہے۔

"محمد بن علی بن محمد بن احمد بن عبداللہ حاتمی الطائی"

آپ عدی بن حاتم کے بھائی عبداللہ بن حاتم کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کا تعلق قبیلہ طی سے تھا۔ آپ کی کنیت ابوبکر اور لقب محی الدین ہے اہل مشرق انہیں ابن عربی کہتے ہیں، تاکہ ان میں اور قاضی ابوبکر بن العربی میں تمیز ہو سکے۔ لیکن اہل مغرب آپ کو ابن العربی ہی لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ آپ نے خود بھی اپنے آپ کو ابن العربی ہی لکھا ہے۔ آپ اندلس میں ابن سراقہ کے نام سے مشہور ہیں۔ ننھیال کی طرف سے آپ کا نسب مدینہ کے انصار سے جا کر ملتا ہے[1]

آپ اندلس کے مشہور شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت بروز شنبہ مورخہ ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۵۶۰ھ میں ہوئی۔ مرسیہ اس وقت اندلس کا نہایت بارونق شہر تھا اس میں بکثرت نزہت گاہیں تھیں وہ علم و ادب کا بھی مرکز تھا۔ لیکن آپ کی ولادت کے بعد وہ سیاسی انتشار کی زد میں آگیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ جب آپ آٹھ سال کے

---

[1] مقدمہ تنزل الاملاک من عالم الارواح الی عالم الافلاک۔ ص ۹

ہوئے اور مرسیہ کے سیاسی حالات زیادہ مخدوش ہوگئے تو والد مرسیہ چھوڑ کر ۵۶۸ھ میں مستقل طور پر اشبیلیہ آکر مقیم ہو گئے۔ اس وقت مرسیہ پر موحدین کا قبضہ ہو چکا تھا۔ البتہ اشبیلیہ پر ابھی تک سلطان محمد بن سعد کی حکومت تھی۔ اشبیلیہ اس وقت علم و فضل کا عظیم مرکز تھا۔ اس میں علماء و صلحا بکثرت موجود تھے آپ نے اپنے وقت کے بہترین اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ ابو بکر بن خلف، ابو بکر محمد بن ابی جمرہ، ابن الموثّق، ابن زرقون، ابو محمد عبدالحق اشبیلی، ابن عساکر، ابو الفرج ابن الجوزی، ابو القاسم بن بشکوال، حافظ بن الجد، ابو الولید الحضرمی، ابو محمد بن عبداللہ، ابو محمد عبدالمنعم بن محمد الخزرجی، ابو القاسم الحرستانی، ابو الحسن بن نصر اور ابو طاہر السلفی کے نام شامل ہیں۔ یہ سب کے سب اپنے دور کے بہترین علما تھے۔ اور ان میں زیادہ تر ظاہری مسلک کے پیرو تھے اور بعض ابن حزم کے شاگرد تھے۔

ابن عربی کے بارے میں امیر شکیب ارسلان اور دوسرے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ ظاہری المذہب فی العبادت اور باطنی النظر فی الاعتقادات[1] تھے۔ ابن حزم سے متاثر تھے اور فقہ میں ان کے مسلک کو پسند کرتے تھے۔[2]

شروع میں ابن عربی صرف علوم ظاہریہ میں منہمک تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ تصوف کی طرف راغب ہوتے گئے۔

تصوف کی طرف ان کی رغبت کی متعدد وجوہات ہیں۔ سب سے اہم عامل جس نے آپ کو تصوف کی طرف مائل کیا، وہ آپ کا خاندانی ماحول تھا۔ آپ کے والد بڑے زاہد عابد اور متقی عارف باللہ اور اہل دل تھے۔ ابن عربی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ایسے لوگوں (عارفین باللہ) کی صفات میں سے ایک صورت یہ ہے کہ مرنے کے بعد ان کے چہرہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ زندہ ہیں مرے نہیں۔ یہی منظر میں نے اپنے والد کی وفات کے وقت دیکھا جب ہم انہیں دفن کر رہے تھے، تو ہمیں شک تھا کہ وہ مر گئے ہیں

---

[1] الحلل السندسیہ ج ۳ ص ۵۱۴

[2] ایضاً

یا زندہ ہیں۔ کیونکہ ان کی صورت و شکل بالکل زندہ لوگوں جیسی تھی۔ ان کی رگیں پرسکون تھیں۔ اور ان کی حالت مردہ لوگوں جیسی نہیں تھی۔ آپ نے مرنے سے پندرہ دن پہلے مجھے بتایا تھا کہ میں بدھ کے دن اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اور ایسا ہوا۔[۱]

اسی طرح آپ کے ماموں ابو مسلم الخولانی بھی بہت بڑے صوفی، زاہد اور عابد تھے۔ آپ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میرے ماموں ابو مسلم خولانی قائم اللیل تھے۔ جب (عبادت کرتے کرتے) آپ کے پاؤں تھک جاتے، تو اپنے پاؤں کو زور سے مارتے۔ اور کہتے، میری سواری کے جانور سے زیادہ تم مار کے مستحق ہو۔[۲]

اس طرح آپ کی زوجہ مریم بنت محمد بن عبدون بن عبدالرحمٰن الباجی بہت بڑی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ آپ اکثر ابن عربیؒ کو اپنے مواعظ و نصائح سناتی رہتی تھیں۔[۳]

اس خاندانی ماحول نیز دوسرے عوامل نے آپ کو تصوف کی طرف ہمہ تن مائل کر دیا۔ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ آپ کو اپنے وقت کے بہترین شیوخ کی صحبت نصیب ہوئی آپ کے جملہ شیوخ کی تعداد ۵۵ تک پہنچتی ہے جن کا ذکر آپ نے اپنی کتاب "رسالۃ القدس" (مطبوعہ سنہ۱۹۳۹ء پیرس) میں کیا ہے۔ ان میں مشہور حضرات یہ ہیں۔

ابو العباس العریبی۔ خمیس بن جراح۔ موسیٰ بن عمران المیرتلیؒ۔ ابو الحجاج یوسف شبربلیؒ۔ ابو عبداللہ بن المجاہد۔ ابو عبداللہ قسوم، نونۃ فاطمۃ بنت ابن المثنیٰ القرطبیہ۔ قرۃ العین، ابو عبداللہ الشرفی۔ ابو عبداللہ محمد الخیاط۔ احمد الحزاز۔ ابو علی حسن الشکاز۔ ابو محمد عبداللہ الباغی الشکاز اور عبداللہ المالقی وغیرہ۔ یہ تمام شیوخ اپنے وقت کے اقطاب تھے، خوف خدا، زہد، تقویٰ میں اپنی نظیر آپ تھے۔

ابو جعفر العریبی کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ بدوی تھے اور اُمّی بھی تھے۔ لکھنا پڑھنا نہیں

---

۱ الفتوحات المکیۃ ج ۱ بحوالہ مقدمہ تنزل الاملاک ص۱۰

۲ ایضاً

۳ تاریخ الفکر الاندلسی ص ۳۷۱

جانتے تھے، لیکن جب علم توحید پر گفتگو کرتے تو بہت سے علما حیران رہ جاتے۔ خود ابن عربی لکھتے ہیں۔

"میرا اور شیخ ابوالعباس العریبی کا ایک مسئلہ میں اختلاف ہو گیا۔ جو بات آپ کہتے تھے وہ میرے نزدیک صحیح نہیں تھی۔ اس لئے میں نے اس کے قبول کرنے میں تردد کا اظہار کیا۔ کیونکہ میں اپنی جگہ بصیرت پر تھا۔ لیکن جب میں ان سے رخصت ہو کر گھر واپس جا رہا تھا تو اشبیلیہ کے بازار حنہ میں ایک شخص مجھ سے آکر ملا اور اس نے بڑی شفقت و محبت سے مجھے سلام کیا۔ اور مجھ سے کہا۔ اے محمد! اپنے شیخ کی بات مان لو۔ جب میں دوبارہ شیخ کی خدمت میں گیا تو انھوں نے پھر وہی مسئلہ چھیڑا اس دفعہ میں نے اثبات میں جواب دیا اور کسی اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے کہا تم ویسے تو میری بات ماننے سے انکار کرتے ہو لیکن جب خضر آکر تجھ سے کہتے ہیں تو ان کا حکم مان لیتے ہو میں نے کہا۔ کیا وہ خضر تھے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ میں نے کہا تو پھر توبہ کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے؟ آپ نے کہا ہاں توبہ قبول ہوتی ہے۔[1]"

ابو عبداللہ الشرفی جب نماز میں کھڑے ہوتے تو اتنا روتے کہ آپ کی ڈاڑھی تر ہو جاتی اور آنسو پاؤں پر ٹپکتے رہتے۔ ابوالحجاج الشبربلی بڑے سخی تھے اگر آپ کھانا کھا رہے ہوتے اور کوئی آ جاتا تو آپ اس کو اپنے ساتھ شریک کر لیتے اس کا ہرگز خیال نہ کرتے کہ کھانا کم ہے یا کھانے والے زیادہ ہیں۔ ابو محمد عبداللہ الباغی الشکاز قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔ نونہ فاطمہ کے بارے میں ابن عربی "الفتوحات المکیہ" میں لکھتے ہیں۔

"وہ نوے سال کی تھیں کہ میں ان سے ملا، نہایت بوڑھی ہو چکی تھیں میں جب ان کی طرف دیکھنے کا ارادہ کرتا تو ان کی ہیبت اور وقار کی وجہ سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔[2]"

ابن عربی مسلسل دو سال تک ان کی خدمت میں رہے علم تصوف کی تکمیل کے بعد آپ کے دل میں مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ آسین کے قول کے مطابق آپ نے سب سے

لہ مقدمہ تنزل الاملاک من عالم الارواح الی عالم الافلاک صفحہ ۱۸

کہ تاریخ الفکر الاندلسی صفحہ ۲۸۶

پہلے مورو، مرشانتہ الزیتون، مدینۃ الزھراء، اور قبر رفیق کی سیاحت کی اس کے بعد آپ نے اندلس سے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ آپ سب سے پہلے ۵۹۰ھ ۱۱۹۶ء میں بجایۃ المغرب آئے۔ یہ المغرب کا مشہور شہر تھا۔ اور یہیں آپ نے صوفی ابو مدین شعیب بن حسن الاشبیلی سے ملاقات کی ابو مدین بڑے عارف اور اہل دل بزرگ تھے۔ بلاد مغرب (الجزائر۔ تیونس اور مراکش) میں آپ کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ علوم ظاہریہ میں بھی دریکتا تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک اور مریدوں کی تعداد لاکھوں تک تھی۔ آپ صاحب کرامات تھے۔ ابن عربی نے "الفتوحات المکیۃ" میں آپ کی کرامات اور فضائل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد آپ تیونس گئے۔ وہاں ابو القاسم بن قسی کے کتابوں کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ یہ صاحب بہت بڑے صوفی اور زاہد تھے انہوں نے ہی مریدین کی مدد سے مغربی اندلس میں مرابطین کے خلاف انقلاب برپا کیا تھا۔ یہاں آپ کی خضر علیہ السلام سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد تلمسان گئے، جہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ ۵۹۱ھ م ۱۱۹۰ء میں آپ کچھ مدت فاس میں رہے یہاں کی درس گاہ میں رہ کر آپ نے خوب مطالعہ کیا اور جو وقت مطالعہ سے بچتا وہ آپ ریاضت میں صرف کرتے اسی طرح حدیقہ ابن جیون میں آپ نے ریاضیات کیں اور یہیں سب سے پہلے آپ کو حالت اشراق میسر آئی۔ ابھی آپ فاس میں تھے کہ اندلس میں داخلی سیاسی انتشار زور پکڑ گیا اور موحدین کے لشکر المغرب سے اندلس جانے لگے۔ چنانچہ "الفتوحات المکیۃ" میں لکھتے ہیں۔

"میں ۵۹۱ھ میں فاس شہر میں تھا۔ اسی وقت موحدین کی فوج دشمن کا مقابلہ کرنے کیلئے اندلس جا چکی تھی۔ میرے ایک خاص دوست نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس لشکر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس کو اس سال فتح نصیب ہوگی یا نہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتح کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فتح کا وعدہ کیا ہے۔ اور وہ ہے آیت انا فتحنا لک فتحا مبینا۔ اس میں بشارت فتحا مبینا سے ظاہر ہوتی ہے۔ اگر الف کے تکرار کو چھوڑ کر ان کے اعداد نکالو گے تو ۵۹۱ھ نکل آئے گا۔ وہ اس طرح کہ ف (۸۰) ت (۴۰۰) ح (۸) ا (۱) م (۴۰) ب (۲) ی (۱۰) ن (۵۰) کل ۵۹۱۔"

پھر میں اندلس گیا۔ دیکھا کہ مسلمان فتح حاصل کر چکے تھے۔

فاس میں قیام کرنے کے بعد آپ پھر اندلس واپس آئے اور وہاں مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کرتے رہے چنانچہ آپ مرسیہ گئے، اس کے بعد مریہ جا کر ابن عریف صوفی کی جماعت کے مرکز میں قیام کیا۔ اور یہیں آپ نے "مواقع النجوم" نامی کتاب لکھی، جس میں تصوف کے مبتدی حضرات کے لئے مخصوص ہدایات درج ہیں۔ اندلس میں تقریباً چار سال قیام کرنے کے بعد دوبارہ ۵۹۵ھ میں مراکش واپس آئے دوبارہ واپس آنے کا سبب اندلس کا داخلی انتشار اور علماء کی بے قدری تھا۔ چنانچہ محمد عبداللہ عنان لکھتے ہیں۔

"اندلس میں داخلی انتشار کی وجہ سے ادبی تحریک کو سخت نقصان پہنچا۔ اس کا شیرازہ بکھر گیا بہت سے عالم اور مفکر ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ اس عرصہ میں جن علماء، اور صلحاء نے وطن کو خیرباد کہا، ان میں شیخ محی الدین ابن عربی، ابن بیطار المالقی، ابن الابار القضاعی ابن حمدون الحمیری النحوی، اور ابن سعید الاندلسی شامل ہیں[1]"

۵۹۵ھ ۱۱۹۸ء میں ابن عربی مراکش میں تھے کہ ابن رشد نے وہاں وفات پائی۔ چنانچہ ابن عربی آپ کی وفات کے وقت ان کے پاس موجود تھے اور آپ کی نماز جنازہ اور جلوس جنازہ میں شریک ہوئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

جب وہ تابوت جس میں آپ کا جسم تھا، سواری پر رکھا گیا، تو آپ کی تصنیفات سواری کے دوسری طرف رکھی گئیں۔ جو ضخامت کے لحاظ سے تابوت کے برابر تھیں میں اس وقت موجود تھا اور میرے ساتھ فقیہہ ادیب ابوالحسن محمد بن جبیر کاتب السید ابوسعید اور میرے دوست ابوالحکم عمر بن السراج الناسخ بھی موجود تھے ابوالحکم نے ہماری طرف دیکھکر کہا۔ دیکھ رہے ہو۔ ابن رشد کے برابر ان کے ساتھ سواری پر کیا چیز پڑی ہے؛ یہ امام ہیں اور یہ ان کے اعمال ہیں۔ یعنی آپ کی تصنیفات ہیں۔ ابن جبیر نے ان سے کہا۔ بیٹے! آپ کی نظر اچھی جگہ پڑی ہے (ابن عربی کہتے ہیں) میں نے ان الفاظ کو اپنے لئے نصیحت اور ہدایت بنا لیا۔ اللہ ان سب پر رحمت کرے۔ اب اس جماعت

---

[1] نہایۃ الاندلس وتاریخ العرب المتنصرین۔ ص ۳۳۴

ہیں سے میرے سوا اور کوئی باقی نہیں رہا ہے۔

۵۹۷ھ میں آپ دوبارہ بجایہ آئے اور اس کے دوران قیام آپ نے ایک خواب دیکھا، جس میں آپ کو مشرق کی سیاحت کا مشورہ دیا گیا تھا اور وہ خواب آپ کے علم لدنی میں کمال حاصل کرنے کی طرف اشارہ بھی تھا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں۔

میں نے رات (خواب میں) دیکھا، کہ میں نے آسمان کے تمام ستاروں سے نکاح کر لیا ہے مجھے حروف دیئے گئے میں نے ان سے بھی نکاح کر لیا۔ میں نے اپنا یہ خواب ایک آدمی کے ذریعہ ایسے عالم کے جو بہت مشہور تھا۔ پاس تعبیر کے لئے بھیجا اور اس کو تاکید کی کہ میرا نام نہ لے اس نے یہ خواب سن کر تعجب کیا اور اسے بڑی اہمیت دی اور کہا کہ یہ وہ گہرا سمندر ہے جس کی تہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ خواب دیکھنے والے پر علوم علویہ اور علوم اسراریہ کے دروازے کھول دیئے جائینگے۔ اور ستاروں کی خاصیت میں ہے کہ اس شخص جیسا اس زمانہ میں اور کوئی نہیں ہوگا پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہنے لگا اگر اس خواب والا شخص اس شہر میں ہے، تو اندلس کا یہ نوجوان (ابن عربی) ہے[2]

اس خواب کے بعد آپ مستقل طور پر مشرق کی سیاحت کے لئے نکلے اور پھر اندلس واپس نہیں گئے۔

اندلس سے آپ سب سے پہلے تیونس آئے۔ یہاں رہ کر آپ نے "انشاء الدوائر الاحاطیۃ علی مضاھاۃ الانسان للخالق والخلائق" کتاب لکھی۔

۵۹۸ھ ۱۲۰۱ء میں آپ مکہ معظمہ آئے، اور مقام ابراہیم میں آپ ریاضت وعبادت میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی شہرت پہلے ہی یہاں پہنچ چکی تھی، اس لئے آپ کے گرد ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا۔ یہیں آپ کے تعلقات مقام ابراہیم کے امام ابوخاشہ کے خاندان سے ہوئے اور ان کی بیٹی نظام کے حسن وجمال سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کی محبت میں "ترجمان الاشواق"

---

۱ الفتوحات المکیہ ج-۱- ص ۱۹۹ - ۲۰۰

۲ الفتوحات المکیہ (بحوالہ فی التصوف الاسلامی۔ ذکی مبارک)

ایک پورا دیوان کہہ ڈالا۔ اس دیوان میں آپ کے محبت، وصل، اور فراق پر بے شمار درد انگیز اور رقت آمیز اشعار موجود ہیں۔ بظاہر تو یہ اشعار ظاہری عشق کی تعریف و توصیف میں کہے گئے ہیں، لیکن ان کے معانی میں تصوف کے راز پوشیدہ ہیں ان کے استعارات و کنایات سے، اللہ، ملاء اعلیٰ اور فنا فی اللہ کی لذت مقصود ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں۔

کلّ ما اذکرہ من طلل   أو ربوع أو مغانٍ کل ما

أو خلیل أو رحیل او ربی   أو ریاض أو غیاض أو حِمَی

أو نساءٍ کاعبات نہد   طالعات کشموس أو دُمیٰ

کلّ ما اذکرہ مما جری   ذکرہ او مثلہ أن تفقھا

صفة قدسیّة علویّة   أعلمت أن لصدقی قدما

فاصرفِ الخاطر عن ظاهرها   واطلبِ الباطن حتّٰی تعلَمَا[1]

(ترجمہ) میں جو یہ سب مرتفع مقامات، سرسبز میدانوں اور منازل کا ذکر کرتا ہوں یا دوست، کوچ، ٹیلوں، باغات، سبزہ زاروں یا چراگاہوں یا ابھری ہوئی چھاتیوں والی عورتوں کا جو سورج کی طرح رونما ہوتی ہیں یا وہ گڑیوں جیسی ہیں، یہ یا ان جیسی اور باتوں کا جو ذکر کرتا ہوں، وہ اس لئے کہ تم سمجھو یہ قدسی، علوی صفت (والی چیزیں ہیں) تم جان لو کہ میرا قدم سچائی پر ہے۔ پس توجہ ان کے ظاہر سے ہٹا لو۔ باطن طلب کرو تاکہ تم حقیقت کو جان لو۔

آخر عشق ظاہری نے عشق باطن کی طرف آپ کی رہنمائی کی، چنانچہ آپ زیادہ تر وقت مراقبہ، ریاضت اور ذکر اللہ میں صرف کرتے۔ اس کے بعد آپ پر مکاشفات ربّانی کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ کشف القلوب میں آپ کو اتنی مہارت حاصل ہوئی کہ آپ لوگوں کو ان کی آنیوالی مصائب سے بھی آگاہ کرنے لگے۔ انہی دنوں آپ نے اپنی کتاب "الدرة الفاخرة" لکھی جس میں المغرب کے مختلف صوفیہ اور شیوخ کا ذکر تھا۔ کچھ عرصہ مکہ میں رہنے کے بعد پھر آپ کے دل میں سیر و سیاحت

---

[1] ذخائر الاعلاق فی شرح ترجمان الاشواق لابن عربی ص۵ طبع بیروت ۱۳۱۲ھ

کا شوق تھا۔ آپ ۶۰۱ھ ۱۲۰۴ء میں موصل پہنچے یہیں آپ کی ملاقات مشہور صوفی علی بن جامع سے ہوئی۔ دو سال کے بعد ۶۰۳ھ/۱۲۰۶ء میں آپ قاھرہ آئے یہاں آپ کی شہرت ہر حلقہ میں پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ آپ کے آنے پر آپ کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ آپ نے محلہ "قنادیل" میں قیام کیا۔ جو صوفیہ کا مرکز تھا۔ یہاں آپ سے بہت سی کرامات کا ظہور ہوا اور لوگوں میں آپ کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ آپ وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ اس لئے علماء نے آپ کی مخالفت کی اور مصر کے حاکم سے آپ کے خلاف شکایت کی اس وقت مصر میں سلطان عادل ایوبی کی حکومت تھی۔ جو شریعت کا بڑا پابند تھا۔ اس نے آپ کو قید کرنے کا حکم دیا۔ لیکن آپ کے دوست ابوالحسن الباجی نے سلطان کے شبہات کو زائل کر دیا۔ اور آپ کے آراء و افکار کی ایسی تاویل کی جس سے شریعت کی خلاف ورزی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ سلطان نے آپ کو سزا دینے کا خیال چھوڑ دیا اور آپ کی کافی عزت افزائی کی۔

اس کے بعد ابن عربی بلاد روم کی سیاحت کو گئے اور قونیہ (ترکی) میں جاکر کچھ عرصہ آپ نے قیام کیا۔ وہاں کے بادشاہ کیقاؤس الاوّل ۶۰۷ - ۱۲۱۰ء نے آپ کو خوش آمدید کہا اور ان کا بہت احترام کیا۔ آپ کو ایک بہت بڑا گھر رہنے کے لئے دیا۔ آپ نے وہ گھر ایک سائل کو دے دیا یہاں بھی آپ سے کرامات اور دیگر خوارق عادات کا ظہور ہوا۔ اس لئے بہت سے لوگ آپ کے مرید اور معتقد بن گئے۔[۱]

قونیہ میں آپ نے دو کتابیں "مشاھدۃ الاسرار" اور "رسالۃ الانوار" لکھیں آپ اناطولیہ اور آرمینیا کی سیاحت کو گئے۔ پھر ۶۰۸ھ ۱۲۱۱ء میں دوبارہ بغداد آئے۔ اس سے پہلے ۶۰۱ھ میں مکہ جاتے ہوئے بغداد جا چکے تھے۔ اس مرتبہ آپ کی ملاقات شیخ شہاب الدین سہروردی سے ہوئی۔ کتاب الارشاد کی روایت ہے کہ محی الدین عربی نے بغداد میں امام سہروردی سے ملاقات کی دونوں بزرگ ایک دوسرے کے سامنے تھوڑی دیر گردن جھکا کر بیٹھے پھر جدا ہو گئے۔ اس کے بعد ابن عربی سے امام سہروردی کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ آپ سر سے

۱ؔ تاریخ الفکر الاندلسی ص ۳۷۵

لے کر پاؤں تک سنت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور جب شیخ سہروردی سے آپ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ حقائق کے سمندر ہیں اور امام العارفین ہیں[1]

۶۱۰ھ - ۱۲۱۴ء میں آپ دوبارہ مکہ مکرمہ گئے۔ اور یہیں آپ نے اپنے دیوان ترجمان الاشواق کی شرح فتح ذخائر الاعلاق لکھی۔ اس شرح میں آپ نے فقہاء اور علماء کے ان اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ اس کے بعد پھر قونیہ گئے۔ اس وقت کیقاؤس انطاکیہ کی مہم پر نکل چکا تھا۔ آپ نے خواب دیکھا کہ فتح کیقاؤس کو ہوگی۔ آپ نے یہ خواب لکھ کر کیقاؤس کو بھیج دیا۔ فتح سے پہلے ہی یہ خط اس کو مل گیا۔ ٹھیک بیس دن بعد کیقاؤس کے ہاتھ پر انطاکیہ فتح ہوگیا۔ اس کے بعد آپ حلب گئے۔ اور سلطان ظاہر غازی (۶۱۳ھ / ۱۲۱۶ء) سے آپ کی ملاقات ہوئی اس نے آپ کا بڑا احترام کیا یہاں آپ کی صحت کچھ خراب ہو گئی۔ اور ہر وقت آپ پر مجذوبانہ کیفیت طاری رہنے لگی۔ اسی حالت میں آپ نے "الحکمۃ الالہٰیہ" نامی کتاب لکھی، جو امام غزالی کی کتاب "تہافت الفلاسفہ" کی طرح فلاسفہ کی تردید میں ہے۔ اس کے بعد آپ دمشق آئے اور ۶۲۰ھ ۱۲۲۳ء سے لیکر اپنی وفات تک یہیں مقیم رہے۔ دمشق کا والی معظم بن العادل آپ کا مرید تھا۔ دمشق میں ہی آپ نے اپنی تین مشہور کتابیں "الفتوحات المکیہ" "فصوص الحکم"، اور "الدیوان" لکھیں[2]

یہاں بھی آپ سے بہت سے کرامات کا ظہور ہوا اور آپ کے اخلاق حسنہ نے لوگوں کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دمشق میں آپ کے پاس بکثرت مال و دولت آتی تھی۔ لیکن آپ اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھتے تھے۔ حمص کے امیر کی طرف سے آپ کو روزانہ سو درہم ملتے تھے اور ابن الزکی تیس درہم روزانہ آپ کی خدمت میں روانہ کرتا تھا۔ لیکن آپ یہ سب رقم روزانہ صدقہ کر دیتے تھے۔

آخر کار علوم ربانیہ کا یہ حامل اور اسرار قدرت کا دانا جمعہ کی رات بتاریخ ۲۸ ربیع الآخر ۶۳۸ھ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اور آپ کو جبل قاسیون کے کنارے علماء اور صلحاء کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

۱۔ اعلام الفلسفۃ الاسلامیۃ ص ۳۴۵

۲۔ تاریخ الفکر الاندلسی ص ۳۷۶

علامہ شکیب ارسلان لکھتے ہیں۔

میں نے ۱۳۱۱ھ میں آپ کی قبر کی زیارت کی اس پر یہ دو بیت لکھے ہوئے تھے۔

قبر محی الدین ابن العربی — کل من لاذ بہ اوزارہٗ

قضیت حاجاتہ من بعدما — غفر اللہ لہ اوزارہٗ

یہ محی الدین بن العربی کی قبر ہے۔ جس نے بھی اس کی پناہ لی یا اس کی زیارت کی اس کی حاجتیں پوری ہو گئیں۔ اور اس سے قبل اللہ نے اس کے گناہ بخش دیئے۔

آپ کے دو بیٹے تھے۔ (۱) محمد سعد الدین جو ۶۱۸ھ میں رمضان کے مہینے میں ملیطہ میں پیدا ہوئے بڑے عالم اور شاعر تھے۔ ۶۵۶ھ میں دمشق میں انہوں نے وفات پائی اور اپنے باپ کے پاس ہی دفن ہوئے۔

(۲) ابو عبداللہ محمد عماد الدین جنہوں نے ۶۶۷ھ میں صالحیہ میں وفات پائی اور قاسیون کے قبرستان میں ابن الزکی کی قبر کے پاس دفن ہوئے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے قانون ارتقا کے بارے میں ارشادات

انسان ہمیشہ ترقی کر رہا ہے۔

کثرت صورتوں یعنی اعراض میں ہے اور جوہر واحد ہے، جو انی کا عین ہے اور کثرت عین واحد میں معقول و مفہوم ہے۔

انسان ہر ساعت اور ہر دم صورت بدلتا ہے۔ یہ صورت خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔ اول صورت کو آخری صورت فنا کرتی ہے اور خود باقی رہتی ہے۔ مگر دوسرے وقت میں بھی آخری صورت اول کی طرح فنا ہوتی ہے۔ اور اس کی آخری صورت باقی رہتی ہے۔ اور اسی طرح غیر محدود سلسلہ چلا گیا ہے۔ ایک صورت فنا ہو کر کبھی مکرر واپس نہیں آتی۔

سوانح عمری حضرت محی الدین ابن عربی

از خواجہ محمد عباد اللہ

بنگالہ کے تین بزرگ

وفا راشدی

بنگال میں جلال نام کے تین اولیاء اللہ محو خواب ہیں، شیخ جلال الدین تبریزی سہروردیؒ، شاہ جلال یمنی رحمت اللہ، شاہ جلال دکنی رحمت اللہ، یہ حضرات صوفیائے کرام اور بزرگان دین میں سے تھے، جن کی ذات بابرکات کی بدولت سرزمین مشرقی پاکستان میں تجلیات الٰہی اور انوار محمدیؐ کی ضیاپاشی ہوتی رہی اسلامی تہذیب و تمدن کرنیں پھوٹیں۔ اور جن کے رشد و ہدایات کشف و کرامات، روحانی کرامات اور علوم و فیض کا سرچشمہ آج تک جاری و ساری ہے۔

شیخ جلال الدین تبریزی سہروردیؒ

شیخ جلال الدین تبریزی سہروردیؒ سرزمین بنگال کے ان اولیاء کبار میں سے تھے جنہیں اللہ جل شانہ نے کمال باطنی و علوم ظاہری دونوں سے یکساں نوازا تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت شہر تبریز جیسی پاک سرزمین میں ہوئی۔ تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ شروع میں آپ صاحب ثروت ہی نہ تھے بلکہ تاجدار مملکت بھی تھے لیکن تجلیات الٰہی کے آگے دنیاوی بادشاہت اور ظاہری چمک دمک ماند پڑ گئی۔ آپ نے اپنے فرزند ارجمند کو تخت و تاج کا وارث بنادیا اور خود منزل سلوک کی طرف گامزن ہوئے۔

آپ شیخ الشیوخ، پیشوائے اولیا، حضرت شہاب الدینؒ کے مرید خاص تھے۔ آپ جس تن دہی، محنت، عقیدت، جوش و خروش کے ساتھ سات سال تک اپنے سالکِ اکمل، اور مرشد کامل کی خدمت میں مصروف رہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حضرت شہاب الدینؒ کو بھی آپ سے بہت محبت تھی اس لئے جہاں کہیں تشریف لے جاتے اپنے متبع شریعت، مرید کو بھی ساتھ رکھتے۔

دہلی میں حضرت شہاب الدینؒ کے خلیفہ حضرت مخدوم بہاالدین سے آپ کے تعلقات قائم ہوئے۔ بادشاہِ وقت سلطان التمش پہلے ہی سے آپ کے بہت قدردان اور عقیدت مند تھے۔ وہ بھی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے بدایوں کے دوران قیام حاکم بدایوں قاضی کمال الدین بھی آپ کے روحانی کمال کے قائل ہوئے اور جب تک آپ وہاں مقیم رہے آپ کی روحانی صحبتوں سے متفیض ہوتے رہے۔

حضرت جلال الدینؒ تبریزی حقیقت و معرفت کی جستجو میں دہلی، ملتان، بدایوں، اودھ، بہار بنگال کی سیر و سیاحت فرماتے رہے۔ ہر جگہ بڑے بڑے بزرگوں، فقیروں، درویشوں، کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ جب آپ بنگال کے ایک گاؤں پنڈوا (جو ضلع مالوہ میں لکھنوتی کے قریب ہے) میں پہنچے تو اس زمانہ میں یہ مقام ہندوؤں کی مقدس عبادت گاہ سمجھا جاتا تھا۔ پورا لکھنوتی کفرستان بنا ہوا تھا وہاں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ شہرہ آفاق سیاح ابن بطوطہ نے آپ سے ملاقات کی تھی۔ اس کے سفرنامہ میں پنڈوا کے پورے حالات ملتے ہیں۔ "انوار اصفیا" میں ان حالات کا اقتباس ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

"پنڈوا میں ہندوؤں کا ایک مشہور مندر تھا جہاں کالی کی پوجا ہوتی تھی جن کی زیارت کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ اس مندر اور بتخانہ کی وجہ سے پنڈوا کی شہرت سارے بنگال میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں بکثرت پجاری تھے، اور بکثرت بت تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزیؒ سہروردی کی عمر ایکسو پچاس برس کی ہو چکی تھی۔ دبلے پتلے اور کشیدہ قامت شخص ہیں۔ میرے آنے کا حال اپنے کشف سے معلوم کر کے اپنے مریدوں کو دو منزل آگے میرے استقبال کو بھیج دیا۔ انہیں دیکھا ایک عمدہ قسم کا چغہ پہنے بیٹھے ہیں جو مجھے پسند آیا۔ انہوں نے اسی وقت چغہ اتار کر مجھے کر دیا اور مریدوں سے کہا کہ دے تو رہا ہوں مگر یہ چغہ ان کے پاس رہے گا نہیں۔ ایک کافر بادشاہ ان سے چھین کر میرے ہی بھائی کو دے دے گا۔ میں نے اسی وقت سے اس کی پوری حفاظت کی اور اس امر کا تہیہ کر لیا تھا کہ میں اسے کسی بادشاہ کے سامنے پہن کر جاؤں گا ہی نہیں۔ مگر ایک شیخ وقت کے منہ سے نکلی ہوئی بات ہرگز غلط نہ ہو سکتی تھی۔ چین میں جب پہنچا تو وہاں کے بادشاہ نے وہ چغہ مجھ سے بہ جبر چھین لیا کہ بہت خوبصورت قیمتی تھا لیکن اس کے عوض اپنی طرف سے ایک بیش بہا خلعت، ایک گھوڑا اور کچھ نقد روپیہ عطا کیا۔ مجھے اس وقت شیخ کا قول یاد آیا لیکن میری حیرت کا وہ عالم

بھی دیکھنے کے قابل تھا جب میں نے چین ہی کے ایک اور شہر میں وہ چغہ ایک اور درویش شیخ برہان الدین کو پہنے دیکھا۔ انہوں نے فرمایا۔ علامہ اس میں حیرت کی کون سی بات ہے میرے بھائی شیخ جلال الدین نے یہ چُغہ حقیقت میں میرے ہی لئے بنایا تھا اور مجھے ایک خط میں اطلاع دی تھی کہ اطمینان رکھو تمہیں یہ چغہ کسی نہ کسی ذریعہ ضرور پہنچ جائے گا۔ یہی نہیں انہوں نے مجھے وہ خط بھی دکھایا۔"

حضرت شیخ جلال الدین کی آمد سے نہ صرف پنڈوا اور اس کے قرب وجوار میں شمع ہدایت روشن ہوئی بلکہ بنگال کے اکثر ضلعوں میں بھی بت پرستی کا قلع قمع ہوا۔ اور بت خانوں کی جگہ منبروں اور خانقاہوں نے لے لی۔ آپ ہی کی ذات مبارک کے طفیل بنگال میں سلسلہ سہروردیہ جاری ہوا۔ حضرت شیخ برہان الدین آپ کے قابل فخر اور باکمال خلیفہ تھے حضرت جلال کی ریاضات وکرامات کے کرشمے بہت ہیں جو روحانیت سے پُر ہیں۔ بندرگاہ دیو محل کے قریب ہی آپ کا آستانہ ہے یہ مقام آپ کی آمد سے قبل بت پرستوں کا ٹھکانا تھا جو آپ کی سکونت کے بعد خدا پرستوں کی سجدہ گاہ بن گیا۔ آپ نے دیو محل میں ۶۴۲ھ میں وفات پائی آپ کا مزار پُر انوار آج تک زیارت گاہِ عالم ہے۔

شاہ جلال یمنی سلہٹی رح

کافرستان تھا سلہٹ، درودیوار سے پوچھ

کون آیا تھا یہاں کس کی اذانیں گونجیں

یہ شعر سلہٹ کے بانی اسلام شیخ المشائخ حضرت شاہ جلال یمنیؒ سے منسوب ہے۔ جنہوں نے سلہٹ کی دنیائے کفر کو شمع اسلام سے روشن کیا۔ ہزاروں انسانوں کو الحاد وگمراہی کے بجائے حق وصداقت کی راہ دکھائی، سلہٹ میں حضرت شاہ جلال کے درودِ مسعود کے سن وسال کے سلسلے میں مورخوں کے بیانات مختلف ہیں۔ کوئی ۱۳۴۸ء بتاتا ہے اور کسی کے نزدیک ۱۳۰۳ء ہے لیکن تحقیقات کے آئینہ میں ۱۳۰۳ء زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سلہٹ میں حضرت شاہ جلالؒ کی آمد کی داستان بڑی دلچسپ اور روحانیت سے لبریز ہے۔ آج سے چھ سو سال پہلے جب حضرت شاہ جلال سلہٹ تشریف لائے، اس وقت اسلام کا نام لیوا واحد بندۂ خدا برہان الدین نامی ایک شخص تھا جو وہاں کے

سلہ سلہٹ گہوارۂ اسلام (بنگالی نسخہ) از مفتی اظہر الدین احمد صدیقی

راجہ گوڑ گوبند کے ظلم وستم کا شکار تھا۔ روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ برہان الدین کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا اس نے اس کی ولادت کی خوشی میں اللہ تبارک تعالیٰ کے نام پر ایک گائے بطور صدقہ ذبح کی۔ راجہ نے اس پر اس کے لخت جگر اور نور چشم کو اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا اور برہان الدین کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا راجہ گوبند کے تشدد کی خبر دور دور تک پھیل گئی جب یہ روح فرسا خبر دہلی کے بادشاہِ وقت علاؤالدین خلجی تک پہنچی تو اس نے اپنے بھانجے سکندر خاں غازی کی کمان میں راجہ کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی۔ سکندر غازی نے راجہ پر دو بار حملے کئے اور ہر بار اسے شکست ہوئی۔ شاید قدرت نے اس کفرستان میں آفتاب اسلام طلوع ہونے کے لئے ایک مرد مجاہد کا انتخاب کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے پیر حضرت شاہ جلالؒ کشاں کشاں فیوض و کرامات کا مینہ برساتے ہوئے مکہ معظمہ سے دریائے برہمپتر تک پہنچے۔ حضرت موصوف کے ہمراہ تین سو ساٹھ (۳۶۰) اولیائے کرام تھے جو حضرت کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ حضرت جلال نے اپنے مصلے کو دریا میں ڈالا۔ اللہ کا نام لے کر اس پار سلہٹ کی وادیوں میں پہنچے حضرت جلالؒ اور ان کے ساتھیوں کا راجہ گوڑ گوبند سے مقابلہ ہوا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ راجہ گوبند کو زبردست شکست ہوئی اور جنگل کی طرف فرار ہو گیا۔ حضرت جلال نے سکندر غازی کو حکومت کی باگ ڈور سونپ دی اور خود یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح حضرت جلالؒ کے دم قدم سے نہ صرف سلہٹ بلکہ سارے بنگال میں پرچم اسلام بلند ہوا۔ ایمان کی تلواروں نے معنوی خداؤں کے بت ڈھا دیئے یہ وہ زمانہ تھا جب علاالدین خلجی پایۂ تخت دہلی پر رونق افروز تھے اور بنگال کی عنانِ حکومت سلطان شمس الدین کے ہاتھوں میں تھی۔

حضرت شاہ جلال الدینؒ کے آبا و اجداد یمن کے رہنے والے تھے۔ حضرتؒ کے والد ماجد حضرت محمد بن ابراہیم برگزیدہ ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ حضرت موصوف بخارا کے قریب قونیا (کنیا) نامی ایک گاؤں میں اقامت پذیر تھے۔ حضرت اپنے ددھیال کی طرف سے قریشی الاصل تھے۔ حضرتؒ کے ننھیال کا سلسلہ اہل سادات سے جا ملتا ہے۔ حضرت کمسنی ہی میں پدر بزرگوار کی شفقت و محبت سے محروم ہو گئے۔ حضرتؒ کے ماموں حضرت سید احمد کبیر الدین حضرت سید جلال سرخ بخاریؒ نے حضرت کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا، حضرت سید احمد کبیرؒ اپنے وقت کے صاحبِ علم عرفان اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، حضرت جلالؒ نے آپ ہی کے حلقۂ

میں رہ کر حقائق و معارف کے درس حاصل کئے اور معرفت و تصوف کے نکات سے بہرہ ور تھے۔ حضرت اپنے ماموں موصوف کے ساتھ مکہ معظمہ میں حجرہ نشین تھے کہ ایک روز ایک ہرنی نے شیر کے ظلم سے تنگ آکر حضرت احمد کبیر سے اپنی زبانِ بے زبانی سے فریاد کی آپ نے اپنے بھانجے اور مرید حضرت جلال سے فرمایا۔ "تم اس معاملہ کا فیصلہ کر دو" حضرت جلال نے جب شیر کی تلاش میں جنگل کی راہ لی تو حضرت کبیر کے دل خیال آیا کہ اگر اس درندے کو داہنے ہاتھ کی تین انگلیوں سے اور بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے طمانچہ مارا جائے تو اس کی یہ سزا کافی ہوگی۔ حضرت جلال کو کشف کے ذریعہ اپنے پیر و مرشد کے اس خیال پاک کا علم ہوگیا۔ چنانچہ حضرت نے ایسا ہی کیا جب حضرت اپنے ماموں کی خدمت میں واپس تشریف لائے اور احوال بیان فرمایا تو حضرت کے مرشد بہت خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا۔

"تم اب واقف اسرار و رموز ہو۔ جاؤ! اور سر زمین ہند میں جا کر واحدانیت حقہ کے چراغ جلاؤ اور دین حق کی تبلیغ کرو" پھر اپنے حجرۂ مبارک کی تھوڑی سے مٹی اپنے دست مبارک سے اپنے ہمشیرہ زادے کو عنایت فرمائی۔ اور ہدایت فرمائی۔

"اس مقام پر سکونت اختیار کرو جہاں کی مٹی اس مٹی کی رنگ و بو اور ذائقہ سے مشابہت رکھتی ہو" حضرت اپنے پیر و مرشد کے حسب ہدایت عازم سفر ہوئے تھے کہ راستہ میں سکندر غازی کی فوج کے ساتھ ہولئے اور سلہٹ کا رخ کیا جس کا حال اوپر بیان کیا گیا ہے کہا جاتا ہے کہ حضرت کے مزار مقدس کی زمین کی مٹی میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جس کی طرف حضرت کے ماموں حضرت سید احمد کبیر نے اشارہ فرمایا تھا۔

"جب حضرت شاہ جلال شہر دہلی میں پہنچے تو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ایک مرید نے حضرت کے ولایت کی مخالفت میں کچھ باتیں حضرت سے کہیں۔ جب نظام الدین اولیاء نے یہ باتیں سنیں تو آپ نے کشف کے ذریعہ ان کی حقیقت معلوم کی چونکہ یہ باتیں غلط ثابت ہوئیں اس لئے آپ نے مرید کو اس خیال بد سے روکا اور دو آدمی حضرت جلال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت نظام الدین کا سلام پہنچایا۔

حضرتؒ جلالؒ نے سلہٹ میں ابتدائی دو سال سلطنت کے نظم ونسق میں صرف کئے اور باقی پنتیس سال خدمت خلق اور ریاضت و عبادت میں گذار دیئے۔ حضرت نے بروز جمعرات ۲۰ ذی قعدہ ۷۴۷ھ کو وصال فرمایا۔

"ابن بطوطہ محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں مراکش سے ہندوستان آیا تھا۔ اس نے بنگال کی سیر و سیاحت بھی کی تھی۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے۔

متواتر چالیس سال سے آپ روزہ رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ صرف دسویں دن روزہ افطار کرتے تھے۔ آپ کے پاس ایک گائے تھی جس کے دودھ سے روزہ کھولتے تھے۔ آپ قائم اللیل تھے۔ اس وقت آپ کا قد بلند ہالا تھا اور رخسار پر بہت کم بال تھے۔ ان پہاڑوں کے باشندے آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ انہیں لوگوں کے درمیان رہنے لگے تھے۔"

حضرت جلال کے مزار مبارک کے آس پاس ان شیدان اسلام کے مقبرے ہیں جو آپ کے ہمراہ سلہٹ تشریف لائے تھے مزار کے باہر درگاہ کے احاطہ میں ایک بہت بڑا ہی دیگ محفوظ ہے درگاہ کے باہر ایک تالاب ہے جس میں مچھلیاں ہیں۔ ان مچھلیوں کو کوئی نہیں مارتا اور نہ کبھی وہ تالاب سے باہر نکالی جاتی ہیں۔ رنگ برنگ کی ننھی منی مچھلیاں اچھلتی کودتی بھلی معلوم ہوتی ہیں روایت ہے کہ یہ چشمہ حضرت کے زمانہ میں جاری ہوا اور آج تک بے شمار امراض کا دافع ہے

حضرت جلال مجرد تھے آپ کے ہمراہ جو اللہ والے تھے ان کے خاندان کے بیشتر افراد درگاہ محلہ میں آباد ہیں۔ اس محلہ کے ایک صاحب دین اور صاحب علم و فضل بزرگ مولانا اظہر الدین احمد صدیقی کے جد امجد کا تعلق بھی انہیں اسلاف سے تھا۔

حضرت جلال کی وہ تلوار جس نے شجر کفر کو جڑ سے کاٹ دیا تھا۔ وہ کھڑاؤں جو آپ کے پائے مبارک کی زینت بنی تھی اور آپ کے کھانے کی سنی اور کاسہ کے برتن، یہ سب چیزیں آپ کے تبرکات میں سے ہیں جو مولانا اظہر الدین صدیقی کے صاحبزادے ایڈوکیٹ کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی زیارت سے حضرتؒ کی شجاعت سادگی اور درویشانہ زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

شاہ جلال دکنیؒ

حضرت شاہ جلال دکنیؒ حضرت شاہ علی بغدادیؒ سے تقریباً سو برس قبل بنگال میں تشریف لائے تھے۔ آپ کا اصل وطن گجرات (ہندوستان) تھا۔ آپ حضرت پیارا کے خلیفۂ خاص تھے۔ حضرت پیارا جن کا وصال ۸۶۵ء میں ہوا۔ حضرت سید احمد گیسو دراز کے مرید تھے اور حضرت گیسو دراز نے حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی سے بیعت کی تھی۔ اس طرح حضرت شاہ جلالؒ کا سلسلہ نظامیہ سے جا ملتا ہے۔ آپ ہی کی ذات مبارک سے سلسلہ نظامیہ کا سارے بنگال میں جال پھیلا۔ آپ کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔

آسودگانِ ڈھاکہ مؤلفہ حکیم حبیب الرحمٰن (ص ۳۳) میں حضرت شاہ جلال دکنی کی شہادت کا حال لکھا ہے کہ۔

> "آپ اپنے مریدوں کے حلقہ میں تخت پر بادشاہوں کی طرح متمکن ہوتے اور مریدوں کا حلقہ دست بستہ سامنے کھڑا رہتا۔ کسی کو خلاف شریعت پاتے تو سزا دیتے۔ حاکم وقت کو جو اس وقت چوک کے قلعہ میں رہتا تھا خبر لگی تو اس نے منع کرایا کہ اس سے دعوئے سلطنت کی بو آتی ہے مگر آپ غلبۂ حال کی وجہ سے نہ مانے۔ آخر شاہی فوج آئی اور آپ اور آپ کے مریدوں پر یورش بول دیا۔ جب تک مریدان قتل ہوتے رہے آپ یا قہار یا قہار کہتے رہے اور جب آپ پر تلوار چلائی گئی تو یا رحمان فرماتے ہوئے شہادت پائی۔ یہ واقعہ ۸۸۱ھ کا ہے۔"

حضرت شاہ جلال دکنیؒ موتی جھیل ڈھاکہ میں ایک گنبد کے اندر آسودہ ہیں پٹھانوں کے عہد میں آپ کا مزار مبارک معمولی طرز کا تھا۔ یہ شاندار گنبد عہد مغلیہ میں تعمیر کرایا گیا۔

تنقید و تبصرہ

روضات

مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح

مترجمہ مولوی ثناء اللہ ندوی۔ ناشر ادارہ تحقیق و تصنیف ۱/۱۸۱ وحید آباد کراچی ۱۸

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ذات گرامی برصغیر کی ان چند عظیم شخصیتوں میں سے ہے جن کے علمی فیوض سے اس سرزمین میں علوم دینی کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اور تصوف اور شریعت میں ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ حضرت شیخ عبدالحق نے بڑی طویل عمر پائی۔ اور یہ ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں صرف کی۔ حضرت سلیم شاہ سوری کے عہد حکومت میں ۱۵۵۱ء میں آپ پیدا ہوئے، اور مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے سولہویں سال جلوس میں ۱۶۴۲ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

زیر نظر کتاب میں فارسی متن اور اس کا اردو ترجمہ ہے۔ اس فارسی متن کے بارے میں مقدمہ نگار جناب مفتی انتظام اللہ شہابی نے لکھا ہے کہ "اس رسالہ کو حضرت شیخ کی تصانیف میں شمار کرنے کے لئے داخلی شہادتیں موجود ہیں" اس کا قلمی نسخہ جس سے ترجمہ کیا گیا ہے، ۱۲۵۷ھ لکھا گیا ہے۔ اور اس میں روضات کو حضرت شیخ کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ روضات کی وجہ تصنیف حضرت شیخ نے یوں بیان فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"بعض کم ہمت لوگ شریعت اور طریقت کو مخالف سمجھ کر شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور علماء و عرفاء کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھ کر پریشان ہوتے ہیں۔ بعض لوگ عارفوں سے عقیدت رکھتے ہیں اور علماء کے عقائد کے منکر ہو کر ملحدوں کے گروہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور بعض علماء کے معتقد اور صوفیوں کے منکر ہو کر ان اندھوں میں شامل ہو جاتے ہیں، جن کی شان

میں آیا ہے کہ

من کان فی هذه الاعمی فهو فی الآخرة اعمی

چنانچہ جہاں تک ممکن تھا، علم حقیقت اور شریعت کی مطابقت کے لئے چند نمونہ بیان کئے گئے ہیں تاکہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے قائل اور معتقد ہو کر متحد ہو جائیں اور ایک دوسرے کا انکار نہ کریں۔ شریعت و طریقت کو ایک سمجھیں اور ایک دوسرے کا مخالف نہ خیال کریں"

غرض "رضات" کی تصنیف کا مقصد شریعت و طریقت میں مطابقت کرنا ہے۔ اور حضرت شیخ عبدالحق سے بہت پہلے سے اور ان کے بعد بھی ان بزرگوں کی طرف سے جو بیک وقت عارف بھی تھے، اور عالم بھی، اس قسم کی کوششیں برابر جاری ہوتی رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت شیخ نے یہ بنیادی اصول مقرر فرمایا ہے :۔ "جو امر شریعت میں خوب ہے، وہ طریقت میں محبوب ہے۔ اگر شریعت اسے پسند نہیں کرتی اور وہ برا ہے، تو یہاں (طریقت میں) بھی مردود ہے ۔۔۔۔

شریعت چراغ است در راہ دیں	منور ز نورش زمان و زمیں
کہ در ظلمت رہ بچشم خرد	ز نورش عیاں می شود نیک و بد

حضرت شیخ نے اس امر کی تردید فرمائی ہے کہ شریعت کا تعلق محض ظاہر سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اجرائے احکام شرع کی دو صورتیں ہیں ایک کا تعلق خلق سے ہے اور دوسری کا تعلق خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔

توحید ذات الہی کا دل سے یقین کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔ "ایسا یقین کہ اس کے سوا عالم میں کچھ ہے ہی نہیں اور تمام چیزیں جو نظر آتی ہیں وہ بہ اعتبار حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہیں جو تعینات متنوعہ حق سے عبارت ہیں۔ عین حق کے ساتھ ہیں اور وہ حق ہستی مطلق ہے۔۔۔" اس صورت میں اس طرح یقین کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذات جمیع عالم کو مظہر ذات حق سمجھے اور سب کی صفات کو مظہر صفات حق خیال کرے، جب اس پر یقین ہوگا تو تمام اقوال و افعال، حرکات و سکنات، صفات و خاصیات کو اپنی اور خلق خدا کی طرف منسوب نہ کرے گا، بلکہ تمام افعال کو حق تعالیٰ کا ارادہ و فعل سمجھے گا۔"

یہ کائنات اسی ذات حق کا پرتو ہے، لیکن ذات حق اس کائنات کی ہر شے سے منزہ اور پاک ہے اس کو "ردضات" میں یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

"معائنہ وشہود کی رو سے قطع تعلق یہ ہے کہ غیر خدا سے نظر ہٹا کر تمام اشیاء کو خدا کا مظہر سمجھے اور ہر جگہ حق کو جلوہ گر دیکھے اور ما رأیتُ شیئاً الا و رأیتہ فیہ کے باغ سے مشاہدہ کا پھول چنے۔ ہر چیز میں اسی کو جلوہ گر دیکھے۔ یعنی جس چیز پر نظر پڑے، اس کے بارے میں یہ سوچے کہ اللہ اس شے کی صفت سے مقدس اور معرا ہے۔ ہاں۔ اس کا ظہور اس صفت سے روشن اور ہویدا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال کرے کہ جس طرح اول میں وہ اس صفت سے پاک اور منزہ تھا، آج بھی اسی طرح پاک ومنزہ ہے۔"

شریعت، طریقت، اور حقیقت کی ایک مقام پر یوں وضاحت فرمائی ہے۔ کہتے ہیں۔

قرآن پاک اور حدیث شریف میں جو کچھ ہے، اور جن باتوں پر علماء کا اجماع ہے، وہ شریعت ہے۔ اور انہیں اعمال کو تقویٰ اور احتیاط سے بجالانا طریقت ہے۔ اور ان اعمال کی برکت سے جو کوائف حاصل ہوتے ہیں، وہ حقیقت ہے۔

اس سوال کا کہ "شریعت وطریقت میں کیا فرق ہے"۔ حضرت شیخ نے یہ جواب دیا ہے۔

"...... شریعت عام اور طریقت خاص یعنی طریقت شریعت میں داخل ہے اور شریعت شامل طریقت ہے۔" اس کی تائید میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:۔ "شریعت میرے اقوال ہیں۔ طریقت میرے افعال اور حقیقت میرے احوال" اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

"پس اقوال افعال کے تحت ہیں۔ جن اقوال پر آپ نے عمل فرمایا ہے، انہیں کی اتباع کا حکم دیا ہے، تو آپ کے افعال کی متابعت ثابت ہو گئی۔ اب رہے آپ کے اقوال تو افعال اقوال میں داخل ہیں اب چونکہ افعال واقوال میں اتحاد ثابت ہو گیا تو شریعت وطریقت میں بھی اتحاد لازم آیا۔"

حضرت شیخ انہیں نادان بتاتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ شریعت روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج کا نام ہے۔ انہیں خبر نہیں کہ شریعت خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر عمل کرنے کا نام ہے، جس میں طریقت بھی شامل ہے۔

اس عالم میں جو کچھ ہے حق ہے۔ اور حق اور خلق کا فرق حقیقی نہیں محض اعتباری ہے، یہ تصرف کا بڑا دقیق اور نازک مسئلہ ہے۔ اور عام طور پر اہل شرع اور اہل طریقت میں یہ مسئلہ مابہ نزاع رہا ہے۔ اگر حق اور خلق میں فرق حقیقی نہیں، تو ایک معبود دوسرا عبد اور ایک آمر دوسرا مامور کیوں۔ حضرت شیخ اس کا جواب یوں دیتے ہیں

یہ سوال کہ "شریعت میں خلق کو غیر حق اور طریقت میں عین حق کہتے ہیں، تو دونوں کے اعتقاد میں موافقت کیسے واقع ہوگی اور مخالفت کیسے رفع ہوگی۔" اس کا جواب یہ ہے:- "شریعت میں خلق کو جو "غیر حق" مقرر کیا ہے، اس سے غیریت مجازی مراد ہے۔ اور مجازی غیریت عینیت حقیقی کے منافی نہیں ہے...... اور حقیقت میں خلق کو جو عین حق کہا ہے اس سے عین، عین حقیقی مراد ہے نہ کہ عین مجازی...... پس اس معنی میں خلق باعتبار حقیقت عین حق ہے اور باعتبار صورت و مجاز غیر حق ہے...."

حضرت شیخ نے عینیت اور غیریت کو مندرجہ ذیل مثال سے واضح فرمایا ہے۔

"ایک زبردست بحر ہے، جس کی نہ ابتدا و انتہا معلوم ہے، نہ عرض و عمق کی وسعت اور ایک چھوٹی نہر اس سے نکل کر ایک طرف رواں ہوئی۔ پس حقیقت کے اعتبار سے وہ نہر عین بحر ہے، کیونکہ یہ اسی بحر سے نکلی ہے....."

اب ایک لحاظ سے یہ نہر عین بحر ہے، کیونکہ اس کا وجود اس بحر سے ہے اور ایک لحاظ سے یہ غیر بحر ہے۔ کہاں یہ بحر اور کہاں یہ نہر۔ ارشاد ہوتا ہے:- "لیکن جو شخص بحر کو عین نہر سمجھتا ہے اور ذات و صفات کے اعتبار سے بھی کوئی فرق نہیں کرتا، جاہل ہے۔ عقل سے نابلد ہے کیونکہ فرق بالمشاہدہ موجود ہے۔ پس منکر مذموم و مردود ہے۔ اور بے دینوں کا یہی مذہب ہے۔ اور جو شخص یہ جانتا ہے کہ یہ نہر اس بحر سے نہیں نکلی ہے۔ بلکہ اس کا اپنا وجود علیحدہ ہے، وہ غافل ہے اور بصیرت نہیں رکھتا۔

گرچہ عالم قطرہ از بحرِ ذات مطلق است درمیان بحر و قطرہ فرق دیدن از حق است
یعنی فرق انگاشتن بر ہر دو ظن ملحد است غیر دیدن یکدگر را نیز با شرک ادفق است

..... اس سے یہ نہ سمجھو کہ ذات حق کل ہے اور خلق اس کا جزو جیسا کہ نہر بحر کا جزو ہے....

خلق ذات حق کا ظہور ہے۔

اس مختصر سے رسالے میں ان معارف پر بحث کی گئی ہے۔ اردو ترجمے کی زبان بڑی رواں ہے اور اگرچہ مسائل بڑے دقیق ہیں، لیکن فاضل مترجم نے ان کو قابل فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ کتابت اور طباعت بڑی معمولی۔ اور کتاب کو عام کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

ماہنامہ الحق

"الحق" دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی ترجمان ہے، جو اکوڑہ خٹک (ضلع پشاور) سے شیخ الحدیث مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ کی زیر سرپرستی شائع ہوتا ہے۔

اس وقت ماہنامہ الحق کی جلد نمبر ا کا چوتھا اور پانچواں شمارہ ہمارے پیش نظر ہے۔ الحق کی سب سے پہلی چیز جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ اس کی اچھی کتابت و طباعت اور اس کا بڑی خوش سلیقگی سے مرتب کیا جانا ہے۔ اس کے بعد اس کی دوسری دل کو کھینچنے والی چیز اس کے مندرجات ہیں، اور اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے۔ مضامین بلند پایہ علمی معیار کے علاوہ ان کی زبان اور ان کا اسلوب بیان بڑا شستہ اور منجھا ہوا ہے۔ نیز شذرات میں وقتی مسائل پر بڑی سنجیدگی سے اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

بے شک "قرارداد تاشقند" پر ہمارے تمام دینی رسائل نے تبصرہ کیا ہے، لیکن الحق نے اس پر جس طرح رائے زنی کی ہے، ہمارے نزدیک اس میں دوسرے تمام رسائل سے کہیں زیادہ صحیح اسلامی روح کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس شذرے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"تاشقند کانفرنس بخیر و خوبی منعقد ہوئی۔ اور دو ہمسایہ ملکوں کے تعلقات اور امن و سکون کی بحالی کے اعلان پر ختم ہوئی۔ امن و سلامتی اور باہمی صلح و خیر سگالی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ پھر مسلمان جس کے دین و کلچر کی بنیادیں ہی امن و سلامتی پر استوار کی گئی ہیں، جس کا مذہب امن و اسلام کا علمبردار اور ظلم و فساد، تباہی و بربادی کی ظلمتوں میں سرگرداں انسان کے لئے ابدی سکون و چین کا پیغام بن کر آیا تھا۔ تمام مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی کا طغرائے امتیاز ہے کہ

اس کے مذہب کا نام اسلام و ایمان (سلامتی و امن) رکھا گیا..... مسلمانوں کو بدترین دشمن کے بارے میں بھی تعلیم دی گئی کہ فإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله (اور اگر یہ لوگ صلح پر مائل ہوں تو تو بھی مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسہ کئے رکھ).....''

ہم اکوڑہ خٹک سے شائع ہونے والے اس رسالے کا خلوص دل سے خیر مقدم کرتے ہیں ہمیں امید ہے یہ رسالہ تمام دینی و علمی حلقوں میں مقبول ہوگا، اور قدر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

قصاص سیدنا عثمان

اس کتاب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اس کے بعد بعض صحابہ کرام کی طرف سے ان کا قصاص لینے کے سلسلہ میں جو کوششیں ہوئیں، ان پر بحث کی گئی ہے۔ اہل سنت و جماعت کا یہ بنیادی اصول ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں اور ان میں سے کسی کے ساتھ بھی معاندت و خصومت رکھنا صحیح نہیں۔ اس بنیادی اصول کو مانتے ہوئے صحابہ کرام کے درمیان آپس میں جو منازعات و محاربات ہوئے، ان کا صحیح جائزہ لینے کی مناسب صورت یہ ہے کہ ان سب باتوں کو تاریخی تنقید و تجزیہ کی روشنی میں دیکھا جائے، اس سے فرقِ اسلامیہ کے اختلافات بھی کم ہو سکتے ہیں اور شاید اس طرح حقائق واقعی تک رسائی بھی ممکن ہو سکے،

زیر نظر کتاب میں اس مسئلے کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کتاب کے مصنف محمد سلطان نظامی ہیں۔

ناشران شرکت ادبیہ پنجاب، شاہی محلہ۔ لاہور۔ قیمت تین روپے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور اُن کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمتِ ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

Phone 4154

Monthly "AR-RAHIM"
Hyderabad ad

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

یہی ہوگا کہ "ہم اُس سلف کا احترام نہیں کرتے ہیں جو ایسی غلط بات کہتا ہے۔ ہم غلط باتیں اور غلط کام کرنے والے اسلاف کا احترام نہیں کرتے۔۔۔۔۔"

اسلاف کے اعمالِ صالحہ کا احترام کیا جاتا ہے۔ اُن کے ناموں کی پرستش نہیں کی جاتی ہے۔ اِس حقیقت کی توضیح کے بعد قرآن اور سیرتِ نبوی کے بجائے محض اسلاف کا نام لے کر تجدّد کی دعوت دینا ایک لایعنی فعل ہے۔ آج دنیائے انسانی جدید فرنگی جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے "بحرِ لجّی یغشاہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب"۔ ظلمات میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں دکھائی دیتا ہے۔ روحانی، ذہنی، اعصابی اور جسمانی امراض نے گمراہ انسان کی زندگی کو جہنم کے عذاب کا پیش خیمہ بنا دیا ہے۔ اِس باطل تہذیب و تمدّن کو نیست کرنے کے لئے فرعونی اور ثمودی طاقتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن اور سیرت النبیؐ کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی زندگیوں کی ضرورت ہے۔ وہی ایمانی اور ایقانی اسلحہ جن سے پہلی صدی ہجری میں ہمارے اسلاف نے میدانِ جہاد میں اُس دور کی دونوں "بڑی" طاقتوں کو مغلوب کر دیا تھا اور بھرپوری کامیابی کے ساتھ اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو قائم کیا تھا۔

؎ دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش	تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ	ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا	مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا (اقبالؒ)

(پروفیسر، خالد عمر صدر شعبہ فارسی سندھ مسلم کالج - کراچی)

(پورے کا پورا مراسلہ بغیر کسی اضافے اور کمی کے مراسلہ نگار صاحب کے حسب ارشاد شائع کر دیا گیا ہے)

ماہنامہ "الرحیم" کے ذریعہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات کی روشنی میں ہمارے موجودہ قدامت پسندی اور رجعت پرستی کے ماحول میں فکری تازگی اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے۔ اگرچہ میں اُس کے حق میں ہوں، لیکن معاف کیجیے گا اگر میں یہ کہوں کہ آپ کی یہ کوشش ریت میں ہل چلانے کے مصداق ہے کیونکہ اِس طرح کی کوششیں نہ پہلے بارآور ہو سکی ہیں اور نہ آپ کی یہ کوشش بارآور ہوگی اور ہمارے معاشرے پر صدیوں سے جو جمود اور آگے کے بجائے ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھنے کا رجحان مُسلّط ہے وہ بحالہ قائم رہے گا،

چنانچہ جہاں دنیا کی دوسری قومیں کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گی وہاں ہمارا شمار پہلے کی طرح "نحن ھٰھنا قاعدون" ہی میں ہوتا رہے گا۔

ہماری تاریخ کا وہ دور جس میں اسلامی فکر ایک متحرک، فعال اور ترقی پذیر طاقت تھی، عملاً سقوط بغداد (۶۵۶ھ) کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جمود اور رجعت پرستی کا جو اندھیرا چھایا ہے تو وہ اب تک نہیں چھٹ سکا گو گزشتہ سالوں میں عالم اسلام نے سیاسی میدان میں بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن جہاں تک اس کے فکر و ذہن کا بالخصوص مذہب کے معاملے میں تعلق ہے۔ اس کا وہی حال ہے، جو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اور اس تک روشنی کی کرنیں نہیں پہنچ سکیں۔

مجھے تسلیم ہے کہ ان صدیوں میں ہمارے ہاں بعض بڑے بڑے اصحاب علم و فکر پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے زمانے میں اور اپنے حالات کے مطابق اس ہمہ گیر جمود اور رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد بھی کی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عموماً ایک صاحب علم و فکر کے بعد بجائے اس کے کہ اس کے جانشین اور مسترشد اس کی پیدا کی ہوئی ذہنی بیداری کے دائرے کو وسیع کرتے اور اس کو اور آگے بڑھاتے، وہ پھر اسی جمود و قدامت کی طرف لوٹتے رہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان صدیوں میں یورپی ذہن نے تو نئی سے نئی دنیائیں تخلیق کر ڈالیں اور ہمارے علماء وہی پرانی لکیر پیٹتے رہے اور ان کا سارا زور اسلاف پرستی پر رہا۔

مثال کے طور پر امام ابن تیمیہؒ کی فکری تجدید مذہبی علوم کے محدود دائروں سے باہر نہ نکل سکی اور بعد میں ان کے متوسلین فقہی امور میں زیادہ تر تقلید و عدم تقلید کی بحثوں میں الجھ کر رہ گئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریک اسلامی فکر کو ایک نئے نہج پر ڈال سکتی تھی۔ لیکن اس کا حاصل محض "مسلم فسطائیت" کی شکل میں نکلا۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب کو لیجئے۔ بے شک انھوں نے اپنے دور میں نئے فکر کی شمع جلائی، لیکن ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے والد کے دوسرے علوم کو تو پھیلایا لیکن اس نئے فکر کو آگے نہیں بڑھایا۔ اور تو اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ "عبقات" لکھ کر دوسری راہ پر پڑ گئے جس میں یقیناً قدامت پر زیادہ زور تھا۔ اور تجدید و تخلیق پر کم۔ سب سے بڑی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ گو دارالعلوم دیوبند سلسلۂ ولی اللہی کی ایک علمی کڑی تھا، لیکن اس میں شاہ صاحبؒ کے تجدیدی و تخلیقی فکر کی دعوت نہیں دی گئی۔ بس ایک مولانا

محمد قاسمؒ تھے جن کے دم سے حکمتِ ولی اللہی زندہ رہی۔ اُن کے بعد دارالعلوم سرے سے فکرِ تازہ سے ہی محروم ہو گیا۔

سرزمین نجد کے شیخ محمدؒ بن عبدالوہاب کی دعوت سے اہلِ نجد کو سیاسی اقتدار تو مل گیا لیکن کیا اسلام کی اس تجدیدی دعوت سے اُن کے ہاں کوئی ذہنی بیداری بھی پیدا ہوئی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ذہنی لحاظ سے ہم سے زیادہ یورپ کے غلام بن گئے۔ اتاترک نے ترکی میں بڑی دُور رس انقلابی اصلاحات کیں۔ اور وہاں کی سیاسی و سماجی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ بدل دیا لیکن آج ترک اکثریت اپنے ذہن و فکر میں کس مقام پر ہے؟

خود ہمارے ہاں سرسید کی آزادیٔ فکر سے علی گڑھ نے کیا فائدہ اٹھایا۔ مولانا شبلیؒ نے "الکلام اور علم الکلام" لکھ کر اور سیاسی "تو ڈ یٹ" کی مخالفت کر کے نوجوان ذہن میں ایک نئی حرکت پیدا کی تھی۔ لیکن اُن کے جانشین سید سلیمان ندوی صاحبؒ اور اُن سے منتسب ادارہ بعد میں قدامت و رجعت کے نقیب بن کر رہ گئے۔

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ ہم میں سے کسی صاحبِ علم و فکر کا اگر کوئی قدم آگے کو اٹھتا ہے، تو اس کے بعد آنے والے اُس کے ہم قدم ہو کر آگے کیوں نہیں بڑھتے بلکہ اُن کے ہاں اُلٹی رجعتِ قہقری ہوتی ہے۔ آخر اس کا کیا سبب ہے؟

یورپ کے سیاسی استیلاء اور اُس کے نتیجے میں ہمارے ہاں جدید علوم و فنون اور جدید تہذیب و تمدّن کو ایک حد تک جو فروغ ہوا ہے، ایک تو اس کا دائرہ بہت محدود ہے۔ دوسرے ہمارے عوام کی غالب اکثریت میں جدید علوم و فنون اور جدید تہذیب و تمدّن کے بارے میں بہت کچھ ذہنی مغائرت ہے، جو اکثر اوقات منافرت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس مغائرت و منافرت کے پیچھے ہمارا وہ مذہبی ذہن کارفرما ہے جو صدیوں کی روایات و اثرات سے بنا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ ہر نیا فکر جو مروجہ قدامت پرستی سے الگ ہو۔ عوام میں زیادہ مقبول نہیں ہو پاتا، چنانچہ اس نئے فکر کے داعی کے بعد جب اُس کے جانشینوں کو عوام میں جانا پڑتا ہے تو لامحالہ وہ مجبور ہوتے ہیں کہ وہ نئے فکر پر زیادہ زور نہ دیں، اور عوام کے معتقدات سے کسی نہ کسی حد تک سمجھوتہ کریں۔ مثال کے طور سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے "ترجمان القرآن" کی جب تک کہ وہ حیدرآباد دکن میں رہے، فکری پرواز بڑی اونچی تھی، لیکن اُس وقت وہ چند سو سے زیادہ نہیں چھپتا تھا۔

لیکن جب وہ اِن فکری بلندیوں سے نیچے اُترا، اور قدرے عوامی سطح پر آ گیا تو اُس کی اشاعت بہت بڑھ گئی۔ یہی حال دیوبند، علی گڑھ اور ادارہ المصنفین کا ہے۔ اِن کے مخاطب جو طبقے تھے اُن کی غالب اکثریت کے ساتھ فکری و عملی ہم آہنگی کے بغیر یہ کبھی اتنے مقبول نہ ہو پاتے۔

اس تمام گفتگو سے میرا مطلب یہ ہے کہ اسلاف پرستی، قدامت پرستی اور اس کی وجہ سے جمود و رجعت پسندی ہمارے عوام کی غالب اکثریت کا عام رجحان ہے۔ اور وہ ہر جدید فکر اور ہر جدید چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لئے "الرحیم" یا "الرحیم" کی طرح کے اور نقیبان اصلاح و ترقی کی سب کوششیں اس وقت تک بے ثمر رہیں گی۔ جب تک یہ جمود نہیں ٹوٹتا۔ اور آپ یقین کریں کہ جمود باتوں سے خواہ وہ کتنی بلند افکار کی حامل ہوں نہیں ٹوٹا کرتا۔ اس کے لئے "عصائے کلیمی" کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس دور میں صنعتی انقلاب ہے۔

مسلمانوں کا نظامِ معیشت بدلیئے اِس سے اُن کا سماج بدلے گا۔ اور جب معیشت اور سماج میں تبدیلیاں آئیں گی تو نظریں صرف پیچھے دیکھنے پر مرکوز نہیں ہوں گی۔ بلکہ وہ آگے بھی دیکھنے لگیں گی۔ اس سے ہر جدید چیز سے نفرت کم ہوگی۔ اور ذہن آزادی سے سوچنے لگے گا۔ اسی طرح جمود کا دور دورہ ختم ہوگا۔ اور صرف اسی طرح ختم ہوگا۔ اگر صرف حکمت و فلسفہ سے کام چلتا تو آج سے دو سو سال پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ تمام کوششیں کیوں بے ثمر رہتیں۔

میرے نزدیک یہ اصل مسئلہ ہے اور اسے اوّلیت دینی چاہیئے۔

الطاف جاوید

مارٹن روڈ۔ کراچی

مطبوعات شاہ ولی اللہ اکیڈمی

★

لمعات (عربی)

شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ، جو اغلاط سے پر تھا، ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب میں "وجود" اور اس سے کائنات کا جس طرح صدور ہوا ہے، اس پر بحث کی ہے، اور اپنی الہیاتی حکمت کے دوسرے مسائل بھی بیان کئے ہیں۔ قیمت دو روپے

——:o:——

شاہ ولی اللہ کی تعلیم

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اردو میں شاہ صاحب کی تعلیم پر یہ پہلی جامع کتاب ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ قیمت ۷/۵۰ روپے ہے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی - صدر - حیدرآباد - پاکستان

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مُصنفوں کی کتابیں شائع کرنا

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ
الرحیم

مجلسِ ادارت:

ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا،
مخدوم امیر احمد

مُدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی

قیمت سالانہ :- آٹھ روپے

فی پرچہ :- پچھتر پیسے

جلد ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۳۸۴ھ مطابق اپریل سنہ ۶۵ء نمبر ۱۰، ۱۱

فہرست مضامین

شذرات

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کے با اثر مذہبی حلقوں میں اتحاد بین المسلمین کی ضرورت کا اب شدت سے احساس کیا جا رہا ہے۔ اور بعض فرقوں کے غیر ذمہ دارانہ افراد کے درمیان وقتاً فوقتاً تشدد کے جو افسوس ناک واقعات ہو جاتے ہیں، یہ حلقے بڑی سختی سے ان کا احتساب کرنے لگے ہیں۔ مسلمان فرقوں کی باہمی منافرت اور ان میں آئے دن اس طرح کے تصادم دین اسلام کی نظر میں تو انتہائی مذموم ہیں ہی لیکن ان کی زد خود اس مملکت کی سالمیت اور استحکام پر بھی براہ راست پڑتی ہے اور ان کی وجہ سے بحیثیت قوم کے ہماری انفرادی و اجتماعی سلامتی خطرات کی آماجگاہ بنتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ تمام مذہبی فرقوں کے ذمہ دار حضرات از خود کوئی مثبت قدم اٹھائیں، اور ملک میں اس قسم کی مذہبی فضا پیدا کریں کہ ان کے کسی غیر ذمہ دار فرد کو ایسی حرکات کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ اسلام پاکستان کے وجود اور اس کی ہئیت سیاسی کی اساس ہے اب اسے باہمی تفرقہ و انتشار کا ذریعہ بنانا اس مملکت کے ساتھ غداری کے مصداق ہے۔ آج مذہبی گروہ بندیوں کی منافرت انگیز سرگرمیوں کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

حال ہی میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائلپور میں تقریر فرماتے ہوئے اس بارے میں بڑی مفید باتیں کہی ہیں موصوف نے موجودہ گروہ بندیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اسلام کے بنیادی اصول الگ ہیں اور ان کی تعبیرات الگ، بدقسمتی سے مختلف گروہوں نے تعبیرات کے اختلافات کو اسلام کے بنیادی اصولوں میں اختلافات قرار دے لیا ہے اور اس بنا پر وہ اختلاف کرنے والوں کو ایک دم اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں دوسری غلطی یہ ہے کہ اسلام کے نام سے ایک جماعت جو کام

کرنے کا پروگرام بناتی ہے وہ اس پروگرام ہی کو عین اسلام سمجھ لیتی ہے اور اس معاملے میں جو اس سے اتفاق نہ کرے اسے وہ دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیتی ہے۔ اگرچہ مولانا موصوف نے اس جماعت کا نام نہیں لیا۔ لیکن اس سے ان کا جو مقصود ہے، وہ صاف ظاہر ہے۔

اب جس طرح ایک زمانے میں کلامی و فقہی اختلافات کو اسلام کے بنیادی اصولوں میں اختلافات بنا لیا گیا اس جماعت نے سیاسی پروگراموں کے اختلافات کو یہ حیثیت دیدی ہے اور اسی سے ساری قباحتیں پیدا ہوئی ہیں قبلہ مفتی صاحب نے جس حکیمانہ انداز سے اس ناصواب رجحان کی نشان دہی کی ہے خدا کرے، جماعت مذکور اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کرے۔

قومیت، اور اس سے مراد ظاہر ہے مروجہ قومیت ہے، اس کا تصور کبھی بھی ایک قوم کا آخری نظریاتی نصب العین نہیں ہو سکتا۔ ایک قوم مجبور ہے کہ وہ قومیت کے محدود تصور سے وسیع تر کوئی ایسا نظریاتی نصب العین رکھے جو ماورائے قوم ہو، اور اس سے زندگی، کائنات اور انسانیت عمومی کی بحیثیت مجموعی تعبیر ہو سکے۔

قوم کا قومیت سے بالاتر اور وسیع تر کیا نظریاتی نصب العین ہو؟ دنیائے اسلام کے دو ملکوں متحدہ عرب جمہوریت یعنی مصر اور انڈونیشیا میں یہ ذہنی کشمکش زیر سطح اور سطح کے اوپر بھی بڑے زوروں سے شروع ہے۔ انڈونیشیا میں جہاں علماء کی نہضتہ العلماء جماعت اور قوم پرستوں کا کافی زور ہے وہاں انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم بھی بڑی طاقتور ہے۔ آگے چل کر ان دونوں گروہوں میں سیاسی اقتدار کا کون مالک بنتا ہے۔ اس سوال سے قطع نظر سب سے بڑا مسئلہ آج انڈونیشیا کے سامنے یہ ہے کہ انڈونیشی ذہن اسلام کے روحانی و مادی نصب العین کو اپناتا ہے۔ یا کمیونزم کے خالص مادی نصب العین کو۔

مصر میں آج کل عرب اشتراکیت کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اس عرب اشتراکیت کو گو اس کے حامی اسلام کے معاشی نظام ہی کی ایک تعبیر بتاتے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کی تہ میں وہ عناصر بھی سرگرم کار ہیں، جو اشتراکیت کو اشتراکیت ہی سمجھتے ہیں۔ پچھلے دنوں مصر کی واحد سیاسی جماعت کے جلسے میں صدر ناصر سے اس بارے میں سوالات کئے گئے اور ان سے پوچھا گیا کہ آیا ہماری اشتراکیت روحانی ہے یا مادی۔ اس سلسلے میں صدر ناصر کی توجہ مارکسی خیالات کے حامی افراد کی طرف مبذول کرائی گئی کہ وہ عرب اشتراکیت کو کن معنوں میں پیش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد مصطفےٰ کمال اتاترک کی زیر قیادت اسلام اور مغربی نظام تہذیب کو ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اب صدر سوکارنو اور صدر ناصر کے ماتحت انڈونیشیا اور مصر میں اسلام اشتراکیت ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہیں، دیکھیں اس مقابلے سے کیا نتائج نکلتے ہیں۔

فروری کی بیس اکیس تاریخوں میں یوپی۔ ہند کے دور افتادہ ضلع اعظم گڑھ میں دار المصنفین کی پچاس سالہ جوبلی بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی ہے اس تقریب میں جہاں حکومت ہند اور حکومت پاکستان دونوں کے نمائندوں نے شرکت کی وہاں دونوں حکومتوں نے بالترتیب پچاس ہزار اور پچیس ہزار روپے کے عطیات بھی دار المصنفین کو دیئے۔ گزشتہ نصف صدی میں مولانا شبلیؒ کے قائم کردہ اور مولانا سید سلیمان ندوی کے پروان چڑھائے ہوئے اس ادارے نے جو علمی خدمات سرانجام دی ہیں، برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی جس قدر منزلت اور احترام ہے، اس کے علاوہ دونوں حکومتوں کی طرف سے دار المصنفین کی خدمات کا یوں عملی اعتراف اس کے حسن کار اور حسن مقاصد کا سب سے روشن ثبوت ہے۔

ہم دار المصنفین کی اس تاریخی تقریب پر اسے اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مولانا شبلی اور سید صاحب کی یہ علمی یادگار اور پھلے پھولے اور اس کے اثمار شیریں سے ہم سب لذت یاب ہوں۔

---

۲۷ مارچ کو کراچی اور دوسرے شہروں میں علامہ اقبال کا یوم ولادت منایا گیا ہے پاکستان و ہند میں عہد حاضر میں اسلام کی احیاء کی تاریخ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے شروع ہوتی ہے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کا خانوادۂ علمی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے ماتحت اور اپنے خاص رنگ میں احیائے اسلام کی انہی کوششوں کو آگے بڑھایا اور موجودہ فلسفہ و سائنس کی روشنی میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے علمی دنیا کو متعارف کرانے کی طرح ڈالی۔ یہ کوششیں برابر جاری رہنی چاہئیں۔ نہ صرف پاکستان کا ذہنی افق اس سے وسیع ہوگا، بلکہ پورے اسلامی و انسانی فکر میں ہم اس کے ذریعہ بہت کچھ اضافہ کر سکتے ہیں۔

ابوحیان التوحیدی

از مولانا ابوبکر شبلی

علی بن محمد بن العباس، ابوحیان التوحیدی مشہور صوفی اور عالم تھے ۔ معقولات اور منقولات میں اپنے وقت کے امام تھے ۳۱۲ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے ۔ آپ فارسی النسل تھے آپ کے اجداد، شیراز یا نیشاپور یا واسط کے باشندے تھے ۔ آپ کے والد بغداد میں آکر سکونت پذیر ہوئے تھے اور کھجور کا بیوپار کرتے تھے علامہ السبکی[1] لکھتے ہیں ۔

علی بن محمد بن العبّاس المعروف بأبی حیان التوحیدی، المتکلم الصوفی صاحب المصنفات، شیرازی الأصل و قیل نیشابوری وقیل واسطی[2]

علی بن محمد بن العباس جو ابوحیان التوحیدی کے نام سے مشہور ہیں، ایک متکلم اور صوفی تھے ۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ شیرازی الاصل تھے کہا گیا ہے کہ نیشاپور کے رہنے والے تھے اور ایک قول ہے کہ واسط کے تھے ۔

خیر الدین الزرکلی[3] لکھتے ہیں ۔

وُلِدَ فی شیراز او فی نیشاپور و أقام مدۃ ببغداد[4]

(علی بن محمد بن العباس) شیراز یا نیشاپور میں پیدا ہوئے اور ایک مدت تک بغداد میں رہے

---

[1] علامہ ابونصر عبدالوہاب بن تقی الدین السُبکی، صاحب طبقات الشافعیہ

[2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۳ ۔ مصر

[3] خیر الدین الزرکلی صاحب "الاعلام"

[4] الاعلام ج ۵ ص ۱۴۴ ط دمشق

الزرکلی کی رائے میں ابوحیان التوحیدی کا مولد شیراز یا نیشاپور ہے لیکن حسن السندوبی کی رائے اس سے مختلف ہے۔

وہ لکھتے ہیں:۔

ولد ابوحیان التوحیدی فی بغداد سنة ۳۱۲ھ و نشا بها[1]	ابوحیان التوحیدی بغداد میں ۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے اور وہاں ہی پرورش پائی۔

بہرحال یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ علامہ ابوحیان التوحیدی فارسی النسل ہیں۔ التوحیدی کے لقب کے سلسلہ میں محققین کی دو رائیں ہیں۔

الف۔ عبدالرزاق محی الدین لکھتے ہیں۔

وللمؤرخین فی معنی لقبہ کلام فقد قیل إن أباہ او احداً اجدادہ کان یبیع نوعاً من التمر یسمّی التوحید[3]	ان مورخین کو ان کے لقب کے سلسلہ میں کچھ کلام ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کے والد یا کوئی دادا "التوحید" نامی کھجور کی تجارت کرتے تھے۔ (اس لئے التوحیدی لقب پڑ گیا۔)

ب۔ علامہ ابن حجر العسقلانی کہتے ہیں۔

یحتمل ان یکون نسبتہ الی التوحید الذی ھو الدین۔ فان المعتزلہ یسمّون انفسھم اھل العدل والتوحید[4]	ممکن ہے کہ ان کی نسبت "التوحید" کی طرف ہو جو ایک عقیدہ ہے۔ اور معتزلہ اپنے آپ کو "اھل العدل والتوحید" کہتے ہیں۔

یہ دونوں رائیں مورخین نے اپنے ذاتی ظن پر قائم کی ہیں۔ خود ابوحیان نے اپنی تصنیفات میں اس

---

[1] حسن السندوبی صاحب "مقدمة المقابسات" [2] مقدمة المقابسات

[3] ابوحیان التوحیدی۔ ص ۵ ط مصر

[4] لسان المیزان۔ ج ۲ ص ۳۶۱ ط حیدرآباد

[5] ابوحیان التوحیدی ص ۵

پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

ابوحیان التوحیدی نے بغداد اور بصرہ کے مختلف مدارس میں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کی انہوں نے حدیث ابوسعید السیرافی[1] ابوبکر الشاشی[2] اور جعفر الخلدی سے سنی اور فقہ قاضی ابوحامد دروزی سے پڑھی۔

دیگر علوم و فنون جیسا کہ ادب، فلسفہ، منطق، طبیعیات، تصوف اور الہیات کی تعلیم زیادہ تر مشہور حکیم و فیلسوف ابوسلیمان السجستانی المنطقی سے حاصل کی ابومحمد المقدسی العروضی، ابوالفتح النوشجانی ابوزکریا الصمیری، ابوبکر القومسی، اور علی بن عیسی الرمانی کے نام بھی آپ کے اساتذہ کی فہرست میں شامل ہیں[3]۔

آپ اپنے دور میں علوم و فنون میں امام مانے جاتے تھے۔ ذہانت اور فطانت میں بے مثال تھے۔ بڑے بڑے علماء نے آپ کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔

یاقوت الحموی لکھتے ہیں۔

کان متفنناً فی جمیع العلوم من النحو واللغۃ والشعر والأدب والفقہ والکلام علی رأی المعتزلۃ[4]	آپ ابوحیان، تمام علوم میں ماہر تھے، نحو لغت شعر، ادب، فقہ، اور معتزلی علم کلام میں۔

السبکی لکھتے ہیں۔

علی بن محمد بن العباس المعروف بأبی حیان التوحید.... کان اماماً فی النحو واللغۃ والتصوف، فقیھاً مورخاً[5]	علی بن محمد بن العباس جو ابوحیان التوحیدی کے لقب سے مشہور ہیں، نحو، لغت، تصوف میں امام تھے۔ بڑے فقیہ اور مورخ تھے۔

---

[1] ہو ابوالحسن بن عبداللہ (بغداد) السیرافی (توفی ۳۶۸ھ)

[2] ہو ابوبکر بن محمد بن علی القفال نشاشی (ولد بشاش ۲۹۱ھ توفی ۳۶۶ھ)

[3] مقدمۃ المقابسات۔ صفحہ ۱۰۔ ط۔ مصر

[4] کتاب بغیۃ الوعاۃ، السیوطی۔ صفحہ ۳۴۸۔ ط۔ مصر [5] طبقات الشافعیۃ الکبری ج ۴۔ صفحہ ۲

علامہ یاقوت ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

فھو شیخ الصوفیہ وفیلسوف الادباء وادیب الفلاسفۃ ومحقق الکلام ومتکلم المحققین وامام البلغاء وعمدۃ لبنی ساسان[1]

آپ صوفیہ کے شیخ ادیبوں کے فیلسوف فلاسفہ کے ادیب، کلام کے محقق محققین کے متکلم، بلغا کے امام اور بنی ساسان کے اشراف میں سے ہیں۔

آپ عالم فاضل، مجتہد اور امام فن ہونے کے ساتھ ساتھ تدین اور تقویٰ میں بھی بہت بلند درجہ کے مالک تھے۔ بڑے صابر، زاہد، صوفی اور صحیح العقیدہ تھے۔

علامہ یاقوت الحموی لکھتے ہیں۔

ھو صوفی السمت والھیئۃ والناس علی ثقۃ من دینہ[2]

آپ صوفی مسلک اور ہیئت کے تھے اور لوگوں کو ان کی دینداری پر پورا بھروسہ تھا۔

الحافظ البغدادی[3] لکھتے ہیں۔

لہ - اولا بی حیان المصنفات الحسنات کالبصائر وغیرھا۔ وکان فقیراً صابراً، متدیناً صحیح العقیدۃ[4]

آپ کی - یعنی ابو حیان کی کئی اچھی تصنیفات ہیں جیسے البصائر وغیرہ۔ آپ فقیر، صابر، دیندار اور صحیح عقیدہ والے تھے۔

غیراز نامہ کے مصنف ابوالخیر رقمطراز ہیں۔

ھو الامام الموحد والعالم المتفرد الجامع للمعارف والعلوم لا نظیر لہ فی المکاشفات الالھیہ والبحث فی التوحید[5]

آپ موحد اور منفرد حیثیت کے عالم ہیں علوم اور معارف کے جامع ہیں۔ مکاشفات الہیہ اور توحید کی بحث میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔

---

[1] معجم الادباء ج ۱۵ ص ۵۔ ط دار المأمون
[2] " " "
[3] ھو العلامۃ ابو بکر احمد الحافظ البغدادی (المولود ۳۹۲ھ)
[4] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۲-۳
[5] (باقی حاشیہ صفحہ پر)

آپ کا علم و فضل زہد و تقویٰ ہر دور میں مسلم رہا ہے۔ ہر مسلک کے علماء نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی ہے اس کے باوجود تین ایسے عالم ملتے ہیں جنہوں نے آپ کی دینداری اور پرہیزگاری کو مطعون کیا ہے۔ اور وہ تین عالم یہ ہیں (۱) ابن فارس (۲) ابن جوزی اور (۳) الذہبی۔

علامہ السبکیؒ ابن فارس کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال ابن الفارس فی کتاب الفریدة والخریدة کان ابو حیان کذابًا قلیل الدین والورع عن القذف والمجاهرة بالبهتان، تعرض لامور جسام من القدح فی الشرع یعتر.	ابن فارس نے کتاب "الفریدة والخزیدة" میں لکھا ہے کہ ابوحیان جھوٹے تھے۔ دین میں کمزور تھے الزام تراشی اور بہتان سے نہیں ڈرتے تھے انہوں نے شریعت میں کئی۔

علامہ ابن الجوزی کی رائے ہے کہ

زنادقة الاسلام ثلاثة ابن الراوندی وابو حیان التوحیدی وابو العلاء واشدهم علی الاسلام ابو حیان	اسلام میں تین زندیق مشہور ہیں، ابن الراوندی ابوحیان التوحیدی اور ابوالعلاء ابوحیان ان سب میں سب سے زیادہ سخت ہے۔

(باقی حاشیہ)

۵ علامہ ابوالعباس احمد بن ابی الخیر۔ صاحب کتاب شیراز نامہ

۶ شیراز نامہ فارسی صـ۱۰ ط طہران بحوالہ کتاب ابوحیان التوحیدی صـ۶۹

۷ طبقات الشافعیۃ الکبری ج ۴ صـ۲

۸ " " " " "

اس کے بعد علامہ السبکی نے الذہبی کا قول نقل کیا ہے۔

وقال الذهبي كان يريد أباحيان عدو الله، خبيثاً سيئ الاعتقاد وقال ايضاً في كتابه ميزان الاعتدال في نقد الرجال علي بن محمد بن العباس صاحب زندقة والضلال[1]	الذہبی نے کہا ہے کہ ابوحیان خدا کا دشمن خبیث اور برا اعتقاد ہے۔ اس نے اپنی کتاب میزان الاعتدال فی نقد الرجال میں بھی لکھا ہے کہ علی بن محمد بن العباس زندیق اور ملحد ہے۔

مورخین نے ان تینوں آراء کو باطل قرار دیا ہے۔ اور اپنی مصنفات میں اس کی سخت تردید کی ہے ابوحیان التوحیدی کے سوانح نگار عبدالرزاق محی الدین لکھتے ہیں "الفریدۃ والخریدۃ نامی جو کتاب ابن فارس کی طرف منسوب ہے اس کا ذکر ہم نے کتابوں کی کسی فہرست میں نہیں دیکھا۔ میں نے بروکلمن کی کتاب "اکتفاء القنوع بما ہو مطبوع" اور "کشف الظنون" بھی دیکھی لیکن کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا[2]۔ تمام فہارس کتب میں اس کتاب کا نام نہ ملنا۔ ابن فارس کے قول کی صداقت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ابوحیان کی تصانیف سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ابن فارس کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ ابوحیان نے اپنی کتاب "الامتاع والمؤانسہ" میں ابن فارس کی ہجو کی ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اگر یہ قول صحیح طور پر منسوب ہو تو بھی حسد اور کینہ پر مبنی ہے[3]۔

ابن الجوزی کا قول بھی حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ ابن الجوزی ابوالوفاء عقیل کے شاگرد تھے اور ان کی تصنیفات میں سے "المنتظم" "صفوۃ الصفوۃ" اور "تلبیس ابلیس" بہت زیادہ مشہور ہیں ان تینوں کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صوفیاء کرام کے بارے میں بہت زیادہ متعصب تھے اور جو شخص بھی ان کی مخصوص آراء سے اختلاف کرتا تھا اس کے خلاف سب وشتم سے دریغ

---

[1] ابوحیان التوحیدی ص ۶۰ ط مصر

[2] 〃 〃 〃 〃 〃

[3] 〃 〃 ۶۲ 〃 〃

نہیں کرتے۔ یہی تاثر ان کے شاگرد کا ہے اور ابوحیان کو صرف صوفی ہونے کی بنا پر مطعون کیا۔
ابن الجوزی کی اس زیادتی پر حسن السندوبی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ارایت کیف یتعرض ابن الجوزی لما لم یجزہ لہ العقل ولا الدین ولا الشرائع فتسرب فی طوایا الضمائر وتولج خفایا القلوب، واستخرج من خبایا الافئدۃ ما اباح لہ الحکم بأن أباحیان کان أشد علی الاسلام من سواہ، ولماذا؟ لانہ لم یقل شیئاً ولم یصرح بشیٔ ألا ساء ما یحکمون۔[1]

تم نے دیکھا کہ ابن الجوزی ایسے معاملات میں کیسے جرأت کرتا ہے جس کی عقل، نہ دین اور نہ شریعتوں نے اجازت دی ہے اور وہ دلوں میں گھس گیا ہے۔ اور دلوں کی پوشیدہ باتوں میں دخل انداز ہوگیا ہے اور دلوں کے راز اس نے باہر نکالنے چاہے ہیں۔ اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ابوحیان دوسروں کے مقابلہ میں اسلام کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ آخر کیوں؟ کیونکہ اس نے کچھ نہیں کہا اور کسی بات کی صراحت نہیں کی۔ آہ کتنا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔

اور علامہ الذہبی کے الزام کا جواب علامہ السبکی نے اس طرح دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

الحامل للذہبی علی الوقیعہ فی التوحیدی، مع ما یبطنہ من بغض الصوفیۃ ۔۔۔۔ ولم یثبت عندی من حال ابی حیان ما یوجب الوقیعۃ فیہ[2]

الذہبی نے التوحیدی پر یہ الزام اس لئے لگایا ہے کہ وہ صوفیا سے بغض رکھتے تھے (اور ابوحیان صوفی تھے) حالانکہ میں نے ابوحیان کے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس کی وجہ سے یہ الزام لگانا ضروری ہو۔

مذکورہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ ابوحیان سیرت اور کردار کے لحاظ سے بہت بلند تھے۔ زہد اور تقوی میں بے اثر تھے۔ لیکن چونکہ آپ حریت فکر کے حامل تھے۔ اس لئے متشددین

---

[1] مقدمۃ المقابسات ص۱۱
[2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۲-۳

نے نہ فقط ان کو مطعون کیا، بلکہ زندیق اور ملحد کے لقب سے بھی ملقب کیا۔

اس آزادخیالی کی وجہ سے بعض علماء نے ابوحیان کو "معتزلہ" ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور التوحیدی کے لقب سے ان کو اور زیادہ مغالطہ ہوا ہے۔ حالانکہ "ابوحیان التوحیدی" بذات خود معتزلہ کے مخالف تھے۔ ان کی تصانیف سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ معتزلہ کو ناپسند کرتے تھے بلکہ سرے سے آپ فرقہ بندی کو ہی غلط سمجھتے تھے[1]

علامہ یاقوت الحموی نے ابوحیان کو "شیخ الصوفیہ" لکھا ہے۔ اسی طرح علامہ السبکی نے بھی ان کو "المتکلم الصوفی" کے لقب سے نوازا ہے۔ صوفیاء کرام کے مختلف تراجم میں بھی آپ کا ذکر آیا ہے۔ درحقیقت ابوحیان التوحیدی اپنے دور کے بہت بڑے صوفی تھے۔ ان کو عالم شباب سے تصوف کی طرف میلان تھا۔ دورجوانی میں جن لوگوں سے ان کے روابط قائم تھے وہ اکثر صوفی تھے جن میں ابن سمعون صوفی، جعفر بن حنظلہ صوفی، ابن سراج صوفی، ابن جلاء زاھد اور ابوزید المروزی کے نام قابل ذکر ہیں[2] ان حضرات کی صحبت نے آپ کو زاہد، قانع، صابر اور متقشف بنادیا تھا۔ ساری عمر آپ نے سادگی سے بسر کی۔ نام ونمود اور شہرت کا تصور تک نہیں کیا۔

تصوف کے علاوہ فلسفہ میں بھی آپ کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ علامہ یاقوت الحموی نے آپ کو "فیلسوف الأدباء اور ادیب الفلاسفہ" کہا ہے۔ ابوحیان کا فلسفے کی طرف رجحان ان کے استاذ ابوسلیمان السجستانی کی وجہ سے ہوا، جو اپنے وقت کے بہت بڑے حکیم اور فیلسوف تھے ابوحیان ان سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ان کے فلسفیانہ افکار و آراء کو اپنی تالیف "المقابسات" میں جمع کیا۔ "المقابسات" کا اکثر حصہ انہی کے اقوال و آراء پر مشتمل ہے۔ آپ کی دوسری تصنیف "الامتاع والموانستہ" بھی فلسفی مسائل کا مجموعہ ہے۔ آپ نے جن فلسفی مسائل پر بحث کی ہے۔ ان میں نفس، روح، جسم، عرض، انسان، طبیعت، حدوث عالم، قدم عالم عالم علوی، عالم سفلی، مواصلات شعاعیہ، عالم اخروی، معاد، کیفیت معاد، باری تعالیٰ وصفاتہٗ

---

[1] ابوحیان التوحیدی

[2] ابوحیان التوحیدی ص۱۹۲ ط مصر

معرفتہ العبادۃ، وغیرہ شامل ہیں۔

اگرچہ آپ فیلسوف الادبا، اوراَدیب الفلاسفہ تھے۔ تاہم آپ کی نظر میں شریعت کے مقابلہ میں فلسفہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آپ کے خیال میں فلسفہ کو شریعت کے ترازو میں تولا جانا چاہیئے، نہ کہ شریعت کو فلسفہ کے تابع بنایا جائے۔ وہ مفکرین، جو شریعت سے زیادہ فلسفہ کو اہمیت دیتے تھے، یا شریعت کو عقل کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے تھے، ان کو ابوحیان التوحیدی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ آپ فرماتے ہیں۔

ان الفلسفۃ حق لکنّھا لیست من الشریعۃ فی شیئی والشریعۃ حق، ولکنّھا لیست من الفلسفۃ فی شیئی وصاحب الشریعۃ مبعوث وصاحب الفلسفۃ مبعوث الیہ واحدھما مخصوص بالوحی والاٰخر مخصوص ببحثہ۔ [۱]

تحقیق فلسفہ حق ہے لیکن اس کو شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور شریعت حق ہے لیکن اس کو فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں ہے (کیونکہ) صاحب شریعت مبعوث ہے اور صاحب فلسفہ مبعوث الیہ ہے ان میں سے ایک وحی کا پابند ہے اور دوسرا اپنی بحث کا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ "اخوان الصفا" کو اسلام کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے۔ ایک جگہ ذکر کرتے ہیں۔

وحملتُ جملۃ منھا یرید رسائل اخوان الصفا الی ابی سلیمان السجستانی المنطقی۔ وعرضتھا علیہ ونظر فیھا ایامًا واختبرھا طویلاً ثمّ ردّھا علی وقال۔ تعبوا وما اغنوا ونصبوا وما اجدوا وعنوا وما اطربوا۔

میں نے اخوان الصفا کے تمام رسائل ابوسلمان السجتانی المنطقی کے سامنے پیش کئے۔ انہوں نے کچھ دنوں تک ان کا مطالعہ کیا اور اچھی طرح ان کو جانچا۔ پھر انہوں نے واپس کرتے ہوئے کہا انہوں (اخوان الصفا) نے محنت کی ہے، لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک مقصد مقرر کیا ہے لیکن اس میں کچھ کر نہیں پائے انہوں نے

---

[۱] الامتاع والمؤانستہ ج ۲ ص۱۸

وظنّوا مالا یکون ولا یمکن ولا یستطاع۔ ظنّوا انّھم یمکنھم ان یدسّوا الفلسفۃ التی ھی علم النجوم والافلاک والمقادیر وآثار الطبیعۃ والموسیقی ..... والمنطق فی الشریعۃ وان یضمّوا الشریعۃ للفلسفۃ

گایا لیکن طرب پیدا نہ کیا۔ اور انہوں نے ایک ایسا گمان کیا ہے جو نہ ہوتا ہے نہ اس کا امکان ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ فلسفہ کا جو کہ علم نجوم علم افلاک، مقادیر، آثار طبیعۃ، موسیقی اور منطق وغیرہ پر مشتمل ہے شریعت میں درس دیں اور شریعت کو فلسفہ کے ساتھ ملا دیں۔

چونکہ معتزلہ کے ہاں شریعت کی صداقت کی کسوٹی عقل ہے۔ اور شریعت کی ہر ایک بات کو عقل کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے ابو حیان التوحیدی کی نظر میں وہ لوگ کبھی قابل احترام نہیں۔ اور جب کبھی شریعت کی کسی بات پر معتزلہ کی طرف سے کوئی اعتراض وغیرہ سنتے تو فوراً جوش میں آجاتے تھے، المقابسات میں ایک واقعہ ہے۔

سمع مرۃ ابا اسحٰق النصیبی وکان من المعتزلۃ یقول ما اعجب اھل الجنۃ قیل وکیف قال لأنھم یبقون ابداً ھنالک لا عمل لھم الّا الاکل والشرب والنکاح أما تضیق صدورھم أما یکلّون اما یبرمون بانفسھم عن ھذہ الحال الخسیسۃ، التی ھی مشاکلۃ لحال البھائم فثارت ثائرۃ ابی حیان علی ما سمع واستعظم أن نتناول مسائل الدین بمثل ھذہ الجرأۃ والوقاحۃ فقال

ایک دفعہ ابو حیان نے ابو اسحٰق النصیبی کو جو کہ معتزلہ تھا، یہ کہتے ہوئے سنا کہ جنت والے بھی کیسے عجیب لوگ ہونگے؟ پوچھا گیا کیسے اس نے کہا کیونکہ وہ لوگ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ کھانے پینے، نکاح کرنے کے سوا ان کو اور کوئی کام نہیں ہوگا۔ کیا وہ گھٹن محسوس نہیں کرینگے۔ وہ اکتا نہیں گے نہیں؟ کیا اس بدحالی سے تنگ نہیں آئیں گے، جو تقریباً جانوروں کے مانند ہے۔ اس پر ابو حیان کو جوش آگیا اور انہیں یہ بہت گراں محسوس ہوا کہ دین کے مسائل میں اس جرأت اور دیدہ دلیری سے حملے کئے جائیں اور پھر کہا مجھے اپنی عمر کی قسم جس کو دل کا سکون

ولعمری ان من طلب طمانینۃ النفس ویقین القلب ولغمۃ البال بطریقۃ اھل الجدل واھل البلاء حل بہ ھذا البلاء واحاطہ بہ ھذا الشقاء والکلام کلہ جدل و دفاع وحیلۃ وایھام ... وبالجملۃ آفتہ عظیمۃ وفائدتہ قلیلۃ [۱]	اور قلب کا یقین اور آسودگی ان جھگڑالو لوگوں کی طرح مطلوب ہو ان پر مصیبت آچکی ہو اور ان کو بدقسمتی نے احاطہ کر لیا۔ علم کلام تمام کا تمام جدل اور دفاع ہے حیلہ اور وہم ڈالنا ہے۔ بالاختصار اس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔

بہرحال "ابوحیان التوحیدی" کی نظر میں فلسفہ شریعت کا تابع ہے، شریعت فلسفہ کی پابند نہیں، یہ ضروری نہیں کہ جو چیز عقل سے مفید نظر آئے وہ ضرور شریعت میں بھی مفید ہو یا اگر کوئی شرعی بات عقل کے نقطۂ نگاہ سے موزوں نظر نہ آئے تو وہ نا قابل عمل بھی ہو شریعت منزل من اللہ ہے۔ فلسفہ انسانوں کی تخلیق ہے اس لئے شریعت کو عقل کے ترازو سے تولنا یا فلسفہ کے معیار پر جانچنا صحیح نہیں۔

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱- المحاضرات والمناظرات
۲- الامتاع والموانستہ
۳- المقابسات
۴- الرد علی ابن جنی فی شعر المتنبی
۵- المنزلنہ
۶- تقریظ الجاحظ
۷- مثالب الوزیرین
۸- الاشارات الالھیہ

---

[۱] المقابسات، ص ۱۲۴ ط الرحمانیتہ

۹- ریاض العارفین

۱۰- الحج العقلی اذا ضاق الفضاء عن الحج الشرعی

۱۱- فی احیاء الصوفیہ

۱۲- الحنین الی الاوطان

۱۳- الصوفیہ

آپ کی وفات ۱۴۱ھ میں ہوئی تاریخ وفات متعین نہیں ہو سکی۔

پروفیسر وائٹ ہیڈ نے کیا خوب کہا ہے۔ "مذہب کا ہر عہد عقلیت کا عہد تھا" لیکن مذہب کو عقلی رنگ میں پیش کیا جائے، تو اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ فلسفہ کو مذہب پر فوقیت حاصل ہے۔ بے شک فلسفہ کو حق پہنچتا ہے کہ مذہب پر حکم لگائے، مگر جس چیز پر حکم لگانا مقصود ہے اسکی ماہیت ہی ایسی ہے کہ وہ فلسفہ کا یہ حق تسلیم کرے گی تو ان شرائط کے ماتحت، جن کو خود اس نے متعین کیا ہے۔ بالفاظ دیگر جب فلسفہ مذہب پر حکم لگاتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اسے اپنے مدلولات میں کوئی ادنیٰ جگہ دے۔ مذہب فلسفہ کا کوئی شعبہ نہیں کیونکہ یہ محض فکر ہے نہ احساس نہ عمل۔ بلکہ انسان کی ذات کلی کا مظہر۔ لہذا فلسفہ مجبور ہے کہ مذہب کی قدر و قیمت کے باب میں اس کی مرکزی حیثیت کا اعتراف کرے۔ اسے ماننا پڑے گا کہ فکر انسانی کا عمل ترکیب و ائتلاف مرتکز ہوتا ہے تو اسی ایک نقطے پر پھر اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ فکر اور وجدان بالطبع ایک دوسرے کی ضد ہیں دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔ ایک جزواً جزواً حقیقت مطلقہ پر دسترس حاصل کرتا ہے۔ دوسرا من حیث الکل، ایک کے سامنے حقیقت کا دوامی پہلو ہے۔ دوسرے کے زمانی۔

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ مصنفہ علامہ اقبالؒ)

(اردو ترجمہ سید نذیر نیازی)

عربی مدارس کا موجودہ نصاب تعلیم

طفیل احمد قریشی۔ ایم۔اے

درس گاہیں قومی زندگی میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان کا نصاب قومی فکر و نظر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین تعلیم وقتاً فوقتاً نصاب تعلیم کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور وقتی مصالح اور ضرورتوں کے پیش نظر اس میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمان ہر دور میں پرانی تحقیقات کے ساتھ ساتھ نئے افکار کا مطالعہ کرتے رہے اور نئے علوم و فنون میں اقوام عالم کی رہبری کرتے رہے ایک زمانے میں بغداد و قرطبہ علوم و فنون کے بڑے اہم مراکز تھے اور تشنگان علم دور دراز سے آتے اور ان سرچشموں سے سیراب ہو کر جاتے تھے۔ مسلمانوں کے دور عروج میں ان کے نظام تعلیم کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کے زیر درس صرف قرآن و حدیث ہی کی تعلیمات نہیں رہیں بلکہ حیات انسانی کے مختلف شعبوں میں جو ترقیاں محققین کرتے رہے، وہ بھی داخل نصاب تھیں۔ قال اللہ و قال الرسول کے ساتھ ان کے ہاں قال ارسطا طالیس و بطلیموس وغیرہ بھی داخل تدریس تھے۔ آیات اللہ فی کتاب المجید کے ساتھ آیات فی الافاق (کائنات) کے عقدے بھی حل ہوتے تھے۔ اور یہی طرز تعلیم اس زمانے میں مسلمانوں کو دیگر اقوام کے نظامہائے تعلیم سے ممیز بھی کرتا تھا۔

مسلمانوں کے تدریسی نظام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ علوم نقلیہ :۔ قرآن پاک، تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم۔

۲۔ علوم آلیہ :۔ وہ علوم جو علوم نقلیہ اور دوسرے علوم کی تحصیل میں لوازم و مبادی خیال کئے جاتے ہیں، جیسے صرف و نحو، کلام۔ بلاغت۔ منطق۔ اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، علم الرجال

۳۔ علوم عقلیہ :۔ علوم کی اس شق میں معاشی، معاشرتی، فکری اور فنی علوم کی تمام شاخیں شامل ہیں
اموی، عباسی یا فاطمی دور کے نظام تعلیم سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم صرف یہاں برصغیر پاک و ہند
کے نصاب تعلیم کا سرسری جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے ایک مشہور عرب سیاح المقدسی کے بیان کے مطابق پہلی صدی ہجری میں ہی
مسلمان سرزمین سندھ میں ہندوستان کو اپنے علوم سے روشناس کرا چکے تھے۔ لیکن فرشتہ کی نظر میں اسلامی
نظام تعلیم کی ابتدا محمود غزنوی کے دور سے ہوتی ہے۔ محمود غزنوی صرف فاتح ہی نہیں بلکہ بہت بڑا علم دوست
بھی تھا۔ ہندوستان میں اپنے مفتوحہ علاقوں کے نظم و نسق کے ساتھ ساتھ اس نے یہاں جا بجا مدارس بھی
کھلوائے۔ چنانچہ فرشتہ محمود کے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

آں مسجد و مدرسہ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب موشح گردانیدہ و بات بسیار
بسجد و مدرسہ وقف فرمودہ"۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول)

محمود ہی کے دور میں جب اس کے بیٹے شہاب الدین مسعود کو لاہور کا گورنر بنایا گیا تو اس نے بھی اپنے
والد کا تتبع کرتے ہوئے مدارس کی طرف خاص توجہ دی۔ اس نے غزنی سے ماہرین تعلیم بلوائے اور بڑے
شہروں میں جا بجا مدارس کی بنیاد رکھی۔ ان علماء میں اس وقت کے جید عالم شیخ اسمٰعیل (المتوفی ۴۴۸ھ)
قابل ذکر ہیں۔ جو اپنے ساتھ حدیث و فقہ کا کافی ذخیرہ لائے۔ چنانچہ فرشتہ مسعود کے حالات قلم بند
کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" در اوائل سلطنت اور در ممالک محروسہ چنداں مدارس و مساجد بنیاد نہاد کہ زباں از تعداد
آں عاجز است"

(فرشتہ جلد اول ص ۱۱۳)

اس کے دور حکومت میں اتنے مدارس و مساجد قائم کئے گئے کہ جن کو بیان کرنے سے
زبان قاصر ہے۔

ہندوستان میں اسلامی نظام تعلیم کا یہ ابتدائی دور تھا۔ اس لئے نصاب اس قدر مختصر مرتب کیا گیا جس سے
دینی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں علم نحو میں کافیہ، فقہ میں ہدایہ، تفسیر میں
کشاف اور حدیث میں مشارق الانوار کی تدریس پر اکتفا کیا گیا۔ مسعود کے بعد بیرم کے عہد میں بھی شیخ

نظامی اور سید حسن غزنوی جیسے علماء نے اسی نصاب کو برقرار رکھا اور بعد میں ان کے تلامذہ بھی اسی نصاب کی تدریس فرماتے رہے۔ بلبن کے عہد تک اس نصاب میں دو چار کتب کے اضافہ سے اس نصاب کی تدریس ہوتی رہی۔ طبقات ناصری کے مصنف کے بیان کے مطابق سید مولی نے دہلی میں ایک مرکزی ادارہ قائم کیا[1]۔ اس ادارہ نے مدارس کی تنظیم کے لئے ایک اہم کردار ادا کیا اور مدارس کے لئے ایک نصاب مرتب کیا، جس میں مندرجہ ذیل کتب پڑھائی جاتی تھیں۔

۱۔ علم نحو:۔ مصباح ۔ کافیہ ۔ لب الالباب ۔ ارشاد

۲۔ فقہ:۔ ہدایہ

۳۔ اصول فقہ:۔ منار ۔ اصول بزدوی

۴۔ تفسیر:۔ مدارک ۔ بیضاوی ۔ کشاف

۵۔ حدیث:۔ مشارق الانوار ۔ مصابیح السنہ

۶۔ علم الکلام:۔ شرح صحائف

۷۔ تصوف:۔ عوارف المعارف ۔ فصوص الحکم ۔ نقد النصوص ۔ لمعات ۔

۸۔ ادب:۔ مقامات حریری

۹۔ منطق:۔ شرح شمسیہ

اس دور کے علماء نے جن میں حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ، شیخ بہاؤ الدینؒ، شیخ بدر الدین غزنویؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ، شمس الدین خوارزمی اور برہان الدین بلخیؒ جیسے بزرگوں کے نام سر فہرست لکھے جا سکتے ہیں۔ اسی نصاب کی تدریس فرمائی۔ بعد ازیں جلال الدین خلجی کے دور میں بھی مولانا سید رکن الدینؒ۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔ فخر الدینؒ۔ نصیر الدینؒ۔ تاج الدینؒ۔ اور علاؤ الدین علاء الشریعہؒ جیسے علماء نے اس نصاب کو برقرار رکھا۔

برصغیر کی اسلامی درسگاہوں میں ایک عرصہ تک یہی نصاب معمولی رہا۔ سکندر لودھی کے دور میں بلبن کے دور کے مرتبہ نصاب میں ۹۲۳ھ کے لگ بھگ مندرجہ ذیل کتب اور داخل نصاب

---

[1] طبقات ناصری ص ۴۳۷

کردی گئیں۔

نحو میں شرح جامی۔ فقہ میں شرح وقایہ۔ بلاغت میں مختصر اور مطول۔ علم کلام میں شرح عقائد نسفی۔ مواقف اور اصول فقہ میں توضیح تلویح۔

اکبر کا عہد حکومت جہاں اور بہت سی تبدیلیوں کا باعث بنا، وہاں اس کا اثر ہمارے نصاب تعلیم پر بھی بہت گہرا پڑا۔ ان اہم تبدیلیوں کا ذکر ابوالفضل نے آئین اکبری میں بھی کیا ہے۔ ۹۹۵ھ میں اکبر نے مدارس میں علوم نقلیہ (قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ) میں بے انتہا کمی کر کے علوم مروجہ فلسفہ، طب، ریاضی، نجوم، ہیئت کیمیا وغیرہ مضامین کی تدریس کے احکامات جاری کر دیئے [1] اور اس کے لئے بیرونی ممالک سے ماہرین تعلیم بلوائے۔ ان حالات کا تذکرہ مصنف مآثر الکرام نے یوں کیا ہے

"تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث منصور و مرزا جان میر بہ ہندوستان آورد و در حلقۂ درس انداخت و جم غفیر از حاشیۂ عقل استفادہ کردند و ازاں عہد معقولات را رواجی دیگر پیدا شد" (مآثر الکرام)

باہر کے علمائے متاخرین جیسے محقق دوانی میر صدرالدین میر غیاث منصور اور مرزا جان میر کی تصانیف ہندوستان میں لائی گئیں اور حلقۂ درس میں شامل ہوئیں اور ایک کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا اور اس طرح اس عہد سے معقولات کا رواج عام ہوا۔

لالہ سیل چند نے بھی اکبر کی انہی تبدیلیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"در عہد جلال الدین محمد اکبر شاہ جا بجا مدرسہا بودند، استادان فارس و شیراز تعلیم می فرمودند" (تفریح العمارات)

جلال الدین محمد اکبر شاہ کے عہد حکومت میں جگہ جگہ مدرسے تھے اور ان میں فارس اور شیراز کے استاد تعلیم دیتے تھے۔

اس تبدیلی سے ہمارا تعلیمی نصاب ایک ایسے موڑ پر آ کھڑا ہوا جہاں سے دو الگ الگ راستے نکلتے تھے

---

[1] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۶۳

ایک گروہ نے تو حکومت کے احکامات پر صاد کرتے ہوئے علوم مروجہ کو اپنا لیا اور ان کے نصاب میں علوم نقلیہ کم اور عقلیہ بہت زیادہ تعداد میں داخل ہوئے۔ دوسرے مکتبِ فکر کے علماء نے اس کے ردِعمل میں علوم نقلیہ اور زیادہ داخل نصاب کئے اور علوم عقلیہ برائے نام رکھے۔ ان دوسرے مکتبۂ فکر کے علماء میں حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کا نام سرِفہرست لکھا جا سکتا ہے جنہوں نے محلہ ہشت بہشت میں اپنا ایک الگ مدرسہ قائم کیا۔ آگرہ میں مولانا علاؤالدین نے اسی قسم کے نصاب کے لئے اپنا ایک الگ مدرسہ قائم کیا۔ ان حضرات کے تلامذہ نے بھی اپنے اساتذہ کے تتبع میں اسی نصاب کے مدارس ہندوستان کے دوسرے شہروں میں قائم کئے۔ لیکن ہند و پاک کے اکثر مدارس نے پہلی قسم کے ہی نصاب کو اپنایا اور لاہور، احمد آباد، دہلی، سیالکوٹ، جونپور اور ٹھٹھ وغیرہ شہروں کے مدارس میں پہلی ہی قسم کا نصاب داخل درس رہا۔ چنانچہ شاہ جہاں کے عہد میں ملا عبدالوہاب، ملا یوسف، ملا جمال، ملا قطب الدین سہالوی اور اورنگ زیب کے دور میں ملا محمد جمیل، قاضی محمد حسن جونپوری، محمد حسن خیرآبادی، سید نظام ٹھٹوی اور ملا محمد فائق جیسے علماء نے اسی نصاب کو داخل تدریس کیا۔

ہندوستان میں اسلامی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، آپ نے اپنی متعدد کتب میں تعلیم و تعلّم میں ماہرین تعلیم کی رہنمائی فرمائی ہے۔ ان خامیوں کو اجاگر کیا ہے جو طریقۂ تعلیم کے سلسلے میں متعلمین کے لئے مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔ ان نئے علوم سے روشناس کرایا ہے جو کتاب و سنت کی تفہیم میں معاون بن سکتے ہیں۔ اور ان طریقوں کا ذکر کیا ہے جو نظام تعلیم میں نئی تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے مدارس کا نصاب اس قدر منتشر ہو گیا تھا کہ اس کا کسی ایک لڑی میں پرو دیا جانا از حد ضروری تھا اس کے لئے ہندوستان کے مشہور جید عالم مولانا قطب الدین کے فرزند ملا نظام الدین فرنگی محلی (المتوفی ۱۱۶۱ھ) نے ایک نصاب تیار کیا جو آج "درس نظامی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ملا صاحب کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ شرح مسلم الثبوت۔ شرح مینار۔ حاشیہ صدرا اور حاشیہ شمس بازغہ آپ ہی کے علمی خزینہ کی ایک جھلک ہیں۔ ملا صاحب نے جو نصاب ترتیب فرمایا تھا انہیں مندرجہ ذیل کتب شامل تھیں۔

۱- صرف :- میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ

۲- نحو :- نحو میر، شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی

۳- منطق :- صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر، سلم العلوم

۴- بلاغت :- مختصر المعانی۔ مطول تا۔ اما قلت

۵۔ حکمت :- میبذی۔ صدرا۔ شمس بازغہ

۶- ریاضی :- خلاصۃ الحساب۔ تحریر اقلیدس۔ مقالہ اولی۔ رسالہ قوشجیہ۔ تشریح الافلاک۔ شرح چغمنی باب اوّل

۷- فقہ :- شرح وقایہ اولین۔ ہدایہ اخیرین

۸- اصول فقہ :- نور الانوار۔ توضیح تلویح۔ مسلم الثبوت

۹- علم کلام :- شرح عقائد نسفی، شرح جلالی، میر زاہد، شرح مواقف

۱۰- تفسیر :- جلالین۔ بیضاوی

۱۱- حدیث :- مشکوۃ المصابیح

ملا نظام الدین کے مترتبہ اس نصاب میں چند اور کتب مثلاً صرف میں علم الصیغہ، ادب میں نفحۃ الیمن، سبعہ معلقات، دیوان متنبی، مقامات حریری، حماسہ

منطق میں۔ ملا حسن، حمد اللہ، ملا جلال، بحر العلوم

فرائض میں۔ شریفیہ

مناظرہ میں۔ رشیدیہ

اصول حدیث میں۔ شرح نخبۃ الفکر

حدیث میں۔ بخاری۔ مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ کا اور اضافہ بعد میں کیا گیا۔ چنانچہ آج اسی پورے نصاب کو ہمارے مدارس میں درس نظامی کے نام سے پڑھایا جاتا ہے۔ اور یہی نصاب اس وقت بھی داخل تدریس تھا، جب ہندوستان میں مغل تاجداروں کی حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا۔

انگریز کے ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد حالات نے پلٹا کھایا۔ اس نصاب کو

پڑھ کر مدارس سے سندِ فراغت لینے والے وہ طلبہ جو اسلامی دورِ حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے تھے، مسجد کے پیش امام اور مدارس کے معلم بن کر رہ گئے۔ انگریز کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ان مدارس کی تنظیم کرتا یا کسی ایسے نصاب کی کتب سے مدارس کو روشناس کراتا جو جدید مغربی تحقیقات پر مبنی ہوں۔ ابتدا میں اسے صرف ایسے کلرکوں اور بابوؤں کی ضرورت تھی جو اس کی حکومت کو چلا سکیں چنانچہ اس نے اپنی طرز کے اسکول کھولے اور ان سے فارغ التحصیل طلبہ کو وہ اچھے عہدوں کی پیش کش کرنے لگا۔ ہندوؤں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی پوری توجہ ان کالجوں کی جانب مبذول کر دی جس کے نتیجے میں حکومت کے شعبوں میں انگریز و ہندو چھا گئے اور مسلمان انہیں خلافِ شرع خیال کر کے اپنی مسجد و خانقاہ تک محدود ہو کر رہ گئے۔

اس صورت حال کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ عام رجحان پیدا ہو گیا کہ مذہب ایک الگ چیز ہے اور کاروبارِ حیات اس سے مختلف ہے دنیاوی تعلیم تو وہ ہے جو کالجوں میں حاصل کی جائے اور دینی تعلیم محض وہ ہے جو عربی مدارس میں دی جاتی ہے۔ اس طرح مدرسہ اور کالج دو الگ راستے یا دو الگ نظام تعلیم بن گئے۔ گو کہ مدرسہ اور کالج کے دو نظاموں کے ملاپ کی کوششیں بھی کی گئیں لیکن ان کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہو سکا ان کوششوں میں پہلی کوشش سنہ ۱۸۹۳ء مطابق سنہ ۱۳۱۰ھ میں مدرسہ فیض عام کانپور کی سالانہ دستار بندی کے موقع پر علماء کے باہمی مذاکرات تھے، جس نے سنہ ۱۳۲۶ھ میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ کی شکل اختیار کی۔ بعد میں دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اس کی ایک کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود مدرسہ اور کالج کے دو مختلف تصورات کو دماغوں سے نہ نکالا جا سکا اور ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کو جہاں "درس نظامی" کا نصاب رائج تھا خالص مذہبی، اور علی گڑھ کالج کو جہاں علوم جدید پر زیادہ زور تھا، خالص دنیاوی سمجھا جانے لگا۔ جب کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی حیثیت دنیاوی اور دینوی دونوں طرح کی متصور ہوتی تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت میں گو کہ دونوں گروہوں، یعنی کالجوں کے تعلیم یافتہ گروہ اور عربی مدارس کے فارغ التحصیل علما کے گروہ کو شانہ بشانہ کام کرنے کا موقع ملا لیکن اس کا نصاب یا طریقۂ تعلیم پر کوئی اثر نہ پڑا۔ تحریک پاکستان میں بھی علماء اور دینی تعلیم کے پیدا شدہ رہنما شریکِ کار رہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد بھی مولوی

اپنی جگہ مولوی ہی رہا اور مسٹر اپنی جگہ "مسٹر"۔ مسٹر کو زعم تھا کہ وہ جدید سائنسی تحقیقات سے واقف اور جدید افکار سے آشنا ہے جب کہ مولوی کے پاس منقولات کو چھوڑ کر معقولات میں جو علم ہے وہ جدید تقاضوں کی تلافی ہرگز نہیں کر سکتا۔ لہذا "مولوی" اچھا فقہ داں یا عالم حدیث تو ہو سکتا ہے لیکن اچھا ریاضی داں جغرافیہ داں اچھا کیمسٹ یا فلسفی ہرگز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ان علوم کا بہت کم حصہ اس کے پاس ہے۔ "مولوی" اپنی جگہ مصر تھا کہ وہ اپنے نصاب میں کسی تبدیلی کو برداشت نہیں کریگا۔ اس کی نصابی کتب اسلاف کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ گو کہ اس کا نصاب دقیق ہے لیکن اس سے وہ اپنے متعلمین میں ایسی پختگی پیدا کر دیتا ہے جو کالجوں اور اسکولوں میں ممکن نہیں ہے شک اس کے اس نصاب سے متعلمین کو سالہا سال کی محنت شاقہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن اسس کا طالب علم ہر فن کا جسے وہ پڑھتا ہے، شائق ہو جاتا ہے اس کے نتیجے میں اگر اسے "دنیادی" عزت نہیں ملتی تو کوئی حرج نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ مدارس کا فارغ صرف پیش امام اور مکتب کا مدرس ہو کر رہ گیا۔ اور "مسٹر" دفتر نشین ہو کر اپنے حال میں مگن ہو گیا۔ حالانکہ قیام پاکستان کے بعد اسے ایک صحیح اسلامی مملکت بنانے کے لئے دونوں کا تعاون اشد ضروری تھا۔ قصور کس کا ہے؟ اس وقت یہ ہمارا موضوعِ گفت گو نہیں ہے سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنے درسی نصاب کا از سر نو جائزہ نہیں لے سکتے؟ اگر "نہیں" تو کیا یہ نصاب جس میں ہم (ماسوا منقولات) پرانے فلسفہ، ریاضی کے پرانے اور دقیق ترین فارمولوں۔ کیمیا اور ہیئت کے متروک ابحاث پر قانع ہو جاتے ہیں، عہد حاضرہ میں کافی ہے؟ کیا ہم علوم جدیدہ کی تحصیل کے بغیر مخالفین اسلام کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں؟ جدید افکار سے واقفیت کے بغیر کیا ہم اسلامی افکار کی دوسرے ممالک میں کامیابی سے اشاعت کر سکتے ہیں؟ غرض یہ کہ اسی قسم کی اور مشکلات بھی ہمارے علماء کے سامنے ہیں اور حالات کے مطابق اس سے کہیں بڑھ کر دشواریاں درپیش ہیں۔ جن کا اگر آج نہیں تو کچھ عرصہ بعد لازماً احساس کیا جائیگا۔

اس سلسلے میں پہلی بات جو "درس نظامیہ" کے نصاب کی فہرست پڑھتے ہی ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ اس پورے نصاب میں بنیادی مذہبی کتب دو چار ہی ہیں تقریباً پچاس کتب میں مشکوٰۃ (حدیث)، جلالین و بیضاوی (تفسیر) اور ہدایہ و شرح وقایہ (فقہ) ہی صرف ایسی کتب ہیں جو مذہبی ہیں۔ اس کے علاوہ جتنی کتب بھی ہیں یا تو وہ ان کتب کے لئے مبادی و لوازم کی

حیثیت رکھتی ہیں اور یا پھر علوم مروجہ سے متعلق ہیں جن کا بلحاظ وقت چرچا رہا ہے۔ وہ کتب جو مقصود بالغرض نہیں میری مراد علوم آلیہ کی کتب سے ہے، انہیں مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے صرف نحو یا گرامر کی تیرہ چودہ کتب میں قواعد کی تکرار زیادہ ہے، مشق بالکل نہیں یا پھر نہ ہونے کے برابر ہے۔ شرح جامی جو کہ نصابی حیثیت سے تو گرامر کی کتاب ہے لیکن اس میں گرامر کو بھی عقلیت کا رنگ دیا گیا ہے۔ علم کلام کی پانچ چھ بڑی بڑی کتب ہیں ان مسائل و مشکلات کا ذکر تک موجود نہیں، جن سے آج ہمارے مدارس کے فارغ التحصیل کو واسطہ پڑ رہا تھا۔ آج علم کلام کے نئے مسائل در پیش ہیں جن کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

ریاضی کی تقریباً چھ کتب میں وہ آسانیاں بالکل نہیں ہیں جو جدید الجبرا، جیومیٹری اور حساب نے مہیا کردی ہیں۔ منطق کی تقریباً گیارہ کتب پڑھا کر متعلم کو اچھا خاصا منطقی ضرور بنا دیا جاتا ہے جس سے وہ قضیوں اور سفسطوں میں اچھی خاصی مہارت بھی پیدا کر لیتا ہے لیکن یہ مقصود بالذات ہرگز نہیں شاید اسی لئے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ

فیکون الاشتغال بهذه العلوم الالیة تضیعاً للعمر و شغلاً بما لا یعنی" (مقدمہ)

ان علوم آلیہ سے اشتغال عمر کا ضائع کرنا اور ایسے امور سے دلچسپی کے مترادف ہے جن سے کوئی فائدہ نہ ہو۔

مزید طرہ یہ کہ ہمارے ہاں معقولات میں بہت سی ایسی کتب زیر درس رہتی ہیں جن میں متعدد فنون خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ متعلم بے چارہ پریشان ہو جاتا ہے کہ وہ کس فن کی کتاب پڑھ رہا ہے اور مباحث کچھ اور ہی نظر آتے ہیں بقول شخصے " احوال ایں قوم دیرت ایشاں" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ملا حسن، حمد اللہ اور قاضی مبارک وغیرہ منطق کی کتب ہیں لیکن ان کے اکثر مباحث الہیات، مابعد الطبیعہ، علم باری، جعل بسیط، جعل مرکب، کلی طبعی کا وجود فی الخارج اور وجود ذہنی وغیرہ سے متعلق ہیں۔

ہمارے درس کی اکثر کتب نفس مضمون سے زیادہ لفظی مباحث سے پر نظر آتی ہیں شمسیہ ہی کے ایک جملے میں جس میں مصنف نے لکھا تھا العلم ما تصور فقط و هو الخ

قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف اس بحث پر لگ گئے ہیں کہ "ھو" کی ضمیر کس طرف پھرتی ہے۔

ہمیں اب اپنے پورے نصاب کا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا جس میں منقولات کے حصے کو برقرار رکھتے ہوئے علوم آلیہ اور معقولات کے حصے میں نہایت اہم تبدیلیاں کرنا ہوں گی صرف و نحو میں مختصر اور جامع کتب قواعد منتخب کر کے جدید طریقوں کے مطابق مشقوں پر زیادہ زور دینا مناسب ہوگا۔ ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، اقتصادیات، شہریت جیسے علوم کی ابتدائی کتابیں داخل نصاب ہونا ضروری ہیں۔ اس سے بقول مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ میں نہیں سمجھتا کہ کس اجر میں فرق پڑے گا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"ہم تو جیسا بخاری کے مطالعے میں اجر سمجھتے ہیں، میرزاہد امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں۔"

(ملفوظات اشرف علیؒ اشاعت ماہ ربیع ۱۳۶۱ھ)

افکار نو اور جدید تحقیقات سے روشناس ہونے کے لئے ہمیں مجبوراً کسی غیر ملکی زبان کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ ایسی زبان جس میں علوم کا سب سے زیادہ ذخیرہ موجود ہو اور پھر جس کے ذریعہ ہم اسلامی افکار و تعلیمات سے دنیا والوں کو روشناس کرا سکیں۔ جس کے ذریعے بیسویں صدی کے انسان پر اسلام کی حقانیت پیش کر سکیں جو آج فطرت کی تسخیر کے باوجود اپنی ذات کی تسخیر نہیں کر سکا ہے جو اس مادی دور کے کھوکھلے نظریوں سے اکتا کر روحانی سکون کا متلاشی ہے۔ شاید اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے مولانا شبلی مرحوم نے کہا تھا۔

تعلیم میں جب تک یورپ کی کسی زبان کی تعلیم
لازمی نہ قرار دی جائے اور زمانۂ موجودہ کے علوم و فنون
نہ پڑھائے جائیں اس وقت تک مذاق حال کے موافق
کیونکر ارباب قلم پیدا ہو سکتے ہیں۔"

(مقالات شبلی جلد ہشتم ص۶۸ مطبع اعظم گڑھ)

یہ معروضات نہ تو کسی طویل بحث کا آغاز ہیں اور نہ غلط فہمی کی کسی

تحریک کا کوئی باب - چند ذاتی تجربات و شواہد کی روشنی میں پیدا ہونے والے وہ حقائق ہیں جنہیں ہمارے علماء ضرور محسوس کریں گے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اور آئندہ کو بدلے گا۔ اب ہمارے اکابر علماء کا فرض ہے کہ وہ وقت کی پکار سنیں اور پھر مدارس کے نظام کا بنظرِ غائر جائزہ لیں۔
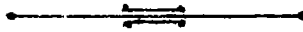
"اور اگر مسلمان علماء کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے تو یورپ ابھی تک جہالت اور نکبت میں پڑا سڑا کرتا۔ کئی طویل صدیوں تک دنیا کی روحانی روشنی اسلامی ممالک ہی سے پھوٹتی رہی۔ اس کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی چنانچہ جہاں یورپ مادی اور معنوی دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا، وہاں مشرق قدیم مذہبی کتابوں کی خشک تاویلات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی کے حوالہ کر دیا کہ وہ گویا اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا۔ یورپ میں صدیوں تک چھاپہ خانوں میں شائقین کے لئے کتابیں چھپا کیں، اور اس کے بعد کہیں جاکر سلطنت ترکی کے شیخ الاسلام نے ۱۷۲۹ء میں باقاعدہ فتوے کے ذریعہ کتابوں کے چھاپے خانے کو عمل شیطان کے الزام سے مبرا ہونا قرار دیا۔ یورپ میں انجیل مقدس وہ کتاب تھی جسے سب سے پہلے چھاپا گیا۔ اور انجیل کے وہاں جو ترجمے ہوئے، وہ مختلف زبانوں کی نشوونما اور ان کے ادب کی ترقی کا باعث بنے اس کے برعکس دین اسلام قرآن مجید کے دوسری زبانوں میں ترجمے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان عوام سے الگ تھلگ رہا یہاں تک کہ آخر میں مصطفےٰ کمال کی اصلاحات نے اس مقدس کتاب کو ان بزرگوں کے لئے جو عربی نہیں جانتے تھے، قابل فہم بنایا۔

اردو ترجمہ از پروفیسر ڈاکٹر الحاج عبدالکریم جرمانوس (ہنگری)

جدید دور میں جدید رہنمائی کی ضرورت[1]

از مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(یہ مقالہ ۲۱۔ نومبر کو تھیالوجیکل سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے یونین ہال میں پڑھا گیا تھا)

حضرات! "جدید دور میں جدید رہنمائی کی ضرورت" مقالہ کا عنوان ہے۔ یہ آواز پُرکشش ہونے کے باوجود قابل توجہ نہیں معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ بے حسی کے عالم میں کون سرپھرا قدیم وجدید کی بحثوں میں الجھے گا اور عافیت کی زندگی پر خار دار جھاڑیوں کو ترجیح دے گا۔

لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ زندگی کی شعاعیں ہمیشہ بے حسی کے پردوں سے پھوٹی ہیں اور زندگی ہر دور میں چند سر پھروں ہی کی منتظر رہی ہے۔ راہ کی مشکلات اس لئے کبھی نہیں پیش آئی ہیں کہ اٹھا ہوا قدم رکے بلکہ اس لئے آئی ہیں کہ اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ قدم اٹھایا جائے۔

معاشرہ کی قدر وقیمت خیر وشر کے تناسب سے ہوتی ہے۔

معزز حاضرین! دنیا انسانوں کی دنیا ہے، جن کے احساسات کی زود اثری، جذبات کی ہیجان انگیزی اور خواہشات کی ناعاقبت اندیشی ملاء اعلیٰ میں ضرب المثل ہے۔ جب ان کے ہاتھوں میں کوئی معاشرہ آئے گا تو لازمی طور سے اس میں خیر کے ساتھ شر اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں اور خرابیوں کا ظہور ہوگا۔ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو کہ خیر کی توانائیاں برقرار رکھنے کے لئے شر کا وجود ضروری ہے اور خوبیوں میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے خامیوں کا ظہور ناگزیر ہے۔

---

[1] ماہنامہ "برہان" دہلی کے فروری ۱۹۶۸ء کے شمارے سے شکریے کیساتھ یہ مضمون نقل کیا جاتا ہے (مدیر)

در کار خانۂ عشق از کفر ناگزیر است
آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

اس بنا پر ہر معاشرہ ان دونوں کی قوت سے تشکیل پاکر وجود میں آتا ہے اور پھر انہیں میں تناسب برقرار رکھ کر اپنی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔

معاشرہ میں تنوع و ارتقا، لازمی ہے۔

معاشرہ کے حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے ہیں بلکہ اس میں ہر عروج کے ساتھ تنوع اور ہر بقاء کے ساتھ ارتقا لازمی ہوتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے تو ایسا نہیں ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ معاشرۂ انسانی زوال پذیر ہو جائے۔ بلکہ اس کی جگہ جو قوم عروج کے مراحل طے کرتی ہے، وہ اپنی بقاء کے لئے مختلف قسم کی ترقیاتی اسکیموں، معاشی تجویزوں اور فلاح و بہبود کی نئی تنظیموں کو بروئے کار لانے پر مجبور ہوتی ہے، جن کے ذریعہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ وجود میں آتا ہے اور زندگی کو خوشگوار و نمو بخش فضا ملتی ہے۔ اسی طرح معاشرتی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور زندگی بہتر سے بہتر فضا کی تلاش میں مصروف رہتی ہے۔ یہ تنوع و ارتقاء قانون فطرت کے عین مطابق ہیں۔ ان کی بدولت کائنات ہست و بود کی نیرنگیاں قائم ہیں اور بڑی حد تک قوموں کی بقاء کا راز بھی ان میں پوشیدہ ہے اگر کوئی قوم ان کی طرف توجہ نہیں کرتی ہے تو قانون فطرت سے بغاوت کی مجرم ہوتی ہے اور اگر اپنی "آن" کو ختم کر کے انہیں میں جذب ہو جاتی ہے تو قومی خودکشی کی مجرم قرار پاتی ہے۔

مسلم قوم سخت قسم کی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہے۔

مبصرین کی رائے ہے کہ مسلم قوم میں "نشاۃ ثانیہ" کے آثار نمایاں ہیں لیکن زندگی کے مراحل طے کرنے میں وہ سخت قسم کی ذہنی کش مکش سے دوچار ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ جو قوم ایک دور سے گذر کر دوسرے دور میں قدم رکھتی ہے تو وہ اسی طرح کی کش مکش میں مبتلا ہوتی ہے۔ ایک طرف اس کی قدیم زندگی اور فلاح و بہبود کی یادگاریں ہوتی ہیں، جن پر زندگی کی عمارت پہلے تعمیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس بناء پر فطرتاً ان سے تعلق اور لگاؤ رہتا ہے۔ دوسری طرف نئی زندگی اور نئے حوصلہ کی وسعت ہوتی ہے، جس میں فراخی کے ساتھ حصول مصالح اور دفع مضرت کا سامان ہوتا ہے اور قوت کیساتھ فلاح و بہبود کے امور انجام پانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں قوم اگر قدیم زندگی پر قانع رہتی ہے

اور زمانہ و معاشرہ کی نئی وسعت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی ہے تو اس کی توانائیوں کا کوئی مصرف نہیں رہتا ہے اور بالآخر گھٹ گھٹ کر دم توڑنے کی نوبت آجاتی ہے۔

اور اگر اپنے تصورات و اصول زندگی کو نظر انداز کرکے نئی وسعت کو اس کے انداز میں قبول کرتی ہے تو قومی وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

یہ کش مکش اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی ہے۔

یہ کش مکش اس وقت اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے، جب کسی قوم کے قائدین دو انتہا پسند گروہوں میں تقسیم ہوں اور عمل و ردِ عمل کی نذر ہو کر افراط و تفریط کی دو راہوں پر کھڑے ہوں۔ ان میں سے ایک گروہ کسی قسم کی وسعت و تبدیلی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو حتیٰ کہ قوم کی توانائیوں کا گلا گھٹ جانے کی فکر سے بھی بے نیاز ہو اور دوسرا ہر وسعت و تبدیلی کو بعینہ قبول کرنے پر تلا ہو اور قومی وجود کے ختم ہو جانے کی اس کو کوئی پروانہ ہو۔

بد قسمتی سے مسلم قوم اپنی نشاۃ ثانیہ کے مراحل میں اسی انتہائی کش مکش سے دوچار ہے اور اس کے قائدین اپنے اپنے انداز میں دو انتہا کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل میں مسلم قوم کا کیا بنے گا؟ اور نشاۃ ثانیہ کے مراحل کس مقام پر اس کو کھڑے کریں گے؟ البتہ زمانہ کی رفتار اور مسلم ممالک کے حالات سے یہ بات یقیناً کہی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں مروّجہ سرمایہ دارانہ مذہب کو سخت دھکا پہونچے گا اور اسکی موجودہ صورت نہ برقرار رہ سکے گی۔ حقیقی مذہب جدید معاشرہ میں کب اور کس شکل میں نمودار ہوگا؟ اس پر تفصیلی گفتگو کا غالباً ابھی وقت نہیں آیا ہے۔

ہندوستان کے حالات دوسری جگہ سے مختلف ہیں

ہندوستان کے حالات دوسری جگہ سے مختلف ہیں۔ یہاں نہ تعمیری ذہن کی قیادت ہے اور نہ قائدین دو گروہوں میں تقسیم ہیں بلکہ چار و ناچار قیادت ایک ہی گروہ کے حصہ میں ہے اور بحیثیت مجموعی ایک ہی "انتہاء" کی نمایندگی ہو رہی ہے، جس کا جدید حالات و معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ہنگامی حادثات و فسادات نے مسلم قوم کی دشواریوں اور پریشانیوں کی نئی نئی راہیں کھول دی ہیں جن کی وجہ سے بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کے حل ہوئے بغیر مذہب و ناموس تک کا سودا آسان ہو گیا ہے۔

اس کے باوجود غریب مسلمان اپنی ضرورت کے ناگزیر مسائل میں رہنمائی سے محروم ہیں جس کی وجہ سے حصول مصالح اور دفع مضرت کی راہیں بڑی حد تک مسدود ہیں۔ اور بہت سی ترقیاتی اسکیموں اور تنظیموں سے محض اس بنا پر فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ نہیں ملتا ہے۔ ہر ہوش مند کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ تعمیری پلان بنانے اور معاشرتی فلاح و بہبود کی اسکیم خود تیار کرنے کی تو کیا توفیق ہوتی، حصول مصالح اور دفع مضرت کے لئے جو اسکیمیں اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں ان میں اعتدال کے ساتھ شرکت کی راہیں بھی نہیں نکالی جاتی ہیں۔ اور اگر احساس دلانے پر کچھ توجہ ہوتی بھی ہے تو "اقدام" کے بجائے ایک ایسی پناہ گاہ (دار الحرب) کی تلاش ہوتی ہے کہ جس میں بزعم خود وہ تو محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن قدیم و جدید تمام عقود فاسد کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور اس کو بھی واضح فیصلہ کی شکل میں لانے کی جرأت نہیں ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں کب تک مسلمان مصائب برداشت کرتے رہیں گے؟ اور موجودہ قیادت کیوں کر راہ کی نشان دہی کر سکے گی۔؟

قومی زندگی میں قائدین کی اہمیت۔

حاضرین کرام! اوپر قائدین کی بحث کو زیادہ اہمیت اس بنا پر دی گئی ہے کہ قومی زندگی میں ان کی حیثیت بمنزلہ روح اور جان کے ہے۔ یہی حضرات زندگی میں ایمان و اعتقاد کی قوت بھرتے ہیں اور ذہنی و اخلاقی استعداد کی تربیت کرکے فکر و عمل کی نئی دنیا بساتے ہیں۔ اگر ان میں انتہا پسندی یا غفلت و بے حسی کی روح سرایت کر گئی تو پھر قوم کا جو حشر بھی ہو جائے وہ کم ہے۔

مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ

ادھر مسلم قوم کا حال یہ ہے کہ نشاۃِ ثانیہ کی تاسیس میں اس نے مذہب سے رہنمائی نہیں حاصل کی ہے بلکہ اپنے قدیم دشمن "یورپ" کو رہنما بنایا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قومی و ملی لحاظ سے اس کی حیثیت ایک گم کردہ راہ قافلہ کی ہو رہی ہے کہ جس کا نہ کوئی نصب العین باقی رہتا ہے اور نہ بلند مقصد۔ بس راستہ کی تلاش میں احساس ناکامی کے ساتھ شب و روز کی مشغولیت رہ جاتی ہے

وہ اجزاء جن سے نشاۃ ثانیہ کی خمیر تیار ہوئی ہے۔

چنانچہ اس کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو خمیر تیار کیا گیا ہے اس کے اجزاء یہ ہیں۔

(۱) فکر و ضمیر کی حریت (۲) مادی ذہنیت اور (۳) ذوقِ حسن و جمال۔

زندگی کے لئے ان تینوں کی ضرورت مسلّم ہے لیکن اگر ان کے حدود و قیود متعین ہوئے اور آزادی وبے باکی کے ساتھ برگ وبار لانے کا موقع ملتا رہا تو ان کی وحشت ناکی وہوسناکی کے وہ مناظر آئیں گے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جائے گی۔ مذہب وروحانیت سے توقع تھی کہ وہ حدود و قیود متعین کریں گے اور وقت ضرورت رہنمائی کرتے رہیں گے لیکن اس خمیر میں دونوں کی "چاشنی" اس قدر ہلکی ہے کہ ان سے کسی اہم کردار کی توقع بے سود ہے۔

وہ اجزاء جن سے تعمیر ہو رہی ہے اور وہ چیزیں جو بطور رنگ و روغن مستعمل ہیں

جن اجزاء سے نشاۃ ثانیہ کی تعمیر ہو رہی ہے اور جو چیزیں بطور رنگ و روغن مستعمل ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ ذہنی وفکری حد نظر میں وسعت اور عالم فطرت کے مطالعہ کا حوصلہ

۲۔ مختلف علوم وفنون کے حاصل کرنے کا جذبہ

۳۔ سرمایہ داری وجاگیرداری کے زوال سے ایک نئی قسم کی شہری زندگی اور نظام معاشرت کی نئے انداز میں تشکیل۔

۴۔ صنعت وحرفت اور تجارت کی وسیع پیمانہ پر اور نئے انداز میں تنظیم وتشکیل جن کا پہلے تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔

۵۔ جلب منفعت اور دفع مضرت کے لئے بہت سی ترقیاتی اسکیمیں اور تنظیمیں جن کا پہلے وجود نہ تھا

۶۔ علم ومعلومات کی اشاعت کے وسیع ذرائع اور تحصیل علم کی سہولتیں۔ جو افکار وخیالات یا علوم وفنون پہلے امیروں اور خاندانی لوگوں کی جاگیر تھے اب عام طور پر ان کی اشاعت ہونے لگی ہے

۷۔ ذرائع آمدنی کی فراوانی اور ضروریات زندگی میں اضافہ نیز ملازمت کی مستقل حیثیت واہمیت، اور تندلانہ وتحائف کو ذریعۂ معاش بنانے کی مذمت۔

۸۔ بحری اور ہوائی اسفار کا سلسلہ اور اس سے متوقع فوائد۔

۹۔ فنون لطیفہ کے مطمح نظر میں انقلاب اور ان کی عریاں نمائش

۱۰۔ مختلف انداز میں حسن ولطافت کی تصویریں حتیٰ کہ شکیل مردوں اور حسین عورتوں کی ایسی تصویریں کہ وہ اس دنیا کے عیش وعشرت میں مشغول ہیں۔

۱۱۔ ربط و ضبط کی نئی نئی شکلیں جن میں ٹی پارٹیاں، جلسے جلوس اور رقص و سرود کی محفلیں نیز ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کے استقبال کی عجیب و غریب شکلیں اور گفتگو و ملاقات میں مکر و فریب کے ٹیکنیکل انداز۔

۱۲۔ ذہنی انتشار کی وا خلاقی بے راہ روی کے ساتھ اعصاب پر عورتوں کا تسلّط۔

۱۳۔ امراء سے نفرت اور علماء سے بغاوت۔

۱۴۔ شر پھیلانے کی منظم طاقتیں اور خیر کے مبلغوں میں ذہنی و فکری اور عملی انتشار۔

۱۵۔ مذہب سے کسی خاص دنیوی فائدہ کا متعلق نہ ہونا۔

اس مجموعہ سے ایک نیا معاشرہ وجود میں آرہا ہے۔

غرض اس قسم کے مجموعہ سے مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ ہو رہی ہے اور ایک نیا معاشرہ وجود میں آرہا ہے۔ اس مجموعہ کے صرف آخری چیزوں پر نظر نہ ہونی چاہیئے بلکہ صحیح حقیقت تک رسائی کے لئے سب پر نظر رکھنا ضروری ہے۔

حالات میں اتار چڑھاؤ ہمیشہ ہوتا رہا ہے اور ان کی وجہ سے معاشرتی زندگی میں معمولی تبدیلیاں ضرور ہوتی رہیں لیکن اس قسم کی ہمہ گیر تبدیلیوں کا پہلے وجود نہیں ملتا ہے۔ مفکرین کو غالباً ابھی اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامل ہو کہ مسلمان جب تک برسر اقتدار رہے، زندگی اور معاشرہ کا ایک ہی دور چلتا رہا۔ حالات کے نشیب و فراز کی وجہ سے معمولی قسم کی تبدیلیاں ضرور ہوتی رہیں لیکن ان کو "دَور" کی تبدیلی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے۔ اشتراکیت کے فلسفہ نے اس دور کو نہیں بدلا ہے بلکہ حالات کے نشیب و فراز سے جو تبدیلیاں ناگزیر ہوتی ہیں وہی اس کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں۔

اب مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ ہے اور نئے دور کا معاشرہ ہے جس میں اشتراکیت ترقی کی شکل میں نمودار ہے۔ اور جس کو مذہبی رہنمائی عطا کرنا ہے۔

موجودہ رہنمائیاں قابل قدر ہونیکے باوجود کافی نہیں ہیں۔

موجودہ رہنمائیاں اپنے اپنے انداز میں قابل قدر ہونے کے باوجود کافی ہیں اور نہ ذمہ داری سے

سبکدوش کررہی ہیں۔ ان کے سامنے رہنمائی کے لئے ایک ایسے مریض کا نقشہ ہے جب کہ وہ قوی و توانا تھا۔ اس کے لئے معتدل انداز میں غذا تجویز کرنے کی ضرورت تھی اور نہ غذا کے انتخاب میں موسم اور قویٰ وغیرہ کا لحاظ ضروری تھا۔ بس جو ذخیرہ اس کے پاس موجود و محفوظ تھا وہ وقت اور موسم کے لحاظ سے کافی تھا اور حسب ضرورت استعمال کرنے میں آزادی تھی۔ لیکن اس وقت مسلم قوم جس انداز کی مریض ہے اس کے لحاظ سے اگر غذا دینے میں مزید غفلت وکوتاہی ہوئی تو نقاہت کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جائے گا اور پھر دوا پینے سے بھی انکار کردے گی۔

اور اگر ضد میں آکر ہدایت کے خلاف خود ہی غذا استعمال کرنے لگی تو اس کی زندگی کا جو حشر ہوگا وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہے لیکن طبیبوں اور تیمارداروں کو بھی اپنے حشر سے بے فکر نہ رہنا چاہیئے۔ جب شاخ ہی پر دوسروں کا قبضہ ہو جائے گا تو اس پر آشیانہ کیونکر برقرار رہے گا۔؟

یہ رہنمائیاں حددرجہ محدود اور تنگ ہیں

یہ رہنمائیاں اس قدر محدود اور تنگ ہیں کہ زندگی کے جدید حالات و معاملات کے لئے ان میں کوئی گنجائش ہے اور نہ وسیع و متنوع ضرورتوں کی طرف کوئی رہنمائی ہے۔ پھر ان کا اثر و نفوذ انہیں ممالک میں زیادہ ہے جن میں قدیم سرمایہ داری و جاگیرداری نظام قائم ہے یا معاشی ناہمواری کا مسئلہ شباب پر ہے۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ذریعہ کسی درجہ میں اس نظام کی تائید اور ایک خاص ذہنیت کی نمود ہوتی ہے یا نہیں لیکن چونکہ پچھلی تاریخ میں سرمایہ داروں اور اکثر نمایندوں کے اشتراک و تعاون سے لوگوں کے کافی حقوق ضائع ہوتے رہے ہیں اس بنا پر نشاۃ ثانیہ کے ناموس نگاران رہنمائیوں سے زیادہ مطمئن نہیں ہیں۔

یورپ کی تحریکوں سے عبرت و بصیرت حاصل کرنا چاہیئے۔

ان کے سامنے یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے وقت کی کئی اہم تحریکیں موجود ہیں جن کے کارنامے کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں حتیٰ کہ "لوتھر" کی مذہبی تحریک بھی موجود ہے کہ جس کی کارگذاری تاریخ یورپ کا روشن باب ہے۔ لیکن جب نشاۃ ثانیہ کا نہایت تیز دھارا آیا تو یہ تحریکیں اس میں مذہبی روح پھونکنے اور اس کے اجزائے ترکیبی کو سمجھ کر رہنمائی کرنے میں کس قدر ناکام رہی

تھیں؟ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے نہ اجتماعی و تمدنی مسائل مرتب کر سکی تھیں اور نہ عوامی فلاح وبہبود کے لئے کسی پروگرام کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

اسلام اور عیسائیت میں کافی فرق کے باوجود پروٹسٹنٹ تحریک کی درج ذیل خامی سے کافی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ مذہب پروٹسٹنٹ (لوتھر کی مذہبی تحریک) اول اول ایک بڑے اخلاقی انقلاب کا خارج میں رونما ہونا تھا' یعنی بعض لوگوں کی دینی اور اخلاقی فطرت نے بدعت آلود مذہب اور ناشائستہ و ناقابل اصلاح رواج کے خلاف سر اٹھایا۔ چونکہ اس کی بنیاد انکار و تردید پر تھی اس بنا پر جب تک اس کا کام کلیتۃً برباد کن تھا' بڑا زور و شور رہا۔ اخلاقی سقم دور کرنا اور ایک ایسے مذہب کے خلاف جس کے اصول کی غلط تعریف کی گئی تھی' یورش کرنا' ان لوگوں کے لئے نہایت آسان تھا۔ جن کے دلوں میں حق کے واسطے مذہبی جنگ کا جوش و ولولہ تھا لیکن جب اس کی باری آئی کہ وہ خود اپنا آئین وضع کرے اور اپنے اصول قرار دینے اور حقیقت کی تشریح کرنے کی کوشش کرے تب اس کی کمزوری نمایاں ہو گئی[1]

اس تحریک نے عوام کے مقابلہ میں امراء کو زیادہ اہمیت دی تھی چنانچہ 'لوتھر' نے عوام کی بہ نسبت رؤسا اور شہزادگان سے زیادہ قریبی تعلقات قائم کئے تھے اور ابتدائی معرکوں میں اس نے انہیں سے حفاظت و مدد کی التجا کی تھی اور آخری ایام میں انھیں پر پورا اعتماد کیا تھا[2] عوامی فلاح وبہبود اور عوامی ضرورت کی طرف اس نے کوئی خاص توجہ نہ کی تھی جیسا کہ "لوتھر" نے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج کے زمانہ میں) کسانوں کی مخالفت سخت تحریروں اور تقریروں سے کی۔ اس نے امراء سے مطالبہ کیا کہ اس شورش کو سختی سے فرو کیا جائے[3]

غرض اس تاریخی تجربہ کے بعد کیسے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ تحریکیں نشاۃ ثانیہ کے وسیع اور متنوع اجزاء کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں اور مزید کسی ٹھوس جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے جب

---

[1] عروج فرانس مصنفہ ایچ۔ او۔ ویکین ایم۔ اے۔
[2] حوالہ بالا ص۱۱ و ۱۲
[3] تاریخ یورپ مصنفہ اے جے گرانٹ ص۵۰۲

معاشرہ کی تمام تر بنیادیں اقتصادی اور معاشی بن گئی ہوں تو کوئی تحریک ان بنیادوں کو چھیڑے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہے؟ اور چھیڑنے کے بعد رجعت پسندی کی راہ اختیار کرنے میں کس قدر عظیم خسارہ ہے۔

موجودہ حالات میں رہنمائی کا طریقہ

معزز حضرات! موجودہ پُرپیچ حالات میں کام کی جو شکل سمجھ میں آتی ہے، یہ ہے کہ ایمان ویقین والی زندگی کی اہمیت تسلیم کی جائے اور اقامت دین کے جذبہ کی قدر کی جائے لیکن سیاسی اسٹنٹ اس کو نہ بنایا جائے، ورنہ قبل از وقت سیاسی اقتدار کی خواہش اس جذبہ کو کچل کر رکھ دے گی اور سیاسی اقتدار ہی مقصود بالذات بن جائیگا۔ پھر جنگ محض اقتدار کے لئے ہوگی اور مذہب آلۂ کار کے طور پر استعمال ہوتا رہے گا۔ پھر نشاۃ ثانیہ کی رہنمائی کے لئے نظام حیات کی جن تفصیلات کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہو (اور وہ بہت ہیں) مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ اہل فن کے مشورہ سے قرآن وسنت کی روشنی میں انھیں مرتب کیا جائے۔ معاشی بدحالی کو دور کرنے، ترقیاتی سکیموں سے منتفع ہونے اور تعلیم کو عام کرنے کے لئے عوامی فلاح وبہبود کے مختلف شعبے قائم کئے جائیں اور امداد باہمی کے مستقل ادارے چلائے جائیں۔

بڑی بات یہ ہے کہ مذہب کی قولی وعملی ترجمانی اس انداز سے کی جائے کہ یہ سب امور اس کے اجزائے ترکیبی قرار پائیں، اور لوگوں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ صرف عید میلاد کے جلسے جلوسوں، مدارس کے لئے چندہ، نفلی حج وقربانی، لٹریچر کی نشر واشاعت اور مذہبی نمائندوں کی خاطر تواضع اور ان کے لئے نذرانہ وتحائف وغیرہ سے مذہبی سند مل جاتی ہے بلکہ اس پر زور دیا جائے کہ جب تک خود کو فنا کر کے دوسروں کی بقا کا سامان نہ ہو اور دوسروں کی دنیوی واخروی فلاح وبہبود کی خاطر ذاتی وخاندانی مفاد کو قربان کرنے اور نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ نہ ہو اس وقت تک نہ انسان صحیح معنوں میں مذہبی بنتا ہے اور نہ مذہب کی کوئی قابل قدر خدمت انجام پاتی ہے بات صرف صدقہ وخیرات پر نہ ختم ہونی چاہیئے۔ انفرادی واجتماعی ملکیت کا گورکھ دھندا بھی نہ حائل ہونا چاہیئے۔ بس اللہ کے بندوں کو رزق حلال میسر ہو اور موجودہ دور کی زندگی کے لئے جلب منفعت ودفع مضرت کا سروسامان ہو۔ اس مقصد کے لئے جو کچھ انتظام ہو وہ

حق اور فرض کی شکل میں ہو۔ احسان و تبرع کی بات اس وقت بھلی معلوم ہوتی ہے جب کہ معاشرہ قوی و توانا ہو اور اپنی غذا کے بارے میں خود کفیل ہو۔ غرض جب تک مذہب کے نام پر ہمہ جہتی پروگرام نہ ہوگا اور ایثار و قربانی کے عملی نمونے نہ سامنے آئیں گے، اس وقت تک مذہب و زندگی کا ربط قائم ہوگا اور نہ طوفان کی شدت کا مقابلہ ہو سکے گا۔

حالیہ انقلابات سے عبرت و بصیرت

مسلم ممالک کے حالیہ انقلاب اور ان میں اسلامی تحریکات کی ناکامی، عبرت و بصیرت کے لئے کافی ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں مذہب کے ساتھ جو کھیل کھیلا جا رہا ہے وہ کسی طرح نظر انداز ہونے کے قابل نہیں ہے[1]

دین و مذہب کے نام پر جس بوکھلاہٹ کا مظاہرہ اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں اگر مذکورہ انداز سے ہمہ گیر پیمانہ پر کام نہ کیا گیا تو وقتاً فوقتاً ایسے بہت سے مظاہرے سامنے آتے رہیں گے اور بہت سے مقامات پر خود مدعیوں کو اپنے دعویٰ کے خلاف بیان دینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ پھر بھی بگڑنے کے بعد بات بنائے نہ بن سکے گی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ غربا تڑپ رہے ہیں۔ بیوائیں سسک رہی ہیں اور یتیم بچے بلک رہے ہیں۔ اور جب سیاست کا کوئی "موڑ" آتا ہے تو حالات و مصالح کے جتنے تیر ترکش میں موجود ہوتے ہیں وہ سب باہر آ جاتے ہیں۔ زمانہ کی ستم ظریفی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جن زبانوں نے کل تک عورت کے عائلی حقوق تسلیم کرنے میں بخل سے کام لیا تھا، آج وہی اس کو سربراہِ مملکت بنانے میں پیش پیش ہیں۔

کہاں لٹا ہے یہ جا کے کاروانِ مہر و وفا
کہ دوستی سے بہت دور دشمنی نہ رہی

سچ کہا ہے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے مارایت من ناقصات عقل و دین اذھب للب الرجل الحازم من احد اکن (الحدیث) کسی پختہ کار اور ہوشیار مرد کی عقل کو سلب کرنے والا میں نے ناقصات عقل اور دین میں سے عورتوں سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔ صورت حال بڑی نازک ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس اقدام پر خوشی منائی جائے

---

[1] غالباً یہ اشارہ بعض مذہبی سیاسی جماعتوں کی طرف ہے (مدیر)

یا ماتم کیا جائے۔ خوشی اس لئے کہ دینی مصالح وہنگامی حالات کا لحاظ کرکے زندگی کے بہت سے نئے اور ضروری مسائل میں اعتدال کی راہ نکالنے کے لئے عرصہ سے جدوجہد جاری تھی اب اس کے لئے ر مثال سامنے آگئی ہے۔ یہ مثال بھونڈی اور بے محل ہونے کی وجہ سے اگرچہ مفید مطلب نہیں ہے لیکن اس میں غیرت وعبرت دونوں کا پورا سامان موجود ہے اور ماتم اس لئے کہ طاغوتی سیاست نے محراب ومنبر کو استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ اب دیکھئے بات کہاں سے کہاں پہنچ کر رہے۔ بس اللہ ہی سے دعا ہے کہ بات زیادہ آگے نہ بڑھے اور ایسی باتوں کی آڑ میں مذہب سے بے اعتمادی نہ پیدا ہو۔ (آمین)

جدید رہنمائی کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

حاضرین کرام! موجودہ رہنمائیاں اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں اور بڑی حد تک کامیاب ہیں جدید دور کے کام غالباً ان کے میدان کے نہیں ہیں، ورنہ وہ یقیناً رہنمائی فرمائیں۔ ایسی حالت میں زندہ رہنے کے لئے جدید رہنمائی کے بغیر چارہ نہیں ہے اور یہ اس وقت بارآور ہوسکتی ہے جبکہ مذہبی حضرات انداز فکر بدلیں اور تنی جلوہ گاہوں کے مدہوش ہوش وحواس درست کریں۔ آخر حقائق سے جنگ کب تک جاری رہے گی، اور خود فریبی کی دنیا کہاں تک ساتھ دے سکے گی؟

میرے الفاظ یقیناً سخت ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ درد آشنا کی نظر درد پر ہونی چاہیئے نہ کہ اس کے اظہار کے طریقوں پر۔

میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کو برملا کہہ دوں اور جس کا آنا یقینی ہے وقت سے پہلے اس کی اطلاع دے دوں تاکہ اگر کچھ رمق حیات باقی ہے تو زندگی کا سروسامان کرلیا جائے

چھتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

انداز فکر بدلنے کے لئے چند حدود ونقوش

ذیل میں "معذرۃً الی ربکم" انداز فکر بدلنے کے لئے چند حدود ونقوش متعین کئے جاتے ہیں، جن سے نشاۃ ثانیہ میں مذہبی کاز کو تقویت پہنچانے میں مدد مل سکتی ہے۔

(۱) ہدایت الٰہی کسی معاشرہ کو وجود میں نہیں لاتی ہے بلکہ انسان کے ہاتھوں معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں خیر وشر دونوں کی نمود اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ظہور ہوتا ہے۔

(۲) موجودہ معاشرہ کو ہدایت اپنے انداز میں ڈھالتی ہے اور خیر و شر کی حد بندی کرکے اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ اس طرح پہلے معاشرہ وجود میں آتا ہے اور پھر ہدایت کے انداز میں ڈھالنے کے لئے احکام و قوانین مقرر ہوتے ہیں۔

۳۔ ہدایت اپنے نزول کے زمانے میں اس وقت کے معاشرہ کو محض خیر و شر کی نسبت سے بطور نمونہ پیش کرتی ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے دست بردار ہوکر زندگی کی گاڑی کو اسی معاشرہ پر چلاتا رہے اور ترقی یافتہ عمارت کے مقابلہ میں ہمیشہ اسی عمارت کی طرف دعوت دیتا رہے۔ مقصود عمارت نہیں ہوتی ہے بلکہ خیر و شر کی وہ نسبت اور عدل و اعتدال کی قوت ہوتی ہے جو ہدایت الٰہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے اور بطور نمونہ اسی کو وہ پیش کرتی ہے۔

۴۔ معاشرہ فطری رفتار کے مطابق ترقی کرتا اور بدلتا رہے گا اس کو نہ کسی طبقہ کا جمود روک سکتا ہے اور نہ کسی قوم کا زوال بریک لگا سکتا ہے۔ اب اگر کسی کو جمود توڑنا اور زوال کو ختم کرنا ہے تو ذہنی و فکری تبدیلی کے ساتھ اس کے لئے اپنے زمانہ کی تنظیمی ترقیاتی چیزوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے البتہ قبولیت سے پہلے انسانوں کی دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود کے لحاظ سے اس کی قدر و قیمت کا تعین ضروری ہے۔ خیر و شر میں امتیاز اور خوبیوں و خامیوں میں حد فاصل قائم کرنے کے لئے وہی "پیمانہ" معتبر ہوگا جو ہدایتِ الٰہی نے مقرر کیا ہے، اور وہی "معیار" درجہ سند حاصل کرسکے گا جس کو ہدایت نے اپنے نزول کے زمانہ میں بطور "نمونہ" پیش کیا ہے۔ ان میں اگر تفریق کی گئی تو صحت کی ضمانت نہ رہے گی اور تبدیلی کی کوشش ہوتی تو قومی و ملّی وجود ختم ہوجائیگا۔

اسی طرح جانچے اور پرکھے بغیر اگر تمام چیزوں کو قبول کیا گیا تو "شر" چونکہ اپنے اندر کشش کے ساتھ سہل الحصول بھی ہوتا ہے اس بنا پر زندگی کی ساخت و پرداخت میں وہی دخیل بن جائے گا اور نمائشی ترقی ہوتے ہوئے بھی حقیقی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

۵۔ جدید معاشرہ کی رہنمائی کے لئے بنیادی نقطۂ نگاہ یہ بنانا پڑے گا کہ اگر اس وقت ہدایت کے نزول کا زمانہ ہوتا اور محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس تشریف فرما ہوتے تو آپ جلب منفعت اور دفع مضرت کا کس قدر لحاظ فرماتے؟ اور معاشرتی فلاح و بہبود کی چیزوں میں

کس جذبہ کو ملحوظ رکھتے ؟

اس سلسلہ میں رسول اللہ نے اپنے زمانہ کے معاشرہ کو "ہدایت" کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے "ازالہ" کے بجائے "امالہ" کی جو روش اختیار فرمائی ہے اور ترمیم و تنسیخ نیز تدریج و تخفیف کے جن اصول و ضوابط سے کام لیا ہے وہ سب جدید معاشرہ کی رہنمائی کے لئے دلیل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وقت کی دو اہم ضرورتیں

جدید معاشرہ میں جس چیز کی اصل کمی ہے وہ روحانیت کا فقدان ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کی رہنمائی میں اس پر زیادہ زور صرف کرنیکی ضرورت ہے، لیکن اس کے حصول کے لئے عمومی طور پر اوراد و وظائف اور نوافل کا طول طویل سلسلہ آج کی مصروف اور متنوع زندگی کے لئے سخت دشوار ہے۔ بس مقررہ احکام کی بجاآوری کے ساتھ آہِ سحرگاہی کا التزام کافی ہے کہ فیض کی تجلیوں کے لئے گہری اندھیری کے بغیر چارہ نہیں ہے اور اس گلی کا سودا لات کی تاریکی میں زیادہ آسانی سے ملتا ہے۔ مسلم قوم کی شہ رگ پر جس چیز کا براہِ راست حملہ ہے وہ اقتصادی بدحالی اور معاشی ناہمواری کا ہے نشاۃِ ثانیہ کی رہنمائی میں موجودہ دور کے معاشی مساوات کو سامنے رکھ کر اسلامی عدل و اعتدال کے احکام وضع کرنے ہوں گے۔ قدیم سرمایہ داری و جاگیرداری کو بنیاد بنا کر عدل و اعتدال کی آواز سے وقت کی ضرورت نہ پوری ہو سکے گی۔

حقیقی مذہب ہی کام دے سکتا ہے۔

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ نفس کی تسکین کے لئے بے جان عقیدہ اور چند مراسم و اعمال کی نمائش سے جدید معاشرہ کی رہنمائی نہ ہو سکے گی۔ اسی طرح جو مذہب صنعت و حرفت میں تبدیل ہو کر محض دنیوی زندگی کی چاکری میں مصروف ہے وہ بھی اس سلسلہ میں بے سود ہے۔ اس راہ میں وہی مذہب کام دے سکے گا جو النفس میں تبدیلی کے ساتھ کائنات کے سربستہ رازوں کی تحقیقات سے دلچسپی ظاہر کرتا ہو۔ اور موجودہ اجتماعی و تمدنی مسائل کو عدل رحمت کی فضا میں حل کرتا ہو۔ اگر ایک طرف جدید معاشرہ کے فکر و عمل کے لئے بلند نصب العین عطا کرتا ہو تو دوسری طرف نشاۃِ ثانیہ کے وسیع اور متنوع اجزاء کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو

اس کے لئے مذہبی لوگوں کو وسیع نقطۂ نظر اختیار کرنا ہوگا اور جلسے و جلوس کی تفریحات کی جگہ سرتاپا عمل بننا پڑے گا۔

آخری بات

حضرات! گفتگو بہت طویل ہوگئی لیکن کہنے کی باتیں ابھی نہیں ختم ہوئیں۔ آخر میں ہوش و حواس کی درستی کے لئے صرف اس قدر گذارش ہے کہ یہ ردّ عمل کا دور ہے جس میں گذشتہ تفریط کے مقابلہ میں افراط ہے۔ یہ ہمیشہ نہ برقرار رہے گا بلکہ اس میں تبدیلی ہوکر رہے گی۔ گھبرانے اور مرعوب ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے بلکہ اس میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے راہ عمل طے کرنے کی ضرورت ہے۔ جن نظریات نے ہماری اخلاقی و روحانی زندگی کے تار پود بکھیر دیئے ہیں، مختصر لفظوں میں ان کا تجزیہ اس طرح ہو سکتا ہے۔

۱۔ انسانی نورانی الاصل کی جگہ حیوانی النسل قرار پایا (نظریۂ ارتقار)

۲۔ فطرتِ انسانی کی لطافت کو جبلّت کی کثافت سے بدلا گیا۔ (نظریۂ جبلت)

۳۔ عفت و عصمت کے جذبہ کو جنسیت کی ہوسناکی میں تبدیل کیا گیا (نظریہ جنسیت)

۴۔ انسان کے روحانی آبگینہ کو اشتراکیت کی قساوت نے پاش پاش کیا (نظریۂ اشتراکیت)

آپ خود غور کیجئے کہ زندگی میں ان کے اثرات انسان کو کس مقام پر لا کھڑا کریں گے۔؟ اور انسانیت کا کارواں کب تک میدان کرب و بلا میں تڑپتا رہے گا۔

آج کارواں کو جس جام حیات کی تلاش اور جس شربت روح افزا کی جستجو ہے وہ آپ کے پاس موجود ہے، جرأت و ہمت کے ساتھ آپ خود پیجئے، اور اہل دنیا کو پلایئے۔

اگر مجھے معاف کیا جائے تو ایک بات اور عرض کردوں وہ یہ کہ واعظانہ مصلحت موجودہ دور کی رہنمائی کے لئے مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ رندانہ جرأت کی ضرورت ہے زاہدانہ ہمت سے کام نہ چلے گا

وَالسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

عالم مثال

عباداللہ فاروقی

عالم مثال کو سمجھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے ہاں "شخص اکبر" کا جو تصور ہے، اس کی وضاحت کردی جائے تاکہ اسکی نسبت سے عالم مثال کا مفہوم پوری طرح سے ذہن میں آسکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک "شخص اکبر" عالم جسمانی کا دوسرا نام ہے۔ یہ عالم جسمانی یا (شخص اکبر) اپنے اندر ایک شخصی وحدت لئے ہوئے ہے۔ دیگر اجساد جو اس میں پائے جاتے ہیں، ان کی حالت ایسی ہے جیسے سمندر اور اس کی لہریں۔ اس عالم جسمانی کے اندر ایک روح ہے۔ جو روح اعظم یا النفس الکلیہ کہلاتی ہے۔ یہ انسانی ارواح سے اس طرح وابستہ ہے کہ اسے ان سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اب شخص اکبر میں دو عالم پائے جاتے ہیں۔ (الف) عالم ارواح۔ (ب) عالم مثال۔

عالم ارواح مادہ اور محسوسات سے منزہ اور پاک تسلیم کیا گیا ہے۔ اسے "شخص اکبر" سے وہی نسبت ہے، جو صورت عقلی کو انسانی دماغ کے ساتھ ہے۔

شخص اکبر میں دوسرا عالم جو پایا جاتا ہے، وہ عالم مثال ہے۔ یہ عالم شاہ صاحب کے نزدیک شخص اکبر کی خیالی قوت کا دوسرا نام ہے۔ شخص اکبر کی عقلی قوت کو وہ عالم ارواح سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ قوت خیال کے توسط سے انسان ان صورتوں کو سمجھتا ہے جو مادی صفات سے متصف تو ہوتی ہیں لیکن وہ مادہ نہیں ہوتیں (مثلاً کسی شے کی شکل رنگ اور مقدار وغیرہ) اس کے برعکس عالم ارواح ہر لحاظ سے مادی صفات سے پاک اور منزہ ہوتا

ہے۔ غرض شخص اکبر کے دماغ میں عالم مثال اس طرح ہے، جیسے انسانی دماغ میں خیالی تصویر ہوتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ "مادی دنیا میں وجود پذیر ہونے والی ہر شے پہلے سے عالم مثال میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ وہی چیز ہے جو عالم مثال میں دیکھی گئی تھی۔ تو غلط نہ ہوگا۔ اس عالم کا وجود شرعاً ثابت ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے رشتہ کو پیدا کیا، تو اس نے پکار کر کہا کب مجھے رشتہ توڑنے والوں سے پناہ دی جائے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ روز محشر سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران دو بادلوں کی صورت میں متشکل ہونگی، یا پرندوں کے دو غول کی شکل میں۔ پھر وہ ان لوگوں کی نجات کی کوشش کرینگی، جو بار بار ان کی تلاوت کرتے رہے تھے۔ ایک اور حدیث میں یوں ارشاد ہوا ہے۔ قیامت کے دن دنیا کو ایک بڑھیا کی صورت میں دی جائیگی جس کی آنکھیں نیلگوں اور دانت باہر نکلے ہوئے ہونگے اور وہ از حد کریہہ المنظر ہوگی۔ علاوہ ازیں ایک حدیث میں آیا ہے۔ قبر میں فرشتے میت کو آہنی گرزوں سے مارتے ہیں۔ اور وہ اس زور سے چیختا ہے کہ یہ چیخیں سوائے جن و انس کے پوری دنیا کی سماعت میں آتی ہیں۔ کافر کے لئے اس کی قبر میں ننانوے سانپ مقرر کئے جاتے ہیں جو برابر قیامت تک اس کو ڈستے رہیں گے۔ ان کے علاوہ اسی قبیل کی دوسری احادیث سے بھی عالم مثال کا وجود ثابت ہے۔

غرض شاہ صاحب کے نزدیک عالم مثال اس عالم حسی کے علاوہ ایک دوسرا عالم ہے وہ محسوس مقداری ہونے میں جوہر جسمانی کے مشابہ ہے اور نورانی ہونے میں جوہر مجرد عقل کے مشابہ ہے۔ وہ جسم نہیں، جو مادہ سے مرکب ہو۔ اور نہ وہ مجرد جوہر عقلی ہے۔ بلکہ دونوں کے درمیان برزخ اور حدِ فاصل ہے۔ جو چیز دو چیزوں کے درمیان برزخ ہوتی ہے۔ اس کے لئے دونوں کا غیر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح عالم مثال عالم ارواح و عالم شہادت کے درمیان واسطہ ہے۔ جہاں تک اس کا مشاہدہ کرنے کا تعلق ہے، بعض لوگ اسے عالم رویا میں دیکھتے ہیں جب کہ ان کے حواس ظاہری معطل ہوتے ہیں۔ بعض کو یہ عالم اوقاتِ بیداری میں بھی مکشوف ہوتا ہے جس کی وجہ علویات کی جانب ان کی توجہ سے ان کے ظاہری حواس کا معطل ہونا ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں

کہ اس ناسوتی دنیا میں وجود پذیر ہونے سے پہلے ہر شے عالم مثال میں موجود ہوتی ہے۔

امام غزالیؒ عالمِ مثال کو "خیالی تمثل" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ حکما میں سے افلاطون کا نام سب سے پہلے آتا ہے جس نے عالم مثال کی نشاندہی کی۔ اسی طرح شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی بھی اس کے قائل تھے۔ محی الدین شیخ اکبر اور ملا صدرالدین نے بھی عالم مثال کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

ذیل میں ہم عالم مثال سے متعلق حکمائے مشائین و حکمائے اشراقین کے نظریات مجملاً پیش کرتے ہیں۔

حکمائے مشائین کے نزدیک عالم مثال نفوس منطبعہ ہی کے عالم کا دوسرا نام ہے وہ نفوس منطبعہ کو ایک مادی قوت خیال کرتے ہیں جو جرم فلک پر محیط ہے اور انعکاس صورت کا محل ہے۔ حکمائے مشائین کا یہ نظریہ غلط ہے۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ عالم مثال عالم سماوات ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہر متنفس پر یہ عالم منکشف ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ افلاک بھی نفوس رکھتے ہیں اس لئے ان میں بھی عالم مثال موجود ہے اور یہ ان کے نفوس منطبعہ میں ظاہر ہوتا ہے۔

حکمائے اشراقیین اس بارے میں اپنے مکشوفات کی بنیاد اشراق پر قائم کرتے ہیں۔ وہ عالم مثال کو عالم اشباح کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو اشیاء عالم شہادت میں ہم دیکھتے ہیں ان کا وجود پہلے عالم مثال میں ہوتا ہے۔ اسی وجود کے مطابق وہ عالم ناسوت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ بعض حکما ایسے بھی ہیں جو بیک وقت مشائین میں بھی ہیں اور اشراقیین میں بھی۔ وہ اپنے دعاوی کی بنیاد نہ صرف قیاس اور برہان پر بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اشراق و انکشاف پر بھی رکھتے ہیں۔ یہ حکماء عالم مثال کو عالم مقداری بھی کہتے ہیں۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ عبقات میں فرماتے ہیں کہ فلسفیوں پر چونکہ عالم کی شخصی وحدت کا راز واضح نہ ہو سکا۔ اور وہ نہ جان سکے کہ سارا عالم اپنے سارے اجزاء کے ساتھ ایک جسد واحد کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے وہ عالم مثال کی وحدت کے بھی قائل نہ ہو سکے۔ اور صوفیہ کرام پر عالم کی شخصی وحدت کا راز چونکہ منکشف ہو چکا تھا۔ اور باطنی طور پر عالم کے "نفسِ کل" کی وحدت کا بھی، اسلئے شخصِ اکبر کے قلب کی وحدت کا بھی اقتضا انہیں محسوس ہوا۔

غرض حضرت شاہ ولی اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ کائنات میں ایک غیر عنصری عالم بھی موجود ہے جس میں معانی اور افعال مناسب صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ اس کائنات میں رونما ہونے والے جملہ واقعات پہلے عالم مثال میں صورت پذیر ہوتے ہیں اور مادی دنیا میں ان واقعات کا وجود عالم مثال میں ان کے جو صُور مثالی ہوتے ہیں ان کا ظل ہوتا ہے۔ اس طرح جو چیزیں عالم محسوس میں وجود میں آتی ہیں ان کے یہاں وجود میں آنے سے پہلے ان کا دوسرے عالم میں وجود ہوتا ہے۔ اور اسی طرح جب یہ چیزیں مادی دنیا سے غائب ہو جائینگی تو اس کے بعد بھی ان کا وجود باقی رہے گا۔ لیکن واضح رہے کہ جو چیز عالم حسی میں موجود ہے، وہ عالم مثال میں بھی ضرور ہو گی۔ لیکن جو چیز عالم مثال میں ہے اس کا عالم حسی میں ہونا ضروری نہیں۔ اس واسطے ارباب شہود فرماتے ہیں کہ عالم حسی کو عالم مثال سے وہ نسبت ہے جو انگوٹھی کے حلقہ کو ایک وسیع میدان سے ہے۔ یعنی عالم مثال کی تمام اشیاء عالم محسوس میں موجود نہیں۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک عالم مثال شخص اکبر کی خیالی قوت کا نام ہے گویا عالم مثال کا ادراک قوت متخیلہ ہی کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عالم خیال بھی عالم مثال میں داخل ہے۔ لیکن عالم مثال محض عالم خیال نہیں۔ بلکہ اس کے سوا بھی ہے۔ درحقیقت صور مثالیہ کا مجموعہ دو قسم پر مشتمل ہے۔ (۱) خیال متصل (ب) خیالات منفصل۔ خیال متصل صور مثالیہ کی وہ قسم ہے جس میں انسانی قوت متخیلہ اس کے ادراک کے لئے شرط ہو۔ اس کی مثال یوں ہے۔ کوئی انسان مکان بنانے سے پیشتر اس کی تصویر اپنے متخیلہ میں متعین کرے۔ دوسری صورت خیال متصل کی یہ ہے کہ انسان خواب میں متخیلہ صورتیں دیکھے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح اس دنیا کی محسوس اشیاء صور مثالیہ کی ظل ہیں۔ بعینہ انہی صور مثالیہ کے خیالات بھی ظل ہیں اور اللہ تعالےٰ نے انہیں اس واسطے پیدا کیا ہے تاکہ وہ عالم روحانی کے وجود پر دلیل ہوں۔

خیالاتِ منفصل صور مثالیہ کی دوسری قسم ہے لیکن قوتِ متخیلہ ان کے ادراک کے لئے شرط نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر اگرچہ عالم خیال بھی عالم مثال میں داخل ہے۔ لیکن عالم مثال عالم خیال کے سوا بھی ہے۔ ضروری نہیں اس کا ادراک قوت متخیلہ سے ہو بلکہ قوت باصرہ سے بھی اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ (مثلاً آئینہ میں اشیا کا عکس دیکھنا) انہیں خیالات منفصل اس لئے

کہتے ہیں کہ یہ تخیلہ انسانیہ سے علیحدہ بذات خود موجود ہیں عالم مثال صرف عالم خیال نہیں - بلکہ یہ عالم خیال سے الگ بھی ہے مثلاً مردوں کی روح کو عالم رویا میں دیکھنا۔ اوران کے ساتھ گفتگو کرنا۔ یا مراقبات اور دیگر اوقات میں ارواح کی رویت اوران سے ہم کلام ہونا۔ یا عالم ملکوت سے ملائکہ کا صور و اشکال میں مشہود ہونا۔ عالم ملکوت سراپا روحانیت ہے۔ لہذا اس کی رویت مادی نہیں۔ یہ خیال منفصل ہے۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خیال منفصل خیال متصل سے بہت مشابہ ہے۔ اور کوئی معنی یا کوئی روح ایسی نہیں ہے جس کی صورت مثالی اس کے کمال کے مطابق نہ ہو۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ عالم مثال کے اوپر کے طبقوں کو سماء کہتے ہیں اور نچلے طبقوں کو جوّ (فضا) اور عالم مادی کو زمین کہتے ہیں۔ ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کے اثر سے بعد میں اسے افلاک بھی کہا جانے لگا۔

جب کوئی چیز عالم مثال کے فوقانی طبقہ سے نیچے اترتی ہے۔ یعنی اس کا عکس نیچے پڑتا ہے، تو اسے "نزول" کہتے ہیں۔ وہ چیز تو بہرحال اوپر کے طبقے میں رہتی ہے۔ صرف اس کا عکس "نزول" کرتا ہے۔ اسی طرح نچلے طبقے میں کوئی چیز موجود ہو اور اس کی مثال فوقانی طبقے میں بن جائے، تو اسے صعود کہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ صور مثالیہ کی حقیقت کیسے معلوم کی جا سکتی ہے؟ مشائخ کے نزدیک ان کی حقیقت کشف ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اور اسکی کئی شرائط ہیں۔ جن کی پابندی لازم ہے مشائخ کے نزدیک صُور مثالیہ کے ادراک کے لئے سالک کو مندرجہ ذیل شرائط مدّنظر رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ حق گوئی۔ ۲۔ توجہ الی اللہ (۳) عالم روحانی کی طرف نفس کا رغبت کرنا (۴) نفس کو برائیوں سے پاک رکھنا (۵) نفس کا عمدہ صفات سے موصوف ہونا۔ کیونکہ یہ سب باتیں نفس کے استحکام کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ جس قدر نفس قوی ہوگا اسی قدر ان امور پر اسے قدرت حاصل ہوگی۔ اور ارواح مجرّدہ کے ساتھ اس کو قوی مناسبت بھی پیدا ہوگی۔ اور مشاہدہ کامل حاصل ہوگا۔

مذکورہ بالا شرائط کے علاوہ بعض دیگر شرائط بھی ہیں جو بدن سے متعلق ہیں۔ مثلاً۔

۱- عبادات میں مصروف رہنا (۲) لوگوں کو نفع پہنچانا (۳) افراط و تفریط کے درمیان اعتدال قائم کرنا، (۴) ہمیشہ باوضو رہنا (۵) ذکر و اذکار میں مصروف رہنا۔

مذکورہ بالا شرائط صُوَر مثالیہ کے ادراک کے لئے نفس انسانی کو آمادہ کرتی ہیں۔ اور یہ وہ اسباب ہیں جو انسان کو بام عروج پر لے جاتے ہیں۔

رحمت کی کارفرمائیوں کو (یعنی تاریخ کے عمل کو) سمجھنے کے لئے ان چند اصطلاحوں کے تجزیئے اور تاویل کی ضرورت ہے جن کو شاہ صاحب نے مختلف مقامات وجود کے لئے استعمال کیا ہے ان میں سے پہلی اصطلاح "عالم مثال" ہے اس اصطلاح میں افلاطونی فلسفے کی جھلک تو ملتی ہے لیکن اس کا مفہوم ذرا بدلا ہوا ہے۔ کسی چیز کی مثال سے شاہ صاحب کوئی ایسا واحد اور منفرد جوہر مراد نہیں لیتے جس کا ایک ٹھوس اور مادی شکل میں ڈھل جانا اس چیز کے وجود کا باعث ہو۔ بلکہ وہ تو فرداً فرداً اس ایک چیز کی یا اس ایک چیز کی مثال کی بجائے "عالم مثال" کا تذکرہ کرتے ہیں جس سے یہ بھی نسبت رکھتی ہے اور وہ بھی، بہرحال یہ عالم وہ جگہ ہے جہاں دنیا کے تمام حوادث روئے زمین پر نازل ہونے سے پہلے ہی نمودار ہوتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ بالفرض ایک تاریخی واقعہ دنیا میں پہلی جنوری ۱۹۶۵ء کی صبح میں ہونے والا ہے۔ شاہ صاحب کا عقیدہ ہے کہ یہ (یا کوئی اور) واقعہ محض اتفاقی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کا کوئی سبب ہوگا لیکن جس معنی میں اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے یہ لازم ہے کہ ہم اس واقعہ کے سبب کو کسی اکیلے یا اکہرے اور دور افتادہ جوہر سے تعبیر نہ کریں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے مسبب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پورا نظام وجود اس واقعہ کا سبب ہے یعنی اس واقعہ کے ہونے سے پہلے، ساری کائنات کی جو بھی ہیئت (۳۱ دسمبر ۱۹۶۴ء کے ختم پر) ہو گی وہی اس واقعہ کا سبب ہو گی کائنات کی اس متعدد ہیئت کے اندر اس ہونے والے واقعے کے جو سرشتے پائے جاتے ہیں ان کا مجموعہ (اس واقعہ کے حق میں بس) عالم مثال ہے۔

(از ڈاکٹر صبیح احمد کمالی)

خانوادۂ شاہ ولی اللہ دہلوی کا تذکرہ

مولوی کریم الدین پانی پتی کے قلم سے

پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے

ابتدائیہ

مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۶۹ء) دہلی کالج (دہلی) کے نامور مدرس، مصنف اور صحافی تھے۔ انہوں نے اردو زبان میں بہت سی کتابیں لکھیں اور شائع کیں۔ کون ایسا پڑھا لکھا شخص ہے کہ ان کی مختصر مگر مشہور معروف اردو لغت "کریم اللغات" سے واقف نہ ہو۔ انہوں نے عربی اور اردو شعراء کے دو تذکرے بھی لکھے ہیں اردو شعراء کا تذکرہ "طبقات الشعرائے ہند"[1] (طبع دہلی ۱۸۴۸ء) تو کہیں کہیں مل بھی جاتا ہے مگر عربی شعراء کا تذکرہ "تذکرہ فرائد الدہر" تو بالکل ناپید ہی ہے۔ اتفاق سے مولوی سید محمد بیدری[2]

---

[1] تذکرہ طبقات الشعراء ہند، مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا ہے اس میں شریک مصنف کی حیثیت سے "ایف. فیلن" کا نام بھی شامل ہے۔

[2] مولوی سید محمد بیدری (مورخ دکن) بیدر (دکن) کے قدیم رہنے والے ہیں تمام عمر دولت آصفیہ حیدرآباد (دکن) کے سررشتہ تعلیم میں گزری۔ ۱۹۶۲ء میں کراچی آئے ایک بیش قیمت کتب خانہ کے مالک ہیں جس میں نہایت اہم اور نادر مطبوعات و مخطوطات کا ذخیرہ ہے اس کے علاوہ شاہی فرامین، سندات، سکہ جات تصاویر اور اخبارات و رسائل کے پرانے فائل موجود ہیں بیدری صاحب کا یہ ذخیرہ بڑا قابل قدر ہے۔ بیدری صاحب بہت خلیق، متواضع اور علم دوست بزرگ ہیں۔

کے نادر ذخیرۂ علمیہ میں یہ نایاب تذکرہ ہمیں دیکھنے کو ملا۔ اس میں تین سو ستانوے (۳۹۷) عربی شعراء کے حالات درج ہیں جن میں (۱۷) برصغیر پاک و ہند کے شاعر ہیں۔

مولوی کریم الدین نے بحیثیت عربی شعراء تذکرہ فرائد الدہر[1] میں شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، اور ان کے خاندان کے نامور تلامذہ میں مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولوی رشید الدین خاں دہلوی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مولوی حسین احمد لکھنوی، مولانا مملوک العلی نانوتوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے حالات لکھے ہیں[2] اور مولوی کریم الدین نے اپنے دوسرے تذکرے طبقات الشعراء ہند میں اس خاندان کے اردو شعراء کی حیثیت سے شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا مملوک العلی اور مفتی صدرالدین آزردہ کا ذکر کیا ہے۔

مولوی کریم الدین[3] شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادگان سے قریب العہد اور بعض دوسرے حضرات کے ہم عصر ہیں اور اس خاندان سے بالواسطہ تلمذ کا تعلق بھی رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لکھے ہوئے حالات بہت قابل قدر ہیں۔
اگرچہ شاہ ولی اللہ کو بحیثیت اردو شاعر المتخلص بہ اشتیاق پیش کرنے میں مولوی کریم الدین کو سخت مغالطہ ہوا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے اساتذہ

---

[1] تذکرہ فرائد الدہر، مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا ہے۔

[2] ان نو حضرات کے علاوہ ہندوستانی شعراء میں سراج الدین علی خان آرزو، علی حزین، اوحدالدین بلگرامی (کریم الدین نے وحید الدین نام لکھا ہے جو غلط ہے) انشاءاللہ خاں انشاء، مولوی اکبر شاہ کابلی۔ مفتی امراللہ خان۔ غلام علی آزاد بلگرامی۔ احمد عرب شروانی کے حالات لکھے ہیں۔

[3] مولوی کریم الدین بن شیخ سراج الدین، پانی پت میں ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے (طبقات الشعراء ہند از مولوی کریم الدین و ایف فیلن ص ۴۷۳ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۸ء)

مولانا مملوک العلی نانوتوی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے حالات عقیدہ کی زبان میں لکھے ہیں۔ مصنف کی زبان پرانی بلکہ بعض جگہ تو بے ربط اور اکھڑی اکھڑی ہے۔

ہم نے ان دونوں تذکروں سے خانوادہ ولی اللہی کے حالات اقتباس کرکے ضروری حواشی و تعلیقات کا اضافہ کردیا ہے اور بعض حضرات کے حالات[1] حاشئے میں لکھ دیئے ہیں۔ امید کہ ناظرین "الرحیم" اس "دریافتہ" کو دلچسپی سے مطالعہ فرمائیں گے۔

محمد ایوب قادری

شاہ ولی اللہ دہلوی

شیخ احمد ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم دہلوی، اوس شیخ اور استادکامل اور عالم اجل پر اللہ تعالےٰ کی بڑی عنایت اور نوازش تھی کیونکہ اوس کو فیض علوم کثیرہ اور فنون جدیدہ کا ایسا ہوا اور ایسا بابرکت وہ شخص تھا کہ آج کے دن تک بسبب تصانیف تفاسیر اور کتب حدیث اور اوراد و وظیفہ وغیرہ کے تمام ہندوستان میں فیض عام اوس سے ہوا۔[2] اوس فاضل کی تصنیفات سے اور فاضلوں کی رہنمائی ہوئی اوس کو اگر امام ائمہ منقول کہوں تو بجا ہے۔ اور اگر فضلاء معقول کہوں تو سزا ہے۔

انہوں نے درمیان شاہ جہاں آباد کے پیدائش پائی۔[3] اصل اون کی سرہند ہے شیخ ظہورالدین حاتم جو کہ ایک شاعر اردو گو گزرا ہے وہ ان کا ہم عصر تھا، یہ شخص مرد متوکل، پارسا، عالم، عامل

---

[1] عربی کے اشعار قصائد جو کریم الدین پانی پتی نے جو بطور نمونہ نقل کئے تھے۔ وہ طوالت کی وجہ سے ہم نے ان حالات میں شامل نہیں کئے ہیں۔

[2] شاہ ولی اللہ کی تصانیف کی تفصیلی فہرست کے لئے ملاحظہ ہو مجموعہ وصایا اربعہ مرتبہ محمد ایوب قادری ص ۲۰ تا ۲۲، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد

[3] شاہ ولی اللہ کی پیدائش انکی ننہال قصبہ پھلت ضلع مظفرنگر (یوپی انڈیا) میں ۴ شوال ۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۳ء کو ہوئی۔

مشغول بحق تھے چونکہ طبیعت موزوں اور سلیم رکھتے تھے اس لئے اکثر قصائد عربی اور عبارت عربیہ نثر اور نظم اور کبھی کبھی اشعار اردو بھی کہتے تھے اشعار اردو میں اشتیاق ان کا تخلص ہے۔[1]
آج کے زمانہ تک بسبب علم تفسیر اور حدیث اور فضیلت کے انکے نام کی شہرت وقتی ہوئی ہے احمد عربی[2]

---

[1] مولوی کریم الدین کو اس سلسلہ میں سخت مغالطہ ہوا ہے کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بن عبدالرحیم کو ولی اللہ المتخلص بہ اشتیاق سرہندی سمجھ لیا ہے، اور ان کو یہ دھوکا مرزا علی لطف کے تذکرہ گلشن ہند کی وجہ سے ہوا کیونکہ سب سے پہلے یہ مغالطہ لطف کو ہوا اور اس کے بعد مولوی کریم الدین نیز دوسرے تذکرہ نویسوں نے اس کا اعادہ کیا۔ ورنہ میر تقی میر نے نکات الشعراء ص۶ (مطبوعہ اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء) فتح علی گردیزی نے تذکرہ ریختہ گویاں ص۸ (مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۳۳ء) اور قائم چاندپوری نے مخزن نکات ص۸ (مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۲۹ء) اور میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو ص۸ (مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۴۰ء) میں صاف صاف ولی اللہ اشتیاق سرہندی کے حالات لکھے ہیں۔ قائم کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتیاق سرہندی کا انتقال ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں ہوا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا انتقال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں ہوا ہے لہذا دونوں الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ اور اشتیاق تخلص حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کا نہیں ہے۔

[2] شیخ احمد عرب یمنی شروانی ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے تحصیل علم محسن نخعی، بہاء الدین عاملی، علی زبیری ابراہیم صنعانی وغیرہ سے کی مذہباً شیعہ اور عربی کے ادیب شہیر تھے برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی اکثر کلکتہ میں رہتے تھے اور انگریزوں کو عربی پڑھاتے تھے۔ ان کی تصنیفات عجب العجاب، حدیقۃ الافراح، جوہر الوقاد اور نفحۃ الیمن مدارس میں داخل نصاب ہوئیں۔ آخر الذکر کتاب تو آج تک عربی مدارس میں داخل نصاب ہے۔ گورنر جنرل کے ایما پر وہ غازی الدین حیدر کے مصاحب ہوئے اور ان کی تعریف میں ایک کتاب مناقب حیدریہ لکھی۔ انہوں نے لکھنؤ میں سید اسمٰعیل خاں مرشد آبادی کی لڑکی سے نکاح کیا۔ غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد وہ بنارس میں رہے۔ اور پھر انگریزوں کے مشورہ سے نواب جہانگیر محمد خاں والی بھوپال کے اتالیق مقرر ہوئے۔ (باقی حاشیہ ص۶۲ پر)

اپنی کتاب[1] میں لکھتا ہے کہ شیخ ولی اللہ کی تصنیف سے ایک کتاب قرۃ العین فی ابطال شہادۃ حسین ہے دوسری جنت العالیہ فی مناقب معاویہ، مگر مجھ کو یقین نہیں آتا کہ ایسے فاضل زبردست نے یہ کتابیں اس طرح کی تصنیف کی ہوں۔ گرچہ دیکھنے میں نہیں آئیں مگر چند لوگوں نے یہ حال لکھا ہے۔ اور زبانی بھی اکثر عوام و خواص کے سننے میں آیا۔ چنانچہ لطف نے بھی اپنے تذکرہ میں یہی لکھا ہے[2]۔ واللہ اعلم

ایک ترجمہ قرآن شریف کا فارسی بہت اچھا ان کی تصنیف سے ہے محمد شاہ بادشاہ کی عملداری انہوں نے دیکھی تھی[3]۔ یہی جناب مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ کے والد ماجد ہیں اور کتابیں بھی ان کی تصنیف سے دہلی میں موجود ہیں یہ قصیدہ مدح نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں انہوں نے لکھا ہے اس قصیدہ کا چھپنا بسبب ضرورت کے بہت مناسب ہے لہذا تمام لکھا جاتا ہے[4]۔

(تذکرہ فرائد الدہر — ۳۷۶)

(بقیہ حاشیہ) اور ایک کتاب شمس الاقبال فی مناقب ملک بھوپال لکھی۔ احمد شروانی کا انتقال پونا میں ۱۹ ربیع الاول ۱۲۵۶ھ (۲۱ مئی ۱۸۴۰ء) کو ہوا۔ مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ منہج البیان، الشافی ذالہ بحر النفائس بھی ان کی تصانیف ہیں۔ محمد عباس شروانی (ف ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷-۸ء) ان کے نامور اور صاحب تصانیف فرزند تھے (ملاحظہ ہو تاریخ آل اعجاز۔ از محمد عباس شروانی ص۱۱۱ — ص۱۱۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۵ھ)

[1] مولوی کریم الدین نے کتاب کی نشان دہی نہیں کی کہ احمد شروانی نے اپنی کس کتاب میں یہ بات لکھی ہے۔

[2] مرزا علی لطف مولف تذکرہ گلشن ہند

[3] شاہ ولی اللہ دہلوی اورنگ زیب عالمگیر (ف ۱۱۱۸ھ) کے عہد میں پیدا ہوئے انہوں نے معز الدین جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ، احمد شاہ کا زمانہ دیکھا۔ عالمگیر ثانی کے عہد میں شاہ ولی اللہ کا انتقال ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء میں ہوا۔

[4] اس قصیدہ بائیہ کا نام "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" ہے یہ قصیدہ متعدد بار چھپ چکا ہے۔ ہمارے پیش نظر مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ کا مطبوعہ ہے اس کے ساتھ شاہ صاحب کے دوسرے ہمزیہ، تائیہ اور لامیہ قصیدے بھی شامل ہیں۔

اشتیاق تخلص شاہ ولی اللہ نام، کہتے ہیں کہ وہ پیرزادہ رہنے والا سرہند کا تھا۔ صاحب مجدد الف ثانی کی نسل سے شاہ محمد کے پوتے ہیں۔ شیخ ظہور الدین حاتم کے معاصرین میں سے تھے مرد متوکل مشغول بحق عالم کامل فاضل بے بدل تھے۔ چونکہ طبیعت موزوں رکھتے تھے اس لئے گاہ گاہ فکر ریختہ بھی کیا کرتے تھے۔[۱]

علم تفسیر اور حدیث کا ان کو بہت شوق تھا۔ آج تک درمیان ہندوستان کے ان کے عالم بے بدل ہونے کا شہرہ ہے۔ لطف کہتا ہے کہ قرۃ العین فی ابطال شہادت حسین اس فاضل کی تصنیف سے ہے اور ایک کتاب جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ سے انہوں نے تصنیف کی ہے[۲] مگر بعضے ثقہ کی زبانی یہ سننے میں آیا ہے کہ یہ صرف ان پہ بہتان ہے انہوں نے یہ دونوں تصنیف نہیں کی ہیں اور نہ ان کے خاندان میں یہ کتابیں موجود ہیں۔

ایک ترجمہ قرآن شریف کا فارسی زبان میں انہوں نے بہت اچھا تصنیف کیا ہے اکثر نکات مشکلہ اور دیکہ اس میں موجود ہیں۔ یہ صاحب مولوی شاہ عبدالعزیز کے والد مرحوم ہیں۔

(طبقات الشعراء ہند ص۱۵۲)

شاہ عبدالعزیز دہلوی

شیخ عبدالعزیز ابن احمد ولی اللہ دہلوی، سلطان اقلیم معانی کا اور مالک ازمۂ بیان کا اور بیلیغ ثانی اس فاضل بزرگ کی تعریف میں جتنا کچھ لکھوں بہت کم ہے اگر یہ کہوں کہ وہ سب ذکیوں اور عالموں

---

[۱] یہ عبارت طبقات الشعراء ہند مئولفہ کریم الدین اور ایف فیلن سے ماخوذ ہے اس کی تردید پیچھے کی جا چکی ہے۔

[۲] مولوی کریم الدین نے تذکرہ فرائد الدہر میں ان کتابوں کی معلومات کا مآخذ شیخ احمد عرب کی کتاب کو قرار دیا ہے اور یہاں مرزا علی لطف مولف تذکرہ گلشن ہند بتایا ہے پھر یہاں مولوی کریم الدین نے پر زور تردید بھی کی ہے اس بات کی تردید مولانا شبلی نعمانی (وفات ۱۹۱۴ء) اور بابائے اردو مولوی عبدالحق (وفات ۱۹۶۱ء) نے کی ہے ملاحظہ ہو تذکرہ گلشن ہند از مرزا علی لطف، تصحیح وحاشیہ شمس العلماء شبلی نعمانی (مقدمہ از مولوی عبدالحق ص۲۴۔ ص۲۵ (حیدرآباد دکن ۱۹۰۶ء)

بادشاہ تھا تو بجا ہے اگر یہ کہوں کہ عابد اور متقی اور پارسا اور نیک اس کے دروازے کی چوکھٹ چومنے والے جاتے تھے تو سزا ہے تصنیفات اس فاضل بے نظیر کی تعداد سے باہر ہیں۔ ایک دیوان عربی اس فاضل کا موجود ہے[۱]

اکثر لوگوں کے پاس شاہجہاں آباد میں ہے رسالے اس کے بے انتہا مشہور ہیں نظم و نثر کا ٹھکانا نہیں کہ کتنے کچھ مسودات پڑے ہوئے ہیں۔ ایک کتاب تحفہ رد روافض میں اس فاضل کی تالیف سے ہے[۲] اس کتاب کو فارسی زبان میں اور کتب عربیہ وغیرہ اور اپنی یادداشت سے تصنیف کرکے لکھی ہے جس کا جواب شیعہ لوگ آج تک لکھ رہے ہیں[۳]

۱؎ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی فہرست تصانیف فتح العزیز، فتاوائے عزیزی، تحفۂ اثناء عشریہ، بستان المحدثین، عجالہ نافعہ، رسالہ فیما یجب حفظہ المناظر، میزان البلاغت، میزان الکلام، السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل، سر الشہادتین، رسالہ الساب، رسالہ تحقیق الرویا، حاشیہ میر زاہد ملا جلال، حاشیہ میر زاہد شرح مواقف، حاشیہ عزیزیہ بر حاشیہ ملا کوسج، حاشیہ شرح ہدایت الحکمۃ، شرح ارجوزہ اصمعی، مجموعہ مکاتیب، تخمیس بر قصائد شاہ ولی اللہ (بائیہ و ہمزیہ) ....

(نزہتہ الخواطر جلد ہفتم ص ۲۷۳ تا ۲۷۴) عزۃ الراشدین (نجوم السارہ ص ۳۵۹) سنگیت شاستر (معارف دسمبر ۱۹۶۲ء) کے نام ملتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز کے تین رسالے، السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل، عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس اور رسالہ وسیلۃ النجات ایک مجموعہ کی شکل میں "فضائل صحابہ و اہل بیت کے نام سے (پاک اکیڈمی ۱۲۱ وحید آباد کراچی ۱۸) نے شائع کیا ہے اس مجموعہ میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے مکاتیب بھی شامل ہیں۔

۲؎ تحفۂ اثناء عشریہ ۱۲۰۴ھ میں تصنیف ہوئی (ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص پاکستان ایجوکیشنل پبلیشرز کراچی ۱۹۶۰ء)

۳؎ تحفۂ اثناء عشریہ ۹۰ - ۱۷۸۹ء کے رد میں شاہ صاحب کے ایک معاصر حکیم مرزا محمد دہلوی (ف ۱۲۳۵ھ) نے سب سے پہلے نزہت اثناء عشریہ ۱۲۰۶ھ / ۹۲-۱۷۹۱ء میں لکھی جس کا جواب شاہ عبدالعزیز نے عزۃ الراشدین سے دیا۔ عزۃ الراشدین کا جواب حکیم باقر علی خاں اور دوسرے شیعہ علماء نے لکھا (باقی حاشیہ ص ۵۵ پر)

جس کا ارادہ اس کتاب کو دیکھنے کا ہو مطالعہ کرے۔ بالفعل کلکتہ میں چھپ بھی گئی ہے[۱]

ہر ہفتہ میں دو دفعہ یعنی منگل اور جمعہ کو درمیان دہلی کے کوچہ چیلوں میں پرانے مدرسہ میں وعظ و نصیحت کیا کرتے ہیں، بہت فاضل دہلی کے داخل درس ہوتے اور اشارے اور نکات قرآن عظیم کے سن کر فائدہ اٹھاتے۔ بہت کتابیں انہوں نے درباب مذہب امام ابوحنیفہ کے تصنیف کی ہیں۔ انشاء عربی بھی ان کی بہت اچھی ہے۔ ایک خط سید علامہ حسین کو جو لندن میں رہتا تھا اس فاضل بے عدیل نے درمیان ۱۲۲۸ھ کے لکھا تھا۔ وہ داخل کتاب عجب العجاب ہے۔[۲] جس کا جی چاہے دیکھ لے اس کے اول کے یہ شعر ہیں چونکہ ان کے شعر بہت ہیں اس لئے بہت لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں

(تذکرہ فرائد الدہر ص۳۹)

(بقیہ حاشیہ ص۵۴) سید دلدار علی (ف ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء) نے تحفہ کے رد میں چھ کتابیں ۱۔ صوارم الہیات۔ ۲۔ حسام الاسلام۔ ۳۔ احیاء السنہ (۴) رسالہ ذوالفقار (۵) کتاب صوارم اور رسالہ غیبت لکھیں، اور ان کے فرزند سید محمد (ف ۱۸۶۶ء) نے تحفہ کے رد میں دو رسالے البوارق فی بحثہ الامامتہ وطعن الرماح فی بحث فدک والقرطاس لکھے۔ اور ان کے تلمیذ مفتی سید محمد قلی خاں کشوری نے (ف ۱۲۶۰ھ) تحفہ کے پہلے باب کے رد میں سیف ناصری، دوسرے باب کے رد میں تقلیب المکائد، ساتویں باب کے رد میں برہان السعادت اور آٹھویں باب کے رد میں تشیید المطاعن وکشف الضغائن اور گیارہویں باب کے رد میں مصارع الافہام لکھیں۔ مفتی کشوری کے فرزند مفتی حامد حسین (ف ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء) نے اپنی تمام عمر تحفہ کے رد میں صرف کر دی حکیم عبدالحیٔ لکھتے ہیں" فانہ صرف عمرہ فی الرد علی التحفہ" (ملاحظہ ہو فضائل صحابہ واہل بیت از شاہ عبدالعزیز دہلوی (مقدمہ از محمد ایوب قادری ص ۸۱۔ ۸۴) پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۶۵ء)

[۱] تحفہ اثنا عشریہ سب سے پہلی مرتبہ ٹائپ میں کلکتہ میں ۱۲۱۵ھ میں طبع ہوئی۔

[۲] عجب اللعجاب، احمد شروانی کے عربی مکتوبات کا مجموعہ اس میں کوئی خط علامہ حسین لندن کے نام نہیں ہے البتہ شاہ عبدالعزیز کا خط خود احمد شروانی کے نام شامل کتاب ہے ملاحظہ ہو عجب العجاب ص۶۵ تا ۶۷، (مطبوعہ مطبع محمدی ۱۲۸۱ھ)

شاہ رفیع الدین

مولوی رفیع الدین فرزند ارجمند شاہ ولی اللہ دہلوی[1] بھائی مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب یہ شخص بہت ذہن رسا اور طاقت عربیہ اور ادب میں بے انتہار کھتا تھا۔ بڑا عالم گزرا ہے۔ انہوں نے اکثر قصیدہ اور خمسہ اور مسدس عربی میں لکھے ہیں۔ ایک ترجمہ قرآن شریف کا بھی ان کا ہے فائدہ اس کے بہت مشہور ہیں، اس فاضل نے اپنے اوقات اکثر کاروبار دنیا میں اور عبادت اور درس و تدریس میں تقسیم کر رکھے تھے تمام ہم سایہ ان فاضل کے بہت شکر گزار اس کے تھے۔ علم بھی اس کو بہت تھا اکثر قصائد شاہ ولی اللہ[2] کے جمع اس فاضل نے کئے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک خمسہ اسی فاضل کا کیا ہوا ہے اس قصیدہ پر جو شاہ ولی اللہ نے شیخ بوعلی سینا کے قصیدہ کے جواب میں لکھا ہے۔ شیخ بوعلی سینا نے ایک قصیدہ اس باب میں لکھا کہ نفس کیا شے ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس فاضل نے اس کا جواب دیا ہے۔[3] مولوی رفیع الدین صاحب نے اس کا خمسہ کیا ہے وہ خمسہ یہ ہے[4]

---

[1] اصل مطبوعہ نسخہ تذکرہ فرائد الدہر میں شاہ ولی اللہ کی بجائے شاہ عبدالرحیم لکھا ہے جو غلط ہے

[2] مولف مولوی کریم الدین پانی پتی نے غلطی سے یہاں شاہ ولی اللہ کی بجائے ان کے والد شیخ عبدالرحیم کا نام لکھ دیا ہے۔

[3] شاہ ولی اللہ نے شیخ بوعلی سینا کے قصیدہ کا جواب لکھا ہے۔ مولوی کریم الدین نے یہاں بھی غلطی سے شیخ عبدالرحیم لکھ دیا ہے۔

[4] یہ خمسہ ابھی حال میں شاہ رفیع الدین کی کتاب "اسرار المحبۃ" میں شائع ہو گیا ہے جسے مولوی عبدالحمید سواتی نے اپنے مقدمہ اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے (دیکھئے اسرار المحبۃ از شاہ رفیع الدین (مقدمہ و تصحیح) از مولوی عبدالحمید سواتی) ص ۱۴۷-۱۴۸۔

(مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ۱۳۸۲ھ)

قریب اٹھارہ انیس برس ہوتے کہ اس جہان سے کوچ فرما کر جنت الماویٰ کو تشریف لے گئے[۱]

(تذکرہ فسر آمد الدہر ص۱۱۳)

شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی رح

مولوی محمد اسمٰعیل، یہ صاحب عالم اور بہت دین دار اور سید احمد جو اس فرقہ کا بانی ہے اس کے بہت سرگرم مریدوں میں سے وہی ایک تھا۔ اس فرقہ کا نام طریقہ محمدیہ ہے اس فاضل زبردست نے ایک رسالہ تقویتہ الایمان اس فرقہ کی ہدایت کے لئے وہابیت کے طور پر لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مطلب اس مصنف کا مسلمانوں کے دلوں سے پرستش دلیوں اور بزرگوں کی دور کرنی اور بدعت اور روضہ کا طواف رد کرنا ارادہ تھا اور ایک خدا کو ماننا اور اس کا شرک کرنا مسائل بیان کئے ہوئے اسماعیل کے درست اور اسلام کے ہیں اکثر لوگ اصل مسائل کو مروجہ سے جو غلط ہیں تمیز کا فی نہیں کرتے۔

اس کی تصنیف سے ایک صراط المستقیم بھی ہے مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے وہ بھتیجا شاہ عبدالعزیز صاحب کا تھا جو کہ سید احمد کا استاد ہے اکثر لوگ اس کو بہت مستعد اور عالم جانتے تھے، اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی کے ہمراہ[۲] سید احمد دہلی سے کلکتہ

---

[۱] شاہ رفیع الدین ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء میں ہوا۔ ان کی تصانیف میں مقدمہ العلم، رسالہ عروض، کتاب التکمیل، قیامت نامہ، فتاویٰ شاہ رفیع الدین مجموعہ رسائل تسعۂ دفع الباطل، اسرار المحبت اور تفسیر آیتہ النور مشہور ہیں، آخر الذکر چاروں کتابیں مولانا عبدالحمید سواتی کے زیر اہتمام گجرانوالہ سے شائع ہوئی ہیں۔

[۲] مولوی عبدالحیٔ بن شیخ ہبتہ اللہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے شاہ عبدالعزیز دہلوی کے داماد تھے علم وفضل کے اعتبار سے وہ ہندوستان کے نامور علماء میں شمار ہوتے تھے تفسیر میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز ان کو شیخ الاسلام لکھتے تھے۔ مولانا عبدالحیٔ سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد ان ہی کے رنگ میں رنگ گئے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں نہایت چست و مستعد رہتے تھے۔ (باقی ص۵۸ پر)

کو واسطے ادائے مناسک حج کے آیا تھا، اسمٰعیل اور یہ مولوی مکہ کو گئے ہمراہ سید احمد صاحب کے درمیان شروع ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے سمندر میں سوار ہوا۔ اور اس سال کے اکتوبر کے مہینے میں مراجعت کی بیس برس کا عرصہ ہوا کہ سکھوں سے جہاد کرکے شہید ہوئے[۱]

(طبقات الشعراء ہند ص۲۹۵)

مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ

بڑا فاضل متبحر شاعر اور بہ گو واعظ اور ادیب اور نیک بخت گزرا ہے اپنے سب اقران اور اتراب سے فوقیت رکھتا تھا نثر بھی بہت اچھی لکھتا تھا۔ ایک خط عربی

(بقیہ حاشیہ) انہوں نے سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں بہت سرگرمی سے حصہ لیا۔ حجاز میں اہل عرب کے لئے انہوں نے صراط مستقیم کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ۸۔ شعبان ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء کو عارضہ بواسیر میں انتقال ہوا۔

ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (رحمٰن علی) مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری ص ۲۸۶ - ۲۸۷۔ (کراچی ۱۹۶۱ء

[۱] شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا حال صیغہ واحد غائب میں تحریر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طبقات الشعراء ہند (از کریم الدین و ایف۔ فیلن) کا اصل ماخذ، گارساں دتاسی کی تاریخ ادب اردو (جلد اول ہے) گارساں دتاسی نے جس انداز میں شاہ اسمٰعیل شہید کا حال لکھا ہے وہی یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔

شاہ اسماعیل شہید ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء کو میدان جہاد (بالاکوٹ) میں شہید ہوئے۔

زبان میں قاضی القضاۃ محمد نجم الدین[1] خاں کو اس نے لکھا تھا جس کے ان کے یہ دو شعر اس کے لکھے ہوئے تھے۔

صبا بلغ ریاحین السلام بذل و ابتهال و التحامی
الی من فاق نجم الخلق فضلا الی نجم الھدی بدر الظلام

وہ قصبہ کاندھلہ سکونت پذیر تھا بہت کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اردو زبان کے اور فارسی اور عربیہ میں بھی ترویج مذہب امام ابو حنیفہ میں اس کے مشہور ہیں[2] میں نے اپنا استاد عالم خفی و جلی جناب مولانا مملوک العلی مدظلہ سے یہ سنا ہے کہ مولوی الٰہی بخش مذکور ۱۲۴۵ھ کے اسی حدود میں فوت ہوئے[3] (تذکرہ فرائد الدہر ص ۳۸۷)

مولوی رشید الدین خاں دہلوی

مولوی محمد رشید الدین خاں فاضل کامل اور عامل باعمل گزرے ہیں۔ وہ مدرس اول مدرسہ دہلی عربی کے تھے انہوں نے مولوی شاہ عبدالعزیز قدس سرہ سے تعلیم پائی اور ہر ایک علم پر بہت قادر تھے خصوصاً علم ریاضی میں بڑی دست قدرت تھی اور معقولات کے امام تھے ان کی تالیفات سے کئی کتابیں ہیں۔ ازاں جملہ ایک شرح تشریح الافلاک کی علم ہیئت میں انہوں نے لکھی ہے بندہ نے خوب سیر اس کی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرح خلاصہ شرح مولوی عصمت سہارنپوری کا ہے

---

[1] نجم الدین خاں کاکوروی بن ملا حمید الدین، کلکتہ کی عدالت کے قاضی القضاۃ رہے تدریس و تعلیم کا شغلہ بھی جاری رہا۔ کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "انموذج" مشہور رہے۔ ۲۳ ربیع الاول ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۹-۵-۱۲-۵)

[2] مفتی الٰہی بخش کاندھلوی صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ مولف حالات مشائخ کاندھلہ نے ان کی ۴۳ تصانیف کا تعارف اپنی کتاب میں کرایا ہے مفتی صاحب نے ۷ درسی کتابوں پر حواشی لکھے ہیں ملاحظہ ہو "حالات مشائخ کاندھلہ" از احتشام الحسن ص ۱۲۵-۱۳۰
(ادارہ اشاعت دینیات دہلی ۱۳۸۳ھ)

[3] مفتی الٰہی بخش کا انتقال ۱۵ جمادی الاخر ۱۲۴۵ھ کو ہوا۔ (حالات مشائخ کاندھلہ ص ۱۱۲)

جو بہت بڑی ایک شرح ہے بعد تطبیق عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ شرح عصمت سے اس فاضل نے مختصر کی ہے اور ایک رد روافض علم کلام میں مولوی دلدار علی کے اور لکھنؤ والوں کے جواب میں انہوں نے لکھی ہے جو تحفہ کے جواب میں اہل شیعہ نے جواب لکھے ہیں اس کتاب میں اصل متن تحفہ کا مع اس کے اعتراضات کے لکھ کر اپنے جوابات ثبت کئے ہیں ایک رد متعہ میں کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام صولۃ الضیغم رکھا ہے۔ یہ کتاب مولوی مملوک العلی مدرس اول حال مدرسہ دہلی کے پاس خاطر سے تصنیف کی تھی اور مسودات ان کے بہت ہیں اور ان کے ہاتھ کی کتابیں بھی بہت لکھی ہوئی ہیں۔ اس جائے آدمی کی عقل حیران ہے کہ باوجود اس کثرت علم اور شغل درس اور تدریس اور تصنیف و تالیف کے کتابیں بھی انہوں نے لکھی ہیں۔

مدت سے دل میں وہ ارادہ حج کعبۃ اللہ کا رکھتے تھے مگر افسوس کہ نصیب نہ ہوا جب جانے لگے ان کو بیماری مہلک عارض ہوئی۔ ڈیڑھ مہینے تقریباً بیمار رہے بیس برس کا عرصہ گزرتا ہے کہ اس جہان فانی سے رحلت کی درمیان ۱۸۲۷ء کے، ان کی تصنیف سے ایک خط عربی زبان کا میرے ہاتھ آیا ہے جو کہ انہوں نے مفتی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو لکھا تھا۔ [۱] (مسلسل)

(تذکرۃ فرائد الدہر ص۱۰)

---

[۱] مولوی رشید الدین خاں بن امین الدین، مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے رشتہ دار تھی۔ مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں ایک کتاب الصولۃ الغضنفریہ تحریر فرمائی ان کی دوسری مشہور کتاب خوات عمریہ ہے اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی لائبریری (شیفتہ کلیکشن) میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ ایضاح لطافۃ المقال، تفضیل الاصحاب اور اعانۃ الموحدین واہانۃ الملحدین (راجا رام موہن رائے کے رسالہ کا رد) بھی ان سے یادگار ہیں بقول صاحب نزہۃ الخواطر جلد ہفتم ص۱۶۸ ۱۲۴۳ھ ۲۸-۱۸۲۷ء میں انتقال ہوا۔

اقبال کا پیام

جناب مسعود سلمان

اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت کی گہرائیوں اور وسعتوں کو سمیٹنا اور ان کے ہمہ گیر پیغام اور اس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ کہنے کو تو اقبال اردو اور فارسی کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں جن کی شاعری کی حدیں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں لیکن اقبال محض ایک شاعر ہی نہیں تھے اور نہ شاعری کی حیثیت ان کے نزدیک مقصد کی تھی دراصل شاعری کو انہوں نے ذریعہ بنایا تھا اپنے پیغام کی اشاعت کا جو وہ اپنی قوم کی زبان اور اپنی قوم کی وساطت سے ساری دنیا کو دینا چاہتے تھے۔

اقبال نے اپنے دل و دماغ کی خداداد نعمتوں اور مطالعہ و محنت سے حاصل کی ہوئی اپنی ساری کی ساری علمی و فکری و ادبی صلاحیتوں کو صرف ایک مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا اور وہ تمام عمر اسی مقصد کی تکمیل میں لگے رہے ان کی زندگی کا حاصل اور اصل مقصود بس یہی مقصد تھا وہ جیتے تھے تو اسی مقصد کے لئے اور آخر وقت تک ان کو خیال رہا تو اسی کا اور یہ مقصد تھا اپنی گری ہوئی قوم کو ایک حیات بخش پیغام دینا جو گو عملاً اس قوم تک محدود تھا لیکن فکراً وہ پیغام پوری انسانیت کے لئے تھا۔ اقبال یہ محسوس کرتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے پیام مشرق کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

> اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی

گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا
تعمیر کر رہی ہے۔"

اقبال نے ایک تو زندگی کی گہرائیوں سے ابھرنے والے اس نئے آدم اور اس کی نئی دنیا کا تعارف کرایا اور دوسرے اس نے ہر دو کی تعمیر میں ہمیں عملی شرکت کی دعوت دی اور اس کے لئے راہ عمل تجویز کی موصوف فرماتے ہیں۔

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب
تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک
کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو فطرت کا یہ اٹل قانون
جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما
بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے
فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔"

چنانچہ اقبال نے اسی کلیہ کے پیش نظر اپنی نظم و نثر دونوں کے ذریعہ انسانی زندگی کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کے ذریعہ زندگی کے مادی ماحول میں بھی انقلاب ہو سکے۔ اور اس طرح نئی دنیا وجود میں آئے اور اس میں نیا آدم پیدا ہو سکے۔

مختصراً یہ ہے اقبال کے پیغام کی اجمالی حقیقت اور یہ تھا اس کا فکری پس منظر اقبال نے اپنا یہ پیغام ہر رنگ اور ہر آہنگ میں دیا کبھی اس کے لئے اردو اور فارسی کا شاعرانہ جامہ پہنا اور کبھی انگریزی زبان میں اس پیغام کو اہل نظر تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کی گفت گو ان کی تحریریں ان کی تقریریں ان کی سیاسی سرگرمیاں اور ان کے سیاسی خطبے سب کا حاصل مدعا صرف اسی پیغام کی اشاعت تھی۔ ان سطور میں اقبال کے اس پیغام کا ایک دھندلا سا خاکہ اور اس کے چند واضح نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کائنات میں قدرت کا سب سے بڑا شاہکار انسان ہے اس کے دم سے قدرت کا یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے اور وہی زندگی کی تمام سرگرمیوں کا مرکز ہے اسے زمین میں خدا کا نائب قرار دیا گیا لیکن خود اس کی زندگی کے ثبات کا یہ عالم ہے کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں، ایک شعلے کی طرح بھڑکا اور پھر ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ گیا۔ موت آٹھوں پہر اس کی گھات میں رہتی ہے اور ذرا بھی اسے موقعہ

ملتا ہے تو اسے است سے نیست کر دیتی ہے اور اس کے جسم خاکی کا دنیا میں کہیں نام و نشان نہیں رہتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر انسانی زندگی اتنی ہی بے ثبات ہے اور اس کی حیثیت پانی کے ایک بلبلے سے زیادہ نہیں کہ ابھی ابھرا اور ابھی پیوند آب ہو گیا تو پھر یہ ہنگامہ کیوں اور کس لئے یہ اتنی تگ و دو اور کیوں صبح شام کی یہ اس قدر فکر یا اگر انسان کے مقدر میں زندگی کے یہی چند شب و روز لکھے ہیں اور اسے دیر یا سویر موت کے ہاتھوں مٹنا ہی ہے تو بہتر ہے کہ کش مکش حیات میں اس قدر سرگرداں نہ ہوا جائے۔ اور آدمی زندگی کے دریا کو جہانِ عمر رواں میں بے اختیار بیٹھ کر قطع کرلے۔

یہ انسانی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور اس پر افراد و اقوام کے تمام فکر و عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ اقبال کے پیام کا اساسی مسئلہ بھی یہی ہے اور اس نے اسی پر اپنے تمام فلسفے کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کا فنا پذیر یا غیر فنا پذیر ہونا ایسا اہم مسئلہ ہے کہ اس کے صحیح حل ہی پر افراد اور اقوام کی زندگی کا دار و مدار رہا ہے۔

انسانی انا کو عمل دوام بخشتا ہے۔

اقبال نے اپنی تصنیفات میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی کا یہ مرکزی نقطہ یعنی "انا" یا "میں" یا اس کی "خودی" فنا پذیر نہیں بشرطیکہ وہ عمل سے اپنے آپ کو لازوال بنالے عمل سے خودی کو نہ صرف اس دنیا میں ثبات اور استحکام ہوتا ہے، بلکہ مرنے کے بعد بھی جب کہ وہ نتیجہ ہو کسی اعلیٰ مقصد اور بلند نصب العین کا چنانچہ عمل صالح اعلیٰ مقصد کا ممنون احسان ہوتا ہے۔ اور اعلیٰ مقصد ہی انسان کو مفید اور ممد حیات عمل کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔

اقبال کے نزدیک انسان کی زندگی کا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہے جو کہ باعث بنتا ہے اس عمل صالح کا کہ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کا علم حاصل کرے اور اس کی تسخیر کے لئے مصروف عمل ہو۔ اقبال کے خیال میں آدم کی تخلیق کا مقصد ہی اصل میں یہی علم کائنات اور تسخیر کائنات ہے اس کے لئے اسے ہر لحظہ اور ہر لمحہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے نبرد آزما ہونا چاہیئے۔ اس سے اس کی زندگی میں حرارت، شوق اور جذبہ نمو پیدا ہوگا۔ اور اس کی خوابیدہ صلاحیتیں جاگیں گی فرماتے ہیں۔

حیات در اصل ایک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی
حرکت کا نام ہے جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں وہ

ان پر غلبہ پاکر آگے بڑھتی ہے حیات کا خاصہ یا جوہر طبعی یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔

بقول اقبال کے انسان اس طرح تسخیر کائنات کرکے اور اپنی خداداد قوتوں کو جلا دے کر اس دنیا میں خدا کا نائب ہو سکتا ہے اور ان کے نزدیک انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ اس دنیا میں خدا کا نائب بنے اور اسے پیدا ہی دراصل اسی لئے کیا گیا ہے اور یہی انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے اور اسی کے لئے اسے سرگرم کار ہونا ہے۔

بے شک عمل سے انسان کو دوام نصیب ہوتا ہے لیکن عمل سے کیا مراد ہے ؟ کیا بغیر کسی معین مقصد کے کچھ کرتے رہنا عمل ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ عمل جو خودی کو مستحکم کرتا اور انسانی "انا" کو لازوال بناتا ہے وہ صرف صالح عمل ہے۔ اور صالح عمل وہ ہے جو بامقصد ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ بامقصد عمل کی کیا نوعیت ہے ؟ اور مقصد کی تعریف کیا ہے ؟ ہمیں اقبال کے انفرادی اور اجتماعی فلسفہ اخلاق اور ان کے مابعد الطبیعاتی تصورات میں اس سوال کا جواب ملتا ہے۔

اقبال کے نزدیک بامقصد عمل یا عمل صالح وہ ہے جو ممدِ حیات ہو۔ اور ممد حیات عمل وہ ہے جو صرف تن کو قوت نہ بخشے بلکہ تن کے اندر جو جان ہے وہ عمل اس کے لئے بھی باعث نمو ہو۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے مفید ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عمل فرد کے لئے تقویت اور افزائش کا باعث ہو۔ لیکن فرد کی یہ تقویت اور افزائش اس وقت تک بے معنی رہتی ہے جب تک کہ اس سے پوری جماعت کو بھی تقویت نہ ملے۔ چنانچہ عمل صالح کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس سے فرد کے ساتھ ساتھ جماعت کو بھی قوت اور نمو حاصل ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ فرد اپنے آپ کو کسی انسانی اجتماع کے ساتھ وابستہ کرلے بغیر اس کے اس کی زندگی کے کوئی معنی نہیں اور اس کا کوئی عمل بھی صالح یا ممد حیات نہیں ہو سکتا ۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال کے نزدیک عمل صالح کے لئے ضروری ہے کہ اس سے جہاں ایک طرف فرد کی زندگی میں استحکام پیدا ہوا وہاں دوسری طرف سے قومی وجود کی بھی تربیت ہو سکے اور اسے بھی نمو ملے اس لئے عمل

عالم کی شرط یہ ہے۔

افراد کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے جذبات کی حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک مطلب مشترک پیدا ہو جائے۔

فرد، جماعت اور انسانیت

اقبال انفرادی "انا" کی حفاظت اور اس کے استحکام پر بہت زور دیتے ہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے ان کی ساری شاعری اسی دعوت کی صدائے بازگشت ہے۔ اس طرح جب افراد کے مختلف "انا" مل کر قومی "انا" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اقبال اس کے استحکام اور ترقی کو بھی کچھ اہمیت نہیں دیتے۔

لیکن آخر یہ قوم بھی تو کل نوع انسانی کا ایک حصہ ہی ہے اور جس طرح اگر فرد اور قوم کے اغراض و مقاصد میں تناقض ہو تو اس سے قومی زندگی ناقص رہتی ہے۔ اسی طرح اگر قوم اور پوری نوع انسانی میں ہم آہنگی اور مطابقت نہیں تو ظاہر ہے قومی زندگی مجموعی حیثیت سے ہموار اور متوازن نہیں ہوگی اور اس کی وجہ سے نہ فرد کی صحیح تربیت ہو سکے گی۔ نہ قومی "انا" ہی صحت مندانہ طریقے سے نشوونما پاسکے گا چنانچہ اقبال پوری انسانیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے اصول و مبادی کی طرف بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں جن سے ایک قوم کا عمل صالح مجموعی انسانیت کے عمل صالح سے متعارض نہیں ہوتا۔ اور جیسے فرد کا عمل قوم کے لئے ممد حیات بنتا ہے اسی طرح قوم کا عمل تمام انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہوتا ہے۔

فرد، جماعت، اور انسانیت ہماری زندگی کے یہ تین مدارج ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے اثبات استحکام اور توسیع کا انحصار دوسرے پر ہے اور عمل صالح وہی ہے جو ان تینوں کے لئے بالترتیب ممد و مفید ہو اور ان میں تناقض و تباین کے بجائے ربط و ہم آہنگی پیدا کرے۔ اسی عمل صالح سے فرد کی خودی مضبوط ہوتی ہے۔ یہی قومی خودی کو مستحکم کرتا ہے اور اسی کا حاصل نوع انسانی کی ترقی ہے

لیکن زندگی کی آخری حد انسانیت پر ختم نہیں ہو جاتی۔ کائنات کی لامحدود وسعتوں میں انسانیت کی مثال دریا میں ایک قطرے کی سمجھئے۔ اقبال کا تصور حیات مادی فلسفیوں کی طرح انسانیت تک آکر رک نہیں جاتا۔ وہ بحر زندگی کو بے کنار مانتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک نہ اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا اور اس کی کیفیت یہ ہے۔

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

کائنات کا یہی سب سے دقیق راز ہے اور اسے عقل انسانی حل کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔ یہاں اقبال کا تصور الٰہیات خدائے حیّ و قیوم کو اصل حیات مان کر کائنات کے اس معمے کو حل کرتا ہے اور اس طرح ایک فرد سے لے کر زندگی کی آخری منزل تک انسانی ذہن و عمل کو جن مراحل سے گزرنا ضروری ہے اور اسے لا ان میں سے گذرنا پڑتا ہے اقبال ہمیں ان میں شمع ہدایت دکھاتا ہے اور ان کے لئے راہ عمل تجویز کرتا ہے بتاتا ہے کہ کس طرح فرد اپنی محدود زندگی کو خالق زندگی کی طرح ابدی اور لازوال بنا سکتا ہے۔

یہ ہے اقبال کا تصور الٰہیات، اور اسی پر اس کے نزدیک ایک فرد کا منتہائے کمال یہ ہے کہ لاہوتی بن جائے۔ اور اس میں خدائی اوصاف پیدا ہوں۔

لا الٰہ الا اللہ

نکتہ می گویم از مردانِ حال
امتاں را لا جلال الّا جمال

اشتراکیت نے "لا سلاطین لا کلیسا، لا اللہ" کا نعرہ لگایا اور خالص مادی قدر پر انسانی زندگی کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی ٹھانی مارکس نے کہا کہ مذہب افیون ہے اور لینن نے انسانوں کی اس افیون خوردگی کی عادت کو ختم کرنے کا تہیہ کیا۔

اقبال نے جہاں ایک طرف اشتراکیت کے اس لا سلاطین، اور لا اللہ کے نعرے کا خیر کیا اور اسے کار خداوندان" قرار دیا۔ اور فرمایا کہ ایک زمانے میں مسلمانوں نے بھی تاریخ میں یہی فر سرانجام دیا تھا۔ دوسری طرف اس نے یہ بھی کہا کہ زندگی میں محض لا سلاطین، لا کلیسا لا اللہ" سے کام نہیں چلتا۔ جیسے تعمیر سے پہلے ہر بنائے کہنہ کو ویران کرنا پڑتا ہے اور اس کے نئی بنیادوں پر نئی عمارتیں بنائی جاتی ہیں اسی طرح زندگی میں بے شک اس لا کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عمل کی زندگی میں پہلے جولات و ہبل بن چکے ہوں ان کو توڑا جا سکے اور نئے افکار و خیالات پر زندگی عمارت تعمیر کی جائے۔

زندگی میں لا کے ساتھ الّا کی لزومیت پر اقبال نے اپنے اشعار میں بہت زور دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ لا ہی سے دراصل انسانی زندگی میں حرکت شروع ہوتی ہے انسان اسی جذبہ سے مت

ہو کر کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لاَ اسے ماضی کے بندھنوں سے آزاد کرنا اور اسے انکار کرنا سکھاتا ہے۔ جس سے نئی زندگی پیدا ہوتی ہے اور انسانی فکر آگے بڑھتا ہے۔

لا کی تعریف میں ارشاد ہوتا ہے۔

در جہاں آغازِ کار از حرف لاست — این نخستیں منزل مرد خداست

ملتے کز سوز او یک دم تپید — از گلِ خود خویش را باز آفرید

پیش غیر اللہ لا گفتن حیات — تازہ از ہنگامۂ او کائنات

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست — بند غیر اللہ را نتواں شکست

یعنی جہاں میں آغاز کار اسی لا سے ہے اور مرد خدا کی پہلی منزل بھی یہی لاَ ہے اور جب تک لاَ کی رمز سے آدمی آشنا نہ ہو۔ اس کے لئے غیر اللہ کے شکنجے سے نکلنا نا ممکن ہے۔

پیام مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

چہ خوش بودے اگر مرد نکوئے — ز بندِ پاستاں آزاد رفتے

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب — پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

اور یہ پہلوں کے بند سے آزاد ہونا اور تقلید کے خلاف اٹھنا ہی اسی لا کا کرشمہ ہے اور یہ لا ہی جو ہر موجود کو ختم کر کے نئے وجود کو ابھرنے کا سامان بہم کرتا ہے۔

ضرب او ہر بود را سازد نبود

تا بروں آئی ز گرداب وجود

لاَ کی اس تمام مدح سرائی کے ساتھ ساتھ اقبال کا یہ کہنا ہے کہ جب تک لاَ کے ساتھ الّا نہ ہو زندگی کی عمارت کسی محکم اساس پر نہیں ہو سکتی۔ لا محض تخریب ہے اور بس یہ ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے ساتھ لڑا سکتا ہے اس کی وجہ سے انسان میں عمل کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لا انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ہر قبائے کہنہ کو چاک چاک کر دے اور قیصر و کسریٰ اس کے ہاتھ سے اپنے انجام کو پہنچے اسی لاَ کا حاصل ہے روسی انقلاب جس نے نہ زاروں کو چھوڑا نہ کلیساؤں کو اور نہ جاگیرداروں کو

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ

بندگی با خواجگی آمد بہ جنگ

روس را قلب و جگر گردیده خون از ضمیرش حرف لا آمد برون

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است تیز نیشے بر رگ عالم زد است

لیکن انسانی عمل لا تک محدود رہے اور الا تک نہ پہنچے تو اس طرح جو نظام بنتا ہے اس میں "آپ دنان کی تو اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن دین کی نہیں۔ اس سے آدمی عقل کا غلام بن جاتا ہے اور اغراض مادی ہی اسکی زندگی کا نصب العین ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے دین محض لا الہ نہیں بلکہ لا الہ کے ساتھ الا اللہ بھی ہے۔

یہی دین دین حق ہے اور یہ کسی زید یا بکر یا کسی مخصوص قوم یا خاص فرقے کی ایجاد نہیں ہوتا اور نہ میری یا آپ کی عقل اس کو وجود دیتی ہے یہ وحی الٰہی کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے۔ اور کائنات کا خالق جو الحیّ یعنی سرتاپا زندگی اور القیوم یعنی زندگی کو برقرار رکھنے والا ہے۔ اس کو منزل فرماتا ہے اس دین کا سب سے بڑا وصف بقول اقبال کے یہ ہے کہ اس کے پیش نظر سب کا بھلا ہوتا ہے اور اس کی نگاہ میں سب انسانوں کی سود و بہبود ہوتی ہے۔ اور پھر لڑائی ہو یا صلح، یہ دونوں میں عدل پر عامل رہنا سکھاتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وحی حق بینندۂ سود ہمہ در نگاہش سود و بہبود ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

یہ تو ہوا دین حق۔ یعنی وہ دین جسے کائنات کا خالق سب عالموں کا پروردگار اور الحی والقیوم نازل فرماتا ہے اور جو صحیح آئینہ دار ہے لا الہ اور الا اللہ کا۔

لیکن اگر دین حق کسی فرد یا قوم کا آئین حیات نہ ہو۔ اور وہ روسیوں کی طرح محض عقل کی ایجاد کی ہوئی مادی قدروں ہی کو آخری حقیقت سمجھے۔ تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

غیر حق چوں ناہی و آمر شود

زور ور بر ناتواں قاہر شود

اور وہ اس لئے کہ جب تک دین حق کے عمومی ضابطہ اخلاق پر عمل نہ ہو۔ ہر فرد اور قوم صرف اپنے نفع اور نقصان کو دیکھتی ہے اور اسی کے مطابق اپنے لئے لائحہ عمل بناتی ہے۔ کیونکہ

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر سود خود بیند نہ بیند سود غیر

اور جب یہ حالت ہو تو "آمری" "قاہری" بن جاتی ہے زور ور ناتواں کو دباتا ہے اور اسے اپنی اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس "آمری" کو اقبال کافری کہتا ہے اور اس کے نزدیک اس وقت روس کا موجودہ آیئن بھی "کافری" ہے۔

اقبال کے نزدیک یہ آیئن کافری جسے وہ "لا الٰہ" کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ انسانیت کو صحیح اخوت سے محروم رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان تن کا ہو کر رہ جاتا ہے اور بجائے اس کے وہ انسانی وحدت اور انسانی مساوات کی بنیاد ہمہ گیر اور عالمگیر اخلاقی قدروں پر رکھے۔ وہ شکم کو اس کا اساس بناتا ہے۔ اور اس کی بنا پر ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے خلاف ابھارنا اور محبت عالمگیر کی جگہ نفرت عالمگیر کو انسانی زندگی کا اساس بناتا ہے۔

اقبال فرماتے ہیں کہ یہ نظام بھی اسی طرح ناقص ہے جیسے کہ ملوکیت، اس کے ہاتھوں بھی ملوکیت کی طرح بدن تو فربہ ہوتا ہے لیکن سینہ دل سے خالی اور بے نور رہتا ہے اور اس کی مثال اس شہد کی مکھی کی طرح ہے جو گل پر چرتے وقت پتوں کو چھوڑ دیتی ہے لیکن اس سے شہد لے جاتی ہے۔ مرحوم کے نزدیک یہ اشتراکیت اور یہ ملوکیت دونوں کی دونوں

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب	ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج	درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست	آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست

دونوں انسان کو ناصبور و ناشکیب بناتی ہیں دونوں آدم کو فریب دیتی اور خدا کا انکار کرتی ہیں ایک کے نزدیک زندگی محض بغاوت اور دوسری کے نزدیک صرف جلب مال ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

غرق دیدم ہر دو را در آب و گل

ہر دو را تن روشن و تاریک دل

میں نے دونوں کو آب و گل میں غرق دیکھا اور دونوں کا یہ حال ہے کہ ان میں تن تو روشن ہوتا ہے۔ لیکن دل تاریک رہتا ہے۔

حالانکہ زندگی کے لئے جتنا سوختن یعنی "لا" ضروری ہے، اتنا ساختن یعنی "الا" لابدی ہے چنانچہ

زندگانی سوختن با ساختن　　　در گلے تخم دلے انداختن

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "سوختن" کے بعد "ساختن" کی منزل نہیں آئے گی اور کیا لا کے بعد ضروری نہیں کہ روسی اشتراکیت الا اللہ کی طرف گامزن ہونے پر مجبور ہو۔

اقبال نے جمال الدین افغانی کی زبان سے ملت روس کو جو پیغام دیا ہے اس میں وہ فرماتے ہیں تو نے کار خداوندان تو کر لیا۔ اب تو لا سے الا کی طرف قدم بڑھا۔ اگر تجھے حق کی تلاش ہے۔ تو لا سے گذر جا تاکہ تو استحکام کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

تو کہ نظام عالم کی خواہاں ہے۔ کیا تو نے اس کے لئے اساس محکم ڈھونڈ لیا۔

وہ اساس محکم کیا ہے؟ وہ ہے لا الہ الا اللہ۔ یہی دین حق ہے اور اسی میں انسانیت کی نجات و فلاح ہے۔

اس کے بعد اپنی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" میں علامہ اقبال اس امید کا اظہار فرماتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب روس کو اس جنون سے نکلنا پڑے اور وہ الا کے حصار میں داخل ہونے پر مجبور ہو۔ فرماتے ہیں۔

آیدش روزے کہ از زور جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

کیونکہ

در مقام لا نیا ساید حیات   سوئے الا می خرامد کائنات

یعنی مقام لا زندگی کے لئے سازگار نہیں ہوتا اور کائنات مجبور ہے کہ الا کی طرف گامزن ہو۔ اور وہ اس لئے کہ

لا و الا ساز و برگِ امتاں
نفی بے اثبات مرگ امتاں
لا و الا احتساب کائنات
لا و الا فتح باب کائنات
ہر دو تقدیر جہاں کاف و نون
حرکت از لا زاید از الا سکون

یعنی زندگی میں حرکت لا سے پیدا ہوتی ہے اور سکون اِلاّ سے اور جس زندگی میں محض حرکت ہے سکون نہیں وہ، جنون ہے اور صرف چند روزہ اور جس میں سکون ہے حرکت نہیں۔ وہ موت ہے۔ زندگی نہیں۔ اس لئے اگر روس لا سے نہیں نکلتا۔ تو اس کی تباہی ہے اور اگر ہم سکون نما جمود کو ترک نہیں کرتے تو ہمارا پنپنا بھی ناممکن، لیکن اقبال کو امید تھی کہ روس اس لا سے ضرور نکل کر رہے گا اور اس حقیقت کو جان لے گا۔

کیونکہ الاّ کے بغیر زندگی کا کوئی نظام پائیدار نہیں بن سکتا۔

تیرھویں صدی عیسوی بغداد کی بربادی نے اسلام کے ذہنی سرمایہ اور مرکز کا خاتمہ کر دیا۔ مزید بربادی اور انتشار سے بچاؤ کی خاطر اسلام کے محتاط رجعت پسند مفکرین نے سارا زور اجتہاد و تجدید کے خلاف صرف کیا تاکہ اسلام میں اندرونی انتشار سے رہی سہی اجتماعیت بھی ختم نہ ہو جائے چنانچہ ہر سعی تجدید کو بدعت و کفر تک کہا گیا پرانی اور کہنہ روایات پرستی اور ماضی کے غلط احترام نے حرکت اور زندگی کے سوتے بند کر دیئے اور ہر طرف جمود اور کہنگی طاری ہو گئی۔

اس صورت حال کے خلاف امام ابن تیمیہؒ نے پہلے احتجاج کیا۔ سولہویں صدی میں امام سیوطی نے آزادی کا نعرہ بلند کیا اور مجدد کا تخیل زندہ کیا۔ اٹھارویں صدی میں ابن تیمیہ کی روح نجد کے ریگستان سے محمد ابن وہاب کی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوئی جس کے اثرات عہد حاضر کی ساری تحریکوں کی پیدائش کا باعث چنانچہ سنوسی تحریک بابی تحریک اور اصلاح پسند تحریک وغیرہ اسی کے شاخسانے ہیں یہ تحریکیں اگرچہ انفرادی فکر و عمل کی آزادی کی علمبردار ہیں مگر فقہی اور آئینی مسائل میں ان کا رجوع ہمیشہ احادیث کی طرف رہا۔ البتہ ترکی میں اجتہاد نے بالکل نئی راہ اختیار کی یہاں عصر جدید کے فلسفیانہ خیالات سے اثر پذیر ہو کر اجتہاد مذہبی اور سیاسی اداروں میں عمل پیرا ہوا۔ اقبال ؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"اگر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ حقیقت ہے۔ اور میرا یقین کہ یہ حقیقت ہے تو پھر ایک دن ہمیں بھی ترکوں کی طرح اپنی ذہنی وراثت اور سرمایہ کو نئی اقدار میں ڈھالنا پڑے گا۔"

(اقبال)

تنقید و تبصرہ

حیات امداد

حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلۂ دیوبند کے مورث اعلیٰ ہیں، زیر نظر کتاب ان کے سوانح حیات اور دینی و روحانی کمالات پر مشتمل ہے جسے مولانا محمد انوار الحسن شیرکوٹی پروفیسر اسلامیہ کالج لائلپور نے تصنیف کیا ہے اور شعبۂ تصنیف و تالیف مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ۵ نے شائع کیا ہے۔

دراصل فاضل مصنف مشاہیر دیوبند کے عنوان سے ایک کتاب لکھ رہے ہیں اور حیات امداد اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ خونیں کے بعد برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے دینی اور بالخصوص روحانی حلقوں میں حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی بڑی منبع فیوض و برکات شخصیت رہی ہے ۱۸۵۷ء سے پہلے اپنی عمر مبارک کے چوالیس سال آپ نے ہندوستان میں گزارے اور بعد کا چالیس سال کا زمانہ آپ کا جوار حرم میں گزرا۔ مکہ معظمہ کے دور مہاجرت میں بھی حضرت حاجی امداد اللہ کا ہندوستان سے برابر تعلق رہا۔ اور نہ صرف بزرگان سلسلۂ دیوبند کے لئے ان کی ذات گرامی ایک مرشد و مقتدا کی رہی بلکہ دوسرے علماء و بزرگ بھی ان سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے۔ نیز اسی زمانے میں مسلمانان ہند میں جو نزاعی دینی بحثیں چھڑ جاتی تھیں ان کے بارے میں اکثر اوقات حضرت حاجی صاحب کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ اور اس ضمن میں حضرت کے جو ارشادات ہوتے تھے یہاں کے مسلمان انہیں بڑی عزت و احترام سے سنتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم کا حکمت و معرفت اور علوم دینی میں جو بلند مقام

ہے اس سے کون ذی علم واقف نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ قدیم مکتب فکر میں شاہ ولی اللہ اور شاہ اسمعیل شہید کے بعد ہمارے ہاں مولانا محمد قاسم جیسا کوئی حکیم عالم دین ہنوز پیدا نہیں ہوا۔ اور مولانا محمد قاسم بھی حاجی امداد اللہ صاحب کے مرید تھے، اسی طرح مولانا رشید احمد گنگوہی بھی حاجی صاحب سے بیعت تھے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے۔ آپ کے مریدوں میں سے کوئی پانچسو کے قریب علماء تھے۔ اور عوام کا تو کوئی حساب نہیں، بزرگان متاخرین میں سے مولانا اشرف علی تھانوی حضرت حاجی صاحب کے مرید تھے۔

حاجی صاحب ۲۲ر صفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء کو ضلع سہارنپور کے قصبے نانوتہ میں پیدا ہوئے جہاں آپ کا ننہیال تھا۔ آپ کا آبائی وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر تھا۔ گو آپ کی کتابی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے باطنی فیوض سے خوب نوازا تھا۔ مصنف لکھتے ہیں :- ایک شخص نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ کیا حاجی صاحب عالم بھی تھے۔ آپ نے فرمایا "عالم ہونا کیا معنی۔ اللہ کی ذات پاک نے آپ کو عالم گر بنایا ہے۔" اسی ضمن میں مولانا اشرف علی صاحب کا ایک قول ہے۔ "حضرت حاجی صاحب نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا۔ اور ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ایک اور کافیہ لکھ دیں۔ مگر حضرت کے علوم ایسے تھے کہ آپ کے سامنے علماء کی کوئی حقیقت نہ تھی ہاں اصطلاحات تو ضرور نہیں بولتے تھے۔"

حاجی صاحب کی اپنی تصنیفات ہیں جن میں شرح مثنوی مولانا روم اور آپ کے ملفوظات و مکتوبات خاص طور سے مشہور ہیں لیکن آپ کی زندہ تصنیف مولانا محمد قاسم تھے اس سلسلے میں مولانا اشرف علی کا ارشاد ہے۔

> " مؤلف (یعنی مولانا اشرف علی) نے اکثر زبان حق ترجمان حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا تھا۔ جیسے مولانا روم کو حضرت شیخ تبریز قدس سرہٗ کی زبان بنایا تھا۔"

حضرت حاجی صاحب طریقت و معرفت میں مرد کامل ہونے کے ساتھ ساتھ جہاد و غزا میں بھی پیش پیش تھے چنانچہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی گئی۔ بیعت کرنے والوں میں مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا حافظ محمد ضامن شہید اور دوسرے بزرگ تھے۔

انہوں نے شاملی کا معرکہ بھی سر کیا تھا۔ ناکامی کے بعد جب آپ کی گرفتاری کے احکام صادر ہوئے تو آپ سندھ کے راستہ بچ کر نکل گئے، اور وہاں سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اس کے بعد آپ واپس وطن نہیں آئے۔

تصوف، جذبہ جہاد اور شاہ ولی اللہ کے خانوادۂ علمی سے انتساب۔ یہ چیزیں تھیں جنہوں نے حاجی صاحب میں وہ غیر معمولی اوصاف پیدا کئے کہ ان کے عقیدت مند کسی ایک مکتب خیال تک محدود نہ تھے، اور ان کا اسلامی مسائل کے متعلق نقطۂ نظر اتنا وسیع تھا۔ جس میں کہ تنگ دلی اور مذہبی فرقہ واریت کا گذر نہیں تھا۔ مدرسہ دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم حضرت حاجی صاحب کے مرید تھے۔ اور مدرسہ کے قیام میں حضرت کی آرزوؤں اور دعاؤں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ مصنف نے کتاب علمائے حق کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> قیام دار العلوم کے بعد اسی جماعت کے ایک بزرگ (مولانا رفیع الدین صاحب) جب حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ میں حاضر ہوئے تو وہاں سیدنا حضرت حاجی امداد اللہ سے عرض کیا۔ ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لئے دعا فرمائیے۔

حضرت حاجی صاحب نے دلچسپ انداز میں فرمایا۔

> "سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑ گڑاتی رہیں کہ خداوندا ہندوستان میں اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ انہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گراں قدر کو یہ سرزمین لے اڑی"۔ علمائے حق[۱] جلد اول

لیکن اس کے باوجود جب مولانا سید محمد علی مونگیری نے ندوۃ العلماء کی تحریک کی داغ بیل ڈالی اور ہر مکتب خیال کے علماء کو اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی اور ایک حد تک مختلف مکاتیب کے علماء ندوۃ العلماء کے مشترک پلیٹ فارم پر جمع بھی ہو گئے، تو بعض مذہبی حلقوں کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت کی گئی۔ اس موقع پر مولانا مونگیری نے حضرت حاجی صاحب سے اس بارے میں استصواب کیا۔ اور انہوں نے جب اس تحریک کے حق میں پیغام مرحمت فرمایا۔ تو اس سے

اسے بڑی تقویت پہنچی۔ یاد رہے کہ مولانا مونگیری بانی ندوۃ العلماء نے حاجی صاحب سے طریقت کے چاروں سلسلوں کی اجازت لی تھی۔ اور آپ نے انہیں ایک تسبیح اور ایک چادر بھیجی تھی۔

مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے معاملے میں حضرت حاجی صاحب کا یہ وسیع اور صلح کل مشرب بعض اور امور میں بھی نمایاں تھا۔ اس سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں۔

"حاجی صاحب کی ایک خاص صفت جو اولیائے کرام میں ان کا خاص طرۂ امتیاز تھا، ان کی وسعت قلبی اور رواداری تھی۔ کسی کی دل شکنی تو ان کے مذہب میں قطعاً ممانعت تھی۔ کسی سے معاصرانہ چشمک کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ اس قسم کے مصلح تھے کہ دیوبندی، بریلوی، غیر مقلد غرض کہ ہر عقیدے کے لوگ آپ سے مرید تھے لیکن کسی کے عقیدے سے غرض نہ رکھتے تھے۔ صرف اصلاح سے کام تھا۔ ایک دفعہ ایک غیر مقلد آپ کا مرید ہو گیا۔ لیکن اس نے جلد ہی آمین بالجہر اور رفع یدین ترک کر دیا آپ نے اس کو بلا کر فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے آمین بالجہر اور رفع یدین ترک کر دیا ہے۔ کیا یہ خود ایسا کیا ہے یا ہماری وجہ سے۔ اگر ہماری وجہ سے ایسا کیا ہے تو بھائی ایسا نہ کرو۔ میں ترک سنت کا باعث کیوں بنوں۔ سنت یہ بھی ہے اور وہ بھی۔ اور اگر اپنی مرضی سے ایسا کیا ہے تو خیر۔ اس نے عرض کیا۔ حضرت! میں نے اپنی مرضی سے ایسا کیا ہے۔"

اس کے بعد مصنف لکھتے ہیں۔ اس حکایت سے حاجی صاحب کی وسعت قلبی کا گہرا نقش دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وسعت خیالی کے باعث آپ سے ہر عقیدے کا مسلمان بخوشی بیعت کرتا اور وہ خود بخود اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا آپ کا طریقہ ہر شخص سے رواداری اور نرمی کا تھا۔

زیر نظر کتاب کے ابتدائی پچاس صفحوں میں مصنف نے دارالعلوم دیوبند اوران سے منتسب علمائے کرام کی دینی و ملی خدمات پر تبصرہ کیا ہے۔

"علمائے دیوبند کا اعتقادی پہلو" کے زیر عنوان مصنف لکھتے ہیں :— علمائے دیوبند اپنے عقائد و اعمال میں اعتدال اور میانہ روی کا رنگ رکھتے ہیں۔ وہ توحید و رسالت احکام قرآن و سنت پر سختی سے عامل نظر آتے ہیں۔ البتہ شرک و بدعت کا استیصال اپنا فریضۂ اولین سمجھتے ہیں

وہ امام اعظم امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں۔ اولیائے کرام اور بزرگان دین کی عظمت بلکہ کرامت کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں رشد و ہدایت اور روحانی تعلیم دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ ہے وہ اپنے ظاہری علوم کے اعتبار سے خاندان ولی اللہی کے شاگرد ہیں تو روحانی طور پر وہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانوی مہاجر مکی کے مرید ہیں۔

"تکفیر سے تا بمقدور احتیاط اور اسلامی فرقوں سے رواداری" کے عنوان کے تحت مصنف نے مولانا محمد قاسم کے یہ ارشاد نقل فرمائے ہیں۔

"فی زمانہ کفر کا غلبہ ہے۔ وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے۔ جس سے ان کا کلمہ منتفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو بلکہ توڑنے کی بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔ (سوانح قاسمی جلد اول ص۴۸)

دوسرا ارشاد یہ ہے۔

ایک اور جگہ کسی شخص کے علم غیب کے مسئلے پر پوچھنے کے بارے میں مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا۔

"مسلمانوں میں کون ایسا ہے کہ قرآن کریم پر اس کا دین و ایمان نہ ہو۔ اس لئے جہاں تک گنجائش ہو کسی کو کافر نہ جاننا چاہیئے۔ (ترجمہ از فارسی)

آج وسیع مشرب اور اسلامی فرقوں میں رواداری کی روح پیدا کرنے کی جتنی شدید ضرورت ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں اس ضرورت کو پیش نظر رکھا ہے حضرت حاجی صاحب کے سوانح جہاں پر اس طرح بحث کی ہے کہ آپس کی فرقہ وارانہ کدورتیں کم ہوں۔ زیر نظر کتاب کی یہ خاص خوبی ہے۔

انگریز کے خلاف جدوجہد برصغیر کی آزادی اور مملکت پاکستان کے قیام کے سلسلے میں مصنف نے علمائے دیوبند کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کا ایک بڑا دلچسپ ارشاد نقل کیا ہے۔

مولانا شبیر علی مولانا مرحوم کے بھتیجے اور آپ کے خادم خاص تھے۔ مئی ۱۹۳۸ء میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے فرمایا۔

"میاں شبیر علی! ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جائیں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی وہ انہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق فاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ یہی لوگ دیندار بن جائیں۔ اور بھائی آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات، ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیا داروں ہی کا کام ہے مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب نہیں دیتے۔ اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دین دار اور دیانت دار بن گئے اور پھر سلطنت انہی کے ہاتھوں میں رہی، تو چشم ما روشن دل ما شاد کہ ہم سلطنت کے طالب ہی نہیں ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو، وہ دیندار اور دیانت دار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور بس تا کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔"

یہ سنکر مولوی شبیر علی نے عرض کیا کہ پھر تبلیغ نیچے طبقے یعنی عوام سے شروع ہو یا اوپر کے طبقے یعنی خواص سے۔ اس پر ارشاد فرمایا۔

اوپر کے طبقے سے کیونکہ وقت کم ہے اور الناسُ علی دین ملوکھم اگر خواص دین دار اور دیانت دار بن گئے تو انشاء اللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔

(بحوالہ تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی)

کتاب مجلد ہے بڑے سائز کے ۱۷۶ صفحات۔

اس سلسلہ کی دوسری کتاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی پر ہوگی۔ ہم بڑے اشتیاق سے مصنف کی اس تصنیف کا انتظار کرتے ہیں۔

تہافتہ الفلاسفتہ (اردو ترجمہ)

از امام احمد غزالی۔ مترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین سابق پروفیسر صدر شعبۂ فلسفہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد، ہندوستان

حضرت امام نے کتاب تہافتہ الفلاسفتہ اپنے عہد کے فلاسفہ کے رد میں لکھی تھی جس میں فلسفیوں کی خوب خبر لی گئی ہے۔ ان کی بے مایگی، تضاد فکر اور انتشار خیال کو اچھی طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ ان ہی کے ہتھیار کو ان کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا گیا ہے کہ فلسفیوں کے مقدمات اور

طرق سے، ان کی پنہاں دچیپں شے سے یقین کا حصول کسی طرح ممکن نہیں"

امام غزالی ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ میں انتقال فرما گئے۔ امام صاحب کی بڑی جامع اور غیر معمولی شخصیت تھی۔ اسلام کی فکری تاریخ پر ان کی تعلیمات کا جتنا وسیع اور گہرا اثر پڑا شاید ہی کسی اور مسلمان مفکر اور عالم کا پڑا ہو۔ وہ بیک حکیم تھے، متکلم تھے۔ علوم شرعیہ کے عالم و عارف تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک صاحب عرفاں صوفی تھے۔ پھر علم و معرفت کو وہ صرف قال نہیں، بلکہ حال بنانے کے بھی سرگرم داعی تھے۔ امام صاحب کی ذات گرامی اور ان کے افکار ہر دور میں مسلمان اصحاب فکر و دعوت کا مرجع رہے ہیں اور ان سے سب نے استفادہ کیا ہے۔ ان کے جلائے ہوئے علم و دانش کے دیئے سے برابر اور دیئے جلتے رہے ہیں، اور ان سے بعد والوں نے روشنی اور ہدایت چاہی ہے۔

زیر نظر کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے۔

"غزالی کی کتابوں کا زمانہ حال تقاضا کر رہا ہے۔ اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ غزالیؒ کا نقطۂ نظر اس قدر وسیع، کلی اور انسان دوستانہ ہے کہ ہر قوم اور ہر ملت و مذہب کے پیرو کو انسانی اور انسانی معاملات پر ان کے خیالات سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے وہ صرف اپنے زمانہ ہی کے لئے پیدا نہیں کئے گئے تھے۔ ان کے خیالات اور تصورات ہر دم تازہ اور ہر دم توانا نظر آتے ہیں"

امام صاحب نے ڈاکٹر سید عبداللطیف کے الفاظ میں "بعد میں آنے والے مغربی فلاسفہ کے خیالات کی نہ صرف انہوں نے پیش بینی کی ہے، بلکہ فلسفیانہ طریقے سے ان کو ادا بھی کیا ہے، فرانس کے شہیر عالم فلسفی ڈیکارٹ نے جس کو فلسفہ جدیدہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ طریقہ تشکیک سے اپنے نظام فلسفہ کا آغاز کیا۔ غزالی میں یہ ہمیں ایک دل کش انداز میں ملتا ہے۔ تشکیک وارتیاب بجائے انہیں حقائق عالم کے چہرہ سے نقاب کشائی پر آمادہ کیا۔ اور انہوں نے شک بھی اتنا کیا کہ شک سے شک انہیں یقین کی راہ پر لے آیا۔"

امام صاحب نے اپنی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کی وجہ تصنیف دیباچے میں یوں رقم فرمائی ہے

"موجودہ زمانے میں ایک ایسی جماعت کو دیکھ رہا ہوں جو اپنے آپ کو عقل و ذکاوت میں اپنے ہمعصروں سے بدرجہا ممتاز سمجھتی ہے اور اسی لئے اس کے افراد نے فرائض اسلامی سے بے نیاز کنارہ کش رہنا اپنا شعار بنا لیا ہے اور شعائر دینی کی توقیر و عظمت کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور اپنے وہم و گمان میں اسکو اپنا اعلیٰ ترین وصف سمجھتے ہیں اور اپنے عمل سے ایک دنیا کی گمراہی کا سبب بن رہے ہیں۔ حالانکہ ان

کی ضلالتوں کے لئے کوئی سند نہیں ہے سوائے ایک قسم کی تقلید اور ایک قسم کی جمود پرستی کے جس کو وہ حرکت سمجھتے ہیں۔ ان کی مثال یہود و نصاریٰ کے ان افراد کی سی ہے جو اپنے مسلک پر اس لئے فخر کرتے ہیں کہ آباء و اجداد نے ان کے لئے یہ راستہ بنادیا ہے چاہے عقل و ضمیر کی رائے اس سے کتنی ہی غیر متفق ہو اپنی جہت کو وہ فکرو نظر سے منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ فکر و نظر کی کسوٹی پر وہ کھوٹی اترتی ہے۔ —"

اس کے بعد امام غزالی فرماتے ہیں۔

"اپنے کفریات کی ترجمانی ہیں جن مہیب ناموں سے وہ مرعوب کرتے ہیں، وہ ہیں سقراط، بقراط افلاطون ارسطاطالیس وغیرہ جن کی عقلوں کی تعریف ہیں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور ان کی ذہنی و اختراعی قوتوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں کہ اس طرح وہ موشگافی کرسکتے ہیں اور اس طرح باریک نکات پیدا کرسکتے ہیں حالانکہ ان کی عظمت رفتہ کے سوائے ان کے مزخرفات پر کوئی سند نہیں۔ جن غلط معتقدات کی طرف وہ رہنمائی کرتے ہیں، وہ بھی اسی طرح ایک قسم کی ذہنی لپنی ہے جس طرح کہ اہل بدعت کی شدید قسم کی روایت پرستی"۔

امام صاحب کو شکایت تھی کہ اس جماعت نے دانش و علم کی جھوٹی ملمع کاری سے دنیا کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور اس کی وجہ سے ذہنی کشاکش پیدا ہوگئی ہے۔ جو ایک عالمگیر صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ چنانچہ امام صاحب کے الفاظ ہیں۔

"اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ ایک ایسی کتاب لکھوں، جس میں ان کے خیالات کا رد کیا جائے اور ان کے کلام و استدلال کے تناقض و بے ربطی کو واضح کیا جائے۔ اس طرح ان کی مقبولیت کے رعب داب کو قوم کے دماغوں سے اٹھایا جائے تاکہ سادہ ذہین عوام اس فتنے سے محفوظ رہ سکیں جس کا نتیجہ انکار خدا اور انکار یوم آخرت ہو رہا ہے۔" اپنے دور کے فلاسفہ کے مزعومات کی تردید کرنے کے بعد آخر کتاب میں امام غزالی لکھتے ہیں کہ "اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ تم ان فلسفیوں کے مذاہب کی تفصیل تو کرچکے اب ان کے کفر و اسلام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کیا تم ان کو کافر اور واجب القتل قرار دیتے ہو۔"

اس کا جواب امام صاحب یوں دیتے ہیں :— (۱) مسئلہ قدم عالم اور ان کا یہ قول کہ جواہر تمام قدیم ہیں۔ (ب) ان کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ جزئی معلومات کا احاطہ نہیں کرسکتا اور (ج) اور ان کا انکار حشر اجساد و بعث و نشر۔ یہ تین مسائل ایسے ہیں جو اسلام کے اصول عقائد سے

متصادم ہیں ان کا معتقد گویا کذب انبیا کا معتقد ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ جنت و دوزخ کی تشبیہات صوری عوام کی محض تفہیم و ترغیب کے لئے ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں، تو یہ صریح کفر ہے جس کا مسلمانوں کے فرقوں میں سے کوئی بھی اعتقاد نہیں رکھتا۔ رہے ان تین مسئلوں کے سوائے باقی امور جیسے صفات الٰہیہ میں تصوف، اعتقاد توحید کو متزلزل یعنی قابل تشکیک بنیادوں پر قائم کر دینا تو یہ قریب قریب معتزلہ کے مذہب کے مماثل ہیں..... اور دوسری باتیں جو فلسفیوں سے نقل کی جاتی ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی نہ کوئی اسلامی فرقہ ان کی تکرار کرتا نظر آتا ہے۔"

غرض امام صاحب کو اپنے عہد کے فلسفیوں سے اوپر کے ان تین بنیادی مسئلوں ہی پر اعتراض تھا، اور انہیں وہ منجر الی الکفر قرار دیتے تھے۔

زیر نظر کتاب "مقاصد الفلاسفہ" کے اس نسخے سے ترجمہ کی گئی ہے جو مصر کے عالم سلیمان دینا نے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شائع کی ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ امام غزالی کی زندگی کو تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور شک کی ابتدا سے پیشتر کا۔ دوسرا شک یا کشمکش ذہنی کا اور تیسرا طمانیت و سکون کا۔ ان تینوں ادوار میں امام صاحب کی تصنیفات کا سلسلہ جاری رہا۔

سلیمان دینا صاحب لکھتے ہیں کہ امام صاحب کی مختلف تصانیف کو جن ادوار میں وہ لکھی گئیں ان کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے ان کے وہ رشحات قلم جو تیسرے دور میں زیب قرطاس ہوئے، دراصل ان پر کچھ صحیح رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ اور ان کا عندیہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی ایک دقت ہے۔ اور وہ یہ کہ امام صاحب کبھی تو خواص کے لئے لکھتے ہیں، اور کبھی عوام کے لئے۔

کتاب حیدرآباد دکن میں انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز نے شائع کی ہے۔ قیمت ۱۰ روپے۔

(ا۔ س)

المسوّی من احادیث الموطأ (عربی)

تالیف ———— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالاتِ زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفیٰ پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔ ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصوں میں قیمت ۲۰ روپے

(فارسی)

سطعات

انسان کی نفسی تکمیل و ترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعین فرمایا ہے اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے ذریعہ جس طرح حظیرۃ القدس سے اتصال پیدا کرتا ہے، "سطعات" میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

ہمعات (فارسی)

تصوّف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوّف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

Monthly "AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 254

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لیے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے۔ اُنہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع

غلام مصطفیٰ قاسمی پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا۔

الرحیم

جلد ۲ ماہ ذی الحجہ ۸۴ھ مطابق مئی ۱۹۶۵ء نمبر ۱۲

فہرست مضامین

شذرات

حج ایک عبادت بھی ہے۔ اور مسلمانوں کے عالمی اجتماع کا ایک ذریعہ بھی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ پچھلے چند سالوں سے مکہ معظمہ میں رابطہ العالم الاسلامی کے قیام سے حج کے مبارک دنوں میں اس عالمی اجتماع نے ایک باقاعدہ اور مفید شکل اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ حج کے فوراً بعد رابطہ العالم الاسلامی کے اجلاس ہوتے ہیں، جن میں تقریباً تمام ملکوں کے مسلمانوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں، اور مسلمانوں کے مشترک معاملات پر آپس میں غور و خوض کیا جاتا ہے۔ رابطہ العالم اسلامی کے یہ اجلاس اب حج کے بعد کا ایک ضروری پروگرام ہو گیا ہے۔ اور ہر ملک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کے ہاں سے مسلمان نمائندے وہاں ضرور پہنچیں۔

اس سال بھی حج کے بعد رابطہ العالم الاسلامی کے اجلاس ہوئے جن میں پاکستان کی طرف سے ایک مستقل وفد نے شرکت کی اسی طرح دوسرے ملکوں کے نمائندے بھی ان میں شریک ہوئے ہیں۔

ان سالوں میں کثیر التعداد ایشیائی افریقی ملکوں کی آزادی نے جہاں بین الاقوامی سیاسیات میں بڑی دور رس تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں، وہاں ان ملکوں کی آزادی کی وجہ سے بین الاقوامی سیاسیات میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا اثر و نفوذ بھی کافی بڑھ گیا ہے، اب جیسے جیسے افریقی ایشیائی عوام کے سیاسی شعور میں ترقی ہوگی اور ان کے ہاتھ میں زیادہ اقتدار آئیگا، مسلمانوں کی بات بحیثیت مسلمان کے، عالمی سیاسیات میں زیادہ توجہ سے سنی جائے گی اور ان کی ایک بین الاقوامی حیثیت ہوگی۔ اسلام کا یہ سیاسی رول مستقبل میں بڑے خوش آئند نتائج کا ضامن ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان خود آپس میں متحد رہیں اور سیاسی و معاشی لحاظ سے وہ مضبوط ہوں۔

صدارتی انتخاب کو ختم ہوئے اب کافی دن ہو گئے ہیں۔ اس انتخاب کے دوران ہمارے علمائے کرام

کا فرداً فرداً اور ان کی بعض تنظیموں کا جماعتی طور سے جو رویہ رہا اس نے عام مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں پر علمائے دین کے معاملے میں کوئی اچھا اثر نہیں چھوڑا۔ ایک عالم دین جو نماز میں امام بنتا ہے۔ ہر جمعہ کو منبر پر سے خطبہ دیتا ہے، اور دینی مسائل میں عام لوگ اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، ظاہر ہے اس بنا پر اس کی حیثیت عملاً ایک نائب رسول کی ہوتی ہے۔ اس حیثیت میں ایک عالم دین اسی حالت میں موثر اور مفید ہو سکتا ہے، جب کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا مذہبی مقام ہو۔ اور اسے ایک معلم و مرشد کا درجہ دیا جائے، لیکن اگر یہ عالم دین پارٹی ٹکٹ پر الیکشن لڑتا ہے۔ اور عالم دین ہونے کی بنا پر لوگوں سے ووٹ مانگتا ہے۔ یا کسی خاص پارٹی کے امیدوار کے حق میں انتخابی مہم چلاتا ہے تو اس کی دونوں حیثیتوں کا بیک وقت قائم رہنا مشکل ہے۔ وہ یا تو پارٹی پالٹیکس میں پڑ کر اپنے نائب رسول ہونے کی حیثیت کھو دے گا۔ یا اگر وہ اس کے باوجود اپنے نائب رسول ہونے پر مصر رہا، تو وہ نہ ادھر کا رہے گا نہ اُدھر کا۔

غیر ملکی حکومت کے خلاف عوام کی آزادی کے لئے لڑنا اور ہے۔ اور خود اپنوں کے مقابلے میں بنیادی جمہوریتوں اور دوسری نمائندہ مجالس کے الیکشن لڑنا اور لڑانا بالکل اور۔ ہمارے علمائے کرام کو اب فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ امامت خطابت اور دین کی تعلیم کے ذریعہ مسلمان عوام کے مخدوم بننا چاہتے ہیں یا کونسلوں اور اسمبلیوں کے ممبر بنکر۔ انہیں لازماً ان میں سے ایک راہ اختیار کرنا ہوگی۔ اور وہ اسے جتنی جلد اختیار کریں خود ان کے لئے اور اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے لئے یہ مفید ہوگا۔

ہماری بعض مذہبی جماعتیں جو گزشتہ صدارتی انتخاب میں پیش پیش تھیں، اور ظاہر ہے وہ انتخاب دو سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں میں تھا، اس میں اسلام اور کفر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا نہ تھے، اب اس طرح کی قرار دادیں منظور کر رہی ہیں کہ ہمارے سامنے حصول اقتدار کا کوئی حقیر سا نصب العین نہیں ہے، جس کی سرگرمیاں محض سیاسی کشمکش اور انتخابات تک محدود ہیں۔ ہم ایک وسیع اور ہمہ گیر مشن رکھتے ہیں، جس کے پیش نظر پوری انسانی زندگی کی حقیقی صلاح و فلاح کے لئے کام کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ کہ فی الحقیقت ہم اپنی پوری قوم بلکہ ساری انسانیت کے ہی خواہ ہیں۔

بے شک یہ مقاصد و عزائم بڑے مبارک ہیں اور ہماری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان مذہبی جماعتوں کو توفیق دے کہ وہ حصول اقتدار سے صحیح معنوں میں قطع نظر کر لیں، جس کا کہ موجودہ حالات میں واحد راستہ صرف سیاسی کشمکش اور انتخابات ہی ہیں۔ اور جس اصولی انقلاب کی داعی ہونے کی وہ مدعی ہیں اس کے لئے وہ وقف ہو جائیں لیکن

ان بلند آہنگ باتوں کے ساتھ ساتھ ان جماعتوں کا یہ کہہ کر کہ ہم محدود معنوں میں ایک ایسی مذہبی جماعت نہیں ہیں جس کی دلچسپیاں صرف اعتقادی، فقہی اور روحانی و اخلاقی مسائل ہی کے لئے مخصوص ہوں، اپنے لئے سیاسی کشمکش اور انتخابات میں حصہ لینے کا دروازہ کھلا رکھنا، اب زیادہ کام نہیں دے سکے گا۔ ان مذہبی جماعتوں کو بھی اب فیصلہ کرنا ہوگا کہ یا وہ خدا اور رسولؐ کی واحد ترجمان بن کر لوگوں کے سامنے جائیں، یا وہ سیاسی جامہ اوڑھ کر حصول اقتدار کے لئے کشمکش کریں۔

بیک وقت خلیفہ اور سلطان ہونے کا زمانہ مدت ہوئی ختم ہوگیا۔ اب احیائے اسلام کے نام سے مسند اقتدار پر مسلط ہونے کے خواب دیکھنے خام خیالی کے سوا کچھ نہیں احیائے اسلام کا کام بذات خود بہت بڑا ہے کہ اسے اپنا کر ایک جماعت اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کردے۔

برصغیر پاک وہند کی مشہور تبلیغی جماعت کے امیر جناب مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے انتقال کا صدمہ تمام اسلامی حلقوں نے بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ مرحوم ومغفور تبلیغی جماعت کے اجتماع کے سلسلے میں مغربی پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ ۲ اپریل ۱۹۶۵ء کو بروز جمعہ آپ کو قلب کا دورہ پڑا اور اسی دن آپ اپنے مالک حقیقی کے ہاں پہنچ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی وفات کے بعد ان کی قائم کردہ تبلیغی جماعت کے کام کو آپ نے بڑی خوبی سے جاری رکھا تھا اور آپ کی کوششوں سے اس میں کافی توسیع بھی ہوئی دہلی کی نظام الدین اولیاء کی چھوٹی سی بستی سے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی بابرکت ذات سے اشاعت اسلام کا جو چشمہ جاری ہوا تھا، مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی جانشینی کے دور میں اس کے حلقۂ فیضان کی حدیں بہت دور دور تک پھیل گئیں۔ اور اللہ کے دین کی اشاعت و تبلیغ کیلئے وقت نکال کر شہر شہر اور ملک ملک پھرنا ہمارے بہت سے سعادتمند نوجوانوں کا مطمح زندگی بن گیا۔ ہر قسم کی فرقہ وارانہ تنگ ذہنیت سے بلند ہو کر اسلام کی زبانی و عملی تبلیغ کا جو نظام مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اپنی زندگی میں قائم کیا تھا۔ ان کے مرحوم ومغفور صاحبزادے نے اسے اور وسعت واستحکام بخشا۔ اور ہزارہا ہزار ہا افراد اس سے متاثر ہوئے، یہ اسلام اور مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت ہے جو یقیناً رب العالمین کی بارگاہ میں مشکور ہوگی۔ اور مرحوم ومغفور کو اخروی نعمتوں سے نوازا جائے گا ہمیں امید ہے ان بزرگوں کے جاری کئے ہوئے کام کو اور آگے بڑھانے والوں کی کمی نہیں ہوگی اور خدا نے چاہا تو یہ چشمۂ فیض برابر جاری رہے گا۔ ۲ مسین

فقیر قادر بخش بیدل

جناب لطف اللہ بدوی

فقیر قادر بخش بیدل روہڑی سرزمین سندھ کے ان ممتاز بزرگوں میں سے ہیں، جن کا علم و عرفاں کی دنیا میں بہت بلند مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ معقولات اور منقولات ہر دو پر آپ کو بڑی دسترس حاصل تھی سندھ کے مردم خیز خطہ روہڑی میں آپ سال ۱۲۳۰ھ میں متولد ہوئے آپ کے والد بزرگوار فقیر محمد محسن بڑے دیندار اور متقی شخص گزرے ہیں۔ وہ قادری طریقے میں روہڑی کے ایک بزرگ سید جان اللہ شاہ ثانی عاشق سے بیعت تھے۔ موصوف سید جان اللہ شاہ اوّل "میر" کے اولاد میں سے تھے، جو شاہ عنایت اللہ شہید کے مقتدر خلفا میں سے تھے روایت ہے کہ فقیر قادر بخش بیدل کا ایک پاؤں پیدائش کے وقت کچھ مڑا ہوا تھا۔ شاہ جان اللہ ثانی کی خدمت میں جب باپ اپنے نوزائیدہ بیٹے کو دعا کے لئے لائے تو حضرت نے بچے کے پاؤں کو مڑا ہوا دیکھ کر سندھی میں فرمایا۔ هن کي ٻڌو نه چئو هي ر وهڙي جو جهنڊو ٿيندو۔
یعنی اس کو لنگڑا نہ کہو یہ روہڑی کا جھنڈا ہوگا۔ آخر سید صاحب کی دعا کام کر گئی۔ چنانچہ آگے چل کر یہ بچہ روہڑی کیلئے افتخار کا باعث بنا۔

صغیر سنی ہی میں فقیر قادر بخش بیدل نے قرآن پاک حفظ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں مختلف استادوں سے علوم متداولہ حاصل کرنے کے لئے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ تو آپ اپنے وطن مالوف میں درس دیتے رہے۔ لیکن فقیر قادر بخش بیدل اچانک سب چھوڑ چھاڑ کر حضرت شہباز قلندر کے مزار کی زیارت کے لئے سیہون چل پڑے اور وہاں کافی عرصہ معتکف رہے آپ کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس درگاہ عالی سے روحانی فیض حاصل ہوا۔ اور طریقہ اویسیت میں داخل

ہو گئے۔ سیون کے اقامت کے زمانے میں آپ نے شعر و شاعری کی طرف توجہ کی اور اپنے لئے بیدل تخلص اختیار کیا سب سے پہلے قلندر شہباز کی مدح لکھی۔ اس مدح سے آپ کے اولیسیت کے طریقہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

ولامت ڈر ز ہولِ روز محشر
پکڑلے دامنِ ابنِ پیمبر
شہے شاہانِ عرفاں دین پرور
قطب ارشاد عشاقوں کا رہبر
مرا مرشد مکمل ہے قلندر
حسینی حیدری سلطان سرور

سیون سے واپسی پر کچھ زمانہ تو آپ نے سیر و سیاحت میں گزارا بعد میں اپنے وطن روہڑی میں مستقل اقامت اختیار کرلی وہاں آپ تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے اور مکروہات دنیا سے قطع تعلق کرلیا۔ اگرچہ آپ کی زندگی میں ہی آپ کے علم و فضل کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی لیکن آپ نے اسے چنداں اہمیت نہ دی اور گوشہ نشینی ہی کو ترجیح دی اور ہمہ تن عبادت الٰہی میں مصروف رہے آپ نے ۱۲۸۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ آپ کی اکثر تصنیفات فارسی نظم و نثر میں ہیں۔ لیکن فارسی کے علاوہ عربی، سندھی، اردو، اور سرائیکی میں آپ کا کافی کلام موجود ہے۔ آپ کی تصنیفات کی مکمل فہرست حسب ذیل ہے۔

فارسی تصنیفات

سند الموحدین (نثر) تقویت القلوب فی تذکرۃ المحبوب (نثر) پنج گنج (نثر) انشائے قادری۔ قرۃ العینین فی مناقب السبطین (نثر) وصیت نامہ (نثر) لغت میزان طب فی بطن احادیث صحاح ستہ (نثر) دیوان منہاج الحقیقت (نظم)، دیوان سلوک الطالبین (نظم)، دیوان مصباح الطریقت (نظم)، مثنوی ریاض الفقر۔ مثنوی نہر البحر۔ مثنوی دلکشا۔ تواریخ رحلت ہائے رجال اللہ (نظم) ظہور نامہ در تصوف بہ نغمہ انا الحق (نظم) رموز القادری (شرح قصیدہ غوثیہ)، رموز العارفین (نظم) بہیر در انجویہ منتخب قصہ لیلیٰ و مجنوں۔ عقائد۔ خطبات جمعہ۔

عربی تصنیفات

فوائد المعنوی

اردو تصنیفات

دیوان بیدل و قطعات

سندھی و سرائکی تصنیفات

سرود نامہ (ابیات) کافیات و غزلیات

فقیر بیدل کثیر التصانیف تھے۔ آپ کی تصانیف کا زیادہ حصہ تصوف اور عقیدہ وحدت الوجود کے نظریات سے متعلق ہے۔ لیکن ان کی "مثنوی دلکش" میں کچھ اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔ یہ مثنوی ذکر الٰہی کے فوائد کے بیان میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کے عنوانات قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث سے لئے گئے ہیں گویا مصنف نے ان آیتوں اور احادیث کی تشریح اور توضیح کی ہے۔ چونکہ ذکر الٰہی تمام عبادتوں کا لب لباب ہے۔ اس لئے بیدل نے ایک علیحدہ تصنیف میں ذکر کی اہمیت کی وضاحت کی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ "جب لوگ بہشت میں داخل ہوں گے تو انہیں دنیا کی اس ساعت کے سوا جو خدا کے ذکر کے بغیر گزری ہے اور کسی بات کی حسرت نہ ہوگی" بیدل اپنی مثنوی کی ابتدا اس شیریں حقیقت کے انکشاف سے کرتے ہیں:-

حمد محبوبی کہ ذکرش دلکش است　　باعث تفریح طبع جانفزا ست
جانفزائے طالبان ذکر حق است　　خوش بگیر آن را کہ فیض مطلق است
فیض مطلق یاد مولےٰ آمدہ　　یادش از ہر کار اولےٰ آمدہ

اس مختصر سی تمہید کے بعد قرآن مجید کی ایک آیت یا ایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیرا سبحوہ بکرۃً واصیلا کو عنوان قرار دے کر اس کی تشریح پیش کرتے ہیں

آمدہ لاریب در مصحف مجید　　اذکروا ذکراً کثیراً بس پدید
پس پدید آمد کہ حق فرمان داد　　مومناں را گفت شما قوم رشاد
اذکروا اللہ ذکر بید بے شمار　　در غم و شادی نہاں و آشکار
پند این است از خدائے بے نظیر　　با خدا خو گیر و با خود خو مگیر

ذکر آکشیرا کی اس سے بہتر اور کیا تشریح ہو گی۔

حقائق الاخیار کے مصنف اسی حقیقت کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

ترا یک پند بس در ہر دو عالم — کہ بر نآید ز جانت بے خدا دم
اگر تو پاس داری پاس انفاس — بسلطانی رسی آخر ازیں پاس

ذکر کی اہمیت کے بعد قرآن حکیم کی آیت واذکر ربک فی نفسک تضرعاً وخیفۃً ودون الجھر بالغدو والاصال ولا تکن من الغافلین کو عنوان بنا کر اس کی تشریح کی ہے۔ اس تشریح میں بتایا گیا ہے کہ ذکر کس طرح احسن ہے اور اس سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

ذکر کن پروردگار خویش را — مرہم کافور بر نہ ریش را
نسخہ این مرہم مجرب آمدہ — صد ہزاراں ریش تازاں بہ شدہ
ذکر خفیہ مرہم این ریش شد — ہر کہ با خود بود زو بے خویش شد

اکثر بزرگوں نے ذکر کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ لسانی اور قلبی، لسانی اور قلبی میں یہ اہم تفاوت ہے۔ کہ جہاں لسانی عوام کا ذکر ہے وہاں قلبی خواص کا ذکر ہے جس کو فقیر بیدلؔ ذکر خفی سے یاد کرتے ہیں قرآن حکیم کا ارشاد بھی ذکر خفی کے لئے ہے نہ کہ ذکر جلی کے لئے۔ ذکر خفی کے ساتھ تضرع وزاری بھی ہونی چاہیئے۔ بیدل خشیت الہی کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں۔

این تضرع چیست فکر نفی تن — خطرۂ ایجاد را برہم زدن
صرف کن انفاس خود در ذکر ھُو — با تضرع خفیہ اے مردانہ خو
لا برائے نفی این ہستی تست — نفی ہستی لا بعد ستی تست
چوں شوی سرمست زین جام خفی — بر دولت پیدا شود کام خفی
ز مہر پر فکر را خورشید ذکر
جنبشی بخشد شوی اصحاب ذکر

فقیر بیدل اس ذکر کو جس میں تضرع وزاری ہے، فکر تن کے لئے نفی کے مترادف سمجھتے ہیں حقیقت میں ذکر سے قلب میں خشیت الہی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ نفسانی خواہش صاحب ذکر سے

آہستہ آہستہ ہٹ جاتی ہیں تن پروری کی ہوس معدوم ہو جاتی ہے اور مرد مومن کو یہی ایک خصوصیت برتر اور بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ علامہ اقبال اس حقیقت کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

در جہاں آغاز کار از حرف لاست — ایں نخستیں منزل مرد خداست

ملتے کز سوز او یک دم تپید — از گل خود خویش را باز آفرید

فقیہ بیدل علامہ اقبال سے آگے چل کر یوں ہمنوا ہو جاتے ہیں۔

ذکر را با فکر ہر کو کرد جفت — گرد خطرات از حریم دل برفت

ذکر جاروب حریم سینہ است — دفع ساز گرد جہل و کینہ است

اس باب کے بعد تیسرا باب ارشاد الٰہی و من اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا و نحشرہ یوم القیامة اعمیٰ" سے شروع ہوتا ہے۔ من اعرض کی تشریح جناب بیدل نے بڑے حکیمانہ اور عالمانہ انداز میں کی ہے اور اس اعراض سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ پر از نصائح بھی ہیں اور دانشمندانہ بھی۔ فرماتے ہیں۔

گفت حق ہر کس کہ اعراض آورد — یعنی از ذکرم تمتع کم برد

تنگ گردد بہر او راہ معاش — در غم و اندوہ باشد ابتلاش

ایں معیشت را دو معنی ظاہر ست — بطن قرآں پیش عارف باہر ست

معنی لفظ معیشت شد معاش — ایں معاش آمد ز تیغ عقل فاش

لیک پیش عارفاں ذوق دل ست — ویں تنعم ذاکراں را حاصل ست

شاغل ذکر است صاحب ذوق دل — روح او با قرب حق شد متصل

اتصالی یافت جزئے او بکل — رونقش گردید در بو خویش گل

ذکر کن انفاس خود ضائع مساز — رو مگرداں زیں چنیں ناز و نیاز

ایں وجود تست اندک چیز کے — ہیچ پیشت شوکت کاوس و کے

دہ زدست ایں کار آں در کف بیار — تا عوض یک دی بہ بینی صد بہار

یہی حقیقت خواجہ شمس تبریزی نے اپنی مشہور تصنیف مرغوب القلوب میں قلمبند فرمائی ہے۔

اگر دنیا و عقبیٰ پیش آید — نظر کردن در آں ہرگز نشاید

چو گردد جان معطل از غیر حق پاک   رسد در عالم لاہوت بیباک
درآں منزل چہارم جست جو ئی   نباشد با خطا جو گفتگو ئی
مقام قرب منزل بے نشان است   بجز کون و مکاں دیگر جہان است

اس باب کے بعد جو عنوانات آتے ہیں وہ احادیث سے ماخوذ ہیں اول یہ حدیث بطور عنوان دی گئی ہے۔

عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل الذی یذکر ربہ والذی لا یذکر ربہٗ کمثل الحی والمیت (متفق علیہ) اس عنوان کے تحت فرماتے ہیں:۔

گفت آں سلطان ملک بے نشاں   رونق افزا تخت گاہ لامکاں
تاج فرق انبیاء و مرسلیں   پیشوائے اولیائے اہل دیں
شاہباز آشیان کبریا   سجدہ گاہ جان جملہ اصفیا
خاتم پیغمبراں شاہ رسل   ہادیٔ سبل حقیقت بے بدل
ہر کہ در ذکر خدا شاغل بود   غوطہ زن آں بحر بی ساحل بود
زندہ ماند با حیات طیبہ   متصف با وصف سبحانی یکہ
آنکہ از ذکرست غافل جان او   دور ماند از رتبہ عرفان او
گوئیا او مردہ ہست و بے خبر   از مدارج عالم جاں چوں حجر

حضرت فقیر بیدل کے تخیل کی بلند پروازی اپنی جگہ پر ہے لیکن واقعہ ہے کہ ان اشعار کی فصاحت اور جزالت نے مصنف کو سندھ کے فارسی گو شعراء کے صف اولیں میں لا کھڑا کیا ہے۔ نظم کی روانی دیکھنے کے قابل ہے۔ تصنیف میں جہاں سنجیدہ اور متین مقام آتے ہیں وہاں زیادہ عذوبت اور شیرینی نظر آتی ہے۔ اس حلاوت سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس باب سے کچھ زیادہ اشعار پیش کر رہا ہوں

ذاکری حی ہاست غافل میت است   مردہ شد کو جاہل او را میت است
ذکر مولیٰ باعث دل زندگی ست   مایۂ آزادی و فرخندگی ست
ترک ذکر آمد وبال جانہا   بل کسوف مہر ایمانہا
ترک ذکر آمد کسوف نور دل   انہدام خانہ معمور دل

ترک ذکر آمد بمعنی سیخ جاں　　کھوئی باطن فسزائند بیگاں
ذکر کن پیوستہ اے مرد خدا　　تا نمانی از حیات جاں جدا

اسی طرح احادیث نبوی کے عنوانات کے تحت تین مزید بابوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ترمذی کی اس حدیث

عن انس رضی اللہ تعالٰی عنہ قال قال رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اذا مررتم بریاض الجنۃ فارتعوا
قالوا و ما ریاض الجنۃ قال حلق الذکر۔

کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

گوش دارے مومن والا نژاد　　منطق مصدوق سلطان رشاد
خسروے ملک رسالت شاہ جہاں　　سید فرماں شما را مومناں
چوں گذر آرید بر باغ بہشت　　وا چریدا ندی بدیں ہمی سرشت
عرض کردند آں صحابہ با ادب　　درحضور حضرت محبوب رب
کاے کلامت کلام کردگار　　دمعل ما از جہالت صد ہزار
باد گو تاویل گلزار جناں　　غنچۂ دل را چو گل زو شگفتاں
در جواب آں عنادل خوش لقا　　غنچہ لب را کشاد آں دلکشا
گفت اے یاراں مراد از بوستاں　　حلقۂ ذکر است مرتع دوستاں
حلقہ ہائے ذکر بتا ہائے خلد　　سید آرام چوں جائے خلد

احادیث نبوی کے بعد حضرت فقیر بیدل مولانا رومی کی مثنوی سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کے مندرجہ ذیل اشعار کو اپنی بصیرت افروز مثنوی میں بطور عنوان پیش کرتے ہیں:۔

قال العارف رومی قدس سرہٗ العزیز

ذکر اللہ شاہ ما دستور داد　　دید اندر نار ما را نور داد
ایں قبول ذکر تو از رحمت است　　چوں نماز مستحاضہ رحمت است

با نماز او بیالودہ است خوں
ذکر تو آلودہ تشبیہ و چوں

رومی کے ارشاد کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں۔

عارف رومی سراج العارفین — ذکر را فرمود تحریص ہمین

گفت دستورے بادہ نور الجلال — بندگان خویش را بہر کمال

اذکروا اللہ با صیاں فرمان داد — گنج رحمت در میان ما نہاد

داد دستورے کہ تا یادش کنیم — آب رحمت حق برین آتش زنیم

نار نفس را کہ آن حرص و ہواست — نور حق بنشاند اے جویندہ راست

ذکر نور آمد بزن بر نار خود — تا شوی آگاہ از اسرار خود

آں نماز مستحاضہ چوں رواست — ذکر ملولی بخطرہ کے رواست

ترک ذکر آمد خطا ہشیار باش — خواب غفلت تا بکے بیدار باش

آں نمازے او بخوں آلودہ است — ذکر و فکرت ہم بر چوں آلودہ است

مستعد نا مستعد کن ذکر حق — تا بتو رحمت کند رب الفلق

مستعد نا مستعد در ذکر کوش — تا ز خواب غفلت آرندت بہوش

مستعد نا مستعد در ذکر باش
جہد کن غافل مباش اے خواجہ تاش

یہاں فکر اور تخیل کا ایک دریائے موجزن نظر آتا ہے حرف اور صوت کی صورت میں نور الٰہی کی کاغذ پر بارش ہو رہی ہے۔ سندھ کے اس عظیم مفکر سے کتنی بے اعتنائی برتی گئی ہے وقت آگیا ہے کہ ہم اس غلطی کی تلافی کریں اور اس فراموش شدہ شخصیت کی یاد کو تازہ کریں۔ "مثنوی دلکشا" میں جہاں رومی اور حافظ کے کلام سے استفادہ کیا گیا ہے، وہاں حضرت فقیر بیدل نے سندھ کے زندہ جاوید مفکر اور شاعر عبداللطیف بھٹائی کے کلام کی بھی تشریح کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

قال سلطان العاشقین حضرت شاہ بھٹائی قدس سرہٗ

سڈن مٿي سڈ ڙا مد مين رلاھ

مان ڪا ڪوڪ سنداہ ڪو هيائي عن پوي

(ترجمہ) دے صداؤں پر صدا شاید کہ نیر آسماں — دوست کے کانوں سے گزرے تیرے بیدآہ و فغاں

آں سر آمد عارفان و شاہ عشق — رہبر عشاق حق در راہ عشق

موجہائے منطقش دریائے راز — بیت بیتش ساغر صہبائے ناز

بیت اونے بیت بل اقلیم وجد — مومن توحید را تسلیم و جد

حرف حرفش سربسر سوز و گداز — لفظ لفظش در حقیقت خوش مجاز

گر تو آری بر زباں اسم شریف — عہد را گرداں معانی پر لطیف

شاہ شاہاں صدر آرائے الست — بہر فرط شوق ما فرمودہ است

گاہ طلبگار وصال لایزال — گاہ بیگہ از تشوق دل نہال

دمبدم میخواں بجاں محبوب را — با ہزاراں رغبت آں مرغوب را

ہست در تنزیل ادعو ربکمُ — از صدا و ادن مشو کم محترم

ہر نفس می نال کیں نالیدنی — روح را بخشد زہی بالیدنی

نالہائے تو نہ شد رائیگاں — عاقبت افتد بگوش دلستاں

نالۂ مضطر قبول دلبر است — شاہدش آمد یجیب المضطر است

نالہائے ذکر جانِ دردمند
حق تعالیٰ را ہمی آید پسند

کیا آیہ شریفہ امن یجیب المضطر اذا دعاہ کی اس سے زیادہ عارفانہ تفسیر ہو سکتی ہے سندھ کا یہ خوش نوا مفکر اور شاعر فراموش کئے جانے کے لائق نہیں قدرت نے جو علم اور فضل کا تاج اس کے سر پر رکھا ہے وہ غیر فانی ہے اور ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ کاش ہم اس سے استفادہ کر سکیں۔

شاہ ولی اللہ کے فقہی رجحانات المسوی اور المصفیٰ کی روشنی میں

مولانا محمد مظہر بقا، ایم اے فاضل دیوبند استاد شعبۂ معارف اسلامیہ کراچی یونیورسٹی کراچی

امت میں ایسے عظیم اشخاص کی کمی نہیں جن کے بعد آنے والے مختلف المسلک لوگوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق انہیں اپنا ہم مسلک سمجھا ہے۔ مثلاً امام ابو حنیفہؒ کہ معتزلہ نے انہیں معتزلی سمجھا، مرجیہ نے مرجی، سنیوں نے اہل سنت اور بعض دوسرے اصحاب فکر نے اپنا بیا۔

شاہ ولی اللہ تفہیمات میں فرماتے ہیں :۔

والامام ابو حنیفۃ .... ھو من کبار اھل السنۃ و ائمتھم، لغم نشأ فی اھل مذھبہ والتابعین لہ فی الفروع اٰراء مختلفۃ فمنھم المعتزلۃ کالجبائی وابی ھاشم والزمخشری ومنھم المرجئۃ ومنھم غیرذالک فھؤلاء کانوا یتبعون ابا حنیفۃ فی الفروع

اور امام ابو حنیفہ ...... یہ اہل سنت اور ائمہ اہل سنت کے بڑے لوگوں میں سے ہیں البتہ ان کے اہل مذہب اور ان کے متبعین کی رائیں فروع میں مختلف ہوگئیں ان میں سے بعض معتزلہ ہیں مثلاً جبائی اور ابو ہاشم اور زمخشری بعض مرجیہ ہیں اور بعض ان کے علاوہ یہ لوگ فروع فقیہہ میں ابو حنیفہ کی اتباع کرتے تھے۔

لہ محترم مولانا محمد مظہر بقا صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ کی عبارتوں سے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کے بارے میں مزید گفتگو کی گنجائش ہے چنانچہ مولانا موصوف کے پورے مضمون کی اشاعت کے بعد اس ضمن میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ قاسمی

الفقہیۃ معانوا ینسبون عقائدھم الباطلۃ الی ابی حنیفۃ رضی اللہ عنہ ترویجا لمذھبہم۔	اور اپنے باطل عقائد کو ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے تھے تاکہ اپنے مذہب کو رواج دے سکیں۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ کی عظمت کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ ان کے بعد آنے والے مختلف فرقوں نے اختلاف مسالک کے باوجود انہیں اپنا ہم مسلک سمجھا ہے۔

شاہ صاحب کے فقہی مسلک کے بارے میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔

۱۔ بعض لوگ انہیں مجتہد مانتے ہیں اور مجتہد خود صاحب مسلک ہوتا ہے، کسی دوسرے امام کے مسلک کا پابند نہیں ہوتا۔

۲۔ بعض انہیں مقلد مانتے ہیں۔ اور چونکہ برصغیر کے علماء اور عوام کی اکثریت حنفی مسلک کی پابند رہی ہے۔ اس لئے یہاں کے جو لوگ انہیں مقلد مانتے ہیں، وہ انہیں حنفی ثابت کرتے ہیں۔

۳۔ بعض لوگ غیر مقلد مانتے ہیں یا بالفاظ دیگر اہل حدیث۔

ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نجست اسرار من

شاہ صاحبؒ کے فقہی مسلک کے بارے میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے اس کے متعدد اسباب ہیں:۔

(۱) تناقض: (الف) شاہ صاحب نے خود اپنے بارے میں ایسی تصریحات کی ہیں جو بظاہر باہم متناقض ہیں۔ مثلاً ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

و بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ واصول فقہ ایشاں و احادیثے کہ متمسک ایشاں است، قرار داد خاطر بمدد نور غیبی روش محدثین افتاد۔[1]	مذہب اربعہ اوران کے اصول فقہ کی کتابوں اور ان احادیث کو دیکھ کر جن سے ان مذاہب میں استدلال کیا گیا ہے، غیبی نور کی مدد سے میرا دل فقہائے محدثین کی روش پر مطمئن ہوا۔

---

[1] الجزء اللطیف مشمولہ انفاس العارفین ص۱۹۵ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی۔

اس سے غیر مقلد حضرات یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ شاہ صاحب انہی کی طرح غیر مقلد اور اہل حدیث تھے۔ اس کے برخلاف دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

استفدت منہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثۃ امور خلاف ما کان عندی وما کانت طبیعتی تمیل الیہ کل میل فصارت ھذہ الاستفادۃ من براھین الحق تعالیٰ علی احدھا ...... وثانیھا الوصاۃ بالتقلید بھذہ المذاھب الاربعۃ لا اخرج منھا والتوفیق ما استطعت وجبلتی تابی التقلید وتأنف منہ راسا ولکن شئی طلب منی التعبد بہ بخلاف نفسی[1]

جو کچھ میرے نزدیک تھا اور میری طبیعت جس طرف پورے طور پر مائل تھی، اس کے برخلاف میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین امور کا اس طرح استفادہ کیا کہ یہ استفادہ میرے لئے حق تعالیٰ کی ایک برہان بن گیا۔ ایک یہ .... دوسرے ان چاروں مذاہب کی تقلید کی وصیت کہ میں ان سے نہ نکلوں اور بقدر امکان ان میں باہم توفیق دوں۔ حالانکہ میری طبیعت تقلید کی منکر اور اس سے قطعاً بیزار تھی۔ لیکن میری طبیعت کے خلاف مجھ سے اسی چیز کی اطاعت طلب کی گئی۔

اس سے مقلد حضرات یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ شاہ صاحب مقلد تھے۔ لیکن ساتھ ہی اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا اصل رجحان عدم تقلید کی طرف تھا۔

بلاشبہ یہ دونوں تصریحات باہم متناقض ہیں اور سطحی نظر سے کام لینے والوں کے لئے یہ تناقض اس کا موقع فراہم کرتا ہے کہ ایک گروہ ایک تصریح کو اصل بنا کر شاہ صاحب کو غیر مقلد کہہ دے اور دوسرا گروہ دوسری تصریح کو اصل ٹھیرا کر انہیں مقلد کہہ دے۔

ان دونوں تصریحات کا تناقض تو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب نے الجزء اللطیف میں اپنے جس رجحان کو ظاہر فرمایا ہے وہ سفر حرمین سے پہلے کا رجحان ہے۔ اپنے والد کے

---

[1] فیوض الحرمین ص۶۴، ۶۵ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی۔

انتقال کے بعد شاہ صاحب تقریباً بارہ سال تک مدرسہ رحیمیہ میں درس دیتے رہے ہیں بارہ سالہ تدریس اور مطالعہ کے نتیجے میں وہ فقہائے محدثین کی روش پر مطمئن ہوئے اور اس کے بعد حرمین تشریف لے گئے چنانچہ الجزء اللطیف ہی میں تحریر فرماتے ہیں :-

"بعد از وفات حضرت ایشاں دوازدہ سال کما بیش بدرس کتب دینیہ و عقلیہ مواظبت نمود در ہر علمے خوض واقع شد و توجہ بر قبر مبارک پیش گرفت و دراں ایام فتح توحید و کشادہ راہ جذب و جانبے عظیم از سلوک میسر آمد و علوم وجدانیہ فوج فوج نازل شدند و بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ .... قرار داد خاطر بسد و نورِ غیبی روش فقہائے محدثین افتاد و بعد ازاں دوازدہ سال شوق زیارت حرمین در سر افتاد و در آخر سنہ ثلث و اربعین بحج مشرف شد ۱۱۴۳ھ"

حضرت (والد) کی وفات کے بعد میں کم و بیش بارہ سال تک مسلسل دینی اور عقلی کتابیں پڑھاتا رہا۔ ہر علم میں خوض رہا اور قبر مبارک پر توجہ بھی جاری رہی۔ ان ایام میں توحید اور جذب کی راہ کشادہ ہوئی اور سلوک کا بڑا حصہ میسر آیا اور وجدانی علوم فوج در فوج نازل ہوئے اور چاروں مذاہب کی کتابیں دیکھنے کے بعد ....
غیبی نور کی مدد سے میرا دل فقہائے محدثین کی روش پر مطمئن ہوا۔ ان بارہ سال کے بعد سر میں زیارت حرمین کا شوق سمایا اور ۱۱۴۳ھ (۱۱۴۳ھ) میں حج سے مشرف ہوا۔[1]

اور فیوض الحرمین یقیناً سفر حرمین کے بعد کی تصنیف ہے۔ گویا شاہ صاحب اپنے عدم تقلید کے رجحان کو ترک کر کے تقلید کی طرف سفر حرمین کے بعد آئے ہیں۔

ان دونوں تصریحات کا تناقض تو اس طرح ختم ہو جاتا ہے، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ شاہ صاحب وصیت نامہ میں جو یقیناً فیوض الحرمین کے بعد کی تصنیف ہے اپنی اولاد اور احباب کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"در فروع پیروی علمائے محدثین کہ جامع باشند میان فقہ و حدیث کردن

---

[1] مشمولہ انفاس ص۱۹۵

ودائماً تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن آنچہ موافق باشد درحیز قبول آوردن والاکالائے بدبریش خاوند دادن۔ امت را ہیچ وقت عرض مجتہدات بر کتاب وسنت استغنا نیست وسخن متقشفۂ فقہار کہ تقلید عالمی رادست آویز ساختہ تتبعت سنت را ترک کردہ اند نشنیدن وبہ ایشان التفات نکردن، قربت خداجستن بدوری ایشان [1]

اور فروع میں ایسے علمائے محدثین کی پیروی کرنا جو فقہ اور حدیث دونوں کے جامع ہوں، اور فقہی تفریعات کو ہمیشہ کتاب وسنت پر پیش کرتے رہنا جو موافق ہو اسے قبول کرنا، ورنہ بُرے سودے کو خاوند کی داڑھی پر ماردینا امت کسی وقت بھی اس سے بے نیاز نہیں کہ مجتہدات کو کتاب وسنت پر پیش کرتی رہے! اور ان متقشف فقہار کی بات نہ سننا جنہوں نے ایک عالم کی تقلید کو اختیار کرکے اتباع سنت کو ترک کردیا ہے، اور ان کی طرف التفات نہ کرنا اور ان سے دور رہ کر اللہ کا قرب تلاش کرنا۔

اسی طرح وصیت نامہ میں دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

چارۂ کار آنکہ کتب حدیث مثل صحیح بخاری وسلم وسنن ابی داؤد وترمذی وکتب فقہ حنفیہ وشافعیہ رانجواند وعمل بر ظاہر سنت پیش گیرد [2]

چارۂ کار یہ ہے کہ کتب حدیث مثل صحیح بخاری ومسلم وسنن ابوداؤد وترمذی اور احناف وشوافع کی کتب فقہ پڑھے اور ظاہر سنت پر عمل کرے۔

اس سے غیر مقلد حضرات پھر بجا طور پر یہ استدلال کرسکتے ہیں کہ شاہ صاحب نے سفر حرمین سے قبل فقہائے محدثین کی جو روش اختیار کی تھی، جب اسی روش کی وصیت انہوں نے اپنی اولاد اور احباب کو بھی فرمائی اور ظاہر سنت پر عمل کرنے کی تلقین کی تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب ابتدار

---

[1] وصیت نامہ وصیت اول ص۲،۳ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی ۱۸۹۹ء

[2] وصیت سوم ص۵

سے انتہا تک ایک ہی روش پر قائم رہے۔ اور وہ روش عدم تقلید کی روش تھی۔

اس لئے عام طور پر جو یہ خیال پایا جاتا ہے کہ شاہ صاحب کے خیالات میں انقلاب اس وقت آیا ہے جب انہوں نے سفر حرمین کیا، اور انہیں شیخ کردی کا تلمذ حاصل ہوا، اس نظریہ پر از سر نو غور کرنیکی ضرورت ہے۔

(ب) ایک جگہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

عرفنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان فی المذهب الحنفی طریقة انیقة هی اوفق الطرق بالسنة المعروفة التی جمعت و نقحت فی زمان البخاری واصحابه وذالك ان یوخذ من اقوال الثلاثة قول اقربهم بها فی المسألة ثم بعد ذالك یتبع اختیارات الفقها الحنفیین الذین کانوا من علماء الحدیث فرب شئی سکت عنه الثلاثة فی الاصول وما تعرضوا لنفیه ودلت الاحادیث علیه فلیس بد من اثباته والکل مذهب حنفی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ حنفی مذہب میں ایک پسندیدہ طریقہ ہے اور یہ طریقہ اس معروف سنت کے بہت موافق ہے جس کی جمع و تنقیح بخاری اور اصحاب بخاری کے زمانہ میں ہوئی ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد) کے اقوال میں سے اس قول کو لیا جائے جو اس مسئلہ میں سنت کے سب سے زیادہ قریب ہو۔ اس کے بعد ان حنفی فقہاء کے اختیارات کا تتبع کیا جائے جو علمائے حدیث بھی ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ ائمہ ثلاثہ نے اصول میں ان سے سکوت برتا اور ان کی نفی بھی نہیں کی اور احادیث نے انہیں ثابت کر دیا۔ ایسی صورت میں ان کے اثبات کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہ سب مذہب حنفی ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

وایاك ان تخالف القوم فی الفروع فانه مناقضة لمراد الحق ثم کشف

خبردار! فروع میں قوم کی مخالفت نہ کرنا اس لئے کہ یہ مراد حق کے منافی ہے پھر

انوذجا ظهر لی منہ کیفیۃ تطبیق السنۃ بفقہ الحنفیۃ من الاخذ بقول احد الثلاثۃ۔ وتخصیص عموماتھم والوقوف علی مقاصدھم والاقتصار علی ما یفھم من لفظ السنۃ ولیس فیہ تاویل بعید ولاضرب بعض الاحادیث بعضاً ولا نقضا لحدیث صحیح بقول احد من الامۃ وھذہ الطریقۃ ان اتمھا اللہ واکملھا فھی الکبریت الاحمر والاکسیر الاعظم[1]

ایک نمونہ منکشف ہوا جس سے حنفی کو فقہ کو سنت کے مطابق کرنے کی یہ صورت معلوم ہوئی کہ ائمہ ثلاثہ میں سے کسی ایک کے قول کو اختیار کیا جائے، ان کے عمومات کی تخصیص کی جائے۔ ان کے مقاصد سے واقفیت حاصل کی جائے۔ اور سنت کے الفاظ سے جو مفہوم ہوتا ہے اس پر اقتصار کیا جائے۔ اس میں نہ تاویل بعید ہو نہ بعض احادیث کو بعض سے ٹکرانے کی نوبت آئے اور نہ کسی صحیح حدیث کو امت کے کسی فرد کے قول کے مقابلہ میں ترک کرنا پڑے اگر اللہ اس طریقہ کو پورا فرمادے تو یہ سرخ گندھک اور اکسیر اعظم ہے۔

اس سے وہ حضرات جو امام ابوحنیفہ کے مقلد ہیں، بجا طور پر یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ شاہ صاحب حنفی تھے۔

بہر حال شاہ صاحب کے کلام میں اگرچہ چند مقامات پر رفع تناقض کی صورت نکال بھی لی جائے، تب بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ متعدد مقامات پر یہ "تناقض اس طرح موجود ہے کہ اس کا حل کرنا آسان نہیں۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جو نہ صرف شاہ صاحب کی تحریروں سے سامنے آتی ہے بلکہ شاہ صاحب نے دوسرے طرز پر ایک جگہ خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

وھیھات ھذہ التناقضات منی لولا مجھ میں یہ افسوس ناک متناقض باتیں نہ پائی

---

[1] فیوض الحرمین صـ۶۳

ان شدة الجامعیة هی التی اوقعتنی فی ذالك [1]	جاتیں، اگر شدت جامعیت ہی نے مجھے اس میں نہ ڈالا ہوتا۔

اس موقع پر مناقضات سے شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ طبیعت تو تحصیل اسباب، عدم تقلید اور تفضیل علیؓ کی جانب مائل تھی لیکن حضورؐ نے ترک اسباب، تقلید اور تفضیل شیخین کا حکم فرمادیا۔

اپنی باتوں میں تناقض کے اس اقرار کے باوجود اسی موقع پر اس سے ذرا پہلے یہ بھی فرمادیا کہ:۔

واکثر ما فی من الامور لا مناقضة بینها [2]	مجھ میں جو باتیں ہیں ان میں سے بیشتر میں کوئی تناقض نہیں۔

بہرحال شاہ صاحب کی پوری تصانیف پر جس شخص کی نظر ہو اسے ان کے کلام میں تناقض کی ایک دو نہیں، متعدد مثالیں بڑی آسانی سے مل جائیگی۔

(۲) **تصوف** - شاہ صاحب کی پوری زندگی، ان کے علوم اور خصوصاً ان کے فقہی مسلک پر روحانیت اور تصوف کی حکمرانی ہے[3] اور صوفی کا مسلک صلح کل مسلک ہوتا ہے۔ اسی مسلک کی تعبیر ان الفاظ میں بھی کی جاتی ہے کہ الصوفی لا مذھب لہٗ - یعنی صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

شاہ صاحب کے کلام میں اگر یہ صورت پائی جاتی ہے کہ کبھی وہ فقہائے محدثین کیجانب مائل نظر آتے ہیں، کبھی شافعیت کی طرف، کبھی حنفیت کی طرف اور کبھی کسی اور امام کی طرف تو قرین قیاس ہے کہ اس صورت حال میں انکے اس مسلک تصوف اور ان کے صوفیانہ مزاج کا بھی دخل ہے۔

---

[1] فیوض الحرمین ص۶۵

[2] " " ص۶۴

[3] فیوض الحرمین ص۶۴ - ۶۵ کے مذکورہ اقتباس استفدت منہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

۲۴- **مجددیت** - جو شخص بھی شاہ صاحب کی تعلیمات، ان کی اصلاحات اور ان کے کارناموں سے واقف ہے وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے وقت کے مجدد تھے اور منصب تجدید کے فرائض کو کامیاب طریقے پر انجام دینے کے لئے جامعیت کی روش بہترین روش ہے۔ لیکن جامعیت کا یہ نتیجہ بالکل قدرتی ہے کہ بعد کے آنیوالے ان کے بارے میں مختلف الرائے ہو جائیں۔

شاہ صاحب واقعتہً ہیں کیا؟ اس حقیقت کا سراغ لگانے کے لئے میں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور جب ان کی دو کتابوں "المسوّیٰ" اور "المصفیٰ" تک پہنچا تو ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کے دوران میں نے یہ جستجو کی کہ مختلف فیہ مسائل میں شاہ صاحب کا رجحان کس طرف ہے۔ چنانچہ ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد جو حقیقت میرے سامنے آئی ہے، چاہتا ہوں کہ اس کا وہ حصہ بعینہٖ اہل علم کے سامنے رکھدوں جو شاہ صاحب سے بحیثیت مقلد متعلق ہے۔ تاکہ خصوصیت کیساتھ وہ حضرات جو شاہ صاحب کو مقلد مانتے ہیں خود کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں کہ شاہ صاحب اگر مقلد تھے تو کس امام کے۔

المسوّیٰ　　اور　　المصفیٰ

یہ دونوں کتابیں موطاء امام مالک کی دو شرحیں ہیں۔ المسوّیٰ عربی میں ہے اور نسبتہً مختصر اور المصفیٰ فارسی میں ہے اور نسبتہً مفصل۔

امام مالک نے الموطاء میں احادیث کے عنوانات مقرر کئے ہیں لیکن انہیں ابواب یا تراجم ابواب کا نام نہیں دیا[1] شاہ صاحب نے اپنی دونوں کتابوں میں ابواب بھی قائم کئے اور تراجم ابواب بھی لکھے۔ (مسلسل)

---

[1] موطاء کے مصر و ہند کے مطبوعہ متعدد نسخوں میں یہی صورت ہے۔ موطاء کا نسخہ، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی، جو میرے پیش نظر ہے، اسمیں صفحہ ۳۸۰ پر صرف ایک جگہ لفظ باب لکھا ہوا ہے۔ وہ ہے "باب فی الاستیذان" زرقانی شرح موطا مطبوعہ مصر میں وقوت الصلوٰۃ کے عنوان کو جس سے موطا شروع ہوتی ہے (باقی حاشیہ صـ ۲۴)

(بقیہ حاشیہ) "باب وقت الصلوۃ" لکھا گیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ موطا کا زمانہ تصنیف چونکہ تدوین کتب کے شیوع سے پہلے کا زمانہ ہے اسی لئے بعد کے مصنفین نے جب کہ تدوین کتب کا عام رواج ہو چکا تھا، اپنی تصنیفات میں کتب والابواب وفصول کا جو اہتمام کیا ہے، امام مالک نے نہیں کیا۔ لیکن ایک موضوع سے متعلق احادیث کو دوسرے موضوع سے متعلق احادیث سے ممتاز کرنے کے لئے انہوں نے جدا جدا عنوانات مقرر کر دیئے اور ابواب کا مقصد بھی چونکہ یہی ہوتا ہے، اس لئے انہیں خواہ عنوانات سے تعبیر کریں یا ابواب سے، بات ایک ہی ہے۔

یہ عنوانات جس طرح ابواب کے منشاء کو پورا کرتے ہیں، تراجم ابواب کے منشاء کو بھی پورا کرتے ہیں۔ باب اور ترجمۃ الباب میں جو فرق ہے اسے مثال کے ذریعہ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ امام بخاری نے کتاب الایمان میں ایک باب باندھا ہے۔

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس وھو قول وفعل ویزید وینقص" اس میں لفظ باب کا مصداق صرف یہی سہ حرفی لفظ ہے جو ب ا ب سے مرکب ہے اور اس کے بعد قول النبیؐ سے آخر تک جو کچھ ہے وہ اصطلاحاً ترجمۃ الباب کہلاتا ہے۔

لفظ باب کے بعد جو عبارت لکھی جاتی ہے یہ ضروری نہیں کہ پوری عبارت ایک ترجمۃ الباب بنے بلکہ بعض اوقات اس میں کئی کئی تراجم ابواب ہوتے ہیں۔ مثلاً امام بخاری کے مذکورہ ترجمۃ الباب کی عبارت کہ دراصل یہ تین تراجم ابواب پر مشتمل (جیسا کہ شیخ الہند نے الابواب والتراجم مطبوعہ مطبع الامان نگینہ کے ص۲۷ پر لکھا ہے) قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس۔ (۲) وھو قول وفعل (۳) ویزید وینقص

حاصل یہ ہے کہ امام مالک نے موطا میں اگرچہ ہر جگہ لفظ باب نہیں لکھا اور نہ ان عنوانات کو ترجمۃ الباب کا اصطلاحی نام دیا لیکن دراصل وہ ابواب بھی ہیں اور تراجم ابواب بھی

فیلسوف العرب - الکندی

طفیل احمد قریشی - ایم - اے

ابویوسف یعقوب الکندی کا تعلق جنوبی عرب کے کندہ قبیلے کے اس گھرانے سے ہے جس کے حصے میں ہمیشہ سرداری رہی۔ لوگ اس کے گھرانے کے افراد کو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اس کے جد امجد اشعث بن قیس کو صحابی رسول ہونے کا شرف بھی حاصل ہے[1]

القفطی اپنی کتاب "تاریخ الحکما" میں لکھتا ہے۔ اشعث قبیلہ کندہ کا حکمراں تھا۔ اور اس کا والد قیس بن معدی کرب بھی کندہ کے حکمراں رہ چکا تھا۔ اور یہ قیس وہی ہے، جس کی تعریف میں عرب جاہلی کے مشہور شاعر اعشیٰ نے چار لمبے لمبے قصیدے لکھے تھے[2]

الکندی کے والد اسحاق بن الصباح عباسی خلیفہ مہدی (۷۷۵ - ۸۵ء) اور ہارون الرشید (۷۸۶ - ۸۰۹ء) کے دور میں کوفہ کے گورنر رہے۔ الکندی اپنے والد کے دور ولایت میں کوفہ میں تقریباً ۱۸۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ جب ہوش سنبھالا تو اس نے اپنے گرد علمی و سیاسی مجالس کو برپا پایا۔ الکندی نے ابتدائی تعلیم کوفہ ہی میں پائی۔ ان دنوں بصرہ اور کوفہ صرفی و نحوی موشگافیوں اور معتزلی عقائد کی بحثوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ کوفہ کی علمی درس گاہوں سے فراغت کے بعد

---

[1] ڈاکٹر میر ولی الدین تاریخ فلاسفۃ الاسلام

[2] تاریخ الحکماء کا اردو ترجمہ حکمائے عالم ص۷۶

[3] محمد عبدالہادی مقدمہ رسائل الکندی الفلسفیۃ ص۲ قاہرہ ۱۳۶۹ھ - ۱۹۵۰ء

بصری مکاتب علم کی کشش اس وقت اسے بصرے لے گئی۔ جہاں اسے بصری علماء سے استفادہ کا موقع ملا۔لیکن اس وقت بغداد جہاں سیاسی لحاظ سے مرکز تھا وہاں اس نے علمی مرکز کی حیثیت بھی اختیار کرلی تھی۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب عباسی فرمانروا دنیا کے گوشہ گوشہ سے اہل علم کو بغداد میں جمع کر رہے تھے۔ مختلف فنون کی کتب بغداد میں لائی جارہی تھیں اور بغداد کی علمی مجالس مثالی بن گئی تھیں۔ تحقیق وجستجو کی تڑپ اور دوسری قوموں کے علوم کی حصول کی لگن نے الکندی کو بالآخر بغداد پہنچادیا

الکندی کو بغداد میں مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ یونانی اور ہندی فلسفہ اور دیگر علوم کے مطالعہ کا موقع ملا۔ افتادِ طبع متجسسانہ تھی ہی، جلد ہی اس کی پوشیدہ صلاحیتیں سب پر عیاں ہونے لگیں۔ اور علمی مجالس میں اس کی آواز بڑی توجہ سے سنی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ علماء کے حلقہ میں اس کا تبحرِ علمی مسلّم ہوگیا۔

دارالحکمت میں

المامون (۲۳۳-۸۱۳ء) نے الکندی کو دارالحکمۃ میں یونانی سائنس و فلسفہ کی کتب کے عربی مترجم کی حیثیت سے مقرر کیا یہ اس وقت بہت بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ دارالحکمۃ میں الکندی نے بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ جس کے نتیجہ میں معتصم کے دورِ حکومت میں اسے شہزادہ احمد کا اتالیق اور شاہی طبیب خاص مقرر کر دیا گیا۔ یہ اس کے عروج کا دور ہے۔ اس کے علمی کارناموں کی ایک طویل فہرست علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبّا میں بیان کی ہے۔ کچھ کتابوں کا ذکر قفطی نے اخبار الحکماء[1] میں بھی کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی کچھ کتب کے نام

---

[1] یہ کتاب "تاریخ الحکماء" اور "اخبار الحکماء" دونوں ناموں سے مشہور ہے قفطی نے کل ۲۲۶ کتابوں کے نام لکھے ہیں جو حسب ذیل موضوعات پر ہیں۔

کتب فلسفہ، کتب منطق، کتب حساب، کتب کریّہ، کتب موسیقی، کتب نجوم، کتب ہندسہ، فلکیات، کتب طب، احکامیات، کتب جدل، نفسیات، سیاسیات، احداثیات البعادیات، تقدمیات، انواعیات،

(حکمائے عالم اردو ترجمہ تاریخ الحکماء)

تو ہم تک پہنچے ہیں لیکن اصل کتب مفقود ہوگئیں۔ مختلف علوم میں اس کے تراجم و تصانیف کا ذکر ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں کیا ہے۔ جس کے مطابق ان کی تعداد دو سو اکتیس تک پہنچتی ہے۔ جن کی تفصیل وہ یوں بیان کرتا ہے۔

۱۔	فلسفہ	۲۲	۹۔	حساب	۱۱
۲۔	نجوم	۱۹	۱۰۔	ہندسہ	۲۳
۳۔	فلکیات	۱۶	۱۱۔	طب	۲۲
۴۔	جدل	۱۷	۱۲۔	سیاست	۱۲
۵۔	احداث	۱۴	۱۳۔	طبعیات	۳۳
۶۔	موسیقی	۷	۱۴۔	منطق	۹
۷۔	نفس	۵	۱۵۔	احکام	۱۰
۸	مبادی معرفت	۵	۱۶۔	العاد	۸
			۱۷۔	کریات	۸

الکندی کی جو کتب آج موجود ہیں، ان میں سب سے مشہور اس کے وہ رسائل ہیں جنہیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ ایک رسالہ فلسفہ اور اس کی تعریف و غایت کے بارے میں ہے ایک دوسرے رسالہ میں اس نے نفس سے بحث کی ہے۔ کچھ رسائل میں مادہ اور کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک رسالہ میں وہ انسانی عقل پر گفتگو کرتا ہے۔ کہیں الہیات اور وحدانیت کے سلسلہ میں مستقل باب ہیں۔ کہیں طبیعات پر گفتگو ہے۔ غرض تقریباً بائیس سائل پر مشتمل یہ مجموعہ الکندی کے علمی تبحر کا ایک نادر نمونہ ہے۔

معتصم کے بعد متوکل (۸۴۷ء۔ ۸۶۱ء) کے دور حکومت میں الکندی کو زوال آگیا۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل چونکہ ذاتی طور پر معتزلہ معتقدات کے خلاف تھا۔ اس لئے اسے الکندی کے معتزلانہ خیالات اچھے نہ لگے۔ اور اس طرح خلیفہ وقت کی بے التفاتی اس کے زوال کا سبب بنی۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں محمد اور احمد نے متوکل پر اپنا رنگ جما لیا تھا۔ اور وہ خلیفہ سے اس قدر قریب ہوگئے تھے کہ جس عالم کو وہ با اثر ہوتا دیکھتے

کہہ سنکر اسے اس کے منصب سے گروا دیتے۔

اس طرح ابین، مامون، معتصم، واثق اور متوکل کے ادوار سلطنت کو اپنی چشم حقیقت بین سے دیکھ کر دنیا کا یہ عظیم فلسفی تقریباً ۲۵۲ھ مطابق ۸۶۶ء کے لگ بھگ فوت ہوگیا۔[1]

ایک اور بیان کے مطابق دراصل متوکل ایک شکی مزاج حکمراں تھا۔ اس نے موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں کے کہنے میں آکر کندی کو دربار سے نکلوا دیا۔ اور اس کا سارا ساز و سامان جس میں علمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ ضبط کرلیا۔ بعد میں مسند بن علی کی سفارش پر یعقوب کندی کی کتابیں تو اسے مل گئیں لیکن دربار سے اس کا تعلق قائم نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۸۶۱ء میں متوکل قتل ہوگیا۔ متوکل کے قتل کے بعد یعقوب کندی قریباً بارہ سال زندہ رہا، لیکن ایک دفعہ دربار سے نکلنے کے بعد وہ درباری زندگی سے ایسا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے اپنی عمر کا باقی زمانہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف کے شغلے میں بسر کیا۔[2]

الکندی کا فلسفی مسلک

مسلمانوں کے ہاں شروع شروع میں یونانی فلسفہ سریانی تراجم اور ان کی شرحوں کے ذریعہ پہنچا۔ المامون کے عہد میں یونانی فلسفہ کی کتابوں کے براہ راست یونانی زبان سے ترجمے ہونے لگے اور اس طرح مسلمان اہل علم کا براہ راست یونانی فلسفہ سے تعارف ہوا۔ قدرتی بات تھی کہ اس کا مسلمان ذہن و فکر پر اثر پڑتا۔ چنانچہ اس کے ردّ عمل کے طور پر مسلمانوں کے ہاں فلسفی فکر کی باقاعدہ نشو و نما شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا فلسفی ابو یوسف یعقوب الکندی تھا۔

الکندی کا وہ دور ہے، جب مسلمانوں میں نئے علوم کا بڑا چرچا ہو رہا تھا اور بیدار طبیعتیں اور فعّال ذہن ان کی طرف بڑے ذوق و شوق سے راغب تھے۔ اب ایک طرف تو علوم نقلیہ تھے، جن کا سکہ پہلے سے رواں تھا۔ اور دینی طبقے ان کے دلدادہ تھا۔ اور اس وقت تک علوم تفسیر و حدیث و فقہ کافی ترقی کرچکے تھے۔ اور دوسری طرف یہ علوم عقلیہ تھے

---

[1] محمد عبدالہادی مقدمہ رسائل الکندی الفلسفیہ ص۵ قاہرہ

[2] نامور مسلم سائنس داں۔ از پروفیسر حمید عسکری

جن کی نئی نئی آمد لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی ظاہر ہے اس صورت حال میں قدیم و جدید میں ایک طرح کی ذہنی کش مکش کا ہونا قدرتی تھا۔ الکندی اسی دور کی پیداوار ہے اور اس کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس کش مکش کو حتی الوسع دور کرے۔

اس دور میں ایک طرف تو مذہب اور فلسفہ کو دو متضاد اور متناقض چیزیں سمجھا جاتا تھا۔ جن میں کسی قسم کی تطبیق نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جہاں علوم نقلیہ کو خالص دینی علوم سمجھا جاتا تھا، وہاں علوم عقلیہ کی تحصیل کو خالص دنیاداری قرار دیا جاتا جس کا کہ دین سے کوئی تعلق نہیں دوسری طرف علوم عقلیہ سے شغف رکھنے والوں میں مذہب کے بارے میں شکوک و شبہات پرورش پا رہے تھے۔ اور یہ عام خیال تھا کہ ان علوم کو حاصل کرنے والے مذہب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ الکندی اس صورت حال سے خوب واقف تھا۔ اور اس نے اسی سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ وہ مذہب اور فلسفہ کو ساتھ لے کر آگے چلتا ہے اور اس کے نزدیک مذہب و فلسفہ اپنی وحدانیتِ مقصد کے اعتبار سے ایک ہیں اور دونوں کی ایک ہی منزل ہے۔ الکندی کے اس نقطۂ نظر اور مسلک کی اس کی زندگی کے ایک واقعہ سے بڑی اچھی وضاحت ہوتی ہے۔

بلخ کا ایک قدامت پسند فقیہہ محض اس وجہ سے کہ یعقوب کندی سائنس اور فلسفہ کی اشاعت کرتا رہتا ہے، اس کا سخت مخالف ہو گیا۔ کیونکہ وہ سائنس اور فلسفے کو اپنی دانست میں مذہب کے خلاف سمجھتا تھا اس نے پہلے تو وعظ کے ذریعہ عوام کو یعقوب کندی کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد وہ اپنے چند ہم خیال شاگردوں کو لے کر بغداد روانہ ہو گیا۔ تاکہ اگر موقع مل جائے تو کندی پر حملہ کر کے اسے قتل کر دے۔ کندی کو بعض ذرائع سے بلخی فقیہہ کے اس منصوبے کا علم ہو گیا۔ یہ مامون الرشید کا زمانہ خلافت تھا۔ جس میں بغداد کے گلی کوچوں میں سائنس اور فلسفے کے چرچے تھے۔ خود خلیفۂ وقت ان علوم کے سرپرست تھا۔ اور دیگر علماء کے ساتھ کندی کو بھی اس کے علم و فضل کے باعث بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس لئے کندی اس موقع پر مامون رشید سے شکایت کر کے بلخی فقیہہ کو بڑی آسانی سے گرفتار کرا سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ طریقہ اختیار کرنے کی بجائے اس فقیہہ کو اپنے گھر میں دعوت دی، اور دلائل سے اسے سمجھایا کہ فلسفہ اور سائنس اسلام کے مخالف نہیں ہیں۔ اس کا بلخی فقیہہ پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے خود بھی ریاضی اور ہیئت کا علم

حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس مقصد کے لئے وہ کچھ مدت یعقوب کندی کے حلقۂ درس میں داخل رہا۔ لیکن ان علوم کے ساتھ اسے طبعی مناسبت نہ تھی۔ اس لئے ان کے حصول میں وہ کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سائنس اور فلسفہ کے بارے میں اس کے شکوک رفع ہو گئے۔ چنانچہ وہ جو بغداد میں کندی کا جانی دشمن بن کر آیا تھا، بغداد سے کندی کا ایک جگری دوست بنکر بلخ کو روانہ ہوا۔ بلخ کے اس فقیہہ کا نام ابو معشر جعفر بن محمد تھا[1]

فلسفہ کی تعریفات

الکندی فلسفی کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"لأن غرض الفیلسوف فی علمہ اصابۃ الحق و فی عملہ العمل بالحق"

فلسفی کا مقصد علمی لحاظ سے حق کو پانا اور عملی طور پر اس حق پر عمل پیرا ہونا ہے۔ (الفلسفۃ الاولی ص۹)

انسان کے اندر تلاش و جستجو کا جو رجحان ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے الکندی لکھتا ہے۔ یہ انسان کا فطری عمل ہے۔ ہر نئی چیز اسے بھاتی ہے اور ہر شے کی کنہ معلوم کرنے کی تشنگی اسے تحقیقات کے لامتناہی سمندر میں اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہے، جہاں سے وہ قسم قسم کی سیپیاں اور موتی جمع کر کے خلق خدا تک پہنچاتا ہے۔ انسان ہر نئی چیز کے بارے میں چار بنیادی باتیں جاننا چاہتا ہے جن کا اظہار ہمیشہ وہ چار سوالوں کی شکل میں کرتا ہے اور وہ ہیں ھَلْ ؟ (کیا) مَا ؟ (کیوں)، اَیّ ؟ (کیسے) لِمَ ؟ (کس لئے) ان سوالوں سے اس کی مراد اشیاء کی انیت، ماہیت، تمیز اور غایت معلوم کرنا ہوتی ہے۔ چنانچہ الکندی انسان کے انہی سوالات کو مطالب علمیہ کا نام دیکر انہیں سائنس و فلسفہ کی بنیاد قرار دیتا ہے[2]

الکندی کے نزدیک انسان کو ان مطالب علمیہ کی تحصیل ہی فلسفہ کی طرف لے جاتی ہے۔ جہاں وہ بسا اوقات یا تو کسی ایسی چیز کو جو محض اس کی راہ میں تحقیق کے دوران آئی تھی حتمی خیال کرنے لگتا ہے یا پھر مقصدیت سے کچھ ہٹ کر مختلف وادیوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ مذہب ہی وہ واحد ساتھی ہے

---

[1] نامور مسلم سائنس داں۔ از پروفیسر حمید عسکری ص۲۶۷

[2] رسائل ج۔ ۱ ص۱۰۱، قاھرہ ۱۹۵۰

جو ایسی حالت میں اس کی مدد کرتا ہے اور پھر اسے مقصدیت کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اپنے رسالہ فی حدود الاشیاء و رسومھا" میں فلسفہ کی وہ مندرجہ ذیل تعریفیں کرتا ہے۔

فلسفہ کی پہلی تعریف تو یونانی لفظ "فیلسوف" سے ماخوذ ہے۔ جو دو الفاظ "فلا" یعنی محب اور دوست اور "سوفا" یعنی حکمت و دانش سے مرکب ہے۔ لہٰذا فلسفہ کی یہ عام تعریف جسے ارسطو نے بیان کیا تھا یہ ہے کہ فلسفہ نام ہے حکمت کا۔ اس کے نزدیک فلسفہ کی دوسری تعریف یہ ہے أن الفلسفة هي التشبه بافعال الله تعالیٰ بقدر طاقة الانسان" اپنی طاقت کے مطابق افعال اللہ سے انسان کی شباہت فلسفہ ہے۔

یہ وہ تعریف ہے جسے بعد میں فارابی نے بھی اپنایا

فلسفہ کی تیسری تعریف الکندی یہ کرتا ہے۔ "الفلسفة عناية بالموت" فلسفہ موت سے اہتمام رکھنے کا نام ہے۔ اسی تعریف کو بعد میں بو علی ابن سینا نے اپنایا اور اسے وہ افلاطون کی تعریف لکھتا ہے[1]

فلسفہ کی چوتھی تعریف وہ ہے جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں عام طور پر کی جاتی تھی۔ اور وہ یہ ہے۔ "الفلسفة صناعة الصناعات وحكمة الحكمة" فلسفہ علموں کا علم اور حکمتوں کی حکمت ہے

پانچویں تعریف یہ ہے کہ:۔ الفلسفة معرفة الانسان نفسه"

فلسفہ انسان کے اپنے نفس کی پہچان کا نام ہے۔ فلسفہ کی یہ تعریف سقراط وغیرہ نے بھی کی تھی۔

فلسفہ کی چھٹی تعریف یہ ہے کہ :۔" أن الفلسفة علم الاشياء الابدية الكلية انتيا نها وما هيتها وعللها بقدر طاقة الانسان"

فلسفہ انسانی طاقت کے اشیاء ابدانیہ کلیہ کی انیت، ماہیت اور علت وغیرہ کو جاننے کا نام ہے

الکندی ان تعریفات میں جیسی آخری دو تعریفوں کا قائل نظر آتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مذہبی معتقدات کو بھی اتنا ہی ضروری خیال کرتا ہے جتنا مسلمہ کلیات کو۔ کیونکہ اس کے

---

[1] رسالہ ابن سینا "دفع الغم من الموت" ص۵۲ لزبن ۱۸۹۹ء

نزدیک انسانی عقل و تجربہ وحی کے مقابلہ میں حتمی نہیں ہیں۔ انسانی عقل پر اس نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس میں وہ عقل کی مختلف اقسام۔ عقل ہیولانی، عقل فاعل، عقل مستفاد، عقل منفعل اور عقل بالملکہ وغیرہ پر بحث کرکے یہ ثابت کرتا ہے کہ حقائق الاشیاء اور معلومات کلیہ صرف عقل ہی سے حاصل نہیں کی جاسکتیں[1] اس کے لئے وحی کا سہارا لینا انسان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

الکندی فلسفہ کو تین بڑی شاخوں میں تقسیم کرتا ہے[2]

۱۔ جوھریات

۲۔ جسمانیات یا طبعیات

۳۔ ربوبیات

علوم فلسفہ کو ان تین شاخوں میں تقسیم کرنے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ انسانی معلومات کے تین ماخذ قرار دیتا ہے۔ پہلی قسم کی معلومات تو وہ ہیں جنہیں ہم حس کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں۔ ہمارے جملہ حواس جن اشیاء کا جائزہ لے سکتے ہیں، انہیں غلطی سے ہم اپنا علم کلی سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ علم کی بالکل سطحی اور ابتدائی صورت ہوتی ہے کیونکہ حواس کے علاوہ اس کرۂ ارض پر ایسی سیکڑوں اشیاء موجود ہیں جنہیں ہم صرف محسوس تو کرسکتے ہیں لیکن ان کی ہیولانی صورت کا تعین ہرگز نہیں کرسکتے۔ اس کے ساتھ ہی ہم انہیں ہیولانی کیفیتوں سے جدا بھی نہیں کرسکتے۔ چنانچہ اس قسم (محسوسات) کا علم پہلے علم کے مقابلہ میں زیادہ اہم و برتر ہے۔ لیکن اس پر اکتفا کر بیٹھنا بھی غیر منطقی اور انصاف کے خلاف ہوگا۔ محسوسات کی سرحدیں ایک ایسے علم سے جا ملتی ہیں جہاں سے حقائق الاشیائ کے علم کی ابتدا ہوتی ہے چنانچہ اس علم کو وہ علم الربوبیت کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الکندی کے نزدیک علوم طبعیات سب سے کم درجہ کے علوم اور علوم جوہریات علوم متوسط اور علوم ربوبیہ اعلیٰ ترین علوم خیال کئے گئے ہیں۔ اور غالباً اس درجہ بندی کی بڑی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ پوری کائنات کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

---

[1] رسائل الکندیہ الفلسفیہ رسالہ فی العقل ص ۳۵۵۔ قاھرہ ۱۹۵۰ء

[2] ابن نباتہ شرح العیون

۱- مادہ -

خواص خمسہ سے پرکھی جانے والی اشیاء

۲- ملابستہ للمادہ ا-

وہ اشیا جو جوھر (مادہ) نہیں ہیں لیکن اس سے متعلق ضرور ہوتی ہیں جیسے نفس اور نسمہ وغیرہ -

۳- غیر مادی

غیر مادی اشیاء میں جہاں وہ الہیات کا ذکر کرتا ہے وہاں اس سے اس کی مراد خدائے واحد ہرگز نہیں ہوتی اس کے نزدیک الہیات اور وحدانیت دو الگ چیزیں ہیں اس لئے وہ جب بھی ذات باری تعالیٰ پر گفتگو کرتا ہے تو اسے وحدانیت کے مسئلہ میں شمار کرتا ہے الکندی نفس پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

نفس ایک بسیط روحانی جوہر ہے۔ اس کی حقیقت ربانی ہے۔ خدا سے اس کا صدور اس طرح ہوا ہے، جس طرح کہ سورج سے روشنی نکلتی ہے[1] نفس مادی جسم سے نہ صرف کلیتہً مختلف ہے، بلکہ متضاد بھی ہے۔ اس کی ایک نمایاں وجہ یہ بھی ہے کہ نفس جسم کی خواہشات پر پابندی اور قیود عائد کرتا ہے[2] اس تاریک دنیا میں نفس جب جسم سے متصل ہوتا ہے تو جسم کی ضروریات اور خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس تاثر کے نتیجہ میں عقل کے علاوہ شہوت اور غضب کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ عقل، شہوت اور غضب کو بادشاہ خنزیر اور کتے سے بالترتیب تشبیہ دی جاسکتی ہے[3] انسان فضیلت کی تحصیل اس وقت کرتا ہے جب کہ عقل کی حکمرانی بقیہ دونوں قوتوں پر مکمل ہوتی ہے انسان کا آخری کمال تفکر

---

[1] رسائل الکندی الفلسفیۃ (۱۹۵۰) (۱ : ۲۷۳) شائع کردہ البوریدہ مطبعۃ الاعتماد۔ مصر

[2] ایضاً : ۲۷۳

[3] ایضاً : ۲۷۴

ہیں ہے۔ جس کا موضوع اعلیٰ خدا کی ذات ہے، خدا کا حقیقی علم صرف اس نفس کو حاصل ہوسکتا ہے، جو آلائشوں سے پاک ہو۔ اخلاق فلسفیانہ کمال کے لئے ناگزیر شرط اور لازمہ ہے کمال کا انتہائی درجہ اس وقت حاصل ہوگا جب کہ روح جسم سے الگ ہوکر عالم روحانی میں داخل ہو جائے گی۔ جہاں اسے خدا کا دیدار ہوگا[1] یہ کمال انسانی کی معراج ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان پر سارے حقائق اس طرح منکشف ہوں گے، جیسے کہ وہ علم الہی میں ہیں[2] حقائق روحانیہ کا یہ انکشاف انتہائی مسرت انگیز ہوگا[3]"

الکندی کی علمی شخصیت کتنی جامع تھی، اس کا اندازہ اس کی ان کثیر التعداد تصانیف سے ہو سکتا ہے، جو اس نے علوم نقلیہ کو چھوڑ کر اپنے زمانے کے ہر علم پر لکھیں۔ اس کے زمانے میں یونان و فارس و ہند سے جو بھی علوم مسلمانوں میں منتقل ہوئے، اس نے ان سب سے استفادہ کیا۔ القفطی الکندی کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

مشتھر فی الملتہ الاسلامیتہ بالتبحر فی فنون الحکمتہ الیونانیتہ والفارسیتہ والھندیتہ، متخصص باحکام النجوم واحکام سائر العلوم۔ وہ ملت اسلامیہ میں یونانی فارسی و ہندی حکمت کے مختلف فنون میں اپنے تبحر علمی کی وجہ سے مشہور ہے اور وہ علم نجوم اور دوسرے علوم کے امور کا ماہر ہے۔

قفطی نے الکندی کے متعلق ابن جلجل کا یہ قول نقل کیا ہے:۔ بصرے سے بغداد میں حصول علم کے لئے گیا اور رفتہ رفتہ طب، فلسفہ، حساب، منطق، موسیقی، ہندسہ، علم الاعداد و ہیئت میں یگانہ روزگار بن گیا۔ علم کی بدولت بادشاہوں کا ندیم بنا کتب فلسفہ

---

[1] ایضاً: ۲۷۴، ۲۷۶

[2] ": ۲۸۵، ۲۷۶

[3] ": ۶۷۷

یہ اقتباس مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ (جون ۱۹۶۳ء) میں شائع شدہ مضمون بعنوان ابتدائے اسلام میں اخلاقی فکر کا ارتقاء از ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری سے ہے۔

کی ایک کثیر تعداد عربی میں منتقل کر کے ان کی مشکلات دور کیں۔ اہل منطق کے رنگ میں توحید و نبوت پر بے نظیر کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب آداب نفس پر لکھی جس کا نام تسہیل سبل الفضائل ہے۔ اقالیم معمورہ پر بھی ایک کتاب لکھی ...[۱]

الکندی کی یہ خصوصیات تھیں، جن کی بناء پر اسے فیلسوف العرب کہا گیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس لقب کا بجا طور سے پوری طرح مستحق تھا۔

---

[۱] حکمائے عالم اردو ترجمہ تاریخ الحکماء۔ ص۲۸۷

انبیاء کے نزدیک اس ذات واجب الوجود کو دیکھنے اور سننے کا تعلق ضرور پیدا ہوتا ہے اور دراصل نبوت کا مطلب بھی یہی ہے کہ نبی نے خدا کی کوئی بات سنی اور پھر انبیاء اپنے پیروؤں کو اس بات کا یقین بھی دلاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ اور ان کے طریقہ پر اپنی ذات کی تکمیل کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ بھی سکتا ہے۔ الغرض ایک طرف تو آرین اقوام کی حکمت کا یہ تصور ہے کہ واجب الوجود جسم سے اتنا مجرد اور منزہ ہے کہ انسانی حواس اس سے کوئی تعلق رکھ نہیں سکتے" تو دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کا یہ کہنا ہے کہ واجب الوجود کی بات سنی جا سکتی ہے اور اس ذات اقدس کو دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے آرین فکر اور حنیفی طریقہ میں یہ اختلاف موجود ہے اب اگر آریائی ذہن کو نبوت کی بات سمجھانی مقصود ہے، اور اسے اگر واقعی حنیفی طریقہ کا اس طرح قائل کرنا ہے کہ اسکی طبیعت از خود نبوت کو ماننے کے لئے آمادہ ہو جائے تو اس امر کی ضرورت ہوگی کہ آرین فکر اور حنیفی طریقہ میں جو اختلاف بتایا جاتا ہے اسے رفع کیا جائے اور دونوں میں مطابقت پیدا کی جائے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے تصوف کا کمال یہ ہے کہ وہ مسئلہ "تجلی" کے ذریعہ سمجھا دیتے ہیں کہ انسان کس طرح واجب الوجود کی جو جسم سے منزہ اور مجرد ہے، بات سن سکتا اور اسے دیکھ سکتا ہے۔

(مولانا عبید اللہ سندھی)

تفسیر معینی

گیارھویں صدی ہجری کی فارسی تفسیر القرآن کا مخطوطہ

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی

اگرچہ قرآن کریم کی تفسیر اور فارسی زبان میں ترجمہ کی شہرت الامام الشاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز کے ترجمہ و حاشیہ سے ہوئی مگر تاریخ تفسیر و ترجمہ دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت شاہ صاحب سے بھی پہلے فارسی زبان کو قرآنی ترجمہ و تفسیر کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ ذیل میں فارسی زبان کی تفسیر معینی کا مختصر سا تعارف درج کیا جاتا ہے۔

۱- یہ تفسیر معینی ۱۲ × ۱۶ انچ کاغذ کے ۱۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحے میں جلی قلم کی ۲۵ سطور ہیں قرآنی آیات لال سیاہی سے اور ترجمہ و تفسیر کالی سیاہی سے زمانۂ سابق کی طرح لکھی ہوئی ہیں حاشیہ سنہری لکیروں کا ہے سورتوں کا نام نیلگوں رنگ سے لکھے گئے ہیں اور سورتوں کے نام کے ساتھ صرف آیات کی تعداد لکھی گئی ہے۔ رکوع کا ذکر نہیں۔

۲- یہ تفسیر متوسط بیان پر مشتمل ہے ترجمہ آیات کے ساتھ ہی مختصر سی تفسیر کر دی گئی ہے اور کسی جگہ تفصیل سے بھی کام لیا گیا ہے۔

۳- اس تفسیر کے مولف خواجہ معین الدین ہیں، جن کے متعلق حدائق الحنفیہ یوں رقمطراز ہے:-

خواجہ معین الدین بن خواجہ محمود نقشبندی کاشمیر کے علماء کبار اور مشائخ نامدار میں سے اتباع شریعت و ترویج شریعت و ترفیع بدعت اور زہد و تقویٰ میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے تمام علماء و صلحاء وقت آپ کی تحریر و تقریر کو قبول کرتے اور نوادر و نوازل میں آپ کے پاس رجوع لاتے تھے۔ اور بڑے بڑے علماء کاشمیر

مثلاً ملا محمد طاہر کشمیری خلف مولانا حیدر علامہ و ملا ابوالفتح کلو و ملا
یوسف مدرس و مفتی محمد طاہر و مولانا عبدالغفور و مولانا مفتی شیخ احمد وغیرہ
جو کاشمیر میں علم شریعت کا کھڑا کرتے تھے۔ آپ کے خاص فرمان پر سر رکھتے
اور احکام روایت و عدالت میں آپ سے فتویٰ طلب کرتے تھے آپ نے علمائے
وقت کی درخواست سے کتاب فتاویٰ نقشبندیہ اور کنز السعادۃ علوم شریعت
و طریقت میں تصنیف کیں۔ اور ایک کتاب فارسی دلچسپ میں الموسوم برسالہ
رضوانیہ درباره خوارق و کرامت والد بزرگوار تالیف کی وفات آپ کی
۱۰۸۵ھ میں ہوئی۔

حدائق الحنفیہ میں اگرچہ خواجہ معین الدین کاشمیری کی مؤلفات میں تفسیر معینی کا ذکر نہیں۔ مگر تفسیر معینی
کے دیباچہ میں مفسر مرحوم نے اپنی اس تفسیر کی ترتیب اور تالیف کو سب سے آخری بتایا ہے اس
لئے ہوسکتا ہے یہ تفسیر زیادہ مشہور نہ ہوئی ہو۔ تفسیر کے دیباچہ میں ہے۔

چنانچہ درحق این فقیر منت نہادہ کہ درمیان سہ، چہار سال درترتیب دادن مصنفات
شریف در رسائل فخیمہ توفیق داد و بانجام رسانید چنانکہ انتخاب کردن تمام کتاب
صحیح بخاری مع اکثر کتاب صحیح مسلم و بعضی از کتاب جامع ترمذی این است کہ ہر کسہ
کتب صحیحہ را حذف اسانید کردہ در اختصار کردن از احادیث صحیحہ مکررہ سعی جمیل نمودہ
شد و بعد از فراغ ازاں در تفسیر زبدۃ التفاسیر من جہد المعین جد و اجتہاد نمودہ
شد الحمد للہ والمنۃ کہ بآں تمتع یافتہ در علم فقہ کتابی گفتہ شد کہ جامع ہمہ فتاویٰ
است و آں را فتاویٰ نقشبندیہ من خزائن فقہ المعینیہ نام نہادہ شد (تفسیر معینی ص ۳)

مفسرؒ نے اس تفسیر کے مقدمہ میں اپنے مرتبہ فتاویٰ نقشبندیہ کی تصریح فرمادی اور اسی طرح علم سلوک
میں مرتبہ رسالہ کی بھی تصریح فرمادی۔ نیز مفسرؒ کی وفات کا سال ۱۰۸۵ھ ہے اور اس تفسیر کا
سن تکمیل ۱۰۷۲ھ ہے۔

بہرکیف اس مخطوطہ کے متعلق یہ باور کرنے کا پورا جواز ہے کہ یہ تفسیر فتاویٰ نقشبندیہ کے
مرتب فاضل معین الدین ہی کی مرتبہ ہے۔

یہ تفسیر تفاسیر سابقہ کا نچوڑ ہے جیسا کہ مفسر نے تمہید میں فرمایا۔

"تفسیر خیر الکثیر کہ مستنبط است از کتب معتمدہ صحیحہ کہ تفسیر معالم التنزیل است
وتفسیر مدارک وتفسیر زاہدی و جامع البیان وقاضی بیضاوی وغیرہا ۔ الخ

یہ تفسیر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں مرتب ہوئی جس کا ذکر مفسر نے مقدمہ میں یوں فرمایا

"این ہمہ توفیق فضائل وتکمیل مآرب محض از آثار ویمن انوار سلطنت سلطان وقت
وبرہان ملت .... دیوان عظمت شاہ عالم گیر بہادر اورنگ زیب ۔ الخ

اس تفسیر کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمن الرحیم سے پہلے اسم الٰہی سے استمداد کرتے ہوئے ھو المعین تحریر فرمایا اپنے کلام منظوم میں اس تفسیر کو تفسیر معینی کا نام دینے کی وجہ یوں بیان فرمائی۔

بحمد اللہ کہ یزدان جہاں دار	عطا کردم از فضلی بہ یکبار
نہ جہدی کردہ ام در پیش استاد	بشادی نبردہ ام رنج بسیار
بسا تصنیف از من گشت ظاہر	بباطن داد حق توفیق این کار
فتادا کردم وشرح القرآن ہم	نمودم بہر خود یاران غمخوار
شدہ این شرح قرآن تا بشش ماہ	تمام از فیض عام رب غفار
تخمینش ابتدائش در رجب شد	شدہ آخر در محرم نسخہ تیار
مرا در واقعہ این امر کردہ	ز حکم حق بزرگی در شب تار
بخوابم نام این تفسیر دادند	بیادم ماند خود کردند بیدار

اشعار مسطورہ بالا میں اس تفسیر کی ابتدائے تالیف اور تاریخ اختتام بھی بیان فرمادی اور ساتھ ہی اس کا نام معینی رکھنے کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ اگرچہ مفسر کا نام معین الدین ہے مگر تفسیر معینی کا یہ نام اشارہ غیبی سے تجویز ہوا۔ جس کا القاء مصنف کے دل ودماغ پر خواب میں ہوا۔ مؤلف کے والد یا جد صوفی اور سالک تھے ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مؤلف کا نام معین الدین تجویز کرنے میں بھی تفاؤل تھا۔ جیسا کہ اسی تفسیر کے مقدمے کا فرماتے ہیں۔

بندہ عرض کردم استعداد ندارم گفتند نفس ما را پاس دارد نام ترا معین نہادہ ایم

دریں اسم خاصیت است۔"

اور یہی خواہش تفسیر کے مرتب کرنے کی موجب ہوئی۔ فرمایا۔

بندہ دریں تفسیر معذور بودم المامور معذور۔"

اس تفسیر کا طرز تحریر یوں ہے کہ آیت یا چند آیات کا ترجمہ کیا جاتا ہے اور پھر اسکی تفسیر و تاویل کی جاتی ہے جس میں زیادہ تر احکام القرآن کے طرز میں بحث کی جاتی ہے اور اس میں مفسر اپنی دوسری مصنفات کا حوالہ دیتے ہیں مثلاً فرمایا۔

و حلائل ابنائکم الذین من اصلابکم و حرام کردہ شدہ زنان پسران شما آں پسراں کہ از پشت شما اند بخلاف زن پسر خواندہ کہ آں حلال است ....

مصنف شرح القرآن معینی آوردہ است در فتاوی نقشبندیہ و خزائن فقہ المعینیہ مسائل چندکہ ترجمہ اش اینست در نسب دوازدہ عورت است کہ نکاح آں حرام موبد است الخ

تفسیر کے آخر میں یہ تحریر ثبت ہے۔

قد وقع الفراغ من تصنیف شرح القرآن لعد سنتہ اشہر زید علیہ ....

وسط یوم الثلثاء من اوّل ...... السبعین بعد الف حول حول ھجرۃ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم الخ۔

فی الحال اسی قدر اجمالی تعارف پیش ہے ان شاء اللہ تفصیلی تبصرہ اس تفسیر پر عنقریب پیش کر دیا جائیگا۔ واللہ الموفق۔
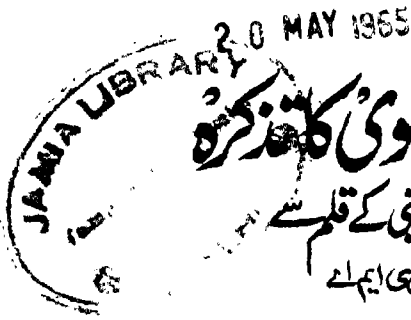
○

خانوادۂ شاہ ولی اللہ دہلوی کا تذکرہ

مولوی کریم الدین پانی پتی کے قلم سے

پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے

(۲)

مفتی صدرالدین خاں آزردہ

شیخنا واستاذنا وہادینا ومرشدنا وحاکمنا مفتی محمد صدرالدین خاں بہادر لقاہ اللہ الی یوم الدین، گنجینۂ علم وکان علم و بحر سخا مخزن لطف وجود عطا لبید[۲] دوراں، حسان[۳] ہندوستاں، عالم کامل فاضل اجل فقیہ بے مثل حاکم دہر مصداق ایں۔

شیخ جہاں پناہ کہ اندوئے حکمت　　بر سروران عالم تحقیق سرور است

دارائے ملک لطف وکرم ہادی امم　　کاوصاف ذات پاکش از اندیشہ برتر است

اس باعلم اور فاضل اجل کی مدح میں جو کچھ لکھوں سو کم ہے کیونکہ وہ ایسا ہی عالم ہے سحبان[۱] اور حسان اور لبید اور متنبی[۲] اور امرا و القیس[۳] یہ نام بہت کتابوں میں مثل لفظ عنقا ر لکھے ہوئے دیکھے۔ پر آج تک کوئی مصداق ان الفاظ کا نہ پایا۔ جب بہت تجسس کیا تو اس ذات گرامی کو کئی مرتبہ ان سے بڑھا ہوا پایا۔ بینندگان تذکرہ ہذا کے واسطے اس فاضل بے بدل کے کوئی تمثیل دے کر سمجھانا چاہیئے مگر افسوس کہ

۱ـ

۲ـ عہد جاہلیہ کے مشہور شاعر جن کا قصیدہ سبعہ معلقات میں شامل ہے بعثت کے بعد اسلام سے مشرف ہوئے اور پھر ایک شعر بھی نہیں لکھا۔

۳ـ حسان بن ثابت، مشہور مداح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔

(باقی حاشیہ ص ۔۔۔ پر)

نظیر اس کا معدوم ہے اب مناسب یوں ہے کہ یہ کہوں کہ کوئی فاضل ہمارے زمانہ میں اس ذات گرامی کے سامنے ذکا، اور ذہن اور عالی طبیعت اور فکر اور تجربہ میں رتبہ نہیں رکھتا یہ سب سے بہتر ہے۔

آنکہ باشد در شرف اوصاف ذات کاملش
برتر از درک خرد بالاتر از وہم و گماں
نفحہ اخلاق او را روح قدسی در پناہ
جوہر انفاس او با عقل کلی تواماں

بالفعل ہمارے زمانہ میں کہ ۱۸۴۷ء میں عہدہ صدر الصدوری شاہجہاں آباد نیک بنیاد پر مامور ہیں باوجودیکہ کار سرکار سے ان کو فرصت بہت کم ہوتی ہے مگر پھر بھی سبب اس کے کہ طبیعت فیض رساں اشاعت علم کی خواہاں رکھتے ہیں اس لئے اس کم فرصتی میں بھی طلبا، اطراف واقطار کو جوان کے گھر میں پڑے رہتے ہیں پڑھاتے ہیں بہت فاضل میرے زمانہ میں ان کے شاگردوں میں ہیں۔

کوئی علم یا ہنر ایسا نہیں ہے کہ اس کے موجد سے زیادہ نہ جانتے ہوں کتابیں ان کے پاس ہر طرح کی اور ہر فن کی موجود ہیں، سننے میں آیا ہے کہ یہ حضرت میاں عبدالقادر برادر کلاں مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگردوں میں در بیان علوم نقلیہ کے ہیں جن کا ایک ترجمہ اردو قرآن شریف کا کئی دفعہ چھپ چکا ہے اور ہندوستان میں مشہور ہے۔ شاہ عبدالعزیز سے بھی انہوں نے علم تحصیل کیا ہے جو کہ علامہ زماں گزرے ہیں مولوی فضل امام صاحب سے علوم نقلیہ مثل منطق و فلسفہ کے انہوں نے تحصیل کئے ہیں۔

مقدمہ کو ایسا کھولتے ہیں کہ حقیقت حال اس کی آئینہ وار کھول لیتے ہیں بات یہ ہے کہ اس عہدہ نے ان سے زینت پائی اور وہ بھی اس عہدہ کے لائق تھے شاہجہاں آباد میں جو کمال فضلاء کی ہے

(بقیہ حاشیہ ، ۱۳ قبیلہ وائل کے مشہور شاعر ہیں۔

۵۔ عربی زبان کا مشہور شاعر ہیں اس نے دعویٰ نبوت کیا اسی لئے متنبی مشہور ہوا۔

۱۴ عہد جاہلیہ کا مشہور شاعر، سبعہ معلقات میں اس کا سب سے پہلا قصیدہ ہے۔

ایسا ہی عالم لائق اس عہدہ صدرالصدوری کے تھا اس امر میں کچھ مبالغہ نہیں۔ میں درست ملاک حلفہ بیان کرتا ہوں کہ یہ عہدہ اس شخص کے ہی واسطے زیبا تھا اور واقع میں ہر ایک مقدمہ کی وہ ایسی تحقیق کرتے ہیں کہ یقیناً کوئی فیصلہ ان کا خالی حق سے نہیں ہوتا۔ حق دار کو حق پہنچاتے ہیں اس لئے اب میں یہ کہتا ہوں کہ خدا تعالے تا قیام قیامت اس شخص کو اس عہدہ پر قائم رکھے تاکہ ظلم جہاں سے یک قلم موقوف ہو۔

ان کی تصنیفات سے ایک حاشیہ قاضی مبارک کا ہے مگر وہ ایام طالب علمی کی شاید تصنیف سے ہے کیونکہ ایسا ہی ان کی زبانی سننے میں آیا ہے اور اکثر رسالے اور فتوے ان کی تصنیف سے ہیں اور ہر روز جو مسائل لکھے جاتے ہیں ان کی کچھ شمار نہیں۔ ایک کتاب صنائع اور بدائع میں انہوں نے تصنیف کرنی شروع کی تھی مگر معلوم نہیں کہ تمام ہوئی یا نہیں۔ اگر یہ کتاب تمام ہو کر چھپ جائیگی تو تمام خاص اور عام کو فائدہ کثیر حاصل ہوگا۔

فارسی میں وہ شعر کہتے ہیں کہ سعدی کی کچھ حقیقت نہیں اردو میں بھی ان کے اشعار بہت ہیں میں نے تذکرہ اردو میں مندرج کئے ہیں عربی میں عبارت نثر اور نظم ایسی لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں دوسرے ویسی ہونی معدوم، غرض کہ ہمہ صفات موصوف ہیں بندہ نے بھی کتاب صدرا علم فلسفہ میں ان سے پڑھا تھا۔ لیکن ان کے تبحر کے سامنے سب بھول جاتا تھا۔ جو کچھ میں دیکھ کر جاتا تھا وہ سب بیان کر دیتے تھے اور رد و قدح ان پر کر کے سب حاشیوں کو مخدوش کر ڈالتے تھے اس وقت اپنے آپ تقریر صاف مثل سلسلہ موتیوں کے تشفی فرماتے تھے، میرزا ہدا مور عامہ بھی میں نے ان سے پڑھا ہے یہی حال کتاب میں بھی پایا۔ ایسی ایسی کتابیں جو انتہائی فضیلت کی ہیں۔ ان کے سامنے ایسی ہیں جیسے آمد نامہ یا خالق باری ایک بڑے فاضل کے سامنے ہوں، ہرچند کے اوصاف اس فاضل بے بدل کے بہت ہیں اور یہ کتاب مختصر، متحمل اس کی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اب یہ مناسب ہے کہ کچھ کلام یا عبارت اس فاضل اجل کی لکھ کر مُردوں کے تنوں میں جان ڈال دوں۔

(تذکرہ فرائد الدہر ص ۳۹۶)

آزردہ تخلص، مفتی صدرالدین خاں بہادر صدرالصدور شاہجہان آباد گنجینۂ علم و کان حلم و بحر سخا مخزن لطف و جود و عطا، لبید دوراں، حسان ہندوستان عالم کامل فاضل اجل فقیہہ بے مثل عالم

باعمل، مدحت میں ان کی جو لکھوں سو کم ہے کیونکہ وہ ایسا ہی عالم ہے صدہا شاگرد اُن کے علوم و فنون درسیہ کے ہیں اور بہت فاضل ان کی شاگردی میں داخل ہیں ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرہ شعراء اردو میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ان کا نام لکھوں مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ بدون نام نامی ان کے یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسند احباب نہ ہوگی کیونکہ اس زمانے کے شعراء اردو گویوں میں وہ مثل شاہنشاہ کے ہیں گرچہ اشعار عربی اور استعداد فارسی کی اتنی کچھ رکھتے ہیں کہ اچھے اچھے مصنفوں کی حقیقت ان کے سامنے کچھ نہیں مگر پھر بھی بہ سبب اس امر کے کہ ہمہ داں ہیں اشعار اردو بھی فرماتے ہیں یہ چند شعر ان کے اس جلسے پر لکھتا ہوں تاکہ یادگار زمانہ رہیں ۱۸۴۷ء میں قریب پچاس برس کے ان کی عمر ہوگی [۱]

(تذکرہ طبقات الشعراء ہند ص ۴۴۵ - ۴۴۶)

مولانا حسین احمد لکھنوی

علوم متداولہ اور فنون درسیہ ادبیہ پر اس شخص کی اچھی نظر ہے نظم اور نثر وہ سب سے بہتر جانتا تھا۔ علم منطق اس کو اچھی آتی تھی۔ احمد عرب کی مدح میں اس نے بر وقت خبر پانے تصنیف نفحۃ الیمن کے جب کہ احمد عرب نے کعبۃ اللہ کا ارادہ کیا تھا کہی ہے وہ شعر یہ ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ میں یہ شخص موجود تھا [۲] (تذکرہ فرائد الدہر ص ۳۸۸)

---

[۱] مفتی صدرالدین بن شیخ لطف اللہ کشمیری ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء کو فوت ہوئے ان کے دو رسالے منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال اور در المنضود فی حکم مراۃ المفقود طبع ہو چکے ہیں ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۲ - ۲۴۸۔

[۲] مولوی حسین احمد بن علی احمد ۲۵ صفر ۱۲۰۱ھ کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے مولوی ظہور اللہ لکھنوی مولوی عبدالرحیم کلکتوی، مرزا حسن علی صغیر محدث، مولوی مخدوم لکھنوی، مولوی نورالحق لکھنوی شاہ عبدالعزیز دہلوی، شیخ عمر محدث مکی، حکیم محمد صادق فیض آبادی، اور مولوی حیدر علی سندیلوی، سے علوم مروجہ تحصیل کئے۔ (باقی حاشیہ ص ۴۳ پر)

مولانا مملوک العلی نانوتوی

مولانا و اولانا و استاذنا و بادینا و شیخنا جناب مولوی مملوک العلی عالم النقی و الجلی مدرس اوّل مدرسہ دہلی رہنے والے نانوتہ[1] کے قدوۃ المتاخرین امام متبحرین متقدمین اس ذات حمیدہ صفات کا شمہ سا یہ حال ہے کہ ایسا فاضل کامل ذاہد و عابد پابند شرع شریف مصطفوی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے نظیر اس کا خطۂ ہند میں بھی مفقود، ہر فن و علم کا سامان اس کے پاس ہر وقت موجود اس کے فیض عام ہی عقل فیاض زار رہا۔ جس نے اس کے مشعل تعلیم سے روشنی نہیں پائی وہ عقل و بصیرت سے نابینا۔ گھر اس کا محط الرجال طلباء مدرسہ اس کا مجمع علماء و فضلاء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے۔ درمیان اکثر بلاد افغانستان کے اور ہندوستان کے اپنا نام پیدا کر گئے۔

بالفعل عہدۂ اوّل مدرسی اوّل عربی پر مدرسہ دہلی میں مامور ہیں۔ سوا درس وہی طلباء مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں تمام علوم درسیہ متاخرین و متقدمین پر وہ عبور رہتے کہ عقل اول بھی ان کی فیض رسانی کے مقابلے میں مجبور ہے تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہے۔

حلیہ ان کا یہ ہے کہ کھلتی پیشانی، خندہ رو، سفید ریش صورت نورانی مثل عالموں ربانی کے ہمارے زمانے میں ان کی ذات سے ہندوستان میں علم نے ترقی اور رفعت پائی۔ سچ ہے اس قول

(بقیہ حاشیہ) رسالہ جواز قرأت فاتحہ خلف امام، رسالہ در بیان بیعت، شرح رسالہ مولوی رفیع الدین دہلوی در بیان وجود، حلیہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تصوف میں کچھ رسالے ان سے یادگار ہیں۔ ۱۰ رمضان ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۹ء کو انتقال ہوا اور اپنے والد کے قریب موضع دودھیا (ملیح آباد) میں دفن ہوئے۔

(تذکرہ علمائے ہند ۔ ۱۶۷)

[1] نانوتہ ضلع سہارنپور (یوپی ۔ بھارت)

کاشفی کا مصداق وہی ہے ۔

آں فاضل زمانہ کہ از یمن درس اوست
ہم عقل در ترقی فہم علم در کمال

متواضع اور حلیم اور بردبار اور صاف منکسر اور مدبر اور دانشمند ہیں غرض کہ جتنی تعریف اور جتنے اوصاف اخلاق کے بتلاش تمام پیدا کئے ہیں اس میں سب موجود ہیں ۔

معارض کو چاہیئے کہ دو چار گھڑی ان کی خدمت میں بیٹھ کر ان اوصاف کو ملاحظہ کرے اس وقت میرے قول کی تصدیق بحلف کرے گا ۔ اور کہے گا کہ سچ ہے یا مبالغہ اور قطع نظر تعریف کے امر واقعی اس شخص نے بیان کیا ہے تمام عمر ہیں باوجود اس کثرت علم اور فضل کے دعظ عام نہیں کیا ۔ اور تصانیف کتب پر مآل نہیں ہوئے باعث اس کا یہ ہے کہ چوں کہ ان کی فہرست میں صدہا طالب علم اطراف و جوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں ، پھر اس صورت میں فرصت واسطے تصانیف کے معلوم لہٰذا اپنا حرج گوارا کیا ۔ دل شکنی کسی کی منظور نہیں کی ۔ مگر ہاں ایک کتاب تحریر اقلیدس جو عربی زبان تھی بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے ۱۸۴۱ء میں ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا ۔ اور بہت اچھی طرح بھی ہر ایک شکل کو حل کیا ہے یہ ترجمہ ۱۸۴۲ء دو مرتبہ چھپ چکا ہے یہی باعث مذکورہ بالا نہ منظوم کرنے افکارات شعریہ کا ہے مگر ایک سودہ عربی خط کا جو مسمی فیروز[1] پاشازادے کو انہوں نے ایام طالب علمی میں بے لفظ لکھا تھا ڈھونڈ لایا ہوں تیمناً تبرکاً اپنی کتاب میں لکھتا ہوں ۔

(تذکرہ فرائد ہبر ص۲۰۱)

مدرس اوّل مدرسہ دہلی مولوی مملوک العلی مدظلہ عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں عہدہ ہیر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار مدرسہ میں مقرر ہیں ۔ حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہیئے ویسی نہیں کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بنا مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے ۔ فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن

---

[1] شہزادہ فیروز شاہ جس نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں ۔

سے جو ان زبانوں میں ہیں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حق الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کے (ص ۴۶۳) ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو بندہ کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے کیونکہ وہ فاضل ایسا ہی ہے کوئی کتاب کسی فن کی مشکل اس کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھا دیں گے گویا حفظ کر رکھی ہے۔ اس لئے رات دن سوا مدرسہ کے ان کے گھر پر طلبا لو پڑے رہتے ہیں ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ یہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے سب کو پڑھاتے ہیں تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا والا سرات دن درس دہی طلبا میں گزرتا ہے اور باوجود اس کثرت درس فیض رسانی کے پابند شرع شریف کے ایسے ہیں کہ اس طرح کے آدمی کم دیکھنے میں آتے ہیں غرض کہ جتنا ان کی تعریف میں لکھوں بجا ہے اگر کوئی امر بطور مبالغہ بھی لکھوں وہ بھی امر واقعی ان کی ذات میں پاتا ہوں بہت بے نظیر فاضل ہے ان کے ثانی کوئی فاضل ایسا نہیں ہے جس سے اس طرح کا فیض عام اور تشفی خاص و عام حاصل ہو عمر ان کی ۱۸۴۸ء میں قریب ساٹھ برس کے ہوگئی۔ بہت خندہ پیشانی اور عقل مند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ہیں۔ تحریر اقلیدس کا ترجمہ زبان اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارہویں بارہویں کا کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے اصل وطن ان کا نانوتہ ہے مدت سے شاہجہاں آباد میں رہتے ہیں۔[۵]

(طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۴)

مولانا فضل حق خیرآبادی

مولوی فضل حق فرزند ارجمند مولوی فضل امام صاحب کے جن کی تصنیف سے چند رسالہ اور

---

[۵] مولانا مملوک العلی بن مولوی احمد علی کا انتقال ۱۱۔ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء کو دہلی میں ہوا۔ اور خاندان شاہ ولی اللہی مہندیوں میں دفن ہوئے۔

حاشیہ علم منطق میں مشہور و معروف داخل تحصیل ہیں۔

مولانا فضل امام بڑے فاضل کامل اور محقق مدقق گزرے ہیں ان کی تصانیف انہیں کے نام سے مشہور ہیں چنانچہ ایک حاشیہ میرزاہد رسالہ پر بنام حاشیہ مولوی فضل امام دوسرا میر زاہد جلالی پر بھی اس نام سے مشہور ہے اوّل ہیں وہ صدر الصدور شاہجہان آباد کے تھے جن کی جا پر مولوی صدرالدین خان بہادر بالفعل رونق افروز ہیں ان کے اشعار اور عبارات عربی بہت ہیں اور بڑے فاضل تھے انہوں نے درمیان ۱۲۴۴ھ کے وفات پائی جن کی تاریخ میں مرزا نوشہ غالب نے یہ چند شعر کہے ہیں [1]

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل	کرد سوئے جنت الماویٰ خرام
کارآگاہی ز پرکار او فتاد	گشت دارالملک معنی بے نظام
چوں ارادت انپئے کسب شرف	جست سال فوت آں عالی مقام
چہرۂ ہستی خرد شیدم نخست	تابنائی تخرجہ گردد تمام
گفتمش اندہ "سایۂ لطف نبی"	باد آرامگہ "فضل امام"
۲۵۷	۵۹۲ - ۵ - ۱۲۴۴ھ

چوں کہ کلام اس فاضل کے میرے ہاتھ نہیں آئے لہذا ان کا ذکر چھوڑ کر ان کے فرزند دلبند مولوی فضل حق صاحب کا بیان کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ یہ فاضل اجل بڑا عالم ہندوستان میں ہے اس سے صدہا لوگوں کو فیض ہوا۔ اور صدہا فاضل اس کے شاگردوں میں ہیں علوم عربیہ میں اس شخص کو بڑا رتبہ حاصل ہے خصوصاً علم منطق اور فلسفہ اس کے خدمت گاروں کو یاد ہے پھر ان کا کیا لکھنا،

---

[1] مولانا فضل امام بن شیخ محمد ارشد ہرگامی، خیرآباد وطن تھا فراغ علم کے بعد دہلی پہنچے انگریزی حکومت کی طرف سے پہلے دہلی کے مفتی پھر صدر الصدور مقرر ہوئے شاہ صلاح الدین صفوی سے بیعت تھے فرائض ملازمت کے ساتھ شغلۂ تدریس و تصنیف بھی جاری تھا کچھ مدت پٹیالہ میں بھی رہے۔ ۵ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء کو فوت ہوئے۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۳۷۶ - ۳۷۷)

میری زبان میں کہاں طاقت اور قلم میں طاقت کہ اس کی تعریف لکھوں یا کچھ لکھوں وہ شاگرد رشید اپنے والد کے ہیں اور ہمراہ مولوی صدرالدین خاں بہادر جن سے کمال ربط و اتحاد رکھتے ہیں مولوی عبدالقادر صاحب و شاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھا ہے قصائد ان کے زبان عربی اور فارسی کے مشہور و معروف ہیں نثر عبارت اس طرح کی لکھتے ہیں کہ آج عرب کو ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں ان کی تصنیف سے ایک حاشیہ قاضی مبارک کا ہے یہ حاشیہ میں نے مولوی نورالحق صاحب کے پاس دیکھا تھا بہت اچھا ہے تفصیل اور تطویل بہت ہے باعث اس کا تبحر اور ملکہ اور استعداد مصنف مذکور کا ہے یہ ایک رقعہ ان کا میرے ہاتھ آیا ہے جو مفتی محمد صدرالدین خاں بہادر کو لکھا تھا۔[2]

(تذکرہ فرائدالدھر ص۱۶)

---

[1] مولانا فضل حق کے عربی قصائد اور رسالہ ثورۃ الہندیہ، مولانا عبدالشاہد خاں نے ایک طویل مقدمہ اور ترجمہ کے ساتھ "باغی ہندوستان" کے نام شائع کر دیئے ہیں مولانا کا کچھ نمونہ عربی کلام انتخاب یادگار (از امیر مینائی) میں بھی شامل ہے۔

[2] مولانا فضل حق ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں خیرآباد میں پیدا ہوئے الجنس الغالی فی شرح الجواہر العالی حاشیہ شرح سلّم قاضی مبارک، حاشیہ الافق المبین، حاشیہ تلخیص الشفاء، الہدیۃ السعیدیہ، رسالہ تحقیق العلم والمعلوم اور الروض المجود، ان سے یادگار ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی علوم معقول کے امام تھے۔ کمشنر دہلی کے دفتر میں پیش کار رہے۔ مولانا فضل حق اور شاہ اسماعیل شہید میں بعض مسائل پر اختلاف ہوئے طرفین سے رسالے لکھے گئے۔ مرزا غالب سے مولانا کے تعلقات بہت اچھے تھے مولانا فضل حق ایک عرصہ تک رئیس جھجر، راجا الور، نواب ٹونک اور نواب رام پور کے یہاں ملازم رہے۔ آخر میں واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ میں رہے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انہوں نے عملی حصہ لیا۔ گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور لبعبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء کو فوت ہوئے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص۳۸۲ - ۳۸۳)

ایک تصحیح اس مضمون کی پہلی قسط میں (جو اپریل ۱۹۶۵ء کے شمارے میں چھپی ہے) "ابتدائیہ" کی پہلی سطر یوں پڑھی جائے مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹) اردو کے مدرس، مصنف اور صحافی تھے۔ (قادری)

حضرت سید احمد شہید

پروفیسر فری لینڈ ایبٹ[1]

شاہ ولی اللہ صاحب کی کوششوں سے، سوائے اس کے کہ انہوں نے جن قوتوں کو منظم کرنے میں حصہ لیا تھا، انہیں میدان پانی پت میں ایک عارضی فتح حاصل ہو گئی، برصغیر پاک و ہند میں کسی قابل ذکر حد تک مسلمانوں کا زوال نہ رک سکا۔ بے شک شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادوں نے ایک حد تک ان کی تعلیمات کے سلسلے کو جاری رکھا اور ان میں سے دو نے تو قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ بھی کیا غرض شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادوں کی بدولت علوم اسلامیہ کا مکتب دہلی بدستور چلتا رہا۔

---

[1] پروفیسر فری لینڈ ایبٹ کے ایک مضمون کا ترجمہ و خلاصہ جس کا عنوان "سلطنت مغلیہ کا زوال اور شاہ ولی اللہ" تھا" الرحیم کے مئی ۱۹۶۲ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ یہ مضمون جس کا یہاں ترجمہ و خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے امریکہ کے مشہور رسالہ "دی مسلم ورلڈ" کے جولائی ۱۹۶۲ء کے شمارے میں چھپا ہے۔

اس مضمون کے مندرجات سے ہمیں اتفاق نہیں۔ یہ ایک دوسرے مذہب اور دوسرے ملک کے صاحب قلم کا حضرت سید صاحب شہید کا تاریخی تجزیہ ہے۔ اور ظاہر ہے اس نے اپنے نقطۂ نظر سے لسے کیا ہے، اگر کوئی صاحب اس کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں تو الرحیم کے صفحات حاضر ہیں۔ (مدیر)

اس عہد میں برصغیر کے مسلمان زعماء اسلامی احیاء چاہتے تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو مسلم سیاسی طاقت کی بحالی کے علاوہ کسی اور شکل میں اس کا تصور کر سکتا. گو مسلمان اپنی مذہبی قوت کا اندازہ برابر اپنی سیاسی طاقت ہی سے لگاتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے، کہ مسلمان علمائے دین کے نزدیک ان فوجی شکستوں کو روکنے کا تعلق جن کی وجہ سے مسلمانوں کے سیاسی وقار اور ان کی مذہبی قوت دونوں پر زد پڑ رہی تھی، مسلمانوں کے زوال کو روکا جا سکتا تھا۔ شاہ ولی اللہ کی عظمت یہ ہے کہ اس بارے میں ان کی نگاہ بہت گہری گئی اور ایک حد تک ان کی ناکامی کی وجہ بھی یہ ہوئی کہ ان کے معاصرین میں سے بہت کم کو یہ توفیق ملی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اسلام کو ایک ایسے عرب کی نظر سے نہیں دیکھا۔ جو ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ نما عرب کو متحد کرنے میں کوشاں ہو۔ بلکہ انہوں نے اسلام کو ایک ایسے غیر عرب کی نظر سے دیکھنے پر اصرار کیا، جو ایک ایسی سرزمین میں رہتا اور اس میں حکمراں ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں شاہ صاحب کے حقیقی اسلام کو دیکھنے کے نقطۂ نظر میں جو وسعت ہے وہ واقعی غیر معمولی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں بھی اس امر پر یقین تھا کہ مسلمانوں کا زوال اس وقت تک نہیں روکا جا سکتا جب تک کہ انہیں جنگ کے میدانوں میں فتوحات حاصل نہ ہوں، ورنہ کفار کا سیلاب انہیں ہر جگہ سے بہا کر لے جائے گا چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے سپاہیوں پر زور دیا کہ وہ غیر اسلامی عادات ترک کریں اور اپنے اندر جہاد کی روح پیدا کریں۔

جنوبی ہند میں میسور کے فرماں روا سلطان ٹیپو نے اپنے فوجیوں میں اسی جذبہ جہاد کو بیدار کر کے انگریزوں کی مخالفت کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود کئی بار اس نے اپنے مقابلے میں نظام حیدرآباد کی مسلمان فوجوں کو معرکہ آرا پایا اور اس ضمن میں اسلام کی اپیل چنداں کام نہ آئی۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء میں وہ انگریزوں کے خلاف لڑتا مارا گیا۔

شمالی ہند میں جہاد کے ذریعہ اسلام کے احیاء کا خیال ایک مسلمان حکمراں کے بجائے ایک پیشہ ور سپاہی[1] کو ہوا جن میں اسلام کا احساس بڑا گہرا پر خلوص اور شدید تھا۔

---

[1] مصنف کا حضرت سید احمد شہید کو پیشہ ور سپاہی کہنا بہت (باقی حاشیہ ص پر)

سید احمد شہید شاہ ولی اللہ کی وفات کے چھبیس سال بعد ۱۷۸۶ء میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ وہ چار سال چار ماہ اور چار دن کے تھے کہ مکتب میں داخل ہوئے، اور تین سال وہاں تعلیم پائی۔ بارہ سال بعد وہ دہلی گئے، وہاں دو سال تک شاہ عبدالقادر سے پڑھا اور شاہ عبدالعزیز سے بیعت کی۔ اس کے بعد جب وہ وطن لوٹے تو ان کا ایک خدا رسیدہ شخص کی حیثیت سے استقبال کیا گیا۔ یقیناً کچھ تو ان کے مثالی اخلاق کی وجہ سے اور کچھ اس بنا پر کہ شاہ عبدالعزیز ایسے مشہور بزرگ سے استفادہ کر چکے تھے۔ دو سال بعد وہ نواب امیر خاں کی رسالہ فوج میں شامل ہو گئے۔ اور سات سال وہاں رہنے کے بعد وہ شاہ عبدالعزیز کے پاس دوبارہ دہلی پہنچے اور انہی کے کہنے پر ان کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے داماد مولانا عبدالحیٰ نے سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کی یہاں سے آپ کی دعوت کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ اور ہزارہا ہزار آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔

سید احمد شہید کے مسلک کو "طریقۂ محمدیہ" کا نام دیا گیا۔ بعض مسلمانوں نے تو اسے عرب کی وہابی اصلاحی تحریک کی ہندوستانی شکل قرار دیا، جس سے انگریزوں نے فائدہ اٹھا کر اسے کہیں سے کہیں ملا دیا۔ بعض کے نزدیک "طریقۂ محمدیہ" ہندوستانی مسلمانوں کا ایک نیا طریقۂ تصوف تھا۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک تصوف کو لئے ہوئے اسلام کے احیاء کی تحریک تھی، جو اجتہاد کی اہمیت پر زور دیتی اور قرون وسطیٰ کے فقہاء کے فتووں کی اندھی تقلید کے اصول کا انکار کرتی تھی۔ اس میں اور عرب کی مشہور وہابی اصلاحی تحریک میں بہت سی باتوں میں مشابہت تھی سوائے اس کے کہ اس میں تصوف کا عمل دخل بالکل نہیں تھا۔ درحقیقت سید احمد شہید اس اشاراتی احتجاج کے سلسلہ کو جو شاہ ولی اللہ نے اپنے زمانے کے جمود خاص طور سے حنفی فقہ کی سخت گیری کے خلاف کیا تھا۔ آگے بڑھا رہے تھے۔ جس طرح شاہ ولی اللہ سماجی شعور رکھنے والے ایک صوفی تھے، اسی طرح سید احمد شہید خالص اسلام کے ایسے داعی تھے جو تصوف سے متاثر ہو۔

(بقیہ حاشیہ) بڑی زیادتی ہے حضرت سید صاحب نواب امیر خاں کی فوج میں شرکت پیشہ ورانہ بنیاد پر نہ تھی بلکہ اس کا مقصد برطانیہ کے خلاف جدوجہد میں عملی حصہ لینا تھا۔ (مدیر)

شاہ عبدالعزیز نے ایک دفعہ فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی زبان پڑھنے یا ایسے سکولوں میں تعلیم پانے میں جہاں انگریزی زبان پڑھائی جاتی ہے، کوئی حرج نہیں، لیکن ان جیسے بزرگ کی یہ سند بھی اس مدافعتی ردعمل کی اس زبردست لہر پر جس کی عملی مظہر سید احمد شہید کی ذات تھی اثر انداز نہ ہو سکی [1] اس زمانے میں اکثر مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے میں یہ خطرہ نظر نہیں آتا تھا کہ اس سے جدید سائنس یا مادیت کی راہ کھل جائے گی بلکہ وہ اسے عیسائیت قبول کرنے کی راہ کا پہلا قدم سمجھتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کی طرح سید احمد شہید پر بھی یہ بات بالکل واضح تھی کہ مسلمانوں کو جو وہ وعظ ونصیحت کر رہے تھے نہ تو سکھوں کو وہ متاثر کر سکتی تھی، نہ عیسائیوں ہی کو، چنانچہ وہ حتمی طور سے اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام کو نئی زندگی بخشنے اور مسلمانوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے وعظ ونصیحت اور محض عقیدت مندوں کو اپنے ارد گرد جمع کرنے سے کچھ زیادہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس وقت تک احیائے اسلام کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں، جب تک کہ ایک صحت مند سیاسی اور معاشرتی ماحول پیدا نہیں ہوتا، سید احمد شہید کو یقین تھا کہ اس کی واحد صورت صرف جہاد ہے۔ آپ کا اس سلسلے میں جہاد پر زور دینا ہی وہ خصوصیت ہے، جو آپ کو دوسرے صوفیہ سے ممتاز کرتی ہے۔

حج سے واپسی کے دو سال بعد ۱۸۲۶ء میں سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ جہاد دیکھنے میں تو بڑا اچھا لگتا تھا لیکن عملاً زیادہ کامیاب نہ تھا اس وقت اتنی بڑی تعداد میں حقیقی اسلام کے نام لیواؤں کا اس قسم کی مذہبی جنگ کے بارے میں اس قدر جوش و خروش یہ بتاتا ہے کہ مسائل کو عقلی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا وہاں کتنا نقدان پایا جاتا تھا جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو باوجود اپنی بڑی اعلیٰ تربیت یافتہ فوج اور اچھی قیادت کے اپنے ہم مذہب مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ بے شک وہاں اس کی راہ میں بڑی مشکلات تھیں لیکن ادھر شمالی ہند میں تو مشکلات اور بھی زیادہ تھیں۔

---

[1] سر سید احمد خاں کے مذہبی افکار - از بی اے ڈار (انگریزی)

اس معاملے میں سید احمد شہید کی مثال پوپ پائس پنجم سے زیادہ مختلف نہیں، پوپ مذکور نے ۱۵۶۹ء میں فیصلہ کیا کہ اگر کیتھولک مذہب کو انگلستان میں بچانا ہے، تو اسے لامحالہ کوئی عملی اقدام کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے انگلستان میں باغیوں کی حوصلہ افزائی کی اور ۱۵۷۰ء میں نہ صرف انگلستان کی ملکہ الزبتھ کو عیسائیت سے خارج کرنے کا اعلان کیا، بلکہ اسے تخت و تاج سے بھی محروم کرنے کا بھی حکم صادر کر دیا۔ پوپ پائس پنجم نے یہ اقدام اپنے بعض ان پیش روؤں کی تقلید میں کیا جو وہ اس سے پہلے زمانے میں یورپ کے بادشاہوں کے خلاف کیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۵۷۰ء کا یورپ ۱۲۰۰ء کا یورپ نہ تھا قرون وسطیٰ کے اس سب سے بڑے پاپائی ہتھیار سے ملکہ انگلستان کو کیتھولک مذہب کو دبانے کے لئے الٹی مدد ملی۔ میری ملکہ سکاٹ لینڈ جو الزبتھ کے مقابلے میں کیتھولکوں کی نمائندہ تھی، قتل کر دی گئی۔ انگلستان کے کیتھولکوں پر بڑی سختی کی گئی اور انگریزوں کا قومی جذبہ ملکہ الزبتھ کی حمایت میں بہت زیادہ جوش میں آ گیا لیکن اس کے سوا اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا یا تو پوپ مذکور خاموشی سے انگلستان میں پروٹسٹنٹ فرقے کی فتح تسلیم کر لیتا یا وہ یہ اقدام کرتا اسی طرح سید احمد شہید کے لئے بھی اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو خاموشی سے اسلام کا زوال اور سکھوں اور انگریزوں کی برتری تسلیم کر لیتے یا وہ یہ اقدام کرتے پوپ پائس پنجم کیتھولک مذھب کی خاطر لڑ رہا تھا۔ اس کی یہ لڑائی کسی خاص بادشاہ یا حکمراں کے لئے نہ تھی اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس لڑائی میں اس نے وہی طریقے اختیار کئے۔ جو ان حالات کے لئے اس کے مذہب نے معین کر رکھے تھے۔ سید احمد شہید بھی اسلام کے لئے لڑ رہے تھے۔ اور ان کی یہ لڑائی مغلوں اور کسی شاہی خاندان کے لئے نہ تھی۔ اور اس لڑائی میں انہوں نے وہی کچھ کیا جو اسلام کا معین کردہ تھا۔ ہو سکتا ہے ان دونوں مذہبوں نے اور کوئی متبادل طریقہ ہائے کار بھی پیش کئے ہوں۔ اور وہ ان مخصوص حالات میں کامیاب ہوتے لیکن یہ واقعہ ہے کہ نہ پوپ مذکور کو اور نہ سید احمد شہید کو اس وقت یہ طریقے سوجھے ان دونوں نے ایک منفی رویہ اختیار کیا، جب کہ زمانہ مثبت رویئے کا متقاضی تھا۔ پوپ پائس پنجم کی طرح سید احمد شہید سے بھی غلطی ہوئی۔ وہ حالات جن کی بنا پر قرون وسطیٰ میں عیسائیت سے خارج کر دینا اور تخت و

تاج سے محروم قرار دینا موثر ہوتا تھا۔ وہ اب نہیں رہے تھے۔ اسی طرح قرون وسطیٰ کے وہ حالات جو جہاد کو کامیاب کرنے کا باعث تھے، وہ اب نہیں رہے تھے۔

جنگی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس جہاد کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن بعد میں اس کے جو اثرات ہوئے انہوں نے انگریزوں کو کافی خوف زدہ رکھا۔ سید احمد شہید نے کوئی پانچ چھ سو رفقاء کے ساتھ یہ جہاد شروع کیا آپ نے میران سندھ سے مدد چاہی۔ لیکن وہ آپ کے بارے میں کچھ شکوک رکھتے تھے۔ بہاولپور کے حکمران نے اس معاملہ میں کوئی واضح موقف اختیار نہ کیا باوجود اس کے کہ اس کی رعایا کا سید صاحب کی طرف پرجوش رجحان تھا سردار بلوچستان کو جہاد سے دلچسپی ضرور تھی لیکن اس نے عملاً کوئی مدد نہ کی۔ مسلمان امراء کی طرف سے سید احمد شہید کے جہاد میں حصہ نہ لینے کی یقیناً یہ وجہ ہوگی کہ آپ نے اس سلسلے میں کوئی خاص تیاری نہ کی تھی۔ سید صاحب کی ایک باقاعدہ سپاہی کی سی فوجی ٹریننگ نہیں ہوئی تھی وہ ایک بے قاعدہ سپاہی کی حیثیت سے لڑ چکے تھے۔ اور ان کی جذباتی افتاد کچھ ایسی تھی کہ وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ یہ جنگ بے قاعدہ سپاہیوں کی نہیں ہے۔ آپ بلوچستان سے افغانستان گئے اور وہاں سے فوجی مدد چاہی۔ اگرچہ وہ افغانستان سے چند سو سپاہیوں کو جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہاں انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ خود مسلمان آپس میں بٹے ہوئے ہیں ان کا خیال تھا کہ جیسے ہی جہاد کا اعلان ہوگا مسلمان ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کے پاس جمع ہو جائیں گے۔

سید احمد شہید کا جہاد شروع سے لے کر آخر تک ایک مقصد کے ماتحت تھا اور ان کے سپاہیوں کی جو حالت تھی، اس کے پیش نظر یہ اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنی کامیابی کے انتہائی عروج میں آپ نے اپنی امامت قائم کی۔ تو جہاد جاری رکھنے کے لئے ایک مرکزی تنظیم تھی اگرچہ سید صاحب کو امام مان لیا گیا، لیکن کسی بھی سردار نے اپنا کوئی اختیار سید صاحب کے حوالے نہیں کیا۔ اور اس طرح جہاد کی مہم بے ترتیب ہی رہی ایک وقت ایسا بھی آیا انہوں نے اپنے ارد گرد اسی ہزار آدمی جمع کر لئے وہ کبھی بھی قبائلیوں کی جن پر ان کا سب سے زیادہ انحصار تھا پوری طرح وفاداری حاصل نہ کر پائے انہوں نے سید صاحب کو

کھانے میں زہر دیا۔ وہ عین لڑائی میں ان کا ساتھ چھوڑ دیتے اور سکھوں سے مل جاتے۔ سید احمد شہید کی فوجوں میں نہ تو نظم و ضبط تھا اور نہ اتحاد و یک جہتی۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے پہاڑی گاؤں میں وہ اچانک گھر گئے اور وہ ان کے مرید شاہ اسماعیل شہید اور دوسرے چھ سو ساتھی سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

سید احمد شہید کے جہاد کے پہلے مرحلے کا یہ انجام ہوا۔ اگرچہ یہ ناکام رہا، لیکن یہ پہلی کوشش تھی کہ مسلمان عوام سے ان کے حکمرانوں کو نظر انداز کر کے براہ راست جہاد کی اپیل کی گئی تھی۔ سید صاحب نے جن اسلامی اصولوں کی دعوت دی تھی، وہ سب کے سب آسان زبان میں منتقل کئے گئے تاکہ اس طرح عوام سے اپیل ہو سکے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی زمانے میں چونکہ ہندوستان میں اردو فروغ پانے لگی تھی، اس سے سید احمد شہید کی دعوت کو بڑی مدد ملی۔

سید صاحب کی دعوت کے مقبول عام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ دعوت اس اس زمانے سے ہم آہنگ تھی یہ زمانہ دنیا کے اکثر اور حصوں کی طرح ہندوستان میں بھی مذہبی اصلاح کا تھا۔ ہندوؤں میں برہمو سماج کی تنظیم کے تحت اس قسم کی مذہبی اصلاح کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اس مذہبی بیداری کو عام طور سے ان عیسائی مشنریوں کا ردّ عمل بتایا جاتا ہے، جو شروع شروع میں یہاں آئے تھے۔ برہمو سماج (خدائی سماج) تو صاف عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا جواب معلوم ہوتا ہے، چونکہ اس کی نوعیت یہ تھی اس لئے لازمی تھا کہ برہمو سماج کی یہ تحریک محض مدافعانہ نہ ہو، چنانچہ رام موہن رائے نے اخلاقی وحدانیت پر زور دیا جس کا سراغ انہیں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں ملا تھا اور یہ اخلاقی وحدانیت ایک طرح کا مثبت نظام دینیات تھا۔ جس سے عیسائی مشنریوں کا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مذہبی اصلاحی تحریک کا تعلق ہے، اس کی جڑیں اور آگے جاتی ہیں۔ ظاہر ہے نہ شاہ ولی اللہ اور نہ ان کے دونوں صاحبزادوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر پر عیسائی افکار کا کوئی اثر پڑا تھا۔ رام موہن رائے نے جس چیلنج کا مقابلہ کیا، اس سے بالکل مختلف چیلنج مسلمانوں کی مذہبی بیداری کو درپیش تھا اور اس کا جواب انہوں نے یہ ڈھونڈا کہ

ابتدائی یعنی قرن اوّل کے اسلام کی طرف لوٹا جائے اس وقت عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہر مسلمان اس حقیقی اسلام سے واقف ہے۔ یہ تو انیسویں صدی کے اواخر میں سر سید احمد خاں ہی تھے، جنہوں نے سب سے پہلے اسلام کے معاملے میں نئی چیزوں پر زور دیا اور اس کی نئی تعبیر کی۔ سید احمد شہید نے تو اسی اسلام کی دعوت دی جو انہوں نے اپنے بزرگوں سے پڑھا تھا وہ انہیں اسلامی روایات کے حامل تھے جو ان کے نزدیک صحیح معنوں میں اسلامی روایات تھیں۔ اس ضمن میں انہوں نے صرف اتنا کیا کہ انہیں ایک نئی تنظیمی شکل دی اور اس کے لئے عوامی اپیل فراہم کی۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ بات بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں کے بعض گروہوں نے جس جوش و خروش سے سید احمد شہید کی دعوت کو لبیک کہا، اس کا ایک محرک وہ ردّعمل بھی تھا، جو عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے ان گروہوں میں پیدا ہوا تھا اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ سید احمد شہید کے معتقدین پورے شمالی ہند میں کافی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے، ان علاقوں میں بھی جہاں عیسائی مشنری سرگرم کار تھے، اور وہاں بھی، جہاں ان کی دسترس نہ تھی۔

وہ مسلمان حکمراں جنہوں نے اس بنا پر سید احمد شہید کے جہاد میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کے لئے پوری تیاری نہ کی گئی تھی، صحیح ثابت ہوئے۔ بھلا سید صاحب کے لشکر کا سکھوں کی ڈسپلن اور نظم و ضبط رکھنے والی، ہتھیاروں سے مسلح اور قابل افسروں کے ماتحت فوج سے کیا مقابلہ[1]۔ لیکن اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کے باوجود سید احمد شہید مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حصے میں بے حد ہردلعزیز تھے۔ اور ان کی شہادت کے بعد اس ہردلعزیزی میں اور بھی اضافہ ہو گیا بات یہ ہوئی کہ چونکہ میدان جنگ میں سید صاحب کی نعش نہیں ملی تھی، اس لئے یہ مشہور ہو گیا کہ وہ زندہ بچ کر نکل گئے ہیں اور نئے سرے سے جہاد کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں اس عقیدۂ غیبت کی بعد میں پھر شہرت ہوئی۔ اور جہاں تک

---

[1] سکھوں کے بعض فوجی دستے ان یورپی افسروں کے تربیت یافتہ اور ان کی کمان میں تھے جو نپولین بوناپارٹ کی جنگوں کے بعد یورپ سے نکل کر ادھر ادھر قسمت آزمائی کر رہے تھے۔

سید صاحب کی نعش نہ ملنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ میدان جنگ ہی میں پہچان لی گئی تھی اور سکھوں نے اسے جلا دیا تھا۔

سید احمد شہید کے جہاد کی ناکامی نے بڑے واضح طور سے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ ہندستان کے مسلمان متحد نہیں ہیں۔ انہیں اپنی دعوت اور جہاد کے دوران ہمیشہ مولویوں کے ایک گروہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو مذہب میں ان کے اصلاحی مسلک کو ناپسند کرتا تھا۔ اب جہاد کے لئے اتحاد و یک جہتی کی ضرورت تھی کیونکہ اسی سے ایک جماعت میں قوت پیدا ہوتی ہے لیکن اس کا ہندوستان کے مسلمانوں میں مجدد الف ثانی کے دور سے پہلے ہی سے فقدان تھا۔ سید احمد شہید کی شہادت کے بعد اگرچہ ان کی جماعت کی تنظیم برابر بروئے کار رہی، لیکن وہ تین گروہوں میں بٹ گئی۔

قرآن مجید کا ترجمہ، "فتوح الغیب" کی توحید اور جہاد اپنے اصلی معنوں میں یہ تھا ہمارا مقصد جس پر ہم نے اپنی علمی سرگرمیوں کا مدار رکھا امروٹ (ضلع سکھر) میں ہم یہی چیز پڑھاتے رہے مسئلہ جہاد کی توضیح اور اس کی تعبیر کے لئے ہمیں امام ولی اللہ، امام عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کی تاریخ اور ان کے حالات پڑھانے کی ضرورت پڑی بات یہ تھی کہ جہاد کو محض عقلی طور پر سمجھا دینا ہمارے نزدیک کافی نہ تھا ہم چاہتے تھے کہ طلبا کے سامنے اس کا عملی طریقہ بھی پیش کریں اور سب جانتے ہیں کہ امام ولی اللہ سے لے کر مولانا اسمٰعیل کی شہادت تک اس خاندان کا جہاد کے واقعات سے خصوصی تعلق رہا ہے ہم نے دیوبند میں زمانہ طالبعلمی کے دوران میں اس خاندان والا تبار کے حالات بزرگوں سے سنے تھے چنانچہ اب جو ہم نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تو ہم یہ کرتے کہ پہلے تو قرآن مجید سے جہاد کا مسئلہ طلبہ کو سمجھاتے بعدہٗ صحیح احادیث سے اس پر روشنی ڈالتے پھر صحابہ رضوان اللہ علیہم کے حالات زندگی اس بارے میں پیش کرتے اور اس کے بعد امام ولی اللہ کے طریقہ سے اس ... جہاد کو منطبق کرتے اور آخر میں طلبہ پر واضح کرتے کہ کس طرح آج کے زمانے میں موجودہ حالات کے مطابق جہاد کا حکم قابل عمل ہو سکتا ہے۔

(مولانا عبید اللہ سندھی)

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلوی کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں

مرتبہ :- مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

اب سے پانچ سال پیشتر عالی جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی مرحوم و مغفور کے زمانۂ حیات میں ان کی اجازت اور مولانا سید ابوالحسن ندوی زید مجدہم کی وساطت سے مجھے ان کے خاندانی نوادر اور مخطوطات دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اب اسی رمضان میں لکھنؤ گیا تو مولانا محمد میاں سلمہم اللہ صاحبزادۂ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی مرحوم نے ازراہِ کرم فرمائی دوبارہ ان نوادر کے مطالعے کا موقع دیا جن کی مدد سے اپنے اس مقالے کو مرتب کر رہا ہوں ــــ اسی ماہ رمضان میں دوسری مرتبہ حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کے ہمراہ رائے بریلی حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہاں دائرۂ حضرت شاہ علم اللہ حسنی قدس سرہٗ اور اس کے آثار باقیہ نے دونوں مرتبہ میری روح کو پیام سکون اور میرے دل و دماغ کو دعوت کیف و نشاط دے کر تاریخ ماضی کا ایک زریں باب میری تصور کی آنکھوں کے سامنے کھول دیا۔ یہ حضرت شاہ علم اللہؒ کی تاریخی مسجد ہے جس میں ہزاروں اہل اللہ سربسجود ہوئے ہیں اور علم و ذکر کے حلقے مدتوں اس میں قائم رہے ہیں۔

---

[1] ماہنامہ الفرقان لکھنؤ سے شکریہ کے ساتھ یہ مضمون نقل کیا جاتا ہے۔ (مدیر)

تقویٰ اور سعادت ابدی کی بنیادوں پر یہ مسجد کھڑی کی گئی ہے ـــ آج بھی اس کے در و دیوار سے دل کی آنکھوں کو خاص کیفیات محسوس ہوتے ہیں ۔ اس کی طرز تعمیر کو دیکھ کر آثار متبرکہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ حضرت شاہ علم اللہ نے گریۂ شب اور آہِ سحر میں مشغول رہ کر اتباع سنت اور متابعت شریعت کے جذبے کے ساتھ اسی مسجد میں اپنے فیوض و برکات کو تقسیم کیا ہے ۔ ان کی باکمال اولاد اور اولاد کی اولاد نے جن میں ہر ایک آفتاب و ماہتاب اور گوہرِ شب چراغ تھا۔ اس مسجد کے محراب و منبر اور سقف و بام اپنے اپنے زمانے میں روحانیت کی روشنی سے روشن اور منور رکھا ہے اور درس توحید و معرفت اور درسِ کتاب و سنت سے اس مسجد کی فضاؤں کو معمور کیا ہے انہیں تعلیمی و تذکیری حلقوں کی تاثیر سے حضرت سید احمد شہید جیسا مرد مجاہد اور غازی علم اللہی خاندان میں نمودار ہوا جس نے اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر ملت اسلامیہ کی سرسبزی و شادابی کے لئے امت مسلمہ کی سربلندی اور سرافرازی کے لئے ایک نقشہ بنایا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ بالاکوٹ کے میدان میں مع اپنے رفقاء کے شہید ہو کر حیات ابدی سے ہمکنار ہوا۔ اور مستقبل کے لئے ایک ایسی فضا قائم کر دی کہ نعرۂ حق و صداقت گوشے گوشے میں بلند ہوتا رہے اور ایمان و یقین کے جھنڈے اونچے رہیں۔

یہ سئی ندی ہے، مسجد کے جنوب میں بہ رہی ہے۔ ندیاں تو اور بھی بہت سی ہیں مگر اس میں رونق ہی کچھ اور ہے۔ سکوت شام کے وقت اس کا سکوت گوشِ دل کو ایک مستقل داستان سناتا ہے، صبح کے سہانے وقت میں اس کی دل آویزی اور بڑھ جاتی ہے۔ کتنے اولیاء اللہؒ نے اپنے مبارک قدوم سے اس کے کناروں کو سرفرازی بخشی ہوگی، کتنے مجاہدین اور ذاکرین نے اس ندی سے وضو کیا ہوگا؟ شام و سحر میں جب چڑیاں ندی کے کنارے مسجد کے بام و در پر اور قریب کے ہرے بھرے کھیتوں پر چہچہاتی ہیں تو ایک خاص کیف حاصل ہوتا ہے اور قلب و دماغ میں یاد ماضی کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔

یہ حضرت شاہ علم اللہؒ آغوشِ لحد میں سو رہے ہیں۔ یہ سادات قطبیہ کے چشم و چراغ ہیں حضرت شاہ آدم بنوری قدس سرہٗ کے خلیفہ یعنی صرف ایک واسطے سے حضرت مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہٗ کے فیض یافتہ ہیں۔ ان کا تقویٰ اور جذبۂ اتباع سنت، اللہ اکبر۔

تاریخیں اور تذکرے ان کے ذکر خیر سے لبریز ہیں۔ ان کی باکمال اولاد کی قبریں ان کے پہلو میں اور آس پاس ہیں۔ یہیں ہندوستان کا ایک مایۂ ناز عظیم مورخ (جس کو مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنیؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) محو آرام ہے، یہیں حکیم صاحبؒ کے والد ماجد حضرت مولانا سید فخرالدین حسنیؒ مدفون ہیں جنہوں نے مہر جہانتاب لکھ کر اپنے محقق صاحبزادے کے لئے تاریخ و تذکرہ کی شاہراہ قائم کی۔ یہیں حکیم صاحب کے لخت جگر ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ بھی دفن ہیں جنہوں نے اپنے والد ماجد کے جواہر پاروں اور شاہکاروں کو محفوظ رکھا، شائع کرایا اور اپنے خاندان کی ایک ایک روایت کو اپنے سینے اور سفینے میں ثبت کیا، جن کے دینی کارناموں میں ایک زبردست کارنامہ یہ بھی ہے کہ اپنے برادر عزیز (مولانا علی میاں مدظلہ) کی تعلیم و تربیت کا انتظام ایک خاص نصب العین کے ماتحت کیا جس کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان کے تعلیمی و روحانی حلقوں اور عالم اسلامی سے ایک مفید رابطہ قائم ہوا بلکہ یورپ کے مادہ پرستانہ ایوانوں میں بھی غلغلۂ توحید اور نعرۂ صداقت بلند ہوگیا۔ آج اس خاندان کی روایات کہن انہیں مولانا علی میاں مدظلہ سے زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے خاندان کو صحت و عافیت سے رکھے اور ملت بیضا کو تادیر ان سے مستفیض رکھے۔ (آمین)

احاطۂ مزار حضرت شاہ علم اللہؒ سے کچھ فاصلے پر ایک عظیم شخصیت سپرد زمین ہے، یہ حضرت شاہ ابو سعید حسنیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا ہیں۔ ان کے مزار پر ولی اللہی فیوض و برکات مجھ جیسے دور از کار کو بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اس باعظمت شخصیت نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے کس قدر فیض حاصل کیا تھا اور ان کے خاندان سے کس قدر ربط و تعلق تھا اس کو تفصیل سے لکھوں تو مستقل ایک رسالہ ہوجائے مگر مجھے تو ایک مقالہ لکھنا ہے۔ آنے والا مورخ توفیق پائے گا تو ان کے مزید حالات خاندانی مخطوطات اور دستاویزوں سے لکھے گا۔ میں اس مقالے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت شاہ اہل اللہ پھلتیؒ، حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، حضرت شاہ نوراللہ بڈھانویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے مکتوبات بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی کہیں کل کہیں اقتباس اور تلخیص کی شکل میں مع ترجمہ پیش کر رہا ہوں جن سے تاریخ کے طالب خصوصاً ولی اللہی سلسلے کی معلومات کے خواہاں کے لئے بہت سی

ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو کسی تاریخ اور تذکرے میں نہیں ہیں۔

خود حضرت شاہ ابو سعیدؒ کے مکتوبات اور واردات جو انہوں نے اپنے پیر و مرشد اور دیگر حضرات اکابر کو لکھ کر بھیجے ہیں۔ اس مقالے میں شامل کردوں تو میرا مقالہ شکوۂ کوتاہی داماں کرنے لگے۔ اس لئے حضرات رائے بریلویؒ کی بعض تحریرات بقدر ضرورت کہیں کہیں بطور تلخیص پیش کردوں گا۔ بعض اکابر نے حضرت رائے بریلوی کے صاحبزادے میاں سید ابو اللیثؒ کو بھی (جو ان مکتوبات اکابر کے جامع ہیں) گرامی نامہ بھیجا ہے اس کو بھی حسب موقع شامل مقالہ کیا جائے گا۔ آخر میں میر محمد نعمان رائے بریلویؒ (حضرت میر ابو سعیدؒ کے برادر عم زاد) کا ایک مفصل مکتوب بھی اس مقالے میں ترجمہ کے ساتھ شامل کیا جائے گا جس میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی وفات کے مکمل حالات ہیں۔ اور جس سے آخری وقت میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے اپنے عزیز و محبوب مرید کو یاد کرنے کا پتہ چلتا ہے یہ بھی تاریخ کی ایک نادر چیز ہے۔

اب میں حضرت شاہ ابو سعیدؒ کے مختصر حالات لکھتا ہوں۔

حضرت شاہ ابوسعید رائے بریلوی کے مختصر حالات

میر شاہ ابو سعید بن سید محمد ضیا بن سید آیت اللہ ابن شیخ الاعظم میر شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی رحمہم اللہ۔ آپ رائے بریلی میں پیدا ہوئے، مولانا عبداللہ[1] امیٹھوی سے تحصیل علم کی، بعدہٗ اپنے چچا سید محمد صابر ابن سید آیت اللہ نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے۔ (جو حضرت خواجہ محمد معصوم کے صاحبزادے خواجہ محمد صدیقؒ کے خلیفہ تھے) ایک مدت ان کے بتائے ہوئے اشغال میں مشغول رہے اپنے والد کے خلیفہ میر محمد یونسؒ سے بھی اپنے آبائے کرام کی روحانی نسبت حاصل کی پھر دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے روحانی تعلق پیدا کرکے ان سے اخذ فیض کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے وصال کے بعد ان کے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ

---

[1] مولانا عبداللہ حنفی امیٹھوی علامہ نظام الدین فرنگی محلیؒ کے شاگرد رشید تھے

کی طرف رجوع ہوئے اور ان سے مابقی سلوک طے کیا۔ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی نے ان کو خلافت نامہ لکھا جس میں تحریر ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے فیض توجہ سے ان کو وہ احوال و آثار ظاہر ہو چکے تھے جو صوفیا کے نزدیک انتہائی مدارج کے ہیں۔ جب حضرت شاہ صاحبؒ کا وصال ہو گیا تو انہوں نے قصد کیا کہ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، وغیرہا طرق کے مطابق اشغال نفیسہ حاصل کریں۔ جب میں نے ان کو اس کا شائق پایا تو ان کے مقصد کو پورا کیا اور اس راہ میں ان کے کمال کا مشاہدہ کر کے اجازت دی۔ جس طرح مجھے میرے شیخ معظم (حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ) نیز میرے والد ماجد شیخ عبیداللہ پھلتیؒ نے مجھے اجازت دی تھی۔ میں نے ان کو اس کی اجازت دی کہ بعد مطالعہ و مراجعت شروح، تفسیر و حدیث اور فقہ و تصوف وغیرہ کا درس بھی دیں۔" علاوہ کمالِ علم ظاہر و باطن حضرت میر ابوسعید جلیل الوقار، کریم النفس اور مہمان نواز بزرگ تھے۔ ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ کو مکہ معظمہ پہونچے اور حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے وہاں چھ ماہ اقامت کی اور شیخ ابوالحسن سندھی الصغیرؒ کے حلقۂ درس میں مصابیح کی سماعت کی، ایک مرتبہ مواجہہ شریف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوا۔ آپ کے خلیفہ شیخ امین الدین کاکوروی نے اپنے رسالے میں لکھا ہے کہ خود حضرت شاہ ابوسعیدؒ فرماتے تھے کہ میں نے مدینہ منورہ میں اپنی ان ظاہری آنکھوں سے آقائے نامدار حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ بعدہٗ مکہ معظمہ واپس ہوئے اور وہاں جزریہ قاری میرداد انصاری سے پڑھی۔ تجوید کے یہی استاد معرفت و سلوک میں آپ کے خلیفہ ہوئے ۱۱۸۸ھ میں ہندوستان آئے اور مدراس میں داخل ہوئے وہاں ایک زمانے تک مقبولِ خواص و عوام ہو کر رہے۔ اس علاقے کے غربا، و روٴسا نے آپ سے آخرت کا نفع حاصل کیا۔ ۹، رمضان ۱۱۹۳ھ کو وفات پائی۔ رائے بریلی تکیہ حضرت شاہ علم اللہؒ میں دفن ہوئے۔ آپ کے حسب ذیل ممتاز اور جلیل القدر خلفاء تھے۔

۱۔ میر عبدالسلام بدخشانیؒ (۲) قاری شیخ میرداد انصاری مکیؒ (۳) مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطبؒ (۴) مولانا عبداللہ آفندیؒ (۵) شیخ عبداللطیف حسینی مصری۔

۶۔ حاجی امین الدین کاکورویؒ (۷) شاہ عبدالقادر خالص پوریؒ

(ماخوذ از نزہتہ الخواطر جلد (۶) و سیرۃ سید احمد شہید جلد اوّل طبع چہارم و مجموعہ نوادر قلمی نزد مولانا محمد میاں صاحب حسنی مدیر البعث لکھنؤ)

مکتوباتؒ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بنام

حضرت شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلویؒ

۱- حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر میر سید ابوسعید سلمہم اللہ تعالیٰ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد از سلام محبت التزام مطالعہ نمایند۔ الحمد للہ رب العلمین علیٰ عافیۃ الطرفین نامہ مشکیں شمامہ متضمن بعض مشاہدات متعلقہ بلطیفۂ خفیہ و اخفیٰ رسید در برابر آں شکر الٰہی بجا آوردہ شد، ایں راہ کہ میروند ہما طریق مستقیم است کہ اکابر اہل عرفان رفتہ اند ہیچ دغدغہ خاطر ایشاں را مشوش نسازد...... بالجملہ انچہ خدائے تعالیٰ عطا کردہ است نعمتے است عظیمہ برآں از جان و دل شکر کنندہ و متوقع مزید باشند و انچہ از نور محمدی علیٰ صاحبہ الصلوات والتسلیمات دیدہ اند نمائش است از نسبت اویسیہ، سابق آرزوے ایں نسبت داشتند، الحمد للہ کہ حاصل شد ـــ برائے خفقان خواندن یا حمید مفید خواہد بود متفرق در اوقات صلوٰۃ خمس و خواہ یک جا ہزار بار۔ درباب وجہ معاش و آسودگی ایشاں متفکر نباشند ہر چہ میگذرد و ہمہ حکمت حق است و نافع است بنسبت شما ھر چند

۱؎ مجموعۂ نوادر حضرت شاہ صاحبؒ کے گیارہ مکتوبات ہیں جن میں نے اس مقالے میں دس مکتوبات کل یا تلخیص کے طور پر لئے ہیں ۔ ان مکتوبات کو مولانا سید ابوالقاسم بن سید محمد عبدالعزیز ہنسوی نے سنہ ۱۳۰۱ھ میں مکتوب المعارف کے نام سے مع عرضداشت شاہ ابوسعیدؒ مطبع مطلع الانوار سہارن پور میں شائع کرا دیا تھا۔

یہ رسالہ اب کمیاب ہے ـــ بقیہ دوسرے اکابر کے مکتوبات جو اگلی قسط میں آئیں گے غیر مطبوعہ ہیں۔

نافیت معلوم نباشد من روشن خواہد شد والسلام۔ فقیرزادہ و والدہ ایشاں سلام می رسانند و متوقع دعائے خیر ہستند کہ دعائے مومن برائے برادر غائب مستجاب است۔

ترجمہ حقائق و معارف آگاہ و سیادت و نجابت دستگاہ ......

میر سید ابو سعید سلمہم اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام مطالعہ فرمائیے۔ طرفین کی خیر و عافیت پر اللہ رب العلمین کی حمد ہے۔ آپ کا نامہ مشکبو شمامہ جو بعض مشاہدات متعلقہ بلطیفۂ خفیہ و اخفیٰ کے بارے میں لکھا تھا۔ پہونچا۔ شکر الٰہی ادا کیا گیا۔ یہ راستہ جس پر آپ چل رہے ہیں وہ صراط مستقیم ہے جس پر اکابر اہل عرفان گامزن ہوئے ہیں۔ کسی قسم کا دغدغہ آپ کے دل میں نہیں ہونا چاہیئے ..... حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ خداوند کریم نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ ایک عظیم نعمت ہے اس کے حصول پر جان و دل سے شکر کریں اور مزید نعمت کی توقع رکھیں۔ اور نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم جو دیکھا ہے وہ بعض بلند اولیہ کا ظہور ہے۔ پہلے سے اس نسبت کی آرزو رکھتے تھے الحمدللہ کہ اب حاصل ہو گئی۔ دل کی گھبراہٹ کے دفع کرنے کے لئے یا حمید پڑھنا مفید ہوگا — ایک ہزار مرتبہ — خواہ متفرق پانچوں نمازوں کے اوقات میں خواہ ایک جگہ — وجہ معاش اور آسودگی کے بارے میں متفکر نہ ہوں جو صورت گزر رہی ہے وہ عین حکمت الٰہی ہے اور آپ کے حق میں نافع ہے۔ اگرچہ بالفعل اس کی نافیت معلوم نہ ہو بالآخر اس کا نافع ہونا واضح ہو جائے گا والسلام — فقیر کے لڑکے اور اس کی والدہ سلام کہتے ہیں اور دعائے خیر کے متوقع ہیں اس لئے کہ برادر غائب کے

حق میں دعائے مومن مستجاب ہوتی ہے۔

(۲) سیادت ونقابت پناہ حقائق ومعارف آگاہ سلالۃ الاکابر میر سید ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ، بعد سلام محبت التیام مطالعہ نمایند۔ الحمد للہ علی العافیۃ والمسؤل من فضلہ ان یدیم العافیہ لنا ولکم ۔ بعد انتظار بسیار رقیمہ کریمہ متضمن بعض معارف و بعض اسولۂ ضروریہ رسید چوں مشعر بعافیت وسلامت ایشاں بود مع اولاد و اتباع موجب کمال سرور و باعث حمد الٰہی شد۔۔۔ والسلام از اندرون خانہ سلام خوانند ہمیشہ خیریت ایشاں مسئول از جناب رب العزت می باشد آنچہ از ایذا ئے برادراں نوشتہ بودند معلوم شد خوسعی در ایذائے کسے نکنند خدائے تعالیٰ نصرت خواہد داد امیر محمد معین و میر محمد امام ومیاں یونس سلام خوانند برخوردار سعادت اطوار میر ابو اللیث دعوات خوانند فرزند ابو القاسم مبارکباد خدائے تعالیٰ بعافیت دارد۔ از عبدالعزیز سلام نیاز قبول باد۔

ترجمہ۔ سیادت پناہ حقائق و معارف آگاہ ......
میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التیام مطالعہ کریں — خیر و عافیت پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے فضل سے اس بات کا خواہاں ہوں کہ وہ مدام ہماری اور آپ کی عافیت کو برقرار رکھے۔ بڑے انتظار کے بعد آپ کا مکتوب جو کہ بعض معارف اور بعض سوالات ضروریہ پر مشتمل تھا۔ پہونچا۔ چونکہ وہ مکتوب آپ کی اور آپ کی اولاد و متعلقین کی عافیت و سلامتی سے آگاہی دینے والا تھا اس لئے موجب کمال مسرت اور باعث حمد الٰہی ہوا...... والسلام اندرون خانہ سے (اہلیہ کی طرف سے) سلام — آپ کی خیریت ہمیشہ جناب رب العزت

سے چاہی جاتی ہے۔ جو کچھ بھائیوں کی ایذادہی کے متعلق
لکھا تھا معلوم ہو گیا خود کسی کو ایذا دینے کی سعی نہ کریں اللہ تعالیٰ
مدد فرمائے گا۔ میر محمد معین میر محمد امام اور میاں محمد یونس کو سلام
برخوردار سعادت اطوار میر ابواللیث کو دعائیں۔ فرزند ابوالقاسم
مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ عافیت سے رکھے۔ عبدالعزیز کا سلام نیاز
قبول ہو۔

(۳) سیادت و نقابت مآب حقائق و معارف آگاہ سلالۃ الکرام میر ابوسعید سلمہ اللہ تعالےٰ۔
از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمائند۔ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول
من اللہ عزوجل ان یدیم العافیۃ لنا ولکم ــــ اجمالاً ہمیشہ در حق ایشاں طلب
کردہ می آید کہ خدائے عزوجل ہم در ظاہر نعمت خود دہد و بغیر خود محتاج نگذارد و ہم در باطن امانت
وانعام فرماید تا بر جادۂ آبائے کرام مستقر ماندہ بہمہ جہت مرضی باشند انّہٗ قریبٌ مجیب
اگر نجیب الدولہ در باب آں عزیز القدر خط مؤثر نویسد وجہ بدار ہمراہ کند می باید باں طرف
رفت متوکلاً علی اللہ و معتمداً علیہ ــــ وایں را یکے از انواع تیسیر الٰہی دانند واگر گرمی ہوا
بہم رسد اینجا تشریف آوردہ رمضان اینجا گزرانیدہ باہستگی قصدِ وطنِ مالوف نمائند خدائے
عزوجل ہر چہ ادفق واصلح باشد ہمارا بظہور آرد والسلام۔ خان عزیز القدر ابراہیم خان علیہ
از فقیر سلام و دعوات خوانند و شیخ غیاث الدین و سادات دیگر ہر کہ آنجا باشد سلام محبت
شام مطالعہ نمائند۔ محمد فصیح بخدمت ایشاں می رسد در کار معہود ہر قدر ممکن باشد توجہ
خواہند نمود احتیاج ابرام نیست والسلام۔

ترجمہ ۔ سیادت مآب حقائق و معارف آگاہ ....
میر ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے
بعد سلام مطالعہ کریں ۔ عافیت پر اللہ کا شکر ہے ۔ اللہ تعالیٰ
سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے
رکھے ۔ اجمالی طور پر ہمیشہ آپ کے حق میں یہ دعا کی جاتی

ہے کہ خدائے عز و جل آپ کو ظاہر میں بھی اپنی نعمت سے نوازے اور اپنے علاوہ کسی کا محتاج نہ کرے اور باطن میں بھی اعانت و انعام فرمائے تاکہ اپنے آبائے کرام کے راستے پر قائم رہ کر ہر طریقے سے پسندیدہ ثابت ہوں انشاء اللہ قریب عجب ۔ اگر نجیب الدولہ آلعزیز کے سلسلے میں کوئی موثر خط لکھ دیں اور چوبدار ہمراہ کر دیں تو اللہ پر توکل اور بھروسہ کر کے اپنے وطن کی طرف جائیں ۔ اور اس سہولت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی آسانی تصور کریں ۔ اگر گرمی شوق ہم پہونچے تو پھر رمضان ہمارے یہاں آکر گزاریں اور اطمینان سے قصد وطن مالوف کریں جو صورت بھی بہتر ہو اللہ تعالیٰ اس کو ظہور میں لائے ۔
والسلام خان عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں کو فقیر کی طرف سے سلام و دعا اور شیخ غیاث الدین اور دیگر سادات جو وہاں لشکر میں ہوں ۔ سلام محبت مشام مطالعہ کریں ۔ محمد فصیح آپ کی خدمت میں پہنچ رہے ہیں کار معہود میں جس قدر ممکن ہو توجہ کریں ۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں[1] ۔

---

[1] میر ابو سعیدؒ جائدادی معاملات میں اپنے وطن سے نجیب الدولہ کے پاس تشریف لے گئے تھے غالباً نجیب الدولہ کا لشکر اس زمانے میں ضلع میرٹھ میں کہیں تھا ۔ اس وقت مرہٹوں کا شدید ہنگامہ تھا ۔ وطن کی واپسی میں دشواریاں پیش آئیں ۔ بالآخر رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں کی ہمراہی میں میر ابو سعیدؒ اپنے وطن پہونچے جیسا کہ ایک دوسرے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے ۔ ابراہیم خلیل خاں کے حالات کی جستجو ہے ابھی تک ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے ۔ مکتوب گرامی پر تاریخ بھی نہیں ہے جس سے معلوم ہو جاتا کہ یہ کس زمانے کا واقعہ ہے ۔ اندازہ یہ ہے کہ جنگ پانی پت سے کچھ پیشتر کی بات ہے ۔

(۴) ایک مکتوب گرامی کے آخر میں ارقام فرماتے ہیں۔

...... بدست ہر آئندہ این صوب احوال ظاہر و باطن خود می نوشتہ باشند کہ خاطر نگراں جانب ایشاں می ماند۔

اس طرف کے ہر آنے والے کے ہاتھ اپنے احوال ظاہر و باطن لکھ کر بھیجتے رہیے اس لئے کہ دل آپ کی طرف نگراں رہتا ہے۔

(۵) حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمایند۔ الحمد للہ علی العافیہ۔ نامہ مشکیں شمامہ رسید احوال باطن کہ نوشتہ بودند ہمہ بہر نہج صوابست آنچہ سابق واضح شدہ بود از لطیفہ سر بود و آنچہ الحال واضح شد از لطیفہ خفیہ است ہمہ خیر است و ہمہ بر نہج صواب است ان شاء اللہ تعالیٰ بتفصیل دیا توفیق با شریعت نوشتہ شود الحال وقت تنگ است دو ٹوکری بہنگی انبہ رسید دیکے بخانہ میاں اہل اللہ رسید جزاکم اللہ خیر الجزاء از اندرون خانہ واز فقیر زادہا واز خواجہ محمد امین وجمیع اہل مدرسہ سلام خوانند۔

ترجمہ حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں۔ الحمد للہ عافیت سے ہوں۔ نامۂ مشکیں شمامہ پہونچا۔ احوال باطن جو لکھے تھے سب صحیح ہیں جو حال پہلے ظاہر ہوا تھا لطیفۂ سر سے تھا اور جو کچھ اب واضح ہوا ہے لطیفۂ خفیہ سے ہے سب بہتر ہے اور درست ہے اگر اللہ نے چاہا تو شریعت کے تطابق کے ساتھ تفصیل سے آیندہ لکھا جائے گا اب وقت تنگ ہے۔ آموں کی دو بہنگیاں مجھ کو ملیں اور ایک میاں اہل اللہ کے گھر پہونچی اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے۔ اندرون خانہ فقیر زادوں نیز خواجہ محمد امین اور تمام اہل مدرسہ کی طرف سے سلام پہونچے۔

(۶) ..... بالجملہ بخاطر جمع دریں سیر و سلوک سعی نمانند ہمہ موافق سیر صوفیہ است وہم مطابق شریعت دریں سخن آخر طول وعرضے دارد کہ بالفعل در نوشتن نمی آید۔

الغرض دلجمعی کے ساتھ سیر و سلوک میں سعی کریں یہ سب کچھ سیر صوفیہ کے موافق ہے اور مطابق شریعت بھی ہے مطابقت شریعت والی بات ذرا طول وعرض رکھتی ہے فی الحال نہیں لکھی جا رہی ہے

(۷) حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نقابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالےٰ۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ، بعد سلام محبت التزام مطالعہ نمانند۔ الحمد للہ علی العافیہ ازاں بازکہ بسبب ہجوم مرہٹہ انتقال از میرٹھ نمودہ ہمراہ رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں آں گزار گنگا رفتند۔ مدتے گزشتہ کہ احوال خیریت مآل آں عزیز القدر لشنیدہ بودم۔ الحمد للہ نامہ نامی ایشاں رسید۔ موجب تسکین خاطر فاطر گشت مبدء را اجمال و عالم را تفصیل نوشتہ بودند وانہ مشاہدہ ایںصورت انس و سرور و از استتار آں تفرقہ و حزن می خیزد ایں ہمہ موافق قاعدہ است راہیکہ سلف رفتہ اند ہمیں راہ راست ہیچ تردد بخاطر نہ دہند یک تعویذ نو اسیر برائے بستن ...... دو دیگر برائے شستہ خوردن فرستادہ شد۔ رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں سلام شوق مطالعہ نمانند۔

ترجمہ — حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام مطالعہ کریں — الحمد للہ عافیت سے ہوں۔ اس کے بعد سے کہ ہجوم فوج مرہٹہ کی وجہ سے میرٹھ سے منتقل ہو کر ہمراہ ابراہیم خلیل خان گنگا پار کر کے (وطن) گئے تھے۔ ایک مدت گذر گئی تھی کہ آپ کے احوال خیریت مآل سے آگاہ نہ تھا۔ الحمد للہ نامہ نامی پہنچا۔ موجب تسکین خاطر ہوا۔ مبدء کو اجمال اور کائنات عالم کو تفصیل تحریر کیا تھا۔ اس صورت کے شاہد سے انس و سرور اور غائب ہو جانے سے تفرقہ و حزن ہوتا ہے اور یہ سب موافق قاعدہ ہے۔ سلف

جس راستے پر چلے ہیں وہ یہی راستہ ہے، کوئی فکر دل میں نہ
نہ رکھیں ..... ایک تعویذ نواسیر کا باندھنے کے لئے اور دوسرا
دھو کر پینے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ رفعت مآب ابراہیم خان سلام
شوق مطالعہ کریں۔

(۸) ..... فقیر بجہت جمعیت ظاہر و باطن ایشان و برائے صحت و مزاج و کشائش رزق
داعی است خدائے عزوجل بفضل و کرم خود قبول فرماید۔

فقیر آپ کی جمعیت ظاہر و باطن نیز صحت مزاج اور کشادگی
رزق کے لئے دعاگو ہے خدائے عزوجل اپنے فضل و کرم سے
یہ دعا قبول فرمائے۔

(۹) حقائق و معارف آگاہ، خلاصۂ دودمان سیادت و سلالۂ خاندان سعادت میر ابوسعید
سلمہ اللہ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمائند۔ الحمد للہ علی العافیۃ رقیمۂ کریمہ مشتمل بر احوال
خویش نگاشتہ بودند رسید و بسعیٔ ایشان صد روپیہ بدست آمد خدائے تعالیٰ برکات بسیار
نصیب ایشان کناد۔ اگر سفارش نواب و چوبہار بدست آمدہ است البتہ بوطن باید رفت امید
کہ ز لطف حضرت لطیف آنست کہ وجہے برائے جمعیت ظاہر پیدا شود انہ قریب مجیب
والسلام والاکرام عزیز القدر ابراہیم خلیل خان سلام اشتیاق تمام مطالعہ نمایند۔ فقیر محمد امین
سلام شوق میرساند۔

ترجمہ —— حقائق و معارف آگاہ .... میر ابوسعید سلمہ اللہ
فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام مطالعہ کریں۔ الحمد للہ
خیر و عافیت سے ہوں مکتوب گرامی جو احوال پر مشتمل تھا پہنچا
اور آپ کی سعی سے سو روپے حاصل ہوئے اللہ تعالیٰ برکات بسیار
آپ کو نصیب فرمائے۔ اگر نجیب الدولہ کی سفارش اور چوبہار
مل گیا تو اپنے وطن رائے بریلی جانا چاہیئے اللہ تعالیٰ کے
لطف و کرم سے امید یہ ہے کہ کوئی صورت جمعیت ظاہر کی

پیدا ہو گی انہ قریبٌ مجیب ـــ والسلام والاکرام۔
عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں سلام شوق مطالعہ کریں (کاتب
تحریر ہذا) فقیر محمد امین سلام شوق پیش کرتا ہے۔

(۱۰) حقائق و معارف آگاہ خلاصۂ دودمان نجابت میر ابو سعید بعافیت دارین باشند
از فقیر ولی اللہ عفی عنہٗ بعد سلام واضح باد۔ از زبانِ بعض مردم شنیدہ شد کہ آں سیادت
پناہ را عارضہ گسل (یا کسل ؟) پیش آمدہ بود خاطر متردد است احوال خیریت مآل خود بنویسند
وانہ سرانجام کاریکہ بسبب آں در لشکر توقف شد نیز بزنگارند۔ در رجب صد روپیہ از طرف
نواب رسیدہ بود آدم را فرستادہ شد اگر صد یا زیادہ کم بدست آید دریں ایام مطلوب است
خان والاشان ابراہیم خلیل خاں سلام مطالعہ نمایند۔ میر علیق اللہ، میاں غیاث الدین و جمیع
یاراں آنجا سلام مطالعہ نمایند۔

ترجمہ ـــ حقائق و معارف آگاہ ... میر ابو سعید
عافیت سے رہیں۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہٗ کی طرف
سے بعد سلام واضح ہو کہ ۔ بعض لوگوں کی زبانی سنا
گیا کہ آپ کچھ علیل ہو گئے تھے ۔ دل پریشان ہے
اپنے احوال خیریت مآل لکھیں ۔ اور جس کام کی وجہ
سے لشکر میں ٹھہرنا پڑا ہے وہ انجام پایا یا نہیں اس کو
بھی لکھیں ۔ ماہِ رجب میں نواب نجیب الدولہ) کی طرف
سے سو روپے پہونچے تھے ۔ اگر سو روپے یا اس سے کم و بیش
حاصل ہو جائیں تو اس وقت مطلوب ہیں ۔ آدمی کو بھیجا گیا
ہے خان والاشان ابراہیم خلیل خاں سلام مطالعہ کریں۔
میر علیق اللہ، میاں غیاث الدین اور اس جگہ کے تمام دوستوں
کو سلام۔ (مسلسل)

تنقید و تبصرہ

معارف الحدیث جلد سوم۔ مشتمل "بر کتاب الطہارۃ" و کتاب الصلوۃ "۔
تالیف مولانا محمد منظور نعمانی۔ ناشر کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ قیمت مجلد
۸ روپے غیر مجلد ۷ روپے۔

احادیث نبوی کے انتخاب کا یہ مفید سلسلہ کتب مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مرتب فرما رہے ہیں اس میں احادیث کا اردو ترجمہ اور ان کی مناسب تشریحات بھی دی گئی ہیں اس سلسلہ کتب کی پہلی جلد ایمان و آخرت سے متعلق اور دوسری جلد تزکیۂ قلب و نفس اور اصلاح اخلاق سے متعلق احادیث پر مشتمل تھی اور زیر نظر تیسری جلد میں کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوۃ کی متعلق منتخب احادیث آگئی ہیں۔

فاضل مولف فرماتے ہیں کہ یہ حدیثیں زیادہ تر مشکوٰۃ المصابیح سے لی گئی ہیں بعض حدیثیں جمع الفوائد سے ماخوذ ہیں اور چند کنز العمال سے بھی۔ اور بعض حدیثیں براہ راست صحاح کی کتابوں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد سے بھی لی گئی ہیں۔ یہ وہی حدیثیں ہیں جو ان الفاظ کے ساتھ مشکوٰۃ یا جمع الفوائد میں مذکور نہیں۔

ہر موضوع سے متعلق ضروری احادیث کے انتخاب، ان کے اردو ترجمے اور پھر ان کی تشریح میں مولانا نعمانی صاحب نے خاص طور پر افادۂ عمومی کو ملحوظ رکھا ہے اور اس ضمن میں کوشش کی ہے کہ ایک تو موضوع زیر بحث کا اجمالاً پورا احاطہ ہو جائے دوسرے مثال کے طور پر قراۃ الفاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر اور رفع یدین جیسے مختلف فیہ مسائل کے بارے میں ایسی توجیہ کی جائے۔ جس سے فقہی مذاہب کے باہمی اختلافات میں تطابق ہو۔ اور ان معاملات میں ایک جامع نقطۂ نظر پیدا ہو سکے۔ واقعہ

یہ ہے کہ محترم مولانا صاحب کی یہ بہت بڑی دینی خدمت ہے۔ اس کا اللہ تعالےٰ کے یہاں تو اجر عظیم انشاء اللہ ملے گا ہی۔ لیکن ضرورت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے اسلامی حلقوں میں اس سلسلۂ کتب کی عام اشاعت ہو۔ اور اس میں احادیث نبوی کی مدد سے احکام دینی کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اسے اساس بنایا جائے اہل سنت والجماعت کے مختلف فرقوں میں باہمی اتحاد فکر و عمل کا۔

فاضل مؤلف نے ان تعلیمات نبوی کو پیش کرتے وقت بقول ان کے اس بیسویں صدی کی پیدا کردہ ذہنی وفکری تبدیلیوں کو سامنے رکھا ہے۔ اور اس میں انہیں حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے بڑی مدد ملی ہے اس بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"اللہ تعالےٰ نے اب سے دوسو سال پہلے ٹھیک اس وقت جب کہ ان مغربی علوم وافکار کی ترقی کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس کام کی بنیاد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں سے رکھوادی تھی۔ ان کی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس کام کے کرنے والوں اور اس راہ پر چلنے والوں کے لئے پوری روشنی موجود ہے اس عاجز کا خیال ہے کہ حدیث و سنت کے بارے میں ہمارے اس دور کے ذہنوں کو مطمئن کرنے کا جیسا سامان اس کتاب میں ہے، ایسا پورے اسلامی کتب خانہ کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے۔"

اس کے بعد مولانا موصوف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی اس بے نظیر کتاب کا یوں تعارف کرایا ہے۔

"اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے مقاصد و مطالب کی وضاحت اور اس کی حکمت کے بیان میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ اس سے اس دور کے ذہن بھی پوری طرح مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری بڑی اور اہم خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس کی روشنی میں امت کے فقہاء مجتہدین کے فقہی واجتہادی اختلافات کی واقعی نوعیت سامنے آجاتی ہے اور ایسا

نظر آنے لگتا ہے کہ ان ائمہ کے یہ تمام فقہی مسالک ایک درخت کی قدرتی
شاخیں یا ایک بڑے دریا سے نکلنے والی نہریں ہیں۔ ان سب کا سرچشمہ
ایک ہی ہے۔ اور ان میں کوئی تضاد اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔"

فاضل مؤلف نے اس پر بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ہماری درس گاہوں میں ابھی تک یہ ولی اللہی طریقہ رواج نہیں پا سکا۔ حالانکہ ہمارے اس دور کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ خاص الخاص نعمت ہے اس ضمن میں ہم یہ عرض کریں گے جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے امت کے فقہا و مجتہدین کے فقہی و اجتہادی اختلافات میں نقطہ جامع سامنے آجاتا ہے اور ان مختلف فقہی مسالک میں کوئی تضاد اور حقیقی اختلاف نہیں رہتا اسی طرح اگر حکمت ولی اللہی کا غور و تدبر سے مطالعہ ہو تو جملہ ادیان و مذاہب کا نقطہ جامع بھی معین ہو سکتا ہے اور اس کی روشنی میں دینی و مذہبی عنادوں کی شدت کم کی جا سکتی ہے۔ افسوس ہے جیسے ہمارے ہاں حدیث و فقہ میں ولی اللہی طریقہ رواج نہ پا سکا، اسی طرح حکمت ولی اللہی بھی ہمارے اہل فکر کا مرجع نہ بن سکی۔

فاضل مؤلف نے خود ان کے الفاظ میں کتاب میں مندرج احادیث کی تشریح میں دوسری شروح حدیث کی بہ نسبت زیادہ استفادہ حجۃ اللہ البالغہ سے کیا ہے۔

مختلف فیہ فقہی مسائل کے بارے میں مولانا النعمانی صاحب نے اس کتاب میں جو مصالحانہ مسلک اختیار کیا ہے ہم یہاں اس کی دو تین مثالیں دینا چاہتے ہیں۔

قرأۃ الفاتحہ خلف الامام کے بارے میں دونوں فقہی مذاہب کی تائید کرنے والی احادیث بیان کرنے کے بعد موصوف فرماتے ہیں۔

یہ مسئلہ کہ امام کے پیچھے مقتدی کو سورت فاتحہ پڑھنی چاہیئے یا نہیں؟ ان معرکۃ الآراء اختلافی مسائل میں سے ہے جن پر ہماری اس صدی میں بلا مبالغہ سیکڑوں کتابیں دونوں طرف سے لکھی گئی ہیں اور بلاشبہ ان میں سے بعض تو علم و تحقیق اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے شاہکار ہیں۔ لیکن معارف الحدیث کا یہ سلسلہ امت کے جس طبقے کے لئے اور جس مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا جاتا رہا ہے یہ مباحث اس کے لحاظ سے نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے مضر بھی ہو سکتے ہیں اس قسم کے تمام اختلافی مسائل میں صحیح راہ یہ ہے کہ تمام ائمہ سلف کے ساتھ نیک گمان

رکھا جائے۔ دل سے ان کا احترام کیا جائے اور سمجھا جائے کہ ان میں سے ہر ایک نے کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے طرز عمل کا مطالعہ اور اس میں غور وفکر کے بعد جو کچھ اپنے نزدیک زیادہ راجح سمجھا ہے نیک نیتی سے اس کو اختیار کر لیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی باطل نہیں ہے ....."

ان تمام اختلافی مسائل میں حضرت شاہ ولی اللہ کا جو مسلک ہے اس کو ترجیح دیتے ہوئے اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

"الحمد للہ پوری بصیرت اور یقین کے ساتھ اس عاجز کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کے مایہ فخر اور استاذ الاساتذہ حضرت شاہ ولی اللہ رح نے حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں اصولی طور پر جو راہ عدل واعتدال ان اختلافی مسائل کے بارے میں اختیار کی ہے، اس دور میں امت محمدیہ کے لئے بس وہی راہ ہے، جس کو اپنا لینے کے بعد امت کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر سے جڑ سکتا ہے۔"

دوسرا اختلافی مسئلہ "آمین بالجہر یا بالسر" کا ہے اس کے متعلق فاضل مولف نے لکھا ہے کہ "کوئی باانصاف صاحب علم اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ حدیث کے مستند ذخیرے میں جہر کی روایت بھی موجود ہے اور سر کی بھی، اسی طرح اس سے بھی کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ صحابہ اور تابعین دونوں میں آمین بالجہر کہنے والے بھی تھے اور بالسر کہنے والے بھی اور یہ بجائے خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طریقے ثابت ہیں اور آپ کے زمانے میں دونوں طرح عمل ہوا ہے ...... ائمہ کے درمیان اختلاف صرف افضلیت میں ہے، جواز سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے ....."

اسی طرح مولانا نعمانی صاحب کے نزدیک بعض صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر، حضرت ابوہریرہ اور حضرت انس وغیرہ رفع یدین کے قائل تھے۔ اور متعدد صحابہ نے ترک رفع یدین کو اختیار کیا تھا"

الغرض آمین بالجہر اور آمین بالسر کی طرح رفع یدین اور ترک رفع یدین بلاشبہ دونوں عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں ..."

کتاب کی کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے اور اس میں نہایت عمدہ قسم کا کاغذ استعمال ہوا ہے۔ اور باوجود اتنی ضخامت کے، اس کی قیمت زیادہ نہیں۔

معارف الحدیث کی اس جلد میں طہارت کے جملہ مسائل اور وضو اور تیمم اور ہر قسم کی نمازوں کے سارے احکام آ گئے ہیں۔ چوتھی جلد زیر تالیف ہے اس میں روزہ، زکوٰۃ، حج اور اذکار و دعوات کے ابواب کی حدیثیں ہوں گی۔

معارف الحدیث کی ترتیب اور اشاعت کا کام اس اہتمام سے کیا جا رہا ہے کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

(ا۔ س)

ذکر اشرف

پروفیسر محمد اشرف صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج سکھر نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم و مغفور کے مختصر ترین حالات، ارشادات اور ملفوظات" پر مشتمل ۶۲ صفحے کا یہ رسالہ اس نیک مقصد کے تحت مرتب کیا ہے، تاکہ ہمارے بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو دین سے رغبت پیدا ہو اور ممکن ہے کہ ان کو اصل کتابوں کے لئے پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے، جن سے اقتباسات لئے گئے ہیں۔

اس دور میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے روحانی فیوض، آپ کی تصنیفات اور دینی و اخلاقی تربیت و تزکیہ سے اتنی کثیر التعداد مخلوق نے اتنا زیادہ فائدہ اٹھایا ہے کہ آپ کو اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ حضرت تھانویؒ نے تقریباً ایک ہزار کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جو اس زمانے کے لئے شریعت و طریقت کے علوم کی بہترین شارح ہیں۔ آپ کے مسترشدین کا کوئی حساب نہیں تھا۔ اور اس پر آپ ان میں سے ہر ایک کی طرف ذاتی توجہ فرماتے، اس کے سوالات کا جواب دیتے اور خط و کتابت کے ذریعہ اس کے نفسی و ذہنی ترددات کو دور فرماتے اور اس کی مشکلات کو حل کرنے کی سعی کرتے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے آپ کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے۔ "حضرت تھانویؒ اپنی تدقیقات باطنی و معالجۂ امراض نفسی سے اپنے وقت کے امام غزالی تھے۔"

مولانا اشرف علی تھانویؒ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے بیعت تھے یہ
اور یہ وہ بابرکت ذات تھی جس سے مولانا محمد قاسمؒ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا
محمد یعقوب مدرس اوّل دار العلوم دیوبند جیسے بزرگوں نے فیض پایا تھا۔ حضرت تھانوی
دوبار مکہ معظمہ گئے وہاں اپنے مرشد کی نگرانی میں سلوک و تصوف کی تربیت حاصل کی
اور پھر آپ نے اسی مسند امدادی کو زینت بخشی۔

گو تصوف کا ذوق اب ہمارے ہاں کچھ کم ہو رہا ہے، لیکن جس عہد سے ہمارے یہ
بزرگ تعلق رکھتے ہیں، اس میں مادی زندگی کے علاوہ انسان کی جو بھی زندگی ہے، تصوف
ہی اس کی اساس اور اس کا مقصود سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی کے ذریعہ اس غیر مادی زندگی کو
سمجھا اور ڈھالا جاتا تھا بدقسمتی یہ ہوئی کہ اکثر دوائر میں یہ تصوف شرعی حدود اور شرعی
فکر سے آزاد ہو گیا۔ اور بقول سید سلیمان ندوی مرحوم نتیجہ یہ نکلا۔

صوفیانہ خانوادوں کی جہالت اور موروثی گدی نشینی کی متواتر
رسم نے اللہ تعالیٰ کی بخشش، اجتہاد اور مقبولیت کو بھی
ایک صنعت گری کا کارخانہ بنا رکھا تھا۔ خانقاہوں کا کام صرف
اعراس و فاتحہ کا اہتمام اور سماع و رقص کا انصرام رہ گیا
تھا۔ مقررہ دنوں میں کچھ لوگ جمع ہو کر فاتحہ خوانی کریں۔
مٹھائی کھالیں اور ایک جگہ جمع ہو کر کسی سازندے کے ترانے پر
ہو حق کریں ....."

حضرت تھانوی کی پوری زندگی اس مبارک کام کے لئے وقف رہی کہ وہ تصوف کا اثبات
کرتے ہوئے اسے قرآن و سنت اور شریعت سے ہم نوا اور تابع کریں۔ اور آپ کا
یہ بہت بڑا کارنامہ ہے، جس کے اثرات تادیر رہیں گے۔ اس سلسلہ میں حضرت تھانوی
نے شریعت و طریقت کی وہی خدمت سرانجام دی ہے، جو کئی صدیاں پہلے امام غزالی
نے دی تھی۔

بے شک حضرت مولاناؒ نے تصوف کو حدود شرع کا پابند بنا کر مسلمانوں کی انفرادی

۔ آگ کو ایک اخلاقی ثبات و استحکام بخشا ہے، لیکن اس اخلاقی ثبات و استحکام کو حرف آخر اور اسلام کا اصل مقصود سمجھ لینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہوگا۔ آج ہمارے سامنے زندگی کی بالکل نئی راہیں کھل رہی ہیں۔ اور ہم خواہ چاہیں یا نہ چاہیں ان راہوں پر ہمیں چلنا لابد ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس اخلاقی ثبات و استحکام کو سب کچھ نہ سمجھ لیں اس سے انسان میں ایک خاص قسم کی تنگی اور کرختگی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اوپر باہر کی زندگی کے دروازے بند کر لیتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اگر نفس کی اصلاح و تزکیہ ہو گئی تو وہ اپنی مراد کو پہنچ گیا۔ باقی دنیا جانے اور اس کے کام۔ مجھے اس سے کیا واسطہ۔

جس طرح بدنی ریاضت اصل مقصود نہیں بلکہ اس سے جو جسمانی قوت حاصل ہوتی ہے، اسے مفید کاموں میں صرف ہونا چاہیئے، اسی طرح اشغال و اوراد جو در اصل روحانی ریاضت کا نام ہیں اعمال صالحہ کا اپنے دینی اور انسانی معنوں میں پہلا زینہ ہیں۔ ہمارے بعض صوفیہ نے بدقسمتی سے انہیں اشغال اوراد کو آخری مقصد سمجھ لیا۔

پروفیسر محمد احمد صاحب ایم اے نے ذکر اشرف میں حضرت تھانوی کا بڑا اچھا تعارف کرایا ہے امید ہے اسے پڑھ کر ہمارے نوجوانوں میں حضرت ممدوح کی تعلیمات کا براہ راست مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔

قیمت آٹھ آنے۔ مقام اشاعت اسلامیہ کالج سکھر

افکار و آراء

جناب ایڈیٹر صاحب

میں اپنی استعداد کے مطابق شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں بعض احادیث میں جو تھوڑے بہت اختلافات پائے جاتے ہیں اور خاص کر ائمۂ فقہ کے آپس کے بعض اختلافات، یہ مجھ جیسے اکثر لوگوں کے لئے باعث تشویش بنتے ہیں۔ اس بارے میں مجھے شاہ صاحب کی کتاب "خیر کثیر" کی ایک عبارت بڑی پسند آئی ہے۔ اس کا ترجمہ میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔

امام ابوالحسن اشعری کے مذہب کو ہم وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور ہماری رائے میں وہ صحابہ کے مذہب کے مطابق ہے، اور اسی کا تمثل ہے۔ اس کا مسلک ارادۂ متجددہ کی فرع اور اس کے ماتحت ہے۔ اس کے علم و معرفت کا دارومدار اسی پر ہے۔ یہ اصول اس کے پیش نظر رہتا ہے کہ ہر ایک غیر ضروری تفصیل کو نظر انداز کیا جائے۔ اگر تم کو صحابہ کے مذہب پر عبور حاصل ہے تو تم اس نتیجے پر پہنچوگے کہ امام موصوف کا مذہب درحقیقت اس کے مطابق ہے۔

اعمال کے متعلق ہمارا نظریہ یہ ہے کہ احادیث کی چھان بین کی جائے۔ اور فقہ اور درایت کے ساتھ ان کے مطابق اپنے اعمال کو درست کیا جائے۔ حکیم ربانی کے نزدیک قیاسات میں سے صرف وہی مقبول ہے، جو قیاس جلی ہو یا وہ قیاس خفی جس کی بنا

مصلحت عامہ پر ہو۔ جو لوگ اتباع رائے میں تعمق کرتے ہیں، وہ قطعاً اہل سنت نہیں۔

صحابہ سے جو اختلاف احادیث کی روایت کرنے میں واقع ہوا ہے، اس کے کئی اسباب ہیں:۔ ایک تو یہ کہ وہ اکثر روایت بالمعنی کرتے ہیں۔ دوسرے ایک راوی کسی عبارت یا کسی فقرے کو حدیث میں سے حذف کر دیتا برخلاف اس کے دوسرا راوی اسے بیان کر دیتا۔ تیسرے ایک راوی کو کچھ وہم سے ہو جاتا تھا، اور اس لئے اس کی تعبیر دوسرے راویوں سے مختلف ہوتی تھی۔ چوتھے بعض اوقات نسیان کی وجہ سے اختلاف ہو جاتا اور ایک لفظ دوسرے سے بدل جاتا۔

آیات کی شان نزول میں اس لئے اختلاف پیدا ہوا کہ بسا اوقات جب صحابہ کرام کسی آیت کی تفسیر کرنے لگتے۔ تو اس کی مصداق واضح کرنے کے لئے کوئی قصہ بطور مثال بیان کرتے یا کوئی ایسا واقعہ سناتے، جو عہد نبوت میں واقع ہوا ہوتا۔ اور اس آیت میں جو حکم کلی تھا اس کی جزدیات میں سے ہوتا۔ یہ سنکر راوی خیال کرتا کہ آیت کے نزول کا سبب بعینہ وہ قصہ یا واقعہ ہے، اور اس کے بارے میں یہ آیت یا آیات نازل ہوئیں۔ وقت نزول میں اختلاف پیدا ہونے کا باعث یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کسی واقعہ کے پیش آنے پر کلام مجید کی کسی آیت یا آیات سے استشہاد فرماتے یا اس واقعہ کا حکم اس آیت یا آیات سے استنباط فرماتے اس سے راوی کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اسی واقعہ کے لئے یہ آیت یا آیات نازل ہوئی ہیں۔

احکام شرعیہ کے متعلق جو اختلاف صحابہ میں پیدا ہوا، اس کا باعث یہ ہے کہ آپؐ کی سنتیں مختلف ہیں۔ کسی نے ایک پر عمل کیا، کسی نے دوسری سنت کی پیروی کی۔ یا یہ کہ دو صحابیوں نے بیک وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی عمل کرتے دیکھا۔ یا آپؐ کی حدیث سنی لیکن ایک نے اس کی ایک طرح پر توجیہ کی، دوسرے نے اس کو کسی اور علت یا جہت پر محمول کیا۔ وقت اور جگہ اور آراء مختلفہ کی بنا پر اکثر مصالح میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب ہو سکتے ہیں۔ راوی اکثر اس بات کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ صحابہ کا درجہ کمال بھی مختلف ہے کوئی تو متوسط متحمل ہے کوئی خلیفہ ہونے کی استعداد رکھتا

ہے۔ کوئی فقیہ اور کوئی اس سے فقیہہ تر ہے صحابہ ہی کا اختلاف بعد کے لوگوں کے لئے اختلاف کا موجب ہوا۔

اس بات کو خاص طور پر یاد رکھو کہ ایمان کی اصل یہ ہے کہ آدمی کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہو۔ اس لئے کسی نہ کسی شکل میں حکمت، عصمت اور وجاہت اس کا اقتضائے ذاتی ہے۔ اگرچہ یہ عالم مادی ان صفات کے کما حقہٗ ظہور میں آنے سے مانع ہے اسی طرح کفر کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی ظاہر اور باطن میں اللہ کے حکموں سے روگردان ہو۔ اس لئے اس کا ذاتی اقتضا یہ ہے کہ وہ ان اوصاف کے اضداد سے موصوف ہو۔" خیر کثیر"

عبدالحمید۔ مزنگ لاہور

محترمی ایڈیٹر صاحب

اس میں شک نہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں ہمارے ہاں جو بھی آج مذہبی بیداری ہے اس کے سوتے حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریکات سے پھوٹتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے سب سے پہلے بادشاہت کو للکارا، اس زمانے کے امراء کو اصلاح احوال کی طرف توجہ دلائی آپ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کا دور آیا، تو انہوں نے امراء کے ساتھ ساتھ ملت کے متوسط طبقے کو بھی مخاطب کیا۔ بعد میں آپ ہی کے سلسلے کے ایک بزرگ حضرت سید احمد شہید بریلوی نے براہ راست عوام تک پہنچے اور ان کو منظم کرکے اس سرزمین میں اسلام کو سربلند کرنے کی کوشش کی۔

واقعہ بالاکوٹ کے بعد احیائے اسلام کی اس جدوجہد کی وہ وحدت نہ رہی اسی زمانے میں انگریزوں جیسی مدبر قوم برسراقتدار آگئی۔ اور اس کی سازشوں نے ملت کی اصلاحی کوششوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ قدامت پسند طبقے الگ ہو گئے اور نئے زمانے کا ساتھ دینے والوں نے اپنی ایک الگ راہ بنالی۔

اس برصغیر کی آزادی و استقلال کے بعد حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ کم سے کم پاکستان میں ملت کی اصلاحی کوششوں کو متحد کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میری یہ تجویز ہے کہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی طرف سے ایک ایسی کتاب شائع کی جائے جس میں اس سارے دور کا جائزہ لیا جائے اور بتایا جائے کہ احیائے اسلام کی یہ تحریک اصلاً کیا تھی، اور اسے کس طرح آج عملی شکل دی جا سکتی ہے۔

الطاف جاوید۔ کراچی

المسوّٰی من احادیث الموطا (عربی)

تالیف ——————— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۴۲ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حاشیے ہیں۔ شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح المصفّٰی پر آپ نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے۔ شاہ صاحب نے المسوّٰی میں الموطا امام مالک کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے منفرد تھے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ الموطا کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر باب کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد دو حصّوں میں — قیمت - ۲۰ روپے

(عربی)

لمحات

شاہ ولی اللہ رح کے فلسفۂ تصوّف کی یہ بنیادی کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفٰے قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ ملا۔ موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔

قیمت دو روپے

شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام حسین جلبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلبانی ایم۔ اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے جس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں قیمت ۷/۵۰ روپے ہے۔

"AR-RAHIM" Hyderabad Regd. S. No. 2548

شاہ ولی اللہ اکیڈمی

اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں
۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور
واشاعت کا انتظام کرنا۔
۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر سے تعلق
جو کتابیں دستیاب ہوسکتی ہیں اُنہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک
کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔
۴۔ تحریک ولی اللّٰہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسر
کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔
۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتبِ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا
۶۔ حکمتِ ولی اللّٰہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں
۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُنہیں
غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں

محمد سرور پرنٹر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر